بابا محمد یحییٰ خان

پیا رنگ کالا



اللہ کا بندہ جسے نماز میں حضوری کی نعمت حاصل ہو جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اُس کے چہرے پہ اللہ کی تجلی و تجمل کا ایک خاص نور جھلملاتا ہے۔ اُس کا چہرہ ایسا شفاف، مسکراہٹ ایسی ملکوتی اور لہجہ ایسا پاکیزہ اور پُر اثر ہوتا ہے کہ مخاطب وفورِ نیاز و تسلیم سے بھیگ جاتا ہے۔ اور وہ اس نور کا سرمدی سا ظہور اپنے وجدان پر محسوس کرتا ہے۔

درویشوں کے دروں کے کالے کتے بادشاہوں کے درباروں کے سفید ہاتھیوں سے لاکھ درجہ قیمتی اور عزت والے ہوتے ہیں۔

خالقِ ازل و ابد نے ایسے انسان بھی تخلیق فرمائے جنہیں مہدِ مادر میں ہی بہت سے علوم و فنون، کرامات و درجات اور قوتیں، صلاحیتیں ودیعت فرما دیں...... کسی کا باطن صیقل کر دیا تو کسی کی آنکھیں آئینہ کر دیں تو کہیں سینے وادیٔ سینا کر دیے۔ دل گداز دیے تو کہیں حوصلے فراخ دیے۔ کسی کے طائرِ فکر کو آشنائے لاہوت کر دیا۔ کسی کو پروازِ تخیل دے کر مبہوت کر دیا۔ کسی کی خرد و بینش کو ارسطو کر دیا تو کسی کو بینائی و دیدہ وری کا حکیم الامت کر دیا۔



باہر ہیں حدِ فہم سے رندوں کے مقامات
کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیا رنگ کالا

سپاس

بڑے بابا جیؒ

حافظ قاری عنایت اللہ جلالپوریؒ

چاچی جموں والی • شاہ صاحب المعروف میاں جی سنگلاں والےؒ

بابا رحمت سائیں • رجل سیاہ پوش المعروف یا علی مدد • بابا جی قاسم شہیدؒ

پیر سیّد قطب الدین جلالی افغانیؒ • بابا ذہین شاہ تاجیؒ

صوفی مستری نوردین المعروف نور جہاںؒ • سوامی اُوم کار جی

حافظ مولوی سیّد قمر الدین شاہ اجمیریؒ • ڈاکٹر اسٹیفن رابرٹ

سیٹھ سلیمان علی بہادر خان بمبئی والے • ڈاکٹر فاسٹر اڈیمس

مرزا محمد یحییٰ علی خان المعروف صبحِ ازل • علی محمد شیرازی • چودھری محبوب عالم شکر گڑھوی

احمد دینار • عمر خیام • عمر مختار • میڈم آبیرے ڈیوڈ

آغائے سلیمان ژندی • سینٹ ڈگلس سیٹھ • مولانا محمد یوسف المعروف قونیائی محبوبؒ

لامے گورڈے شیوا • پنڈت رام دھیان • مادام ٹی ایم زیڈ بائی ڈبل زیڈ

نصیبو بی بی • کستوری کی ''ا'' کی اجازت و معاونت

اور

''م'' • ن ظ د ذ ن ک ظ ن ک ظ ن ک س ن ک ع

کی بھرپور استعانتوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

پیا رنگ کالا

بابا محمد یحییٰ خان

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Muhammad Yahya Khan, Baba
Piya Rang Kala / Baba Muhammad
Yahya Khan.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2009.
722pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2009
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔
باردوم، جولائی 2009

بابا محمد یحییٰ خان
412-نرگس بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
فون: 042-7844838
موبائل: 0300-9417829, 0333-4231848
0322-4670170, 0346-6629985
piyarang_kala@hotmail.com
piyarang_kala@yahoo.com
www.piyarangkala.com

بوجوہ چند نام و مقامات اور واقعاتی کوائف و بیان میں چند اں ترمیم، تخریج و تخصیص ناگزیر تھی......کوئی بھی مطابقت، مماثلت محض اتفاق ہوگی......!

ISBN-10: 969-35-2225-7
ISBN-13: 978-969-35-2225-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

○

داستان سرائے

۱۲۱۔ سی 'ماڈل ٹاؤن'

لاہور۔

کے

مکینوں 'درخشندہ جبینوں

کے

نام

○

- اَلِف اَللہ
چَنبے دِی بُوٹی میرے مَن وِچ مُرشد لائی
ہُو

حرفے چند

بحمد اللہ' "پیا رنگ کالا" کا موجودہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا مرحلہ بھی طے ہوا۔ اِس کتاب کے "مضامینِ بارنگ جنوں" اپنے بیاں و زباں' موضوع و مذاکرت اور انداز و انگ کے اعتبار سے جہاں مُہمل و اَدق سے لگتے ہیں وہیں یہ (بظاہر) بے ربط و بے ضبط اور تحیّر خیز سے بھی محسوس ہوتے ہیں اور شاید یہی ان کی "نمایاں خرابی" یا "نہفتہ خُوبی" بھی ہے۔ بااَیں ہمہ اِس کتاب کو ناول کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ سفرنامہ' افسانہ' انشائیہ یا قصے کہانیوں کی ذیل میں آتی ہے۔ البتہ اسے کسی جہاں نورد دیوانے کی ڈائری یا کسی دَر دَر خوار و زبوں حال دَرویش پہ پڑنے والے "ہاتھوں" یا سر پڑی "وارداتوں" کی اَجمالی تفصیل ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی پُراَسرار اور عجیب و غریب "وارداتیں" ہیں جو میرے بطون اور قلب و نظر پر سے ہو گزری ہیں...... بچوں کی سی باتیں' شرارتیں' جوانوں کی سی خوشیاں ترنگیں اور بوڑھوں مجذوبوں سے اُونگیاں بونگیاں...... فقیروں دَرویشوں کی پیش بیتیاں' بوالعجبیاں اور نکتہ آفرینیاں۔ فلک فلک' ملک ملک' شہر بہ شہر' قریہ قریہ' سمندر' پہاڑ اور صحرا...... میری چالاکی ملاحظہ فرمائیں' مَیں نے واقعہ دَر واقعہ' رمز با رمز' حروف و الفاظ کی ہر اوٹ اور حیلہ' اپنی بے علمی اور جہالت اپنی سی حد تک چھپانے کی ناکام کوشش بھی کی ہے۔ وہ بات کہ ہاتھی کے دانت' بارہ سنگھے کے سینگ' کم سوا بے ظرف اور جہالت کی بینگ کی بُو کو چھپانا' لُکانا مشکل ہوتا ہے۔ یا جیسے ناکام گویا یا مُنہ بگڑا موسیقار بالآخر قوالوں کے سنگ گلے بازی پہ بیٹھ جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی مجھ ایسے بے علمے' بے اَدبے' آخر وقت اَدب کے ساتھ یہی کچھ بے اَدبی کرتے ہیں یعنی یہ کتاب لکھ کر جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے ایک اور بات جو مَیں کہنا

چاہوں گا کتاب کے حوالے سے ایک حادثہ یہ بھی ہوا کہ خوش عقیدہ قارئین کی ایک خاصی تعداد میرے ساتھ عقیدت و اَرادت کے سلسلے بھی جوڑ بیٹھی ...... الحمدللہ! کہ اِس ''تعلقِ خاص'' کے حوالے سے مجھے بھی اللہ کی مخلوق کی چنداں فکری' ذہنی' نفسیاتی اور رُوحانی تناظر میں کچھ خدمت کا موقع نصیب ہوا۔

زیرِ نظر ایڈیشن میں جسامت وقدامت' سرورق وپس ورق ...... طباعت وضخامت ...... کمپوزنگ' آرٹ ورک اور پیشکش میں بڑی جاذبِ نظر' جدید انداز کی خاطرخواہ تبدیلیاں لائی گئیں۔ اسی طرح ازسرِنو کمپوزنگ سے بہت سی خامیاں اور اغلاط بھی گرفت میں آئیں ...... سو ایسی نکھری اُجلی تقطیع وتعدیل کے بعد کتاب مزید کالی شاکالی ہو کر آپ تک پہنچ پائی ہے۔

کسی بھی کتاب میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے اِس میں سہو کے اِمکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سو یہ کتاب بھی بے شمار خامیوں کا مجموعہ دکھائی دے گی ...... میں پڑھا لکھا یا کوئی مستند اَدیب نہیں اس لئے زبان و بیان کے لاتعداد سقم و سہو بھی نظر آئیں گے اور اکثر وبیشتر الفاظ واستعارات' تشبیہات' تلمیحات اور کچھ اصطلاحی اسماء کی تکرار بھی کھٹکے گی۔ اِسے آپ میری بے ہنری' بے علمی سمجھ لیں یا پھر مجبوری ...... جیسا کہ وِلایت ووَصائیت ...... نقابت و وِراثت ...... حکمت و کیمیا یا اور جتنے بھی معقولات و منقولات' لاہوتی ملکوتی' عُلوی سفلی' خفی علوم ہیں سارے اسی لئے اَدق اور پُر اسرار ہیں کہ ان کی علمی تشریحی اصطلاحیں' مَعارف و معنی عام فہم و ادراک سے بالاتر ہوتے ہیں۔ انہی علوم کا ایک اَدنیٰ طالبعلم ہونے کے ناتے جو کچھ میں نے دیکھا' جانا' جانچا' برتا' محسوس ہوا اور حاصل کیا ...... وہ مِن وعَن لکھ دیا۔ اب مجھے اپنے بہت سارے کرم فرماؤں اور بچوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میری معاونت ومعاملت فرمائی ...... اللہ کریم! انہیں جزائے خیر دے۔

بابا محمد یحییٰ خان

●

اشفاق احمد

پیچیدہ اور ژولیدہ واقعات کی کتھا ......

اس کتاب کو میں نے تفریحاً پڑھنا شروع کیا کہ مجھے محمد یحییٰ خان کی تحریر اور اُس کا انداز بہت ہی پسند ہے۔ یہ قاری کو پکڑتا ہے اور ٹھم سیٹیاں دیتا ہوا ساتھ بھی گھسیٹے لئے جاتا ہے۔ نہ ہاتھ چھوڑتا ہے نہ سانس لینے دیتا ہے' نہ اپنے نظاروں اور نیرنگیوں سے صرفِ نظر کرنے دیتا ہے۔ ایک بار اُس کے چنگل میں آ گئے تو پھر چل سو چل' آگا نزدیک' پیچھا دُور' منزل در منزل سفر در سفر یا کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

یہ کتاب چونکہ بڑی ضخیم ہے اور تحریر کے مقابلے میں متکلم زیادہ ہے۔ اس لئے میں نے پوری تیاری اور ہشیاری کے ساتھ اس پر ہاتھ ڈالا۔ کچھ دیر اور ذرا سی دُور تک تو میں اپنے پاؤں پہ چلا پھر اُچک لیا گیا۔ لیکن اس اُچک میں' میں نے آنکھیں بند نہیں کیں اور کشادہ نظروں سے جو کچھ دیکھا وہ ایک نیا تجربہ اور انوکھی واردات تھی۔

یہ کتاب یوں تو "مے مائرز" کے ذیل میں آتی ہے اور جو کچھ مصنف کی ذات پر گزرا مجھ پر کبھی نہیں گزرا لیکن میں ان واقعات کا بطلان نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگوں پر بہت دیر تک ایسی کیفیات اور ایسی واردات وارد رہی ہیں۔ لیکن ان کی پکار کو کسی نے اہمیت نہیں دی اور اسے سچ نہیں جانا۔ اُردو کا جدید اَدبی دَور ایسے واقعات' مشاہدات اور ایسی کیفیات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا کہ اس نے اپنی توجہ کا پورا ہینڈل 180 ڈگری پر سائنس' منطق' کلام اور دلیل کی طرف موڑ رکھا ہے اور دوسری قسم کی ساری واردات کو تشکیک اور ضعیف الاعتقادی کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ وَلایت والے ابھی تک اس پر بڑے زور و شور سے کام کر رہے ہیں مگر اُردو والے اسے اپنی "گہری تحقیق" کے بعد توہم پرستی کی مسل میں باندھ کر داخلِ دفتر کر چکے ہیں۔

...... [illegible]

اس داخلی دفتر کوٹھڑی کے کسی کونے سے ایک نیولا اُلجھے ہوئے کاغذوں کا ایک مُٹھا لے کر برآمد ہُوا ہے جس کے گرد "پیا رنگ کالا" کی ڈوری بندھی ہوئی ہے۔ یہ کاغذ کچھ ایسے پیچیدہ اور ژولیدہ واقعات کی کتھا سناتے ہیں کہ کبھی تو ان پہ فریزر کی "گولڈن بوع" کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی کولن ولسن کے تحریروں کا اور کبھی اس کے اندر گرجیف کی خرکی قوت روشن ہونے لگتی ہے۔

سیدھے سیدھے عام واقعات' کچھ پیشِ روزن کچھ پسِ دیوار' آپ انہیں پڑھیں گے تو لڑیں گے اور جھگڑا کریں گے کہ ایسے کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ مجھ پر ایسا کوئی واقعہ نہیں گزرا تو محمد یحیٰی خان پہ کیسے گزر گیا! سندھی مانجھی یہ کیوں کہتا ہے کہ پلّہ مچھلی سب سے مزیدار ہوتی ہے۔ میں نہیں مانتا کیونکہ میں نے آج تک پلّہ مچھلی نہیں کھائی پھر میں کیسے مان لوں کہ وہ سب سے زیادہ مزیدار ہوتی ہے۔ سندھی مانجھی جھوٹ کہتا ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

اُردو کے ذہین قاری چونکہ سائنسی رَوِیوں کے حامل ہیں اس لئے اس کتاب پر ہمیشہ بحث ہوتی رہے گی۔ مغرب کے محقق اس کا ترجمہ کروا کے اس پہ غور کرنا شروع کر دیں گے کہ "لامعلوم" کی دُنیا کس قدر وسیع ہے اور اس کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

میں اس کتاب کو ایک مرتبہ پھر پڑھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں کہ اُردو ادب میں ایک بہت بڑی بلکہ بہت ہی بڑی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔ مصنف کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں مگر نہیں دے سکتا کہ اُصولاً بڑے رائیٹر ہمیشہ جونیئر اور نئے آنے والے ادیبوں کو مبارک باد دیا کرتے ہیں۔ یہاں معاملہ اُلٹ ہو گیا ہے۔

بانو قدسیہ

محمد یحییٰ خان کی کتاب ''پیا رنگ کالا'' شیش ناگ کی داستان ہے۔ سُنا ہے یہ دیومالائی سانپ جب پیدا ہوتا ہے تو اِس کی رُوپا رنگت پر آنکھ نہیں ٹکتی۔ جُوں جُوں بڑھتا ہے اس کا رنگ لاکھا اور آنکھیں سفید ہوتی جاتی ہیں۔ پھر جہاں سے یہ گزرے وہیں اس کی چاندی اُتر کر جگہ کو کافوری کر جاتی ہیں۔ پورا قد آنے پر یہ پورے کا پورا ہَوا میں مُعلّق ہو سکتا ہے۔ جو اس کی جانب دیکھے لے مسحور ہو جاتا ہے۔ سو سال کا شیش ناگ جُون بدل کر اِنسان بن جاتا ہے پھر اس کی نت نئی کہانیاں' نئے نئے رُوپ' اَنت کی شعبدہ بازی اور بے اَنت قصّے ہیں۔

''پیا رنگ کالا'' لکھ کر محمد یحییٰ خان نے اُردو فکشن پر بڑا احسان کیا ہے۔ انوکھا سٹائل' بے پناہ تجربہ و مشاہدہ دریا کی سی رَوانی...... جب جی چاہا جدھر چاہا قاری کو پیچھے لگانے کا فن و ہنر...... اس ناول میں دیومالا قصّے بھی ہیں۔ انسانی سائیکی کے چُھپے ہوئے شعبدے بھی ہیں اور عام زندگی کی دانش بھی موجود ہے۔ ایسی کتاب لکھنے کے لئے جو تجربات اور جس سیلانی زندگی میں قلم ڈبونے کی ضرورت پیش آئی ہوگی' وہ صرف بے قرار' مضطرب' بے چین محمد یحییٰ خان کے حصّے میں آئی ہے۔

محمد یحییٰ خان وہ دروازہ ہے جو کسی خانقاہ میں کُھلتا ہے' وہ کھڑکی ہے جو طوائف کے کمرے میں وَا ہوتی ہے' وہ جُھرّی ہے جس سے بچّے مندر کے اندر جھانکتے ہیں۔ اُس اندھی ماں کی آنکھ ہے جو لاٹھی ٹیک کر بازار میں اپنا گُم شدہ بیٹا ڈھونڈتی ہے۔ محمد یحییٰ خان قبر کے اندر سے پُھوٹنے والا میٹھا چشمہ ہے جو شہرِ خموشاں میں چُپ چاپ راستے بناتا ہے۔ وہ چِق ہے جس کے پیچھے سے ہسٹریا زدہ لڑکی گلی میں زندگی کی تلاش کرتی ہے...... محمد یحییٰ خان زُوم لینز بھی ہے اور انٹرنیٹ کی سکرین بھی...... اگر آپ جاننا چاہیں کہ اُردو میں ناول کے کیا کیا امکانات ممکن ہیں تو ''پیا رنگ کالا'' کی ورق گردانی کیجیے۔ محمد یحییٰ خان سے آپ کا تعارف بھی ان ہی صفحوں پر ہو جائے گا۔ سلامت رہو محمد یحییٰ خان لکھتے رہو......

زوم لینز اور انٹرنیٹ کی سکرین......

مظفر وارثی

علامہ اقبالؒ نے.....
گوشت کے ایک نوزائیدہ لوتھڑے کو اپنی
دُعاؤں میں لپیٹ کر زندگی کے حوالے کر دیا'
زندگی اِسے کالکوں کے پاس لے گئی۔
.....اُسے زاغ بہت اچھا لگا
"صبحِ صادق کا پہلا مُوذّن"
اُس نے اپنے رنگ ڈھانپنے کے لئے احرامِ زاغ پہن لیا۔
کالی چادر میں روشن باطن'
کوئلے کی کان میں ہیرا'
چمکیلی آنکھوں میں سُرمے کی ڈوریاں.....
زاغ ہی زاغ اُس کے اندر اُترنے لگے'
وہ اِس سے مانوس ہو گئے ہیں۔
روشنیاں اِس کا راستہ بن گئیں
راستے اِسے آواز دیتے ہیں
لیکن وہ اَن سُنی کر دیتا ہے
وہ اندھیروں کا شوقین ہے
ذات کے اندھیروں کا
کوئی زاغ آئے گا جو اِسے صبحِ نو کی خبر دے گا
اور اس کا اقبال دُعاؤں کی چادر میں لپیٹ کر
اِسے گھونٹ گھونٹ آبِ حیات پلائے گا۔

ابدال بیلا — بوتل کا جن

بابا محمد یحییٰ خان.. بندے کے رُوپ میں کسی عہدِ عمیق کا کوئی جِن ہے۔ خدا جانے اسے بوتل سے کس نے نکالا ہے۔ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے' اس نے سہمی ہوئی دُکھی دُھندلائی منزلوں کی انسان بستی میں اَمن کا بڑا سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ خُدا اور بندے کے رشتے کو اِک نئے رنگ سے متعارف کرا دیا ہے۔ بندے کو اُٹھا کر خُدا کے سامنے ننگا کھڑا کر دیا ہے کہ لو' جو تیرا خالق ہے تُو اُسے دیکھ اور وہ تجھے دیکھے۔

زیرِ نظر یہ کتاب ہی انوکھی نہیں' اس کا مصنف بھی وکھرا ہے۔ اپنی کتاب لے کر وہ عکسی مُفتی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "اس کتاب پر ممتاز مُفتی سے کچھ سطریں لکھوا دیں۔" عکسی مُفتی' بابا محمد یحییٰ خان کی بات سن کر مسکراتا مسکراتا رُک گیا۔ حیرت سے آنکھیں پھیلائے بابا محمد یحییٰ خان کو دیکھتے ہوئے زیرِ لبی بولا۔ بابا محمد یحییٰ خان! ممتاز مُفتی کو گئے تو بارہ سال ہو گئے ہیں' تم اَب اُن سے کچھ لکھوانے آئے ہو!

بابا محمد یحییٰ خان' عکسی مُفتی کی حیرت زدہ آنکھوں میں اپنی بے نیازی کی پچکاری مارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ عکسی جی! یہاں جسموں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مَیں ممتاز مُفتی کے قلم سے کچھ لکھوانے آیا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں بندے کا جسم مرتا ہے' اس کا قلم نہیں۔ خُدا سے عطا ہوئے قلم کو موت نہیں آتی۔ وہ زندہ و اور قائم رہتا ہے۔ اِس لئے کہ اِس قلم نے خُدا کی عظمت اور اُس کے رسول ﷺ کی بڑائی بیان کی ہوئی ہوتی ہے۔ اِس نے اپنے قلم سے اپنی "مَیں" میں ہوا نہیں بھری ہوتی۔ اپنی "مَیں" کے غبارے میں سُوئیاں ماری ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ چُرمُر ہُوا' چھیچھڑا بنا' بے ہُوا کا غبارہ ہوتا ہے مگر ہوتا وہی قائم اور زمین سے بندھا ہوا ہے۔ اسے اندر یا باہر کی کوئی بھی آندھی بے وزن بنا کر اُڑا نہیں سکتی۔ آپ مجھے اُن کے بارہ سال پہلے چلے جانے کی خبر نہ

سُنائیں۔ اس کا پتہ بتائیں جس کے ہاتھ میں وہ اپنا قلم دے کر گئے ہیں۔

عکسی مُفتی کچھ دیر کھڑا بابا محمد یحییٰ خان کو ایسے دیکھتا رہا' جیسے اس کے سامنے بندہ نہیں کوئی جن کھڑا ہو۔ عکسی مُفتی سمجھ گیا جو اس کے رُوبرو کھڑا ہے' اُسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ اُس نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور مجھے ڈائل کر کے کہنے لگا۔

ابدال! تیرے بابے کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک بابا آیا ہے..... اِسے آتے آتے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ بارہ سال بعد آ کے اُس نے اِدھر دستک دی ہے۔ اَب تُو دروازہ کھول..... ''پیا رنگ کالا'' تجھے بھیج رہا ہوں' تُو اسے اپنے بابے کو پڑھا اور اُن سے کچھ سطریں لکھوا کے مجھے فیکس کر دے۔

میرا فیوز اُڑ گیا..... یہ کون میرے بابے کو نیند سے جھنجھوڑنے آ گیا ہے۔ بارہ سال بعد اُن کی وفات کے اُنھیں اپنی کتاب پڑھانے' اُن کے تاثرات لکھوانے کی ضد پال لی ہے۔

کتاب مجھے مل گئی۔ میں اپنے بابے کو اوڑھ کے اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ چند صفحے پڑھے ہوں گے کہ میں زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق ہو گیا۔ اپنے بابے ممتاز مُفتی سے کہنے لگا۔ شکر کریں آپ رُخصت ہو چکے ہیں..... ورنہ آج رُخصتی ہو گئی ہوتی۔ اِدھر میرے ساتھ زمین پر بیٹھے ہوتے تو میری طرح ہوا میں ناچتے۔

وہ مسکرا کر بولے۔'' کملے! یہ کتاب لکھے جانے کا مقصد سمجھ۔ یہ لکھی گئی ہی پر بانٹنے کے لئے ہیں اور پر تو صرف بے وزن لطیف رُوحوں کے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ رُوحیں اپنے اپنے جسم کے اندر ہوں یا باہر۔ رُوح کہانی ہر زندہ رُوح کے پڑھنے کی چیز ہے۔'' دیکھ! اس کی داستان طرازی' کہانی کے اندر رکھی کہانیاں۔ سفر پہ نکلے مسافر کی مسافتوں کے سارے سفر..... وہ سفر بھی جو ابھی طے نہ ہوئے ہوں۔ وہ مسافتیں بھی جن پہ ابھی نکلنا ہو۔ زندگی کی کھٹی میٹھی ست رنگی اَن کہیاں' اَنوکھے قصے' بیتیوں کی بِپتا' کچھ آپ بیتیاں کچھ جگ کی پُراسرار دُنیا'

بوتل نکلا جن ......

تصوّف کے بھید، طلسمات، مکاشفات اور کرامات کی نان سٹاپ چاند ماری۔ طلسمِ ہوش رُبا کا درویش ایڈیشن......!

یہ بابا محمد یحییٰ خان بڑا گھپرا ہے۔

سمندر کے کنارے کھڑا ہو کے یہ مچھلیاں نہیں پکڑتا۔ یہ بیچ سمندر لنگر ڈال کے جال پھینکتا ہے۔ پکڑتا بھی وہ مچھلی ہے جس کے پیٹ میں لعل و گوہر ہوں۔ انہی آبدار موتیوں کے یہ ہار بناتا ہے۔ مگر اسے کہہ...... نولکھے موتیوں کی مالائیں یہ دو دو دمڑی میں پھیری لگا کے نہ بیچے۔ ہیرے، نیلم، لعل اور زُمرد میں جڑی ہوئی انگوٹھیاں بندہ بندہ پرکھ کے دی جاتی ہیں۔ ان نگینوں کے چمکتے رنگ رُوپ تو سب کو ہی بھاتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کے اثرات سب پہ ایک جیسے ہوں۔ پھر یہ دیکھ یہ محمد یحییٰ خان کسی کو نہیں بخشتا۔ دیکھ کدھر سے مجھے کھینچ کے اپنی کتاب پڑھانے پہنچ گیا ہے۔ یہ بندہ نہیں جن ہے۔

میں نے قلم ان کے ہاتھ میں دیا اور ہاتھ جوڑ کے کہا۔ سرکار! اس جن لکھاری پہ کچھ لکھنا بندے کے بس کی بات نہیں، آپ ہی کرپا کریں۔"

بولے لکھ...... اصل فساد کی جڑ وہ ہے جس نے اس جن کو بوتل سے نکالا ہے۔ یہ شرارت اس کے پڑوسی چاچا گُکڑ کی دوسری بیوی روشن رُوح والی چاچی کی ہے، اُوپر سے سیالکوٹ کے پیر مُراد یا سمیت پرانے قلعے کے سب زور آور باباؤں نے اپنی بے پناہ توجہ اور محبت کے تنبو ڈال کے اس کے اندر قلعہ بندی کی ہوئی ہے۔

اصل میں اس جن کو نکلنا ہی تھا۔ اس لئے کہ ایسے جنات کے نکلنے کا اب سمے آ گیا ہے۔ انوکھی بیتیاں بیتوا کے انہیں بیتوانے کا وقت آ گیا ہے۔ بہت سی اَنہونیاں ہونیاں ہونے والی ہیں۔ ہزار ہا ایسے بھید جسے لوگ مغربی سائنس کی ٹیکنگی پر چڑھا کے اپنے اُدھورے علم کے ہنٹر مار مار کر دبائے رکھتے ہیں، اب وہ راز آفشاں ہونے والے ہیں۔ بڑے بڑے بھید، رازوں

کے راز کُھلنے والے ہیں۔

غور سے دیکھ' آسمان کی مقدس روشنی اور کائنات کے نُور کا بادلوں کے ریلے میں گھِرا "دروازہ کھلتا ہے"

انسانیت کے خستہ حال بنیرے پہ آب کاگ کی کائیں کائیں ٹُٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔ جانتے ہو' دیوار پہ بیٹھ کے کوا بولنے لگے تو کون آتا ہے؟ ہاں' مہمان! کسی مہمان مہمان کے آنے کا اعلان ہونے والا ہے۔

تُو چھوڑ تبصرے۔ آنے والے مہمان کے سواگت کی تیاری کر۔ یہ بابا محمد یحیٰی خان جس مقصد کے لئے بوتل سے نکالا گیا ہے' اُسے سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ جو لکھ رہا ہے' اُسے پڑھتا جا۔ بس اِس سے ایک بنتی کر...... یہ اپنی تحریر کے موج در موج سمندر میں کبھی کبھار کوئی ناؤ' کوئی ساحل بھی لے آیا کرے۔ ریگزاروں کے لامتناہی سفر میں کوئی پڑاؤ تو رکھے۔ کہیں تو اُنگلی چھوڑے..... کہیں تو قاری کو رُک کے سانس لینے دے۔ کہیں اسے' کائنات سفر کی اپنی آپ بیتی کو جلد بازی میں یوں بے کنارہ نہ کرے۔ اپنی تحریر میں ذیلی عنوان دے۔ زیادہ نہ سہی' تھوڑے بہت اَبواب میں تو کتاب کو تقسیم کرے۔ اسے بول' تقسیم کرنے کی دیگ پر بیٹھ کر اسے خود کو بھی بانٹنا ہے۔

بول! جن جی۔ تمہاری کتابوں کو جنّوں کے علاوہ انسانوں نے بھی پڑھنا ہے۔ انسان کی آسانی کا خیال رکھنا ہر ذی رُوح پر لازم ہے۔ انسان کی سب سے بڑی آسانی' آسائش اور آرائش اس کی لنگوٹی ہوتی ہے۔ اسے کہہ..... سرِ عام لنگوٹیاں نہ اُتارے۔ نہ اپنی' نہ دوسروں کی۔ اسے سمجھا کہ علی بابا چالیس چوروں میں بھی زور ہوتا ہے۔ بندھی گٹھڑیاں بیچ چوراہے میں بیٹھ کر نہیں کھولتے۔ "کھل جا سم سم" سے بڑا اسم "بند ہو جا سم سم" ہے۔ یہ اسم جو بھول جائے وہ پکڑا جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی، ..... ز دوان دیہارے

ایک یحییٰ خان تھا جس نے مُلک وقوم کی دُنیا ڈبو دی تھی اور ایک بابا محمد یحییٰ خان وہ ہے جو مُلک وقوم کا نام روشن کرنے میں لگا ہُوا ہے۔ علم و دانش سے وابستہ لوگ اپنے انداز میں مُلک وقوم کا نام روشن کرتے ہیں۔

بہت پہلے مَیں نے کالی چادر میں ملبوس بابا محمد یحییٰ خان کو جب اشفاق احمد کے قدموں میں بیٹھے دیکھا اور بعد میں اشفاق صاحب سے سُنا کہ اس روز تم نے فقیری لباس میں جس شخص کو دیکھا تھا' وہ بہت اعلیٰ درجے کا رائیٹر ہے مَیں نے ان کی اس تحسین کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مَیں سمجھا شاید حسبِ عادت حوصلہ افزائی کے جملے ادا کر رہے ہیں لیکن بعد میں جب مجھے بابا محمد یحییٰ خان کو پڑھنے کا اتفاق ہُوا' میرا اشارہ ان کی کتابوں کی طرف ہے تو مجھے جس چیز نے بے پناہ متاثر کیا وہ ان کی کردار نگاری تھی جو ان کی کتابوں میں متعدد جگہ نظر آتی ہے۔ یہ بلا کی کردار نگاری ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ منظر' ماحول اور کلچر کے مظاہر کا بیان بھی بابا محمد یحییٰ خان پر ختم ہے۔

مَیں نے چھپے ہوئے کچھ رستم دیکھے ضرور ہیں لیکن یہ رستم زمانے کی نگاہوں سے کچھ زیادہ ہی چھپا ہوا ہے' شاید اس لئے کہ وہ ظاہر ہونا ہی نہیں چاہتا۔ مَیں جانتا ہوں میرے یہ لفظ بابا محمد یحییٰ خان کے لیے بہت کم ہیں مگر مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے میرے لفظوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ خوبصورتی کو سراہنا' سراہنے والے کی ضرورت ہے' خوبصورتی کی نہیں۔

ڈاکٹر یونس جاوید

وَہبی لکھاری......

بابا محمد یحییٰ خان ایک تخلیقی قوت کا نام ہے۔ ایسی تخلیقی قوت لکھاری میں علومِ انسانی کی گہرائی اور مشاہدے کی سچائی کا باعث ہوتی ہے۔ اگر ریاضت کا نکھار جھلک دِکھا دے تو فنی معراج تخلیق کار کا مقدر ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا وصف ہے جو قدرت اپنے منظورِ نظر اور منتخب لوگوں کے لیے وقف رکھتی ہے۔

محمد یحییٰ خان جنہیں میں بابا کہتا ہوں زندگی کو جس طریق سے برتا' دیکھا اور سمجھا ہے یہ اس کی حیران آنکھ کا کرشمہ تو ہے۔ اِس کی فکشن اپنی' اس کی ڈکشن منفرد' اس کی ہُنرمندی اور جزیات کی بُنت کا انوکھا پن بھی بچ جائیں تو فن کا پھل بالآخر مہکتا ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان یُوں بھی پیدائشی لکھاری ہے۔ اس پر قدرت کے اَسرار نزول کرتے ہیں۔ جنہیں ترتیب دیتے ہوئے وہ زیادہ توانا اور جری اُدیب کے رُوپ میں ڈھل جاتا ہے۔ اسے اپنے بڑے پَن کا کم کم یقین اس لئے ہے کہ عجز ہر بڑے شخص کا وتیرہ ہے۔

میں اس وَہبی لکھاری کی تحریریں پڑھ کر اکثر تحیّر میں ڈوب جاتا ہوں اور یہی تحیّر خود مجھے زندگی کو سمجھنے کے لئے نئی راہیں سُجھاتا ہے۔

اُوریا مقبول جان؛

اک درویشِ بے گلیم کی عطا......

سحر کا کمال یہ ہے کہ اِس کا پتہ اُس وقت چلتا ہے جب وہ سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ بابا محمد یحییٰ خان کو مَیں نے ایک بار اشفاق احمد کے ہاں دیکھا۔ سارے عالم سے بے نیاز، اپنے ہی کسی عالم میں گم تھے۔ پھر مُدّتوں مَیں اِسی عالم حیرت میں رہا کہ جادو ان کی تحریر میں زیادہ ہے یا شخصیت اور سراپے میں ہے۔

میرے جیسے رَہ نَورد لاکھ ٹھوکریں کھانے کے بعد قلم کی جس اُٹھان پہ پہنچے اور تحریر کے جس اُسلوب کو اپنا کمال سمجھنے لگے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھنے کے بعد تو یُوں لگتا ہے کہ ابھی تو تحریر کے بڑے خوابناک محل کے باہر ہی ٹوہکٹو یاں مارتے رہے ہیں۔ تحریر کے آسمان کو چھوتے دروازے میں تو ابھی داخل ہی نہیں ہوئے جہاں بابا محمد یحییٰ خان رہتے' سوتے' جاگتے ہیں...... ہنستے اور بولتے ہیں۔

ڈاکٹر اجمل نیازی

بابا محمد یحییٰ خان نے کالے رنگ میں سارے رنگوں کے جمال وجلال کی موجودگی اور آسودگی کو محسوس کیا...... وہ اَندر کے آدمی ہیں۔ اُن کے وَجود میں رعنائیاں' سچائیاں اور گہرائیاں وَجد کرتی ہیں...... رُوحانیت ان کی ذات میں ٹھکانا بناتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تحریر میں رُوحانیت اور رُومانیت کو یکجائی دے کر یکتائی حاصل کی ہے۔

انہیں کالے رنگ کے پرندے پسند ہیں جو اَن دیکھی فضاؤں میں اُڑتے رہتے ہیں۔ وہ پرندے زیادہ خوبصورت اور شفاف ہوتے ہیں۔ کوّا اور کبوتر (ک) سے شروع ہوتے ہیں' کالا بھی (ک) سے ہے۔ کبوتر صوفی پرندہ ہے' مزاروں پہ اپنا آشیانہ بناتا ہے۔ کبوتر کالے رنگ کا ہو تو سرمستی اُس کی آنکھوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان نے اپنی کتابوں میں روشنیوں کو بھی کالے رنگ میں دیکھا ہے۔ اس لیے روشن لفظ لکھتے ہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ تحریر اور تقدیر ہم قافیہ ہی نہیں ہم معنی بھی ہیں۔

طلسماتی بوڑھا......

فرحت عباس شاہ

بابا جی محمد یحییٰ خان شاید الف لیلوی دور کی شخصیت ہیں اور یقیناً ان وقتوں میں یہ کوئی مہربان نیک دل اور عبادت گزار جن ہوں گے کہ جو آج بھی ان کی زندگی طلسماتی واقعات اور پُر اسرار حالات سے بھری ہوئی ہے اور ان کا دل درباروں مزاروں کی طرف کھنچتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "پیا رنگ کالا" ان کی ذات کی پُر اسرار کائنات کا طلسم کدہ ہے۔ جس میں وہ ایک قدم دُنیا کے کسی موجود خطّے میں اُٹھاتے ہیں تو دس قدم اپنے باطن کے اندر ہزار داستانی جزیرے میں سفر کرتے ہیں۔

یہ کتاب ان کی ظاہری اور باطنی زندگی کی ساحرانہ کیفیات کے امتزاج کا حُسن ہے۔ وہ پُرانے زمانے کے نئے انسان ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئے زمانے کے ایک پُرانے آدمی ہوں۔ میرے خیال کے مطابق ان کے اندر ہر وقت ایک معصوم لیکن شرارتی بچے اور صدیوں پُرانے بڈھے کھوسٹ کے درمیان تصادم برپا رہتا ہے۔ وہ معصوم بچے کے انداز میں سوچتے...... اور ایک بوڑھے کے انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ اب میں کیا کروں کہ مجھے کبھی کبھی ان کے اندر ایک نازک مزاج اور بنکی اَلھڑسی ناری بھی دکھائی دیتی ہے۔ میں کئی بار جھلا کے سوچتا ہوں کہ یہ پُر اسرار بوڑھا ہر بار اپنے بارے میں قائم کیے گئے میرے پچھلے نظریئے کو بُری طرح خاک میں کیوں ملا دیتا ہے اور مجھے اس کے بارے میں ہر دفعہ ایک نئی رائے قائم کرنا کیوں پڑتی ہے۔ لیکن میں بھی ایسا ہار ماننے والا نہیں ہوں کیوں کہ میں نے ان گرگٹ بابا جی کا ایک رنگ تو بہر حال پکڑ لیا ہے اور وہ "پیا رنگ"۔

میرے اور آپ کے باباجی......!

خالد بن حامد

’’بھئی! آپ نے بہت تنگ کیا ہوا ہے..... آپ بہت خراب ہیں۔‘‘

مُدت ہوگئی کہ ’’السلام علیکم‘‘ کے بعد میرے، آپ کے باباجی محمد یحییٰ خان کا یہی جملہ میرے نام ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو مجھے بہت اُلجھن ہوئی اور اپنی اس ’’پہچان‘‘ اور اُن کی جانب سے ’’خراب‘‘ ہونے کی سند پانے پر میں نے احتجاج بھی کیا لیکن پھر رفتہ رفتہ جیسے یقین آتا گیا کہ واقعی میں نے انہیں بہت تنگ کیا ہے اور میں بہت خراب ہوں۔ بہر حال! ایک بات میرے باباجی کو تسلیم کرنا پڑے گی آپ سب بھی تائید کیجیے گا کہ اگر میں نے انہیں ’’بہت تنگ‘‘ نہ کیا ہوتا اور میں واقعی ’’خراب‘‘ نہ ہوتا تو یہ ’’پیا رنگ کالا‘‘ وہ اپنے من میں چھپائے بیٹھے رہتے اور سامنے نہ آتے۔

نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ باباجی محمد یحییٰ خان وہ نہیں ہیں جو دِکھائی دیتے ہیں اور کہیں اُن کے اندر ایک ایسا انسان چھپا بیٹھا ہے جس نے اپنے آپ کو سدا آزمائشوں میں رکھا ہے، تجسس اور کھوج جس کی عادت ہے اور جو راستہ اپنی آنکھوں کی نہیں، دل کی بینائی سے ڈھونڈتا ہے۔ بظاہر دُنیا کے تمام وسائل اُن کی دسترس میں دِکھائی دیتے ہیں، کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود ایک بے چینی اور بے قراری اُن کے وُجود میں ہر لمحہ دِکھائی دیتی ہے۔

آج ہر پڑھا لکھا بلکہ جاہل آدمی بھی یہ بات یقین سے کہتا ہے کہ آج کی دُنیا بہت تیز رفتار ہے، فاصلے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں اور دُوریاں اب کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ دُنیا کے دوسرے کونے کی خبر لا سکتے ہیں، خیر خیریت دریافت کر سکتے ہیں لیکن سوچئے تو اس ادراک نے ہمیں ہماری اصل سے بھٹکا دیا ہے، ہم نے اب سوچنا کم کر دیا ہے اور ضروریات کا استعمال بڑھا دیا ہے۔ آج کے دَور کا یہی المیہ ہمیں انسان سے ایک ایسے رَوبوٹ میں تبدیل کرتا جا رہا ہے جس کا اپنا ایک ہی فنکشن ہوتا ہے حالانکہ انسان بہر حال رَوبوٹ نہیں۔ جتنی وُسعت اس کائنات کی ہے، اس سے زیادہ وُسعتیں رَبّ کریم نے اس انسان میں رکھ دی ہیں۔ آسان راستوں کی طلب نے ہم سے لگن چھین لی ہے جو بندے کو رَبّ سے ملانے کے کام آتی ہے۔

آپ سے اِتنا ہی کہنا ہے کہ اس کتاب میں بکھرے حرف حرف کو صرف پڑھئے گا نہیں بلکہ اپنے دل پر نقش کرتے جائیے گا تو سب کچھ آپ پر عیاں ہوتا جائے گا۔

طارق اسمٰعیل ساگرؔ

وفا ساگر سے چند بوندیں......

اس عالم آب و خاک میں یُوں تو ہمیشہ سے انسانی میلہ سجا رہا ہے لیکن معدودے چند لوگ ہیں جو غیر مشروط محبتیں تقسیم کرنے آتے ہیں جنہیں قُدرت نے صِرف "دان پُن" کے لیے دُنیا میں بھیجا۔

بابا جی محمد یحییٰ خان اس کی مثال ہیں۔ بابا جی ایک انجمن کا نام ہے۔ ایک طلسم ہوشربا ہے' الف لیلیٰ کی ہزار داستان ہیں۔ کلام کرتے ہیں تو جلتے اور دُکھتے کلیجوں پر برف پڑنے لگتی ہے۔ دِلوں کو مسخر کرتے چلے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بابا جی فاتح عالَم ہیں کہ خون روتی آنکھوں اور زخمی دِلوں پر محبت کا مرہم رکھتے ہیں۔ ایسا سحر پھونکتے ہیں کہ جو اُن کا ہُوا کسی اور کا نہ ہو سکا۔ جہاں بابا جی ہیں وہاں زندگی کی رعنائیاں اپنے مکمل حُسن کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

لوگو! جان لو کہ میرے بابا جی معاشرے کا تبرّک ہیں' برکت ہیں' دُعا ہیں اور سب سے بڑھ کر کہ یہ ہمارے ہیں' ہمارے اپنے بابا جی......!

ڈاکٹر کنول فیروز

بشکل مُومناں کرتوت......؟

بابا محمد یحییٰ خان سے میری پہلی ملاقات پچھلی صدی میں یارِ دیرینہ بقول بانو قدسیہ بھگوان سٹریٹ پُرانی انارکلی کے ''کرشن کنہیا'' اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کے دفتر میں ہوئی۔ ساغر صدیقی ایسے سیاہ لباس میں ملبوس باریش شخص، گویا بشکل مومناں میرے سامنے تھا۔ نہ جانے انہیں میری اور اظہر جاوید کی کون سی ''ادا'' پسند آ گئی کہ انہوں نے ہم دونوں کو اپنا اُستاد کہنا ہی نہیں بلکہ اس بات کو عوامی سطح پر مشہور بھی کر دیا۔ مجھے تو اس میں اُن کی اپنی کوئی ''اُستادی'' نظر آتی ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان خواتین سے ملاقات کرتے وقت شرعاً نظر جھکا کر بات کرتے ہیں اور اگر کوئی اور دیکھ نہ رہا ہو تو گاہے بگاہے نظر اُٹھا کر دیکھ بھی لیتے ہیں۔ وہ خواتین سے ملاقات کے دوران انہیں دوپٹہ سے سر ڈھانپنے کی ''بزرگانہ'' انداز سے تلقین کرتے ہیں اور اکثر خواتین اُن کی اس بات یا مطالبہ کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔

بابا محمد یحییٰ خان ناول نگار بھی ہیں، انہیں شعر کہنے کا بھی چسکا ہے جس کا انکشاف وہ باوجود کرنے سے مجتنب ہیں، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ سے اُن کی آشفتہ سری کی حد تک دلچسپی نے انہیں اک جہاں گرد بنا دیا ہے۔ کثرتِ مطالعہ اور پیہم سیاحت نے اُن کے فکر و خیال کو جہاں وُسعت و کُشادگی عطا کی ہے وہاں انہیں روشن خیالی اور انسان دوستی کے جذبات سے بھی سرشار کیا ہے۔ لہٰذا بظاہر ''مولوی'' نظر آنے والا بابا محمد یحییٰ خان اپنے خیالوں اور سوچوں اور خلیے سے صُوفی منش دُرویش نظر آتا ہے جسے بلا امتیاز مذہب و مسلک ہر ایک سے پیار ہے اور یہی جھلک اُس کے افکار اور نثر پاروں میں نظر آتی ہے۔ مجھے اپنے قلم قبیلے کے اس معتبر ساتھی سے دلی محبت ہے میں اُس کی تازہ تصنیفات ''پیا رنگ کالا'' اور ''کاجل کوٹھا'' کی اشاعت پہ اُسے مبارکباد دیتا ہوں اور اُس کے زورِ قلم کی رعنائی اور صحت و تندرستی کے ساتھ درازیٔ عمر کے لئے دُعا گو ہوں۔

سید مجاہد حسین کاظمی:

چشمۂ آبِ حیواں دَرونِ تاریکیست ......

"پیا رنگ کالا" بظاہر ایک ادبی کتاب ہے۔ جس میں کسی دینی کُتب یا قرآن و حدیث کے حوالہ جات نہیں' نہ ہی کوئی فقہی بحث ہے۔ ادبی تحریریں ہر دور میں دستیاب ہوتی ہیں ادب اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا رہتا ہے۔ لکھنے والے اپنی تحریر و تصانیف میں لُطف اندوزی کے ساتھ ساتھ نصائح و تدریب کو بھی مقصود رکھتے ہیں۔

ادب کے ارتقاء نے ادب میں نئی نئی ادبی اصناف کو جنم دیا ہے۔ نسلِ نو کی دلچسپی کے پیشِ نظر بابا جی نے "پیا رنگ کالا" میں پیا رنگ تو دِکھایا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ادب کی ہر صنف کا رنگ بھی بھرا ہے۔ الفاظ و تحریر کو جملوں کا لباس پہنا کر "بابا جی" نے "پیا رنگ کالا" میں تابندہ گوہر سجائے ہیں۔

حیف در چشم زدن محفلِ یار آخر شد   روئے گُل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

"پیا رنگ کالا" دُنیائے ادب میں ایسا شاہکار ہے جس پر صاحبانِ علم و دانش کی نگاہیں مرکوز رہیں گی اور جدید اُردو ادب میں ایک نادر کتاب کی حیثیت سے تاریخی حقیقت کا ثبوت رہے گی۔ اس میں کمال یہ ہے' نہ تو متن و معنی متاثر ہوئے اور نہ ہی مادۂ اشتقاق میں فرق آیا۔ یقیناً یہ ایک جدید اور انوکھا انداز ہے جس سے قاری متاثر ہی نہیں بے حد محظوظ بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف تہذیبوں' ثقافتوں' مناظر' عُلوم اور طبقاتِ عالم کا تذکرہ ہُوا ہے۔ جہاں واقعات کو رُوحانی تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور محیرالعقول داستان سُنا دی گئی ہے۔ وہاں ہی منطقی اور سائنسی تطبیق بھی کی گئی ہے اور مؤثر سائنسی حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ اصحابِ علم و دانش اپنی اپنی منزل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ عُقلاء' عُلماء' فُقراء' عُرفاء کے لئے بابا جی نے زادِ راہ چھوڑا ہے۔ بالواسطہ علم کے ہر شعبہ میں باب کھولے ہیں۔ "پیا رنگ کالا" میں پیا کی جستجو' پہچان' اکتسابِ فیض کے لئے اخلاص اور تسلیم و رضا کی روشنی فراہم کی گئی ہے۔ پیا رنگ سے مُراد وہ خاص رنگ ہے جس کی نشاندہی صدیوں سے فُقراء و عُرفاء کرتے آئے ہیں۔ وہ رنگ جس کو قرآنی اصطلاح میں حزب اللہ کہتے ہیں' وہ رنگ فقر کا' معرفت کا' تقویٰ' تسلیم و رضا کا ہے۔

علامہ شیخ سعدیؒ نے آبِ حیات کے لئے تاریکی یعنی سیاہ رنگ کی نشاندہی کی ہے کہ آبِ حیات سیاہ رنگ میں مستور ہوتا ہے۔ اُس کی تلاش کے لئے اس راز کو سمجھنا ہوگا کہ خزانہ سیاہی اور تاریکی میں چھپا ہوتا ہے۔ اُس کی تلاش کے لئے ایسے پیا کی ضرورت ہوتی ہے جو کالے رنگ کے راز سے واقف ہو۔ اس کے پاس وہ نُورِ معرفت اور وہ روشنی ہو جو تاریکی میں آبِ حیات تلاش کر سکے۔

عکسی مفتی؛

LIVING SUFI ....

اسلام کا کمال یہ ہے کہ یہ وقت کے ساتھ سفر کرنے والا مذہب ہے۔ نماز اس کا ایک اہم رُکن ہے جو کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور سپرسونک جیٹ میں سفر کرتے ہوئے بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک پروگریسیو اور لبرل مذہب ہے۔

بابا محمد یحییٰ خان ایک (Living Sufi) ہیں جو صُوفی اِزم اور اِسلام کی جدید تصویر پیش کرتے ہیں۔ جن کے بہت سے عقیدتمند دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن کی کتابیں صُوفی اِزم اور اِسلام کا جدید تصوّر پیش کرتی ہیں۔

ممتاز مفتی کے سلوک ورثے ......

سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

● کتاب سے تعلق کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اِس دوران سینکڑوں نہیں، ہزاروں کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ کیں، جو کتابیں زیرِ مطالعہ رہیں۔ اُن میں معدودے چند ایسی ہیں؛ جن کی "پکڑ" بڑی مضبوط تھی۔ ایسی کتابوں میں محمد یحییٰ خان صاحب کی کتابیں "پیا رنگ کالا" اور "کاجل کوٹھا" بھی ہیں۔ جُوں جُوں پڑھتا گیا، اِن کتابوں کی موضوعاتی گرفت بڑھتی چلی گئی اور جب اِن کو ختم کیا، تو خود کو ایک اَنوکھے عالمِ تحیر میں پایا۔

نیاز احمد

عاشق چور فقیر خُدا توں منگدے گُھپ ہنیرا
اک لٹاوے اک لٹے اک کہدے سب کج تیرا

میں نہیں، تُو ہی تُو......

ڈگ ڈگا ڈگ...... ڈگا ڈگا ڈگ...... ڈھول پیٹنے کے وقفے میں ایک گونج دار آواز اُبھری۔

"اُٹھو جاگو مسلمانو! سحری کا وقت ہو گیا ہے......" پیچھے والی اُن بچوں کی گلیوں میں بھی ٹین کنستر کھڑکانے والا منہ پھاڑ پھاڑ کر گہری نیند میں پڑے ہوئے لوگوں کو بیدار کر رہا تھا، اگلے دس پندرہ منٹوں میں اس محلّے، علاقے کے قریب قریب ہر گھر میں چراغ اور چولہے روشن ہو چکے تھے لوگ حسبِ توفیق و استطاعت سحری کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ گھر بیبیاں بالیاں خصوصاً سحری کے وقت کھانے کی تیاری میں بڑی عجلت اور مہارت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ گرم گرم پراٹھے، رات کا بچا ہوا سالن، دہی اور چائے، اکثر یہی کچھ ہوتا ہے۔ روزہ رکھنے والے جلدی جلدی کھانے پینے سے فارغ ہو کر نماز و تلاوت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں لیکن جن گھروں میں افراد کی کمی ہوتی ہے یا جہاں صرف میاں بیوی ہی رہتے ہیں وہاں افطاری اور سحری بڑی پھیکی، بے رونق اور اُدھوری اُدھوری سی رہتی ہے۔ گھروں میں رونق اور ہماہمی تو ہنستے مسکراتے، کھاتے پیتے، زندگی کی توانائیوں اور برکتوں سے معمور، بھرپور انسانوں اور شاداب پھولوں سے تر و تازہ کھل کھلاتے ہوئے بچوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی باتیں، حرکتیں اور شرارتیں بڑی دلپذیر ہوتی ہیں اور جہاں سرے سے کوئی چھوٹا بڑا بچہ ہی نہ ہو وہاں کیا سحری اور کیا افطاری اور کیسی عید کی تیاری؟...... وہاں کے تو در و دیوار پہ بھوتوں کے سائے سے لہراتے دکھائی دیتے ہیں، اندر باہر اک بانجھ سی اُداسی سی چھائی رہتی ہے۔ احساسِ محرومی کے داغ دھبے دُکھتی آنکھوں کے چھتے بن کر رہ جاتے ہیں۔

بند تپلی گلی کے سامنے ماتھے والے مکان کی یہی حالت تھی' یہاں کوئی بھی پھول سا بچہ نہ تھا۔ اس گھر میں اپنی عمر کی نمازِ عشاء کی تیاریوں میں مصروف ایک صابر و شاکر سا شخص اور زندگی کی شکر دوپہر میں سوا نیزے پہ اُترے ہوئے سورج تلے کھڑی ایک سوبھاگیہ سی عورت رہتے تھے' اولاد کی نعمت سے محروم...... لیکن یہ میاں بیوی ابھی تک خدا کی ذات سے نا اُمید نہیں ہوئے تھے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ وہ قادرِ مطلق ضرور ایک دن ان کی آرزوؤں کے گلشن میں اولادِ نرینہ کا پھول کھلائے گا...... ڈھول پیٹنے والا اب ان کی بند گلی میں کھڑا زور زور سے ڈھول پیٹ رہا تھا۔ خاتونِ خانہ تو بہت پہلے ہی سے جاگی ہوئی تھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی اور روشن دان سے لالٹین کی ملگجی سی روشنی اور توے پہ دیسی گھی سے تر تراتے ہوئے پراٹھے سے اُٹھتا ہوا دھواں اور خوشبو باہر نکل رہی تھی اور قریب ہی اس کا بوڑھا شوہر ابھی تک چارپائی پہ ہی نیم نوم سا پڑا ہوا تھا' ویسے بھی سحری میں اکثر مردوں سے پہلے عورتیں ہی جاگتی ہیں۔ خاتونِ خانہ نے سوندھی سوندھی خوشبو اور سنہری رنگت والا پراٹھا توے سے اُتارا اور ساتھ ہی ایک چھوٹی سی پراٹھی توے پہ پھیلا دی' پراٹھی اس کے اپنے لئے اور پراٹھا خاوند کے لئے تھا۔ ایسے میں باہر گلی کی سیا لکوٹی چھوٹی اینٹوں والے فرش پہ ٹپ ٹپ کی آواز یوں ابھری جیسے کوئی نعل بند گھوڑا آہستہ آہستہ ادھر چلا آ رہا ہو۔ سُنی ان سُنی کرتے ہوئے وہ پراٹھی پہ گھی لگانے لگی' انگیٹھی میں دست پناہ سے انگیخت کرتے ہوئے دو چار کوئلے بھی جھونک دیئے کیونکہ توا اُترتے ہی سبز چائے کی دیگچی دھرنی تھی۔ بڑے گگے بندھے انداز میں وہ ساتھ ساتھ باورچی خانے کے دیگر کام بھی کر رہی تھی' ابھی وہ کانسی کے برتن سے دہی نکال ہی رہی تھی کہ باہر دروازے سے ایک صدا آئی۔

''ہے کوئی مُراد والا جو پیر مُراد دیئے کے فقیر کی مُراد پوری کرے' سحری کروائے......''

خاتون نے یہ الفاظ سُنے تو اپنے ارد گرد نظر دوڑائی کہ اس وقت فقیر کو کیا دیا جا سکتا ہے؟...... چنگیر میں پڑے ہوئے پراٹھے پہ نظر آ ٹکی' وہی پراٹھا اُٹھایا' سر کا پلّو دُرست کرتے ہوئے دروازہ کھولا...... کالے شا گھوڑے پہ ایک نیم ننگا فقیر' کندھوں پہ جھولتی ہوئی اُلجھی جٹیں' گھوڑے کی دونوں اطراف لٹکے ہوئے پوٹلے۔ وہ سواری پہ ایک ہی جانب دونوں ٹانگیں لٹکائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے ابھی ابھی کود کر کہیں بھاگ لے گا۔ گلی کی مدھم سی روشنی میں یہ سب کچھ کسی خواب کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اور عام سی گھریلو خاتون ہوتی تو چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی' یہ اللہ والی بڑے تحمل اور عاجزی سے بولی۔

''لو بابا! یہ گرم گرم پراٹھا...... بسم اللہ' سحری کھا لو......'' وہ فقیر کو پراٹھا تھما کر مڑتے ہوئے بولی...... ''اگر ضرورت ہو تو ایک اور لا دوں......؟''

"پتر! ایک ہی بہت ہے......!" فقیر نے کمال استغناء سے جواب دیا۔

بن سوچے سمجھے خاتون کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں بابا! ہمارے لئے ایک ہی پتر بہت ہے......!"

فقیر نے ایک لمحہ خاتون کی جانب دیکھا پھر اسی پراٹھے سے دو لقمے توڑ کر خاتون کو دیتے ہوئے کہا۔

"ایک لقمہ اپنے میاں کو کھلا دو اور ایک خود کھا لو' یہی رزق تم دونوں میاں بیوی کے لئے آج کی سحری ہے۔ آج اُنیسواں روزہ ہے' اگلے برس اکیسویں روزے تک پیر مُراد شاہ کی خانقاہ پہ ہر جمعرات میٹھے پراٹھے لے جا کر بچوں میں تقسیم کر دیا کرنا!" خاتون ہاتھ میں پراٹھے کے لقمے لئے حیران و ششدر کھڑی تھی اور فقیر جا چکا تھا۔

نیم خوابیدہ خاوند کے نتھنوں میں جب توے پہ پڑی ہوئی پراٹھی کے جلنے کی بساند اور کڑوا کسیلا دھواں گھسا تو وہ پوری طرح بیدار ہو گیا بلکہ اُٹھ بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا' بیوی تو کہیں نظر نہ آئی البتہ سامنے باورچی خانے میں توے پہ پڑی ہوئی پراٹھی جل کر کوئلہ ہوتے ہوئے ضرور دکھائی دی۔ خاوند نما مردوں کا غصہ تو ویسے ناک پر دھرا رہتا ہے خاص طور پہ اگر سحری سیالکوٹی اور لاہوریئے!...... ان کے غصے کی حالت میں منہ کی مارٹر گن سے نکلتے ہوئے فائروں کی تاب و سکت نہ لاتے ہوئے اکثر تھڑ دلی بیویاں میکے جا بیٹھتی ہیں' یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے میکے پہنچ کر اُن کے منہ سے کچھ زیادہ ہی سنتی ہیں......

بہر حال' چارپائی سے اُتر کر خاوند باورچی خانے میں گھسا تو اچھے سے اتارا ہی تھا کہ وہ نیک بخت ہاتھ پہ چھپا سا پراٹھا دھرے اندر باورچی خانے میں آ گئی۔ خاوند کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر چارپائی پر لا بٹھایا' اپنی کوتاہی کی معذرت چاہتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سُنایا اور پھر وہی دو لقمے سامنے دھرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کے بندے! آج یہی ایک آدھ لقمہ ہم دونوں کی سحری ہے۔ میرا اندر بول رہا ہے کہ یہ نعمت اللہ کی طرف سے ہمارے لئے خوشخبری ہے......"

خاوند نے بسم اللہ پڑھ کر پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھا اور بیوی سے کہا۔

"نیک بخت! تو نے سچ کہا...... ابھی ابھی میں نے خواب دیکھا' میں اور شیخ صاحب" دونوں اپنے استادِ محترم مولوی میر حسن کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک شیخ صاحب نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ حضور! ان کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں ہے' یہ دُعا کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب نے چند لمحے غور سے میری جانب دیکھتے ہوئے فرمایا' آج تم مولوی ابراہیم کی مسجد میں تراویح پڑھو اور پھر کل سے

پیر مُرادیہ شہید کے پاس مسجد میں اعتکاف بیٹھ جاؤ...... دیکھو کیا ظہور پذیر ہوتا ہے......؟"

اگلے برس اکیسویں رمضان' تہجد کے وقت سجدے میں پڑے ہوئے اسی بوڑھے صابر و شاکر شخص کے پیچھے اس کی انتہائی ضعیف ماں گوڈڑی میں کچھ لپیٹے ہوئے بیٹھی اس کے سلام پھیرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بوڑھے نے سلام پھیرا تو ضعیف ماں نے کپکپاتی نحیف سی آواز میں کہا۔

"پتر! ست ست مبارکاں' سوہنے رَبّ نے تیرے گھر بوٹا لایا اے......"

بوڑھے شخص نے یہ مژدۂ جانفزا سننے کے بعد بھی مڑ کر دیکھنا یا کچھ کہنا گوارہ نہ کیا' وہیں سجدے میں گر گیا۔ کافی انتظار کے بعد جب اس کا سر سجدے سے نہ اُٹھا اور "اُوں آں' اُوں آں" کی معصوم سی آواز اُبھری تو ضعیف ماں نے دوبارہ آواز دی۔

"وے 'پتر!! اپنے پتر دا منہ تے تک لے فیر نمازاں پڑھدا رہیں......"

تشکر کے آنسوؤں سے دُھلا ہوا چہرہ' بھیگی ہوئی سفید ریش' کپکپاتے ہوئے ہونٹ اور فرطِ جذبات سے لرزتے ہوئے سراپے کو لئے وہ شخص اُٹھا اور اپنی ماں کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ماں نے بڑی آہستگی سے پُرانی سی گوڈڑی' بیٹے کی جھولی میں دھر دی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس شخص نے گوڈڑی کو ٹٹولا۔ نومولود اگر رو رہا نہ ہوتا تو شاید وہ سمجھتا کہ گوڈڑی خالی ہے...... بچہ کیا تھا ایک چھوٹے سے خرگوش جیسا' ایک ہاتھ اور ایک چپّہ۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا سا گیا' اتنا چھوٹا اور خفیف و نحیف سا بچہ' اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا' وہ اسے چھوتے ہوئے ڈر سا رہا تھا...... اچانک اس کی ضعیف ماں بولی۔

"پتر! جلدی سے اس کے کان میں اذان دے...... دیکھتا نہیں رو ریا اے......"

بوڑھے نے نحیف سے پھول بچے کو یوں ہاتھ پہ رکھا جیسے وہ کسی کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو یہ دیکھو خدا کی قدرت! مرد کی اُنگلی برابر بازو' ماچس کی تیلی جیسی اُنگلیاں' بڑے بیر جتنا سر' ننھی ننھی ٹانگیں ہلاتا' کانوں تک باچھیں کھولے بُری طرح چیختا روتا ہوا نادر سا بچہ! کسی قلندر' درویش یا فقیر کی دُعا یا بڑھاپے کے اس مقام پہ شاید یہی کچھ نصیب ہوتا ہے...... اذان کے بعد بوڑھے باپ نے بچے کی پیشانی پہ ہلکا سا بوسہ دے کر ماں کو پوتا تھما دیا۔ ماں کی بُجھتی ہوئی مُندھی مُندھی آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے تھے' وہ دل ہی دل خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اُس نے آج اس کے' اس صابر و شاکر چوتھے بڑے بیٹے کے ہاں تین شادیوں کے بعد اس عمر میں اولادِ نرینہ عطا کی۔ اُس کی بوڑھی آنکھوں میں تشکر کے ساتھ کچھ تفکر بھی نمایاں تھا' شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ الٰہی! میرا یہ بیٹا اب عمر کی اس منزل پہ ہے جہاں زندگی کا سفر بس دو چار قدم ہی ہوتا ہے۔ یہ ننھا سا کیڑا کب جسم و جان پکڑے گا' کب بڑا ہوگا؟ اس کا بوڑھا باپ اس کی جوانی' خوشیاں' شادی' کمائی

دیکھے گا۔ عورتیں جوان ہوں یا بوڑھی' وہ اپنی اولاد کے بارے میں یہی کچھ سوچتی رہتی ہیں۔ وہ بوڑھی بھی اپنے بوڑھے بیٹے اور اس کے آگے اس کے نومولود بیٹے کے بارے میں شاید یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ اسے یوں گم پا کر بیٹے نے پوچھا۔

"بے بے! کیا سوچ رہی ہو......؟"

وہ اِک نظر اپنے بیٹے اور پھر اپنے پوتے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اللہ سوہنے کے رنگ دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ کب یہ تیرا بیٹا بڑا ہوگا' جوان ہوگا' تجھے اس کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں گی اور کب تو اِس کی کمائی کھائے گا؟...... اللہ نے تجھے اولاد کی خوشی بھی اس وقت دکھائی ہے جب کہ تو خود......"

بیٹے نے ماں کی بات کو ادھورا رکھنے کی خاطر اس کے پوپلے منہ پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ محلے کی مسجد سے درود و پاک کا ورد بلند ہوا۔ اس مردِ تسلیم و رضا نے دَرود شریف پڑھ کر بچے کے چہرے پر پھونکا اور پھر اِک نظر اس کے نحیف و کمزور سراپے پہ ڈالتے ہوئے اوپر آسمان کی جانب' اس زبردست قوت و اختیار اور قدرت و حکمت والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے بے جی! جس مالک و خالق نے مجھے یہ انعام بخشا ہے وہ اِس کی پرورش' صحت' زندگی اور میری عمر و بڑھاپے کے بارے میں بھی بہتر جانتا ہے اور خوب اچھے فیصلے کرنے والا ہے۔ آپ جسے کمزور سا کیڑا کہہ رہی ہیں اور جس کی سلامتی اور زندگی کے بارے میں پریشان سی دِکھائی دے رہی ہیں تو اِنشاء اللہ میں اس محمد یحییٰ خان کے کندھوں پہ سوار ہو کر اللہ کے گھر کے گرد چکر لگاؤں گا۔ دُنیا گھوموں گا' زیارتیں کروں گا۔ اِس کی ایک نہیں بلکہ کئی شادیاں کروں گا تا کہ یہ کثیر الاعیال ہو۔ اس کی اولاد میری کمر پہ سوار ہوگی' اس کے سر پہ چاندی کا بال میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا......"

پیدائش کے اگلے چار پانچ عشروں میں کئی ایسے سخت مقام بھی آئے کہ اِس بچے نے گھر والوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ پلوں' ساعتوں میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لُوٹ پَوٹ کر دیتا۔ گھڑی میں تولہ' گھڑی میں ماشہ۔ دو چار قطرے دودھ اگر حلق سے نیچے اُتر بھی گیا تو پیٹ پتلا پڑ جاتا۔ ہاتھ پاؤں نیلے' آنکھیں کھنچ جاتیں اور اگر کہیں ٹھنڈا گرم ہوا کا جھونکا اس کے پالنے کے پاس سے گزر جاتا تو اِسے چھینکیں اور انگڑائیاں توڑنے لگتیں۔ نزلہ' بخار' زکام گھیر لیتا۔ غرض کہ کوئی نہ کوئی اُلجھن گھیرے ہی رہتی۔ ماں باپ کی جان ہر وقت پھٹے پرانے کپڑے کی مانند پریشانی اور فکر مندی کی الگنی پہ لٹکی رہتی۔ جب ڈیڑھ دو ماہ کے بعد بھی اس کے پیدائشی ڈیڑھ پاؤ نرم بوٹی کے وزن میں ایک آدھ چھٹانک کا بھی اضافہ نہ ہوا تو بچے کی دادی اور ماں

نے اِسے کسی سیانے سے ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ بچّے کے باپ نے کہا کہ مَیں تو صرف ایک ہی ڈاکٹر اور حکیم کو جانتا ہوں' یوں بھی چِلّا پورا ہونے اور اِس کے قدرے سنبھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب مَیں کل صبح ہی اِسے لے کر لاہور روانہ ہوتا ہوں۔ بچّے کی دادی بولی۔

"بچّہ کمزور اور بیمار ہے۔ اتنی دور کا سفر...... پُتر! سیالکوٹ میں تمہیں کوئی حکیم ڈاکٹر دکھائی نہیں دیتا......؟"

"بے بے جی! مَیں اِسے جس حکیم ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں وہ میرا یار بھی ہے اور آپ کے اِس پوتے کا اُستاد بھی' یہ اُن کی دُعا برکت ہی سے ہمیں ملا ہے۔ آپ کو وہ میرا خواب تو یاد ہو گا جو مَیں نے آپ کو اِس کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے سُنایا تھا اور وہ پچھلے رمضان' سحری والے فقیر کا واقعہ بھی...... میرا خیال ہے' آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ آپ کے پوتے کا نام بھی اُنہی ڈاکٹر صاحب کا تجویز کردہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا' اوئے عمر خانا! اِس آخری عمر میں پُتر تو حضرت ذکریا علیہ السلام کی سُنّت پہ عمل پیرا ہونے سے ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ تو صرف اِس کا نام یحییٰ رکھنے کی نیت کر لے' باقی دُعا کے لئے ہم اپنے مولوی صاحب سے درخواست کریں گے۔ [illegible] میرا خیال ہے' آپ اب ساری بات سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ درویش بچہ اپنے بزرگوں کے قدموں کو پکڑ کر ہی چھین پکڑے گا......

عزیز قارئین! یہ عاجز فقیر وہی بیمار' لاغر' ڈیڑھ پاؤ زم بوٹی کا بچّہ ہے۔ میرے والد جنت مکانی نے میری پیدائش کے وقت میرے بارے میں جو کچھ بھی فرمایا تھا' وہ سب کچھ من و عن ظہور پذیر ہوا' جیسے کہ یہ سب کچھ اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ صد شکر کہ مَیں بھی اللہ کی توفیق سے اپنے بزرگوں کی تعلیم اور خواہش کے مطابق عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر کوشش کرتا رہا مگر بہ تقاضۂ بشریت کہ مَیں بھی کسی طور لغزشوں' کوتاہیوں اور بشری کمزوریوں سے کبھی خالی نہیں رہا بلکہ اِس عالمِ صد پیری میں بھی میرے اندر ہزاروں عیب ہیں اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کبھی بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ میرا سب سے بڑا عیب میری جہالت' بے علمی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ میری بدقسمتی (یا خوش نصیبی) کہ مَیں اوائلِ عمری میں چھوٹی کلاس سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ سکول جانے' نصابی کتابیں پڑھنے سے کہیں زیادہ آوارہ گھومنے' مزاروں' ملنگوں' درویشوں کی صُحبت میں بیٹھنے اُٹھنے کا لپکا رہتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ منتوں مُرادوں' دُعاؤں اور ماتھے رگڑ رگڑ کر حاصل کیا ہوا' پیدائشی طور پہ ہی طبیعت میں جذب و وجد کی کچھ عجیب سی کیفیات بیدار تھیں۔ کچھ اضافی حِسیّات بھی سر اُٹھاتی محسوس ہوتی تھیں' تخلیق و تخیّل کی وادیاں بڑی شاداب و گل ریز تھیں' طبع کا میلان رُوحیت اور رُوحانیت سے لگّا کھاتا تھا۔ سیکھنے سکھانے کا جنون' حافظہ اور ذہن اتنا آب دار کہ

تہہ در تہہ پرت در پرت ورق ہائے ادغام کو کھنگال کر رکھ دے نگاہ نگارش نہاں و نمود تک اتر جاتی تھی۔ اجنبی نیا میں چشم زدن میں نوکِ زبان ہو جاتیں۔ پردے بے پردہ ہو جاتے۔ گنگ اور ٹن جو ہوتے وہ کھنکنا تے ہو بجنے لگتے۔ سر پہ بادل پاؤں گرداب بازوؤں میں بجلیاں۔ آگے سامنے سمندر پیچھے ریگ زار۔ عجیب طرفہ تماشہ تھا اور آج بھی یہی عالم وارفتگی و گرفتگی ہے۔ خدا جانے ناقۂ جنوں کہاں جا ٹھہرے گا؟

یہ گوتھنا سا بچہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لئے اک کڑی آزمائش ہی تو بن گیا تھا کوئی دن بھی تو ایسا نہ گزرتا...... کہ جس دن یہ گھر بھر میں اک کہرام برپا کئے ہوئے نہ رکھتا۔ پتلا پیٹ ٹھیک ہوتا تو نزلہ بخار آ دبوچتے۔ خدا خدا کر کے ان سے جان چھوٹتی تو اینٹھن اور مروڑ شروع ہو جاتے' آنکھ دُکھنے کو ہوتی تو کبھی منہ زبان پک کر لیچی ہو جاتی پھر جب دانت دھرے تو گھر والوں کے علاوہ اڑوس پڑوس والوں کو بھی عذاب پہ دھر لیا...... چوبیس گھنٹوں کی ریں ریں...... بانگا اڈ کر باچھیں کانوں تک چیر لیں۔ بہلاتے بہلاتے جب بیچاری ماں عاجز آ جاتی تو پھر بوڑھی دادی اپنے اس ''نمونے'' پوتے کو پوپلے منہ سے لوریاں سنانے لے بیٹھتی۔ مگر آفرین اس بچے پہ کہ دادی تو سو جاتی مگر یہ گلا پھاڑنے والا وظیفہ نہ بھولتا۔ تب اس کا بوڑھا صابر و شاکر باپ اسے اپنے کاندھے والے تولئے میں لپیٹے آنگن کے باہر نکل جاتا۔ چار قل اور درود شریف پڑھ کر پھونکیں لگاتا اور رشتہ داروں کے گھروں محلّے گلیوں اور گلی گلی گھوم گھوم کر اس کے بہلاوے کے جتن کرتا رہتا مگر یہ ریں ریں کا باجا کیا مجال جو کسی چکر میں پھنس کر اپنا چلن چھوڑتا۔ لیکن اس طرح یہ ہوا کہ پہلے گھر اور آس پاس پڑوس والے اس بچے کے رونے چیخنے سے عاجز تھے اب محلّے دار اور بازار والے بھی ''آشنائے راز'' ہو گئے۔ آخر ایک دن محمد دین حجام نے مشورہ دیا (اسی حجام نے اس بچے کا اُسترے سے ایک بوند خون نکال کر راکھ کی پٹی باندھی تھی کہ بچے کے ختنے پیدائشی طور پہ ہی ہوئے تھے) خان صاحب اس درویشے کو بہاول شہیدؒ (گھر سے نزدیک ایک بزرگ کا مزار) لے جا کر سلام کرواؤ...... بوڑھا شخص بچے کو لے کر فوراً وہاں پہنچ گیا۔ مسلسل ہچکیوں سے روتے ہوئے بچے کو صاحبِ مزار کے قدموں میں فرش پہ ڈال دیا...... اللہ کا کرنا اور اُس بزرگ کا تصرف کہ بچہ فرش پہ پڑتے ہی سکون پکڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے خوشی اور آسودگی کا اظہار کرنے لگا...... اب کہاں کا رونا اور چیخنا چلانا' ہمک ہمک کر چہکنے لگا۔

باپ حیران و ششدر کہ اک دم اسے کیا ہو گیا ہے وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ چلو جیسے بھی ہوا یہ چُپ تو ہُوا...... مگر وہ نہیں جانتا تھا اصل رَولا تو اب شروع ہوا......!

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بچہ پُرسکون سو گیا تھا۔ بوڑھا بھی پچھلی دیوار سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گیا کہ چلو یہ نچلا بچہ بھی نیند لے لے اور وہ خود بھی تھوڑی دیر کمر سیدھی کر لے۔ بوڑھوں اور بچوں میں

یہی ایک خرابی ہوتی ہے کہ وہ جہاں ذرا سکون محسوس کرتے ہیں وہیں آنکھیں موندھ لیتے ہیں...... یہاں بھی یہی کچھ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد بچہ نیند میں شہد کی مکھیوں کی بیں بیں سی بھنبھناہٹ بکھیرنے لگا اور بوڑھا خراٹوں کے کاٹھے اخروٹ توڑنے لگا۔ اُتھری نیند کی لہلوٹ میں بوڑھے کی کُہنی کہیں پچھلی دیوار سے ٹکرائی تو بجلی کی سی کرنٹ سے وہ کانپ سا گیا۔ چہرے پہ عینک دُرست سے جماتے ہوئے سامنے فرش پہ اپنے بچے کی جانب دیکھا لیکن بچہ وہاں موجود نہ تھا۔ ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر بچہ نہ پا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا...... سامنے دیکھا تو بچہ اُونچے مزار کے تھڑے پہ صاحبِ مزار کے دائیں جانب' پہلو میں پڑا مزے سے سو رہا ہے۔ کچھ دیر تک وہ متوحّش نگاہوں سے بچے اور مزار کو دیکھتا رہا پھر وہ آگے بڑھا اور نرم ہاتھوں سے بچے کو اُٹھا لیا پھر وہ جو گھر پلٹا تو گلی میں داخل ہوتے ہی بچے نے اپنا ''راگ روہاس'' پھر سے الاپنا شروع کر دیا...... اب جو دوپہر تک اِس کی راگ داری ختم نہ ہوئی تو بوڑھا اپنی بیوی سے کچھ کہے سُنے بغیر ایک بار پھر باہر نکل گیا...... ظاہر ہے اِس کا رُخ بہاول شہیدؒ کی جانب ہی تھا...... بہاول شہیدؒ کی جُو میں داخل ہوتے ہی بچہ پھر شانت ہو گیا۔

گھر عصر کی نماز ادا کرتے ہی بوڑھے نے لوٹتے ہوئے بچے کو کاندھے سے لگاتے ہوئے بیوی سے آج کے دن کا پورا ماجرا کہہ سنایا اور کہا...... نیک بخت اچھی طرح جان لے کہ ہمارا یہ بچہ اب تیری میری گود سے نکل چکا ہے اِس کا چین سکون' گھر اور گود نہیں...... مزار اور گورستان ہیں۔ اِس کا جنم ضرور ہمارے ہاں ہوا ہے مگر اِس کی راہ اور منزل کہیں اور ہے...... آج کے بعد تو اِسے بھول جا جو بھی یہ کرے اور جو چاہے' اِسے مت روک اور ٹوک اور نہ ہی کبھی اِسے ڈانٹنا...... پیروں' فقیروں اور بزرگوں کی دُعاؤں برکتوں سے حاصل ہوئی اولاد عام اِنسانوں کی طرح نہیں ہوتی...... آج مزار کے اندر' خواب میں بابا بہاول شہیدؒ میرے پاس آئے اور اِسے میرے سامنے سے اُٹھا کر اپنے پہلو میں لٹاتے ہوئے فرمایا۔ اِس کا چین اور قرار باپ اور بے بے کے پاس نہیں اپنے بابوں کے پاس ہے......''

صاحبو! شیر خواری سے چھٹپن تک کے ماہ و سال اِنہی خرابوں اور ''پٹ سیاپوں'' میں گزرے کہ گھر' آڑوس پڑوس' محلّہ بلکہ پورا شہر مجھ سے بیزار اور بدگمان تھا...... میری شرارتیں' بغاوتیں اور ناقابلِ بیان و برداشت حرکتیں میری وجہِ شہرت تھیں مجھ سے ہر کوئی پناہ مانگتا تھا۔ اَب جہاں سے عقل و شعور کا کچھ مضبوط دامن ہاتھ آیا وہیں سے کتھا شروع ہوتی ہے۔

۞

• مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں......!

مشاہدے میں آیا ہے کہ کیمیا گری کے ٹھرکی بڑے جنونی' ارادے کے مضبوط' سخت کوش اور صابر و شاکر ہوتے ہیں۔ اِن کے ساتھ اگر گدھ' گدھے کو بھی شامل کر لیا جائے تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اِن تینوں سے زیادہ سخت جان' طویل عرصہ تک صبر برداشت کی ہمت و جرأت رکھنے والا راضی بہ رضا قسم کا جانور شاید ہی اِس روئے زمین پہ اور کوئی ہو۔ نیم مردہ لاشہ مہینہ بھر سانس کی ڈوری کے ساتھ بندھا رہے' پاس گدھ بھی بھوکا پیاسا جامد و ساکت محوِ انتظار رہے گا' جونہی سانس کی ڈوری ٹوٹی وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اِس کے پوسٹ مارٹم کے لئے آئے گا اور اپنا سر اِس کے پیٹ میں ڈال دے گا اور گدھا تو گدھ کا بھی باپ ہے۔ گرمی' سردی' بارش' آندھی پیٹھ پہ سات گدھوں کا بوجھ' بھوکا پیاسا سوٹنے پہ سوٹے کھا رہا ہے۔ مالک اور بیوی کی گالیاں سُن رہا ہے مگر کیا مجال جو کبھی حرفِ شکایت زبان پہ آ جائے۔ چنگیز خان سے لے کر چنگڑوں تک' ہر کسی کو اپنی پیٹھ پہ بٹھایا' منزل تک پہنچایا مگر یہ خود بے منزل اور بے مُراد یعنی گدھے کا گدھا ہی رہا۔ اسی طرح مہوس یعنی کیمیا گر بھی اِس شوق کی خاطر اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کا جگرا رکھتا ہے۔ گھر بار' بیوی بچے' مال جائیداد' صحت و صُحبت' سب کچھ اِس جنون کے جہنم میں جھونک دے گا بس اِس آس پہ کہ اب کی بار کامیاب ہو جاؤں گا اور اگلے پچھلے سب دلدّر دُور ہو جائیں گے۔ کبھی رنگت' کبھی وزن' لچک اور کبھی سختی' ہمیشہ کوئی نہ کوئی اُڑچن آڑے رہتی ہے۔ تاؤ کم رہا تو کبھی منزل چھُوٹ گئی۔ تادولی پرتی سنگت اُدھوری رہی' چاند اندر تھا تو کہیں سورج مُکھ چھُپا گیا' چاندی کچّی رہ گئی تو کہیں رَت جوت جھڑ گئی۔ تو تیا اور کالا تیلیا کبھی وزن پی گیا' شنگرف اُٹھا تو اِدھر تانبا تانت پکڑ بیٹھا' رانگ سُست تھا اور کبھی شعلہ تیز۔ غرض کوئی نہ کوئی معمولی سی غلطی' خامی' بے توجہی اور بے ہُنری کامیابی کی منزل کو دھیرے دھیرے آگے آگے سرکاتی رہتی ہے اور عامل آج کل' آج کل کی اُمید میں زندگی کے بہترین ماہ و سال اور بڑھاپے کی بدترین صبح شام میں اِسی شوقِ خانہ خراب اور جنونِ نامراد کی نذر کرتے ہوئے خاموشی سے دَم توڑ دیتے ہیں اور مکافات کا گدھ پھڑ پھڑاتا ہوا اِن کے استخوانی ڈھانچے میں شگاف ڈال کر اپنی منحوس

چونچ سے اِن کی ایک ایک آنت کی تانت کو کھینچ کھانچ کر سُر میں کر دیتا ہے۔

سونا بنانا میرا کبھی بھی مقصد و مقصود نہیں رہا‘ صرف ’’جاننے‘‘ کا چسکا تھا۔ ویسے ’’جاننا‘‘ تو ہر کسی کا بنیادی حق ہے‘ انسانی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر آپ محض ایک کاٹھ کے پُتلے ہیں۔ قادرِ مطلق نے بھی اپنے احکام و ارشادات میں ’’جاننے‘‘ پہ بہت شدّت سے زور دیا ہے کہ اپنے رَبّ کو جانو۔ اُس کی نعمتوں اور عطاؤں میں‘ زمین و آسمان‘ چاند سورج‘ ستاروں اور کہکشاؤں کی گردشیں‘ اِن کے جھرمٹ محوِ خلاؤں کی لامحدود‘ پُراَسرار خاموشیاں‘ بحر و بر کی وُسعتوں گہرائیوں کے ضم و دَم۔ کوہ و دمن‘ دشت و صحرا‘ ہوائیں خوشبوئیں‘ رنگ و نمو‘ نغمے زمزمے‘ آہنگ ترنگ‘ چرند پرند‘ علوم فنون‘ زندگی موت‘ انسانی دماغ‘ اس کا قلب‘ سماعت‘ بصارت‘ نطق احساسات جذبات یعنی جو کچھ بھی کائنات اور زندگی و حرکت سے وابستہ ہے سب ’’جاننے‘‘ اور ’’ماننے‘‘ سے عبارت ہے۔ ہر ذی نفس اپنی بساط‘ اپنے مذاق و ظرف اور اہلیت ضرورت و طبع کے مطابق ’’جاننے‘‘ کے عمل سے گزرتا ہے۔ میرے ایک اُستاد ریاض شاہد دہلوی مرحوم میرے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے میاں‘ تمہاری بجلی نوچھی۔ تم تو اَزلی آوارہ اور پیدائشی گروہو۔ جو کچھ چالیس برس کی محنت شاقہ سے دُنیا [illegible] سکتا [illegible] تم [illegible] شکل [illegible] آئے تھے

خیر‘ یہ تو وہ محبت و مذاق میں فرمایا کرتے تھے لیکن اپنی جگہ پہ یہ بھی حقیقت ہے کہ گلِ لالہ کی طرح میری حنابندی بھی فطرت و قدرت نے اوائل عمری میں ہی کر دی تھی۔ گھر والے تو خیر گھر والے تھے میرے سکول کے اُستاد‘ مسجد کے مولوی‘ محلے والے‘ رشتہ دار‘ دوست یار‘ سب ہی مجھ سے نالاں اور بیزار تھے۔ نت نئی شرارتیں‘ مرغیوں کی چوریاں‘ ہمسایوں کی ہانڈیاں‘ مسجد کی ٹوپیاں بلب ٹوٹے کا تیل‘ امرودوں‘ جامنوں اور خربوزوں‘ تربوزوں‘ کماد کے کھیتوں میں شب خون‘ مزاروں دَرباروں کے ’’گلوں‘‘ سے پیسوں کی چوریاں‘ سنیما کے پہلے شو کے دن بغیر ٹکٹ بھیڑ کے ساتھ اندر گھسنا‘ ریل پہ بغیر ٹکٹ سفر‘ چیکر سے لُکن میٹی کھیلنا‘ شہر بھر کے ہوٹلوں سے اُدھار کھانا اور پلٹ کر شکل نہ دِکھانا۔ ڈرامے‘ مباحثے‘ مشاعرے‘ ڈانس‘ گانے‘ نعتیں‘ لڑائیاں مار کٹائیاں۔ غرض کہ کوئی شعبۂ حیات یا واہیات ایسا نہ تھا۔ جس میں ’مَیں‘ یکتا و بدنام نہ تھا۔ سڑک کنارے کسی مداری کو دیکھا کہ ایک سے دو روپے بنا رہا ہے‘ انگوٹھی کسی کنوئیں میں پھنکوا کر بینگن کے اندر سے برآمد کر رہا ہے تو اُس کے پیچھے ہو لئے کہ یہ کیسے کرتا ہے۔ جیسے بھی بن پڑا‘ یہ کرتب سمجھ اور سیکھ کر ہی چھوڑے۔ ہمارے سکول میں ایک بار ایک جادوگر تماشا دکھانے آیا۔ وہ بلیڈ اور برنجی کے کیل منہ میں ڈال کر چنوں کی مانند چباتا تھا اور صرف چار روز بعد مَیں سرِعام گھر باہر سکول میں ہر جگہ کیل اور سیون او کلاک کے بلیڈ ریوڑیوں کی طرح کڑ کڑ مزے سے چباتا پھر رہا تھا۔ اسی طرح سینکڑوں اچھے بُرے کام محض

"جاننے" کے جنون کی وجہ سے میں نے جانے یعنی جاننے' سیکھنے سمجھنے کی قوت اور طلب اتنی زیادہ تھی کہ ذہن ہر وقت پارے کی مانند اک تھرتھلی سی مچی رہتی تھی' حافظہ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ آنکھوں دیکھی' کانوں سنی جھٹ سے ریکارڈ ہو جاتی۔ بس ہر وقت یہی لگا رہتا کہ یہ کیا ہے' کیوں ہے' کیسے ہے؟ پھر کوئی تخصیص بھی نہیں تھی کہ یہ کام کرنے یا سیکھنے کا ہے کہ نہیں۔ میری عمر' تعلیم' حالت' حالات' طبع' طبیعت سے لگا کھاتا ہے یا نہیں؟

- چاچا' سونے دا سُلوکا' چاندی دا لاچا......!

بات سونے کی ہو رہی تھی۔ میں بچپن میں سونے سے بہت محبت کرتا تھا...... ویسے بھی بچوں کو نیند بہت آتی ہے۔ جب دیکھو جہاں دیکھو ان کے نین کٹورے نیند سے جل تھل رہتے ہیں اور یہ دوسرا سونا' جس کے زیورات بنتے ہیں۔ جو قیمتی دھاتوں میں سے ایک ہے۔ جس کی خاطر بہت کچھ ہو جاتا ہے' جو بہت کا اصل خنز ہے۔ پہلے پہل اس سونے کو میں نے "چاچا لنگڑ" کے حوالے سے جانا تھا۔ اس سے پہلے سونے کی اہمیت اور قدر و قیمت سے میں اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ دادی کے کانوں میں چاندی کی "ڈنڈیاں" تھیں اور بازوؤں میں چاندی کے کڑے' البتہ امی کے کانوں اور بانہوں میں سونا تھا یا پھر اس سونے کو کبھی کبھار بازار میں سُنار کی دوکان میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ بھی ابھی نہیں جانتا تھا کہ یہ سونا کہاں سے آتا ہے' نکلتا ہے یا کہیں بنتا ہے؟ سونے کی اصل اہمیت مجھے چاچا لنگڑ کے ہاں معلوم ہوئی۔ اس سمت' یعنی کیمیا گری کی جانب لے جانے والے یہی ذاتِ شریف تھے' خدا جانے انہیں میرے اندر کیا جوہر نظر آیا کہ انہوں نے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا۔ جہاں تک میں نے دیکھا اور جہاں کہیں سے میں نے سُنا' یہی سُنا کہ انہوں نے ساری زندگی بس یہی ایک کام کیا ہے۔ خاندان کے افراد کے علاوہ اصلی نام شاید ہی کوئی جانتا ہو لیکن چاچا لنگڑ کے نام سے یہ شہر بھر میں مشہور تھے۔ چپڑی ہوئی زُلفیں' لمبا سا قد' پتلا کاٹھ۔ ہمیشہ اُجلے کپڑوں میں ملبوس دکھائی دیتے۔ حقہ پینے کے شوقین تھے...... ہمارے گھر کے پچھواڑے وہ بڑے سے صحن والے دو کمروں کے گھر میں رہتے تھے' صحن میں نیم' دھریک اور آم کے درخت بھی تھے۔ ایک جانب بڑا سا تنور اور دیوار کے ساتھ مرغیوں چوزوں کے بڑے بڑے ڈربے' ساتھ ہی اُنہوں نے پکی اینٹوں کا چھوٹا سا جھونپڑا نما کمرا بنا رکھا تھا۔ یہی جھونپڑا جس کے دروازے پہ ہمیشہ مضبوط بھاری تالا پڑا رہتا' اُن کی پُر اسراری تجربہ گاہ بھی تھا۔ اس کے اندر کیا کاٹھ کباڑ تھا' اس کے متعلق اُن کی بیوی یعنی

ہماری چاچی معراجاں بھی شاید کچھ نہ جانتی تھی کیونکہ اس ''ریڈ ایریا'' کی جانب کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا' تو پھر بھی اس منحوس جھونپڑے کی جانب جانا تو درکنار' کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کرتا' آس پاس گلی محلوں کی مائیں اکثر اپنے شریر بچوں کو چاچے گُگڑ کے جھونپڑے کا ڈراوا دے کر سُلایا اور دھمکایا کرتیں۔

میں مڈل سکول کی عمر تک کوٹھے پہ اینٹوں کی سوراخوں والی منڈیر سے پہروں چاچا گگڑ کے طلسماتی جھونپڑے کو وحشت بھری آنکھوں سے تاکا کرتا' میری دانست میں وہاں بھوت اور جن قید تھے جنہیں چاچا سیاہ مرغوں کا کچا گوشت کھلایا کرتے تھے۔ جب بھی کبھی جھانکا' چاچی معراجاں چولہے پہ مرغا پکاتی ہی دکھائی دی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ چاچا' سونا بنانے کے نسخے میں اصیل کالے مرغ کا پوٹا استعمال کرتا تھا۔ پوٹا نکال کر وہ پورا مرغ چاچی کے حوالے کر دیتا' وہ اسے کاٹ کر ہنڈیا میں ڈال دیتی۔ چاچا کی کوئی اولاد تو تھی نہیں جو مزے مزے لے کر کھاتی۔ چاچی' چاچا کھا پی لیتے اور فالتو سالن ہمسایوں کے گھروں میں بھیج دیتے۔ جی چاہتا تو کوئی کھا لیتا ورنہ اکثر پھینک دیا جاتا یا مہترانی لے جاتی۔ ہمارے ہاں وہ سالن نہیں بھیجتے تھے' والد صاحب نے سختی سے منع کر رکھا ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کے ہاں کی ہر چیز مکروہ ہے کیونکہ چاچا مرغ کو حلال نہیں کرتا تھا بلکہ جیتے جاگتے مرغ کا پیٹ چاک کر کے پوٹا کھینچ لیتا تھا۔ اکثر مرغ بیچارہ اس حالت میں بھی اُٹھ کر بھاگ لیتا۔ نیچے آنتیں لٹک رہی ہیں' خون ٹپک رہا ہے اور وہ زندہ اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ جب کہیں ڈھے جاتا تو چاچی اُسے کاٹ لیتی۔ پوچھنے پہ چاچا بتاتا کہ گردن کٹے مرغ کا پوٹا اس کے کام کا نہیں ہوتا۔ میں تکبیر پڑھ کر پیٹ چاک کرتا ہوں' فرق کیا پڑتا ہے۔ گردن نہ سہی' پیٹ سہی...... چاچا کا نسخہ ہی ایسا تھا جس کے لئے اصیل کالا مرغ جس کی آنکھیں عقربی' سر کی کلغی سُرخ لال بوٹی' چونچ نوکیلی' پنجے تیز ہوں۔ ایک بھی سفید پَر نہ ہو۔ وہ ایسے مرغوں کی تلاش میں رہتا۔ گلی محلے' شہر کونے کونے گھومتا رہتا اور منہ مانگے داموں خرید لیتا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ باپ مرتے وقت اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے مکان' زمین' بہت کچھ چھوڑ گیا تھا جو آہستہ آہستہ بکتے جا رہے تھے۔ رشتہ دار اور جاننے والے بھی اسے خوب اُلو بناتے۔ وہ بھی مرغ ڈھونڈتے رہتے' تھوڑے بہت جو سفید پَر ہوتے' وہ کھینچ نکالتے۔ بعض اوقات انہیں کالے رنگ سے رنگ کر اور چاچا کے ہاں بیچ کر اچھے دام کھرے کر لیتے...... چاچا مجھ سے بڑا پیار کرتا تھا۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ والد صاحب کے منع کرنے کے باوجود میں اکثر چھپ چھپا' دیوار پھلانگ کر اُن کے ہاں چلا جایا کرتا۔ میں جنم جنم کا چٹورا' چاچی مجھے خوب بُھنے مرغ کی بوٹیاں کھلاتی۔ نیز آم' جامن' جو بھی موسم

[illegible] پھر کھاتا رہتا۔ دھیلا پیسہ بھی میسّر آ جاتا جو اَلوک' مونگ پھلی یا چنے ریوڑیوں کے کام [illegible] کے گھر اندر بیٹھا بیٹھا میں چاچا کے جھونپڑی کی جانب متجسّس نگاہوں سے دیکھتا رہتا......
[illegible] اندر بھی کہیں سونا بنانے کی خواہش تھی کہ اگر مجھے بھی یہ ہُنر آ جائے تو ایک بار ہی ڈھیر سا [illegible] اور پھر ساری عمر آرام سے بیٹھ کر مونگ پھلیاں' ریوڑیاں کھاؤں اور دوستوں کو کھلاؤں۔ سکول [illegible] نہ کمانے کا چکر۔ اِس سے پیشتر بھی میں اور میرا دوست اسلم' پیر شعلہ شہید کے مزار پہ [illegible] کی چادر کے نیچے اٹھنّی رکھ کر سونے کی اشرفی میں تبدیلی کا چلّہ کاٹ چکے تھے۔ سات روز [illegible] اٹھنّی وہاں سے غائب ہو گئی تو ہم دونوں میں ایک دوسرے پہ اٹھنّی چرانے کے الزام میں ٹھن [illegible] کے ساتھ دوستی بھی ختم کر دی۔ ہم دونوں چار چار آنے کے حِصّہ دار تھے۔ یہ نقصان ہم نے مزار [illegible] کے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے کہ میں [illegible] جمعرات کے روز سرسوں کا تیل چُرا کر خزانے پکوڑے والے کو دے کر پکوڑے کھاتا [illegible] فلمیں بھی دیکھتا ہوں۔ وہ کم بخت یہاں بھی میرا پارٹنر ہوتا تھا مگر اپنا نام نکال کر اب [illegible] دیا تھا۔ یہ بھی سچ کہ وہ اٹھنّی میں نے ہی اُدھار چُرا کر [illegible] جان کاؤس کی فلم ''ہنٹروالی'' [illegible] میں میرا اور [illegible] کھائے تھے مگر یہ تو اُدھار تھا' چوری تو نہ ہوئی...... چاچا لنگڑ کے [illegible] مجھے یہ [illegible] اپن' پیسوں کا لالچ اور سونا بنانے کا تجسّس لے کر جاتا تھا مگر چاچا کھلاتا پلاتا تو تھا' [illegible] طرف نہیں آنے دیتا تھا بلکہ کام کے دوران اپنے قریب تک پھٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔

[illegible] روز موقع پا کر میں نے چاچا سے چکر چلایا۔

''چاچا! اِدھر گنڈا سنگھ کے کارخانے کے پاس میں نے ایک کالا شا مرغا دیکھا ہے۔ اگر حکم کرو [illegible] لے آؤں......؟''

چاچا نے [illegible] کی نَے پرے ہٹاتے ہوئے مجھے گھورا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''[illegible] کاکا! کوئی چکر وکر تو نہیں چلا رہا......؟''

میں نے کانوں کی لوؤں کو پکڑ کر کہا۔

''توبہ کر چاچا! اللہ دی قسمے' میں نے خود اپنی آنکھوں سے اِس کالے شا مرغے کو دیکھا ہے۔''

چاچے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جیب سے چمکتی ہوئی اٹھنّی نکال کر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کالا مرغ لے آئے تو ایک اور اٹھنّی انعام ملے گی...... شاباش!''

اٹھنّی تھام کر باہر نکلے۔ خوب کھایا پیا' پھر فلم دیکھی...... فارغ ہوئے تو فکر ہوئی کہ اب چاچا کا

مرغ کہاں سے لائیں؟...... اسٹیشن کی جانب نکل آئے۔ ریلوے کوارٹروں کے پاس مجھے ایک کالا مرغا دکھائی دیا جس کے کچھ پر سفید بھی تھے' بڑے جتنوں سے گھیر گھار کر اُسے پکڑا' سفید پر کھینچ نکالے' چھپتے چھپاتے گھر کی طرف آ گئے اور پچھلی گلی سے چاچا کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے بھوت بنگلے میں تھا۔ باہر صحن میں چاچی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

"وے' کاکا! تم یہ مرغا کہاں سے لائے ہو......؟"

ہم نے جواب دیا کہ چاچا کے لئے خرید کر لائے ہیں۔

"خبردار' جو آئندہ ایسی حرکت کی...... اس مرجانے نے تمہیں بھی اس کام پہ لگا دیا...... تمہارے باپ کو خبر ہو گئی تو تمہارے ساتھ وہ ہمیں بھی رگڑ دے گا...... لا مجھے دے یہ مرغا اور بھاگ جا' آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔"

چوری کا مرغا...... اُٹھنی سے خوب عیش کی تھی۔ چھوٹی موٹی چوریاں گھر اور باہر تو میں کرتا ہی رہتا تھا' یہ مرغے والی چوری ہمارا پہلا کارنامہ تھا...... چاچا کو مرغا کیا ملا تھا جیسے منزل مراد مل گئی تھی۔ یہ ایسا مرغا تھا جس کی چاچا کو مدتوں سے تلاش تھی۔ کالا کلوٹا' چونچ' کلغی' سب ہی سیاہ [illegible] تھا' کم بخت کا خون' گوشت اور ہڈیاں بھی کالی ہی ہوں گی۔ چاچا نے مجھے بلایا' ایک اور اٹھنی شاباشی کے طور پر دی اور ساتھ یہ بھی خوشخبری دی کہ اگر اس مرغے کے وسیلے سے وہ سونا بنانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ مجھے بھی یہ ترکیب بتانے کے بارے میں سوچے گا...... میں نے کمال معصومیت سے چاچا سے پوچھا۔

"چاچا! سونے کا انڈا دینے والی مرغی کے بارے میں تو سنا تھا' تم مرغے سے سونا کیسے بناؤ گے......؟"

چاچا حقے کا کش لیتے ہوئے نرمی سے مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

"کاکا! بس دیکھتے جاؤ' میں سونا کیسے بناتا ہوں...... یہ تمہاری چاچی اور ادھر اُدھر کے لوگ جو میرے بارے میں اُلٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہیں' یہی میری تعریفیں کیا کریں گے' مجھ سے آ کر سونا مانگا کریں گے۔ بس ذرا ایک مہینہ گزر لینے دو' پھر دیکھنا......"

"ایک مہینہ......؟" میں نے مہینے کو بہت لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... سونا یوں ہی نہیں بن جاتا' بڑی محنت کرنی پڑتی ہے......"

چاچا مجھے لے کر جھونپڑے کے اندر آ گیا۔ میرا رنگ فق تھا' دل دھک دھک کرنے لگا۔

"کہاں میں اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ"...... چاچے ککڑ کا جھونپڑا۔ ڈرتا ڈرتا ساتھ اندر پہنچ گیا تھا۔

ایک عجیب سی سڑی ہوئی بدبو مچی اور پتھر کے عجیب و غریب برتن' بوتلیں' برنیاں' سنگِ مرمر کے کھرل' جڑی بوٹیاں' شیشے کے مرتبان جن میں شاید مختلف تیزاب تھے۔ لکڑیاں' کوئلے' گوبریاں' اُپلے اور ایک چوبی تھی بند الماری۔ کسی جادوگر کی غار کی طرح منحوس' خوفناک اور تاریک۔ ایک طرف ریچھ اور شیر کی کھال معہ سر' جبڑے' دانت لٹکی ہوئی دکھائی پڑی تو مارے خوف میری گھگھی بندھ گئی...... یا اللہ! میں کہاں پھنس گیا۔ چاچا تو مجھے یہاں بھون کر کھا جائے گا۔ میں بھاگنے ہی والا تھا کہ چاچا بولا۔

"کاکا! گھبرانا نہیں' ذرا اندھیرا ہے...... تم پہلے فرد ہو جسے میں یہاں اپنی مرضی سے لایا ہوں۔ تمہاری تو چاچی بھی کبھی یہاں نہیں آئی......"

اتنا کہہ کر وہ مجھے تاریک کونے میں پڑا ہوا ٹوٹے گھڑے کا پیندا دکھانے لگا جس میں ایک کالی ڈائن خوفناک بڑی سی مرغی بیٹھی خونخوار آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی پتلی سی سرخ زبان چونچ کے باہر نکلی لرز رہی تھی۔ چاچا نے اسے پچکارتے ہوئے ذرا پرے سرکایا۔ چوں چوں کرتے کالے کالے چوزے دکھائی دیے' میں حیرت سے انہیں تکنے لگا۔ اُس نے ایک ننھا سا چوزہ میری ہتھیلی پہ رکھ دیا' میں چوزے میں مگن ہو گیا۔ چاچا' مرغی کو ہٹا کر ٹوٹے ہوئے انڈوں کے چھلکے صاف کرنے لگا۔ میں نے دیکھا' گھڑے کا پیندا چوزوں سے بھرا ہوا تھا۔ خاصی نگرانی کرنے کے بعد چاچا مجھے لے کر باہر آ گیا۔ ننھا ریشم جیسا کالا چوزہ میری ہتھیلی پہ چوں چوں کر رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا' یہ چوزہ مجھے انعام کے طور پہ دیا گیا ہے۔

"چاچا! میں یہ بچہ لے جاؤں......؟"

"کاکا! تو اسے لے کر کیا کرے گا...... لا مجھے دے اور تو گھر بھاگ جا۔ شام سے پہلے آنا' میں نے تیرے والے ککڑ کو دوا کھلانی ہے تو میری مدد کرنا...... خبردار' کسی کو بتانا نہیں ورنہ تو سونا بنانا نہیں سیکھ سکے گا۔"

میں دو چار اللہ کی قسمیں کھا کر' وعدہ کر کے باہر نکل آیا۔ طبیعت میں اتنا ہیجان تھا کہ گھر آتے ہی چارپائی پہ پڑ گیا۔ دن کو میں کبھی نہیں سویا تھا مگر ایسی نیند اور دن کو ایسے خواب...... میں نے سونے کی تاروں کے کپڑے پہنے ہیں۔ سر پہ سونے کا تاج' سونے کے جوتے' میرا گھر خالص سونے کی اینٹوں کا ہے' گھر کا ہر برتن چمکتے ہوئے سونے کا بنا ہوا۔ میری سائیکل اور چھروں والی بندوق' بستہ' کتابیں' قلم دوات' ہر چیز سونے کی...... سو کر اُٹھا تو سیدھا اوپر کوٹھے پہ چڑھ گیا۔ دیوار کے سوراخوں سے اس طرف جھانکا۔ چاچا حقہ دھرے گولیاں بٹ رہا تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر اِدھر کوٹھے پہ اُتر گیا۔ چاچا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ''تُو میرا بیٹا تو پہلے ہی تھا' آج سے شاگرد بھی ہو گیا ہے...... لے' ذرا ککڑ کو پکڑ۔ اس کو خوراک دیں لیں......''

ککڑ رسّی سے بندھا ہوا تھا۔ رسّی سے آزاد کر کے میں کسی بچّے کی مانند اسے گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ چاچا اس کی چونچ کھول کر موٹی موٹی گولیاں اس کے حلق میں اُتارنے لگا۔ عجیب سی ناگوار بدبو میرے نتھنوں میں گھُس رہی تھی۔ عجیب سی' کالی کالی گولیاں تھیں جیسے تارکول سے بنی ہوئی ہوں۔

''بیٹا! بدبو سے ہی خوشبو پھوٹے گی......'' رازدارانہ لہجے میں بتانے لگا۔ ''جو چوزہ میں نے تجھے دیا تھا یہ اُسی کے گوشت' تانبے کے باریک ذرّات کالا تیلیا' کچّا شنگرف اور کشتہ پارا سے بنی ہیں' تو آہستہ آہستہ اِن چیزوں کو جان جائے گا۔ فی الحال' صرف دیکھتا جا......''

گولیاں کھا کر مرغا بے سُدھ پڑ گیا۔ چاچا نے مجھے بھی بھگا دیا کیونکہ چاچی نماز سے فارغ ہو کر باہر آنے والی تھی...... بھاگم بھاگ گھر آیا۔ ایک پرانی ڈائری میں اِن دواؤں کے اُلٹے سیدھے نام درج کیے۔ خوشی اور سنسنی انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طور دن گزرا' رات آئی۔ رات کیا تھی' خوابوں کی بارات تھی۔ ساری رات میں خواب دیکھتا رہا' عجیب خواب جو پہلے کبھی دیکھے نہ تھے۔ ہر طرف چم چم چمکتا ہوا سونا' میرا جسم بھی جیسے سونے کا بن گیا ہو۔ بیٹ بلا' ہاکی' فٹ بال' اینٹ روڑے پتھر' بجلی کے کھمبے تاریں' تالے' گھر کے سارے برتن۔ ہر طرف سونا ہی سونا...... عجیب سُنہری دن تھے۔ میں ہر روز شام کے وقت وہاں پہنچ جاتا۔ چاچا نے گولیاں بٹ کر رکھی ہوتیں۔ میں ککڑ کو تھامتا کھاپی کر ککڑ کسی چرسی کی طرح ٹُن ہو جاتا۔ چند ہی دنوں میں وہ خوبصورت مرغے سے ایک عجیب الخلقت سی چیز بن گیا تھا' یوں دکھائی دیتا جیسے وہ مریخ سے فرار ہو کر سیدھا چاچے ککڑ کے گھر آ گیا ہو۔ گردن اور جسم خوبصورت پَروں بالوں سے خالی' صرف بازوؤں اور دُم پہ چند ڈھیلے ڈھیلے ڈنٹھل ٹھُنڈے رہ گئے تھے۔ کلغی میں جیسے ہوا سی بھر گئی اور علیحدہ ہی سر پر دھری نظر آتی۔ آنکھیں چپٹی' سفید موتیے سے دُھواں بھری۔ سبز نیلی غلاظت سے لتھڑی ہوئی سرخ پیٹھ' مقعد اُلٹ کر باہر نکل آئی تھی۔ چونچ ٹیڑھی' بالوں سے خالی سینے اور پیٹ پہ گومڑے سے اُبھرے ہوئے۔ اسے کسی طور پر مرغا نہیں سمجھا جا سکتا تھا' مرغے کا بھوت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو بالکل ایسا ہی ہوتا ہوگا...... چاچا' ایک چمچ سے اس کی بدبودار بیٹ کرید کرید کر ایک شیشے کی برنی میں ڈال رہا تھا۔

''چاچا! اِس غلاظت کا کیا کرو گے......؟'' میں نے ناک پہ ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''کاکا! چُپ......'' وہ ہونٹوں پہ اُنگلی دھرتے ہوئے' مہین سی آواز میں بتانے لگا۔ ''یہی تو اصل مسالہ ہے۔ بس پندرہ روز تمہیں اور میری مدد کرنا پڑے گی۔ چاند کی آخری تاریخ' ہم سونا بنانے کا عمل

شروع کریں گے۔"

چار پانچ روز بعد جب چاچا اور میں نے ایک دوسرے کو اعتماد میں لے لیا تو چاچا نے اب مجھے ہر مرحلہ وعمل میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ اِدھر میرا یہ عالم کہ سکول سے آئے تو بہانے بہانے سیدھے چاچا کے گھر۔ دوستی یاری موقوف' آوارہ گردی ختم' فلم بینی بند۔ بہانہ یہ بناتا کہ میں چاچا سے کتابوں کا پیوں کی جلد بندی سیکھ رہا ہوں۔ کاپیاں کتابیں میں ساتھ لے جاتا تھا' ایک کاپی نما ڈائری پہ نسخے بھی لکھتا رہتا ـــــ جیسے جیسے چاند گھٹتا جا رہا تھا' مرغے کی نحوست اور نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں دکھائی دیتا جیسے وہ وقت مقررہ سے پہلے ہی کوئی عفریت بن کر معدوم ہو جائے گا۔ پلپلی سی لوتھ کی لوتھ' جیسے کسی ڈھیلے سے غبارے میں نیل بھر کر اُلٹا لٹکا دیا ہو...... آخری تاریخ اس کی آنکھیں پانی ہو کر بہہ گئیں' وہ نیم مُردہ کشتہ اجل مٹی کی کنالی میں پڑا تھا۔ اِس لمحے کے انتظار میں چاچا اور میں نے بجا کشٹ بھوگا تھا۔ چاچی کو ایک منصوبے کے تحت میکے بھجوا' فصل کے چاول لانے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ ہم دونوں اُستاد شاگرد' بڑی خاموشی اور رازداری سے مصروف عمل ہو گئے۔ متعلقہ سامان تو کئی دنوں سے پیشگی تیار کیا ہوا تھا۔ تانبا' تیزاب' چاندی' سیماب' ابرق کا بورا' شنگرف' کجا تیلیا' گاچنی' اونٹنی کی گو بھا' پرانے کپڑے کی پٹیاں' لیپنے کی ملتانی مٹی' بڑی سی کچی ہانڈی' چیاو سانڈے کی لبلبی' کلیجہ بھرے امتلا' کیا ہوا شیشے کے مرتبان میں مرغ کا فضلہ' قلعی کا کشتہ وغیرہ...... چاچا نے بڑی بے دردی سے تیز چھُری سے مرغ کے نیچے پیٹ پہ شگاف لگایا' آنتیں باہر نکال کر پوٹا علیحدہ کیا۔ پوٹہ چیر کر بیٹ نکالی' اسے پہلے والی بیٹوں کے مرتبان میں ڈال کر ملا دیا۔ پھر سب دھاتیں' کشتے اور تیزاب مرغ کے پیٹ میں بھر کر اوپر گیلی مٹی سے لتھڑی ہوئی کپڑے کی پٹیاں لپیٹ دیں' بالکل ایسے جیسے قدیم مصری اپنے مُردوں پہ لپیٹا کرتے تھے۔ میں چاچا کی مدد کر رہا تھا' ایسے ہی جیسے مُردہ نہلاتے وقت یا آپریشن کے دوران مددگار ساتھی کرتے ہیں۔ چاچا بڑی مستعدی سے پٹیاں لپیٹ رہا تھا' میں لمبی لمبی پٹیاں مٹی کے کیچڑ میں بھگو کر اُسے دیتا جاتا۔

مرغا اچھا خاصا گھڑے کے سائز کا وزنی گولا بن گیا۔ سائیکل کے پہیئے کی گولائی کا ایک گڑھا پہلے ہی تیار تھا جس کے اندر بڑی ترتیب سے اُونٹنی کی گوبھا یاں رکھی گئیں...... گولا رکھ کر چاروں اطراف اُپلے رکھ دیے گئے۔ اُوپر مٹی پہ مزید اُپلوں کا ڈھیر رکھ کر آگ دکھا دی۔ اب چاچا ہاتھ منہ دھو' کاٹھ کباڑ سمیٹ کر حقہ بھر کے چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"کاکا! آج رات تم نے سونا نہیں ورنہ سونا کچا رہ جائے گا...... گھر جاؤ' نہا دھو کر نماز پڑھو اور خوب گڑگڑا کر دُعا مانگو۔ میں تو اِدھر سے ساری رات بیٹھا آگ کا حساب کتاب لگاتا رہوں گا...... کاکا!

اس کیمیاگری میں آنچ کا حساب ہی ساری کاریگری ہوتی ہے۔ تمہارے باپ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں بھی یہاں بٹھاتا...... خیر! اب تم جاؤ اور دیکھو! لیٹنا اوپر کوٹھے پہ۔ ہوسکتا ہے تمہاری ضرورت پڑے......"

میں بڑی بے دلی سے گھر چلا آیا۔ نہا کر اُوپر کوٹھے پہ مصلیٰ بچھا کر سونے کی کامیابی کے لئے نفل پڑھنے لگا' گاہے گاہے دیوار کے سوراخوں سے چاچا کے صحن میں بھی جھانک لیتا۔ دھیمی آگ' لپکتے شعلوں کے عکس میں چاچا کا چہرہ سونے کی طرح چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ دس بارہ نفل پڑھ کر رات کسی پہر میں مصلے پہ ہی سوگیا۔ وہی چمکتے دمکتے سُنہری خوابوں کا تانتا بندھ گیا۔

کوئی مجھے ہولے ہولے پکار رہا تھا۔ پہلے تو خواب ہی سمجھا مگر ایک چھوٹا سا کنکر جب میرے چہرے سے ٹکرایا تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُدھر چاچا دکھائی دیا جو مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔ بنیرا پھلانگ کر اُدھر اُتر گیا۔ چاچا بدحواس سا میرا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

"سونا بن گیا چاچا......؟" میں نے بے صبری سے پوچھ لیا۔

چاچا بوکھلایا ہوا تھا' آدھی سیڑھیوں پہ رُکتے ہوئے کہنے لگا۔

"بکو والے سے تمہاری چاچی کے دو رشتے دار آئے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے یہ بُری خبر دی ہے کہ تمہاری چاچی کو سانپ نے ڈس لیا ہے اُس کی حالت بڑی خراب ہے۔ میرا فوری طور پہ وہاں پہنچنا ضروری ہے' دوائیں میں ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ تم یہ چابی سنبھالو اور یہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میں پہنچتے ہی اُسے ہر حالت میں یہاں لانے کی کوشش کروں گا...... الاؤ کی تپش صبح تک ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ تم اس کے قریب مت جانا' صرف اپنے کوٹھے سے نگہداری کرتے رہنا۔ دوپہر تک اگر میں واپس نہ پہنچا تو گڑھے کے اوپر مٹی ڈال کر برابر کر کے اُوپر چارپائی بچھا دینا...... تمہیں پھر تاکید کر رہا ہوں کہ گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا' گڑھے کی راکھ کو مت ہٹانا' اُوپر مٹی ڈال کر چارپائی بچھانا اور خبردار' کسی سے ذکر نہ کرنا...... یہ لو دو روپے پاس رکھو......"

وہ جلدی جلدی اُتر کر آدمیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے اندر سے کُنڈی لگا کر اِک حسرت بھری نگاہ سُلگتے ہوئے الاؤ پہ ڈالی' روپے اور چابی جیب میں ڈال کر واپس اپنے کوٹھے پہ پہنچ گیا۔ اس اچانک مصیبت پہ غور کرتے کرتے خدا جانے میں کب چارپائی پہ لُڑھک گیا تھا۔ نُور کا تڑکا لگ چکا تھا' دور نزدیک کے مرغوں نے بیدار ہو کر بانگ سرائی شروع کر دی تھی۔ اِن دُنیاوی مرغوں کو کیا خبر کہ ان کا ایک بھائی آگ میں کشتہ ہو کر ہمارے لئے سونا آرائی کر رہا ہے۔ نیند کا اب سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ چاچی پہ رہ رہ کر غُصہ آ رہا تھا کہ کیا اِسی وقت سانپ ڈسوانا ضروری تھا' یہ کام آگے پیچھے بھی ہوسکتا تھا۔

نئے نئے خیال آنے لگے۔ مجھے یہ سانپ والا سانحہ بدشگونی محسوس ہونے لگا' کہیں پڑھا اور سنا بھی تھا کہ جہاں خزانہ اور سونا ہوتا ہے وہاں ایک نگران سانپ بھی موجود ہوتا ہے۔ میں خوف سے اُٹھ کر بیٹھ گیا' آیتیں پڑھنے لگا۔ جب کسی پل چین نہ آیا تو اُٹھ کر دیوار کے سوراخوں سے لگ گیا۔ دور ننھے ننھے لہراتے کپکپاتے شعلے' جیسے کالے ناگوں کی سرخ زبانیں لہرا رہی ہوں' بل کھاتے دھوئیں' راکھ پٹکتے سرسراتے شعلوں کا عکس' آس پاس کا ماحول یوں جیسے سینکڑوں سانپ سنپولئے الاؤ کے گرد رقص کر رہے ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں' پھر نیچے آ کر ماں جی کے پائنتی کی طرف لیٹ گیا۔ عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی جسم لرز رہا تھا۔ وہ فوراً مجھے اندر لے گئیں' گرم چادر اوپر ڈالی اور دوا پلا کر لٹا دیا......

صبح کو جب آنکھ کھلی تو گھر کی سوگوار فضا دیکھ کر مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ پوچھنے پہ ماں جی نے بتایا کہ ابھی ابھی چاچا کے گھر سے فوتیدگی کی خبر ملی ہے۔ چاچی جانبر نہ ہو سکی' چاچا اس کی میت لے کر آ گیا تھا...... میں اُٹھنے لگا تو ماں جی نے ڈانٹ پلا کر مجھے لیٹے رہنے کا حکم دیا۔

"خبردار جو تو چارپائی سے نیچے اُترا...... رات اوپر کھلے آسمان تلے اوس کھا گیا ہے۔"

والد صاحب تو چاچا کے گھر تھے' ماں جی بھی چلی گئیں تو میں کوٹھے پہ چڑھ گیا۔ صحن میں بچھی دریوں پہ بہت سے لوگ [illegible] چارپائی بچھی ہوئی تھی جس کے اوپر کفن دفن کا سامان بھی پڑا ہوا تھا...... شام سے پہلے ہی چاچی کو دفن کر دیا گیا' ماں جی نے بتایا کہ اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور جگہ جگہ سے تڑخنے لگا تھا۔ میں نیچے پہنچ کر چارپائی پہ لیٹ گیا' سوچنے لگا کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔ کتنے دن یہ مرگ کا سلسلہ چلے گا' کہیں سونا اندر دبا دبا خراب نہ ہو جائے؟...... رہ رہ کر مرنے والی چاچی پہ غصہ آ رہا تھا جس نے بے وقت مر کر ہمارا کام اور ساری خواہشیں ملیامیٹ کر دی تھیں۔ بہرحال' اب کیا ہو سکتا تھا۔ انتظار اور صبر تو کرنا ہی پڑے گا...... چاچا کے کچھ رشتہ دار جموں اور دوسرے شہر سے بھی آئے تھے۔ دیہاتی قسم کے مجہول لوگ جنہیں سوائے کھانے پینے' حقے اور فضول باتوں کے اور کوئی کام نہ تھا' رات ہوتی تو چارپائیوں پہ پڑ جاتے۔ میرا بخار بھی اُتر چکا تھا' ایک دو چکر اِدھر کے بھی لگائے مگر چاچا سے بات کرنے کا موقعہ نہ ملا' جب بڑے قُلوں کے بعد کچھ لوگ واپس چلے گئے......

شام کے وقت چاچا سیڑھیاں چڑھتا نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آ گیا۔

"کاکا! گھبرانا مت...... بس دو چار دنوں کی بات ہے۔"

دو چار دن کیا' ہفتہ بھر گزر گیا۔ آنے جانے والوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ سارا دن دری پہ حقہ اور باتیں چلتی رہتیں۔ کھانے کے وقت کھانا' چائے۔ بیکار بوڑھے' بیکار میں ہم دونوں کا جی جلا رہے

تھے ...... منگل وار بدھ جمعرات کے روز بڑا ختم ہوا۔ دو دیگیں چاولوں کی پکی تھیں۔ کھا کھلا کر چاچا نے دری سمیٹ لی لوگ باگ بھی اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی ہم نے چارپائی ہٹا کر مٹی راکھ کریدی اور مٹی کا گولا اُٹھا کر جھونپڑے میں پہنچ گئے۔ کپڑے کی پٹیاں خود بخود راکھ کی صورت اُتر رہی تھیں۔ مرغے کی ہڈیوں کی راکھ سے ایک کھنگر سا نمودار ہوا۔ سیاہ رنگت مٹی کوئلوں سے اَٹا ہوا۔ میں عالمِ محویت میں کبھی چاچا کبھی اس پتھر سے کھنگر کو دیکھ رہا تھا جسے ہماری محنت شوق اور توقع کے مطابق سونا ہونا چاہئے تھا۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا پوچھ ہی بیٹھا۔

"چاچا! سونا کدھر ہے......؟"

چاچا نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا بولا۔

"یار کاکا! ایک تو تم بڑے بے صبرے ہو...... جسے تم دیکھنا چاہتے ہو اِسے میں بھی تلاش کر رہا ہوں۔ یہ دیکھو؟"

چھری کی نوک سے کھرچتے ہوئے وہ دکھانے لگا سنہری سونا چمک رہا تھا۔ میری تو باچھیں کھل اُٹھیں۔ چاچا نے پاؤ بھر ڈھیلے کو کھرچنا اور رگڑنا شروع کر دیا۔ جھاڑ پھونک صفائی کے بعد ایک بڑی سی کٹھالی میں ڈال کر [illegible] کوئلوں کو دہکا رہا تھا۔ پھر چاچا نے قفل بند الماری سے تیزابوں کی بوتلیں اور پتا نہیں کیا کچھ نکالا چھوٹی بڑی پتھریلی کٹھالیاں بھی تھیں۔ بڑے انہماک اور لگن سے وہ ایک ایک چیز ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ میں بار بار دھوئیں سے اَٹی ہوئی آنکھوں سے آگ پہ چڑھی ہوئی کٹھالی کے اندر جھانک رہا تھا۔ وہ کالا سیاہ پتھر کا پتھر جس پہ شاید آگ کوئی اثر نہیں دکھا رہی تھی۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا۔

"چاچا! یہ تو ویسے کا ویسا ہے...... سونا......؟"

مجھے ایک بار پھر چاچا کی گھور کا سامنا کرنا پڑا اور ڈانٹ بھی پڑی۔

"کاکا! یہ اپنے مخصوص ٹمپریچر پہ پگھلے گا۔ تم ایسا کرو گھر جا کر سو جاؤ۔ صبح آنا تب دودھ کا دودھ پانی کا پانی تمہارے سامنے آ جائے گا...... ابھی یہ کہیں جا کر پگھلے گا پھر میل کچیل کٹ ہو گی۔ پھر اسے تیزاب دیئے جائیں گے۔ بڑی ناگوار بدبو ہو گی تم بیزار اگر نہ ہوئے تو بیمار ضرور پڑ جاؤ گے...... جاؤ شاباش!"

چاچا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ تو منحوس اُلوؤں کا کام دکھائی دیا دُنیا سے علیحدہ ہو کر اس کے پیچھے لگ جاؤ۔ اِدھر گھر والوں کا ڈر بھی تھا کہ اگر والد صاحب کو خبر ہو گئی تو وہ مجھے بھی مرغا بنا کر صحن میں گاڑ دیں گے۔ وہ چاچا کو ان ہی حرکتوں کی وجہ سے سخت ناپسند کرتے تھے اور اِدھر یہ سارا کچھ اُن کی بے خبری میں

ہو رہا تھا۔۔۔ میں ناچار اُٹھ آیا۔ ماں جی نے میرا اوپر کوٹھے پہ سونا بند کر دیا ہوا تھا پھر بھی میں موقع بے موقع اوپر جا کر تاک جھانک کر لیتا تھا۔

اگلی صبح میں پھر وہیں دھرا ہوا تھا۔ چاچا کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں' شب بھر کا رت جگا اس کے چہرے پہ عیاں تھا۔ عجیب ناگواری بُو...... کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ ناک پہ ہاتھ رکھے میں اندر پہنچ گیا۔ صاف شفاف چمکتے ہوئے سونے کے ٹکڑے میرے سامنے موجود تھے۔ میں ہاتھ بڑھا کر گرم گرم ٹکڑوں کو پکڑ کر دیکھنے لگا۔ چاچا خاموش...... اس کا لمبوترا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

''چاچا! مبارک ہو......''میں نے سونے کے ٹکڑوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''کاکا! ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے......''

''کیا مطلب؟...... سونا تو بن گیا ہے اصلی سونا...... یہ ایک آنچ کی کسر کیا ہے؟''

میں نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کاکا یار! تم نے کبھی اصلی سونا دیکھا ہے؟''

''ہاں دیکھا ہے...... بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''پتر! اصلی سونا وزن رنگ اور خواص میں پورا اور مکمل ہوتا ہے۔ یہاں رنگ تو آ گیا ہے' وزن اور خواص پورے نہیں ہیں۔''

میں شک میں پڑ گیا کہ چاچا مجھے ٹال رہا ہے' خود ہی سارا سونا ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ ہمت کر کے کہا۔

''چاچا! یہ وزن والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی......؟''

''مجھے معلوم ہے کہ یہ باریک بات تم نہیں سمجھو گے...... ایسا سونا تو میں کئی بار بنا چکا ہوں۔ یقین کرو یہ پیتل کی قیمت کا بھی نہیں۔ تم چاہو تو یہ سارا لے جاؤ......''

''چاچا! اتنی محنت اور خرچہ......؟''میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو سب کچھ ہے...... پتر! شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ اگر اتنی آسانی سے سونا بن جائے تو پھر اس کے زیور نہیں' چھٹے اور برتن بننے لگیں...... خیر' تمہاری چاچی کے مرنے کی وجہ سے کہیں چُوک ہو گئی ہے۔ تم کہیں سے کالا مرغ تلاش......''

چاچا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اس منحوس جھونپڑے کی دہلیز پار کر چکا تھا...... لعنت ہے...... چاچا سے میری پکّی کٹی ہو چکی تھی۔ کوئی شرافت ہے؟ میں نے کیسے کیسے ارمان پال رکھے تھے۔

کیا کیا پروگرام تھے اور کتنا اُدھار اس سونے کی اُمید پہ لے کر ہضم کر چکا تھا۔ اب میں اپنی نظر میں گر چکا تھا کہ خوامخواہ پیتل نما سونے کی اُمید پہ مجھ سے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوئیں۔ چاچا بھی جان گیا کہ میں اس سے پکا پکا ناراض ہو چکا ہوں۔

● چاچی' کوزہ مصری ہری الا ئچی......!

بہت سے دن آگے سرک گئے' سکول کی تعطیلات پہ میں اپنی بڑی آپا کے پاس ڈسکہ چلا گیا' مہینہ بھر اُدھر گزار کر آیا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ چاچا نے نواں شہر جموں سے ایک ڈوگری عورت کو مسلمان کر کے نکاح کر لیا تھا۔ میرے لئے یہ واقعی ایک حیران کن خبر تھی' اس بڑھاپے میں چاچا کو کیا سُوجھی؟...... شاید وہ بھی اپنی جگہ صحیح تھا۔ اولاد تو کوئی تھی نہیں جو اس کی خبرگیری کرتی۔ پھر اس کے شوق شغل بھی ایسے کہ کوئی قریب نہ پھٹکے۔ ان حالات میں کوئی نہ کوئی تو اسے چاہیے تھی جو اس کا مُردہ سنبھالتی...... میں نے اب اس کے متعلق سوچنا اور جھانکنا بھی چھوڑ رکھا ہوا تھا مگر یہ خبر سُن کر میرے اندر کُھد بُھد سی پیدا ہوئی کہ دیکھوں تو سہی چاچے نے ہماری چاچی بنا کر لایا ہے...... میں اوپر چلا گیا' دیوار کی جھریوں سے اُدھر تاک جھانک کی مگر وہ چاچا' نہ چاچی۔ دونوں کہیں دکھائی نہ دیے۔ ایک آدھ دن مزید گزر گیا۔ ایک صبح ماں جی اوپر کوٹھے پہ کریلے دھوپ میں رکھنے آئیں تو میں نے ماں جی سے ٹوہ لینے کی خاطر پوچھا۔

"ہماری چاچی کیسی ہے......؟"

"کاکا! میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ تمہارے نکمے چاچے نے ساری زندگی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا' بس اَلھڑ بلھڑ باوا ہی بنا رہا۔ اچھا ہوا اس مرنے والی نیک بخت کا پلّہ پاک ہوا' اس کلموہے نے اسے رَول کر رکھ دیا ہوا تھا۔ اب تمہارا بے مہارا اُونٹ چاچا پہاڑ تلے آیا ہے' کسی بلونگڑے کی طرح اس کے آگے بچھا رہتا ہے......"

"ماں جی! چاچی کیا بہت خوبصورت ہے؟"

"وہ تو پریوں سے زیادہ خوبصورت ہے' بڑی نیک اور اللہ والی ہے۔ دیکھ لینا' گگڑ کو کیسا سیدھا کرتی ہے...... ہندو برہمنی تھی' نواں شہر والے سائیں نیاز محمد کی ماننے والی۔ رَبّ نے ایسی آنکھ کھولی کہ مسلمان ہو گئی' وہیں سائیں جی کے ڈیرے پڑی اللہ اللہ کرتی رہتی تھی۔ گگڑ بھی انہیں کا مرید ہے' نواں شہر گیا

تو سائیں سرکار سے دُعا کے لئے عرض گزاری اور اپنی بیوی کے مرنے کا بھی بتایا...... سائیں جی نے دُعا بھی کردی اور وہیں نکاح بھی پڑھا دیا۔ اب دیکھ لینا' یہ گگز سب خراب دھندے چھوڑ کر پکا حاجی نمازی بن جائے گا......"

"ماں جی!...... اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن چاچا گگز کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

"کاکا! ایسے نہ بول۔ رَبّ سوہنا جسے چاہے' جب چاہے ہدایت دے دے۔ اس کو تو سائیں سرکار نے یہ بھی بشارت دی ہے کہ رزقِ حلال کما' اللہ کی بندگی کر...... اپنی بیوی کو خوش رکھ' اسی کے بطن سے تیری نسل چلے گی۔"...... مَیں ماں جی کی باتیں سُن کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی' جی میں آیا کہ ابھی چاچا کے پاس پہنچ کر اس سے صُلح کرلوں' نئی چاچی کو دیکھوں۔

"ماں جی! مَیں ذرا چاچی کو دیکھ آؤں...... آپ نے اس کی اتنی تعریف کی ہے۔ دل چاہتا ہے' دیکھوں کہ وہ کون سی چاچی ہے جو چاچا گگز جیسے ٹیڑھے انسان کو سیدھا کر سکتی ہے۔"

"وے اتنا اتاولا نہ ہو...... آج شام ہم نے تمہاری نئی چاچی کی دعوت کی ہے' وہ یہیں آ جائے گی' جی بھر کے دیکھ لینا لیکن زیادہ چھیڑ چھاڑ مت کرنا۔"

مغرب [illegible] چاچا [illegible] ہاں پہنچے [illegible] چاچی [illegible] ساتھ تھی۔ چاچا کے پیچھے چاچی پہ جب نگاہ پڑی تو مَیں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ چاچی کا قد ایسا تھا کہ اسے دُنیا کی کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی تھی' نہ تو بونا قد کہا جا سکتا تھا اور نہ سرو قامت' ایک لمحے کے لئے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاچی کے پاؤں پاتال میں گڑے ہوں اور سر کہیں اوپر بادلوں اور فضاؤں کو چیرتا ہوا ساتویں آسمان پہ جا لگا ہو۔ دوسرے لمحے پھر وہ یوں دِکھائی دی جیسے شمال جنوب کو اپنے ہاتھوں بازوؤں سے علیحدہ کئے کھڑی ہو' پوری دُنیا لمبائی چوڑائی اور اُونچائی میں اس کے وجود سے بھری ہوئی ہو اور جسم' تو وہ بھی کچھ ایسا کہ اسے آسان اور عام لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے' جیسے اس کا پیکر گلیشئر کے کسی شفاف سے ٹکڑے سے تراشا ہوا ہو۔ دیکھو تو آر پار ہوتے ہوئے نگاہیں جم سی جائیں' ساتھ جڑے لمحے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کا تمازت تو زسراپا جیسے کسی آتش فشاں کے گرم گرم لاوے کے آتشیں کرسٹل سے ابھی ابھی ڈھلا ہو۔ چاند سا روشن چہرہ' عجیب سا اُبھرتا ڈوبتا' سیماب کی مانند سرسراتا ہوا کمیں سور نگا۔ چیچک کے سُنہری داغ' اتنے گہرے کہ نہ ہوتے تو شاید چہرے پہ چندرما کی یہ چم چم نہ ہوتی۔ سیاہ کالے لمبے بال' ایک آنکھ گول اور دوسری قدرے لمبی جسے عام آنکھ رکھنے والا محسوس نہیں کر سکتا۔ اِک عجیب سی شخصیت تھی جیسے وہ عورت نہ ہو' کوئی ابھرا ہوا اِک طاقتور مقناطیس ہو۔ دیکھنے والا نگاہیں ہٹانا بھی چاہے تو ہٹا نہ سکے۔ عام انسانوں سے

ہٹ کر یقیناً اس میں کوئی خاص بات تھی جو مقابل کو مسحور کر دیتی تھی...... اس سحر سے نکل کر چاچا کی جانب دیکھا' تو وہ بھی اک عجیب سی شے دکھائی دیا۔ سر پہ نماز والی ٹوپی' شانے پہ تولیہ' مسکینوں کی سی صورت' چہرے پہ بڑا گہرا انکسار اور عاجزی جو چندہ مانگنے والوں کے چہروں پہ ہوتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری ہلکی سی ہنسی کھسک گئی۔ چاچا میری جانب اور میں اسے دیکھ رہا تھا...... جب وہ دونوں چارپائی پہ بیٹھ گئے تو چاچا نے آنکھ کے اشارے سے میری توجہ چاچی کی جانب مبذول کروائی' شاید اس کا مطلب یہ پوچھنا تھا کہ کیسی ہے تمہاری چاچی؟...... تھوڑی دیر بعد چاچا وہاں سے اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا' موقع پاتے ہی میرے کانوں کے پاس ہونٹ لا کر ہولے سے کہنے لگا۔

''یار' کاکا! گولی مار سونے وَونے اور ناراضی کو...... پھر سے دوستی پکی۔''

چاچی میری جانب پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر میں چاچی کی طرف دیکھنے سے اجتناب برت رہا تھا۔ شاید میری ظاہری آنکھ اس کی پُراسرار سحر انگیز شخصیت کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی' لیکن میرے باطنی وجود کی اربوں کھربوں آنکھوں کا محور و مرکز وہی تھی۔ جیسے صدیوں پہلے سے ہم اک دُوجے کو جانتے ہوں۔ ہماری ایک نہیں' کئی ایک قدریں مشترک ہوں۔ ہم دونوں کا کچھ سانجھا ہو۔ چاچی کی جانب سے توجہ ہٹانے کی غرض سے میں نے یہی چاچا سے سوال کر دیا۔

''چاچا! شادی سے پہلے تم نے چاچی کی آنکھیں دیکھی تھیں؟''

''یار! آنکھیں تو ایک طرف' میں نے تو تمہاری چاچی کو بھی نہیں دیکھا تھا...... بس مُرشد پاک کا حکم تھا' سر جھکا کر حکم کی تعمیل کی اور شادی ہو گئی۔''

میں نے چاچی کے صدقے چاچا سے اپنی کُٹی ختم کر دی۔ میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ چاچی باتیں تو میری امّی سے کر رہی ہے۔ لیکن بہانے بہانے چور نظروں سے مجھے بھی دیکھتی جا رہی ہے۔ ایک آدھ بار میری نظریں بھی اُس کی فسوں بار نظروں سے ٹکراتے بچیں' ہر بار میرا دل بلّیوں اُچھل کر حلق میں اٹکنے آ رہا تھا۔ بہرحال' مجھے چاچی اچھی لگی تھی...... کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو ابا جی اور چاچا حُقّہ لے کر پرے بیٹھ گئے' امّی برتن سمیٹنے میں لگ گئیں۔ چاچی فوراً موقع محل سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھی اور میرا دل تھا کہ حلق میں آ کر اٹک گیا۔ میں بھونچکا سا اُٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ چاچی نے موتیے کے پھول سا مومی ہاتھ میرے شانے پہ رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں قلاقند سے بنی ہوئی عورت کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔ دودھ کھوئے' رُوح کیوڑہ' کوزہ مصری اور زعفران کی ملی جُلی خوشبو میری رُوح میں اُترنے لگی۔ مٹھاس' مہک اور ایک دل آویز سی لذّت کے احساس سے میرا

وجود سرشار ہو گیا۔ اب اس نے اپنی مکھن سے پولے پولے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں واضح طور پہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے غیر مرئی سی سرسراتی لہریں میرے جسم میں سرایت کر رہی ہیں۔

● کاگا' کیا کیا کیوں داراگا......!

اچانک چاچی نے دُلار بھرے انداز میں میرا مُنہ چُوما' پیار کیا۔ کہیں دُور سے آتی ہوئی مترنم آواز اُبھری۔

"کاگا! ہم سے بات نہیں کرو گے......؟"

میں بوکھلایا گھبرایا ہوا' پسینے سے بھیگا ہوا' سچ سے سنا ہی نہیں تھا کہ اُس نے مجھے "کاکا" کہا ہے یا "کاگا"...... میں ہاتھ چھڑا کر اُٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس نے مجھے پکڑا' اپنی گود میں بٹھا کر بازوؤں میں بھر لیا۔ چٹاخ' چٹاخ زوردار دو تین بوسے داغ دیئے' بڑی دلربائی سے بولی۔

"کاگا! اب بھی اگر ہم سے بات نہیں کرو گے تو ہم روٹھتی رہوں گی۔"

میں ہکلایا بولنا چاہا مگر میری تو بولتی ہی بند تھی۔ ویسے میں کوئی ایسا بھی چھوٹا نہ تھا کہ وہ مجھے یوں بچے کی مانند اُچک کر گود میں بٹھا لیتی لیکن اُس کا والہانہ انداز ہی ایسا تھا جیسے میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں۔ گھر اور باہر کہتے تو مجھے سب کاکا ہی تھے مگر میں اپنی عمر' علم اور زمانے کے حساب سے بہت آگے کی سوچ رکھتا تھا۔ آگ کو صرف دیکھ اور محسوس کر کے ہی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ہاتھ' دامن جلا کر جاننے کا جنون رکھتا تھا۔ طوطوں کے بچے اُڑانے کے چکر میں کئی بار طوطوں سے اُنگلیاں کٹوائیں' بھِڑوں کے چھتے توڑتے ہوئے ناک منہ آنکھیں ڈنگوں سے برابر کرائے' امرودوں جامنوں آموں کے درختوں سے گر کر ہڈیاں تڑوائیں۔ شیخ مولا بخش کے تالاب میں دو دفعہ ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ جن چڑیلیں دیکھنے' قابو کرنے کے جنون میں قبرستانوں میں راتیں گزاریں۔ اُلو کی چونچ' ہُد ہُد کے پَر اور ہُما کی تلاش میں جنگلوں بیلوں میں خاک چھانی۔ اسمِ اعظم سیکھنے کے لئے حافظ صاحب اور شاہ صاحب کی معیت میں کئی کئی ہفتے جَو' شہد اور پانی کے گھونٹ پہ روزے رکھ کر وظیفے کئے' چلّے کاٹے' اور تو اور چاچا ٹکڑ سے قریب قریب کیمیا گری بھی سیکھ چکا ہوتا اگر پرانی چاچی نہ مرتی۔ ایسے خرانٹ' ہر فن مولا' چاروں کھونٹ کے کھوچل اور رنگ باز بظاہر بچے کو اگر کوئی دودھ ملائی سے بنی ہوئی عورت گود بٹھائے اور چوما چاٹی کرے تو دونوں کا اللہ حافظ ہے......

مجھے مسلسل خاموش اور سراسیمہ سا محسوس کرتے ہوئے اُس نے حکمتِ عملی سے میرا مُنہ کھلوانے کی بڑی

خوبصورت کوشش کی' کہنے لگی۔

''کلمہ شریف آتا ہے......؟''

بسم اللہ شریف پڑھ کر میں نے چھ کے چھ کلمے پوری صحت سے سُنا دیئے۔ پھر اس نے مجھ سے دُعائے قنوت' آیتہ الکرسی سُنی۔ میں تو اب شروع ہو چکا تھا' سامنے مودّب کھڑے ہو کر سورۃ یٰسین بھی بغیر کسی ہلکی غلطی یا لغزش سُنا دی۔ سورۃ رحمٰن شروع کرنے سے پہلے ہی اُس نے مجھے لپک کر پھر گود میں بھر لیا اور میری اَمّی سے صاف کہہ دیا کہ بھابی جی' یہ آج سے میرا مُنہ بولا بیٹا ہے۔

اس دن کی آنے والی رات میرے لئے اک عجائبات کی بارات ہی تو تھی' چاچی تو جیسے میرے رُوم رُوم کا قبلہ سیدھا کر گئی تھی۔ کُھلی آنکھیں وہ سامنے' بند آنکھوں میں وہ موجود۔ ہر پہلو' ہر کروٹ وہی مسکتی ہوئی' مسکان' وہی کانسی کی گھنٹیوں سا مترنم لہجہ' گداز سے گداز ہاتھوں کا گداز' بادلوں میں تحلیل ہوتا ہوا دُودھیا نُورانی ہالہ لہرایا۔ رُوح کے اندر دُور تک جھانکتی ہوئی آنکھیں' یخ بستہ برف زاروں میں کافوری دُھوئیں سے اُبھرتے ڈوبتے عجیب و غریب معبد۔ اُونچی نیچی گھاٹیوں کے اندر ڈوبتی ہوئی اندھیری گپھائیں' بادلوں سے اُترتے ہوئے معلق جھولے اور [illegible] جلترنگ کے سایوں میں اُودے' بنفشی' ہرے' پیلے [illegible] یا جانے کیا کیا کچھ۔ عجیب عجیب [illegible] دیکھتا رہا۔ جسم تھکاوٹ اور بے آرامی سے چُور چُور تھا' آنکھوں کے جھروکے تخیلات اور انبساط کی پُروائی سے کبھی کُھلے کبھی بند' مگر دماغ اور احساس کے تمام سلسلے جیسے جشنِ نوروز منا رہے ہوں۔ ایسی ہی چکاچوند میں صبح کاذب کے آثار ہویدا ہوئے تو میں اُٹھ بیٹھا' کوٹھے پہ دیوار کے ساتھ ساتھ کافی دیر ٹہلتا رہا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایسے ہی سوراخ سے چاچا گکڑ کے گھر کی جانب جھانکا تو صحن میں تخت پوش پہ سفید لباس میں ملبوس چاچی شاید نوافل پڑھ رہی تھی۔ اتنی دور سے وہ مجھے کوئی غیر مرئی آفاقی مخلوق دکھائی دی جو صبح دَم زمین پہ اتر آئی ہو۔ میری جلتی ہوئی آنکھوں پہ جیسے کسی نے کافور کی ڈلی رکھ دی تھی' جسم جیسے جاگ پڑا اور تمام دُکھن دُور ہو گئی ہو...... الٰہی! یہ چاچی کیا چیز ہے' اُس نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میرے باطن کے اندر کوئی چیز اُسے پکار رہی ہے جیسے کوئی پُرانی شناسائی ہو' کہیں کوئی سانجھا یا کوئی باہمی ربط ہو۔ سوچتے سوچتے میرا ماتھا تپنے لگا...... ہلکی سی کھانسی کی آواز اُبھری' چاچا گکڑ اپنی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا' شاید اس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ دیوار کی دوسری جانب سے آہستہ سے بولا۔

''کاکا! صبح صبح کیا اِدھر دیکھ رہے ہو......؟''

''چاچی کو دیکھ رہا تھا' چاچا!'' میرے مُنہ سے بیساختگی سے نکل گیا۔

دیوار کے اوپر سے زراف کی طرح سر اٹھا کر رازدارانہ لہجے میں آہستہ سے بولا۔

"چاچی تمہیں اچھی لگتی ہے......؟"

"ہاں چاچا! بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن چاچا' اس کی آنکھیں......؟"

وہ میری آنکھوں میں اپنی بٹیرے جیسی آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"کاکا' جی! میں نے ابھی تک اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا ہی نہیں...... وہ جب سے میرے پاس آئی ہے اسی سوچ میں ہوں کہ میں اُسے کس طرح سے شروع کروں' مجھے تو اُس کا کوئی اُلٹا سیدھا نظر نہیں آتا۔ قسم لے لو جو ابھی تک اسے چُھوا تک ہو' سوچتا ہوں کہ کہیں میلی نہ ہو جائے۔ بیوی کی نظر سے دیکھتا ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے کہ کہیں اُس کی توہین نہ ہو جائے......" وہ صبح کے تارے کو ٹھہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کاکا یار! میں کئی راتوں سے سویا تک نہیں...... جب دیکھو' تمہاری چاچی نمازیں پڑھتی رہتی ہے۔ فارغ ہوتی ہے تو قرآن شریف کھول کر بیٹھ جاتی ہے' وہاں سے اُٹھتی ہے تو ایک لمبی سی تسبیح سنبھال لیتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے کسی پیرنی یا مولویانی سے نکاح کر لیا ہے۔

میرے یار کاکا!" وہ روہانسو ہو کر کہنے لگا۔ "تمہاری چاچی نے میرا سارا سامان' جو تا بنانے کے نسخے اور پائلیں [illegible] تو زیور [illegible] بنا دیے [illegible] بھی تو باقی نہیں بچے۔ تم تو جانتے ہو کہ سونے کی تیاری میں بس ایک آدھ آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ کل تو میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مرشد سرکار کے پاس جا کر اُسے واپس کر آؤں......" وہ میرا بازو دبا کر بکری کی طرح ممیاتے ہوئے فریاد کرنے لگا۔ "یار کاکا! مجھے تو اسے بیوی سمجھتے یا کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

میری ہنسی چھوٹ گئی' ہونٹ دبا کر بڑی مشکل سے ضبط کی۔ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نیچے سے چاچی اوپر چڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ چاچی اُوپر کیا چڑھ رہی تھی' ایک قیامت تھی جو بامِ بالا کی جانب مراجعت کر رہی تھی۔ کسی زہرہ نگاہ' آئینہ بدن کا وفورِ شوقِ دید میں کوٹھے پہ چڑھنا اور کسی جوانِ رعنا کا جرمِ اُلفت و غیرت میں سُولی پہ چڑھنا اپنے اپنے مقام پہ بڑا مزہ دیتے ہیں۔ چاچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی' ہم دونوں پاگلوں کے بس میں ہوتا تو ہم دوسری جانب کسی باؤلی میں اُتر جاتے۔ میں پس دیوار تھا' اوپر پہنچ کر چاچی نے ایڑیاں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"السلام علیکم! یہ صبح صبح چاچے' بھتیجے میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" پھر چاچا سے مخاطب ہوئی۔ "آپ مسجد جا کر نماز پڑھیں' اذان ہونے والی ہے......" میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کاکا! تم ادھر آؤ' نہا دھو کر وضو کرو اور آج سے تم میرے ساتھ نماز پڑھا کرو گے......"

مجھے یاد پڑا کہ چاچی نے ہمارے گھر میں بھی مجھے ''کاکا'' کہنے کی بجائے ''کاگا'' کہا تھا۔ چاچی مجھے کاکا کی بجائے ''کاگا'' کیوں کہتی ہے' میں کچھ سمجھ نہ سکا تھا...... نماز تلاوت کے دوران بھی چاچی مجھے کاگا ہی کہہ کر مخاطب ہوتی رہی۔ چاچی کی پہلے اور کون سی بات تھی جو میری سمجھ میں آئی تھی کہ اب کاگا والی بات بھی سمجھ میں آتی۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی' میں صرف اتنی بات جانتا تھا کہ کاگا' ہندی کا لفظ ہے اور اس کے معنی کوّے کے ہیں' فارغ ہوئے تو چاچی مجھے حسبِ حال گم صم پا کر خود ہی گویا ہوئی۔

''کاگا! میں تمہارے لئے چُورما بناتی ہوں۔ آج اور آئندہ تم ناشتا یہیں میرے ساتھ کیا کرنا......''

''چُورما......'' میں نے زیرِ لب دُہرایا اور پوچھا۔ ''چاچی! یہ چُورما کیسا ہوتا ہے؟''

چاچی مجھے چُومتے ہوئے خوش خوش کہنے لگی۔ ''کاکا! ایک چُوری ہوتی ہے۔ جو سوہنی اپنے مہینوال اور ہیر اپنے رانجھن کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنا کر لے جاتی تھی۔ اس چُوری میں گھی شکر اور باجرے کی روٹی ہوتی ہے اور چورما میں گھی' ملائی' شکر' تل' چھوہارے' پستے' بادام' چار مغز' سونف' پھل مکھانے اور جو کا آٹا ہوتا ہے۔'' میں ٹکر ٹکر چاچی کے شہابی چہرے اور پُر اسرار آنکھوں کی بصری تلاوت میں مگن تھا' [illegible]...... اور ہاں یہ چورما میں تمہارے لئے اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی۔''

جواب میں مجھے کوئی اور بات تو نہ سُوجھی' یونہی بات چلانے کی غرض سے پوچھ لیا۔

''چاچی! تم مجھے کاکا کیوں نہیں کہتیں' کاگا کیوں کہتی ہو...... کیا تمہیں کاکا کہنا اچھا نہیں لگتا؟''

وہ مسکرائی' جیسے کپاس کا شگوفہ چٹکا ہو۔ دھیرے سے بولی۔

''تم سب کے لئے کاکا ہو مگر تم میرے لئے کاگا ہو۔''

''میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا......'' میں یونہی اُسے ہٹ بٹ دیکھنے لگا۔

''اسی لئے تو ناشتے میں تمہیں چُورما شروع کروا رہی ہوں کہ کاگا' چُورما بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اب ہر روز صبح ناشتے میں چورما کھاؤ گے تو پھر دھیرے دھیرے میری سب باتیں خود بخود ہی سمجھ جایا کرو گے۔''

''میری اچھی' چاچی! ابھی صرف کاگا والی بات سمجھا دو' باقی اور باتیں میں چورما کھا کر سمجھ لیا کروں گا۔'' میں نے خوشامد کی۔

چاچی نے آنکھیں بند کر لیں' صرف گول آنکھ تھوڑی سی نیم وا تھی۔ جیسے کنویں سے بول رہی ہو'

بھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... ہر انسان جو دُنیا میں ہے وہ کسی نہ کسی چوپائے' دوپائے' رینگنے والے' تیرنے والے' اُڑنے والے جانور کی جبلّت پہ پیدا ہوا۔ جہاں یہ انسان اشرف المخلوقات ہے وہیں اپنی مخصوص حیوانی جبلّت کی بناء پہ افضل اور اسفل رُجحانات کا حامل بھی ہے۔ انسان تمام عمر اپنے اسی جبلّی خواص کے مطابق عمل پیرا رہنے پہ مجبور ہے۔ اس کی یہ اچھی بُری' سعد نحس' جبلّی خصلت اس کی سوچ بچار' فیصلوں اور روزمرّہ کے دیگر عوامل پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ کوئی شیر ہے تو کوئی محض گیدڑ' کوئی لومڑ کی خصلت رکھتا ہے تو کوئی ہرن کی مانند بھولا بھالا ہے۔ کوئی شکرا تو کوئی کبوتر ہے اور بالکل اسی طرح کوئی مچھلی' مینڈک' گدھ' اُلو اور کوئی بکری کی طرح بزدل......"

میں تو کوّے یعنی "کاگا" میں پھنسا ہوا تھا۔ میں اپنے اندر ہی اندر اپنی کوئی کوّے کی عادت خصلت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے چاچی مجھے کاگا کہتی تھی۔ چاچی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں بول پڑا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں کوّا ہوں؟ ...... کوّا تو [illegible] ڈھیٹ [illegible] اور نڈیدہ ہوتا ہے۔ چاچی! ذرا غور سے دیکھو۔ [illegible] مجھ میں کوئی ایسی چیز نظر آئی۔ یہ تو میرے ساتھ بہت زیادتی ہے" ...... میں نے روٹھتے ہوئے مُنہ سا بنا لیا۔

"کاگا! میں [illegible] تمہیں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی' یہ سب چُورے [illegible] کے بعد شروع ہونا تھا۔ تم نے خود ہی مجھے بتانے پہ مجبور کیا اور اب [illegible] کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں؟"

یہ سُن کر میں بیٹھ گیا لیکن مُنہ بسورے رہا۔ چاچی اب قدرے سنجیدہ ہو رہی تھی' کہنے لگی۔

"کوّے...... اور کاگا میں بھی زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوّا گُھ مُوت' ماس اناج' گندہ مندہ' جھوٹے پیٹ میں اُتار لیتا ہے۔ یہی کوّا نڈیدہ' ڈھیٹ اور چکر باز ہوتا ہے ...... کاگا تو پی کی خبر لاتا ہے۔ یہ ازل سے اَبد تک کے تار ہلاتا ہے' جانداروں میں سب سے لمبی عمر پاتا ہے۔ اس نے ہابیل' قابیل والے قتل کے معاملہ میں قبر کُشائی کا طریقہ سمجھایا ...... نوح علیہ السلام کی رہبری کی' خضر علیہ السلام کی خبر لی۔ پارس رگیدا' آبِ حیات چکھا۔ کوہ قاف پہ اُڑان بھری' سیف الملوک میں ڈبکیاں لگائیں۔ تن مَن کالا' پہ ملنگ درویش منافق نہیں ہوتا ...... میرے بابا نے مجھے نصیحت کی کہ کاگا' کبوتر اور کتا جہاں ملیں' تمہیں جہاں بھی پاؤ' انہیں تکریم دو۔ اگر ان کی صرف ایک ایک خوبی خصلت بھی اپنا لو تو تمہارے پاس سنگِ پارس' وفا حیا' اس کی رضا' ادا صبرِ صادق' توکل تقویٰ کامل' نگاہ کیمیا......"

میں گستاخی کر کے درمیان میں بول پڑا۔

''چاچی! میں یہ اوکھی اوکھی باتیں نہیں سمجھ سکتا...... میں جا رہا ہوں' میرا سر درد کرنے لگا ہے۔''

چاچی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پہ رکھ دیا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے درد کافور ہو گیا ہو اُن کی کہی ہوئی اَدق اَدق باتیں اپنے آسان ترین مفہوم کے ساتھ میری سمجھ میں آ رہی ہوں۔

''کاگا! آئندہ ایسا مت کہنا' یہ بے اَدبی ہے۔ ہم بابا جی کے سامنے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔''

''یہ بابا کون ہوتے ہیں؟'' میں نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔

''پہلے ''کاگا'' کو تو سمجھ لو۔ پھر خود بخود ہی پتہ چل جائے گا کہ بابا' مُرشد' پیر یا اُستاد کون ہوتے ہیں...... ہاں' تو میں بتا رہی تھی کہ ہر انسان کسی نہ کسی حیوانی جبلّت پہ ہوتا ہے۔ جو نظر والے ہیں' مقابل کو دیکھ کر اس کے ''جانور'' کو جان جاتے ہیں۔ وہ پھر اسی نسبت سے اس سے مذاکرات یا معاملات کرتے ہیں۔'' وہ سمجھانے کے انداز کو آسان تر کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ''اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے سامنے ایک سانپ یا بچھو بیٹھا ہوا ہے تو تم یقیناً اس کے آزار سے خود کو محفوظ بناؤ گے......''

• بابا' [illegible]

''کاگا! ٹھیک دو دن اور ایک پہر کم چالیس برس پیچھے جب میں سات برس کی چھوکری تھی' اپنے ماتا پتا کے ساتھ دُرگا مائی کے میلے پہ آئی تھی۔ بھرت ناگ' اننت ناگ کے پاس ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ بس ساٹھ ستر گھر' چھ سات مسلمانوں اور باقی ہم ہندوؤں کے تھے۔ ہم اُونچی جات کے پنڈت براہمن...... میرے پتا جی بستی کے مُکھیا تھے اور مندر کے پنڈت پروہت بھی...... جموں سے اٹھارہ کوس پچھم کی جانب پرم پوت' ایک مسلمان فقیر کا اَستھان تھا جو ہماری راہ میں پڑاؤ تھا۔ ہمارا پریوار ایک بیل گاڑی پہ سوار تھا۔ پہاڑی علاقوں میں شام اُترتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے' سردی یا بارش ہو جائے تو دُھند بھی گہری چادر تان لیتی ہے اور ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا۔ آڑے ٹیڑھے' اُونچے نیچے پہاڑی راستوں پہ سفر جاری رکھنا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہو جاتا ہے۔ میں تو میّا کی گود میں تو شک میں لپٹی سو رہی تھی۔ اچانک اندھیرے میں بیل کسی چیز کو دیکھ کر بدک گیا' سرپٹ جو بھاگا تو آگے موڑ پہ سیدھا گہری کھائی میں گاڑی سمیت گر گیا۔ ماتا پتا جی اور گاڑی والا بیل سمیت سب جل بھسم ہوئے' مٹی کے تیل کی لالٹین جو گاڑی کے گھاس پھوس پہ اُلٹ گئی تھی۔ صبح دن چڑھے جب سڑک پہ آمد و رفت شروع ہوئی۔ تو لوگوں کو آدھا جلا ہوا بیل

اور تین منشوں کی جلی ہوئی ہڈیاں ملیں۔ نہ کسی کو خبر کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں سے آئے اور کدھر جا رہے تھے؟ جائے وقوع سے مشکل تین چار فرلانگ پرے ایک فقیر نے اپنے بالکے کو حکم دیا کہ فوراً ساڑی باڑی کے موڑ پہ جاؤ وہاں چیڑ کے جھاڑ میں ایک کبوتری اُلجھی پڑی ہے، اسے بحفاظت اُتار لاؤ......"

چاچی یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگئی...... میں ایک جامد و ساکت پتلے کی طرح بغیر پلکیں جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ پورے واقعے کی فلم میرے سامنے چل رہی تھی بلکہ یہ تک محسوس ہوا کہ میں خود بھی اس بیل گاڑی میں سوار تھا، گرتے سمے جیسے میں خود بھی درخت کے جھاڑ میں اُلجھ گیا تھا۔ جلتے ہوئے بے بس زندہ انسان، ان کی آہ و بکا، بیل کا ڈکرانا، پتھروں سے سر پھوڑنا اور پھر ہڈیوں اور گاڑی کی لکڑیوں کی تڑاخ چٹاخ، جھاڑ جھنکاڑ کے جلنے کی آوازیں۔ دھواں سڑاند اور پھر خاموشی...... میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک سیاہ پوش، ننگے سر ننگے پاؤں، بے خوف و خطر آیا، درخت پہ چڑھ کر اس نے مجھے اُتارا۔ میں تکلیف سے رو رہا تھا کیونکہ میری بائیں آنکھ کے پاس کسی جھاڑی کا کانٹا گھسا ہوا تھا۔ مجھے وہ درویش بڑی حفاظت سے فقیر کے ڈیرے تک لایا۔ فقیر نے فوراً مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا، آنکھ سے کانٹا کھینچ نکالا، انگلی سے لعاب لگا کر میری آنکھ پہ لگایا اور دودھ پلا کر کبوتری پہ ڈال...... اچانک میری اُنگلی میری بائیں آنکھ کے گڑھے پہ چلی گئی۔ چاچی یہ دیکھ کر ہنس رہی اور ہنستی ہی گئی۔

"کاگا دیکھا، تم بھی تو وہاں تھے، تمہاری اسی آنکھ میں کانٹا گھسا تھا......"

آگے بڑھ کر چاچی نے میری زخمی آنکھ چوم لی، مجھے عجیب سی ٹھنڈک اور تسکین کا احساس ہوا۔ ایک دو شدید جھٹکے سے لگے جیسے آنکھ کے اندر کوئی ہلچل، گڑبڑ، کوئی حرکت سی ہو رہی ہے اور پھر ہلکا سا درد اُبھرا۔ میں نے گھبرا کر آنکھ پہ ہتھیلی رکھ دی۔ چاچی نے منہ سے لعاب لگا کر میری کنپٹی اور آنکھ کے کونوں پہ لگایا۔ دو چار لمحوں بعد میں نے ہولے سے آنکھ کھولی۔ میرے سامنے کبوتری اور چاچی دونوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بائیں میں کبوتری، دائیں میں چاچی۔ کبھی دونوں آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں۔

"چاچی! یہ کیا...... میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"ہاں، کاگا! تم ٹھیک دیکھ رہے ہو، میری کایا کا یہ بھی ایک روپ ہے۔ برکی اشرفی کبوتری!...... یہ وہاں تک بھی پرواز کر سکتی ہے جہاں یہ بھی اشرفی کی مانند کھرا چمکتا دکھائی پڑے۔"

"چاچی! کاگا تو وہاں تک پرواز نہیں کر سکتا نا......؟"

"کاگا...... پوچھو کہ کہاں تک پرواز نہیں کر سکتا۔ کاگا تو سیاہ پوش درویش ہوتا ہے۔ 'کیا' 'کیا' کی چنتا اسے ہر پل بے چین اور بے قرار رکھتی ہے جسے ہم "کاں' کاں" سمجھتے ہیں۔ وہ "کیا کیا" کیوں

کیوں" ہے۔ وہ ہر سے کھوجتا رہتا ہے۔ یہ موذنِ اوّل' اسے ازل اور اَبد کا گیان ملا۔ اسی نے الست' ہست اور مست کا فلسفہ سمجھایا۔ یہ چھین اور اُچک لیتا ہے' مانگتا نہیں۔ یہ گھر در کا قائل نہیں' یہ رنگ روپ کا چولا نہیں بدلتا۔ کُتا' کبوتر رنگ سنگ بدلے مگر کاگا کا راگا کبھی نہ بدلے۔ یہ زیرک درویش مرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے...... کُتا روڑی' کبوتر شکم اور کاگا گور گھورا......"

"وے کاکا......!"

امی کی آواز مجھے جیسے کوہ قاف سے واپس کھینچ لائی تھی۔ صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا' امی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بُلا رہی تھیں۔ چاچی نے آگے بڑھ کر سیڑھیوں پہ جا کر امی کو سلام کیا اور بتایا کہ کاگا نے نماز اور تسبیح میری ساتھ پڑھی ہے' کل سے انشاء اللہ قرآن پاک بھی پڑھا کرے گا اور ہاں' ناشتا تو یہ میرے ساتھ ہی کیا کرے گا۔ امی کو اور کیا چاہیے تھا' وہ تو یہی چاہتی تھیں کہ میں ایک نیک دیندار بچہ ہوں اور کسی طرح سے میری آوارگیاں' دوستیاں اور ناک میں دم کر دینے والی شرارتیں ختم ہوں۔ اس کے باوجود امی اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"بہن! اللہ آپ کو خوش رکھے' جزائے خیر دے۔ مگر ایک بات صاف صاف کہہ دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں' بعد میں مجھے کوئی الزام نہ دیجیے...... آپ ابھی اسے ٹھیک سے جانتی نہیں ہیں۔ یہ بڑا شرارتی' مکار اور حرفوں کا بنا ہوا شیطان ہے۔ اکلوتا بچہ ہے' ہمارے بے جا لاڈ پیار اور دُلار نے اس کا اور بھی بیڑا غرق کر دیا ہوا ہے۔ کچھ عرصے سے اسے چوری کی عادت بھی پڑ گئی ہوئی ہے۔ اسے زیادہ مُنہ نہ لگائیں...... آگے آپ کی مرضی۔ جیسا میرا فرض بنتا تھا۔"

چاچی نے بات ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا۔ "بھابی جی! اس عمر میں بچے ایسے ہی ہوتے ہیں......" وہ مجھے پچکارتے ہوئی بولی۔ "آپ بالکل فکر نہ کریں...... یہ بچہ تو بہت اچھا اور بلا کا ذہین ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے' علم سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ اسے اللہ اور میرے سپرد کر دیں۔ انشاء اللہ' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہاری زبان مبارک' بہن! اللہ کرے ایسا ہی ہو...... میں تو ہر وقت اللہ سے یہی فریاد کرتی رہتی ہوں' بڑھاپے میں دیا ہے تو بس تُو ہی اس کا نگہبان ہے' تُو ہی اسے اپنا نیک بندہ بنا دے۔ اسے اپنے ماں باپ اور خاندان کا نام روشن کرنے والا کر دے۔"

"آمین......!" کہہ کر امی اپنے سر پہ دوپٹہ دُرست کرتے ہوئے اِدھر اپنے صحن میں اُتر گئیں اور چاچی زبردستی مجھے اپنی کمر پہ لاد کر واپسی تخت دراز پہ آ گئیں۔ میں کسمسا کر سامنے بیٹھ گیا' نظریں جُھکا کر

بولا۔

"چاچی! تم نے امّی سے سُن لیا کہ میں کیا ہوں' کیسا ہوں...... اور چاچی! یہ تمہاری باتیں' ایسی میں نے کبھی کسی سے نہیں سُنیں۔ یہ کس طرح کی باتیں ہیں جنہیں سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ہی باتیں کر رہا ہوں۔ جیسے یہ ساری باتیں' یہ سب کچھ میرے اندر موجود ہوں...... چاچی! آپ کے پاس یہ سب کچھ کیسے آیا' کہاں سے ملا؟ عورتیں تو ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ میری امّی' میری دادی' نانی' ممانی' گلی محلے کی عورتیں۔ ہزاروں عورتوں کی میں نے باتیں سُنی ہیں۔ چغلیاں' بدگوئیاں' کوسنے' طعنے اور بیکار دُنیا بھر کی باتیں...... تمہاری ایسی من موہنی' سوہنی سوہنی' دل و دماغ میں خوشبو کی طرح مہکنے والی باتیں اس دُنیا سے پرے کسی اور جہان کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔"

چاچی دلفریب ملکوتی سی مسکراہٹ کے ساتھ' میری باتیں سُن رہی تھی۔ پھر پیار سے میرے پھولے ہوئے گال پہ چپت جماتے ہوئے کہا۔

"زیادہ کیا کیا' کیوں کیوں' کائیں کائیں نہ کر' کاکا......!"

چاچا [illegible] نے اندر داخل ہوتے ہی ایک [illegible] السلام علیکم [illegible]...... "تُوں فقیری تے دو پہریں دُھوئیں" چاچا جیسے نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ داڑھی کا خط بھی نکال لیا تھا۔ سر پہ سفید براق ٹوپی' صاف ستھرا لباس' شانے پہ ڈھلا ہوا پرنا' لب و لہجے اور چال ڈھال میں بھی اک نمایاں فرق ظاہر تھا۔ پاس بیٹھتے ہوئے چاچی کی نظر بچا کر مجھے ایک آنکھ نکائی' پھر شرارتی لہجے میں کہا۔

"کاکا! بڑے خوش قسمت ہو' چاچی تمہیں بہت چاہنے لگی ہے۔ جب سے تمہاری گھر سے ہو کر آئی ہے' تمہارے ہی کلمے پڑھتی رہتی ہے......" لفافہ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "لو تمہاری چاچی اور تمہارے لئے حلوہ پوری اور قتلمے کا ناشتا...... اور ہاں' کاکا یار......!" چاچا پتا نہیں اور کیا کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"چاچا! آئندہ تم مجھے "کاکا یار" نہیں کہو گے بلکہ بڑے احترام سے کاگا جی پکارو گے اور نہ مجھے کبھی آنکھ مارو گے' یہ بڑی نامناسب باتیں ہیں......"

چاچا دیدے پھاڑے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ بات اس کے پلّے نہیں پڑی تھی' سر جھٹکتے ہوئے بڑے کرب سے بولا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کاکا......؟"

"کاکا نہیں...... کاگا!" میں نے "کاگا" پہ پورا زور دیتے ہوئے تصحیح کی۔

چاچا نے مجھے طنز لگاتے ہوئے پوچھا۔ ’’بڑے میاں! یہ کاکے کی بجائے ’’کاگا‘‘ کیوں کہوں‘ ہمیشہ ہم سب تمہیں کاکا ہی کہتے چلے آئے ہیں...... ‘‘ پھر وہ اپنی چُندی چُندی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے بولا...... ’’اور بڑے بھائی! یہ احترام وحترام کا کیا چکر ہے اور یہ الزام کہ میں تمہیں آنکھ مارتا ہوں جبکہ میری بائیں آنکھ ویسے ہی پھڑ پھڑاتی رہتی ہے...... تم دو روز چاچی کی گود میں کیا بیٹھے کہ صاحبزادے کا دماغ ہی ساتویں آسمان پہ جا اٹکا؟‘‘ وہ پیار سے میرا کان اینٹھ کر پوچھنے لگا۔ ’’پہلے تم مجھے کاگا کا بتاؤ کہ یہ کیا ہے؟‘‘

’’چاچا! تمہیں ککڑ کا تو پتا ہے‘ کاگا کا پتا کیوں نہیں......؟‘‘

چاچا مجھے دُھول جمانے کے لئے آگے بڑھا تو میں وہاں سے اُڑنچھو ہو چکا تھا۔

چاچی تو اس گھر میں جیسے کسی پدمنی اور رُشنی کی چھایا لے کر آئی تھی۔ ایک آدھ مہینے میں تو ہاتھ پاؤں لگی مہندی بھی رنگ نہیں چھوڑتی۔ چاچی نے چاچا اور گھر کی ایسی کایا پلٹ دی تھی کہ ان گنت صدیوں کے پرانے طلسم سب ٹوٹ گئے تھے۔ کہاں پہلے اس گھر کی نو بیت سے ہمسائے ناک مُنہ پہ کپڑا پالا رکھتے تھے [illegible] اس گھر کا پکا ہوا تو کوئی فقیر تک نہیں اٹھاتا تھا۔ کہاں کہ مسان بجری بوتیوں کے دھوئیں آگ کے الاؤ جیسے قاریاں‘ حقے کی گڑگڑاہٹ نامرادیاں‘ محرومیاں‘ نحوستیں‘ غلاظتیں ایسی دُھلیں کہ گھر جیسے پوتر تا کا استھان بن گیا اور گھر والا جو سدا کا نیز حال نکلا تھا اور جو جھوٹا سچا سونا بناتے بناتے خود ہی پیتل تمارہ رہ گیا تھا اب چاچی کی جوتی کے صدقے کھرا پارے کا سونا بن چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ عورت چاہے تو سوئی کے ناکے سے گھر بنا لے اور چاہے تو اسی سوئی کے ناکے سے اسے اُجاڑ دے۔ چاچی‘ چاچے کے لئے ایسی بھاگوان ثابت ہوئی کہ اب محلّے‘ شہر‘ کچہری میں اسے معتبر سمجھا جانے لگا۔ محلّے بھر کی لڑکیاں بالیاں‘ بچے بچیاں‘ سگھڑاپا اور دین داری سیکھنے کے لئے یہاں آنے لگیں۔ چاچی کی دینداری‘ سمجھداری‘ عقل اور دِل میں کُھب جانے والی شخصیت وتہذیب کا شہرہ کسی کافوری قندیل کی مسحور کن دھیمی دھیمی روشنی کی مانند پھیل چکا تھا‘ اور تو اور میں خود شیطان کے ناخنوں سے کھرا ہوا ایسا ملائم ہوا کہ کچے موتیے والا آنکھ میں رکھے تو محسوس تک نہ ہو۔ میرا ناشتے والا چُورما تو پہلے سے دوسرے روز ہی شروع ہو گیا تھا جسے چاچی اپنے کسی نسخۂ خاص سے ہر صبح نماز کے فوراً بعد تیار کرتی۔ چاچا اپنے ہاتھ سے کھاتا‘ چاچی اپنے پیارے ہاتھ سے پہلے مجھے کھلاتی‘ پھر خود بھی کھاتی۔ چاچے کا حُقّہ توڑ پھوڑ کر پھینک دیا گیا تھا۔ چاچی کہتی تھی کہ صاحبِ علّت‘ صاحبِ عزت نہیں ہوسکتا۔ چُورے کا اثر یا چاچی کی شخصیت کا تصرف کہ چاچے نے پچاس ساٹھ سال کا لگا حُقّہ چھوڑ دیا۔

شطرنج اور تاش کی بیٹھکیں بھی ختم ہو گئیں۔ چاچے کا سونا بنانے کا جنون بھی ایک عجیب واقعہ سے چھوٹا۔ یہ تو میں پہلے بتا ہی چکا ہوں کہ ہماری پہلی چاچی سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو گئی تھی اور چاچا نے اس سانحہ کا کوئی خاص اثر بھی نہیں لیا تھا۔ بچہ نہ کوئی بالکا' جس کی پرورش کی فکر ہوتی۔ چاچا' چاچی دونوں ہی لنڈورے تھے' لنڈوری لڑھکی تو لنڈورا اپنے مُرشد کے پاس نواں شہر جموں پہنچ گیا۔ مُرشد جانتے تھے کہ اس نے سونا بنانے کے ٹھرک میں اپنی ساری زندگی برباد کر دی ہوئی ہے۔ چاچا کئی روز مُرشد کے قدموں کو پکڑے بیٹھے رہا۔ خدا جانے مُرشد کے مَن میں کیا آئی' لہرا کے بولے ...... مُورکھ! بول' اب کیا چاہتا ہے۔ دو تولہ اناج تیرے پیٹ کے لئے کافی ہے' ڈھیروں سونا چاٹے گا؟ پیتل' سنکھ دے تو سونے کی کھوجن کس کارن......؟ اپنی بالکی چاچی کو بلایا' بیٹھے بیٹھے دو بول پڑھوا دیئے اور چاچا سے بولے کہ لے سونے کی کان لے جا۔ اب تجھے بے سود سونا بنانے کا کشٹ نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر چاچی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کبوتری! جا' اونٹ کے کوہان پہ بیٹھ جا...... چاچا' چاچی کو ساتھ لے کر چُپ چاپ چلا آیا۔ ایک بیوی کے جانے اور دوسری بیوی کے آنے پہ کہیں بھی تو اس نے اپنے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ غم' نہ خوشی...... شاید چاچا کا مزاج یا طبع ہی ایسی تھی۔ چاچی جب [illegible] کر چاچی نے ہر وہ چیز تلف کر دی جو اس کی سمجھ میں بے کار تھی یا اس چیز کا تلف کرنا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ سیاہ مُرغے مُرغیاں' چُوزے انڈے' شیر چیتے کی کھالیں' کھوپڑیاں' اُلو کی چونچیں۔ ہاتھی دانت' پتھر کے کھرل' گھوٹنے' جڑی بوٹیاں' مٹی' پتھر کی کٹھالیاں' کشتوں کی بوتلیں برنیاں' چاندی قلعی تانبے کے ٹکڑے یہ سب الم غلم اکٹھا کر محلے کے مہتر کو بخش دیا۔ چاچا چُپ چاپ کھڑا گھر لُٹنے کا تماشا دیکھتا رہا' نہ کوئی شکن ماتھے پہ اُبھری اور نہ کوئی شبد مُنہ سے نکلا۔ چاچا کو ہکا بکا' خاموش دیکھ کر چاچی نے کہا۔

"سونا بنانے کے لئے ایسے کاٹھ کباڑ کی حاجت نہیں ہوتی' صرف نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

چاچے کی سمجھ میں یہ باریک بات نہ آئی' مُنہ اُٹھائے اپنی عجوبہ سی پُراسرار بیوی کو تکتا رہا جس کی اٹھائیس برس' اس کے مُرشد نے تربیت کی تھی۔ جو وہی کشمیری برہمن زادی تھی جس کے ماں باپ حادثے کا شکار ہو گئے تھے' جو برکی اشرفی کبوتری کا پَران تھی...... چاچی کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ پھر بولی۔

"سونا پڑا رہے تو مٹی ہے' بندھ جائے تو سنگھار' پیٹ پڑے تو روٹی ہے۔ سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا' سونے کے پہاڑ پہ بھاری ہے اگر بھوک سچی ہو۔ سونے کی سلطنت ایک سانس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اگر جان بچتی ہو۔ فقیر کے فاقے کے سامنے سونے کی کائنات بھی ہیچ ہے۔ ہمارے مُرشد پاک کے لئے جَو کے آٹے کی گوگی' آگ میں سُرخ کئے ہوئے پتھر پہ سِکتی ہے۔ جَو کے ستو پتھر پہ پتھر رکھ کے کوٹے

جاتے ہیں...... اب آپ بولیں' آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر تو آپ محض سونا چاہتے ہیں تو لائیں دس بیس من کوئی دھات پیتل' چاندی' تانبا۔ اللہ کے اُمر سے میں سونا بنا دیتی ہوں' خوب عیش کریں...... سونا بنانا تو بچوں کا کھیل ہے' اصل کام تو یہ جاننا ہے کہ ہماری تخلیق کا مقصد کیا ہے اور جب کوئی یہ جان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ کے اُمر سے کائنات کی ہر چیز پہ حق اور اختیار حاصل کر کے بھی' اُمراً اور عملاً لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتا ہے جیسے نبی پاکؐ اگر چاہتے تو عرب کے سارے پہاڑ اور صحرا کے سب ذرّے سونے میں تبدیل کر دیے جاتے مگر سرکارِ مدینہ نے ہرگز ایسا نہیں چاہا۔ کائنات کے وارث ہوتے ہوئے بھی قناعت' صبر اور شکر پسند فرمایا' اَدنیٰ سے اَدنیٰ کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیے۔ لباس' طعام' قیام میں میانہ روی اور عام لوگوں کا سا انداز پسند فرمایا۔ رعونت' تکبر اور شاہانہ رسم و راہ سے ہمیشہ اغماض برتا...... مُرشد پاک کے حُکم کے مطابق میں نے تمہیں نیکی' بدی' بھلا بُرا سمجھا دیا ہے۔ اب جو کہو میں حُکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔''

چاچا نے لڑکھڑائی زبان سے صرف اتنا کہا۔

''نیک بخت! میں نے آج سے ہر علّت ترک کی...... میں نے بھی صرف مُرشد پاک کے حُکم کی تعمیل کی تھی ورنہ میں کسی طور بھی تمہارے جیسی نیک عورت کا شوہر کہلانے کے قابل نہ تھا...... اللہ میرے گناہ معاف کرے نہ تو مجھے تسبیح کے آتے ہیں اور نہ نماز روزہ' قرآن پاک تو میں نے پڑھا ہی نہیں۔ اللہ اور مُرشد سرکار نے اگر تمہیں میرے لئے نعمت کا سامان بنا کر یہاں بھیج دیا ہے تو میری عاقبت بھی سنوار دو۔ اس عمر اور حالت میں میں کوئی ولی اللہ بننے سے تو رہا' کم از کم موت تک کا تو راستہ آسان ہو جائے۔''

● مارِ سیاہ' حدِ اَدب کا انتباہ......!

میں ایک روز صبح نماز کی ادائیگی کے بعد اُنگلیوں پہ تسبیح کر رہا تھا۔ چاچی کا معمول تھا کہ وہ نماز سے فراغت کے بعد تسبیح و تہلیل اور قرآن پاک کی تلاوت کے لئے سُکھ چین کے پیڑ تلے مٹی کے بنے ہوئے تھڑے پہ دوزانو سی بیٹھ جاتی۔ میں اپنی جگہ تخت دراز پہ بیٹھا اُنہیں نرم نرم نظروں سے تلاوت کرتے دیکھ رہا تھا' صبح کی ملگجی میٹھی سی روشنی میں چاچی کسی اور ہی جہاں کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے آئینے کی طرح شفاف چہرے پہ کتنی پاکیزگی اور معصومیت تھی' ایسی محویت اور جذب جیسے دُنیا جہان کے باقی سارے مسئلے دھندے محض دُھند اور غیر اہم ہیں۔ اصلی اور راسخ و روشن عمل محض یہی ہے جس میں وہ اس وقت مصروف تھی۔ وہ قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور میں اُس کے چہرے کی تلاوت میں مگن تھا۔

اچانک میں بے ساختہ سا اُٹھا' اک عجیب سی وارفتگی کے عالم میں چاچی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہی مہکتے خوشبو۔ رُوح کیوڑہ اور زعفران کی دھیمی دھیمی مہک۔ اس عالمِ سرمستی میں' میں نے اچانک چاچی کی آنکھ چوم لی۔ اچانک دھپ سے کوئی نرم سی چیز میرے سر پہ آ گری۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا' ایک کالے سیاہ سانپ نے میری گردن اپنی گرفت میں لے لی۔ چاچی نے قرآن پاک رحل پہ رکھ کر فوراً مجھے اپنی گود میں بھر لیا۔ سانپ کو پرے ہٹا کر' کچھ پڑھ کر مجھے دَم کیا...... یہ سب کچھ اتنی عُجلت اور بے ساختگی سے ہوا کہ مجھے کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع تک نہ ملا۔ سانپ' چاچی کے سامنے سر ڈالے ہوئے پڑا تھا' چاچی اسے جیسے سرزنش کر رہی ہو۔ میں ابھی تک چاچی کی گود میں ہی تھا۔ سانپ ہولے سے سرکا اور میرے پاؤں پہ آ کر سر رکھ دیا...... میں نے اِس وقت تک اپنی چھوٹی سی عمر میں سینکڑوں مختلف قسم کے سانپ سنپولے دیکھے' مارے اور پکڑے تھے۔ گڑھے کھود کر انہیں دفن کیا۔ کئی بار اِس کی کینچلی بِلوں سے باہر کھینچ نکالی' نظر کی تیزی کے لئے آنکھوں پہ رگڑی اور ایک دو بار سُرمہ بنانے والوں کے ہاں بیچی بھی' اس کی منکیاں دریافت کیں اور ان کی مالائیں بنا کر درد گُردہ والوں کو فروخت کیں۔ ایک دفعہ چیل نے ہمارے کوٹھے پہ آدھ کٹا سانپ گرایا تھا جسے میں چھری سے لٹکا کے بچوں اور عورتوں کو ڈراتا پھرا۔ اب اس سانپ والی واردات سے میں بالکل نہیں ڈرا تھا شاید اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سانپ کا وجود میرے لئے اجنبی نہ تھا اور میں اسے محض ایک رینگنے والا کیڑا سمجھتا تھا' چاچی کی گود اور اس کی موجودگی بھی نہ ڈرنے کی دوسری وجہ تھی۔ سرسراتے ہوئے کالے سانپ نے جب ٹخنے سے اُوپر ٹانگ کی جانب چڑھائی شروع کی تو تب ہلکا سا ڈر محسوس ہوا۔ چاچی دیکھ رہی تھی اور میں کبھی سانپ اور کبھی چاچی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چاچی نے اپنی ازلی مسکراہٹ سے جو اُس کے چہرے پہ سجی رہتی تھی' مجھے خاموش اور پُرسکون رہنے کا اِذن دیا۔ سانپ بڑے آرام سے میرے سارے جسم کا سروے کرنے کے بعد اُتر کر سُکھ چین کے پیڑ کی جانب کہیں غائب ہو گیا۔ میں چاچی کی گود میں یوں پڑا تھا' جیسے کوئی بچّہ پالنے میں پڑا انگوٹھا چُوس رہا ہو۔ چاچی نے اس غیر معمولی واقعہ پہ کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا جیسے اُس کے لئے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ بڑی پُرسکون سی پھر سے قرآن پاک کی تلاوت میں مگن ہو گئی۔ چاچی نے اب تلاوت پاک میں قرأت شامل کر لی تھی۔ نرم سا ملکوتی انداز' صحرائی آہنگ' یوں جیسے حُدی خواں شب کے آخری پہر منزل کے قریب پہنچ کر اپنے لحن کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ کا انداز پیدا کر لیتے ہیں' نوائے سروش سی طمانیت و آشتی عود کر آتی ہے۔ اب یہاں میری کیا بساط تھی؟ جب طالب و مطلوب' عاشق و معشوق' محب و محبوب' الوہیت کے رنگ میں رنگے جائیں اور کسی ایک کو دوسرے کی گود نصیب ہو جائے تو پھر گور کی بجائے گود میں سونے کو جی چاہتا ہے۔ کہتے ہیں

کہ ماں' محبوب اور مرقد کی گود بڑی گداز ہوتی ہے' سونے کا سواد آ جاتا ہے اور حشر تک پڑے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ مَیں بھی چاچی کی گود میں سکون کا انگوٹھا مُنہ میں لئے مزے سے ننھے ننھے خراٹے لے رہا تھا' چاچی مجھے یوں گود میں سمیٹے چھپائے بیٹھی تلاوت کر رہی تھی جیسے اس کے مُرشد پاک نے کہا ہو کہ اگر سُکھ چین کے پیڑ پہ سورج کی پہلی کِرن پڑنے تک تم سورۂ رحمٰن تلاوت کر لو تو گود بڑا گُھر تمہارا......

سُکھ چین پہ سورج کی بہت سی کرنیں پڑنے کے بعد محلّے کے بچّے پڑھنے کے لئے آنا شروع ہو جاتے تھے۔ چاچی نے پہلی دو چار کرنیں پڑتے ہی مجھے ناشتے کے لئے بیدار کر دیا۔ مُنہ پہ پانی کے دو چار چھپاکے مارنے کے بعد میں چاچی کی چادر سے مُنہ خشک کر رہا تھا تو مجھے صحن میں گلاب کی کیاریوں کے پاس ایک اصیل مُرغا بیٹھا دِکھائی پڑا' آنکھیں ملنے کے بعد دوبارہ دیکھا تو چاچا تھا۔ عجیب تماشا...... کہ کبھی چاچا' کبھی سُرخ مُرغا۔ پھر آنکھیں جھپکیں۔ ایک کھولی' دوجی بند کی۔ معلوم ہوا کہ ایک آنکھ میں چاچا دِکھائی دیتا ہے تو دوجی میں سُرخ مُرغا...... اچانک باہر کے دروازے کی جانب نظر پڑی تو اُدھر سے ایک گدھی اندر داخل ہوتی دِکھائی دی۔ یا مظہر العجائب' یہ میرے ساتھ صبح صبح کیا تماشے ہو رہے ہیں؟...... مَیں ہڑپ ہڑپ چُورما کھا رہا تھا' چاچی دزدیدہ نگاہی سے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی' چاچا پرے بیٹھا باقر خانی اور چائے نوش جاں کر رہا تھا۔ چاچی بڑی ملائمت سے بولی۔

"کاکا! چھوٹے چھوٹے لُقمے اور ہر وقفۂ لقمہ میں اَلحمدُللہ کہنا رازق سے رزق وصول کرنے کی شکر گزاری ہے......

چاچی نے یہ الفاظ ایسے آہنگ سے کہے کہ چاچا نے بھی سُن لئے میرے ساتھ چاچا کا اندازِ طعام بھی بدل گیا۔ چاچی نے ہم دونوں کو "اَلحمدُللہ" کہتے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے لُقمے اُٹھاتے دیکھ کر خود بھی "اَلحمدُللہ" کہا...... مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں کہنے لگی۔

"آج صُبح صُبح جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوا ہے' اس کا کسی سے بھی ذِکر نہیں ہونا چاہئے اور آئندہ کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس کی تمہیں میری جانب سے اجازت نہ ہو۔ تم ابھی بچّے ہو' نا سمجھی اور بے علمی سے اگر سرپٹ بھاگو گے تو ٹھوکر کھا کر گرنے کا اندیشہ رہے گا...... مَیں بھی تو تیرے جتنی عمر کی بچّی تھی جب میرے بابا جی نے مجھے گود لیا تھا۔ نادانی اور بے سمجھی میں بہت سی حرکتیں اور باتیں غلط سلط ہو جایا کرتی تھیں لیکن میرے بابا جی کبھی ناراض یا خفا نہیں ہوتے تھے' ہمیشہ شفقت اور نرمی سے سمجھا دیا کرتے اور مَیں بھی تمہیں نرمی سے سمجھا دیا کروں گی......" چاچی' چُورے کا پیالہ صاف کرتے ہوئے آخری لُقمہ میرے مُنہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگی...... "کاگا! کاگا کو چُورما اس لئے کھلایا جاتا ہے کہ وہ "پی" کا سندیس

[illegible] ہے اور یہ فقیر کی طرح بے ٹھکانہ ہوتا ہے' یہ ''کیا کیا' کیوں کیوں'' الاپتا ہے یعنی سیکھنا سکھاتا رہتا ہے۔ کاگا ہی ہے جو سرّی عُلوم کا ادراک رکھتا ہے۔ یہ ملامتی ہے' مُکتا اور یہ' دونوں اس معاملے میں [illegible]ف ہیں۔''

''چاچی! تم تو کبوتری ہو' تم تو سب کچھ جانتی ہو۔ پھر تم اپنا ذکر کیوں نہیں کرتیں؟'' ڈرتے ڈرتے مَیں نے سوال کیا۔

- ## بَرکی کبوتر' ہگ نہ مُوتر......!

چاچی نے ہلکے سے میرے گال پہ چپت لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ کبوتر بڑے بھولے اور نادان ہوتے ہیں' ان کی بڑی کمزوری خود پسندی اور آرام طلبی کی عادت ہے' ڈرپوک اور شرمیلے' یہ اکثر مراقبے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ مرقدوں' مزاروں' مقبروں' میناروں پہ تم نے ان کے غول کے غول دیکھے ہوں گے۔ مکے مدینے' بغداد شریف' اجمیر شریف' داتا سرکار'' کہیں بھی چلے جاؤ کبوتر ضرور وہاں موجود ہوں گے۔ یہ بڑا ہی معصوم سا پرندہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنی بے ادبی کی وجہ سے بِلّی شکرے اور آندھی بارش' طوفان کی نذر ہو جاتا ہے...... کاش! یہ قبروں پہ بیٹھ کر غلاظت نہ پھیلائے۔

''چاچی! کیا بَرکی اشرفی کبوتر' ان کبوتروں سے مختلف ہوتا ہے؟''

''ہاں' یہ مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح کاگا اگر غلاظت پہ پڑے تو کوا بن جاتا ہے...... ''کیا کیا'' کی آواز ''کاں کاں'' میں تبدیل ہو جاتی ہے...... بَرکی کبوتروں کی نسل کو ایک بزرگ بابا سرمد بَرکیؒ کی دُعا ہے۔ یہ نہ تو غلاظت پھیلاتے ہیں اور نہ اپنی نسل بڑھانے کا رجحان رکھتے ہیں' ہر ولی ابدال کے مزار پہ ایک آدھ جوڑا ضرور موجود ہوتا ہے' دوسرے کبوتر بھی اِس جوڑے کی خوشبو سے وہاں آ جاتے ہیں۔ خدا جانے یہ بَرکی کہاں سے آتے ہیں......؟''

- ## منش کا حیوانی رُوپ' بِندرابَن میں چھُپی دُھوپ......!

''چاچی! مَیں نے جب سے تیری آنکھ کو بوسہ دیا ہے' میری ایک آنکھ جیسے سامنے آنے والوں

کے دوسرے روپ کو بھی دیکھنے لگی ہے۔ چاچا مجھے مُرغ دِکھائی دیا اور مہترانی' گدھی......''

''تم نے صحیح دیکھا ہے' واقعی تمہارے چاچا کا حیوانی رُوپ مُرغ ہی ہے' اصیل مُرغ!...... ایک بات بتاؤ' تمہارا چاچا ''چاچا ککڑ'' کے نام سے کیوں مشہور ہے؟'' چاچی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں' لیکن ہر کوئی انہیں اسی نام سے پکارتا ہے۔''

''میں بتاتی ہوں...... کبھی کسی صاحبِ نظر بزرگ نے ان کا حیوانی رُوپ دیکھ کر انہیں مُرغا یا ککڑ کہہ دیا ہوگا' وہیں سے یہ سلسلہ آگے بڑھ گیا...... بیٹا! انسان کی ظاہری بصارت کے آگے چالیس رُوحانی حجاب یا پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں' ان پردوں کی اوٹ سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح آنکھ میں موتیا اُتر آئے تو دھندلا یا بالکل دِکھائی نہیں دیتا' مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے پردہ پڑ گیا ہے۔ آپریشن علاج سے وہ پردہ دُور کر دیا جاتا ہے اور انسان پہلے کی مانند پھر سے دیکھنے لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی اللہ کے ولی' اس کے برگزیدہ بندے' اللہ پاک کے امر سے جس کے بھی چاہیں' جب چاہیں اور جتنے چاہیں' حجاب دُور کر دیتے ہیں...... یہ چالیس حجاب اس طرح ہیں۔ دس ذات کے' دس کائنات کے' دس اَزل اور اَبد۔ جب تک پہلے دو حجاب یکے بعد دیگرے دُور نہ ہو جائیں' باقی حجاب اُٹھ نہیں سکتے۔ ایک دو' تین چار سے چالیس تک پہنچنا پڑتا ہے۔''

میں جیسے کسی کنویں کی گہرائی میں اُترا ہوا' چاچی کی تصوّف میں ڈوبی ہوئی اور اَسرار میں رَچی بَسی زندہ و تابندہ باتیں سُن رہا تھا۔ میرے دماغ کا کمپیوٹر مِن و عَن' ایک ایک کیفیت اور ایک ایک لفظ اپنے اندر ''فیڈ'' کر رہا تھا اور میرے تصوّر اور تخیّل کا کیمرہ کھٹ کھٹ ہر کیفیت کی تصویریں اُتار رہا تھا۔ میں عالمِ تحیّر میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا کہ الٰہی! یہ چاچی کیا چیز ہے' انسان یا جِن؟...... فرشتہ تو وہ ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ ایک عورت تھی۔ جب سے میری ایک آنکھ کام کرنے لگی تھی' میں اس جستجو میں تھا کہ چاچی کا کوئی اور رنگ یا رُوپ بھی دیکھوں مگر ہر بار وہ مجھے چاچی یا بَرکی ہی دِکھائی دی۔

''چاچی! یہ بَرکی کبوتر......''

چاچی نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میرے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا' چاچا ناشتے کا خالی پیالہ اُٹھائے اس طرف آ رہا تھا۔ چاچا باہر چلا گیا تو چاچی درود شریف پڑھنے لگی۔

''چاچی' جی! یہ سب کچھ آپ نے پڑھا ہے' سیکھا ہے...... میرا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ' اتنا علم' ایسی عقل و دانش' ایسی اِستقامت آپ نے کہاں سے حاصل......؟''

چاچی نے پھر میرا جملہ چھین لیا' شہادت کی اُنگلی میرے لبوں پہ رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''کاگا! تم بہت ہی ''کیوں کیوں' کیا کیا'' کرنے لگے ہو؟...... مجھے تم یہ سب کچھ کہہ رہے ہو' بتاؤ تو سہی کہ اس عمر اور اس ماحول میں جہاں بچّے کو ڈھنگ سے اپنا نام بتانا اور لکھنا تک نہیں آتا' تم ایسے ایسے سوال کہاں سے لاتے ہو اور میری یہ مشکل مشکل سب باتیں کیسے سمجھ لیتے ہو؟''

مَیں جواب میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا تو چاچی خود ہی بول پڑی۔

''تم شاید ڈھنگ سے جواب نہ دے سکو' مَیں خود ہی تمہاری طرف سے جواب دیتی ہوں...... تم یہی کہو گے کہ مَیں نے یہ کچھ لوگوں سے سیکھا' کتابوں سے جانا اور شاید یہ بھی کہو کہ یہ سب کچھ مجھے اللہ کی جانب سے وَدیعت ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آخری بات دُرست ہے......'' وہ خلاؤں میں گُھورتے ہوئے بولی۔ ''تم میں جاننے کا تجسّس بہت ہے اور مجھ کو سمجھ لینے اور اسے مناسب وقت پہ عمل میں لانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ تم میں باہمی رَبط پیدا کرنے کی قدرتی اہلیت ہے جسے عاملوں اور خَفی علوم کے ماہروں کی اصطلاح میں ''معمول'' کہتے ہیں۔ اس بات کو یوں سمجھو کہ جیسے سونا کانوں سے مٹی پتھر اور دیگر دھاتوں ملے ڈلوں کی صورت میں نکلتا ہے جسے بعد میں بڑے طریقوں سے بتدریج صاف کر کے خالص سونا حاصل کیا جاتا ہے [illegible] بھی [illegible] چمکتے ہوئے [illegible] ہیرے ترشے ترشائے بھی دستیاب ہو جاتے ہیں...... اب چند باتیں غور سے سنو۔ تم ایک فقیر کی دُعا سے عالمِ وجود میں آئے' تم نے کوئی مخصوص غذا لینے سے پہلے ایک قلندر کی آنکھ کا آنسو پیا۔ تم پیدائشی طور پہ مختون ہو' تمہارا نام آسمانی نام ہے۔ تم چار ہستیوں کی نظر کا فیضان ہو۔ ایک قلندر' ایک ولی' ایک مجذوب اور ایک شہید۔ ایک گھنگھروؤں والا' ایک دَمڑیاں والا' ایک کاواں والا اور ایک قلعے والا...... پیدائشی طور پہ تمہاری باطنی آنکھ سے آنکھ حجاب ہٹے ہوئے تھے۔ کچھ اور کہوں کہ بہت ہے؟...... کاگا! تمہیں رَبّ العزّت و حکمت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے' اُس کے کارخانۂ قدرت و ایجاد میں بے شمار شکلیں' ترکیبیں' ترمیمیں' ترجیحیں' تخصیصیں جو ہمارے لئے ہوتی ہیں' ہمارے سامنے موجود ہوتی ہیں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کے لئے پھر ہمیں کسی رہبر' اُستاد یا کوئی جو ہدایت یافتہ' کسی حد تک کامل اور صاحبِ فضیلت اور ذی وقار ہو اُس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مَیں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے ظاہری کان میری بعض باتوں کو سمجھنے میں دِقّت محسوس کرتے ہیں مگر تم باطنی طور پہ ہر بات کو سمجھتے ہو اور جو کچھ مَیں نے کہا' اس کو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔''

مَیں نے تو اب چاچی کی باتوں پہ حیران اور پریشان ہونا بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب مَیں خوب

جان چکا تھا کہ مَیں نے جس "وادیِ حیرت و تحیّر" میں قدم رکھا ہے وہاں اب مجھے بچّہ کچّا نہیں بلکہ ایک پکّا اور سچّا بن کر گزرنا پڑے گا۔

"چاچی! جو کچھ آپ نے کہا' وہ حرف بحرف دُرست ہے' اب مَیں آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ یہ سب کچھ کیسے جانتی ہیں لیکن آپ مجھے کچھ چاچا اور اپنے مُرشد پاک کے بارے میں ضرور بتائیں۔ مَیں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ نواں شہر جموں میں کہیں رہتے ہیں......"

"کاکا! وہ تمہارے چاچا کے مُرشد پاک ہیں' میرے تو وہ بابا ہیں......"

"چاچی! مُرشد پاک اور بابا جی میں کیا فرق ہوتا ہے......؟"

● مُرشد شاہ تے بابا فقیر......!

مُرشد رُشد و ہدایت کرتا ہے' ایک طریقہ اور ضابطہ بنا کر ہاتھ میں تھما دیتا ہے' بس! کوئی عمل کرے نہ کرے۔ مُرشد ڈنڈا نہیں مارتے اور نہ ہی قطع تعلق کرتے ہیں۔ مُرشد کا ہاتھ چوما جا سکتا ہے' ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر سہلایا نہیں جا سکتا۔ معانقہ کیا جا سکتا ہے' سینے سے سینہ لگا کر بھینچا نہیں جا سکتا۔ لیٹے ہوئے مُرشد کے پاؤں داب جا سکتے ہیں' چھپا مار کر ساتھ سویا نہیں جا سکتا ہے...... بابا آپ کا دوست ہوتا ہے۔ اُس کی دہشت نہیں ہوتی' اُس سے محبت ہوتی ہے' اُسے چُوما جا سکتا ہے۔ اُس سے رُوٹھا جا سکتا ہے' اُس سے ہنسی مذاق کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے زانو پہ سر رکھ کے سویا جا سکتا ہے۔ وہ آپ کے اندر باہر بسا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے نہیں' اپنے یار کے ہاتھ سے کھاتا ہے۔ اُسے نہلاتا' کھلاتا پلاتا' سُلاتا ہے۔ بس ایک بابا ہوتا ہے اور ایک بچّہ جیسے میں تھی' میرے بابا تھے۔ مَیں اُن کے سینے سے لگ کر سوتی تھی' اُنہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی تھی۔ میری سانسیں' اُن کی سانس سے چھن کر مجھ تک پہنچتی تھیں اور تم نے مجھ سے پوچھنا چاہا کہ یہ سب کچھ میرے پاس کہاں سے آیا' مجھے کہاں سے ملا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ میرے مالک و خالق و محافظ کا کرم ہے جو ربّ العالمین ہے' اُس کے بعد میرے بابا کی نظر کا فیضان ہے۔"

"چاچی! ایک بات کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ یہ چاچا سے آپ کی شادی......"

مَیں پھر پکڑا گیا۔ چاچی نے میری فوراً بات پکڑ لی۔

"کاکا! خواہش' مرضی' تمنا' طلب اور حرص' اِن سب چیزوں سے ہٹ کر راہ پکڑنے کا نام فقیری

درویشی ہے۔ جو حکم ہوتا ہے' بلا چوں چرا اس پہ عمل کیا جاتا ہے۔ اندیشہ' سود و زیاں دُنیا کے بندوں کے دلوں میں ہوتا ہے' فقیروں کے ہاں محض تسلیم و رضا کی بات ہوتی ہے۔ بابا نے جو چاہا' وہ کر دیا ہے۔ یوں جانو کہ تم ''جاننے'' والے ہو اور ہم ''ماننے'' والے ہیں۔''

میرے مُنہ سے خود بخود نکل گیا۔ ''جاننا اور ماننا......؟'' اور آنکھیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔

● جاننا' عِلم کی جان...... ماننا' عِلم کا ایمان......!

''جان کر ماننا' تو صرف ماننا اور اگر ایمان سے ماننا تو بہت خوب ماننا...... مومن اُسے کہتے ہیں جو رب کریم کو بغیر دیکھے بغیر جانے' اُس پہ ایمان لائے اور کافر کہتا ہے کہ پہلے میرے سامنے آؤ' مجھے اپنا آپ دکھاؤ...... جو بابا کی بات ہو رہی تھی۔ بابا' مُرشد نہیں بلکہ مہربان اور معشوق ہوتا ہے۔ وہ پیر نہیں ہوتا' وہ تو پیار کرنے والا اور پیاس بجھانے والا ہوتا ہے۔ لمبی داڑھی' تسبیح' مصلے' منکے' مجاہدے چلّے' یہ سب کچھ اس کے لئے ضروری نہیں ہوتے۔ اس کے لئے رزقِ حلال کی جستجو کرنا' اپنا محاسبہ اور خود ملامت کرتے رہنا' اللہ کی مخلوق کی بھلائی ...... اللہ کے خوف سے ڈرتے رہنا' قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات پہ عمل کرنے کی کوشش کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ عام سا انسان دکھائی دیتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ تکبّر' تموّل' نمائش و آرائش سے یکسر بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ ڈاکیا ہوسکتا ہے' موچی اور بڑھئی بھی ہوسکتا ہے' سڑک پہ جھاڑو پھیرتا ہوا بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ انجن اور رکشا ڈرائیور یا کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ اپنا رزق خود کماتا ہوگا' پورا پورا دُنیا کے اندر ہوگا۔ بابا اپنے بچوں سے نذرانہ' کوئی قیمتی تحفہ' مٹھائیاں' پھل' تحفے وصول نہیں کرتا بلکہ خود ان کی خدمت' عزت کرتا ہے۔ پاؤں دبواتا نہیں' دابتا ہے۔ بچے سو جائیں تو پنکھا جھلتا ہے۔''

''چاچی! آپ کے بابا بھی ایسے ہی تھے......؟''

''ہاں' کاکا! ایسے ہی ہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ...... میرا بابا بکریوں کے دودھ سے پنیر بناتے رہے ہیں۔ بکریاں پالی ہوئی تھیں' خود ہی دودھ دوہتے تھے۔ سب سے پہلے بکریوں کے بچوں کو خوب پیٹ بھر کر دودھ پلاتے۔ پھر مجھے پلاتے اور جب دوسرے سب پی چکتے تو جو بچتا' وہ پنیر بنا لیتے جو شہر میں فروخت ہوتا۔ نہ بابا کے پاس کوئی کرامت تھی' نہ کوئی معجزہ یا چمتکار۔ تعویذ' دھاگے' جھاڑ پھونک...... ان کے ہاں ان چیزوں کا کوئی تصوّر نہیں ہے......''

”چاچی! آپ نے کہا تھا کہ بابا کے نیچے سارے پہاڑ پتھر سونے کے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے یا آپ......؟“

”ہاں‘ کاگا! واقعی ایسا ہی ہے...... کہتے ہیں کہ جہاں اللہ کا ولی بیٹھ جائے وہ جگہ‘ ہر اینٹ‘ پتھر‘ مٹی کا ایک ایک ذرہ سونے سے زیادہ قیمتی بن جاتا ہے اور جہاں سے وہ گزرتا ہے وہ راہیں‘ راستے مُشک وعنبر کی خوشبو سے مُعطر ہو جاتے ہیں۔ راستے کا ہر شجر‘ چرند پرند‘ جانور اللہ کی ثناء میں مشغول ہو جاتا ہے۔“

”چاچی! سونے سے یاد آیا‘ میری چاچے سے دوستی سونے کی وجہ سے تھی۔ چاچا ساری عمر سونا بنانے کے چکر میں رہا مگر وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکا‘ ایک آدھ آنچ کی کسر ہمیشہ باقی رہ جاتی تھی...... چاچی! بُرا نہ ماننا‘ مجھے صرف یہ بتا دو کہ اصلی سونا بنایا جا سکتا ہے یا یونہی یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں......؟“

”کاگا! تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اصلی سونا ضرور بنایا جا سکتا ہے‘ اگر چاہو تو تم بھی بنا سکتے ہو......“

● سونے [illegible]......

ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے‘ بہت دُور دُور تک ان کے علم و فضل اور فیض و برکات کا شہرہ تھا۔ دُنیاوی لالچ اور طمع حرص کا ایک بندہ کسی طرح ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا‘ ایک لمبا عرصہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا رہا۔ تن‘ من‘ دھن سے ان کی خدمت و اطاعت میں جُتا رہا۔ ریاضتوں‘ مجاہدوں کے اشغال سے بھی ہو گزرا لیکن اندر کا لوبھ لالچ جوں کا توں ہی تھا‘ اس کا جھکاؤ دُنیا کے لوازمات اور اس کی مکروہات کی جانب ہی رہا۔ اللہ کی حکمت کہ اس بندۂ حرص و ہوا سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو گیا یا اس کی کوئی ادا حرکت اُس بزرگ کو ایسی بھائی جو اُن کے مُنہ سے اچانک نکل گیا کہ مانگ‘ کیا مانگتا ہے؟ یہ مُرید تو شاید ایسے ہی کسی موقع کے لئے یہاں پڑا ہوا تھا‘ جھٹ بولا کہ حضور‘ مجھے سونا بنانے کا بہت شوق ہے‘ کوئی ایسا عمل عطا ہو جائے کہ میں سونا بنا لیا کروں۔ یہ خواہش سُن کر اس بزرگ کا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا کہ نہ کسی دُعا کا طالب ہوا‘ نہ عاقبت آخرت کی خیر چاہی‘ نہ رزق ایمان میں برکت مانگی اور مانگا بھی تو کیا مانگا۔ دُنیا کا میل‘ گندگی اور فتنہ...... دل میں سوچا کہ اس مُورکھ کو سمجھانا فضول ہے اور زبان دے کر انکار کرنا فقیر کی شان نہیں۔ دل گرفتہ ہو کر بادلِ نخواستہ انہیں اس لالچی کو سونا بنانے کا عمل بتانا ہی پڑا!

ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر لالچ اور نمائش کے لئے سونا بناؤ گے تو دین کے ساتھ دُنیا بھی گنوا بیٹھو گے......
لالچ و ہوا اور نمود کا بھوت سر پہ سوار ہو تو کون کسی کی نصیحت پہ کان دھرتا ہے یا عاقبت اور آخرت کی
سوچتا ہے۔ عمل سیکھ کر مُرشد کا دوارہ چھوڑا...... اب کہاں کی عبادت' نماز روزہ اور ذکر اذکار۔ داڑھی
منڈھ گئی' عمامہ اور لبادہ اُتر گیا' فقر و فاقہ سے جان چھڑائی۔ پہلے پہلے بقدرِ ضرورت سونا بنا کر اپنی
ضروریات کرتے رہے' پھر آہستہ آہستہ جائز و ناجائز ضرورتوں نے پاؤں پسارے تو رتّی ماشے سے تولے' دو
تولے پہ جا پہنچے۔ ضرورتوں اور نفس کی نت نئی خواہشوں نے اپنے اپنے راستے نکالنے شروع کر دیئے۔
سونا بنانے کا نسخہ ہاتھ میں تھا' ڈلے کے ڈلے سونا اُٹھائے صراف بازار میں جا پہنچتے اور دام کھرے
کرتے۔ رات اور دِن اور...... لباس لبادہ' شاہانہ سواری اور مُؤدب خدام بھی آگے پیچھے نظریں جھکائے
کھڑے دِکھائی دینے لگے۔ جب گلی محلے شہر ان کی ثروت و دولت شہرت پکڑ گئی تو پھر شہر بھر کے چور'
ڈاکو' جرائم پیشہ ان کے دوالے ہو گئے کہ اتنی دولت کہاں سے آتی ہے' کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہے یا کوئی
سونے کا پہاڑ کہ ڈلے کے ڈلے نکالے جا رہے ہیں۔ اُدھر صراف بازار میں سونے کا بھاؤ بیٹھ گیا۔
سونا زیادہ آنے لگا' آگے خریدار کم تھے۔ شہر کے ایک جرائم پیشہ ٹولے نے ٹوہ لینے کی خاطر اپنے ایک دو
جاسوس اس کے خادموں میں شامل کر دیئے۔ بہت جلد ہی ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت سونا بناتے
ہیں۔ جب حقیقت ظاہر ہو گئی تو ان چوروں ڈاکوؤں نے ایک منصوبے کے تحت اس کیمیا گر کو اغوا کر لیا۔
ادھر صراف بازار کے سناروں نے بھی کوتوال شہر کو اطلاع دی کہ ایک شخص بالکل خالص سونے کے ڈلے ہر
دوسرے تیسرے روز انتہائی ارزاں داموں پہ انہیں فروخت کر جاتا ہے اور بازار میں سونے کی فراوانی نے
عجیب ارزانی کی صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ اِن بدقماشوں نے اس کیمیا گر کو پہلے تو منت و خوشامد سے
رام کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح سونا بنانے کا راز انہیں بھی بتا دے مگر وہ کسی طور بھی ان کے ہتھے نہ
چڑھا۔ پھر جب ہر طرح کا لالچ' دھمکی ڈراوا بھی بے اثر ثابت ہوا تو انہوں نے اُنگلی ٹیڑھی کر کے گھی
نکالنے کا بندوبست کرتے ہوئے اسے بھاری زنجیروں سے جکڑ کر ایک اُونچے مینار کے عقوبت خانے میں
قید کر دیا اور ایک بھاری آہنی تالا ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم جا رہے ہیں' اس قید خانے میں تمہاری کوک فریاد
سننے والا کوئی نہیں اور نہ ہی یہاں کوئی کھانے پینے کا انتظام ہے۔ یہاں سڑو مرو۔ چند روز بعد ہم یہاں
آئیں گے اور تمہارے مُردار کو چیلوں کوؤں کے آگے پھینک دیں گے اور ہاں' اگر تمہارا دماغ ٹھکانے آ
جائے یا بھوک پیاس ستائے تو اس لوہے کی زنجیر کا ایک حلقہ کھولو اور اسے سونے کا بنا کر رسّی سے باندھ
کر نیچے لٹکا دو۔ اس سونے کے وزن کے برابر تمہارے لئے کھانا پینا اسی رسّی سے باندھ دیا جائے گا جسے

تم اوپر کھینچ سکتے ہو۔ ایک آدھ روز تو اسی سوچ بچار اور فاقہ مستی میں بیت گیا۔ اپنے اردگرد' نیچے اوپر کوئی راہ فرار نہ پا کر سر جھکا کر سوچنے لگا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا' جب غریب اور نادار تھا تو کم از کم روکھا سوکھا کچھ پیٹ تو پڑتا تھا' سونا بنانا آیا تو پیٹ پوجا سے بھی گیا۔ اسی فکر و تردد اور بھوک پیاس میں ایک روز اور بیت گیا۔ ہاتھ پیر ہلانے مشکل ہو گئے' نقاہت اور کمزوری نے بے حال کر دیا تھا۔ پیٹ کے گڑھے میں درد کی لہریں لہراتی ہوئی محسوس ہوئیں تو ناچار اُٹھا' آہنی زنجیر کا ایک حلقہ کھینچا اور عمل کر کے اسے سونے میں تبدیل کیا' رسّی سے باندھ کر نیچے لٹکایا۔ تھوڑی دیر بعد رسّی کو جنبش ہوئی' اوپر کھینچی تو ایک پوٹلی بندھی تھی۔ چند بھنی ہوئی بوٹیاں' ایک چلّو پانی' ایک چوتھائی روٹی۔ ہبڑ ہبڑ دو چار تھے پیٹ میں ڈالے تو محسوس ہوا کہ اِن دو چار لقموں نے تو اصل بھوک کو اور بھی دو چند کر دیا ہے۔ بے اختیار ہو کر چار پانچ بڑے بڑے لوہے کے کڑے [illegible] سونے میں بدل کر نیچے بھیجے۔ اب کے نیچے سے مرغ مسلّم' گرم گرم شیرمال اور مچھلی کے کباب اوپر بھجوائے گئے۔ اِس کے بعد ایسا ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دو چار پائیوں کے برابر گول کمرا تھا۔ چار قدم اِدھر' چار قدم اُدھر' کمرا ختم۔ گول چکر کاٹ کر سر گھومنے لگتا۔ مرغن اور وافر غذاؤں نے فربہی اور آرام طلبی پیدا کر دی تھی' اب محض کھانا اور غنودگی میں لمبے لمبے پڑ جانا...... بس [illegible] ختم ہو [illegible] کیل میخ' جب ایک ایک کر کے کمرے میں لوہے پیتل کی ہر چھوٹی بڑی چیز ختم ہو گئی تو وہ بڑا پریشان ہوا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے پیغام بھجوایا کہ سونا بنانے کے قابل اب کچھ نہیں رہا تب انہوں نے کئی من پرانا لوہا' اَنٹ شنٹ' دھاتی کباڑ اوپر بھجوا دیا۔ ایک مُدت یونہی گزر گئی۔ پھر ایک عجیب سی تبدیلی آئی کہ اوپر سے سونا تو دس سیر نیچے آ رہا ہے لیکن نیچے سے غذا کی صورت میں بمشکل چند چھٹانک ہی اوپر جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ بازار میں سونا' پیتل سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا ہے۔ پھر ایک وقت یہ بھی آ گیا کہ نیچے سے اوپر سونا بھجوایا گیا کہ اسے لوہے میں تبدیل کر دو کیونکہ گھوڑوں کے کھروں میں نعل لگانے کے لئے لوہا دستیاب نہیں ہے' سونے کے نعل بڑے ناقص' کمزور اور گھٹیا تصوّر ہونے لگے۔ اِس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں نوبت یہاں تک آ گئی کہ عورتیں لوہے کے زیورات اصرار کر کے پہننے لگیں۔ گھر کے برتن' زراعت کا سامان' تعمیراتی اوزار' یعنی جہاں جہاں پہلے لوہے یا دیگر دھاتیں استعمال ہوتی تھیں وہاں اب سونے کا بے دریغ استعمال ہونے لگا۔ سونا بناتے بناتے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے جب یہ کیمیاگر انتہائی لاغر اور ذہنی طور پہ نیم معذور ہو گیا تو اِن لوگوں نے اُسے اِس شرط پہ وقتی طور پر رہا کیا کہ وہ اپنے اُستاد سے اب سونے کو لوہا بنانے کا نسخہ سیکھے۔ بُرا حال اور دیوانوں کی سی صورت حالت میں جب یہ اپنے پیر صاحب کے پاس

پہنچا تو کوئی بھی اسے پہچان نہ سکا۔ اپنے مُرشد کے پاس پہنچتے ہی اس نے پاؤں پکڑ لئے کہ میں وہی راندۂ درگاہ ہوں جس نے آپ کو مجبور کر کے سونا بنانے کا نسخہ سیکھا تھا۔ اب میری جان بڑے ضیق میں پڑی ہے' سیاہ رُو مہنگا اور زرد پھل رُو ارزاں ہے۔ میرے اُوپر رحم فرمائیں اور اب مجھے سونے کو لوہا بنانے کا عمل عطا کر دیں۔ بزرگ تبسم فرما کر کہنے لگے کہ مُورکھ' نادان! جب تمہیں سونے سے کچھ حاصل نہیں ہوا تو لوہے سے کیا ملے گا؟ لوہے تانبے کو سونا بنانا یا سونے کو لوہے میں تبدیل کرنا کوئی ایسا اہم یا کوئی بڑا کام نہیں۔ اصل کام تو مالک جس حال میں رکھنا پسند کرے اس پہ مطمئن رہنا اور اس پہ صبر و شکر کرنا ہے۔ حرص اور لالچ کی آنکھ اور پیٹ سوائے قبر کی مٹی کے کسی اور چیز سے نہیں بھر سکتے۔ مال و زر کی ہوس تو ایسی پیاس ہے کہ جیسے جیسے بجھاتے جاؤ' یہ آگ لگاتی جائے...... بولو اب اگر چاہو تو میں تمہیں سونے کو لوہا بنانے کا عمل بھی بتانے کے لئے تیار ہوں ویسے اگر تم نے میری اس وقت کی نصیحت پہ عمل کیا ہوتا اور کبھی اس طرح لالچ اور طمع میں نہ پڑتے اور اس عمل کو کبھی اپنے عیش و آرام کے لئے استعمال نہ کرتے تو آج تم دین و دُنیا دونوں میں ایسی رُسوائی کی ذلت نہ اُٹھاتے۔ وہ بڑے پیار سے سمجھانے لگے' بیٹا! کوئی بھی علم سیکھنا بُرائی نہیں ہے' بُرائی تو اس علم کا غلط اور غیر متوازن استعمال ہے۔ جس علم و ہنر کا استعمال بد اثرات اللہ کی مخلوق خاص پہ یعنی نوع انسان کے لئے ضرر رساں اور معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتے ہوں یا نظامِ حیات کے کسی شعبے میں غیر متوازن طرزِ عمل اور منفی طرزِ فکر کو فروغ دینے میں مدد معاون ثابت ہوتے ہوں ایسے علم و ہنر کے اظہار سے اجتناب برتنا چاہئے تاکہ بندگانِ خدا کی عتاب' نادیدہ افتاد' حادثات اور ناپسندیدہ حالات کی نحوست سے محفوظ رہ سکیں۔ وہ شخص نادم ہوا' یہ ارشادات سُن کر خاک میں لوٹنے لگا کہ ناحق لالچ و طمع سے مغلوب ہو کر اتنے جوکھم جھیلے مگر اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ---- تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے آہ و بکا' فریاد اُٹھائے کہیں نکل گیا......"

چاچی یہ کتھا سُنا کر میری جانب تکنے لگی۔ چند ثانئے خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگی۔

"کاکا! اللہ کے عاجز بندوں' فقیروں' درویشوں کی منزل سونا بنانا' ہوا پانی پہ چلنا' آگ پھلانگنا' شعبدے معجزے یا کرامتیں دکھانا نہیں ہوتی۔ ایسا طرزِ فکر' ایسی سوچ اور خواہشیں فقیر کی منزل کو کھوٹا کر دیتی ہیں۔"

"چاچی! میں خوب سمجھ گیا' آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ کسی علم و ہنر کو سیکھنا یا جاننا بُرا نہیں' اچھائی بُرائی محض اس کے استعمال پہ منحصر ہے۔ میں محض علم کیمیا سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اسے سیکھنے' پڑھنے جاننے کی حد تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ آپ کے پاس بھی یہ علم ہے نہ تو آپ کو ذاتی

طور پہ سونا بنانے سے دلچسپی ہے اور نہ ہی ضرورت......؟''

''کاگا! میں جانتی ہوں کہ تجسس جتنا کاگا میں ہوتا ہے' کسی اور میں نہیں ہوتا۔ میں تمہیں ضرور سکھاؤں گی بلکہ تم تو سیکھے سکھائے ہوئے ہو' بس ذرا قد میں کاٹھ' مزاج میں ماٹھ اور سوچ سمجھ میں ہلکا سا ٹھاٹھ نکل آئے تو پھر شروع کریں گے......''

● فقیری' بند مٹھی کا جگنو......!

''کاگا! ایک بات یاد رکھنا اور کبھی مت بھولنا' چھپانا فقیری ہے اور اظہار یا نمائش کرنا بادشاہی۔ فقیر' بند مٹھی میں جگنو ہوتا ہے اور بادشاہ بھرے دربار میں جگمگاتا ہوا آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا فانوس۔۔۔ فانوس کو بندے بناتے ہیں اور جلاتے بجھاتے ہیں جبکہ جگنو کی ذات سمیت سارے اہتمام قدرت کرتی ہے۔ اپنے فقر' ہنر اور ظرف کو مٹھی میں بند جگنو کی مانند چھپاؤ گے تو اس راہ پہ آگے بڑھو گے۔ جس دن تم نے سونا بنا کر استعمال کر لیا' کسی کو دیکھ کر اس کا حیوان بتا دیا' کسی کے متعلق کوئی فیصلہ کر دیا تو اس دن' اس سے تم بڑے امتحان میں پڑ جاؤ گے۔ یہ بات یاد رکھنا' فقیر موت سے زیادہ...... کسی کی جانب سے اُترے ہوئے کسی امتحان سے ڈرتا ہے...... میرا خیال ہے' تم میرا اشارہ سمجھ گئے ہو گے۔''

اَب تو جیسے یہ سب کچھ میرے روزمرّہ میں شامل ہو چکا تھا۔ علی الصبح چاچی کو جا کر سلام کرنا۔ وہیں نہانا' وضو کرنا' نماز کے بعد وہاں قرآن مجید پڑھنا پھر چاچی کے ساتھ پودوں پھولوں کو پانی لگانا۔ یہ پودوں والا کام میں اکیلا ہی کرتا' اس دوران چاچی میرے اور اپنے لئے چُوری بنانے میں مصروف ہو جاتی' چاچا اپنا مَن پسند ناشتا باقرخانی اور کشمیری چائے لیتا۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر تختِ دراز پہ بیٹھ جاتے اور یوں ہی کہیں سے اُڑتی چنگاری کی طرح کوئی بات آ گرتی اور پھر سلسلہ تحیرّ و تکلم شروع ہو جاتا' اس دوران میں چاچی کے پاؤں داب تا رہتا۔ سورج نکلنے پہ بچّے بالے بھی آنا شروع ہو جاتے تو میں اجازت لے کر اپنے گھر اُتر آتا اور سکول جانے کی تیاری میں لگ جاتا۔ شام کھیل کود کے بعد پھر چاچی کے صحن اُتر جاتا جہاں چاچی کو میں نے ہمیشہ نظریں اُٹھائے ہوئے اپنا منتظر ہی پایا۔ چاچی بچوّں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ رات کے کھانے کی تیاری میں بھی لگی رہتی اور ساتھ ساتھ ہمارے اپنے مَن مزے کی باتیں بھی چلتی رہتیں...... جب سے میری بائیں آنکھ کا کوئی پردہ ہٹا تھا' میں اک عجیب سے مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ ایک آنکھ کچھ دیکھتی تو دوسری کچھ اور' بالکل ایسے ہی جیسے ایک آنکھ پہ ہتھیلی رکھ کر دیکھیں تو منظر کچھ نظر آتا ہے۔

دوسری آنکھ پہ ہتھیلی رکھ کر دیکھیں تو کچھ اور' منظر کا مرکز ایک ہی ہوتا مگر قدرے دائیں بائیں کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ۔ بازار سے گزر رہا ہوں' ایک دم یوں لگا کہ جنگلی منگلی جانوروں کا ایک ریوڑ گزر رہا ہے۔ سانپ' بچھو' بلیاں' باگڑ بلے' چوہے' مینڈک۔ دوسرے لمحے انسانوں کی بھیڑ۔ کبھی دونوں منظر ایک دوسرے پہ "سپر امپوز" سے ہوتے دکھائی پڑتے...... ایک دن چاچی سے ذکر کیا' کہنے لگیں۔

"شروع شروع میں تو ایسا ہی ہوگا۔ تم اگر چاہو تو ایک طریقہ اختیار کر سکتے ہو کچھ دنوں بعد یہ مسئلہ پھر پیدا نہ ہوگا۔ اپنی ڈرائنگ کی کاپی کے سائز کا ایک آئینہ لو' لمبائی کی جانب سے دو حصوں میں تقسیم کر کے بائیں حصہ پہ کالا کپڑا یا کالا کاغذ چڑھا کر اپنے قد کی اونچائی کے مطابق سامنے دیوار پہ لگا لو۔ چار فٹ کے فاصلے پر سامنے کھڑے ہو جاؤ' لیکن یہ احتیاط رہے کہ سورج تمہارے پیچھے ہو' یعنی سورج کی چمک شیشے پہ پڑتی ہو اور اس کا عکس تمہاری آنکھوں پہ پڑے۔ اب دائیں آنکھ پہ ہتھیلی رکھ کر شیشے کی جانب یوں دیکھو کہ تمہیں صرف کالا حصہ ہی دکھائی دے۔ ہتھیلی ہٹا کر پھر جما کر سات مرتبہ ایسا کرو کہ صرف کالا کاغذ نظر آئے اور چکاچوند والا حصہ دکھائی نہ دے۔ پھر سات بار بائیں آنکھ پہ ہتھیلی جما کر ایسا ہی عمل کرو کہ ہر بار چکاچوند والا حصہ دکھائی دے اور ہر بار ہتھیلی جماتے اور ہٹاتے وقت یہ پڑھو۔" ..... ایک ...... [illegible] ...... ہو جائے گی کہ تم جس شخص کا دوسرا روپ دیکھنا چاہو اسے دائیں آنکھ ایک لمحہ کے لئے بند کر کے دیکھ لو' اس کا حیوانی روپ تمہارے سامنے دوہرا ہوگا ورنہ دونوں کھلی آنکھوں سے وہ اپنے انسانی سراپے میں نظر آئے گا۔

اگلے سات روز میں اس عمل کو کرتا رہا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ایک ہی روز میں ہی یہ سارا عمل کر گزرتا...... خیر' سات دنوں بعد واقعی ایسا ہو گیا۔ دائیں آنکھ ایک لمحہ بند کر کے میں چند الفاظ زیرِ لب پڑھتا' بائیں آنکھ کے آگے وہی آئینے والا کالا کاغذ سا آ جاتا' پھر فوراً سامنے والے کا دوسرا روپ اُبھر آتا۔ چاچی کی نصیحت یاد تھی کہ علم ہو یا ہنر' ان کا استعمال کبھی بیجا نہ کرو۔ اس طرح یہ تمہارے سینے میں محفوظ و مصئون رہے گا۔ تم اس کی حفاظت کرو گے تو یہ تمہاری حفاظت کرے گا' ایک اور نشست میں چاچی نے زور دے کر کہا تھا کہ کاکا! کبھی کسی کو جاننے کی کوشش مت کرو تاوقت کہ جاننا تمہاری اشد ضرورت نہ ٹھہرے۔ کوئی سامنے ہو تو مت پیچھے پڑو کہ یہ کون ہے' اس کا حیوان کون سا ہے۔ اس طرح خوامخواہ وقت ہی تو ضائع کرو گے۔ سینکڑوں لوگ روز ملتے ہیں' ان سب کو جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں۔ ایک شخص اگر حاضرات یا موکلات سے کام لینے کا ہنر و عمل جانتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ ہر جگہ یہی کام کرتا پھرے۔ تم اگر ہر کسی کا حیوانی روپ دیکھتے پھرو گے تو ہمیشہ بے چین اور متردد رہو گے' اپنے اصلی کام سے

دُور ہو جاؤ گے۔ کوئی کچھ اور کوئی کچھ نظر آئے گا۔ تمہارے لئے جینا مشکل ہو جائے گا۔ تم کسی کے گھر جاتے ہو' وہاں تمہیں عورت کے روپ میں کوئی ناگن نظر آتی ہے۔ اب ہو سکتا ہے وہ تمہاری چچی' ممانی یا کوئی اور عزیزہ ہے۔ اگر تم نے اس کا یہ روپ ظاہر کر دیا یا اسے بتا دیا تو تم ایک گناہ اور جُرم کے مُرتکب ہو گئے۔ یاد رکھو' جہاں ''جاننا'' ایک نعمت ہے وہیں نہ جاننا بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے..... چاچی کی ان باتوں نے جہاں مجھے ایک ''بچے'' سے اُٹھا کر ''بڑا'' کر دیا تھا' وہیں میں اس معاملے میں بڑا سنجیدہ اور گہرا بھی ہو گیا غیر سنجیدہ رہتا تو میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے طور بڑا پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جو کچھ بھی سیکھوں یا جانوں گا' اس کا نہ تو کبھی غلط استعمال کروں گا اور نہ ہی کبھی کسی کے سامنے آؤں گا۔ ان علوم کو خفی اور سری اسی لئے ہی کہتے ہیں کہ یہ سات پردوں اور سات سمندروں کی تہہ میں چُھپا کر رکھے جاتے ہیں۔

● شکر گڑھ میں کھوڑے کے پہاڑ......!

انہی دنوں ہمیں بھی چھٹیاں ہو گئیں۔ سکول کے بچوں کے لئے یہ چھٹیاں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ بہت پہلے ہی پروگرام بن جاتے ہیں کہ کہاں کہاں جانا ہے۔ پچھلی چھٹیوں میں ہم ڈسکہ میں اپنی بڑی آپا جی کے ہاں گئے تھے' اس مرتبہ ہمارا پروگرام شکر گڑھ جانے کا تھا۔ وہاں میرا ایک کلاس فیلو سرفراز رہتا تھا' سرفراز بہت عرصہ ہمارے گھر بھی رہا۔ وہ شکر گڑھ کے دُور افتادہ گاؤں کا رہنے والا تھا اس لئے میں مذاق میں اسے پینڈو کہا کرتا تھا' ہمارے گھر رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیچارہ سادہ سا ایک پینڈو تھا اور سیالکوٹ میں اکیلا' بڑا ذہین' سمجھدار' تعلیم حاصل کرنے کا شوقین۔ ہیڈ ماسٹر کی سفارش پہ والد صاحب نے اسے گھر پہ رکھ لیا' ثواب کے علاوہ شاید ان کے پیشِ نظر یہ بھی ہو کہ پڑھائی میں لائق اور شریف نمازی بچہ ہے' مجھے اس کی صُحبت صالح کے علاوہ نماز' روزہ اور لکھائی پڑھائی میں بھی مدد ملے گی۔ چونکہ میں بھی اکلوتا بیٹا تھا' میرا دل بھی لگا رہے گا۔ اس کا کپڑا لتا' کھانا پینا' کاپیاں کتابیں' سب کچھ میرے ساتھ ہی تھا۔ جیسے میں' ویسے ہی سرفراز۔ والدہ اور والد صاحب اس کو اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ اکثر وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی اپنے گاؤں جایا کرتا تھا' اس کا گاؤں کوسوں دور تھا۔ پہلے نارووال جاؤ پھر شکر گڑھ اور وہاں سے پیدل یا سواری پہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں اس کے گاؤں پہنچو۔ دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں۔ دریا کی وجہ سے ہر سو سبزہ ہی سبزہ' ہرے بھرے کھیت کھلیان' درخت' مویشی' محبت کرنے والے

سیدھے سادے لوگ۔ شہر کی کثافتوں، منافقتوں اور گہما گہمیوں سے دُور پڑے ایسے مثالی گاؤں ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تو ہیں۔ دو کچے کمروں، بڑے سے دالان اور وسیع سے صحن پہ مشتمل اس کا گھر تھا جسے گھر کی بجائے گھروندا کہنا زیادہ بھلا لگتا ہے۔ صحن میں کیکر اور آم کے درخت، ایک کنواں، تنور۔ ایک کونے میں بیت الخلاء، دوسری جانب ننگا باورچی خانہ۔ ایک شتر بچہ، بیلوں کی جوڑی، گھوڑی، گدھے کا بچہ، بھینسیں، ایک گائے اور بے شمار مرغیاں چوزے۔ گھر کیا تھا ایک چھوٹا سا چڑیا گھر تھا۔ کیکر کے اُوپر پھنگوں پہ جھولتے ہوئے بیا کے گھونسلے، دروازے کی چوکھٹ سے لٹکے ہوئے کالے تیتر کا پنجرہ۔ لسی بلونے والی مدھانی پہ بیٹھا ہوا ہریل طوطا...... کمی تھی تو صرف ایک ہاتھی، چیتے، ایک ہرن اور زرافے کی۔ میرے لئے یہ گاؤں اور خاص طور پہ یہ گھر میرے خوابوں کا گھروندا تھا، یہاں پہنچنے کے لئے میں سارا سال خواب اور خواہشیں بُنتا رہتا۔ آٹھویں تک سرفراز اور میں ساتھ ساتھ رہے امتحانوں کے بعد اچانک اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اسے ٹی بی تھی گاؤں سے اُٹھا کر سیالکوٹ کے بڑے ہسپتال میں لائے، بہتیرا علاج معالجہ کیا، چند روز وہ ہمارے گھر بھی رہا۔ آخر وہ جانبر نہ ہو سکا، باپ کی موت کے بعد سرفراز کے لئے سیالکوٹ میں کشش نہ رہا۔ بڑے ٹوٹے ہوئے دل اور مایوسی کے عالم میں مجھے چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا گیا، اب وہ مجھے شکرگڑھ [illegible] رہا تھا، پچھلے دنوں وہ ایک روز کے لئے آیا تھا، صرف مجھے یہ کہنے کے لئے کہ میں ان چھٹیوں میں فوراً اس کے پاس پہنچوں۔ اباجی اور امی سے بھی وہ وعدہ لے کر گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی چاچی سے بھی ملوایا، وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوئی اور کافی دیر اس سے باتیں کرتی رہی۔ اگلی صبح اسے ناشتے پہ چُوری کھلایا جس کے بعد سرفراز واپس شکرگڑھ چلا گیا...... میرے کہنے پہ سرفراز نے چاچی سے بھی میرے شکرگڑھ جانے کی اجازت لی تھی کیونکہ میں چاچی کی اجازت کے بغیر اب کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میرے لئے چاچی سے جُدا ہونے کا تصور بھی محال تھا، اِدھر چاچی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتی تھی مگر اس نے خوشی سے جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ میں جب تک چاہوں، وہاں قیام کر سکتا ہوں۔ میں چاچی کی اس شفقت پر قربان ہو گیا۔

دوسرے روز میں شکرگڑھ جانے کے لئے تیار تھا۔ میرے چند کپڑے، کچھ کتابیں رسالے ایک بیگ میں بند تھے۔ میں اپنے گھر سے فارغ ہو کر آیا تھا، اب صرف چاچی سے دُعا اجازت لے کر سٹیشن پہنچنا تھا جہاں ساڑھے نو بجے والی گاڑی پہ سوار ہونا تھا۔ چاچی نے چُوری تو مجھے صبح اپنے وقت پہ ہی کھلا دیا تھا۔ ایک پوٹلی اور کچھ روپے مجھے تھماتے ہوئے بولی۔

"یہ چُوری مار راستے میں جب بھوک لگے' کھا لینا۔ یہ کچھ روپے ہیں' دوست کے گھر جاتے ہوئے کچھ پھل خرید لینا اور باقی پیسے جہاں تم دونوں دوستوں کو ضرورت پڑے' خرچ کر لینا...... وہاں پہنچتے ہی دوست کے مرحوم والد کی قبر پہ جانا' فاتحہ پڑھ کر اِن کی اگلے جہان میں آسانی کے لئے دُعا مانگنا۔ رات اندھیرے میں باہر مت نکلنا اور نہ ہی رات کے اندھیرے میں بہتے پانی سے گزرنا......" مجھے چُومتے ہوئے کہا۔ "جاؤ' اللہ تمہارا نگہبان......"

● تختِ سلیمان کا پایہ' خواج خضر کی بکری......!

ظہر کی نماز سے بہت پہلے میں شکر گڑھ پہنچ چکا تھا۔ سرفراز اور اس کا چچازاد بھائی مجھے لینے آئے تھے' خوب جپھیاں ڈال کر ملے۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں دو سائیکلوں پہ گاؤں کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر پہلے تو ہم نہائے دھوئے' کھانے سے فارغ ہو کر مسجد کی جانب ہو لئے۔ نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں کھلیانوں کی سیر کرتے کرتے دریا کی جانب نکل گئے۔ کنارے سے کافی ادھر بیلے میں درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے پاس بہت سے مرد و زن دکھائی دیئے۔ پہلے تو یہ گمان گزرا کہ شاید کوئی قبرستان ہے لوگ باگ میت دفنانے آئے ہیں مگر میرے دریافت کرنے پہ سرفراز کہنے لگا۔

"نہیں یار! یہاں کوئی قبرستان نہیں۔ یہاں خواج خضر کی بکری اور کشتی ہے۔ آج جمعرات کے روز لوگ یہاں خواج خضر کا منڈا چھڑانے آتے ہیں۔"

"بکری...... منڈا...... خواج خضر......؟" میں نے زیرِ لب دُہرایا۔ "بھئی' یہ خواج خضر' بکری اور منڈا کیا چیزیں ہیں......؟"

سرفراز کچھ جواب دینے کی بجائے میرا ہاتھ پکڑ کر ادھر درختوں کے جھنڈ کی جانب ہو لیا' آم کے ایک درخت کے نیچے پہنچ کر کہنے لگا۔

"خان' یار! دراصل میں یہ بُھول گیا کہ آج جمعرات ہے ورنہ میں تمہیں اس طرف ہرگز نہ لاتا...... یہ توہم پرست دیہاتی لوگ ہیں' یہ جہاں مطمئن ہیں ان کو وہیں رہنے دو۔" وہ مجھے ذرا اور قریب لے جا کر روکتے ہوئے کہنے لگا۔ "بس یہیں سے تم ان لوگوں کو دیکھ لو' قریب جانے کی ضرورت نہیں...... ویسے بھی دیر ہو رہی ہے' ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

"یار' سرفراز! میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہ منڈا' خواج خضر اور یہ بکری' یہ سب کچھ کیا ہے

ہو تم کہہ رہے ہو کہ یہ توہم پرست دیہاتی بے وقوف ہیں' میں ان کے قریب نہ جاؤں بلکہ دُور سے ہی نظارہ کر کے واپس لوٹ جاؤں...... آخر کیوں؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اِدھر لوگوں کی جانب کھینچتے ہوئے مزید کہا...... ''مائی ڈیئر پینڈو! میں ان سے زیادہ توہم پرست ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ یہیں بتا دو ورنہ میں جا رہا ہوں خواج خضر کو ملنے......''

سرفراز زچ ہو کر میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا' مجھے گھسیٹ کر ایک طرف لے جا کر ایک ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پہ بٹھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''آج سے کچھ عرصہ پیشتر اسی جگہ' انہی درختوں کے جھنڈ میں ایک اجنبی ملنگ نے کہیں سے وارد ہو کر ڈیرہ ڈالا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ دریا کا کنارہ' بیلہ' سنسان بے آباد سا ہے اور بارڈر بھی نزدیک ہے۔ یہاں یا تو چرواہے اپنے ریوڑ مویشیوں کے ساتھ آتے ہیں یا کبھی اِکا دُکا کسان جنہوں نے تربوز خربوزے یہاں بو رکھے ہوتے ہیں...... ملنگ نے چپکے سے یہاں ڈیرہ جما لیا' نہ وہ کسی سے کچھ مانگتا تھا اور نہ ہی کسی سے کوئی بات چیت کرتا تھا۔ جب بھی اسے کسی نے دیکھا' خاموش اور دھیان میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ گرمیوں' سردیوں میں وہ ایک ہی لنگوٹ رہتا تھا۔''

میں نے [illegible] سرفراز! اگر اس ملنگ کو بقول تمہارے کھانے پینے کی ضرورت نہیں تھی۔ سردی گرمی سے بھی بے نیاز تھا تو میرا خیال ہے کہ اِسے لنگوٹ کی بھی کوئی حاجت نہیں تھی...... میرے [illegible] چاچی نے مجھے بتایا ہے کہ فقیری' چھپانے کا نام ہے اور میں نے اپنی طرف سے اخذ کیا ہے کہ ملنگی جوگی کے ہم معنی ہے' اسے ننگا ہونا چاہئے جیسے ننگا پربت ہے' اس نے تو کوئی لنگوٹی وغیرہ بھی نہیں پہنی ہوئی یا جیسے نانگا منڈی ہے......''

''نانگا منڈی نہیں' مانگا منڈی......'' سرفراز نے میری تصحیح کی۔

''میری غلطی دُرست کرنے کا شکریہ!...... ویسے میں بھی اپنی جگہ پہ دُرست ہوں کہ جس نے مانگا اس کو بھوناگا۔ جس نے دستِ طلب بڑھا کر مانگ لیا' وہ بھوننگا ہو گیا...... ہاں' تم اس ملنگ کے لنگوٹ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے......؟''

''یار خان! تم سے کوئی کیا بات کرے' تم تو بات کا نست مار کے رکھ دیتے ہو۔ پچھلے سال جو تم نے اسٹیشن کے مسافر خانے والے سائیں ڈھوئیں شاہ کا ''بڈاوہ'' باندھا تھا' وہ تب سے کہیں غائب ہے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں' خدا کے لئے اس دفعہ تو چھٹیوں کو برباد مت کرو۔ چھوڑو ان کو' ہم نے کون سا ان کے ٹھیکے لے رکھے ہیں۔ اُٹھو چلیں' گائے کا دودھ بھی دوہنا ہے اور چارا پٹھے بھی کاٹنے ہیں۔''

میں نے اس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میاں گوالے! تمہارے یہ کام دھندے تو ہوتے ہی رہیں گے' میں تو یہ ملنگ والا ڈرامہ دیکھ کر ہی جاؤں گا...... ہاں' تم آگے بڑھو۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بتانے لگا۔ ''پھر یہ ملنگ تھوڑا تھوڑا بولنے لگا......''

میں نے یکدم پھر اسے ٹوک دیا۔ ''تم نے لنگوٹ والا سین کاٹ دیا ہے۔ فلم کو وہیں سے چلاؤ جہاں لنگوٹ ہے۔''

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کھسیایا۔ خدا دے واسطے' خان! ایس لنگوٹ نوں تے مینوں بخش دے......''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پینڈو یار! دراصل یہ ہندی لفظ اپنے صوتی' صوری اعتبار سے بڑا ہی ذلیل اور گندا ہے۔ کہتے ہیں نا' مارنے سے گھسیٹنا زیادہ برا ہوتا ہے' تو میں بھی اس لنگوٹ کو گھسیٹ رہا ہوں...... تم مجھے اس ملنگ کے پاس لے چلو' میں یہ لنگوٹ والا کام اپنے مبارک ہاتھوں سے ہی کر دوں......''

وہ تنگ آ کر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ایسا کرو' تم وہاں ملنگ کا لنگوٹ اتارو' میں تو جا رہا ہوں گھر' مجھے خواہ مخواہ پھڈے میں ملنگ سے پٹوانے کا کوئی شوق نہیں۔''

میں نے اس کی پتلی سی ٹانگ ناپتے ہوئے اسے پھر پکڑ کر بٹھا دیا۔

''اچھا' لنگوٹ کو گولی مارو...... ہاں' تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ ملنگ اب تھوڑی بہت بات چیت کرنے لگا مگر کس سے...... وہاں تو وہ اکیلا تھا؟''

''بھائی' لوگ اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ گوالے' ڈھور ڈنگروں کے رکھوالے' آتے جاتے مسافر' شکاری' کسان وغیرہ۔ پھر ان ہی لوگوں نے مل ملا کر اسے ایک جھونپڑی بھی بنا دی۔ آس پاس دو چار پانی کے مٹکے اور چٹائیاں بھی رکھ دیں۔ اب کیا ہوا کہ پہلے ایک آدھ' پھر دو چار ملنگ سادھو قسم کے لوگ مستقل اس کے ڈیرے پہ رہنے لگے' اکا دکا منت مرادوں والا بھی پہنچنے لگا۔ پھر ایک روز' زور کا دھماکا ہوا' اردگرد کے بیسیوں گاؤں جمع ہو گئے۔ خواج خضر نے اس ملنگ کو اپنی زیارت کروائی اور اشارہ دیا کہ جس جگہ وہ بیٹھا ہے' عین اس کے نیچے میری پرانی کشتی کا ایک ٹکڑا دبا پڑا ہے' وہی کشتی جس کو خواج خضر نے اپنے ہاتھوں سے دو نیم کیا تھا۔''

میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' غصے سے میں لرزنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ گئیں...... ''استغفراللہ'' میرے منہ سے نکلا اور کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ سرفراز اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"اگر تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو میں گھر چلا جاؤں گا...... اگر تم نے کچھ سُننا ہے تو جو بھی ہے خوشی سے سُنو اور سُننے کے بعد تم نے جو بھی توپ چلانی ہے وہ چلا لینا لیکن میرے گھر جانے کے بعد کیونکہ مجھے تمہاری طرح ذلیل و خوار ہونے اور "ٹُھٹ" کھانے کا کوئی ارمان نہیں۔"

میں نے اس کی خوشامد کرتے ہوئے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے برادرِ محترم، عزیزِ من! درحقیقت آپ نے میرے جذبات کا غلط اندازہ فرمایا ہے...... دراصل اتنے بڑے انکشاف پہ میں اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھ سکا۔ آپ بلا احتمال اپنا بیان جاری رکھیں۔"

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "خواج خضر کی کشتی کا ظاہر ہونا تھا کہ خلقِ خدا جوق در جوق زیارت کے لئے ٹوٹ پڑی......"

میں نے بڑی عاجزی سے اسے پھر ٹوکا، بلکہ ہاتھ باندھ کر پوچھا۔ "جان کی امان پاؤں تو پوچھوں کہ واقعی ملنگ کے ڈیرے پہ خواج خضر کی کشتی موجود ہے؟"

"ہاں بھئی ہے...... صدیوں پرانی سیاہ کالی لکڑی کی کشتی کا ایک بڑا سا ٹکڑا جو بیچ میں دھنسا ہوا ہے اندھوں کو بھی نظر آتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کی زیارت کی ہے بلکہ بوسہ بھی دیا ہے۔"

"شاباش...... آگے ارشاد فرمائیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ جھنجلاتے ہوئے سڑا سا بولا۔ "اچھا اچھا، مجھے زیادہ لیسیاں لگانے کی ضرورت نہیں...... خواج خضر کی بیڑی میں نے کئی بار دیکھی اور چومی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں اللہ کی قدرت کا ایک اور نظارہ بھی موجود ہے وہ ایک چھوٹی سی بکری ہے جس کے ایک طرف پیٹ پہ "محمد رسول اللہ" لکھا ہوا ہے۔ مشہور ہے کہ اس بکری کا تعلق یا اس کی نسل اس بکریوں کے ریوڑ سے ہے جنہیں حضرت موسیٰ چرایا کرتے تھے۔"

"لاحول ولاقوۃ الا باللہ......" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے پھر کوئی بات کی......؟" وہ خشمگیں نظروں سے مجھے تولتے ہوئے بولا۔

"توبہ بھئی، میں تو قرآن شریف کی ایک آیۂ مبارکہ پڑھ رہا تھا......" میں نے جھٹ جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔ "یار! تم نے پھر یہ محترمہ بلی مبارکہ بھی دیکھی، چومی ہوگی......؟"

"بلی نہیں، بابا!...... بکری، بکری...... ب، بکری...... سمجھے؟"

"یار! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ بلی نہ سہی، بکری سہی۔ ان دونوں کے درمیان بھلا فرق ہی کتنا

ہے' صرف یہ کہ بکری سے دودھ نکالنا پڑتا ہے اور بلی سے زبردستی نچوڑنا پڑتا ہے۔ ایک ''میں میں'' کرتی ہے تو دوسری ''میاؤں میاؤں'' جیسے ایک پنجابی بول رہی ہو' دوسری سرائیکی...... اچھا بھائی' آگے بڑھو۔ تم نے بکری کو چوما بھی ہوگا' اِس کی مینگنیں......؟''

''دیکھو' خان!...... میں شرافت سے کہہ رہا ہوں...... اُٹھو چلو' دیر ہو رہی ہے۔''

میں اسے آمادۂ پیکار دیکھتے ہوئے واقعی شرافت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یار! جانے سے پیشتر ذرا اِن متبرک چیزوں کی زیارت ہی کر چلیں......'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔

''...... چلا چلتا ہوں مگر خیال رہے' کوئی بدتمیزی وغیرہ نہ کرنا۔ یہ دیہاتی کام پہلے ڈال دیتے ہیں' سوچتے بعد میں ہیں......''

وہاں تو مستورات کی قطار لگی ہوئی تھی۔ عورتیں سروں پہ المونیم کے بڑے بڑے دیگچے دھرے آ جا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مقدس بکری کے لئے دیسی گھی' تلوں کے تیل میں گندھا ہوا چارہ اور تازہ ونڈا لاتی ہیں۔ کچھ دیہاتی بوڑھے سفید سُرخ اور سیاہ داڑھیوں والے ڈیرے کے باہر حُقے سنبھالے بیٹھے تھے۔ بچے' بوڑھی جوان عورتیں بڑی خاموشی اور وفورِ عقیدت سے سرشار سائیں جی یا شاہ جی کے گرد سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ لمبی لمبی لٹیں' سیاہ سفید بھرپور بے تحاشا داڑھی' نشے سے چڑھی ہوئی مخمور آنکھیں' نیچے ٹانگوں پہ تہبند' اُوپر ننگے پنڈے پہ گائے بھینس باندھنے والے لوہے کے سنگل' میل کچیل سے اٹا ہوا مُردار سا سائیں اپنے سامنے لکڑی کے جھولنے والے پالنے میں ریشم میں لپٹے ہوئے بکری کے ایک گلگوتھنے سے بچے کو مور چھل سے ہوا دے رہا تھا۔ ہر کوئی آنے والا پہلے سائیں جی کو بڑے ادب سے سلام کرتا' پھر ہاتھ پاؤں چُومتا' نذر نیاز گزار کر پھر وہ بکری کے بچے کو سلام اور اس پہ پھول پتی نچھاور کرتا۔ اس کے پاس پڑے ہوئے آہنی صندوق میں حسبِ توفیق نقدی کی صورت میں نذرانہ ڈال دیتا۔ عورتیں باری باری بکری کے پالنے کو جھلانے کی سعادت بھی حاصل کر رہی تھیں۔ میں نے بھی اندر آ کر یہی کچھ کیا۔ فارغ ہو کر میں اور سرفراز' سائیں جی کے سامنے بیٹھ گئے۔ گو یہاں عورتوں کی بھرمار تھی' مرد لوگ صرف سلام اور زیارت کے بعد باہر نکل جاتے مگر ہم تو بچے پالے تھے' عورتوں سے جُڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ یہاں بیٹھتے ہی میرے اندر جیسے کوئی کُھد بُھد شروع ہو گئی تھی' بار بار ذہنی جھٹکے لگتے محسوس ہو رہے تھے اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سرفراز نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دے کر کان میں کہا۔

''خان! کشتی شریف کی زیارت بھی کر لو' پھر یہاں سے کھسکیں...... یہاں صرف عورتیں ہی بیٹھ

سکتے ہیں۔"

مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ یہاں کوئی کشتی بھی ہے...... سائیں صاحب کے دائیں جانب ایک جھنڈی کی بنی ہوئی تھی' بالکل جیسے بچے عیدمیلادالنبیؐ کے موقع پہ چندہ جمع کرنے کے بعد گلی کوچوں میں سجاتے ہیں۔ ذرا آگے جھک کر دیکھا' زمین کے اندر سے ایک پرانی لکڑی کا ٹنڈ سا باہر نکلا ہوا تھا۔ اردگرد دائرے کی شکل میں مٹی نکال کر زمین ذرا گہری کر دی گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی رنگین موٹرکاریں' کھلونے' کرنسی نوٹ' مٹی کے گھگو گھوڑے' بے شمار بچوں والی نئی پرانی چیزیں پڑی تھیں۔ لکڑی کا باہر نکلا حصہ ایسا ہی تھا جیسے کسی پرانی ہل یا کولہو کے ہتھے کو زمین میں داب دیا گیا ہو۔ عقیدت مندوں نے اس لکڑی کے ٹنڈ کو گھی چپڑ چپڑ کر بڑا چمکیلا اور ملائم کر دیا ہوا تھا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر زیارت کی' بلکہ چھونے کی سعادت با برکات سے مستفیض بھی ہوا۔ اللہ اللہ کہاں میں اور کہاں یہ مقام !...... ایک عجیب قسم کی چٹکی بھر کر سرفراز مجھے باہر کھینچ لایا۔

"یار! کیا جلدی ہے...... گھر ہی تو جانا ہے' مجھے جی بھر کر زیارت تو کر لینے دو۔"

"خان صاحب! اندر زیادہ دیر رکنے کی شاہ جی کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔" سرفراز نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"عورتیں اور لڑکیاں تو بڑی جم جما کر شاہ جی کے گرد بیٹھی ہیں' شاہ جی انہیں کچھ نہیں کہتے...... سرفراز! یہ تو بتاؤ' یہ بکری کا بچہ زندہ ہے یا کسی مردہ بچے کے کلبوت میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ مجھے تو وہ کوئی حرکت کرتا دکھائی نہیں دیا؟"

"کانوں کو ہاتھ لگاؤ' یار!...... وہ اکثر سویا رہتا ہے اس لئے حرکت نہیں کرتا۔ سائیں جی رات کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں' فیڈر سے دودھ پلاتے ہیں۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی مینگنیاں بھی کرتا ہے۔ سو روپے کی ایک مینگنی ملتی ہے۔ عورتیں سکھا کر' منکے کی مانند دھاگے میں پرو کر بیمار بچوں کے گلے میں باندھتی ہیں' کالی کھانسی اور دمے کے مریض کو کچے ادرک اور شہد کے ساتھ گھوٹ کر چٹائی جاتی ہیں اور تو اور گنٹھیا جوڑوں کے درد اور پتے کے ورم والے مریض اس مینگنی کو میٹھے تیل میں جلا کر استعمال کرتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ اسی طرح کچی یادداشت' کورنظری' کانوں کی بہتی پیپ کے امراض میں اسے عرقِ دھتورہ میں یک وزن' ایک جان کر کے آنکھ کان' کھوپڑی میں لگایا اور ٹپکایا جاتا ہے۔ اٹھراہ کے مرض میں ایک دھرکونہ ایک مینگنی' ایک دھرکونہ کی مالا پرو کر مریضہ کے گلے میں ڈالی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ قوت باہ' امساک کے امراض میں بھی شافی پائی گئی ہے۔ کہو تو ایک دو مینگنیاں تمہیں بھی دلوا

دوں؟'' وہ ایک ہٹے کٹے ملنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ سائیں برکتا ملنگیوں کا ٹھیکیدار ہے۔''

مَیں سرفراز کی اوٹ پٹانگ سے بے زار ہو چکا تھا' اسے دھکیلتے ہوئے گاؤں کی راہ پہ لگا لیا۔ گاؤں کچھ زیادہ دُور نہ تھا مگر مَیں بڑی دُور کی سوچ رہا تھا۔ میرے اندر ایک جھونجل سی مچی ہوئی تھی۔ دُکھ یہ نہیں تھا کہ یہ لوگ کیا ڈرامہ لگائے ہوئے ہیں' اذیت یہ تھی کہ بھولے بھالے سیدھے دیہاتی لوگ اپنی کم علمی اور توہم پرستی کی وجہ سے ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ ایسے دھوکے بازوں' جعلسازوں اور نام نہاد پیروں ملنگوں کی چیرہ دستیوں سے بھولے بھالے عوام کو بچانے کی ذمہ داری کن اداروں' لوگوں یا محکموں پہ عائد ہوتی ہے؟ ان اردگرد کے گاؤں دیہوں میں یقیناً ایسے علم والے' عالم' مولوی یا پڑھے لکھے موجود ہوں گے۔ وہ بھی جانتے ہوں گے' ان کے علم میں بھی یہ کچھ ہوگا جو آج میرے علم اور مشاہدے میں آیا ہے پھر یہ لوگ ایسے دھوکے بازوں کا سدباب کیوں نہیں کرتے' سرکاری محکمے ان فراڈیوں کو کیوں نہیں پکڑتے؟...... مَیں ابھی سوچوں میں گم' ایک پتھر سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔

''دیکھ کر چلو...... کیا سوچ رہے ہو......؟'' سرفراز نے مجھے گم صم سا دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سرفراز! یہاں ہر روز ایسا ہی میلہ لگا رہتا ہے؟''

''نہیں تو...... آج چونکہ جمعرات ہے' اس لئے دُور دراز جگہوں سے بھی عقیدت مند زیارت کرنے اور منتیں چڑھانے چلے آتے ہیں ورنہ باقی دنوں میں تو نارمل سا ہی معاملہ رہتا ہے......''

مَیں نے فوراً ایک سوال داغ دیا۔ ''یہ بتاؤ کہ بکری کے بچے پہ ''محمد رسول اللہ'' قدرتی طور پہ لکھا ہوا ہے' تم نے خود لکھا ہوا دیکھا ہے اور یہ بکری کا بچہ شاہ صاحب کو کہاں سے ملا ہے......؟''

''خان! بکری کے بچے پہ ''محمد رسول اللہ'' صاف اور واضح طور پہ لکھا ہوا مَیں نے خود کئی بار دیکھا ہے۔ باقی رہا کہ بچہ کہاں سے آیا تو اس کے بارے میں' مَیں کچھ زیادہ نہیں جانتا' چاہو تو شاہ صاحب سے خود ہی پوچھ لینا۔''

''مَیں نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے جوش سے کہا۔

''دوست! مَیں بھی یہی چاہتا ہوں...... کل صبح ہم پھر یہاں آئیں گے۔''

● پنڈ کا پینڈورا بکس......!

گھر پہنچتے پہنچتے شام کے سائے جنوں کے سایوں کی طرح باون باون گز کے ہو گئے تھے۔

سرفراز کی بے بے نے منڈیر کی اوٹ' ہمیں دُور سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ صحن کا بڑا سا ہاتھی دروازہ پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تو ایک نواری پلنگ پہ چارخانہ کھیس' لال پتے اور سبز پھولوں کی کڑھائی والے تکیے دھرے منتظر تھے۔ صحن کے بڑے حصے میں پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ اُپلوں کا ہلکا ہلکا کڑوا دُھواں' دھوئیں پہ پرندوں کا شور' عجیب سا سماں تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے والی اندھی سی لالٹین دالان کے برآمدے پہ لٹک رہی تھی...... ہم دونوں چارپائی پہ بیٹھ گئے تو سرفراز کی بے بے نے ہلکی سی سرزنش کی کہ تمہیں اس وقت دریا کی طرف نہیں جانا چاہئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد سرفراز کا چچیرا بھائی سلیمان بھی آ گیا۔ سلیمان نے آتے ہی کہا کہ کھانے سے پہلے نہا دھو لو' پاس ہی گلی میں مسجد تھی۔ سلیمان کنویں سے پانی کھینچ کھینچ کر حوض میں ڈالتا رہا' ہم دونوں باری باری خوب مزے سے نہائے۔ مسجد کے بغیر دروازے کے غسل خانے میں کنویں کے پانی سے نہانے کا لطف ہی کچھ اور ہے' کئی بار پانی کے ساتھ ننھے ننھے ڈڈو بھی سر پہ آ بیٹھ جاتے تھے۔ مغرب کی نماز مسجد میں ادا کر کے ہم تینوں گھر پہنچ گئے۔ اب چارپائی کے پاس ایک پیڑھی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ شیشے کا جگ' تین چار شیشے کے گلاس' موسمی پھل وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ سرفراز کی بے بے نے مرغی کا سالن' تنور کی روٹیاں' ہاتھ کی بٹی ہوئی میٹھی سویاں اور مچھلی بھونی ہوئی تھی۔ [illegible] دیہاتی [illegible] کے ایک چیز مجھے سب سے بالاتر تھی کہ ہر کھانے میں دھوئیں کا سواد کیسے رچ بس جاتا ہے۔ دودھ پیو تو جیسے چینی کی بجائے کڑوا دُھواں ملایا گیا ہے' لسی پیو تو یہی مزہ۔ سالن روٹی' میٹھا پھل پھول بھی کا ذائقہ بھی فلیور۔ حتیٰ کہ ان پینڈو لوگوں کی باتوں سے بھی دھوئیں کی دُھونی سی آتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر گاؤں کے باہر کوڑے کی روڑیاں ہوتی ہیں۔ ہر صحن اور گھر میں دودھ کی دَونی کے نیچے دُھواں اُٹھتا رہتا ہے۔ گوبر' گھاس پھوس' جھاڑ جھنکار' کانٹے اُپلے۔ یہاں ہر قابلِ آتش زدنی چیز جلتی کم ہے اور دُھواں زیادہ دیتی ہے...... کھا پی کر ڈکارنے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ گاؤں کا داوا (میراثی) اس کے دو بیٹے جو قریب قریب ہمارے ہم عمر تھے' ایک چھوٹی سی ڈھولک لئے بڑی سی ''سلاما علیکم'' کے ساتھ اندر داخل ہوئے' ابھی وہ نیچے چارپائی کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ سرفراز کے دو اور دوست عمران اور دلاور بھی آ گئے' ہمسائے سے غلام رسول فوجی بھی دیوار پھلانگ کر آ گیا۔ ذرا سی دیر میں چھ سات افراد یوں آ براجے جیسے وہ سارے باہر کھڑے ہمارے کھانے پینے سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے...... گاؤں دیہاتوں کے مجموعی ماحول میں بہت سی اچھائیوں اور چند ایک بُرائیوں میں ایک اچھی یا بُری روایت یہ بھی ہے کہ گاؤں کے کسی گھر میں مہمان اُتر آئے تو سارا گاؤں فرداً فرداً اس سے جا کر ملے گا۔ بڑی سی ''سلاما علیکم'' کے بعد

اُنگلیاں توڑ مصافحہ ہوگا' پھر پسلی کھسکاؤ قسم کا معانقہ ہوگا اور پھر ''سناؤ ہور کی حال اے'' کی گردان ہوگی۔ مجھے ان حرکتوں سے بڑی اُلجھن اور گدگدی ہوتی ہے...... جب سب اکٹھے ہو گئے تو سرفراز کی بے بے برتن سمیٹ کر 'صحن کے'' اس پار'' باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ''اس پار'' کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ صحن کیا تھا' پانی پت کا میدان تھا...... چاند اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کسی گھر کے صحن میں نہیں' بادلوں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں' ہلکے ہلکے دھوئیں کی دُھند ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ دیواریں' منڈیریں' دَرخت وغیرہ بڑے پُراسرار سے لگ رہے تھے۔ کوئی حقہ بھی اُٹھا لایا تھا' دادا اور فوجی اس سے شغل کرنے لگے۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی ہوائی باتیں چلتی رہیں۔ پھر یوں ہی سرفراز نے دریا پہ خواج خضر کی زیارت کا ذکر چھیڑ دیا کہ آج ہم اُدھر گئے تھے' خان صاحب بھی خواج خضر کی بیڑی کی زیارت کر آئے ہیں اور کلّے والا بکری کا بچہ بھی دیکھا ہے۔ دادا بیچ میں بول پڑا۔

''بچوں کو ساتھ لے کر آیا ہوں سرکار! یہ بشیرا ہے' بڑی اچھی ڈھولکی بجاتا ہے اور یہ نذیرا گاتا ہے۔ مولا خوش رکھے' یہ بچے بڑے گُر سُر میں ہیں۔ فلمی گانے' غزلیں' ٹپے' ماہیا' مرزا' جو فرماؤ گے' بچے سناویں گے...... موتیاں والیو! ذرا ادھر دھیان کرو......''

اس سے پہلے کہ بشیرا ڈھولک پہ شروع ہو گیا' میں نے ایک دفعہ اسے ٹھوڑا' پھر ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''دیکھو بھئی دادا! آج بڑا تھکے ہوئے ہیں اور ایک ضروری مسئلے پہ بات بھی کرنی ہے لہٰذا آج یہ پروگرام رہنے دو' پھر کسی وقت سہی...... اس وقت یہ بتاؤ کہ وہ بیلے والا ملنگ کون ہے' اس کا اصل نام کیا ہے۔ کیا یہ واقعی سیّد ہے یا کوئی انگرا جگرا ہے اور اگر تم وہ خواج خضر کی کشتی اور کلّے والی بکری کی اصل حقیقت کی پوری تفصیلات سے مجھے آگاہ کرو تو تب مانو کہ تم گاؤں کے اصلی دادا ہو......''

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''خان جی! آپ کن بکھیڑوں میں پڑ گئے ہیں' یہ سارے پیٹ پوجا کے چکر ہیں۔ وہ ملنگ اور اس کے چیلے سب چکر باز اور نوسرباز ہیں' سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا حلوہ مانڈہ سیدھا کرتے ہیں۔ ایک دو کو میں ذاتی طور پہ جانتا ہوں لیکن جو بڑا ملنگ ہے' اس کو نہیں جانتا۔ تین چار سال سے وہ کہیں سے آ کر اِدھر بیلے میں بیٹھا ہوا ہے' بالکل خاموش' نہ کسی سے بات چیت کرتا اور نہ ہی کچھ مانگتا ہے۔ کوئی ایسا عمر رسید بھی نہیں' داڑھی مونچھ بال وغیرہ صاف کروا دیئے جائیں تو اندر سے بالکل آلو بخارا نکل آئے۔'' وہ حقے کا دم لگاتے ہوئے پوچھنے لگا...... ''ویسے آپ اس کے متعلق یہ ساری معلومات کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

"دادا! مجھے وہاں کی ہر چیز فراڈ' دو نمبر دکھائی دیتی ہے...... فراڈ دھوکہ تو ہر جگہ ہوتا ہے' ہم کس کس کو روکیں گے مگر مقدس ہستیوں کے نام پہ فراڈ ہو' یہ برداشت نہیں ہوتا...... دادا! میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ دو اور بڑی رازداری سے کام کرو تو تین چار فائدے ہو سکتے ہیں۔"

دادا جھٹ پوچھنے لگا۔ "مثلاً......؟"

"مثلاً نمبر ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ جو انہوں نے غلط چیزیں منسوب کی ہوئی ہیں' ان کی حقیقت کھل کر ہم بھولے بھالے لوگوں کے ایمان کو بچائیں گے۔ یہ بہت ثواب کا کام ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ایسے فراڈیے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی اور یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس علاقے سے یہ گند ختم ہو جائے گا۔"

دادا یہ سوکھے خشک فائدے سُن کر کچھ زیادہ خوش نہ ہوا' بس خاموش سا ہو گیا۔

"خاموش ہو گئے ہو' دادا!...... کیا سوچ رہے ہو؟" مَیں نے پوچھ لیا۔

وہ کہنے لگا۔ "سوچنا کیا ہے' موتیاں والیو! ہم بھانڈ میراثی لوگ ہیں' ہمارے اندر سوچنے کی گراریاں ہی نہیں ہوتیں۔ ہمارا کام اللہ کے بندوں کو خوش رکھنا ہے۔ مولا آپ کو خوش رکھے' میں تو آج گلوکار بچے لے کر آپ کے قدموں میں حاضر ہوا تھا کہ خان صاحب ماشاء اللہ خود بھی بڑے سُریلے ہیں' سُریلے بچوں کو سُن کر حوصلہ افزائی کریں گے۔ سرکار دے قدم برکت سے کل ہمارے گھر بھی مرغی نہیں تو کم از کم کوئی چوچا ہانڈی میں پک جائے گا۔ ایتھے پنڈ وچ بغیر ترکے کے گونگلوؤں تے ٹینڈے کھا کھا کر پیٹ وی پڑاسن گئے نے سرکار! اور وہ جب سے پنڈ میں وارد ہوا ہے' ہمارے نصیبوں میں اب فاقے ہی رہ گئے ہیں۔"

"وہ کون......؟" مَیں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جی...... گورو' جہاں دے ٹینڈے' چیلے جان شڑپ...... وہی بیڑی تے بکری والا۔ ایک بُزبچہ دے دیسی گھی کے چُورے۔ بادام' پستہ' کشمش' گری کھوپا' سُوجی تے چھوہارے...... ہم بھی کس طرح کے مسلمان اور اِنسان ہیں۔ دھوکے باز بے ایمان فراڈیوں کے لئے سَت سَت نعمتیں پکا کر' سر پہ اُٹھا کر ان کے ڈیرے پہ پہنچاتے ہیں اور پاس پڑوس میں کسی غریب فاقہ مست کو سوکھی روٹی اور مٹھی بھر اناج نہیں دیتے۔"

غلام رسول فوجی بھائی نے بھی لُقمہ دیا' کہنے لگا۔

"ہم کو خدا کا خوف نہیں' دادا! اِسی لئے تو خدا نے ہم پہ ایسے چور ڈاکو' دھوکے باز مسلط کر دیئے

ہیں جو ہماری سادگی اور توہم پرستی کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہمیں دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں۔''

مَیں نے دادا کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بڑی ہمدردی سے کہا۔

''تم نے مجھے غلط سمجھا...... تم مُرغی کے چُوزے کی بات کرتے ہو' مَیں تمہارے لئے بہت بڑے شُتر مُرغ کا انتظام کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ بس ذرا خاموش ہو کر سنتے جاؤ۔'' اب مَیں نے بھائی فوجی کو اپنی دائیں طرف بٹھایا اور پوچھا۔ ''فوجی بھائی! تم آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''خان صاحب! فوج میں تھا' اچھی کارکردگی پہ میرا چناؤ کمانڈو کے لئے ہو گیا۔ وہاں بھی مَیں بہادری' محنت اور اپنی اچھی صحت کی بنا پہ بڑا اچھا جا رہا تھا۔ بس آخری امتحان باقی رہ گیا تھا۔ بدقسمتی سے ٹریننگ کے دوران ایک خندق پھلانگتے ہوئے ذرا سا اندازہ غلط ہو گیا' بس اسی غلطی سے ایک ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ چار مہینے تک فوجی ہسپتال میں علاج کرتا رہا مگر ٹانگ میں نقص رہ گیا۔ اب سرکار نے میڈیکل بنیاد پہ مجھے پنشن کے ساتھ ریٹائر کر دیا ہے۔ یہ دیکھیں' میری ٹانگ بالکل ٹھیک ہے' بس ہلکا سا لنگ ہے۔ سرکار کی طرف سے پنشن مل جاتی ہے' اپنی چھوٹی سی کھیتی باڑی بھی ہے اور ساتھ کوشش کرتا ہوں کہ اللہ کی مخلوق کی خدمت اور بھلائی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہوں۔ اردگرد کے پانچ چھ دیہاتوں کی رفاہی فلاحی تنظیم کا رُکن بھی ہوں۔ آپ [illegible] سمجھتا ہوں۔''

مَیں نے فوجی بھائی کو سراہتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو بڑے کام کے' بڑے مخلص اور جذبے والے مجاہد انسان ہیں۔'' مَیں نے دادا اور فوجی بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ جیسے مخلص اور دردمند لوگوں کی وجہ سے تو ابھی تک یہ دُنیا قائم ہے ورنہ کب کے چراغ گُل ہو چکے ہوتے۔''

سرفراز کے دونوں دوست عمران اور دلاور بھی بڑے حوصلہ مند مخلص لڑکے تھے' سرفراز کا چچیرا بھائی سلیمان بڑے کھلے ہاتھ پاؤں کا جیالا سا جوان تھا' کچھ کر گزرنے کا شوق اور حوصلہ رکھتا تھا۔ ہم سب کافی دیر تک اس مسئلے پہ اپنی اپنی رائے اور معلومات کے مطابق گفتگو کرتے رہے لیکن جو کچھ میرے اندر تھا' وہ مَیں نے ابھی کسی پہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ گلوکار بچوں کو نیند آ رہی تھی' باہر چوکیدار گھنگھروؤں والی بڑی سی ڈانگ کے ساتھ چکر لگا رہا تھا۔ دادا اور بچوں کو کل پھر ملنے کے وعدے پر بھیج دیا گیا' کچھ دیر بعد عمران اور دلاور بھی نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ غلام رسول فوجی' سرفراز اور مَیں' ہم تینوں نے آنے والی صبح' اذان سے بہت پہلے دریا پہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر غلام رسول فوجی بھی دیوار پھلانگ گیا تو مَیں اور سرفراز بھاں بھاں کرتے ہوئے پانی پت کے میدان میں اکیلے رہ گئے۔۔۔۔۔ ڈھور ڈنگروں کے گلوں سے بندھی گھنٹیوں کی آواز یا کسی بلّی' بکری کے ممیانے اور میاؤں سے احساس ہوتا تھا

ے علاوہ بھی یہاں کوئی مخلوق ہے۔ تاروں بھرا آسمان' نیالے بادلوں کے ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا مجھے منہ کا چاند' ابابیلوں کی ساؤنڈ بیریئر بریکنگ پروازیں' کچی منڈیروں کے پاس اکا دکا ۔۔۔ ایک عجیب سا پینڈو ماحول جس کی اپنی ایک الگ ہی شان اور خوبصورتی تھی۔ سرفراز بیٹھا بیٹھا ہی ۔۔۔ پہ سرہانے کی جانب لڑھک گیا تھا۔ ہائے' ایسی پینڈو سٹائل نیند مصنوعی زندگی بسر کرنے والے شہر ۔۔۔ کو بھلا کہاں نصیب ہوتی ہوگی۔ رات اور نیند تو ازخود جادو ہیں اور یہ جادو کسی دیہاتی ماحول ۔۔۔ سر چڑھ کر بولتا ہے۔

● "کھیت الخلاء" صلائے عام' پیٹ برداروں کے لئے ......!

گاؤں دیہاتوں میں انسانوں سے بہت پہلے چرند پرند اور دیگر جانور جاگتے ہیں۔ سورج جی ابھی تنتیا کے ہنڈولے میں آنکھیں مل رہے ہوتے ہیں اور ادھر کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے ۔۔۔ دے رہے ہوتے ہیں۔ عورتیں لڑکیاں دودھ دوہ کر بلونے کی تیاری کر رہی ہوتی ہیں' اذان بعد ۔۔۔ رات کب اور ۔۔۔ نیند کی دیوی سے ملا تھا۔ کچھ بھی تو یاد نہیں تھا' بس اتنا یاد تھا کہ جب آنکھ کھلی تو سب اپنی بکھری ۔۔۔ کو سمیٹ رہی تھی۔ دیہاتوں میں لاکھ اچھائیاں سہی مگر ایک برائی سب پہ بھاری ہے اور وہ ہے ۔۔۔ کی۔ میں باہر کھیتوں میں فارغ نہیں ہو سکتا' میں جب بھی کسی دیہات سے بھاگا ہوں تو اس کی ۔۔۔ یہ "کھیت الخلاء" تھے اور اگر کسی گاؤں یا دیہات میں جملہ سہولتوں سے آراستہ باتھ روم ہیں تو ۔۔۔ سے گاؤں ہی نہیں بلکہ گاؤں کے نام پہ گاؤدی ہے' تہمت ہے' الزام ہے۔ کئی بار اس بارے میں ۔۔۔ کہ آخر کیا وجہ ہے' دیہاتی لوگ اپنے گھروں کے اندر بیت الخلاء کیوں نہیں بناتے؟ میری ناقص ۔۔۔ میں یہی وجہ آئی کہ یہاں لوگ سبزیاں ترکاریاں مثلاً گونگلو' باتھو' میتھی پالک' کچی مچی' پیلی مکو' کلفہ ۔۔۔ کے ساگ اور گنے کا جوس بھی استعمال کرتے ہیں اور ان سے فراغت حاصل کرنے کے لئے انہیں ۔۔۔ بیت الخلاء کی ضرورت ہوتی ہے...... سرفراز المونیم کا لوٹا پکڑے میرے سر پہ آ کھڑا ہوا۔

"اٹھو بادشاہ! فارغ ہو لو......"

میں اس کور ذوق پینڈو کا منہ تکنے لگا جو میرے منہ پہ مجھے بادشاہ بھی کہہ رہا تھا اور باہر کھیتوں میں "دعوت فراغت" کا اذن بھی دے رہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ میں بادشاہ ہوں یا گدھا؟...... چونکہ

صبح صبح میں اس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈلی کھجلاتے ہوئے اس سے کہا۔

''فاضلِ اجل وزیرِ اعظم! یہ فراغتی لوٹا یہیں رکھ دیا جائے...... کیونکہ آپ خود بنفسِ نفیس بے پیندے کے لوٹے ہیں لہٰذا آپ آگے آگے ہراول دستے کی ذمہ داری سرانجام دیں۔ مابدولت آپ کے نقشِ کفش پہ قدم بہ قدم' قدم رنجہ فرماتے ہیں۔''

وہ میرا منہ تکنے لگا' شاید سوچ رہا تھا کہ صبح صبح مجھے کوئی مغلِ اعظمی قسم کا دورہ پڑا ہے۔ وہ مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے لوٹے سمیت باہر نکل گیا۔ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ اس نے کوئی عقلمندی دکھائی تھی۔ اگر وہ کوئی اچھا بُرا جواب دے دیتا تو پھر ہم دونوں یہیں فارغ تھے' باہر کھیتوں کی جانب جانے کی حاجت نہ رہتی...... بہرحال' میں نے بھی عقلمندی دکھائی کہ چند منٹوں بعد اسے جا لیا۔

''بڑے تیز گام بنے ہوئے ہو...... رات کو ذکوسی ہوئی مرغی معدے میں پنجے مار رہی ہے یا پیٹ چلا پڑ گیا ہے؟''

میں نے اسے تیز تیز جاتے ہوئے دیکھ کر پیچھے سے کہا مگر مجھے پھر ایک بار اس کی پیٹھ کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ پھر خاموش تھا۔ وہ چینڈو یانہ رفتار سے برابر [illegible] اونچے نیچے رستے' پانی باڑیں' کھیتوں کے کنارے بنے [illegible] دور دو کالے دار جھاڑیاں راستے راہ کی ہر چیز وہ پھلانگتا' ہٹاتا' گراتا ہوا ''علاقہ سنڈا الفنز'' تک آ پہنچا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں بڑے بڑوں کے ناک جلتے ہیں۔ جہاں قریب کے علاقے کا ہر مرد و زن ''اخراجِ معدیت'' پیش کرنے خراماں خراماں کھنچا چلا آتا ہے۔ چادر سے منہ ڈھانپے ہاتھوں سے تہبند کا پلو اُٹھائے ایک دوسرے سے آنکھیں کتراتے ہوئے کہ جیسے دیکھا ہی نہیں۔ جہاں اوٹ آڑ اونچ نیچ دیکھی وہیں تہبند کا تنبو تان دیا۔ عالمِ تعجیل یا اور کسی وجہ سے بعض پارٹیاں اتنا قریب فروکش ہو جاتی ہیں کہ بن پوچھے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں گزری رات کو بھی پکی تھی یا گوت باتھو کا ساگ؟...... ہر ضرورت مند یہاں ڈیرہ جمانے سے پہلے ''کھنگھورہ'' ضرور مارتا ہے۔ ''گڈ مارننگ'' کے علاوہ اس کا مقصد پاس قریب دو چار فٹ کے فاصلے پہ براجمان پارٹی کو اپنی آمد سے خبردار کرنا بھی ہوتا ہے۔ چینڈو لیڈیز ذرا اُجڑ اور جم کے بیٹھتی ہیں۔ رات کا کھایا پیا' گھر خاوند کی تازہ رپورٹیں' ساس کی بیماری' دیورانی جٹھانی کی آوازاری' رشتے ناتوں کی بات' تعویذ دھاگے' زیورات' کمیٹیوں کی تاریخیں اِدھر ہی طے ہوتی ہیں۔ اکثر وہیں پہ ''آن ڈیوٹی'' باقاعدہ لڑائیاں' کوسنے اور ناقابلِ شنید الزام تراشیاں بھی سننے کو ملتی ہیں۔ ذرا ساتھ پرے مرد حضرات دَم سادھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کئی اپنے متعلق غلط سلط الزام سُن کر برداشت نہ کرتے ہوئے وہیں ایک دوسرے سے دست و گریباں بھی ہو جاتے ہیں۔ یہاں

صرف لڑائی کی بسم اللہ کرتے ہیں' باقاعدہ جنگ وجدل واپس گھر آ کر ڈانگ سوٹوں سے ہوتی ہے......

یہاں فراغت کے بعد طہارت کے لئے قدرت اور کسانوں کی جانب سے وافر انتظام ہوتا ہے۔ مٹی کی ڈھیلیاں ڈھیلے' گھاس پتے' راجباہوں' آڑوں اور سُوؤں میں بہتا ہوا تازہ پانی۔ اسی طرح قدرت نے ناشتے کا بندوبست بھی اِدھر ہی کیا ہوتا ہے' اُدھر فارغ ہوئے تو اُٹھتے ہوئے ایک آدھ مولی' گاجر' شلغم یا کوئی ککڑی اکھاڑی۔ پاس بہتے ہوئے پانی پہ بیٹھ کر "سب کچھ" دھویا۔ پتے وغیرہ اُدھر پھینکے' ناشتا کرتے ہوئے واپسی پہ کنوئیں پہ غسل کیا اور گھر آ گئے۔ میں بھی بالکل اسی طرح فارغ ہو کر سرفراز کے پیچھے پیچھے خاموشی سے گھر واپس پہنچ گیا۔ ہم نے باہر ہی سے دیکھ لیا تھا کہ فوجی غلام رسول' دلاور' عمران اور سرفراز کا چچازاد بھائی سلیمان صحن میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اندر داخل ہونے سے پہلے سرفراز نے مجھے دروازے کے پاس روک کر کہا۔

• چھچھوندر اور کرونڈیا سانپ......!

"خان! مجھے پتا ہے کہ تو میرے لئے ایک چھچھوندر ہے۔"

میں نے اس کی بات پہ ذرا سا غور کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے یہ تو پتا نہیں کہ میں تمہارے لئے چھچھوندر ہوں یا نہیں البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں اپنی چاچی کا کاکا ہوں۔ چلو مان لیا کہ میں اک چھچھوندر ہوں مگر یہ بتاؤ' تم کیا ہو......؟"

سرفراز نے کسمسا کر فوراً جواب دیا۔ "میں ایک کرونڈیا سانپ ہوں اور تم میری دوستی کے حلق میں پھنسے ہوئے ہو' میں نہ تو تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں اور نہ تمہاری ان پھڈے بازیوں کی وجہ سے تمہیں برداشت کر سکتا ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" مجھے غصہ آ گیا تھا۔

"میں کیا کہوں' تم نے اپنی حرکتوں سے باز تو آنا نہیں۔ ابھی مشکل سے ایک دن ہی تمہیں یہاں آئے ہوئے نہیں ہوا کہ تم نے آتے ہی ملنگ والا محاذ کھول دیا ہے...... خدا کے بندے! تم نے دُنیا کو سدھارنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ تم اپنی نیز ذوجوں سے واسطہ کم رکھو...... دیکھو' یہ سب لوگ تمہارے جانے پہ بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں' کچھ کرنے سے پیشتر مجھے ضرور بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو...... یار! یہ گاؤں ہے' شہر نہیں۔ یہاں کے طور طریقے......"

مَیں نے اس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''یار جی! مَیں کوئی ایسا کام کرنے نہیں جا رہا جو غلط اور تمہارے لئے باعثِ بے عزتی ہو۔ مَیں تو وہ اہم آپریشن کرنے جا رہا ہوں جو تم مقامی لوگوں کو بہت پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن تم لوگ تو صرف اپنے ورڈ اپنے گھر کے مسائل' اپنی ذات کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہو۔ دین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے' معاشرہ اور عوام الناس کس کھڈے میں گر رہے ہیں' اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں...... یار! ہم کیسے بے حس خود غرض اور ظالم لوگ ہیں۔ ہم میں سے ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے' ہماری سوچ یہ نہیں ہونی چاہئے کہ کوئی غلط ہے تو ہوا کرے' ہمیں کیا؟...... ہمیں ملک دشمن' سماج دشمن' اخلاق دشمن قانون شکن اور اپنے دین کے دشمنوں پہ گہری نظر اور گرفت رکھنی پڑے گی۔ اب آؤ اس ملنگ کی جانب...... مَیں اللہ کے فضل سے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ مسلمان ہی نہیں' چہ جائیکہ تم لوگ اسے سید کہتے ہو۔ اگر یہ مسلمان ہوتا تو کم از کم متبرک نام اور حوالہ ایسی دیدہ دلیری سے استعمال نہ کرتا۔ تم نے بھی کچھ نہ کچھ پڑھا ہے' تاریخ کا مطالعہ اور دین کی کتابیں' پیغمبروں کے حالات پڑھے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ خواج خضر علیہ السلام کی کون سی کشتی تھی جو یہاں انڈیا کی سرحد کے قریب اس ملنگ کے ڈیرے کے اندر ظاہر ہوگئی ہے اور یہ بھی [illegible] میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ جعل سازی سے بکری کے بچے کی کھال پہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے اور اس بچے کو حشیش یعنی بھنگ کے پتے کھلا کر نیم خوابیدگی کے عالم میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے سارے چیلے چانٹے فراڈیئے اور منشیات کے عادی ہیں......''

''تم یہ سب کچھ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو' تم نے تو ان لوگوں کو آج ہی دیکھا ہے؟''

''مائی ڈیئر گھامڑ......!'' مَیں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم میں اور مجھ میں یہی ایک فرق ہے کہ تم اُوپر کے پانی کی تھیلا مچھلی ہو اور مَیں اتھلے پانی میں تیرتا ہی نہیں' کستی مچھلی کی مانند تہہ سے مونچھ کی نوک ملا کر رکھتا ہوں۔ بس' دو چار روز کی بات ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی تمہارے سامنے آ جائے گا۔'' مَیں نے اسے مزید دلاسا دینے کی خاطر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یار! کیا تیری اور میری عزت' نفع نقصان علیحدہ علیحدہ ہیں' اور پھر جو کام نیکی کی خاطر اور اللہ کی مخلوق کی بھلائی کے لئے کیا جائے اس میں کیا ڈرنا......؟''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دادا میراثی بھی آ پہنچا۔ ہم تینوں اندر آ گئے۔ لسی' شربت' پراٹھے سے ناشتے کے بعد ہم سب اکٹھے دریا کی جانب چل دیئے۔ راستے میں ساری بات مَیں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دی' اپنے پلان کے مطابق دادا' عمران اور دلاور کو ہم نے آدھے راستے پہ اعوانوں کے ڈیرے کے

پاس چھوڑ دیا۔ میں، سرفراز اور سلیمان ابھی ملنگ کے ڈیرے سے کوئی آدھ فرلانگ دور ہوں گے کہ مؤذن نے وہی نغمۂ اُلوہیت شروع کر دیا جس میں اللہ سبحان و تعالیٰ کی شان و ربوبیت، ختم المرسلین کے مقامِ محبوبیت کی گواہی، راہِ فلاح و بہبود کی نشاندہی اور اُس اکبر و برتر کے حضور سجدہ ریز ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ ملنگ کے ڈیرے تک پہنچتے پہنچتے اذان اپنے اختتام تک پہنچ گئی تھی۔ ڈیرے کے باہر ایک طرف کچا سا تھڑا بنا ہوا تھا جس پہ مٹی کے دو گھڑے اُلٹ کر رکھے ہوئے تھے، ان پہ سفیدی سی پھری ہوئی تھی۔ چند مٹی کے لوٹے اور ایک آدھ پھٹی پرانی پرالی کی چٹائی بھی لپٹی ہوئی دھری تھی۔ ہم چٹائی تھڑے پہ بچھا کر سنتیں ادا کر کے بیٹھ گئے تھے کہ اب ادھر ڈیرے سے بھی کوئی نماز کے لئے آئے۔ ہم تینوں بار بار ادھر درختوں کے جھنڈ کی جانب دیکھ رہے تھے جدھر خواج خضر کی کشتی اور مقدس بکری کا بچہ اور ان کے کارندے شاید ابھی تک نیند یا کسی نشے کی ترنگ میں مدہوش پڑے تھے۔ فرض کی ادائیگی کے لئے ابھی خاصا وقت تھا، لبِ دریا ہونے کی وجہ سے فضا میں قدرے خنکی اور تازگی کی مہک رچی ہوئی تھی۔ دریا کنارے بیلے میں بسنے والے پاک پلید جانوروں، پرندوں کی مدھم بلند مبہم آوازوں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں بھی زندگی بیدار ہو چکی ہے مگر ''شاہ جی'' کے ڈیرے میں ہنوز سکوتِ مرگ طاری تھا۔ کچھ وقت اور اسی [illegible] کہا۔

''بہتر ہے کہ نماز ادا کر لی جائے۔''

• یلغارِ اغیار اور بکری کے بچے کی پکار......!

نماز کے بعد دُعا میں اللہ کریم سے التجا کی کہ اے مالکِ ظاہر و باطن! ہم تیرے عاجز، کمزور اور بے گھر بندے ہیں، ہم میں سے ابھی تک کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ ہم بے آسرا اور تیرے کرم کے محتاج ہیں۔ تو بہتر جانتا ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے، یہ لوگ تیری برگزیدہ ہستیوں کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مولا کریم! ان کو ان کے عزائم سمیت نیست و نابود فرما اور اپنے بندگان کو ان کے شر، کذب اور فجور سے نجات دلا...... اب کیا کرتے؟ نماز، دُعا، تسبیح کے بعد وہیں بیٹھے رہے۔ ہلکی ہلکی روشنی نے اندھیرے کی رنگت میں گھلاوٹ گھول دی۔ جھاڑیوں، جھاڑوں اور درختوں سے صبح خیز پرندے دانے دُنکے کے لئے اُڑان بھرنے لگے، بادِ نسیم کی نکہت بیزی نے مشامِ جاں کو تراوت و تازگی سے سرشار کر دیا۔ مشرق کی شمع نے گھونگھٹ سرکا دیا تھا، گل ہیں عارضوں کی حیا کی تمازت سے ہلکی ہلکی سُرخی اُبھر رہی تھی۔ سبحان اللہ!

فطرت کے حُسن و جمال' اس سحر آفرینی اور فسوں کاری کو سمجھنے' جاننے اور صحیح لُطف و جذب حاصل کرنے کے لئے سحر خیزی بڑی ضروری ہے...... بیٹھے بیٹھے سورج کچھ اور اُوپر آ گیا تھا' روشنی میں دور نزدیک تھوڑا بہت نظر آنے لگا۔ اب طبیعت میں ہلکا ہلکا اضطرار پیدا ہونے لگا' رہ رہ کر یہی سوچ رہا تھا کہ یہ ڈیرے والے انسان ہیں یا کاٹھ کے بنے ہوئے ڈھانچے؟ گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھے ہیں' اُدھر سے کوئی خیر خبر یا کوئی ہلچل ہی نہیں۔ اگر کوئی بدقسمت انسان نماز روزے کے لئے نہیں اُٹھتا تو کم از کم نہانے دھونے یا اپنی واجبی ضرورتوں کے لئے ہی صبح صبح بیدار ہو جاتا ہے۔ اب ساتھی بھی کُھد بُد کرنے لگے' اب ہم سب یہی سوچ کر اُٹھے کہ ذرا ڈیرے کے قریب جا کر صورتِ حال کا جائزہ تو لیں۔ زیارت گاہ کے نزدیک پہنچے تو یہاں سارے کا سارا میدان ہی کھیت پڑا ہوا تھا' دین و دُنیا سے بے خبر سب ہی سوئے مرے تھے۔ راکھ آلودہ جسمیں' چہروں پہ نحوست پھٹکارتیں۔ "شاہ صاحب" اپنے گندے میل خوردہ پاؤں "مقدس کشتی" پہ ٹکائے' نیم برہنہ سے اکا کلیں تھے۔ دیگر ملنگ بھی جیسے کسی گہرے نشے کی حالت میں ہوں' صرف ایک جاندار ایسا تھا جو نیم وا آنکھوں تلے ہماری جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے خاموشیوں کی زبان سے کہہ رہا ہو کہ خدا کے لئے' مجھے اِن قصائیوں سے بچا لو۔ تمہارے گھروں میں بھی کہیں بھیڑ بکریوں' [illegible] بچے ہوں گے' اور وہ نہ ہوں تو تمہارے اپنے بچے تو ہوں گے اور اگر اِن کی ابھی نوبت نہ آئی ہو تو تم خود بھی کبھی معصوم بچے رہے ہو گے۔ بس تمہیں تمہارے کبھی بچے ہونے کا واسطہ' مجھے یہاں سے رہائی دلا دو۔ میرے کلکاریاں بھرنے' تتلیوں' مینڈکوں اور چڑیوں کوّوں کے پیچھے لپکنے کے دن تھے مگر ان ظالموں نے اپنے مفاد پوست بھنگ پلا پلا کر مجھے بھی "جہاز" بنا دیا ہے' میری سُدھ بُدھ ماری گئی ہے۔ یہ لوگ نرم نرم پتوں اور دودھ کی بجائے چورما پراٹھے مٹھائیاں' جو بھی الم غلم زیارت کرنے والے لاتے ہیں' زبردستی میرے حلق میں ٹھونستے ہیں۔ یہ نامناسب غذا ہر وقت پالنے میں پڑے رہنے کی وجہ سے 'میں' ہضم نہیں کر پاتا' دائمی قبض کی بنا پر میرا پیٹ بوجھل اور طبیعت میں اضمحلال سا رہتا ہے۔ اجابت نہ ہونے کے برابر...... کاروباری مقاصد کے لئے چونکہ ان کو میری "مقدس مینگنیوں" کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی خاطر یہ پھر میری معصوم اور معدوم سی جان پہ ظلم توڑتے ہیں کہ جس کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کیسا ملک ہے جہاں کوئی ادارہ یا محکمہ انسدادِ بے رحمی حیوانات نہیں جہاں جا کر کوئی داد فریاد لکھوا سکے۔ ستم بالائے ستم' یہ پاکھنڈی ہر دوسرے تیسرے دن میری دائیں جانب کھال پہ ڈبک سوئیوں کو نیل' سُرمے اور تیزاب کے آمیزے میں ڈبو کر محمد رسول اللہ کے مصنوعی طور پر بنائے الفاظ و حروف کو مزید گہرا اور نمایاں کرتے ہیں جس سے میری

جان و جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میری ماں موضع للیانی خورد کے پیراں دِتہ' جو ذات کا بھانڈ اور وقتی پیشے کے لحاظ سے بہروپیا ہے' کے پاس رہتی ہے۔ میرے دو بھائی بھی ماں جی کے پاس رہتے ہیں۔ یہاں کا ایک ملنگ مولا موچھا میری مینگنیوں کا ٹھیکیدار ہے' اس نے مجھے پیراں دتے سے پندرہ پڑوپی منجی درجہ دوئم کے عوض خریدا تھا۔ مجھے خریدنے کی وجہ یہ تھی کہ میرے پیٹ کی کھال پہ قدرتی طور پر کچھ سیاہ داغ دھبے اس طرح سے تھے کہ انہیں اگر کوئی چاہے تو لفظ بنائے جاسکتے تھے چنانچہ ان ملنگوں نے ان دھبوں کو سوئی' نیل اور لسُرمے تیزاب سے بڑھا بنا کر محمد رسول اللہؐ بنا دیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کی قدرت اور معجزاتی طور پہ لکھا ہوا ہے۔ بے وقوف' جاہل لوگ میری مینگنیوں کے علاوہ میرے ''چھی چھی'' سے بھیگے ہوئے کپڑے بھی تبرک کے طور پہ لے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ کثرت البول کا مریض اس کپڑے کا لنگوٹ پہنے تو پہلے دن ہی افاقہ ہو جاتا ہے اور اگر پیشاب بند کا مریض اس کپڑے کو بچھا کر' اس پہ پیشاب کرنے کے متعلق محض خیال ہی کرے تو اس کے بند سوتے' پرنالے کی طرح کھُل جاتے ہیں۔ پھر ایسے کھُلتے ہیں کہ اُسے پھر اس کپڑے کا لنگوٹ باندھنا پڑتا ہے...... سرفراز نے مجھے جھٹکا دے کر مجھے جگایا۔

''خان! [illegible] تمہارے چہرے کے تاثرات اور اعضاء کی جنبش سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی تم سے باتیں کر رہا ہے اور تم بڑی محویت سے اس کی باتیں سُن رہے ہو......''

''ہاں' سرفراز! ایسا ہی تھا...... یہ معصوم اور مظلوم بکری کا بچہ مجھے اپنی بپتا سُنا رہا تھا۔ تم نے مجھے ڈسٹرب کر کے بہت بُرا کیا' مجھے اس کی ساری رام کہانی تو سُن لینے دیتے...... خیر' اب سارا پروگرام بدل گیا ہے۔ اس سے قبل کہ کوئی ان میں سے ہمیں دیکھے' فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا چاہئے...... باقی باتیں گھر پہ جا کر ہوں گی۔''

راستے سے ہم نے دادا' دلاور اور عمران کو ساتھ لیا اور بھاگم بھاگ گھر پہنچ گئے۔ ساری پارٹی حیران تھی کہ ہم کیا کرنے گئے تھے اور اس طرح سے بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا' نہ کسی کی ہمت تھی کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ ہم ایسے واپس کیوں آ گئے ہیں؟...... دادا حُقے کی چلم تازہ کرنے کے لئے اُٹھ گیا۔ سرفراز کو میں نے چائے بنوانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے سُڑکتے ہوئے میں نے دادا سے پوچھا۔

''دادا! یہ للیانی خورد کس طرف ہے اور یہاں سے کتنے فاصلے پہ ہے؟''

دادا نے حُقّے کی منہال پرے ہٹاتے ہوئے بتایا۔

''للیانی کلاں اور خورد دونوں چک اُمرو سے چند کوس کی مسافت پہ ہیں۔ للیانی کلاں میں میرے ننھیال ہیں اور للیانی خورد میں میرا سانڈو رہتا ہے...... حکم کریں' مَیں دونوں گاؤں کے بچّے بچّے سے واقف ہوں۔ مولا خوش رکھے......''

مَیں دادا کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی میرا اس طرح سے دیکھنا محسوس کر رہا تھا' قدرے گھبرا کر پوچھنے لگا۔

''مولا خیر کرے' خیریّت ہے نا!...... آپ للیانی کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''دادا! تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر آج اسی وقت تمہیں چھوٹی للیانی روانہ کیا جائے تو جلد سے جلد تم کب واپس آ سکتے ہو؟''

وہ حُقّے کا ایک کش لے کر اُنگلیوں اور آنکھوں میں حساب لگا کر بولا۔

''گھنگ بھاگ لگے رَہن تے دُشمناں دے منہ کالے تے نیلے پیر...... سرکار! جے مَیں اَج تے ہُن' میرا مطلب اے کہ مَیں اگر آج ابھی للیانی جاؤں تو میرا خیال ہے کہ مَیں رات تک بخوشی واپس آ سکتا ہوں۔''

مَیں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''...... اور اگر وہاں سے ایک آدمی اور ایک عدد بکری ساتھ لانی پڑے تو پھر کب واپس آ سکتے ہو؟''

وہ حُقّہ پرے کرتے ہوئے حیرانی سے پوچھنے لگا۔

''مولا! خیر' خان صاحب دی۔ اُچے شملے تے سرداریاں قائم...... بکری اتنی دور سے اور قصائی للیانی سے...... مُوتیاں والیو! منّوں پہلے سوا لکھ بکری تے پلٹن قصائیاں دی یہاں پر حاضر کر دیتے ہیں۔''

''نہیں' دادا! مجھے بکری وہ چاہیے جو تیرے ہم زلف یعنی سانڈو پیراں دتّے کے گھر پہ ہے۔''

دادا تو چارپائی سے گرتے گرتے بچا' دریائی گھوڑے کی طرح آنکھیں چہرے سے باہر نکال کر مجھے تکنے لگا۔ باقی ساتھی بھی حیران ششدر کہ مَیں کیا کہہ رہا ہوں' کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سلیمان ہمت کر کے بولا۔

''دادا! تمہارے سانڈو کا نام پیراں دتّہ ہے اور کیا واقعی اس کے ہاں کوئی بکری ہے......؟''

''ہاؤ سلیمان! رَبّ تیری حیاتی کرے...... یار! خان صاحب یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں۔ مجھے

تقریباً کئی مرتبہ ملے ہیں اور میرا سانڈو پیراں دتہ‘ اُسے تو مجھے بھی ملے ہوئے ڈیڑھ دو ورے ہو چکے ہیں۔ مگر صاحب اُسے کیسے......؟“

”دیکھو دادا! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال اس بات کو چھوڑو‘ پھر کسی وقت بتاؤں گا کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا...... یہ روپے پکڑو‘ اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لو اور ابھی للیانی چلے جاؤ۔ سیدھے جا کر اپنے سانڈو کو ملو۔ اس کے پاس ایک بکری ہے جس کی سفید کھال پہ کالے کالے داغ دھبے ہیں۔ اس بکری کے تین بچے پیدا ہوئے تھے‘ ایک مادہ اور دو نر۔ مادہ بچہ وہی ہے جو تم نے ملنگ کے ڈیرے پہ دیکھا ہوا ہے‘ دو نر بچے پیراں دتہ کے پاس موجود ہیں۔ تم پیراں دتہ کو بکری سمیت کسی نہ کسی طور کل رات تک یہاں لے کر آ جاؤ۔ تم اس سے یہاں ڈیرے کے متعلق کوئی بات نہیں کرو گے۔ اب اصل کہانی پیراں دتے اور بکری کے یہاں آنے پہ شروع ہوگی...... ایک وعدہ کرتا ہوں۔ اگر تم سب دوستوں نے رازداری‘ ہمت اور صبر سے کام لیا تو نہ صرف یہ ملنگوں والا گند ختم ہو جائے بلکہ دادا اور پیراں دتے کی غربت بھی ختم ہو جائے گی اور ہم سب کو ثواب بھی ملے گا۔“

دادا اور اس کے بیٹوں کو روانہ کر کے ہم پانچوں دوست یعنی میں، فوجی، سرفراز، غلام رسول فوجی‘ دلاور اور سلیمان باہر نکل آئے۔ عمران اجازت لے کر اپنے کسی ضروری کام چلا گیا تھا۔ گاؤں سے باہر آ کر اب ہمارا رُخ دریا کی مخالف سمت پہ تھا۔ یہاں ایک پرانا قبرستان تھا۔ اس کے ساتھ ایک مناسب فاصلے پہ ایک گہرا کھڈ تھا‘ شاید کسی وقت یہ کسی نالے کی گزرگاہ رہا ہوگا۔ کھڈ کے دوسرے کنارے ایک چھوٹا سا مٹی کا قدرتی ٹیلا سا اُبھرا ہوا تھا‘ تین اطراف سے ڈھلوان تھا اور ایک جانب سے عمودی۔ ہم سارے یونہی سیر و تفریح کے انداز میں بندروں کی طرح پھلانگتے ہوئے کھڈ کراس کر کے ٹیلے پہ چڑھ آئے۔ یہاں سے گاؤں بہت نیچے اور دُور سا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیلے کے تین اطراف میں بھی کھیت ہی تھے لیکن جیسے کئی موسموں سے یہاں کھیتی باڑی نہ کی گئی ہو جبکہ ذرا پرے دوسرے کھیتوں میں موسم کی فصل کھڑی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں سرفراز سے پوچھا۔

”یار! یہ ٹیلا بہت عجیب سی پچوایشن پہ ہے۔ اگر میں اسی گاؤں میں رہتا ہوتا تو ہر روز یہاں اوپر نیچے چڑھنے اُترنے کا شغل کرتا......“

اس نے جواب دیا۔ ”مہربان‘ قدردان! اگر تم اس گاؤں میں مستقل رہتے ہوتے تو ہماری طرح کبھی بھی اس ٹیلے کی طرف نہ آتے۔ ہم تو آج صرف تمہاری وجہ سے یہاں تک آ گئے ہیں کہ کہیں تم ہمیں بزدل اور توہم پرست نہ سمجھو......“

''میاں مداری! ذرا کھل کر بات کرو...... میں جانتا ہوں کہ تم یقیناً کوئی دُرفنطنی چھوڑو گے۔ ضرور چھوڑو میں یہی کچھ تو تم سے سننے کے لئے ہر سال یہاں آتا ہوں...... چلو شاباش کہو۔ میرے پیسے کھرے کرو......''

''پہلے میں تمہاری ''دُرفٹے منہ'' تو سن لوں پھر اگر گنجائش رہی تو میں بھی کوئی دُرفنطنی چھوڑوں گا۔'' سرفراز نے جلا کٹا سا جواب دیا تھا۔

''شاباش......'' میں نے اسے تھپکی دی۔ ''مجھے تمہاری ذہنی اوقات کا پتہ تھا' مکھی پہ مکھی مارے بغیر تم رہ ہی نہیں سکتے۔ کیا مجال کوئی تمہیں کچھ کہے اور تم اسے برداشت یا ہضم کر سکو...... خیر' یہ بتاؤ۔ یہ ٹیلا اور اس کے گرد یہ کھیت وغیرہ اس طرح ویران سے کیوں ہیں جبکہ ذرا پرے سب کھیتوں میں فصلیں کھڑی ہیں......؟''

● کستوری' اضطراب عشق خضوری......!

''د[illegible] پاس کے کھیت ہماری ملکیت ہیں۔ کوئی چھ سات سال قبل یہاں بھی معمول کی کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ دس پندرہ افراد پہ مشتمل خانہ بدوشوں کا ایک خاندان ٹیلے پہ آ کر بیٹھ گیا۔ میرے دادا نے انہیں سردیوں کا موسم یہاں بسر کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس خانہ بدوشوں کے خاندان میں عورتیں زیادہ اور مرد کم تھے۔ یہاں پڑاؤ کے بعد یہ وہی کچھ کرنے لگے جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں۔ مرد جھونپڑوں میں نشہ پانی کرتے' تاش پتے کھیلتے یا پھر سوئے پڑے رہتے اور عورتیں اردگرد کے گاؤں میں چھوٹے موٹے کاشتکاری محنت کے کام یا پھر بھیک مانگتی پھرتیں...... ان عورتوں میں ایک نوعمر سی لڑکی کستوری بھی تھی جو اس قبیلے کے سربراہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جس کسی نے اس کا نام رکھا تھا' وہ کوئی بڑا مردم شناس اور گیانی ہوگا۔ وہ بالکل اپنے نام کی طرح تھی' سچ مچ کستوری کی ایک پھنکی سی۔ شمشاد قامت' بوٹی کے نشے جیسی' فضا میں جھونکے سے مارتی ہوئی جوانی...... وحشی ہرنوں سے نینوں میں ایسی چمک جیسے کسی نے سچے موتی کوٹ کر بھر دیئے ہوں۔ ناک جیسے کٹار کی دھار' ابرو ہلالی خنجر۔ لانبے لانبے ٹخنوں کو چومتے ہوئے چمکیلے شانا کالے بال' موتیے کی کلیوں کو شرمندہ کرتے ہوئے سپید دانت۔ سراپا ایسا دلکش اور من موہنا کہ جیسے کسی نیم دیوانے صنم تراش نے کسی لہک میں آ کر چندن کاٹھ سے اپنی تصوراتی محبوبہ کو تخلیق کیا ہو۔ اس گہری صندلی ملیح رنگت میں ایک ایسا جادو تھا کہ جو کوئی

[illegible] دیکھ لیتا' وہ دُنیا بھر کے کُھلے' صاف اور گورے رنگ والوں پہ تین حرف بھیج کر اسی ''شیام گوپالی'' [illegible] کی مالا جپنے لگتا۔ اس فتنہ کی طبیعت طبع میں ایک پُراسرار سا رکھ رکھاؤ اور اِک پُروقاری تمکنت تھی۔ [illegible] حرکات میں ایک قدرتی لہریا اور رِزت جو متھرا کی مثالی رقیوں میں ہوتا ہے اور......''

میں ہاتھ جوڑ کر سامنے آ گیا' سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''یار' سلیمان! میری توبہ۔ میری خطا معاف جو میں ٹیلے کی بابت پوچھ کر گستاخی کر بیٹھا...... [illegible] پہ محمول نہ ہو تو میں یاد دلادوں کہ میں نے ٹیلے کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تھا اور آپ نے شاید [illegible] بات کو غلط سمجھتے ہوئے مجھے داستانِ الف لیلیٰ کا کوئی باب سنانا شروع کر دیا ہے۔'' میں نے اِسے تحسین آفرین نظروں سے جانچتے ہوئے بڑھاوا دیا۔ ''ماشاء اللہ الفاظ کے طوطے مینا خوب اُڑا لیتے ہو۔ تم [illegible] کامیاب داستان گو ثابت ہو سکتے ہو [illegible]'' میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے مزید کہا۔ ''یار! چند لمحوں کے لئے تو میں واقعی کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس فرخندہ جمال' ناہید خصائل اور [illegible] کو تم نے الفاظ سے جو پینٹ کیا ہے اور تمہاری جادو بیانی سے جو میں نے اثر لیا ہے' اس کا فی الفور [illegible] یہ ہے کہ تم بکری وکری اور ملنگ وغیرہ کے قضیئے کو مؤخر سمجھو اور جلدی سے مجھے یہ بتاؤ کہ محترمہ کستوری [illegible] کہاں ہیں [illegible] اس وقت اپنے [illegible] اور اپنے اطراف میں بھی کستوری کی بھینی بھینی باس محسوس کر رہا ہوں۔''

اب شاید سرفراز کی باری تھی' بولا۔

''یار خان! خدا کے لئے یہ رنگ بازیاں چھوڑو اور جو مقصد لے کر ہم سب ادھر آئے ہیں' اس کی طرف دھیان دو۔''

''بھائی! میرا دھیان تو اسی طرف تھا...... میں نے صرف اُس سے اس ٹیلے کی بابت کچھ جاننا چاہا تھا' اس خوگرِ حسن و جمال نے مجھے کوہ قاف پہ چڑھا دیا...... ویسے آپس کی بات ہے' یہ میڈم کستوری اب کہاں چلی گئی ہے......؟''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹیلے کی عمودی جانب کھینچتا ہوا لے گیا' مٹی کے ایک ڈھیر کے پاس لے جا کر کہنے لگا۔

''یہ میڈم کستوری اور مسٹر کستورہ یعنی میرے چچازاد اور سلیمان کے سگے بھائی محبوب عالم کی [illegible] پڑاؤ ہے...... اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میڈم کستوری سے کہاں ملا جا سکتا ہے؟''

میرے کانوں میں جیسے کسی نے سویٹر بننے والی ملائم سی سلائیاں گھسا دی ہوں اور سر پہ پورا ڈبا

کافور کا اُلٹ دیا ہو۔ مذاق اور شگفتگی کے موڈ میں چلتی ہوئی بات کس قدر سنجیدہ اور رنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں اپنے تئیں خفت محسوس کر رہا تھا۔ سرفراز نے مجھے احساس دلایا کہ ہر وقت کا مذاق بھی اچھا نہیں ہوتا۔

وقت کے سرپٹ بھاگتے ابلق کی لگام اس زور سے کھینچی گئی کہ وہ پچھلے پیروں پہ الف ہو گیا اور بلوئی بصارت کا برما بڑی سُرعت سے قبر کے ڈھیر کے درمیان اُتر گیا۔

محبوب عالم کے دادا سے اجازت ملتے ہی یہ خانہ بدوش ٹیلے پہ فروکش ہو گئے تھے۔ قریہ قریہ نگر نگر گھومنے والے بنجارے' فقیروں' پرندوں' ہواؤں' بادلوں اور نکہتوں کی طرح کہیں جم کر نہیں ٹکتے۔ ان کے مزاج' لہجے' جذبے' ارادے' خوبصورتیاں' چاہتیں اور دشمنیاں بھی موسموں' رُتوں' سمتوں' منظروں' جگہوں اور ضرورتوں کی ہم نوا ہوتی ہیں۔ یہ ابلق کی طرح اڑیل' ترنگ کی مانند کڑیل' غصیلے' جابر و جاہل' طرحدار مگر اُونٹ جیسے کینہ توز ہوتے ہیں۔ طور ضابطے کیلئے ان کی وقتی ضرورتوں اور حالات کے منت کش ہوتے ہیں۔ روپے رزق کی خاطر کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ غیرت' اخلاق' مذہب' حلال' جائز' راستی' وغیرہ یہ کسی کے معنی و مطلب نہیں جاننا چاہتے۔ اکثر مرد روسیاہ' چہرے مہرے سے غنڈے ہوتے ہیں اور بیشتر زنانیاں رنگی' مشکی' چلبلی' مزاجاً رنگین' ذائقے میں نمکین اور عفیفہ [illegible] ہوتی ہیں۔ ان کی اکثریت کے پاس تین انچ مہلک ہتھیار ہوتے ہیں۔ ان کا شکار مخصوص قسم کے بھاڑو ہوتے ہیں۔ ان میں مخنث' پیشہ' شاہد باز' رجولیت پسند' مخصوص قسم کی طرز تلذذ کے رسیا یا پھر انتہائی پست طبقہ جو چونی اٹھنی یا محض زبانی کلامی رانجھا راضی کر لیتے ہیں۔ یہ خانہ بدوش اپنی فطرت و ضرورت کے مطابق میلہ کما کر کسی نئے جزیرے کی کھوج میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ قیام کے دوران اگر کوئی لڑھک بھی جائے تو یہ بغیر کسی شور شرابے یا آہ و بکا' خاموشی سے معمولی سی تکفین کر کے مُردے کو کسی بے آبادی سی جگہ یا جھونپڑی جہاں ان کے گھنگھرو بجے ہوتے ہیں' گڑھا کھود کر گاڑھ دیتے ہیں۔ نہ کہیں اطلاع نہ اندراج' نہ پولیس اور نہ میونسپل کمیٹی کا دفتر۔ کسی نومولود کی پیدائش بھی ایسے ہی ہوتی ہے۔ ان کی عورتوں میں زچگی کی حالت میں آرام اور احتیاط برتنے کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی کسی خاص اہتمام کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ آخری دنوں کا حمل اُٹھائے ہوئے بھی محنت و مشقت یا بھیک مانگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مستانہ آنکھوں میں ڈمبل سرمہ ہونٹوں پہ مسّی کا لاکھا۔ پھمنوں والا رنگین پراندہ' ناک میں دونوں اطراف سونے یا چاندی کے بلاق۔ بڑے ناز و ادا سے ہتھیلی پھیلائے اِٹھلا کر آپ سے بھیک مانگیں گی۔ ان کے مانگنے کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ دان مانگ کر آپ پہ دیا کر رہی ہیں۔ اکثر دو چار اکٹھی ہوتی ہیں تاکہ کوئی ''ہتھ پکڑ'' ہاتھ نہ ڈال دے۔

کستوری' دوسری عورتوں اور لڑکیوں بالیوں کی طرح بھیک مانگنا یا عشوے نخرے دکھا کر ''لوٹ کھسوٹ'' کرنا پسند نہیں کرتی تھی' اس کے باوجود وہ باپ کے کہنے یا سنگت کی دوسری لڑکیوں کے اصرار پہ کبھی کبھار قرب و جوار میں نکل جاتی۔ سنگت والیاں تو گانا بجانا بھی کر لیتی تھیں مگر یہ جگہ جگہ ڈگڈگی بجا کر ماہیے ٹپے سنانا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ ہمجولیاں دن ڈھلے جب ڈیرے پہ لوٹتیں تو ان کے پلّو' چادریں اُجناس اور دوسری چیزیں کی دوسری کھانے پینے' برتنے کی اشیاء سے بھاری ہوتیں۔ ایک آدھ دوَنی' چونی' اٹھنی' بھی پلّو کی کنّی میں بندھی ہوتی۔ کستوری جب جاتی تھی تب بھی کستوری ہی ہوتی اور جب واپس پلٹتی تب بھی خالص کستوری یعنی مہک سے بھری معصوم سی بھینی بھینی خوشبو والی کستوری ہوتی۔ اُس کا بوڑھا مگر تومند باپ اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا۔ وہ جانتا ہوتا کہ یہ ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ آئی ہے۔ بھیک تو وہ مانگے جو بھکاری ہو' جس کا من منگتا ہو' اس کی سوچ اور خیالات بھکاریوں جیسے ہوں سراپا خدوخال انگ انگ بھکاریوں سا ہو۔ اُس کے پیٹ میں بھوک اور طبیعت میں یبوست اور یاست ہو اور جو سراپا کستوری ہو' اس کا ان ننگ خیالوں سے کیا واسطہ؟...... بوڑھا باپ اس کی اقبال مند پیشانی کو آگے بڑھ کر چوم لیتا' پھر سوچ کی کوئی لہر اس کے جھریوں بھرے چہرے کو اور گھمبیر کر دیتی...... کہاں ...... کہاں ...... گا میں اس کے لیے...... اس کستوری کی خوشبو کو کہاں چھپا کر رکھوں گا۔ کستوری تو سات پردوں سے نکل کر بھی اپنی شناخت کروا دیتی ہے۔ اس کستوری کے لیے شہزادہ کہاں سے آئے گا' اس کے اپنے گوت قبیلے میں تو کہیں دُور دُور تک اس کی جوتیوں اٹھانے کے بھی قابل کوئی نہیں تھا؟...... انجانے خدشے' خیالات اس کو دہلا کر رکھ دیتے۔ وہ بازو بڑھا کر کستوری کو اپنی گود میں بھر لیتا جیسے وہ اسے اپنی حفاظت میں لے کر دُنیا سے چھپا لینا چاہتا ہو' پر توبہ کریں۔ کنواری سو عیب اس کے جسم میں ہوں۔ بھینگی' اندھی' کانی' لولی لنگڑی یا اپاہج ہی کیوں نہ ہو' کوئی نہ کوئی اس کو بیاہ کر لے ہی جاتا ہے۔ یہ تو وہ چنگاری ہے جسے بھوسے بھرے گھر میں زیادہ دیر رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس چنگاری کے متعلق سوچ و بچار کر اگر جلد عملی جامہ نہ پہنایا جائے تو پھر ذرا سی کوتاہی و غفلت سے پورے گھر گھرانے کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کستوری کی نہ تو ماں زندہ تھی اور نہ کوئی بھائی بہن جو اس کے بوڑھے باپ کو سہارا دیتے' روئے تو اس کے آنسو پونچھتے' اس کی ڈھارس بندھاتے...... بیٹی کا پھولوں جیسا بوجھ تو بڑے بڑے شہ زوروں اور شہنشاہوں کی کمر توڑ دیتا ہے۔ یہ بوجھ تو دُنیا کا سب سے بھاری بوجھ ہوتا ہے۔ کستوری کا باپ جیونا تو پھر بھی بوڑھا شخص تھا۔ اس کی مرنے والی جورو مرتیو بھی کستوری کی طرح بڑی خوبصورت اور طرح دار تھی۔ کستوری کو جنم دینے کے دوسرے دن مر گئی تھی' دایہ کی بے ہنری سے پورے جسم میں زہریلا مادہ پھیل گیا تھا۔ دم توڑتے سے اس نے جیونے کو پاس بٹھا کر کان میں کہا تھا

جیونے! میری بچّی سے بھیک نہ منگوانا اور نہ اسے کسی دھندے پہ لگانا' بڑی ہو جائے تو کسی اچھے مرد سے اِس کا بیاہ کر دینا جو اِس کی قدر کرے۔ پھر تو مولود بچّی کی پیشانی پہ بوسہ ثبت کرتے ہی مرتو مرگئی۔ بچّی کو اُوپرے دودھ پہ ڈال دیا گیا۔ دودھ کا اثر یا جنم میں کوئی پھیر تھا کہ بچّی کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو گئے۔ بڑی بوڑھیوں نے بتایا کہ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں' اکثر اُوپرے دودھ کے بچّوں سے ایسا ہو جاتا ہے۔ جوانی کے سِن کو پہنچے گی تو سر پہ بال گھنے ہو جاویں گے۔

● گنجی' تن پاویاں دی منجی......!

برس' دو' تین' چار گزر گئے۔ بچّی کا سر مرغی کے انڈے کی طرح شفاف نکل آیا تھا جبکہ بھوئیں اور پلکیں بالوں سے پُر اور ٹانگوں بازوؤں پہ بھی ہلکی ہلکی روئیں موجود تھیں۔ ایسی پیاری بچّی اور سر بالوں سے خالی' جو دیکھتا افسوس کرتا۔ بعض بچّوں یا بڑوں کو بال جھڑ کی بیماری ہوتی ہے لیکن اس نامراد بیماری میں سارے جسم کے بال ختم ہو جاتے ہیں لیکن یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جو صرف سر پہ ہی حملہ آور ہوئی [illegible] نتیجہ صفر تھا۔ پیدائشی نام جیون جوگی رکھا گیا جو بعد میں گنجی منجی میں بدل گیا...... گیارھواں برس جب لگا تو گنجی منجی کے فکرمند باپ سے نہ رہا گیا' وہ اسے سلام کرانے کی غرض سے سرکار سخی شہباز قلندرؒ کے قدموں میں سہون شریف لے آیا۔ یہاں دریا کے کنارے اندرونِ سندھ کے خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ یہیں اس کی ملاقات ایک عمر رسیدہ سنیاسی بابا سے ہوئی۔ جیونے نے بچّی کو دھکیل کر سنیاسی بابا کی گود میں پھینک دیا۔ بچّی اس وقت بچّے کے بھیس میں تھی۔ جیونے نے بابا کے پاؤں پکڑ لئے' رو کر کہا۔

"بابا! یہ بچّہ نہیں' بچّی ہے۔ میری اکلوتی بِن ماں کی بچّی...... میرا اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ میری مرنے والی بیوی کی نشانی ہے' اس کا صرف سر بالوں سے خالی ہے۔ بڑے جتن کئے مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں اِسے اس ارادے سے یہاں لایا ہوں کہ یا تو قلندر پاک اِسے ناری کا مکمل رُوپ دے دیں یا پھر اِسے مجھ سے لے لیں...... میں اس کے ساتھ تین روز سے سرکار کے قدموں میں پڑا رہا مگر میری مراد مجھے پوری ہوتے ہوئے دِکھائی نہیں دی' مایوس ہو کر میں اِسے یہاں دریا بُرد کرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ آپ کو دیکھا تو آخری اُمید کی غرض سے ساری مشکل بیان کر دی ہے۔ اس کے سر کے بالوں کا کوئی جتن بتائیں یا پھر اِسے اپنے ہاتھوں دریا میں دھکیل دیں۔ قبیلے والے سارے بچّے بڑے اسے

کچھ نہیں کہتی ہیں۔ یہ جنم جلی خاموشی سے آنسو بہاتی رہتی ہے' منہ سے کسی کو کچھ بھی تو نہیں کہتی......''

آنکھیں میچے سنیاسی بابا خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے۔ جیونے کے خاموش ہونے پر انہوں نے آنکھیں کھولیں' مسکراتے ہوئے ایک نظر بچّی پہ ڈالی اور اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا۔ پھر آنکھیں میچ لیں۔ غائب ہو گئے' ہاتھ بچّی کے سر پہ ہی رہا۔ وقت جیسے ٹھہر گیا۔ یا بابا پران چھوڑ گئے ہوں' بچّی بھی پتھر کی بت بنی بیٹھی تھی۔ آخر بابا کی محویت یا مراقبہ ختم ہوئے تو انہوں نے بڑی آہستگی سے جیونے سے کہنے لگا۔

''بندے کو نا اُمید نہیں ہونا چاہئے' مالک کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں مرض بیماریاں آئی ہیں' وہیں ان کے لئے شفا بھی اُتار دی گئی ہے لیکن کچھ بیماریاں ایسی بھی ہیں جن سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے۔ ان بیماریوں میں ایک یہ بھی بیماری ہے' جنم سے اناڑی عورتوں سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ بچّہ جب عورت کے پیٹ سے چھٹکارہ پاتا ہے تو اس وقت تین طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ پہلی طاقت قدرت یا فطرت' دوسری جنم دینے والی عورت جو زندگی اور موت کے درمیان اپنی پوری قوتوں کو بروئے کار لا کر تخلیق کے مرحلے سے گزرتی ہے۔ تیسری کوشش وہ مددگار عورت ہوتی ہے...... بعض دائیاں پکڑنے میں کوئی غلطی کر بیٹھتی ہیں۔ اس سے بچّے کا سر بالکل پھونک بھرے غبارے کی مانند بلبلا سا ہوتا ہے۔ دائی کے ہاتھ کی اُنگلیوں سے بعض اوقات سر' گردن کی ان نسوں وریدوں پہ زور پڑ جاتا ہے جو سر دماغ تک خون پہنچاتی ہیں۔ سر' دماغ کے لاکھوں حصّے ہیں اور ہر حصّے کو مخصوص انداز اور توازن سے خون اور ہوا پہنچتی ہے۔ جب کسی غلطی سے ایسا ہو جائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بینائی' شنائی' دماغی بیماریاں ...... کے بال وغیرہ......''

''بابا! کچھ اس بیماری کا علاج......؟''

بابا اسی لہجے میں بولے۔ ''بیٹا! ہر وہ مشکل بیماری جس کا کوئی بھی علاج ممکن نہ ہو' ایسی بیماری کا بھی ایک حتمی علاج ہوتا ہے اور وہ علاج بڑی سنکٹ تپسیا مانگتا ہے' قربانی مانگتا ہے۔''

''میں اپنی بچّی کی زندگی اور خوشی کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں......'' جیونے نے پلّو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

بابا پھر بولے۔ ''تمہیں اپنی جان قربان کرنے کی ضرورت نہیں' یہ قربانی بھی اس بچّی کو دینی پڑے گی۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں' بابا......؟''

''میں سمجھاتا ہوں...... دیکھو' یا تو اس کو یوں ہی رہنے دو' سر کے بالوں کے علاوہ یہ مکمل عورت ہے۔ یہ شادی بھی کر سکے گی۔ گھر ہوگا' بال بچے داری ہوگی' نہ ہوں گے تو صرف سر کے بال نہ ہوں گے۔

جیونے نے بڑے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بابا! جس ناری کے سر کے بال نہ ہوں اس سے کون مورکھ بیاہ کرے گا؟ عورت اپنے اعضاء اور سر کے بالوں سے ہی تو عورت ہوتی ہے۔ پھر دُنیا ایک ٹنڈ منڈ عورت کو کہاں جینے دیتی ہے اور ایسی عورت بھی تمام زندگی احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اذیت میں مبتلا رہتی ہے......''

بابا بولے۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو...... اب دوسرا راستہ ہے...... آ جائیں گے بہت لمبے' نہایت خوبصورت گھنے خوشبودار بال لیکن......''

بابا رُک گئے۔ جیونے نے بابا کے چرن پکڑ لئے۔ ''لیکن کیا' بابا......؟''

''بال پا کر پھر یہ شادی نہ کرے تو بہتر ہوگا۔ جو مرد اس سے ہمکنار ہوگا' وہ فوراً مر جائے گا۔''

''مر جائے گا......'' جیونے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہاں وہ پھر زندہ نہ رہ سکے گا...... اب یا تو اس سے بال چھین کر اسے عورت دے دو یا اسے عورت سے لے کر بال دے دو...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''بابا! کوئی بھی باپ اپنی بیٹی سے اس کی ''عورت'' چھیننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ دُنیا میں لاکھوں عورتیں ہیں جن کے خاوند نہیں ہوتے' مر جاتے ہیں یا وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں لیکن انہیں یہ احساس تو اعتماد اور سکون دیتا ہے کہ وہ مکمل عورت ہیں اور ایسی ایک چیز جو بھلے اندر سے عورت ہی ہو مگر دِکھے سر سے مرد اور نیچے سے عورت' یہ توہین ایک عورت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے لئے تمام عمر کی اذیت ہے...... بابا! تم میری بچی کو بال دے دو۔ اس کی آنکھیں' اس کا ماتھا۔ ہونٹ دانت' اس کا بھولپن بالوں کے بغیر یہ سب کچھ کتنا عجیب اور تماشا سا لگتا ہے...... پیالا تھما کر' لمبا سبز جھولا پہنا کر بازار لے جائیں تو لوگ دولے شاہ کا چوہا جان کر خیرات دینی شروع کر دیں۔''

بابا نے جیونے سے نسخے کی رازداری کا حلف لے کر تمام نسخہ سمجھایا تو جیونے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایسا جوکھن والا کام...... اولاد تو بڑے بڑے امتحانوں سے گزار دیتی ہے' ان کی خاطر ماں باپ بہت کچھ کرنا اور جھیلنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے طور پہ بامراد ہو کر واپس آ گیا۔ آتے سمے بابا نے اسے دُعا دیتے ہوئے اس کا نام کستوری تجویز کیا اور کہا کہ اس کی مہک ایک زمانے کو مسحور کرے گی۔ جیونے کے دل میں

آنے کی تیسرے روز اس کے قبیلے نے اپنا تام جھام سمیٹ کر کالا خطائی کے نواح' ایک کھلے سے بے آباد کے بچے میدان میں چھولداریاں نصب کر دیں...... کستوری اب کوئی ایسی بچی بھی نہ تھی جو اپنے بھلے بُرے سب کی پریشانی اور اس کے جذبات کو نہ سمجھ پاتی۔ وہ اُوپر سے بہت کچھ اور اندر سے سب کچھ سمجھتی جانتی تھی۔ وہاں سہون شریف میں بھی اس نے سنیاسی بابا اور اپنے بابا کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سنی تھی۔ نیا نام اور زندگی کا ایک نیا پیام پا کر وہ بہت خوش تھی۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس اَمر سے بھی آگاہ ہو چکی تھی کہ بال پانے کے بعد بیاہ کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو سکے گا اور وہ جس مرد کو بیوی یا عورت کی حیثیت سے چھوئے گی' وہ فوراً مر جائے گا۔ شادی بیاہ' مرد خاوند' پیار محبت وغیرہ یہ سب کچھ اس کے لئے ابھی خاص اہم اور ضرورت کی چیزیں بھی نہیں تھیں یا پھر وہ اس وقت بچی عمر میں ان کچی پکی باتوں کچی پکی باتوں کو صحیح طور پہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال اس نے بھی بالوں کی خاطر ہر قسم کے امتحان اور مشکل سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا' جبکہ اس کو نسخے کی ہولناکی کا بھی علم تھا۔ آنے والے چند دن جیونے نے بڑے مصروف گزارے۔ اسے ایک فربہ قسم کا ''مار سیاہ'' یعنی کالا ناگ دانتوں کے بغیر زندہ یا مل گیا تھا جو اسے شاہدرے کے ایک سپیرے سے مل گیا۔ کالی سرسوں کے بیج اور دیگر ضروری سامان ساتھ لیتا [illegible] سے زمین کھود جب حسبِ منشا زمین کھد چکی تو اس نے بابا کی ہدایت کے مطابق بن دانتوں کے کالے ناگ کو ٹوکری سے پکڑ کر باہر نکالا' بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے اس کے جبڑے دبا کر منہ کھولا' دائیں ہاتھ سے چٹکی بھر والی سبز نسوار کی چٹکی اس کے حلق میں اُتاری اور پھر اسے ٹوکری میں بند کر دیا۔ دو چار منٹ میں مار سیاہ مر چکا تھا۔ پٹھانوں کی سبز نسوار کی ہلاکت آفرینی کا اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ جو نسوار انسان کے کسی خوفناک دُشمن کو دو چار منٹوں میں ہی موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے وہ انسان کے لئے کتنی سود مند ہو سکتی کیا کہے؟...... جیونے نے ڈیڑھ بالشت بھر زمین کھود کر اندر مُردہ سانپ' جلیبی کی شکل میں پھیلا کر رکھ دیا اوپر ہرمل کے دانے چھڑک دیئے۔ پھر خُتنے کا سڑا ہوا پانی انڈیل کر گڑھے کو گردن تک مٹی سے بھر دیا۔ اوپر کالی سرسوں کے بیج بکھیرے اب مزید خُتنے کے پانی سے سینچائی کر دی۔ اوپر بڑا ٹوکرا رکھتے ہوئے کستوری کو تاکید کی...... دیکھ ری' یہ تیرے بالوں کے لئے تریاق بنے گا۔ اب تو ہر وقت اس پہ نظر رکھیو' کوئی بھی یہ رکھا ہوا ٹوکرا نہ اُٹھائے' نہ کوئی جناور اِدھر آئے۔ تیس دن جب پورے ہوں گے تو یہاں اُگی ہوئی سرسوں کاٹیں گے۔ اِن کے بیج دانوں سے پھر تیرے لئے بالوں کا تیل تیار ہوگا۔ ہر روز صبح شام ٹوکرے کے اوپر سے ہی پانی سے ترائی کرتی رہیو...... ٹوکرے کے اردگرد اس نے بانس کی نلیاں ٹھوک کر

رسّی کی مدد سے ٹوکرے کو مضبوط کر دیا تھا تا کہ کوئی اِسے ہٹا یا اُٹھا نہ سکے۔

● کالی سرسوں، اُگے مہینوں پھولے برسوں......!

وقت کی چکّی چل پڑے تو صبح، دوپہر، شام، رات۔ ایک روز، پھر دو، بات ہفتوں عشروں اور پھر سال، صدیوں، نسلوں تک سب کچھ پیس کھرل کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ تو پھر ایک چاند کا اُترنا چڑھنا تھا۔ چند نیلی پیلی رُتوں، ایک آدھ بارش، کچھ حبس کی راتوں اور تپکتی دوپہروں کے آنے جانے سے کالی سرسوں کے پھول پتوں سے ٹوکرا ابھر گیا بلکہ پھول پتے ٹوکرے کے چھدرے سوراخوں سے باہر بھی جھانکنے لگے تھے۔ کستوری، عود، عنبر اور سرسوں کی خوشبو نے اِردگرد کے ماحول کو معطر سا کر دیا تھا...... وہ چودھویں کے چاند کی آخری رات تھی۔ یہ وہی سماں اور وقت تھا جب اِس کالی سرسوں کے بیجوں والے پھولوں کو چاندنی جیسی دھیمی روشنی میں علیحدہ کر کے محفوظ کرنا تھا۔ باپ، بیٹی ایک کھلے منہ والا شیشے کا مرتبان لے کر ٹوکرے کے پاس بیٹھ گئے۔ رات کا دوسرا پہر لگتے ہی جیونے ٹوکرے کی طنابیں کاٹنا شروع کر دیں۔ سرسوں کی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا ٹوکرا بڑی مشکل سے علیحدہ کیا۔ چاندنی کو تو ویسے بھی سراب کہتے ہیں، اس کی روشنی میں عجیب اَسرار ہوتے ہیں۔ یہ بیک وقت مختلف کیفیتوں اور اثرات کی حامل ہوتی ہے، کہیں رومانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے تو کہیں سفلی جذبات اُبھارتی ہے، کہیں سوچ وبچار اور تفکرات کی فضا پیدا کرتی ہے اور کہیں خودکشی کا رُجحان...... کہیں سرخوشی، ترنگ اور مستی تو کہیں ذہنی اور دماغی خلجان، ڈر، خوف۔ چاندنی میں بڑے بڑے چکر ہوتے ہیں۔ یہ عام اِنسانوں کے لئے محض چاند کی ملگجی سی روشنی ہے مگر حساس، زُود حس، شاعر، موسیقار، مفکر، عرفان و آگہی کے طالبعلم، مایا گت اور اننگ وِدیا والے، عشق کی آگ میں جلے ہوئے، مدِ شب میں مخصوص وظیفہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک نعمت، ایک نغمۂ سرمدی، دریائے نور و حسن اور ایک وقفۂ جودت و جمال ہے...... چاندنی اپنے شباب پہ تھی، زمین کا ایک ایک ذرہ نگینوں کی مانند چمک رہا تھا۔ ٹوکرا کیا علیحدہ کیا، جیسے کسی گنجینۂ حیرت ساماں سے پردہ اُٹھا لیا ہو۔ عجیب سی پُراَسرار خوشبو جو اِنسانوں کے سونگھنے کے لئے نہ ہو، پریوں اور پری زادوں کے پروں کے پسینے جیسی جسے اگر زیادہ دیر تک سونگھا جائے تو اِنسان ایک عنصرِ لطیف میں تبدیل ہو کر فضا میں تحلیل ہو جائے۔ چمکتے ہوئے سیاہی مائل نیلگوں پتوں، پھولوں اور ڈنٹھلوں کا ایک چھوٹا سا جنگل، ہر ڈنٹھل...... کالی ناگ بوٹی کی طرح دل میں خواہش پیدا کر دینے والا...... باپ بیٹی آنکھیں پھاڑے اِس کارخانۂ حیرت کو دیکھ رہے تھے۔ جیونے نے ہاتھ

کر ایک ڈنٹھل کو اکھاڑ لیا' پھر فوراً ہی اسے واپس پھینک دیا کہ ڈنٹھل کے ساتھ ایک چھوٹا سا نیلے رنگ کا سانپ پٹا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ اسے کینچوا سمجھا جو مچھلیاں پکڑنے کے لئے بطور چارہ استعمال ہوتا ہے لیکن وہ سانپ ہی تھا۔ کافی دیر دونوں باپ بیٹی بیٹھے حیرت سے اس سانپوں کی کھیتی کو دیکھتے رہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک تنکے سے کیڑے کو چھیڑا تو کیڑا علیحدہ ہو کر نیچے زمین پہ گر پڑا' نہ تو کیڑے نے کوئی حرکت کی اور نہ ہی کوئی مزاحمت۔ جیونے نے پھر اسے تنکے سے اُلٹ پلٹ کیا' معلوم ہوا کہ یہ جیسے کسی نشے یا مستی کے عالم میں ہے۔ اب اس نے ہمت کر کے ڈنٹھل اُکھاڑنے شروع کر دیئے۔ جس کے ساتھ کیڑا ہوتا' وہ اسے تنکے سے علیحدہ کر دیتا۔ اس طرح اس نے سارے ڈنٹھل اکھاڑ لئے۔ کیڑوں کا بھی ڈھیر لگ گیا۔ سارے ہی بے حس و حرکت جیسے زندہ نہ ہوں' سب ہی نے نسوار چاٹ لی ہو..... باپ بیٹی ساری کالی سرسوں اُٹھا کر اندر جھونپڑے میں لے آئے اگلے ایک گھنٹے میں دونوں نے مل کر بیجوں والے پھل علیحدہ کر کے شیشے کے مرتبان میں ڈال لئے تھے' بے کار ڈنٹھل اور پتے وغیرہ اُٹھا کر باہر آ گئے تاکہ انہیں دوبارہ اسی جگہ پہ گاڑ دیا جائے..... حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہاں سارے کیڑے پگھل کے پانی میں تحلیل ہو چکے تھے' کچھ کیڑے ابھی تک ایسے بھی موجود تھے جو آدھے پانی تھے اور آدھے کیڑے..... انہیں غور سے دیکھتے رہے' ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی زہریلے نیلے پانی میں بدل گئے۔ اس جگہ مٹی ہٹا کر انہوں نے ڈنٹھل اور پتے بھی اسی جگہ دفن کر دیئے۔

اس رات وہ دونوں باپ بیٹی بیدار رہے۔ مدھم سی بتی کی روشنی میں وہ سرسوں کے پھولوں سے کالے کالے بیج جھاڑتے رہے۔ اگلی صبح جیونا کالی سرسوں کے دو سیر بیجوں کو لے کر پاس کے گاؤں کے کوہلو والے کے پاس پہنچا' ان بیجوں میں یہ سانپ والے بیج بھی شامل تھے۔ ایک بڑی بوتل میں تیل نکلوا کر وہ دوپہر سے پہلے ڈیرے پہنچ گیا تھا۔ ایک علیحدہ پوٹلی میں وہ بیجوں کا بچا ہوا فضلہ بھی موجود تھا جسے کھل کہتے ہیں۔ وہ اس نے واپسی پہ ایک محفوظ جگہ پہ دبا دی تاکہ کوئی جانور منہ مار کر ہلاک نہ ہو جائے..... اس تریاق یا تیل کو پورا مہینہ دھوپ دکھائی تھی پھر کہیں جا کر یہ استعمال کرنے کے قابل ہوتا۔ موسم نے بھی انگڑائی لے لی تھی اور اب یہ جگہ بھی کچھ خوفناک سی دکھائی دینے لگی تھی' خاص طور پہ وہ کیڑوں والی اور فصل اُگانے والی جگہ۔ جہاں اب بھی کیڑے سے کلبلاتے دکھائی دیتے تھے۔ ٹھیک تین دن بعد یہ "قافلہ نا آسوداں" اپنی کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھا..... نارووال جنکشن کے شنٹنگ یارڈ کے کنارے جوہڑ کے پاس پہلے سے موجود ایک خانہ بدوشوں کی بستی کے پاس انہوں نے بھی ڈیرے ڈال دیئے۔ پہلے بھی وہ یہاں ایک دو بار ایک لمبا عرصہ گزار چکے تھے۔ ان کے پیشے کسب کے لحاظ سے بھی یہ

جگہ یہ شہر بڑا سود مند تھا۔ عورتوں کی ریلوے سٹیشن پہ اچھی خاصی دیہاڑی لگ جاتی اور بچے بالے' بوڑھے بھی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ کر جی بہلاتے رہتے۔ پھر یہاں جیونے کی مرنے والی بیوی کے بہن بھائی بھی موجود تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کستوری کے علاج کے لئے جس احتیاط اور رازداری کی ضرورت تھی وہ صرف اسی جگہ ہی میسر آ سکتی تھی...... کستوری بھی یہاں پہنچ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کے ماموں ممانیاں اور ان کے بچے' بڑا سا جوہڑ' درخت' آتی جاتی گاڑیاں' دھواں اُگلتا ہوا کالا سیاہ انجن سگنل ڈاؤن نہ ہونے پہ پھاٹک کے پرے کھڑی ٹرین' کھڑکیوں سے جھانکتے مسافر' بچے اور بار بار انجن کی سیٹی کا بجنا' یہ سب کچھ اسے بہت بھلا لگتا تھا...... جیونے نے یہاں نکلتے ہی سب سے پہلے اپنے سالوں کو کستوری کے علاج کے معاملے میں اعتماد میں لیا' سہون شریف کے سنیاسی بابا سے لے کر کالا خطائی میں کالی سرسوں کی بوائی تک ایک ایک مرحلے کی کتھا کہانی تفصیل سے سنائی۔ پھر انہی کے مشورے سے یہی کالی سرسوں کے تیل والی بوتل اچھی طرح بند کر کے مضبوط رسّی کے ساتھ شیشم کے درخت کے اوپر والی ٹہنی پہ باندھ دی تاکہ مہینہ بھر تیل خوب دھوپ کھائے۔ یہ شیشم کا درخت اس کی جھونپڑی کے بالکل ساتھ تھا۔ اب یہ تیل اگلی چودھویں کے چاند کی رات کو اُتارنا تھا۔ یہ دن بھی کسی تیز گام ٹرین کی طرح شوں شوں کر کے گزر گئے [illegible] جیونے کا چھوٹا سالا بوتل اُتارنے کے لئے ایک مضبوط سی رسّی لے کر اوپر چڑھا' رسّی اس لئے تھی کہ بوتل کو باندھ کر احتیاط سے نیچے لٹکا دیا جائے۔ آشو نامی اس کا سالا آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ دودھیا چاندنی رات کا سحر گردوپیش ہر چیز دودھیائی ہوئی' آسمان کے سمندر میں بادبانی کشتیوں کی طرح تیرتے ہوئے سرمئی بادلوں کے ٹکڑے...... بوتل والی ٹہنی ابھی چند قدم آگے تھی کہ آشو نے گھبرائی ہوئی آواز میں اُوپر سے ''ہپ ہپ'' کی ہنکار لگائی۔ ''وہ ''سپ سپ'' کہہ رہا تھا لیکن گھبراہٹ کے عالم میں منہ سے ''ہپ ہپ'' نکل رہا تھا۔ یہ سنتے ہی جیونا گھبرا گیا کہ کہیں اسے سانپ ڈس نہ لے یا گھبراہٹ میں یہ اوپر سے نیچے نہ گر پڑے۔ اس نے نیچے سے آواز دی۔

''آشو! گھبرانا مت۔ یہ سانپ کا سایہ ہے' اصلی سانپ نہیں ہے۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا...... جہاں بیٹھے ہو وہیں ٹہن کو مضبوطی سے پکڑے جمے رہو۔ میں بھی اُوپر آ رہا ہوں......''

جیونا بھی اُوپر چڑھ گیا۔ پاس پہنچ کر آشو کو تسلی دی' پھر ایک بڑی سی ٹہنی توڑی۔ آگے بڑھ کر سانپ کے سامنے لہرائی تو سانپ جو بوتل سے لپٹا ہوا تھا' بالکل بے حس و بے حرکت رہا۔ اب جیونے نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر ذرا زور سے سانپ کی بوتل کے گرد گرفت کو ڈھیلا کر کے ایک جھٹکا دیا' سانپ

بیٹھ گیا۔ جیونے نے جلدی سے بوتل اُتاری' رسّی سے باندھ کر نیچے لٹکا دی اور خود بھی گھبرائے ہوئے تنے سے ہو کر نیچے اُتر آیا۔ سانپ جس جگہ گرا تھا وہاں ایک گاڑھے سے کالے رنگ کے مواد کو دیکھ کر جیونے کو قطعی کوئی تعجب نہ ہُوا' اس نے فوراً اس جگہ پہ گھاس پھوس ڈال کر آگ دکھا دی ...... رات کا باقی حصہ بھی جاگتے اور اسی موضوع پہ بات چیت کرتے گزر گیا۔ اگلے روز جیونے نے سب سے پہلے تیل کو بوتل سے باہر نکال کر صاف کیا' پھر دو تین چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں بھر کر محفوظ کر لیا۔ تیل کی خوشبو سے پوری جھونپڑی مہک اٹھی' ایسی نادر اور پُراسرار خوشبو جسے کوئی بھی اندر سے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ سہون شریف والے سنیاسی بابا کی ہدایت کے مطابق اس تیار تیل کی ایک چھوٹی شیشی کو خالص سرسوں کے تیل میں ایک اور دس کی نسبت سے ملا کر استعمال کیا جانا تھا' باقی ماندہ تریاق مضبوط شیشیوں میں بند کر کے' ٹھنڈے کے پانی سے بھرے ہوئے مٹکے میں ڈبو کر محفوظ کر نا تھا ...... کستوری کے سر کو پہلے صابن سے خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف اور سرخ کیا گیا' اس کے بعد اسی تیل سے اچھی طرح مالش کر کے اوپر موٹی کپڑا لپیٹ دیا گیا۔ علاج شروع ہو چکا تھا۔ کستوری علاج کے معاملے میں بڑی دلچسپی دکھا رہی تھی۔ بس ایک قباحت ...... وہ یہ کہ تیل کی مہک عجیب سی تھی۔ خوشگوار نہ ناگوار ...... ملی جلی کیفیتوں کی حامل جیسے سلگتے ہوئے عنبر کو کسی پیاہوا کافور ملا دیا جائے۔ یا پھر ...... تیل لگانے کے بعد وہ اپنے جھونپڑے میں ہی بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی' ویسے بھی وہ خاموش' تنہائی پسند یا شاید احساسِ کمتری کی شکار لڑکی تھی ...... تین چار روز بعد اسے اپنے سر میں شدید کھجلی سی ہوئی' پھر ہلکا ہلکا درد سا رہنے لگا۔ ایک آدھ دن بخار کی سی کیفیت بھی طاری ہوئی مگر وہ بڑی سخت جان اور صابر لڑکی تھی' کسی پہ اپنی تکلیف ظاہر کیے بغیر اپنی ننھی سی جان پہ جھیل جاتی۔ ساتویں روز' آدھی رات اسے یوں لگا جیسے اس کی کھوپڑی کا پیالا بھک سے پھٹنے والا ہو۔ خود بخود اس کے دونوں ہاتھ سر پہ آ گئے' بالوں کا ایک انبوہ اس کی ہتھیلیوں تلے تھا۔ حیرت اور گوناگوں مسرت کے مارے اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ...... جیونا گھبرا کر اٹھ بیٹھا' بتی کی روشنی بڑھائی۔ دیکھا' ایک خوفناک کالا سانپ کستوری کے سرہانے پھن پھیلائے کھڑا ہے جس پہ شاید کستوری کی نظر نہیں پڑی تھی۔ جیونے نے فوراً اپنی پگڑی کے پلّو سے اسے ہٹانا چاہا' سانپ بغیر کسی اشتعال و حرکت وہیں ڈھے گیا۔ کستوری کو دیکھا' وہ سر تھامے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے باپ کو اور کبھی سانپ کو دیکھ رہی تھی۔ جیونے نے سانپ کو دُم سے پکڑ کر باہر پھینک دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باپ بیٹی کے ذہنوں پہ سانپوں والا خوف' دہشت بن چکا تھا۔

"بابا! تم نے میرے بال دیکھے؟" آخر وہ سر پہ سے ہتھیلیاں ہٹاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

جیونا مسرت اور حیرت کے ملے جلے اظہار کے ساتھ کستوری کے نادرِ روزگار بال دیکھ رہا تھا مگر یہ بال تو عام انسانی بالوں سے بہت مختلف گھنگھریالے اور کالے سیاہ تھے۔ ناگنوں کی لچکدار نرم جسم کی نرماہٹ اور چمک لئے ہوئے جیسے ننھے ننھے ہزاروں لاکھوں سیاہ کالے سنپولئے کستوری کے سر کے بلوں سے اُبل پڑے ہوں اور وہی مانوس سی خوشبو جو اَب شاید ان کی روزمرہ کی زندگی کا لازمہ بن کر رہ گئی تھی۔

دن اوپر' رات نیچے' صبح نیچے شام اوپر' زندگی پھر چل دوڑی۔ بال جیسے سر کی کھوڑی سے کالی کالی بل کھاتی سیویاں اُمڈی پڑ رہی ہوں۔ کچھ ہی دنوں میں خوشبودار بانس کے پودوں کی مانند بالوں کا جنگل اُگ آیا' اب تو یوں دکھائی دینے لگا کہ اگر انہیں ابھی سے کنٹرول نہ کیا گیا تو ممکن ہے' بالوں کا یہ سلسلہ نارووال سے آگے نارنگ منڈی سے ہوتا ہوا ننکانہ صاحب' وہاں سلام کرتا ہوا ننگا پربت تک دراز ہو جائے۔ بال شانے سے اُتر کر جب کمر تک آئے تو جیونے نے فل بریک لگا دیئے' یعنی تیل مالش موقوف کر دی۔ فل بریک لگی گاڑی کی طرح یہ بال بھی کمر سے اُترتے اُترتے سرین تک آ پہنچے۔ پھر اپنے ہی زور وزن سے گھسٹتے لٹکتے ہوئے اِس کے پاؤں کے ٹخنوں تک پہنچ آئے۔ بال کیا تھے کالی سیاہ گھٹاؤں کا ایک اُمڈا ہوا طوفان' اتنے گھنے بھرپور گنجان جیسے سندر بَن کا جنگل...... آپس میں اُلجھے ہوئے گڈمڈ' جنہیں کنگھی کرنا یا سمیٹنا [illegible] پیچھے چھوڑتی تو خود بالوں کے بادلوں میں چھپ سی جاتی' اگر کسی طرح لپیٹ لپاٹ کر جوڑے کی شکل میں لاتی تو یوں لگتا کہ کالی اون کا بڑا سا گٹھڑ پیٹھ پہ لادے کہیں دُھنائی کے لئے جا رہی ہے۔ ننھی سی جان اک عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اِس کے علاوہ حشرات کی نہ کسی سانپ کیڑے کی [illegible] زور آزمائی اک الگ اذیت ناک پریشانی تھی۔ گو کسی کیڑے نے اسے یا ڈیرے کے کسی فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا پھر بھی دہشت تو دہشت ہی ہوتی ہے' جیونے کے علاوہ کوئی اور اس کے جھونپڑے میں سوتا بھی نہیں تھا۔ جیونے کا اپنا ذاتی خیال تھا کہ یہ کیڑے سانپ وغیرہ اِس طلسماتی تیل کی مہک سے کھنچے چلے آتے ہیں اور پھر اس کے نشے سے ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ ان کی سُدھ بُدھ ماری جاتی ہے۔ وہ کسی کو نقصان یا فائدہ پہنچانے کے قابل نہیں رہتے' اور یہ کہ اِس خوشبو میں کچھ ایسی سرّی اور کیمیاوی اثرات ہیں جن کے زیرِ اثر رہنے کے کچھ دیر بعد اِن کے اندر ہڈی گوشت پگھل جاتا ہے' صرف ظاہری جسم کھڑا رہتا ہے جیسے گتے' کاغذ' کپڑے کو جلایا جائے تو جل جانے کے باوجود بھی وہ کچھ دیر کے لئے پہلی والی حالت میں قائم رہتے ہیں' ہوا کے تیز بہاؤ یا انہیں چھیڑنے ہلانے سے یہ راکھ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ کیڑے سانپ بھی ذرا سا ہلنے سے گاڑھے نیلے سے سیال مادے میں بہہ جاتے ہیں۔ اپنی اس قیاس آرائی کو اس نے کستوری کو بھی

سے انداز میں سمجھا دیا تا کہ وہ آئندہ کے لئے اس قسم کی صورتِ حال میں ڈر اور خوف سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

■ رَواں دَواں، زندگی کا کارواں......!

"وقت گزرتا گیا، ٹھکانے بدلتے رہے۔ زندگی سن و سال کے چند سنگِ میل پھلانگتے ہوئے کچھ آگے نکل آئی تھی۔ جیونے کی جیون جوگی بیٹی اب اس میٹھے برس کو آ لگی تھی جہاں لڑکیاں کھٹے میٹھے سپنے دیکھنے لگتی ہیں، آمدِ شباب کی رَوئیدگی انگ انگ، بند بند اور رُوئیں رُوئیں سے چھلکنے لگتی ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی پہ جھک کر اپنا عکس دیکھنا پھر ہاتھ کی حرکت سے پانی کو گدلا کر دینا، آئینہ دیکھنے کو جی کا چاہنا وغیرہ اسی عمر کی مستیاں ہیں۔ بالی عمر میں جب بال ہٹ در آتی ہے تو یہی سمجھنا چاہئے کہ بال اب بال نہیں رہا وبالِ جان بن گیا ہے۔ جب ہنڈیا کناروں تک اُبل جائے، جوش نکل جائے تو شانت پڑ جاتی ہے۔ کستوری اب جھاڑ بالوں کو سنبھالنا اور ان کی بال ہٹ سے نپٹنا سیکھ گئی تھی۔ اب تو یہ عالم تھا کہ سو کر اُٹھتی [illegible] انہیں جھٹک کر پیچھے جھٹک دیتی ہیں۔ بال برگد کی داڑھی کی مانند ٹخنوں تک اُتر آئے تھے، اگر ساتھ ساتھ بال جھڑنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ زلفِ بنگال خدا جانے کہاں تک دراز ہوتی...... کنگھی کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ کنگھی تو بالوں میں ہوتی ہے سنپولیوں میں نہیں۔ اب اسے اپنی مخصوص خوشبو بھی محسوس ہوتی تھی، ویسے بھی جوانی کی اپنی اِک خوشبو ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی اور خوشبو نہیں ٹھہرتی۔ کستوری اپنی خوشبوؤں میں مست و مگن تھی، اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کا جہاندیدہ بوڑھا باپ کس چنتا میں پھنسا ہوا ہے، کن سوچوں میں ڈوبا ہوا ہے؟ وہ اس کی چڑھتی جوانی کی بپھرتی ندی کے تیکھے تیور محسوس کر رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا کہ وہ کس طرح اس کے منہ زور بہاؤ کے آگے کوئی بند باندھ سکے گا۔ وہ تو بیاہ کے قابل ہی نہیں تھی۔ اس نے بیٹی کا عورت پن مانگا جو اس کو مل گیا تھا، اب اس کے نصیب؟...... کستوری کے نین نقش ایسے تیکھے نکل آئے تھے کہ دیکھنے والی نگاہ دیکھ کر خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی، قبیلے کے کنوارے لڑکے یہ جاننے کے باوجود کہ اس سے بیاہ کرنے کا مطلب سہاگ رات اپنی میت اُٹھانا ہے پھر بھی وہ اِسے ایسی نظروں سے تکتے کہ تیری قُربت و وصال کے چند لمحے بھی اگر پوری زندگی کے عوض میسّر ہو جائیں تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ مصر والی قلوپطرا تو محض اِک چاتر عفیفہ تھی، وہ اگر موجودہ زمانے میں مصر کی

بجائے مانگا منڈی میں ہوتی اور کہیں اپنی کستوری کو دیکھ لیتی تو کبھی کی سانپ بچھو ڈسوا کے اُوا کر قصہ پاک کر گئی ہوتی...... جیونا حالات اور خدشات کی ننگی تلوار پہ کھڑا تھا۔ کبھی کبھی اسے یہ بھی خیال آتا کہ اگر وہ بالوں کے چکر میں نہ پڑا ہوتا تو وہ اسے آج کہیں بیاہ کر سکھ کا سانس لیتا' قبیلے کا کوئی نہ کوئی لڑکا بیاہ کرنے پہ تیار ہو ہی جاتا۔ پھر خود ہی اپنی سوچ پہ لعنت بھیجنے لگتا کہ وقت تو گزر چکا ہے' اب پچھتانے سے کیا ہوگا لیکن وہ شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ایک کنواری جوان بیٹی کا باپ ہونا اور پھر اس کا بیٹی کو نہ بیاہنے پہ مجبور ہونا کتنا بڑا عذاب ہے۔ وہ کس طرح اس اذیت و عذاب کو سہار سکے گا۔ اپنی سوچوں کی اذیت سے چھٹکارا پانے کے لئے اب اس نے ایک اور راستہ تلاش کر لیا تھا۔ وہ اب جلد از جلد اپنے پڑاؤ ٹھکانے بدلنے لگا تھا' چار پانچ ہفتوں سے زیادہ کہیں ٹھکانا نہ کرتا۔ قبیلے والے اس کے دُکھ اور پریشانی کو سمجھتے تھے لیکن اس کے دُکھ درد کا درماں تو شاید کسی کے پاس نہیں تھا۔ دیہاتوں' قصبوں' شہروں کی خاک رولتا اور فاصلے ناپتا ناپتا وہ بہرام کے گاؤں اور سلیمان کے باپ دادا کے کھیتوں اور ٹیلے کی جانب آ نکلا اور ان کی اجازت سے ٹیلے پہ ڈیرہ جما دیا۔ دراصل اس ٹیلے پر ڈیرہ ڈالنے کی ایک وجہ بھی تھی...... سانپوں اور کیڑوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی ہوئی تھی' قبیلے کے دوسرے لوگ بھی ہر وقت سہمے سہمے اور ڈرے ڈرے سے رہتے تھے۔ ان کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ کستوری خود ان سے عاجز آ چکی تھی۔ جیونا اس کا کوئی حل تلاش کر رہا تھا۔ اچانک اس کی ملاقات ایک پرانے تجربہ کار سپیرے سے ہوئی۔ اس سپیرے نے جیونے کی بپتا سننے کے بعد اسے چار عدد لونگ دیئے پھر ایک منتر بتاتے ہوئے کہا کہ ایک مٹی یا پتھر کا ایسا تپہ یا ٹیلا تلاش کرو جو زمین سے کم از کم چار فٹ اونچا ہو اور اس کی کھوؤں یا درازوں سوراخوں میں چھوٹے جانور یا پرندے رہتے ہوں۔ یہ چار لونگ ذرا دور ہٹ کر چاروں کونوں میں گاڑ دو۔ اس حصار کے اندر کبھی کوئی کیڑا' سانپ یا موذی جانور داخل نہیں ہو سکے گا۔ بڑی تلاش کے بعد جیونے کو یہ جگہ عین اس کی مرضی اور مقصد کے مطابق نظر آئی۔ یہ چھوٹا سا تپہ دراصل مٹی کا ایک تودہ تھا۔ خدا جانے یہ کس طرح معرضِ وجود میں آیا تھا کہ اس کی مغربی دیوار بالکل اُفقی سیدھی کھڑی تھی۔ صرف اس جانب ہی کوؤں' ابابیلوں' شارکوں کے سوراخ تھے۔ ناہموار چھوٹا سا تپہ جس پہ کبھی کبھی اردگرد کے گاؤں کے بچے بالے ہواخوری کے لئے آ جاتے یا خوش فکرے یار باش ڈھولے ماہیے الاپنے یا کبھی پتنگ بازی والے بھی گڈیاں اُڑانے پہنچ جاتے' اطراف کے کھیتوں میں خوب فصلیں ہوتی تھیں۔ ٹیلے کے دوسری طرف کھیتوں کے درمیان سلیمان اور محبوب عالم نے بانسوں اور جھاڑ پھونس سے ایک مچان سی بنا رکھی تھی۔ یہاں ان کے ایک دو ملازم ان کی گائے بھینسوں کا چارا وغیرہ کاٹتے رہتے' صبح و شام دودھ دوہتے اور

... کے کھیتوں کی رکھوالی بھی کرتے۔ سلیمان تو طالب علم تھا' سکول سے فارغ ہونے کے بعد وہ اکثر ... کھیتوں کی جانب ہی نکل آتا۔ اس کے ہم عمر دوست اکثر ٹیلے پر چڑھ کر شام کا منظر اور ... شور وغل دیکھا سنا کرتے۔

محبوب عالم' سلیمان سے دس برس بڑا تھا۔ دسویں جماعت میں چھوڑ کر اپنے باپ کے ساتھ ... میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ بڑا ہی پُروجاہت' چیتے کی طرح خوبصورت' تومند اور خاموش سا ... نوجوان تھا۔ کام کاج کے علاوہ اس کا واحد شوق یا عشق' بانسری بجانا اور ہیر گانا تھا۔ اکثر وہ کام ... فارغ ہو کر تھڑے کے اوپر آ کر بیٹھ جاتا۔ شام کا سماں ہو یا رات کا کوئی پہر' گاؤں کی فضا میں اگر ... مستی رچی بسی ہوئی ہے' ڈھور ڈنگر اگر ساکت و جامد مسحور کھڑے ہیں اور کچے گھروں' کھیتوں تنوروں' ... اور چرخوں' چکیوں پہ بیٹھی مٹیاریں اگر بوتتری نئی ہیں تو سمجھیں کہ محبوب عالم تھڑے پہ بانسری الاپ ... اس کی سُریں اتنی پاکیزہ اور مسحور کُن ہوتی تھیں کہ دلوں میں سُرور اور سرمدی مستی سی پیدا کرتی ... اس سے کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی اور وہ تو گاؤں کی گلیوں میں بھی بہت کم دکھائی ... جس ... الٰہی خانہ ... نے ... کی ... ٹھوکے تھے' ... شام اس ... شکر دین ... پٹواری کے ساتھ زمین کے کسی بکھیڑے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جب ... رات واپس لوٹا تو ستاروں کا پنجا نگالانے کے عین وسط میں پہنچ چکا تھا۔ تھڑے پہ جگنو ... شمار رہے تھے' ... عجب سا منظر...... جیسے سب کچھ سے کچھ اور ہو گیا ہو' فضا اور ہوا میں اک انجانی سی مہکار تھی جسے کوئی نام ... دیا جا سکتا تھا۔ اس پُر اسرار سی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے گھر جانے کی بجائے کھیتوں میں اپنے ... پہ ہی رُک گیا' چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے محبوب عالم نے اپنے کامے سے پوچھا۔

"شکر دین! یہ آج کیسی موج لگی ہوئی ہے' یوں لگتا ہے کہ جیسے یہاں سے جنوں پریوں کی بارات ... ہو...... یار! تھڑا بھی آج کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیتا ہے' یہ ہلکا ہلکا لہراتا ہوا دھواں اور ٹمٹماتے سے ... "

شکر دین نے اس کو دودھ کا پیالہ پکڑاتے ہوئے بتایا کہ اک پکھی واسوں کا ڈیرہ آ گیا ہے' ... چوہدری صاحب نے انہیں ساون پوہ تک یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ دودھ پی کر وہ ... سیدھی کرنے کی غرض سے چارپائی پہ لیٹ گیا۔ شکر دین نے اسے یوں لیٹتے دیکھ کر پوچھا۔

"محبوب باؤ! حکم ہو تو گھر سے کھانا یہیں لے آؤں...... یا گھر جاؤ گے؟"

محبوب اک عجیب شانِ محبوبیت سے تھڑے کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"شکر دین! کیا تمہاری آنکھیں اور ناک کام کرتے ہیں؟"
شکر دین ہڑبڑا کر بولا۔ "باؤ!...... کی مطلب 'میں کچھ سمجھا نہیں......؟"
"شکر دین! نہ تو میں نے عربی بولی اور نہ ہی فارسی...... اک سیدھا سادا سوال کیا ہے کہ تمہاری آنکھیں اور ناک کام کرتے ہیں یا نہیں؟"
"باؤ! اللہ دا شکر ہے' دونوں بالکل صحیح صحیح کام کرتے ہیں۔" شکر دین نے جلد جلد جواب دیا۔
محبوب نے اسی مسحور کن لہجے میں کہا...... "اچھا' یہ بتاؤ کہ تمہیں صرف وہی کچھ نظر آ رہا ہے جو ہر روز نظر آتا تھا یا آج کچھ علیحدہ سا مختلف دکھائی دے رہا ہے اور ہاں یہ بھی بتاؤ کہ آج تم کوئی عجیب سی خوشبو بھی محسوس کر رہے ہو یا صرف میرا وہم ہی ہے؟"
شکر دین ٹوٹ بٹوٹ سا دیدے اٹھائے اور ناک کے نتھنے مچھلی کے گلپھڑوں کی مانند پھیلاتے ہوئے کہنے لگا...... "کچھ کچھ محسوس تو مجھے بھی ہو رہا ہے لیکن آپ کہتے ہیں تو میں کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیتے ہوں...... ویسے باؤ' محبوب! ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ ہم کمیوں نوکر چاکروں کی دیکھنے' سننے' سونگھنے یا سوچنے کی طاقتیں واقتیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ہم سب کچھ اپنے مالکوں کی طاقتوں سے دیکھتے ہیں۔ جو وہ ہمیں دکھانا چاہیں ہم وہی کچھ دیکھنے لگتے ہیں۔"
محبوب ہلکا سا چونکا' بولا۔ "شکر دین! آج تو بڑی سیانی باتیں کر رہا ہے۔ لگتا ہے' یہاں کی ہر شے کی طرح تو بھی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے......"

● اُچے ٹبے دا یار......!

ٹبے کی اوٹ سے چاند اُبھر رہا تھا۔ ہلکے ہلکے دودھیائی اُجالے کا ہالہ ٹبے کو اپنی آغوش میں لے چکا تھا' وقت کو بھی جیسے کسی نے ہاتھ پکڑ کر تھام لیا ہو۔ محبوب اسی کروٹ لیٹا ہوا' گہری محویت میں لت پت آنکھوں تک ڈوبا ہوا تھا' وہ اس سحر انگیز ٹبے کی جل تھل میں بھیگ چکا تھا۔ شکر دین اجازت لے کر پانی لگانے کے لئے کھیتوں کی جانب نکل گیا تو محبوب نے اپنی جان سے محبوب بانسری نکالی' بانسری کو وہ ہمیشہ ریشمی رومال میں لپیٹ کر رکھتا تھا...... کہتے ہیں کہ جو ساز بنے سانس سے زندہ ہوتے ہیں ان کا پہلا سُر چاہے وہ کسی لے یا انگ رنگ سے ہو' سرمدی ہوتا ہے۔ وہ آہنگ' الوہیت رنگ ہوتا ہے۔ سانس کا تعلق دَم سے ہوتا ہے' دَم دَم مَست' بانسری کے سُروں میں ایسا بانکپن' ہوک' ہمک' کسک' کرب اور کشش ہے

ہوگئی۔ ہر ساز میں کہاں؟...... محبوب نے اپنی محبوبہ کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی' پھر اپنے نفس کا فسوں پھونکا۔ وقت' سماں اور رات کا جگر کاٹتا ہوا ایک مضطرب سائر کسی ستارے کی طرح ٹوٹ کر کستوری کے کنجِ دل پہ گرا تو اسے گھائل کر گیا۔ کونج کی طرح کرلاتی بانسری نے اس کا "اندر" زندہ کر دیا تھا اور جب اندر زندہ ہو جائے تو پھر انسان کا باہر مُردہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بانسری کے سُروں نے ایک ایک کر کے تمام بھید کھول دیئے تھے۔ جیسے کستوری کو اپنے بھیتر کی خوشبو کا سراغ مل گیا' اِدھر محبوب کو بھی اپنے بھیدوں کا جواب ملنے لگا تھا۔

کئی برسوں بعد آج پہلا سورج طلوع ہوا تھا کہ کستوری دوالے کوئی سانپ کیڑا نہیں تھا اور کستوری کو جیسے اک نیا سروپ سراپا مل گیا ہو' کستوری وہ کستوری ہی نہیں تھی جو پچھلی رات سوئی تھی۔ یہ کستوری تو کوئی مادھوری تھی' سرشار بے قرار' طنبورے کی تاروں کی طرح تنی ہوئی جیسے کسی راجواڑے کی بیٹی ہو۔۔۔۔ راج ہنس کے پروں پہ سوار ہو کر کسی راج محل سے آئی ہو۔ رُعب و نخوت سے مکھ تپا ہوا' نخوت سے جیسے ابھی ابھی پریوں نے اِسے غسلِ صحت دِلا کر' خوشبوؤں میں بسا کر سنگھاسن پہ لا بٹھایا ہو۔ بستی قبیلے والے سب حیران تھے کہ [illegible] ناز' عشوے [illegible] نہیں سہاگ کا سندور چاٹ کر دکھاتی ہیں۔ جیونا بھی حیرت و خوف میں ڈوبا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی اس سے کچھ کہنے پوچھنے کی جرأت بھی نہیں رہی تھی۔ باپ بیٹی سے کیا پوچھے کہ تُو اس قدر خوبصورت کیوں لگ رہی ہے' تو اس قدر خوش کیوں ہے؟ بس' وہ اسے بٹ بٹ تکے جا رہا تھا۔ تب کستوری خود ہی اِٹھلا کر پوچھنے لگی۔

"بابا! تو مجھے اس طرح کیوں دیکھے ہے' میرے سینگ نکل آئے کیا......؟"

جیونا' دُلار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا میں اپنی بچی کو دیکھ بھی نہیں سکتا؟...... بس' تو آج بہت پیاری دِکھے ہے۔ رَب تجھے بُری نظر سے بچائے......"

کستوری اُٹھ کر باپ کے چھدرے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"بابا! اب تو میری فکر نہ کیا کر' اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اب تو اِدھر بیٹھا آرام کیا کر' میں خود سب کچھ سنبھال لوں گی۔"

جیونا' زہر خندہ سا ہو کر کہنے لگا۔ "تو بڑی ہو گئی ہے اور اب میں تیری فکر نہ کروں؟...... پگلی! تیرے بڑے ہونے کی چنتا ہی تو مجھے کھائے جا رہی ہے اور تُو کہے ہے کہ میں تیری فکر نہ کروں......" چند

ثانیے خاموش رہ کر پھر روہانسو سا ہو کر کہنے لگا۔ ''میں کیسا بدنصیب اور مجبور باپ ہوں کہ کہیں تیرا بیاہ بھی نہیں کر سکتا۔ تُو تو سب کچھ جانتی ہے۔ بتا' میں کیا کروں؟ تجھے دیکھتا ہوں تو لہو کے گھونٹ پی کر دم سادھ لیتا ہوں...... کستوری! تُو میرے لئے وہ زہر اور ایسا اَمرت ہے جسے میں نہ پی سکتا ہوں اور نہ پھینک سکتا ہوں......''

کستوری یوں مسکرا رہی تھی جیسے اس کا بابا' اس سے کوئی ہنسی ٹھٹھول کی بات کر رہا ہو۔

''بابا! میں نے کہہ دیا نا' اب تُو میری فکر چھوڑ اور یونہی اپنا جی میلا نہ کیا کر...... تجھے میرا بیاہ کرنے اور اس بارے کوئی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں' میں نے اپنا بَر چُن لیا ہے۔ میرا انت مجھے مل گیا ہے......'' کستوری نے اتنی بڑی بات' بڑی آسانی سے کہہ دی۔

''کیا کہہ رہی ہے کستوری......؟'' جیونے نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بابا! پیٹ کے لئے اناج ضروری نہیں' اسے بھرنا ضروری ہوتا ہے۔ میرے بیاہ کے لئے بَر کی ضرورت نہیں' صرف بانسری کی ضرورت ہے......'' وہ جھونپڑے سے باہر محبوب کے ڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''رات ایک بانسری چھڑی ہوئی تھی اور میں اس کی دُھن کے بھیدوں سے بھری ہوئی تھی' اک تان لپکے' اب سمجھ رہی ہوں...... میں نے اپنا انت پا لیا ہے بابا! مجھے سب کچھ مل گیا......''

''کستوری! تو یہ سب کچھ کیا کہہ رہی ہے...... بانسری' تان' لپکے' بھید......؟''

''بابا! بس یہی ایک بھید ہے۔ جو سمجھ لے وہ بھیدی ہے...... بابا! ایک بھید یہ بھی ہے کہ بندہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا...... تُو نے ڈھیر ساری زندگی یوں ہی اَن گنی منزلوں میں گزار دی۔ چار دن جہاں بیتا دیئے دُکھن ہونے لگی' پھر اگلی کھوج نکل پڑے۔ پھر اگلی' اس سے اگلی...... بابا! یہ زندگی کی کھوجیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بس یہی بھید ہے کہ جس حال میں رہو' راضی رہو۔ تجھے اتنی بڑی زندگی نے اک چھوٹا سا بھید نہیں دیا' مجھے تو اک پَل کی ہُوک نے سارے بھید دے دیئے...... بابا! میں آج اس طرف جا سکتی ہوں؟'' کستوری نے محبوب کے ڈیرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایسے پوچھا جیسے کوئی بالڑی اچانک اپنے باپ سے کہے کہ ابا! میں یہ کھلونا لے سکتی ہوں؟

''کستوری! جہاں جی چاہے' ضرور جا پر اکیلی کہیں مت جائیو' سکھیوں سنگت جائیو......'' پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''گاؤں تو اس طرف ہے اور جدھر کا تُو بول رہی ہے اُدھر تو کھیت ہی کھیت ہیں ری......؟''

''ہاں' بابا! اُدھر کھیت ہی کھیت ہیں مگر ان کھیتوں میں بھی تو لوگ رہتے ہیں اور جس نے مجھے

[illegible] سارے بھید سمجھائے، وہ بھی تو انہیں کھیتوں میں رہتا ہوگا۔"

● سُروں کے بھید، عاشق جانے یا کوئی وید......!

دیہاتوں، گاؤں یا مضافاتی بستیوں میں سورج صبح سویرے ہی درشن دے دیتا ہے اور شام کو [illegible] سارے ملگجا بھی جلدی ڈال دیتا ہے۔ آج اس نئی بستی میں ان نئے لوگوں کے نئے دن کا آغاز ہو [illegible] اس سے پہلے یہ خانہ بدوش اس جگہ پہ نہیں آئے تھے۔ یہاں کے رہنے والوں کو ان کے مزاج [illegible] اور ان کے اصل کاروبار سے واقفیت نہیں تھی۔ ان لوگوں کا کاروبارِ حیات ہی مانگے تانگے یا کہیں [illegible] محنت مزدوری سے چلتا ہے۔ صبح سویرے ہی ان کی عورتیں لڑکیاں روزی جیلے کے لئے گاؤں کی [illegible] نکل گئیں، مرد لوگ جھونپڑوں کے باقی ماندہ کام میں جُٹ گئے اور جیونا ایک لڑکے کو لے کر شہر کی [illegible] چل دیا کیونکہ اس کے ریڑھے کے دھرے کا بیرنگ خراب ہو گیا تھا۔ کستوری کو وہ سوتا ہوا چھوڑ کر [illegible] پچھلی رات سونا تو درکنار اس نے تو ایک لمحے کے لئے آنکھ تک نہیں میچی تھی اور اب پوری کھاٹ [illegible] سے خراٹے لے رہی تھی۔ پیاری سی ناک، ننھے ننھے نتھنوں پہ سانس بھرتے سمے ہلکا سا ارتعاش، [illegible] یاقوت سے تراشے ہونٹوں پہ اک پاکیزہ سی ملکوتی مسکان جیسی وہ کسی گہرے سپنے میں کھوئی ہوئی [illegible] کی مدھر تانوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو...... بانسری اپنے [illegible] سماں باندھتی ہے۔ یہ گھنگھرو [illegible] کہ چُپ لگیں اور جھن جھنا نن نن بول اٹھیں۔ یہ بانسری تو لبوں کے لمس سے بھی بجنے کی شرافت [illegible] کی نزاکت کا احساس و خیال مانگتی ہے۔ یہ تو ایک ایسا معشوق ہے جسے چوم چوم کر منایا اور سُر میں [illegible] ہے۔ دوسرے ساز نے دیکھیں تو کسی کو سُر میں کرنے کے لئے اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں، کسی کی کول چتر یا ہتھوڑی سے مرمت کرنی پڑتی ہے، کسی کی طنابیں کھینچنے کے لئے باقاعدہ زور آزمائی کرنی پڑتی ہے، کسی کے کھرن پہ چماٹے مارنے پڑتے ہیں، کسی کو آٹا اور کسی کو سینک...... اور بانسری، یہ تو [illegible] کے سازوں کی بدیع الجمال ہے...... سیف الملوک اپنی بدیع الجمال کو اپنے سینے پہ لٹائے، بے کی [illegible] ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، یہ جنہ تو اب اس کے لئے سلسلۂ کوہ قاف بن کر رہ گیا تھا۔ پچھلی رات کے چاند اور ستارے تو کب کے کہیں جا کر سوئے پڑے تھے، اگر مسلسل جاگ رہی تھیں تو وہ اس کی آنکھیں [illegible] من موہنی خوشبو کی رُت تھی، وہ پچھلی رات کا شہر سے واپس لوٹا ہوا تھا۔ رات گئی، کھانا پینا اور دیگر

حوائج ضروریہ؟...... معلوم ہوا کہ داڑھ کی ڈھن کی طرح' جب اندر کی لپک جاگ پڑے تو پھر مابعد کچھ بھی اہم نہیں ہوتا۔ کھیتوں کا رکھوالا' رات کھیتوں کو پانی دکھا کر نیند آرام کے بعد دودھ نکال' گھر پہنچا کر واپس بھی پہنچ گیا مگر محبوب...... ایسا خوشبو کے سنگ تپے پہ پہنچا کہ ابھی تک واپسی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ آفاقی ملکوتی' ماورائی خوشبوئیں دیوانوں' مستانوں کے خوابوں کی مانند ہوتی ہیں اور جب خواب اور خوشبوئیں آپس میں گڈمڈ ہو جائیں تو پھر دیوانوں کی نیند کہاں؟...... بانسری کی نوائے نیم شبی کا آہنگ رنگ ابھی تک فضا میں رنگ گھولے ہوئے تھا کہ شمر دین نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

''باؤ' محبوب! طبیعت ٹھیک ہے' نا؟...... لالے تے بے بے پوچھ رہے تھے کہ محبوب رات کو گھر کیوں نہیں آیا...... جا' باؤ! گھر جا کر تھوڑا سا آرام کر لے......''

''ہوں......'' محبوب یوں چونکا جیسے شمر دین نے اسے کوئی نہ سمجھ میں آنے والی بات کہہ دی ہو۔ ''ہاں' آں......'' جیسے اسے کچھ بھولا ہوا یاد آ گیا ہو' بانسری کو رومال میں لپیٹتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''شمر ادی! اب تو بھی کچھ آرام کر لے......''

کاغذات کا تھیلا اور بانسری سنبھالے وہ گاؤں کی راہ پہ ہو لیا۔ گاؤں کی جانب نکلنے والی یہ پگڈنڈی کوئی [illegible] فرلانگ آگے [illegible] کے دامن کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ [illegible] ذرا پہلے معمول کی گہرائی سے گزرنا پڑتا تھا' دراصل یہ ایک برساتی پانی کی گزرگاہ تھی۔ جیسے جیسے محبوب آگے بڑھتا گیا' اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی خوشبو فشاں پہاڑ کی جانب رواں ہے اور وہ پہاڑ اسے مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ اس کے پاؤں تیزی سے اٹھ رہے تھے جیسے اس عمل میں اس کے اپنے کسی ارادے کا دخل نہ تھا وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح بے سُدھ سا آگے بڑھ رہا تھا۔ سورج اس کے پیچھے اور سایہ بھی قدم آگے...... وہ اپنے سائے کی طوالت و ہیئت کذائی پہ غور کرنے پہ مجبور ہو گیا۔ سایہ تو جسم کا محتاج ہے' یہ کیسا سایہ ہے؟ وہ کچھ سوچ کر رُک گیا' بلکہ اپنے قدموں پہ بیٹھ گیا۔ مگر سایہ نہ رُکا اور نہ ہی بیٹھا۔ اپنی راہ پہ چلتا اور بڑھتا رہا۔ آگے برساتی نالے کے کنارے ایک کنٹھل آم کا چھوٹا سا درخت تھا' سایہ اس درخت کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہ آیا' اچانک اس کی نظر آم کے درخت کی جانب اُٹھی' وہاں کستوری کھڑی اسے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی' ساتھ ہی مست کر دینے والی خوشبو کا ایک زبردست جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ کستوری جیسے سائے کے قالین پہ پگ دھرتی ہوئی اس کی جانب آ رہی تھی' بالوں کی ایک سیاہ پانیوں کی ساکت آبشار اس کی جلو میں تھی اور سایہ تھا کہ سمٹا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ وہ محبوب کے سامنے' قریب آ کر رُک گئی۔ کئی صدیاں وہ ایک دوسرے کو

... نظروں سے دیکھتے رہے۔

''تم ۔۔۔ تم وہی خوشبو ہو جس نے یہاں ہر زندہ چیز کو بے خود دیوانہ سا بنا دیا ہے......؟'' محبوب نے ... بغیر کستوری سے پوچھا۔

کستوری کے نازک لبوں میں جنبش ہوئی۔ ''...... اور...... اور تم بھی وہی بانسری ہو جس کی سُروں نے وہ سارے بھید کھول دیے جو ابھی تک میرے سپنوں کی دُھند میں لپٹے ہوئے تھے۔''

''تم اوپر ٹیلے پر رہنے کو آئی ہو نا......؟''

''ہاں وہیں ٹیلے سے آئی ہوں اور اب ہمیشہ وہیں رہوں گی۔ تمہاری بانسری کی میٹھی میٹھی، بھید ... سُروں کو سُنا کروں گی...... تمہاری کھوج میں کیسی کیسی مشکلیں اور مصیبتیں جھیلیں بڑے بڑے ... سے گزری تب کہیں جا کے تم مجھے ملے ہو......''

محبوب نے اسی خواب آگیں لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں تم وہی میرے سپنوں اور خیالوں کی خوشبو ہو۔ میں نے جب سے بانسری پکڑی ہے، میں ... ہی کو الاپتا رہا ہوں...... میں اپنے اسی ڈیرے پہ چاندنی راتوں میں [illegible] دیکھتے ہوئے [illegible] تمہاری خوشبو ... کوئی اجنبی نہیں ہے۔ یہ تو سدا میرے ساتھ رہی، مجھے جینے کا حوصلہ دیتی رہی اور جانتی ہو، ... کیا ہوں؟''

''ہاں......'' کستوری بولی۔ ''تم میرے محبوب ہو......''

سورج کچھ اور اُوپر چڑھ آیا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے ایک سیدھ میں کھڑے تھے اور دونوں کا ... تھا۔

کستوری کے بالوں اور خوشبو کا گاؤں بھر میں چرچا پھیل گیا تھا۔ وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ ... میں ہرنی کی مانند زقندیں بھرتی پھرتی تھی۔ ایک گھر سے دوسرے، تیسرے، جہاں جاتی، صحن ... لڑکیوں بالیوں سے بھر جاتے۔ ہر کوئی اس کے نین نقش، سانولی سی دل کو کچوکے لگانے والی ... سے بے خبر اور بے نیاز کر دینے والی مہک اور رات کا کالا جادو بھری گھنگھور گھٹاؤں جیسی ... ناگنوں سی بل کھاتی لہراتی زلفیں دیکھتا جن کو چہرے پہ ڈال کر مر جانے کو جی چاہے۔ لڑکیاں ... کے بالوں کو بالشتوں سے ناپ ناپ کر پریشان ہو جاتیں۔ تاک دھر کر سوچتیں، اپنے بالوں ... محسوس کرتیں۔ اکثر لڑکیاں عورتیں اس سے ایسے لمبے، مہکتے سیاہ کالے چمکدار بالوں کا راز پوچھتیں

تو وہ ہلکے سے مسکرا کر چپ رہتی' کئی عورتوں نے روپے پیسے کے لالچ سے یہ بالوں کا بھید جاننے کی بھی کوشش کی...... کستوری کے باپ جیونے کو بھی یہ خیال سُوجھا کہ اس بالوں والے نسخے سے تو بہت سا پیسہ کمایا جا سکتا ہے' کیوں نہ یہی دھندہ شروع کیا جائے؟ تین چار تیل کی بوتلیں تو اس کے پاس محفوظ تھیں۔ اس نے ایک بوتل اصلی تیل اور پچاس بوتلیں سرسوں کا تیل کے حساب سے تیل تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس گاؤں اور اردگرد کے گاؤں' جس لڑکی کو دیکھو وہ اس تیل سے سر کی مالش کر رہی ہے۔ اس تیل نے بھی کام دکھایا' گنجیاں اور چھدرے بالوں والیاں زلفِ بنگال کا جادو بن گئیں۔ اب سارا قبیلہ ہی اسی تیل کے کاروبار میں لگ گیا۔ دو چار اصلی تیل کی شیشیاں تو کب کی ختم ہو چکی تھیں' اب نقلی بے اثر تیل بکنے لگا تو نتیجہ بھی صفر رہا...... جیونے کا دل اب یہاں سے بھی اُچاٹ ہو گیا تھا۔ دو ماہ رہنے کی مہلت تھی' اب تیسرا مہینہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ اِدھر کستوری اور محبوب اپنی دُنیا میں مست تھے۔ کبھی کستوری کھیتوں والے ڈیرے پہ پہنچ جاتی اور کبھی محبوب ٹبے کے اُوپر چلا جاتا لیکن اس سُر اور خوشبو کے ملن کی خبر ابھی نوکِ زبان زدِ عام نہیں ہوئی تھی۔ کھیتوں کے نوکر چاکر یا پھر سلیمان جانتا تھا۔ کستوری کے قبیلے والے تو جانتے تھے کہ یہ محض وقت گزاری ہے...... جیسے ہی اُن کا یہ کاروان اپنی منزل کی جانب رواں ہوگا تو یہاں کے معاملے تعلق ناتے بھی یہیں رہ جائیں گے اور بنجارے اپنا لاؤ لشکر کہیں اور روانہ ہو جائیں گے۔ جانے سے پہلے جیونے نے یہ بالوں والا نسخہ مقامی سپیروں اور سنیاسیوں کو بھی بتا دیا کہ تم اسے بناؤ اور مال پیدا کرو۔ روانگی سے ایک دن پہلے جیونے نے کستوری کو بتایا کہ بیٹی' کل صبح سویرے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ محبوب کے باپ نے ہمیں یہاں صرف دو مہینے رہنے کی اجازت دی تھی اور اب تیسرا مہینہ بھی ختم ہونے کو ہے۔ اب کچھ میرا جی بھی مندا رہنے لگا ہے' پسرور پہنچ کر کسی حکیم کو دکھاؤں گا...... کستوری باپ کی یہ بات سُن کر بڑی مطمئن سی بولی۔

''بابا! تم نے بالکل ٹھیک سوچا اور یہاں سے جانے کا صحیح فیصلہ کیا۔ تم تو پورے قبیلے کے مکھیا ہو' تمہارا حکم یا فیصلہ ہر کوئی سُنتا ہے۔ کل اس قبیلے کو روانہ ہو جانا چاہیے' مگر بابا! اس قبیلے کا ایک فرد اس کاروان میں شامل نہیں ہوگا اور وہ تمہاری بیٹی کستوری ہوگی۔ یہ میرے مقدر کے مکھیا کا حُکم ہے اور میرے اندر کے بھیدوں کا فیصلہ ہے۔ جس طرح تم اپنی دُکھن کی دوا دارو لینے پسرور کسی سیانے کے پاس جانے کا سوچ رہے ہو' اسی طرح میری اندر کی دُکھن کا دارو یہاں میرے سیانے کے پاس ہے......'' پھر وہ قدرے سنجیدہ سی ہو کر کہنے لگی۔ ''میں جانتی ہوں' میری یہ بات تمہاری بُدھی میں نہیں آئے گی لیکن ایک حقیقت تم بھی جانتے ہو کہ میں کسی مرد کو چھو نہیں سکتی' میرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ میں وہ چیز نہیں ہوں کہ جسے گھر

[illegible] میں سجایا جا سکے اور نہ میں وہ گائے بکری ہوں جسے کسی کھونٹے کے ساتھ باندھا جا سکے۔ میں تو ایک خواب ہوں' سپنا ہوں۔ ایک آوارہ منزل خوشبو ہوں۔ میں اسی کی ہوں جس کے سپنوں میں میں بھی [illegible]......"

جیونا دم سادھے' گم صم اس بچی کا یہ نہ سمجھ میں آنے والا بھاشن سن رہا تھا کہ جب پیدا ہوئی تھی تو [illegible] آندھی اور طوفان نے ایک قیامت اٹھا رکھی تھی۔ مشقت سے ٹوٹی ہاری دایہ نے اسے ایک چیتھڑے میں لپیٹ کر جھونپڑی کے اوپر والے بانس سے باندھ کر لٹکا دیا تھا تاکہ یہ طوفان' آندھی اور بارش [illegible] سے محفوظ رہے۔ قبیلے والے تمام مرد و زن اپنے جھونپڑوں اور سامان کی فکر میں لگے ہوئے تھے [illegible] بیل گھوڑے باڑھیں توڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اسی افراتفری اور ہڑبونگ میں ایک جھونپڑے [illegible] گئی۔ قبیلے والے اس بچی اور اس کی ماں اور دایہ کو تو بھول ہی گئے کہ انہیں بھی کسی مدد کی [illegible] پڑ سکتی ہے...... جیونا بھی قبیلے والوں کے ساتھ اس طوفان سے مقابلہ کر رہا تھا۔ دایہ اسے باندھ [illegible] جانب متوجہ تھی جس کی حالت لحظہ بہ لحظہ دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ اسی دوران آندھی کا ایک [illegible] چشم زدن میں رہی سہی جھونپڑیاں بھی اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ طوفان کے ساتھ اڑنے [illegible] میں یہ بچی والی جھونپڑی بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ جھونپڑے کے بڑے بانس سے جو بچی بندھی تھی وہ بھی کہیں ساتھ ہی اڑ گئی تھی۔ اسی کشمکش اور افراتفری میں صحیح نگہداشت نہ ہونے کے [illegible] جیونے کی جورو بھی کی جیون جوت بھی جواب دے گئی...... طوفان تھما تو ایک جوان لڑکی' ایک [illegible] بڑھیا' دو گدھے ایک گھوڑا اور بچے اور یہ کستوری غائب تھے۔ لڑکی اور بچہ صحیح سلامت مل گئے۔ [illegible] تھی۔ کستوری والا بانس مع تیز قریب دو کوس دور بانسوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے میں [illegible]۔ لگ بھگ بارہ گھنٹے بعد وہ پوٹلی اتاری گئی تو بچی صحیح سلامت منہ میں انگوٹھا لئے غوں غوں کر رہی [illegible] جیونے کے تصور میں ادھر یہ فلم چل رہی تھی' کستوری ادھر باتیں کر رہی تھی۔ کستوری نے اور کیا [illegible] اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ کستوری چپ ہوئی تو جیونا دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے جھک کر بیٹھ گیا' [illegible] بیٹی کے درمیان ایک بھیانک سی خاموشی در آئی تھی اور جیسے ہر گہری خامشی کے بعد ایک آہنگ کا سنگ [illegible] بالکل اسی طرح اچانک محبوب آ گیا۔ بیک وقت باپ بیٹی دونوں کی نظریں اٹھ کر اس پر جم گئیں۔

"بابا! میں تم سے کستوری کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔ مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آپ سب کل یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں...... ویسے یہ کام میرا نہیں' میرے والدین کا تھا' میں نے اپنے بزرگوں سے التجا کی تھی کہ وہ تمہارے پاس اس مقصد کے لئے آئیں مگر انہوں نے میری اس گستاخی پہ نہ صرف مجھ سے ہمیشہ

کے لئے تعلقات ختم کر لئے بلکہ سوائے اس تنبے کے اپنی تمام جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے دی ہے......"

تھوڑی توقف کے بعد کہنے لگا۔

"بول بابا! اب تو کیا کہتا ہے......؟"

جیونے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ عیاش اور دل پھینک قسم کے لوگ اکثر ان کی چھوکریوں کے پیچھے شادی یا سچی محبت کے چکر میں ان کی جھونپڑیوں تک پہنچ جاتے ہیں روپے پیسے کا لالچ بھی دیتے ہیں مگر یہ خانہ بدوش لوگ بڑی خوبصورتی سے کھا چاٹ کر طرح دے جاتے ہیں اور اگر یہ بوڑھے اپنی چھوکریوں کے عاشقوں کی مُرادیں اُن کی خواہش کے مطابق پوری کرتے رہیں تو پھر یکایک کرکے شادی چھوکریاں چھوٹتی ہو جائیں اور یہ خانہ بدوش مردانگی انگلیاں چھیل کر چپ رہیں مگر اس معاملے میں جیونے نے اپنے طور طریقوں سے کافی ہٹ کر حقیقت پسندی اور سچائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت یہ بحث چھیڑ کر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ ہم خانہ بدوش اپنی لڑکیوں سے [illegible] اس وقت [illegible] ایک حقیقت تمہارے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ کستوری خاص وجوہ کی بنا پر تم سے کیا کسی سے بھی بیاہ کرنے کے قابل نہیں۔ اس کو جیون ساتھی بنانا یا اسے بیوی بنانا بالکل اپنی موت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ تم اس بات کی تصدیق کستوری اور قبیلے کے کسی فرد سے بھی کر سکتے ہو۔"

"بابا! کستوری تو پھر کستوری ہے عورت تو ہاتھ پاؤں سے ادھوری بھی ہو تو وہ بھی موت کا فرشتہ بن سکتی ہے اگر اس کو محض کھلونا سمجھ کر اسے اپنی ہوس اور نفسانی خواہشات کے لئے استعمال کیا جائے— بابا! جو کچھ تم نے مجھے بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ سب کچھ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے قبیلے کے رسم رواجوں سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ جو کستوری کی خوشبوؤں اور میری بانسری کی مدھر سُروں کا بھید محل ہے یہ یہاں کی مہارانی ہے اور میں اس کا محبوب...... بالکل یہی باتیں میں اپنے ماں باپ کے رُوبرو بھی کھری کھری کر کے آیا ہوں۔ میرا فرض تھا کہ کستوری کے بابا ہونے کی حیثیت سے میں تم سے کستوری کا ہاتھ مانگوں سو میں نے اپنا فرض ادا کر دیا...... یہ کستوری موجود ہے۔ باپ بیٹی آپس میں کوئی فیصلہ کر لو......"

کستوری تو یوں بے نیازسی کھڑی باتیں سُن رہی تھی جیسے یہ باتیں اس کے بارے میں نہ ہوں

جیسے کوئی بھینس کے اُدلے بدلے کا کوئی معاملہ زیرِ بحث ہو...... جیونا عجیب سی شش و پنج میں پھنس گیا تھا۔ بے چارگی کی پرچھائیاں اس کے چہرے پہ لہرا رہی تھیں۔ اس نے انتہائی کرب کے عالم میں کستوری کی جانب دیکھتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کستوری! تو بھی تو کچھ بول...... اپنے آپ دیکھ...... اپنا بوڑھا باپ' اپنا قبیلہ...... ریت رواج' سب کچھ تول اور پھر بتا مگر ایک بات یاد رکھ' فیصلہ یا بات وہ کرنا جو تیری من بھاونا ہو...... میں نے تیری خاطر یہ داڑھی سفید کر لی۔ اب جو بھی کر' میرے سفید بالوں پہ پھر سے کالک نہ لگ جائے......"

کستوری باپ کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ ایسی جگر پاش مسکراہٹ عشق کرنے والوں' جہاد پہ شہادت کی آرزو لے کر جانے والوں' زہر کا پیالہ ہونٹوں پہ رکھنے والوں یا کسی کی خوشیوں کے لئے قربان ہونے والوں کے ہونٹوں پہ آخری بار نمودار ہوتی ہے۔ بولی۔

"بابا! میرے [illegible] کی خاطر تم نے اپنے بال چاندی کر لئے اور اپنی [illegible] جوانی چٹیل کر لی' میری خوشی اور بھلائی کے لئے تم نے کیا کچھ نہیں کیا مگر بابا! تم لاکھ جتن اور بھی میرے لئے کر لو لیکن تم قسمت نہیں بدل سکتے۔ اب وہ سمے آ گیا ہے جہاں تمہاری اور میری آزمائشیں ختم ہو رہی ہیں۔ میں [illegible] نہیں [illegible] ساری عمر بیٹھی نہیں رہتی۔ ایک نہ ایک دن اسے وہاں سے [illegible] رزق پانی سمیٹنا پڑتا ہے۔ بابل اپنے ویہڑے اور بیٹی اپنے گھر......

اچے بنّے موت نے کل لئے باغ ملے مرغابیاں

اگے وڈ [illegible] سینے لائے میرے [illegible] سایاں"

● جس تن لگیا عشق کمال......!

کہتے ہیں کہ اسی رات کستوری اور محبوب کا بیاہ کر دیا گیا۔ جیونے کا جھونپڑا ان انوکھے دلہا دلہن کے لئے حجلۂ عروسی بنا دیا گیا۔ محبوب ساری رات اندر جھونپڑے میں اپنی سہاگ سیج کھودتا رہا اور اُدھر قبیلے والے اپنے جھونپڑے' ڈھور ڈنگر' سامان سمیٹتے رہے۔ ساری رات اسی کشمکش اور تگ و دو میں گزر گئی۔ صبح دم سے پہلے جیونا آہستہ سے اپنے جھونپڑے کے اندر داخل ہوا' دیکھا کہ کستوری اور محبوب دونوں ایک ہی قبر نما گڑھے میں ایک دوجے میں سمائے ہوئے مرے پڑے ہیں۔ کستوری کے سینے پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور محبوب کے سینے پہ بانسری دھری تھی۔ خوشبو اور سُر کا ایسا انت کیا کسی نے دیکھا

ہوگا؟...... جیونے نے اوپر کھڑے ہو کر چند لمحے دونوں کو دیکھا' اپنے آپ دو آنسو ٹپک کر دونوں پہ گرے۔ ایک بیلچہ اُٹھایا' اِردگرد کی مٹی سمیٹ کر قبر برابر کر دی۔ پھر چند لمحے قبر کو دیکھا' اُلٹے پاؤں واپس پلٹ آیا۔ اس کے پہنچتے ہی بنجاروں کا یہ کارواں اپنی کسی نئی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

● ونجارے' آئے بلخوں گئے بنجارے......!

میں عالم تصور میں صبح کے دُھندلے سے اُجالے میں آٹھ دس ریڑھوں پہ مشتمل کاروان کو محبوب اور سلیمان کے باپ کی زمینوں سے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ جانوروں کے گلوں میں بندھے گھنگھرو اور ٹلیاں کپڑوں سے باندھ دی گئی تھیں تاکہ شور نہ ہو اور ریڑھوں کے نیچے بندھی ہوئی لالٹینیں بھی گُل تھیں قافلہ اپنی کستوری کی خوشبو کو اس کے اَنت سمے کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ اُن کے چہروں کی ویرانی جیونے کے آئندہ جیون کی محرومی مجھ سے بھی دیکھی نہ گئی' میں وقت کی چلمن کو ذرا سا سرکا کر ٹک ادھر کھسکا کر باہر نکل آیا...... یہ تینوں چاروں ایک ڈھیری کے پاس کھڑے ہاتھ اُٹھائے فاتحہ شریف پڑھ رہے تھے' میں بھی [illegible] قدم [illegible] جیسے کسی نے من من کے بھاری پتھر ہماری پنڈلیوں سے باندھ دیئے ہوں۔ پگڈنڈی پکڑی تو سلیمان بتا رہا تھا۔

''خانہ بدوش صبح صبح ہی چلے گئے تھے۔ اس رات غصے اور پریشانی سے کوئی بھی ہمارے گھر نہ سویا اور نہ کسی نے کھانا کھایا۔ ساری رات اسی کشمکش اور پریشانی میں کٹی۔ صبح لوگوں نے اطلاع دی کہ ڈیرہ خالی ہے' صرف ایک جھونپڑا ابھی تک وہاں کھڑا ہے۔ والد صاحب اور دادا نے تو رات ہی کو محبوب اور اس کی ضد پہ لعنت بھیج کر اس کی آخری خواہش کے طور پہ بیٹا اسے بخش کر باقی تمام جائیداد اور خاندان سے عاق کر دینے کا اعلان کر دیا تھا' اب اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی اس گھر اور گاؤں میں محبوب اور کستوری کا ذکر نہ کرے...... میں اور سرفراز اپنے ساتھ چند دوستوں کو لے کر والدین کو بتائے بغیر تھے پہ پہنچے' وہاں وہی عالم تھا جو اکثر میلہ اُٹھ جانے کے بعد کھیت کھلیان یا میدان کا ہوتا ہے۔ ہر طرف گندگی اور بیکار اشیاء کے انبار لگے ہوئے تھے' مشرقی کنارے پہ ایک جھونپڑا ابھی تک ثابت سالم اپنے ڈنڈوں بانسوں پہ تنا کھڑا تھا۔ پردہ ہٹا کر اندر دیکھا تو جھونپڑی کی ہر چیز اس کے اندر موجود تھی۔ ایک قبر نظر آئی جو تازہ تازہ کھدی ہوئی تھی۔ یہ قبر دیکھ کر تو ہماری گھگھی بندھ گئی' محبوب کے بارے میں بُرے بُرے وسوسے پیدا ہونے لگے...... اُلٹے پاؤں واپس گھر آئے۔ ساری بات والدین کو بتائی۔ ماں باپ تو آخر ماں باپ

ہوتے ہیں۔ اولاد چاہے کیسی ہی ہو، وہ ہر دم اس کی خیر چاہتے ہیں اور اس کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے فوراً گاؤں کے گورکن کو بلایا اور قبر کشائی کا حکم دیا۔ پورا گاؤں ٹیلے کے اوپر نیچے جمع ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے گھوڑے کھول لئے کہ خانہ بدوشوں کا پیچھا کر کے ان کو پکڑتے ہیں مگر دادا نے منع کر دیا کہ پہلے قبر کو کھولو، دیکھو کہ اندر کیا ہے؟...... قبر اتنی گہری نہیں تھی۔ یہ تو ایک عاشق نے کھودی تھی جس نے محبت بھری خوشبو کو چھپانا تھا، اسے دبانا تھا اور اپنے سُروں کے بھیدوں کو دُنیا سے لُکانا تھا۔ چند تاپے مٹی کے ڈھیرے ہٹائے تو خوشبو شرنانے مارتی ہوئی باہر اُمڈ آئی، ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی بانسری بھی سامنے آ گئی۔ چہروں سے مٹی صاف کی تو دونوں آسودہ سی مسکان لئے ہوئے پڑے تھے...... دادا کے حکم کے مطابق ہاتھ روک دیئے گئے، نکالی ہوئی مٹی واپس ڈال دی گئی۔ قبر برابر کر کے دو بھاری پتھر اوپر رکھ دیئے گئے۔ بڑوں کے حکم پہ نہ تو اپنے گھر اور نہ ہی گاؤں کے کسی گھر میں سوگ منانے کی اجازت ملی، نہ کوئی ماتم ہوا۔ قُل نہ سوئم، غسل نہ جنازہ اور دُعا کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو کیا خبر کہ یہ سب کچھ تو دین داروں اور نیک نمازی، شریعت کے پابند انسانوں کے لئے ہوتا ہے اور جنہیں عشق نے مارا ہوتا ہے ان کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ ٹیلے کے دوسری طرف کے کھیت بھی ایسے بانجھ ہوئے کہ اس واقعے کے بعد انہوں نے کبھی ہرا تنکا تک نہ اگانے کی قسم کھالی۔ تب سے اب تک یہ ٹیلا، یہ سارے کھیت ویرانی کی حالت میں ہیں۔ اب کم ہی کوئی اس طرف آتا ہے، ہم ہی ہیں جو دن میں ایک آدھ بار ادھر آ کر دیکھ بھال کر جاتے ہیں۔"

"ٹھیک...... اب ایک بات اور بتاؤ کہ اگر ہم ... اس ٹیلے کو اپنے کسی جائز مقصد کے لئے استعمال کر لیں تو آپ کے والدین کی جانب سے کوئی پابندی تو نہیں ہوگی یا ان کی اجازت حاصل کرنے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی؟"

سلیمان نے فوراً مجھے جواب دیا۔ "بالکل نہیں، ہم ٹیلے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ساری زمین ہماری ملکیت ہے، باقی رہی والدین سے اجازت کی بات تو ان کی طرف سے اب اجازت ہی اجازت ہے۔ محبوب کے اس واقعہ کے بعد انہوں نے تقریباً دُنیا کے ہر کام سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب تو وہ ادھر کی ساری زمینیں مفت بوائی کے لئے دینے کے لئے تیار ہیں مگر کوئی بھی لینے کی حامی نہیں بھرتا۔ اکثر چاندنی راتوں کو یہاں بانسری کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں اور سانپ تو جیسے یہاں اُگتے ہیں۔ ہر سال کئی جوگی سپیرے ادھر آتے ہیں اور سانپوں سے ٹوکریاں بھر بھر لے جاتے ہیں لیکن ایک بات ہے کہ یہاں کبھی سانپ کاٹنے کی واردات نہیں سُنی اور نہ ہی کوئی موت واقع ہوئی ہے۔ ادھر دوسری طرف کھیتوں

میں جاؤ' دو چار سانپ ضرور دکھائی دے جائیں گے اور ادھر ٹبے پہ بھی انہیں دیکھ سکتے ہو......''

میں نے فوراً ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ اس لحاظ سے بڑی خطرناک اور منحوس تھی مگر میں بھی جو کام کرنے جا رہا تھا' اس کے لئے تو اس سے بھی زیادہ خوفناک اور منحوس ترین جگہ درکار تھی — خیر' واپسی کا راستہ ایسی ہی ڈراؤنی اور انہونی سی باتیں سنتے سناتے کٹ گیا۔ گھر پہنچ کر بھی ہم سب اسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں پہ غور کرنے کے ساتھ ساتھ ٹبے پہ پیش کئے جانے والے ڈرامے کے لئے ہوم ورک بھی کرتے رہے۔ دوپہر تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد کھانا کھا کر ہم پھر سارے کھیتوں کی جانب روانہ ہو گئے' اس دفعہ ہمارے ساتھ کچھ سامان اور اوزار بھی تھے۔ سب سے پہلے ہم نے کھیتوں میں مویشی خانے کی اک عرصہ سے بند کوٹھڑی کھولی۔ وہاں کاٹھ کباڑ میں بانس اور ٹبے والی جھونپڑی کے تیلے اور ترپال پڑی ہوئی تھی ہم سب سامان اور ضرورت کی دیگر چیزیں اٹھا کے ٹبے پہ آ گئے۔ کستوری اور محبوب کے مرقد سے ذرا پرے ہم نے غلام رسول فوجی کو کھدائی پہ لگا دیا' باقی سارے بانس اور ستون گاڑنے پہ جُت گئے۔ ڈھائی گھنٹے کی مشقت کے بعد ہم نے اپنا مطلوبہ جھونپڑا اور دو فٹ اونچا تھڑا تیار کر لیا۔ پرانے ہل کا ایک ٹکڑا اور بھینسوں کی چارا کھانے والی پرانی لکڑی کی کُرلی' دونوں چیزیں زمین میں اس طرح سے گاڑیں کہ ان کا کچھ حصہ باہر نظر آتا تھا۔ تھڑے پہ نماز پڑھنے کا بندوبست کر دیا گیا۔ بنجاروں کا پڑا ہوا کوڑا کرکٹ بھی سمیٹ کر ٹھکانے لگا دیا گیا۔ سہ پہر تک ہم نے قریب قریب تمام کام جو ہو سکتا تھا' مکمل کر لیا۔ عصر کی نماز ہم نے کھیتوں والے ڈیرے پہ پڑھی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے ٹبے کا ایک اور چکر لگایا اور پھر گاؤں آ گئے۔ گھر پہنچتے ہی سرفراز کی بے بے سے خوب ڈانٹیں سنیں کہ ہم لوگ سارا دن پتہ نہیں کہاں کہاں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کا ہوش' نہ کپڑے لتے کا پتہ — مغرب کی نماز کے بعد پھر ہم گھر سے باہر نہیں نکلے...... آج ہم نے گھر والوں کو خوش رکھنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا کیونکہ آنے والے دنوں میں ہم نے انہیں پھر پریشان بھی تو کرنا تھا...... سرفراز کی بے بے نے رات خدا جانے ہمیں دودھ میں کیا گھول کر پلا دیا تھا جو ہوش ہی نہ رہا کہ زمین پہ ہیں یا آسمان پہ' ساری رات خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح اُٹھ کر پہلا راؤنڈ کھیتوں کی جانب لگا' فراغت واجابت کے بعد نہائے دھوئے' ہلکے سے ناشتے کے بعد ہوا خوری اور آوارہ گردی کے لئے دریا کی طرف رُخ کر لیا۔ ٹبے کے راستے میں مقدس ڈیرہ خواج خضر والا بھی پڑتا تھا۔ وہاں بھی پہنچ گئے۔ ابھی ہم ڈیرے سے باہر ہی تھے کہ ہماری آہٹ پا کر ایک مادہ خنزیر اور اس کے چھ سات بچے خوم خوم کرتے ہوئے ملنگوں کے ڈیرے سے نکلے اور ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے دریا کی جانب بھاگ گئے۔ صبح صبح یہ منحوس اور

[illegible] منظر دیکھ کر میری تو طبیعت مکدر ہو گئی۔ پھر خیال آیا کہ جس جگہ نہ نماز ہو نہ روزہ' مقدس ناموں اور [illegible] برگزیدہ بندوں کی توہین ہوتی ہو' اللہ کی بھولی بھالی مخلوق کو اللہ کے نام پہ لوٹا جا رہا ہو وہاں خوک [illegible] گے' غزال اور طاؤس رقص فرما نہیں ہوں گے...... ایک قہر کی لہر میرے اندر لہرا گئی' یکبارگی [illegible] سے نکلا۔

"اے ظاہر و باطن کے جاننے والے! بے شک توفیق اور ہدایت تیرے ہی در سے ملتی ہے۔ مجھ [illegible] وسائل اور میرے ساتھیوں کو یہ توفیق عطا فرما کہ ہم ان بے ہدایتوں اور دھوکے بازوں [illegible] تیرے معصوم سادہ لوح بندوں کو بچا سکیں' بے شک تو نیتوں کا حال خوب جانتا ہے......"

پنڈ دا پیر' لسوڑیاں دی کھیر......!

گاؤں واپس آتے ہوئے میں نے یونہی سلیمان سے ان کے والد اور دادا سے ملاقات کرنے کا [illegible] وہ جیسے میرے مُنہ سے لُقمہ چھینتے ہوئے [illegible]

"خان جی! میں تو کب سے آپ سے کہنے والا تھا' بس یونہی ہمت نہ پڑی...... ہم تم آپ چلیں [illegible] گھر۔ جیسے سرفراز کا گھر' ویسا وہ سلیمان کا گھر۔ ایک ہی بات ہے...... کل ابا جی بھی کہہ رہے کہ [illegible] دوست سیالکوٹ سے آیا ہوا ہے' سنا ہے کہ بڑا قابل لڑکا ہے۔ کسی دن اسے کھانے پر بلاؤ' ذرا ہم [illegible] دوست سے مل لیں گے...... ایسا کرتے ہیں کہ آج رات آپ سب ہمارے گھر کھانا کھائیں' [illegible] سب کی ملاقات بھی ہو جائے گی اور بات چیت بھی......"

میں چاہتا ہی یہی تھا کہ میں سلیمان اور محبوب مرحوم کے والدین سے ملوں۔ محبوب کے طرزِ عمل [illegible] ان کے دلوں میں مٹی بیٹھ گئی ہے' اسے صاف کرنے کی کوشش کروں۔ رقبہ اور دیگر سونے جیسی [illegible] اگلنے والی قیمتی زمینیں جو محض کم علمی اور فضول ضد کی وجہ سے سیم و تھور میں تیزی کے ساتھ تبدیل ہو [illegible] ان کے بارے میں ان کے خیالات اور ارادے بدلنے کا کوئی جتن کروں۔ ان کے دل و دماغ [illegible] اور زمینوں کے اندر منحوس خطرناک سانپوں کی موجودگی ہی گھسی ہوئی تھی' اسی وجہ سے کوئی مزارعہ [illegible] کو ٹھیکے یا آدھے پہ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کستوری کی خوشبو کی وجہ سے [illegible] کے سانپ کیڑے مست ہو کر اُدھر کا رُخ کرتے تھے۔ کستوری کو مرے ہوئے کئی برس گزر گئے [illegible] ہنوز زندہ تھی۔ ڈیرے کے قُرب و جوار میں کیڑے مکوڑے اور سانپ جب پہنچ جاتے تھے تو

بے خود و بے ہوش سے ہو جاتے' کسی کو ضرر پہنچانے کی ان میں سُدھ بُدھ ہی نہیں رہتی تھی اور اگر وہ اِک مخصوص وقت کے اندر اندر وہاں سے نہ ہٹتے تو پھر وہ یہیں پہ پانی پتہ ہو کر ختم ہو جاتے۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ کسی طرح سلیمان کے والدین اور گاؤں والوں کے دلوں سے یہ غلط قسم کے مفروضات ڈر خوف اور سانپوں کی دہشت نکلے' یہاں پھر وہی خوشگوار سا ماحول اور خیر و برکت کی فضا قائم ہو اور وہی وقت لوٹ آئے جو کبھی بنجاروں کی آمد سے پہلے تھا...... سلیمان کی دعوت رسمی طور پہ تھوڑی سی رد و کد کے بعد قبول کر لی گئی' اس قسم کی باتیں کرتے کرتے ہم گاؤں کے حدے پہ پہنچے تو میں نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔

''بھائی لوگو! آج گاؤں کے شمالی حصے کی طرف سے ہوتے ہوئے تھے تک' وہاں سے کھیتوں والے ڈیرے اور پھر واپسی......''

دراصل مجھے اندر ہی اندر بڑی شدت سے میراثی کا انتظار تھا جو للیانی خصوا اپنے بہروپے ساتھ پیراں وتّے کو مع بکریاں لینے گیا ہوا تھا۔ یہ اپنے گاؤں کا دادا یعنی میراثی' اس کا ساتھ و پیراں وتّہ' اس کی بکریاں' سارے جنگل کا دار و مدار انہی پہ تھا اور کہیں اجالے سے خدشات بھی سر اٹھا رہے تھے۔ پیراں وتّہ ملے نہ ملے بکری کہیں مر کھپ یا ذبح نہ ہوئی ہو اس کے بچے کہیں بک بکا نہ گئے ہوں؟ اس قسم کے حالات میں بے شمار اچھے بُرے خیالات خود بخود ہی چلے آتے ہیں اور انسان اُمید و بیم کے سمندر میں اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہے...... ہم حدے سے بائیں جانب مُڑے تو سرفراز نے اپنی ٹانگ اڑانے کی عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے آج روٹ بدلنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے [illegible] ہو کر فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''تمہاری معلومات میں اضافہ اور تمہارے علم میں برکت ڈالنے کی خاطر عرض کروں گا کہ ٹانگ اڑانا' ٹانگ مارنے یا ٹانگ پھنسانے سے زیادہ خطرناک اور معیوب ہوتا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم آئندہ کبھی بھی' میں جب تک ایک سو ایک قدم چل نہ لوں' مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کرنا......''

وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی گستاخی سے بولا۔

''اچھا' گورو جی مہاراج! ہم کُتّے کمینے کون ہوتے ہیں جو آپ سے کچھ پوچھ سکیں...... چلیے......''

''اب تو ہمیں اس گاؤں کے مہامنت تک پہنچانے میں ہماری مدد کرو گے...... وہ دُور مینار دیکھ رہے ہو' وہ یقیناً ان کے کہیں قریب ہی رہتا ہوگا۔''

وہ دیدے اُٹھائے دُور نظر آتے ہوئے میناروں کو تکنے لگا' پھر خشمگیں نظروں سے مجھے ثابت نگلنے

ہوئے دھاڑا۔

''وہ گاؤں کی جامع مسجد کے مینار ہیں اور وہاں اس کے قریب کوئی مہامہنت نہیں رہتا' وہاں مسجد کے حجرے میں پیر ابوالسلطان نویدالرحمٰن شکرگڑھی رہتے ہیں جو استغفراللہ' مہامہنت نہیں بلکہ بڑے مولوی صاحب ہیں۔''

''مائی ڈیئر' بے وقوف اور جاہل انسان! مہامہنت کا مطلب بھی بڑے مولوی صاحب ہی ہے۔ نام کوئی بھی ہو' مطلب ایک ہی ہوتا ہے...... ویسے جس علاقے کا عالم فاضل خطیب' مولوی' جو بھی وہ ہو' اگر وہ اپنے علاقے میں خواج خضر کی کشتی اور حضرت موسیٰ کی مقدس بکری جیسے فراڈیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اگر اپنے میں وہ جرأتِ ایمانی نہیں پاتا تو پھر مہامہنت ہی کہلانے کا مستحق ہے۔ جب فوج کا سپہ سالار ہی عسکری جرأت و جذبے سے جدا ہو اور ملک و ریاست کا فرمانروا علم و قوت' فراست اور تدبر سیاست میں سپاہی بھی ہو' خوفِ خدا سے بے خوف' مصلحت کوش' تن آسان ہو اور پھر جب اللہ کے گھر اور اس کے گھروں کے رکھوالے...... اپنی ناک تلے ایسی بے دینی اور مقدس ہستیوں کی ایسی اہانت کو برداشت کر جائیں تو پھر جان لو کہ وہ فوج' وہ ملک و ریاست' وہ قوم' وہ ملت اور وہ شہر' گاؤں یا محلّہ ضرور اپنے برے انجام کو پہنچیں گے کہ جس کا تذکرہ قلم زد کرتے وقت مورخ کی جھکوں اور انگلیوں میں بھی پسینہ آ جائے گا......''

سرفراز نے پھر ناگواری سے میرے سامنے ہاتھ باندھ دیئے۔

''بھائی! خدا کے واسطے آج صبح میرے اس خطا کے ساتھ ساتھ میری پچھلی اگلی ساری خطاؤں کو بھی معاف کر دو......''

''بچہ! تمہاری اگلی پچھلی تمام خطاؤں کو معاف کیا۔ اب ذرا تم بابا کی رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں بتاؤ...... کیا نام بتایا تھا؟...... ہاں' پیر عیدالقربان شکرگڑوی کے پاس لے چلو......''

''اُن کا نام ابوالسلطان نویدالرحمٰن شکرگڑھی ہے' عیدالقربان شکرگڑوی نہیں...... خدا کے لئے اُن کے منہ پہ نہ کہہ دینا۔ وہ مولوی ذرا وکھری ٹائپ کا ہے۔ میرا مطلب' خاص شکرگڑھیا ہے۔''

''سُبحان اللہ...... بھیا! ویسے اللہ کا بندہ تو ہر وقت خوفِ الٰہی سے لرزتا رہتا ہے' رزقِ حلال کی کوشش سے ہڈیوں کی مُٹھ ہوتا ہے۔ اُس کا نام دو لفظوں میں ختم ہو جاتا ہے جیسے محمد دین' غلام رسول' محمد علی' اللہ دتہ وغیرہ اور جس میں خدا کا خوف نہ ہو' جس کی کمر اٹھائیس انچ سے بڑی ہو۔ گردن تنی ہوئی' پیٹ توند نکلی ہو۔ حلوہ اور مُرغا شوق سے کھاتا ہو تو جان لو یہ شے قابلِ ازکتب و مسجد نہیں......''

سرفراز نے میرے مُنہ پہ اپنا دیہاتی سا ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش...... اب پیر صاحب کے حُجرے تک ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالنا...... خدا کی قسم' تم یہ حرفوں کا بنا ہوا لپاٹیا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہاں پہنچو تو سہی' وہ ہی تمہاری چُونچ کُتریں گے......"

اِنہی چُونچلوں' چُونچوں میں پیر صاحب کے حُجرے پہنچے جو مسجد کے ساتھ ہی ایک بے ڈھنگے سے کمرے پہ مشتمل تھا۔ باہر دیوار پہ ایک بڑے سے بورڈ پہ بہت کچھ لکھا ہوا تھا' پڑھ کر طبیعت بڑی بوجھل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حضرت صاحب محض اس مسجد کے خطیب ہی نہیں بلکہ ایک حاذق طبیب بھی ہیں۔ بورڈ پہ نمایاں طور پہ ان کی طبی اسناد اور طب کے میدان میں ان کی "کارہائے خدمات" کا ذکر بھی تھا۔ اسی بورڈ سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ آپ طبابت کے علاوہ فنِ جراحت میں بھی یکتا ہیں۔ کھسکی ہوئی ہڈیاں' جوڑ پُرانے دَرد' اندرونی چھٹے پُرانے چھوٹے بڑے' کسی کی چوٹیں چڑھی ہوئی ناف' وجع المفاصل' دردِ شقیقہ' جنون' سرسام' اختلاجِ دل کا ڈوبنا' معدے کے سُدے' فوطوں کا پانی' ہرنیا۔ بچھو' سانپ' باؤلے کتے کے کاٹے کا علاج اور ماہرِ روحانیت تو وہ تھے ہی۔ کئی ایک جن ان کے قابو میں تھے' ہمزاد اور موکلات کو بُلا کر اپنی دُکھی بندوں کی خدمت کروانا ان کے معمولات میں شامل...... نقش' الہامات...... کیا مجال' کوئی اس کا توڑ کر سکے۔ سُدے دھاگے' تعویذات اور تو اور کسی کو بتایا ہوا وظیفہ یا چلہ جو اس کے لئے جوکھم کا کام یا جان کا خطرہ ہوتا' مناسب ہدیہ لے کر خود ہی سرانجام دے لیتے۔ بورڈ پہ تحریر ایک سطر کی رُو سے یہ بھی ظاہر تھا کہ نکاح پڑھوانے کے علاوہ مناسب رشتے کروانے میں بھی ان کی خدمات سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔ نومولود بچوں کے نام قرآن پاک اور نوزائیدہ بچے کے ستاروں کی روشنی میں اور علم الاعداد کے باہمی ملاپ سے تجویز کئے جاتے ہیں...... بورڈ پڑھتے پڑھتے میں اَدھ موا سا ہو گیا مگر بورڈ ختم ہونے پہ نہیں آ رہا تھا۔ خالی کونے بھی پُر تھے۔ ھوالشافی' شک کرنا ایمان کی کمزوری ہے' پورے اعتماد اور یقین سے تشریف لائیں' بندے کا کام پانی دینا ہے' پھل پھول لگانا مالک کا کام ہے...... سرفراز نے ہی مجھے دھکا دے کر آگے بڑھایا ورنہ بورڈ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے سرفراز سے کہا۔

"یار! یہ شخص پیر ہے' مولوی ہے یا عمرو عیار ہے۔ اس کی طلسماتی زنبیل میں تو ہر دُکھ کا درماں اور ہر مشکل کا حل موجود ہے......"

دروازہ کیا کھٹکھٹانا تھا' وہ تو کسی حریصِ ندیدے کی آنکھ کی طرح پہلے ہی سے کُھلا ہوا تھا بس ٹاٹ کا پردہ ہٹانا پڑا۔ ناگاہ میری نگاہ سامنے بیٹھے ہوئے ایک گرانڈیل شخص پہ پڑی' عجیب اُلجھا پُھولا ہوا سا تھوبڑا' موٹی موٹی آب دار باہر پھوٹی ہوئی مکاری سی آنکھیں۔ پیلی' نیلی اور سیاہ سی رنگت' بڑی سی

تھی کی حناء آلود سرخ داڑھی' موٹے موٹے ہونٹوں کی اوٹ میں ماس خور قسم کے خوفناک سے دانت۔ وہ قریب قریب آدھے پنڈ کے بچوں کو اپنے حصار میں لئے بیٹھا تھا۔ تہبند کے اوپر صرف ایک میلا سا شلوکا پہنے کا تکلف کیا ہوا تھا۔ مارے خوف و دہشت کے ہماری ''السلام علیکم'' ہمارے سائز کے مطابق خاصی خفیف سی نکلی مگر اس جانب سے جیسے مارٹر کا فائر ہوا۔

''وعلیکم السلام......'' ایسا طنطنہ اور دبنگی کہ ہماری گھگھی بندھ گئی۔ ''آؤ بچو! ادھر میرے پاس بیٹھو۔''

وہ پانچ سات بچوں کو بھیڑ بکری کے بچوں کی طرح دیوار کی جانب ہنکارتے ہوئے ہمارے بیٹھنے کے لئے جگہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس باڑے میں پہنچ کر واقعی پچھتا رہا تھا' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے سرفراز اور سلیمان نے باری باری اپنے اپنے انداز میں میرا تعارف کرایا۔ اس پر ان پیر صاحب ''ماشاء اللہ' ماشاء اللہ'' کہہ کر مجھے ایسی تحسین بھری نظروں سے تولتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ یہ بالشت بھر کا لوترا بلونگڑا' شکل عمر سے تو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ بہرحال' تعارف کے بعد انہوں نے کمال شفقت و رغبت سے پیچھے رکھے ہوئے بڑے برتن سے بساند بھری بلوئی ہوئی لسی پلائی۔ پھر مزید سلسلۂ عنایات جاری رکھتے ہوئے الماری سے تین چار چھوٹے چھوٹے کتابچے نکلوا کر ہمیں مرحمت فرماتے ہوئے فرمایا۔

''...... ویسے تو ان کا ہدیہ شریف آٹھ آٹھ آنے ہے مگر آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں آپ کے لئے تحفہ ہیں......''

یہ جیبی جنتری نما قسم کی کوئی چیز تھی۔ اس میں کسی روضے کی تصویر' چاند ستاروں' برجوں کے نقشے' اندر ایک حمد اور ایک نعت کے بعد ان کی مجرب ادویات' صدری نسخے' ٹوٹکے' ٹونے۔ علم رمل جفر کی روشنی میں مختلف زائچے' عملیات اور وظیفوں کی تفصیل اور عملی طریقے' چاولوں کی سُسری' سر کی لیکھیں' گھر کے چوہے کیڑوں بلیوں سے نجات کے طریقے۔ مرغیوں کی رانی کھیت اور وافر انڈے حاصل کرنے کا طریقہ' اپنی محلے کی مسجد کے امام کا احترام و اکرام اور اس کی خدمت کرنے کا اجر عظیم...... کتابچہ کیا تھا' کسی انسائیکلوپیڈیا کا نالائق و ناجائز بچہ تھا۔ کتابچوں کو بڑے احترام سے وصول کرنے کے بعد میں نے عرض کی کہ میں ایک ضروری مسئلے پہ آپ کے قیمتی مشورے کا خواہاں ہوں' اس وقت تو آپ مصروف ہیں اور بھی خاص طور پہ ان نونہالوں کا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا...... پیر صاحب نے مجھے بڑی گہری نظروں سے تولتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی خاص یا کوئی بہت ہی ضروری بات ہو تو ابھی باہر چل کر سن لیتے ہیں' دوسری صورت میں

آپ ظہر کی اذان سے پہلے یہاں آ جائیں' تفصیل سے بات ہو جائے گی......"

میں ظہر سے پہلے پہنچنے کا وعدہ کر کے چلا آیا...... ہم باہر نکلے تو سرفراز نے پوچھا۔

"یار' خان! تم ان سے کیسا مشورہ چاہتے ہو؟"

میں نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

"تم گاؤں والوں نے مکھن' دودھ اور لسیاں پلا پلا کر اسے بندے سے بھاؤ بِلّا بنا دیا ہوا ہے۔ آخر اس سے بھی تو کوئی کام لینا چاہیے......"

"مثلاً......؟" سرفراز نے پوچھا۔

"تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ پیر اصلاً کیا چیز ہے' میرا مطلب ہے یہ واقعی کوئی پیر ویر ہے یا ویسے ہی...... ہاں' یاد رکھو' اسے سید وغیرہ مت کہنا...... کیونکہ یہ اور کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن سید نہیں ہو سکتا' سید کو دیکھ کر اس پہ قربان ہونے کو جی چاہتا ہے مگر اسے دیکھ کر بڑی عید پہ اسے قربان کرنے کو دل چاہتا ہے......"

سرفراز نے جھنک کر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دھاڑا۔

"بھروسی بولی...... میں نے پوچھا ہے کہ تم اس سے کیسا مشورہ چاہتے ہو؟"

"بھئی' میں جو بھی پوچھوں گا' تمہارے سامنے ہی پوچھوں گا۔ اتنے اتاولے ہو...... میں سوچ رہا ہوں کہ میراثی ابھی تک للیانی سے بکری اور اپنے سانڈو کو لے کر نہیں آیا' کل کا گیا ہوا ہے......" میں نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے اسے نئی پٹڑی پہ چڑھا دیا۔

"کوئی وجہ تو ہو گئی ہو گی...... ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں' انشاء اللہ شام سے پہلے وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ محض سانڈو کو ہی لانا ہوتا تو وہ کب کا پہنچ گیا ہوتا' بکری بھی تو ساتھ ہو گی جسے کہیں نئی جگہ پہ لے جانا ایک مصیبت سے کم نہیں ہوتا۔ ایک قدم آگے گھسیٹو تو وہ چار قدم پیچھے کھسک کر پیشاب کر دیتی ہے......"

"بس بس' ڈھولنا! شروع ہی ہو گئے ہو' چھری تلے دم لو...... اچھا یہ تو بتاؤ' کوئی اندازہ ہے کہ میراثی سیدھا ہمارے گھر آئے گا یا نہیں پہ ملے گا؟...... دراصل میں اسے' اس کے سانڈو اور بکری وغیرہ کو گاؤں اور گھر والوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں' انہیں ایک خاص وقت پہ ہی سامنے آنا چاہیے۔"

سرفراز کاندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔"...... کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کدھر لینڈ کرتا ہے؟...... یا ہم اسے کہہ دیتے کہ واپس پہنچ کر ہمیں فلاں جگہ پہ ملنا۔ اب تو یہ اس کی اپنی سہولت اور صوابدید پہ

"اس کی واپسی کا راستہ وہی ہے جو شہر سے گاؤں کی طرف آتا ہے یا کوئی اور بھی ہے......؟"

"سیدھا اور مختصر راستہ تو یہی ہے۔ انسان کا دماغ خراب ہو یا کوئی اور نامعقول سی وجہ ہو تو اور بھی کئی راستے ہیں......" سرفراز نے روکھا سا جواب دیا۔

"بہرحال' تم یوں کرو کہ کسی ذمہ دار سے ساتھی کی ڈیوٹی لگا دو۔ وہ گاؤں سے باہر راستے پہ نظر رکھے جونہی میراثی اینڈ کمپنی نظر پڑیں تو ان کو لے کر سیدھا کھیتوں والے ڈیرے پہ پہنچ جائے اور ہمیں خبر کرے۔"

گاؤں کے باہر بڑے جوہڑ کے پاس برگد کے نیچے کوئی دیہاتی قسم کا مداری دس بیس بچے بوڑھے اکٹھے کر کے تماشا دکھا رہا تھا' ہم بھی وہیں پہنچ گئے وہیں پہ گاؤں کے پرانے اور نئے چوکیدار سے ملاقات ہوئی۔ نیا چوکیدار پُرانے چوکیدار کا داماد تھا' دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ ہمیں نے دونوں کو رات کے کھانے پہ بلا لیا۔ آج رات ہمیں سلیمان کے دادا اور والد صاحب سے کھانے پہ ملاقات کرنی تھی......

گاؤں میں گھومتے ڈاک خانہ' مویشی گھر' پٹواری کا ڈیرہ' ڈسپنسری' سکول اور آٹا پیسنے کی چکی اور بھی کئی جگہ [illegible] [illegible] [illegible] سرفراز [illegible] [illegible] گھڑیاں وصول کیں اور چپ چاپ بیٹھک میں گھس کر چارپائی پہ پڑ گئے۔ گزشتہ رات بے آرامی سے کٹی تھی لہٰذا سوچا' دو گھڑی کمر سیدھی کر لیں کیونکہ ظہر سے پہلے پیر صاحب سے بھی تو ملنا تھا...... پیر بوڑھا' بیمار اور بدمعاش تو سوتے نہیں اور اگر کسی مجبوری یا معذوری سے سو جائیں تو پھر انہیں کوئی جگاتا نہیں کہ ان کا سویا پڑا رہنا ان کے جاگنے سے بدرجہا بہتر اور افضل ہوتا ہے۔ اس میں بہت سوں کے لئے امن' چین' سکون اور راحت ہوتی ہے۔ ہم تاکید بھی کر کے لیٹے تھے کہ ظہر سے پہلے ہمیں زبردستی بیدار کر دیا جائے مگر چنیڈو قسم کے لوگ بے ہوتی ہیں' وہ ایسی تاکیدیں واکیدیں درخورِ اعتناء نہیں سمجھتیں۔ ان کی اپنی ایک علیحدہ ہی منطق ہوتی ہے اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پیر صاحب نے اپنے دو عدد شاگرد پیغام دے کر بھیجے کہ اگر آپ نے مجھ سے ملنا ہے تو فوراً آ جایئے ظہر کے بعد مجھے ایک مریض کو دیکھنے کسی دوسرے گاؤں جانا ہے۔

منہ پہ پانی کے چھپاکے مار کر' ہونقوں کی طرح مسجد کی طرف بھاگے' ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوئے تو پیر صاحب بڑا مناسب سا لباس زیبِ تن کئے' بڑے ٹھسے سے پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ خوشبو کی بھینی بھینی خوشبو اور پیر صاحب کی شین لیس سٹیل قسم کی دندان زیب مسکراہٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ حنا آمیز احمریں کاکلیں بھی تیل سے چپڑی ہوئی تھیں' دُنبالہ سُرمہ زیبِ چشم تھا۔ پیر صاحب جمال و جلال

کا ایک نمونہ بنے ہوئے تھے۔ مجھے انہوں نے بطورِ خاص کمالِ شفقت و محبت اپنے دائیں پہلو میں جگہ مرحمت فرمائی جہاں ایک نرم سی توشک بچھی ہوئی تھی۔ سرفراز' فوجی اور سلیمان سامنے بیٹھ گئے تھے۔ سب کا مجموعی طور پہ حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے بڑے تحکمانہ انداز میں اپنے ایک چھتنگے سے شاگرد کو اشارہ فرمایا' وہ جھٹ شکر کا شربت بنا لایا۔ دو چار منہ پھاڑ قسم کے ڈکار لینے کے بعد "شکر الحمدللہ" کہہ کر فرمایا۔ کہئے' مجھ سے کس قسم کا مشورہ آپ چاہتے ہیں؟...... میں نے مناسب سے تامل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں آیا تو یہاں چوہدری سرفراز اور چوہدری سلیمان کے پاس چھٹیاں گزارنے تھا' سوچا تھا کہ دو تین ہفتے یہاں خوب گزریں گے مگر یہاں آتے ہی صورتِ حال کچھ ایسی سامنے آئی کہ اب میرے سامنے صرف دو راستے ہیں' یا تو میں فوراً یہاں سے بھاگ لوں یا پھر ہمیشہ کے لئے یہیں پہ ڈیرے ڈال لوں......"

پیر صاحب نے اپنی موٹی موٹی اُبلی ہوئی عجیب سی بے قرار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے احتراز کر رہا تھا۔ انہوں نے میری بات بیچ میں ہی قطع کرتے تھی...... فرمایا۔

برخوردار! جو بھی کہنا ہے' بلا تمہید ہو تاکہ میں بھی کچھ جان سکوں کہ تم دراصل مجھ سے کیا چاہتے ہو......؟"

سرفراز دخل در معقولات کرتے ہوئے بولا۔ "مولوی صاحب! اسے دو راتوں سے ایک عجیب و غریب قسم کا خواب پریشان کر رہا ہے۔ یہ خواب چونکہ رُوحانی کیفیات کا حامل ہے اس لئے اس کی تعبیر کے سلسلے میں ہمیں آپ کی رہبری کی اشد ضرورت ہے۔"

سرفراز نے یہ پھلجھڑی خدا جانے کس مصلحت کے تحت چھوڑی تھی ورنہ میرا ارادہ سیدھے سیدھے خواج خضر والے فراڈ کے سلسلے میں ان کا تعاون اور مشورہ حاصل کرنے کا تھا...... اک دم جیسے میرے دماغ کا بلب روشن ہو گیا ہو' مجھے ایک نیا آئیڈیا اور ایک اچھوتا طریقہ سُوجھا' ساتھ ہی ابھی کی گفتگو آئندہ کے لائحہ عمل کی تمام تر جزئیات اور تانے بانے بھی سامنے آ گئے۔

پیر صاحب قدرے خوش ہوئے کہ ہم اس رُوحانی کیفیات والے خواب کی خاطر خواہ خوش کن تعبیر کے سلسلے میں ان سے رجوع ہوئے ہیں۔

"سُبحان اللہ" کہتے ہوئے گویا ہوئے...... "برخوردار! بسم اللہ پڑھ کر خواب بیان کرو"......

...ٹھہرو ــــ'' کہتے ہوئے وہ بمشکل اُٹھے اور پیچھے والی چوبی الماری سے ایک بوسیدہ سا ہار جس میں ... پروئے ہوئے تھے' نکالا اور میرے گلے میں ڈال دیا...... فرمایا۔

''یہ حضرت ادریسؑ کے مخصوص خوابوں کی تعبیر کے وظیفے والا بابرکت ہار ہے جسے میں صرف اُن ... قسمت خواب دیدوں کے گلے میں ڈالتا ہوں جن کے خواب معدے کی خرابی اور نیت کے فتور سے ... روحانی کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس ہار میں ایک اور کرامت بھی ہے' وہ یہ کہ خواب دیکھنے ... میں وہی سارا خواب یاد آ جاتا ہے۔ اس ہار کو صرف گلے میں ڈالنے کا ہدیہ ہی پانچ پڑوپی اناج ... ہوتا ہے۔'' ...... ہاں' بسم اللہ......''

وہ آنکھیں میچ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے عجیب سی بے بسی اور جھنجلائے ہوئے انداز میں ... کی جانب دیکھا ...... اس کم بخت نے مجھے اکھاڑے میں اتار دیا ...... شروع ہو جاؤ ...... پیر صاحب ... غنودگی کے یا مراقبے کی حالت میں گھڑی کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں ہلکورے لے رہے تھے' ... جیسے عالم تنویم میں کہہ رہا تھا۔



- خواب: مرکب کا بیتاب

''ایک بڑا سا سنہری پروں والا پرندہ ہے۔ اس کی لمبی سی راج ہنس کی طرح گردن کے گرد میں ... حائل کئے ہوئے ہوں۔ ... بیٹھنے کی کاٹھی تاتاریوں کے ... گھوڑوں کی مانند اور مرمریں جسم ... پشم' شتر مرغ کے لمبے لمبے پروں کے نفیس و نازک لمس کی طرح غنودہ آور اور دبیز ہے۔ وہ مجھے ... ہوئے بڑی سبک خرامی سے خلاؤں میں محوِ پرواز ہے۔ اُودے اُودے نرم نرم بادلوں کے گالے ... گالوں کو گدگداتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اُوپر تا حدِ نظر نیلا نیلا آسمان' جیسے کسی نیلم پری نے نیل کنٹھ ... نیلے پَر' کچا نیلم' نیل پالش' سب کچھ ملا کر بسیط و بیکراں اُفق کو سپرے کر دیا ہو۔ پاؤں تلے' بہت ... جیسے سبزے کا بہت بڑا قالین بچھا ہوا ہو۔ عجیب سے منظر نظارے' جھیلیں' جھرنے' آبشاریں' دریا و دمن' ... و کہسار...... میں ہر اک سے لطف و نیاز لیتا ہوا رواں دواں ہوں۔ اچانک میرے مرکب سیمرغ ... جھکائی لی' میں نے مضبوطی سے صراحی دار گردن پکڑ لی۔ منظر تیزی سے بدلنے لگے۔ ہم نیچے' بہت نیچے ... گئے۔ صبح صبح کا وقت' فضا میں گائے بھینسوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کا ترنم اور ہواؤں میں کستوری اور ... کے خالص عطر کی باس رچی ہوئی تھی۔ سیمرغ نے بڑی نرمی سے مجھے جھٹک کر نیچے اُتارا' پھر ذرا

ہٹ کر اپنے پنجوں سے زمین کریدنا شروع کر دی۔ تھوڑی سی مشقت کے بعد ایک پرانی سی دبی ہوئی لکڑی برآمد ہوئی' اپنے سبک پروں کی ہوا سے اسے صاف کیا۔ پھر ایک اچنبھا ہوا' میری تو گھگھی بندھ گئی۔ وہ انسان کی کلام کرنے لگا۔ میں ہٹ بٹ اس کی جانب دیکھ رہا تھا' وہ کہہ رہا تھا کہ یہ ایک مقدس جگہ ہے یہاں جنوں کے سردار سلیمانؑ کے اڑن تخت کا لینڈنگ گیئر دفن ہے۔ میں نے اس کی نشاندہی کر دی ہے اب تُو اس مقدس ٹیلے کا متولی ہے۔ پھر اس مقدس سیمرغ نے مجھے ایک اور شکل جو آپ کی شکلِ مبارک سے ہو بہو ملتی جلتی تھی' دکھا کر کہا کہ باقی رہنمائی تُو ان سے حاصل کر...... یہ کہہ کر سیمرغ نے مزید کچھ کہے سُنے بغیر اڑان جو بھری تو یہ جا' وہ جا۔ میں کبھی اس کو اور کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہ گیا......''

یہاں تک خواب سُنا کر میں نے جو آنکھ کھولی تو پیر صاحب جیسے ستو اور بھنگ پیئے ہوئے مجھے گھور رہے تھے۔ باقی میرے اپنے ٹرٹریے وہ تینوں گہرے سمندر کی طرح خاموش باادب بیٹھے تھے۔ پیر صاحب مجھے مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ اک لمحہ کے لئے تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی چیتے کی طرح اچھل کر میری گردن دبوچ لیں گے اور اگر وہ اپنے وزن اور بے ہنگم وجود کی بناء پر ایسا نہ کرنے کا سوچ رہے ہوں تو مجھے پھر وہ اپنے کسی نہ کسی موکل سے ضرور دبوچ لیں گے...... پیر صاحب کے موٹے موٹے ہونٹوں پہ پتلی سی جنبش ہوئی۔

''تم اپنے گلے میں پڑا ہوا مقدس ہار اُتار دو......''

میں نے ایک نظر چھوہاروں والے ہار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو میرا خواب مکمل نہیں ہوا......''

''یہ خواب میرے خیال میں کسی جادوئی فلم کی سٹوری ہے' لاحول ولا...... اچھا یہ بتاؤ' یہ تمہارے والا ٹیلا کہاں واقع ہے؟''

میں نے فوراً گھڑا گھڑایا جواب دیا۔ ''جی' یہی اپنے گاؤں والا ٹیلا...... اب میں آگے کا خواب سُناتا ہوں۔''

''میں حیران و پریشان ٹیلے پہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔ اچانک کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دی' دیکھا کہ وہی سیمرغ' ایک بکری جیسا جانور میرے قریب چھوڑ کر پھر اُڑ گیا ہے......''

پیر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے' آگے بڑھ کر میرے گلے سے چھوہاروں والی مالا اُتارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ کا خواب محض بوجھل معدے کی کارستانی ہے' اپنا ہاضمہ دُرست کریں' پانچ

وقت نماز پڑھا کریں اور ایسے بیہودہ خواب سُنا سُنا کر لوگوں کا ایمان اور دھیان خراب نہ کریں۔ طلسماتی قسم کی قصّوں سے پرہیز کریں' یہی آپ کے خواب کی تعبیر ہے......''

وہ اُٹھ کر جانے لگے تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''جی وہ جو خواب میں اشارہ ہوا کہ میں آپ سے رہنمائی حاصل کروں......؟''

وہ ڈنڈا اُٹھانے کے لئے بڑھے لیکن ہم ڈنڈے کی دسترس سے باہر نکل چکے تھے۔ واپس ہوتے ہوئے راستے میں سب ہی خاموش خاموش تھے جیسے کبڈی ہار کر پلٹ رہے ہیں یا کوئی ایسا فرد فوت ہو گیا ہو جس کے ذمے اِن کا کچھ لیکھا نکلتا تھا۔ میں بھی دانستہ چُپ رہا کیونکہ اس سمے انہیں چھیڑنے کا مقصد تھا آ بیل مجھے مار کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا...... شکر دوپہر' سورج سر پہ چڑھا قوالی کر رہا تھا۔ سب کا پسینہ ٹپکا تو دم لینے کی خاطر ایک ببول تلے گھاس پہ بیٹھ گئے۔ یہاں بھی سب نے مُنہ میں گنگھنیاں لگی ہوئی تھیں۔ جیسے سب نے ایکا کیا ہوا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو لے' آج بات نہیں کرنی۔

''اچھا' بھائیو! خدا حافظ' ہجارے تو چلے...... کہا سُنا معاف کر دینا۔''

میں یہ کہہ کر خاموشی سے اُٹھا اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پہ ہو لیا۔ کچھ دیر تک چلنے کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھے روکا اور نہ ہی پیچھے سے آواز دی' بڑی طبیعت جالو ہوئی کہ ایسے بے وفا اور چشم طوطا دوست کہ جھوٹے مُنہ رُکنے کو کہا' نہ کسی نے تکلفاً یا رسماً یہ تک پوچھا کہ میاں! کیوں اور کہاں جا رہے ہو؟...... غصہ اور آنچ پکڑ گیا تھا' رفتار بھی قدرے تیز ہو گئی۔ کچھ دُور آگے ایک موڑ پہ میں نے بڑی ہوشیاری سے پیچھے دیکھا تو تینوں کم بخت اُلٹو کے اچیلوں کی طرح پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ میں ٹھٹک کر رُک گیا' وہ بھی وہیں پہ تھم گئے۔ دو چار قدم میں نے اور آگے بڑھائے' اُنہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ بڑی طبیعت جھنجھلائی' کہ یہ کیا حرکت کر رہے ہیں؟...... آخر کار میں نے انہیں ایک موٹی سی گالی دے کر پاس بلایا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ تم سب نے اگر مُنہ بند کر لیا ہے تو پھر میرے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور مجھے بھی جانے دو......''

''ہم تینوں بھی تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔'' سرفراز نے بے رُخی سے جواب دیا۔

''کیوں...... تم لوگوں نے مجھ سے نکاح پڑھوایا ہوا ہے......؟''

''نکاح پڑھوانے والی ہی بات سمجھو...... تم نے گاؤں پہنچتے ہی جو گھپلا گھمایا ہے اور جس طرح سے بندے کے سامنے ہماری نکاتی کرائی ہے' خدا لگتی کہو کہ کیا اب ہم اس گاؤں میں کسی کو مُنہ

دکھانے کے قابل ہیں؟...... ایک آخری معزز بندہ مولوی صاحب رہ گئے تھے انہیں بھی ہمیں نکالنے کے لئے ڈنڈا اُٹھانا پڑا اور......"

"بس اور کچھ آگے مت کہو...... میں ہی بُرا اور فسادہ ہوں اسی لئے تو میں جا رہا ہوں......"

میں نے یہ کہہ کر پھر چلنا شروع کر دیا۔

"وہیں رُک جاؤ ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو فوجی ان ایکشن آ جائے گا...... سیدھی طرح واپس گاؤں چلو۔ دادا کی دعوت تو بڑے دعوے سے قبول کر لی تھی۔ اب وہاں مُرغے بٹیرے اور دریا کی تازہ مچھلی جو تیار ہو رہی ہے وہ کون کھائے گا اور اگر تم دعوت پہ نہ پہنچے تو دادا ابا ہمیں بھون کر کھا جائیں گے......"

ان کی یہ دلیل اور دھمکی واقعی اپنا کام کر گئی۔

● بہروپیا بہروپ نگر کا کروپیا......!

واپس پلٹ ہی رہے تھے کہ دور سے ایک سائیکل دھول اڑاتی ہوئی دکھائی پڑی۔ سلیمان نے دور سے سونگھا لگا کر نعرہ لگایا کہ آنے والا ہمارے لئے کوئی پیغام لے کر آ رہا ہے۔ واقعی وہ خورشید تھا جسے میراثی اور اس کے ساتھ ہماری آمد کی خبر دینے پہ معمور کیا گیا تھا...... ڈیرے پہ پہنچے تو مارے حیرت میری آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ایک تن و توش والے بزرگ جن کی چھاتی تک اتری ہوئی سُرخ و سفید داڑھی پٹے دار کاکلیں اوپر بڑا سا پگڑ موٹی موٹی انگلیوں میں کئی ایک انگوٹھیاں اور بڑی سی تسبیح ہاتھ میں لئے رول رہے تھے۔ پاس ہی ایک بکری بندھی جگالی کر رہی تھی۔ بکری ویسی ہی سیاہ سفید دھبوں والی بزرگ کے پاس اک ملنگ بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارا اپنا میراثی اور اس کے دو بیٹے چار پائی پہ بیٹھے بزرگ آدمی کو پنکھا جھل رہے تھے۔ سلام میں پہل میں نے کی...... بزرگ نے بڑی بڑی کاٹ دار آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا پھر بڑی بے نیازی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اِدھر آ کر بیٹھ جاؤ بچہ! بزرگوں کے آگے اس طرح ڈھٹائی سے کھڑے نہیں ہوتے......"

میں دائیں جانب کھسک کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا چیز ہیں......؟" میں نے آہستہ سے سرفراز کے کان میں کہا۔ "یہ بزرگ بھی مجھے کوئی ڈبہ صاحب کے پیر بھائی دکھائی دیتے ہیں۔" پھر میں نے سلیمان کے کان میں ہولے سے کہا۔ "یار! اگر تمہیں

[illegible] کہ آج صبح ہم نے کون سی شے الا گئی تھی کہ جس کی پاداش میں ہمیں آج ایسی ایسی ہوائی [illegible] کو مل رہی ہیں......"

شاید ہماری کانا پھوسی کی ہلکی سی بھنک بزرگ کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں بڑے [illegible] میں ڈانٹا اور حکم دیا کہ ان بدتمیزوں کو فوراً سے پہلے یہاں سے بھگا دیا جائے...... میرا تو خون [illegible] اس سے پہلے کہ میں کسی کارروائی کے لئے اُٹھتا' میراثی نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے [illegible] بزرگ کے کان میں پھونکا۔ بزرگ کو تو جیسے کسی نے بجلی کی ننگی تار چھوا دی تھی۔ اک زبردست [illegible] سے وہ اُچھلا' دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے اپنے سر کا بڑا سا پگڑ جو اُتارا تو جیسے وہ ننگا ہو گیا۔ چھتنار [illegible] مونچھیں' شانوں تک لہراتی ہوئی زلفیں سب کچھ چشم زدن میں اُس نے اُتار کر میرے قدموں [illegible] اور اندر سے وہ اُودبلاؤ سا نکل آیا۔ ہاتھ جوڑ کر پھر وہ شروع ہوا۔

"اُچے شملے' سرداریاں قائم۔ میں کی کمینہ' میراثی' بہروپیا۔ تہاڈی جُتیاں دی خاک' تہاڈے [illegible] دی راکھ' خطاواں معاف' تے وفاواں یاد۔ اللہ بیلی یاؤ' تے سیالکوٹ دے [illegible] خان صاحب' [illegible] سلامت......" وہ ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "سرکار' آپ نے راوی کا پُل دیکھا [illegible]"

میں نے زبان کی بجائے سر کی جنبش سے ہاں کا جواب دیا۔ وہ پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا بات ہے سرکار! منہ سے نہیں بولتے' منہ میں بغل گند ہے...... بولو سرکار! دل دی کنڈی [illegible]"

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں ہاں دیکھا ہے بلکہ کئی بار دیکھا ہے......"

"او شاوڑیاں' بھئی شاوڑیاں...... خان صاحب نے راوی کا پُل دیکھا ہے' بلکہ کئی بار دیکھا [illegible] کیا بات ہے' پُل کے سینگ نکل آئے تھے یا پُل کی مونچھیں اُگ آئی تھیں۔ آپ نے بار بار کیوں [illegible] اچھا چلو' دیکھ لیا تو دیکھ لیا' مولا خوش رکھے۔ اب بتائیں کہ پُل اندر کتنا ہوتا ہے اور باہر [illegible] سرکار! میری توبہ' میں کوئی امتحان نہیں لے رہا۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا ہے......"

میں نے بھی اس کی جگتوں کا لُطف لیتے ہوئے جواب دیا۔ "بھئی کوئی دو گنا اندر اور ایک حصہ [illegible]......"

"موتیاں والیو!...... ہُن دسو کہ آپ اندر کتنے اور کتنے باہر ہیں......؟"

اس بات پہ سب ہی لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ ہنسی مذاق کی گرد بیٹھی تو میں نے سب سے پہلے

میراثی کے سانڈو کو بزرگ کے بہروپ کی دل کھول کر داد دی اور کہا کہ میں خود بھی دھوکا کھا گیا' یہی سمجھ کہ کوئی بہت بڑا پیر بیٹھا ہوا ہے۔ پھر میں نے اس کی مصنوعی داڑھی' مونچھیں اور لمبی زلفیں ملاحظہ کیں۔ یہ تینوں چیزیں سر کے پگڑ کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں' پگڑ پہن لو تو ایک سیکنڈ میں چہرہ کچھ سے کچھ ہو جاتا تھا۔ یہ گٹ اپ بھی اس کا خود ساختہ تھا۔ بڑا ہی ذہین فطین اور بلا کا فنکار بلکہ اُستر کار تھا...... میں نے تین یا گھنٹے لگا کر اپنے پروگرام کی ہر چیز' ہر بات چھوٹی سے چھوٹی جزویات کے ساتھ اس کے دماغ میں بٹھا دی تھی۔ پھر اسے ساتھ لیا' یہ آ کر سلیمان کا اُڑن کھٹولہ' محبوب اور کستوری کے مدفن' اس کی خوشبو سانپوں کا سلسلہ' لوگوں کی توہمات' محبوب کے والدین کا وہم اور نفرت' سب کچھ اس کو سمجھا دیا...... اب ہم سب بکری کے حوالے ہو گئے۔ یہ وہی بکری تھی جس کا ایک بچہ ان فراڈیوں کے ڈیرے پہ مقدس بچہ بنا ہوا تھا' جس پہ کلمہ پاک کا آدھا حصہ "محمد رسول اللہ" عجیب طریقے سے لکھا ہوا تھا۔ اب ہم نے اس بکری پہ سیاہ دھبوں کو برش' تیل اور تیزاب کی مدد سے بڑھا کر "لا الہ الا اللہ" بنا لیا تھا' اس ہنرمندی سے کہ یہ محسوس ہو کہ یہ قدرتی طور پہ ہی ایسا لکھا ہوا ہے۔ گھنٹے میں یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ اب ہم نے فوجی' میراثی اور دلاور کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اس بہروپ پارٹی کو کل شام سے پہلے دریا پہ جا کر اور ڈیرے پہ لے جا کر ہر چیز کی زیارت کرواتے...... ظاہر ہے یہ ہم رات سلیمان کے دادا کے ہاں کھانے پہ مدعو تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم نے ڈیرے پہ واپس آنا تھا اور دن بھر کی کارروائی کو دیکھنا تھا اور کھیل شروع کرنے سے پہلے چھپ کے سٹیج پہ فائنل ریہرسل بھی تو ضروری تھی۔ ہر کارکن کو اس کی ڈیوٹی اور ہر ایک کو اس کا کریکٹر سمجھا کر میں' سرفراز اور سلیمان گھر آ گئے۔ نہانے دھونے کے بعد سلیمان کے گھر جانے کی تیاری میں لگ گئے۔

● دادا' آتش گیر مادہ......!

محبوب مرحوم اور سلیمان کے والد اور دادا ویسے ہی تھے جیسے عام دیہاتوں میں باپ' دادے نانے ہوتے ہیں۔ ایک جیسے نام' ایک جیسے سر شملے' پگڑیاں' مونچھیں' داڑھیاں' باتیں' سوچیں' فکریں۔ ایک بوڑھا سندھ سے' دوسرا بلوچستان سے' تیسرا پنجاب اور چوتھا سرحد سے لے لیں۔ سب اپنے ناموں کا سمیت دلچسپیوں' تکلم' زبان بیان اور فکری اعتبار کی معمولی سی کمی بیشی کی رعایت کے ساتھ ایک جیسے ہوں گے۔ کشادہ سے صحن میں خوب چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ چار پانچ چارپائیوں پہ صاف اُجلے کھیس اور تکیے بچھے ہوئے

تھے۔ سرکنڈوں کی آرام دہ کرسیاں اور ایک بڑی سی تپائی بھی تھی۔ سلیمان کے دادا ایک پلنگ پہ نیم دراز ایک بڑے سے جناتی حُقّے سے شغل فرما رہے تھے۔ ایک نوجوان سا کاما' زمین پہ اکڑوں بیٹھا' پلنگ پہ بیٹھے دادا کے خارش زدہ پاؤں داب رہا تھا۔ ادھر جب ہم گھر سے چلے تھے تو تین چار مقامی کتے بھی ہمارے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پہ آ رہے تھے۔ دیہاتیوں کی طرح یہ چینڈو کتے بھی اپنے گاؤں کے مہمانوں کو پورا پروٹوکول دیتے ہیں۔ ہم حویلی کے جہازی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو باہر کے کتے باہر کھڑے' دُم ہلا ہلا کر جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کر رہے تھے۔ اب ہم خانہ زاد کتے کی عملداری میں تھے جس نے ہمیں اندر دروازے سے وصول کیا اور دادا جان کے پاس پہنچا کر' چار پائی پہ بٹھا کر خود حُقّے کی ''نیچے'' کے پاس بیٹھ کر نیم باز نظروں سے ہمیں تاکنے لگا...... بوڑھے' دادے' نانے ٹائپ کے لوگ سوتے جاگتے عموماً ایک سی حالت میں ہی رہتے ہیں۔ کیا مجال جو سامنے والا آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ یہ جان پائیں کہ بزرگ سوئے ہوئے ہیں یا عالمِ بیداری کے کسی درجے پہ ہیں؟ عام طور پہ ان کی موجودگی میں موجودگی ہلکی سی ہوں ہاں' اوپر والے ہونٹ پہ ہلکی سی کپکپاہٹ یا پھر حقے کی گڑگڑاہٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ''السلام علیکم'' کہہ کر ہم ''وعلیکم السلام'' کے لئے ان کی [illegible] بیٹھا یا جاگا ہوا بھی ''خراٹیاں'' سی اُبھر ڈوب رہی ہیں۔ کان کی لوویں بھی کھجلا رہے ہیں۔ حُقّے کی 'نے' ہونٹوں کی گرفت میں دبی پڑی ہے' نتھنوں سے ہلکا ہلکا دھواں غبار بھی خارج ہو رہا ہے اور دادا میاں سو بھی رہے ہیں۔ میں نے دادا سے نظریں ہٹا کر کامے پہ گاڑ دیں مگر وہ کوئی انسان تھوڑا ہی تھا' وہ تو ٹوکے' بیلنے ٹائپ کی کوئی مشین تھا۔ ٹک ٹک' کٹ کٹ چل رہی ہے...... یہاں سے بھی مایوس ہو کر میں نے قدموں میں بیٹھے ہوئے پالتو کتے کی جانب دیکھا۔ وہ رُوسیاہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ کتے کی ایک آدھ کمزوریوں میں ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ گھر آئے ہوئے مہمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہتا ہے جبکہ یہ حرکت بدتمیزی میں شامل ہو سکتی ہے۔ میں اس کی متجسس نظروں کی تاب نہ لا کر دوسری جانب دیکھنے لگا' نظریں اُلٹا پلٹا کر ایک بار پھر جو دیکھا تو اُس نے مجھے آنکھ ٹکائی۔ باہر لٹکی ہوئی زبان کو سمیٹ کر اندر کیا اور پھر تر کر کے باہر ڈال دی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اس کامے انسان اور مجھ کتے کی مانند اس ایک سو چار کلے اراضی کے مالک کے جوتوں میں سر اور نظریں جھکا کر بیٹھ جاؤ...... اپنی خوش بختی پہ ناز کرو کہ تم مٹی کے ''م'' سے کس قدر قریب ہو...... یا پھر یوں ہی الف کھڑے رہو اور الف کی ماہیت پہ غور کرو کہ اس میں نشیب کہاں سے شروع ہوتا ہے اور فراز کدھر جا کر ختم ہوتا

ہے؟...... میں گُتّے کی اس فلسفیانہ فراست پہ غور ہی کر رہا تھا کہ اندر برآمدے میں سے سلیمان کے والد محترم برآمد ہوئے۔ بڑے وجیہہ' لمبے تڑنگے اور بارُعب۔ وہ بڑی سُبک خرامی سے ہمارے پاس آئے تو میں نے بڑے اَدب سے انہیں سلام کیا...... جواب کے بعد اُنہوں نے ایک نظر ابے والد صاحب پہ ڈالی' مسکراتے ہوئے ہمیں چارپائی پہ بٹھایا۔ حال چال' پڑھائی اور مصروفیات کے متعلق پوچھتے رہے۔ دادا میاں نے بھی کروٹ لی' شاید ایک جانب پڑے پڑے کوئی نس پٹھا اکڑ گیا تھا۔ "ہائے ہائے" کرتے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور قہر آلود نظروں سے ہمیں دیکھا۔ سلیمان کے والد نے بتایا کہ یہی مہمان ہیں جو آج رات ہمارے ہاں مدعو ہیں۔ دادا پھر ہم تینوں کو گھورنے لگے۔

"مہمان...... کہاں ہیں' کدھر ہیں؟...... یہ تینوں بلونگڑے...... یہ اپنا سلیمان' یہ سرفراز احمد یہ بچہ......؟"

سلیمان نے آگے پاس جا کر ذرا بلند آواز میں بتایا۔

"دادا! یہی میرا دوست خان ہے جو سیالکوٹ سے آیا ہوا ہے۔ اپنا سرفراز ان ہی کے گھر سیالکوٹ رہتا تھا......"

اُنہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا' میرے بازوؤں کو ٹٹولتے ہوئے فرمانے لگے۔

"خان ہو کر اتنے کمزور؟...... اوئے تم میں تو ساہ ست ہی نہیں......"

"دادا! ان کی ساری طاقت' جسم کی بجائے دماغ میں ہے۔" واہ پیا جانے یا راہ پیا جانے یہ باتیں سُن کر دادا کی آنکھیں جیسے کُھل سی گئی ہوں' وہ ہاتھ کے انگوٹھے سے حُقّے کی چلم کو ٹھوکتے ہوئے کامے سے بولے۔ "اُٹھ اوئے' بگیا! چلم تے پخا کے لے آ......" پھر مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔ "شاوا بھئی شاوا...... خان پُتر! مجھے سیانے تے سُلکھنے بچے بڑے پسند ہیں۔" پھر وہ سلیمان کو بھی اپنے دوسری جانب بٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "یار! تم نے ابھی کہا ہے کہ خان کے جسم کی طاقت بھی دماغ میں ہے۔ یہ نئی بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی...... تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو کام جسمانی طاقت سے لیا جاتا ہے خان وہ کام دماغی قوّت سے سرانجام دے سکتا ہے......؟"

"ہاں' دادا! قریب قریب ایسا ہی ہے۔ جماندرو تیز ہے جیسے کانٹا منہ نکالتے ہی نوکیلا ہوتا ہے۔"

کرم کرم چلم' حُقّے کے سینے پہ آ پڑی تھی۔ دادا نے دو چار بھرپور کش لگائے۔ اب دادا تو جیسے پچاس برس پیچھے کی جانب جوان ہو گیا ہو۔ آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی مانند دہکنے لگیں تھیں' چہرے

جیسے مرغ خون نے یلغار سی کر دی ہو' اک بڑی سی "ہوں" کرتے ہوئے مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔

● بُز بچہ' شیر کے کچھار میں......!

"بچے' خان! پہلے اور اب بھی تیری بڑی پلھے پلھے سُنی ہے۔ میرے تجھ سے تین سوال ہیں۔ جو بھی لو مگر جواب کُکڑ' تیتر کھانے کے بعد دینا...... شرائط سن لو۔ پہلے سوال کے صحیح جواب پہ انعام ہماری مرضی کا ہو گا۔ دوسرے دو سالوں کے جواب اگر دُرست ٹھہرے تو ہر جواب پہ انعام تمہاری مرضی کا...... بولو منظور ہے......؟"

مَیں حیرت زدہ سا اس بزرگ کو دیکھ رہا تھا جنہوں نے مجھ پہ ایسی گرفت ڈالی تھی کہ مَیں چاروں شانے چت پڑا تھا۔ کہاں یہ زمانہ دیدہ شنیدہ' چشیدہ بزرگ اور کہاں میں ...... مَیں ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا۔

"دادا! مَیں بچہ کچا ہوں اور آپ دادا' پَردادا ہیں۔ مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالیے۔ یہ میرے بس [illegible] پوچھ لیں۔"

"نہ برخوردار! اب ایسے جان نہ چھوٹے گی......" انہوں نے ایک شیری دھاڑ کے ساتھ کھانا لانے کا حکم دیا اور پھر میری جانب متوجہ ہوئے۔ "سوال نمبر ایک۔

ایک اور ایک کتنے ہوتے ہیں......؟" پھر خود ہی کہنے لگے۔ "دیکھا' کتنا آسان سا سوال ہے۔ یہ سوال آج سے پچاس برس پہلے مجھ سے میرے مُرشد نے پوچھا تھا اور فرمایا تھا کہ کرم الٰہی! اگر تم نے اس کا جواب دُرست دے دیا تو پھر تم میرے پکّے مُرید اور اگر غلط دیا تو پھر زن مرید...... سوال نمبر دو۔ عشق کیا ہے؟...... سوال نمبر تین۔ ایک گاؤں کے باہر ایک بورڈ آویزاں ہے' اس پہ لکھا ہے کہ "یہ دیپ پور ہے۔" اس تحریر میں کیا خوبی ہے جس نے اس کو باکمال اور لاجواب بنا دیا ہے۔"

دادا نے ایک بھرپور کش کھینچ کر اپنی متجسس سی بے قرار آنکھیں مجھ پہ گاڑ دیں' شاید وہ اپنے سوالات کا کوئی رَدِ عمل میرے چہرے پہ دیکھنا چاہ رہے تھے اور ادھر میں تو بنا ہوا ہی چکنی ملتانی مٹی کا تھا جس پہ نظر تو کیا' کچھ بھی نہیں ٹکتا' پھسل کر ادھر اُدھر لُڑھک جاتا ہے...... کھانا آ گیا تھا۔ ہم دن بھر کے بھوکے پیاسے' ایسے بدیدے پنجے سے کھانے پہ ٹوٹے کہ توبہ بھلی...... میرے خیال میں دادا کے دانت نقلی تھے۔ مرغ کی ران' بٹیر بیچارے کی کیا بساط؟ مچھلی کنگھی کانٹے سمیت سب کچھ' جو منہ میں پہنچتا وہ

سیدھا پیٹ میں اُتر جاتا' ہڈی تک نہ کھینچی جاتی۔ کسی سمندری وہیل کی طرح گوشت' ہڈی' کانٹے سب اندر...... سلیمان کے والد صاحب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''میاں جی! آپ کس شغل میں پڑ گئے۔ چھوڑیئے ان بچوں کو' یہ ابھی نادان اور شیطان ہیں۔''

''نہ' فضل کریما! میں اس بچے خان کو نہیں چھوڑ سکتا' باقی رہے یہ دونوں سلیمان اور سرفراز احمد ان دونوں کو تمہاری سفارش پہ چھوڑ دیا......'' دادا' کھانے کے بعد پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''ہاں بچے میرے جواب کیا ہوئے......؟''

''دادا! کہتے ہیں کہ ہر سوال کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور ہوتا ہے' ضروری نہیں کہ وہ دُرست اور ٹھیک ہو مگر ہوتا ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے سوالوں کا بھی کوئی نہ کوئی جواب ضرور ہوگا...... ایک بات آپ نے فرمائی کہ آپ کے مرشد نے آپ سے ''ایک اور ایک کتنے ہوتے ہیں'' کا سوال پوچھا۔ کیا میں پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ نے کیا جواب دیا تھا؟''

دادا' ذرا سا اُکھڑے جیسے جواب دینے میں تامل کر رہے ہوں' آخر بولے۔

''[illegible]''

''ویسے آپ نے کچھ نہ کچھ تو جواب ضرور دیا ہوگا؟'' میں نے اسی لمحہ پوچھا۔

دادا بولے۔ ''ہاں' میں نے وہی جواب دیا جو اس سوال کا جواب ہے یعنی ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ بھی ہے کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں......''

میں نے ان کی بات [illegible] کہا جائے کہ علم ریاضی میں ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ علم تجارت میں یہ گیارہ اور علم العشق میں یہ ایک سے دو پھر سے ایک' اور بالآخر یہ ایک سے زیرو ہونے کے باوجود کچھ نہیں رہتا۔ یہ ذات کی نفی ہی عشق ہے' اس زیرو کو شش جہات کہیں سے بھی دیکھو یہ نفی یعنی زیرو ہی نظر آتا ہے۔ اس کو سکیڑتے جاؤ تو بالآخر ایک معدوم سا نقطہ رہ جاتا ہے...... دین و دنیا کے ہر قلم سینۂ قرطاس پہ قدرتی طور پہ پہلے نقطہ ہی بناتا ہے' اسی نقطے سے پھر علم الاسماء کے سارے نقشے اُبھرتے ہیں...... ''یہ روپ پور ہے'' اس منظر تحریر میں بھی اسی نقطے کا نکتہ کارفرما ہے۔ اسے نفی کے نقطے کی طرح سیدھا پڑھو یا اُلٹا پڑھو ''یہ روپ پور ہے'' ہی پڑھا جائے گا۔''

''دادا نے ایک بھرپور ٹھوکر سے تختے کو پرے پھینکا' دیوانوں کی مانند اُٹھے۔ ننگے پاؤں ہی دالان کو پھلانگتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گئے۔ سلیمان کے والد بھی اُٹھے اور دادا کے بند کمرے کے باہر خاموش سے کھڑے ہو گئے۔ سلیمان اور سرفراز احمد بھی یوں گھور رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ بچو

[illegible] نے کوٹھڑی کے اندر مرغابیوں کا شکار کرنے والی بندوق سے خودکشی کر لی تو تمہیں بھی اس بندوق [illegible] سے"

"یار! آپ کے دادا کو حُقّے توڑنے کا دورہ پڑتا ہے۔ حد ہو گئی' اتنا غصہ؟...... میرا خیال ہے کہ [illegible] دینے کا بہانہ یا کوئی جواز تلاش کرنے کمرے کے اندر گئے ہیں۔"

اسی دوران عشاء کی اذان بلند ہوئی' جواز ہاتھ آ گیا تھا۔ نماز کے بہانے ہم مقتل سے سر بچا کر [illegible] گئے اور گھر جانے کی بجائے بڑی مسجد کی جانب چل دیئے۔ سرفراز نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہاں تو [illegible] صاحب ہوں۔ مَیں نے جواب دیا کہ وہاں پہ اللہ بھی تو ہوگا...... مسجد میں داخل ہوتے ہی مجھے [illegible] صاحب دکھائی دیئے جو بڑے اہتمام سے وضو کر رہے تھے۔ دو شاگرد مٹی کے لوٹے تھامے پانی ڈال رہے تھے۔ حلق کے غرارے' نتھنوں میں پانی کا اوپر چڑھاؤ [illegible] ہوئے بازوؤں کہنیوں پہ پانی کا [illegible] بہاؤ...... مَیں سوچ رہا تھا کہ کسی عاجز سے فقیر کے لئے تو ایک آدھ لوٹا پانی ہی بہت بڑی نعمت [illegible] ہے' وہ اسی سے بینت بینت کر وضو کر لیتا ہے۔ یہ بھی میسر نہ ہو تو وہ اللہ کا بندہ اپنے ایک آدھ [illegible] ہی اندر باہر کے وضو کا اہتمام کر لیتا ہے۔ پیر صاحب کا یہ انداز تو آخر مجھے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اندر [illegible] ہوتے ہی [illegible] پیر صاحب جیسے بوکھلا سے گئے کہ [illegible] ہے جو اتنی جرأت سے سلام کر رہا ہے؟ انہوں نے مجھے کچا کھا جانے والی نظروں سے دیکھا' یقیناً [illegible] لاحول بھی پڑھی ہوگی...... خیر' خیریت گزری نماز سے فارغ ہوئے۔ عام مساجد' خاص طور پر [illegible] کی مساجد کی روایت رواج کے مطابق نمازی' نماز کے بعد قطار بنا کر امام صاحب سے مصافحہ [illegible] تے ہیں بلکہ بعض تو باقاعدہ معانقہ بھی فرماتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سلسلہ چل نکلا۔ مَیں اپنے ساتھیوں [illegible] خاص طور پہ سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ قطار آہستہ آہستہ آگے کی جانب کھسک رہی تھی اور [illegible] اندازے کے مطابق اُدھر پیر صاحب کی ہوا بھی کھسک رہی ہوگی کیونکہ وہ بار بار قہر بار نگاہوں سے [illegible] کر رہے تھے۔ اگلے دو اڑھائی منٹ میں' مَیں اُن کے رُوبرو تھا۔ وہ مجھ سے شاید ہاتھ نہ [illegible] مگر وہاں صورتِ حال ہی ایسی تھی کہ ہاتھ ملائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ جبراً و قہراً انہوں نے ہاتھ کی [illegible] کو یوں آگے بڑھایا جیسے خدشہ ہو کہ پورا ہاتھ ملانے سے کہیں ہاتھ ہی سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ [illegible] نے اپنا ہاتھ بڑھانے میں بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا تھا' ساتھ ہی مَیں نے چٹکی بھی ڈال دی اور یہ [illegible] کرتے ہوئے مجھے اپنے پیروں کے پنجوں پہ اُٹھنا پڑا۔ اسی دوران میں نے ان کے کان میں آہستہ [illegible]

''آپ نے میرا خواب ابھی پورا نہیں سُنا' مہربانی فرما کر باقی حصّہ بھی سُن ......''

وہ تو شاید غبارے کے مانند گردن تک بھرے ہوئے تھے۔ میری اس خواب والی سوئی کے ٹکنے کی دیر تھی کہ مجھے وہ کچھ سننا پڑا جسے کم از کم لکھا نہیں جا سکتا' اگر کسی طرح لکھ بھی دیا جائے تو طبع نہیں ہو سکتا اور اگر چُھپ چُھپا کر چھپ بھی جائے تو پڑھا نہیں جا سکتا۔ خدا کا صد شکر کہ ہم بالکل آخری ہاتھ ملانے والے تھے' میں نے یہ آخری والا اہتمام اسی خدشے کے پیشِ نظر کیا تھا۔ مسجد سے باہر نکلتے نکلتے میں نے پیر صاحب کو دعوت دے ہی ڈالی کہ پرسوں جمعرات کے روز بمقام ٹیلا چوہدریاں پہ مائی کستوری کا عرس منایا جا رہا ہے۔ اس مبارک موقع پر حضرت سلیمانؑ کے تخت کا ایک حصّہ اور خدا کی قدرت کا زندہ ثبوت پاکیزہ بکری' جس پر ''لا الٰہ الا اللہ'' لکھا ہوا ہے' زیارت کروائی جائے گی۔ جادوئی کھیل تماشے' کبڈی کتوں اور مرغوں کی لڑائیاں مقابلے' ملنگ مستانوں کی منڈلی کا خاطر خواہ انتظام ہوگا۔ تین روزہ میلے کا افتتاح پیر صاحب خطیب جامع مسجد اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں گے' پھر ہم منہ اُٹھائے ہوئے بھاگے تو گھر پہنچ کر ہی دَم لیا مگر وہاں تو دَم قبض کرنے والا ایک جنّ ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تھے سلیمان کے چھ فٹ دو انچ کے والد محترم' ایک ڈانگ ہاتھ میں اور ایک سوٹا بردار کاما ساتھ—

''وعلیکم السلام' [illegible] ......! ہم [illegible] ہوئے ان کے اس رویے کو کوئی معنی پہنانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ پھر قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولے۔

''فوراً سے پہلے دادا کے حضور پیش ہو جاؤ۔ اسی میں تمہاری خیر ہے' بچو ......!''

ہم سر جھکائے اپنے اعمال اور ماضی قریب میں سرزد ہونے والی کسی کوتاہی و حرکت کو تلاش کرنے لگے جس کی پاداش میں ہمیں اس طرح دادا حضور کے باڑے کی جانب بزور ڈانگ ہانکا جا رہا ہے۔ شکر ہے کہ رات کا وقت تھا' گلیاں آمد و رفت سے خالی تھیں ورنہ بڑی سبکی ہوتی...... حویلی کے پاس پہنچے تو صدر دروازہ چوپٹ کُھلا ہوا تھا۔ صحن کے پار برآمدے کے ستون سے بندھا ہوا بڑا سا گیس ہنڈولا جل رہا تھا جس کی روشنی میں پورا صحن بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ دادا' اکبرِ اعظم ...... پشت پہ ہاتھ باندھے بڑے جاہ و جلال اور اکبری تمکنت و تمکین کی تصویر بنے' اپنے ایوانِ خاص میں' تخلیۂ خصوصی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ ایک کاموں کی صورت میں درجن سنگھ اور بیرم خان بھی قدم قائم' قلب اطاعت آمادہ' نگاہ رُوبرو' نفس نفس جسم بنے قربان ہونے کو تیار کھڑے ہیں۔ میں دہلیز پہ رُک گیا' دادا سامنے دُور دالان کے پاس گیس کے ہنڈولے کے سامنے کھڑے اور اُن کے سائے کا بھوت میرے پاؤں سے لپٹا ہوا تھا۔ اُنہیں ہمارے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی' وہیں کھڑے کھڑے ہمیں گھورتے ہوئے۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کا سایہ میرے

سے گزر کر دروازے سے باہر نکل گیا اب وہ میرے سر پہ کھڑے تھے۔ اس اندھیرے میں اُن کی شکل کی کیفیت کو دیکھنا تو میرے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ میری کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے گئے' سرفراز اور سلیمان بیچارے صدقے کے بیلوں کی طرح میرے ساتھ تھے۔ مجھے ایک خوبصورت پلنگ پہ بٹھایا' خود سامنے دوسرے پلنگ پہ بیٹھ گئے...... حُقہ طلب کر کے' مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''تم میری اجازت کے بغیر یہاں سے کیوں گئے......؟''

''جی آپ غصہ کی حالت میں حُقہ توڑ کر ''اپنے اندر'' کہیں چلے گئے۔ میں سمجھا کہ آپ ''باہر جانے'' والی بندوق لینے کمرے میں گئے ہیں اس لئے میں جان بچا کر بھاگ گیا......''

انہوں نے بڑی سی ''ہُوں'' کرتے ہوئے مجھے اس طرح گھورا جیسے کہہ رہے ہیں کہ اب تجھے کمرے میں نہیں جاؤں گا' تیرا کہیں گا دبا دوں گا۔

''ایک بات سچ سچ بتاؤ...... تم نے جو میرے تین سوالوں کے جواب دیئے ہیں' ان کے جواب کس طرح جانے......؟''

''دادا! گستاخی معاف' یہ بالکل وہی بات ہوئی کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ نے یہ تین سوال کیسے بنائے......''

دادا اب قدرے غضب میں بولے۔ ''تم ہر بات کا جواب اس طرح آگے بڑھ کر کیوں دیتے ہو۔ تمہیں اپنی عمر' قد وقامت اور مقام واوقات سے بڑھ کر بات نہیں کرنی چاہئے۔''

''دادا! ہر سوال پیچھے اور اس کا جواب آگے ہوتا ہے۔ دوسری بات رہی عمر' قد اور مقام کی' تو جہاں وزن ووقار' تو بات دلیل اور حقیقت پسندی کا ہوتا ہے۔ جہاں یہ تین چیزیں ہوں گی' وہیں وزن ہوگا۔ وزن بندے سے نہیں' بات سے ہوتا ہے۔ لمبی لمبی داڑھیوں والے جوتے پالش کر رہے ہوتے ہیں اور کم عمر جج کی کرسی پہ بیٹھا ہوتا ہے۔ بات ساری بات کی تاب کی ہوتی ہے اور تاب' بات کی ہمہ گیری سے ہوتی ہے۔ جب دونوں چیزیں مل جائیں تو پھر وزن بن جاتی ہیں۔ بات کو اُلٹا پڑھو تو تاب ہی بنتی ہے نا......!''

دادا پھر بڈھے شیر کی طرح دھاڑے اور سلیمان کے والد کو بلایا...... ذرا میں آپ کو بتا دوں کہ جوان اور بڈھے شیر کی دھاڑ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جوان شیر ہمیشہ سینے کے زور پہ دھاڑتا ہے جیسے اچھا اور پختہ پکا راگ گانے والے ہمیشہ بزور سینہ گاتے ہیں۔ گلے سے گانے والے رنگی اور ردی کہلاتے ہیں' جیسے غلام علی خان بلمپت گاتے ہوئے اکثر ایسی ہی دھاڑ لگاتے تھے مگر بڑھاپے میں پہنچ کر انہوں نے

یہ چلن چھوڑ دیا تھا۔ بڑے فنکار تھے' بُڈھے شیر کی دھاڑ سے نفریں تھے۔ بُڈھے شیر کی دھاڑ' دھاڑ نہیں ہوتی' لُڑہار ہوتی ہے جو سینے کی بجائے پچھلی ٹانگوں سے شروع ہو کر پورے جسم کو لرزاتی ہوئی کمزور سینے سے بمشکل گزر کر حلقوم سے باانداز کراہ خارج ہوتی ہے۔ جنگل کے باسی یعنی کہ کمین گیدڑ' لگڑ بھگے' جنگلی کھوتے' جنگلی کُتے' اُود بلاؤ' لومڑ' باگڑ بلّے تک یہ نام نہاد "دھاڑ" سُن کر ہنس دیتے ہیں اور "پاگل ای اوئے" کہہ کر حال مست رہتے ہیں۔

دادا نے سلیمان کے والد کو اپنی بندوق لانے کا حکم دیا...... حُکمِ حاکم مرگِ مفاجات' اُن کا حُکم کون ٹالے؟...... وہ لرزتے قدموں سے بندوق لانے چلے گئے' اِدھر سلیمان اور سرفراز دادا کے قدموں سے لپٹ گئے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"دادا! خودکشی کرنا بزدلی اور احکام خداوندی کے خلاف ہے' یہ حرام موت ہے......"

"میں خودکشی نہیں تمہیں گولی ماروں گا۔" دادا نے 'مٹھیاں بھینچ کر لفظ گولی پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"دادا جی! میرے کہنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ مجھے گولی ماریں گے۔ میں بظاہر مر کر زندہ ہو جاؤں گا کیونکہ میں شہادت کی موت مروں گا۔ آپ بظاہر زندہ رہ کر اصل میں ہر روز مریں گے اور ہر روز جئیں گے...... دیکھیے نا! آپ نے اسی صحن اور اسی جگہ جہاں میں موجود ہوں' اپنے پوتے محبوب عالم کو غلط فیصلے کی گولی سے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ تو خوش قسمت تھا کہ امر ہو گیا اور آپ ہر روز مرتے ہیں اور ہر روز جیتے ہیں' محبوب عالم نے آپ کی رُوح پہ اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں...... میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟ بقول آپ کے ان تین سوالوں کا وہ جواب جو آپ کے ذہن میں ہے' کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ آپ کسی سے ہارنا نہیں جانتے' آپ کو ہار سے نفرت ہے۔ ایک ڈیڑھ انچ کا بچہ ڈیڑھ منزل اُونچے پُرانے تجربہ کار عمر رسیدہ بندے کو ایسے جواب دے جو اُس نے کبھی زندگی میں سُنے نہ ہوں اور نہ ہی کبھی سُننے کی توقع ہو تو اس انسان کا اس بچّے کو گولی مار دینا واقعی بنتا ہے۔"

اتنے میں سلیمان کے والد بندوق لے کر آ گئے۔ دادا نے بندوق پکڑ لی اور میری طرف اس کا رُخ کر کے کاندھے پہ لگا لی' نشست باندھنے لگے تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دادا جانی' بندوق میں چلا ہوا کارتوس پڑا ہوا ہے' اندر سے آٹھ نمبر کا نیا کارتوس منگوا لیں......"

دادا نے کارتوس چیک کیا' وہ واقعی استعمال شدہ کارتوس کا خول تھا...... میں نے آگے بڑھ کر بندوق لے لی۔

"دادا! آپ تشریف رکھیں اور وعدے کے مطابق میرا انعام دیں......"

دادا نے مجھے گھسیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ اپنے کامے کو کہا کہ ساتھ والے گھر میں عطا اللہ پٹواری ہے اسے بلا لاؤ۔ دو منٹ میں پٹواری پہنچ گیا۔ دادا نے اُسے حکم دیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں دو گھنٹے پہلے کہا تھا وہ بیان کرو۔ پٹواری نے اپنے بستے سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

"بڑے چوہدری صاحب نے دو کِلّے زمین سیالکوٹ والے خان کو بطور انعام دی ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جملہ اراضی دیگر کے جس حصے سے چاہیں' یہ زمین لے سکتے ہیں......"

اب دادا بولے۔ "برخوردار! یہ سب بندوق وندوق ڈرامہ تھا۔ میں نے جیسا سُنا تھا' ویسے ہی تمہیں پایا۔ میں نے سلیمان کے والد سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر اس بچے نے میرے سوالوں کا ویسا ہی جواب دیا جو میرے ذہن میں ہے تو اسے ایسا انعام دیا جائے گا کہ وہ کیا' سب ہی یاد رکھیں گے...... اب میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تم دو چیزیں جو چاہو مجھ سے مانگ لو......"

"دادا! شکریہ۔ میں نے آپ کی دی زمین قبول کی مگر مجھے صرف اور صرف ٹیلا چاہئے......"

"ٹیلا......؟" دادا چونکے۔ "اس منحوس' بنجر اور بے ڈھنگے ٹیلے کو لے کر کیا کرو گے۔ اس پہ تو سانپ اور کرلے وغیرہ دوڑتے پھرتے ہیں اور پھر ٹیلا تو ہم اس کا ظف کو دے چکے ہیں جس کا مجبوب تھا......"

"دادا! مجھے صرف یہی ٹیلا چاہئے...... باقی رہیں وہ دو چیزیں تو دادا! ایک دفعہ پھر آپ وعدہ کریں کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔" میں نے دادا کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں بیٹا! کھلے دل سے مانگو' انشاءاللہ ضرور ملے گا......"

"دادا! سب سے پہلے آپ اپنے پوتے محبوب عالم مرحوم کو صدقِ دل سے معاف کر دیں اور اپنا فیصلہ واپس لے لیں جس میں آپ نے اُسے اپنی جائیداد' خاندان اور اپنے نام سے بے دخل کر دیا تھا اور دوسری چیز اپنی وہ اراضی جو ٹیلے کی دوسری جانب بے آباد اور منحوس آسیب زدہ قرار دے کر بیکار کر دی ہے اس کے ایک چوتھائی حصے پہ سکول یا کوئی ہسپتال تعمیر کروا کر اسے محبوب عالم کے نام وقف کر دیں اور باقی ماندہ زمین پہ خود اپنی کاشت کریں۔ پھر قدرت کا تماشا دیکھیں......"

دادا میرے مُنہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زبان گنگ' آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ سرفراز' سلیمان اور اس کے والد' کامے' سوائے میرے سب ہی زار و قطار رو رہے تھے...... اس کے آدھ گھنٹے بعد جب میں وہاں سے نکلنے لگا تو میں نے دادا کا مُنہ چومتے ہوئے کہا۔

"بس' ایک چھوٹی سی خواہش اور ہے۔ پرسوں جمعرات کو ہم محبوب اور کستوری کا ٹیلے پہ عُرس کر

رہے ہیں اور ساتھ ہی آپ کی زمین پر میلہ بھی ہوگا۔ آپ ان دو دنوں میں سب انتظام کروادیں۔ میلے کے سب لوازمات ہونے چاہئیں۔ کبڈی' کھیل تماشے' مقابلے وغیرہ وغیرہ......''

تین روزہ اس میلے کی تمام تفصیلات بتا کر میں نے ایک اور درخواست بھی داغ دی کہ نئے پیر عُرس کی تقریبات کے افتتاح کے لئے اپنے بڑے پیر صاحب کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس سے پہلے اُنہیں' ان کی شمولیت کا نہ بتایا جائے اور ہر قیمت پہ اُنہیں وہاں لایا جائے...... جسمانی اور ذہنی طور پہ تھکے ہارے گھر آئے تو گاؤں کا میراثی اور للیانی والا اس کا سانڈو بھرو پیا اور غلام رسول فوجی' ایک اور آدمی کے ساتھ بڑی شدت سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اُنہوں نے خواج خضر ڈیرے کی پوری رپورٹ دی' تفصیل سے ایک ایک بات بتائی۔ للیانی والے بھروپئے نے کہا۔

''اللہ جوڑیاں سلامت' خان صاحب! وہ فراڈیا تو [illegible] باپ ہے۔ میں اُس کو بڈوں سے جانتا ہوں۔ وہ ڈالو والی کا چنگڑ سلامتا ہے' اشتہاری مجرم اور منشیات فروش ہے کوئی تین چار برس پہلے اس نے اپنی سالی کو قتل کر دیا تھا' اس کے بعد سے یہ مفرور ہے۔ اس کے دو بچے اور ایک پھوہڑ سی بیوی اپنے گاؤں میں [illegible] کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی قتل ہونے والی سالی بڑی خوش شکل اور طرح دار تھی' یہ اپنی بیوی کو [illegible] ایک رات [illegible] اپنی سالی کو کسی اور کے ساتھ ایسی ویسی حالت میں دیکھ لیا تو اسی وقت اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا' اس کے بعد سے یہ مفرور ہے۔''

''تم اسے کیسے جانتے ہو' اور خاص طور پر یہ تمام باتیں اتنی تفصیل کے ساتھ......؟''

''سرکار' مولا خوش رکھے...... یہ ضلع سیالکوٹ تو اپنی جو ہے ناں' اک پنڈ' اک اک قصبہ دیکھا بھالا ہے۔ یہ بھانڈ' میراثی' چنگڑ' نیاریئے' وان کٹ' چوہڑے' بروے کوبے' ملنگے' سانسی' یہ ساری قومیں قریب قریب چھوٹی موٹی جرائم پیشہ ہوتی ہیں' پولیس ضلع کچہری کے مخبر بھی یہی ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی کرتوتوں سے خوب واقف ہوتے ہیں بلکہ ضلعے میں کہیں بھی کوئی واردات ہو جاتی ہے تو فٹ دوسروں کو علم ہو جاتا ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہے اور جب پولیس کسی کیس میں ناکام ہو جاتی ہے تو آخری حربے کے طور پہ ان ہی لوگوں کو پکڑ کر اندر کر دیتی ہے۔ مال' انعام یا کسی بھی ذرائع سے وہ ان سے اپنے کام کی بات اُگلوا لیتی ہے...... میں اس کے باپ شادے چنگڑ سے چھتروں کا کاروبار بھی کرتا رہا ہوں۔''

''اچھا' یہ بتاؤ کہ جب تم ڈیرے پہ گئے تو اس نے تم لوگوں کو دیکھا۔ کہیں تمہیں پہچانا تو نہیں......؟''

''مولا تہاڈی خیر کرے...... ایک تو معمولی سا اندھیرا تھا' دوجے وہ نشے میں ٹُن' آنکھیں

تے ہوئے تھا...... باقی' سرکار! مَیں بہروپیا ہوں۔ توے کی کالک' مٹی اور چند منٹوں کی تنہائی دے اس غلام کو آپ بھی پہچان جائیں تو سو جُوتا آپ کا اور ایک میرا سر...... مُوتیا والیو! ہم تو اپنی بیویں بچوں کو بھی چکمہ دے جاتے ہیں۔ اپنے ہی گاؤں علاقے میں افسر بن کر آتے ہیں اور مال ہو جاتے ہیں بلکہ تھانوں میں اچانک پہنچ کر تھرتھلی مچا دیتے ہیں۔ کھاپی خدمت کروا' رعب جما اصلیت ظاہر کرتے ہوئے پاؤں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جوتے گالیاں کھا کر واپس آ جاتے ہیں۔ کچھ بھی بن جائے' کچھ بھی کر لے' اس کی سلامتی اپنا آپ ظاہر کر دینے میں ہوتی ہے۔ اپنے اور پیشہ بتا کر وہ اپنی جان بچا لیتا ہے اور مال بناتا ہے۔ مَیں نے بھی وہاں جانے سے پہلے تبدیل کر لیا تھا۔ آپ بے فکر رہیں......''

مَیں نے اُسے اس گاؤں کے پیر صاحب کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائیں' اس سے اپنی کا بھی تفصیلی ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنا سارا پلان اُس کے کانوں سے نکال دیا کہ ہم نے کیا کیا کرنا ہم خواج خضر والے ڈیرے کے فراڈ کو اسی گاؤں کے پیر صاحب کے ہاتھوں ختم کروانا دین کے ان ذمہ دار لوگوں کا ہی فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو ایسے دھوکا بازوں سے [illegible] ہے اور ہم وقت' بڑے موثر انداز میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہم تو لونڈے مونڈے تھے' ہم بچوں کی جہالت کدے میں کون سنتا؟...... مَیں نے اُسے صبح کی نماز میں شامل ہو کر پیر کی زیارت کرنے کھیتوں والے ڈیرے بھجوا دیا۔

صبح صبح ہی کامے نے آ کر جگایا اور دادا میاں کا حکم سُنایا کہ سب بچے لوگ ناشتہ ادھر آ کر کریں۔ وہاں پہنچے تو ناشتے کا اہتمام دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ لسی' مکھن' باجرے کا ملیدہ' تر تراتے ہوئے سوڑوں کا اچار' بُھنے تیتر اور بٹیرے' رَوے کا حلوہ' گاجروں کا مربہ...... دادا بڑے خوشگوار موڈ میں کہنے لگے۔

''اِک زمانے کے بعد پُرسکون نیند سویا ہوں۔ رات ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ مجھے کبھی کوئی خواب یاد نہیں رہتا' رات خواب دیکھا' صبح آنکھ کھلتے ہی سب کچھ بھول گیا لیکن یہ خواب شاید زندگی کا پہلا خواب ہے جو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ حرف حرف اور منظر منظر مجھے یاد ہے۔ صبح صبح تمہیں اسی خواب کے سلسلے میں بلایا ہے کہ تمہیں بھی سُناؤں......''

''دادا! معاف کیجئے گا' میرا خیال ہے کہ خواب کی تعبیر کے معاملے میں اگر آپ مسجد والے پیر

صاحب سے رجوع کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا......"

"نہیں' یار! یہ اتنا نازک' نفیس اور خوبصورت خواب ہے کہ اسے مولانا جیسے تندو تلخ' کیم وشحیم اور عنصرِ فضولیت قسم کی شے کے سامنے رکھنا' خواب کا جھٹکا کروانے کے برابر ہے۔ مجھے یقین ہے' اس خواب کے متعلق تم مجھے بہتر طور پہ کچھ بتا سکو گے......"

"دادا جی! یہ خواب آپ کے لئے بڑا سعد اور مبارک ہے' آپ نے محبوب عالم اور کستوری کو معاف کر کے اِن کی ارواح کو خوش کر دیا ہے...... آپ کے سامنے چاندی کی طشتری میں پھول ہیں' کستوری کے نافے کی جھلی والی پوٹ جس کی سوکھی ہوئی آنت کی تانت آپ کی ٹانگوں سے اُلجھ جاتی ہے جسے کھینچتے کھینچتے آپ ایک اُونچے ٹیلے پہ پہنچ جاتے ہیں۔ جگنوؤں کی جگمگاہٹ' چاند کی کرنوں کا نور اور سے کی سحر انگیزی' خوش رنگ وخوش الحان بیلوں کی ترنم ریزی سے آپ بہت مسحور اور خوش ہوتے ہیں۔ اچانک ایک اوٹ سے ایک ہفت رنگ پرندہ' مثلِ مرغ زریں پھڑپھڑاتا ہوا آتا ہے اور آپ کے قدموں میں گر پڑتا ہے۔ جھک کر آپ دیکھتے ہیں تو زخمی خوبصورت پرندے کا چہرہ آپ کے پوتے محبوب عالم کے چہرے سا دکھائی دیتا ہے۔ آپ پریشان سے ہو کر اس پرندے کو گود میں بھر لیتے ہیں۔ پھر ایک اُڑتا ہوا طشت نمودار ہوتا ہے [illegible] تازہ پھول [illegible] خوبصورت سی باجری اور پان کے پتے پہ کستوری پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ پھر آپ......"

"بس بیٹا بس...... اب آگے جو کچھ ہوا' اُسے اپنے تک ہی محدود رکھو...... یہ خواب تو میں نے دیکھا' مگر سُنا تم رہے ہو جیسے تم نے بھی یہی دیکھا ہو......؟"

"آپ یوں ہی سمجھ لیں...... ویسے میں نے یہ خواب نہیں دیکھا۔ مجھے ابھی ابھی ایسا خیال ضرور آیا ہے جس کو میں نے مِن وعَن آپ کو سُنا دیا......"

دادا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "میرا خواب' تمہارا خیال...... ایک سے دونوں...... میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"دادا جی! خیال جب جم جاتا ہے' منجمد ہو جاتا ہے تو خواب بن جاتا ہے۔ ایسے ہی جیسے دودھ ملائی' مکھن اور شکر یخ بستہ کر دیئے جائیں تو آئس کریم بن جاتی ہے۔ تحت الشعور اپنا فالتو اُبال جب دن کو نکالتا ہے تو وہ خیالات کی صورت اختیار کر لیتا ہے' انسان سویا ہوا ہو تو یہی کچھ خواب میں بدل جاتا ہے بہر حال' اللہ آپ کو سلامت رکھے' آپ کے دل پہ جما ہو غبار اُتر گیا۔ جیسے لاکھوں پرندوں میں سیمیں مرغ ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ لاکھوں پرندوں کے رنگ' ان کی خوبصورتیاں' بانکپن' ان کی چہچہاہٹ' یہ سب

تخم اس ایک پرندے میں سما جاتا ہے تو اس طرح لاکھوں کروڑوں انسانوں میں کئی صدیوں کے بعد ایک عاشق صفت انسان پیدا ہوتا ہے۔ وہ عاشق صادق ہوتا ہے' اس میں کروڑوں انسانوں کی سچائیاں' اُن کا خلوص و ایثار' جذب و جذبات کی گہرائیاں' پیار و چاہت کی پنہائیاں' پتہ نہیں کیا کیا بسا رچا ہوتا ہے۔ محبوب عالم جیسا جوانِ رعنا تو صدیوں بعد کہیں دِکھائی دیتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جو بویا' وہ کاٹا بھی ضروری تو نہیں کہ یہ سب کچھ ہم سب کی سمجھ میں آ جائے' بعض خوش رنگ خوشبودار پھول پھل ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ تو دکھائی دیتے ہیں' نہ کسی کے کام آتے ہیں اور نہ کسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔

دادا! کوئی نہ کوئی کسی دُلہن کا نقاب اُلٹنے ضرور آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی دیوار گرانے ضرور آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی پردہ ہٹانے ضرور آتا ہے۔ اسی طرح کوئی دیا جلانے آتا ہے' کوئی بچھڑے ملانے آتا ہے' کوئی ٹوٹا ہوا دل جوڑنے آتا ہے اور کوئی کوئی بھید کھولنے آتا ہے...... دادا! کستوری اور محبوب کے تعلق کے پاس ایک پودا بویا گیا ہے۔ یہ پودا جب تناور درخت بنے گا تو بڑا گھنا سایہ' میٹھا پھل اور دیکھنے والے کو خوشنما منظر دے گا۔ آپ کم از کم اس کی آبیاری کا بندوبست تو کر سکتے ہیں......؟

دادا نے اپنے شلوکے سے ایک بھاری سی تھیلی نکالی اور کہا۔ ''بیٹا خالق! میں نے تمہارے عرس کے تمام انتظامات کر دیئے ہیں۔ گاؤں کے بوڑھے جوان بچے سب تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ تھیلی کی رقم حاضر ہے' جہاں چاہو خرچ کرو...... بڑے پیر صاحب کو عین وقت پہ پہنچا دیا جائے گا۔''

دادا نے اپنے کارندوں اور گماشتوں کے ذریعے بڑے شاندار انتظامات کروائے۔ دو روز کے اندر اندر ٹھٹھ کے اردگرد کی تمام زمینیں' کھیت کھلیان' میدان' جدھر دیکھو انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ مویشیوں کی منڈی' کھیل تماشے' دوکانیں' پکوان' مٹھائیاں' کھلونے...... میلے میدان تو لگتے ہی رہتے ہیں' لیکن اس میلے کی دو نمایاں خصوصیات تھیں۔ ایک تو مائی کستوری کا عُرس تھا جو پہلی بار شروع ہوا تھا۔ دوسرے حضرت سلیمان کا اُڑن تخت اور مقدس کلمے والی بکری کی زیارت تھی۔ دیہاتی لوگ بڑے سیدھے سادھے ہوتے ہیں' اکثریت کم علموں اور شریفوں کی ہوتی ہے۔ کوئی بھی دھوکے باز دین و دُنیا' کسی بھی معاملے میں انہیں آسانی سے اپنے شیشے میں اُتار سکتا ہے۔ یہ بھولے بھالے معصوم لوگ خاص طور پہ دین کے معاملے میں اکثر و بیشتر بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ توہمات' پیری فقیری' تعویذ گنڈے' جادو ٹونے اور دیگر واہیات چیزیں ان پہ بڑی اثر انداز ہوتی ہیں۔ خواج خضر کی کشتی اور مقدس بکری کا فراڈ اس کی ایک زندہ مثال تھی۔ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص جو دین کے بارے میں معمولی سی شُد بُد بھی رکھتا ہو' اس فراڈ کی حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے مگر اس کے باوجود یہ لوگ' یہ پیر' یہ مولوی۔ اس گاؤں اور گرد و پیش کے لوگ اس

فراڈ کی حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے تھے۔ کوئی بھی تو نہ تھا جو یہ کہتا کہ ان فراڈیوں کا پول کھول کر جوتے لگا کر ان کا مُنہ کالا کر کے گدھے پہ گھمایا جائے۔ یہ جو والا سارا ڈرامہ ان فراڈیوں کو ان ہی کی گھناؤنی کرتوتوں کے پہاڑ تلے دفن کرنے کے لئے رچایا گیا تھا۔ ہم ان کے لئے ایسا ماحول تیار کر رہے تھے جو خود بخود ان کو ان کے منطقی انجام تک پہنچا دے۔

نوبت اور ڈھول مسلسل پیٹا جا رہا تھا۔ مسلسل دو دنوں سے آگ کا الاؤ روشن تھا۔ خالص کستوری عود عنبر اور صندل کا بُرادہ ایک خاص مقدار میں الاؤ پہ ڈالا جا رہا تھا۔ اِردگرد کوسوں دور تک کا ماحول ایک خاص سرمدی خوشبو سے مہکا ہوا...... ایسی مہک جو مشامِ جاں کو پاکیزگی اور رُوح و وجدان کو بالیدگی عطا کرتی ہو۔ تال تھاپ پہ دھمالیں ڈالنے والے ملنگوں اور دیہاتیوں نے مائی کستوری اور محبوب سائیں کے مزار پہ خوب دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ ساتھ ہی ذرا پرے ایک جھونپڑے میں صوفیوں کی ایک ٹولی ورد کر رہی تھی۔ مقدس بکری جس کے پیٹ پہ ''لا الہ الا اللہ'' لکھا ہوا صاف پڑھا جا سکتا تھا' ایک مخمل کی مسہری پہ لیٹی جگالی کر رہی تھی۔ بکری کے بستر کے ساتھ ہی حضرت سلیمانؑ کے اُڑن کھٹولے کے تختے کی زیارت تھی۔ عورتیں' مرد' بوڑھے' بچے قطار در قطار کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر اک کی زبان پہ سُبحان اللہ' سُبحان تیری قدرت کا وِرد جاری تھا۔ پیر قدرت اللہ شاہ' اپنی لمبی داڑھی' نورانی چہرہ اور سبز چولے میں ملبوس' زیارت کے قریب مجاورت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ باقاعدہ افتتاح بعد از نماز ظہر بڑے پیر صاحب کے ہاتھوں سرانجام پانا تھا اور اس کی ساتھ ہی بڑے میلے کا آغاز ہونا تھا جس کا اہتمام دادا جی کی زمینوں میں کیا گیا تھا۔

اِدھر دادا صاحب نے بڑے پیر صاحب کو اپنی حویلی طلب کیا ہوا تھا۔ یہ میلے اور عرس وغیرہ کا پروگرام اتنی عُجلت اور طوفانی انداز میں طے ہوا تھا کہ گاؤں والے بھی حیران و ششدر تھے کہ یہ تو چوہدریوں کی زمینوں پہ کیا ہو رہا ہے؟ ڈھنڈورچی کی زبانی جب زیارتوں اور محبوب سائیں کے عرس کا سنا تو ہر سننے والا سوچتا رہ گیا کہ اتنے برسوں بعد یہ عُرس کیسے یاد آ گیا؟ اور یہ زیارتیں کہاں سے دریافت ہو گئیں؟ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا کسی کے پاس بھی کوئی ٹھوس جواب نہیں تھا' ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے ان انہونیوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تجسس بھی اس میلے کی رونق دوبالا کرنے کا بڑا سبب بنا اور جب یہ پتہ چلا کہ یہ سب کچھ بڑے چوہدری خود کروا رہے ہیں تو ہر سوال خود بخود کہیں دفن سا ہو گیا کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں...... دادا صاحب نے پیر صاحب کو بڑے احترام و ادب سے بٹھایا ہوا تھا کھلا پلا کر ان کی خدمت میں عرض کی کہ جناب آپ آج محبوب سائیں اور مائی کستوری کے عُرس مبارک' زیارت مبارک

...کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے کر کے اہلِ علاقہ پہ احسان فرمائیں۔ پیر صاحب نے اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے مجھے عزت بخشی' اس کے لئے شکریہ...... میں یہ تو دریافت کرنے کی جسارت نہیں کرتا کہ یہ عرس اور میلہ کن وجوہ کی بناء پہ منعقد کئے جا رہے ہیں جبکہ ماضی قریب یا بعید میں یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا البتہ ایک مسئلہ پہ مجھے کچھ جاننے کا یقیناً حق ملتا ہے اور وہ مسئلہ ہے زیارتوں کا۔ میں ان نئی نئی دریافت ہونے والی زیارتوں کے متعلق کچھ آپ کی زبانِ مبارک سے جاننا چاہوں گا کہ یہ جو دریافت ہوئیں۔ یہ آدھے کلمے والی بکری' یہ حضرت سلیمانؑ کے اُڑن تخت کا تختہ' یہ سب کچھ کیا ہے..... معاف کرنے یہ چیزیں یہاں کدھر سے آ گئیں اور کیا ثبوت ہے کہ یہ سب مقدس چیزیں اصلی ہیں......"

دادا جی مسکرائے اور بولے۔ "حضرت صاحب! میں تو خود ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے پوتے کا ایک دوست سیالکوٹ سے آیا ہوا ہے' اسی نے یہ سب کچھ دریافت کیا ہے۔ میں نے آپ کے شریف لڑکے سے کہا بھی کہ برخوردار' پہلے جا کر حضرت صاحب سے بات کرو' انہیں مطمئن کرو' ان کی اجازت لو اور پھر یہ سب کچھ کرو...... لیکن میری بات کہاں سنی جاتی ہے' بس آپ کی اجازت سے بے ادبی کی نمائی ہو رہی ہے......"

پیر صاحب نے مجھے بے نُطق سُنانی شروع کر دیں۔" چوہدری صاحب! یہ لڑکا شیطان کا ایجنٹ ہے' میں کہتا ہوں کہ اس کا سیالکوٹی ہونا ہی کافی ہے......"

وہ کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔ "خدا جانے اُس نے ابلیس کے ہاتھوں کوئے کھائے ہوئے ہیں یا یہ بارہ باسی اُلوپ پڑھا ہوا ہے۔ مجھے خود اس نے دو روز ایسا دق کیا ہے کہ توبہ بھلی۔ آپ کس لپاڑئے کے چکر میں آ گئے۔ یقین فرمائیں' یہ بالشت کا چھوکرا آپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلنے سے باز نہیں آئے گا......"

دادا صاحب کو تو میں نے ساری پٹی پڑھائی ہوئی تھی' یعنی وہ بھی اس ڈرامے کے ایک اہم کریکٹر ایکٹر تھے۔ انہوں نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کرتے ہوئے پیر صاحب سے کہا۔

"حضرت! اب کیا کریں' اس سیالکوٹی' چکر باز نے تو مجھے بھی چکرا کر رکھ دیا ہے...... بہرحال' آپ یوں کریں کہ آپ بالکل علیحدہ رہیں۔ میں اس رنگ باز کو خود ہی ٹھیک کرتا ہوں' میں آپ کی عزت پہ حرف نہیں آنے دوں گا......" دادا نے دراصل اسے نفسیاتی طور پہ مزید اُکسایا تھا کہ وہ خود ہی آگے بڑھتے۔

''چوہدری صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ تو اب دین کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ایسے دھوکہ باز جو دین اور اپنے اسلاف کے تقدس کو اپنے مذموم مقاصد کی خاطر پامال کرتے ہیں' ان کی سرکوبی کے لیے پیران عظام اور آئمہ کرام پوری تندہی سے متحد ہیں۔ اس حیثیت سے میرا اہم فرض ہے کہ میں خود آگے بڑھ کر اس شر کی سرکوبی کروں البتہ آپ کی معاونت بھی قابلِ صد ستائش ہوگی ......'' وہ اپنا بھاری ساجسم اُٹھاتے ہوئے داوا سے کہنے لگے۔ ''اُٹھیے' بسم اللہ ...... نیک کام میں دیر مت کریں......''

● پیرِ بے پیر آف للیانی شریف......!

ایک بڑے سے جلوس کے ساتھ پیر صاحب اور داوا بھی جلوس میں پہنچے' نعروں اور اللہ اکبر کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ پھولوں ہاروں سے لدے پھندے' گاؤں کے دیگر معززین کے جلو میں وہ سب محبوب سائیں کے مزار پہ آئے' بڑی رقت سے فاتحہ پڑھی' دُعا مانگی۔ پھر ڈھول پہ تھاپ پڑتے ہی عرس اور میلے کا افتتاح ہوگیا۔

اس [illegible] بڑے [illegible] روحانیت [illegible] کی جانب آیا جہاں ہمارا للیانی والا بہروپیا ایک بہت بڑے بزرگ کے بھیس میں بیٹھا ہوا تھا' دیگر چمچے بھی پاس ملنگوں کے بھیس میں فروکش تھے۔ ہمارے بہروپیے نے اُٹھ کر پیر صاحب کے گلے میں ہار ڈالنے چاہے تو پیر صاحب نے بڑی رعونت سے اُسے اس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ایک نظر بھنگ پلا کر مدہوش کی ہوئی بکری اور اس پہ لٹکے ہوئے کلمے کو دیکھا' پھر پاس ہی گڑھے ہوئے مل کے پُرانے ٹکڑے کو دیکھا جس کو حضرت سلیمانؑ کے اُڑن تخت کے ایک ٹکڑے کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ اب پیر صاحب نے بہروپیے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا اسم شریف' آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور یہ سب کچھ کیا ہے؟''

وہ تو ایک زمانے کا خرانٹ بہروپیا تھا اور پھر میرا ٹرینڈ کیا ہوا' اس نے کمال تحمل اور بُردباری سے ہاتھ باندھے اور تلاوت شروع کر دی۔ اب پیر صاحب کی کیا مجال کہ وہ بیچ میں بولیں یا ٹوکیں۔ بھی اللہ کا بندہ ایسی صاف بے عیب قرأت کر رہا تھا کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ قرأت کے بعد اُس نے وعظ شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کو حق کا ساتھ دینے اور باطل کو برباد کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اپنے دین' بزرگوں' پیروں' مولویوں کی خدمت اطاعت کے فوائد گنوا رہا تھا۔

ایک آدھ مرتبہ پیر صاحب نے اُسے پٹڑی پہ لانے کی کوشش کی مگر ہم سب انہیں خوب تپانے پہ تُلے ہوئے تھے' کوئی اُن کی سُن ہی نہیں رہا تھا۔ بڑی دِقت سے پیر صاحب کو موقع مل ہی گیا۔ ہمارے "پیر آف للیانی پور" کو اچانک کھانسی اُٹھی' اِسی دوران پیر صاحب نے انہیں دبوچ لیا۔

"ہاں جی' حضرت! پہلے تو آپ اپنا تعارف کروائیں اور پھر یہ بتائیں کہ یہ زیارتوں کا کیا سلسلہ ہے۔ اچانک یہ سب کچھ کہاں سے دریافت ہو گیا ہے اور آپ کے پاس ان چیزوں کی اصلیت کی کیا سند ہے؟...... ویسے آپ کو خبردار رہنا چاہئے کہ دین' شریعت اور اپنے اکابرین اور اُن سے متعلقہ کسی بھی روایت کو عوام تک لانے سے پہلے بڑی تحقیق' احتیاط اور سند و ثبوت کی ضرورت پیش آتی ہے اب آپ کے پاس ان چیزوں کے اصلی ہونے کی کیا تاویل اور سند ہے......؟"

پیر آف للیانی صاحب نے کمال جرأت و تمکنت سے جواب دیا۔

"مجھے مسلسل خوابوں میں بشارت ہوئی ہے جبکہ یہ مقدس بکری خود چل کر میرے پاس آئی اور انسانوں کی مانند زبان کھول کر مجھے بتایا کہ میں اللہ کی قدرت کی نشانی ہوں' آدھا کلمہ میری کھال پر اور آدھا کلمہ میری بہن کی کھال پہ تحریر ہے۔ مجھے میری بہن کے پاس لے جا کر کلمے کو مکمل کر دو...... اس حضرت سلیمانؑ [illegible] کی نشانی [illegible] مجھے [illegible] ایک جن [illegible] نے مجھے [illegible] کر یہاں لا رکھا اور ان مقدس زیارات کی مجاوری میری پیرداری میں دی اور اس سے بڑی کیا تاویل اور ثبوت ہو سکتا ہے۔ بزرگ جن نے مجھے یہ بھی کہا ہے کہ جو کوئی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا وہ خود ہی برباد ہو جائے گا لہٰذا ہر کوئی آگاہ ہو' کوئی مجھے ضرر پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔"

پیر صاحب نے قہر آلود و نگاہوں سے "پیر آف للیانی" کو دیکھا اور واپس گھوم کر دادا جی سے مخاطب ہوئے۔

"ان دنوں ہر ایرے غیرے کو رُوحانی اور مقدس خوابوں کے تجربے ہونے لگے ہیں......" پھر انہوں نے سرسری سا میرا' اور میرے خواب کا ذکر بھی کیا اور فرمایا...... "دراصل بے کار اور شرارتی قسم کے انسانوں کے دماغ و اعصاب پہ شیطان مردود بڑی رغبت و آسانی سے قبضہ جما لیتا ہے' پھر مختلف قسم کے وسوسوں کے ذریعے انہیں بہکاتا رہتا ہے۔ وہ سیالکوٹ والا خان اور یہ شیطان ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میں آپ کو اس کا ثبوت بھی دیتا ہوں......" پیر صاحب "پیر آف للیانی" سے مخاطب ہوئے۔

"حضرت! کیا میں اس مقدس بکری کی زیارت سے مستفیض ہو سکتا ہوں......؟"

"ضرور' ضرور...... یہ مقدس بکری اسی لئے یہاں لائی گئی ہے کہ لوگ اس کی زیارت کریں......"

وہ بھنگ کے نشے میں ٹن بکری کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

پیر صاحب نے آدھے کلمے والے حصے کو بغور دیکھا' پھر دادا جی کے کان میں کچھ کہا۔ دادا جی نے ایک کاسے سے پانی کا پیالہ منگوایا' کاسے کا پرنا بھگو کر کھال پر رگڑا۔ بکری بلبلا اٹھی تو بکری کو مضبوطی سے پکڑ کر پھر کپڑا رگڑا۔ اب جو دیکھا تو بکری کے پیٹ پہ اصلی سیاہ دھبے داغ ہی رہ گئے' کلمے کا آدھا حصہ غائب ہو گیا...... "پیر آف للیانی" کے ہوش اُڑ گئے' وہ سیدھا دادا کے پاؤں پڑ گیا۔ دادا نے اُسے اُٹھا کر جو ایک ہاتھ گھمایا تو اُس کی مصنوعی داڑھی' مونچھیں' زلفیں' پگڑ سمیت پیر صاحب کے قدموں میں ڈھیر تھے۔ اب جو جوتے' تھپڑ' لاتیں' گھونسے چلے' اللہ ہی بھلی۔ "پیر آف للیانی" اپنے مخصوص حربے کو برتے ہوئے جان بوجھ کر بے ہوش ہو چکا تھا' دادا صاحب نے بمشکل اُس کی جان چھڑائی اور حکم دیا کہ سیالکوٹی شیطان کو بھی پکڑ لاؤ' لگے ہاتھوں اُس کی تو تو بھی ہو جائے...... ہم کون سا چھپے بیٹھے تھے' بھلا کسی ڈرامے کا ہدایتکار بھی غائب ہو سکتا ہے جبکہ اس کا کھیل سٹیج پر ہو رہا ہو؟ سین کی ڈیمانڈ کے مطابق چند لمحوں بعد ہمیں ڈنڈا ڈولی کر کے دو لڑکوں نے دادا اور پیر صاحب کے سامنے ڈال دیا...... پیر صاحب نے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"[illegible] بہت [illegible] ہیں۔ تمہارے ساتھی کو تو اس کے خواب کی اچھی طرح تعبیر مل چکی ہے اور اب تمہاری باری ہے......" پھر وہ دادا جان کی جانب مخاطب ہوئے۔ "چوہدری صاحب! اس مکار کو بھی کڑی سزا دیں تاکہ آئندہ کسی کو علماء حضرات سے گستاخی کرنے کی جرأت نہ ہو اور نہ ہی کسی کو مذہبی معاملات میں اس قسم کا فراڈ کرنے کا حوصلہ ہو......"

دادا بولے۔ "پیر صاحب! اس شدے نے چونکہ آپ کی بے ادبی کی تھی لہٰذا اسے آپ خود ہی سزا دیں۔"

پیر صاحب نے چند ثانیے سوچا' پھر بڑی تمکنت سے بولے۔

"ہاں جی' خان صاحب! آپ ذرا ہمیں حضرت سلیمانؑ کے تخت کا ٹوٹا ہوا وہ حصہ تو دکھائیں جو آپ کو خواب میں نظر آیا تھا......؟"

میں نے چند لمحے تذبذب' سراسیمگی کی اداکاری کی جیسے میں پیر صاحب کے ڈر اور خوف سے بے حال ہو رہا ہوں۔ پھر میں جیسے ہمت کر کے اُٹھا اور مقدس تخت کے ٹکڑے کے پاس پہنچا اور کانپتے ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگا کہ یہ ہے وہ مقدس ٹکڑا...... پیر صاحب استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ دادا جی کو لئے مقدس ٹکڑے کے پاس آ کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ دائیں بائیں' اوپر نیچے اسے خوب دیکھا۔ ہاتھ سے

پکڑ کر ہلانے جُلانے لگے پھر یک دم ایک بھرپور جھٹکے سے باہر کھینچا۔ تین چار فٹ پُرانے ہل کا ٹکڑا مکمل طور پہ باہر تو نہ نکلا لیکن اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔ پیر صاحب نے ایک دو مضبوط قسم کے جوانوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے دو منٹ میں ہلا جلا کر' باہر نکال کر دادا صاحب کے قدموں میں رکھ دیا...... پیر صاحب بولے۔

''لیجئے' حضرت سلیمانؑ کے اُڑن تخت کا مقدس ٹکڑا......!''

دادا جی نے میری جانب غُصّے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے......؟''

مَیں نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''یہ ہل کا ایک حِصّہ ہے......''

دادا نے دوسرا سوال کیا۔ ''یہ کس کی حرکت ہے' میرا مطلب ہے کہ اِسے یہاں کس نے گاڑا اور گاڑنے کا مقصد کیا تھا......؟''

مَیں نے اسی پہلے والے لہجے میں کہا۔

''اِس پُرانے سے ہل کے ٹکڑے کو مَیں نے یہاں گڑوایا اور اِس کا مقصد اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور ان بھولے بھالے لوگوں کی آنکھیں کھولنا تھا۔ اِس بکری کے سیاہ دھبّوں کو بھی ہم نے ہی سُرمے اور تیل سے کلمے کے الفاظ میں بدلا تھا' ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بھی لوگوں کے ایمان و یقین کی حفاظت کرنا تھا۔''

پیر صاحب جیسے اُبل پڑے۔ ''دیکھی آپ نے اِس شیطان کی چرب زبانی اور بے خوفی' ہے اسے خدا کا خوف اور آپ کا ڈر؟...... کس دھڑلے سے آپ کے مُنہ پہ اقبالِ جرم اور اپنی جعلسازیوں کی وکالت بھی کر رہا ہے......''

دادا جان' پیر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولے۔

''آپ بالکل دُرست فرماتے ہیں۔ مجھے ذرا اِس سے معلوم تو کر لینے دیں کہ اصل میں یہ حرامزادے چاہتے کیا تھے...... ہاں جی' خان صاحب! آپ زحمت کر کے یہ بتائیں کہ اس سب ڈرامے کا اصل مقصد کیا تھا......؟''

''دادا حضور! مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا مقصد اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا ہے اور زیادہ سے زیادہ رُوحانی فیوض و برکات سے انہیں نوازنا ہے' بس......''

اب پیر صاحب نے میری گردن ناپی۔

''اے شیطان! اِس جعلسازی' دھوکہ دہی اور کذب و کراہت میں اللہ کی مخلوق کو فیض پہنچانے اور اس کی خدمت کرنے کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟''

''دیکھئے' پیر صاحب! اگر آپ کسی کو کلمہ پڑھاتے یا سکھاتے ہیں تو اُسے کس طرح پڑھاتے سکھاتے ہیں؟''

پیر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ مجھے چوہے کی طرح دبوچ کر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''گستاخ! تو مجھ سے دین کے مسئلے پہ سوال و جواب کرے گا۔ میرے بس میں ہو تو میں تجھے اُلٹا لٹکا دوں......''

''ٹھیک ہے......'' میں نے دادا جان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ اگر میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے' اور یک طرفہ کوئی فیصلہ دینا چاہتے ہیں تو مجھ سے کوئی سوال و جواب نہ کریں' اپنا فیصلہ سُنا دیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دوسری پارٹی ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی اپنی صفائی میں بولنے کا کوئی حق حاصل ہے تو پھر تحمل صبر سے میری بات سُنیں اور پیر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجھ پہ کوئی فردِ جرم عائد ہونے سے پہلے اُنہوں نے مجھ پہ جو حملہ کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ مذمت' غیر اخلاقی و غیر قانونی حرکت ہے......''

پیر صاحب کی غیض و غضب کی حالت دیدنی تھی' وہ کسی وحشی درندے کی طرح غرا غرا کر مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ دادا جان نے پیر صاحب کو ٹھنڈا کیا اور کہا۔

''یہ گستاخ اور بے ادب ہے۔ اس نے یہ سب کچھ جو کیا ہے' وہ دھوکہ دہی کی ذیل میں آتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے اپنی صفائی میں بولنے کا پورا پورا حق ہے......'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''تم نے جو بھی کہنا ہے' مختصر اور بغیر کسی ابہام کے بیان کرو......''

● آدھا کلمہ' صبغت اللہ نہ سلے......!

''میں پیر صاحب سے بصد ادب و احترام پوچھتا ہوں کہ وہ کسی کو جب کلمہ سکھاتے یا پڑھاتے ہیں تو وہ پورا ہوتا ہے یا آدھا اور پھر اس کلمے کی ترتیب کیا ہوتی ہے......؟''

پیر صاحب نے مجھے کچا کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'اس سوال کا جواب ہر کوئی جانتا ہے' مجھے بتانے کی ضرورت نہیں......''

''ضرورت ہے' دادا جان! میں درخواست کروں گا کہ پیر صاحب مہمل جواب دینے سے پرہیز فرمائیں اور صاف صاف جواب دیں......؟''

میں نے دادا کے وسیلے سے پیر صاحب سے بات کی۔ دادا جان نے فوراً ایکشن لے کر فرمایا۔

"مولانا! قانون قاعدے کی رُو سے دونوں فریق برابر ہیں۔ جب تک کسی ایک فریق پہ فردِ جرم عائد نہیں ہو جاتی' وہ ایک دوسرے پہ بھرپور جرح کر سکتے ہیں لہٰذا آپ اپنی حیثیت کا احساس و خیال رکھتے ہوئے کسی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت و فعل سے اجتناب کریں اور جو کچھ پوچھا جا رہا ہے' اس کا جواب عطا فرمائیں......؟"

پیر صاحب نے طوعاً کرہاً جواب دیا کہ کلمہ پاک پورا لکھنا اور پڑھنا چاہئے اور یہی اس کی حقیقی و صحیح ترتیب ہے۔

"بالکل دُرست...... یہاں ایک مقدس بکری عرصہ سال ڈیڑھ سال سے صرف "محمد رسول اللہ" لکھے ہوئے پڑی ہے جبکہ یہ کلمے کی اصلی اور صحیح ترتیب نہیں۔ "محمد رسول اللہ" پڑھنے سے پہلے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھنا ضروری ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس بدعت اور دھوکہ دہی کے خلاف کوئی اقدام اُٹھایا۔ اس بکری کو جا کر دیکھا' بھیگے ہوئے کپڑے سے بکری کے جسم کو رگڑا۔ اِس کے اصلی یا نقلی ہونے کے بارے میں کوئی تحقیق کی؟...... کیا ایک ذمہ دار عالمِ دین اور علاقے کی جامع مسجد کے خطیب و عالم ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ آپ اس فتنے اور شر کو جہاد سمجھ کر ختم کرتے اور اللہ کی بھولی بھالی مخلوق کے ایمان و مال کی حفاظت کرتے......؟"

دادا میاں نہ ہوتے تو پیر صاحب مجھے اپنی آتشیں غضب سے کبھی کا خاکستر کر چکے ہوتے...... بہرحال کچھ دیر خاموشی سے گزر گئے۔ آخر میں ہی بولا۔

"حضرت! جواب عطا فرمائیں...... جن شریف اور نیک لوگوں نے آپ کو منبرِ رسولؐ پہ کھڑا کیا ہوا ہے' جو آپ کی مالی خدمت کے علاوہ مکھن' لسی' دودھ' انڈے' اناج' پھل' ترکاریاں آپ کے حُجرے تک روزانہ پہنچاتے ہیں اور بقول آپ کے' اس خدمت کے بدلے انہیں جنّت میں دودھ' شرابِ طہورہ' حوریں اور محلات ملیں گے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا یا کبھی منبر پہ کھڑے ہو کر یہ کہا کہ لوگو! اللہ کے خوف سے ڈرو' کیوں اپنا ایمان اور یقین خراب کرتے ہو۔ یہ خواج خضر کی کشتی اور مقدس بکری سب کچھ جعلی ہے۔ آپ کے ایمان کو خراب اور جیبوں کو خالی کرانے کا مکروہ منصوبہ ہے؟...... میرا خیال ہے کہ آپ نے اس پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ پھنسانا ازروئے مصلحت مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ لوگ اشتہاری' قاتل اور جرائم پیشہ تھے۔ وہ کسی نہ کسی رنگ اور طریقے سے آپ کا حصّہ آپ تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ آیئے میں ذرا آپ کا موڈ بدلنے کے لئے ایک واقعہ سُناؤں۔

• جج، ججمانہ بے جج......!

آپ کی طرح ایک جج صاحب بڑے پکے نمازی، پرہیزگار اور رزقِ حلال پہ ایمان رکھنے والے تھے۔ دُور دُور تک اُن کی شرافت اور امانت کا شہرہ تھا۔ رشوت تو کجا، وہ کسی سے شکریہ تک وصول نہیں کرتے تھے۔ بڑی بڑی مقدمے باز پارٹیاں انہیں خریدنے یا رشوت دینے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھیں۔ اتفاق سے ایک ایسا مقدمہ ان کی عدالت میں آ پھنسا جس کی ایک پارٹی ہر قیمت پہ مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں چاہتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ یہ جج رشوت قبول نہیں کرتا، پھر بھی انہوں نے مختلف طریقوں سے اسے رشوت پہ لگانے کی کوششیں جاری رکھیں اور آخر وہ کامیاب ہو ہی گئے۔ پارٹی نے کسی نہ کسی طریقے سے جج صاحب کے بیت الخلاء تک رسائی حاصل کی اور جج صاحب کے لوٹے میں اچھی خاصی رقم باندھ کر رکھ دی۔ جج صاحب جب بیت الخلاء گئے تو لوٹا پانی کے بجائے دولت سے بھرا ہوا تھا۔ حیران پریشان کہ کیا کریں؟ رقم بھی اتنی کہ کئی تنخواہوں کے برابر۔ انسان کمزور ہے۔ سوچا، ہو سکتا ہے کہ میری غیب سے مدد ہوئی ہو۔ اللہ جانتا ہے میں رشوت نہیں لیتا۔ میرے فرض و واجبات میری آمدن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مکان بھی کرائے کا، لڑکی بھی بیاہنی ہے۔ ضمیر، ضروریات، بشری کمزوریوں، معاشی مجبوریوں کے درمیان اچھا خاصا دنگل شروع ہو گیا۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ آخر لوٹا جیت گیا۔ پھر مقدمے کے فیصلے تک ہر روز کچھ نہ کچھ لوٹا اُگلتا رہا، جج صاحب ''ہٰذا من فضلِ ربّی'' سمجھ کر لوٹا خالی کرتے رہے۔ آخر وہ دن آ گیا جب فیصلہ ہونا تھا۔ کچہری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، سب کو امید تھی کہ ایماندار جج انصاف کرے گا، لوٹے والی پارٹی مقدمہ ہارے گی کیونکہ یہ ظالم نادہند اور جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ہر شہادت، گواہی اور ثبوت اُن کے خلاف تھا۔ فیصلے کی گھڑی آئی، لوٹے والا کھڑا ہو گیا اور بولا، سرکار! میں غریب مظلوم بدکار، گندی موری کا کیڑا، آپ کے پاؤں کی جوتی اور آپ کے بیت الخلاء کا لوٹا ہوں...... ''لوٹے'' پہ زور تھا۔ جج کو لوٹے پہ زور کا جھٹکا سا لگا، ایک ایک کر کے پانچ دس رشوت سے بھرے ہوئے لوٹے نظروں کے سامنے گھومنے لگے، آنکھیں پتھرا گئیں، سر چکرا گیا، اُنگلیوں کو جنبش ہوئی اور فیصلہ لوٹے کے حق میں ہو گیا..... دادا جانی! انسان بڑا کمزور ہے، وہ حتی الوسع ایماندار اور پاک صاف رہنا چاہتا ہے مگر اس کی مجبوریاں، اس کی ضرورتیں، اس کا گردوپیش، اس کی اندر کا فطری طمع و لالچ اسے کہیں نہ کہیں چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔ اتنا پڑھا لکھا، باوقار عہدے پر متمکن جج جس کا عہدہ ہی عقل، ذہانت کی اعلیٰ قدروں کا داعی ہوتا ہے ایک شاطر و مکار، ہوشیار و عیار شخص کے بچھائے ہوئے ایک معمولی سے دام میں موٹے کی

بھینچ کر رہ گیا۔ اس کی شرافت' ایمانداری اور اکلِ حلال کھانے کمانے کی کوشش و خواہش' ساری کی ساری دھری رہ گئی...... اگر آپ کو تہجد کی نماز کے بعد مصلّے سمیٹتے وقت مصلّے کے نیچے سے ایک معقول سی رقم مل جائے تو آپ کیا کریں گے۔ غریبوں کو بانٹ دیں گے' مسجد کی مرمت پہ خرچ کریں گے' وہیں پڑی رہنے دیں گے یا اپنی جیبِ خاص میں "ہٰذا من فضلِ ربّی" جان کر ڈال لیں گے؟"

پیر صاحب کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا' ایک رنگ جا رہا تھا۔ زبان گنگ' رنگ فق۔ میری بات کی نوک نے ان کی پیری فقیری کے پھولے ہوئے غبارے کی ساری ہوا خارج کر دی تھی...... اب میرے مخاطب دادا تھے۔

"دادا! اگر کسی بکری پہ "محمد رسول اللہ" لکھا ہو سکتا ہے تو کسی اور بکری پہ "لا الٰہ الا اللہ" بھی تو ہو سکتا ہے۔ اگر خواج خضر کی کشتی کا کوئی حصہ اس گاؤں کی سرزمین پہ ظاہر ہو سکتا ہے تو حضرت سلیمانؑ کے تخت کا کوئی تختہ بھی تو ظاہر ہو سکتا ہے اور اگر کوئی اشتہاری مفرور قاتل اس گاؤں میں اس مقدس تختے کا محافظ و مجاور بن کر توجہ' مہربانی' عزت و دولت حاصل کر سکتا ہے تو اس گاؤں کے میراثی دادا کا بیٹا جو میانی کا پیر ہو سکتا ہے اور جس سے خواج خضر والے ڈیرے کی مقدس بکری حاصل کی گئی تھی' اس کو اس ڈیرے کا مجاور کیوں نہیں بنایا جا سکتا جبکہ تیے والی معزز مقدس بکری' خواج خضر والے ڈیرے کی بکری کی ہمشیرہ صاحبہ ہے۔ دونوں ڈیروں کی کہانی ایک ہے' کردار ایک سے ہیں مگر مقاصد الگ الگ ہیں۔ خواج خضر کے ڈیرے کے منظر سے آنکھیں بند کر لی گئیں ہیں مگر تیے کے منظر کو اُجاگر کر دیا گیا ہے۔ دادا جان! یہ کہاں کا انصاف ہے؟...... چلئے' پیر صاحب اور گاؤں والوں کو ساتھ لے لیں اور وہاں جا کر بکری کو پکڑیں' نہلائیں۔ دھوئیں رگڑیں۔ تیے والے ہل کی طرح وہاں بھی ایک رہٹ کی ہتھی دبی ہوئی ہے۔ اسے ہلائیں' کھینچیں' باہر نکالیں۔ وہاں کے مجاور کو پکڑیں' اُس کے ساتھیوں کو گرفت میں لیں اور پھر دیکھیں کہ وہاں سے کیا کچھ برآمد نہیں ہوتا...... اسلحہ' منشیات' اغواء شدہ عورتیں اور بہت کچھ جو آپ کو حیران و پریشان کر دینے کے لئے کافی ہوگا...... دادا جی! یہ سب کچھ ہم نے جان بوجھ کر کیا تا کہ اس ڈرامے کو رچا کر ہم آپ کی اور قبلہ پیر صاحب کی توجہ اس بڑے فراڈ کی جانب مبذول کروا سکیں...... اب میں چپ ہوں۔ جو کچھ کہنا تھا' کہہ دیا۔ اب فیصلہ آپ اور قبلہ پیر صاحب کے ہاتھوں میں ہے......"

"دادا جان نے پیر صاحب کی جانب دیکھا' پیر صاحب تاسف و تراحم کی تصویر بنے کھڑے تھے—— دادا جی نے ان سے پوچھا۔

"ہاں جی' مولانا! اس گستاخ اور بے ہودہ لڑکے کو اس کے اس جرم کی کیا سزا دی جائے......؟"

پیر صاحب بڑی دبی دبی آواز میں بولے۔ ''ناچیز کی رائے میں پہلے دریا پہ چل کر خواجہ خضر کے ڈیرے کی خبر لی جائے' پھر اس لڑکے کو بھی دیکھیں گے......''

دادا جی اور پیر صاحب آگے آگے اور پورا میلہ پیچھے پیچھے۔ کسی کے ہاتھ میں 'ڈانگ' کسی کے پاس سوٹا۔ کوئی ہاکی بردار اور کوئی کلہاڑی۔ جو کسی کے ہاتھ لگا' لے کر نعرے لگاتے ہوئے چل پڑے۔ کتوں کی ایک فوج ظفر موج آگے پیچھے' دائیں بائیں بھونکتی ہوئی ساتھ تھی...... کوئی گھنٹے بھر میں جب سارے وہاں پہ پہنچے تو ایک ان ہونی ان کی منتظر تھی۔ سارے کا سارا ڈیرہ اُجڑا پڑا تھا۔ دادا جی نے تمام لوگوں کو ڈیرے سے باہر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ دادا' دو چار معززین اور پیر صاحب کے ہمراہ ڈیرے میں داخل ہوئے تو بساط اُلٹی ہوئی تھی اور جیسے ابھی ابھی تازہ تازہ کوئی بُونچا پھیر کر گیا ہو۔ پُرانی توشکیں' کپڑے' سامان' اناج کی بوریاں اور دیگر کھانے پینے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ تازہ تازہ ریت کھدی ہوئی تھی۔ لکڑی کی پیٹیاں اور شراب کی بوتلیں سگریٹ کے بکھرے ہوئے پیکٹ۔ ایک کونے سے بکری کی نحیف سی آواز اُبھری' وہ بیچاری شراب کی ایک ٹوٹی ہوئی بوتل سے شراب چاٹ رہی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی ہانپتا ہوا [illegible] دو عورتیں اور ایک بچہ بندھا ہوا ہے۔ ہم سب فوری طور پر اُدھر گئے۔ دیکھا کہ دو جوان عورتیں اور ایک معصوم بچہ' منہ پہ پٹیاں بندھی ہوئیں' ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے نیم بیہوشی کی حالت میں بندھے ہوئے تھے۔ دادا نے فوراً دو چار گھوڑوں والوں کو ان بدمعاشوں کی تلاش میں بھجوایا' واپس پھر اُجڑے ہوئے ڈیرے پہ پہنچے۔ لوگ بکری کو دھو رہے تھے۔ وہ بھی دُھلنے کے بعد صاف ستھری نکل آئی۔ ایک دو آدمیوں نے خواجہ خضر کی کشتی کو نکالا' واقعی وہ رہٹ پہ گھومنے والی لکڑی کا ٹکڑا نکلا۔ دادا کے حکم سے اِردگرد کی جگہ کو کدالوں سے کھودا گیا۔ شراب اور چوری کا مختلف سامان برآمد ہوا۔ اتنے میں گھڑسوار بھی واپس آ گئے اور اطلاع دی کہ وہ تو سارے اُسی وقت بھاگ کر دریا پار کر گئے تھے جب آپ نیچے پہ بکری کو رگڑ رہے تھے اور حضرت سلیمانؑ کے تخت کی لکڑی نکلوا رہے تھے۔

تین روز بعد عرس اور میلے کے اختتام پہ دادا نے گاؤں کے میراثی دادا اور اُس کے سائنڈ وچ آف للیانی کو یہ دونوں مقدس بکریاں برآمد ہونے والا بہت سا سامان' ایک جوڑی بیل اور کچھ نقد انعام دے کر رُخصت کیا۔ گاؤں کے چند نوجوانوں پہ مشتمل ایک میلہ اور عرس کمیٹی تشکیل دی جو ہر سال یہاں عرس اور میلے کے اہتمام کی ذمہ دار تھی۔ محبوب سائیں اور کستوری مائی کی مشترکہ قبر پہ کالے پتھر سے ایک بغیر چھت کے مزار کی تعمیر شروع کروا دی۔ قبر کے ساتھ خالی جگہ پہ چھوٹی سی مسجد اور دو کمرے بھی تعمیر

[illegible] ٹیوب ویل، کھیتوں کو آباد کرنے اور سکول ڈسپنسری کی تعمیر بھی منصوبے میں شامل تھی۔

• [illegible] سکہ نُسوئے ڈسکے......!

ڈرامے کا ڈراپ سین ہوتے ہی میں وہاں سے یوں بھاگا تھا جیسے کوئی چوری یا یاری کر کے [illegible] ہے۔ دادا تو دُور...... میں نے تو اپنے دوست سلیمان اور سرفراز کو بھی اپنے یوں نکلنے کی بھنک پڑنے [illegible] تھی میں جانتا تھا کہ انہوں نے مجھے ابھی جانے نہیں دینا۔ لیکن جو کچھ مجھ سے اچھا بُرا سرزد ہو چکا [illegible] اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں جتنی جلدی ہو سکے فوراً یہاں سے غائب ہو جاؤں۔ جبکہ پیر صاحب کو [illegible] گئی تھی کہ میں نے ٹوپی [illegible] کر کے انہیں خوب ذلیل کیا ہے' دادا اور گاؤں والوں کے سامنے [illegible] ان کی خوب بھد اُڑ چکی تھی...... مُلوانے' مصلّی' میراثی اور ادنیٰ ملازم اپنی تذلیل کبھی فراموش نہیں [illegible] کے ہی حساب چکا دیتے ہیں ظاہر تھا کہ اب پیر صاحب اور خواجہ خضر [illegible] بکری والوں [illegible] مصلّیوں کی نظر میں' میں ان کا دشمن نمبر ایک بن چکا تھا...... ان کے سارے [illegible] اور فراڈ کو [illegible] کر [illegible] صرف [illegible] اب وہ [illegible] بھی [illegible] نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ایسے [illegible] میں [illegible] میرا وہاں سے نکل لینا ہی بنتا تھا۔ آٹھ دس روز خوب شغل میلہ کر لیا تھا۔ کستوری' محبوب [illegible] یہ تینوں گرد [illegible] تو جیسے میرے ہڈ گوڈوں میں بیٹھ گئے تھے' میں ان سے دُور جا کر انہیں ذہن [illegible] سے جھٹک دینا چاہتا تھا' لہٰذا دوسرے دن علی الصبح میں چپکے سے [illegible] میں بیٹھ کر سمبڑیال چلا آیا' وہاں [illegible] سے بس پکڑی اور ڈسکہ ہسپتال سامنے پہنچ کر اُتر گیا...... یہاں میری سوتیلی بڑی آپا رہتی تھی اور بہنوئی [illegible] یہاں آنکھوں کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ ظاہر کہ ان کا یہاں اچھا اثر رسوخ تھا' کافی آسودگی [illegible] ...... سہولتوں والا کشادہ' سرکاری مکان...... نوکر چاکر' بھینس' مرغیاں' انڈے...... طرح طرح کے پھل [illegible] تربوزے گنے...... جو مریض یا دوست لاتے تھے...... میرے لئے تو ڈسکہ ایک محفوظ ٹھکانا اور [illegible] پوائنٹ تھا...... آپا نے پہنچتے ہی میری کلاس لی کہ میں امّی ابّا سے پوچھ کر آیا ہوں یا حسبِ عادت [illegible] حرکت کر کے بھاگا ہوں...... میں نے من و عن تمام واقعات اور اپنی کرتوتیں ان کے سامنے بیان کر [illegible] اور درخواست کی کہ سیالکوٹ کسی کو نہ بتایا جائے کہ میں یہاں ڈسکہ میں ہوں...... آپا چونکہ مجھے [illegible] طرح جانتی تھی اس لئے میرے حلفیہ بیان و کلام سے ان کی قطعی تسلی نہ ہوئی' صرف اتنا کہا...... اللہ [illegible] ہدایت دے اور تیری حفاظت کرے...... پتہ نہیں کیسے چَن چڑھا کے آیا ہوئیں گا۔ اب اگر یہاں گھر

سے باہر نکلے تو ٹانگیں توڑ دوں گی ...... دراصل مَیں نے ہلکی سی غلط بیانی کر کے اِن کے دل میں یہ وہم ڈال دیا تھا کہ چونکہ مَیں نے فراڈ کرنے والے گروہ کو طشت ازبام کیا ہے اِس لئے وہ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ مَیں سلیمان کے دادا سے جان چُھپاتا پھر رہا تھا۔ علاقے کا چوہدری' آدھے گاؤں کی زمینوں کا مالک' ستّر برس کا زمانہ دیدہ چشیدہ بوڑھا' پُرانا عربی فارسی خواں' دین ودُنیا اور تصوّف وتصرّف کو سمجھنے جاننے والا اگر ڈیڑھ بالشت کے چھوکرے کو اپنا بابا بنانے اور اُس کے قدموں میں اپنا سب کچھ رکھنے پہ مُصر ہو تو خدا لگتی کہیں کہ وہ بچہ ...... بھاگے گا نہیں تو اور کیا کرے گا ...... لیکن وہ بات کہ ''موئی ڈریا موت توں تے اَگے کھڑی موت ......''

دو اڑھائی روز تو مَیں بالکل باہر نہیں نکلا بلکہ آپا نے مجھے نکلنے ہی نہیں دیا' بڑا سخت پہرہ لگا دیا کہ اگر دروازہ اُلانگا تو گٹے توڑ دوں گی ...... مَیں بھی بڑی سعادت مندی سے سارا دن صحن میں دھریک کی چھاؤں تلے چارپائی ڈالے' کراچی کا رسالہ ''نقاد'' پڑھتا اور معمے حل کرتا رہتا' کھانا پینا اور نماز روزہ بھی وہیں کہ ہسپتال کی مسجد تک جانے کی پابندی تھی ...... تا کہے! کہیں عشق مُشک ...... موسموں اور درویشوں پہ بھی کہیں پابندی لگی ہے؟ تیسرے دن' ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت' سُرمے والا' پِچھا نمک اور مرچیں سے گھسا کر آ[illegible] آپا سے کہا [illegible] آنکھیں دُکھنے لگی ہیں اجازت ہو تو ہسپتال جا کر بھائی جان سے دارو ڈلوا لوں ...... آپا نے انکار کرتے ہوئے کہا ...... دارو گھر میں بھی موجود ہے تم لیٹو میں ڈال دیتی ہوں ...... ناچار لیٹ گیا ...... آپا نے پہلے بورک سے میری آنکھیں دھونا چاہیں تو مَیں نے واویلا شروع کر دیا کہ تکلیف ہو رہی ہے ...... پھر خود کہنے لگیں ...... اچھا تو اپنے بھائی جان کے پاس ہی جاؤ اور دارو ڈلوا کر فوراً واپس آؤ ...... بھائی جان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے آنکھیں دیکھیں اور کمپوڈر کو دارو ڈالنے کے لئے کہا ...... دارو ڈلوا مَیں سیدھا واپس آ گیا ...... آپا بڑی خوش ہوئیں اور چارپائی پہ لیٹ کر آرام کرنے کو کہا ...... دو چار بار ایسی شرافت دکھا کر' دراصل مَیں نے آپا کے اعتماد کو بحال کیا تھا ...... آنکھیں تو اسی روز ٹھیک ہو گئیں تھیں ...... بس ہم اب آزاد تھے' ہسپتال کے باغ' کینٹین' مریضوں کے وارڈز' مسجد اور باہر بازار تک آنا جانا لگ گیا ...... ہسپتال کا سارا عملہ' باہر بازار والے دوکاندار بسوں تانگوں والے سب مجھے جانتے تھے کہ ہم ڈاکٹر خان صاحب کے سالے ہیں۔ دُنیا ساری ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف والی بات تھی ...... ہسپتال میں جہاں جی چاہتا دندناتا پھرتا' کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اسی دوران سیالکوٹ گھر والوں اور چاچی کو بھی پتا چل گیا تھا کہ مَیں ڈسکہ پہنچ گیا ہوا ہوں۔ سکول سے چُھٹیاں تھیں ...... لمبی سی فرصتیں اور موجیں ...... اسی بے فکری اور موجا موجی میں پندرہ بیس روز بیت

گئے۔ ایک روز میں مریضوں کے وارڈ کے برآمدے سے گزر رہا تھا تو اچانک کھلی کھڑکی سے میری نظر بیڈ پہ لیٹے ہوئے ایک بوڑھے شیر پہ پڑی ...... یہ کچی آنکھ والے مریضوں کا وارڈ تھا...... یعنی وہ مریض جن کی آنکھ میں ایک دو روز دارو ڈال کر آپریشن کے لئے تیار کیا جاتا ہے...... ایک بیڈ پہ شکرگڑھ کا بوڑھا سا شیر چت لیٹا ہوا ہے اس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی تھی ...... پاس سرفراز سلیمان اور ان کے والد صاحب بیٹھے ہوئے تھے...... یا اللہ! جن سے جان بچا کر یہاں چھپا بیٹھا ہوں وہ یہاں بھی پہنچ گئے...... میرے تو پاؤں کانپنے لگے۔ منہ سر چھپا کر فوراً وہاں سے نکل آیا...... دوسرے روز صبح ہی صبح میں سیالکوٹ کے لئے بس پہ بیٹھ چکا تھا...... گھر والوں نے میرے پہنچتے ہی مجھے آڑے ہاتھوں لیا کہ میں شکرگڑھ سے سیالکوٹ کی بجائے ڈسکہ کیوں چلا گیا تھا...... میرے شکرگڑھ سے بھاگنے کے بعد دادا نے فوراً سیالکوٹ سرفراز اور سلیمان کو میرا پتا کرنے کے لئے بھیجا تھا اس طرح گھر والوں کو بھی فکر پڑ گئی تھی کہ میں کہیں غائب ہو گیا ہوں...... سب کو خدشہ تھا کہ کہیں خواج خضر والے بدمعاشوں نے مجھے اغواء نہ کر لیا ہو۔ جھوٹ سچ بول کر گھر والوں سے جان چھڑائی تو پھر چاچی نے بھی کلاس لی...... میری زبانی ساری کہانی سن کر بہت محظوظ ہوئی۔ ماتھا چوم کر کہنے لگی...... مجھے پتہ تھا کہ وہاں کا [illegible] کا ہی صاف [illegible]

● داتا کی نگری پھُلاں وانگوں بھری......!

داتا کی نگری کو ایک شرف یہ بھی حاصل ہے کہ اس کے تاریخی' عظیم الشان ریلوے سٹیشن کے ماتھے پہ نمایاں طور پہ کلمہ طیبہ کی مقدس مُہر ثبت ہے۔ اس عزتاں والے شہر کے اس کرماں والے ریلوے سٹیشن کو عین وسط سے ایک آہنی پُل عبور کرتا ہے جو زیادہ تر سٹیشن کی دوسرے جانب رہنے والوں کے آنے جانے کے کام آتا ہے۔ پُل پہ سے گزرتے ہوئے پورا ریلوے سٹیشن آپ کے پاؤں تلے ہوتا ہے۔ تمام پلیٹ فارم' آنے جانے والی گاڑیاں' اُترتے چڑھتے ہوئے مسافر' سُرخ قمیضوں والے قلی' ریڑھوں ٹھیلوں والے۔ اک عجیب سی افراتفری' نفسانفسی' بھاگم بھاگ کا عالم ہوتا ہے اور اس پُل سے گزرتے ہوئے آپ ان نظاروں سے بھی لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ انگریزوں کے وقتوں کا بنا ہوا یہ پُرانا خستہ حال آہنی پُل بڑا سخت جان' مضبوط اور کسی گپت درویش کی مانند اپنے آپ میں ڈوبا ہوا ہے۔ نیچے سے آگ' دھوئیں' سٹیم کی مار اور اوپر چوبیس گھنٹے جوتم پیزار۔ یہاں کوئی لمحہ یا وقت ایسا نہیں ہوتا جب یہ پُل کسی کے

بوجھ یا کسی کے جوتوں تلے دبا ہوا نہ ہو۔ آنے جانے والے تو آئے اور گزر گئے مگر ان کا کیا کیجئے جو پیدا بھی اسی پُل پہ ہوئے اور ان کے کفن دفن کا چندہ بھی اسی پُل پہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ فقیر' ملنگ' لولے لنگڑے اپاہج' اندھے' مجذوب' نیم پاگل' دوکاندار' تعویذ گنڈے والے' پھانسنے اور پھنسنے والے' یعنی ہر قبیل و قسم کے فنکار اور اُستر اکار' آپ کو اس پُل پہ دھرے ملیں گے۔

ایک زمانہ تھا کہ میں اکثر اس پُل پہ جا کھڑا ہوتا تھا۔ آتی جاتی گاڑیاں' مسافروں کا اژدحام' کالے کلوٹے دیوہیکل انجنوں کے وسل اور اِن کی چھک چھک' بھک بھک میری دلچسپی کا باعث ہوتی اور میں لوہے کی ریلنگ پہ ٹھوڑی ٹکائے پہروں محو نظارہ رہتا تھا۔ پھر جب جی بھر جاتا تو اپنی پنگا لینے والی بُری عادت سے مجبور ہو کر پُل کے مکینوں کو سونگھنے لگ جاتا' اُلٹ پلٹ حرکتیں کرتا۔ کبھی اس کو گھورا' کبھی اُس کو تاڑا۔ کسی چھابڑی والے سے خواہ مخواہ بھاؤ تاؤ' دو نمبر اندھوں کو کھوٹی چونی اَنٹی دے کر باقی ریزگاری مانگنا' جھوٹے کوڑھیوں اور جذامیوں کے مصنوعی زخموں کو کُھرچنا' طوطا فال اور نجومیوں سے اُلٹ پلٹ سوال کر کے انہیں تپانا' فراڈیے ملنگوں کو دِق کرنا' غرض ہر وہ اُلٹ کام کرنا جس کی کم سے کم اُجرت گالیاں اور بددعائیں ہوتیں اور زیادہ سے زیادہ سزا مجھے اُٹھا کر نیچے پٹڑیوں پہ پھینک دیا جانا ہو سکتی تھی لیکن اس کی نوبت کبھی اس لیے نہ آتی کہ میں بجلی کی مانند تڑپ کے نکل جانا بھی جانتا تھا۔ بچہ تو تھا ہی' لیکن شرارتیں کچھ زیادہ ہی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں' ہر وقت بانسوں پہ چڑھ کر ڈنڈے دینے کی سوجھتی رہتی تھی۔ خاص طور پہ جعلی اور فراڈی لوگوں کو تو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تپاتا تھا...... خیر' ان خرابوں سے گزر کر میں کبھی کبھی پُل کی دوسری جانب اُتر جاتا' سامنے چلتے بازار سے گزرنا بھی اِک عذاب ہوتا کہ کچے چمڑے کے گوداموں سے اُٹھتی ہوئی بدبو کے بھبکے میرے دماغ کو بھک سے اُڑا دیتے اور میں سرکار گھوڑے شاہ کے دربار تک ناک منہ پہ ہاتھ رکھے ہوئے پہنچتا' باہر سڑک پہ ہی کھڑے کھڑے سلام عرض کرتا اور وہاں سے تقریباً فرلانگ بھر آگے ایک بزرگ بابا رحمت سائیں کی دوکان پہ پہنچتا۔

● بابا رحمت سائیں' اللہ میاں کی گائیں......!

سائیں جی حلوائی تھے' حکیم یا کوئی اللہ کے ولی' یہ کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا' بظاہر ایک دیہاتی سے دکھائی پڑتے جو کسی مجبوری سے شہر آ گیا ہو۔ اکہرا بدن' تنکی سی داڑھی' شانوں پہ لٹکتے پٹے' معمولی سے گاڑھے کا کالا کرتہ' نیچے ٹخنوں سے اوپر کالی چادر کا تہبند' پاؤں میں کمائے ہوئے چمڑے کا دیسی جوتا۔

[illegible] اسی حلیے حال میں مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ وہ صرف جلیبیاں بناتے تھے۔ چھوٹے چولہے پہ چڑھی کڑاہی' پاس پڑی مٹی کی ناند میں گلابی رنگ گھلا ہوا میدہ' بیسن اور ایک برتن میں شکر کا شیرہ۔ خدا جانے وہ منہ میں کیا کچھ پڑھتے رہتے تھے' شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت کم کسی سے بات چیت کرتے تھے۔ وہ گاہک' مریض یا مرید' کچھ بھی کہہ لیں' کے آنے پہ اس کا مرض جاننے' پتا سننے یا پھر بات سمجھنے کے بعد ہی تشخیص کے مطابق پہلے چند لمحے آنکھیں بند کرتے' زیرِ لب کچھ پڑھتے۔ کپڑے کی دستی [illegible] کا مغوبہ ڈالتے' دبا کر میدے کی دھار کو رواں کرتے کہ گلابی گلابی خستہ جلیبی کسی اسم کا شہکار بن جاتی۔ پھر وہ مریض' مرید یا حاجت مند کو کیلے' اروی یا پیپل کے پتے پہ گرم گرم رکھ کر تھما دیتے اور ساتھ ہی کہتے کہ گھوڑے شاہ کے مٹو سائیں مل جائیں' انہیں یہ جلیبی کھلا دو تھوڑی بہت یا ساری جلیبی' جتنی بھی بچ جائیں' خود بھی کھالو۔ اگر نہ ملیں تو کل پھر یہاں سے اور لے جانا۔ وہاں آنے جانے والے زیادہ تر غریب' تنگ دست لوگ ہی ہوتے۔ لاعلاج بیماریوں والے' دکھی لاچار' فاقہ مست' عقیدت مند' سب ہی آتے جاتے تھے اور میرے جیسے فقرے بھی جو محض مفت کی میٹھی میٹھی جلیبی چکھنے کے لالچ میں گھوڑے شاہ کا ایک لمبا چکر لگاتے۔ بابا رحمت سائیں کا [illegible] بھی ہمیں ایک اچھے مفت خورے دوست نے ملایا تھا۔ یوں ہی برسبیلِ تذکرہ ایک دن ان کا ذکر چھڑ گیا۔

"خان قیصر نے کبھی اِمرتی کھائی ہے......؟"

"ہاں...... کیوں کھلانا چاہتے ہو......؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"...... کھلا سکتا ہوں مگر اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میں کھلاتا ہوں یا کوئی اور......؟"

"بات صاف کرو' اِمرتی کی بات کی ہے تو بات کو الجھاؤ مت...... صاف صاف بتاؤ' کہیں نیا بھنڈ خانہ کھولا ہے' کسی حلوائی کی دوکان پہ نانا جی کی فاتحہ ہے یا کوئی مال وال ہاتھ لگا ہے......؟" میں نے بیک وقت تین نشانوں کی زد میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پیارے' ایسی کوئی بات نہیں...... میرے علم میں بھی یہ بات تھوڑا عرصہ پہلے آئی ہے کہ گھوڑے شاہ کے پاس کوئی صوفی یا سائیں صاحب ہیں جو ہر روز ظہر سے عصر تک بڑی خستہ' گرم گرم اِمرتیاں مفت تقسیم کرتے ہیں۔ لطف اور مزید لطف یہ کہ اِمرتی بڑی دِلکش مصوّر خطاطی کا نمونہ بھی ہوتی ہے......"

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا...... یار' یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ آج تو وقت نہیں مگر کل وِل اُدھر کا ضرور پھیرا لگائیں گے۔"

وہ قدرے ٹھنڈے سے لہجے میں بولا۔ ''ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا...... اُمرتی اور کھانے والے کے مُنہ کے درمیان ایک سائیں ٹٹوّ حائل ہوتا ہے......''

میں نے اِس کی گردن ناپتے ہوئے کہا۔ ''اُلّو کی دُم! ایسی آرٹسٹک' لذیذ اور میٹھی خبر میں یہ ٹٹو کہاں گھس آیا؟...... اور اُمرتی کے ساتھ مکھی چیونٹے کی بات تو بنتی ہے' ٹٹو کی نہیں......''

وہ گردن چھڑاتے ہوئے ممیایا۔ ''ایک تو تم پوری بات سُننے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ سُنا دیتے ہو۔ بندۂ خدا' پہلے پوری بات تو سُن لو......؟''

● گھوڑے شاہ کا ٹٹوّ' مجذوبوں کا نظر بٹوّ......!

میری بڑی بہن کے سُسر ایک مدت سے فالج کے مرض میں مبتلا تھے۔ ہر علاج' حربہ آزمایا مگر کسی طور انہیں افاقہ نہ ہوا بلکہ روز بروز مرض میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ جہاں بھی کسی نے اُمید دلائی' بلا سوچے سمجھے مُنہ اُٹھائے اُدھر چل دیئے۔ بابا جت سائیں سے بھی اسی ضمن میں ملاقات ہوئی تو کسی نے بتایا کہ آپ مریض کو لے کر ان کے پاس جائیں پھر قدرت کا تماشا دیکھیں۔ میری ہمشیرہ نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ بابا جی سے ملنے میں کیا حرج ہے' شاید ان کے لئے شفا بابا صاحب کے ہاتھ میں ہی ہو...... خیر' دوسرے روز جمعرات کے دن ہم مریض کو تانگے میں لٹا کر اُن کے پاس پہنچ گئے' گلی کی نکڑ پہ چھوٹی سی دوکان کے اندر وہ گرم کڑاہی دھرے ننھی ننھی جلیبیاں یا اُمرتیاں تیار کر رہے تھے۔ آٹھ دس مرد و زن' بچے باہر بنچ پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ باری باری آگے بڑھ کر وہ اپنا حال کہتے بابا جی بڑی میٹھی مسکراہٹ اور تسلی سے اُن کی بات سُنتے۔ پھر کپڑے کی رومالی میں بڑے حساب و کتاب سے بیسن میدے کا ملیدہ ڈالتے اور تر تراتے ہوئے گھی میں وہ رومالی کو ہاتھ کی مٹھی میں دبا کر خدا جانے کیا لکھتے کہ جھٹ اُمرتی کسی خوبصورت سے لکھے ہوئے تعویذ کی صورت اُبھر آتی۔ یوں سمجھو کہ جیسے کوئی ذمہ دار بڑا افسر فائلوں پہ بڑی مشاقی سے دستخط کرتا چلا جاتا ہے' بالکل ایسے ہی وہ مریض کے مرض سے لئے اُمرتی تیار کرتے۔ دو چار پیسے اگر کوئی وہاں از خود ڈال گیا تو انکار نہ کرتے لیکن کسی سے کچھ طلب کرنے کا وہاں کوئی چلن نہ تھا...... ہماری باری بھی آئی۔ مریض تو ہل نہیں سکتا تھا۔ بابا جی کمال محبت سے اُٹھ کر مریض کے پاس تانگے تک آئے' السلام علیکم کہا اور دھیمی سی مسکراہٹ سے مریض سے حال احوال پوچھا۔ مریض کو نہ بولنے کا یارا' نہ آہ بھرنے کی سکت۔ حسرت اور آنسو بھری فالج کے اثر سے پھیلی ہوئی

[illegible] آنکھوں سے اپنے فقیر سے مسیحا کو تک رہا تھا۔ باباجی نے سر سے پاؤں تک اس کے بے حس و ساکت جسم پہ ہاتھ پھیرا' واپس دوکان پہ آئے اور ایک مخصوص سی جلیبی تیار کی جیسے خالص کندن کا بڑا سا لاکٹ ہو [illegible] درمیان میں "ھوالشافی" لکھا ہوا تھا۔ پان جیسے پتے پہ وہ جلیبی رکھ کر میرے بہنوئی سے بولے کہ آپ یہاں سے سیدھے گھوڑے شاہ چلے جائیں۔ وہیں باہر یا قبرستان میں کہیں "گھوڑے شاہ کے ٹتو" بیٹھے ہوں گے۔ بس یہ جلیبی اُنہیں دے دیں۔ اگر وہ جلیبی لے کر کھا جائیں اور مریض کو نہ دیں تو کل پھر یہاں میرے پاس آیئے گا اور اگر وہ مریض کو کھلا دیں تو پھر یہاں میرے پاس آنے کی تکلیف نہ کریں بلکہ [illegible] طرح صحت یاب ہونے تک گھوڑے شاہ کے ٹتو کے پاس ہی جایا کریں۔ ہم چلنے لگے تو مزید فرمایا کہ اگر گھوڑے شاہ کے ٹتو تلاش کرنے کے باوجود وہاں نہ ملیں تو وہاں کسی سے بھی پوچھ لیں کہ گھوڑے شاہ کے ٹتو کہاں ملیں گے۔ وہ کبھی کبھی ریلوے شنٹنگ یارڈ' ریلوے گوداموں یا پل کی جانب بھی نکل جاتے ہیں [illegible] بھی خیال رہے کہ یہ جلیبی گھوڑے شاہ کے ٹتو کے علاوہ اور کسی کو نہیں دینی لیکن وہ جسے دیں' وہ کھا سکتا ہے۔ [illegible] صاحب! اب ہم جلیبی سبز پتے پہ دھرے مریض کو تھامے حضرت گھوڑے شاہ کے ٹتو کی تلاش میں نکل کھڑے [illegible] رہا تھا۔ دربار کے باہر سڑک کنارے مٹی کے گھوڑے بیچنے والے دوکاندار' دیہاتی خانہ بدوش عورتیں [illegible] دیکھو مٹی کے گھگھو گھوڑے فروخت کر رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ صاحب مزار کو لوگ گھوڑے [illegible] کہتے ہیں۔ اب تھوڑی سی گھوڑے شاہ کے ٹتو کی بات بھی سمجھ آ رہی تھی' ظاہر ہے کہ گھوڑے شاہ [illegible] کے پیچھے اُن کا ٹتو ہی ہو گا یا گھوڑے شاہ پیار سے اسے اپنا ٹتو کہتے ہوں گے جیسے اُستاد بزرگ پیار سے کسی بچے یا شاگرد کو کہہ دیتے ہیں "اوئے کھوتیا!" جبکہ وہ بیچارہ اِنسان کا بچہ ہوتا ہے لیکن پیار' بیوپار اور [illegible] میں سب کچھ روا ہوتا ہے...... دربار شریف کے قریب ہی ایک گلی میں ہم نے اپنے گھوڑے تانگے کو [illegible] ہمشیرہ اور بہنوئی صاحب مریض کے پاس ٹھہر گئے اور میں اکیلا گھوڑے شاہ کے ٹتو کی تلاش میں [illegible] جانب بڑھ آیا۔ دربار کے باہر ایک معقول سا ملنگ دِکھائی پڑا۔ میں نے بڑے اَدب سے گھوڑے [illegible] کے ٹتو کے بارے میں دریافت کیا تو وہ مجھے ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے میں نے اُس کی بیوی [illegible] متعلق پوچھ لیا ہو کہ وہ مجھے کہاں ملے گی؟...... ایک آدھ منٹ جب اُس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ مسلسل [illegible] والی نظروں سے مجھے گھورتا ہی رہا تو میں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ذرا [illegible] ایک اور بزرگ دِکھائی پڑے۔ اب میں ذرا محتاط تھا کہ کہیں پوچھنے میں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو گئی ہو۔

"السلام علیکم...... حضور! یہاں کوئی بزرگ حضرت گھوڑے شاہ کے ٹتو......"

کبوتر جیسی سُرخ بوٹی آنکھوں سے ان بزرگوں نے مجھے جو دیکھا تو میری جیسے جان نکل گئی۔ انہوں نے مجھے کوئی جواب ضرور دیا جس کی کوئی نوکیلی سی کرچی میری سماعت سے ٹکرائی ضرور تھی مگر میں جب تک اُن کی دسترس سے باہر نکل چکا تھا...... الٰہی! اب کیا کروں' کس سے پوچھوں؟...... بار بار میرا دھیان سبز پتے پہ پڑی ہوئی اَمرتی کی جانب نکل جاتا جو تانگے کی اگلی سیٹ پہ رومال سے ڈھانپ کر رکھی ہوئی تھی' جسے گھوڑے شاہ کے ٹٹو کے روبرو پیش کرنا ضروری تھا۔ سالم تانگے کا کرایہ بھی سر پہ لمحہ لمحہ بڑھتے بوجھ کی مانند بھاری ہو رہا تھا...... خیر' میں اسی شش و پنج میں آگے بڑھا۔ اب یہاں سے قبرستان شروع ہو گیا تھا۔ املتاس کے ایک بھاری سے جھاڑ کے پیچھے ڈھولئے اور چھنکوں والے دَھمال کا سماں باندھے ہوئے تھے' اچھا خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔ ڈھول کی تھاپ اور دھمال کی تال' جب دونوں ہم آہنگ ہو جائیں تو پھر حال وجود میں آتا ہے جو صاحبِ حال کا جوڑ جوڑ توڑ دیتا ہے لیکن وجود کو وجدان کے ساتھ جوڑ بھی دیتا ہے۔ یہاں صاحبِ حال صرف ایک تھا مگر یہ کیسا حال تھا کہ نہ جھٹکے' نہ سر کا پھٹکا' نہ گردن کے بل نہ کمر کے لٹکے' نہ ٹھمکنا نہ چھناکے نہ نرت کے توڑے بلکہ صرف دائیں ہاتھ اُنگلیوں پہ ڈھول کی تھاپ کا اُنگل سم قائم تھا۔ کمر اور گھٹنوں کے درمیان ایک میلی چیکٹ سی لپٹی ہوئی چادر' گرمیوں میں اُبلتے ہوئے خمیرے آٹے کی طرح پھیلا ہوا [illegible] پیٹ اور اوپر اُبھری [illegible] لٹکی ہوئی چھاتیاں۔ ٹانگیں' بازو' ہاتھ بے ڈول اور بے ڈھنگے' لٹکے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ' مُندی مُندی سی آنکھیں' چھوٹی سی پیشانی' چمکدار چہرے پہ بکھرے ہوئے بال۔ ذرا ہٹ کر اگر قدرے آنکھیں میچ کر دیکھا جائے تو یوں لگے جیسے کسی ولندیزی سنگ تراش نے سنگِ خارا کے کسی بہت بڑے ٹکڑے سے ایک نامکمل' بے ہنگم' بے توازن سا مجسمہ گھڑ کر میدان میں گاڑ دیا ہو۔ دائرے کی صورت میں کھڑے ہوئے لوگ بھی جیسے صرف اسی رانجھے کو رانجھا راضی کرنے کے لئے ہی موجود ہوں' ہر نگاہ اسی پہ جمی ہوئی تھی۔ ڈھولیوں کو نذرانے' ویلیں اور بڑھاوا دینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ڈھولیا دھیان ہوتا ہے اور ڈھول سراپا گیان' جتنے دھیان سے گیان بجے گا' اتنا ہی گہرا گھاؤ لگائے گا۔ اللہ جانے' سوئی کہاں پہ اَٹکی ہوئی تھی' لوگ جیسے کسی خاص کیفیت یا کسی انوکھے رنگ سنگ کے منتظر ہوں۔ آہنگ کا ترنگ' تلوار کی کاٹ بنا ہوا تھا مگر کیا کیجئے کہ ''رنگ' تیرے سنگ'' والی گرہ نہیں کھل رہی تھی۔ تماشائی ہاتھ کے اشاروں اور واہ واہ سے ڈھولیوں کی لے کو بھڑکتی لوؤں میں تبدیل کرنے کی جستجو کر رہے تھے' ڈھول کے پڑے اور گھماسیاں' ڈھولیوں کے بازوؤں کی مچھلیاں اور ہاتھوں کی پُرکار اُنگلیوں کی پوریں جیسے دَم پخت ہو کر دُھواں چھوڑنے لگی تھیں۔ پسینے کے نگینوں کی آبشاریں چھوٹی ہوئی تھیں کہ یہاں کا پورا عالم ہی اس اکیلے بالم کو آمادہ برسرِ آشفتہ کرنے

ہوا تھا۔ میں بھی اس تماشا گہ ضرب وزد کا ایک حصہ بن کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سے کی کوئی گرہ کھلی تھی یا کی کوئی تنی تانت تڑک سے ٹوٹی تھی۔ حلقے کے بیچ برگد کی مانند گڑے مجذوب کی حلق کے غار سے کی ایک ابابیل سی دلخراش چیخ کے ساتھ پھڑ پھڑاتی ہوئی نکلی۔ آسمان کی جانب کھلا ہوا منہ دوسرے لمحے نیچے جھکا، ٹھوڑی ننگے سینے لگ گئی۔ آہ نکل جائے تو سیستان، آرزو نکل جائے تو دل اور آہ نکل جائے تو سینہ بڑے سبک ہو جاتے ہیں...... کافی دیر تک یہ آہنگ وحال کا مدار چلتا رہا۔ انت آیا، بھیڑ بھاڑ چھٹی تو چند محدودے، بظاہر بودے سے پانچ دس باقی بچے۔ مجذوب وہیں پہ ہی نیم دراز سے پڑ گئے، کچھ لوگ کیے کے چتوں پہ جلیبیاں سجائے قریب آ گئے۔ یہیں مجھے معلوم ہوا کہ میں تو گھوڑے شاہ کے ٹٹو کے حضور کھڑا ہوں۔ میں جھٹ واپس پلٹا، جلیبی اور مریض دونوں کو لا کر ٹٹو سائیں کے حضور پیش کر دیا۔

ٹٹو صاحب زمین پہ ڈھیر سے پڑے بڑے بلند آہنگ خراٹے لینے لگے تھے۔ اب انھیں جگائے کون۔ دو چار جن میں، میں بھی شامل تھا، ٹانگیں بازو دبا رہے تھے۔ دبانا بھی کیا، آٹا گوندھ رہے تھے۔ پنڈلیوں، بازوؤں، رانوں پہ گوشت ہی گوشت، جاپانی سومو پہلوانوں کی طرح نرم نرم بھرے گندھے آٹے کی مانند...... لوگوں کے ہاتھوں میں تھامی جلیبیاں ٹھنڈی اور مٹی سے لتھڑی [illegible] ہو گئی تھیں۔ ہر ٹٹو سائیں کی [illegible] جلیبیاں [illegible] چاولوں کے [illegible] میں...... خیر، وہ ساعت بھی آ ہی گئی۔ ٹٹو سائیں نے کسی معصوم بچے کی مانند موتیے کی ڈوڈی سی گول گول آنکھیں کھول دیں اور اٹھنے کا جتن کرنے لگے۔ زمین میں کشش ثقل نہ بھی ہو پھر بھی ان کو ان کے وزن کے سبب سے اٹھانے کے لیے کرین سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی، پانچ دس انسانوں کے بس کی بات تو تھی نہیں اور وہ محض گوشت و پوست یا تین چار من کی صورت میں محض وزن ہی نہیں تھے بلکہ وہ تو وہ کچھ بھی تھے جو فہم و ادراک، گرفت و قابو، حل و عقد سے کہیں ماورا ہوتا ہے، انھیں تو شاید کہیں اور سے اٹھایا بٹھایا جاتا تھا۔ دوسرے جلیبی برداروں کے ساتھ میں بھی آگے بڑھ کر پیش ہو گیا۔ جلیبیاں سامنے، بندے سامنے مگر وہ تو کہیں اور "آمنے سامنے" تھے۔ اتفاق یا میری شامت کہ پہلے میری جانب ہی رجوع فرمایا۔ جلیبی میرے ہاتھوں پہ اور مریض میرے دائیں جانب بندھے ہوئے مرغے کی مانند اینٹھا ہوا پڑا تھا۔ ٹٹو سائیں نے کسی چیل کی مانند جھپٹ کر میرے ہاتھ سے جلیبی اچکی، مٹھی میں دبا کر مریض کے چہرے پہ نچوڑی۔ گاڑھے شیرے کی چند بوندیں مریض کے ہونٹوں، ناک، ماتھے پہ عقیق کی مانند چمکنے لگیں۔ بچی ہوئی جلیبی کو زبان نکال کر چکھا، پھر منہ بناتے ہوئے ہاتھ مریض کے بدن پہ جھاڑ دیا۔ ہم واپس چلے آئے۔

اگلی رات، مریض نے کئی مہینوں کے بعد پہلی مرتبہ اپنے ہونٹوں اور آنکھوں کو ہلانے کی کامیاب کوشش

کی اور پھر آنے والے چند ہفتوں میں وہ اپنے پاؤں پہ چلنے لگا تھا۔

اپنے فقرے دوست کی اس ساری کہانی میں میری دلچسپی صرف بابا رحمت سائیں اور ان کی مفت اُمرتی تھی۔ دیسی گھی سے تیار کردہ گرما گرم خستہ اُمرتیاں جن پہ بڑی ہُنرمندی سے اَسمائے حُسنہ لکھے جاتے ہیں۔ بابا رحمت کا شو سائیں سے کیسا رشتہ ہے۔ جلیبیاں یہ تیار کرتا ہے' شفا شو سائیں کے وسیلے سے ملتی ہے۔ دونوں بے غرض اور بغیر کچھ مانگے' طلب کیے دُکھی انسانیت کی خدمت میں مگن......!

● کُتے' میتھوں اُتے......!

دوسرے دن میں اکیلا ہی بابا رحمت کی دوکان کے سامنے ایک تھڑے پہ دَھرا ہوا تھا کیونکہ دوکان ابھی بند تھی اور ایک عجیب سا لمبوترے مُنہ والا کالے رنگ کا کُتا باہر بیٹھا تھا۔ وہ بھی زبان نکالے مجھے گھور رہا تھا اور میں بھی سہمی سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کُتے کا وہاں بیٹھنا بھی کچھ عجیب سا لگا۔ حلوائیوں' قصائیوں' دودھ دہی کی دوکانوں کے آس پاس کُتے بلّے منڈلاتے ہی رہتے ہیں۔ دوکان بند ہو تو بھی بو باس کی وجہ سے تھڑے کے اوپر یا نیچے پسر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے کُتے بڑے بازاری اور رذیل قسم کے ہوتے ہیں' ذرا سی آنکھ یا ککری دکھانے سے چُوں چُوں کرتے دُم سمیٹے اِدھر اُدھر کھسک جاتے ہیں۔ میرا کُتوں' کتوروں سے بڑا پرانا پیار اور واسطہ رہا ہے۔ یار دوست بھی ایسے کہ ہر ایک نے چار کُتے کتورے سنبھالے پالے ہوئے تھے۔ نہ پاکی پلیدی کا خیال نہ کوئی عزت کا احساس۔ کُتوں کے ساتھ جیسے ہم بھی سب کُتے بنے ہوئے تھے۔ جو خود کھا رہے ہیں' انہیں بھی کھلا رہے ہیں۔ نہلا رہے ہیں' مالش ہو رہی ہے۔ گیند' گلی سے انہیں ورزش کروا رہے ہیں۔ اگلی ٹانگیں پکڑ کر انہیں پچھلی ٹانگوں پہ چلنے کی ٹریننگ دے رہے ہیں۔ جمپ لگانا' آنکھوں پہ پٹی باندھ کر اپنے مالک کو تلاش کرنا۔ کیا کچھ نہ ہوتا جو ہم نہ کرتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ کُتا ایک بہترین وفادار ساتھی بننے کی جُملہ اہلیت رکھتا ہے۔ اسے دوست دُشمن کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے کی خداداد صلاحیتوں سے بہرہ مند کیا جن سے عمومی طور پر دیگر مخلوق کو محروم رکھا۔ یہ وہ کچھ بھی دیکھ لیتا ہے جو عام انسان نہیں دیکھ پاتا۔ اس کے اندر کا معکوسی سسٹم اتنا حساس' اتنا دُرست اور معتبر ہے کہ آنے جانے والا ہر حادثہ' حشر توز ہر بلا اور آفت نہ صرف محسوس کر لیتا ہے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ جنّات' بدروحیں' بھوت پریت' حشرات' نوری ناری مخلوق' سب کچھ اسے دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اندھی راتوں کو یہ بھونکتے' لپکتے اور خوامخواہ اِدھر اُدھر بھاگتا دکھائی دیتا ہے' یہ سب کچھ

غفلت نہیں ہوتا۔ یہ آسمان سے اُترتی اور فرش سے اُبلتی ہوئی بلاؤں، مصیبتوں اور شر شرارے اپنی گلی، گھر اور اپنے مالک کو خبردار کر کے حفاظت کرتا ہے، بھونک بھونک کر ان بلیات کو بھگاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کتے کا پتر پاگل ہو گیا ہے۔ قافلوں، کاروانوں کے آگے پیچھے، دائیں بائیں۔ بستیوں میں مویشیوں کی گلہ بانی، کھیتوں، باڑوں، ذخیروں کی نگہبانی، اندھیری، سنسان ٹھٹھرتی ہوئی یخ بستہ راتوں میں آپ کے اسباب واموال اور جان کی خبرداری یعنی انسان کی بے بسی کے بعد اس کا بس ہوتا ہے۔

بس، وہ مجھے گھورے جا رہا تھا اور میں اسے، جیسے پچھلے کسی جنم کی کوئی شناسائی جنم لے رہی ہو۔ وہ کوئی عام بازاری قسم کا کتا نہیں تھا اور میں بھی شاید اس کے لئے کوئی معمولی سا لڑکا نہیں تھا جو سکول سے بھاگ کر محض چھٹی تک کا وقت گزارنے کے لئے کسی تھڑے پہ پریشان سا بیٹھا ہو..... آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتا، ہاتھی، ریچھ اور [illegible] بالکل انسانوں کی [illegible] اپنی زبان میں آپ سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اپنے نطق کا ڈیٹا ہم سے مختلف ہونے کی بنا پہ وہ اپنا پیغام یا مدعا پہنچانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ تب وہ دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں، اپنی مخصوص قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے ہمیں پیغام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پہ کتا ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال [illegible] لیتا ہے اور پھر وہ آپ کی نیت کے حساب سے پیش آتا ہے۔ یعنی وہ اگلے ذی نفس کے مطابق، اپنی مخصوص حسوں اور صلاحیتوں سے کام لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں جو کام انسان اور کمپیوٹر نہیں کر سکتے وہ کتے کرتے ہیں..... وہ مجھے گھورتے گھورتے شاید بوریت محسوس کرنے لگا تھا، اس کی باچھوں کے سیاہی مائل گلابی کناروں سے لعاب کی موتی دھار لڑی لٹک رہی تھی اور سپید نوکدار دانتوں کے درمیان سرخ قالین جیسی مانند لگی ہوئی زبان جو ہر چند منٹ بعد منہ کے اندر چلی جاتی اور پھر لعاب سے تر ہو کر واپس باہر نکل آتی تھی..... اب میں نے ذرا اسے ٹٹولنا چاہا۔ آنکھیں تو ایک دوسرے پہ لگی ہوئی تھیں، میں نے ایک ننھا سا پیغام چھوڑا کہ دوست! یہ سائیں جی کب آئیں گے، میں تو آج ان کے درشن کرنے اور تازہ تازہ مرغی چکھنے آیا تھا..... یک بارگی اس کی زبان اندر چلی گئی۔ ''ہف، ہف'' کرتا ہوا وہ اُٹھا، بے چین سا کھڑا ہو کر چند لمحے مجھے گھورا، سرسراتی ہوئی انگڑائی توڑی اور پھر پھرتی سے دائیں جانب کی پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ یعنی اس نے میرا پیغام وصول کر لیا تھا۔ صحیح ہے کہ درویشوں کے در کے کالے کتے بادشاہوں کے درباروں کے سفید ہاتھیوں سے لاکھ درجہ قیمتی اور عزت والے ہوتے ہیں..... ایک چلا گیا، دوسرا سامنے تھڑے پہ بیٹھا تھا۔ انتظار بھی کیا چیز ہے۔ اس میں بڑی عجیب سی لذت اور بڑی غریب سی

کوفت ہوتی ہے۔ کسی کی دید کا انتظار ہو' عید ہو یا کوئی نوید ہو' انتظار کی کیفیت بڑی شدید ہوتی ہے۔ میں یہاں انتظار کی جس کیفیت سے دوچار تھا' وہ امرتی کی تھی یا کسی چکروتی کی' میں ابھی اس کیفیت کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس بغلی پتلی گلی سے وہی ''نابغۂ روزگار'' کالا شا کالا کتا' زبان لٹکائے بگٹٹ بھاگا چلا آ رہا ہے۔ وہ آتے ہی اپنے پچھلے پیروں پہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور جیسے اپنی زبان میں مجھے بتانے لگا کہ بابا رحمت سائیں کو اطلاع کر دی ہے' بس وہ اب آیا ہی چاہتے ہیں...... ابھی کتے سے ''گٹ کتاریاں'' ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ایک' دو دو کر کے کچھ اور لوگ بھی آ جمع ہوئے۔ ان کی شکل حلیئے سے ہی پتا چلتا تھا کہ بیچارے غرض مند دیوانے ہیں۔ کتا بھی جیسے ہر ایک آنے والے کو چیک کر رہا تھا۔ ایک ایک کو گھورتا' زبان اندر اور باہر' دُم' کان مسلسل حرکت میں تھے۔ اسے پھر اک دم جیسے دورہ پڑا' وہ دوبارہ اسی پتلی گلی میں کہیں غائب ہو گیا۔ میں اب اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ گیا تھا' یہاں سے مجھے وہ پتلی گلی دور تک دکھائی دے رہی تھی۔ میری چھوڑی ہوئی جگہ پہ دو تین مریض منتظر سے بوڑھے آ کر بیٹھ گئے تھے۔ چند ایک پل سے لمحے اور گزر گئے ہوں گے' میں مسلسل اُدھر گلی کے آخری دکھائی دینے والے حصے تک نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اچانک مجھے اسی گلی میں کالے لمبے کُرتے اور ٹخنوں سے اوپر تہبند میں تہہ بہ تہہ ایک دھان پان سے [illegible] روڑوں کو پاؤں سے ہٹاتے ہوئے راہ میں پڑے ہوئے اخبار کی ردی ٹکڑوں کو اُٹھاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سر پہ سیاہ رنگ کی بے ڈھنگی سی پگڑی جس کا لمبا سا پلو آگے سینے پہ جھول رہا تھا...... یہ بابا رحمت سائیں ہی ہو سکتے ہیں' میں سوچ میں پڑ گیا اور اگر یہ وہ نہیں ہیں تو پھر جو بھی ہیں مگر ایک عام انسان نہیں ہیں' میرے اندر جیسے کسی نے اُن کے بارے میں فیصلہ کر دیا تھا...... میں پاس ہی کھڑے ایک ریڑھے کی اوٹ میں دبک گیا' شاید میں اُنہیں دیکھ کر ڈر سا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اِک جاں فزا جھونکے کی مانند میرے سامنے سے گزر کر دوکان کی جانب بڑھ گئے اِک میٹھی سی نظر سے اپنے منتظر مریضوں یا مریدوں کی جانب دیکھتے ہوئے دوکان کھولی اور اپنے معمول کے کاموں میں جُت گئے۔ اسی دوران ایک سات آٹھ برس کا بچہ بھی دوکان پہ آ گیا اور اُن کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اگلے آدھ گھنٹے میں وہ امرتیاں تیار کر رہے تھے۔ میں ریڑھے کے پہیئے کی آڑ سے اُن کی ہر حرکت کا بہ نظرِ غور جائزہ لے رہا تھا' وہ چوبی چوکی پہ بیٹھے امرتیاں بناتے ہوئے مجھے یوں لگے جیسے وہ امرتیاں نہیں' تقدیریں بنا رہے ہوں۔ جیسے وہ انسانوں سے ہٹ کر کوئی اور ماورائی قسم کی مخلوق ہوں اور اُن کا واحد کام اللہ کی مخلوق کو آسانیاں دینا اور اُن کی خدمت کرنا ہو۔ منتظر لوگ اب اپنی اپنی آمد کے حساب سے ایک قطار سی بنا کر پاس کے تھڑے پہ بیٹھ گئے تھے۔ بابا رحمت سائیں نے امرتیوں کی بسم اللہ خلاف معمول

ایک بڑی سی اُمرتی سے کی تھی۔ اُن کے پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں پہ کوئی وِرد بھی جاری تھا۔ موسم اور سامنے جلتے ہوئے چولہے کی تمازت سے اُن کا چہرہ ایک شمع کی مانند روشن تھا۔ میں ذرا دور سامنے بیٹھا دید نظارہ کر رہا تھا' اُن کے پاکیزہ چہرے کی تلاوت میں ایسا منہمک...... کہ گردوپیش کا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ پھر جیسے مجھے کوئی متوجہ کر رہا تھا۔ میں اپنے آپ میں واپس آیا تو سامنے وہی دوکان والا چھوٹا لڑکا ہاتھ میں پتوں کے دونے پہ بڑی سی گرم گرم اُمرتی رکھے میرے سامنے کھڑا تھا۔

● اُمرتی' بازِ بیمار کی رُوپ متی......!

"السلام علیکم...... باباجی نے اُمرتی دی ہے' کھالیں......"

"اُمرتی' لڑکا اور باباجی!"...... زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے میں نے حیرانگی سے باری باری تینوں کی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' لڑکا دونا میرے ہاتھ میں تھما کر واپس دوکان پہ پہنچ گیا تھا۔ [illegible] طعام دیتی ہوئی میرے ہاتھ پہ پڑی تھی۔ کچھ لکھا ہوا نظر آیا' غور سے دیکھا تو اُمرتی پہ "یاحیّ" بنا ہوا تھا...... یا خدا یہ کیا؟...... معاً لڑکے کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے کہ باباجی نے اُمرتی دی ہے' کھالیں...... میں نے ایک بار پھر بابا رحمت سائیں کی جانب دیکھا' وہ کسی ضرورت مند یا شاید کسی بیمار کی بپتا سُن رہے تھے۔ ایک بار پھر اُمرتی کو بڑے غور سے دیکھا' اسپرنگ جیسے چھوٹے چھوٹے دائروں کے بیچ "یاحیّ" ایسی پختگی اور خوبصورتی سے بنا ہوا تھا کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ سوچا' ایسی نادر خطاطی والی اور ایسے نیک سیرت بزرگ کے ہاتھوں تیار کردہ بابرکت اُمرتی کو ہڑپ ہڑپ پیٹ میں اُتارنا بدذوقی ہی نہیں' توہین بھی ہے۔ پھر خیال آیا کہ حُکم ہوا ہے' اسے کھا لیا جائے۔ بسم اللہ پڑھ کر کنارہ توڑ کر مُنہ میں رکھ لیا...... سبحان اللہ! کیا لُطف و حلاوت تھی' جیسے رگ و جان میں فرحت بخش تازگی' قوت اور انجانی سی رُوحانیت بجلی کی مانند سرایت کر گئی ہو۔ اُمرتی کا دوسرا کنارہ بھی توڑا کھایا۔ تیسرا اور چوتھا کنارہ بھی جب حلق میں سے اُتر گیا تو اب ہاتھ میں "یاحیّ" ہی رہ گیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی یمنی جواہر تراش نے کسی نایاب سے عقیقِ یمنی سے اسمِ الٰہی تراشا ہو۔ میں گُم صُم سا نظریں جمائے دیکھ رہا تھا' دیکھتا ہی چلا گیا۔ میری محویت ایک بار پھر اُسی پُر اسرار سے لڑکے نے توڑی جو ایک اور اُمرتی اُٹھائے میرے سر پہ کھڑا تھا۔

"السلام علیکم...... یہ ایک اور اُمرتی باباجی نے بھیجی ہے۔ کہتے ہیں' گرم گرم کھاتے جائیں

اور مزید یہ بھی کہا ہے کہ اَمرتی اور تعلق میں اگر گرم جوشی ختم ہو جائے تو دونوں میں پھر مزہ نہیں رہتا...... "

یک نہ شُد' دو شُد والی بات درپیش تھی ...... قدرے ٹھنڈی پہ ایک اور گرم گرم۔ "یا غنی" یہ "یا رشید" بھی آ گئی اور ساتھ یہ حکم بھی کہ گرم گرم کھاتے جاؤ مگر یہاں تو ابھی پہلی بھی دھری ہوئی تھی۔ ہمت کر کے میں نے "یا غنی" والی اَمرتی نیچے سے نکالی اور دو قسطوں میں اسے کھا گیا۔ یوں لگا کہ دو جہاں کی نعمتیں میرے اندر اُتر گئی ہوں۔ دوسری اَمرتی ابھی آدھی ہی کھائی تھی کہ "یا رحیم" والی تیسری بھی آ گئی اس پیغام کے ساتھ کہ بہت اچھے بچے ہو۔ شاباش' کھاتے جاؤ...... آدھی "یا رشید" اور پوری "یا رحیم" اُٹھائے میں جو بھاگا' مڑ کر نہیں دیکھا۔ سیدھا سرکار گھوڑے شاہ کے دربار پہنچ کر سانس لیا۔ بھاگم بھاگ میں اَمرتیاں سبز پتوں کے دونے میں پچک سی گئی تھیں اور اُنگلیاں بھی گاڑھے گاڑھے گلابی شیرے سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ سوچا کہ پہلے یہ اَمرتیاں کھا لوں پھر شیرے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ دھوؤں گا۔ دربار کے اندر' مٹی کے ننھے گھوڑوں والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو اُنگلیوں سے لپٹا ہوا شیرہ زبان سے چاٹا' پھر پچکے ہوئے دونے کو جھولی میں رکھ کر مزے مزے سے اَمرتیاں کھانے لگا۔ کھا پی' چوم چاٹ کر پاس ہی نلکے سے ہاتھ منہ دھویا اور کے اچھا لگا کہ غیر ارادی طور پہ دربار کی دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں پسارے نیم دراز سا ہو گیا۔ ظہر کی نماز میں ابھی کافی وقت تھا' لمبی سی جمائی اور لمبی سی انگڑائی توڑ کر بادلِ نخواستہ اُٹھا کہ یہاں کی بجائے پاس مسجد میں لیٹ کر کمر سیدھی کر لوں اور پھر نماز ادا کر کے واپسی کی راہ پکڑوں گا' ویسے بھی اَمرتیاں کھا کر جی چاہ رہا تھا کہ کہیں سکون سے بیٹھوں' تنہائی ہو اور جو کچھ ہو گزرا ہے اس پہ ذرا دھیان دوں ...... سچی بات تو یہ ہے کہ میں اصل میں دیسی گھی میں تلی ہوئی گرم گرم مُفتے کی اَمرتیوں کے لالچ میں آیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اندرونِ خانہ میری یہ خواہش تھی کہ میں اُن دونوں بزرگ ہستیوں کی زیارت کروں۔ میرے جیسے فقرے دوست نے مجھے جو کچھ بھی ان دونوں ہستیوں کے باری میں بتایا تھا' وہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور قریب ہو کر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ بابا رحمت سائیں کی زیارت اور اَمرتیوں والی تواضع و شفقت سے تو میں فیض یاب ہو چکا تھا' اب گھوڑے شاہ سرکار کے نکو سائیں کی زیارت باقی تھی۔ انہی کے بارے میں سوچتا ہوا میں مسجد کے دروازے کے پاس ہی ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے نیم دراز سا ہو گیا۔ پھر اللہ جانے میں کسی نمازی کی ٹھوکر سے اُٹھا' یا موذن کی اذان نے مجھے بیدار کر دیا تھا' آنکھ کھلتے ہی میں خالی الذہن سا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ نمازی سُنتیں پڑھنے میں مصروف تھے۔ سُستی اور جاگو میٹی میں کچھ اور وقت گزر گیا' آخر ایک بھرپور انگڑائی توڑ کر اُٹھا' طہارت اور وضو سے فارغ ہو کر سُنتیں ادا کرنے کی غرض سے کھڑا

ہوگیا۔ سُنتوں کے ختم ہوتے ہوتے جماعت کھڑی ہوچکی تھی۔ آخری تیسری صف میں ایک بچہ اور ایک بوڑھا کھڑے تھے' میں بھی جلدی سے ''اللہ اکبر'' کہہ کر ساتھ کھڑا ہوگیا۔ یہ عجیب سی نماز تھی۔ کچھ یاد نہ کوئی ہوش۔ کہاں قیام' رکوع اور سجود' کیا پڑھنا اور کیا کرنا ہے' کچھ بھی تو یاد نہیں تھا۔ جیسے میں پہلی بار نماز پڑھنے کھڑا ہوں۔ عجیب سی حالت...... میں نے اپنے آپ کو ساتھ والے نمازی پہ چھوڑ دیا۔ وہ جو کچھ کرتا میں اس کی نقل کررہا تھا...... نماز ختم ہوئی' سلام پھیرا تو دائیں جانب بابا رحمت سائیں اور وہی دوکان والا بچہ تھا۔ پھر بائیں جانب سلام پھیرا' اُدھر تو پوری صف ہی خالی تھی۔ آخری سرے پہ کوئی عجیب الخلقت بے ڈھب سا ڈھیر' انسان سجدے میں پڑا یا سویا ہوا تھا۔ دائیں جانب بابا رحمت سائیں کو دیکھنے سے جو جھٹکا لگا تھا' بائیں جانب دیکھنے سے اس کا اثر جیسے مدھم سا پڑ گیا تھا۔ ننگا' گوشت کے پہاڑ سا جُثّہ نیچے ستر پوشی کے لیے مختصر سا تہبند۔ گھٹا ہوا سر' عجیب سا ننگ دھڑنگ سا انسان!...... مجھے جاننے اور سمجھنے میں یہاں بھی کوئی دیر نہ لگی کہ یہ مجذوب بھولے شاہ کے ٹٹو ہیں جو ٹٹو سائیں بھی کہلاتے تھے۔ امام صاحب تسبیح کے بعد دعا فرمارہے تھے اور میں بے خبر سا ٹٹو بادشاہ کو دیکھ رہا تھا جو بے سُدھ سی حالت سجدہ میں پڑے ہوئے تھے۔ تبھی میرے دائیں کان میں شیریں سی آواز گونجی۔

''السلام علیکم...... بابا رحمت سائیں مجھ سے مخاطب تھے۔ اللہ کے ولی ''تم جلیبیاں کھانے اور مجھ سے ملنے آئے تھے' نہ تو تم نے پیٹ بھر کر جلیبیاں اُمرتیاں کھائیں اور نہ ہی مجھے ملے اور اِدھر بھاگ آئے۔'' وہ مجھے اُمرتیوں کا ایک دونا دیتے ہوئے بولے۔ ''لو کھاؤ' تمہارے لیے اور اُمرتیاں لایا ہوں۔ پیٹ بھر کر کھاؤ...... اور میں بالکل تمہارے پاس بیٹھا ہوں جی بھر کر مجھے دیکھو......''

وہ ذرا کھسک کر میرے سامنے ہوگئے...... اللہ کا بندہ' جسے نماز میں حضوری کی نعمت حاصل ہو' جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اُس کے چہرے پہ اللہ کی تجلّی و تجمّل کا ایک خاص نور جھلملاتا ہے۔ اُس کا چہرہ ایسا شفاف' مسکراہٹ ایسی ملکوتی اور لہجہ ایسا پاکیزہ اور پُر اثر ہوتا ہے کہ مخاطب وفورِ نیاز و تسلیم سے جھک سا جاتا ہے اور وہ اس نُور کا سرمدی سا ظہور اپنے وجدان پہ محسوس کرتا ہے' ایسی ہی کچھ کیفیت میری بھی تھی۔ میں بڑے سہج انداز سے اُن کے دیکھتے ہوئے رُخِ روشن کی تنویر اور لہجے کی پاکیزہ سی تاثیر کو بڑے مزے سے اپنے اندر جذب کررہا تھا۔ یہیں مجھے حکیم الامت کے اِس شعر کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا جس میں اُنہوں نے ایک مسلمان کے حُسنِ اخلاق کی اَساس کی نشاندہی فرمائی......

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دِل نوازی کا
مروّت' حُسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

مَیں نے اپنا خشک حلق تر کرتے ہوئے عرض کی۔

''بابا جی! کیا میرے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ میں اُمرتیاں کھانے سے پہلے ٹنو سائیں کی خدمت میں بھی پیش کرتا......؟''

بابا جی نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''اللہ کے ولی! یہ شرط صرف بیماروں کے لئے ہے' یاروں اور پیاروں کے لئے نہیں......''

''بابا جی! اجازت دیں تو ایک اور بات پوچھوں......؟'' مَیں نے ڈرتے ڈرتے دوسرا سوال داغ دیا۔

''بسم اللہ......'' بابا جی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے فرمایا۔

''بابا جی! آپ نے ایک اُمرتی پہ ''یاحیّ'' دوسری پہ ''یارشید'' اور تیسری پہ ''یارحیم'' رقم فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ مَیں فوراً کھالوں۔ اب آپ میرے لئے مزید اُمرتیاں لے آئے ہیں۔ مجھ ایسے نکمے اور نالائق......''

انہوں نے بڑی شفقت بھرا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے کچھ مزید کہنے سے روکا' اُمرتی کا ایک ٹکڑا میرے منہ میں رکھتے ہوئے اپنی کلام کے لہجے میں فرمایا۔

''اللہ کے ولی! چھوڑو ان باتوں کو' میٹھی میٹھی خستہ خستہ اُمرتیاں کھاؤ...... جب تم یہاں آئے ہی اُمرتیاں کھانے اور مجھے دیکھنے کے لئے ہو تو پھر پیٹ بھر کر کھاؤ اور جی بھر کر مجھے دیکھو...... اور ہاں' آئندہ خود کو نکما اور نالائق مت کہنا' تم تو اللہ کے ولی ہو......''

''بابا جی......!'' مَیں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ بار بار مجھے اللہ کا ولی کہتے ہیں جبکہ مَیں آپ کے قدموں کی خاک اور بہت ہی......''

''اللہ کے ولی!...... اللہ کے ولی کا مطلب اللہ کا بندہ اور دوست بھی ہوتا ہے...... ویسے یہ میرا تکیہ کلام ہے۔ مَیں تو محمد یحییٰ کو بھی اللہ کا ولی کہتا ہوں۔'' وہ پاس بیٹھے ہوئے بچّے کو چھوتے ہوئے بولے۔

''جی...... اس کا نام بھی محمد یحییٰ ہے؟'' یکبارگی میرے منہ سے نکلا۔

''اللہ کے ولی! ایک تم ہی تو نہیں' اور بھی بہت سے محمد یحییٰ ہیں...... چلو' سب سے پہلے اس بات کا بھی جواب لو جو تم نے پوچھی تھی کہ اُمرتیوں پہ یاحیّ' یارشید اور یارحیم لکھا ہوا تھا۔ یہ اسماء مبارک ''محمد یحییٰ خان'' کے اعداد سے ترتیب پاتے ہیں جو جسمانی' رُوحانی عوارض میں اسمِ شفا ہیں...... اللہ کے ولی! کچھ سمجھ میں آیا؟...... مَیں تو ہر طلب کرنے والے کو اس کے نام کے اعداد کے مطابق اسماء الٰہی کو اُمرتی پہ

کر کے دیتا ہوں' اللہ کے فضل سے یہی اسم' اس کا اسم اعظم بن جاتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ اُمرتی اور اس پہ اسم نقش کرنا' پھر سائیں ٹنو سرکار کو اُمرتی پیش کرنا اس سوہنے رَبّ سے اس کی رحمت اور فضل طلب کرنے کا ایک بہانہ بن جاتا ہے اور مریض اللہ کے کرم سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔''

یہ باتیں سُن کر میری تو مت ماری گئی' کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا' ہمت کر کے پوچھنے کی جرأت کر بیٹھا۔

''سائیں جی! میں نہ کبھی آپ کے سامنے آیا' نہ ہی کبھی ملا پھر آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا اور جب کہ میں ایک ریڑھے کی اوٹ میں تھا' آپ نے یہ سب کچھ کیسے جانا کہ کوئی محمد یحییٰ خان آپ کے ہاں مٹھائی کھانے آیا ہوا ہے اور آپ کو دیکھنا اور ملنا بھی چاہتا ہے......؟''

''اللہ کے ولی! تم کس اُلجھن میں پڑ گئے ہو' ایسی باتوں پہ غور اور سرکھپائی کرنا محض وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ ہمیں کوئی کام کی بات کرنی چاہئے جس سے اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا کوئی پہلو نکلتا ہو...... ویسے جو باتیں تم نے پوچھی ہیں وہ تو میرا کُتّا بھی جانتا ہے۔''

''وہ ...... کاش کُتّا ہی آپ کی دوکان کے باہر ......؟'' میں تو جیسے گڑبڑا گیا [illegible]

وہ بڑی شفقت سے کہنے لگے۔ ''اللہ کے ولی! یہ ظاہری باتیں ہیں بالکل ظاہر کی باتیں...... انسان کا سب کچھ اس کے ماتھے پہ رقم ہوتا ہے۔ دِل و دماغ کی کیفیات اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہیں' اس کی باتوں سے کچھ سراغ اس کے سراپے سے بھی ہویدا ہوتے ہیں۔ بھوک' پیاس' حرص و ہوس' طمع لالچ' مطلب' غرض' عیاری' مکاری' بہادری' بزدلی' حسب نسب' اصل نسل' ذوق' ظرف' مقام' وزن' سب کچھ اس کے چہرے بشرے سے پسینے کی طرح نکلتے ٹپکتے اور پھوٹتے رہتے ہیں بس دیکھنے' سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے نگاہ اور دِل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ غائب...... پردے' اوٹ اور وقت کے آگے پیچھے کی باتیں تو صرف مالکِ ازل و ابد وحکمت وحق ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ جب چاہے' جتنا چاہے اور جسے چاہے عطا کر دے' بے شک وہ علم و تدبر کی نعمت اور بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔''

''سُبحان اللہ......!'' میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''سائیں جی! میں بے علم اور کچا ہوں' میرے مُنہ سے کوئی اُوٹ پٹانگ غلط سلط بات نکل گئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے گا میں تو......''

وہ پھر میری بات لپکتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''اللہ کے ولی! تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟...... تم نے کوئی غلط بات نہیں کی اور نہ ہی تم بے علم اور کچے ہو۔ تم تو راہِ حق و معرفت کے معصوم سے طالب علم ہو' میں تو خود تمہاری دُعا کا طالب ہوں۔ میرے لئے دُعا کرو کہ اللہ کریم مجھ گنہگار عاجز کو نورِ ہدایت سے

نوازے...... ''پھر وہ ٹنو سائیں کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ''...... اور میرے باباجی مجھ سے راضی کریں......''

یہ کہتے ہوئے وہ ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگے۔ انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میری بھی عجیب سی کیفیت...... ایک بزرگ جو خود سلوک و معرفت کے بحور کے پرانے شناور، وہ میرے جیسے شرارتی، نالائق، آوارہ منش کا ہاتھ تھامے بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہے ہیں اور وہ جنہیں راضی اور خوش رکھنا چاہتے ہیں، جن کی نظر التفات کے متمنی اور منتظر ہیں یعنی ٹنو سائیں ! وہ ایک گوشت کے پہاڑ کی صورت کسی لمبے ہی سجدے میں پڑے یا پھر بے سُدھ سے سوئے ہوئے تھے۔ کوئی حرکت نہ کروٹ۔ تہہ بہ تہہ تھل تھل، جسم جیسے کوئی وہیل سمندر کے کنارے پڑی ہو۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں...... یاالٰہی! ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ روتے ہوئے بچوں کو بہلا پھسلا کر چپ کرواتے ہیں مگر کسی بزرگ کو بچوں کی مانند بلک بلک کر روتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا جو ایک بچے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اس سے دُعا کی التجا بھی کر رہا ہے۔ جس کے پاس روزانہ سینکڑوں حاجت مند دُعا کے لئے آتے ہیں، جو ہر اللہ کے بندے کو اللہ کا ولی کہتا ہے...... پھر میں نے اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ دیا۔ بچے اور عاشق ان بیچاروں کے پاس یہی کچھ تو ہوتا ہے۔ چپ رہتے ہیں یا رونے لگتے ہیں اور اگر اس سے بھی جان نہ چھوٹے تو پھر خاموشی سے اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دیتے ہیں، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنا سر سلامتی کے لئے رکھتا ہے اور عاشق اپنا سر اُتار کر سلامتی کے لئے رکھتا ہے...... سائیں جی نے میرا سر اپنے زانوں پر دھر لیا، پولی پولی اُنگلیوں سے میری پیشانی سہلانے لگے۔ سر کے تالو سے پاؤں کے انگوٹھے تک اک کافوری لہر سی سرسرا گئی۔ اللہ کے ولیوں کی آنکھوں اور اُنگلیوں کی پوروں میں اک عجیب سی مسیحائی ہوتی ہے۔ آنکھیں خود بخود مُندھنے لگیں۔ رگ و پے میں لہو کی بجائے جیسے کافوری دُھواں دوڑنے لگا تھا۔ کہاں کا ہوش، کدھر کی عقل و دانش، عذاب و ثواب اور اندیشہ ہائے سُود و زیاں، سب کچھ جیسے گڈمڈ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ہونے، نہ ہونے کی کسی درمیانی اکائی میں بٹ چکا تھا، ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا وجود میرے جسم کے خول سے نکل کر لاکھوں کروڑوں لطیف سے سالموں کی شکل میں تقسیم ہو کر کائنات کی بیکراں پنہائیوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ اس کیفیت کی کوئی صحیح سے تشریح و توضیح نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ہی اس کے سیاق و سباق کسی ضبطِ تحریر و تصویر میں لاناممکن تھے لیکن اس کے باوجود میرے اندر کوئی دریچہ، کوئی کھڑکی، آنکھ ایسی ضرور کھلی تھی جو مجھے اس عالم استغراق میں بھی قدرے ہوش و شعور کا ادراک بخشے ہوئے تھی۔

اب میں محسوس کر رہا تھا کہ عالمِ بالا سے آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہوں' بادلوں کے نرم نرم گالوں سے گزرتا ہوا بابا رحمت سائیں کے گداز زانوؤں پہ آ ٹکا ہوں جہاں سکون اور رُوحانی طمانیت کا ایک جاں فزا سا احساس تھا جو اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوا...... جب جسم و جان سکون پکڑ لیں۔ فہم و ادراک' احساس و خیالات قلفی کی مانند جم سے جائیں تو وجدان' عالمِ وجد میں جھلیں لینے لگتا ہے' بندہ چاروں کھونٹ نچنت سا ہو کر پڑا رہتا ہے جیسے ٹنو سائیں پڑے ہوئے تھے...... آنکھ کھلی تو عصر کا وقت لگ چکا تھا۔ بابا رحمت سائیں سرکار نے بڑے پولے سے انداز میں زانو سرکاتے ہوئے فرمایا۔

"بیٹا! خوب سکون لے لیا۔ اب اُٹھو' طہارت وضو سے فارغ ہو لو۔ جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔"

آنِ واحد میری نگاہ ٹنو سائیں کی جانب اُٹھی وہ تو اسی طرح بے سدھ تن کے پڑے ہوئے تھے جیسے گٹھڑی اُٹھیں گے۔ اچانک میرے منہ سے نکل گیا۔

"سائیں جی! ٹنو سائیں نماز نہیں پڑھتے......؟"

بابا نے میری جانب یوں دیکھا کہ جیسے میں نے کوئی بہت ہی نامناسب سوال کر دیا ہو۔ ان کے چہرے پر ایک عجب سا رنگ در آیا وہ میرے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھتے ہوئے بولے۔

"بیٹا! تم صرف اپنی نماز کی طرف دھیان رکھو' سرکار کی نماز پہ دھیان رکھنا تمہارا کام نہیں......"

• الٰہی! یہ کس نگر کے وسنیک ہوتے ہیں

نماز سے فارغ ہوئے تو ہم ٹنو سائیں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ بابا رحمت سائیں نے بڑے ادب سے سلام کیا اور پولے پولے پاؤں دابنے لگے' ادھر کوئی حرکت نہ وعلیکم السلام کی برکت' جیسے محض خالی جسم پڑا ہوا ہے اور اندر جان و رُوح موجود نہ ہو...... میرے جی میں بھی آیا کہ میں بھی پاؤں دابوں مگر ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی' یہی سوچ رہا تھا کہ یکبارگی ایک بھاری سا پاؤں میرے گھٹنے پہ یوں آ پڑا جیسے کسی نے پوری دھرتی کا بوجھ میری ٹانگ پہ ڈال دیا ہو۔ میں نے مسمسی سی صورت بنا کر بابا رحمت سرکار کی جانب دیکھا تو اُنہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے ٹنو سائیں کا پاؤں دابنے کا حکم دیا...... پاؤں کیا تھا بس ہاتھی کے پاؤں ایسا کھردرا' سخت' میلا۔ تلوے' ٹخنے پہ بڑی بڑی سیاہ گانٹھیں' بڑھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے میل سے بھرے ہوئے ناخن جیسے کئی برسوں سے نہانے دھونے کا تکلف نہ کیا ہو۔ طبیعت

میں ایک عجیب سا تکدّر پیدا ہوا۔ پاؤں سے نظر ہٹائی' بابا رحمت سائیں کی جانب دیکھا تو وہ دوسرا میل کچیل سے بھرا ہوا پاؤں اپنی گود میں رکھے ہوئے بڑے خضوع کے ساتھ نرم نرم پوروں سے داب رہے ہیں۔ چہرے پہ ایسی طمانیت اور انکسار کہ شکر مالک' آج یہ خدمت کی نعمت ہاتھ آئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسوؤں سے جیسے وہ ان کے پاؤں دھو رہے ہوں...... میں اس دید تماشے میں مگن' سوچ رہا تھا کہ مالک! یہ کس بستی کے وسنیک ہیں' یہ کیسے سلسلے اور منزلیں ہیں؟ تیرے ان پُراسرار بندوں کے قول و فعل کی یہ حالتیں کم از کم میری سمجھ و عقل سے بالا ہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ہوتا نہیں اور جو ہے وہ نہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ نظر میں' جو ظاہر نماز پڑھتا ہے وہ پاؤں داب رہا ہے اور جو بظاہر غافل سویا ہوا ہے اور نماز پڑھتا نظر نہیں آتا وہ پاؤں بھی دبوا رہا ہے۔ الٰہی! یہ کیسا تماشا' عقیدت اور یقین ہے

جاگنے والے کو محروم دو عالم رکھا
سونے والے سے کہا جا ساری خدائی تیری

بابا رحمت سائیں جس انہماک' عقیدت اور سرشاری سے اشکوں کے نذرانوں کے ساتھ ٹنو سائیں کے پاؤں [illegible] پاؤں پہ میں جھکا ہوا تو میں بھی اپنی بساط اور اوقات سے وہی کچھ کر رہا تھا جو بابا رحمت سائیں کر رہے تھے۔ وہ اندر باہر سے بھیگے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں تمنا کی' انہماک اور سرشاری تھی جس سے میں خالی اور اندر باہر سے خشک تھا۔ ادھر سرور ہی سرور' کیف ہی کیف اور میرے ہاں مکدّر اور بے کیفی...... بظاہر گندہ بے ڈول سا پاؤں' تہہ بہ تہہ میل' کئی پھٹی سی جلد جو شاید [illegible] ننگے پاؤں اور نہ نہانے کی وجہ سے ہو گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے ٹیڑھے میڑھے ناخن' ٹائر کی مانند سخت تلوا...... سچی بات یہ تھی کہ میری طبیعت متلا رہی تھی' بے دلی سے لگا ہوا تھا کہ ماحول ہی کچھ ایسا بن گیا تھا اور پھر بابا رحمت سائیں نے بھی تو پاؤں دابنے کا اشارہ کیا تھا۔ میرے اس طرح سے جی بیزار کر لینے میں کچھ میرا قصور نہ تھا' میری طبع ہی ایسی تھی کہ پل میں پارا اور اگلے پل ٹوٹا تارا۔ مزاج میں تلوّن' دو دھاری تلوار کی طرح دھرا ہوا تھا۔ جان سے عزیز دوست کو دشمن بنانے میں صرف اور صرف دو منٹ درکار ہوتے تھے اور کچھ ایسی ہی کیفیت و کلفت اس کج سے بھی در آئی تھی' ادھر بابا رحمت سائیں نے بھی چُپ سی سادھ لی تھی۔ میں رسّی تڑوا کر بھاگنے کی سوچنے لگا کہ کہیں ذرا سا موقع ملے تو میں رفو چکر ہو لوں۔ اس وقت تو نہیں لیکن بہت آگے جا کر یہ ادق بات اور باریک نکتہ سمجھ میں آیا کہ اس قسم کی رُوحانی کیفیات میں جہاں طالب' مادیت اور ظاہریت کے حصار سے نکل کر رُوحانی کیفیت و تصرفات سے ملتفت ہونے لگتا ہے تو شیطان اسے بیزاری کی کیفیت میں دھکیلنے کی کوشش میں ذہنی

...یہ شروع کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ تو یہ ہوتا ہی رہتا ہے' شاید آپ بھی کبھی اس کیفیت سے گزرے ہوں کہ جونہی حالتِ نماز میں کچھ لطف اور حضوری کی خوشبو آنے لگتی ہے تو فوراً ہی کسی فاسد خیال وحال کی ...پھیل جاتی ہے۔ بیتی باتیں' گزرے واقعات' بھولی بسری صورتیں' ناکام عشق' لینا دینا' ذہن سے اُترے ہوئے شعر۔ شیطان اس وقت دماغ کی سکرین پہ ایسے ایسے ''ٹوٹے'' چلاتا ہے کہ نمازی بھونچکا سا ہو کر محض ٹکریں مارتا رہ جاتا ہے۔ قرآن الحکیم کی تلاوت' تسبیح' ذکر اذکار' نوافل یا کوئی رُوحانی مجلس' ہر وہ عمل یا سلسلہ' جو آپ کے لئے برکت' ثواب اور خیر و خوبی کا موجب بن سکتا ہو' اللہ کی خوشنودی یا کسی بزرگ کے تصرف و فیض سے کچھ حاصل ہونا ہو وہاں یہ ابلیس الرجیم ضرور اپنی شیطانی کارروائی ڈال کر آپ کو محروم کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اگر دیکھے کہ مقابلہ ذرا سخت ہے تو پھر اپنا ترپ کا پتا پھینکتا ہے' تحقیق' تجسّس' تماشے کے ایسے ایسے سین فریم کرتا ہے کہ عبادت و ریاضت کرنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بیچارہ تلملا کر رہ جاتا ہے۔ راہِ راست سے بہکانے کے اس کے پاس کئی رنگ ڈھنگ ہیں۔ بندہ دیکھ کر اپنا داؤ آزماتا ہے۔ کہیں دہشت ڈالتا ہے تو کہیں وحشت آزماتا ہے کہیں سستی پیدا کرتا ہے تو کہیں نیند کا غلبہ وارد کر دیتا ہے۔ غرور و سرور' رغبت' نفرت اس کے آزمودہ حربے ہیں۔ مجھے بھی اس خبیث شیطان نے [illegible] گندے پاؤں' میلے کچیلے اور جسم و لباس سے اُٹھنے والی بدبو سے طبیعت میں تکدر سا پیدا ہو گیا اور دل میں یہ خیال جاگزین ہو گیا تھا کہ ان کا پاؤں چھوڑ کر فوراً یہاں سے بھاگ لوں...... اچانک میرے ہاتھوں کے نیچے ہلکی سی حرکت ہوئی' پھر کھڑپ سے شُوسائیں کا پاؤں میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر بابا رحمت سائیں کی گود میں جا پڑا' جیسے قابو آئی ہوئی مچھلی لہراتی' کسمساتی' پھسلتی ہوئی واپس دریا میں اُتر جاتی ہے اور کنارے پہ کھڑا ہوا نامراد اپنی ناکامی کے احساس سے اپنے خالی ہاتھوں کو محض دیکھتا رہ جاتا ہے۔ میں بھی اپنے ہاتھوں اور کبھی ان کے پاؤں کو دیکھتا رہ گیا' غیر ارادی طور پہ میرے ہاتھ پھسلی ہوئی مچھلی کے تعاقب میں اُٹھے' بابا رحمت سائیں نے بڑی پیاری ملکوتی سی مسکراہٹ اور چہرے کی خفیف سی جنبش سے مجھے روک دیا' مچھلی دریا میں اُتر چکی تھی۔ اسی کھٹکتے لمحے مجھے اپنی حماقت اور بدنصیبی کا شدید احساس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا' زماں کی حدود سے وقت' ہاتھ کی گرفت سے مچھلی' کمان سے تیر اور مُنہ سے بات نکل جائے تو اس کی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ تاب ہزیمت نہ لاتے ہوئے میں نے انتہائی بے چارگی سے بابا جی کی جانب دیکھا' میری نظروں سے نظریں ملتے ہی انہوں نے اپنی آنکھوں کو حجاب دے دیا۔ میرا تو جیسے کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بڑے مُردہ سے لہجے میں عرض کی۔

"سرکار! میرے لئے کیا حکم ہے......؟"

پھر کافی دیر تک میں اُن کے جواب کا منتظر رہا لیکن وہاں اک خامشی تھی ہر اک کے جواب میں...... خود پہ نفرتیں بھیجتا ہوا وہاں سے اُٹھ آیا۔

● وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی......!

یہ میرے لڑکپن کے نم و نمو کا زمانہ تھا۔

میں پرائے پھڈوں میں پاؤں پھنسانے والی بُری عادت، خوامخواہ پنگا لینے والی بدعت، آوارگی، خودسریوں اور فوق العقل و فطرت دلچسپیوں کی وجہ سے اچھا خاصا بدنام و بدحال تھا۔ اسلامیہ سکول کی انتظامیہ نے ہمیں نہ جانے کتنی بڑی "عزت" سے فارغ التحصیل کر دیا ہوا تھا کہ یہ عام سا سکول اس خاص سے بچے کے لائق نہیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر علم دین صاحب کے خیال کے مطابق ہم اس شیطانی سے (حالانکہ عربی کے اُستاد مولوی جن نے ہمیں "رُوحانی بچہ" کا خطاب دیا ہوا تھا اور ہم سکول میں رُوحانی بچہ مشہور تھے) [illegible] تھا جبکہ [illegible] جناب [illegible] لعین صاحب تھا۔ ماسٹر علم دین کے علم کے مطابق، فرش و عرش کی یہ درسگاہیں ہم ایسی نابغۂ روزگار طباع ہستیوں کی "دانش شیطانی" کی آبیاری کے لئے چنداں موزوں و ملزوم نہ تھیں، بس اسی خدشہ کو نظریہ ضرورت بنا کر اُنہوں نے ہمیں اپنی اجل علم [illegible] کی درس گاہ سے محروم کر دیا ہوا تھا (وہ بڑے خلیفہ قسم کے پُرانے پیشہ خوش تھے، ہر وقت عطر تمو مین کے تے آور بھینڈی بدبو میں رچے بسے رہتے تھے) ان دنوں ہم اک کٹی پتنگ کی مانند ڈانواں ڈول بھٹک رہے تھے۔

دراصل یہی درس گاہ ہماری "جولان گاہ" تھی جس کے عین سامنے بیری کے درختوں کے بہت بڑا قبرستان، چوبِ خشک و تر کا اوپن ایئر ذخیرہ اور لائسنس یافتہ ٹھیکیدار کا چنڈو خانہ تھا۔ بائیں بغل میں میوہ منڈی، دائیں جانب یتیم خانہ اور موتی محل سینما...... اس سے ذرا آگے ریلوے اسٹیشن اور اس سے ذرا ہی پرے بازارِ حُسن تھا۔ ایسے "علم و عرفان اور عاقبت پرور" ماحول سے تھپٹ کر ہمیں اک عجیب سا ذہنی اور جذباتی جھٹکا لگا ہوا تھا۔ سکول کے قُرب و جوار سے گزرنا بھی متروک ہو چکا تھا، مبادا اس علاقے کے دوکانداروں، چھابڑی اور ریڑھی والوں سے کوئی پھڈا پڑ جائے۔ دُنیا کا پرانا طریقہ ہے کہ نکالے جانے والوں کی پیٹھ پہ بدخواہوں، بدخلقتوں کے بڑے لمبے لیکھے نکل آتے ہیں اور آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ گھر

نوکری اور دل سے نکالے جانے والوں کے نامۂ اعمال میں وہ کچھ بھی لکھ دیا جاتا ہے جس کا ے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتا۔ فراڈ سکینڈل' لینے دینے کے حساب کتاب پہ اپنے بل' گلے شکوے' ان نسب میں کیڑے' کوئی ناجائز بیوی بچے' وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا' کوئی دفترِ شکایات کھولے آ رہا ہے تو کوئی شکووں کے انبار لئے اور کچوریوں کے سوا تین روپے بقایا بتا رہا ہے اور کوئی ساڑھے سات روپے نقد دستی اُدھار کا بیٹھا ہے۔ کئی ایک بے ایمان' مکار' جھوٹے اپنی کتابوں کی شکایت لے کر گھر پہنچے کہ ہم نے عاریتاً لے کر واپس نہیں لوٹائیں' انہیں خدشہ بلکہ کامل یقین تھا کہ وہ کتابیں ہم نے بیچ کر کھا پی لیں یا بیچ چکے ہیں (جھوٹے کہیں کے!) سکول کی جانب سے امام دین ہیڈ چپڑاسی کئی بار گھر بھیجا جا چکا تھا کے لئے چارٹ بنوانے کے لئے ہم دس روپے لے کر علی حسین پینٹر کے پاس گئے تھے کہ وہ تھا مگر علی حسین پینٹر کہتا ہے کہ میں اُلٹا اس سے دو روپے اس مد میں وصول کر چکا ہوں کہ میں سے چارٹوں کا کام لے کر دوں گا۔ امام دین چپڑاسی پچھلا حساب یعنی سکول کی کانسی کی گھنٹی وزن کلو جس کو ہم اپنے چچا کی ورکشاپ میں لے گئے تھے کہ اس میں برقی سے نیا سوراخ [illegible] کام چلایا جا رہا پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں کے فوراً بعد کا تھا۔ سکول والوں کو پکا یقین تھا کہ ہم وہ گھنٹی کلو کی وزنی بدھی بازار کباڑیوں کے ہاں پیتل کے بھاؤ فروخت کر کے ڈکوس چکے ہیں۔ اسی قسم کے کئی وارداتیں مثلاً ایک دو مرغیوں کی چوری کے چکر' کنک منڈی سے والد صاحب کا نام لے کر ہیں لے آیا تھا' رحیم تیزاب والے سے آٹھ آنے کی پوٹاش' دودھ دہی اور مٹھائی والوں کی شکایتیں۔ واردات یا الزام کہ ہم نے سویٹر بننے والی آٹھ نمبر کی سلائی سے دادی ماں کے صندوق کا تالا کھولا زم زم سے بھگوئے ہوئے کفن کے اندر تہہ در تہہ لپٹے ہوئے بیس روپے کے کرنسی نوٹ سرقہ کر دادی ماں نے بطور مرنا جینا کفن کے اندر رکھے ہوئے تھے۔ بس ایسی اشتعال آمیز باتیں' تہمتیں کرتی جو چڑھا تو اگلی صبح' چاچی کی اجازت سے لاہور جانے والی باؤ ٹرین پہ چڑھ گیا۔ جس جا پہ فقیر سادات'' پہ حرف آتا ہو' جس شہر کے لوگ الزام تراشی کو اپنا شیوہ بنا لیں' چھوٹی چھوٹی باتوں کو شت نہ کر پائیں۔ مرغیوں کو انسانوں پہ فوقیت دیں' مذاق میں ہی دو چار برس کے اُدھار پہ دیوالیہ ہوا سب سے بڑی بات کہ گھر والے اپنے لختِ جگر کی بجائے باہر بازار والوں کی اَنٹ شنٹ' شکایتوں سر و پا باتوں پہ کان دھر کے لتے لینے شروع کر دیں تو ایسے گھر' ایسے بے قدر شہر اور اس کے

بے مروّت باسیوں سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ بندہ بن باس لے لے۔

● لاہور شریف' نہیں جس کا کوئی حریف......!

میرا خیال ہے' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیالکوٹ سے لاہور کے نواحی سٹیشن بادامی باغ (بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے زیادہ تر یہیں اُترتے ہیں) تک ہم ٹی ٹی سے اور وہ ہم سے کیسی دلچسپ آنکھ مچولی اور "لُک چھُپ جانا مکئی دا دانہ" کھیلتے ہوئے پہنچے تھے۔ بادامی باغ سے پیدل' ٹوٹے ہوئے سلیپر گھسیٹتے ہوئے داتا سرکار رحمتہ اللہ علیہ کے قدموں میں پہنچے' فاتحہ اور لنگر ناشتہ کے بعد دَم کی دُم کھر سیدھی کی۔ جمعرات کا روز تھا' پیچھے صحن میں قوال بیٹھ چکے تھے۔ طبلے پہ تھاپ پڑی تو میں اٹھ کر وہاں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا' پھر وہاں سے چوکھٹ کی سیڑھیوں تک آیا۔ اب میری نظریں کسی اچھے جوتے کی جستجو میں تھیں۔ میرا ٹوٹا ہوا چپل جس کو پہن کر چلا نہیں بلکہ پاؤں کو صرف گھسیٹا ہی جا سکتا تھا' اب میں اس سے پاؤں چھڑانا چاہتا تھا۔ سائز' ڈیزائن اور کلر شیڈ مسئلہ نہیں ہوئے تھے' عالم میں چوکھٹ کے اندر کھڑا دعا پڑھ رہا تھا' لیکن اصل میں چھپے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان سے زائرین کے اُتارے ہوئے جوتوں کو نظروں سے ٹٹول رہا تھا لیکن ہنوز کوئی جوڑا نظروں میں جچا نہیں تھا...... یہ تو داتا' سرکار کا دربار ہے۔ جو جس نیت و نگاہ سے آتا ہے' اُسے وہی ملتا ہے تو میں کیسے محروم رہتا۔ اچانک ایک جنٹلمین سامنے آیا۔ شکل صورت' لباس جوتے سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا دکھائی دیتا تھا' میرے قریب ہی کھڑے کھڑے اس نے اپنی قیمتی مکیشن اُتاری' جرابیں نکال کر جوتوں میں رکھیں اور سر پہ رومال باندھ کر روضہ مبارک کی جانب بڑھ گیا...... واہ' داتا سرکار! میرا ہی سائز' سیاہ چمکدار لش کرتی ہوئی تقریباً زیرو میٹر مکیشن اور وہ بھی میرے پاؤں سے بالشت بھر کے فاصلے پر۔ کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔ تیز تیز زاویئے سے دیکھا' وہ لڑکا کہیں نظر نہ آیا اور بس یہی وہ مطلوبہ لمحہ تھا۔ مُرغی چور' جوتا چور اور جیب تراش اس زرّیں لمحے کی قدر و قیمت سے خوب آشنا ہوتے ہیں۔ میں اگلی چند ساعتوں میں سیڑھیوں سے نیچے تھا اور میرے تیز تیز قدم بھاٹی چوک کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ میری مست خرامی قابلِ دید تھی' یہ داتا سرکارؒ کے جوتوں کا اعجاز تھا یا لاہور پہنچنے کی خوشی؟...... بھاٹی چوک تک پہنچتے پہنچتے میں فراموش کر بیٹھا کہ میرے پاؤں کے نیچے جو پیزار ہیں وہ "سرقہ بالخواہش" ہیں اور لاہور میں یہ میری پہلی "حرکت بالضرورت" تھی۔ انتہائے ضرورت یا حاجت میں ایک حد تک تو یہ کچھ جائز ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ

میں انارکلی کے سامنے مسلم مسجد کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں سیالکوٹ سٹیشن کے سامنے ملک نیوز ایجنسی کی برانچ تھی' اس کا نام بھی ملک بک ڈپو تھا جس کے مالک سیالکوٹ کے مشہور صحافی ملک محمد اسلم صاحب تھے۔ کئی بار میں پہلے بھی یہاں والد صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ اس دوکان کا انچارج فرید نامی ایک شخص تھا۔ عجیب ملنگ سا...... اَدبِ لطیف کے مرزا ادیب کے دفتر والی بلڈنگ کے ایک کمرے میں اس کی رہائش تھی۔ واجبی سی واقفیت کی بنیاد پہ میں اِسے دوکان پہ بیٹھے دیکھ کر رُک گیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے دوکان پہ بلایا۔ تپاک سے ملا' اندر کاؤنٹر کے پیچھے سٹول پہ بٹھایا۔ حال چال پوچھا' بتایا کہ ابھی ابھی پہنچا ہی ہوں۔ میرے انکار کے باوجود اس نے میرے لئے سامنے چوک سے فالودے کا جل تھل پیالہ منگوالیا اور پوچھنے لگا کہ لاہور کیسے آنا ہوا؟

"بس بھائی! کیا کہوں کہ کیسے اور کن حالات میں آیا ہوں...... اگر کرسکو تو میرے لئے کسی چھوٹی سی نوکری اور رات سونے کا کہیں بندوبست کر دو......"

وہ میری جانب دیکھے بغیر کمال لاپروائی سے بولا۔ "بچے! بندوبست تو سارا ہو جائے گا' مگر یہ بتاؤ گھر سے بھاگ کر آئے ہو یا......؟"

"فرید بھائی! آپ سے تو جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ آپ کو پتا ہے کہ میرے والد صاحب بڑے ملک صاحب کے دوست ہیں......"

"ہاں ہاں' کاکا! مجھے پتا ہے' اسی لئے تو میں پوچھ رہا ہوں کہ گھر سے بھاگ کر آئے ہو یا واقعی نوکری کرنے......؟"

"فرید بھائی! میں سیالکوٹ سے تنگ آ گیا ہوں...... سیالکوٹ کا کوئی سکول مجھے قبول نہیں کرتا۔ محلے والے مجھ سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ مجھ پہ نہ تو کوئی اعتبار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اُدھار دیتا ہے اور نہ ہی چاچی کے علاوہ کوئی مجھ سے پیار کرتا ہے...... ان حالات میں سوائے گھر سے بھاگنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

وہ بدستور حساب کتاب کرتے ہوئے' مجھے دیکھے بغیر زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"یہ چاچی کون ہے......؟"

"بس وہ میری چاچی ہے' دُنیا میں واحد ہستی جو میری ایک لاکھ بُرائی کے باوجود بھی مجھے سوا لاکھ کا بدخشان سمجھتی ہے۔ میری چاچی کا ہر فلسفہ اور ہر معاملہ عجیب وغریب سا اور اُلٹا ہے۔"

فرید نے انوائس بک دراز میں پھینکتے ہوئے بھاری شیشوں والی عینک کے پیچھے سے مجھے گھورا'

گول گول آنکھوں میں عجیب سی حماقت کے علاوہ حیرت بھی تھی۔ موٹے موٹے بھدّے ہونٹوں کے پیچھے سے پانی کی پچکاری سی سُرکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''......مثلاً ہر فلسفہ' معاملہ کیسے اُلٹا ہے......؟''

''مثلاً ایسے کہ وہ کہتی ہے' نیک پارسا لاکھ کا اور گنہگار خطاکار سوا لاکھ کا...... اچھے کو مت چھوؤ لیکن بُرے کو سینے سے لگا کر اتنا بھینچو کہ وہ بھنڈی کا بیج بن کر رہ جائے...... فرید بھائی! آپ کچھ سمجھے؟''

- دریائی گھوڑا' کچّی اینٹ پکّا رَوڑا......!

موٹے شیشوں اور بھاری فریم کی عینک پہننے والے بڑے بڑے گاؤدی سے دکھائی دیتے ہیں' ایسے لوگوں کے کان ہاتھیوں جیسے' ہونٹ سُرخ موٹے بھدّے' ہونٹوں اور مسوڑوں کی درمیانی خندق میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا ہے۔ آنکھیں جنوں کی طرح گول اور کسی بھی تاثر سے یکسر خالی' پیشانی تنگ' گردن گینڈے سی ہوتی ہے مگر ایسے لوگ بڑے ہمدرد' مخلص اور اچھے بُرے وقت ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ فرید بھائی بھی سپاٹ طلوع ہونے سے پہلے ہی ہوش سنبھالتے' پڑے پڑے ہی نیم بیدار ہو کر چار پانچ گھٹیا قسم کی سگریٹوں کا خالص نکوٹینی ناشتہ کرتے۔ پھر بیت الخلاء میں تسلی سے بیٹھ کر' بسیط خلاؤں کو گھورتے ہوئے مزید ایک آدھ سگریٹ سے خلال کرتے۔ بڑی تگ و دو اور پہلو بدل بدل کر ''اجابت بھاریہ'' سے خلاصی پا کر' پُستک بغل میں دابے کر یہ اخبار میں اپنی دوکان پہ بیٹھ جاتے اور ملک بھر کے اخبار رسالے' کتابیں اِدھر اُدھر کرتے۔ گلاسوں پہ گلاس چائے' سگریٹ کے پیچھے سگریٹ کی چین۔ اُبھرتے سورج کی زرد کرنوں میں سپیدی کی جھلک پڑتے ہی یہ تام جھام سمیٹ کر ذرا سامنے دوکان پہ آ براجتے۔ پھر سارا دن سوئے سوئے' کھوئے کھوئے' رَوئے رَوئے رہتے۔ ایسے خدائی مارے دین کے ہوتے ہیں نہ دُنیا کے لگائی سے لگا کھاتے ہیں نہ بھرجائی کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ وقت سے پہلے گنجے' توند یلے اور اندھراتے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد فرمانے لگے۔

''تمہاری یہ عجیب و غریب فلاسفری چاچی کہاں رہتی ہے اور کیا تم مجھے اس سے ملا سکتے ہو؟''

''نہیں' یہ نہیں ہو سکتا......''

''کیوں......؟'' وہ آنکھوں میں حیرت کی کرچیاں دکھاتے ہوئے بولا۔

''...... اس لئے کہ وہ صرف میری اپنی پیاری' اکلوتی چاچی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کسی

دریائی گھوڑے سے نہیں ملتی......''

بے سوچے سمجھے میرے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ فرید کے لٹکے ہوئے ہونٹ کے کنارے سے مسلسل پانی قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا تھا' آستین سے پونچھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کہیں تم نے مجھے دریائی گھوڑا تو نہیں کہا......؟''

جھٹ سے چاچی کی گھورتی ہوئی آنکھیں میرے سامنے آ گئیں' مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا' وہی مکیشن والا لڑکا اچانک سامنے پہنچ کر دوکان کے تھڑے پہ چڑھ آیا۔ اسے دیکھ کر میری تو ہوا سرک گئی۔ پاؤں میں پڑی مکیشن جیسے کسی فولادی شکنجے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہ تو وہی داتا صاحبؒ والا لڑکا تھا' وہ آتے ہی سلام دُعا لئے بغیر بولا۔

''فرید صاحب! آج کوئی انتہائی شریف آدمی میرا نیا جوتا اُٹھا کر لے گیا ہے......'' وہ اپنے ننگے پاؤں دکھاتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ ''فرید جی! میں نے ابھی اُس کے پیسے بھی نہیں دیئے تھے۔ پرسوں ہفتے کے روز انٹرویو کے لئے جانا تھا۔ آج جمعرات تھی' سوچا کہ چلو' داتا صاحبؒ جا کر اپنی کامیابی کے لئے اِلتجا کرتے ہیں۔ نئے کپڑے' نیا جوتا پہن کر گیا تھا کہ داتا صاحبؒ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے کہ اپنے بیٹے رئیس نے بھی نئے کپڑے' نیا جوتا پہنا ہے۔ چلو اِسی خوشی میں اِسے نوکری دلوا دیتے ہیں...... یار فرید! اب کیا کروں......؟'' فرید سے کوئی جواب لئے بغیر وہ پھر بولا...... ''یار! اِس دُنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ مسجد' میلادوں' قبرستانوں میں بھی چوری کرنے سے باز نہیں آتے۔ انہیں کچھ خدا کا خوف نہیں ہوتا......؟''

فرید نے اب جواب دیا۔ ''رئیس بھائی! ضرورت اور مجبوری خود بہت بڑے خوف ہیں' ہو سکتا ہے کہ جس نے تمہارے جوتے اُٹھائے ہوں اسے اُن جوتوں کی تم سے کہیں زیادہ ضرورت ہو......'' فرید گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''آؤ' اندر آؤ۔ جوتے کو بھول جاؤ' میں تمہارے لئے فالودہ منگواتا ہوں۔ اور ہاں! اِس سے مِلو' یہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے......''

رئیس مجھ پہ ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے اندر آ گیا' میں نے اپنے پاؤں مزید سمیٹ کر شلوار کے اندر کر لئے۔ میں پہلے اسے دیکھ کر قدرے حواس باختہ ضرور ہوا تھا۔ چور' چور ہی ہوتا ہے چاہے کتنا ہی ہوشیار ہو' اپنے اعصاب' حواس کو قابو اور حالات پہ گرفت رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر میں رئیس کی گفتگو سے متاثر بھی ہوا اور اپنے تئیں ایک فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ انسان جب مائل بہ کرم ہوتا ہے یا بھلائی نیکی کی جانب راغب ہوتا ہے' مثبت سوچ پکڑ لیتا ہے تو اس کے اندر لامحالہ ایک جذبہ اور قوت غیر متزلزلہ خود آتی ہے' جراٴتِ اظہار بیدار ہو جاتی ہے' ضمیر مزید روشن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے جرم یا غلطی

کے اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا' اخلاقی جرأت کی روشنی میں وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے اور یہیں سے اس کی جیت شروع ہو جاتی ہے۔ انسان تو انسان' اللہ بھی خوش ہو کر اسے معاف کر دیتے ہیں ـــ میں نے مسکراتے ہوئے زبان کھولی۔

''رئیس بھائی! آپ تو بڑے بھلے انسان دکھائی دیتے ہیں' جوتا چور کو کم از کم آپ کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا پھر بھی آپ اس گدھے کو معاف کر دیں' اللہ درگزر کرنے والوں سے بھی درگزر کا وعدہ کرتا ہے...... اور ہاں' اگر میں آپ کو ویسے ہی جوتے کا جوڑا پیش کر دوں تا کہ آپ ہفتے کو انٹرویو کے لئے جا سکیں تو......؟''

اب فرید بولا...... ''معلوم ہوتا ہے کہ تم گھر سے کوئی مال وال بھی چُرا کر لائے ہو......''

میرے کسی جواب سے پہلے رئیس مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بھائی! تم تو خود بھی میری طرح گھر سے بھگوڑے ہو' مجھے نئے جوتے کہاں سے خرید کر دو گے؟...... پورے چار روپے کے تھے' ابھی تو پیسے بھی نہیں دیئے...... ویسے تمہاری ہمدردی اور پیشکش کا شکریہ......!''

میں پھر بولا۔ ''رئیس صاحب! آپ رئیس آدمی ہیں۔ چلیں' اس جوتا چور کو صدق دل سے معاف کر دیں۔ اتنا کہہ دینے سے آپ کو بھی سکون مل جائے گا اور وہ بھی پھر اطمینان سے جوتا پہن سکے گا۔''

''بھائی! جوتا تو میرا گیا ہے' اُسے کُتا کہہ کر آپ گنہگار کیوں ہو رہے ہیں؟ یقیناً کوئی ضرورت مند ہوگا' مجھے کہتا تو میں خوشی سے پیش کر دیتا......''

فرید نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''رئیس صاحب! جن کے ہاں چوریاں ہوں یا جن کے جوتے اُٹھا لئے جائیں' بعد میں یہی کچھ کہتے ہیں' خوشی سے کوئی بھی نہیں دیتا ہے۔ آپ ایمانداری سے کہیں کہ اگر کوئی آپ سے وہ جوتے مانگتا تو آپ دے دیتے......؟''

''بالکل...... بلکہ میں فوراً اُتار کر پالش کرتا اور بڑے کُھلے دل سے اُسے پیش کر دیتا۔ پھر اُس سے مزید پوچھتا' کوئی اور خدمت......؟''

رئیس کی اس بات پہ میں نے ہلکی سی تالی بجائی اور مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''رئیس بھائی! فرض کریں' وہ بھلا آدمی اب اگر آپ کو مل جائے اور جوتے واپس کر دے تو؟''

''تو کیا' میں اُسے کُھلے دل سے معاف کر کے سینے سے لگا لوں گا......''

رئیس نے بڑے پختہ لہجے میں یہ سب کہا تو میں اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''رئیس بھائی! مجھے اپنے سینے سے لگا کر اتنا بھینچیں' اتنا بھینچیں کہ میرے آنسو نکل آئیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا' آخر نفی میں سر ہلا کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ پھر مجھے جُدا کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"لو لگا لیا سینے سے...... اب بولو؟"

"بولنا کیا' اب بولنے کہنے کے لئے رکھا بھی کیا ہے......؟" میں نے جُھک کر جوتے اُٹھائے' آستین سے انہیں صاف کیا۔ پھر نیچے جُھکا اور اس کے پاؤں میں پہناتے ہوئے کہا۔ "لو' میرے دوست تم بھی کیا یاد رکھو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا ہے۔"

رئیس کے پلّے کچھ نہیں پڑا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے' بس وہ ہٹ بٹ مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اب فرید کے بولنے کی باری آئی۔

"اوئے ڈرامے بازو! کچھ میرے پلّے بھی ڈالو......؟"

میں نے "دلدار صاحب" والا قصہ من و عن بیان کر دیا اور صدقِ دل سے معافی چاہتے ہوئے کہا۔

"رئیس دوست! دیکھو اگر یہ سب کچھ ظہور پذیر نہ ہوتا یعنی جوتے درمیان میں وسیلہ اور حیلہ نہ بنتے تو مجھے تم جیسا [illegible] دوست کیسے [illegible] ہوتا......"

پتا نہیں رئیس کی کون سی رگ ہل گئی تھی کہ اسے ہچکیوں کے ساتھ جیسے کانپا سا لگ گیا تھا۔ بید مجنوں کی مانند لرزتے کانپتے اس نے مجھے ایک بار پھر سینے سے چمٹا لیا۔ اب شاید میری باری تھی' وہ جیسے میرے سینے میں گھسا کھڑا تھا' دل کسی مینڈک کی مانند پُھدک رہا تھا' پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میری آنکھوں میں بھی [illegible] اُتر آئی...... فرید [illegible] تم تو دونوں آپس میں ویلڈ ہو گئے ہوتے۔ وہ جھڑکیاں دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اوئے پاگلو! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟...... بندے بن کر آرام سے بیٹھ جاؤ' ایسا نہ ہو کہ یہی پاؤں کے جوتے تمہارے سروں پہ پڑیں......"

ہم دونوں آنکھیں پونچھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ فرید سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"او بھائی' جوتی چور! یہ تم کیا ڈرامہ کر رہے تھے' ایک چوری دوجے سینہ زوری؟...... اوئے سمجھو' یہاں رونے اور سینے لگنے کا کون سا موقع مقام ہے؟"

رئیس اپنے جوتوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ فرید بھائی! آج تو ذرا یونہی اِن جوتوں نے رونے کا مقام پیدا کر دیا ہے' ویسے میرا جی کئی دنوں سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں اپنے حجرے میں ایک آدھ بار خوب تسلی سے رو لیتا ہوں' اس طرح دل دماغ پہ پڑا ہوا غبار چھٹ جاتا ہے'

آدمی ہلکا پھلکا سُبک دَم ہو جاتا ہے......"

فرید موٹے موٹے آتشی شیشوں والی عینک کے پیچھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "او بھائی' گوجرانوالیئے! یہ رونے دھونے اور جی ہلکا کرنے والا کام کم از کم آئندہ میری دوکان پہ نہ کرنا۔ رونا دھونا دیکھ' سن کر مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے' نحوست الگ پھیلتی ہے......" پھر وہ میری طرف گھوما اور اسی طرح ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "......اور تم بھی بھائی سیالکوٹیے' بھگوڑے المشہور جوتی چور! یہ میرے باپ کی دوکان نہیں ہے اور نہ ہی مَیں نے یہاں کوئی سدا ورت لگا رکھی ہے۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ جو داتا سرکار کو نہیں بخشتا وہ بابے فرید کو چھوڑے گا؟......اُٹھو بھائی! جاؤ اپنے اس دوست کے ساتھ' جس کے سینے سے لگ کر تم نے ٹسوے بہائے ہیں۔ اس کے ہاں رہنے سونے کی جگہ بھی موجود ہے۔ تم دونوں کی آپس میں بنے گی بھی بہت خوب' ایک چور دوسرا گرہ کٹ' ایک سیالکوٹیا دوسرا گوجرانوالیا......مَیں تو دریائی گھوڑا ہوں' میرا آپ سے کیا تعلق......؟"

میری تو آنکھوں میں خون اُتر آیا' اس کی یہ بے بھاؤ کی سن کر میرا دماغ کھولنے لگا۔ پھر بھی خلاف طبیعت تحمل سے بولا

"فرید صاحب! آپ نے بہت کچھ کہہ لیا ہے' مَیں آپ کو کوئی جواب نہیں دیتا کہ ایک تو آپ مجھ سے بڑے ہیں اور دوسرے مَیں آپ کی دوکان پہ بیٹھا ہوں اور آپ کا فالودہ بھی کھا پی چکا ہوں پھر یہ دوکان ملک اسلم صاحب کی ہے جو میرے اَبا جی کے دوست ہیں......باقی رہی جوتی اور اس کا تذکرہ تو یہ میرا ذاتی فعل ہے جو غلط تھا۔ مَیں نے جوتے واپس کر دیئے کہ رئیس بھائی کو ان کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس وقت جوتا مَیں نے یہ سمجھ کر اُٹھایا تھا کہ جوتے والا کوئی امیر رئیس ہوگا کیونکہ ایسا قیمتی جوتا کوئی مجھ ایسا غریب غُربا تو خریدنے یا پہننے سے رہا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ جوتے والا بس نام ہی کا رئیس ہے اور اندر سے مجھ سے بھی گیا گزرا فُقرا ہے......"

● رئیس' میرا ہمدم میرا جلیس......!

بس یہی وہ دن تھا کہ جب رئیس' میرا پیارا رئیس فُقرا بن گیا تھا۔ ہم دونوں دوست دریائی گھوڑے اور اس کی دوکان پہ چار حرف بھیج کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دوکان سے نیچے اُتر آئے رئیس فُقرے نے چند قدم آگے پہنچ کر مجھے روک لیا' جوتے اُتار کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہنے لگا

"انہیں پہنو......"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں پہنے رکھو اور داتا سرکارؒ کے [illegible] تک مجھ سے کوئی بات نہ کرو' میرے دماغ کا فیوز اُڑا ہوا ہے...... فرید نے بڑی زیادتی کی ہے۔ اس [illegible] نہ کھایا ہوتا تو میں اس دریائی گھوڑے کا تھوبڑا توڑ دیتا...... ذرا سوچو' یار! اگر میں چور یا اندر سے [illegible] تو جوتے واپس کیوں کرتا' تمہیں گلے لگا کر کیوں روتا؟...... ٹھیک ہے کہ میں گھر سے بھاگ کر آیا [illegible] انسانیت سے تو نہیں بھاگا...... اور ہاں' اگر میرا سیالکوٹ سے نکلنا میرے مفاد میں نہ ہوتا تو میری [illegible] مجھے کبھی لاہور آنے کی اجازت نہ دیتی' چاچی نے مجھے کہا ہوا ہے کہ کاگا...... ! کاگا کا کام' سکوت اور [illegible]۔ جہاں سے بھی ملے' لے اُڑو۔ چھینو' جھپٹو' کھاؤ اور مزے اُڑاؤ۔ کاگا کی کائیں کائیں دراصل [illegible] اور "کیوں کیوں" کی کھوج ہے...... میں یہی سوچ میرا بوجھ ہے کہ چاچی نے مجھے یہاں سرکار کے [illegible] میں بھیجا' وہاں قدموں میں جوتے پڑے جو تم تک لائے اور اب تم اور میں...... وہیں سے وہی [illegible] کے وہی جنہیں پہن کر صحیح سے چلا بھی نہیں جا سکتا' محض پاؤں گھسیٹے جا سکتے ہیں......"

"یہ چاچی کون ہیں......؟" رئیس فقرے نے بھی پوچھ ہی لیا۔

"[illegible] جائیں...... تم یہ جوتے ایک ایک پاؤں میں پہنو اور دربار کی جانب چلو۔"

"جا تو وہیں رہے ہیں' مگر دوست! جوتے تو تم پہنو گے یا پھر میں بھی نہیں پہنوں گا۔"

اس نے جیسے فیصلہ دے دیا...... میں بیچ بازار کھڑا اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ باگی [illegible] قبول مندی کی مُہر' زلفوں کی دو پہلو دراز جھالر' سُرمئی شربتی آنکھوں میں جیسے لعلِ بدخشانی جڑ دیے [illegible]۔

"مجھے اس طرح سے کیوں تک رہے ہو......؟" وہ قدرے گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

"سُبحان اللہ......!" میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا...... "بہ سیرت فرشتہ' بہ صُورت صنم......"

"ماشاء اللہ۔" کہتے ہوئے اس نے میرے بائیں پاؤں میں جوتے کا ایک پیر ڈال دیا' بایاں [illegible] کے پاؤں میں تھا...... لوگ دیکھا کیے کہ دو پاگل سے ہاتھوں میں ہاتھ اور ایک ایک پاؤں میں [illegible] دُنیا و مافیہا سے بے نیاز بھاٹی دروازے کی جانب جا رہے ہیں۔ دربار پہنچ کر ہم دونوں وہیں پہ [illegible] جہاں پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ چوکھٹ چوم کر اندر چلے گئے' فاتحہ شریف پڑھی۔ اُن کے درجات کی [illegible] اور اُن کے در کی گدائی کے لئے اِلتجا کی۔ پھر ہم دونوں نماز کے لئے مسجد کی جانب بڑھ گئے...... [illegible] جوتوں والی جگہ پر آئے تو ایک نئی پریشانی ہماری منتظر تھی' رئیس فقرے کے جوتے پھر غائب تھے۔

بہتیرا اِدھر اُدھر دیکھا مگر جوتے ہوتے تو کہیں دکھائی دیتے...... اب ہم دونوں پاؤں سے ننگے جا رہے تھے۔

رئیس فقرے کی رہائش شاہ عالمی کے اندر، کوچہ بابا خوشحال سنگھ ڈھلوں میں تھی۔ رہائش کیا تھی، ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں وہ اپنے جیسے دو اور طالبعلموں کے ساتھ رہتا تھا اور رہتا بھی کیا تھا، بس رات کو کسی وقت فرش پہ لیٹ کر کمر سیدھی کر لیتا...... کتابیں، اِدھر اُدھر کا کاٹھ کباڑ، جھوٹے موٹے چند برتن، گھی کے کنستر اور چند گندے اَن دُھلے کپڑے وغیرہ، اِس کمرے کا کُل اثاثہ تھے۔ کمرے کا دروازہ کُنڈی تالے کے تکلّف سے آزاد تھا...... اِس کمرے کے ایک کونے میں مجھے بھی جگہ مل گئی...... شام کی نماز سے ذرا پہلے ایک اخبار بیچنے والا لڑکا سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہوا ہمارے کمرے کے باہر رُکا اور ہماری کُھلی کھڑکی سے جھکتا ہوا اندر آ گیا، خاکی موٹے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پارسل رئیس فقرے کو تھماتے ہوئے بولا۔

''بابو فرید نے بھیجا ہے......''

اِس سے پیشتر کہ ہم کوئی بات کرتے یا مزید کچھ پوچھتے، وہ دہلیز پھلانگ کر جا چکا تھا۔ خواہ مخواہ گھنٹی بجانے کی شاید اسے عادت تھی، باہر گلی تک مسلسل گھنٹی کی آواز سنائی دیتی رہی اور ہم بھونچکے اس دروازے کو تکے جا رہے تھے جدھر سے وہ چھلاوہ غائب ہوا تھا۔ پھر ایک دم ہم دونوں نے اِک دوجے کو دیکھا اور چند لمحے خاموشی سے پارسل کو تکتے رہنے کے بعد رئیس فقرا بولا۔

''یہ کیا ہے......؟''

مَیں نے بھی ترت جواب دیا۔ ''ظاہر ہے کہ یہ ایک پارسل ہے، فرید نے بھیجا ہے اور اِس کے اندر دو عدد جوتوں کے جوڑے ہیں...... کھول کر دیکھ سکتے ہو۔''

وہ میری جانب یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے وہ پاگل ہے یا مَیں اس کے سامنے بیٹھا ہوا اِک دیوانہ ہوں۔ وہ اَبرو سکیڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اِس کے اندر دو عدد جوتے ہیں؟''

مَیں نے اِسی لاپروائی سے جواب دیا۔ ''بھائی اس میں غصّہ کرنے والی کون سی بات ہے؟ محمل کا پردہ ہٹاؤ اور لیلیٰ کا نظارہ کر لو اور اگر لیلیٰ کی بجائے لیلا بکری نکل آئے تو بے شک پھر میرے لے لینا۔''

اِک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے چھت کی جانب دیکھا، جیسے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کر رہا ہو کہ کس اُلو کے پٹھے سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے خاکی کاغذ ہٹایا، اندر سے دو گے

بے نکلے۔ انہیں کھولا تو ایک وہی مکیشن جو دو مرتبہ داتا صاحبؒ کے دربار سے اُٹھائی جا چکی تھی اور ڈبے میں ایک بالکل نیا جوڑا‘ وہی سائز‘ قریب قریب وہی ڈیزائن اور ویسا ہی کالا رنگ...... وہ انہیں دیکھ رہا تھا جیسے کالے شا کالے ناگ کا جوڑا ڈبوں سے نکل آیا ہو۔ پھر اس نے میرے اُوپر نظریں گاڑیں جیسے مَیں بھی کوئی خطرناک قسم کا سپیرا ہوں...... اس نے اپنے جوتے کو چیک کیا‘ بالکل وہی شا کالی لش لش کرتی ہوئی نُبک سی مکیشن!

”کیا دیکھ رہے ہو...... میرا خیال ہے‘ تمہارے ہی جوتے ہیں......؟“ مَیں نے ہلکی سی چوٹ کی۔

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھنجھلا کر پوچھنے لگا۔ ”یار! یہ سب کیا ہے...... جوتا ہم نے دربار کی سیڑھیوں پہ اُتارا تھا اور یہ برآمد یہاں گھر میں اچھے کے ڈبے سے ہو رہا ہے اور...... اور یہ دوسرا

پیارے دوست‘ رئیس فُقرا صاحب! بندہ جیب دامن کا فُقرا ہو تو ہو مگر عقل دماغ کا نہ ہو...... جس جوتے نے ایک بار اپنا رستہ کھول دے تو پھر وہاں اکثر تفریحاً بھی گرتی رہتی ہے اور جو عورت ... تو پھر وہ عورت اپنے ... پھر ذرا مشکل ہوتی ہے۔ سانول اگر بغلول قسم کا چڑ قناتیا ہو تو دھوبی کا کُتا بن کر رہ جاتا ہے اور اگر ذرا ڈنڈ ڈولے ہیں تو اپنے بچوں کی کاپی سے ورق پھاڑ کر تین لفظوں کی تکرار لکھ کر بیوی کے پیچھے پیچھے اس کے میکے ہے اور پھر اگلے ہی ہفتے بختو سے نئی شادی رچا کر ساری زندگی کے لئے مُکتی پاتا ہے اور ساری عمر بابو میاں اور بھابی بھیا سے جوتے کھاتی رہتی ہے...... بالکل ایسے ہی اگر کوئی الھڑ جوان سی رغبت کسی گھبرو سے پاؤں میں پھنس کر اپنا در چھوڑ جاتی ہے تو وہ پھر ساری عمر دو کانوں اور سے ہی برآمد ہوتی رہتی ہے۔ کچھ سمجھے......؟“ پھر مَیں نے نئی جوتی اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اب پہنو اور یہ اپنی پہلی جوتی میرے پاؤں سے ہی بیاہ دو‘ ایسی جوتی کا آخر کار یہی علاج ہوتا ہے پینڈو بابے عورت کو پاؤں کی جوتی کہتے ہیں کہ جس کو تنگ کرے یا کاٹے‘ وہ اُتار دے اور دے‘ پاؤں پوری پڑے وہ پہن لے......“

رئیس فُقرا مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اگر مَیں فوراً چپ نہ ہوا تو وہ مجھے یا قتل کر کے بھاگ لے گا یا کشی کر لے گا۔ مَیں اس کے خطرناک تیور بھانپ کر ذرا کی ذرا چپ ہو لیا...... ایک دم اس کے کا رنگ بدلا‘ بڑے پُراسرار سے لہجے میں الفاظ چبا چبا کر پوچھنے لگا۔

"خان! ایسی چھوٹی عمر میں تُو نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟...... تیری باتیں سنتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تو نہیں' تیرے اندر کوئی اور بول رہا تھا...... خان! تم نے کسی چاچی کا ذکر کیا تھا ہو کیا تیری سگی چاچی ہے' کہاں رہتی ہے اور کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟" وہ میرے اور قریب ہو لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مزید کہنے لگا۔ "اگر تم مجھے اپنی چاچی سے ملانے کا وعدہ کرو تو میں بھی تمہیں ایک نہیں' دو ایسے بزرگوں سے ملاؤں گا کہ تمہاری طبیعت اور معدہ دونوں خوش ہو جائیں گے۔"

"طبیعت اور معدہ...... بات ذرا صاف کرو' میں کچھ سمجھا نہیں ہوں......؟"

"میری جان! وہ بزرگ گرم گرم جلیبیاں کھلاتے ہیں اور نرم نرم باتوں سے رُوح گرماتے ہیں......"

"بس! اسی ایک فقرے سے بابا رحمت سائیں اور ٹنو سائیں سرکار کا سراغ ملا تھا۔

رئیس فقرا تو دن بھر کسی معقول سی ملازمت کی تلاش میں رہتا اور شام کو پرائیویٹ کالج میں پڑھنے کے لیے چلا جاتا...... ظاہر ہے کہ میں پڑھائی لکھائی کا ازلی بھگوڑا اور اس معاملہ میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لہٰذا صبح نماز اور ناشتے کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہو جاتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتروں میں انٹرویو بھگتانے نکل کھڑا ہوتا اور میں بھی "یاعلی" کا نعرہ بلند کر کے باہر آ جاتا۔ پہلے داتا سرکارؒ کی چوکھٹ چُومتا۔ پھر اللہ دے اور بندہ سہے...... لاہور اور اس کی سڑکیں' پارک' نہریں' باغ' مزار' مسجدیں' عجائب گھر' سینما' فلم سٹوڈیو' قلعہ' شاہی محلہ وغیرہ وغیرہ...... داتا سرکارؒ کے علاوہ کچھ جگہیں اور چند مقام ایسے بھی تھے جہاں اکثر میری حاضری رہتی تھی۔ مثلاً تکیہ مراثیاں' حجرہ اُستاد دامن' بیٹھک اداکار ایم اسماعیل کوچہ چابک سواراں' رائل پارک' مزار مُرشد علامہ اقبالؒ' بابا رحمت سائیں ٹنو سائیں وغیرہ...... لباس کا ہوش نہ کھانے پینے کا خیال۔ جہاں' جدھر اور جو بھی کہیں میسر آ جاتا وہیں اپنی فُرصت ہو جاتی۔ پیدل گھسٹ گھسٹ کر جوتے' چپل جواب دے جاتے تھے۔ پاؤں میں چھالے اُبھرتے اور پھوٹتے رہتے۔ سر میں اک عجیب سا سودا سمایا ہوا تھا۔ ہر لمحہ بے چین' ہر پَل بے کل و مُضطرب...... بابا رحمت ٹنو سرکار کے قدموں میں بیٹھنے سے میرے اضطراب و جنون میں کئی گناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے اندر کہیں کوئی پیاس کا صحرا تھا۔ بزرگوں درویشوں کی زیارت کا خبط' مخفی علوم کو جاننے سیکھنے کا لپکا الگ تھا۔ اب چاچی نے بھی میرے ہاتھ پاؤں خوب کس باندھ کر مجھے تحیّر کے اندھے گہرے سمندر میں پھینک دیا ہوا تھا۔

میری ایک چچازاد بہن چوبرجی سرکاری کوارٹر میں رہائش پذیر تھی، گھر والوں کو پتا تھا کہ میں اگر لاہور میں ہوں تو اسی کے پاس رہتا ہوں لہٰذا وہ بھی ''خس کم جہاں پاک'' کہتے ہوئے میری طرف سے بے فکر ہو جاتے تھے۔ میں بیکار، مکار، چور اور پرلے درجے کا شیطان تھا، ان کے لئے باعثِ بدنامی و رسوائی تھا۔ گھر ہوتا تو اک عذاب مسلسل ان پہ مسلط رہتا اور جب کہیں میں اِدھر اُدھر دفع ہو جاتا تو سب سکھ کا سانس لیتے، یعنی ان کے لئے میرے وجود کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کے لئے میں بہت قیمتی تھا، وہ میری چاچی تھی جس کے ہاں ایک بار میری ماں جی نے میری حرکتوں سے تنگ آ کر بڑی سخت شکایت کی تو میری چاچی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ہیرے اور ہاتھی کو ہر کوئی نہیں سنبھال سکتا ہے اور نہ ہر کوئی ان کی قدر کر سکتا ہے۔

● کسبِ آوارگی، بخششِ درماندگی......!

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا کہ گھوڑے شاہ کی مسجد میں بابا رحمت سائیں اور میں ٹنو سائیں سرکار کی صحبت سے بڑا لطف اور سرور حاصل ہو رہا تھا۔ یکایک شیطان الرجیم نے میرے دل میں سرکار کے بظاہر میل کچیل سے بھرے لتھڑے ہوئے پاؤں کے بارے میں نفرت اور کراہت سی پیدا کر دی۔ پھر اچانک ٹنو سائیں نے اپنا پاؤں میرے زانو سے اُٹھا کر اُدھر بابا رحمت سائیں کی گود میں رکھ دیا تھا۔ ان کے اس عمل سے مجھے یہی محسوس ہوا کہ اُنہوں نے میری سوچ اور میرے دل و دماغ کی کیفیت کو کشف یا اپنے باطنی تصرف سے جان لیا تھا یا پھر اسے محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال، بابا رحمت سائیں کو بھی آمادۂ التفات نہ پا کر مجھے بہر طور وہاں سے رُخصت ہونا پڑا۔ جونہی میں دربار شریف کی سیڑھیوں سے نکل کر باہر بازار میں اُترا تو میرے اندر یہ احساس شدت پکڑ چکا تھا کہ میں نے آج اپنا بہت بڑا نقصان کر لیا ہے، شیطان نے میرے دل میں وسوسہ ڈال کر مجھے بہکا دیا۔ ٹنو سائیں کا اچانک اپنا پاؤں کھینچنا اور پھر بابا رحمت سائیں کا عجیب سی نظروں سے مجھے گھورنا اور میری بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کرنا، یہ سب اسی لئے تھا کہ مجھ سے بے اَدبی سرزد ہو چکی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا، ہونے والی بات تو ہو چکی تھی۔ میں اسی سُود و زیاں کے حساب و کتاب میں منہمک شکستہ و آزردہ سا واپس سٹیشن کی طرف آ رہا تھا۔ بازار میں دائیں بائیں کچے چمڑے کے گودام، دوکانیں، تنگ گلی، خشک و تر کھالوں کے انبار، بھنبھناتی ہوئی مکھیاں، بدبُو و تعفن کے ناقابلِ برداشت بھبکے، کیونکہ سارے شہر کی کھالیں

یہیں آتی تھیں مگر آج تو اِن کھالوں کے ساتھ بدبُو بھی کچھ سوا ہی تھی' یوں جیسے یہ حلال مویشیوں چوپایوں کی کھالیں نہ ہوں۔ رُوڑی لدے گدھے ہوں' آتے جاتے لوگ بھی جیسے زمانے بھر کی غلاظتیں الانگ کر کہیں سے آ رہے ہوں۔ کسی نے کہا تھا کہ اچھے بُرے سارے موسم انسان کے اندر ہی سے عالمِ وجود میں آتے ہیں' یہ ساری آذرِ احساس کی اصنام گری ہی تو ہوتی ہے۔ اِک کیا میں ٹتو سائیں کے پاؤں کی ظاہری غلاظت اور بدبو کے بارے میں سوچ بیٹھا کہ اب میرے لئے آگے پیچھے' دائیں بائیں' نیچے اُوپر' ہر جانب جیسے گندہی گند نظر آ رہا تھا...... فاقے کا مارا ہوا اندھے کو بھی نظر آ جاتا ہے۔ آگے چوک کے بیچ' ملتی جلتی لون لگی کھالوں سے اَٹا ہوا ایک ہتھ ریڑھا اُلبار ہو کر رُکا ہوا تھا۔ ریڑھے پہ بوجھ زیادہ تھا' بوڑھا ریڑھا بان ریڑھے کے آگے بموں پہ ٹنگا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں زمین سے بالشت بھر اُوپر تھے' کھالوں کا سارا بوجھ پیچھے کی جانب سرک رہا تھا' وہ گزر و سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نظر انداز کئے ہوئے ریڑھے کا راستہ چھوڑ کر گزرتے جا رہے تھے کہ کون اپنے ہاتھ پاؤں اور کپڑے خراب کرے' کچے چمڑے کے قریب سے گزر جاؤ تو بدبُو بساند انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہے اور اگر کہیں ہاتھ یا کپڑا اس قسم کی کھال سے مس ہو جائے تو کئی پہر بدبُو اور کئی دن اس کا احساس پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اسی لئے چمار' موچی' چمڑا چھیلنے رنگنے والے' مُردار مُردوں کی کھالیں ہڈیاں اور چربی اُتارنے والے چنگڑ چلیاڑ' اَدھوڑی' قصاب چرم دوز اپنا کاروبار' کارخانے' ڈوبے اور تلاؤ وغیرہ آبادی سے پرے ہٹ کر ویران اور علیحدہ جگہوں پہ رکھتے ہیں تاکہ اللہ کی مخلوق بدبُو کے آزار سے محفوظ رہے۔ یہ سٹیشن کے پیچھے اور گھوڑے شاہ دربار کے قُرب و جوار میں جو سینکڑوں چمڑے کے گودام وغیرہ ہیں' یہ علاقہ بھی کبھی لاہور شہر سے باہر ہی تھا۔ وقت کے گھیراؤ اور نئی آبادیوں کے پھیلاؤ نے اب اس علاقے کو شہر کے وسط میں کر لیا ہے...... وہ ریڑھے کے بم پہ ٹنگا ہوا ریڑھا بان بیچ بازار ریڑھے کا اُلبار لئے ہوئے تھا۔ یہ تو محض ریڑھے کا اُلبار' نم نمدے کا بار اور تندی تعفن کاروبار تھا مگر یہاں تو ریڑھ کی ہڈی کے اُوپر حلقے پہ اُلبار تھا۔ کھال وہاں بھی زندہ پور پور اُترتی ہوئی' چوک بازار وہاں بھی تھا مگر سب ہی رُکے جمے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں اب ریڑھے کے برابر پہنچ چکا تھا' ریڑھے پہ کھالیں پیچھے کی جانب سرک رہی تھیں۔ میں فوراً پیچھے ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ریڑھے کو تھام کر اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ عمر چھوٹی' ہمت طاقت کم اور کھالوں کا بوجھ زیادہ۔ آتے جاتے' گزرتے ہوئے لوگ دیکھ بھی رہے تھے کہ ایک لڑکا کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کی ہمت سے زیادہ کی متقاضی ہے مگر اس کے باوجود کسی نے بھی منزل' کپڑے اور وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں پیچھے سے زور لگا کر ریڑھے کو مزید پیچھے جھکنے سے

[illegible] کی کوشش کر رہا تھا مگر نمک لگی ہوئی نیم خشک کھالیں پیچھے سرک چکی تھیں۔ پھر وہی ہوا جو اس دن [illegible] ساتھ ہونا ہی چاہئے تھا اور جس کا پیشگی احساس بھی مجھے دربار سے نکلتے ہی ہو گیا تھا۔ میں نیچے اور [illegible] غلاظت کی رطوبت سے لتھڑی ہوئی کھالیں میرے اُوپر تھیں اور میں اِک انبارِ تعفن و تعفن کے نیچے کسی [illegible] کی مانند دب چکا تھا۔ اب شاید آس پاس کے گوداموں سے کچھ مزدور بھی پہنچ آئے تھے' فوراً کھالیں [illegible] مجھے نیچے سے نکالا۔ منہ سر' ناک کان' کپڑے جوتا' اندر باہر جیسے شریر بچوں نے گندی موری میں [illegible] ادھ موئے چوہے کو دُم سے پکڑ گھسیٹ کر باہر نکال کر سڑک پہ پھینک دیا میرے ساتھ تو بلکہ [illegible] بھی کچھ ناروا سلوک ہونا چاہئے تھا۔ نمکین غلاظت سے بھری ہوئیں آنکھیں کُھل نہیں رہی تھیں [illegible] ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں کھار اور نمک نے جیسے آگ سی لگا دی...... دیکھنے اور گزرنے والوں [illegible] اک تماشا' جو بیچ بازار ہو رہا اور میں اندھا سا لیٹا ہوا ہاتھ بازو لہرا رہا تھا۔ تب دو چار ہاتھوں نے [illegible] اٹھایا جیسے میں کوئی خارش زدہ کُتا ہوں۔ میرے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا...... مجھے اُٹھا کر [illegible] نے مجھے ایک کھالوں کے گودام کے احاطے میں دستی نلکے کے نیچے لا کر بیٹھا دیا اور میرا ہاتھ [illegible] کو بچا... کہنے لگے

''اوئے پاگلا! یہ نلکا ہے اب خود ہی اپنی صفائی کر لو......

میں کوئی جواب دینے کی بجائے ہنس رہا تھا' ایک بولا۔

''کوئی پاگل ای لگدا اے......''

''پکّی عمر دے پیار دی خوشبو سنگھ کے تے... دی بدبو کوئی چمار ہی برداشت کر سکدا اے [illegible] ......''

[illegible] بولا تو میری ہنسی اور چھوٹے قہقہوں کے بلبلے اور غبارے اس ''چمار'' اور ''دلدار'' [illegible] کی تیکھی سوئیوں نے ٹھاٹھا' ٹھوں ٹھس کر دیئے اور میں ''جماندرو حافظوں'' کی مانند اپنے دیدے [illegible] بند آنکھوں میں ہی گھماتا رہ گیا جدھر مٹی کنکر ملا میلا نمک اک قیامت بپا کئے ہوئے تھا۔

[illegible] آنکھ اور دوکان کا شٹر جب گر کر بند ہو جاتا ہے تو باہر کا ہر منظر' سیاہ و سفید اور سود و زیاں کا [illegible] ہو جاتا ہے۔ اب کہاں کی بدبُو کیسی بدمزگی اور بدنمائی؟ شٹر گر گیا تھا' صرف ''باہر کا چمار'' [illegible] ''دلدار'' ہی سامنے تھے۔ یہیں ایک اور پردہ ہٹا کہ کھلی آنکھیں ہی بند شٹر ہیں جبکہ بند آنکھوں [illegible] بڑے دلفریب منظر' بڑی واضح حقیقتیں اور روشن راستے ہیں۔

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ چمڑے کھالوں کے اِس گودام میں بسنے والی بدبوؤں کی

اَزلی چمگادڑیں خدا جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ جسم ولباس سے لپٹی ہوئی گندگی، کراہت آمیز بُو جیسے دَم سادھے کہیں سو گئی تھی، اندر کے مندر میں کوئی قلندر "جاگو موہن پیارے" کا اَلاپ کر رہا تھا کہ اچانک نلکے کی ہتھی پہ کوئی ہاتھ آیا، جَل کی اُمرت دَھارا کلبلا کر باہر نکلی۔ ایک مہربان سے ہاتھ نے میرا سر دھار کے نیچے کر دیا تھا۔ سمے، سُر اور جَل کی دَھاریں اِنسان کو جَل تھل کئے بنا نہیں چھوڑتیں، اندر باہر سے بھگو دیتی ہیں۔ اِن تینوں دَھاروں نے جیسے مجھے دھو کر ظاہری باطنی غلاظتوں سے صاف کر دیا تھا۔ زندگی میں دو بار، صرف دو بار ایسا نہلایا گیا کہ پھر یہ حسرت ہی رہی کہ ایسا پھر کوئی نہلائے۔ ایک مرتبہ اِس کھالوں کے گودام میں، اِس نلکے کے نیچے اور دوسری بار رحمتوں کے گودام حرمِ پاک میں میزابِ رحمت کے عین نیچے...... اس روز ایسا کھُل کر مینہ برسا تھا کہ پہلے اور بعد پھر برسوں ایسا نہ برسا۔ رَبّ جانے میں کب تک نلکے کے نیچے رہا، میرے ساتھ کیا بیتی؟ بس، اگر کچھ یاد ہے تو اتنا کہ بابا رحمت سائیں میرے اُوپر جھکے ہوئے میرے بالوں میں تیل لگا رہے تھے۔ میرے جسم پہ سیاہ لباس تھا، آنکھوں میں سُرمہ تھا، جسم ولباس سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، معاً میرے منہ سے نکلا۔

"بابا رحمت سائیں آپ یہاں؟...... السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام" کہتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکرائے، پھر بولے۔

"اللہ کے ولی! یہاں کرفیو لگا ہوا ہے یا میرے آنے پہ کوئی پابندی ہے؟...... بس تمہیں نہلانے کے لئے آ گئے۔"

"لیکن...... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں......؟" میں بن سوچے سمجھے بولے جا رہا تھا۔

"اللہ کے ولی! اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ چوٹ ووٹ نہیں لگی، بس کھالیں اوپر پڑنے سے ذرا دَب شَب لگ گئی ہے...... لوگ اکٹھے ہو گئے تھے، مٹو سائیں سرکار نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ، بچے کو نہلاؤ، دُھلاؤ، کپڑے بدلواؤ...... محمد یحییٰ کو گھر بھجوا کر کپڑے منگوائے اور تمہیں نہلایا دُھلایا، کپڑے پہنا کر خوشبو، تیل، سُرمہ لگایا...... کہو اگر کچھ غلط کیا تو معافی مانگ لیتے ہیں......"

مَیں حیرت اور بدحواسی کی مِلی جُلی کیفیت سے آنکھیں پھیلائے اِن کی مَن موہنی سی قند و شہد باتوں کی حلاوت کو محسوس کرتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا، آخر مَیں نے پوچھ ہی لیا۔

"بابا جی! مٹو سائیں تو کسی سے بات ہی نہیں کرتے، میرے بارے میں اُنہوں نے آپ کو کیسے کچھ کہہ دیا......؟"

"اللہ کے ولی!" کہتے ہوئے وہ ہلکا سا متبسم ہوئے، گال تھپک کر فرمایا۔

''کیا ہر کسی کو کچھ کہنے سُننے کے لئے لب ہلانے اور کان دھرنے ضروری ہوتے ہیں؟...... تم کہیں دور بیٹھے اپنی چاچی سے چُوں چُوں کرتے رہتے ہو' ہم قدموں میں بیٹھے ہوئے کیا اپنے باباجی سے کچھ کہہ سُن نہیں سکتے؟'' پھر وہ بات پلٹتے ہوئے کہنے لگے۔ ''اپنی کہو۔ بُو' بدبُو' خوشبُو' کریہہ' کراہت' نفاست' اور کالے سفید کا کچھ بھید بھاؤ سمجھ میں آیا......؟''

اُن کی نگاہوں کے تیز رفتار باریک برمے میری آنکھوں کو ''سنتر'' کیے ہوئے' میرے دل و دماغ بلکہ روح تک اُترے ہوئے تھے۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر ایک ساکت و جامد مجسمے کی مانند سامنے پڑا ہوا تھا۔ فطرتی جسمانی ضروریات' دل و دماغ کی کیفیات' ان سب کا ایک نقطہ پہ مجتمع ہو کر منجمد ساکت سا ہو جانا مجھے اسی مقام و ساعت میں سمجھ آیا۔ مجھے یوں مبہوت سا پا کر انہوں نے میرے شانے پہ اپنا سبک سا ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کے ولی! کہاں اُتر گئے ہو......؟''

میں محویت کی گہری باؤلی سے کہیں اُبھرتے ہوئے بولا۔

''باباجی! میں تو آپ کی باتوں کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہوں...... آپ نے ابھی ابھی میری چاچی کے بارے میں کچھ فرمایا ہے' آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''ہاں اللہ کے ولی! چور' چوروں کو اور مور' موروں کو خوب جانتے ہیں...... انہوں نے ہی تو تمہیں یہاں بھیجا ہے...... کاکا! اب علاوہ کیا کیا' کائیں کائیں مت کر' شام ہو گئی ہے' گھر جا......''

- رنگ میں اپنے موہے رنگ ڈالا......!

اب تو چھب ہی نرالی تھی۔ چھڑے ہوئے بال' دہکتے ہوئے گال۔ آنکھوں میں سُرمے کی دھار۔ ستی ترنگ اور خمار۔ چال میں اِک بانکپن' لہریے لیتا ہوا مَن۔ انگ انگ میں بسی خوشبو...... دیا جی روشن ہوتے ہوتے میں سٹیشن والا پُل پار کر چکا تھا۔ باہر نکلا' سامنے اِک تانگے والا کھڑا آوازیں لگا رہا تھا ''داتا سرکار' داتا دربار''...... داتا سرکار کے نام پہ چونکا۔ ایک نگاہ ''داتا دربار' داتا سرکار'' کہنے والے پہ ڈالی۔ پھر نگاہ واپس پلٹنے سے انکاری ہو گئی کہ وہیں قربان ہو گئی۔ ایک بانکا' چھیل چھبیلا سا نوجوان۔ کھلتا ہوا سیدہ ملیدہ رنگ' آنکھوں میں جیسے کسی نے قطبی تارا گھوٹ پیس کر بھر دیا ہو۔ میں ازلی جمال پرست' جمال میں کمال اور کمال میں جمال کھوجنے' پوجنے والا پجاری' دیکھتا ہی رہ گیا۔ پچھلی بھول گئی' اگلی سر پڑ گئی۔

میرے ساتھ اَزل سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ یعنی 'نیا سفر ہے پُرانے چراغ گُل کر دو...... اس کارزارِ حیات میں دراصل کچھ بھی پُرانا یا نیا نہیں ہوتا۔ کڑی سے کڑی' لڑی سے لڑی جُڑتی رہتی ہے اور یہ میرا والا معاملہ اور سلسلہ تو ہواؤں میں گرہیں لگانے' بہتے پانیوں پہ حکایتِ قلب ونظر لکھنے اور جذب کے آتش کدوں میں دفترِ جنوں طلب کرنے والا سلسلہ ہے۔ اِس کا تو یہی طریق وطور ہے۔ سبق یاد کر لو تو سزا ملتی ہے۔ بازی جیت لو تو بساط مُنہ پہ مار دی جاتی ہے۔ چاہ لو تو دیوار میں چُن دیا جاتا ہے' سچ کہہ دو تو کھال کھینچ لی جاتی ہے اور کبھی تو بندہ گھر اور گھاٹ کے درمیان ہی ''چوں چوں'' کرتا رہتا ہے' نہ دُنیا کی چپڑی ملتی ہے اور نہ دین کی کھچڑی نصیب ہوتی ہے۔ اِس راہ میں خوب گھسوٹ ہوتی ہے' کبھی کانٹوں پہ ننگے پنڈے تو کبھی پتھروں پہ ہاتھ پاؤں باندھ کر خوب رگڑا جاتا ہے۔ گود میں بٹھا کر اَمرتیاں کھلائی جاتی ہیں تو کبھی بیچ بازار کچّی غلیظ بدبودار کھالیں اُوپر پھنکوائی جاتی ہیں' کبھی نکالا جاتا ہے تو کبھی بلایا جاتا ہے۔ تختۂ زمین تنگ کر دیا جاتا ہے' وُجود کو باعثِ ننگ کر دیا جاتا ہے۔ راستے مسدود' ہر سعی لاحاصل و بے سود' صد بیاباں دکھانے کو کچھ اور ہوتا ہے اور دینے کے لئے کچھ اور...... بارے چوٹ دے کر دیکھا جاتا ہے' اگر برداشت کر گیا ہے تو اور دی جاتی ہے۔ یہاں فریاد کرنے کی بھی نہیں ہوتی' جو کوئی وادِ لکھوانے کی ہوتی ہے۔ جو زبان سے نکل جائے' وہی تیر ہوتا ہے انکار کرنے والا بے پیر ہوتا ہے۔ اِن کا کوئی بھی ساتھ میں کا ہو سکتا ہے اور آپ لاکھ بھی ''کافر'' ہوتا ہے۔ اکثر آنے والے معاملات میں پیشتر ہی کھڑک جاتی ہے' اس میں کوئی علم الغیب کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ تجربہ یا کچھ تعلق کہہ لیں' کہنے والے بھی کہہ دیتے ہیں اور کچھ قرآئن بھی اشارہ دے دیتے ہیں۔

نوائے سروش' رَجلِ سیاہ پوش......!

''بسم اللہ...... یا علی مدد...... آؤ' مومنو! داتا سرکار چلئے......''

وہ اگلی سیٹ کپڑے سے صاف کرتا ہوا بولا۔

اب میں کیا کہتا کہ میں نہیں جاتا؟...... ''السلام علیکم'' کہہ کر اگلی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ میرے پیچھے وہ پائیدان پہ کھڑے ہو کر' گھوڑا ہشکارتے ہوئے تانگہ موڑنے لگا تو میں نے کہا کہ بھائی صاحب اور سواریاں بھی بٹھا لیں' میں نے سالم تانگہ لے کر نہیں جانا۔

سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے وہ تانگہ بڑھا کر چوک میں آ گیا۔ وہاں ایک گُل بدن سالڑکا کھڑا

[illegible] کے ہاروں کا ہانکا لگا رہا تھا۔ پائیدان پہ وہیں کھڑے کھڑے اس نے دو ہار خریدے اور [illegible] کہتے ہوئے میرے گلے میں ڈال دیئے۔ یہ سب کچھ ایسے اچانک یوں میکانکی انداز میں ہو گیا [illegible] سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جیسے میری سُرت سیان ہی ماری گئی ہو۔ پیشتر اس کے کہ میں اسے کچھ کہتا [illegible] کر تانگہ بڑھا چکا تھا۔

اس راہ پہ تو قدم قدم تحیّر و تردّدات سے واسطہ رہتا ہے، متحمّل وہی ٹھہرتا ہے جو ہر لمحہ، ہر لحظہ [illegible] اور تغیّر کی ضرب و زد سے خود کو بچاتا ہوا تحلیلِ نفسی اور تعمیلِ منصبی کو اپنا شعار بنا لے اور صرف ''جی'' [illegible] ہے۔ کہیں ''نہ'' اور ''نہیں'' نکل گیا تو سمجھو کہ پاؤں پھسل گیا۔ پھر پھسلتا ہوا کہاں پہ جا ٹھہرے، یہ کون [illegible] تانگہ بان کو دیکھ کر اور ''داتا صاحب، داتا دربار'' کے آوازے سنتے ہی مجھے کھٹک گئی تھی کہ [illegible] تماشے لگے ہی لگے۔ میرا کالا لباس اس کے سیاہ کپڑے۔ یا علی کا نعرہ، گلے میں گلابوں کے ہار ڈالنا، [illegible] کے بٹھانا، میرے سوال کو نظر انداز کرنا، یہ سب کچھ یونہی تو نہیں تھا؟...... تانگہ سرپٹ بھاگا جا رہا [illegible] عالم چوک کے سامنے مسجد شب بھر کے عین نیچے پہنچ کر وہ سیاہ پوش پری زاد مجھ سے نظریں ملائے [illegible] زبان سے گویا ہوا۔

''یہ [illegible] مبارک ہو۔''

یہ اس نے یوں کہہ دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ شاہ عالمی ہے، یہ مسجد شب بھر ہے...... ذرا آگے [illegible] کے پاس پہنچتے ہی وہ آپی آپ ٹھمری انگ میں گنگنانے لگا۔

''سکھی ری، دیکھو ری، پیا رنگ کالا، اپنے رنگ میں موہے رنگ ڈالا...... سکھی ری، دیکھو ری، [illegible] ......''

- داتا دوارے، جنت نظارے......!

بھاٹی کے تانگہ اڈا پہ اس نے گھوڑا، تانگہ سٹینڈ پہ کھڑا کر دیا تھا۔ گھوڑے کے منہ پہ دانے والا [illegible] چڑھا کر، اپنے نرم ہاتھ کی مضبوط گرفت میں میری کلائی پکڑے وہ کشاں کشاں مجھے داتا سرکارؒ کے [illegible] مبارک کی جانب لئے جا رہا تھا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے کسی نوآموز جیب کترے کو [illegible] اندرون بھاٹی دروازہ لے کر جا رہا ہو۔ میں اک پگ پیچھے، اس کے ڈولتے سائے کی مانند گھسٹتا [illegible] تھا۔ ہم وہیں ''جوتا چوری'' والی جگہ پہ جا کھڑے ہوئے تھے۔ جوتے اُتارنے، عین وقت ہم

دونوں نے جھک کر چوکھٹ چومی۔ فرش پہ ہاتھ پھیرے منہ پہ مل کر اندر داخل ہوئے۔ مزار شریف کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ شریف پڑھی دعا مانگی۔ پھر اس نے میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر حجرے کی سنگ جالی میں پھنسا دیا ساتھ ہی اپنی پیشانی بھی جالی پہ ٹکا کر خدا جانے کہاں گم ہو گیا۔ ہاتھ اور پکڑا اور بندھا ہوا۔ کیا کروں کس سے کہوں؟ آخر میں بھی جالی سے ماتھا لگا کر آنکھیں موندے پکڑ تک گیا۔

انسان جب اندر سے سکون پکڑ لیتا ہے تو اسے باہر کی کچھ خبر و خواہش نہیں رہتی۔ وقت نے شاید ہلکا سا سکون لے لیا تھا شاید میں نے بھی کہیں ہلکی سی جھپکی لے لی ہو گی کیونکہ جب میں اپنے میں لوٹا تو رات ہلکی سی بھیگ چکی تھی اور میں وہیں حجرے سے کمر ٹکائے نیم دراز سا تھا۔ بوجھل کافور سا دماغ بے وزنی کی سی کیفیت۔ میں خالی خالی نظروں سے ارد گرد کے بھرے بھرے دیکھنے لگا۔ وہ جو میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ دھرے حجرے کی جالی میں پھنسائے میرے ساتھ کھڑا تھا موجود نہیں تھا۔ آس پاس دیکھا مگر وہ وہاں ہوتا تو کہیں دکھائی بھی دیتا...... میں اب تھوڑے سنبھل سٹیشن سے لے کر یہاں تک کے تمام منظر آنکھوں کے روبرو آ گئے...... میں سمجھتے ہوئے بھی یہ تھا کہ وہ کون ... یہاں قریب ... کا مقصد کیا تھا۔ حجرے ... کرنا اور پھر مجھے یہاں چھوڑ کر خود غائب ہو جانا؟...... ظاہر ہے کہ تحیّر تماشے میں کسی بھی بات کا جواب و جواز نہیں ہوتا لیکن بلاوجہ اور خالی از حکمت و حجت بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی قطعی ضروری ''طالب'' کے فہم و ادراک میں بھی آ جائے اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی دائرہ فہم میں ہی نہ آئے۔ استقامت کے چولہے پہ یقین کی ہانڈی میں صبر کا سالن پکانا پڑتا ہے اور پھر جب سب کچھ جل بجھ تو پھر اسے بارغبت و رضا کھانا پڑتا ہے۔ اس راہ کے راہرو کے لئے جبلی فطرتی اور جسمانی تقاضے چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ پتھر راہوں اور پہاڑوں میں پڑے دھرے رہتے ہیں وقت زمانے کے اور ٹھک ٹھوکروں کی چار چوٹ سے چمک پکڑتے ہیں اور پھر یہی پتھر جب آتشِ شوق اور حدت کشتہ ہو کر ''سرمۂ طور'' بن جاتے ہیں تو پھر ان کے لئے آزمائشوں اور کلفتوں کے نئے در ہیں۔ گناہ ثواب اچھائی برائی نیکی بدی کے کلیئے قاعدے قانون اور رویئے ہر ساعت و پل جگہیں بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں ہر لحظہ نطق پہ تالے عقل پہ جالے اور جان کے لالے پڑے رہتے جانا عذاب بھی بن سکتا ہے لیکن ماننا راحت ہی راحت ہوتا ہے...... اس راہ میں طالب فٹ بال ہوتا ہے ٹھوکریں ٹھڈے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا جاتا ہے کسی فٹ بال کی طرح کوئی

ایک بابے کے پاس نہیں ہوتا' ٹھوکر مار کر دوسرے بابے کی جانب بڑھا دیا جاتا ہے' وہاں سے کسی اور کی طرف۔ جب تک کھیل کے میدان میں وہ بال گول اور بابوں کے درمیان وہ ''غریب کا بال'' انمول نہیں ہو جاتے' دونوں بال دونوں طرح کے کھلاڑیوں کی بھرپور ٹھوکروں کی زد میں رہتے ہیں...... اچھا فٹ بال' بھیے خشک چمڑے کے ٹکڑوں سے بنتا ہے۔ بڑے اعلیٰ قسم کے دھاگے سے بڑی مضبوط سلائی کی جاتی ہے۔ اس کے اندر ہوا ہوتی ہے جو اسے ہلکا' سُبک اور لچکیلا بناتی ہے اور اچھا ''غریب کا بال'' فٹ بال کے برعکس تر' جاندار اور نرم چمڑے کا ہوتا ہے۔ یہ فل چمڑی کھال چمڑا اُتار کر بنتا ہے۔ سوتی دھاگے کی بجائے اسی کی آنتیں و ریدیں کھینچ کر اسی کی سلائی بندھائی کی جاتی ہے۔ اس کے اندر ہوا نہیں ''آہ'' بھری ہے' جس کی وجہ سے یہ نہایت ہی سہل' سُبک اور سُریلا ہوتا ہے۔ کسی اچھے کھلاڑی کی ایک ہی ٹھوکر بلکہ ایک نگاہ سے ہی دین دُنیا کا میدان پار کر جاتا ہے۔ میں بھی ان بابوں کی ٹھوکروں میں ایک بال ہی تھا۔ مولوی میر حسن' مولوی ابراہیم سیالکوٹی' حکیم الامت' گھوڑے والا تانگا' فقیر مراد' ماسٹر جن' چاچی سرفراز کا دادا' پنجی فقرا' بابا رحمت سائیں' شو سائیں' تانگے والا...... ابھی تک کے کھیل میں یہ سب ''ٹھوزی'' مجھے ٹھوکروں میں رکھے ہوئے تھے لیکن میں شاید ''چینڈ و ناپ'' کا فٹ بال تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دیہات میں غریب بچے [illegible] چیتھڑوں کو لپیٹ کر ایک گیند سا بنا لیتے ہیں۔ اسے ''کھندو'' کہتے ہیں اور اگر اس کھندو پہ اور زیادہ چیتھڑے لپیٹ دیے جائیں تو وہ فٹ بال سا بن جاتا ہے مگر اس میں یہ قباحت ہوتی ہے کہ یہ بھاری اور پتھر کی مانند سخت ہوتا ہے' یہ کسی کی ٹھوکر سے زیادہ دور نہیں جاتا جبکہ اُلٹا پاؤں کو تکلیف بھی دیتا ہے اور بار بار اُدھڑ بھی جاتا ہے...... میں بھی ایک ایسا ہی کھندو تھا۔

میں اپنی اسی بپتا اور بُنت میں پھنسا ہوا حجرہ غریب نواز کی دیوار سے لگا ہوا پڑا تھا۔ بھوک پیاس نہ حوائج ضروریہ کا ہوش' نیم وا آنکھوں کی ندی میں نیند کی نیا ابھی تک ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھی۔ اسی غنودگی کے عالم میں ناک نے کسی اشتہا آور قسم کی مہک محسوس کی' دیکھا تو میری ناک کے نیچے ایک پلیٹ میں گرم گرم پلاؤ اور زردہ' خوشبو کی لپٹیں چھوڑتا ہوا دعوتِ طعام دے رہا ہے۔ زعفران اور کیوڑے کی پاکیزہ سی مہک نے میرے اندر بھوک کے گلزار سے کھلا دیے۔ ایسا خوش رنگ' خوش نظر طعام' میرے مُنہ میں تو جیسے سیلاب آ گیا۔ صبر کا یارا نہ رہا' لقمہ اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ایک نورانی سا ہاتھ میرے ہاتھ پر آ گیا۔

''السلام علیکم...... ! میں یہاں کھانا دیکھتا ہوں' تم وہاں سامنے نل سے ہاتھ دھو لو......''

نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک کالی سی گھٹا میرے اُوپر جُھکی ہوئی تھی۔ مُشک بار گیسوؤں کی اُمڈی گھٹا برکھا' موٹی موٹی گلابی ڈوروں والی سُرمئی آنکھوں میں کسی عُقاب کی سی چمک' کالے سیاہ کرتے کے کُھلے گریبان سے لٹکتی ہوئی عقیقوں کے موٹے موٹے منکوں والی مالا اور ایک ایسی ناقابلِ بیان سی خوشبو کا احساس کہ رُوح تک سرشار ہوگئی...... اُس مردِ سیاہ پوش نے یہ کھانا لُقمہ لُقمہ مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ ایسی لذت و حلاوت کہ طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی' رگ و پے میں اِک عجیب سی طمانیت اور سرمستی کا احساس بجلی کی مانند کوند گیا تھا۔ پھر وہ یوں مجھے اپنی جلو میں سمیٹے ہوئے نکلا جیسے کوئی عقاب کسی کبوتر کو جھپٹ کر اُفق پیر ہوتا ہے۔ اللہ جانے' کھانے میں کیسی تاثیر تھی یا اس میں تعویذ پڑے ہوئے تھے' مرے وُجود سے ہلکے نیلے رنگ کی ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں سی باہر نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں' جیسے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے ہوں۔ اردگرد کا ماحول ہر چیز' چیزے دیگرے سی لگتی دکھائی دے رہی تھی۔ اجنبی اجنبی بدلی بدلی سی جیسے جسم و وجود پر سے اپنا اختیار اُٹھ گیا ہو۔ سوچ' فکر' ارادہ' کچھ بھی تو اپنے اختیار میں نہ تھا۔ میں ایک جکڑے' پھنسے ہوئے پرندے کی مانند اپنے صیاد کے رحم و کرم پہ تھا...... وہی تانگا' شاید سواری پوری ہونے کے انتظار میں رُکا ہوگی۔ جیسے بیٹھنے کے لیے کوئی وصف دیکھنے اور سُبحان اللہ کہنے کے لیے ہو۔ تانگہ کیا تھا ارن کھٹولہ کہ چندن کاٹھ سے تراش کر اُوپر مُشک نافہ سے پالش کردی ہو۔ بڑی پُر اسرار مدھم مدھم سی خوشبو کی لپٹیں دماغ کو سُن سا کر رہی تھیں۔ بیٹھنے کے گدے جیسے کستوری ہرن کی کھال میں ہنسوں کے بال و پر سے بنائے گئے ہوں۔ دبیز' ملائم اور سکون بخش...... اُس ''رجالِ رشید'' کے پہنائے ہوئے گلابی ہار ابھی تک میرے گلے میں گلوبند بنے ہوئے تھے۔ اُس نے اس بار بھی مجھے تانگے پہ ''سرگزشتی'' جگہ پہ ہی بٹھایا اور خود پائیدان پہ اَلف کھڑا ہو کر گھوڑے کو لپکا دیا۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ' ٹپ ٹپ' بڑی بانکی دُلکی چال پہ گھوڑا رواں تھا اور میں کہاں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ سڑک کنارے پیڑوں کے قدموں سے لگتے ہی گھوڑا قدم بہ قدم آ گیا تھا۔ ہم نے شاید بیک وقت جھک کر سلام پیش کیا تھا۔ تب دلربا' دُلکی پہ پھر رواں ہوا تو اچانک اس نے زبان کھولی۔

''باوا کا لنگر مبارک ہو......''

''باوا کا لنگر......؟'' میں نے بیچ دانتوں دُہرایا۔ چند لمحے سامنے گھوڑے کی کھڑی کنوتیوں کو دیکھتا رہا جو ہر نئے قدم پہ دائیں بائیں بالفعل اپنا رُخ بدلتی تھیں۔ اِس ''مردِ قدسی'' کی جانب بھی ایک اُکھڑی سی نگاہ ڈالی جو شاید میرے وُجود سے بے نیاز' کسی اپنی لگن میں کہیں لگا ہوا تھا...... بلا ارادہ میرے مُنہ سے نکل گیا......

"پرشاد پڑے جب پیٹ میں تو بُدھی بدھیا دھا گئے
جمنا جل کی جل ککڑی' جا جبل پور میں جھانکے"

میں کیا جانوں کہ میں نے یہ کیا کہہ دیا۔ یہ تو وہی جانے جس نے آدم کو علم الاسماء سکھایا' [illegible] اور علم البیان کی بُنت اور باریکیاں ودیعت کی تھیں۔ اس کے کوئی معنی بھی ہو سکتے ہیں یا کچھ بھی [illegible] منہ سے نکلا' وہ معقول تھا' منقول' فضول یا محض لفاظیت؟ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ کچھ میں نے [illegible] تھا۔ یہ الفاظ' یہ لہجہ' یہ ترتیب' کچھ بھی تو میرا نہ تھا۔ اگر کوئی بعد میں مجھے یہ گت من وعن دہرانے [illegible] ایسا ہرگز نہ کر سکتا...... ایکا ایکی جو اس نے راسیں کھینچیں تو چشم زدن میں گھوڑا الف کھڑا ہو گیا' [illegible] ہوئی باچھوں سے ناک کے بانسے بانسے تک کھنچی چلی آئی۔ گھوڑے کے نتھنوں سے دھواں اور [illegible] نے شعلے چھوڑے' ایکدم پچھلے پاؤں پر رُکنے اور اگلے پیروں آسمان ہونے سے جو ناگاہ جھٹکا سا لگا [illegible] تختے سے بزغالہ کی مانند پیچھے سیٹ پہ جا پڑا' وہاں سے گیلے صابن کی ٹکیہ کی مانند پھسلتا ہوا پچھلے [illegible] پر جا ٹکا۔ گھوڑا سیدھا ہوا تو وہ پُرکھ پُراسرار' آنکھوں میں شعلے اور ہاتھوں میں چھمنوے والا بانکا سا [illegible] میرے سامنے فرشتۂ قضا بن آ کھڑا ہوا۔ میں [illegible] ہی چت [illegible] تھا کہ آدھی [illegible] طرف اور آدھا [illegible] گردن [illegible] ان کی دوسری جانب [illegible] میں لیٹے [illegible] نے اس صاحب اسرار کو دیکھا۔ انسانی ظاہری بصارت بھی کچھ اصولوں پہ کام کرتی ہے' کھڑے [illegible] ہو کر دیکھو تو صاف سیدھا دکھائی دیتا ہے۔ الٹا لٹک یا لیٹ کر دیکھو تو عجیب سا ٹیڑھا میڑھا نظر آتا ہے۔ اسی طرح چت لیٹے لیٹے جو میری اُلٹی نظر اس پہ پڑی تو میں بھونچکا سا رہ گیا...... یہ کیا؟ جیسے پاتال [illegible] تک سنگِ سیاہ کی ایک لاٹ سی گڑی کھڑی ہو...... ابھی میں اس اسرار پہ غور ہی کر رہا تھا کہ [illegible] سیاہ کی لاٹ نے مجھے ہاتھ بڑھا کر یوں اُچکا جیسے سیستانی سیاہ عقاب کسی چار پہر پہلے کے نومولود [illegible] اُچک لیتا ہے۔ چند شعلے بار لمحے وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں نے غور کیا کہ اس کی صورت شباہت اب [illegible] تھی۔ چہرے کے خدوخال' آنکھوں کی حالت' مجھے دیکھنے کا انداز' جیسے سب کچھ فی الفور بدل گیا [illegible] جب وہ مجھ سے مخاطب ہوا تو یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اور تو اور اس کا تو لہجہ اور طرزِ تکلم بھی کچھ سے کچھ [illegible] ہے...... یا للعجب! پتہ نہیں کہ اور کتنی بلیاں ابھی تھیلے سے باہر نکلنی باقی ہیں؟...... میں نے ایسا سو [illegible] تھا کہ وہ الفاظ کو لوہے کے چنوں کی مانند چباتے ہوئے بولا۔

"باگھ ہو کر بلیوں کے بارے میں سوچ رہے ہو......؟"

میں نے اس کی تند نگاہی سے بچنے کے لئے آنکھیں نیچے رکھتے ہوئے ادب سے کہا۔

''بھانجوں کو اپنی خالاؤں کا خیال رکھنا چاہئے''......

میری آنکھیں اَب بھی نیچے تھیں مگر میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اَب شندی کے ساتھ تیزی بھی آ گئی تھی' قدرے جُز بُز ہوتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

''خالہ یاد ہے اور چاچی بھول گئی جبکہ خالہ سے چاچی کا رشتہ اُتّم ہوتا ہے۔ اصل رشتہ تو باپ کی پشت کا ہوتا ہے' ماں کی پشواز کا رشتہ بتاشے کی مانند ہوتا ہے جس سے مُنہ تو میٹھا ہوتا ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا چاہے ٹوکرا بتاشے توڑ لو......''

میں ابھی تک اس کے بازوؤں کے حلقے میں ہی کسمسا رہا تھا۔ اس نے مجھے پھر آگے والی سیٹ پہ یوں رکھ دیا جیسے کوئی گرم نرم اور تازہ بتاشے کو ملائم جگہ پہ آ ٹھرنے کے لئے رکھتا ہے۔ پھر وہ گھوڑے کو ہلکے ہلکے تھاپڑے لگاتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''کا کہیں کا ...یں اور کیا کیا کم کریں' کا گا جی! اگر میں آج ''ملک کافور'' کو قابو نہ کر پاتا تو ما لک ہی جانے کہ کیا ہو جاتا...... ہاں تو' کا گا جی! آپ نے کہا......

[illegible] بجھ [illegible] چمکائے

جبلا جبل کی جبل نگری جا جبل پور میں جھائے''

''یہ کس نے کہا تھا...... مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا میں نے یہ کہا ہو......؟''

''جی' یہ تم نے ہی کہا تھا...... شکر کرو کہ راسیں کھینچ لی گئیں ورنہ یہ ''ملک کافور'' تمہیں اور مجھے آج جبل پُور پہنچا کر ہی آتا......!''

''یہ جبل پُور کہاں ہے......؟''

میں کہاں باز آنے والا تھا کہ دانتوں تلے زبان دابتا' سوال پہ سوال کئے جا رہا تھا۔ اسی بات پہ اس نے زبان کھولی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک آدھ بات کے علاوہ خاموش ہی رہا جبکہ میں اسے زیادہ سے زیادہ سُننا چاہتا تھا...... وہ تانگے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''بس تھوڑا سا صبر اور کر لو' تم جبل پُور پہنچنے ہی والے ہو......''

- ## ہیرا منڈی' کیسی پستی کیسی بلندی......!

اس نے چوک سے تانگہ شاہی محلّے کی طرف موڑ لیا تھا' ذرا آگے دُوشاخے سے بائیں سڑک

[illegible] تو یہ روزمرہ کا راستہ تھا، میں اکثر اسی سڑک سے گزرتا ہوا اپنے مُرشد پاک کے مزار پہ [illegible] کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ "ملک کا فوڈ" اور یہ بندۂ واقف و رموز مجھے [illegible] لئے جا رہے ہیں؟...... شاہی مسجد کے پُرشکوہ دَر و مینار، دائیں جانب گھنگھروؤں کی جھنکار۔ رنگ و [illegible] طرب و ترنگ میں ڈوبا ہوا شاہی بازار۔ دریچوں جھروکوں سے نیم جھانکا کرتے ہوئے روغنی [illegible] چھیلن، ہار گجرے والے لہریے لیتے ہوئے تماش بین، تاکا جھانکا کرتے ہوئے شاہد باز [illegible] حماموں پہ بننے سنورنے والوں کے جھمگٹے، پنواڑیوں کے ہاں پرے کے پرے۔ کجن، [illegible] آبادی، وحیدن اور عیدن، عنایت بیگم کی ٹھمریوں غزلوں کے بجتے ہوئے توے۔ اوباشوں، [illegible] عیش دیتے ہوئے پچولئے اور بھڑوے...... میرے لئے یہ سب کچھ نیا اور حیران کُن نہیں [illegible] کیوں یہ سب کچھ آج بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ حجرہ شاہ مقیم سے گزر کر ہم بہت آگے آ [illegible] شرقی دیوار کے سامنے احاطہ میاں بخشو میں اس نے تانگہ ڈال دیا۔ اندر میدان میں نیم کے [illegible] جٹادھاری سبز پوش ملنگ بیٹھا بھنگ گھوٹ رہا تھا، تانگہ گھوڑا اس کے سپرد کر کے وہ میرا ہاتھ [illegible] گلی میں اُتر گیا۔ تعفن، گھٹن اور بوسیدگی نے بڑی فراخ دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ دَر، [illegible] کھڑکیوں، چھجوں کی حالتِ زار سے اس گلی کے مکینوں کی حالت و حیثیت کا بخوبی [illegible] سارنگی کی آوازیں مفقود تھیں۔ ذرا آگے بڑھے تو یرقان زدہ لالٹینوں کی آتشکی روشنی [illegible] ہوئے چہرے بھی دکھائی دیئے، گویا کہ یہ "تھکے ٹوکری" ٹائپ بیسواؤں کی "لوٹ سیل" [illegible] ہمیں دیکھ کر کئی ہمدرد قسم کی خواتین نے کھنکورے بھی مارے تھے یا شاید ان کے گلے سینے [illegible] لگی ہوئی تھی یا کہیں بلغم پھنسی ہوئی تھی کہ پوری گلی کھنکوروں، ٹھرکیوں اور سسکاریوں سے [illegible] وہ مردِ باصفا، مضبوطی سے میرا بازو پکڑے گلی سے نکلا جا رہا تھا۔ نیم اندھی گلی سے نکل کر اب [illegible] پہ، اندھیرے میں ڈوبے ہوئے، ایک پرانے سے چوبارے کے نیچے آ کھڑے ہوئے، [illegible] ایک دستی پمپ نظر آیا۔ مجھے اس کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں پانی نکالتا ہوں، تم وضو کر لو......"

[illegible] سی روشنی میں وضو کرتے ہوئے میرے کپڑے بھی بھیگ گئے تھے۔ میں نے اپنی آستین [illegible] ہاتھ پونچھے۔ اب میں پمپ کی دستی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"اب آپ وضو کر لیں، میں پانی نکالتا ہوں"...... میں نے اندھیرے میں اس کا روشن چہرہ [illegible] ہوئے کہا۔

''تمہیں وضو کی ضرورت تھی......''

وہ میرا ہاتھ تھامے' چوبارے کی سیڑھیوں کے دروازے پہ آ کھڑا ہوا۔ مَیں نے نظریں گھُما کر اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چھوٹے سے میدان کے درمیان میں ایک کنوئیں کی منڈیر جان پڑی' اردگرد دُو چار چوبارے مزید دکھائی دیئے جن میں ہلکی روشنی بھی تھی جس سے یہ ظاہر تھا کہ ان چوباروں میں زندگی پائی جاتی ہے مگر جس چوبارے کے نیچے ہم آ کھڑے ہوئے تھے وہ تو زندگی کی ہر رَمق سے محروم دکھائی دیتا تھا۔ سیڑھیوں کے دروازے کی ساتھ دو کانیں بھی تھیں۔ دروازوں کی ہلی ہوئی چولیں' شکستہ چوبی تھڑے' نیچے دو چار گتے اور پلّے نیم دراز سے دکھائی دے رہے تھے' لگتا تھا کہ جیسے یہ دوکانیں ایک مدّت سے بند ہیں...... مردِ سیاہ پوش نے دروازے سے مُنہ لگا کر ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے ہلکی سی دستک دی۔ میرے کان اُدھر ہی لگے تھے۔ جواب کیا آتا' وہاں تو اندھیرے میں خاموشی گھُلی ہوئی تھی' دستک دینے سے البتہ تھڑے کے نیچے کُتیا کے پلّوں نے ہلکا سا ''عف' عف'' ضرور کیا تھا مگر وہ بندۂ اسرار بندۂ انتظار بنا ہوا بڑی عاجزی سے سر جُھکائے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے بھینس والے گھر لسی مانگنے والے صبح صبح گھڑ [illegible] تو میں چھوڑتا سوچتا ہی رہتا تھا بلکہ اس عادتِ قبیح کے ہاتھوں میں کئی مرتبہ ذلت بھی اٹھا چکا تھا۔ تو سالن والا واقعہ بدبودار کھالیں کھینچنے والا سانحہ' مجھے کم از کم آج کے اس واقعہ کو اتنی جلدی فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا مگر یہ بات تو ذمہ دار اور سمجھ دار انسانوں کے لئے ہوتی ہے' مجھ ایسے مُورکھوں اور گندے ڈھیلو کے تو سر پہ سے گزر جاتی ہے۔ اب یہاں بھی مَیں نے لسی مانگنے والی بات سوچی ہی تھی کہ جھٹ سے جواب آ گیا۔

''کاکا! تم نے کبھی بھینس کے دودھ کی لسی پی ہے تازہ تازہ بلوئی' نمک کے ڈلے سے ٹھوری ہوئی......؟''

مَیں نے ڈری ہوئی آواز میں لرزاں لرزاں سا جواب دیا۔

''جی......''

''لو! لسی والی بات کے ساتھ دو باتیں اور بھی سُنو...... بھینس والے گھر سے لسی' بیٹی والے گھر سے رشتہ' رزقِ حلال کمانے والے گھر سے کچھ کھانے پینے کے لئے اور علم و بزرگی والے گھرانے سے عزت عافیت و عاقبت کی بھیک طلب کرنا عین جائز ہی نہیں بلکہ ثواب بھی ہے......''

اب جس دروازے کے آگے ہم دونوں ''بھکے'' ہوئے سیاہ پوش کھڑے تھے' وہ کُھل ہی نہیں رہا تھا۔ جیسے کسی غلط دروازے پہ آ گئے ہوں۔ آخر اس خستہ' بے رنگ وانگ دروازے کے اُس پار بھی کسی

بھری جو لحظہ بہ لحظہ قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اب دروازے کی دریدہ درزوں سے ہلکی سی روشنی کی شعاعیں بھی دکھائی دینے لگیں جیسے کوئی لالٹین لیے کسی لمبی سی راہداری سے دروازے کی جانب آ رہا ہو۔ ہم سر جھکائے، ناف پہ ہاتھ باندھے، نیم اندھیرے میں یوں کھڑے تھے کہ ابھی عقوبت خانے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلے گا اور میرِ مقتل، خشمگیں سفاک نظروں سے ہمیں گھور کر دیکھے گا اور پھر کھوجنے والی آنکھوں سے ہمارے سراپا کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے ہوئے بادلِ نخواستہ اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ دے گا۔ ہم کڑوے دھوئیں سے اٹی، دردناک چیخوں اور آہ و بکا سے بھری ہوئی راہداری کی نحوست زدہ دیواروں پہ استادہ آہنی قندیلوں کی لرزتی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے زنداں کے اس حصے میں پہنچا دیے جائیں گے جہاں کچھ دیر قبل ایک بے گناہ، مظلوم قیدی ناقابلِ برداشت اذیتیں سہتے ہوئے پران تیاگ دیتا ہے اور ہم سیاہ پوشوں کی خدمات اس [illegible] کی آخری رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں حاصل کی گئی ہوں۔

اس اللہ کے بندے نے میرے ہاتھ کو ہلکا سا دبا کر مجھے ہوشیار کیا، دروازے کے اندر کی چٹخنی ہلچل کر رہا تھا، چر چر کی چرچراہٹ کے ساتھ دروازے کا ایک پٹ وا ہو چکا تو دیکھا، چھوٹی سی اندھی ڈیوڑھی میں کوئی [illegible] کھڑا تھا۔ ذرا قدم پیچھے ہٹ کر، سر کی خفیف سی جنبش سے اس نے ہمیں اندر آنے کا اذن دیا۔ اندر قدم رکھتے ہی پہلا احساس یہی ابھرا کہ ہم کسی عود و عنبر کی کان میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہلکی ہلکی، بھینی بھینی پُراسراری مہک جو قدیم فرعونوں کے مقبروں میں صدیوں مقید رہتی ہے، جو انسان میں تحیر اور جھرجھری سی پیدا کر دیتی ہے، جسے سانس میں کھینچتے ہی انسان خود کو صدیوں پیچھے کسی گہری کھائی میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتا ہے...... رات جیسی تاریک، سب کے لباس سیاہ، اندھیری سی ڈیوڑھی، جیسے ہم ماضی کے بیتے گزرے زمانوں میں کہیں اتر گئے تھے۔ دروازے کے پٹ کو بھیڑتے ہوئے اس سیاہ پوش نے چٹخنی چڑھائی، پھر چراغ کی لو بڑھاتے ہوئے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ دیا۔ چند قدم آگے بڑھ کر ہم ایک صحن میں داخل ہو گئے۔ دکھائی نہ دینے والے کسی چراغ کے باوجود وہاں ہلکی سی برائے نام روشنی ضرور موجود تھی جبکہ تاریکی اور گھٹن کا احساس یہاں بھی قائم تھا۔ صحن کے پار اتر کر ہمارا رہبر پھر ایک غلام گردش میں داخل ہو گیا۔ چراغ بردار آگے آگے، اس کے عقب میں تانگے والے چابک بردار اور اس کے پیچھے میں دُم چھلا، جھولی چک، پاپوش کا حاشیہ بردار، شاملِ واجہ بھاڑے کا ٹٹو!...... میں جو بھی تھا، پیچھے پیچھے بندھا ہوا چل رہا تھا۔ غلام گردش ختم ہوئی تو سامنے برائے نام ایک باغیچہ سا آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک پرانی، اونچی سی رنجیت شاہی چھوٹی

اینٹوں کی بنی ہوئی دیوار جو جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی دکھائی دی۔ اس میں ایک اُونچا جہازی سا دروازہ جس کے پَٹ دُھروں پہ لوہے پیتل کے پترے، میخیں اور کنول کُپّے چڑھے ہوئے تھے۔ چوکھٹ کے دونوں اطراف سُرخ جودھپوری اینٹوں کے دربانی تھڑے اور اِن کے ساتھ اُوپر چونے گچ سے ڈھلی ہوئیں بغلی محرابیں اور قُبّے...... گو یہ سب کچھ شکستہ اور انتہائی مخدوش حالت میں تھا، پھر بھی جو کچھ باقی تھا وہ خوب تھا یعنی، کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت عظیم تھی...... یہاں پہنچتے ہی واضح طور پہ محسوس ہوا کہ اب ہم قدرے کُھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں، رات کی رانی اور چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو نے ہمارا استقبال کیا تھا اور قُرب و جوار سے سازوں کا آہنگ بھی سنائی دے رہا تھا۔ یہاں اندھیرے کی گرفت بھی ڈھیلی سی محسوس ہوئی۔ اب ہم کم سے کم اپنے اردگرد بخیر و خوبی دیکھ سکتے تھے۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر ہمارے رہبر نے ڈھانپا ہاتھ بڑھا کر چوکھٹ کے اوپر اُبھرے ہوئے پیتل کے ایک کنول کو گھمایا، اِسی اثناء میری نگاہ ساتھ ہی دیوار پہ ایک سنگی لوح پہ جا ٹکی اور میری سٹی گم ہو گئی...... ''حویلی جمنا بائی جل جبل پوری''...... یک لخت میرے کانوں میں میرا وارفتگی کے عالم میں کہا ہوا کبت گُونجنے لگا۔ ''جمنا جل کی جل کر پہنچ جا جبل پور میں جھانکے''...... ''مگر سیاہ پوش کے الفاظ بھی کہ تھوڑا سا صبر [illegible] تم جبل پور پہنچنے ہی والے ہو...... الٰہی! یہ کیسا اَسرار ہے [illegible] کا بھید ہے اور [illegible] کا تغیر ہے؟ [illegible] طور پہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھے تو اس ''تحیّر تماشے'' میں پھنسے ہوئے یہ بھی دکھائی نہ دیا کہ دروازہ کب کا کُھل چکا ہے اور ہمارا رہبر اس انتظار میں ہے کہ ہم اندر داخل ہوں، سیاہ پوش نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا تھا۔ بڑے دروازے کے پَٹ میں لگے ہوئے ایک چھوٹے دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں سے چھوٹے چھوٹے بغلی کمروں اور دالانوں سے گزرتے ہوئے ہم ایوان میں پہنچے۔ یہاں تو دُنیا ہی دوسری تھی۔ نکہت و نُور سے نہلائے ہوئے دَر و بام، روشنیاں تھیں کہ کسی چنچل شوخ کی ہنسی کے جلترنگ کی مانند پھوٹ رہی تھیں۔ وسیع و عریض سجا ہوا شبستان، کمخواب کے سرسراتے ہوئے پردے، سپید براق چاندنیوں پہ سُرخ اطلس کے منقش تکیے۔ پاندان، اُگالدان، پیچوان، جھاڑ فانوس، دیواروں پہ مصوّر طغرے، عشق پیچاں کی ڈالیوں بیلوں سے ڈھکے پڑے سنگی اور چوبی دیوار گیرے۔ آبنوسی تپائیوں پہ گلابوں سے بھرے قلعی دار تھال، ایک جانب شیشے کی کشتی میں ڈھکے سجے ہوئے آلاتِ مے کشی، خوب رنگ و راحت افزا مشروب کی لبالب صراحیاں، بھنے ہوئے مُرغ و ماہی کے قاب، تنجن و مزعفر کی دَم پُخت مٹی کی قلفیاں، پیٹھے اور کروندے کے حلویات پہ مختلف مغز و بادام، پستہ و لوز پہ نقرئی طلائی آب دار ورق...... وہ طرحدار سیاہ پوش رہبر جس کی صورت، جسم اور جنس میں نہ دیکھ، سمجھ اور جان سکا تھا۔ اس ایوان تک ہم دونوں کو پہنچا کر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ حیرانگی کی

بات تھی کہ وہ باہر والے دروازے سے لے کر یہاں اس ایوان تک ہماری نظروں کے سامنے رہا' کسی لمحہ بھی دائیں بائیں نہیں ہوا تو پھر وہ اکا ایکی کہاں اُڑنچھو ہو گیا؟...... خیر' اب ہم یہاں دونوں نفوس تھے اور تمام پنڈال خالی پڑا تھا۔ میں ششدر' حیران و پریشان سا اس طلسم ہوشربا کو سمجھنے' جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اچانک وہ تانگہ والا سیاہ پوش ایک تخت پوش پہ بڑی بے نیازی سے بیٹھا میرا تماشا دیکھتا ہوا دکھائی دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے بات کرنا یا کچھ دریافت کرنا لاحاصل ہے' اسے شاید ہدایت تھی کہ وہ مجھ سے کسی سوال جواب نہ کرے یا پھر وہ مجھے جان بوجھ کر تپا رہا تھا...... میں نے ایک اُچٹتی سی نظر اس پہ ڈالی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا مگر نظر سے نظر ملتے ہی طرح دے گیا...... ٹھیک ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے' میں بھی اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا...... اسے تپانے یا خود کو بہلانے کی غائیت سے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

• مجلسِ خویشاں و رقصِ درویشاں......!

دائیں دیوار پہ مجھے ایک بہت بڑی پینٹنگ دکھائی دی [illegible] فریم میں قریباً آدھی دیوار پہ آویزاں تھی۔ عجیب و غریب' بہت کم استعمال کئے جانے والے مگر کشش آمیز رنگوں کا استعمال بھرپور طور پہ کیا گیا تھا۔ میں ذرا قریب ہو لیا...... اتنا بڑا کینوس' اتنا بڑا کام؟ خدا جانے وہ کون تھا' کون سر پھرا سا مصور! آخر اسے ایسی عجیب و غریب' پُراسرار قسم کی پینٹنگ بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی یا کس نے اسے بنوایا ہی ہے تو یہاں اس کا مقصد کیا تھا؟...... میں اپنی پنگا لینے اور کُرید کرنے کی عادت سے مجبور ہو کر پینٹنگ کے بالکل قریب چلا گیا۔ ایسا نفیس' باریک اور تفصیل کا اعلیٰ کام کہ میری دلچسپی دوچند ہو گئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھ رہا تھا۔ تصوراتی' فنی' تفصیلی جزئیات اور معنوی حوالوں سے ایسا لطیف' شفاف اور نظر نواز کام کہ دیکھنے والا اسے دیکھتا ہی رہ جائے لیکن یہ ایسا وسیع کینوس تھا کہ انسانی دائرہ بصارت یک بیک اس کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا' یا تو سامنے ذرا دور کھڑے ہو کر اسے کُلی طور پر سمجھا جا سکتا تھا یا پھر قریب کھڑے ہو کر اسے جزوی طور پہ دیکھنا پڑتا تھا۔ میں ایک بار پھر پینٹنگ سے ہٹ کر سامنے ذرا دور کھڑا ہو گیا' مکمل طور پہ فریم کو فوکس کر کے غور سے اس کو دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے روشنی مدھم پڑتی جا رہی ہے' آنکھوں میں چوندھ پیدا کرنے والی روشنی کی بجائے پولی پولی پوتّر سی چاندنی کھل اٹھی ہے۔ ملگجا سا اُجالا بڑا سکون نواز سا محسوس ہوا' لوبان کی سوندھی سوندھی مہک کا جادو نہ جانے کدھر سے بولنے لگا تھا۔ میں ششدر سا اس بدلتی رُت اور کروٹ بدلتے

ماحول پہ غور کرنے لگا' معاً میرے دماغ میں اک کوندا سا لپکا' یاد آیا کہ یہاں وہ تانگہ والا مرد سیاہ پوش بھی موجود تھا جس کی معیت اور رہبری میں 'مَیں اس طلسم کدے تک پہنچا تھا۔ وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا' وہ تخت پوش تو اب خالی تھا۔ متوحش نظروں سے اردگرد دیکھا' وہ کمرے میں نہیں تھا یا پھر مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ داتا کے دربار پہ اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ یہ تقاضہ بشریت ہلکے سے تردد کی لہر ترتراتی ہوئی آئی اور میرے اندر کی طمانیت کو محسوس کرتے ہوئے لہرا کر کہیں نکل گئی۔ اب پھر میری تمام تر توجہ کا مرکز وہی سامنے دیوار والی عجوبۂ روزگار دیواری تصویر تھی...... تصویر کو دماغ میں فوکس کرنے سے پیشتر میں نے اپنی تمام تر ظاہری' باطنی حسیات کو الکینٹ کر دیا تھا۔ پینٹنگ کے ہزاروں مختلف زاویے چشم زدن میں میرے دماغ میں محفوظ ہو چکے تھے۔ پھر میں نے علم تقویم کے ایک خاص طریقے کے تحت پوری تصویر کو اس کے انداز اً طول عرض کے مطابق آٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور تصویر کے قطب میں نظریں گاڑ دیں۔ جب قطب قائم ہو گیا تو میں نے ہولے ہولے اسے پھیلانا شروع کر دیا۔ ... میں تمام تر تصویر اپنی تمام تر ظاہری جزویات کی ساتھ میری بصری فہمیت کی دسترس میں تھی۔ اس کے بعد میں تصویر کے اور قریب آ... حصوں ... کیا ... تحیر کے ... میں اترتا گیا۔ ... بہلول پاشا درویش نامی کسی گرستانی مصور نے شتر پوست پہ یہ نادر ... تخلیق کیا تھا۔ اسے تخلیق کہنا شاید مبالغہ آرائی کی ذیل میں آئے' یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ایک جیتے جاگتے منظر کو جیسے مصور نے کسی پُراسرار عمل سے منجمد کر کے شتر کی پوست پہ پلٹا دیا ہو۔ پورے قد کے پانچ درویش محورقص ہیں۔ اس عمل میں اُن کی محویت ... مستی ... ان کی باطنی کیفیت روح کی سرشاری تک جو اُن کے انگ انگ اور انداز و اظہار سے مترشح تھی' قابل دید تھی۔ اُن کے حلقۂ رقص سے ذرا ہٹ کر دو عجیب سے حلیے اور چہرے مہرے والے کوہستانی بڑی لہک بہک سے بیٹھے اسی رنگ ترنگ میں رنگے' نفیری اور دف بجا رہے تھے۔ ان کے چہرے عیاں تھے جبکہ رقص کناں درویشوں کے چہرے اُن کی گلے پڑتی دستاروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پشواز نما گھاگروں پہ کسی ہوئی چھ گریباں والی الفیاں' سرخ یاقوتی کمر کس پٹکا' سنگ یشب کی موٹے موٹے منکوں والی مالائیں' گھیرے دار کھلی ہوئی آستینیں جو دست ... کے پاس گاؤ زباں کی مانند بالشت بالشت لٹکی لہرا رہی تھیں۔ پس منظر میں سنگِ خارا کی دریدہ دیوار ... کی درازوں سے گندھک کے پھوک اور نیلگوں برادے کی شفاف قمقموں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے ... پارے...... ان کی جلو میں لہریے لیتے ہوئے' کلبلاتے دھواں دھواں سے بخورات...... کھونٹیوں سے ٹنگے ہوئے آب گلوں کے چرمی مشکیزے اور خشک کدو کے کاسے' نیچے زرتافی خس کے رڑے...... یہ منظر ...

کسی خانقاہ کا ہو سکتا ہے جس کا محلِ وقوع دُور اُفتادہ پہاڑیوں میں ہو۔ وہاں کہیں نیم تاریک گپھاؤں' غاروں' عبادت گاہوں میں یہ تارک الدنیا درویش رہتے ہوں گے۔ کوہِ بیستون' کوہِ جودی' کوہِ البرز کی گھاٹیوں' چٹانوں کے تہہ خانے' کوہِ ارارط کے بالائی درّے' کوہِ سینا کے پیچ دار سلسلوں میں...... کئی زمانوں سے یہ مجذوب درویش اور صائم الدہر صالح صوفی دیکھے جاتے رہے ہیں جن کے اشغال عبادات اور طور طریق بڑے پُراسرار اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے ہوتے ہیں۔ اِن کی زیادہ تر عبادت تزکیہ' مناجات' ذکر' اور اک مخصوص تال وسم کے رقص پہ محمول ہوتی ہے۔ درمیانے سے دائرے میں والہانہ انداز میں رقص کرتے ہوئے یہ درویش دُعائیہ ورد بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ پینٹنگ بھی ایسے ہی ایک منظر کو زندہ و تابندہ کئے ہوئے تھی۔ اُونٹ کی کھال پہ کسی مخصوص عمل سے یہ رنگین و حسین منظر کشی کی گئی تھی۔ زمانہ قدیم میں کھالوں' چھالوں' پارچوں' پتھروں اور مختلف دھاتوں پہ مصوری' خطاطی اور کندہ کرنے کا فن اپنے عروج پہ تھا۔ کینوس تو بہت بعد میں آیا۔ اِسی طرح رنگین مصوری بھی بڑی محنت و مشقت طلب تھی۔ رنگین مصوری کے لئے مختلف اقسام کی معدنیات' نباتات' تجربات سے رنگوں کے لئے بُنیادی مواد حاصل کیا جاتا تھا۔ جیسے چاندی کا محلول' ملمع' کانچ' ابرق' رنگ' سیاہ' سُرخ' مچھلی کا پِتّہ' شنگرف' ہِنگ' پارہ' تانبہ' چُون' اقسام تیزاب' مختلف اجناس کے نشاستے اور تخم' سنگِ ابری' طوطیا' چونا' خونِ خرگوش' کستوری' کافور' درختوں کی چھالیں' گودے اور پھل پھول تک استعمال میں آتے تھے۔ اِس تصویر میں بھی مصور نے بڑے دھیمے دھیمے' فطرت کے قریب تر اور نظر نواز قسم کے رنگ استعمال کئے تھے۔ اِس تصویر کو عنوان کے ساتھ ''رقصِ درویشاں'' یا ''مجلسِ درویشاں'' کا نام دیا جا سکتا تھا۔ گو اِن رقصان و مستان درویشوں کے چہرے چادر سے ڈھکے ہوئے تھے لیکن ان کی نیم وا مخمور و مدہوش سی آنکھوں میں ایک عجیب سا تجسس' تلاش اور تڑپ سی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پانچوں درویش مجھے ہی کھوج رہے ہوں' ہر کوئی آنکھوں کی زبان سے کہہ رہا ہو کہ میری طرف دیکھو صرف میری طرف...... میں نظریں ملانے سے احتراز کر رہا تھا مگر میں کوشش بسیار کے باوجود ان میں سے ایک درویش کے مستور چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا بلکہ مزید ایک قدم آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ معاً مجھے یوں لگا کہ وہ درویش میرے اِس آگے قدم بڑھانے کے عمل سے خوش ہوا ہے۔ اس کی سمندر کی مانند گہری اور کسی تیر کی طرح دل میں کُھب جانے والی آنکھوں میں اک خیرہ کر دینے والی چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سکڑنے پھیلنے کے عمل سے گزر کر اب کنول کی مانند کِھل اٹھی تھیں جبکہ اس دوران میں نے ہلکی سی آنکھ بھی نہیں جھپکی تھی...... لاریب! اس نے مجھے ساکت و مسحور سا کر دیا تھا۔ پھر میرے دماغ میں ایک چھناکا

سا ہُوا جیسے ہی اس کے چہرے سے چادر کا پلّو ہلکا سا سرکا۔ وہ بابا رحمت سائیں تھے۔ سائیں سائیں کرتی سرسراتی خنک کافوری لہر میرے سَر و پا میں سے لہراتی ہوئی گزر گئی۔ پھر یوں...... جیسے اُن کی نگاہیں بازوؤں میں تبدیل ہو گئی ہوں اور ان بازوؤں نے آہستہ سے آگے بڑھ کر میرے وجود کو اپنی ناممحسوس سی گرفت میں جکڑ کر مجھے بھی منظر کا حصہ بنالیا۔ اب کھمبیوں جیسا گھیرے دار گھاگرا' کمر کسے زیرِ ذرکوفی پاجامہ' جھاریا واسکوٹ کا چاک' چرمی تسمہ سے کسا ہوا پیزار' جھالروں والی سُرخ ترکی ٹوپی پہنے بھمبیری کی مانند گول گھومتا' چکر کاٹتا ہوا پانچوں درویشوں کے درمیان میرا وجود قطب طاق بنا ہوا تھا۔ میں تصویر کے باہر کھڑا تھا مگر خود کو تصویر میں بھی متحرک دیکھ رہا تھا۔ پانچوں درویش بھمبیریوں کی مانند گھوم اور میرے گرد دائرے میں چکر بھی کاٹ رہے تھے اور دف کی تال تھاپ پہ ذکر بھی جاری تھا۔ دونوں ہاتھوں کی تال پہ "اللہ" کہتے ہوئے دونوں ہاتھ ہر اک کو لگتے اور پھر لٹو کے انداز میں لٹو کی طرح گھوم کر "ہُو" کہتے ہوئے ہاتھ میرے قریب چھوانے کے انداز میں لاتے مگر مجھے چھوئے بغیر یہی عمل دُہراتے جاتے تھے۔ "اللہ ہُو" کے الفاظ ایسے مُبہم سے انداز میں دُہراتے کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کوہستانی لہجہ' نفیری کی مہین لرزتی ہوئی آواز' دف۔ تھپ تھپ کی تھاپ۔ بار بار دُہرائے جانے والا ایک ہی لفظ...... سب کچھ میرے ذہن پہ دھواں سا ہو کر چھا رہا تھا۔ اب تو بس ایک ہی یہ عالم ہو گیا کہ نہ باہر جسم کا احساس رہا اور نہ اندر کہیں وجدانی وفور......!

تھوکرِ نیم شب سے جب ذرا ہوش ٹھکانے لگے تو محسوس ہوا کہ کسی مسہری سے دیوان پہ لیٹا ہوا ہوں۔ میری بائیں جانب کوئی دریچہ کھلا ہوا تھا۔ چوکھٹی سے لٹکے ہوئے زیتونی شہد کے حریری پردے رُخ کی جانب سے مست خرام' مُشکبار' شتیل سی پُروائی سے لہرا کر بار بار میرے عارض سے چھو چھو جاتے تھے۔ شاید انہی کی وجہ سے میں گہری نیند سے اُچٹ گیا تھا۔ ہلکے ہلکے ہلکورے لیتی ہوئی ارغنون کی اُبھرتی مدھر تانیں کانوں میں رَس سا ٹپکا رہی تھیں۔ دروبام اور فرش و فانوس پہ اُتری ہوئی بھیگی شب کی چاندنی نے اس شبستانِ لالہ رنگ کو فردوسِ گوش بنا دیا ہوا تھا...... ؎

آوے ہے یہی جی میں' یہیں عمر بسر کرو

- رَجلِ سیاہ پوش و نساء' آبِ شبنم بادِ صبا......!

دائیں طرف کہنی ٹکا کر ٹیک لی تو دیکھا کہ میرے اور اُن کے درمیان آبِ شبنم کا مہین پردہ حائل

ہے۔ دُودھیا سے نیم اُجالے میں کچھ رجال و نساء کالی قبائیں، سیاہ غرف اور عباء و عمامہ سے مزین و ملبوس بڑے تزک و تزئین سے اس جلسے میں بیٹھے ہیں۔ ان میں جو رجال تھے وہ اپنے کرّوفر، چہرے مہرے اور تن و توش سے بڑے صاحبِ مقام و منزلت دکھائی دیتے تھے اور کچھ اپنے مستور چہروں، نفاست و نزاکت اور لباس و لوازم سے نساء دکھائی دے رہی تھیں۔ ہاتھ زانوؤں پہ، نگاہیں رُوبرو، فاضل حرکت نہ سکت جیسے سنگِ خارا، سنگِ مریم کے قدِ آدم بُت، حالتِ نشستن میں تراش خراش کر یہاں رکھ دیئے گئے ہوں۔

میرے تعجب میں بے پناہ اضافہ ہوا جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے ہیں، حرکات و سکنات اور لبوں کی جنبش سے بھی یہ امر واضح تھا مگر کیا کہیے کہ جو کوئی ایک آدھ لفظ بھی مجھے سنائی دیا ہو۔ درمیانی فاصلہ بھی کوئی ایسا نہ تھا کہ ان کی آواز مجھ تک آتے آتے راہ میں کہیں رہ جائے۔ میں نے ذرا توجہ سے اُدھر کان دھرے اور دیکھا کہ ذرا پرے تپائی پہ بانس تیلیوں کے پنجرے میں سیاہ گلدم چہک رہا ہے، نیچے قدم پہ مُنڈی دھرے ایک فربہ سی شا کالی بلی بیٹھی ان سیاہ پوش ہستیوں کو دیکھ رہی ہے۔ گلدم کے چہکنے کی خفیف سی صدا مجھ تک پہنچ چکی تھی...... للعجب! کہ میں ان بزرگوں کی آواز سننے سے قاصر تھا، جیسے ان کے صوت و سماعت، نطق و نمو کا کوئی الگ ہی نظام تھا۔

ایک نمایاں سی جگہ پہ بیٹھے ہوئے بزرگ جو حاضر و موجود میں معزز و محترم دکھائی پڑتے تھے، زیادہ ہی مصروفِ گفتگو تھے، وقفہ وقفہ سے سلسلہ کام و دہن بھی جاری تھا لیکن جرعہ و لقمہ میں پہل یہ سرکردہ بزرگ ہی کر رہے تھے۔ ان سب ذکور و اناث ہستیوں کے چہرے کھلے ہونے کے باوجود بھی نمایاں نہ تھے۔ دُھندلے، بے خدوخال، گندم کے ... منہ، آنکھیں، پیشانی، کان، کچھ بھی واضح نہ تھا جیسے سب ہی بے نقش و نگار پتلے ہوں۔

یہیں غور کرتے ہوئے اچانک میری نظر دیوار والی پینٹنگ پہ پڑی تو ایک نئی حیرت میرا انتظار کر رہی تھی۔ پینٹنگ میں سب کچھ ویسے ہی تھا، سوائے ان درویشوں کے جو "می رقصم می...... رقصم" اور گھیری اور دف بجانے والوں کی صورت، منظر میں موجود تھے۔

میں نے اپنے شعوری حواس مجتمع کرنے کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر وہ جو کہتے ہیں کہ آنکھیں بند کر لینے سے سورج کا وجود ختم نہیں ہو جاتا سو وہی ہوا۔ لیکن میں نے اسی حالت میں کافی دیر تک آنکھیں بند رکھے غور و غوض کی ایک آدھ کھڑکی کھول لی تھی۔ سکون کی ٹھنڈی ٹھنڈی پُروا اور سکوت کے گہرے احساس نے جیسے میرے دماغ پہ ایک چھوٹی سی کافوری ڈلی رکھ دی تھی...... جہان تو دل روشن کی دسترس میں ہے۔

• سیاہ گربہ و گندم' لمسِ حریر و ابریشم......!

میرے پاؤں پنڈلیوں پہ رواں رواں' نرم نرم سا ریشم سرک رہا تھا' کفِ پا پہ آبِ گلاب سے بھیگا ہوا بچاہا سا پھریری لیتا ہوا محسوس ہوا۔ پاؤں' پیٹ کی جانب کھینچتے ہی میں بیدار سا ہو گیا تو وہی سیاہ گندم کے پنجرے کے پیچھے والی کالی شا کالی بلی میرے پاؤں میں لوٹ رہی تھی۔ بلی' کتا اور گھوڑا' یہ لاڈ اور پیار توجہ والے جانور ہوتے ہیں۔ ان کے لاڈ و پیار کے اظہار میں بڑی وارفتگی' سپردگی' سچائی اور خلوص ہوتا ہے...... میری نگاہ پڑتے ہی وہ سرک کر میرے سرہانے کی جانب آ گئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پیار بھری نظروں سے اُسے تکنے لگا لیکن مجھے نہایت ہی غور سے اسے دیکھنا پڑا...... میرے خداوند! میں بھونچکا سا اسے تکتے رہ گیا۔ وہ بھی کوئی عام بلی نہ تھی جو ہمارے گھروں کی گلی محلوں میں مرے ہوئے چھیچھڑے سونگھتی پھرتی ہیں۔ وہ کچھ کچھ دنیا کی بلیوں سی شباہت ضرور رکھتی تھی مگر نہیں' وہ تو اس دنیا کی بلی ہی نہیں لگتی تھی۔ اتنی کالی' ایسی سیاہ کہ اگر دُنیا بھر کی سیاہیوں' تاریکیوں' شبِ دیجور' شبِ فراق' کالی راتوں' دشمنوں قانونوں' احکاموں' نصیبوں' مرواریدوں' گلابوں' مرچوں' کلونجیوں' جادوؤں اور ٹونوں کی تمام سیاہی کو کشید کیا جائے اور اس سے بھی سیاہ دستیاب ہو اور اس سے اگر ہم کوئی بلی وجود میں لانا چاہیں تو یہی بلی ہو سکتی ہے جو اس وقت میری آنکھوں میں آنکھیں گڑھائے مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیلنا چاہ رہی تھی۔ اب وہ میرے سامنے بیٹھ گئی جیسے شاگرد' استاد کے یا استاد' شاگرد کے آگے بیٹھتا ہے۔ اس کی مقناطیسی آنکھوں کے تیز گھومتے ہوئے گرے میرے دماغ میں گھسے جا رہے تھے' بصد دقت میں نے اپنے آپ کو اس کی سحر نگاہی سے نکالا۔ اب میں چھت سے لٹکتے ہوئے چوبی فانوس کو دیکھنے لگا تھا جس کے شمع مستی کنولوں میں کافوری شمعیں بقعۂ نور بنی جھلملا رہی تھیں۔ اچانک میری سماعت سے ایک مہین سی آواز ٹکرائی۔

"من آ...... نم' من آ...... نم......!"

میں نے چونکتے ہوئے اپنے ارد گرد دیکھا' کون ہے جو "من آ نم' من آ نم" پکار رہا ہے مگر گربہ سیاہ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ میں اُٹھ کر سامنے کھلے دریچے کے پاس پہنچ کر اس آواز کے اسرار کی کھوج کرنے لگا۔ اب میرے پیچھے سے وہی "من آ نم' من آ نم" کی آواز آئی۔ میں نے یکلخت ایڑی پہ گھوما مگر وہاں بھی کون تھا' بجز گربہ سیاہ اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہ آواز بلی کے منہ سے نکل رہی تھی۔ "می آ' اوں" کی بجائے "من آ...... نم"...... میں نے آنکھوں کو ہاتھ سے ملتے ہوئے پھر تھی

کہ کہیں سہوِ نظر ہی نہ ہو مگر یہ حقیقت تھی۔ بغیر سوچے سمجھے میرے بھی منہ سے ''مَن دانم'' نکل گیا۔ کے گلدار کی طرح اس کی موٹی سی لمبی دُم بڑی نمایاں تھی' اس نے اپنی دُگنی لمبی دُم سے ایک حصار سا کھینچ لیا تھا اور بیچ میں کسی سیامی شہزادی کی طرح' تنے تنبورے کی تار بنی ہوئی بیٹھی تھی اس کے حضور یوں کھڑا تھا کہ ابھی وہ اشارہ ابرو کرے گی اور مَیں چشم زدن میں اپنے سر کی فصل اس کے قدموں میں ڈھیری کردوں گا۔ اس تماشائے ''مَن آنم کہ مَن دانم'' میں شاید اک زمانہ تھا۔ ساعتوں کی گرہ کھلتے ہی اس نے اپنی دُم والا حصار بھی کھول دیا تھا۔ کمالِ استغنائے دلبری کر اٹھی اور سر کو ایک جھٹکا سا دے کر بائیں جانب ایک دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ کا آبنوسی پٹ کھلا ہوا تھا' چوکھٹ پہ رنگین کانچ کے موتیوں' شیشے کی موگرا لڑیوں کی ایک سی آبشار لگی ہوئی بڑی دلفریب دکھائی دے رہی تھی اس چوکھٹ کی لٹکتی ہوئی آبشار دیکھنے میں کہ اچانک اسی آبشار میں ''چھنانن' چھنانن'' کی مترنم آواز کے ساتھ ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔

موتیوں اور شیشے کانچ کے موگروں کی ایسی جھالریں بمبئی' کاٹھیاواڑ' پونا' پٹنہ' رامپور' لکھنؤ اور امراء کے محل سراؤں' حویلیوں کی چوکھٹوں پہ بڑی بہار دکھاتی ہیں۔ ان میں بڑے جاذبِ نظر رنگوں سے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ ان جھالروں والی چوکھٹوں سے گزرنے والا دلچسپ تجربے سے گزرتا ہے۔ ہلکی سی جلترنگ' چھنانن اور پھر کئی لمحوں تک ان لڑیوں کا آپس میں ارتعاش پیدا ہوتا بڑا اچھا لگتا ہے اور انسان کے موڈ مزاج پہ بڑا خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ ان رنگین کے ساتھ ایک اور چیز بھی اس تہذیب کا حصہ ہے وہ ہے موتیوں' موگروں کی لڑیوں والے کمرے جھولتا ہوا سنگھاسن۔ پیتل تانبے کے منقش سریوں' زنجیروں اور آبنوس کی قیمتی لکڑی کا بنا ہوا منقش یا خوبصورت جھولا عین کمرے کے وسط میں چھت سے لٹکا ہوا ہوتا ہے' سندھ کے وڈیروں کے ہاں اس کا رواج ہے۔ اس جھولے پہ گاؤ تکیے کے نیچے غالیچہ یا توشک وغیرہ ہوتی ہے۔ گھر کے افراد قیلولے یا استراحت کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں...... ہاں' تو مَیں ذکر کر رہا تھا کہ اس موتیوں والی آبشار میں ارتعاش کے ساتھ جلترنگ سے بج اُٹھے تھے۔ یہ چوکھٹ دروازہ بھی اسی دیوار کی میں واقع تھی جس دیوار پہ مذکورہ بالا پینٹنگ آویزاں تھی۔ جلترنگ بجنے کی وجہ یہ تھی کہ گربہ سیاہ اپنی دُم سے جھالر کو اس انداز سے جھال کر رہی تھی جیسے کوئی ماہر سارنگی نواز اپنی تانت تڑی سے سارنگی کی کی ہوئی تاروں کو کھوستا ہے اور مَیں اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ چاچی کے ہاں سانپ سے پالا پڑا تھا۔ پھر کر بابا رحمت سائیں کے کُتے سے واسطہ پڑا' بازار میں کھالوں والے گدھے سے جس نے میرے

اوپر بدبُوبھری کھالیں اُلٹ دی تھیں۔ اس کے بعد تانگے والے ''یاعلی مدد'' مردِ سیاہ پوش کے اسپ تازی سے سابقہ ہوا جو میرے مُنہ سے ''جمنا جَل کی جَل گگرُی' جا جبل پُور میں جھانکے'' نکلنے پہ الف کھڑا ہو گیا تھا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔ اب یہاں اس ''گُربہ کشتن روزِ اوّل'' سے ماتھا بھڑ گیا ہے۔ میری تو ان سانپوں' کُتّوں' کھوتوں اور گھوڑے' بلیوں سے جیسے کوئی رشتہ داری ہو گئی تھی' غصّہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے اس طرح ساکت و جامد دیکھ کر گربہ سیاہ نے سُر بدلے جیسے اسے محسوس ہو گیا ہو کہ وہ جو اس نے شام کے سَمے کا راگ ہنڈول چھیڑ رکھا تھا' وہ بے وقت و بے رنگ تھا۔ اس نے فوراً دُم کے دَمدمے کو گھما کر جیسے انگ بدلا۔ اب وہ راگ دیس کو دمیر رہی تھی جو قریب قریب اسی سَمے' یعنی آدھی رات کا راگ ہے۔ آرزوئے وصل' درشن کے پیاسے دو نینوں کی التجا' ہجر فراق دیاں لمیاں راتاں' جہاں انگ انگ میرا سلیا۔ رقصِ بسمل' دَرد وچھوڑا' اندرو اندری وانگدا رہندا' پالی دردِ حیاتی دا...... پتا نہیں میں کدھر کا کدھر نکل گیا۔ اب جو متوجہ ہوا تو وہ اپنی دُم کے برچھے کو میری جانب گھما کر یوں ہلا رہی تھی جیسے کوئی انگشتِ شہادت سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بلاتا ہے۔ میں بلا سوچے سمجھے آگے بڑھ گیا۔ وہ اب چوکھٹ کے اندر تھی اور میں چوکھٹ کے اوپر یعنی نہ اندر اور نہ باہر۔ چند لمحے وہ مجھے گھورتی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ کیسے احمق گاؤدی سے واسطہ پڑا ہے؟...... میں اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے چوکھٹ کے اندر آ گیا۔ وہ پھر آگے بڑھ کر گھومتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی کہ میں پھر کہیں رُک تو نہیں گیا؟ وہ آگے آگے' میں پیچھے پیچھے۔

اندھیرے اُجالے میں آٹھ دس گام آگے ایک اور چوکھٹ آ گئی۔ ویسی ہی موتیوں کی جھالر دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی سی دودھیا پانی سی روشنی جھالر کی جھلملاہٹ سے باہر ٹپک رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے نتھنوں سے ایک علیحدہ سی خوشبو ٹکرائی۔ میرا ماتھا ٹھنکا' یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس سے پیشتر یہ خوشگوار اور حیرت سی ملی جلی کیفیت والی مہک کہاں سونگھی تھی؟ اسی یادش بادش میں میرا گُربہ سیاہ کی جانب دھیان چلا گیا۔ وہ مارِ سیاہ جیسی اژدھی دُم کو الجبرے کی تکونی شکل دیئے بٹ بٹ میری جانب مُنہ اُٹھائے دیکھ رہی تھی...... اُوہو' اس پُراسراری مہک سے تو میرا ایک دفعہ پہلے بھی واسطہ پڑا تھا۔ میں تھوڑا سا ماضی قریب میں اُتر گیا۔

- بُوئے صحرا' مُشکِ آہو......!

سیالکوٹ شہر سے باہر' مشرق کی جانب پسرور' نارووال روڈ پہ ''بابے کی بیری'' ایک جگہ ہے۔

روایت ہے کہ یہاں باباگرونانکؒ نے بیری کے ایک پیڑ کے نیچے قیام فرمایا تھا' اسی وجہ سے یہ بیریوں کا ذخیرہ "بابے کی بیری" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بہت بڑا قبرستان بھی ہے۔ مَیں ایک اپنے جیسے شرارتی اور آوارہ دوست کے ہمراہ کبھی کبھی جمعرات کے روز وہاں جایا کرتا تھا۔ قبرستان سے کافی آگے نہر کے پاس ایک ویران سی جگہ تھی۔ روایت ہے کہ سکھوں کے دور میں یہاں ایک درویش بابے کو زندہ دفنا دیا گیا تھا۔ یہاں اُس درویش بابے کا ایک عجیب سا مزار تھا۔ مزار کیا تھا' ایک بڑا سا گمرا نما تنور تھا یا یوں سمجھ لیں جیسے اینٹیں پکانے والے بھٹے کی بے ڈھنگی سی چمنی ہوتی ہے۔ اس تنور نما مزار میں نہ تو کوئی اندر جانے کا راستہ تھا اور نہ ہی کوئی قبر وغیرہ تھی۔ پیروں فقیروں' قبروں مزاروں سے اَندھی عقیدت رکھنے والوں کی بھی کہیں کمی نہیں ہوتی' بس معلوم ہونا چاہئے کہ کہیں کوئی پیر یا کسی کا مزار ہے' چاہے پیر کے روپ میں کوئی جعلساز اور مزار میں کوئی کھوتا ہی دفن ہو لوگ بس اندھا دھند وہاں میلہ لگا دیتے ہیں...... اس مزار پہ بھی اکثر لوگ آتے جاتے تھے۔ شہر سے تو کوئی کم ہی جاتا ہوگا البتہ اردگرد کے دیہاتوں کے لوگوں کی اکثریت وہاں آتی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ جب عقیدت مند یہاں آئیں گے تو نذر نیاز بھی دیتے۔ دیا بتی' چادروں پھولوں ہاروں کا تو یہاں کوئی مقام نہیں تھا کیونکہ یہ چیزیں تو وہاں ہوتی ہیں جہاں قبر' مزار' مقبرہ' چادر وغیرہ ہوتے ہیں۔ زائرین اور عقیدت مند ان چیزوں کی بجائے نقدی رومال' کپڑے یا مٹی کے ڈھیلے سے باندھ کر تنور یا چمنی نما مزار کے اُوپر سے اندر پھینک دیتے تھے۔ یہ مزار نما چمنی زمین سے کم از کم بیس فٹ اُونچی ہوگی۔ وہی مغلوں کا اندازِ تعمیر۔ چھوٹی پتلی لاکھی اینٹ' گچ چونے کا کام نیچے کرسی راجستھانی سُرخ پتھر کی بنی ہوئی۔ امتدادِ زمانہ اور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے گو یہ تعمیر اب خستہ حال ہو چکی تھی پھر بھی اس کی پختگی اور خدوخال کی دلکشی کے مٹے مٹے' بُجھے بُجھے سے آثار باقی تھے۔ نیچے بنیاد کی کُرسی بہت چوڑی تھی۔ ایک طرف ٹبہ تھا' ٹبے والی طرف سے کُرسی نظر نہیں آتی تھی۔ باقی تین اطراف میں ایک طرف کٹا پھٹا سا کھڈ تھا' دو جانب ویران ناہموار سی زمین تھی جس پر تھوہر' کھجل' کیکروں کے جھاڑ تھے۔ کھڈ والی طرف نیچے سے سیلابی پانی پڑ پڑ کر کافی نشیب سا بن گیا تھا' نیچے جا کر غور سے دیکھنے پہ معلوم ہوتا تھا کہ مزار کی بنیاد بہت گہری رکھی گئی تھی۔ بنیاد میں لگائے گئے پتھر اور مسالہ بھی بڑا عجیب اور مخصوص سا محسوس ہوتا تھا...... مَیں اور میرا یارِ غار اسلم کبھی کبھی بابے دی بیری اور اس مزار پہ چکر لگاتے تھے۔ مقصد کوئی فاتحہ پڑھنا یا خیر و برکت کا حصول نہیں تھا' یہ تو محض اپنے خرچے پانی کا ذریعہ تھا۔ ہم دونوں فراڈیئے' نوسرباز آنکھوں میں سُرمہ' اُجلے کپڑے اور سَروں پہ رومال باندھے وہاں پہنچ جاتے۔ "بابے دی بیری" سے ایک تو خوب سیر ہو کر بیر کھاتے اور دوسرے زائرین کی نظروں سے بچ بچا

کر پیسے دھیلے' ٹکے اور کبھی کبھی آنی اور دونی بھی اُڑا لاتے تھے۔ اس ''مالِ غنیمت'' سے ہم اگلی جمعرات تک ریوڑیاں' مونگ پھلی' املوک' ٹنگری' پکوڑے اور کھیلنے کے لئے سگریٹوں کے خالی پیکٹ' کھوکھے' کنچے' گیڈیاں وغیرہ چلاتے اور اگلی جمعرات پھر چل سو چل...... اس ''شہید درویش'' کے مزار پہ کچھ ''نقدو'' تو کم ہاتھ لگتا تھا البتہ لنگر تبرک وغیرہ کافی میسر آ جاتا تھا جو واپسی پہ ہمارے پیٹ کے علاوہ رومالوں' شلواروں اور جیبوں میں ٹھنسا ہوا ہوتا تھا۔ ایک دن وہاں ہم نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت نے ہمارے سامنے ایک پوری اٹھنی لال سُرخ رومال میں کَس کر باندھی اور اپنے جوان سال بیٹے کے ہاتھوں اوپر مزار کی چمنی میں پھنکوا دی۔ معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کسی مقدمے سے بری ہوا تھا اور وہ اپنے بیٹے کو یہاں سلام کروانے لائی تھی۔ اس اٹھنی والے ''سانحہ'' نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا' اس بڑھیا پہ رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ خدا کی بندی! اتنی بڑی ''رقم'' تم نے ایک قبر کی تاریکیوں میں اتار دی۔ پیسے' ٹکا' آنی تو خیر ٹھیک ہے۔ یہ اکٹھی ایک اٹھنی؟ ...... ایک دم میرا شیطانی دماغ گھوما' میں سوچنے لگا کہ یہ تو صرف ایک اٹھنی تھی۔ خدا جانے یا یہ شہید بابا جانیں کہ ایسی کتنی اٹھنیوں' چونیوں' دونیوں' آنیوں اور ٹکے پیسے دھیلوں کے ڈھیروں کے ڈھیر چمنی کے اندر لگے پڑے ہوں گے اور بیچارے شہید بابا کے سر پہ خوامخواہ کا بوجھ دھرا ہوگا۔ دن اور سر پہ رات بے چینی اور بے کلی میں گزاری بس دماغ میں یہ خناس گھس بیٹھا کہ کسی طور شہید بابا کو اس دُنیا کے گندے بوجھ سے فراغت دلائی جائے۔ یہ بڑے ثواب کا کام تھا اور یہ کارِ ثواب میں خود کرنا چاہتا تھا' اپنے ساتھی اسلم کو میں نے ہوا تک لگنے نہیں دی۔ وہ ویسے بھی آنی دونی' حد چونی کی اوقات کا بندہ تھا لہٰذا میں نے اسے اپنے طور پہ فارغ کر دیا بلکہ ملنا جلنا تک ترک کر دیا تھا کہ کم بخت میری عادتیں خراب کرتا ہے۔

میں نے اب بابے دی بیری جانا چھوڑ دیا تھا۔ کچّے پکّے بیر ویسے بھی گلا خراب کرتے...... بلغم اور ریشہ پیدا کرتے ہیں' منہ لیسدار لعاب سے بھر جاتا ہے۔ بیریوں پہ بندروں کی مانند ڈال ڈال اُچھلنا پھلانگنا' قبروں کو الانگنا' یکلام مجھے یہ سب کچھ بکواس اور محض تضیع اوقات بلکہ بہت بڑا گناہ دکھائی دینے لگا۔ اللہ کسی وقت بھی بندے کو ہدایت دے دے...... اب میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ شہید بابا کے مزار پہ جانے لگا۔ اسلم سے قطع تعلق کے بعد پہلی جمعرات میں جو وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کمبخت اسلم بھی سر پہ رومال باندھے وہاں موجود ہے۔ وہ میرے قریب بھی آیا' دیکھتا بھی رہا پر توبہ کیجئے۔ جو ایک بار نظر سے اُتر گیا' سمجھو کہ دل سے نکل گیا...... میں نے منہ نہ لگایا۔ اب جو دیکھا تو اگلی جمعرات وہ پھر وہاں موجود۔ مجھے کھٹک گئی کہ یہ ندیدہ اتنی آسانی سے میرا پلّہ پاک نہیں کرے گا۔ میری صحبت میں لونا میٹھا' کھا چکا کر

بھی اِک کائیاں بن چکا تھا مگر میں تو اس کا گُرو تھا۔ گُرو اور گُرگ یہ ہمیشہ اپنا ایک گُر اور ایک داؤ بچا چھپا کر رکھتے ہیں تا کہ کہیں ایمرجنسی میں کام آئے اور اگر یہ دونوں ہستیاں ایسی پالیسی اختیار نہ کریں تو یہ دُنیا کب کی گُروؤں اور گُرباؤں سے مکمل طور پر خالی ہوگئی ہوتی اور ہر طرف چیلے ہی چیلے اور باگھ بچے یعنی شیر کے شیر بیلوں کی طرح للکاریاں مارتے پھرتے نظر آتے...... میں نے فوراً پینترا بدلا اور جمعرات کی بجائے جمعہ کے روز جانا شروع کر دیا' ویسے بھی وہ باقاعدگی سے جمعہ کی نماز اپنے والد کے ساتھ پڑھتا تھا اور بعد از نماز اُسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا تھا یعنی جمعہ کے دن وہ قید سا ہو جاتا تھا۔

آج جمعہ کا روز تھا اور میں صبح صبح ہی گھر سے بہانہ لگا کر نکل گیا تھا۔ گھنٹہ بھر کی مسافت پہ وہاں پہنچا تو نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ وہ علاقہ ویسے بھی اُجاڑ سا تھا' کھیت وغیرہ تھے مگر کچھ دُور دُور...... میں نے پہلے تو پورے صدقِ دل سے فاتحہ شریف پڑھی پھر کافی دیر درود شریف پڑھتا رہا۔ بعد دُعائے گنج العرش بھی پڑھی۔ ہمارے اُستاد حافظ عبدالرحمٰن صاحب المشہور "حافظ منّا لوہار" نے ہمیں ایک دفعہ بتایا کہ دُعائے گنج عرش ستر مرتبہ پڑھنے سے گنج نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر انہوں نے گنج کا مطلب خزانہ بتایا تھا...... پڑھنے پڑھانے کے بعد میں نے صدقِ دل سے دُعا کی التجا کی کہ یہ دُنیا کا مال یہ دونوں چونیوں ریزگاری کا [illegible] آپ بڑے شہید [illegible] پہ مجھے معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اللہ والوں' شہیدوں کا رزق پانی تو شہادت کے دن سے لگ بندھ جاتا ہے۔ یہ اَن پڑھ جاہل پینڈو توہم پرست لوگ تھے تو ہیں جو یہ پیتل تانبے کی گلی سڑی ریزگاری پھینک کر آپ کی سونے جیسی قربانی اور موتیوں جیسی محویت میں خلل ڈالتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے لئے یہ سب کھوٹی کھری ریزگاری بیکار ہے' وہی کے کام نہ پتّر کے مطلب۔ آپ نے یقیناً چاہا ہوگا کہ کوئی تو ہو جو مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلائے۔ گو میں ابھی بچہ ہوں مگر اپنی دُھن کا سچا ہوں۔ پیروں فقیروں' شہیدوں کو سلام کرنے والا' ماننے والا!...... شہید بابا! یقین کریں کہ مجھے کوئی لالچ نہیں' بس میرے دل میں اللہ نے خود بخود یہ بات ڈال دی ہے یا شاید آپ کی دُعا ہی قبول ہوئی ہے۔ میں نے اپنے لالچی دوست اسلم کو علیحدہ کر دیا ہے کیونکہ وہ بڑا کمینہ اور مکار ہے' پیسے لے کر واپس نہیں کرتا۔ فلمیں دیکھتا ہے' چوری چوری سگریٹوں کے سُوٹے لگاتا ہے۔ اس کی عادتیں مجھے اچھی نہیں تھیں۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ بھی اُسے اچھا نہیں سمجھتے تھے' بس میرے اچھے شہید بابا! میں آج اسی نیت و ارادے سے یہاں آیا ہوں کہ آپ کو اس دُنیا کے میل کچیل سے پاک و صاف کر کے اپنی عاقبت سنواروں...... یہ کہتے کہتے میری ہچکی سی بندھ گئی۔ صبح کا وقت تھا' یہاں اور تو کوئی موجود نہیں تھا اس لئے میں قدرے بلند آواز سے دُعا مانگ رہا تھا تا کہ شہید بابا جن کو ظالموں نے کانٹوں اور گانٹھوں سے بھرے

ہوئے ببول کے ساتھ زنجیروں سے باندھ کر' اردگرد اُونچا سا تنور بنا کر انارکلی کی طرح زندہ دفن کر دیا تھا' آسانی سے سُن سکیں۔ میں نے دُعا مانگ کر اپنی آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں خشک کیں اور وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ ''یاحل المشکلات'' کا زیرِ لب ورد کرنے لگا تاکہ اللہ میاں بھی میری مشکل کو آسان کر دیں...... اک دم جیسے خوشبو کا طوفان سا اُمڈ آیا ہو اچانک پیچھے سے کسی نے میرے دائیں کاندھے پہ لرزتا ہوا بھاری پتھر کی سِل سا ہاتھ دھر دیا تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی' اتنا بھاری بوجھ جیسے دھرتی اُٹھا کر میرے کاندھے پر رکھ دی گئی ہو۔ میں آپے آپ ہی بوجھ والی جانب جھک گیا تھا۔

''السلام علیکم......!'' یہ کہتے ہوئے کسی نے کاندھے سے ہاتھ اُٹھا کر میرے سر پہ رکھ دیا۔

''بیٹا! تم اکیلے یہاں صبح صبح...... اور یہ تم رو کیوں رہے ہو......؟''

اُس نے سر سے ہاتھ اُٹھا کر میرے سامنے آتے ہوئے پوچھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عجیب سا بوڑھا دیہاتی' سر پہ بھاری سا پگڑ' معمولی سا لباس مگر صاف ستھرا۔ ایک ہاتھ میں لٹھ جیسے بکریاں بھیڑیں چرانے والے ہاتھ میں رکھتے ہیں' کندھے پہ جھولتی ہوئی چھوٹی سی پوٹلی...... اب میں واقعی اس سے ڈر گیا تھا کہ میں جب یہاں آیا تھا تو دُور دُور تک کہیں کسی ذی نفس کا وجود نہ تھا۔ اب اچانک یہ بوڑھا کہاں سے آ گیا مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایسی اجاڑ ویران جگہوں پہ اکثر شرارتی بھی ہوتے ہیں اور چڑیلیں' چھلاوے بیریاں بھی...... میں نے جھٹ آیۃ الکرسی کا وِرد شروع کر دیا۔ بابا جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹا! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا...... تم صبح صبح یہاں کیوں آئے ہو اور رو کیوں رہے تھے......؟''

ہمت کر کے میں نے زبان کھولی۔ ''بابا جی! میں شہر سے آیا ہوں اور اکثر یہاں آتا رہتا ہوں...... آج جمعہ شریف تھا۔ سوچا' صبح صبح یہاں سلام کر کے فارغ ہو جاؤں''...... میں نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

وہ ہلکا سا مسکرائے اور کہا۔ ''جھوٹ بھی ایسی معصومیت سے بولتے ہو کہ غصے کی بجائے پیار آ جائے......'' پھر وہ اپنی پوٹلی اُتار کر کھولتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''اچھا' یہ کہو کہ آنسو کیوں بہا رہے تھے......؟''

میں کوئی جواب دینے کی بجائے سوچ میں پڑ گیا کہ اب پھر جھوٹ بولوں یا؟...... وہ خود ہی کہنے لگے۔

"جھوٹ بولو گے تو کاگا کو کوا کاٹ لے گا......"

خالص دیسی گھی کی سچی کھری خوشبو' پہلی خوشبو میں گھل مل گئی۔ پوٹلی میں کانسی کا کٹورا' اندر ملیدہ دیسی گھی میں گندھا ہوا۔ ایک چھوٹا سا لقمہ میرے منہ میں رکھتے ہوئے بولے۔

"لو بسم اللہ...... پہلے کچھ ناشتہ کر لو لسی کا گلاس ہی پی کر گھر سے نکل پڑے تھے......"

یہ سنتے ہی میں لڑھک چکا تھا...... جب ہوش آیا تو میں ایک کشادہ گول سی پرانی قبر میں پڑا ہوا تھا۔ میرے سرہانے' پاؤں میں دائیں بائیں سکے ہی سکے' پیتل تانبہ' چاندی سونا' چمکتے دمکتے کرتے ہوئے...... میں آنکھیں ملتے حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اپنے اردگرد دیکھنے لگا......

یہ کیا اسرار ہے' میں کہاں پھنس گیا۔ میرے اردگرد یہ سب کچھ کیا ہے؟...... ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ پاس ہی کہیں سے جیسے کوئی ملی اور مخصوص ہلکی سی خوشبو کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ بابا جی چلے آ رہے ہیں مگر اب تو جیسے وہ کسی بیوٹی پارلر سے ہوتے ہوئے آئے ہوں۔ اگر چہرے سے نہ پہچانتا تو وہ باہر والے بابا جی ہی نہیں تھے جنہوں نے مجھے حجرے کا ملیدہ کھلایا تھا۔ "السلام علیکم" کہتے ہوئے وہ میرے قریب ہی فروکش ہو گئے' فرمانے لگے۔

"...... کچھ نے ...... ہو......"

میں انہیں اس حالِ پُر جمال میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میرا سارا ڈر' خوف اور جھجک جیسے انہیں دیکھتے ہی کافور ہو گئی تھی۔ خود کو ڈھارس بندھاتے ہوئے میں نے زبان کھولی۔

"بابا' آپ...... آپ کون ہیں اور یہ جگہ کون سی ہے......؟" میں نے اپنے اردگرد نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بیٹا! میں وہی ہوں جس کے پاس تم پہنچے تھے اور یہ جگہ بھی وہی ہے جہاں تم میرا بوجھ ہلکا کرنے آئے تھے......" پھر وہ فرش پہ جا بجا انباروں کی شکل میں پڑی ہوئی ریزگاری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ سارا اپنا بوجھ میں نے اُتار کر یہاں رکھ دیا ہے۔ تم یہی کچھ لینے یہاں آئے تھے اسی کے لئے تم اوپر گڑگڑا کر دُعائیں مانگ رہے تھے نا!...... تم یہ سب کچھ یہاں سے لے جا سکتے ہو' میرے لئے یہ سب کچھ بیکار ہے......"

میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"بابا جی! میں واقعی یہی کچھ لینے یہاں آیا تھا مگر...... مگر اب مجھے یہ کچھ نہیں چاہئے۔ میں جان گیا ہوں کہ دُنیا کے مال و زر کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے...... ہاں! اگر آپ مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں

تو مجھے یہ دُعا دے دیں کہ مولیٰ کریم مجھے نورِ علم صالح سلامتی کے ساتھ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واطاعت اور فرقان الحمید کو سمجھنے کی بصیرت اور اس پہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

یہ کہہ کر میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میری طلب' جان کر مسکرائے' بڑی رسان سے گویا ہوئے۔

''سُبحان اللہ...... ماشاء اللہ!''

''بابا جی! مجھے یہ تھوڑی سی خوشبو بھی چاہئے......'' میں نے گہرا سا سانس کھینچتے ہوئے' التجا سی کی۔

فرمانے لگے۔ ''ادھر کا مال اور حال ادھر ہی رہتا ہے۔ ایسی ہی خوشبو' تمہارے لئے کہیں اور رکھی ہوئی ہے' جب وقت آئے گا تم اس مہک کو پہچان لو گے......''

شا کالی گُربہ آنکھوں کے زاویئے بدل بدل کر مجھے تاڑ رہی تھی...... میں اس کی کیا پرواہ کرتا جب میں تو خود کہیں ماضی کے دُھندلکوں میں اترا ہوا تھا' شہید بابا اور ان کی مخصوص خوشبو کے سحر میں ڈوبا ہوا۔ اب یہاں پہ مجھے شہید بابا کی کہی ہوئی وہ بات بھی یاد آ گئی کہ تمہاری خوشبو کہیں اور رکھی ہوئی ہے' وقت پہ تم اسے پہچان لو گے...... یہ ادھ کھلے کواڑ سے بالکل وہی خوشبو چھن چھن کر باہر آ رہی تھی' یعنی میں اس خوشبو کو پہچان کر بےلوث سا ہو گیا تھا۔

- کارخانۂ قُدرت' عجائباتِ حکمت و فطرت......!

رَبّ اَلعالمین کے اس عالمِ ہست و بُود اور اس لامحدود کائنات میں اربوں کھربوں نظام بیک وقت عمل پذیر ہیں۔ کچھ نظام تو ایسے ہیں جو اِنسانی دائرۂ ادراک اور حدِ فہم و شعور میں کبھی آسانی سے کبھی قدرے دِقّت سے آ ہی جاتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اِنسانی بساط و برتے سے کہیں ماورا ہوتے ہیں۔ حیوانات' جمادات' نباتات' فواکہات وغیرہ۔ کُرۃ التراب' کُرۃ الماء' کُرۃ الہوا' کُرۃ النار' آسمان' بروج' سیارے' علومِ اَرضی یا سِفلی' علومِ فلکی یا علوی' استعانتِ اَجرام اور روحانیاتِ آفاقی وغیرہ یہ سب رازہائے کائنات ہیں اور اس کے علاوہ جو بھی کچھ ہے وہ ماورائے کائنات ہے۔ رَبِّ کائنات چاہے تو اپنے خاصانِ نگاہ اور محبوبانِ بارگاہ کو جتنا چاہے' جب چاہے' عطا بھی کر دیتا ہے۔ اس عنایت و بخشش اور کرمِ خاص کو درویشی' حکمت اور علومِ مخفی کی اصطلاح میں ''استعانت باللہ'' یعنی اسماء و صفاتِ الٰہیہ کے علوم و عمل بھی کہتے ہیں۔ علیّین و سجّین کے درمیان اَعلائے علیّین اور اَسفل السافلین کے مابین جو کچھ بھی ہے وہ علم و عملِ الٰہی یعنی استعانتِ باللہ ہے۔ ظاہری' باطنی' آسمانی عوامل و عُلوم کے جتنے بھی اَسرار و رموز

…مات واثرات ہیں' ضروری نہیں کہ وہ ہر عامل و طالب پہ کماحقہ روشن ہو جائیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جسے چاہے' بغیر محنت و طلب عطا ہو جاتے ہیں۔ یہ اس مالک و خالق کی دین ہے۔ جسے چاہے نواز دے اور جسے چاہے' محروم رکھے...... اس کارخانۂ عجائب میں ابتدائے آفرینش سے ہی عجیب و غریب سلسلے اور معجزات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہر لمحہ' ہر پل اپنے جلو میں نت نئے جلوے' طرح طرح کے ظرفہ تماشے' ورطۂ حیرت میں غرق کر دینے والی ہونیاں' اَن ہونیاں۔ فوق العقل' فوق الفطرت اور مافوق الطبیعات قوتوں کی بوالعجبیاں' آفاقی اصولوں قانونوں اور فطرت و جبلّت کے طور طریقوں کی فرمانروائیاں اور پھر تربیت' سرخوشی میں سے برگشتگی' اور سرگشتگی میں سرمستیاں' گوبر اور موت کے درمیان دودھ اور ولی کے گھر میں بھوت۔ آگ لینے آئے تو پیغمبری دے دی یا ایک نوعمر بچے کو گھوڑے پہ بٹھا کر سکندری دے دی۔ کسی نے حق کہا تو کھال کھنچوا دی اور کسی نے سچ کہا تو زہر پلوا دیا۔ کسی کو پالنے میں ناطق کر دیا اور کسی کو شکمِ مادر میں ہی حافظ کر دیا' کسی کو چروا دیا تو کسی کو کٹوا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حراء کی تنہائی دے کر حیران کر دیا اور کسی کو داؤد کی داوری دے کر سلیمان کر دیا۔ وہ ذات بے نیاز ہے۔ جو چاہے سو کرے۔ تدبر' تجبر' تکبر اور تحمل سب اُسی قادرِ مطلق کو زیبا ہیں۔ اُس کے ... اور بخشنے کے ... ہی ... کا بہانہ ... کی ... گناہوں کے بوجھ سے لڑکھڑاتے ہوئے عاصیوں کو سہارا ملتا ہے۔ عام انسان کسی بھی سطح پہ معصیت' مصائب و مکروہات سے مبرّا' منزّہ نہیں ہو سکتا وہ اپنی پاکیٔ داماں کا کتنا ہی داعی کیوں نہ ہو۔ اپنے اعمالِ صالح' اشغالِ رشیدہ اور افعالِ حمیدہ پہ کیسا ہی حُسنِ ظن محسوس کرتا ہو' بات تو بالآخر اس کے فضل و کرم پہ ہی آ کر پڑتی ہے۔ بندہ تو بندہ ہے۔ اس کے خمیر اور سرشت میں ہی نافرمانی' ضد' کرید' لڑائی جھگڑائی' رشک و حسد' تلوّن' نسیان' طمع' حرص اور سرکشی کے ذرات کم و بیش کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ یہ خدا سے زیادہ شیطان (تھپڑ' مکا) کے نزدیک ہوتا ہے لہٰذا کبھی بھی اپنے نیک اعمال' نمازوں' عبادتوں' حجّوں اور داڑھیوں پہ اترانا نہیں چاہئے' ہر وقت اللہ سے اُس کا فضل و کرم ہی مانگنا چاہئے...... حسبِ عادت میری بات ایک بار پھر اپنے محور سے اِدھر اُدھر ہو گئی ہے اور میں شاید یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جو اس کائنات اور ہماری جان و اَموال کا مالک و خالق ہے' جس کی تائید کے بغیر ایک شمہ تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا اس نے کچھ ایسی مخلوقات بھی اپنی کمال صنّاعی اور حکمت و مصلحت سے تخلیق فرمائی ہیں جن کو اوّلاً سمجھنا اور ان کے کار و ورود' عدم و وجود' ممات و حیات' سرشت و جبلّت کے متعلق کماحقہ جاننا ہی خاص طور پہ انسان کے لئے ادق کر دیا گیا۔ آسمانی صحیفوں اور دیگر انبیاء کرام کے ذرائع سے جو کچھ حضرت انسان کو معلوم ہوا اس سے شاید

اس کی متجسسانہ فکر وطبع کی خاطر خواہ تسلی نہ ہو سکی بس یہیں سے خفی علوم' رازہائے سربستہ' اسرارِ علوی' علم الافلاک' فوق العقل' فوق الفطرت اور مافوق الفطرت اور پھر مابعد الفوق الفطرت اور دیگر بہت سے علوم افلاکی پردہ اخفا سے منظر پہ آئے۔ صانع حکیم لم یزل نے اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق سے بہت پہلے ملائکہ' جنات اور دیگر نوری وناری عنصر الوجود مخلوقات تخلیق فرما دی تھیں۔ تخلیقِ آدم سے پیشتر کی یہ تمام مخلوقات اپنے اپنے دائرہ کار میں محدود اور اپنی متعین مخصوص حد بندیوں میں مسدود تھیں' انسان سے اُن کا بنیادی عنصری بُعد ہی ان میں آپس کی تفریقی ضدین ہے۔ نوری ناری اور خاکی مخلوقات کی ضرورتیں الگ' دُنیائیں الگ۔ صورتیں' سیرتیں' خوراکیں' طبع' عمریں' ہر چیز الگ بلکہ ایک دوسرے کی ضد...... بس یہی چیزیں تھیں جنہوں نے انسان کو اُکسایا کہ وہ ان مخلوقات اور ان کے متعلقہ علوم کو جانے۔ خدائے سبوح وقدوس نے قرآن مجید میں اجمالاً تفصیلاً مختصراً اور کہیں کہیں اشارتاً ان مخلوقات اور ان کے متعلق کچھ معلومات ان کے نام' اختیارات' ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ انسان نے اسی قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیلہ بنا کر اپنے تجسس سے علوم الٰہیات میں درک حاصل کی' یعنی جو کچھ بھی نکلا وہ معدن قرآن سے ہی نکلا۔ مالکِ قرآن نے خود فرمایا کہ قرآن میں تفکر و تجسس کرو اور یہ بھی ارشاد ہُوا ہم نے تمام مخلوقات میں سے اشرف المخلوقات صرف انسان کو ہی بنایا۔ اب اللہ نے اس انسان میں بھی بہت سی اقسام بنائیں۔ افضل بھی' اسفل بھی' لائق بھی اور نالائق بھی' معصوم اور معجزہ بھی' حکیم بھی اور رجیم بھی' عالم بھی اور جاہل بھی۔ خالق نے ایسے انسان بھی تخلیق کیے جنہیں بطنِ مادر میں بھی بہت سے علوم وفنون اور قوتیں' صلاحیتیں ودیعت فرما دیں۔ کئی انسانوں کو علیحدہ سی حسیات اور مخصوص بالیدگیاں عطا کر دیں تو کئی ایک کے باطن صیقل کر دیے۔ آنکھیں آئینہ کر دیں تو کہیں سینے وادیٔ سینا کر دیے۔ دِل گداز دیے تو کہیں حوصلے فراخ دیے۔ کسی کے طائرِ فکر کو آشنائے لاہوت کر دیا' کسی کو پروازِ تخیل دے کر مبہوت کر دیا' کسی کی خرد وبینش کو ارسطو کر دیا' کسی کو بینائی ودیدہ وری کا حکیم الاُمتؒ کر دیا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ کچھ انسان' عام انسانوں سے ماورئی اور علیحدہ سی خصلتیں اور خاصیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں' گو ایسے نابغۂ روزگار کہیں خال خال ہی ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی دَور' وقت' زمانہ ان کے وُجود سے خالی نہیں ہوتا۔ ایسے انٹلیکچوئل' جینئس مرد وزن ہر شعبۂ حیات میں ملتے ہیں جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور پُراسرار قوتوں کی بِنا پہ صفِ اوّل میں سرکردہ فرد کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں' زمانہ ان کی قدر ومنزلت سے اغماض نہیں برت سکتا۔ موسیقی' آرٹ' مصوری' شاعری' ادب' رقص۔ ان فنونِ لطیفہ سے ہٹ کر دیگر علوم وفنون' صنعت وحرفت' سائنس' کاشت کاری' تجارت' عمارت' سیاست' قانون۔ ان سے بہت بڑے

کیمیا گری، علومِ مخفی، روحانی علوم۔ افلاکی، سفلی، جادوگری شعبدہ بازی، یوگا، خودحفاظتی فنونِ حرب، کھیل، وغیرہ وغیرہ...... موضوع فی الوقت مخفی علوم ہیں اس لئے صرف اس پہ بات کرتے ہیں کہ شخص اس کا اہل نہیں ہوتا۔ یہ مخصوص مکتبِ فکر کے لوگ علیحدہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی حسیات، انداز ے تخمینے، قوتِ برداشت، سوچ کے زاویئے، اعصاب غرضیکہ ہر چیز مختلف ہوتی ہے۔ جو صلاحیتیں کوشش اور بہت سا وقت ضائع کرنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتیں وہ یہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ انہیں شروع سے ہی ایسی صلاحیتیں عطا کر کے بھیجتا ہے۔ ان کے مٹی علیحدہ اور خوشبو جُداگانہ سی ہوتی ہے۔ جیسے وَلی ایک دُوجے کو پہچان لیتے ہیں۔ جیب کترا، جیب کترے کو شناخت کر لیتا ہے۔ فوجی، فوجی کو اور پولیس والا، پولیس والے کو، اسی طرح اس فیلڈ کے لوگ بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ ہر انسان کے گرد مختلف ہالے ہوتے ہیں، مختلف رنگوں کے بہت سے دائرے، بہت اقسام صوت و آہنگ کے لہریئے، روشنیوں کے بنتے پھوٹتے بلبلے، جگنوؤں سے جلتے ہوئے بجھتے ستارے۔ اس کی شخصیت، فطرت اور کردار کے مطابق خوشبوؤں یا بدبوؤں کی لپیٹیں ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ اجسام لطیف یا اجسام کثیف بھی ہوتے ہیں جو آپ اپنی انسانی آنکھ سے ہوائی چیزیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہوائی اجسام بھی انسان کی خصلتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اچھوں کے ساتھ اچھے خوبصورت چہروں والے اور بدکرداروں بدطینتوں کے ساتھ کریہہ، جُثہ اور کریہہ صورت۔ اب ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ہر کوئی تو نہیں دیکھ سکتا لیکن جنہیں اللہ نے مخصوص نگاہ دی ہوتی ہے وہ دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے چاچی نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا تھا جبکہ میں اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ''کاگا'' ہوں۔ چاچی نے جب میری بند گرہ کھولی تو مجھے نظر آنے لگا کہ میرے سامنے کون کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ میرے پاس کچھ بندھا ہوا تھا جو مجھے عطا کر دیا گیا، چاچی نے صرف اس کی نشاندہی کی تھی اور اس سے آشنائی کرائی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے مجھے بہت کچھ ودیعت کیا۔ میں اَن پڑھ جاہل ہونے کے باوجود ان نعمتوں سے بہرہ مند تھا ویسے جب دینے والا دیتا ہے تو پھر ایسے مواقع بھی پیدا فرماتا ہے اور ایسی ہستیوں سے بھی ملواتا ہے جن سے مزید تربیت اور ہدایت ملتی ہے۔ جیسے ان کے پاس پہلے سے ہی ''نام کام'' پہنچ چکا ہے۔ چاچی، بابا شہید، بابا رحمت سائیں، ٹنو سائیں اور تانگے والا، جنل سیاہ پوش وغیرہ اور چند گئے گزرے بلیاں بھی...... یوں تو میرے ساتھ ایسے واقعات اکثر و بیشتر ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک واقعہ بیان کرنے کے قابل ہے۔

فلپائنی میڈیم' زیڈ بائی ڈبل زیڈ......!

مَیں اور میرا منجھلا بیٹا محمد رضوان خان ایک خوبصورت اُجلی سی صبح سیر گشت کی غرض سے باہر نکلے۔ یہ اتوار کی صبح تھی اور مقام بروک لین' براؤن زوائل' نیویارک۔ جوگنگ سوٹوں میں ملبوس ہم باپ بیٹا بڑی سُبک خرامی سے فٹ پاتھ پہ چلے جا رہے تھے۔ کچھ دُور آگے چل کر دائیں طرف ایک گرجے کے پاس ہم رُک گئے۔ یہاں اپنے جمعہ بازار کی طرح ایک مارکیٹ لگی ہوئی تھی۔ ایسی مارکیٹیں جنہیں کار بوٹ مارکیٹ کہتے ہیں' اکثر اتوار کے اتوار سکولوں' گرجوں میں لگائی جاتی ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کا فالتو سامان یہاں لے آتے ہیں' تفریح اور کاروبار دونوں کام ہو جاتے ہیں۔ ہم تو ایسے ہی محض دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے تھے۔ اچانک میری نظر قریب ہی ایک موٹی سی بڑھیا پہ پڑی جو ابھی اپنی کار کے بوٹ سے سامان نکال کر سامنے لکڑی کی میز پہ سجا رہی تھی۔ جس چیز نے مجھے اس کے قریب جانے پہ مجبور کیا وہ ایک پُرانی تصویر تھی۔ تصویر کیا تھی' دس ضرب سولہ کا ایک فریم تھا۔ ڈیڑھ انچ گہرا' اوپر شیشہ لگا ہوا تھا اور اندر پیپر پنوں سے مصلوب کی ہوئی ایک غیر معمولی بڑی کالی [illegible] تتلی جس کا سائز بھی غیر معمولی طور پہ بڑا تھا۔ مزید غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ سُرخی چپکا دار دکھائی دے رہا تھا۔ میں [illegible] کالا رنگ [illegible] کہتا ہوا پاس جا کھڑا ہوا۔ کالا رنگ میری بہت بڑی کمزوری ہے' میرا بس چلے تو مَیں اپنا رنگ کالا کر لوں۔ کھانے پینے' پہننے برتنے' اوڑھنے بچھونے کی ہر چیز سیاہ ہو اور مزید بس چلے تو مَیں اس دُنیا کی ہر چیز کو کالا کر دوں — خیر' مَیں تصویر کو اُٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ مَیں شاید یہ بتانا بھول گیا کہ وہ موٹی سی خاتون بھی کالی شا کالی تھی' یعنی جمیکن۔ اس نے کانوں پہ کھوپے چڑھائے ہوئے تھے' میوزک سُن رہی تھی اور ہاتھ سامان سجا رہے تھے' ہونٹ گنگنا رہے تھے۔ اس نے مجھے سرسری نظر سے دیکھا ضرور تھا' پھر اگلے ہی لمحے وہ مجھ سے بے نیاز سی ہوگئی تھی۔ رضوان صاحب وہاں رکھے ہوئے پرانے ریکارڈ اُتھل پُتھل کرنے لگے۔ مَیں بڑی محویت سے تتلی کو دیکھ رہا تھا۔ میرا اپنا خیال تھا کہ یہ عظیم الجثہ تتلی کہیں سیام' سیلون یا جاوا ساٹرا کے جنگلات میں پائی جاتی ہوگی۔ تتلیوں کا کوئی شوقین سیاح یا فوجی وہی اسے نادرالوجود سمجھ کر خرید لایا ہوگا اور اب یہ موٹی کالی جمیکن اسے منحوس سمجھتے ہوئے کاٹھ کباڑ کے ساتھ بیچنے کے لئے لے آئی ہے۔ میری دلچسپی محض اس تتلی کا کالا ہونا اور عام سائز سے بڑا ہونا تھا۔ اب رضوان مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ڈیڈی! یہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟...... چھوڑیں اسے' اس سے بڑی عجیب سی بُو آ رہی ہے —''

مَیں نے اس کا اشتیاق بڑھانے کی غرض سے کہا۔

''یار! دیکھو تو کیسی خوبصورت کالی شا اور بڑی سی تتلی ہے...... ذرا اُس موٹی سے اس کی قیمت تو پوچھو؟''

''ڈیڈی! مجھے پتہ ہے' آپ اسے صرف بلیک ہونے کی وجہ سے خرید رہے ہیں ورنہ اس میں اور کوئی خاص بات نہیں......''

مَیں نے اسے عینک کے اُوپر سے گھورتے ہوئے کہا۔

''یار! تتلی سے زیادہ کالی تو یہ موٹی ہے۔ اگر محض رنگ کی ہی بات ہوتی تو مَیں تتلی کی بجائے اس موٹی کی قیمت پوچھنے کی بات کرتا......''

رضوان اسے ایک نظر دیکھتے ہوئے قیمت پوچھنے لگا۔ اُس نے ڈیڑھ ڈالر بتائی تھی' مول تول کر کے [illegible] پر بات طے ہو گئی۔ اچانک خیال آیا کہ ہم تو جوگنگ کے لئے نکلے ہوئے ہیں' ہمارے پلّے تو [illegible] جنت تک نہیں۔ رضوان کو بھی احساس ہوا تو وہ مسکرانے لگا' موٹی سے کہا۔

''ہم تو جوگنگ کے لئے نکلے تھے' پیسے ساتھ نہیں لائے۔ تم اسے ہمارے لئے رکھو ہم ابھی واپس [illegible] ہیں''۔

وہ موٹی ترت بولی۔ ''تم ہمارے ایشین معاملات کے ایسے ہی ہوتے ہو...... میرا بوہنی کا ٹائم ہے تم میرا موڈ اور ٹائم خراب کر رہے ہو...... اپنے ملک سے باہر نکلو یا یہاں اپنے گھر سے آؤٹ قدم رکھو' پیسے جیب میں رکھنا مت بھولو...... یُو انڈرسٹینڈ' مین! بھاگ جاؤ' اگر واپس آنا چاہو تو ڈیڑھ ڈالر لے کر [illegible] ابھی کا ریٹ ہے' بعد کا نہیں...... اور ہاں اگر تمہارے آنے سے پہلے کوئی اور گاہک اسے لے [illegible] تمہاری بیڈلک ہو گی......''

ہم شرمندہ سے وہاں سے کھسک لئے۔

''یار' رضوان! یہ موٹی تو بہت بڑی بزنس مائنڈڈ نکلی۔ اُلو کی پٹھی نے ہماری بے عزتی ہی کر دی ہے۔''

''ڈیڈی! یہ تصویر ہی منحوس تھی' آپ یوں ہی اُسے کالے رنگ کی وجہ سے لے رہے تھے...... [illegible] اچھا ہوا ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔''

''نہیں' یار! اس سے پراَمس کر کے آئے ہیں...... چلو واپس چلتے ہیں۔ ڈیڑھ ڈالر اُس کے مُنہ [illegible] تتلی اُٹھاتے ہیں۔''

آدھے گھنٹے بعد واپس پہنچے تو تتلی وہاں سے اُڑ چکی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر خُوب پیٹ میں لہریں

اُٹھا اُٹھا کر ہنسی' پھر مترنم سی آواز میں کہنے لگی۔

''مائی ڈیئر' پاکستانیو! تم ہمیشہ ہر معاملے میں دیر کر دیتے ہو...... اچھا ہوا کہ تمہارے پاس پیسے نہ ہونے کی وجہ سے سودا نہیں پٹا تھا۔ مجھے پورے پانچ ڈالر کا فائدہ ہوا ہے۔ وہ زرد رو منحوس سی فلپائن اس فریم کے ساتھ کچھ اور کاٹھ کباڑ بھی لے گئی ہے......''

ہم اس پرکالہ کو کوئی جواب دیئے بغیر ہی کھسک لئے۔ ہم آگے یونٹی سنٹر کی جانب بڑھ گئے۔ اب خال خال لوگ آ جا رہے تھے' اکثریت کالے امریکنوں کی تھی جو خاص طور پر نیویارک کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھتے ہیں۔ سفید رنگت والے امریکن یہاں خود کو ریفیوجی سمجھ کر رہنے پہ مجبور ہیں۔ نیویارک واقعی بدیسیوں کا شہر ہے۔ بھانت بھانت کا بنده' مختلف رنگوں' لباسوں' مزاجوں اور بولیوں ٹھولیوں کے لوگ اور ہر کوئی اپنی دُھن اور لگن میں مگن۔ قدم قدم پہ قتل' ڈکیتیاں' نوسر بازیاں' لوٹ کھسوٹ۔ کوئی سڑک' سٹریٹ ایسی نہ ہوگی جہاں پولیس کی گاڑیاں' وگینیں سیٹیاں بجاتی' لائٹ فلیش کئے ہوئے چکراتی ہوئی آپ کو دکھائی نہ دیں۔ اس کے باوجود لوگ باگ بڑی بے نیازی' بے خوفی سے آ جا رہے ہیں' اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہیں۔ [illegible] پر کیا مجال کہ لوگوں میں کوئی ہراس یا خوف ہو' اِدھر کوئی توجہ ہی نہیں دیتا جیسے یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول ہو۔ آپ جا رہے ہیں' بڑے سکون و آرام سے کوئی کالا آپ کو ہیلو کہے گا' پھر بڑے سکون سے گن نکال کر آپ سے ملتمس ہوگا میں نے ڈرنک اور ڈنر کرلینے ہیں' مجھے پانچ ڈالر دے دو۔ یہ واردات گزرنے والے بھی دیکھ رہے ہیں۔ آپ دونوں بیچ فٹ پاتھ پہ کھڑے ہیں پر کیا مجال جو کوئی راہرو آپ دونوں کو ڈسٹرب کرے' مسکراتے ہوئے پاس سے گزرتے جائیں گے۔ آپ آرام سے پانچ ڈالر یا جو بھی آپ کے پاس ہے اسے نکال کر دے دیتے ہیں۔ وہ تھینکس کہہ کر ڈالر لے لے گا اور ٹہلتا ہوا' سیٹی بجاتا ہوا ایک جانب کو ہو لے گا۔ نہ کوئی پولیس والے کو بتائے گا' نہ کوئی ٹیلیفون ہوگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور ہاں' اگر آپ نے ہچر مچر کی یا معذرت داغی کہ میری جیب خالی ہے' دونوں صورتوں میں گن سے ایک گولی بنا کسی تکلف نکلے گی اور آپ کی بغل میں ایک سوراخ کرتی ہوئی دوسری جانب نکل جائے گی اور آپ وہیں فٹ پاتھ پہ بڑے سکون سے لیٹ جائیں گے۔ یہ سب کچھ سرزد ہو جانے کے باوجود کوئی وہاں پہ رُکے گا اور نہ کوئی آپ کی مدد کو آگے بڑھے گا' خود ہی ایمبولینس پہنچ جائے گی اور شام کے اخبار میں جرائم کے ایک مخصوص کالم میں دو سطری خبر لگ جائے گی۔ بس چھٹی...... یقین جانئے' نیویارک کے زیادہ تر کالے باسی اسی روزگار سے اپنے کباب شراب کا خرچہ نکالتے ہیں۔ محکمہ سیاحت نے تو صاف طور پہ نمایاں لکھا ہوتا ہے کہ

اگر آپ اس شہر میں نو وارد ہیں اور گھومنا پھرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ باہر نکلتے وقت زیادہ نقدی اپنے پاس رکھنے سے اجتناب برتیں لیکن خالی جیب بھی نکلنے سے احتراز فرما دیں کیونکہ آپ کو اس صورت میں فوراً نقصان پہنچنے کا احتمال زیادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکو حضرات کے لئے ہلکا سا خرچہ پانی ضرور اپنے پاس رکھیں۔ تعاون کا شکریہ......! پرانے' سمجھدار اور نیک سیر سپاٹے کے شوقین لوگ ہمیشہ اپنے پاکٹ میں پانچ دس ڈالر علیحدہ ہی ڈاکو فنڈ میں رکھتے ہیں۔ جونہی کوئی موسیقی کی لہروں پہ جھومتا جھامتا کالا قریب آیا' اس کے پسٹل نکالنے سے پہلے ہی اُس کا بھتہ اُس کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ میں تو اکثر دُور ہی سے ایسے ڈاکو کو سونگھ لیتا تھا۔ وہ کہیں اور کسی کی تاک میں کھڑا ہوتا' میں اس کے پاس پہنچ کر بڑی رسان سے پانچ کا نوٹ اسے پیش کر دیتا۔ وہ شریف ڈاکو پہلے پانچ ڈالر کے نوٹ کو اور پھر مجھے دیکھتے ہوئے [illegible] کر کہتا۔

"تھینکس...... یو آر رئیلی جنٹلمین' ویری کائنڈ آف یو......"

یہ نیویارک کے رنگیلے ڈاکوؤں کا قصہ یوں ہی بیچ میں آ ٹپکا' میں اصل بات اس تصویر کی کر رہا تھا جو بقول اس جمیکن کے ایک زرد رُو فلپائنی عورت [illegible] گئی تھی۔ چلو خس کم جہاں پاک۔ جان چھوٹی اس بلا سے [illegible] غیر معمولی طور پہ بڑھی اور اس کا سر چمگادڑ جیسا تھا۔ اب ہم باپ بیٹا بڑے ہلکے پھلکے مزے سے کمیونٹی سنٹر کی جانب جا رہے تھے۔ ذرا آگے جا کر دائیں جانب شراب خانہ تھا' اس کے باہر [illegible] لکڑی کے بیچ تھے جن پہ شراب بیئر پینے والے بیٹھتے ہیں۔ دُور سے مجھے نظر آیا کہ کوئی عورت' ٹانگ پہ ٹانگ دھرے' سنٹر والے بینچ پہ بیٹھی ہماری جانب دیکھ رہی ہے۔ دُور دُور اکا دُکا آتے جاتے لوگ ہوں گے مگر ہماری والی فٹ پاتھ پہ اس وقت صرف ہم ہی باپ بیٹا تھے جو شراب خانہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے ایک دم میرے دماغ میں فلیش سا ہونے لگا اور میں جس حالت میں تھا' وہ ایک دم جیسے ڈسٹرب سا ہو گیا۔ میری رفتار میں بھی فرق آ گیا تھا...... الٰہی! یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے؟...... میں چنداں غور کرنے کی غرض سے ایک سٹریٹ پول سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ رضوان بولا۔

"ڈیڈی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔ رضوان کو میں کیا کوئی جواب دیتا' میں تو کہیں اور اُلجھ گیا تھا۔ دراصل میں اس لہر یا فریکوئنسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھے چھو کر یا میرے قریب آ کر کوئی سگنل دیئے بغیر پھر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ میں بڑا مضطرب سا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آخر میری نظر اس فلپائن

عورت پہ جا کر جم گئی۔ وہ بھی سگریٹ کے کش پہ کش لگاتے ہوئی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی' رضوان نے بھی میری نگاہوں کو فالو کرتے ہوئے اُسے دیکھ لیا تھا۔

''ڈیڈی! وہ عورت ہمیں کیوں دیکھ رہی ہے......؟''

''بیٹا! تم کسی کے دیکھنے پہ پابندی تو نہیں لگا سکتے......؟''

مَیں نے اس عورت سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر رضوان کو جواب دیا۔ رضوان نے میری محویت کو محسوس کرتے ہوئے پھر ایک اور سوال داغ دیا۔

''ڈیڈی! آپ اِسے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

مَیں نے اسی کیفیت میں جواب دیا۔

''رضوان! یہ وہی عورت ہے جو ہماری کالی شا کالی تتلی اُڑا لائی ہے' اب وہ ہمیں دیکھنا اور ملنا چاہتی ہے......''

''مگر کیوں......؟'' رضوان نے قدرے متذبذب سا ہو کر پوچھا۔

اب [illegible] نظریں ہٹا کر [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ تو مجھے پتا نہیں کہ وہ مجھے کیوں ملنا چاہتی ہے مگر...... مگر وہ ایسا چاہتی ضرور ہے۔''

رضوان میرا ہاتھ پکڑ کر قدرے کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔

''دفع کریں ڈیڈی! اس چڑیل کو...... ہم اِدھر جاتے ہی نہیں' واپس چلتے ہیں۔''

مَیں نے اُس کی بات پہ صاد کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے' ہمیں واپس ہی چلنا چاہیے۔ آج کا دن ہمارے لئے کچھ بہتر دکھائی نہیں دیتا' صبح صبح یہ دوسری چڑیل ہے جس سے ہمارا واسطہ پڑا ہے......''

''دوسری نہیں' تیسری چڑیل...... وہ چمگادڑ کے مُنہ والی کالی تتلی بھی اک چڑیل ہی تھی......''

واپسی کے لئے ہمارے قدم ذرا تیز ہی اُٹھ رہے تھے' خاص طور پہ رضوان تو جیسے جلد سے جلد یہاں سے دُور نکل جانا چاہتا ہو۔ آگے سینٹ مائیکل سکول والی ٹریفک لائیٹ سے ہم سڑک کراس کرنے کے لئے زیبرا کراسنگ پہ آ گئے۔ رضوان نے سڑک پہ آتے ہی مڑ کر اس فلپائنی کی جانب دیکھا' دوسری طرف فُٹ پاتھ پہ پاؤں دھرتے ہی بتانے لگا کہ وہ چڑیل وہیں بیٹھی ہماری جانب دیکھ رہی ہے۔ اب مَیں نے بھی اُدھر دیکھا' وہ بڑے سکون سے بیٹھی سگریٹ کے مرغولے اُڑاتی ہوئی ہماری طرف تک رہی تھی۔

''رضوان!'' مَیں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"یہ بات یاد رکھو کہ یہ ہمیں چھوڑنے والی نہیں ہے' یہ مجھ سے مل کر ہی رہے گی......"

"میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا......" رضوان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مکا لہرا کر کہا۔

"یار رضوان! اس میں ٹانگیں توڑنے والی کون سی بات ہے' اس بیچاری نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟" [illegible] نے دھیمے لہجے میں رضوان کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"ڈیڈی! اس نے صبح صبح ہمارے مُوڈ کا ستیاناس کیا ہے...... جوگنگ غارت کی' ہماری تسلی لے [illegible] سے زیادہ اور کیا زیادتی ہو سکتی ہے......؟"

سڑک کے کنارے پلاسٹک کے ایک کوڑے دان سے ٹیک لگاتے ہوئے میں نے کہا۔ "رضوان! [illegible] ذمہ داری سے دیکھیں تو سارا قصور ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت اگر صرف ایک ڈالر ہی ہوتا [illegible] وقت سارا معاملہ ہی مختلف ہوتا...... وہ بے چاری تو صرف ایک معصوم سی "میڈیم" ہے۔ بے ضرر [illegible] طاقتور...... یہ سمجھو کہ میں نے آج تک ایسی مکمل اور بے عیب میڈیم کم دیکھی ہوگی۔"

رضوان میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا...... پھر اس موضوع پہ مزید کوئی بات کیے بغیر ہم اپنے [illegible] فلیٹ پہ واپس پہنچ گئے۔ ناشتہ کرنے کے بعد رضوان تو اپنے دوست کے ساتھ باہر نکل گیا اور میں اپنے [illegible] احسن خان کو ٹیلیفون پر صبح بخیر کہنے تک گیا۔ ایسے بچپن سے فرار وہ دوست ہیں جو ایک دوسرے [illegible] سمجھاتے رہتے ہیں۔ وہ ابھی تک بستر میں ہی گھسا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے آج سارا دن سوتے ہی رہنا ہے؟"

یہ احسن خان صاحب ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں...... ذہین فطین' شریف الطبع اور [illegible] پڑھے لکھے بندے ہیں' پیدائشی طور پہ ہی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک...... فقہ' جدل' تقویم' نجوم وغیرہ [illegible] میں تحصیل کیئے۔ ہیئت اور علوم سفلی افلاکی تُرکی سے سیکھے پڑھے۔ اب چار پانچ برس سے امریکہ میں [illegible]۔ یہاں کی کئی ایک سپر نیچرل سوسائٹیز کے رُکن ہونے کے علاوہ ان کے اچھے اچھے عاملان مسمریزم' [illegible] زبان و ابطان سے بھی خاصے روابط ہیں۔ ریڈرز ڈائجسٹ' واشنگٹن پوسٹ اور دی ٹورنٹو سن میں بھی [illegible] کے مضمون مقالے چھپتے رہتے ہیں اور بہت اچھی بات یہ کہ اعلیٰ دینی قدروں کے امین بھی ہیں۔ [illegible] پکے نمازی اور پرہیزگار! خان صاحب جز وقتی پیشے کے اعتبار سے ایک میڈیم بھی ہیں' یعنی وہ ارواح [illegible] اجسام کے درمیان بات چیت کا وسیلہ بنتے ہیں۔ نیویارک میں قریب قریب ایک صدی پرانا ادارہ [illegible] ہے۔ جس کا سربراہ ایک مصری النسل یہودی ہے۔ یہ ادارہ ضرورت مند لوگوں کی ان کے مرے کھپے [illegible] بعد لوگوں کی روحوں سے ملاقات یا گفتگو کرواتا ہے یا وہ سر پھرے لوگ جو کسی صدیوں پہلے کے مرے

ہوئے شاعر، مفکّر، بادشاہ یا کسی بزرگ سے کچھ دریافت کرنے کے متمنّی ہوں۔ کسی مسئلے کا حل دریافت کرنا چاہتے ہوں یا وہ جو محض اپنی دلچسپی، شوق کی خاطر ایسے تجربے مشاہدے سے گزرنا چاہتے ہوں وہ بھی یہاں آ جاتے ہیں۔

میں احسن خان کو کراچی سے جانتا ہوں، میری ان سے اکثر بابا ذہین شاہ تاجی کے ڈیرے اور بابا رئیس امروہوی کی رئیس اکیڈمی میں بڑی لمبی چوڑی ملاقاتیں رہتی تھیں، گو وہ عمر میں مجھ سے ہلکے سے چھوٹے تھے لیکن اپنے علم و تبحّر اور افتادِ تجسّس و تحقیق میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے۔ وہ اپنی علمی پیاس اور سیلانی طبع کے ہاتھوں گھاٹ گھاٹ اُترنے پہ مجبور اور میں اپنی تلاش و جستجو، بادیہ پیمائی اور مزاج کی آوارگیوں کی بدولت قریہ قریہ، گام گام رنجور مقہور۔

اللہ حکیم کی حکمت تھی کہ ہم دونوں چاہے اس دُنیا جہاں کے کسی کونے میں بھی ہوں، ملاقات ضرور ہو جاتی تھی اور جب بھی ملتے تو پھر ہم خوب اچھی طرح ایک دُوجے کی خبر لیتے، گھروچ گھروچ کر ایک دوسرے کے سینے اور دماغ صاف کرتے اور کبھی موقع مل جاتا تو حاضرات اور اَرواح کی وَرود و وکالت کی مجلس میں بھی اکٹھے بیٹھ جاتے تھے۔ ...... کل بھی ایک عمل تھا اور وہ بیچ میں اپنے کسی موکّل کے ہاں روحانی عمل میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا...... جاتے وقت مجھے اپنے ہوٹل کا ٹیلیفون نمبر لکھا گیا تھا۔

''میاں خان صاحب! یہ کوئی بستر توڑنے کا ٹائم ہے......؟'' میں نے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''بابا جی! رات کافی دیر تک مجلس چلتی رہی۔ آنکھیں سُرخ اور سوجھی ہوئی ہیں، یقین کریں کہ کھل بھی نہیں پا رہیں۔ میں اس وقت حافظ بنا ہوا آپ سے بات کر رہا ہوں'' ...... وہ لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''اچھا اچھا' بتاؤ کہ کب پلٹ رہے ہو......؟''

''بابا جی! کچھ صحیح سے کہہ نہیں سکتا...... میری کلائنٹ ایک صنعت کار بیوہ لیڈی ہے۔ بڑی خودغرض اور سڑی سی، اپنے ڈیڑھ سو سالہ پرانے مَرے ہوئے دادا سُسر کی رُوح سے موروثی جائیداد کے ایک سلسلے کی وضاحت چاہتی ہے اور آج پورے تین دن ہو گئے' وہ 'بُڈھا' ٹس سے مس ہی نہیں ہو رہا ہے۔ ذرا جھنجھوڑتا ہوں تو '' ہوں' ہاں'' کر کے پھر غنود پکڑ لیتا ہے' ہلاتا جُلاتا ہوں تو پھر وہی اُوٹ پٹانگ جھنجلاہٹ اور بیزاری کا اظہار کر کے چُپ پڑ جاتا ہے...... کچھ آپ ہی بتایئے' کیا کروں؟ اس بُڈھے نے

بیزار کیا ہوا ہے۔ کل رات مجلس میں ہی سوچ رہا تھا کہ آپ کو بھی یہاں بلا لوں......"

"خان صاحب! بال ہٹ اور بزرگ ہٹ سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ بڈھے سے پہلے اس کی بیتی جوانی کے دنوں کی باتیں چھیڑیں۔ جب بڈھا رواں ہو جائے تو اصل بات پوچھ لیجئے گا' آزمودہ ترکیب ہے......"

وہ تھوڑا سا ہنسا' بولا۔ "واہ' بابا جی! آپ نے خوب ترکیب بتائی...... ہاں' فرمایئے کہ یہ صبح صبح ٹیلیفون...... خیریت؟"

"خان صاحب! سب سے پہلے تو یہ کہ اب صبح' صبح نہیں ہے' دوسری بات یہ کہ آج بلکہ ابھی ابھی میں نے ایک میڈیم دیکھی ہے' زیڈ بائی ڈبل زیڈ۔ ایک زمانے کے بعد یہ نمبر دیکھنے کو ملا ہے۔ ابھی تک وہ میری ایکس کلوز رینج میں ہے۔"

وہ تو جیسے بوکھلا گیا' ہڑبڑا کر بولا۔ "بابا جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں...... آپ نیویارک سے ہی بات کر رہے ہیں نا' آپ نے زیڈ بائی ڈبل زیڈ کو کہاں دیکھا ہے؟...... پلیز' اگر آپ اسے فائل کر سکتے ہیں تو میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔"

"خان صاحب! اتنا اتاولا ہونے کی ضرورت نہیں' وہ اپنی فائل میں ہے اور میں اس کی فائل میں ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنا کام......"

وہ میری بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"بابا جی! گستاخی نہ سمجھیں تو پلیز! اس کو آپ فوراً ایکس فائل کریں اور میں پہلی ترجیحی فرصت میں پہنچ رہا ہوں......"

اسی دوران ہلکی سی جنگ ٹونگ کے ساتھ آؤٹ ڈور انٹرکام فلیش کرنے لگا تھا' اچانک میرے منہ سے نکل گیا کہ تم پہنچو گے' سو پہنچو گے وہ تو پہنچ بھی گئی ہے...... انٹرکام کا بٹن پش کر کے میں مخاطب ہوا۔ جی؟...... اُدھر سے آواز ایسے آئی جیسے کوئی منوں مٹی میں دبا ہوا بڑی کراہت و کراہ کے ساتھ کسی قبر سے جواب دے رہا ہو۔

"گڈ مارننگ! اس وقت مخل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں...... میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے اور ساتھ ایک میری خواہش کہ میں آپ کی زیارت کروں اور آپ سے چند مفید مشورے اپنی بقا کے لیے حاصل کروں۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ آپ میری التجا کو رد نہیں فرمائیں گے...... اگر آپ چاہیں تو مجھے زیڈ کہہ سکتے ہیں......"

انٹرکام سے کورڈلیس ٹیلیفون ہٹاتے ہوئے اب میں خان سے مخاطب ہوا۔

''احسن خان! تم نے ساری گفتگو سُن لی ہے۔ اب بولو کیا کہتے ہو......؟''

ادھر سے جواب آیا۔ ''بابا جی' پلیز! میں نے سب کچھ سُن لیا ہے' واقعی یہ زیڈ بائی ڈبل زیڈ ہے۔ کسی نہ کسی طرح اسے روکئے یا رابطہ رکھیں' میں پہنچ رہا ہوں......''

کھٹ سے ٹیلیفون بند ہوگیا۔ اب میں انٹرکام کا بٹن ریلیز کر کے مخاطب ہوا۔

''ویلکم' میڈم زیڈ!...... دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ پلیز! آپ لفٹ کے ذریعے پانچویں فلور پہ فلیٹ نمبر تین تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں۔ آپ مجھے دروازے پہ اپنے استقبال کے لئے بصد ادب منتظر پائیں گی......''

اب میں سوچ رہا تھا کہ اچھا ہی ہوا جو رضوان یہاں موجود نہیں ورنہ وہ تو واقعی اس کی ٹانگیں توڑ دیتا۔ وہ جان بھی کیسے سکتا تھا کہ یہ زرد رُو' سوکھے کاٹھ کی طرح جلی بُھنی' بے رنگ و رَمق فلپائن! چہرے پہ دبی ہڈیوں پہ برائے نام گوشت' فراخ پیشانی کے نیچے کسی چیتے سی تُندی و تابانی والی گہری آنکھیں جن کے نیچے متورم سُرخ نیلے حلقے کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے' سُوکھی ہوئی ڈنڈی سی ٹانگوں پہ کالی لانگ ٹائٹس' اوپر سکرٹ' شرٹ اور شارٹ جیکٹ پہنے' چھدرے بے رنگ بے برکت اُجڑے اُجڑے بال جنہیں بچیوں کی طرح معمولی کلپس سے مزید بکھرنے سے بچانے کی خاطر قابو میں کیا ہوا تھا' آنکھوں میں تیز کاجل اور ہونٹوں پہ ڈیپ لپ سٹک' عجیب سے حُلیئے حال والی یہ مدقوق اور مشکوک سی عورت کتنی قیمتی اور کیسی نادرُ الوجود ہے؟ اسے جو قدرتی قوتیں اور جو فطرتی صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں ان کا تناسب دس لاکھ میں ایک کا ہے۔ سُپر سائیکاٹری کی ایک خُفیہ اصطلاح میں ایسی کمپیوٹر دماغ اور بام کے بارہ بُرجوں اور پاتال کے تیرہ پَرتوں تک رسائی والی آنکھ' قُلزم میں قطرہ اور قطرے میں قُلزم کا اُلٹ پھیر سمجھنے کا ادراک اور مکان' لامکاں کی حدوں کے پَرے تک پرواز کرنے والا تخیّل رکھنے والے اس نابغہ روزگار انیک گُنی مُدعی ہمدانی کو'' زیڈ بائی ڈبل زیڈ'' کہتے ہیں۔

عام اور محض زیڈ تو اکثر مل جاتے ہیں اور ہزاروں لاکھوں میں کسی ڈبل زیڈ کا ملنا بھی کچھ مشکل نہیں ہوتا مگر'' زیڈ بائی ڈبل زیڈ'' نہیں ملتا۔ اگر کہیں ہو بھی تو اسے خود یہ معلوم یا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ یہ کچھ ہے۔ اسے اکثر دوسرے ہی کھوجتے ہیں اور پھر خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ میڈیم عاملوں کے آگے کام کرتے ہیں جبکہ وہ خود اکیلے کچھ بھی نہیں کر سکتے' وہ عاملوں اور عامل ان کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چاہے لاکھوں انسانوں میں رَلے مِلے ہوں۔ ایک دوسرے سے ناآشنا' ناواقف ہوں' سامنے آتے

نظر ملتے ہی ایک دوسرے کو پہچان جائیں گے۔ کچھ ماتھے پہ لکھا نہیں ہوتا' ان کے جسم سے خوشبو ہی ایسی پھوٹتی ہے۔ ان کے وجود کے گرد جو ہالے اور دائرے ہوتے ہیں اور ان کے سر پہ حفاظتی اور زیرِ قوتوں اور فطرتی صلاحیتوں کے جو پابند موکل اور رجالِ غیب ہوتے ہیں اور پھر جو روشنیوں کے روشندان سے کھلے ہوتے ہیں' یہی ان کی پہچان ہوتی ہے یعنی ولی راولی می شناسد والی بات ہوتی ہے۔

یہ سارا واقعہ مجھے اس لئے سُنانا پڑا کہ مجھے خود اپنی خداداد صلاحیتوں اور ربّ کریم کی بخشی ہوئی قوتوں کا کماحقہ' احساس اور علم نہیں تھا لیکن دوسرے اصحابِ تصرّف' مجھ جاہل میں ان خوبیوں کی خوشبو کو محسوس کر لیتے تھے یا میری وجہِ وُجودی میں انہیں کچھ ایسے جراثیم نظر آ جاتے تھے جن کی وجہ سے وہ مجھ سے التفات بھرا رویہ روا رکھتے اور اپنی شفقت و عنایات سے نوازتے تھے اور میں بھی ان کی نوازشات اور تصرّف رُوحانی و باطنی سے خوب فیض یاب ہوتا۔ مجھ میری کرید مرید کی بُری عادت' یعنی پرلے درجے کا تجسّس۔ بات سے بات پیدا کرنا' حرفوں پہ نہلے اور لفظوں پہ دہلے پھینکنا' منہ بسوروں کو ہنسانا اور کھِل کھلاتے ہوؤں کو رُلانا' ہر وقت کوئی نہ کوئی پٹ سیاپا' اشغلا ڈالے رکھنا۔ فرقوں کی طرح بہتر (۷۲) تو میری گھٹی میں پڑے ہوئے تھے جن کو میں نے کسی سے نہیں سیکھا ... کہ میں پیدائشی ہی ایک طرح کا سیدیم تھا۔ میں روزِ اوّل سے ہی بجلیوں کی زد میں رہا۔ کوئی لمحہ کوئی پل پہر دن ہفتہ عشرہ ماہ و سال ایسا نہ بیتا کہ جب مجھ جاں پہ سے نہ گزرا ہوں۔ کوئی امتحان' آزمائش' آفت' ہلچل' افراتفری' تماشہ تفریح' تفنن' تکرار' تردّد' تکلیف میرے سر پہ نہ پڑی کھڑی ہو۔ گھر والے پچھتاتے کہ ہم نے اس کے لئے دُعا کیوں کرائی' اس سے تو ہم لاولد ہی اچھے تھے۔ مسلسل غلط سلط حرکتوں' شرارتوں اور آوارگیوں سے عاجز آ کر انہوں نے میری فکر کرنی چھوڑ دی تھی...... کئی کئی ہفتے' مہینے گھر' گلی' محلے' شہر سے مفقودالخبر رہتا جیسے دھرتی پہ وجود ہی نہ ہو۔ پھر اچانک کہیں سے وارد ہو جاتا۔ نہ پڑھائی لکھائی' نہ کوئی مسیت مسجد' ہر وقت ٹخنے گھسیٹی تھی اور ہم...... گھر والوں نے تنگ پڑ کر جب بابوں سے شکائت کی تو کھرا سا جواب چانٹے کی طرح منہ پہ پڑا کہ چار درویشوں کا گوہ موت' تھوک اور ہنجو سب اکٹھے کرو تو کیا نکلے گا؟...... شکر کرو کہ کوئی چال نکلی ہے' تم لونڈے کی فکر مت کرو۔ یہ بھگت کبیر کی طرح بعد کی بدیاں بُرائیاں پہلے بھگت رہا ہے بھگتے گا تو بھسم ہو گا اور بھسم ہو کر ہی بھگت بنے گا...... گھر والے نچنت ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم جُوں جُوں آگے بڑھے تو احساس ہوا کہ ہر اگلا قدم سخت پڑتا ہے۔ ہر اُنگلی پکڑنے والا دو گام ساتھ لے کر چلتا ہے' پھر آگے کوئی اور پکڑ لیتا ہے یوں جیسے اِک عالم صرف میرے ہی پیچھے پڑا ہوا ہے' ہر اک کو صرف میری ہی دھن اور دُھن ہے۔ تھپیڑے' ٹھوکریں' ٹھُڈے' ہُجیاں گھبیاں کھا کھا کر میں نے بھی خود کو اسی کے رحم و کرم

پہ ڈال دیا ہوا تھا جس نے اپنی کمال حکمت و مصلحت رحمت و برکت سے میری رُوح کو عالم برزخ سے اُتار کر میری بوڑھی ماں کے رحم میں پھونکا تھا اور یہی میرے حق میں بہتر ہوا کہ میں آج تک اسی تسلیم و رضا کے آگے سرنگوں کئے کھڑا رہا۔ کبھی کچھ چاہا ہی نہیں' مانگا ہی نہیں۔ خوشی نہ خوشامد۔ آس نہ یاس' وہی بات کہ......

مورے سیاں بھئے کوتوال' ڈر کاہے کا

بات کو پھر سمیٹ کر اسی مقام پہ لاتا ہوں۔ وہ فلپائن زیڈ بائی ڈبل زیڈ لفٹ سے برآمد ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا اور راستہ چھوڑتے ہوئے اپنے فلیٹ میں آنے کی دعوت دی۔ وہ یوں تھی جیسے ایک رَوبوٹ ہو جس میں صرف حرکت' عمل اور ایک معینہ کارکردگی ہوتی ہے۔ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اسے فیڈ کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے کوئی جذبات' احساسات اور خیالات نہیں ہوتے۔ وہ نفرت' محبت' ہمدردی' دلداری' کچھ بھی نہیں جانتا۔ اسی طرح یہ بھی جیسے ایک مشینی عورت یا لڑکی تھی۔ یہ جاپانی' چینی' فلپائنی' کورین' تھائی لڑکیاں کچھ عجیب سے نقش و نگار' جسم' جثے' قد و قامت اور شکل و صورت والی ہوتی ہیں۔ سب ہی نامحسوس سے فرق کے ساتھ ایک جیسی' سینکڑوں میں کسی ایک کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب سے جو بیاپیہ ہوتا ہے کہ آپ ان کی عمر کا اندازہ آسانی سے نہیں کر سکتے' ہو سکتا ہے کہ آپ جسے معصوم سی بالڑی سمجھ رہے ہوں وہ عفیفہ پانچ بچوں کی ماں اور دو عدد شوہروں کی بیوی رہ چکی ہو اور جسے آپ بڑھیا جانیں وہ بچی ابھی سکول کی ابتدائی کلاس میں ہو۔ میں خود بہت دفعہ دھوکا کھا چکا ہوں اور کسی کو میڈم یا مس کہنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچتا اور دیکھتا ہوں۔ بہرحال' یہ تصدیق شدہ اور گارنٹیڈ میڈم' میڈیم تھی۔ وہ اندر پہنچ کر یوں صوفے کے کنارے پہ بیٹھ گئی کہ اگر وہ صحیح سے اور آرام دہ حالت میں بیٹھ جاتی تو شاید صوفے کے سپرنگ بیٹھ جاتے یا پھر اس تنگ سے منی سکرٹ کی کوئی مجبوری تھی کیونکہ میں عین اس کے سامنے صوفے پہ دھرا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ساکت و جامد اور کسی قسم کے تاثرات سے یکسر خالی تھا۔ پھر اس کے باریک سے ہونٹوں پہ جیسے جنبش سی ہوئی۔

''میرے بلند مرتبت محسن! میں آپ کی بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے شرف ملاقات بخشا...... میں آپ کے پاس یہ پُریقین اُمید لے کر حاضر ہوئی ہوں کہ آپ مجھے اپنی انتہائی قیمتی نصیحت سے آگاہ کریں......'' پھر وہ میری جانب پیکٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ حقیر سا ہدیہ میری جانب سے قبول فرمایئے......''

میں نے پیکٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میڈم! پہلے یہ بتایئے کہ آپ ڈرنک میں کیا لیں گی...... ٹی‘ کافی یا کوئی جوس وغیرہ......؟"

وہ پرس کھولتے ہوئے بولی۔ "آپ کی اس آفر کا شکریہ...... میں اس وقت ایک سگریٹ سُلگانے کی اجازت کے لئے درخواست کروں گی‘ باقی میں کچھ کھانے پینے سے معذور ہوں کیونکہ میں "زیڈپ" ہوں۔"

وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی سگریٹ سُلگا رہی تھی۔ وہ ایک مکمل زیڈپ تھی...... رُوحانیت فلکی اور [illegible] بَرزخی کے علوم کے ماہرین میں ایک سلسلہ ایسا بھی ہے جو "زیڈپ" کہلاتا ہے‘ اس سلسلے میں عامل اور معمول دونوں ہی کنوارے ہوتے ہیں۔ عامل مَرد‘ نامَرد ہوتا ہے اور معمول عورت‘ ناعورت ہوتی ہے۔ [illegible] ابتداء میں اپنے آپ کو بانجھ کروا دیتے ہیں۔ اپنے سَر کے بال مکمل منڈھوا دیتے ہیں۔ مُنہ کے [illegible] ہاتھ پاؤں کے ناخن‘ پلکیں‘ بھنوئیں‘ ہر چیز سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو زمین‘ پہاڑ‘ سمندر [illegible] ہوتی ہے یہ اس کو کھا نہیں سکتے۔ زمین‘ دریا‘ چشموں کا پانی تک نہیں پیتے صرف خالص بارش کا [illegible] پیتے اور [illegible] ٹڈیوں‘ مکڑیوں‘ تتلیوں کو خشک کر کے کھاتے ہیں اور بس! ان چار چیزوں کے [illegible] ہر چیز ان کے لئے زہر اور حرام ہے۔ یہ زیڈپ بول و براز کی علت و ضرورت سے تقریباً [illegible] ہوتے ہیں۔ ان کے جسم و اعضاء ایسے نازک اور حساس ہوتے ہیں کہ وہ اکثر عام حالات میں اپنے [illegible] مخصوص چیمبر سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ کھلا موسم‘ تپش‘ تیز ہَوا ان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ خاص [illegible] میں اگر انہیں پبلک میں آنا پڑے یا باہر نکلنا پڑے تو یہ مصنوعی بالوں کی وگ‘ سونے کے دانت‘ [illegible] ناخن‘ پلکیں وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا پسندیدہ شغل یا ماحول دُھواں دھار قسم کا ہوتا ہے یعنی [illegible] بہت پسند کرتے ہیں اس لئے ان کی رہائش گاہوں میں ہر وقت خوشبویات اگردانوں میں دہکتی [illegible]۔ لوبان‘ اگر‘ صندل اور عود‘ دھواں ان کی اصل غذا ہے۔ یہ سگریٹ نوشی بھی بے انتہا کرتے ہیں۔ [illegible] ہاتھوں کی انگلیاں نکوٹین سے داغدار اور سُرخ دکھائی دیتی ہیں۔ "زیڈپس" کے اصل رُوپ اس [illegible] حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں جب وہ اپنے اجلاس حاضرات ارواح میں اپنے معمولات سرانجام [illegible] ہوتے ہیں۔ زمین دوز خانقاہوں‘ حُجروں میں جہاں سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کا تصور تک [illegible]۔ وقتِ شبور‘ یعنی وہ وقت جب رات اپنے آخری سانس لے رہی ہوتی ہے اور صبح کاذب [illegible] سانس کھینچ رہی ہوتی ہے‘ روغنی مشعلوں کی کانپتی روشنی کے پُراسرار سایوں میں عامل اور معمول [illegible] سے آراستہ و مزین‘ سیاہ اطلسی چُغے پہنے‘ سَروں پہ سیارگانِ فلکی کے دُمدار قُبے دھرے‘ عود اور

خوشبویات کی تیز و تند لپٹوں کے جلو میں جب جلسہ گاہ میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو حاضرین با تمکین کی مارے حیرت آنکھیں پھٹنے کو آتی ہیں۔ عامل و معمول کی آنکھوں کی وحشت' چہرے کی اُبھری ہوئی استخواں کاجل سے تھپی ہوئی بن ابرو و مژگاں آنکھیں' بے دانت کا پوپلا منہ' زرد رنگت' خوف و ہراس سے کھنڈے ہوئے سپید و سپاٹ چہرے' ہاتھ میں عصائے سامری' دوسرے ہاتھ کے کف پہ دھرا انسانی کھوپڑی کا مے ارغوان سے لبالب پیالہ' مار سیاہ کی پوستین سے مرصع پاپوش اور پھر جب روئے عالم برزخ' چیخ و پکار کا اک در کھلتا ہے تو وہاں بڑے بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ عامل تو ڈنڈوت کر کے سرنگوں ہو جاتا ہے مگر جو معمول پہ گزرتی ہے' یوں جانئے کہ وہ جلسے میں کئی موتیں اپنے وجدانی اعصاب پہ جھیلتا ہے اور کئی جنم بھوگتا ہے' صرف ایک ہی جلسے میں جیسے کسی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ پھر بعد میں کئی دن تک اپنے ظاہری' باطنی اعصاب کو [illegible] کرتا رہتا ہے لیکن ''زیڈپس'' یہ [illegible] مراحل قدرے آسانی سے طے کر لیتے ہیں.....تو یہ میڈم ''زیڈپ'' تھی۔ بڑے سلیقے اور قرینے سے وہ ہلکے ہلکے کش لے رہی تھی۔ اس کا دیا ہوا تحفہ ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔

''[illegible] تھا کیا؟''

وہ بڑے بے حس سے لہجے میں بولی۔ ''یہ آپ کے لیے تھی اور آپ [illegible] ہے.....''

''مگر تیتلی تو تتلی کے پاس ہی رہنی چاہئے'' ..... میں نے دلیل سے اسے قائل کرنا چاہا۔

''ہاں' ٹھیک فرماتے ہیں لیکن کاگا کس کے پاس رہنا چاہئے.....؟''

اچانک میرے منہ سے نکلا ''کاگا کے پاس''

کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب میں نے پیکٹ کھولا تو یہ فریم بالکل وہی تھا لیکن تتلی کی بجائے ایک چھوٹا سا کالا کاگا حنوط تھا اور وہ تتلی؟..... لب ہلائے بغیر میں نے میڈم کی جانب دیکھا۔ وہ ایک چھوٹا سیاہ سگریٹ سلگاتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''میں زیڈپ ہوں.....'' لبوں کو جنبش کی زحمت دیے بنا اس نے مجھے خوب جواب دیا تھا۔

دُنیاداری میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی کو کہیں کوئی چیز پسند آ جاتی ہے تو وہ پھر اس کوشش میں ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کیا جائے۔ آپ نے گھوڑوں' کتوں' بیلوں' کبوتروں' مرغوں کے بڑے بڑے شوقین' جنونی اور قدردان دیکھے ہوں گے۔ انہیں جہاں کہیں اپنے مطلب کی کوئی خاص چیز نظر آئے تو وہ دیوانہ وار اس کی جانب لپکتے ہیں اور ہر ممکن اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس ظاہری دُنیا کی تین چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ مٹی کی مہک' حکمت و کیمیا پہ لکھی ہوئی پرانی کتابیں

مثلاً معجزات پہ کندہ مقدس اسماء والی انگشتریاں' بابرکت جواہر جڑی پرانی انگوٹھیاں۔ ان تینوں اشیاء میں سے مجھے کسی ایک کی کہیں بھنک پڑ جائے یا دکھائی دے جائے تو پھر میری دیوانگی اور کمینگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خوشامد' چاپلوسی' منت سماجت' اخلاقی' غیر اخلاقی اور مالی وسائل' یعنی ہر وہ حربہ طریقہ استعمال میں لاؤں گا جس کے ذریعے سے مجھے وہ چیز مل سکتی ہو یا اس کے ملنے کا امکان پیدا ہو سکے۔ بالفاظِ دیگر میں ان تینوں چیزوں کے جائز و ناجائز حصول کی خاطر ایسی کوئی بھی قبیح حرکت کر سکتا ہوں جس کی سزا کم سے کم قطع ید اور زیادہ سے زیادہ بریدِ سر ہو سکتی ہے۔ موسیقی' حکمت' کیمیا' علومِ مخفی از قسم تنجیم' رمل و جفر' سحر بابلی یا سحرِ افلاکی' علوی' سفلی' کالا علم' جھاڑ پھونک' ٹونہ ٹوٹکا' قیافہ چہرہ' دست و کف و پاشناسی' تقویم' تعبیرِ خیال اور خواب بینی۔ اسرار عالمین از قسم نوریہ' روحیہ' نفسیہ' طبعیہ' جسمیہ' عنصریہ' مثالیہ' عقلیہ' برزخیہ' حشریہ' جنانیہ' جہنمیہ' اعرافیہ' روئیہ' صوریہ' جمالیہ اور جلالیہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا اٹھارہ عالمین کے علوم مخفیہ کی بنیاد متصور ہوتے ہیں۔ مذکور بالا سے ذرا بالا جو علوم ہیں وہ الہیاتِ عالیہ کے زیرِ اثر سمجھے جاتے ہیں یعنی ان ہی کی استثنائی صورتیں ہیں۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ اگر کسی گھوڑے' کتے' مرغے' بیل' کتاب قلمی وغیرہ کے حصول کے لئے کوئی شوقین یا سرپھرا کوئی بھی جائز و ناجائز حربہ استعمال کر سکتا ہے تو یہ مخفی علوم و حکمت کی چیٹک اور [illegible] ان چیزوں سے کہیں زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔ حکمت و کیمیا اور علوم شرقی و غربی کے عالم و طالب اس ترنگ و جستجو میں تو اک عالم کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے اندر کا مد و جزر اور مزید تر مزید کا جوار بھاٹا ان کے ساحلِ سکون کو ہمیشہ خطرہ [illegible] رکھتا ہے۔ ہر لحظہ و ساعت یہ تحیر و تماشے کے دیوانے بنے رہتے ہیں۔ ان کی لڑیاں آپس میں لڑی ہوئی ہوتی ہیں جیسے زنجیریں بٹی ہوئی ہوں۔ ایک نہ ایک یا ایک سے زیادہ کمی یا محرومی ہر ایک میں ہوتی ہے اور ایک یا بہت سی خوبیوں والے فیض یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ ایک کی کمی دوسرے میں ودیعت کی صورت میں موجود ہوتی ہے' اس لئے یہ ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میں نے چاچی کو تلاش کیا' چاچی نے مجھے کھوجا۔ رحمت سائیں' ٹنڈو سائیں سرکار' مردِ سیاہ پوش۔ کتے' بلیاں' گھوڑے' گلدم' تتلی' کاگا اور یہ فلپائن! یہ سب عنصر اور اکائیاں ہیں۔ ایک دوسرے کے عامل و معمول۔ ایک دوسرے سے موتی مالا کی مانند پروئے ہوئے' جڑے ہوئے یا کبھی بکھرے ہوئے' ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے جیسے' جب جدھر اور جونہی ایک دوسرے کو پا لیتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل الگ بات ہے کہ انسان اپنے علم کا استعمال کس طرح کرتا ہے۔ وہ اندھیروں ظلمتوں کا خوگر اور شیطان کا ساتھی گندہ ہے یا اجیالوں تجلیوں سے منور اور مالکِ یوم الدین کا بندہ ہے' وہ شیطان الرجیم کی معاونت کا متلاشی ہے یا وہ

غفورالرحیم کی استعانت کا طلبگار ہے۔ وہ اپنے علم و ہنر کو انسانیت کی بہبود و بہتری اور اس کے لئے آسانیاں فراہم کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے یا پھر وہ اپنے علم و کسب کو شیطنت کے فروغ اور بنی نوع انسان کے لئے ویرانیاں اور پریشانیاں پیدا کرنے کے لئے آگے لاتا ہے۔ وہ ڈیول ''جینئس'' بنتا ہے یا ایک ''مرکری مین'' بننا پسند کرتا ہے؟

وہ میڈم فلپائن جو ''زیڈ پ'' تھی اور وہ بھی زیڈ بائی ڈبل زیڈ یعنی وہ اس وقت کے بہاؤ میں یوں سمجھ لیں کہ لاکھوں میں ایک تھی' پیدائشی طور پہ پُراسرار قوتوں اور خاص الخاص حسّوں کی حامل...... اس کی نگاہوں کے سامنے پتھر کے دَر و دیوار شیشے سے آر پار تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے گرد بہت دُور تک نظر رکھ سکتی تھی۔ انسانی ذہن میں جھانک لگا کر خیالات پڑھ سکتی تھی...... اَدق سے اَدق سوال کا جواب کمپیوٹر سے بھی پہلے دے سکتی تھی۔ نوری ناری غیر مرئی مخلوقات از قسم موکلات' ہمزاد' ارواح کو دیکھ محسوس کر سکتی تھی' ان سے رابطہ یا بات چیت کر سکتی تھی۔ اس کا باطن قدرتی طور پر ایسا صیقل اور شفاف تھا کہ وہ گزرتے وقت کی پرچھائیاں تک محسوس کر لیتی تھی۔ میں اس کے تصرفات کی زد میں آ گیا تھا' وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور شاید اس کی نظر میں میری کچھ اہمیت بھی ہوگی جس کی وجہ سے وہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے پہ مجبور ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل غفورالرحیم بھی اس کی رینج میں آ گیا تھا جسے میں کھو چکا تھا۔ اس فریم سے میری دلچسپی کو وہ محسوس کر چکی تھی اور جہاں وہ یہ جان چکی تھی کہ میں اُسے جانتا اور پہچان چکا ہوں' وہاں وہ اپنی بیدار حسّوں کی بدولت یہ بھی سونگھ چکی تھی کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے دھڑک سی' ناک کی سیدھ میں میری طرف چلی آئی لیکن اُس کا اس طرح سے مجھ تک اپروچ کرنا بھی کچھ خالی از علّت نہ تھا۔

میں اوپر کہیں لکھ چکا ہوں کہ اس فیلڈ میں کوئی نہ کوئی خاص حیثیت ہر کوئی رکھتا ہے جیسے کہ موسیقاروں گویّوں میں بھی ہے۔ موسیقی کا ہر گھرانا اپنی کسی نہ کسی خاص خوبی میں اپنی نمایاں پہچان رکھتا اور ہر گھرانے کے اُستاد فنکار اپنے کسی مخصوص انداز گائیکی اور چند ایک راگ راگنیوں میں ہی منفرد ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک بے کنار سمندر ہے' ہر کوئی اس راگ وِدیا کی تمام راگ داری کو سمجھنے' جاننے یا اسے حفظ کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ بڑے غلام علی خان مرحوم بھی بس چند ایک راگ راگنیوں پہ ساری عمر گزارہ کرتے رہے۔ خان صاحب عبدالکریم' عاشق علی خان' روشن آرا' بیگم' للت' ایمن کلیان' سری' ملتانی' ولس' مالکوس' بھاگ' پہ ہی اکثر ٹھیکا لیا کرتے تھے۔ اُستاد امیر علی خان' اُستاد علی اکبر خان' بابا علاؤالدین خان' اُستاد احمد خان تھرکوا اور پنڈت اُوم کارناتھ' یہ ہستیاں بھی اپنی اک مخصوص راگ داری کی پہچان تھیں۔ کئی

کوئی وجیوت، کوئی رکھب، کوئی دادر، کنٹھیا، کوئی سُرگم گرہ کا رسیا۔ اکثر بول بانٹ، تان پلٹے
بیٹھے کُل راگوں کی چھتیس راگنیاں، سات سُر، بائیس سُرتیاں۔ آج تک جتنے بھی مہا گائیک، نائیک، پنڈت،
سنگیت راگ وِدیا گرو ہو گزرے ہیں سب ہی فنی خوبیوں خامیوں سے عبارت تھے۔ کلکتے، بمبئی، گوالیار،
بنارس، لکھنؤ اور لاہور کی بڑی بڑی میوزک کانفرنسوں میں ایک دوسرے کی مخصوص راگ داری، لے کاری،
جگہوں، گھروں، گرہوں، تان پلٹوں سے محظوظ ہوتے اور ایک دوسرے سے اکتسابِ فن کرتے
اپنی خامیوں کمیوں کو دُور کرتے۔ اسی طرح اس اسرار و تحیر کی دُنیا کے بھی بڑے بڑے عالم، عامل،
عدیم المثال جید اُستاد ہر دور میں موجود رہتے ہیں اور ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ گپت ہیں، منظر پہ نہیں ہوتے اور جو منظرِ عام پہ ہوتے ہیں اِن میں
وہ نمبریوں اور فراڈیوں کی ہوتی ہے جن کا مقصد محض مخلوقِ خدا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا اور اُلّو
بنانا ہوتا ہے۔ یہ نام نہاد عامل اور علم رُوحانیات کے جھوٹے اور جعلی دعوے دار روحانیت اور علم و عمل کی
بجائے چرب زبانی، مکاری، اداکاری، قیافہ، انسانی نفسیات، کیمیکلز، الیکٹرونک شعبدہ بازی، بازی اور
ضرورت پڑنے پر بلیک میلنگ، دھونس کے علاوہ زیادتی بالجبر اور اغواء و قتل تک کی وارداتوں میں ملوّث ہو
جاتے ہیں۔

اخباروں، رسالوں میں یہ بڑے بڑے عاملوں، منجموں، رَمل و جفر اور رُوحانی علوم کے ماہرین
کامی کی صورت میں لاکھوں روپے انعام کے بڑے دلکش، جاذبِ نظر اور پُر اثر کرنے والے
اشتہارات نظر آتے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر کاروباری اور مال بنانے والے لوگ ہیں۔ ان کا کسی علم و فن
سے کوئی تعلق نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کوئی اصلی اور صحیح بھی ہے، اگر ہے تو کہاں اور کدھر ہے؟...... اس کا
جواب یہ ہے کہ حقیقی علم و حکمت والے لوگ موجود ہیں، ان کی مجبوری ہے کہ وہ سامنے منظر پہ نہیں آتے۔
جنون، ان کی طلب و جستجو، مشاغل و وظائف، طبیعت مزاج کے تقاضے، یہ سب کچھ انہیں خلوت نشینی
پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ نمود و نمائش اور بُرے بے سُرے لوگوں سے ملاقاتیں، بزم آرائیاں اور دُنیاداری
کے دھندوں سے وہ بیزار ہوتے ہیں۔ یہ علم و شوق طالب علم کو مردم بیزار، بلکہ خود اپنی ذات سے آوازار کر
دیتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ اخباروں میں اپنے علم و کسب کی بھاری رقوم کے عوض تشہیر کرواتے پھریں۔ یہ لوگ
اپنے علم کو لے کر اپنے سینوں کی قبروں میں اُتر جاتے ہیں لیکن کسی کو بھنک نہیں پڑنے دیتے...... ہاں،
اگر کسی کا کسی طور بھی بھلا ہوتا دکھائی دے اور اس میں اپنا کوئی مسئلہ مفاد نہ ہو اور نہ ہی اپنے اصولوں طور
طریقوں پہ زک پڑتی ہو تو اس علم و حکمت سے مستفید کرنا عین ثواب ہے بلکہ اس کا صدقہ ہے۔

• ناآسودہ رُوحیں......!

پچھلے دنوں میرے ہاں میرا ایک ملنے والا آیا۔ آدھی رات کا وقت...... الٰہی خیر! کہتا ہوا میں اس سے مِلا' پوچھا' خیریت؟...... اس نے بتایا کہ میری جوان کنواری بہن پہ اچانک جنون طاری ہو گیا ہے۔ ایک دم ہی اُس نے عجیب و غریب قسم کی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ توڑ پھوڑ چیخ و چنگھاڑ آنکھوں میں شعلے' جسم و جان میں بے پناہ طاقت سی آ گئی ہے اور کسی کے قابو میں نہیں آ رہی۔ اس وقت میرے چار بھائیوں نے اُسے قابو میں کیا ہوا ہے' میں بھاگا بھاگا آیا ہوں...... خدارا! میری دستگیری فرمائیں' ساتھ چلیں یا پھر کچھ ایسا کریں کہ یہ اچانک سر پڑی مصیبت کسی طرح سے ٹل جائے...... میں نے اُسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''مثلاً بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں...... حکیم' ڈاکٹر تو میں ہوں نہیں......؟''

وہ مجھ سے نظریں چُراتا ہوا کہنے لگا۔ ''بابا جی! امی بڑی پریشان ہیں' انہوں نے کہا ہے کہ بابا جی سے کوئی تعویذ یا پانی دَم کرا کے آؤ...... ان کا خیال ہے کہ یہ کسی جن بھوت کی کارستانی ہے۔''

''[illegible] ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''جی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا تو ان چیزوں پہ یقین نہیں ہے لیکن......''

میں نے فوراً اسے ٹوک دیا اور قدرے خفگی سے کہا۔

''میاں! یہ ''لیکن'' والا جن اور بھوت ہے اور میرے پاس اس ''لیکن'' والے جن بھوت کا کوئی تعویذ نہیں...... تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ان تعویذوں گنڈوں' دَم درودوں اور جھاڑ پھونکوں اور بے طرح کی دعاؤں کو برحق مانتے ہوئے بھی نہیں مانتا پھر بھی اس طرح کی بے سروپا اُڑاؤ گے تو ظاہر ہے کہ مجھے تاؤ تو آئے گا......!''

میں نے اسے بٹھا کر پانی پلایا اور کہا کہ اب تم جلدی سے پوری کیفیت تفصیل سے بتاؤ جتنا جانتا تھا' اس نے مجھے بتا دیا۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔

''دیکھو' وہ تمہاری بہن ہے۔ ظاہر ہے کہ تمہیں اس سے بڑی محبت ہوگی' تم چاہو گے کہ وہ اس مصیبت سے جلد سے جلد چھٹکارا پا جائے۔ وہ جوان بھی ہے' کنواری اور خوبصورت بھی...... میری بات مانو گے تو ایک دو روز میں ہی وہ بھلی چنگی ہو جائے گی اور اگر تم نے یا تمہارے گھر والوں نے اسے کسی عامل کی سیڑھی چڑھا دیا تو میری یہ بات کسی اشٹام پہ لکھ لو کہ تم لوگ اس معصوم کی زندگی برباد کرنے

[illegible] ہو گے اور اگر تم نے میری سُنی اور اس پہ سختی سے عمل کیا تو وہی کہ دو تین دِن میں وہ ٹھیک ہو جائے [illegible] کے اَمر سے گارنٹی ہے۔..... فوراً گھر جاؤ' چینی کی ایک پیالی میں تھوڑی سی چینی یا مصری گھول کر' [illegible] قُل دَم کر کے اسے پلا دو' پھر فوراً اُسے اپنے فیملی ڈاکٹر کو دِکھاؤ یا اس کے مشورے سے ہسپتال لے [illegible] اور مجھے کل صبح رپورٹ دو......''

اُس نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا' میں نے اسے روک دیا۔

''جو کہا ہے' وہی کرو' اور کوئی بھی بات نہ کرو......''

میں نے اسے بھگا دیا۔ واپس بستر پہ لیٹتے ہی میں نے ہلکی سی توجہّ دی..... اے کریم و حکیم! [illegible] تو چاہے۔ جوان بچّی ہے' ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ نام بھی حلیمہ ہے۔ بس' ذرا اپنے کرم [illegible] رکھیو...... بس' پھر میں گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ جوان بچیاں جو شادی کی عمر کو پہنچ جائیں' اکثر و بیشتر [illegible] جسمانی' نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ گھر والے سمجھتے ہیں کہ جن بھوت یا کوئی سایہ وغیرہ [illegible]۔ یہ رُوسیاہ نام نہاد عامل خوب جانتے ہیں کہ یہ معمولی بیماری ہے جو جوان لڑکیوں کا مخصوص جسمانی [illegible] [illegible] ہے۔ اس کا علاج صرف ایک انجکشن' ملٹی [illegible] دو روز کا مکمل [illegible] ہے یا اِس کا مکمل وِیریا علاج نکاحِ مسنونہ ہے..... اگلی صبح جاوید نے مجھے بتایا کہ حلیمہ گھر میں آرام [illegible] ہے' فیملی ڈاکٹر کو بلایا تھا' اس نے ایک انجکشن اور کچھ گولیاں کھلا کر سُلا دیا تھا۔ [illegible] بجے کے قریب [illegible] کھڑکا کہ حلیمہ ناشتہ کرنے کے بعد دوا کھا کر پھر لیٹ گئی ہے۔ رات کو وہ آرام سے بیٹھی ٹیلی [illegible] دیکھ رہی تھی..... یہ سب یہاں لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ آج کل یہ عامل و کامل حضرات کیا کیا گل کھلاتے [illegible] اس اور نقل کیا ہے۔ بے علم' بے عمل اور باعلم اور باعمل میں کیا فرق ہے' علم کا صحیح اور بروقت [illegible] کیا ہے۔ جن بھوتوں' سایوں اور تعویذ گنڈوں پہ تکیہ اور یقین کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ [illegible] ہماری جہالت اور بے علمی کا شاخسانہ ہے۔

ہاں' تو میں کہہ رہا تھا کہ اس فلپائن میڈم زیڈ بائی ڈبل زیڈ المشہور ''زیڈپ'' کا مجھ تک پہنچنا اور [illegible] کی بجائے کا گا والے فریم کا فراہم کرنا کچھ خالی از علت نہ تھا۔ وہ امریکہ کے فلستان' ہالی وڈ کے ایک [illegible] سیکرٹ ادارے ''ہالوایم مسٹری'' میں بطور فرسٹ میڈیم سلیکٹ ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر وہ لندن [illegible] اسکوائر میں ایک جیوش ادارے ''سُپریم مرسیکل ڈیوائیڈ'' میں سیکنڈ میڈیم تھی۔ یہاں یہ بتا دینا [illegible] ہے کہ پروفیشنل میڈیم کی عموماً زندگی بڑی کم ہوتی ہے۔ رُوحوں سے رابطے کا کام بڑا جان جوکھم [illegible] والا اور انتہائی دَرجے کا رُوح فرسا ہوتا ہے۔ ایک بار رُوح سے رابطے کی مجلس خالص طور پہ

میڈیم یعنی معمول کی زندگی کا کم از کم ایک ماہ کم کر دیتی ہے۔ اس حقیقت کو یہ میڈیم لوگ بھی جانتے ہیں اس لئے یہ ہر مجلس کے بعد دو چار دن مکمل تنہائی میں آرام کرتے ہیں۔ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ خیراتی اداروں کو دیتے رہتے ہیں...... رُوحوں سے ملاقات اور رابطہ کروانے والے ہالی وڈ کے اس ادارے میں زیادہ تر فلموں سے تعلق رکھنے والے ایکٹرز' ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ ہی آتے ہیں۔ کئی کئی ماہ پہلے یہ اپنی بکنگ کروا لیتے ہیں' بڑی بھاری ایڈوانس رقوم کے ساتھ یہ اپنی درخواستیں بمعہ رُوح کا نام' تعلق' مذہب' جنس' قبر کا محلِ وقوع اور دیگر معلومات مثلاً تعداد افراد متمنی شرکت جلسہ وغیرہ درج کر کے جمع کروا دیتے ہیں۔ ہر پندرھواڑے میں صرف ایک جلسہ آدھی رات کو منعقد ہوتا ہے۔ شریک اراکین کی حتمی تعداد تیرہ ہوتی ہے جو ایک زیتون کی لکڑی سے بنے ہوئے بڑی سی گول میز پہ بچھے سُرخ بانات کے میز پوش پہ بنے ہوئے ایک تیرہ گوشہ ستارے کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں' ان میں عامل اور معمول بھی شامل ہوتے ہیں۔ تاریخ مقررہ سے دو ہفتے قبل ہی عامل' معمول اور دیگر عملہ جملہ انتظامات اور متعلقہ رُوح سے سلسلہ جنبانی کی ریہرسل شروع کر دیتے ہیں۔ رُوح کون سے عالم برزخ میں ہے' کس درجے اور کس مقام و حال میں ہے' [illegible] کس زبان میں ہوگا۔ رُوح کی کوئی شرط قربانی' بھینٹ وغیرہ وغیرہ...... یہ چودہ پندرہ روز ان ہی انتظامات اور ریہرسل کے لئے ہوتے ہیں۔ کوئی اڑیل قسم کی رُوح معاملے کو اُلجھا کر لٹکا بھی دیتی ہے' تنگ کرتی ہے یا کوئی ایسی شرط درمیان میں رکھ دیتی ہے کہ اس کا پورا کرنا ادارے' عامل یا معمول کے بس میں نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہے کہ مجلس ملتوی کر دی جاتی ہے اور رُوح کی اس شرط یا ضد کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ایسے ایک جلسے کے اخراجات بلاشبہ لاکھوں میں اُٹھتے ہیں...... یہ میڈیم بھی کسی ایسے ہی گنجلک میں پھنسی ہوئی تھی جس کا اشارہ وہ مجھے شروع ملاقات میں "مجھے نصیحت سے آگاہ کریں" کہہ کر دے چکی تھی۔ مصری فلمساز ہدایتکار مصطفیٰ عکاد جس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اور ابتدائے اسلام پہ "دی میسج" (پہلا نام محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نامی فلم بنائی تھی' یہی مصطفیٰ عکاد اس فلم سے پہلے لیبیا کے بطلِ حُریت عمر مختار پہ "دی لائن آف ڈیزرٹ" کے ٹائٹل سے ایک معرکہ آرا ہٹ فلم بنا چکا تھا۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب یہ فلم ذہنوں اور کاغذوں سے نکل کر کیمروں اور لوکیشنز کی زد میں آ چکی تھی۔ لیبیا' الجزائر' مراکش اور پتہ نہیں کہاں کہاں اس کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ شہرہ آفاق اداکار انتھونی کوئین' حریت پسند عمر مختار کا ٹائٹل رول کر رہا تھا جسے فلم کے آخری سین میں پھانسی پہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ وائنڈ اپ کا یہی آخری سین پوری فلم کا کلائمیکس تھا جس کے لئے انتھونی' جان توڑ محنت کر رہا تھا مگر بار بار کی ٹیک وقت اور جان

پیدا کرنے کے باوجود بھی وہ بات، تاثرات اور کیفیات پیدا نہیں ہو رہی تھیں جو ہدایتکار اور انتھونی کو مطلوب تھیں۔ اچھی خاصی سر کھپائی کے بعد کام روک دیا گیا، انتھونی نے مصطفیٰ کو مشورہ دیا کہ یوں بات نہیں بنے گی۔ کسی ماہر روحیات سے رابطہ کرو، شاید اسی طرح سے کچھ مسئلہ حل ہو سکے۔ فلم کے پروڈکشن یونٹ نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ہالوایم مسٹری سے رابطہ پیدا کیا۔ روحانی جلسہ ہوا باوجود کوشش بسیار، عمر مختار کی روح نے پلّہ نہ پکڑوایا، اس کی ایک ٹیکنیکل وجہ بھی تھی۔ آخر جلسہ ایک غیر معینہ وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا لیکن آخر اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو تلاش کرنا ہی تھا۔ ادارے کا یہودی سربراہ جو بجائے خود عامل اور علومِ روحیات اور ماورائے طبیعات و تحلیل نفسی کا ایک جید عالم بھی تھا، اس نے اپنے علم سے یہ معلوم کر لیا کہ اسے جب تک کسی مسلمان معمول کی جو عربی مستعمل اور غیر مستعمل زبانوں کو بھی جانتا ہو اعانت نہ ملے گی اس کا یہ عمر مختار والا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اسے میڈیم کی کیٹگری میں زیڈ بائی سنگل یا ڈبل زیڈ، چاہئے تھا۔ جو جودت طبع، قوت جاذبہ اور کمال فقاہت بھی اعلیٰ درجہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ پھر یہ ہوا کہ کسی نہ کسی طور اسی فلپائن میڈیم زیڈ بائی ڈبل زیڈ کے وسیلے سے یہ مسئلہ حل ہو گیا اور فلم کی منظر کشی کے مطابق نتائج حاصل [illegible] ایک عجیب سی اڑچن پیدا ہو گئی کہ اس روح نے کسی نامعلوم وجہ کی بنا پہ اپنے میڈیم سے رابطہ ختم نہ کیا اور اک عذاب مسلسل بن کر اس پہ مسلط ہو گئی۔ اب یہ بے چاری اک لمبے عرصے سے کام وام سے فارغ تھی کہ ایسی صورت میں وہ کسی روحی جلسے میں شریک نہ ہو سکتی تھی۔ اس سلسلہ کے کسی عامل کے مشورے پہ وہ کسی ایسے مسلمان عامل کی تلاش میں تھی جو اپنے روحانی طریقے سے اسے اس اذیت سے نجات دلا سکے۔ ایسے عامل کی پہچان بھی اسے بتا دی گئی تھی...... اس کی مشکل، حل ہونی تھی۔ میری صورت میں اسے ایک وسیلہ مل گیا۔

قصہ مختصر، میڈیم کو میری وساطت سے احسن خان مل گیا تھا جو اسی شام نیویارک پہنچ چکا تھا۔ سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ ان پُراسرار علموں کے ماہرین، عاملین، معمولین ایک دوسرے کی اضافی اور خاص الخاص ودیعتی اہلیتوں اور صلاحیتوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے باطنی تصرف، مکاشفات اور موکلین کی استعانت سے ایسے [illegible] لوگوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ان کی کئی شکلیں ہوتی ہیں، یہ مختلف اجسام و وجود میں اپنے آپ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کتا، بلی، چڑیا، چمگادڑ، سانپ، گھوڑا، تتلی کچھ بھی، کوئی بھی اور کہیں بھی۔ یہ اپنا بڑھاپا، جوانی، عمر، ماہ و سال اور جون تک بدل لیتے ہیں۔ آگ، پانی، [illegible] ان کے روبرو عاجز ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں طاقتِ پرواز ہوتی ہے، پلک جھپکتے یہ قطبوں کے فاصلے طے کر لیتے ہیں۔ یہ سارے تماشے، شعبدہ بازیاں عین ظہور ہیں۔ یہ سارے علومِ ارضی اور افلاکی ہیں۔ ان

کا تعلق افلاک و آفاق سے ہے، عرش اور عرشِ بریں سے نہیں۔ یہ استعانت باللہ نہیں ہیں۔ بلکہ نوری ناری، خاکی اور افلاکی استعانتیں ہیں...... یہ قوتیں، علوم غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں کے پاس بھی ہوتے ہیں، مسلمان بھی عامل کامل ہوتے ہیں مگر ایک فرق نمایاں اور ایک اصول واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو اہلِ ایمان ہوگا، اگر وہ یہ سفلی، علوی علوم جانتا بھی ہوگا تب بھی وہ انہیں استعمال میں نہیں لاتا۔ وہ خلافِ فطرت، خلافِ شریعت اور ماورائی اصول و قاعدہ کچھ بھی کرنے سے حتی الوسع اجتناب کرتا ہے، صرف حسبِ ضرورت شدیدہ وہ علوم الٰہی یعنی استعانت باللہ کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی مخلوق کی آسانی اور اس کی بہبودی کے لئے، بامرِ الٰہی استعمال کرتا ہے اور اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جیسے ایک کیمیادان یہ بخوبی جانتا ہے کہ خطرناک بم کیسے تیار کیا جا سکتا ہے یا کسی شہر کی آبادی کو تابکاری اثرات سے کس طرح نیست و نابود کیا جا سکتا ہے، خوراک اور پانی کے ذخیروں کو کس عمل سے مضرِ صحت بنایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ منفی طرزِ فکر کا دلدادہ ہے تو وہ اپنے علم و عمل سے ایسے ہی کرے گا اور اگر وہ مثبت سوچ، رجحانات اور رویوں کو اہمیت دیتا ہے تو وہ کوئی ایسی انسانیت سوز حرکت نہیں کرے گا جس سے مخلوقِ خدا، انسانیت اور معاشرے میں کسی سطح پہ کوئی بگاڑ پیدا ہونے کا کوئی امکان ہو۔ درویش اور عبدہ میں یہی ایک نمایاں فرق ہوتا ہے کہ درویش کبھی معجزوں، کراماتوں، کرشموں، برکتوں اور خوارق الفطرت و عادات اور محیرالعقول واقعات کا پرچار اور اظہار نہیں کرتا۔ وہ تو بے جا اور بے سوچے سمجھے کی دعاؤں، تسلیوں سے بھی متنفر ہوتا ہے۔ درویش کے پاس صرف اور صرف عاجزی اور تسلیم و رضا کی طاقت و دولت ہوتی ہے۔ میرے باباجی نے مجھے بتایا تھا کہ درویش وہ ہے جو ہر قسم کی صورتحال کے درپیش ہونے پہ بے ساختہ الحمدُللہ کہے اور راضی برضا ہو کر اسے تسلیم کرے۔ جو بھی سر پہ پڑ جائے، اس کو مشیتِ ایزدی جانے۔ ربّ العزت خود فرماتے ہیں، وتعز من تشاء وتذل من تشاء۔ اس بات پہ ایمان لانے کے بعد پھر کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی...... ایک بات تو یہ ہوئی کہ کسی علم کا جاننا کوئی برائی نہیں، اصل بات تو استعمال ہے۔ دوسری بات کہ اصل چیز تو تسلیم و رضا ہے۔ میرے مہربان جناب قتیل شفائی کا ایک خوبصورت شعر ہے......

پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جائیے
پھر جو نگاہِ یار کہے، مان جائیے

سبحان اللہ! کتنی سادگی اور کیسی آسانی سے ایک دقیق مسئلے کو سمجھا دیا ہے۔ کہنے کو یہ محض شعر ہے مگر یہ خوبصورت شعر اپنے اندر فلسفۂ تسلیم و رضا کا ایک جہان سموئے ہوئے ہے۔ تسلیم و رضا پہ بڑی بڑی

تشریحیں، شرحیں اور تاویلیں پڑھیں مگر اس شعر نے بڑے سیدھے سادے اور موثر انداز میں مجھے تسلیم و رضا کی اصل حقیقت سے روشناس کرا دیا۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اپنے کسی عمل دخل، سوچ فیصلے، ارادے وعدے کے بارے میں پہلے اپنے دل دماغ، حالات معاملات، نفع و نقصان، ہر بات پہ غور کرلو، مشورہ اور استخارہ کرلو تو تب کوئی فیصلہ کرو اور پھر وہ ''قولِ فیصل'' ہی ہونا چاہیے۔ درویشوں کی یہی وفا، یہی ادا اور یہی حیا ہوتی ہے کہ وہ جب کسی کے قدموں میں بیٹھ جاتے ہیں، لڑ پکڑ لیتے ہیں، اپنے گلے میں غلامی کا پٹکا ڈال لیتے ہیں۔ جب کسی کے نام پہ بک جاتے ہیں تو پھر یار سوہنا جس حال میں رکھے، مست رہتے ہیں کہ ''جے یار میرا، میرے دُکھ وچ راضی، سُکھ نوں چلّھے پاواں'' والی بات ہونی چاہیے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے حواسِ ناقص سے جو کچھ دکھائی یا سُنائی دیتا ہے، جو محسوس ہوتا ہے اس سے ہم عقلی یا شعوری طور پہ مطمئن و متفق نہیں ہوتے۔ لیکن عقل سے کام لیتے ہوئے اس سے روگردانی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی پسند ناپسند، طبیعت مزاج اور حالات، مجبوریاں، معذوریاں درپیش آجاتی ہیں۔ طالب یہ سوچتا ہی نہیں یا وہ اس نکتے پہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا کہ جو حکم دیتا ہے، جو کسی پلیتھن میں ڈالتا ہے وہ کون ہے؟ اگر اس سے مُرشد، رہبر، محبوب، اُستاد، یار یا جو بھی رشتہ، تعلق استوار کیا ہے، مطلب یہ کہ وہ کوئی [illegible] اس کے نتائج و عواقب پہ بھی اُس کی نظر ہوتی ہوگی۔ اس میں اندیشہ ہائے دُور دراز بھی ہوگا اور اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر وہ جانے اور اس کا کام۔ طالب کا کام صرف سر جھکانا اور ماننا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے چاچے نے مجھے کہا تھا کہ کاکا! تم جاننے والے ہو اور ہم صرف ماننے والے ہیں ـــــ یہ بات بہت بعد سمجھ میں آئی تھی کہ جاننے سے ماننا کتنے لاکھ درجے آگے ہوتا ہے۔ جاننے اور ماننے والے دونوں ہی طالب ہیں مگر ایک نمایاں فرق و حیثیت کے ساتھ...... ہوتا یوں ہے کہ طالب علم کو مختلف اوراد و اسباق کے لئے مختلف اُستادوں، بزرگوں کے ہاں بھیجا جاتا ہے، یعنی اس کے حالات اور زندگی کے ماہ و سال، شب و روز کی تقسیم کچھ اس انداز اور طور سے کر دی جاتی ہے کہ طالب خود بخود ہی اس ڈیزائننگ میں ڈھلتا چلا جاتا ہے، اس کے سمجھنے میں یہی کچھ آتا ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ بیت رہا ہے وہ محض اتفاقات ہیں جبکہ یہ سب کچھ ایک سسٹم اور شیڈول میں طے شدہ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی جو کچھ ہو رہا تھا اور جو ہستیاں مجھ پہ مامور و فائز تھیں، بباطن مجھے سب کا ادراک تھا مگر ہونٹوں پہ چُپ کی مُہر تھی۔ جیسے سالک صوفی درویش اپنے ''زمانۂ شوق و اشغال'' میں مختلف اَدوار سے گزرتے ہیں۔ کبھی مشاہدۂ ذات ہوتا ہے، کبھی مشاہدۂ کائنات اور کبھی مشاہدۂ حق تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی ایک

جن میں جذب و انفاس' مشاہدہ ہست و بُود' وجدان و وجود' حیات و ممات' ایقان و احسان' ایمان و عرفان' فقر و استغنا' تاب و تواں' یکتائی و دُوئی' حاضر و موجود وغیرہ اپنی اپنی بساط توفیق اور درجات کے مطابق...... جب اِن مشاہدات کی وارداتوں سے طالب گزر رہا ہوتا ہے تو ساتھ ساتھ اس کے ٹیسٹ بھی ہوتے جاتے ہیں۔ کہیں وہ بالکل زیرو بٹا زیرو ہوتا ہے اور کہیں قدرے مناسب اور ایک آدھ مضمون میں اچھا یا بہت اچھا' کہیں تو طالب کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کسی ٹیسٹ سے گزر رہا ہے۔ میرے ساتھ ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ اِدھر میں نے مضمون دیکھا یا قدرے چکھا' اُدھر میرے پرچے ہو گئے...... اس قسم کی میری کلاسیں کبھی مرحوم و مغفور رئیس اَمروہوی کی رئیس اکیڈمی میں لگا کرتی تھیں......

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء

● بن مُرشد راہبر کیہڑا اے......!

میری اس روحانی زندگی کا ایک عجیب و غریب سا واقعہ یاد آگیا ہے جو واقعتاً میرے رُوحانی سفر کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ اپنی اسی رُوحانی ترتیب و تربیت کے سلسلہ میں' مَیں اپنے ایک باباجی کے ڈیرے پہ پڑا ہوا تھا۔ جو سر بفلک برفانی پہاڑوں کے دامن میں ایک تنگ سے دَرّے میں واقع تھا۔ ایک ٹھٹھرے ہوئے دِن ظہر کے وقت باباجی کے قدموں میں بیٹھے تھے' ایک لڑکا بھاگا آیا اور عرض کی کہ سرکار! مہمان خانے میں ایک سانپ دیکھا گیا ہے' سب ہی مہمان سرک کر باہر برآمدے میں جمع ہو گئے ہیں۔ باباجی نے سُنی' اَن سُنی کرتے ہوئے بڑی لاپروائی سے فرمایا۔

''بیٹے! کوئی سانپ وانپ نہیں' اگر کوئی ہو بھی تو اسے مارنا نہیں...... جاؤ' سب مہمانوں کو کہو کہ جہاں دل چاہے بیٹھیں' لیٹیں۔ یہاں کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا......''

وہ لڑکا مطمئن ہو کر چلا گیا۔ باباجی نے اس کے جانے کے بعد مجھے مہمان خانے میں بھیجا کہ جا کر مہمانوں کو سمجھاؤں کہ یہاں کسی کو کوئی خطرہ نہیں۔ پہاڑی' برفانی علاقہ تھا۔ ہر کسی نے موٹے اُونی کپڑے اور چادریں اُوڑھ رکھی تھیں۔ مہمان خانہ پتھروں سے بنا ہوا تھا' فرش پہ ڈھیر سی کھپریل بچھی ہوئی تھی جو نرم گرم گدّوں کا کام دیتی تھی چھت سرکنڈوں اور جھاڑ پھونس کی تھی۔ بڑے سے کمرے کا صرف ایک دائمی راستہ تھا اور کوئی کھڑکی نہ دَر...... پتھروں کی دیواروں میں دو چار طاقچے بنے ہوئے تھے جن پہ

قرآن مجید اور بڑے بڑے مشعل نما دیئے دھرے رہتے تھے۔ مشعلوں کے دھوئیں نے کمرے کی ہر واضح تہہ پہ اپنی کالک کی تہہ چڑھائی ہوئی تھی۔ کالک کا احساس اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ ہر کوئی سیاہ پوش تھا......

میں اُدھر پہنچا تو وہ لڑکا وہاں برآمدے میں کھڑا' دُور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کو شاید باباجی کا حکم سُنا رہا تھا۔ میں مہمان خانے کے بڑے سے دروازے کی دہلیز پہ کھڑا اس انتظار میں تھا کہ وہ خاموش ہو تو میں بھی کچھ کہوں' معاً اندر سے ایک افغانی ''سانپ' سانپ'' پکارتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ دو چار بیمار سے مہمان جو ہمہ وقت لیٹے رہتے تھے' وہ اندر چیخ و پکار کر رہے تھے۔ میں عُجلت میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سامنے کھپریل کے ڈھیر کے اندر سے ایک کالا شا سانپ بڑی تیزی تندی سے میری جانب لپکا۔ سانپ کیا تھا' ایک بجلی کا لپکا تھا' شور غوغا سُن کر باہر والے بھی اندر آ گئے۔ کسی کے ہاتھ میں چھڑی اور کوئی جلانے والی لکڑی پکڑے ہوئے...... ایسے میں وہ سانپ میرے پاؤں تلے پہنچ چکا تھا۔ یہاں بھی کھپریل تھی' میں نے ہلکی سی جھکائی لے کر ذرا پرے چھلانگ لگا دی' اپنے طور میں سانپ کی زد سے بچ نکلا تھا۔ ہر کوئی چھڑیوں' لکڑیوں سے کھپریل کو کوٹ رہا تھا۔ بے طرح سے دُھنائی کرنے کے بعد جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ سانپ کا کچومر نکل گیا ہوگا تو اُنہوں نے کھپریل کو ٹٹولنا شروع کیا مگر سانپ کہیں نظر نہ آیا...... میں ابھی تک کھپریل پہ کھڑا تھا۔ اچانک سرگوشی سی ابھری۔

''اُٹھنا مت' یہیں بیٹھے رہو......''

دھیانی' بے دھیانی کرتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا' دیکھا تو سانپ میرے پاؤں سے لپٹا ہوا تھا۔ نظر پڑتے ہی میں نے دوسرے پاؤں کی مدد سے اسے علیحدہ کر دیا۔ وہ پھر میرے پاؤں کی جانب لپکا مگر اب شاید دیر ہو چکی تھی۔ ایک لپکتی ہوئی چھڑی زن سے پڑی پھر ایک گھماش سی سرسراہٹ گونجی جیسے چھمک بان کے چابک لہرانے سے سرسراہٹ سی گونجتی ہے۔ سانپ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی' وہ سر کٹے میرے قدموں میں پڑا تھا۔ اس کا خوبصورت جسم اینٹھ کر بل کھاتے ہوئے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مہمان اب سارے کے سارے میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔ کوئی فارسی' کوئی پشتو' ترکی اور ازبکستانی' پنجابی اور کوئی اُردو' سب اپنی اپنی ڈفلی بجا رہے تھے مگر میرے اندر جیسے مُردنی سی چھا گئی۔ سانپ کا کیا ڈر خوف تھا' بس یوں جیسے مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو...... کانوں میں وہ التجا بھری سرگوشی گونجنے لگی...... ''اُٹھنا مت' یہیں بیٹھے رہو''...... مگر جس کے نصیب میں ہی ایک جگہ کا ٹھکانہ نہ ہو وہ کیا کہیں جم یا جُڑ کر بیٹھے گا؟ عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی مجھے باباجی سرکار نے علاقہ بدر بلکہ صوبہ بدر کرتے ہوئے فرمایا۔

''گو تم نے قصداً ایسا نہیں کیا' بس یہی مقدّر تھا۔ باقی ''تسلیم و رضا'' اور من مارنا' ماننا تمہیں کوئی

اور ہی پڑھائیں سکھائیں گے...... آہ! ہاشم بابا جوف! اللہ تمہیں سُرخرو اور اقبال مند کرے......'' دوبارہ وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ ''تم نے اُن کی سرگوشی پہ بھی توجہ نہیں دی تھی......؟''

میں ہاتھ جوڑتے ہوئے صفائی پیش کرنے لگا۔ ''باباجی! غلطی ہوگئی۔ سرگوشی سُنی تھی' بس ہوتی دغا دے گئی۔ جب تک اصل بات سمجھ میں آتی' ایک مہمان اپنا وار کر چکا تھا......'' میں پاؤں میں بیٹھ گیا۔ ''باباجی! نمازِ جنازہ میں شرکت کی اجازت مراحمت فرما دیں' اس کے فوراً بعد رخصت ہو لوں گا......''

باباجی تاسف بھرے لہجے میں فرمانے لگے۔ ''پچیس برس سے ہاشم بابا جوف یہاں مہمان خانے میں پڑا ہوا تھا' اسے وہاں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی ماہِ صیام میں وہ یہاں سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا...... آہ! ہاشم بابا جوف! اللہ سوہنا تمہارے درجات بلند فرمائے' آمین!'' پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا' ارشاد فرمایا۔ ''بس ملامت کرو' تمہارا کوئی دوش نہیں لیکن تمہارا اور اس مہمان کا اب یہاں رہنا مناسب نہیں...... ہاشم بابا جوف کی نمازِ جنازہ یہاں بھی ہوگی لیکن میرے علاوہ اور کوئی اِدھر سے شرکت نہیں کر سکے گا۔ ہاشم بابا جوف کے لواحقین پہنچ گئے ہوئے ہیں' اللہ حافظ و ناصر...... اب تم فوراً رخصت ہو لو......''

مرشدی سے ...... جانے اب میری کہاں کہاں گتی تھی...... وقت نے ایک بھرپور انگڑائی لے لی تھی' زمانہ ایک آدھ زقند لے کر آگے نکل گیا تھا۔ جنم پتر پہ نصیبوں کا لکھا ہوا چاٹے بغیر کوئی چارہ نہ تھا...... جدھر جدھر جہاں جہاں قدم دھرنا اور جتنا جتنا' جیسا جیسا رزق پانی مقسوموں میں مرقوم تھا' چکتا چوستا رہا مگر جیسے من کی دنیا ماری گئی تھی۔ ہر لحظہ ہر پل بے کلی اور بے قراری میں بسر ہوتا۔ نہ دن کو چین' نہ رات کو قرار۔ سوچوں کے بھالے' خیالوں کے نشتر اور احساس کے تیر ہر ساعت کلیجہ چیرتے رہتے۔ سجود میں حضوری نہ قیام میں شرابوری' تسبیح میں تسلّی نہ تہلیل میں تشفّی' ذکر میں ذائقہ نہ فکر میں فائدہ دکھائی دیتا تھا۔ راضی برضا تھا' دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ لحہ لحہ سانس کا خنجر کاٹ رہا تھا۔ ایک زمانہ یہی سوچتا رہا کہ آخر میری غلطی کیا تھی؟ یہ تو بہت بعد سمجھ میں آئی کہ جس طرح کچھ دینے اور بخشنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ بہم ہو جاتا ہے اسی طرح کچھ چھیننا جھپٹنی اور چھپانے چھیدنے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی چھید ڈال دیا جاتا ہے' بھیتر کچھ اور ہوتا ہے اور باہر کچھ اور بیجا ڈال دی جاتی ہے۔ ناز و ادا' وفا و حیا' حُسن و جمال اور کرامت و کمال والوں کے ہاں ایسے کارنامے ہوتے ہی رہتے ہیں یعنی جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے...... آخر گھبرا اور تنگ آ کر گودڑی اور بُھنے چنے تھیلے میں ٹھونس کر بادیہ پیمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ گرمی' سردی' ساون بھادوں' بیماری' صحت۔ دَر دَر کی ٹھوکریں' فاقے' فقیر' مسجدیں' تکیئے' مزار' قبرستان۔

بدحال بانکے ڈیہاڑے۔ ایک سو اکیس تک گنتی اور اڑھائی کا پہاڑا...... چولستان' تھرپارکر' بیکانیر' راجستھان' اجمیر شریف ریگ پھانکتا' خاک چھانتا ہوا خواجہ مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ سرکار منگھوپیرؒ کے قدموں میں ٹھیکی لی۔ شانوں سے نیچے لٹکتے ہوئے ناتراشیدہ اور چیکٹ بالوں میں سرکار کی جوؤں سے کچھ زیادہ ہی جوئیں تھیں۔ جمعرات کی ایک دوپہر سرکار بابا ذہین شاہ تاجیؒ معہ چند مریدوں کے دربار پہ آئے ہوئے تھے' ایک مخصوص سی محفل سماع بھی آراستہ تھی۔

سرکار منگھوپیرؒ کے دادا پیر حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جس شعر کی تکرار پہ واصل الی اللہ ہوئے تھے......

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را' ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

یہاں بھی اسی شعر پہ گروہ کا ایک بوڑھا سا قوال تکرار کر رہا تھا۔ جس طرح ہر کے سلیمانی و مسیحائی مقدر نہیں ہوتی' ایسے ہی اس بوبک قسم قوال کے ہاں بھی دستگاہ ہنر' کمال فن اور بالا آفرینی کا فقدان تھا۔ شعر سُن کر قربان ہونے کو نہیں بلکہ اس قوال کا بلیدان کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں بھی طبلہ کھڑکانے والے نیم کانے طبلچی کے قریب بیٹھا کلام کی بجائے اس کے طبلے پہ جمائے اس کی گتیں نوٹ کر رہا تھا۔ میرے ناقص خیال میں وہ تماشہ سے اُترا ہوا تھا۔ اچانک سامنے نظر پڑی تو بابا تاجی شاہ سرکارؒ وہاں سے اُٹھ کر روضے مبارک کی جانب جا رہے تھے۔ بنا سوچے سمجھے میں بھی کانے کے پاس سے اُٹھ کر دونوں جہانوں کو دیکھنے والی آنکھوں والے کے پیچھے ہولیا۔ بابا جی اندر سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو میں نے لپک کر پاؤں چھولئے' وہیں جھکے جھکے عرض کی۔

''السلام علیکم' بابا جی!...... اس ہیجڑے کو اجازت ہو تو یہ کلام' خصوصاً یہ شعر' آپ کو پڑھ کر سنائے؟''

بابا جی نے مجھے اور میری خواہش دونوں کو دیکھ سُن کر تبسم فرمایا' مجھے شانوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا۔ چند ثانئے میرے چہرے پہ توجہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''وعلیکم السلام...... شعر ضرور سُنیں گے' پہلے اس پہاڑی شیر کا تو سُناؤ؟...... باگھ نے کاگ کو اُڑا دیا۔ چلو' یہ بھی بہتر ہی ہوا ہوگا......''

یہ کہتے ہوئے سرکار' سیڑھیوں سے نیچے اُترنا شروع ہوئے تو میں بھی سر میہوڑے لرزاں و ترساں' کسی شتر بچے کی طرح پیچھے پیچھے آستانے تک پہنچ گیا۔ یہاں دُنیا ہی دوسری تھی' میرے جیسے کئی یہاں پڑے ہوئے تھے۔ شب و روز گزرنے لگے اور میں کسی لاوارث بچھڑے کی طرح مکتب' مسجد اور مطبخ کے درمیان ہی کہیں پھنس کر رہ گیا۔ نماز روزہ کر لیا' کچھ لنگر وغیرہ مل گیا تو کھا ٹھونس لیا۔ نیند غالب ہوئی تو کہیں

بھی پڑ گئے' بس یہی کچھ ہو رہا تھا اور میں ٹھہرا ازلی آشفتہ سر' پاگل' ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سوچتے رہنے والا' ہنگامہ اُٹھانے اور کچھ کر گزرنے والا !...... یہ بیماروں اور چرسیوں سا لگا بندھا روزمرّہ' طبیعت اُوبنے لگی تھی۔ کئی روز نیچے اوپر گزر گئے' پر کیا مجال جو باوا سرکار نے بھولے سے بھی کسی سے پوچھا ہو کہ ایک چھوکرا منگھوپیر دربار سے ہمارے پیچھے پیچھے یہاں تک آیا تھا' وہ زندہ ہے یا گزر گیا ہے؟......

تم کو آشفتہ سروں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

انہیں اپنی مجلسِ خاص سے ہی فرصت نہ تھی۔ اکثر اوقات بڑی بڑی چمکدار گاڑیوں والوں کا ہجوم لگا رہتا' ہر وقت ہٹو بچو ہوتی رہتی۔ سوچا' یہاں دُنیاداری زیادہ نظر آتی ہے۔ دعوتیں ہیں تو کبھی مشاعرے وزیر آرہے ہیں تو کبھی کبیر۔ ''حق ہو'' والا کام کم ہے اور بندہ توڑ والا تماشا زیادہ ہے۔ بڑے بڑے اُستاد گویئے' بڑے بڑے منکسار کے فنکار...... ایکٹر' اخباروں فلموں تھیٹروں والے تجارتی' کاروباری۔ جسے بھی اللہ میاں نے دو ٹانگیں اور پاؤں دیئے تھے' وہ چلا آرہا ہے۔ صرف ایک ہم ہی انہیں عین ناک کے نظر نہیں آرہے تھے۔ بس اُڑنے کے لئے ہواؤں میں ہوا ہونے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک رات ایک چھَلّی سی داڑھی والا میں سمانے کے پھر ٹکانے کی کوشش کر رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھے...... بولا۔

''بھیّا اُٹھو...... باوا سرکار یاد فرماویں ہیں......''

الٰہی! آدھی رات آگے' آدھی پیچھے۔ یہ یاد فرمانے کا کون سا وقت ہے؟...... مُنہ پھاڑ کھول ایک لمبی سی جمائی توڑتے ہوئے میں نے پیامبر کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مولانا! تم نے غلط جگہ پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ اس راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے......'' میں نے دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔ ''باوا کو مجھ بیکار ناکارے سے کیا سروکار؟ اِدھر دائیں بائیں کسی اور کو دیکھو بھالو' مجھے کمر سیدھی کرنے دو......''

''کاکا بھیّا! باوا تمہی کو بلاویں ہیں' اَب اُٹھ بھی چکو......''

اگلے لمحے ہی میں الف سیدھا ششدر سا کھڑا اُسے گھور رہا تھا...... دیوان خانے میں حاضر ہوا تو وہاں سماں ہی کچھ اور تھا۔ مجلسِ خاص منعقد تھی۔ سپید براق چاندنیوں پہ مجلّا مطلّا گاؤ تکیئے' اگالدان' اگرداتوں میں دہکتے ہوئے بخورات۔ حاضرین جیسے اِنسان نہ ہوں' حاضرات قُدسی ہوں۔ اعلٰے قدر مراتب اور مجلس آرائی کا ایسا نفیس اہتمام و انداز شاید ہی کہیں مشاہدے میں آیا ہو۔ جھلملاتے ستاروں کے جُھرمٹ میں ماہتاب کی مانند روشن روشن بابا ذہین شاہ تاجیؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسی مجلس سعید دیکھ کر

شگفتہ یوں کھل کھل اُٹھا۔ دل و دماغ کا سارا ادبار' شیطانی وساوس کا سارا اُدلدر' طبیعت کا تکدّر اور تلملاہٹ یہاں پہنچتے ہی کہیں اَلف اُڑنچھو ہو گئی۔ حضرت مولانا ماہرالقادری غزل سرا تھے ....

ہر ذرّہ دِل بن جاتا ہے' ہر چیز نظر ہو جاتی ہے
جس سَمت وہ نظریں اُٹھتی ہیں' کونین اُدھر ہو جاتی ہے

اُستاد بہزاد لکھنوی' ابوالاثر حفیظ جالندھری' جوش ملیح آبادی' سید ذوالفقار علی بخاری' صہبا لکھنوی' سراج الدین ظفر' مجید لاہوری' صوفی غلام مصطفےٰ تبسم' صابری برادران قوآل' اور بھی کئی لوگ اپنے اپنے مقام و مراتب پہ تشریف فرما تھے۔ دائیں جانب برآمدے میں مکتب کے اساتذہ کرام اور معتقد مُریدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھے بھی ادھر برآمدے میں ایک ستون کے پاس بٹھا دیا گیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس جگہ سے بابا سرکار بالکل صاف سامنے بیٹھے نظر آتے تھے ظاہر ہے کہ انہیں میں بھی اِدھر بیٹھا نظر آ رہا ہوں گا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی محفل تھی۔ واہ رے ڈونگرے نہ ہاہو نہ واہ واہ نہ مکرر۔ صرف سبحان اللہ کی آواز یا شاعر کا کلام' اس کے علاوہ ہوا کے سرسرانے تک کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جس پہلو جس کروٹ جو بیٹھا ہے وہیں یہ وہ جیسے کھو سا پڑا ہوا ہے۔ اس محفل کو یوں نہیں بلکہ سے میدان کا رزار سمجھئے کہ یہاں ایک سے ایک جغادری چھپے اور ادب و شعر کے ببر شیر بیٹھے ہوئے تھے۔ علی الاجمال اِن کے مابین اُستاد بہزاد لکھنوی' ماہر القادری' صوفی' صہبا' شبنم ایسے غزال و آہو گلدم و طاؤس بھی تھے۔ دیکھا ہے کہ جہاں جوش ملیح آبادی ہوں گے وہاں ہوش نہیں ہوتا بلکہ جوش اور نا و نوش ہوتا ہے اور اگر کسی ایسی مجلس میں غلغلہ ہنگامہ بحث و تمحیص و شنام طرازی اور ہلڑ آرائی بپا نہیں ہے تو جان لو کہ وہاں یہ رامپوری پٹھان جوش ملیح آبادی موجود ہی نہیں ہے اور جہاں حفیظ اور چھوٹے حضرت صاحب دھرے ہوں اور اِن نہلوں پہ ایک ہی دہلہ یعنی مجید لاہوری بھی پڑے ہوئے ہوں وہاں تصور کرنا ہی پاپ ہے کہ یہاں اَمن و امان' انتظام و انصرام' التفات و اکرام کا ماحول قائم رہ سکتا ہے اور اگر بھی کوئی قیامت سے پہلے قیامت اُٹھانے کی سوچتا تو اِن شرابوں اور کبابوں میں دو چار عذاب اور بھی شامل کر لئے جاتے۔ ابراہیم جلیس' شاہد احمد دہلوی' سلمیٰ آغا کا نانا رفیق غزنوی اور ابنِ انشاء وغیرہ۔ آہ یہ یگانہ روزگار ہستیاں! اِن میں اب کوئی بھی زینتِ ہستی نہیں ہے۔ اللہ غفور الرحیم اِن کے اعمال و افعال پہ اپنے خاص کرم و فضل والا معاملہ فرماتے ہوئے اِن کی قبروں کو عنبرین کرے۔ یہ عظیم اور مَن کے اُجلے لوگ اپنے اپنے مقام پہ ایک نمونۂ تہذیب' ایک درخشاں دور کی نمو و ضو' ایک زمانہ اور ایک گرانمایہ خزانہ تھے' بلکہ در دانہ' اپنی جگہ یک دانہ تھا۔ ہر انسان کی طرح یہ بھی اپنی بشری کمزوریوں خامیوں سے خالی نہ تھے مگر

وہ علم و ادب کے مہان اور اپنی جگہ اچھے انسان بھی تھے۔ یہ ہماری تہذیبِ رفتہ کے امین' ہماری ادبی علمی ثقافتی قدروں کے علمبردار تھے۔ وہ اپنی شخصیت کے اُجلے پن کی ساری ردائیں' اپنی دلداری' دلنوازی اور دستگیری و دمسازی کی ساری ادائیں' اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئے اور اب جو دیکھنے کو باقی بچا ہے اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ...... ان نینوں کا یہی بسیکھ' وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ......!

بات ہو رہی تھی بابا ذہین شاہ تاجیؒ کی جو ماہِ درخشاں بنے ہر خاص و عام کو اپنی رُوحانی ضوفشانی سے منور فرما رہے تھے۔ بابا جی خود بہت بڑے قادر الکلام شاعر تھے' ایسی ایسی سنگلاخ زمینوں پہ شعر کہتے اور ایسے اَدَق تنگ و تند اور چُست قافیے رَدیف باندھتے تھے کہ بڑے بڑے کُہنہ مشق عروضیوں اور اُستادوں کو دانتوں تلے پسینہ آ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے معاصرین میں چیدہ چیدہ شعراء جیسے جگر' جوش' مجید' سراج' رئیس امروہی' جون ایلیا' حفیظ' بہزاد اور ماہر بابا جی کا بحیثیت ایک شاعر بھی بے پناہ احترام کرتے اور اپنے تمام ''اشغالِ غیر شرعیہ'' اور ''اطوارِ قبیحہ'' سے بابا جی کی محافل میں اجتناب برتتے۔ بابا جی کے ہاں یہ شعر و شاعری' سماع' علمی ادبی مذاکرے قریب قریب روزمرّہ کا ہی وطیرہ تھا۔ خوش طبعی' شگفتہ بیانی' لطائف و مزاح' پھبتی' طنز و تکرار' مناظرے مکالمے' مباحث و مذاکرے خوب چلتے تھے مگر یہ سب کچھ ذاتی قریبی دوستوں اور مخصوص محفلوں تک محدود ہوتا۔ اس وقت بھی شعر و شاعری کے بعد اب صابری برادران بیٹھ چکے تھے' محفل کا رنگ یکسر تبدیل ہو گیا تھا جیسے تیور چڑھے سُر یکدم کومل سُروں کی مہار میں اُتر آتے ہیں یا جیسے سخت تڑتڑاتے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی ہے یا ساگر کنارے گیلی ریت پہ کھڑے اچانک کوئی شوخ چنچل سی لہر پاؤں کو ایک پل میں چُھو جاتی کر کے واپس سمندر کی بانہوں میں اُتر جاتی ہے۔ لیلائے شب کی مشکبار زُلفوں کی بھینی بھینی خوشبو نے ماحول میں جادو سے جگا دیے تھے۔ اُدھر طوطیٔ ہند' راگ وِدّیا کے گورو گوبند' بندۂ خدا' محبوب نظام الدین اولیاء' ہم اوصاف یگانہ' شمعِ فُقر کا پروانہ' نابغۂ روزگار' صاحبِ طاؤس و تلوار' واقفِ رموزِ عشق' باصفا' باوفا' باحیا' باصدق۔ موزونِ موسیقی' آلات غنا' طرز و طور راگ داری' بانداز قوالی قلبانہ' ترانہ...... کہ اس کے ترانہ الاپا جا رہا تھا۔ ترانہ' رنگ باندھنے کا ابتدائیہ ہے' قوال حضرات اسے خیر و برکت اور راگ ورگ کھولنے اور حضرت امیر خسروؒ کے حضور ہدیہ سلام پیش کرنے کی غائیت سے بھی پڑھتے ہیں۔ ترانے نے تو صرف رنگ کی پوٹلی کھولی تھی' اصلی رنگ تو اب چڑھنا شروع ہوا جب قوالوں نے ''کشتگانِ خنجرِ تسلیم را' ہر زماں اَز غیب جانِ دیگر است'' چھیڑ دیا۔ ہارمونیم پہ سُر چھڑتے ہی جیسے کسی نے بھِڑوں کے چھتّے کو چھیڑ دیا تھا' خاص و عام میں شریک ہر فرد جیسے بھِڑوں کے عتاب میں آ گیا ہو۔

اچانک جو میری نگاہ اٹھی تو بابا میری جانب توجہ کیے ہوئے تھے' نظریں یوں میرے چہرے پہ ٹکی ہوئی تھیں جیسے میرے دماغ میں میخیں سی ٹھکی ہوئی ہوں۔ لَے دھیرے دھیرے چڑھ رہی تھی اور میں ہولے ہولے اندر سے بیٹھ رہا تھا۔ اردگرد دائیں بائیں' سامنے جیسے کوک بھرے ننھے ننھے کھلونے حرکت میں آ گئے ہوں۔ ہر کوئی بقدرِ ظرف و بساط اپنے آپ کو پھولنے اور ٹٹولنے میں مصروف تھا۔ کوئی جھوم رہا ہے تو کوئی خود کو تُوم رہا ہے' کوئی گردن ڈالے اپنے اندر سے کچھ نکال رہا ہے تو کوئی کانوں' آنکھوں کے رستے کچھ اندر داخل کر رہا ہے۔ شاید ہر کوئی اسی کیفیت و جذب کو کھوج رہا ہے جو کبھی قطب الاقطاب حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ پہ طاری ہوئی تھی مگر یہ تو وہی بات ہے کہ...... ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بُنیاد

لاریب' شعر اور کلام وہی تھا مگر اب کوئی خواجہ بختیار کاکیؒ نہیں تھا' وہ وقت کا وفور اور سمے کا ست اور اس نہیں تھا' بول کی کاٹ اور صوت کا پاٹ وہ نہ تھا...... کھسکتی سی نظر بابا جی پہ ڈالی' میری طرح وہ بھی خموشی سے نچنت بیٹھے تھے' عجیب تماشا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس طرح دیدے اٹھائے دیکھنا نہیں چاہیے' بابا جی کیا سوچیں گے؟...... ویسے بھی ہلکی سی جھپک مستی سی محسوس ہو رہی تھی' ٹھوڑی سینے پہ ٹکائی اور اندر کنوئیں میں اتر گیا۔ جیسے چند [illegible] کے اندر [illegible] تمام احساسات اور [illegible] دوسری ہوتی ہے اسی طرح بند آنکھوں سینے پہ ٹھوڑی ٹکا کر قدرے سر جھکائے ہوئے جب آپ دماغ سے دل تک ایک آدھ بالشت نیچے اترتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو بڑا مسرور' محظوظ اور مدہر سا محسوس کرتے ہیں۔ یہ قریب قریب مراقبے کی حالت ہوتی ہے۔ اب یہ آپ کی مشق' ہمت اور دلچسپی پہ محمول کرتا ہے کہ آپ اس حالتِ مراقبہ کو کتنی دیر تک قائم رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ ابتداء میں مراقبے کا وقت متعین کر دیتے ہیں' وقت ختم ہوتے ہی آپ کا شعوری نظام آپ کو بیدار کر دیتا ہے۔ دوسری صورت کہ آپ کسی خاص مقصد کو حاصل کیے بغیر مراقبہ توڑنا نہیں چاہتے۔ اس صورت میں جب تک آپ کسی نتیجے تک نہیں پہنچتے' آپ بیدار ہی نہیں ہوتے۔ تیسری صورت کہ آپ کا کوئی مقصد یا ارادہ نہیں ہوتا' بس وقتی طور پہ آپ کچھ ریلیکس کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے بیٹھے بیٹھے قیلولہ کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کے مراقبے سے کچھ نتیجہ حاصل کرنا مقصد نہیں ہوتا' محض وقت گزاری اور دل دماغ نگاہ کو چنداں فراغت دینی مقصود ہوتی ہے...... خود بخود میرے لبوں پہ "کشتگانِ خنجرِ تسلیم را' ہر زماں اَز غیب جانے دیگر است" جاری ہو گیا...... سڑپ سڑاپ' یوں جیسے کوئی پوری تندی سے مجھ پہ کوڑے برسا رہا ہو اور میں مارے کرب و اذیت دُہرا ہوتا جا رہا ہوں' کوڑے مارنے والے کو میں نہیں دیکھ سکتا کیونکہ باوجود کوشش میری آنکھیں ہی نہیں کُھل رہی تھیں۔ میں بُری طرح چیخ و پکار کر رہا

ہوں۔ کبھی اِدھر لڑھک رہا ہوں' کبھی اُدھر سر پٹک رہا ہوں۔ ناگاہ دو شفیق سے نرم گداز ہاتھوں نے مجھے کھینچ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ میں سینے سے لگ کر یوں سکون پاتا ہوں جیسے بھوک پیاس یا کسی تکلیف میں بلبلاتا ہوا شیر خوار بچہ اپنی مادر کی مہربان چھاتی سے لگ کر سکون پکڑتا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بابا تاجی شاہ کے پہلو سے لگا پڑا ہوں' آپ بڑی شفقت سے کوڑے پڑنے والی جگہوں کو ہاتھ سے سہلا رہے ہیں۔ مجھے بہ مائل سکون دیکھتے ہوئے مسکرا کر فرمایا۔

''تم یہاں سے اُڑنے کا سوچ رہے تھے...... کاگا چھینا جھپٹی کر کے اُڑ ہی جایا کرتا ہے' کہیں ٹکتا نہیں۔ 'کتا' کاگا سے کہیں زیادہ تسلیم و رضا کو مانتا اور سمجھتا ہے ٹک کر دوارے بیٹھ جاتا ہے۔ مالک دے نہ دے۔ پُوچھے نہ پُوچھے۔ مارے دُھتکارے وہ دُم ہلا کر اظہار تسلیم کرتا رہتا ہے۔ ہر حال میں خوش رہتا ہے تمہاری طرح اظہار برہمی نہیں کرتا...... تو پہاڑوں سے اُتر کر شہر میں آ گیا' اب یہاں سے بھی اُڑان پکڑ۔ جا صوفی نوردین کے پہلو سے بیٹھ۔ ان سے سیکھ کہ تسلیم و رضا کیا ہے؟...... محض 'کشتگانِ خنجر تسلیم را' خالی خولی الاپنے سے اِن کے معنوں کے باطنی معنے پلّے نہیں پڑتے۔ بس دو چار کوڑوں سے ہی بلبلا اُٹھا ہے' آہ و بکا اور دُہائی دینے لگا ہے۔ اِدھر دیکھ......''

اُنہوں نے [illegible] اپنی پشت [illegible] دکھائی [illegible] اُبھری ہوئی [illegible] دیکھ کر میں [illegible] گیا۔

تہجد کوئی پڑھے نہ پڑھے' فجر کی نماز سے بہت پہلے اجتماعی طور پہ سب کو جگا دیا جاتا۔ یہاں اکثر مُرید و طلباء سحر خیز تھے۔ صبح کاذب کا فسوں کب کا ٹوٹ چکا' صُبح صادق کی صباحت و صداقت اپنا سرمدی رنگ جما چکی تھی۔ اِدھر کے مکین حوائج ضروریہ' طہارت و وضو سے فراغت پا کر صفیں سیدھی کر چکے تھے۔ تعجب کہ مجھے کسی نے جگایا تک نہیں' میری تو اچانک آنکھ اُچٹ گئی تھی اور اب تو تکبیر تحریمہ ہو رہی تھی۔ گڑبڑا کر جھٹکا لے کر جو اُٹھا تو وہیں ڈھب سے ڈھے گیا' یوں لگا جیسے میرے جسم کو کسی نے تُوم کر رکھ دیا ہوا ہے۔ اِک ٹیسوں کی لہر بجلی کی مانند میرے رَگ و پے میں کوندی سی گئی۔ کچھ دیر بعد ہوش ٹھکانے لگے تو رات والی ''واردات'' دُھندلی دُھندلی سی دماغ میں اُبھرنے سی لگی۔ جو ہلکا سا مزید غور کیا تو سارا قصہ کہانی سامنے آ گیا۔ یہیں محسوس ہوا کہ مجھے تیز حرارت بھی ہے۔ اُدھر پیش امام کے ہاں ثناء کے بعد الفاتحہ شروع ہو چکی تھی جبکہ اِدھر مجھ پہ فاتحہ پڑھنے کا مقام بن رہا تھا۔ خیر' جس طرح بھی بن پڑا اُٹھا۔ بصد عُجلت و نقاہت طہارت و وضو سے فارغ ہو کر ایک کونے میں گرتا پڑتا نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ سُنتوں کے بعد فرض نیت لئے' اُدھر ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' بھی ہو چکی تھی۔ سلام پھیر کر فارغ ہوا ہی تھا کہ وہی چٹی داڑھی والا ہاتھ میں تسبیح لئے ''السلام علیکم'' کہتا ہوا میرے پاس بیٹھ گیا' دو اسپرین کی ٹکیاں تھماتے ہوئے بولا۔

"ناشتے کے بعد پانی کے ساتھ نگل لینا......" پھر دو روپے دیتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ "باوا سرکار نے یہ روپے دیئے ہیں اور کہا تھا کہ صوفی نوردین کے پاس چلے جائیں......"

فوراً مجھے باباجی کی گزشتہ رات کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ جا' صوفی نوردین کے بھیرے بیٹھ۔ اُن سے سیکھ کہ تسلیم و رضا کیا ہے؟...... مَیں نے بڑی بددلی سے جواب دیا۔

"مولانا! پہلے مجھے جوڑوں ہڈیوں کی مرہم پٹی کرنے والے کسی پہلوان کے پاس لے چلیں تا کہ میں ٹوٹی ہڈیوں پسلیوں کی مرمت کرواؤں......" مَیں نے اسے اپنی پشت اور بازوؤں پہ نیلے نیلے سُرخی مائل نشان دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں کوڑوں کے نشان...... آخر مجھ سے ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی تھی جس کی پاداش میں مجھے ایسی بیدردی سے زدوکوب کیا گیا......؟"

وہ سیٹی بجانے کے انداز میں منہ گول کئے ہوئے میرے زخم دیکھتے ہوئے بولا۔

"کاگا بھیا! یہ کس نے آپ کو پیٹا ہے......؟"

"یہی تو مَیں بھی جاننا چاہتا ہوں' ذرا مجھے بابا سرکار کے پاس لے چلو......"

وہ تڑپ کر بولا۔ "کاگا بھیا! وہ یہاں نہیں ہیں' وہ تو کب سے سہون شریف' قلندر بابا کے ہاں پہنچے ہوئے ہیں۔"

"مولانا! کوئی حساب کتاب کی چھوڑو...... تم رات مجھے سوتے سے جگا کر باباجی کی محفل میں لے کر گئے تھے' مشاعرہ اور سماع ہو رہا تھا۔ پھر وہاں مجھے پیٹا کس نے تھا' یہ تو خبر نہیں لیکن یہ تو خوب یاد ہے کہ باباجی نے مجھے خود اپنے پاس بٹھایا تھا اور بہت سی باتیں بھی کی تھیں۔ یہ صوفی نوردین والی بات بھی اُنہوں نے خود مجھ سے کی تھی......"

وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا' ڈرتے ڈرتے کہنے لگا۔

"کاگا بھیا! تم دو منٹ رُکو' مَیں پانی لے آؤں۔ ابھی تمہیں اسپرین کھلاتا ہوں...... معلوم ہوتا ہے' تمہارے سر میں بخار پہنچ گیا ہے ورنہ تم یوں ایسی بہکی بہکی نہ چھوڑتے......"

مَیں نے اس کی پتلی سی کلائی پکڑ کر نیچے بٹھا لیا' بولا۔

"کیا مطلب' میرے سر میں بخار چڑھ گیا ہے اور مَیں بہکی بہکی چھوڑ رہا ہوں؟...... بتاؤ' مَیں نے کون سی بہکی ہوئی بات کہی جو تم نے مجھے ایسے کہا ہے......"

وہ مسمسی سی صورت بنا کر کہنے لگا۔ "کاگا بھیا! تم نے ابھی کہا ہے کہ مَیں تمہیں اُٹھا کر مشاعرے کی محفل سماع میں لے کر گیا' وہاں باوا سرکار بھی تھے جبکہ مَیں تو کل صبح سے اپنے گھر کو گئی گیا ہوا تھا۔ رات

وہاں بسر کی ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے نماز کے وقت یہاں پہنچا ہوں۔ رات یہاں نہ کوئی محفل ہوئی اور نہ ہی بابا سرکار یہاں موجود تھے......"

میں بھونتروں کی مانند منہ بنائے اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟...... اچانک میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ جو تم مجھے ابھی اسپرین کی گولیاں دو روپے اور بابا جی کا پیغام دے رہے ہو کہ میں صوفی نوردین کے پاس چلا جاؤں یہ سب کچھ تمہیں بابا جی دو روز پہلے ہی دے گئے ہوں گے؟"

"ہاں بابا! ایسا ہی ہوا تھا"...... اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"لیکن بخار اور یہ کوڑوں کی مار تو مجھے آج ابھی دو چار گھنٹے پہلے پڑی......"

وہ مجھ سے جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ "کاکا بھیا! جو تم کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے اور میں بتا رہا ہوں اس میں بھی رتی بھر جھوٹ نہیں...... بحث فضول ہے یہ تھا مو دو روپے اور پکڑو اپنا رستہ یہی بابا سرکار کا حکم ہے"۔ وہ انتہائی سرد مہری سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "اللہ حافظ......!"

وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

"صوفی نوردین کون ہیں اور مجھے کہاں ملیں گے......؟"

وہ ہنسا اور عجیب سے استہزائیہ انداز سے مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "کاکا بھیا! اگر کوئی کاگا سے یہ سوال کرے کہ اس شہر میں مجھے روٹی کا ٹکڑا کہاں ملے گا تو میرا خیال ہے کہ تم اس کاگا کو یہی جواب دو گے کہ بھیا! پر پھیلاؤ اُڑو۔ "کاگا" "کا" کی بجائے "کہاں کہاں" کرو نظر دوڑاؤ بنیرے پھرو دیواریں اُلانگو چھتوں کو پھلانگو پھر دیکھو۔ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو صوفی نوردین مل ہی جائے گا......"

● تیز ہوا کی زد میں......!

دو چار چیتھڑوں کا پوٹلا اُٹھائے وہاں سے اُٹھ آیا۔ اُدھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ کراچی والے ایسے بے درد اور بے مروت لوگ کہ نہ آئے کو چاہیں نہ جائے کو پوچھیں۔ اگر یہ سب کچھ بقول اس چنگی والے کے خواب اور خیال ہی تھا تو میرے جسم پہ یہ کوڑوں کے نشان بھی نہ ہوتے مجھے اس وقت ایک سو بخار بھی نہ ہوتا۔ یہ کیسا تماشا تھا آدھا خواب آدھی حقیقت آدھی نصیحت اور آدھی فضیحت؟...... اللہ! کدھر جاؤں یہ صوفی نوردین کی خبر کہاں پاؤں؟...... کوڑوں کے نشان نما زخموں پہ یوں جیسے کسی نے

مرچیں چھڑک دی ہوں' بخار کی الگ ڈکھن۔ مُنہ میں کڑواہٹ' آنکھوں میں شب جگے کی جلن۔ لنڈوروں کی طرح مُنہ اُٹھائے سامنے چوک میں آ کھڑا ہوا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ کدھر قدم بڑھاؤں کہ چگی داڑھی والا پھر نازل ہو گیا' رومال میں بندھا ناشتہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"السلام علیکم...... کاکا بھیا! تم ناشتہ لینا بھول گئے تھے۔"

میرا دماغ اور مزاج تو پہلے سے ہی چھ ضرب چھ بنا ہوا تھا' اسے اور ناشتے کی پوٹلی دیکھ کر میں [illegible] کا پورا بارہ ضرب بارہ کا اسلحہ ڈپو بن کر جو پھٹا تو اس بے چارے کو بھاگتے ہی بنی...... میں یہاں سے جلد از جلد نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ "کاکا بھیا" والا پھر نازل نہ ہو جائے۔ اچانک کہیں سے ایک کھٹارا سی بس نمودار ہوئی اور ہچکیاں ہچکولے توڑتی ہوئی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ' بس میں گھسنے کی سوجھی۔ پھر چل سو چل۔ کنڈیکٹر نما ایک آدمی میرے پاس آیا۔

"کہاں جانا ہے بچے......؟"

جواب دینے کی کیا سوجھتی' میں تو کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔ معاً مُنہ سے نکل گیا۔

"صوفی نور دین۔"

وہ پونی اٹھنی کا ٹکٹ مجھے تھما کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ بخار نے مت ماری ہوئی تھی' سیٹ پہ بیٹھتے ہی رہا سہا جسم ٹوٹنے لگا۔ گھٹنوں پہ دھرے کپڑوں کے تھیلے پہ ماتھا ٹکا کر میں ٹُن سا ہو گیا' میری جانے بلا کہ بس کس کس مقامات سے گزری' میں پسینے سے نہایا ہوا نیم بیہوش سا اینگی پینگی تک رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے مجھے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔

"بچے! اُترو' تمہارا اسٹاپ آ گیا ہے......"

میں سر پہ چوٹ لگے کبوتر کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تھیلا تھامے بس سے نیچے لُڑھک گیا۔ صبح صبح کا وقت' نوکری پیشہ لوگ عُجلت میں آ جا رہے تھے' ایسے لوگوں سے اگر کچھ دریافت کیا جائے تو اکثر تو وہ سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بنا کوئی جواب دیئے زن سے گزر جاتے ہیں اور اگر کوئی مروّت کا مارا رُک بھی جائے تو وہ خود کو اجنبی ظاہر کر کے نکل لیتا ہے' دوکاندار بھی صبح صبح بوہنی کے وقت خالی چلی کسی کو کچھ بتانا نیک شگون نہیں سمجھتے۔ میں تھیلا تھامے سامنے ایک بند دوکان کے بیرونی تھڑے پہ بیٹھ گیا کیونکہ ٹانگیں کمزوری کے باعث لرز رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے کھسک کر شٹر کے ساتھ دُکھتی کمر ٹکا کر نیم دراز سا ہو گیا۔ شاید پندرہ بیس منٹ بعد کوئی مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا' ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو ایک ادھیڑ عمر شریف سا آدمی بڑی نرمی سے مجھ سے مخاطب تھا۔

"بیٹا! تُو کون ہے' کہاں سے آیا ہے...... اِدھر کیوں لیٹا ہے؟" ذرا قریب آ کر وہ میری جلتی ہوئی آنکھوں اور سُرخ تپتے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے ذرا تردّد سے کہنے لگا۔ "ارے' تم تو ماندے بھی دکھائی دیتے ہو......"

اس کے سوالوں کے جواب میں میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا البتہ دو چار آنسو ضرور ڈھلک کر میرے تڑختے ہوئے گالوں پہ لڑھک آئے۔ اس نے کوئی مزید سوال کئے بغیر مجھے تھڑے پہ لمبا لٹا کر میرا کپڑوں کا تھیلا میرے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! صرف تھوڑی دیر کے لئے اسی طرح لیٹے رہو' میں ابھی واپس آتا ہوں......"

مَیں پہلے نیم دراز تھا' اب جب سیدھا لیٹا دیا گیا تو آنکھیں خود بخود مُندھ گئیں۔ انتہائی نقاہت اور بخار کی غنودگی نے مجھے پھر ایک بار ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا...... مَیں جب دوبارہ ہوش میں آیا تو شام نے اپنے شامیانے گاڑ دیئے ہوئے تھے۔ ہوش پلٹنے کے بعد سب سے پہلے میں نے جس چیز کا ادراک کیا وہ بجلی کا پنکھا تھا جو میرے اوپر بڑی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ چھت' جھاڑ' دیواریں' دروازے' کھڑکیاں' فرنیچر' فرش' قالین اور وہ قیمتی پلنگ جس پہ صاف شفاف چادر بچھی تھی...... سرہانے اور بھیگا سا تکیہ' ماتھے پہ برف کی پٹی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے بخار کی حدت اور شدت اب خاصی کم ہو گئی ہے۔ ایکا ایکی مجھے غسل خانے جانے کی حاجت محسوس ہوئی اور ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ کمرا' یہ مکان' یہ جگہ؟...... پھر اس مہربان شخص کی صورت بھی سامنے آ گئی جو مجھے تھڑے پہ چت لٹا کر تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر گیا تھا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ ہوئی' وہی دوکان والا شخص ہلکی سی بے ریا مسکراہٹ کے ساتھ میرے پاس کھڑا تھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے......؟" وہ پلنگ کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"السلام علیکم!...... الحمد للہ' مَیں اب قدرے بہتر ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی' اللہ آپ کا بھلا کرے...... میرا نام محمد یحییٰ خان ہے۔ پنجاب' سیالکوٹ سے میرا تعلق ہے۔ مَیں یہاں صوفی نور دین صاحب کی تلاش میں ہوں۔ اگر آپ مجھے ان تک......"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "بیٹا! پہلے تندرست تو ہو لو' پھر کسی کو تلاش کرنا......"

مَیں اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے......"

اس نے میری کمر کے نیچے بازو ڈال کر مجھے پلنگ پہ بٹھایا۔ پھر میرے لئے سلیپر سیدھے کر کے انہیں میرے پاؤں میں پہنایا اور بسم اللہ کہتے ہوئے مجھے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ پھر بازو تھامے ہوئے

آہستہ آہستہ باتھ روم تک لایا' دروازہ کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹا! میں باہر کھڑا ہوں۔ اچھی طرح سکون تسلی سے ہاتھ منہ دھوؤ' دانت منجن کرو لیکن نہانا ابھی مناسب نہیں...... کسی چیز کی ضرورت محسوس کرو تو مجھے آواز دے لو۔ باہر نکلو گے تو ہلکا پھلکا کچھ کھانا پینا بھی تیار ہو گا......"

میں سوچ رہا تھا کہ مالک! یہ کیسا انسان ہے' ولی ہے یا کوئی فرشتہ' مجھ معمولی انجان سے لڑکے کی خدمت اور ایسی محبت؟...... صاف ستھرا تولیہ' صابن' منجن کی ڈبیا' تازہ مسواک۔ فراغت' طہارت' ہاتھ منہ دھو دھلا کر باہر آیا تو میں خود کو قدرے تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ سامنے پلنگ کے آگے تپائی پہ ہلکا پھلکا کھانا سا پڑا تھا...... دلیا' کھچڑی' آش' دودھ۔

"لو بیٹا! تم حسب خواہش کچھ کھا پی لو اور مجھے تھوڑی دیر کے لئے اجازت دو...... اور ہاں' وہ سامنے مصلیٰ پڑا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت بھی ہوا چاہتا ہے اور کھانے کے بعد یہ دوا لینا مت بھولنا"...... پڑیاں میرے آگے رکھ کر باہر نکل گیا۔

عشاء کی نماز ہم دونوں نے مسجد میں ادا کی۔ اب ہم باہر ایک کھلی سی سرسبز جگہ پہ چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس شخص [illegible] اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ اس کا نام' کام' میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ کون تھا مگر یہ تھا کہ اس وقت تک وہ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اسی نے لمحہ لمحہ میرا خیال رکھا۔ دوا' خوراک' حتیٰ کہ مجھے نئے کپڑے سلوا کر جوتے تک پہنائے۔ وہ میرا محسن اور دوست تھا۔ اب میں بات چیت کا کوئی موقع تلاش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس کا شکریہ ادا کر کے یہاں سے رخصت لوں اور صوفی نوردین کو ڈھونڈوں جن کے پاس میرے "تسلیم و رضا" والے پرچے تھے لیکن وہ بھی تو شاید کوئی صاحب کشف تھا' ہاتھ ملا کر بولا...... "اللہ حافظ' بیٹا! یہ نیچے سڑک سیدھی سمندر پہ ختم ہوتی ہے۔"

● الف لام میم تیری رضا میری تسلیم......!

میں سڑک پہ سمندر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ جس طرح ہر راستہ مختلف نشیب و [illegible]' آسانیوں پریشانیوں اور کم و بیشی سے ہوتا ہوا ایک ہی منزل پہ جا کر ختم ہوتا ہے۔ جیسے ہر مذہب' مسلک' مقصد طرح طرح کے گنجلکوں' ابہامات' افہامات' بینات اور توہمات سے چھوا چھوئی کرتا ہوا ایک

ہی صرف ایک ہی رب کی جانب رجوع ہوتا ہے اور قطرے سے لے کر آبجو آبجو سے ندی نالے دریا چشمے آبشاریں سب کے سامنے صرف سمندر ہوتا ہے۔ آبِ حنظل ہو یا آبِ انگور آبِ شورہ ہو یا آبِ زلال آبِ حیات یا آبِ کوثر سب اسی سرچشمہ قدرت وحکمت سے پھوٹتے ہیں...... اُڑو کاگا! اُڑو۔ سمندر سے بہت پہلے تمہیں ایک نالہ اور ملے گا اس سے سیراب ہوتے جانا......"

کپڑوں والا تھیلا تو اُدھر اسی کے گھر پہ تھا، پاجامہ، قمیض اور چپل جو پہنے تھے وہ اسی مردِ نیک خُو کے دیئے بلکہ پہنائے ہوئے بھی تھے۔ رات کا پہلا خنک سا پہر سمندر کی نمدار بوجھل ہوا جس میں شاید برکت کے لئے ہلکا سا نمک ملا دیا ہوا تھا۔ صاف آسمان کہیں کہیں میری طرح آوارہ بادلوں کے ٹکڑے شرمیلے سے ستارے اور پیلا سا چاند۔ یہ میرے آسمانی ساتھی تھے اور زمین پہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں ٹرامیں بسیں۔ دو رویہ بڑی سی سڑک پام یوکلپٹس کے درخت [illegible] جھاڑ جھنکاڑ پتھر دھول دھواں اور غبار...... میں آگے پیچھے [illegible] دُور دُور تک اکیلا پیلی پیلی اُداس سی پول لائٹ [illegible] میں سمندر کی جانب یعنی کیماڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی تو پرانی نمائش کا بڑا سا گول چکر والا چوک بھی کچھ دُور [illegible] سامنے نظر آ رہا تھا اسے جب پار کروں گا تو پھر اصل بندر روڈ شروع ہوگا۔ میں اپنی لگن اور لگی بندھی [illegible] ردھم برقرار رکھے ہوئے [illegible] چپ چاپ [illegible] ایک بھاری بھرکم ٹرام [illegible] ہوئی گزر گئی میں اپنے قدموں پر رُک سا گیا اور سوچنے لگا کہ کیا بیہودہ سواری ہے نہ ٹرین اور نہ بس یا گاڑی۔ شاید اسی لئے اسے ٹرام کہتے ہیں [illegible] کیسا بے ہنگم اور صوتی لحاظ سے بے سُرا سا نام ہے یعنی پہلے ٹر ٹراؤ پھر ٹرام کہو—— میں دُور تک اس کی پیچھے والی [illegible] دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے گزرنے سے میری محویت کا سارا لطف غارت ہو چکا تھا جیسے طبلہ یا طاؤس اگر سُر سے اُتر جائیں تو پھر ٹھوک ٹھاک کر کھینچ تان کر سُر میں کر لئے جاتے ہیں مگر کچھ بدمزگی اور بے لطفی ضرور پیدا کر دیتے ہیں ایسے ہی مجھے خود کو دوبارہ سُر میں لانے کے لئے ہلکا سا تردد کرنا پڑا...... اب پھر میری چال چاپ اور رفتار میں ردھم سا آ گیا تھا مگر کانوں میں کچھ سُریلے تان پلٹے بھی سنائی دینے لگے۔ میں نے اب سارا دھیان کانوں پہ دھر دیا آواز کی لہروں کو بھانپتا اور ان کے بہاؤ کے رُخ کو جانچتا ہوا میں سڑک سے کچے پہ اُتر گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں مہاجروں کی آبادکاری ہو رہی تھی جہاں جدھر جس کے سینگ سمائے وہ اُدھر بیٹھ گیا تھا۔ جگہ جگہ جھونپڑیاں جھگیاں اور ٹین ٹاٹ کے گھروندے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ پرانی نمائش کا آدھے سے زیادہ علاقہ غیر آباد کچی پچی جھاڑیوں کھڈوں اور غیر ہموار بیکار سی زمین پہ مشتمل تھا۔ قائداعظمؒ کے مزار والا علاقہ بھی ایسا ہی غیر آباد نیم جنگل سا تھا...... یہ طبلے سارنگیوں کی آوازیں بھی یا کے

جانب کی کسی جھونپڑپٹی سے آ رہی تھیں۔ ذرا اور آگے بڑھا تو سازوں کی آوازوں کے ساتھ اب قوالوں کے قول قلبانے بھی سنائی دینے لگے...... میں جماندرو بلا کا کن رسیا! نماز جنازہ پہ جاتے جاتے اگر راستے میں کہیں سا رے گا ما کی بھنک پڑ جائے تو رُخ بدل جاتا ہے اور یہاں تو معاملہ ہی اپنے ہاتھ تھا...... اب میں ایک کچی بستی میں داخل ہو چکا تھا۔ ریت کے بلاکوں سے تیار کئے ہوئے چھوٹے چھوٹے ڈربہ نما جھونپڑے بغیر کسی نقشے یا پلاننگ بنے عجیب سے بے ڈھنگے بے ترتیب مکان نالیاں موریاں راستے۔ یعنی یہ جیسے فری لینڈ تھی اور کسی محکمے اصول قانون کا یہاں کوئی عمل دخل نہ ہو...... عجیب سی بات کہ میں اکیلا! یہاں سب موجود ہیں مگر میں کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ چند کتے البتہ ضرور دکھائی دیئے جو میری طرح ہی شاید فالتو قسم کے تھے۔ کام نہ کاج کے دشمن اناج کے...... میں نے ان کا نوٹس لیا نہ انہوں نے مجھے درخورِ اعتنا سمجھا تھا۔ وہ میرے لئے بے ضرر اور میں ان کے لئے بیکار کہ انہوں نے مجھ اول جلول کو دیکھ کر ہلکی سی بھوں بھی ضائع کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اس بستی کی اس عسرت مزاجی اور غربت کشی پہ غور کرتا ہوا ذرا اور آگے بڑھا تو ایکدم سماع کا سارا لشکر جیسے میرے سر پہ آ رہا ہے۔ چند قدم آگے موڑ مڑتے ہی سامنے جیسے یکبھی جنوں کی ٹیچ چڑھی ہوئی ہو۔ کھلے میدان میں شامیانے لگے تھے۔ ایک جم غفیر جس کے آگے آگے سبز چوغے میں ملبوس سفید براق داڑھی والے ایک پیر مرد دائیں جانب متعدد باریش نورانی چہروں والے بزرگ اور بائیں طرف قوال حضرات معہ سازندے جنہوں نے اپنے آلاتِ غناء اپنی کمر سے کسے باندھے ہوئے تھے اور پیچھے مریدین یا سامعین کا لاؤ لشکر...... وہ میری جانب بڑھتے چلے آ رہے ہیں دو چار گیس ہنڈولوں والے بھی روشنی کے لئے ساتھ تھے۔ میں یہ نظارہ دیکھ کر ٹھٹک کر ایک گلی کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ قوالوں نے ''ترک بچہ'' یعنی امیر خسروؒ کو ہی چھیڑا ہوا تھا......

اک ہندو بچہ ہیں کہ عجب حُسن دھرے چھے
بروقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو ایک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ''ارے رام ترک کائیں کرے چھے''

میرے کان کلام پہ پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں اس ''قافلہ قیل و قالاں'' پہ جمی ہوئی تھیں لحظہ لحظہ میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نیم اندھیرے میں ایسی آڑ لے کر کھڑا تھا کہ کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا پھر بھی احتیاطاً میں مزید آڑ میں ہو گیا تا کہ یہ بھلے لوگ جہاں جا رہے ہیں مجھے دیکھے بغیر گزر جائیں۔ پھر کہوں گا کہ یہ عجیب سی بستی تھی کہ میرے علاوہ کوئی بھی ذی نفس مجھے کہیں نظر نہ آیا یا

شاید سب ہی وہاں سماع میں چلے گئے تھے۔ پھر بھی کوئی بچہ یا عورت' کوئی بوڑھا بوڑھی' کوئی تو ہوتا جو میرے اس وہم کی نفی کرتا کہ یہ جنوں کی بستی نہیں ہے...... وہ لوگ اب بالکل ہی میرے سر پہ پہنچ گئے تھے۔ قوال بھی کلام سے آگے حاصلِ کلام اور سازندے بھی ''سازم ساعق'' پہ بھڑکے ہوئے تھے۔ میں اس یقین میں تھا کہ وہ مجھے بالکل نہیں دیکھ سکتے پر کیا کیجئے' یہاں تو ہوتا ہی وہی ہے جو وہم وگمان میں نہیں ہوتا اور وہ کچھ بالکل ہی نہیں وقوع پذیر ہوتا جس کے ہونے پہ یقین و ایمان ہوتا ہے۔ یعنی وہ سارے عین گلی کے منہ پہ آبراجمان ہوئے' قوالوں نے خوب دھاڑ دھاڑ اور سازندوں نے خوب پھاڑ پھاڑ طبلے بجائے۔ اشعار کی تھوڑی سی تکرار کے بعد جب معاملہ قدرے واپس سم پہ آیا تو ان سبز چولے والے پیر مرد نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر میرے گلے گلابوں کے ہار ڈال دیئے اور پھر مجھے سینے لگا کر معانقہ فرمایا۔ ادھر میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں' میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس گلی یا جہاں میں کھڑا ہوں' وہاں ان کے پیر کا کوئی مزار وغیرہ ہوگا اور وہ سب یہاں چوکی بھرنے یا چادر چڑھانے آئے ہیں...... اب مریدوں نے آگے بڑھ بڑھ کر میرے سر پہ سے ریزگاری وار وار کر قوالوں کو دینا شروع کر دی۔ جب یہ سلسلہ بھی مدھم پڑا تو پیر صاحب نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ کر لیا...... نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' عجب ضیق میں جان پھنس چکی تھی۔ [illegible] شامیانوں والی جگہ پہ لے جا کر اپنے ہاتھوں سے مار کریں گے اور پہلا پتھر بھی سبز چوغے والے پیر مرد ماریں گے جنہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی مگر شفقت سے تھاما ہوا تھا۔ سمجھ سے بالا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے' کیا سارے جہاں کے پیروں' فقیروں' درویشوں کی نظریں مجھ عاجز پہ ہی جمی ہوئی ہیں یا پھر وہ کون سی گیدڑ سنگھی میرے نیفے میں اڑسی ہوئی ہے جو یہ سب مجھ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟...... اب واپسی شروع ہو کر ختم ہونے والی تھی' قدم بہ قدم شامیانے اور میدان کے پاس پہنچنے والے تھے۔ مردوں کی جگہ عورتیں اور قوالوں کی جگہ ڈومنیاں ہوتیں تو یہی دکھائی دیتا کہ لڑکے والے مہندی لے کر لڑکی کے گھر آ رہے ہیں...... خیر' یہاں پہنچے تو پہلے گل نچھاور ہوئے' پھر عطر پاشی کی گئی۔ بڑی عقیدت و احترام سے نمایاں جگہ پہ بٹھایا گیا۔ پیچھے آرام دہ تکیئے' نیچے صاف ستھری سفید چادریں' آداب والے لوگ' بیٹھتے ہی پیر مرد نے ہاتھ کے اشارے سے قوالوں کو سانس درست کرنے کا اشارہ دیا۔ ایک دم جیسے سکون سا لوٹ آیا ہو۔ سماع یا سخن' محبت یا مخاصمت ایک حد' ایک سطح اور ایک وقت تک مزہ دیتی ہے۔ غیر مناسب اور بے توازن کی بیشی اس کے لطف' اس کی لذت اور اس کی لطافت کو غارت کر دیتی ہے...... پیر مرد کے اشارے پہ فوراً ٹھنڈے میٹھے مشروبات پیش کر دیئے گئے۔ میں چونکہ پیر مرد کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اس لحاظ سے ابتدا پیر مرد اور مجھ سے ہوئی۔

جب سب حاضرین تک مشروبات پہنچ گئے تو باآوازِ بلند "بسم اللہ" ہوئی۔ پہلا گھونٹ جو حلق سے نیچے اُترا تو چودہ طبق روشن ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ عجیب سا سواد جیسے بھنگ ہوتی ہے بے مزہ' کسیلی سی۔ کوار گندل' سونف' خشک دھنیا' بس ایسا کوئی ذائقہ تھا لیکن بے حد زُود اثر' قوت بخش اور فرحت انگیز...... سب ہی "بسم اللہ' الحمدُ للہ" کہتے ہوئے پی رہے تھے' میں بھی چڑھا گیا۔ اچانک پیر مرد میرے دائیں کان میں گویا ہوئے۔

"بیٹا! تردد مت کرو' یہ مشروب طیب ہے۔ ذائقہ اس لئے جُداگانہ سا لگا کہ تم نے یہ کبھی پیا ہی نہیں۔ یہ جَو، ستو، کلونجی کے بیج، دھنیا مقشر اور شکر سے بنتا ہے۔ معدے' مثانے' دماغ اور مزاج کی گرمی کے لئے اکسیر ہے......"

دو پیالے پینے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ رہا سہا بخار' مزاج کی تلخی' تھکاوٹ اور کسلمندی سب رفوچکر ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعی اپنے آپ کو چاق و چوبند سا محسوس کر رہا تھا۔ اسی وقفے میں یہ اعلان بھی ہوا کہ جو ساتھی طہارت و وضو سے فارغ ہونا چاہیں' وہ دس منٹ میں تیار ہو کر واپس یہیں پہنچ جائیں۔ میں بھی وضو کر کے واپس اپنی جگہ پہ پہنچ گیا۔ اب پنڈال کو خالی تین اطراف سے بھی قناتوں سے بند کر دیا گیا' روشنیاں مدھم [illegible] ایک دبلے لاغر سے بزرگ انتہائی عجز و انکسار سے اُٹھے اور سُورۂ جن کی تلاوت شروع کر دی...... میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے...... الٰہی! یہ سورۂ جن کی تلاوت کرنے کا کون سا مقام ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی بھی خوشی کی تقریب ہو' واسطے برکت و سعادت تلاوت کا مقام بنایا جائے تو قاری سُورۂ یٰسین شروع کر دے......

تلاوت تو تلاوت ہی ہے' اللہ کا کلام ہے۔ کہیں سے بھی تلاوت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر موقع محل کا خیال بھی کر لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوتا ہے...... تلاوت کے بعد پیر مرد اپنی اُوپر والی قباء اُتار کر حلقے کے درمیان استادہ ہو گئے۔ دو لمبی لمبی کالی چادریں ان کی کمر کے گرد آدھی آدھی گانٹھ دے کر باندھ دی گئیں' یوں کہ ان کے چاروں پلّو برابر ہو گئے۔ اب چادروں کے پلوؤں کا کراس سا بنا کر چار چار مُریدوں نے پکڑ لیا۔ وہ پیر مرد درمیان میں ڈھیلے سے بندھے ہوئے تھے۔ روشنیاں مزید کم کر دی گئیں۔ اب پیر مرد نے "الف' لام' میم" کا نعرہ بلند کیا اور پلّو تھامے ہوئے سولہ افراد نے "تیری رضا' میری تسلیم" دُہرایا۔ پھر پیر مرد کہتے' وہ دُہراتے اور ساتھ ساتھ ایک قدم آگے بھی بڑھاتے لیکن چادروں کے پلوؤں کا کراس اور تناؤ برقرار رہتا۔ اسی لحاظ سے پیر مرد بھی ایک قدم سیدھی جانب گھوم جاتے۔ بڑے ذکر اذکار جہری خفی دیکھے سنے اور خود بھی کئے مگر یہ استادہ ہو کر "الف' لام' میم" کا ذکرِ جہر پہلی مرتبہ دیکھا۔ ذکر کی لے کبھی تیز ہو جاتی

اور کبھی اُتر لیتی۔ پندرہ بیس منٹ بعد پیرِ مرد بیٹھ جاتے اور مُریدین پلّو چھوڑ کر اپنی اپنی جگہ واپس چلے جاتے۔ دو منٹ بعد سولہ مُریدوں کا نیا گروپ آ جاتا اور پھر وہی سلسلہ ـــ اس دوران دیگر تمام مُرید یا حاضرین سر جھکائے اُن کے ساتھ ''تیری رضا' میری تسلیم'' پڑھتے رہتے۔ میرا بھی یہی حال ہو گیا۔ پہلے تو میں بغور دیکھتا رہا' پھر ان سب کے ساتھ شامل ہو گیا یعنی انہی کے رنگ میں رنگا گیا۔ کوئی دو اڑھائی گھنٹے بعد میری باری بھی آ گئی تھی۔ میں بھی پلّو پکڑنے والوں، چاروں میں ایک تھا' اب تو مجھے خوب پریکٹس ہو چکی تھی۔ درمیان میں چکّی کی طرح پیرِ مرد نے ''الف' لام' میم'' کہا اور میں نے پہلی مرتبہ ''تیری رضا' میری تسلیم'' کہا۔ ہم پلّو پکڑ چکّی کے پاٹ کی مانند دائرے میں گھوم رہے تھے۔ خدا جانے گھومتے گھومتے میں کہیں گم ہو گیا یا سمے کا سبھاؤ کُھل گیا تھا۔ شعور و ادراک کا جیسے تالی راز کُھل گیا ہو' یادداشت جیسے کسی گہرے کھڈ میں گر کر ختم ہو گئی ہو۔ یہ بھی یاد ہے کہ ہم سب نے وہیں پنڈال میں انہی پیرِ مرد کی اقتداء میں نمازِ فجر ادا کی تھی۔ اس سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کیا ہوا' کیا بیتی' کچھ یاد نہیں۔ میرے علاوہ شاید سب ہی نارمل تھے۔ کانوں میں بات چیت کی آوازیں آ رہی ہیں' چلتے پھرتے لوگ محسوس ہو رہے ہیں لیکن جسم' ذہن' دل جیسے کسی سردخانے میں لگے ہوئے ہوں۔ نہ بولنے' کچھ کہنے کی سکت اور نہ حرکت و جنبش کا یارا...... ہاں ناشتہ میں نے کیا۔ مشروب کی مانند وہ بھی عجیب سا تھا۔ بڑے بڑے گول پیالوں میں جیسے [illegible] اور اوپر گاڑھی سی آش' ساتھ جو کی بھوسی سمیت تنوری روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ اس کے بعد چراغوں میں جیسے روشنی نہ رہی' یوں کھلواڑہ اُجڑا کہ جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات گئی' بات گئی والا معاملہ ہوا۔ سورج کے اُجالے سے پیشتر رات کے ہر قصہ کہانی کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔

میں اسی میدان میں ایک اینٹوں کے ڈھیر پہ بیٹھا بیتی شب کی ایک ایک کارگزاری کو یاد کر رہا تھا جو اب وہم و خیال بن چکی تھیں۔ میں اس ساری کتھا کہانی کو خواب تسلیم کر لیتا اگر میرے گلے میں پڑے ہوئے گلابوں کے ہاروں والے دھاگوں کے ساتھ مُرجھائے ہوئے شگوفے اور ڈنٹھل نہ ہوتے' میری قمیض کی سامنے والی جیب میں پھولوں کی پتیاں پڑی ہوئی نہ ہوتیں...... میں اینٹوں کے ڈھیر سے اُٹھا' وہاں سے اس گلی تک گیا جہاں میں آڑ لے کر چھپا کھڑا تھا۔ پھر میدان میں آیا مگر نہ کوئی شامیانوں اور قناتوں کے کھڑے کرنے کے نشان' نہ زمین میں کیل کِلّے گاڑنے کا سُراغ' نہ کوئی پھول پتی...... الٰہی! یہ کیا اسرار تھا؟ سامنے والے جھونپڑے سے ایک دھان پان سا آدمی باہر نکلا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

''بزرگوار، یہاں رات کو محفلِ سماع تھی اور ایک برگزیدہ سے بزرگ بھی......''

وہ میرا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

''اماں' باؤلا ہو گیا ہے کیا...... کیسی محفل اور کیسا بزرگ......؟''

وہ مجھ پہ لاپروائی سے نظر ڈالتا ہوا دوسری جانب نکل گیا...... ساتھ والی گلی سے ایک بابو ٹائپ لڑکا نظر آیا' میں نے اسے جا پکڑا۔

''بھائی صاحب! اس میدان میں رات کو کوئی ذکر و سماع کی مجلس تھی...... ایک بزرگ جو پیر نظر آتے تھے' میں نے اُن سے ملنا ہے......''

پہلے تو اس نے مجھے سر سے پاؤں تک نگاہوں سے نکالا' پھر زیرِ لب ایک ''ہلکی'' سی نکالتے ہوئے میری بات کا جواب دیئے بغیر یہ کہتا ہوا چل دیا۔

''اللہ خیر کرے' صبح صبح ہی ایک چریا ٹکرا ہے......''

اب میری تسلی ہو گئی کہ میرے ساتھ رات ہاتھ ہو گیا ہے' یہ سوچتے ہی ٹانگیں کانپنے لگیں...... آخر میں بھی اس بابو کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ کچھ دُور جا کر مُڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں بھی اس کے پیچھے آ رہا ہوں تو اس نے اپنی رفتار بھی قدرے بڑھا دی۔ ذرا آگے جا کر اس نے پھر میری جانب دیکھا' میں [illegible] لینے کی خاطر اسے ہاتھ [illegible] کا اشارہ کیا مگر وہ تیزی سے ساتھ والی گلی میں گھس گیا۔ میں [illegible] جہاں پہنچا...... ذرا آگے ایک کھولی نما مکان سا نظر آیا' ساتھ ایک [illegible] چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ ایک مسکین صورت غریب سے مولوی صاحب چند بچوں کو سامنے بٹھائے ناظرہ القرآن پڑھا رہے تھے۔ بچوں کی شکلوں اور لباس حلیے سے پتا چلتا تھا کہ یہ کوئی انتہائی مفلوک الحال بستی ہے اور میں اس نیت سے اس کے پاس جا کھڑا ہوا کہ یہ ایک شریف آدمی دکھائی دیتا ہے۔ چلو' اس سے ہی رات والے جھگڑے پہ بات کر کے دیکھو۔ مولوی آدمی ہے' ہو سکتا ہے کہ صُوفی نُوردین کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہو جن کے پاس میری تسلیم و رضا والی امانت ہے۔ یہیں پر یہ بھی یاد آیا کہ رات بھی کوئی تسلیم و رضا والی بات ہوئی تھی۔ دماغ پہ زور دیا تو ''الف لام میم' تیری رضا میری تسلیم'' یاد آ گیا۔ یہیں کھڑے کھڑے میں نے یونہی ''الف لام میم' تیری رضا میری تسلیم'' دُہرانا شروع کر دیا کہ خُوب اچھا رٹا لگا لوں تا کہ بھول نہ جاؤں۔ میں اندھا دُھند دُہرائے جا رہا تھا۔ نہ جانے پھر کیا ہوا کہ میں وہیں مسجد یا مکتب کے بیچوں بیچ اسی رات والے انداز میں گھومنے لگا۔ بچیاں' بچے مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ مولوی صاحب نے انہیں ڈانٹ کر چُپ کروایا اور ہاتھ میں چھڑی لئے میرے قریب آ کر قہر بھری نظروں سے مجھے گُھورنے لگے۔ وہ شاید میرے ورد ''الف لام میم' تیری رضا میری تسلیم'' پہ بھی کچھ گہرا غور کر رہے تھے لیکن وہ تو محض مولوی صاحب تھے۔ الفاظ کے ہجے تالو حلق اور نوک زبان سے صحیح نکلوانے والے اور یہاں تو ازل و اَبد کے درمیان جو کچھ بھی ہے' اِن کے مخفف

مخفی حُروف تھے کلیجہ کٹوانے اور حلق سے چیخیں نکلوانے والے۔ یہ انہیں کیا سمجھ پاتے...... میں نے مدرسے میں دو چار چکر اسی والہانہ انداز میں لئے تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آخر کار چھڑی آگے بڑھا کر قدرے تلخی سے بولے۔

''اے چھوکرے! یہ تو مکتب میں کیا اُوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا ہے......؟''

میں چھڑی اور اِن کی کڑی بات کو کب خاطر میں لاتا' اپنی موج میں لگا رہا۔ مکتب کی کوئی باقاعدہ چاردیواری تو تھی نہیں' بس کچی پکی باڑھ سی بنی ہوئی تھی۔ آنے جانے' گزرنے والے اوپن ایئر تھیٹر میں یہ ''رقصِ بالک'' دیکھنے لگے۔ مولوی صاحب کے لئے اب صُورتِ حال کو سمیٹنا ضروری ہو گیا تھا' انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے میرا بازو پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ چکر تو خیر رفو چکر ہو گئے مگر میری یا کسی کی بھی زبان کو بھلا کون روک سکا ہے۔ میری ڈیڑھ تولے کی تر تری برابر ''الف لام میم' تیری رضا میری تسلیم'' کا ورد کئے جا رہی تھی۔ راہ گیروں میں ایک بھلا سا بوڑھا آگے بڑھ کر پوچھنے لگا۔

''ہاں' صوفی جی! یہ لونڈا کیا کہہ رہیا اے......؟''

اب پہلے صوفی جی یا مولوی صاحب کو [illegible] اپنا قول [illegible] چکا تھا۔

''صوفی نُوردین...... صوفی نُوردین...... صوفی نُوردین......''

اب مولوی صاحب بولے۔ ''خود دیکھ لو بھیاً' عبدالجبار! پہلے کوئی ''الف لام میم اور رضا تسلیم'' کا ورد کر رہا تھا' اب تمہارے صُوفی کہنے پہ صُوفی نُوردین کی رٹ شروع ہو گئی ہے......''

اب ہمت کر کے ایک اور جوان قریب آ گیا' اپنی رائے دینے لگا۔

''تاؤ! مجھے تو کوئی کھوپڑی سے کھِسکا ہوا لگے ہے......''

ایک اور بولا۔ ''ہاں' بھیاً! آج کل یہ مغز کی بیماری عام ہووے ہے' اپنے جمن کا لونڈا بھی ایسی ہی واہی تباہی بکے ہے......''

بہرحال' ان تین چار شریف آدمیوں نے مجھے سمیٹ سمٹا کر چٹائی پہ لٹا دیا۔ استنجے والے مٹی کے لوٹے سے پانی لے کر میرے مُنہ پہ دو چار چھپاکے مارے۔ ایک تلوے سہلانے بیٹھ گیا' ایک پیچھے گردن اور شانے دابنے لگا۔ مولوی صاحب نے زیرِ لب کچھ پڑھ کر دو چار سڑی سی پھونکیں بھی ماریں' ظاہر ہے کہ ایسی خاطر تواضع پہ مجھے اب ہوش میں آ جانا چاہئے تھا اور میں آ گیا بلکہ باقاعدہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بِٹ بِٹ اپنے گرد لگے ہوئے تماشے کو دیکھنے لگا...... وہ پہلے والا بوڑھا غور سے مجھے دیکھتے ہوئے انکشاف کرنے لگا۔

''صوفی جی! مجھے تو یہ کورنگی والے مجّو حجّام کا لونڈا لگے ہے...... مجّو کی ہمشیرہ ادھر ہی کہیں رہتی ہے' یہ

ہی کو ملنے اِدھر آیا ہوگا۔ مجّو کو بھی پرانی مرگی کی کسر ہے...... ہاں بھیا! باپ پہ پُوت پتا پہ گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا"...... وہ اپنا پُرانا جُوتا اُتارتے ہوئے بولا۔ "یہ اِسے سنگھاؤ! ابھی لونڈا ہوش پکڑے گا......"

اِدھر میں نے جوتے کی جو حالت دیکھی تو پورے پورے ہوش پکڑ لیے بلکہ میں نے باقاعدہ مولوی صاحب کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی قسم! میں مجّو حجّام کو جانتا تک نہیں اور نہ ہی مجھے مرگی کے دورے پڑتے ہیں...... میں تو صوفی نُوردین صاحب کو تلاش کرتا ہوا آپ کے پاس پہنچا تھا' بس تھکاوٹ اور پریشانی کی وجہ سے مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا......؟"

اب پھر وہی جوتی سنگھانے کا مشورہ دینے والا بوڑھا بولا۔

"یہ صوفی نُوردین' نُورجہاں والے تو نہیں......؟"

"نُورجہاں والے......!" میں نے زیرِ لب دُہرایا اور فوراً اِن کی غلط فہمی رفع کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی' طبلہ بجانے والے نہیں۔ وہ تو تسلیم و رضا والے صوفی صاحب ہیں......"

بوڑھے نے میری بات کا مزہ لے کر زور سے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے ایک دھول جمائی' پھر میری کلائی تھامتے ہوئے بولا۔

"آؤ بھیا! میں تمہیں اُن کا راستہ دکھاتا ہوں......"

اس کو کہتے ہیں آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا...... میں راستے میں پھر جھنجھلایا۔

"بزرگوار! میں نے صوفی نُوردین کے پاس جانا ہے۔ آپ مجھے کسی غلط صوفی نُوردین کے پاس لے جا رہے ہیں' اُن کا میڈم نُورجہاں سے کوئی تعلق نہیں......"

وہ میری بات کو سُنی اَن سُنی کرتا ہوا بڑی لاپروائی سے بولا۔

"بھیا! تم مانو یا نہ مانو پر میں خوب جانوں کہ تمہیں مرگی کی تھوڑی بہت کسر ضرور ہے اور مجّو نائی سے بھی تمہارا کچھ نہ کچھ تعلق موجود ہے......"

"میری اس بات سے مجّو نائی اور مرگی کا کیا تعلق بنتا ہے؟"

میں نے ایک قدم پہ رُکتے ہوئے کہا تو وہ دو قدم آگے رُکتے ہوئے بولا۔

"تم نے دو مرتبہ کہا کہ صُوفی نُوردین کا نُورجہاں سے کوئی تعلق نہیں جبکہ وہ سراپا نُورجہاں ہے اور تم نے یہ کہا کہ وہ تسلیم و رضا والے ہیں تو یہ بالکل درُست ہے۔ اب بولو کہ تم نے نُورجہاں والے صُوفی نُوردین کے پاس جانا ہے یا تسلیم رضا کے...... تسلیم اور رضا' اِن کے دونوں بیٹے اِن کے ساتھ ہی کام

کرتے ہیں۔ ان سے بھی مل لینا......"

میں پھر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کون سے تسلیم و رضا بتا رہے ہیں؟...... اب کے اس بوڑھے نے مضبوطی سے میری کلائی پکڑتے ہوئے ڈانٹ سی پلائی اور کہا۔

"مجو کے بچو! اگر اب تم نے کوئی مرگی والی حرکت کی تو ایک چھانپڑ جما دوں گا...... ٹھنڈے ٹرام سٹاپ تک چلتے چلو۔ میں کنڈیکٹر کو سمجھا دوں گا' وہ تمہیں نیپیئر روڈ کے پاس اُتار دے گا۔ وہاں کسی بھلے مانس سے دارالسلام ہوٹل کا معلوم کر لینا۔ اس ہوٹل کے پاس پہنچ کر کسی سے صوفی نوردین کی بجائے نُور جہاں خرادیہ کا پوچھ لینا' تمہیں انہیں تلاش کرنے میں کوئی وقت نہیں ہو گی...... وہاں پہنچ کر میرا اسلام بھی کہنا' کہنا کہ مطیع الرحمٰن آشفتہ انبالوی نے سلام عرض کیا ہے......"

● آواز دے کہاں ہے......!

واقعی مجھے وہاں پہنچنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں ٹھیک ان کی ناک کے نیچے کھڑا تھا۔ ایک پرانی طرز کی بلڈنگ کے نیچے ایک درمیانی سی دوکان اور ایک چھوٹی سی خراد مشین نصب تھی۔ مشین کے عین اوپر ایک پہیہ گھوم رہا تھا جس پہ چڑھی بیلٹ اس مشین کو چلا رہی تھی۔ جب اس مشین کو ذرا سی ذرا روکنے کی ضرورت ہوتی تو اوپر لگے ہوئے لیور کو حرکت دی جاتی اور مشین چلتے چلتے رُک جاتی۔ مشین کو روکنے والے لیور کے ساتھ ہی ایک پرانا سا ٹیپ ریکارڈر بھی لٹکا ہوا تھا۔ نور جہاں اپنی آفاقی آواز میں نغمہ الاپ رہی تھی کہ اگر یہ دونوں "تو" یعنی نوشاد اور نُور جہاں' اس سرمدی آہنگ و کیفیت والے نغمے کو تخلیق نہ کرتے تو شاید یہ دونوں "تو" آج نوشاد اور نُور جہاں نہ ہوتے...... خراد کے چکے میں ایک پیتل کا سریا گھوم رہا تھا۔ ایک دُبلا پتلا' لاغر لمبا سا شخص بڑے انہماک اور مشاقی سے فٹ بال میں ہَوا بھرنے والے پمپ کے آگے والے نپل بنا رہا تھا۔ میں ایک آڑ لے کر اس پُراسرار شخص کو دیکھنے لگا جو میرے اعصاب پہ سوار ہو گیا تھا۔ سوچنے لگا کہ یہ دہاڑی دار ٹائپ' بنگالیوں کی طرح ٹھوڑی پہ داڑھی کے نام پہ گنتی کے چند بال لگے' دو دانتوں تلے دبی اَدھ جلی بجھی ہوئی بیڑی۔ اُلجھا اُلجھا' پریشان حال' نُور جہاں کے گانے میں پھنسا ہوا' پاپی پیٹ کے ہاتھوں شکنجہ جنجال میں کَسا ہوا مجھے بھلا کیا تسلیم و رضا سکھائے گا؟ تب کھٹ سے اس بوڑھے کی بات یاد آ گئی جس نے اپنا نام شاید مطیع الرحمٰن شگفتہ یا آشفتہ' آگے شاید گڑبڑ گھوٹالہ' شاید انبالوی بتایا تھا کہ تسلیم اور رضا دونوں بھائی بھی اِدھر باپ کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں...... دونوں

تسلیم و رضا کی بات لے کر آیا تھا اور یہاں کون سے تسلیم و رضا نکلے؟...... اب میں انہیں تلاش کرنے لگا۔ کھڑکی کا ذرا زاویہ بدل کر اندر دیکھا تو واقعی خراد مشین کی دوسری جانب دو کچے سے بچے زمین پہ دھرنا دیئے بیٹھے کسی کی رگڑائی کر رہے تھے اور اِدھر مشین کا شور میڈم کی آواز کے ساتھ ایسے تال میل سے ہم آہنگ تھا جیسے یہ مشین بھی آرکسٹرا کا ایک نمایاں ساز ہو۔ اس نغمے میں ایک وجدانی کیفیت بھی موجود ہے مگر اس کیفیت سے کماحقہ لطف و لذّت اور لنک لینے کے لئے بندے کا صحیح معنوں میں "عشق پراگندہ" ہونا ضروری ہے۔ وہ شہیدِ شوقِ وصل ...... تنہائیوں اور شب خیزیوں کا خُوگر ہو تب وہ اس کی اصل رُوح سے روشناس ہو سکتا ہے......

آواز دے کہاں ہے' دُنیا میری جواں ہے؟

آ' رات جا رہی ہے جیسے چاندنی کی بارات جا رہی ہے

چلنے کو اب فلک سے تاروں کا کارواں ہے

دُنیا میری جواں ہے

- الوہیت کا سرمدی نغمہ......!

دن کا پہلا پہر تھا مگر اس نغمے نے جیسے وقت اور زماں کی ہیئت کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ موسم' وقت' زمانہ' کیفیات' نیکی بدی' گناہ و ثواب' خوبصورتی بدصورتی' رنگ ڈھنگ' سب انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں اور صرف انہیں کھوجنے' برتنے کا ہُنر آنا چاہیئے۔ انسان چاہے تو وقت کی لگام کھینچ کر اسے الف کھڑا کر سکتا ہے' زمانے کی رفتار کو روک کر اسے پتھر سِل کر سکتا ہے۔ ماضی کو پلٹ سکتا ہے' مردہ تن خاک سے وہی حیات و نمو پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے رُوبرُو کائنات کے سارے اجزاء اپنے خواص ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ ان کے اُصولوں' طریقوں اور سرشتوں کو بدل سکتا ہے بس بات وہی ہے کہ اس میں محنت ہے ذرا محنت زیادہ...... محض نماز روزے' حج' زکوٰۃ سے ہی کام نہیں بنتا۔ یہ بنیادی فرائض میں شامل ہیں' اصل بات تو آگے ہے۔ وہ ہے خود کو پہچاننا اور پھر اپنے رَبّ کی خوشنودی تک رسائی حاصل کرنا اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں حضورِ اقدس ﷺ کا راستہ اور قرآن الحکیم کی راہنمائی درکار ہوتی ہے۔ اُن تک رسائی کے لئے ہمیں نبی پاکؐ کے وارثوں کا دامن پکڑنا پڑتا ہے اور وہ ہیں اہلِ بیت' اولیائے کرام اور صوفیائے کبار۔ بس انہی سہ اصناف میں ہمیں قُدوۃ الواصلین' زبدۃ الکاملین' قُطب الوقت اور علمائے عاملین

کی جستجو و تلاش رہے گی۔ یہ برگزیدہ میر النفس ہستیاں ہر زمانے میں موجود ہوتی ہیں' کوئی دور و وقت ان ذاتِ قدسیہ صفات سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔

ان نادر الوجود ہستیوں میں چند ایک اقسام ہیں جیسے کچھ عافیت پسند ہوتے ہیں اور کچھ اذیت خو۔ عافیت چار حالتوں میں رہتی ہے۔ انسان گم نامی کی زندگی بسر کرے' یہ ممکن نہ ہو تو گوشہ نشین ہو جائے۔ یہ بھی راس نہ آئے تو مکمل چُپ اور خاموشی اختیار کر لے۔ یہاں بھی بات نہ بنے تو پھر آخری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ کسی درویش کے قدموں میں جا بیٹھے یعنی صحبتِ سعید' مجلسِ صلحاء اختیار کرے۔ اب رہی اذیت پسندی' تو اس کی بھی چار ہی حالتیں ہیں۔ اولاً" یہ دُنیا اور علائق دُنیا میں گھس اور پھنس کر اپنے دینی' علمی' رُوحانی اور باطنی مشاغل اور اعمال کو برقرار رکھے اور کسی کو اپنے معاملات کی بھنک تک نہ پڑنے دے۔ ثانیاً یہ صورت اختیار میں نہ رہے تو دنیا برائے احتیاجِ ضرورت و حاجت رکھے اور دینی' رُوحانی مشاغل کی جانب رجوع کر لے۔ ثالثاً قطعی تارک الدُنیا ہو جائے اور ہمہ تن رجوع من اللہ اور اللہ کی مخلوق کے لئے خود کو وقف کر دے۔ رابعاً صورت سب سے زیادہ اذیت ناک اور مشکل ہوتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے اندر گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لے۔ اپنے پاؤں کو کُھلا چھوڑ دے۔ جو راستہ سامنے آ جائے اسی کا راہی بن جائے۔ [illegible] خلش' خوف' ہر تردد سے خود کو ناآشنا کر لے۔ اپنے ظاہر باطن کو مشیتِ ایزدی کے سپرد کر کے فارغ ہو جائے۔ ترکِ تعلقات' ترکِ خواہشات' ترکِ وطن' ترکِ سود و زیاں۔ جنت و دوزخ' تعزیر و تکریم' جزا سزا سب کچھ اپنے ربّ پہ چھوڑ دے۔ شریعت کی پابندی کرے اور اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور اس کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے وقف کر دے۔ اللہ کی زمین' کائنات' سلطنت میں گھومے۔ ہر چیز پہ غور' تجسس اور تفکر کرے۔ اپنی ضرورتوں کو کم سے کم اور اپنے لئے رزقِ حلال خود اپنے دست و بازو سے کمائے۔ کسی سے کسی دُنیاوی چیز کا طلبگار اور خواہشمند نہ ہو۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کام اپنے ہاتھوں سرانجام دینے میں عار و ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔ چھوٹی بڑی ہر قسم کی علت کی ذلت سے خود کو بچائے رکھے۔ کچھ اللہ والے اس مقام سے بھی دو قدم آگے ہوتے ہیں' ان کا باوا آدم ہی نرالا ہوتا ہے۔ یہ بظاہر حدودِ شریعت سے باہر نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ ہر علت' حد اور حرکت دکھائی دیتی ہے جو کسی کو فاسق' فاجر اور فارغ و فاتر العقل دیوانہ کہلانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ان کے پیشِ نظر شاید یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر عمل کرو جو اچھائی' نیکی اور راستی کی ضد ہو تاکہ تم دُنیا کے شر اور نگاہوں سے خود کو بچا سکو۔ یعنی ناپسندیدہ کام و حرکات کا ارتکاب کرو اور اچھائیاں' نیکیاں' بھلائیاں' دیگر عبادات کو پردۂ نہاں میں رکھو تاکہ تکبر' غرور' دکھاوے اور ریا کی غلاظت سے محفوظ

کسی کو دکھانے کے لئے نمازیں مت پڑھو۔ نیکیاں بھلائیاں اس لئے مت کرو کہ لوگ تمہیں متقی اور پرہیزگار سمجھیں۔ تسبیح داڑھیاں ماتھے کے نشان مت اچھالو۔ یہ سب چھپانے کی چیزیں ہیں انہیں خالص اپنے مالک کے لئے رکھو کہ وہی سب عبادتوں، تعریفوں، تعظیموں اور تکریموں کے لائق ہے۔ قتیل کہتے ہیں

دل میں رکھنے کی چیز ہے غم عشق
اس کو ہرگز نہ برملا کہئے

جیسے اگر کسی کو خیرات زکوٰۃ دو، کسی کی مدد کرو تو ایسے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ کسی پہ احسان کرو تو جتا مت ایسا نہ ہو کہ تم اجر سے محروم کر دیئے جاؤ۔ لوگوں پہ احسان کرو تاکہ کل وہ مالک کل تم پہ بھی اپنا احسان کرے۔ بھوکوں کو کھانا، پیاسوں کو پانی، مستحق حاجت مندوں کی حاجت روائی، یتیموں کے سروں پہ ہاتھ رکھو۔ خدمت اور عزت کرنے والوں پہ مہربان رہو تاکہ تم دین و دنیا میں فلاح پاؤ۔ بیشک وہ نیتوں کی اور بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ یہ ملامتی لوگ بظاہر ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے والا ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کرتا۔ بظاہر مست، نشے میں دھت، بے نمازی، گندے پلید اور جاہل و کاہل دکھائی دیتے ہیں مگر خبردار رہو کہ یہ بڑے دانا اور اندر سے بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ عقلمند ہوشیار دانا [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنی برائیاں دنیا والوں کو ہی لوٹا کر اور ان سے اپنے لئے لعن طعن لے کر بڑے خوش ہوتے ہیں تاکہ دنیا انہیں برا کہے اور اچھا مالک و خالق ان سے راضی رہے۔ یہ حال مست، اعمال مست، ہست مست، الست مست، کچھ مشاہدہ ذات میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں، کچھ مظاہر کائنات میں مگن ہوتے ہیں اور کچھ محو ذکر حق میں ہُو ہُو ہوتے ہیں۔ ان مقامات اور مدارج پہ یہ دُنیا ان کے لئے ایک پَشّے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی چہ جائیکہ وہ دُنیا کو دیکھیں اور دُنیا داروں کی پرواہ کریں۔...... یہ کچھ اجمال و احوال اس غرض سے دیا گیا تاکہ جن بزرگوں اور مست الست اللہ کے بندوں کا ذکر ہوا، کچھ ان کے بارے میں سمجھا جا سکے۔ ایک اور سوال بھی ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ آخر میرے ساتھ ہی کیوں پیش آتا تھا یا میں ہی کیوں نشانے پہ تھا؟...... یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو یہ واقعات مختلف اوقات اور ادوار کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ میٹھی یا گندی چیز پہ ہی مکھی بیٹھتی ہے، خوبصورتی پہ اچھی بری نظر ٹکتی ہے۔ جس چہرے کا کوئی تل کسی موزوں جگہ پہ بہار دکھا رہا ہوگا تو ہر کوئی نگاہ جما کر اس کی زیارت کرے گا۔ کسی کے نقش، نین، زلفیں، قد و قامت، گفتار، رفتار میں کوئی گوناگوں خیر و خوبی ہوگی تو لوگ بھی اس خوباں کو دیکھیں گے۔ میری پیشانی اور پیش ذات میں بھی کچھ "ذوات شریف" نے کچھ اشرفیاں ظاہریں ٹھونکی

ہوئی تھیں' بس جوہری اسے دیکھ لیتے تھے۔ یہ کمپیوٹر' یہ وائرلیس' کارڈلیس' انٹرنیٹ' ای میل' پیجر' موبائل' انٹرکام آج ایجاد ہوئے ہیں مگر یہ تو روزِ اوّل سے کام کر رہے ہیں۔ انسانی گرفت و دانست میں بڑی معمولی مقدار میں آج آئے ہیں اور ہم بڑے اینٹھتے پھرتے ہیں کہ ہم نے بڑی ترقی کر لی۔ اس سے کہیں زیادہ عروج و ترقی تو یونانیوں' مصریوں' سمیریوں' بابلیوں' آشوریوں' فارسیوں اور عربوں کے بچوں نے صدیوں پہلے حاصل کر لی تھی۔ بڑے بڑے ہیئت اور ریاضی دان' کیمیا دان' حکمت دان' ماہرِ تنجیم اور فلاسفر آج بھی موجود ہیں لیکن فیثا غورث' فارابی' افلاطون' سقراط' بقراط' ابن الہیثم' ابن سینا' عمر خیام' ابن رشد' لقمان جیسا کیا آج کوئی ہے؟..... فقیروں' درویشوں کے ذروں کے ٹکڑے آج کے سائنس دانوں سے زیادہ علم و ادراک رکھتے تھے اور رکھتے ہیں' ان کے غلاموں کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ درویش کو چپ لگ جاتی ہے۔ کرامتیں' معجزے' تصرفات یعنی اظہارِ ذات و صفات وہ کبھی سامنے نہیں لاتا' اس معاملے میں وہ اجتناب و حجاب برتتا ہے۔ وہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کا راستہ کھوٹا کرنے والی ہیں۔ وہ مشیتِ ایزدی کے آگے دخل در معقولات نہیں کرتا' راضی برضا رہنا ہی اس کا مقصد و منتہا ہوتا ہے۔

● تسلیم و رضا ریت وقت

بات صوفی نوردین' نورجہاں کی ہو رہی تھی جو خراد مشین پہ کام بھی کر رہے تھے اور نورجہاں کے نغمے سے بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ تسلیم و رضا دونوں اپنی اپنی دھن میں اپنے کام کر رہے تھے اور میں بیک وقت سامنے دیکھ اور سن بھی رہا تھا' اپنے آپ میں ڈوبا ہوا یہ سوچ بھی رہا کہ ان چاروں "نو" کو کس انداز میں سمیٹوں' برتوں' تولوں کہ بالآخر خیر نکل آئے۔ پہلا "نو" نوشاد کا' دوسرا "نو" نورجہان' تیسرا "نو" صوفی نوردین کا اور چوتھا "نو" مجھ ایسے نو آموز' نووارد' نوخیز' نوگرفتار' نومشق اور جاہل جبلوٹے کا...... سوچ رہا تھا کہ ادھر گانا ختم ہو تو ادھر میں اپنا راگ کہیں سے شروع کروں۔ اسی دوران ایک چائے والا لونڈا ایک کنڈی کی چینک' تین چار گلاس اور ایک روغنی کاغذ میں لپٹے ہوئے ہوا کیک لے کر دوکان میں داخل ہوا۔ میں سنبھل گیا کہ لو اب صوفی صاحب مشین بند کر دیں گے اور چائے پئیں گے اور اس دوران میں بھی اپنا جی تل لوں گا مگر تو بہ کیجئے کہ وہاں کچھ ہوا ہو۔ لونڈا چائے' کیک لوہے کی ایک لنگڑی سی کرسی پہ دھر کر چلا گیا تھا۔ چینک کی ٹونٹی میں اخباری کاغذ کی پھریری سی ٹھنسی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مکھیوں کے کئی ایک کیک والے ہو گئے اور دو چار دس منٹ اوپر نیچے گزر گئے... یا رازق! یہ لوگ چائے کیک کی جانب متوجہ

یہ نہیں ہوتے' چائے جوشاندہ بنانے کے لئے یہاں دھری ہوئی ہے؟...... رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ کمبخت نے تخمین کے اوپر والے لیور پہ الٹا سا ہاتھ پڑا'' کاروانِ شوق'' رُک سا گیا تھا اور ادھر میرا ابھی دورانِ خون تھم گیا کہ دیکھیں' اب کیا پردۂ غیب سے ظہور پذیر ہوتا ہے؟...... صوفی صاحب آستین مزید اڑس کر تخمین کی حدود سے یوں باہر نکلے جیسے خشک سالی کی زد میں آئے ہوئے نیستاں میں لاغر سا شیر اپنے کچھار سے نکلتا ہے' پیچھے پیچھے شیر کے چھوٹے چھوٹے'' شیر خانے'' یعنی تسلیم و رضا بھی نکل آئے۔ میلے چیکٹ سے کپڑے پہنے دونوں شہزادے مؤدب سے صوفی صاحب کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ صوفی صاحب نے تخت کی چھوٹی چھوٹی گلاسیوں میں شربتی سی چائے انڈیلی' کیک کا گھونگھٹ سرکایا اور یہیں میری زبان منہ میں پھرنے لگی تھی۔ لاکھ پیٹ بھرا ہوا ہو پھر بھی کہیں کھانے پینے کی کوئی چیز سامنے دکھائی پڑ جائے تو زبان گیلی ہونے لگتی ہے اور چائے پھر کڑاہی میں یہ تو مشروب ہی ایسا ہے کہ جسے چکھنے کے لئے کسی موسم یا صحت کی طلب کی قطعی ضرورت نہیں۔ نیند' موت اور صوم و صلوٰۃ کے علاوہ ہے ہر وقت' ہر جگہ پیا جاتا ہے...... اب چائے سامنے دھری ہے' کیک کے ٹکڑے بھی کاغذ پہ پڑے ہیں۔ تینوں چائے پی رہے ہیں اور ساتھ ہی کچھ کھا رہے ہیں۔ میں ٹکٹکی باندھے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ چائے کے دور تین ہی ہو جانے چاہئیں بعد کیک کے ٹکڑوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ یہ دیکھ کے میری تو آنکھیں پھٹ گئیں کہ یہاں بندے تو تین ہیں' یہ چار گلاس اور کیک؟ ...... یہی سوچتے سوچتے میں نے جو نظریں اوپر اٹھائیں تو دیکھا کہ صوفی صاحب میری جانب ہی دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظریں مجھے جیسے کہہ رہی ہوں......

'' ادھر آ اے او چاک گریباں والے...... مت فرار ہونے کی سوچ'' ڈوری کھینچنے سے کانا لگی ہوئی پتنگ جیسے ڈوری کی جانب بے اختیار کھنچی چلی جاتی ہے۔ اب میں سلام کرنے کے بعد سکول سے بھاگے ہوئے کسی بزدل لڑکے کی مانند ان کے روبرو سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ مجھے نگاہوں سے نکالتے ہوئے انہوں نے ''وعلیکم السلام'' اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا جیسے کوئی قرضدار' قرض خواہ کو قرض کی رقم قسطوں میں برباد کر کے دیتا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شیر کی دھاڑ سنائی دی۔

'' یہ چائے اور کیک ٹھونسو گے بھی یا یونہی انہیں پڑے پڑے غارت کرواؤ گے......''

میں نے ہڑبڑا کر کانپتے ہاتھوں سے گلاس پکڑ کر چائے سڑکنا شروع کر دی۔ وہ کیک بڑھاتے ہوئے اب قدرے نرمی سے بولے۔

'' لو یہ بھی کھاؤ......''

دونوں تسلیم و رضا بھی کیک کے ٹکڑے چائے میں بھگو بھگو کر کھانے لگے۔ میں نے چائے کی گلاس

کو مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا' مبادا صوفی جی کی کسی دھاڑ سے کہیں ہاتھ سے چھوٹ جائے کراچی کے لوگوں کی طرح یہاں کی چائے بھی مختلف ہوتی ہے۔ پنجاب میں تو چائے کو صرف چند ابالے دیئے جاتے ہیں جبکہ کراچی میں چائے کو خوب رگڑا اور چھینٹا لگایا جاتا ہے کیونکہ یہ اکثر پوڈر والے دودھ سے بنائی جاتی ہے۔ اس کی پھیکی اور پھٹے دودھ جیسے سواد کو مارنے کے لئے شاید اس میں قلمی چھکڑی اور پھٹ پوٹاش بھی ملائی جاتی ہو جبکہ آدھ انچ موٹی ملائی والی سنگھاڑا پوڈر چائے چینک سے باہر یعنی گلاس اور کپوں میں ملتی ہے۔ کراچی کی چائے کا ذائقہ یوں سمجھئے کہ آپ نے دیواروں والے ایمولشن پینٹ کے نیم خالی ڈبے میں چورا چائے چھڑکی (چینی کے نام کا تکلف بھی برتا اور پھر چولہے پہ ایک آدھ جوش بھی دے دیا۔ پھر وہ تیجھٹ نوش جاں کرلی تو جانئے کہ آپ نے کراچی کی چائے پینے کا اعزاز حاصل کرلیا' بس اتنی سی احتیاط یہ ملحوظ رکھ لیں کہ رنگ والا خالی ڈبا وائٹ یا آف وائٹ طرز کا ہی ہو۔ خدانخواستہ اگر ڈبا گلابی یا حنائی رنگوں والا نکل آیا تو عین ممکن ہے کہ وہاں کشمیری یا تھیپیائی چائے بن جائے۔ چھوٹی چھوٹی گلاسیوں میں بمشکل دو دو گھونٹ چائے کہ تیج سے حلق تک گیلا نہ ہو۔ اگر یہی دو گھونٹ گرم گرم ہوں تو تب بھی چار چھ چسکیوں سے چائے نوشی کا چسکا پورا کر لیتے ہیں اور اگر یہی دو گھونٹ جیسے چائے اپنی گی ٹھنڈی کو اجنبی ... نام کے دو گھونٹ کسی مجبور' معذور اور مقروض کے جذبات کی طرح ٹھنڈے ٹھار ہو چکے تھے۔ میں تو خیر انہیں صوفی صاحب کے مزاج و مقام کی گرمی اور ٹھنڈی کی آمیزش سے بہرطور پی گیا جبکہ تسلیم و رضا بھی چپ چاپ بے حس و بے زباں سے اپنی گلاسیاں ختم کر گئے۔ چائے اور کیک کا ٹکڑا پیٹ میں اتر چکے تھے۔ تسلیم و رضا اٹھے اور دوکان کے اندر اپنے اپنے ٹھکانے پہ چلے گئے۔ میں کسی نائی یا نکاح خواں کے آگے بیٹھے ہوئے پینڈو کی طرح اپنی پت کو پتلا کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ صوفی صاحب نے کان میں انگلی دے کر جماہی سنا ڈالی!

دنیا میں جتنی بھی علتیں اور نشے "دھواں کش" اور "انگار رس" قسم کے ہیں' میری دانست میں ان میں سب سے کثیر المقاصد جو نشہ یا علت ہے' وہ پتا بیڑی ہے کہ دمڑی میں بیڑیوں کی گٹھڑی مل جاتی ہے۔ پوروں سے بیڑے کو کھول لو تو مغز تنباکو جتنا تمباکو بھی ہاتھ نہ لگے۔ پتے کے ٹکڑے کو پھیلا کر دیکھو تو کچے کے پتے کا رقبہ بھی برآمد نہ ہو' اسے شعلہ دکھا کر دہکا لو تو ہونٹوں کو "زبردستی" کرتے ہوئے لات کھتی ہے' دم احتیاط سے کھینچنا پڑتا ہے کہ کہیں معصومہ کا دم ہی نہ نکل جائے۔ اسی لئے حق اہل کریم النفس دم کش حضرات اس کے تخم سے بند لبوں کو جلتی ہوئی ماچس کی تیلی سے چھیڑ کر کھولتے ہیں۔

[illegible] منہ شرم سے گلنار ہو جاتا ہے تو پھر بڑے پیار سے وہ چار تا ہو تو ڑ قسم کے بوسے لے کر اسے اپنی [illegible] میں اڑس لیتے ہیں۔ یہ کان میں اڑسی ہوئی ''گل نکوٹین'' کی بھینی بھینی مہک سے ''صاحب دم مارو [illegible] جان کو معطر و معطر کرتی رہتی ہے۔ یقین جانیں کہ اسے ہونٹوں سے لگانے، دانتوں تلے دبانے [illegible] چبانے سے مطلق کوئی نقصان یا اندیشۂ ٹی بی و سرطان نہیں ہوتا کیونکہ اس ڈومونجی کلموہی میں وہ [illegible] ہی نہیں ہوتا جو پھیپھڑوں پھپھولوں کی پھوڑ پھاڑ کرے۔ بیڑی اپنے خفیف و نحیف وجود میں [illegible] خواص بھی رکھتی ہے۔ ادھ جلی بیڑی کے بن جلے حصے سے کان کا میل آسانی سے باہر آ جاتا ہے [illegible] سے آپ دانتوں میں پھنسے ہوئے بوٹی اور جڑی کے ریشے نکال سکتے ہیں جو حلیم کھاتے ہوئے [illegible] ان میں پھنسے رہ گئے تھے۔ بغلوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان کھجلی خارش کا سدباب کیا جا [illegible] کراچی کے مشہور شہنائی نواز استاد خدا بخش نیسونند و ادم والے تو ادھ جلی بیڑی سے شہنائی میں [illegible] یعنی ''جیبھ'' کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ مرحوم کہا کرتے تھے کہ ادھ جلی بیڑی سے شہنائی [illegible] ہے۔ پرانے بوڑھے کہتے ہیں کہ آنکھوں میں اندھراتا ہو، پڑوال پڑتے ہوں، پپوٹے متورم [illegible] رنگت بگڑتے ہوں، ڈورے کھنچ توڑتے ہوں یا [illegible] بھی بھر آتی ہو تو [illegible] اپنے کھوسٹ [illegible] کے [illegible] سے افاقہ ہوتا ہے۔ ہاتھ کا کچا ہو اور کبھی بیڑی [illegible] بھی اگر کچھ نرمی پکڑ گیا ہو تو رات سوتے سے اس بیڑی کے کونے کو دونوں آنکھوں میں ایک [illegible] سے دوسرے کونے تک پھیر لیا جائے تو آنکھوں کی جملہ عوارض کے لیے اکسیر اور مجرب ہے۔

بات دراصل صوفی صاحب کی بیڑی سے شروع ہوئی تھی اور کھینچتے کھینچتے یہاں تک آ پہنچی۔ ان کا [illegible] بھی بیڑی کے دھوئیں سے ہی معلوم ہوا ورنہ میں تو گردن ڈالے اپنے پاؤں کے گندے بڑھے [illegible] دیکھ رہا تھا۔ بیڑی کا پھنکی بھر تمبا کو تو شاید پہلے ایک آدھ کش میں ہی بھسم ہو جاتا ہے باقی سواد [illegible] حقے کے پانی کی طرح خالی خشک پتے کے تپنے سلگنے کا ہی ہوتا ہے۔ بیڑی باز بھی جان گیا ہوتا ہے کہ [illegible] محض علت مارنے کی عادت پوری کر رہا ہوں اندر سے اصل میں تمک گئی ہوئی ہے۔ صوفی صاحب [illegible] شاید بیڑی کا وہ بچا یا انگلیوں میں مسل دیا تھا جس کے بارے میں سائنس دان انگشت بدنداں [illegible] بیڑی باز یہ ڈیڑھ دو سینٹی میٹر بیڑی کا سلگتا ہوا ٹکڑا پکڑتے کس طرح ہیں اور اسے ہونٹوں سے لگا کر [illegible] کھینچتے ہیں؟

''ابے لمڈے! کیا پاؤں تلے تیل نکل آیا ہے جو برابر دیکھے جاوے ہو؟'' ایک دم انہوں [illegible] داغ دیا تھا۔

''نا...... ناخن دیکھ رہا ہوں......''

میں نے بھی بنا سوچے سمجھے وہی بتا دیا جو میں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا جواب سن کر یوں بھڑکے جیسے شُرلی پٹاخا آگ دکھانے سے بھڑک اُٹھتا ہے۔

''نالائق' نانہجار' نامعقول! تم ''نا'' ہی کا نذرانہ لے کر آئے ہو' ''ن'' ہی کھندا ہوا ہے میرے نصیبوں میں...... جواب کیا دیا...... ''نا...... خن...... ''پہلے ہی ''نا!''...... تجھے اتھیں تو ''جی'' کہنے سیکھنے کے لئے اِدھر بھیجا تھا۔''

میں نے حواس باختہ سا ہو کر جواب دیا۔ ''نہیں جی' میں نے ''نا' نہیں کی...... ناخن کہا تھا''

اُنہوں نے زور سے زانو پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ناخلف! پھر نہیں کہا۔'' اے ناسمجھ! ناخن میں پہلے 'نا' ہی لگتا ہے......''

اب میں اپنے الفاظ پہ غور کرنے لگا' واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اپنے کان کھینچتے ہوئے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں......''

اب [illegible] اور سے پھر وہی نا......

''ہائے' کیا کروں۔ آج تو بجلی گری ہے...... نومبر کا مہینہ' نو تاریخ۔ یہ نو بجے کا عالم' نوروز بلڈنگ کی یہ نونمبر دوکان۔ نورجہاں' نوشاد' نوردین...... چائے کیک سمیت نو آنے کا بل...... میں اپنی خوارگی والی عادت سے مجبور ہو کر پھر بول اٹھا۔ ''یہ تو سارے 'نو' ہیں' 'نا' تو نہیں ہیں' صوفی جی......''

''ہائے ہائے' ناعلم بچے! اگر محض اے بی سی کا قاعدہ وہی پڑھنے کی تہمت لے لی ہوتی تو آج تجھے اتنی انگریزی تو سمجھ میں آتی کہ ''نو'' کا مطلب ''نا'' ہی ہوتا ہے...... ہائے ہائے' کیسے نامحرموں سے واسطہ پڑ گیا۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بھی اُٹھنے کا اشارہ دیتے ہوئے بولے۔ ''اُٹھ' سر جھکائے ہوئے حالت میں رُخ بدل اور گن کر نو قدم آگے بڑھ اور پھر سر اُٹھا' دیکھ کہ کدھر راستہ صاف ہے...... بھاگ کر دیکھا یا کبھی پھر اِدھر دکھائی پڑا تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا......''

کیا ستارہ ہے کہ گردش سے نکلتا ہی نہیں...... اے مالک ارض و سما! بے شک تیری سلطنت [illegible] وسیع ہے' اس میں بے سہاروں کے لئے بڑی گنجائشیں ہیں۔ تو میرے حال پہ رحم فرما...... اب میں نے من و عن وہی کیا جو صوفی جی نے بتایا تھا۔ سر جھکائے ہوئے کھڑے پاؤں پہ پلٹا' نو قدم گن کر آگے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو دائیں جانب راستہ صاف ستھرا پایا' اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ مڑ کر تو

…سامنے سے سرپٹ آتی ہوئی گدھا ریڑھی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ بالکل ٹھک سا ہوا۔ میں نیچے، گدھا اوپر۔ گاڑی بان بھی تھا، وہ اپنی زبان میں پتہ نہیں کیا کچھ کہتا رہا...... وہی ہوا جو اس طرح کی باتوں میں ہوتا ہے، …نے والا زخمی ہوتا ہے۔ میں تو پہلے ہی بر ہا، بخار اور بحران سے ہلکان تھا، میرا تو بھرکس نکل گیا۔ پنڈلی … چھیلے گئے، ایک دو رگڑیں پیٹ پہ بھی پڑیں، باقی بچ بچا ہو گیا۔ گدھا گاڑی کے ''ڈرائیور جی'' نے مجھے دوتی آنی تھماتے ہوئے کہا۔

''ہلدی یا ریوڑیاں کھا لینے ہے اور آئندہ سمجھداری سے کام لینا'، گدھا ریڑھی والوں سے اتنی …ڈی ملے گی..... آئندہ پروگرام ہو تو کوئی اچھی سی گاڑی دیکھنا لیکن اس کے آگے گدھا نہیں بلکہ فورسلنڈر … ہونا چاہئے..... سمجھے!'' پھر آنکھ دبا کر رازداری کے انداز میں کہنے لگا۔ ''اگر موٹر چلانے والی کوئی میم صاحبہ ہو تو دو چار روپے مرہم پٹی کے لئے مل جاتے ہیں......'' پھر وہ مجھے پکارتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''تمہارا باپ اور بڑا بھائی بھی یہی دھندا کرتے ہوں گے، کل ان سے پوچھ کر بتانا، دھندے پہ نکلنا کے … بڑی گاڑی کا کیا ریٹ ہے۔ ادھر تو یہی آنی دونی ہے......''

وہ مجھے حیران و ششدر سا چھوڑ کر … دوکان کے سامنے … مجھے باہر … دیکھا تو مارے غضب کے … بند کر کے باہر نکل آئے، … چڑھائی کرنے لگے۔

''نابکار! … کی مانند تھوبڑا اٹھائے چلا آیا ہے؟..... سنا نہیں تھا جو میں نے کہا تھا کہ اگر … ادھر رخ کیا تو ہڈی پسلی ایک''

میں نے ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی آستین اور پائنچے چڑھا کر بازو اور ٹانگ ننگے کر کے … کر دیئے۔ ٹانگ پہ کھوتے کے کھر سے ایک لمبا سا سرخ نیلا نشان پڑا ہوا تھا جبکہ بازو اور گھٹنے پہ رگڑ … زخم سے خون کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے، کالی قمیض اور پاجامے پہ جابجا دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ میں یوں دکھا رہا تھا جیسے کوئی اپنی اعلیٰ کارکردگی دکھا کر کسی انعام و تحسین کا مستحق ہوتا … ہو اور وہ بھی یوں ملاحظہ کر رہے تھے جیسے کسی نئے ناواقف درزی کے ہاں اپنے سلے ہوئے کپڑوں کی … اور ناکارہ پائی دیکھ رہے ہوں، قدرے توقف سے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''ٹیکی لاگے! ناخن کی بجائے ''آخون'' کہتے ہوئے بجیا آتی تھی یا … راہ میں پڑتے تھے؟'' … کے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے بولے۔ ''آجا اندر، نحوست، تھکے، نکھٹے!''

مجھے ایسے کوسنے پڑ رہے تھے جیسے گلی کوچوں میں اپنے گھروں کی چوکھٹوں پہ بیٹھنے والی روایتی مائیں

اپنے لاڈلوں کے لتے لیتی ہیں۔ مَیں بھی اندر بھیتر چھپکے چھپکے لُطف لے رہا تھا' ایسا آخون یعنی اُستاد' رہبر جو دوست بھی اور دشمن بھی لگے' باپ کی ڈپٹ بھی دے اور ماں سی ممتا بھی وارے' کہاں ملتا ہے؟......

مَیں نے ابھی تک ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا تھا' بس اب وہی کہے بولے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ایک میلی سی کپڑے کی پوٹلی بھگو بھگو کر میرے زخموں پہ ٹنکچر بھی لگاتے جا رہے تھے۔

''نحوستے' پتا نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں......'' وہ پاؤں کے زخم کو پولے پولے سہلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''خدائی مارے گدھوے نے پورا کُھر ہی چڑھا دیا ہے......'' پھر وہ میرے سَر پہ اِک دھول جماتے ہوئے بولے۔ ''ناصبورے' تو ہی ویدے کھول دیکھ لیتا کہ گدھا گاڑی آ رہی ہے۔ شرُول شپّ کھیلنا ہو تو سڑکوں پہ نہیں' میدانوں میں کھیلتے ہیں......''

مَیں کیا جواب دیتا' مَیں تو مُنہ بند رکھنے کا اِرادہ کئے ہوئے تھا ورنہ اُن کی بات ہی پلٹ کر یہ دیتا کہ حضرت! آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ مُنہ اٹھا کر بھاگ لے۔ خبردار' جو واپس پلٹا یا کہیں دکھائی دیا' ہڈی پسلی ایک کر دوں گا...... یہ سوچا ہی تھا کہ ایک دھول گُدّی پہ اور پڑی۔

''ناہنجار! اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیچ سڑک سے بھاگ...... ارے بوم کی دُم! تو فٹ پاتھ پہ بھی بھاگ سکتا تھا' گدھا گاڑی اُدھر کو چڑھنے سے رہی......''

دھول دھپے' کوسنے' ٹنکچر' مرہم پٹی کر کے اُنہوں نے پھر مجھے گرم گرم چائے پلوائی۔ دو گولیاں اور پانی کا پیالہ دیتے ہوئے کہا۔

''یہ گولیاں دو گھونٹ پانی سے نگل لے اور اندر وہ لکڑی کے تختے پہ نماز پڑھنے کی چٹائی پہ دو گھڑی سکون لے لے' طبیعت بحال ہو جائے گی......''

طبیعت اندر پہنچ کر بحال تو بھلا کیا ہوتی' بُرا حال بہرحال ہو گئی۔ نیچے لکڑی کا تختہ' جسم جب ہلکا سا ٹھنڈا پڑا تو رگڑ اور زخموں کی جگہوں سے ٹیسیں نکلنے لگیں' بدن اکڑنے لگا۔ مَرے کو مارے شاہ مدار' پہلے ہی کئی روز سے مرا مرا یا ہوا تھا اور اب یہاں آتے ہی اَولے پڑ گئے...... شہزادے اپنے کام میں مگن تھے۔ اُنہوں نے نہ تو میری جانب کسی لگاوٹ سے نگاہ کی اور نہ ہی ہم عمر ہونے کے ناتے کوئی دلچسپی دکھائی۔ اس عمر میں نوعمروں کی طبیعت اور مزاج میں جو فطری چلبلا پن' حرکتیں اور شرارتیں ہوتی ہیں وہ شاید ان میں سرے سے ہی مفقود تھیں یا پھر صوفی صاحب کا رُعب داب اور دوکان کا سسٹم ہی ایسا تھا کہ کام' محویت اور خاموشی کے علاوہ کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ شہزادوں کی میری جانب پُشت تھی اور صوفی صاحب کی سائیڈ۔ کچھ دیر تو مَیں نشئیوں کی مانند اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر جسم سے جیسے سینک سا نکلنے لگا تھا۔ ایک دو

ہلکے ہلکے نیند کے ہلکورے سے لگے اور پپوٹوں کے شٹر آپ ہی آپ گر گئے۔ ظہر کی نماز سے کچھ پہلے ایک شہزادے نے مجھے جگایا۔ میرے اُٹھ بیٹھتے ہی صوفی صاحب نے مشین بند کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

''بھیا! یہ دوکان ہے۔ پنڈت رام دیال کا اناتھ آشرم یا مولوی معزالدین سُورتی کا سرائے خانہ نہیں ہے جو پاؤں پسارے لمبی تانے سوئے پڑے ہو...... اُٹھو جاگو موہن پیارے! سامنے مسجد میں بڑے بڑے بچھونے ہیں......''

میرے ابھی حواس ہی سیدھے نہیں ہوئے تھے۔ میں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ایک دو جمائیاں توڑتے ہوئے پھر نیم دراز سا ہو گیا جیسے اکثر بچے بیدار ہوتے سمے کرتے ہیں۔ سونے سے پہلے بیدار حواس کو تھپک تھپک' بہلا پھسلا کر سُلانا پڑتا ہے جبکہ بیدار ہونے کے کافی دیر بعد تک سوئے کھوئے اعصاب وحواس کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اکٹھا کرنا پڑتا ہے بلکہ پانی کے چھینٹے اور دھمکیاں تک برداشت کر کے بالآخر اُٹھنا ہی پڑتا ہے یعنی سونے سے پہلے جاگنا بہر طور بڑا جوکھم کا کام ہے...... میں یہاں دوکان میں بھول ہی گیا تھا کہ میں کہاں ہوں' کون اور کیا ہوں؟ اپنی ذات اور اوقات کا صحیح ادراک ایک عدد پُرانے جوتے سے ہوا جو صاحب سے مجھ پر پڑا تھا' اس مقام سے بالشت بھر نیچے گُدّی والی جگہ تھی جہاں وجود کے اثرات بھی موجود تھے۔ پُرانے چام کا جوتا پڑتے ہی میں چلاتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ نیند تو جیسے کافور بن کر اُڑ گئی' درد بھی جیسے غائب ہو گیا تھا اور میں اپنے حواسوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایک ہاتھ دُکھتے سر پہ اور دُوجا ہاتھ زمین پہ ٹکتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُٹھتے اُٹھتے صوفی صاحب نے ایک بھرپور ہاتھ مزید جما دیا۔ ہائے ستم کہ یہ دستِ جفا بھی وہیں پڑا جہاں گُدّی کے گوشت پر ٹھونچا لگا یا تھا' ٹیس کی اِک لہر نے مجھے دوہرا کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ تیسرا ہاتھ بھی مجھ پہ پڑتا' میں ہلکی سی زقند لگا کر' مشین سے ٹکراتا ہوا دوکان سے باہر تھا۔ اب نہ سمت کا تعین' نہ تن وتوش کی ہوش۔ ننگے پاؤں' مُنہ اُٹھائے فٹ پاتھ پہ سرپٹ بھاگے جا رہا تھا اور صوفی صاحب جوتا لہراتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے تھے۔

''گھر کے نہ گھاٹ کے' قطب صاحب کی لاٹ کے...... بڑاوؤں کی مانند آویں' چھلاووں کی طرح بھاگ لیں۔ کہویں ہیں' تسلیم ورضا سیکھیں گے...... کہا کہ ''ناں'' مت کہنا پر ناں ناں ہی رٹے جاوے۔ پھر کہا کہ اُٹھ نماز سَر لگی ہے' کیا مجال جو بُدھی میں آئی ہو۔ اُٹھ کر دوبارہ لیٹ گیا مرُدوا......''

ایسی ہی آوازیں میرے کانوں پڑ رہی تھیں۔ وہ ہانپتے ہانپتے پیچھے رُک گئے تھے' میں بھی سانس درست کرنے کی غرض سے ٹھہر گیا۔ پھر مڑ کر دیکھا تو جوتے والا ہاتھ لہرا لہرا کر مجھے کوسنے دے رہے تھے۔ میں اب چونکہ اُن کی دست اندازی سے قدرے باہر تھا اس لئے پاس ہی ایک دوکان کے تھڑے پہ

ہانپتا ہانپتا بیٹھ گیا۔ یہ کسی دھوبی کی دوکان تھی جو سڑک کی جانب رُخ رکھے' کپڑے اُستری کر رہا تھا' ظاہر ہے کہ اُس نے یہ تماشا بھی دوسرے لوگوں کی طرح دیکھا ہوگا۔ اب صوفی صاحب واپس پلٹ رہے تھے مگر وہ چلتے چلتے بھی مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھتے جاتے تھے اور جوتے والا ہاتھ لہرا لہرا کر کچھ کہتے بھی جا رہے تھے جو یقیناً یہی کچھ ہوگا کہ اگر تم مجھے پھر اس علاقے یا میری دوکان پہ دِکھائی دیے تو ہڈی پسلی ایک کر دوں گا...... وہ مسجد والی گلی میں مڑے تو مَیں نے بھی کچھ سکون کا سانس لیا۔ اب مَیں اپنے کسی اگلے قدم کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دھوبی پوچھنے لگا۔

''بچے! تم پنجاب سے آئے ہو......؟''

''آہو جی''...... مَیں نے پیچھے مڑ کر اس پنجابی لہجے والے شخص کو جواب دیا۔

''کس شہر سے آئے ہو......؟''

''سیالکوٹوں''......

''آجا فیر اندر لنگ آ......''

اس شخص نے کچھ ایسی اپنائیت سے یہ دعوت دی کہ مجھے اُٹھتے ہی بنی' یقیناً وہ بھی سیالکوٹیا ہی تھا۔ دوکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے غور سے دیکھا۔ پچاس پچپن کے پیٹے میں یہ شخص کچھ فربہی مائل سا تھا۔ مہندی سے رَنگے ہوئے بال' ویسی ہی سُرخ مونچھیں۔ کشادہ پیشانی اور چہرے پہ ہنسوڑپن چھلکتی ہوئی مسکراتی سی آنکھیں...... وہ خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا۔

''پُتر! مَیں کوٹلی بہرام حق سے ہوں...... تم سیالکوٹ شہر کے ہو یا کسی پنڈ سے......؟''

مَیں نے اِسے اپنا مناسب سا تعارف کرا کر پوچھا۔

''چاچا جی! آپ صوفی صاحب کو جانتے ہیں......؟''

وہ سیٹی سے انداز میں اِک عجیب سا قہقہہ لگاتے ہوئے بتانے لگا۔

''لو ہور سُنو...... ایس صُوفی نُور جہاں نُوں کون نہیں جاندا پُتر! اے بدمغزا تے سارے کراچی وچ مشہور اے...... یہ بتاؤ کہ تم اس کے پاس کیسے پھنس گئے؟''

چاچا کے ریمارکس سُن کر مَیں دوکان سے باہر آ گیا' تھڑے سے اُترنے لگا تو چاچا استری والا ہاتھ روک کر پوچھنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو...... کیا ہوا؟''

''بزرگو! آپ نے صوفی صاحب کو بدمغزا کہا ہے۔ کسی کی پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔

وہ اللہ والے بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں......"

وہ سُرخ مونچھوں کے نیچے پِھس پِھس کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔ اس کے ہنسنے کی یوں آواز آ رہی تھی جیسے سائیکل کے پہیئے کی ٹیوب سے اک دم وال نکال کر ہوا نکال دی جائے۔

"اوئے بچیا! اللہ والے اللہ کا قرآن پڑھتے اور سُنتے ہیں، ہر ویلے نور جہاں دی ریں ریں نہیں سنتے۔ میرا یقین ہے اس نے وصیت کر دی ہوگی کہ جب میرا جنازہ اُٹھے تو کلمہ شہادت کی بجائے "کیا مل گیا بھگوان غریبوں کو ستا کے، ارمانوں کی نگری میں میری آگ لگا کے" بجانا تاکہ میری رُوح کو سکون پہنچے......"

وہ مزید بتانے لگا۔ "پُتر اوئے، اللہ والے اللہ کے بندوں سے نرمی سے پیش آتے ہیں، لگا کے کھاتے ہیں۔ یہ تمک چڑھا تو ناک پہ مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا۔ اِس علاقے میں کسی سے اِس کی نہیں بنتی، نہ کوئی اِس کے پاس جاتا ہے اور نہ وہ کسی سے بات کرتا ہے، اور تو اور اس نے تو تیرے جیسے اپنے دو معصوم بچوں کا بھی سولی پر سُکھا کر رکھا ہوا ہے......"

میں نے اس کی ساری باتیں سُنیں مگر کوئی جواب دیے بغیر تھڑے سے نیچے اُتر کر پھر کسی انجانی منزل کی جانب چل پڑا۔ نہ علم کہ سامنے والا راستہ کس منزل پر ختم ہوتا ہے، نہ یہ پتا کہ کون کی راہوں سے بچھڑ کر یہاں تک پہنچا ہوں......

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے دے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

ناگہاں بغلی گلی سے اذان کی مدھم سی صدا بلند ہوئی، خیال آیا کہ صوفی صاحب نے بھی ظہر کی نماز کا کہہ کر جگایا تھا۔ قدم خود بخود ہی دائیں گلی کی جانب بڑھ گئے۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک چوک تک پہنچا، اذان کی آواز تو سُنائی دے رہی تھی مگر مسجد کہیں دِکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہیں پاس سے گزرتے ہوئے ایک بھلے سے آدمی سے مسجد کا دریافت کیا۔ اس نے مجھے اور میرے سیاہ لباس کو دیکھتے ہوئے ایک دو گلیاں اِدھر ایک پبلک سکول کے پاس مسجد کی نشاندہی کرائی۔ سکول کا پوچھتے پوچھتے بالآخر میں مسجد تک پہنچ ہی گیا مگر یہاں تو جماعت کھڑی تھی بلکہ دوسری رکعت شروع تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جو اذان میں نے سُنی تھی وہ کسی اور مسجد سے بلند ہو رہی تھی اور یہ کوئی اور مسجد تھی۔ بہرحال، بصد عُجلت وضو وغیرہ سے فارغ ہوا تو دوسری رکعت کا رکوع مل گیا لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ مسجد کسی اور مسلک والوں کی ہے...... خیر، نماز تو نماز ہے اور مالکِ مُلکِ عظیم کے لئے ہے۔ مسلک اپنے اپنے اور صوم وصلواۃ و تسبیح صرف ایک وحدہٗ لاشریک کے لئے...... نماز سے فارغ ہوا، چند لمحے سکوت کیا۔ نمازی کب کے رُخصت ہو چکے تھے۔ دو چار میرے جیسے

لاوارث و مسکین مصحف کھول کر بیٹھ گئے۔ میں اُٹھ آیا' باہر نکلا۔ میرا تو دم ہی نکل گیا۔ وہاں اجل کھڑی تھی' صوفی صاحب میرے چپل اُٹھائے خُوں بار نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ صاحب زادگان تسلیم و رضا بھی بہ رضا و رغبت' نگاہیں رُو بہ رو کئے ظلِ سُبحانی کے جلو میں اِستادہ تھے۔

''میں آپ کے باوا جی کا ملازم ہوں جو آپ سرکار کے پیزار اُٹھائے پیچھے پیچھے لُڑھکتا پھروں؟'' پھر اُنہوں نے دھڑل سے میرے چپل میرے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے اس سُرخ جوٹ والے دھوبڑے کو منہ توڑ جواب نہ دیا ہوتا تو میں تمہارے چپل تو کیا' سو جوتے بھی تمہیں مارنے کے لئے تیار نہ ہوتا...... وہ دھوبڑا بڑی بڑی باتیں کرتا ہے مائی جی (نورجہان) کے خلاف' ارے اِس کی اِستری کے دو سیالکوٹی کوئلوں کی بات نہ ہوتی تو کب کی اِستری ٹھنڈی ہوگئی ہوتی۔ بڑا آیا تمہیں میرے خلاف بہکانے والا!''

یہ میرے وہی چپل تھے جو میں افراتفری میں بھاگتے وقت اُن کی دوکان پہ ہی چھوڑ آیا تھا......

اب میں چغدوں کی مانند ہونق بنے کھڑا تھا۔ پھر دھاڑ پڑی۔

''چپل پاؤں پہنے گا یا میں تمہارے کھوپڑے پہ برساؤں؟...... بُوجھ کے نہ دیکھ کے' بکرے بڑی عید کے'' ...... پھر وہ سُرمے بھرے دیدے مٹکاتے ہوئے ڈانٹنے لگے۔ ''دوسری مرتبہ تم نے یہی حرکت کری ہے۔ پہلے گدھے پہ چڑھ کر آئے اور اب مجھ سے میرے پیچھے اکڑے ہوئے۔ میں پوچھوں ہوں' تم میرا پیچھا چھوڑو گے کہ نہیں......؟'' اب آگے بڑھ کر میرا کان پکڑ کر اینٹھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے تو میں محلّے سے نکال کر آیا تھا' بُھوت بڑا وا ہے' کیا ہے آخر......؟''

میں چُپ' سختی سے منہ بھینچے ہوئے کہ کچھ بھی ہو لے' بولوں گا نہیں۔ بڑوں کے آگے بولنا ہی سب سے بڑی بُرائی ہے' بولنے سے ہی بیسیوں بدیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک چُپ سو سُکھ...... میری خامشی پہ میرے سر پہ اِک دھول جماتے ہوئے بولے۔

''منہ میں مُور کا پنکھ پڑا ہے جو بولنے نہیں دے رہا...... بھیا! میں بکواس کر رہا ہوں جو تم جواب میں ٹالم ٹولا کر رہے ہو......؟''

اُنہوں نے چابی کی طرح پورا کان مروڑا تو میری چیخ نکل گئی' پھر منہ سے بھی نکل گیا۔

''مجھے معاف کر دیں' غلطی ہو گئی...... بتایئے' میں کہاں جاؤں؟ جدھر جاتا ہوں ہر راستہ مجھے پھر آپ کے قدموں میں لا کر پھینک دیتا ہے...... اب میں نے منہ بند کر لیا ہے' میرے منہ سے کبھی ''نا'' نہیں نکلے گی...... مجھے تو تسلیم و رضا کے لئے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے اور آپ مجھے......''

وہ مجھے خونخوار نگاہوں سے تولتے ہوئے بولے۔ ''یہ دیکھ' یہ تیرے سامنے تسلیم و رضا کھڑے ہیں۔

تُو نے اِن کے مُنہ سے کوئی شبد سُنا ہے' انہیں بات کرتے ہوئے دیکھا ہے' انہیں سر اُٹھاتے دیکھا ہے؟''

مَیں اب مُنہ سے جواب دینے کی بجائے' تربوز جیسا سر دائیں بائیں ہلا کر اُن کی بات کی تائید کر رہا تھا کہ مبادا مُنہ سے پھر کچھ نکل جائے۔ شاید اسی سَمے میری آنکھوں سے کچھ آنسو نکل آئے تھے۔ وہ میرا کان پکڑے کھڑے تھے اور مَیں اپنے ہاتھ جوڑے جُھکا کھڑا تھا۔

دیا دَر آئی یا کوئی سَمے کی کلی چٹکی...... کان چھوڑتے ہوئے بولے۔

''تجھے تسلیم و رضا سیکھنا ہے' تجھے میرے ہاں اسی لئے بھیجا گیا ہے نا......؟'' وہ کہے جا رہے تھے' مَیں بدوانے جیسا سر تائید میں ہلا رہا تھا۔ ''اچھا......'' جیسے وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''آج رات کچھ رنگ مستے میرے ہاں جمع ہو رہے ہیں' تم بھی عشاء کے بعد وہیں پہنچ جانا......''

''جی...... کہاں؟'' میرے مُنہ سے خود بخود نکل گیا۔

''رنگ چڑھے تھے؟ وہیں جہاں رات باوا کی گود میں بیٹھا کھا پی رہا تھا' کولہو کے بیل کا بچھڑا بنا گھومت رہا تھا...... الف لام میم......''

وہ مجھے ایک ڈھول جما کر' حیران ششدر سا چھوڑ کر آگے بڑھ چکے تھے...... پاس تھے۔

پوری شہر' پاؤں میں دَم' مسندری ہوا میں نم۔ جدھر رُخ ملا مرغ بادنما کی مانند اُدھر ہو لیا۔ بھوک لگی' کھا لیا۔ اذان ہوئی اور جو مسجد ملی' نماز پڑھ لی۔ بڑی بڑی بلڈنگیں' وسیع و عریض شاہراہیں' بھانت بھانت کے لوگ' طرح طرح کی زبانیں۔ سارا دن انہی میں بیت گیا۔ مغرب کی نماز میمن مسجد میں ادا کی' وہاں تو عشاء کی نماز کے بعد پہنچنے کا حکم ہوا تھا اور ابھی درمیان میں ایک زمانہ پڑا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں شل ہو گئے تھے' تھوڑی بھوک کا احساس ہوا تو وہیں صوفی صاحب کی دوکان کے قریب دارالسلام ہوٹل کا خیال آ گیا۔ صاف ستھرا نفیس ہوٹل' شور نہ کوئی شرابا۔ اندر داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پہ مالک یا منیجر بڑے وقار سے بیٹھا تھا۔ مہذب اور تربیت یافتہ عملہ' اندر داخل ہوتے ہی بڑی فرحت اور طمانیت کا احساس ہوا۔ خالی ٹیبل کے گرد بیٹھ آرام دہ کرسی پہ بیٹھ گیا۔ غیر محسوس انداز سے اردگرد کی میزوں پہ نظر دوڑائی تو اکثر لوگ پائے کھاتے دکھائی دیئے۔ بِلا کچھ سوچے سمجھے مَیں نے بھی پائے ہی منگوا لئے۔ اک عرصہ بیت گیا تھا کہ ڈھنگ اور اپنی طبیعت کے رنگ کا کھانا نہیں چکھا تھا۔ پائے بھی بڑی لذیذ نعمت ہیں' شرط یہ ہے کہ وہ کسی درویش سے بکرے کے ہوں' پکانے اور کھانے والا بھی یہی کچھ ہو تو پھر یہ بڑا مزہ دیتے ہیں۔ یوں جانئے کہ ایک ایک ٹکے پہ سمرقند و بخارا قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ٹخنے اور نلی کے درمیان کا ملائی کی مانند نرم نرم سلسلہ تو کھانے کے کام آتا ہے اور پھر وہ نلی کے اندر کا شرمیلا لُطفیلا سا مواد جو مُنہ سے کھینچنے کے بعد بھی اگر

برآمد نہ ہو تو پھر اسے دونوں ہاتھوں کے جھٹکوں سے زبردستی باہر نکالنا پڑتا ہے' بڑے کمال کا کھابہ بلکہ تجربہ ہے۔ بس ذرا کھانے کے بعد ہاتھ اُنگلیوں' مُنہ مُونچھوں' داڑھی کو عُجلت سے دُھونا' صاف کرنا پڑتا ہے......
بات دارالسلام ہوٹل کے پایوں کی ہو رہی تھی...... ایک کے بعد دوسری پلیٹ اور نلی صاف کر رہا تھا تو معاً خیال آیا کہ مزے لے لے کر کھا تو رہا ہوں' جیب میں بل چکانے کے لئے پیسے ہیں کہ نہیں؟...... ہاتھ کا لُقمہ رکھتے ہوئے میں نے جیب کی جمع پونجی باہر نکالی' چھوٹی بڑی ریزگاری کل ملا کر ایک روپیہ اڑھائی آنے اور ایک پیسہ دِکھائی دیئے...... الٰہی! تو ہی عزت رکھیو...... بڑا صاف ستھرا' قرینے سلیقے کا ہوٹل ہے۔ خدا جانے بل کتنے کا ہو؟...... اسی اُلجھن میں باقی ماندہ دو چار لُقموں کا سواد بھی مارا گیا۔ خیر' اب جو ہو' سو ہو۔ جو پیٹ پڑا' وہ تو نکلنے سے رہا اور جیب میں پڑا اب بڑھنے سے رہا...... اُٹھا' واش بیسن پہ جا کر ہاتھ مُنہ دھوئے' صاف ستھرے تولئے سے اچھی طرح خشک کئے' یہ الگ بات کہ اب بل کے خوف سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل پائی سے کسی نہ کسی طرح کاؤنٹر پہ پہنچ پایا' پیچھے سے آواز آئی۔
''ڈبل پلیٹ پایہ...... ایک روپیہ دو آنہ......'' میں نے جھٹ بند مٹھی کھول کر آگے کر دی' بل ادا کر کے میرے پاس تین پیسے بچے تھے۔ دو پیسے جیب میں رکھے' ایک بیرے کو تھما کر میں دارالسلام سے باہر نکل آیا۔

● بازارِ حُسن......!

حاشا! مجھے علم نہیں تھا کہ دارالسلام ہوٹل سے باہر نکل کر اگر تھوڑا سا آگے آ کر سڑک پار کریں تو یہ علاقہ نیپیئر روڈ یعنی کراچی کا بازارِ حُسن شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا وسیع قدیمی علاقہ ہے۔ اس زمانے میں یہ جگہ بمبئی کے فارس روڈ' دہلی کے چاوڑی بازار اور کلکتہ کے سُونو بازار حُسن کے بعد سب سے مشہور اور اہم مارکیٹ تھی۔ ناچ گانے' قحبہ گری' عصمت فروشی اور خام مال کی آمد و رفت' خرید و فروخت کا بڑا اہم مرکز تھا۔ تھیٹر اور فلم انڈسٹری کو تازہ تربیت یافتہ اور ایک سے ایک نادر گُل اندام چہرے یہیں سے سپلائی کئے جاتے تھے۔ آج بھی آپ کی فلم انڈسٹری کی چند چندے آفتاب چندے ماہتاب' عزت مآب ہیروئنز' ڈانسرز اسی بازار سے تعلق رکھتی ہیں۔ نیپیئر روڈ کے بعد لاہور کی ہیرا منڈی اور حیدرآباد قحبہ گری کے اہم قدیمی مراکز تھے۔ مجھے اس بازار کی اصل حقیقت اس وقت سجھائی دی جب میرے کانوں میں گھنگھروؤں کی چھن چھنا چھن چھن اور طبلے کی تڑک دھم' دھا دھم تڑک تڑک' کی آوازیں پڑیں۔ بڑی بڑی بلڈنگیں' فلیٹس

کئی طرح کے کمرے' بالکونیاں' مخملیں پردے' روشنیاں' دعوتِ گناہ اور اذنِ نظارہ دیتے ہوئے مومی چہرے' تھتھی جڑے لئے دیئے میں بیٹھی سروتے تھامے ہوئی نائکائیں۔ گجرے' ہار' پھول پتی۔ نوکیلی مونچھوں اور خبیث چہروں والے بھڑوے۔ بازار کے دُورویہ نیچے اُوپر' اور اُوپر یہی کچھ تھا۔ نیچے کمروں کوٹھڑیوں میں پیشہ والیاں تھیں' اوپر طرب و نشاط والیاں۔ میں بے وقوفوں کی طرح ویدے پھاڑ پھاڑ دائیں بائیں' اُوپر نیچے بنا کسی حساب و کتاب دیکھ رہا تھا۔ یہ کچھ یا ایسا کچھ میں نے پہلے لاہور بھی دیکھ رکھا تھا۔ سیالکوٹ کچہری کے پاس بھی ایسا ہی ایک قحبہ گری کا بازار تھا جسے تیل گھر کہتے تھے کیونکہ یہاں پاس ہی تیل پٹرول کا ڈپو تھا۔ وہاں بیس کوٹھڑیاں یا کمرے تھے۔ اچھی بری' کالی چٹی' بہت سی پیشہ کمانے والیاں بن سنور کر بیٹھتیں اور دیہاتیوں کو اشاروں سے پھنساتی رہتی تھیں۔ ہم سکولیے شریر لڑکے سکول آتے جاتے ہر روز تماشا کیا کرتے تھے۔ آوازے کستے اشارے کرتے مگر یہاں تو بات کچھ اور تھی۔ اوپر دیکھتے دیکھتے میری گردن دُکھنے لگی تھی' بھول وُول گیا کہ میں کون ہوں' کہاں ہوں اور مجھے عشاء کے بعد کہاں جانا ہے۔ بھول گئی تھی ...... میری ماں' میرے ابا' میری چاچی' بابا رحمت سائیں' شو سرکار اور ابھی صوفی نوردین تک بھی...... دماغ کی پلیٹ بالکل صاف تھی ...... ایک ...... تک نہیں ...... پانی ہی منہ میں ...... اونٹ کی مانند ...... کہ نظریں کہاں اور قدم کدھر ...... پہ جا رہا تھا کہ ایک آدمی سے ٹکر ہو گئی' شانے سے شانہ ٹکرایا تھا۔

"او بچے! دم لگایا ہوا ہے یا چسکی چڑھائی ہوئی ہے؟ ...... جدھر دیکھ رہا ہے ادھر روپے چلتے ہیں۔ مجھے کیا دونی چونی بھی چلے گی ......"

وہ مجھے آنکھ نکا کر آگے بڑھ گیا۔ میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اس کی بات نے مجھے یہ سوچنے پہ مجبور کر دیا کہ میں اپنی عمر اور قد و قامت کے حساب سے اس بازار میں سر اُٹھا کر چلنے کا ابھی اہل نہیں تھا۔ میں تو ابھی کچا بچہ تھا' چہرے پہ ابھی خط کا نشان تک نہ تھا۔ بظاہر تو یہی کچھ تھا۔ یہ الگ اور بالکل میری ذاتی بات تھی کہ میں اپنے اندر ہی اندر بہت دُور تک نکل گیا تھا' اتنا کہ میں خود بھی خود کو روک اور پکڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ بھلا آدمی جس سے میں ٹکرایا تھا' مجھے ایک "ٹھولا" دے کر کہیں آگے بڑھ چکا تھا مگر میں اب نظریں نیچے جھکا' چلنے لگا ...... ٹھک ...... اب ایک اور بھلا آدمی مجھ سے ٹکرا گیا تھا جو نظریں کہیں اور قدم کدھر' یعنی میرے پہلے انداز میں چل رہا تھا اب میں بولا۔

"بھائی جان! راستہ نظر میں رکھ کر چلو ......"

وہ کوئی سندھی تھا جو شاید اُردو صحیح سے سمجھ بول نہیں سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہا' میرے پلّے بھی پڑا!

کہ تم نیچے دیکھتے ہوئے چلے آرہے تھے' سامنے دیکھ کر چلو...... یا اللہ! اوپر دیکھو تو ٹکر' نیچے دیکھو تو ٹکر...... چلو اب سامنے دیکھ کر چلتے ہیں......!

سامنے دیکھا تو ایک بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا ایک عجیب سے حلیے کا لڑکا سا مجھے اشارے سے بلا رہا تھا۔ میں تو ادھر ہی جا رہا تھا' اگلے پانچ چھ قدم میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر قدرے دباتے ہوئے بولا۔

''بھیا! کالج کی چھوکری ہے' ایک دم فٹ فاٹ' انگریزی بھی بولتی ہے...... صرف چونی اور ایک آنہ میری فیس...... کیا بولتا ہے؟''

وہ میرا جواب سنے بغیر ہی میرا ہاتھ پکڑے ساتھ والی گلی میں اتر گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی جو میں اسے کہتا کہ بھائی! میں غلطی سے اس بازار سے گزرنے کی حماقت کر بیٹھا ہوں۔ میں اس راستے کا مسافر نہیں۔ میرا جسم' عمر اور جیب دیکھ لو' کہیں بھی دم نہیں مگر وہ کشاں کشاں مجھے لئے جا رہا تھا' گلی کے کونے پہ ایک کھڑکی کے سامنے رک کر بولا۔

''بھیا! میری اکنی مجھے دو...... وہ سامنے جدھر طوطے کا پنجرہ لٹکا ہوا ہے' کالج گرل تمہارا ''انتظار'' کر رہی ہے۔''

میں بمشکل اپنا خشک حلق اپنے کڑوے تھوک سے تر کرتے ہوئے ہکلایا۔

''بڑے بھائی! میری جیب میں تو اللہ نام کے دو پیسے ماتھا پھوڑنے کے لئے ہیں بس' تم اکنی' اکنی اور چونی کی بات کرتے ہو......!''

وہ بڑا مایوس سا مجھے سر سے پاؤں تک گھورنے لگا' بولا۔

''میرے باپ! تم کھالی پیلی دو پیسے لے کر ادھر عیاشی مارنے کو آیا ہے......؟'' پھر وہ مجھے سامنے ایک گلی کا نقشہ سمجھاتے ہوئے بتانے لگا۔ ''پچھلی تیسری گلی گھوم لو تو سامنے ماتھے پہ کھدڑا گلی ہے' آدھی اکنی کے ہیجڑے اُدھر ہی ملتے ہیں۔ ادھر تم کسی کا ''ٹیم'' خراب مت کرو......''

وہ مجھے اُدھر ہی پھینک کر کسی اور ''اکنی' چونی والے'' کی تلاش میں نکل گیا۔

دارالسلام کی دو پلیٹیں پائے اب اپنا کام دکھا رہے تھے' شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ آس پاس نظر دوڑائی' سامنے بلڈنگ کے کونے پہ ایک نلکا ٹپ ٹپ کرتا دکھائی دیا' ٹونٹی کی جگہ کپڑا لپٹی ہوئی ایک موٹی سی مسواک ٹھنسی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھ کر نلکے کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور کسی طرح پیاس بجھانے کا جتن کرنے لگا۔

● باجھ حضوری نہیں منظوری……!

''سی سی''……کوئی ''سی سی'' کی آواز نکال کر شاید مجھے متوجہ کر رہا تھا۔ بائیں جانب دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا' دائیں طرف دیکھا تو ساتھ والی کوٹھڑی کے دروازے کی اوٹ میں ایک سڈول سی عورت مجھے [illegible] کر رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ موٹی موٹی بولتی ہوئی غلافی آنکھیں مگر ان کے نیچے بڑے واضح [illegible] جنہیں پوڈر کی موٹی سی تہہ سے چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ بھرا بھرا سا گدرایا جسم' شوخ [illegible] لباس۔ مجھے وہ کوئی بڑی چھوٹی سطح کی پیشہ ور عورت دکھائی دی۔ میں ٹھہرا ازلی پنگا گیر۔ زہریلے [illegible] کو دم سے اُٹھانے والا' بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ اور شیر کے مُنہ میں ماتھ دینے والا! ہر وہ کام اور [illegible] جس میں خطر ہی خطر ہو۔ [illegible] رسوائی ذلت اُٹھانا' خفت اور [illegible] مول خرید کر گلے میں ڈالنا اور [illegible] اگر نصیبوں میں [illegible] یہ کچھ لکھا ہو تو اِسے کون ٹال سکتا ہے۔ کسی آبشار میں [illegible] تے ہوئے سوکھے پتے [illegible] اختیار نہ کوئی منزل…… بے اختیار سا اُٹھا اور مُنہ سیدھا کر کے اس کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچ کر [illegible] کہا۔ اُس نے راستہ چھوڑتے ہوئے بڑی [illegible] سے سلام کا جواب [illegible] ہوئے کہا اندر [illegible] بغیر سوچے سمجھے اندر داخل ہو گیا۔ [illegible] اب میں اندر کوٹھڑی یا کمرے کا جائزہ [illegible] کمرا کیا تھا' اکیلی دوکیلی مرغی بند کرنے کا ایک ڈربا سا تھا۔ تنگی تاریکی' بدبو سیلن اور گھٹن کا احساس' [illegible] مری سی یرقان زدہ روشنی کہ سراپا تو سُجھائی دے مگر خدوخال' خال خال ہی نظر آئیں۔ ڈھیلا سا پرانا' [illegible] سے دبا ہوا پلنگ جس پہ [illegible] میلی چیکٹ [illegible] کی چادر جیسے کسی خارش ماری کُتیا کی پوستین کے [illegible] ٹکڑوں کو کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ پلنگ کے عین اوپر سندھی ٹکڑا بندی کا رنگین جھالر دار ڈوری سے [illegible] والا کپڑے کا پنکھا' کمرے کے ایک کونے والے حصے میں رسّی پہ کپڑا تان کر شاید نہانے دھونے کا [illegible] کیا گیا تھا۔ مٹی کا سندھی انداز کا تنور نما مٹکا جو پانی کے لئے بطور حمام ہوتا ہے' لوٹا اور تام چینی کا بڑا [illegible] جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ بید مجنوں کی ایک لنگڑی سی آرام کرسی جس پہ پھوسڑے نکلی اُدھڑی ہوئی گدی [illegible] مریل سی بلّی بیٹھی نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے شاید یہ سوچ رہی تھی کہ یہ بچہ مکتب کی بجائے [illegible] میں کیسے آ نکلا؟…… اس نے کونے میں رکھے ہوئے ایک کوزے سے شیشے کے گلاس میں پانی [illegible] میری طرف بڑھاتے ہوئے بڑی ادا سے بولی۔

''لو یہ پانی پیو…… میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اِس نلکے سے پانی پیو……''

پانی والا گلاس ابھی اُس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ میں نے پوچھ لیا۔

"کیوں' اس پانی میں کیا خرابی تھی؟"

وہ گلاس مجھے تھما کر پیچھے کھلا دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے بولی۔ "اس نلکے میں جس بلڈنگ کی ٹنکی سے پانی آتا ہے اس بلڈنگ کی مالک ایک بردہ فروش' بیاج خور نائیکہ ہے۔ کراچی اور اس بازار میں سینکڑوں نوچیوں سے پیشہ بھی کرواتی ہے اور جس انسان کی کمائی جسم وجاں کی مشقت اور کسبِ حلال سے نہ ہو اُس کے ہاں کی ہر چیز محض مکروہ ہی نہیں' نجس بھی ہوتی ہے......"

میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس میں جیسے کوئی جوار بھاٹا اُٹھ آیا تھا' ہاتھ میں ارتعاش سا در آیا۔ پیاس وپاس غائب' میں پوری آنکھیں کھولے اس کی رگ جان کھول دینے والی بات پہ غور کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے' وہ کہاں کھڑی ہے' وہ خود کیا ہے' مجھے کیوں بلایا اور دروازہ اندر سے کیوں بند کیا؟ اس کی یہ ایمان افروز بات اور اس کے ظاہری حال و حالات میں تضاد پہ غور کر رہا تھا کہ وہ میرے شانے پہ نرم سا دباؤ ڈال کر پلنگ پہ بٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"پیاسے ہو' پانی پیو......"

اُس نے بسم اللہ کہتے ہوئی اپنے ہاتھ سے گلاس کو میرے لبوں کے قریب کر دیا۔ پانی تھا یا امرت دھارا' پہلے ہلکا [illegible] گلاس خالی کر دیا۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"اور پیو گے......؟"

میں نے زبان کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دوسرے گلاس نے مجھے خوب نہال کر دیا اور اب جیسے مجھے یقین ہونے لگا کہ اس خاتون نے جو کہا' وہ بالکل درست تھا...... زندگی میں آگے جا کر میری سمجھ میں آیا کہ جو رزق پانی' تعلق تصرف' صُحبت محبت' حرکت وعمل' علم' پیشہ تجارت آپ کو اطمینان قلب سلامتی وصالحیت' ذوقِ عبادت اور شوقِ شرافت سے آشنا کرائے وہی اللہ کی مشیت ورضا' اُس کا اجر وانعام اور فضل وکرم ہے اور جو مشاغلِ حیات اور اعمالِ ذات آپ کے اندر تمکنت اور تکبر وتفاخر پیدا کریں' اللہ اور اللہ کی مخلوق سے [illegible] دور اور [illegible] کر دیں۔ چہرے کا نور دل کا سکون چھین لیں۔ خوفِ خدا اور شرم وحیا سے بے بہرہ کر دیں' وہ سب خدا کا قہر اور عذاب ہیں۔

"خاموش کیوں ہو' کوئی بات کرو...... وقت بہت کم ہے' پندرہ یا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں تمہیں یہاں سے جانا ہوگا...... اچھا چھوڑو اسے' یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے پاس پہنچ کر کچھ سکون ملا......؟"

وہ میرے ہاتھ کو سہلا رہی تھی۔

"پہلے یہ بتائیں کہ میں یہاں زیادہ دیر کیوں نہیں رک سکتا......؟"

''اس لئے کہ یہاں کا یہی اُصول طریقہ ہے''...... وہ عارضی غسل خانہ کی دوسری جانب ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ''اس دروازے کے دوسری جانب میرا بوڑھا اپاہج شوہر چارپائی پہ پڑا ہوا ہے۔ وہ میرے دروازہ بند کرنے کی آواز سے وقت کا اندازہ لگا لیتا ہے' ٹھیک پندرہ منٹ بعد اگر اسے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز نہ آئے اور فوراً بعد میں اسے چوٹی اٹھنی نہ پکڑاؤں تو پھر مجھے گالیاں اور دروازے پہ ڈنڈے برسانا شروع کر دیتا ہے......''

اس کی باتیں' جیسے کوئی میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل رہا ہو۔ میری اُبلی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایکا ایکی اُداس سی ہو گئی' قدرے توقف سے پھر کہنے لگی۔

''اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہیں چُوم لوں......؟''

میرے چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ اُبھری' میں قدرے سرک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اپنے دونوں بازو اس کے گلے کے گرد حائل کر دیئے' سر سے سر ملاتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے چُوم بھی سکتی ہیں' سینے سے لگا کر بھینچ بھی سکتی ہیں...... آپ جو چاہیں کر سکتی ہیں' میں پسر ہوں ماں......!''

اس نے جُھک کے میری پیشانی پہ بوسہ دیا۔ پھر کافی دیر تک وہ مجھے گلے سے لگا کر پیار کرتی رہی۔ پھر اٹھی' ایک بند سا برتن لائی۔ اس میں سے مُٹھی بھر بھنے ہوئے چنے نکال کر دانہ دانہ مجھے کھلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' ہونٹ فرطِ جذبات سے کپکپا رہے تھے...... ''ٹھک ٹھک......'' دروازے پہ کوئی جیسے لاٹھی برسا رہا تھا۔ پھر ایک بے ہودہ سی ننگی گالی...... پھر کوئی کہہ رہا تھا۔

''حرامزادی! یار کو نکالے گی یا رات بھر یہیں سلائے گی؟...... ٹیم ختم ہو گیا ہے' نکال حرامزادے کو باہر......''

وہ جیسے کانپ سی گئی' میرا ماتھا چُوم کر ایک چاندی کا روپیہ تھماتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''اگر میرے بیٹے اپنے باپ کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر برسوں پہلے بھاگ نہ جاتے تو آج وہ بالکل تمہاری عمر' تمہاری ہی شکل اور ایسی ہی سیان والے ہوتے......'' وہ میرے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پھر کہنے لگی۔ ''تمہارے وجود سے مجھے تسلیم علی اور علی رضا کی خوشبو آ رہی ہے۔ تم گلی میں داخل ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا تسلیم علی آ گیا ہے...... جا' اب بھاگ لے۔ پھر جلد اپنی ماں کو مُنہ دکھانا......''

میں روپیہ مُٹھی میں دبائے پلنگ سے اُٹھ کر ماں کے قدموں میں جُھکا' پاؤں چُھوئے۔ پھر وہیں مجھے جُھکے کہا۔

"ماں! تمہیں مجھ میں تسلیم و رضا کی خوشبو محسوس ہوئی اور مجھے تم میں اپنے اور تسلیم و رضا کے بابا کی مہک محسوس ہوتی ہے"...... اب میں سیدھا کھڑا ہو گیا' بولا۔ "ماں! مجھے یہ بتاؤ' صوفی صاحب یہاں آتے ہیں......؟"

"بچے! ایک صوفی صاحب منہ سر لپیٹے ہر روز آتے ہیں۔ میرا قرآن پاک کا سبق سُن کر دو چاندی کے روپے دے کر چلے جاتے ہیں...... میں سارا دن قرآن حفظ کرتی رہتی ہوں۔ کوئی اِدھر اچھائی بُرائی کی نیت سے آتا ہی نہیں اور اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی جائے تو میں دو روپے بتا کر دل میں اپنا سبق دُہرانا شروع کر دیتی ہوں۔ وہ اُلٹے پاؤں بھاگ جاتا ہے' آدھ پون گھنٹے بعد دروازہ قدرے زور سے بند کر کے کھول دیتی ہوں' میرا شوہر سمجھتا ہے کہ میں دھندے میں لگی ہوئی ہوں......"

"بڑا بے غیرت خاوند ہے......"

اچانک میرے منہ سے نکل گیا' ماں نے فوراً میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"...... کہ ایسا کبھی نہ کہنا۔ وہ میرا سرتاج ہے اور یہ میری آزمائش ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو میرے پاس ایک صاحبِ کشف ہر روز کیسے آتا' میں قرآن حفظ کی دولت سے کیسے مالا مال ہوتی۔ مجھے صبر اور راضی بہ [illegible] میرے بچے! انہیں پیغمبروں پہ بھی وقت اور آزمائش آئیں۔ اللہ سوہنا جس حال میں رکھے' شکر الحمدُللہ ہی کہنا چاہئے...... جاؤ' اللہ حافظ — جہاں جاؤ' میرا اسلام کہنا......!"

● جنّات کا جلسہ......!

میں ٹرام پہ سوار ہو کر وہیں اُتر گیا جہاں سے روانہ ہوا تھا' عشاء کی اذانیں تو کب کی ہو چکی تھیں۔ راستے میں ایک مسجد دکھائی دی' جھٹ اندر داخل ہو گیا۔ چند لوگ شاید وتر و نوافل میں مصروف تھے۔ دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی' بہت کچھ گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ کچھ تو عقل و سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ فہم و ادراک سے کوسوں دور تھا لیکن وہی بات کہ درویش کو اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے ایک استغناء ہی تو عطا کیا ہوتا ہے اور راضی بہ رضا رہنے والی حالت ہی اِس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر و باطن کے ہر دُشمن کو زیر رکھتا ہے۔ خوف و تردّد' وہم و وَساوس' اندیشہ اور شکوہ شکایت سے جان چھٹی ہوتی ہے۔ میں نے بھی یہ زیرِ لب پڑھ کر اپنے آپ کو آسودہ کر لیا...... تُو ہے محیطِ بے کراں' میں ہوں ذرا سی آبجو —

تھی اور میری نماز کیا، محمود کیا اور ایاز کیا۔ ٹکریں ماریں اور خود کو مطمئن کر لیا کہ نماز پڑھ لی۔ ایسی نماز کی طرح ایسی ہی دُعا مانگی کہ اے ذاتِ بے ہمتا! مناسب سی لچک فولاد کو مضبوطی عطا کرتی ہے، تو بھی میرے حال و اعمال پہ رحم فرما......!

مسجد سے نکل کر صبح والے راستے کو کھوجتا کھوجتا، پوچھتا پاچھتا بالآخر میں اس مکتب والی مسجد تک پہنچ ہی گیا جہاں سے مجھے صوفی نوردین نور جہاں کا اتا پتا ملا تھا اور جہاں سے کچھ ہی پرے بڑے سے میدان میں شب بھر محفلِ سماع و ذکر بپا رہی تھی اور میں خود بھی "الف لام میم، تیری رضا میری تسلیم" کے ذکر میں شامل رہا تھا۔

غریبوں، خستہ حالوں اور محنت کشوں کے بستی علاقوں، گھروں صحنوں میں شام کے فوراً بعد ہی رات اپنی سیاہ زلفیں کھول دیتی ہے۔ دن بھر کی محنتِ شاقہ اور انگ انگ میں بیٹھی ہوئی تھکن، سکوت اور سکون پاتے ہی اپنے پاؤں پسار دیتی ہے۔ ان کے بوڑھے، بچے، طوطے، کتے، بلیاں، جانور بھی اکثر رات کے پہلے دوسرے پہر میں ہی اپنی زیادہ تر نیند پوری کر چکے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی عشاء کے بعد سناٹے اور ویرانی کی جھاڑو پھر چکی تھی۔ میں اندر ہی اندر ڈرا ہوا بھی تھا کہ جادو ٹونے کہیں گزشتہ رات جیسا پھر شروع نہ ہو جائے...... چلتے چلتے اب میں اس گلی کے سامنے سے گزر رہا تھا جہاں میں آڑے کر کے ایک شخص چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس جگہ سے میں ذرا عجلت سے گزر گیا۔ چند قدم آگے بڑھا تو سامنے سے گلی کے کونے میں تھا ایک چوکیدار قسم کی چیز آتی دکھائی دی۔ سوچا، چلو اسی سے صوفی صاحب کا ٹھکانہ دریافت کرتے ہیں۔ ذرا اور اس کے قریب پہنچا تو اس نے لالٹین میرے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے بھیا......؟"

میں نے سلام کرتے ہوئے بتایا...... میں نے صوفی نورالدین صاحب کے ڈیرے جانا ہے۔ سنتے ہی اس کی چہرے پہ کچھ ناگوار سے تاثرات اُبھرے جیسے میں نے کسی ناپسندیدہ شخص کے بارے میں دریافت کر لیا ہو، وہ مجھ سے جان چھڑاتے ہوئے اشارے سے بتانے لگا۔

"اللہ خیر کرے بھیا، تمہاری...... تم اس شخص کے پاس جا رہے ہو جس کے پاس کوئی دن کے اُجالے میں نہیں جاتا۔ بہر حال، سیدھے سیدھے وہ دھوبی گھاٹ تک چلے جاؤ۔ دائیں جانب ایک تنگ سی گلی نکلے گی، اندر جاؤ گے تو جہاں ہا ہُو سنائی دے اور بدبُو تمہارے نتھنوں میں پہنچ کر ہلچل پیدا کر دے تو جان لینا کہ تم نوردین نور جہاں کی کھولی کے باہر کھڑے ہو......"

وہ یہ سب کچھ بتا کر یوں وہاں سے غائب ہوا جیسے میں کوئی بھوتنا اور صوفی صاحب کوئی جن یا بھوت ہوں۔ میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نیم اندھیرے میں اس راستے پہ ہولیا جو سُوئے مقتل جاتا تھا۔ تنگ و تاریک اُدھڑی ہوئی گلی' جا بجا کھڈے' کیچڑ اور پتھر روڑے۔ بندہ تو بندہ' کوئی مریل سا کتے کا پلا تک دکھائی نہ دیا کہ میں قیاس ہی کر لیتا کہ یہاں کوئی آتا جاتا یا رہتا سہتا ہوگا اور واقعی مجھے صوفی صاحب کا ٹھکانا کھوجنے میں قطعی کوئی دُشواری پیش نہ آئی کیونکہ گلی کے آخری نکڑ والے جھونپڑے نما کھولی باڑے یا مکان سے نہ سمجھ میں آنے والے غوغے اور عجیب سی ناگوار بُو نے مجھے منزل کا پتا دے دیا تھا۔ کوئی دروازہ یا پٹ در ہوتا تو کھٹکھٹانے کا تکلف بھی کرتا' یہاں تو سرے سے ایسی کوئی چیز ہی موجود نہیں تھی۔ ٹاٹ بوریے اور ترپال کو بانسوں کے پھٹک پہ باندھ کر مکان کی بیرونی دیوار سی بنا دی گئی تھی۔ میں کوئی رابطہ یا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ کسی طرح اندر صوفی صاحب کو اپنی آمد سے باخبر کروں اور اس دشتِ وحشت و دہشت سے نجات پاؤں۔ اسی دوران میں جدھر سے آیا تھا اُدھر سے کوئی سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر ساکت و جامد کھڑا ہو گیا کہ دیکھئے پروانہ اِدھر آتا ہے یا کہیں اور جاتا ہے؟...... آنے والا بے نیاز سا اپنی دُھن میں گنگناتا ہوا آ رہا تھا۔ اکثر رات گئے کوئی شو دیکھ کر آنے والے ایسے ہی اپنی ترنگ میں کسی فلم کا کوئی عاشقانہ سا گانا گاتے ہوئے علاقے کی سنسان اونگھتی ہوئی گلیوں سے گزرتے ہیں۔ وہ میرے نزدیک بھی آ گیا لیکن اب بھی وہ ایک سایہ سا دکھائی دے رہا تھا' اندھیرے کے ساتھ ساتھ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنے والے نے کالے سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اب وہ بالکل میرے سامنے تھا اتنا قریب جتنا باتیں کرتے ہوئے دو انسانوں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے اور جیسے وہ جانتا ہو کہ میں یہاں کھڑا ہوں۔ اگر وہ محض کوئی راہ گیر ہوتا تو یقیناً مجھے محسوس کیے بغیر ہی گزر جاتا کیونکہ میں کھڑا ہی ایسی اوٹ میں تھا۔ میں نے اسے ذرا غور سے دیکھنا چاہا تو میری سٹی گم ہو گئی۔ اس کا چہرہ بغیر کسی خدوخال کے تھا۔ نہ آنکھیں' نہ ناک۔ کان' ہونٹ' ابرو' سب کچھ ندارد۔ چہرے کی پلیٹ بالکل سپاٹ' صاف...... مجھے اوائلِ بچپن میں دیکھے ہوئے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے وہ گڈے گڈیاں یاد آ گئے جو نئے پرانے کپڑوں کی کترنوں' بچے بچائے ٹکڑوں سے تیار ہوتے تھے۔ کپڑے سے پتلا سی کر اندر روئی' گھاس پھونس یا کترنیں بھر دی جاتیں' اسی طرح الگ سے سر بھی بنتا تھا جو بھرائی کے بعد ڈھانچے کے اوپر سی دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی سگھڑ اور سیانی بچی ہوتی تو وہ سیاہ' سُرخ دھاگے سے ناک' منہ' آنکھیں بنا لیتی ورنہ اکثر گڈیاں گڈے بے ناک' منہ' آنکھ کے ہی ہوتے تھے۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ میں تو ازقسم پاگل' جاہل' بیوقوف تھا کہ کچھ اثر نہ لیا ورنہ کوئی اور ہوتا تو دھاڑ مار کر دیتا۔

قت ہو گیا ہوتا...... اِدھر سے شہد کی مکھیوں سی بھنبھناہٹ سُنائی دی جیسے کوئی زبان دانتوں تلے دبا کر بولنے کی کوشش کر رہا ہو بلکہ ایسا ویسا تو میں خود بھی کرتا رہا ہوں۔

بند ہونٹوں گفتگو کرنا ایک باقاعدہ فن ہے' یورپ میں اس فن کے بڑے بڑے ماہرین ہیں۔ یہ ہنر بہت ریاضت و محنت اور مستقل مزاجی کا متقاضی ہوتا ہے مگر اس کی باوجود اس کے جاننے والے شعبدہ گروں اور اُستادوں کی کمی نہیں۔ اِس کو یوں سمجھئے کہ آپ دو آدمی کمرے میں کھڑے یا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اچانک آپ سُنتے ہیں کہ کمرے سے باہر کوئی شخص آپ کو پکار رہا ہے۔ آپ اُٹھ کر باہر جاتے ہیں وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ یہ کمال اُس آدمی کا ہے جو آپ کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ وہ آپ سے باتوں کے دوران اپنی آواز کو کمرے سے باہر پہنچا دیتا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ باہر کوئی دوسرا فرد کھڑا آپ کو آواز دے رہا ہے۔ یہ ماہرین بند منہ سے ہر قسم کی آواز دوسری جگہ منتقل کرنے پہ قادر ہوتے ہیں۔ میں نے سَوہو کے علاقے پکاڈلی لندن میں آج سے لگ بھگ چونتیس برس پہلے ایک تھیٹر میں ایک شعبدہ گر کا تماشہ دیکھا تھا جو بظاہر مجمع میں مُنہ سیئے ہوئے خاموش تماشائی بنا کھڑا مسکرا رہا تھا' لوگوں نے ایک اُٹھائی گیرے کو قابو میں کر رکھا تھا جو ایک عورت کا پرس اُڑاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اُٹھائی گیرا لوگوں کو دیکھ کر اپنا جرم قبول کر لیتا ہے اور اپنی عافیت چاہتا ہے چنانچہ وہ عورت سے اظہار ندامت کرتے ہوئے اپنے جرم کی معافی چاہتا ہے۔ سیدھی سادی شریف عورت اس کی معذرت محض قبول ہی نہیں کرتی بلکہ اس کی غربت کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے کچھ رقم بھی اسے بخش دیتی ہے۔ وہ پہلے والا خاموش تماشائی' مسکراتا ہوا فنکار شخص جو دراصل خود بھی ایک اُٹھائی گیر ہوتا ہے' جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کا ہم پیشہ نہ صرف بچ گیا ہے بلکہ اس نیک نفس عورت سے اسے ایک معقول رقم بھی ہاتھ لگی ہے تو وہ بیچ میں آ گیا اور اس شخص کو اپنے خفیہ اشارے سے اس رقم میں ساجھی دار بننے کا اشارہ کیا مگر اس شخص نے اس کو دَرخورِ اعتنا نہ جانا بلکہ اس عورت سے انعام لے کر وہاں سے نو دو گیارہ ہونا چاہا۔ جُونہی وہ لوگوں کے ہجوم سے باہر نکلتا ہے تو اُنہی لوگوں نے سُنا کہ وہ قہقہے لگاتا ہوا کہتا جا رہا ہے کہ اُلو کی پٹھی عورت اور اُلو کے پٹھے لوگوں کو کیسا بے وقوف بنایا ہے۔ ہا' ہا' ہا...... اس عورت اور لوگوں نے جب یہ سُنا تو اس بیچارے شخص کو پھر پکڑ کر نیچے دَھر لیا اور خوب مرمت کرتے ہوئے وہ رقم بھی واپس لے لی۔ اب پٹنے والا اپنی صفائیاں پیش کر رہا ہے' بڑی بڑی قسمیں اُٹھا رہا ہے کہ میں نے یوں نہیں کہا اور نہ قہقہے لگائے ہیں مگر ایک کے مقابلے میں بیسیوں لوگ جھوٹے تو نہیں ہو سکتے؟ وہ پہلے والا خاموش تماشائی' اُٹھائی گیرا اب بھی اسے پٹتے اور ذلیل ہوتے دیکھ کر مسکراتا رہا' یہ ساری انتقامی کاروائی اسی فنکار کی تھی جو بند مُنہ سے

اپنی آواز کہیں بھی پہنچانے پہ قادر تھا۔ یہ محض ایک ادنیٰ سی مثال ہے ورنہ قوتِ ممیزہ، قوتِ متخیلہ، قوتِ جاذبہ، قوتِ نُطق، قوتِ اَنفاس، قوتِ تحلیل، قوتِ بینا۔ طبیعات، مافوق الطبیعات اور مابعدالفوق الطبیعات میں ایسے ایسے جہان مخفی ہیں کہ انسان ششدر سا رہ جاتا ہے۔ آبائے علوی، مسیحا اور پاکیزہ نفس درویشوں کی یہ سب کچھ گھٹی میں موجود ہوتا ہے۔ کہیں بیٹھے ہوئے ہزاروں کوس دُور دیکھ لینا، یہاں بھی موجود ہیں، کہیں اور بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ اپنی آواز، اپنی سوچ، اپنے خیال کو بیٹھے بیٹھے کہیں اور پہنچا دینا۔ کسی کے ذہن، دماغ، دل میں ڈال دینا۔ تصرف تو رہی دور کی بات بلکہ یہ سب کچھ اب باقاعدہ سائنس بن چکا ہے۔ روس، جرمنی، امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک کی یونیورسٹیوں کے نصابوں میں شامل ہے۔ طالبعلم، شائقین مستفید اور فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔

میں کہہ رہا تھا کہ انسان خود ایک کارخانہ عجائبات و تحیرات ہے۔ صناعِ فطرت نے اس کے اندر ازل سے ابد تک جو کچھ ہے، فیڈ کر دیا ہوا ہے۔ ان میں علوم، فنون، قانونِ ظاہر و بطون، استطاعتیں، استعانتیں، فراستیں، قوتیں، استقامتیں، سب کچھ شامل ہے۔ بس اپنے اندر کھدائی کرنے اور شوق، محنت، استقامت کی ضرورت ہے، راستے اور رہبر سے منزل قریب ہو جاتی ہے۔ پھر جہد و جذب، سکوت، خاموشی سے سلامتی عطا ہوتی ہے۔

بات بھٹکتے بھٹکتے کہاں نکل گئی، بالکل میری طرح کہ میں کیا سے کیا ہو گیا، کیا تھا اور کیا بن گیا؟ بات کرتے کرتے جب کوئی نئی بات سامنے آ جاتی ہے تو پھر ضرورتاً اور مصلحتاً اس کو بھی نبھانا پڑ جاتا ہے بالکل ایسے جیسے کوئی دوست کے ساتھ بات کرتا ہوا کہیں جا رہا ہو، راستے میں اگر کوئی جاننے والا مل جائے تو اپنی جاری گفتگو روک کر اس کے ساتھ مروتاً سلام دُعا لینی پڑ جاتی ہے، پھر بعد میں وہیں سے بات شروع ہو جاتی ہے جہاں سے وقتی طور پہ روک دی تھی۔

قارئین! مجھے احساس ہے کہ میرے مضامین پڑھتے پڑھتے آپ کو اس قسم کی صورتِ حال سے کئی بار دوچار ہونا پڑا اور مزید بھی ہونا پڑے گا اور ہاں، یہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ ایک تو قاری کا حافظہ تقویت پکڑتا ہے، دوسرے پڑھتے پڑھتے ذرا اچانک خوشگوار سی تبدیلی آ جاتی ہے جو موڈ اور محویت میں خود بخود در آنے والی سنجیدگی کے لئے تازہ آکسیجن کا کام دیتی ہے...... بات اسی اندھیری گلی اور تاریک رات اور اس بے خدوخال چہرے والے سیاہ پوش اجنبی کی، جو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور شہد کی مکھیوں سی بھنبھناہٹ سے مجھ سے مخاطب تھا۔ میرے سر میں ایک ہلکا سا جھٹکا لگا، پھر جیسے میرے ذہن کی سکرین روشن ہو گئی۔ بے صوت مجھ تک پیغام پہنچا۔

درِ حیرت کھلتا ہے......!

''السلام علیکم...... میرے پیچھے چلے آؤ......''

جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے تین چار قدم آگے' میں اُس کے پیچھے پیچھے بوریے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے سمندری ریت سے بنے ہوئے بلاکوں سے بنا ہوا ایک کمرا نظر آیا جس پہ ٹین کی چادروں کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ ایک دروازے سے داخل ہوئے تو نیم اندھیرے میں فرش پہ چند سیاہ پوش' سیاہ چادروں سے گھونگھٹ کاڑھے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں بھی آہستہ سے ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے حلقے میں ایک مناسب سی بیٹھنے کی گنجائش دیکھ کر بیٹھ گئے تو ہماری جانب کسی نے توجہ دی اور نہ ہی کسی نے ہماری آمد کو کوئی اہمیت دی تھی۔ درمیان میں ایک ہفت پہلو طشتری نما کانسی کا چراغ روشن تھا' چراغ کی طرح اس کی ضوفشانی بھی بڑی پُراسرار تھی۔ چراغ اندر سے خربوزے کی سات ایک سی پھانکوں کی مانند بنا ہوا تھا۔ چراغ کے ہر حصے کی باتی اور روغن علیحدہ تھا۔ کوئی سیاہی مائل' کوئی سرخی مائل۔ سبز' پیلا' نارنجی اور کوئی سفید۔ اس گنگا جمنی چراغ کے ساتوں حصوں سے جیسے سات مختلف خوشبوؤں کی دھارا بھی بہہ رہی تھی۔ کافور' گلاب' چنبیلی' عود' عنبر' زعفران۔ کوئی لو ٹھہری ہوئی تھی تو کوئی لرزاں تھی' کوئی بجھنے کو تھی اور کوئی دھیمے سے دہکی ہو رہی تھی۔ کوئی میوز پھل کی چھب لئے ہوئے' تو کوئی قلم کی کاٹ کا ڈھب پکڑے ہوئے تھی اور ایک سُلفے کی لاٹ کی مانند سُلگ رہی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ ہم دونوں ملا کر کل سات افراد وہاں بیٹھے تھے۔ چادروں سے ڈھکے قدرے جھکے ہوئے سر' نہ کوئی دیکھ سکے کہ کون' کیا اور کہاں ہے۔ ہر موجود کا چہرہ سوالیہ تھا اور ظاہر چراغ تھا' وہاں صرف یہی ایک چیز تھی جو سامنے ظاہر اور روشن تھی۔ اپنے اپنے مقابل روشن چراغ کی لوہ کو ہر کوئی میری طرح دیکھ رہا ہوگا۔ ایک تازہ ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا' اس کے ساتھ ہی دو سیاہ پوش' پست قامت' سیاہ چادروں میں لپٹے لپٹائے سائے اندر داخل ہوئے اور ہم سب کے سامنے مٹی کی ایک ایک رکابی اور پیالہ دھر کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آئے۔ اب اِن کے ہاتھوں میں بلوریں صراحی اور ایک طباق میں خوب بُھنی ہوئی سُرخ سُرخ بوٹیاں تھیں جن میں سے ہلکا ہلکا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ عجیب نامانوس سی بدبُو سے ماحول پراگندہ ہو گیا' شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ اب وہ پست قامت کارندے ہر فرد کے سامنے دھرے ہوئے پیالوں اور رکابیوں میں وہ گاڑھا سُرخ' لہو ایسا مشروب اور خوب بُھنی ہوئی کلیجی جیسی بوٹیاں ڈال کر چلے گئے۔ بدبُو تھی کہ دماغ پھٹنے لگا' پیالے پہ نظر پڑی تو یوں لگا کہ کسی نے تازہ تازہ کٹے ہوئے بکرے کے نرخرے سے

خون بھر کر یہاں رکھ دیا ہو ویسے ہی اُوپر تیرتے ہوئے ننھے ننھے بُلبلے اور تازہ خون کا گاڑھا پن...... اب قاب کی جانب نظر ڈالی تو اِدھر بھی کچھ یوں ہی دِکھائی دیا کہ جیسے کسی بچے کے کلیجے کے ٹکڑے خوب سُرخ مرچ میں بھون کر اَدھ کچے پکے لا کر یہاں رکھ دیئے ہوں۔ عجب کریہہ سا منظر کہ کھانا تو درکنار محض دیکھ لینے سے ہی طبیعت دِق ہو جائے' بدبُو سے الگ ہول اُٹھ رہا تھا...... اے مالکِ ظاہر و باطن! یہ کیسا اُسرار ہے؟ یہ کالی رات' یہ تاریکی' یہ سکوت۔ یہ پُراسرار بے چہرہ لوگ۔ کہیں مَیں جن بھوتوں میں تو نہیں پھنس گیا؟...... یہ بدبُودار مشروب مجھے تو کسی انسان یا جانور کا تازہ تازہ خون دِکھائی دیتا ہے اور...... اور یہ بوٹیاں' یہ بھی مشکوک سی ہیں۔ یہ لوگ باتیں کیوں نہیں کرتے؟...... مکھیوں کی بِھنبھناہٹ پھر سے اُبھری' یوں لگا کہ اب کھانا پینا شروع ہونے والا ہے۔ بدبُو تھی کہ لحظہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ پیالہ و قاب سے چشم پوشی کرتے ہوئے میں اب چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ باہر بھاگنے کا راستہ کدھر ہے؟...... یکدم میرے دماغ میں چھناکا سا ہوا جیسے کسی نے کانسی کی پازیب میرے سَر پہ پھینک دی ہو۔ مجھے یاد آیا کہ میری بند مُٹھی میں بازار والی ماں کا دیا ہوا روپیہ دبا ہوا ہے اور اُنہوں نے کہا تھا کہ تم سے تسلیم و رضا کی خوشبو آتی ہے اور پھر یہ بھی کہ تم وہاں پہنچ کر میرا اسلام کہنا۔ مجھے یاد آیا کہ مَیں تو یہاں تسلیم و رضا سمجھنے کے لئے بھیجا گیا تھا [illegible] تسلیم تو یہی ہے کہ بلا چُون و چَرا' بلا اندیشۂ سُود و زیاں' بلا سوچے سمجھے اور بلا خوف و خطر سَرِ تسلیم خم کر دیا جائے اور رضا شاید یہ ہے کہ بلا شک و شبہ بلا رغبت و راحت اور طمانیت و تسلی سے اپنے اس تسلیم والے کو راست و صائب سمجھا جائے۔ نتائج و عواقب کو بڑوں کی صوابدید پہ چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر باطن' خوشبو بدبُو' نفع نقصان' نشیب فراز اور سیاہ سفید' یہ سب اکائیاں دہائیاں ہیں جو آپس میں ایسی سرعت سے جمع تفریق اور ضرب و تقسیم ہوتی رہتی ہیں کہ کبھی بھی کوئی اُنہیں انفرادی حیثیت سے شناخت و ساکت نہیں کر سکتا۔ آج جو ہو سو ہو۔ بسم اللہ......! بِھنبھناہٹ سی اُبھری تو سلسلہ کام و دہن چل نکلا۔ مَیں نے بھی جی کڑا کر کے دوسروں کی دیکھا دیکھی پیالہ لبوں سے لگایا...... سُبحان اللہ!...... بے ساختہ مُنہ سے نکل گیا۔ تربوز کے یخ ملیدے میں شیرۂ انار' تخمِ زعفران' تخمِ ملنگاں کا ایسا جانفزا مشروب کہ رُوح تک نہال ہو گئی۔ بدبُو کروٹ بدل کر خوشبو میں ڈھل گئی تھی۔ دوسروں کی تقلید میں اب قاب کے طعام پہ ہاتھ ڈالا...... مکرر سُبحان اللہ!...... باغِ عدن کے کسی کھجوروں کے ذخیرے کے پختہ شیریں خرموں کے ٹکڑے روغنِ زیتون میں فلفلِ سُرخ اور زعفران کے پتوں کے ساتھ دم پُخت کئے ہوئے تھے۔ ایسا شیریں ذائقہ کہ کھاتے کھاتے جی نہ بھرے...... کھانا پینا ختم ہوا تو وہ پست قامت سیاہ پوش کوئی قہوہ نما خوشبو سے بھرا ہوا گرم گرم مشروب لے آئے۔ بعد میں یہاں

بھی وہی ''اَلف لَام میم' تیری رضا میری تسلیم'' والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اجمیر کا اَجل مجذوب......!

اس واقعہ قصّے کے لگ بھگ بیس برس بعد میں ایک دوپہر اجمیر شریف' خواجہ غریب نواز سرکارؒ کے دَر پہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں پڑے ہوئے میرا آٹھواں روز تھا۔ طبیعت سخت مضمحل' پیٹ بولایا ہوا اور طہارت وضو کو قائم رکھنا مسئلہ بنا ہوا تھا' وجہ میری بے احتیاطی تھی۔ جدھر' جہاں سے جو ملا' کھا پی لیا۔ پانی' موسم' ماحول' خوراک اَدل بدل ہونے سے اکثر پریشانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ دس روز پہلے میں سرینگر' حضرت بلؒ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کی آب و ہوا' خوراک' ماحول' تاثیر کچھ اور' یہاں راجستھان' جودھ پور' بے پور' اجمیر میں کچھ اور' زمین آسمان کا فرق۔ کچھ دوا دارو بھی کیا مگر پیٹ تھا کہ رُکتا ہی نہیں تھا۔ صحن میں موتی مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے نیم مُردہ سا پڑا ہوا تھا کہ ایک بوڑھا سا آدمی' پیپل کے پتوں کے دونے میں از قسم کوئی تبرک' پرشاد لے کر آیا۔ میں نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا تو وہ کوئی غیر مسلم دکھائی پڑا۔ ماتھے پہ تلک بار دونوں اور چندیوں پہ تیل اور دُرّے گیروے رنگ کی دھوتی' سر پہ بھاری سا پگڑ اور وہاں کے رواج کے مطابق کمر کے پٹکے میں چھوٹی سی کٹاری اُڑسی ہوئی تھی۔

''بابا' پرشاد کھا لو......''

وہ دونا مجھے دیتے ہوئے بولا۔ دونے میں کوئی صحرائی قسم کی مٹھائی تھی جو شاید بُھنے ہوئے چاولوں' گڑ' خشک ناریل اور مونگ پھلی کے مغز سے بنی ہوگی کیونکہ یہی چیزیں مجھے نظر آ رہی تھیں۔ میں پہلے ہی کھانے پینے سے بیزار' اِک نگاہِ غلط سے پرشاد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''شما کرو' بابا! کسی اور کو دے دو......''

وہ بوڑھا مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا کسی اور طرف نکل گیا اور میں نقاہت سے بے حال سا پھر سر ڈالے پڑ گیا...... اللہ جانے کس لمحے میری بُدھی کی گرہ کُھلی کہ میں تو ہڑ بڑا کر' سنبھل کر بیٹھ گیا...... توبہ! میں کیا کر بیٹھا' یہ کیسا پاپ مجھ سے سرزد ہو گیا' بیٹھا ہوا کہاں' خواجہ غریب نوازؒ کے دَر پہ! اُن کے نام کا پرشاد آیا اور میں نے محض اس لئے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ دینے والا غیر مسلم اور نہایت لاغر و مفلس دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دانت زرد' آنکھیں دھنسی ہوئی۔ ہاتھ' پاؤں' لباس' ہر چیز سے اس کی بے چارگی اور درماندگی چیخ رہی تھی۔ خواجہ غریب نوازؒ نے تو اس لئے اس بے آب و گیاہ

ریگستانی علاقے کو اپنا مسکن بنایا تھا کہ یہاں کے افتادِ زدہ' بے حال و بے مایہ لوگ جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور نانِ جویں کو سخت جان توڑ مشقت اور کوشش کے باوجود بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ جن کے سَروں پہ جہنم کی آنکھیں دِکھاتا ہوا آسمان اور پاؤں تلے آگ کی مانند جھلسی ہوئی ریگ ہے جو اپنی کوکھ سے سوائے خارِ مغیلاں' تھوہڑ' تھرآٹ اور حشرات الارض کے کچھ اور نہیں اُگلتی۔ یہی ان کا مقدر ہیں۔ ان کے ہاں آسودگی' عیش و عشرت' آرام و سکون کا تصور تک نہیں۔

فرمایا گیا کہ مفلسی' فاقہ زدگی انسان کو کُفر کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ مذہب' تہذیب و تمدن سے ناآشنا یہ لوگ صدیوں کُفر و الحاد اور بے راہروی کی زندگی گھسیٹتے رہے۔ مَرے پہ سَو دُرّے' کے مصداق ٹھاکروں' وڈیروں کی ٹھاکر بتی اور وڈیرہ شاہی نظام نے ان لاچاروں محنت کشوں کو جو تعلیم' اخلاق' تہذیب اور دینِ سلیم سے یکسر بیگانہ تھے بُری طرح اپنے پنجہ جبر و استبداد میں جکڑ رکھا تھا۔ ان کی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی مقروض اور غلام بنا کر رکھا جاتا۔ یہ لوگ اپنے قبائلی رسم و رواج' صحرائی اور علاقائی طور طریقوں' اپنی ثقافت' قدروں' تفریحات اور شغل میلوں ٹھیلوں میں بے پناہ دلچسپی لیتے تھے۔ توہمات' جادو ٹونے' بھوت پریت' بلیدان۔ اندھا اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ راگ داری' سُر سنگیت' دھرت بھاؤ کے بھی بڑے رسیا تھے بلکہ یہی سُر سنگیت کا ایک ایسا جادو تھا جو ان کے سر پہ چڑھ کر بولتا' ان کی شکستہ درماندہ زندگی میں تازگی اور ترنگ کا رنگ گھولتا تھا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب سرکار' خواجہ غریب نواز نے اپنے مُرشدِ پاک کے حکم سے اس ظلمت و طاغوت سے آلودہ سرزمین پہ قدم رکھا تو ان کو اپنے چاروں جانب اندھیر ہی اندھیر' ظلم و جبر' غربت و افلاس اور کُفر و الحاد پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ عرصہ آپ نے ان لوگوں کی عادتوں' ضرورتوں اور دلچسپیوں کا بغور مشاہدہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اخلاق و اخلاص اور شفقت و محبت سے ان کے اور اپنے درمیانی فاصلے کم سے کم کرتے گئے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت کا پیغام ضرور سناتے رہے مگر کہیں اور کبھی بھی آپ نے زبردستی اپنی تعلیمات کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ کافی عرصہ آپ اپنی جدوجہد میں منہمک رہے مگر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی البتہ اس ظلمت کدے میں ایک الوہیت کی شمع ضرور روشن ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے محسوس کیا کہ یہاں کے باشندے موسیقی' گانے بجانے میں بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اسی موسیقی اور راگ داری کو سماع یعنی قوالی کے رنگ میں رنگ دیا کہ کہیں تو کوئی راستے نکلے اور ان لوگوں کو اللہ کے دین کی جانب متوجہ کیا جا سکے۔ یہ طریقہ بہت کامیاب رہا۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے ان کے طور طریقوں' رہن سہن' توہمات' غیر اخلاقی و غیر انسانی مشاغل' شیطانی رسومات کی جانب توجہ فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں سینکڑوں

کے بعد ہزاروں اور لاکھوں تک تعداد پہنچ گئی' قبیلے کے قبیلے مسلمان ہو گئے۔ آپ کسی بھی انسان سے نفرت یا بے رخی کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ اس علاقے میں اونچی ذات مرتبے اور حیثیت والے ٹھاکر راجپوت تھے' ہر جگہ ان ہی کا چرچا اور حکومت تھی یا پھر انتہائی گھٹیا ذات والے شودر' بھنگی' بنجارے خانہ بدوش...... جنہیں ٹھاکروں کے قریب سے گزرنے کی بھی اجازت' جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی بستیاں الگ' ان کا کاروبار' مرنا جینا الگ' یعنی سو شودر کا سر اور ایک ٹھاکر کی جوتی برابر تھے۔ خواجہ غریب نوازؒ نے ان ہی ٹھکرائے ہوئے' ٹوٹے ہوئے اور احساسِ کمتری کے شکار لوگوں کو یہ باور کرایا کہ تم بھی اللہ کے بندے ہو' اللہ کے نزدیک وہی بہتر ہے جو متقی ہو' اُس سے ڈرے' عبادت کرے۔ اللہ کی مخلوق کے لئے آسانیاں' خوبصورتیاں اور محبتیں فراہم کرے۔ ذات پات بیکار چیزیں ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو سینے سے لگایا' ان کو عزت و حرمت کا مفہوم سمجھایا۔ آپ کا حکم تھا کہ میرے قریب کسی کو بھی آنے سے نہ روکا جائے چاہے وہ غیر مسلم ہو یا بظاہر گھٹیا اور چھوٹی ذات کا ہو' یہ سارے میرے اپنے ہیں...... یہ تھا سرکار غریب نوازؒ کا اخلاق [illegible] تبلیغ کہتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی پہ دین کو ٹھونسا نہیں بلکہ انسانی نفسیات' انسان کے اندر کی سچائی اور راستی سے کام لیا اسی لئے آپ وہاں کی بھاشا میں ''غریب نواز'' مشہور ہوئے کہ آپ غریبوں بے سہاروں کے ملجا و ماویٰ تھے۔ بڑے بڑے تاج ور ذی جاہ حشمت و حکومت والے وہاں بھکاریوں کی طرح کھڑے ہوتے ہیں۔

بحمد اللہ کہ سرکار غریب نوازؒ اس عاجز و درویش کو اذنِ چوکھٹ بوسی عطا فرماتے رہتے ہیں......

بات وہیں کہ میں نے اس زائر سے جو بظاہر شودر' غیر مسلم اور تنگ وقت دکھائی دیتا تھا' اس کا پیش کیا ہوا پرشاد مندرجہ بالا وجوہ یا اپنی ناسازیِ طبع کی بنا پہ قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی اور وہ مجھے خشمگیں نگاہوں سے تولتا ہوا کہیں اور نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بھی جیسے ایک بے کلی سی لگ گئی' یہ احساس کچوکے سے لگانے لگا کہ مجھ سے بھاری نادانی ہو گئی ہے۔ وہ جو جیسے بھی تھا' خواجہ غریب نوازؒ کا ماننے والا تھا۔ پرشاد جو وہ بانٹ رہا تھا' خواجہؒ کے نام کا تھا...... میں جیسے یکبارگی اُٹھا' دیوانہ وار ادھر اُدھر اسے تلاش کرنے لگا مگر وہی بات کہ گرفت میں آئی ہوئی مچھلی' دروازے پہ پہنچی ہوئی روزی اور راہ میں پڑا ہوا درویش اگر ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر ''کارِ جہاں دراز ہے اب اُس کا انتظار کر'' ایسا مصرعہ زیرِ لب دہرانے کا بڑا لطف آتا ہے۔ اسی دوران یہاں کے مقامی یا علاقائی لوگوں کا ایک گروہ درگاہ شریف کے احاطے میں داخل ہوا۔ خندہ رُو مرد و زن اور بنے سنورے بچے' ان کے درمیان دولہا اور دُلہن نوعمر سے [illegible] سلونے سانولے سے۔ وہی تنگ چولی' معمولی سا انگرکھا' موسمی پھولوں کا زیور۔ گہرے کا جل' سندور

اور ہلدی کے اُبٹن کا میک اپ۔ دولہا ویسے ہی جھلسا جھلوتا ہوا جیسے کہ وہاں کے نوجوان ہوتے ہیں۔ کٹیلی آنکھیں اور کٹاری مونچھیں۔ تنگ موری کے پائجامہ پہ صدری انگرکھا' کمر میں سُرخ پٹکا اور پٹکے میں اُڑسا ہوا خمدار خنجر۔ گلے میں گیندے کے پھول کا ہار' سر پہ بھاری پگڑ' کانوں میں موتیوں کے بُندے۔ یہ لوگ اپنی بھاشا میں لگن سے کا کوئی گیت گاتے ہوئے آ رہے تھے' سرکارؒ کے روضے کے باہر بڑے ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ غیر مسلم ہونے کے باوجود جو عقیدت' ادب و عجز ان لوگوں میں نظر آیا وہ شاید مسلمانوں میں بھی کہیں خال خال ہی ہو۔ یہاں کے باشندے دُلہن' دولہا کو پہلے خواجہ غریب نوازؒ کی چوکھٹ پہ لاتے ہیں۔ اپنے طور و توفیق کے مطابق نذر نیاز' پھول پتی' چُنری چادر چڑھانے کے بعد خواجہ کی ''آ گیا'' لے کر گھر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی گلی بازار علاقے سے گزرنے والا مسلم' غیر مسلم سیس نوائی' ہاتھ جوڑے اور رُک کر سلام کئے بغیر یہاں سے نہیں گزرتا۔ میں نے یہاں اندرا گاندھی' ذاکر حسین کو بچوں کی مانند بلکتے ہوئے اور چوکھٹ تھام کر دھاڑیں مارتے ہوئے دیکھا۔

بات کر رہا تھا اس زائر کی جو کہیں کھو گیا تھا...... ان شادی والے لوگوں کی آمد کی وجہ سے بھک منگوں نے بھی اپنی بھگدڑ مچا دی تھی اور جب مجھے اپنے کھو جانے کا محسوس ہوا تو میں سرکار سے معافی مانگنے روضہ مبارک کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ پائنتی کی جانب ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنی ندامت اور حماقت کا اظہار کرنے لگا۔ کوئی ایسی بھیڑ بھی نہیں تھی' روزمرہ کی چال کے مطابق زائرین صدر دروازے سے داخل ہوتے اور فاتحہ' سلام دُعا کے بعد بائیں بغلی دروازے سے باہر نکل جاتے' یعنی صدر دروازہ جس کے باہر بڑے بڑے دیوان اور ناظم بیٹھے ہوتے ہیں صرف داخلے کے لئے ہی مختص ہے۔ چھوٹے دیوان صاحب معہ اپنے دو نائبین' مرقدِ اقدس کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔ دیوان صاحب حسبِ مراتب آنے جانے والے زائرین کو مرقد شریف کے پھول پتی بھی تبرکاً دیتے ہیں جبکہ نائبین آتے جاتے ہوئے زائرین پہ نگاہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ کوئی خلل واقع نہ ہو۔ صدر دروازے سے داخل ہو کر لوگ سلام و فاتحہ کے بعد بغلی دروازے سے نکلتے جاتے ہیں۔ وہاں کسی کو لمبے وقفے کے لئے بیٹھنے یا ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ میری مجاوروں سے خاصی علیک سلیک تھی بلکہ میرا اجمیر شریف میں قیام و طعام ان ہی کے ہاں ذاتی مہمان کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ پارسال سے پچھلے برس میری دستار بندی کی تقریب بھی انہوں نے بڑی دُھوم دَھام سے کی تھی' ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے بلکہ صبح تالہ کشائی اور شام ''دیا بتی'' کی خصوصی تقریب میں مجھے بالخصوص شامل کیا جاتا مگر اس کے باوجود مجھے آج اندر آدھے منٹ سے زیادہ ٹکنے نہیں دیا گیا۔ میں حیران کہ یاالٰہی! یہ لوگ مجھے آج پہچانتے تک نہیں۔

”بس جی، آپ اب باہر جائیے......“

مجھے شانے سے پکڑ کر بغلی دروازے کی جانب ٹہلا دیا گیا۔ میں بادلِ نخواستہ باہر نکل آیا، دل میں گرہ سی لگ گئی تھی کہ آج کام خراب ہو گیا۔ لیکن ایسا تو میرے ساتھ ہوتا ہی آیا ہے۔ بندہ اور بندر کیسے ہی سدھر جائیں، جیسی بھی نگرانی اور تربیت میں رہیں، شرارتیں، اشغلے اور کوئی نہ کوئی حرکت برکت ان سے سرزد ہونا ہی ہوتی ہے۔ سہو اور نسیان تو سرشتِ آدم میں دھرے ہوئے ہیں...... سر جھکائے، شکستہ پائی سے میں بالکل سامنے شتی برآمدے کی جانب نکل آیا۔

گلابی جاڑوں کی شرمیلی سی دھوپ نے سیماب رنگی چنریا سے ہلکا سا گھونگھٹ ڈال رکھا تھا۔ ایک اور گھونگھٹ سامنے برآمدے کے باہر اکڑوں بیٹھے ہوئے ژولیدہ سے ملنگ نے بھی کاڑھ رکھا تھا جو مجھے یوں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی ان کا مقروض ہوں اور آج کئی برسوں کے بعد انہیں دکھائی دیا ہوں۔ اس قسم کے ملنگوں درویشوں کی طبیعت اور آنکھیں چڑھی ہوئی ہی ہوتی ہیں مگر یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی دکھائی دیتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ ہی کیا تھا، چند قدم آگے پہنچ کر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کچھ لمحے مجھے انہی سالم کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر میلے کچیلے، گنجائی بڑھے ہوئے ناخنوں والے مغرور سے ہاتھ کے اشارے سے پاس بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ میں نے سلام کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے غور سے دیکھا۔ صدیوں پرانی خستہ ہڈیوں پہ خشک گندلی سی پوست منڈھی ہوئی تھی کہ لاف پہ دھنسی ہوئی پیٹ کے گرد ڈوری بندھی تھی جس سے لٹکی ہوئی بالشت بھر کپڑے کی دھجی سے آگے کا مردانہ حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ پھر ایک بڑی ہوئی دلق جو اونٹ کے کوہانوں سے شانوں پہ پڑی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی بائیں جانب چیتھڑوں، اخباری کاغذ کی کترنوں اور بیکار سی چیزوں کا ڈھیر۔ میں نے اپنی حیاتی میں بڑے بڑے جٹا دھاری ملنگ، درویش، سادھو سنت، جوگی، روگی، رشی، منی اور بیراگی وغیرہ دیکھے ہیں مگر جو زیادتی اس باوا نے اپنے سر اور بالوں سے کی ہوئی تھی اس کی نظیر میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ آسام، جاوا، سماٹرا، سیلون اور بنگال میں سندربن جیسے بڑے بڑے گنجان جنگل دیکھے جہاں اکثر سورج کی کرنوں تک کا گزر نہیں ہوتا۔ وہاں تو ہوا کو بھی رستہ تلاش کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ مکڑیاں تتلیاں بھی پر چھدوائے بنا گزر نہیں سکتیں مگر اس باوا کے بال جو آپس میں جڑی ہوئی گنجلک لٹوں کی صورت میں تھے، جیسے اس کے سر پہ مہاتما بدھ کے وقتوں کا کوئی برگد درخت اگا ہوا ہو جس کی سینکڑوں گتھی ہوئی شاخوں نے اس کے شانوں اور کمر پہ جھک کر جڑیں پکڑ لی ہوں۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی مگر میں اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ چکا تھا، بیٹھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ باوا کی آنکھوں میں اب وہ پہلی سی خشونت

اور خلش نہیں ہے البتہ اس کی نظریں ہنوز مجھ پہ ٹکی ہوئی تھیں جبکہ میں پہلے ہی ٹکی سا ہوا تکا ہوا تھا۔

جب انسان یہ جان جاتا ہے کہ آپریشن کرائے بغیر کوئی چارہ نہیں تو پھر وہ اپنے اندر مجبوراً قوت اور جرأت پیدا کر لیتا ہے۔ پھر اسے بے ہوش اور بے حس کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی' وہ آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ وہی بات کہ اپنے آپ کو سمجھانا اور قائل کرنا ہی اصل مسئلہ ہوتا ہے۔ میں چونکہ جان گیا تھا کہ مجھ سے حماقت سرزد ہو چکی ہے اور اب مجھے اس کی سزا بھی بھگتنی ہے لہٰذا میں اب ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا اور نظریں نیچے کر لیں' یقیناً انہوں نے بھی مجھ سے نظریں اُٹھالی تھیں جبھی تو وہ اپنے مال گودام' یعنی کاٹھ کباڑ کے گٹھڑ سے کچھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ میں بھی قینچی نظروں سے ان کی حرکات کو دیکھنے لگا تھا۔ اللہ جانے وہ کب سے اس طومار فضولیات کو سنبھال اور اکٹھا کیے ہوئے تھے۔ پُرانے لیے بڑے ہوئے کپڑے' چادریں' پھوڑے ڈوپٹے اور اخباری کاغذ یعنی جو بھی کہیں پڑا ہوا نظر آیا' اُٹھا کر اپنے گٹھڑ میں ڈال لیا۔ جیسے جیسے چیتھڑوں کے پرتوں کو ہٹاتے جاتے' رنگ رنگ کی بدبو اپنے انگ کھولتی جا رہی تھی۔ وہ بڑی مستعدی اور انہماک سے کسی گوہرِ یگانہ کی جستجو میں تھے جو کہیں ان کی گٹھڑی میں چھپا پڑا تھا۔ جب اُنہوں نے کاٹھ کباڑ کا اچھا خاصا تماشا اسے گھر بنا لیا تو آتے جاتے لوگ بھی جمع ہو کر تماشا دیکھنے لگے کہ دیکھیں بابا ہی نکالتے ہیں یا بھالو۔ اتفاق سے ایک دو کار ٹھہرے بھی بھیڑ بھاڑ دیکھتے ہوئے آ گئے تھے مگر کیا مجال کہ جو کسی نے باوا کو کچھ کہا ہو یا وہاں سے لوگوں کو ہٹایا ہو۔ ادھر باوا اپنی موج میں مگن تھے' نہ یہ دھیان کہ جب اُتھل پتھل کرتے ہوئے وہ ذرا جھکائی لیتے ہیں تو نیچے سے بے پردہ بھی ہو جاتے ہیں' نہ یہ خیال تھا کہ ان کے اردگرد کافی مجمع اکٹھا ہو چکا ہے جو ان کی کارکردگی ملاحظہ کر رہا ہے اور میں...... میں تو تھا ہی چکنی مٹی کا مادھو! ایک بچہ جمورا کی مانند سامنے دھرنا دیئے بیٹھا تھا کہ ابھی باوا جھولے سے چترے کی بنی ہوئی گندی سی چھری نکالیں گے' مجھے لٹا کر میری زبان کاٹ کر لوگوں کو دکھا دکھا کر پکاریں گے...... "آل اولاد والا دے گا' مولا حسینؑ کا پیارا دے گا......" اور میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے' منہ سے خون کے بلبلے اور جھاگ نکال رہا ہوں گا۔ بہرحال' اچھی خاصی چھانا چھانٹی کے بعد بالآخر باوا کو وہ گوہرِ مقصود مل ہی گیا جس کو اک نظر دیکھنے کے لئے یہ ساری ضرب تقسیم جمع ہوئی تھی۔ باوا ایک پرانے گندے سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کسی چیز کو ٹٹول رہے تھے' تہہ در تہہ کپڑا اُتارنے کے بعد ایک پرانا زنگ والا ڈبا برآمد ہوا' جس کے اوپر ٹھکا ہوا ڈھکن ہوتا ہے۔ ڈبے پہ جا بجا مختلف رنگوں کے داغ نشان موجود تھے' خدا جانے باوا نے یہ ڈبا کہاں سے اُٹھایا تھا؟...... باوا پہلے تو اسے گھورتے رہے۔ پھر ہلا جلا کر' کان کے قریب لے جا کر کچھ سننے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر منہ کے قریب لا کر زیرِ لب کچھ کہنے سننے میں لگ

گئے...... اردگرد لوگ، جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ باوا کی ہر حرکت سے ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی کہ پتہ نہیں، ڈبے کے اندر قید کوئی شیش ناگ ہے یا کوئی جن جس سے باوا راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر لمحہ تماشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا بلکہ دھکم پیل بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں اور باوا بیٹھے تھے، لوگ کھڑے تھے۔ میرے شانوں پہ جب لوگوں کا دباؤ پڑا تو میں ایک قدم اور باوا کی جانب سرک گیا۔ باوا ڈبے کو کھولنے کا جتن کر رہے تھے۔ ڈبے کا ڈھکن زنگ آلود اور میل کچیل سے بھرا ہوا تھا۔ باوا نے کپڑے سے بے تحاشا بڑھے ہوئے ناخنوں سے میل کچیل صاف کیا مگر ڈھکنا خدا جانے کتنی صدیوں سے بند تھا جو کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر باوا نے اپنے کاٹھ کباڑ سے کسی بکسوئے کا پرانا سا ایک کیل ڈھونڈ نکالا، کیل کی اڑلیس دے کر جو ڈھکنا کھولنا چاہا تو بھک سے دھماکے کے ساتھ ڈھکنا اُڑ کر اوپر چھت سے جا ٹکرایا، بدبودار جھاگ نے باوا اور مجھ سمیت تماشائیوں کو بھی متعفن کر ڈالا۔ کئی تو دھماکے کی آواز سے ہی بھاگ گئے اور جو کھڑے تھے وہ بُرا سا منہ بنائے ہوئے اپنے منہ ہاتھ اور کپڑے صاف کر رہے تھے۔ بدبُو ایسی جیسے کسی نے سڑے ہوئے جو، جوار یا بُسی بساندی چنے کی دال اُچھال دی ہو۔ میرے بھی ناک، منہ اور لبوں پہ چنے کی دال کے اُبلے گلے ہوئے دانے چپک گئے تھے۔ ناقابلِ برداشت سڑے ہوئے پانی کی بدبو نے باقی ماندہ لوگوں کو بھی وہاں سے کھسکنے پہ مجبور کر دیا۔ جمع ہونے کی طرح ان کے بکھرنے کا بھی باوا نے کوئی نوٹس نہ لیا، میدان صاف ہوتے ہی باوا نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر مجھے کلائی سے پکڑ لیا اور میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ وہ سڑی ہوئی دال اُنڈیل دی اور کھانے کے لئے اشارہ کیا۔ دال میری ہتھیلی کے پیالے میں اوجڑی کے کیڑوں کی مانند کلبلا رہی تھی۔ سفید سفید جھاگ، سڑاند، بساند سے الگ دماغ پھٹ رہا تھا...... اے ارض و سما کی نعمتوں کے مالک و خالق! میں کیا کروں؟ کھانا تو دُرکنار، اسے تو دیکھا تک نہیں جاتا...... میری اُنگلیوں کی جڑوں سے بدبُودار پانی قطرہ قطرہ میرے گھٹنوں پہ ٹپک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باوا نے مزید دال والا ملغوبہ میری ہتھیلی پہ ڈال کر دوبارہ خشمگیں نگاہوں سے کھانے کا حکم دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا، آنکھیں مُوندیں، بسم اللہ پڑھی اور ہتھیلی والی دال منہ میں ڈال لی...... حسبِ عادت اَلحمدُ لِلہ کہا اور پھر وہ دال جب حلق سے نیچے اُتر گئی تو خود بخود ہی منہ سے سُبحان اللہ نکل گیا جیسے بہشت کی کوئی نعمت نصیب ہو گئی ہو۔ ایسا ذائقہ، ایسی حلاوت، ایسی خوشبو...... باوا کھلاتے گئے، میں کھاتا گیا اور پھر وہی جو اِس طرح کے کاموں میں ہوتا ہے۔

"بھائی! اُٹھو، اذان ہو رہی ہے......"

میاں ظہور الٰہی مجھے جگا رہے تھے۔ چبوترے یعنی اس برآمدے کے بائیں جانب وضو کے لئے

ایک بڑا سا حوض بنا ہوا ہے' اسے آپ چھوٹا سا تالاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک دروازہ پڑتا ہے۔ دوسری جانب جہاں ملکہ وکٹوریہ کا بنایا ہوا حُجرہ (یادگار) اور تبرک پکانے والی مشہور و معروف جہازی دیگیں گڑی ہوئی ہیں۔ اس دروازے کے پاس کچھ اَملتاس کے پیڑ بھی ہیں' ممتیں یہ میاں ظہور الٰہی انگوٹھیاں تسبیاں' نگینے اور اسی نوع کی مختلف چیزیں فروخت کیا کرتے تھے' میری بھی ان سے یاداللہ تھی۔ انہوں نے مجھے جگا تو دیا' اب میں انہیں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دو جمائیاں اور ایک بھرپور انگڑائی توڑنے کے بعد جب میرے حواس پوری طرح بیدار ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں خُوب خواب بھر کر سویا ہوں' انگ انگ تازگی اور طمانیت کی طراوٹ سے سرشار تھا۔ نیند' نماز' بھوک اور بُھوگ' اگر ان میں حضوری نصیب نہ ہو تو یہ محض خانہ پُری کے کام بن جاتے ہیں اور ان سب میں حضوری تو دُور رہی' ان میں سے کسی ایک کی حضوری بھی بڑے نصیب کی بات ہے۔ یہ چار چیزیں ہی دین و دنیا کی اصل جڑیں ہیں' ہیں سب ہی کے پاس مگر حضوری کے ساتھ شاید ہی کہیں آئیں...... نوم یعنی نیند کی حضوری قدر و قضا ہے' صلوٰۃ یعنی نماز کی حضوری تسلیم و رضا ہے' پیٹ یعنی بھوک کی حضوری تسکین و شفا ہے اور اپنی منکوحہ سے مباشرت یعنی بھوگ کی حضوری شرم و حیا ہے۔

''میاں جی! [illegible] وقت [illegible] پہلے [illegible] تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک تماشا سا لگا ہوا تھا اور ایک ملنگ بابا یہاں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ آپ انہیں......''

میاں جی جو ایک بازو سے معذور تھے' میری بات بیچ میں ہی کاٹ کر مسکراتے ہوئے بتانے لگے۔

''بھائی! وہ ملنگ آج ہی کہیں سے آ کر یہاں براجمان ہوئے تھے' اس سے پہلے انہیں یہاں نہیں دیکھا گیا۔ ایسے درویش ملنگ تو یہاں روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں...... ہاں' وہ بابا تمہارے لئے ایک پیغام اور ایک اُدھار چھوڑ گئے ہیں۔ پیغام یہ ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے رُک سے گئے اور میرا منہ دیکھنے لگے۔

''بتائیں' بتائیں میاں جی! رُک کیوں گئے......؟''

''بھائی! رُکا اس لئے ہوں کہ پیغام ذرا سخت ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ مناسب الفاظ میں بتاؤں......''

''نہیں' میاں جی! آپ بالکل ان ہی کے الفاظ میں بتا دیں' میں قطعی بُرا نہیں مناؤں گا...... بلکہ جلدی سے ایک ہی سانس میں پیغام کے ساتھ وہ اُدھار بھی بتا دیں......''

''بھائی! انھی کے شبد دُہرا رہا ہوں' بُرا نہ ماننا...... وہ کہہ رہے تھے کہ اس لیٹے ہوئے گدھوے کو کہنا کہ بیس برس بعد بھی تمہاری تسلیم و رضا کی پٹی کچّی ہے۔ کراچی ہوتے تو گن کر سو جُوتے گدی پہ دھرتا۔ بابا کے چرنوں میں پڑے ہو لہٰذا لحاظ رکھا' چوّنی جرمانہ بھی ڈال گئے۔ مجھ سے چاندی کا چھلاّ لے کر چھین لیا اور کہا کہ ہے تو یہ اکنّی کا' پر تم اس گدھوے سے پوری چوّنی ہی وصولنا...... اور بھائی! ایک کاٹھ کباڑ والا گھوڑا بھی...... کہتے گئے کہ اِس گدھوے کو بتانا کہ سات روز تک اجمیر شریف کی گلیوں کوچوں میں گھومے اور ہر روز ایک بورا کاٹھ کباڑ اُٹھا کر مرشد پیا کی پہاڑی کی دوسری اوٹ ڈال کر آگ لگا دے...... وہ کاٹھ کباڑ والا گھوڑا تمہارے لیے چھوڑ گئے ہیں' دروازے سے باہر نختو موتی پھلوارے کے پچھتّے کے نیچے دھرا ہے......''

میں یہ سب کچھ سُن کر اُٹھا' سر جھکائے ہوئے وضو خانے کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بدبو میں خوشبو' نفرت میں محبت' گندگی میں پاکیزگی' مکروہ میں حلال' ذلت میں عزت' کراہت میں رغبت اور موت میں زندگی۔ یہ اُلٹا سیدھا چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔ الیکٹرون کے ساتھ پروٹون' کرم کے ساتھ غضب۔۔۔ انسانی [illegible] عقل' دانش [illegible] بصیرت [illegible] ہے مگر کم احمق پہ سمجھتا اس کے بڑا [illegible] پڑتا ہے۔ یہ اپنی سرشت سے مجبور ہو کر ہمیشہ نسیان' سہل پسندی' تنگ نظری' ابہام' تشکک اور گومگوئی کا شکار رہتا ہے۔ یہ جگ ہنسائی اور سرکھپائی کے جو [illegible] سلسلے ہیں' ان میں قطرے کے گوہر بننے تک جو مراحل' مہمات اور مشکلات پیش پڑتی ہیں ان سے نبرد آزمائی' کشمکش انہی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتی [illegible] تمیز کی پٹی والا ہونا چاہئے جو اپنے نیچے تھوڑے کی ہر آڑے ترچھے وقت پہ رہنمائی کر سکے اور اس کے سہو و ستم پہ اسے ہلکی بھاری سرزنش کے حد قائم اور ثابت رکھ سکے۔ اسی لئے ہر اصول پسند ثقہ اور سخت گیر اُستاد کے ہاتھ ایک چھڑی ضرور ہوتی ہے۔ ہر رہبر فرزانہ چوکیدار' چرواہے' مُرشد' رہبر کے پاس امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسا ڈنڈا ایسا عصا ضرور ہوتا ہے جس سے وہ بھیڑ بکریوں' اپنے ساتھ چلنے والوں' چور اُچکوں' دین و دُنیا میں فساد پیدا کرنے والوں اور فرد و قوم کو ان کی حدود اور کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ میں تو تھا ہی شتلی' بارہ ماسیہ اور پکا پکوک۔ کس کس شرارتوں اور اُچھلیوں کی نفیریاں بجانے والا! میرے بڑے اگر میرے سر پہ نہ ہوتے اور مجھے نہ سمجھاتے تو میں گئے وقتوں کا کہیں بے بختا ہو گیا ہوتا۔ میرا ذرا کہیں قدم لڑکھڑاتا' اُدھر سے کھٹ سر پہ جوتا پڑتا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً سنبھل جاتا۔ بس اسی لڑکھڑانے' گرنے' سنبھلنے میں ہی بوڑھا ہو گیا۔ تسلیم و رضا میں کچا پکا ہی رہا۔

بات ہو رہی تھی ملنگ بابا کی کہ وہ کاٹھ کباڑ کا گودڑا اور چونی کا اُدھار میرے لئے چھوڑ گئے اور ساتھ یہ پیغام بھی کہ بیس برس بعد بھی گدھوئے' تیری تسلیم و رضا والی پٹی کچی کی کچی ہی رہی — واہ' باواجی! واہ...... پرشاد کھانے سے میرا ذرا سا جی کیا مُڑا کہ آپ نے سیدھا مجھ پہ چڑھا دیا گھوڑا' اور گھوڑوں والا دال دانہ بھی کھلا دیا۔ واہ' سرکار صوفی نُوردین قدس سرہ المعروف نورجہان! موتیاں والیؔ ابھی چھ ماہ پہلے میں کراچی آپ کے بیسویں عُرس مبارک میں بنفسِ نفیس موجود تھا۔ اب آپ یہاں؟

بات کہاں سے کہاں جا کر اپنا سرا نکالتی ہے؟ انسان کا ذہن' حافظہ بھی کیا عجیب چیز ہے۔ یاد نہ آئے تو صبح کا کہا ہوا اور کھایا پیا نہ آئے اور اگر یاد آ جائے تو پیدائش کی وقت کی چیخیں اور رونا بھی یاد آ جاتا ہے۔ جس دایہ کے ہاتھوں میری پیدائش ہوئی تھی (خدا اس نیک نفس کی قبر کو عنبریں کرے) مجھے آج تک اُس کے ہاتھوں کا نرم نرم گرم گرم لمس اور اُس کے سانسوں اور پیرہن کی انوکھی سی پاکیزہ خوشبو تک یاد ہے۔ اپنے مُرشد پاک کی آشوب میں مبتلا آنکھ سے اپنے ہونٹوں پہ ٹپکا ہوا قطرہ' اُن کا چہرہ' آنکھیں' فراخ ماتھا اور مونچھیں تک یاد ہیں بلکہ ہر وقت منظر میں رہتی ہیں۔ اُن کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت سماعت سے ٹکراتی رہتی ہے۔ چند دنوں کا نومولود جس کے اعضا و حواس ابھی کچے اور نامکمل ہوتے ہیں کیا کچھ یاد اور [illegible] جسم و جان [illegible] ابھی [illegible] مکمل ہوتی ہے مگر اس کا وجودِ انسانی بطون اور رُوح الامر ہر طور مکمل ہوتی ہے۔ پھر یہ مولود پہ بھی منحصر ہوتا ہے کہ محض کون ہے۔ محض ہے یا مخصوص ہے' عام ہے یا انعام ہے' مقتدر ہے یا مقدور ہے؟ کچھ کو تو روزِ الست سے وقفۂ قیامِ برزخ اور وہاں سے وقفۂ قیامِ شکمِ مادر اور وہاں سے جہانِ رنگ و بو تک کا ایک ایک قدم تک یاد ہوتا ہے اور لوحِ محفوظ کی طرح ہر انسان کے اندر بھی ایک لوحِ بطون ہوتی ہے' بس کمپیوٹر کا فیڈ پروگرام آپریٹ کرنا اور پھر اسے سمجھنا پڑھنا' یہ ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ لاکھ میں سے ننانوے ہزار نو سو نوے اللہ کے بندوں کے ہاں یہ کمپیوٹرز سر کی بند الماریوں میں محض دھرے پڑے رہتے ہیں' انہیں کوئی چھیڑتا تک نہیں۔ آخر کار میت کے ساتھ انہیں بھی قبر کے گڑھے میں دبا دیا جاتا ہے۔ یہ اللہ والے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ دُنیا و کائنات کے مسلمہ اصول ضابطوں کا شاید ان پہ اطلاق نہیں ہوتا' وہی مُرشد والی بات کہ......

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں

یہ پُراسرار بندے جن کا موت بھی کچھ نہیں بگاڑتی' موت کی چادر اوڑھ لینے کے بعد بھی وہ جب

چاہتے ہیں اپنے جلوے دکھاتے رہتے ہیں' خلاقِ اللہ کو اپنے فیوض و برکات سے مستفیض فرماتے رہتے ہیں بلکہ حجاب دُنیا کر لینے کے بعد ان کے فیض و تصرفات میں حیرت کُن اضافہ ہو جاتا ہے یعنی ان کی روشن کی ہوئی ایمان و عرفان اور ایقان کی شمعوں کی ضوفشانیاں گاہے مدھم نہیں پڑتیں بلکہ وقت کے ساتھ ان کی تابانی و تجلیات میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ جسے یقین نہ آئے' خود اپنی کھلی آنکھوں سے جا کر دیکھے' بقا اور فنا اس کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ ہزاروں برسوں سے جلوت و جمال کے چراغ جگمگا رہے ہیں۔ ادھر جنت کے دریچے کھلے ہیں' کوثر و تسنیم سے معطر مدینے کی ہوائیں آ رہی ہیں۔ جن و بشر' قدسی و حاملانِ عرش تلاوت و تسبیح' تہلیل و تکبیر' مراقب و مذاکر میں مصروف ہیں۔ آسمان سے انوار کی برسات ہو رہی ہے۔ کوئی لمحہ' کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی جو اللہ کے پاک ذکر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ درود کی مشکباری سے تہی گزرے۔ وہاں ساعتیں زندہ تھے پائندہ ہیں پاکیزہ مجلسیں روشن' دوپہریں درتاب' شامیں شمیم بیز اور راتیں ذکرِ ربّ ذوالجلال سے زندہ ہیں۔ جہاں جہاں بھی اللہ کے برگزیدہ بندے محوِ استراحت ہیں۔ ان کے مقامات و مراتب' مقابر و مراقد زندہ و پائندہ ہیں۔ زندگی صرف جسم و جاں اور سایہ کایا کا نام ہی تو نہیں۔ زندگی تو اللہ کے ذکر' دین کی فکر' خدمت خوشبو اور اللہ کی مخلوق سے محبت و قربت سے تعبیر ہوتی ہے اور یہی کچھ وہیں ہوتا ہے۔ یہ تو اللہ کریم کے مہر و ماہتاب ہیں جن کی نفس سوزی سے اس جہان میں درخشندگی اور تابندگی قائم ہے۔ ایسے میں میرے مُرشدِ حق آگاہ نے کیا برحق کہا ہے……

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے' اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یعنی اُن کی رُشد و ہدایت کی تجلّیاں' تابانیاں ہر لمحہ ہر پل اور ہر ساعت جاری و ساری رہتی ہیں…… جیسا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے تجل خوار ہونے کا بڑا ایکا اور چسکا ہے۔ جتنی بھی حیاتی گزری' اس میں زیادہ حصہ میرا اسی تجل خواری کے اشغلے میں بیتا۔ ایک دفعہ موج میں آ کر میری چاچی نے مجھے بتایا تھا کہ دُنیا ساری درویش کے پاؤں تلے اڑھائی قدم ہوتی ہے۔ دماغ چھوٹا' سمجھ عقل محدود۔ بات کچھ پلّے نہ پڑی' نادانی میں پوچھ بیٹھا۔

''چاچی! اگر میں پیرانِ پیر دستگیر کے روضۂ مبارک پہ جانا چاہوں تو کیا میں اڑھائی قدم بڑھا کر وہاں پہنچ سکتا ہوں……؟''

وہ حسبِ معمول مسکرائیں' میرے گال تھپک کر کہا۔

''پہلے تو تمہیں درویشی کا وہ مقام دیکھنا پڑے گا اور پھر تمہیں اڑھائی قدموں والی بات کا اصل

مطلب سمجھنا پڑے گا کہ اڑھائی قدموں سے کیا مراد ہے......؟''

''میری پیاری' چاچی! مجھے کوئی ایسا عمل بتادو یا مجھے ایسا بنا دو کہ میں دو قدم اُٹھاؤں اور مدینے شریف پہنچ جاؤں۔ کبھی مکے شریف' کبھی بغداد شریف اور کبھی اجمیر شریف......''

میں لاڈ سے چاچی کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر ضد سی کرنے لگا تھا۔ چاچی نے پیار سے میرے سر پہ ایک چپت جماتے ہوئے کہا۔

''...... ایسا ہی ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ تو ہواؤں' بادلوں اور پرندوں کی طرح اُڑتا پھرے گا۔ تیری راہوں میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوگی۔ یہ دُنیا ترے آگے ایک کِھندو (کپڑے کی کترنوں سے بنایا ہوا گیند) کی مانند بن جائے گی......''

اس وقت تو یہ بات ایک انہونی سی لگی۔ سوچا چاچی نے بس بچے کا دل خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ دیا ہے مگر پھر بھی دل بڑا خوش ہوا کہ چلو' دو قدم اٹھائیں گے تو مکہ چلے جائیں گے اور پھر دو قدم اُٹھائے تو مدینے ہو آئے۔ مقصد یہ تھا کہ دوستوں اور محلے داروں میں ذرا اپنا ٹہکہ جمائیں گے...... میں نے اپنے تصور اور خیالوں میں مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' بغداد شریف اور اجمیر شریف کی زیارتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس روز سرِشام ہی طاق کے اوپر عطر کا پھاہا رکھ کے میں پہنچ گیا تھا۔ عشاء کی بانگ تک میں نے کئی تسبیحیں درود شریف کی پڑھیں۔ عشاء کی نماز ادا کر کے پھر آیۃ الکرسی' دُعائے گنج العرش اور جو بھی یاد تھا' پڑھا اور پھر دُعا کی کہ اے اللہ! مجھے اپنا درویش بنا دے۔ جیسے میری چاچی نے کہا ہے ویسے ہی دُنیا میرے قدموں میں اڑھائی قدم کر دے...... یا اللہ میری عزت رکھیو...... میں نے کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں بند کیں' بسم اللہ شریف پڑھی۔ پھر میں نے داتا صاحبؒ لاہور پہنچنے کی نیت باندھی کہ پہلے شروع شروع میں تھوڑے فاصلے کی پریکٹس کرنی چاہئے۔ پھر آہستہ آہستہ' ملتان' سہون' اجمیر' بغداد اور پھر آخر میں مکہ مدینہ۔ پھر اگر دل چاہا تو پیرس' لندن اور امریکہ' افریقہ بھی چکر لگا آئیں گے' دو ہی تو قدم اُٹھانے ہیں۔ مجھے کون سے ٹکٹ خریدنے اور ویزے لگوانے ہوں گے؟...... دل بلّیوں اُچھل رہا تھا' اعصاب پہ ہلکا سا رعشہ بھی طاری تھا۔ دھڑکتے دل کی ساتھ بالکل ہلکا سا آدھ اِنچ قدم آگے بڑھایا کہ کہیں لاہور سے آگے چُوکی نہ پہنچ جاؤں۔ اب میں اِنچ بھر آگے سرک کر کھڑا ہوں' آنکھیں سختی سے میچ رکھی ہیں کہ داتا صاحبؒ پہنچنے کی کوئی نشانی مل جائے تو پھر انہیں کھولیں۔ کافی دیر یوں ہی دم سادھے کھڑا رہا مگر کوئی آواز' بات یا ایسی کوئی چیز ظاہر نہ ہوئی جس سے یہ اندازہ ہوسکتا کہ میں داتا صاحبؒ پہنچ گیا ہوں جبکہ باہر بازار سے باقر پانوں والے کے ریڈیو پہ منور سلطانہ کے ٹپے گانے کی آواز بدستور آرہی تھی۔ یہ بھی تصور

کیا کہ ہوسکتا ہے' یہ گانے کی آواز' داتا صاحبؒ کے باہر بھاٹی دروازے کی کسی دوکان یا منڈوے سے آرہی ہو لیکن عاشقے قصائی کے مخصوص بے ہنگم اور بلند و بانگ قہقہوں نے میری یہ خوش فہمی بھی دُور کر دی۔ اَب میں اس خدشے سے آنکھیں بھی نہیں کھول رہا کہ ہوسکتا ہے' میرا قدم ذرا آگے یا پیچھے پڑا رہ گیا ہو۔ یہ پاؤں کو آگے پیچھے کرنے والا کام بھی کر کے دیکھ لیا مگر باقر پانوں والا' منور سلطانہ اور عاشقا قصائی اور اس کے قہقہے اب بھی موجود تھے۔ چند لمحوں بعد بڑی بددلی اور مایوسی کے عالم میں ہلکی سی آنکھیں کھولیں' پھر آہستہ آہستہ پوری کھول دیں۔ سامنے' نیچے اپنے کوٹھے پہ چاچی اپنے ہاتھ میں لالٹین تھامے کھڑی میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ متوجہ پا کر اُس نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ پاس پہنچ کر سلام کرتے ہوئے میں ایک جانب خاموش کھڑا ہو گیا تھا' شرمندہ اور ناراض سا...... چاچی چند لمحے مصنوعی سی ناراضی سے گھورتی رہی' پھر گویا ہوئی۔

''کاکا! جلد بازی تو شیطان کا وطیرہ ہے اور مایوسی گناہ...... تمہیں یاد ہوگا میں نے تم سے کہا تھا کہ اڑھائی قدموں والی بات کے اصل معنوں کو جاننا بڑا ضروری ہے کہ اس بات کے باطن میں کیا بات ہے اور تم نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اکیلے ہی داتا صاحبؒ پہنچنے کی ٹھان لی...... خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تم صبح صبح بابو ٹرین پہ لاہور چلے جاؤ' اب تم میرے بس کے نہیں رہے۔ ناشتہ داتا صاحبؒ پہنچ کر ملے گا......''

یہ وہی لاہور والا سفر تھا جس کا ذکر ابتدا میں ہو چکا ہے۔ فرید اور رحیمن ٹھٹھرے سے ملاقات اور بعد میں پھر سائیں ٹُو اور صوفی صاحب سے کئی فیض حاصل ہوتے رہے۔ مگر مجھے اسی سفر میں آگے جا کر کہیں اڑھائی قدموں والی بات میرے پلّے پڑی تھی کہ دَرویش کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سفر و سیاحت اور روزی رزق میں آسانیاں اور برکتیں پیدا کر دی جاتی ہیں' نہ یہ کہ بس قدم اُٹھاؤ اور امریکہ پہنچ جاؤ لیکن مزے کی بات کہ ایسا بھی ہوتا ہے مگر استثنائی صورت حال کے علاوہ اس قسم کے تماشے دکھانا فقیر' دَرویش کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے خارقُ العادت مظاہر اس کے نزدیک ایک بچگانہ فعل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

بات میری اپنی ہو رہی تھی کہ ساری زندگی آوارگی اور خوارگی میں گئی۔ میدان' پہاڑ' جنگل' صحرا اور سمندر۔ آتش فشاں' خونی دلدلیں' پُراسرار غاریں' گھپائیں' قدیمی قبرستان' مرگھٹ' معبد' عبادت گاہیں' قربان گاہیں' خونی مینار۔ اجتماعی قبریں' پرانی تہذیبیں' بازیافت شہر و زیارتیں۔ زیرِ زمین' تہِ سمندر' بے کنار فضائیں' کرۂ مدار اور اس سے آگے' اور اس سے بھی آگے...... میری چاچی کی کہی ہوئی بات حرف بحرف

سامنے آگئی۔ واقعی یہ دُنیا میرے آگے پن چکی کے پاٹ کی طرح اڑھائی قدم ہی رہی...... میری دُنیاوی یعنی سکول کالج کی تعلیم تو تھی نہیں' وہی دو چار پچی پکی جماعتیں۔ مہینے میں صرف دس بارہ ٹوٹی پھوٹی سی حاضریاں' پندرہ بیس فلمیں' بیس بائیس چوریاں' ستائیس اٹھائیس لڑائیاں اور درجنوں چوری کی مُرغیاں۔ بس ایسے کاموں کے ریاض تک ہی میری ریاضی تھی اور باقی تعلیم کا حساب آپ خود لگالیں۔ بس مَیں تھوڑا بہت جو تمیز الرحمان تھا وہی میری تعلیم و ہنر اور جو بھی مجھے علم لدنی عطا ہوا' وہی میرا علم تھا۔ پتھر پاتھے چاٹ چاٹ جو لذتِ سنگ حاصل ہوئی' اس نے میری جولانِ طبع اور اُفتادِ طرح و طرز کو گدرایا۔ کچھ میری مطالعہ کی عادت اور کچھ میری گہرے مشاہدے کی خُو اور کچھ فکر و تجسس کے تعلقے' دین و دُنیا کی معاملت و معاشرت اور کچھ ملاطفت و منافرت کے تجربات' چنداں بزرگوں کی جوتیوں کی مٹی' میرا عجز' میری سادگی اور قناعت ہی میری پی ایچ ڈی ہوئی۔ یقین فرمائیں کہ مجھے آج تک انگریزی' اُردو' عربی اور پنجابی میں بارہ مہینوں کے نام نہیں آتے۔ اکائی' دہائی' سینکڑہ کے آگے گنتی ختم ہو جاتی ہے۔ پانچ سو ہزار کی ریزگاری کو گنتا ہی نہیں کہ ہر بار سو پچاس کم و بیش ہو جاتے ہیں۔ یہی حال میرا لکھنے کا ہے' کچھ علم نہیں کہ کیا لکھ رہا ہوں' شروع کہاں سے ہوا تھا' موضوع کون سا تھا...... ذکر کس پری وش کا یا کسی رقیب رُوسیاہ کا تھا؟...... [illegible] اجمیر شریف اور مکا وہ بغداد شریف چلا جاتا ہے۔

● مکاتیبِ جذب و جنوں......!

عرب و عجم کی خاک چھانی' جگہ جگہ کی مٹی چاٹی' ٹھوکریں کھائیں لیکن تا ایں دم تجسس کا طمع ختم نہ ہوا' علم کی چاٹ کم نہ ہوئی اور جاننے' کھوجنے کا لپکا نہ گیا۔ یعنی جیسے جیسے پیتا گیا' پیاس بڑھتی ہی گئی۔ کسی طور اڑھائی قدم کم نہ پڑے۔ ارضِ مقدس بشمول فلسطین اور اس کے پڑوس میں عراق' شام' مصر' ایران اور ترکی میرے لئے ہمیشہ سے ہی بے پناہ کشش کا باعث رہے اور پھر ہمارا دین دُنیا کا قریب قریب سارا اثاثہ اور ورثہ بھی ان ہی ممالک میں محفوظ اور موجود ہے۔ مَیں نے اپنی زندگی کا ایک خاصا اہم حصہ اِن مقدس' پُراسرار' پُرکشش اور قابلِ دید ممالک میں صرف کیا ہے۔ ہر بار یہی جی میں آئی کہ یہیں کہیں پڑا رہوں' خاص طور پہ عراق کی سرزمین تو میرے لئے ایسی ہے کہ اس کی مقدس خاک میں محض ایک حقیر سا ذرہ بن کر پڑا رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں پہنچ پاؤں تو مَیں پاؤں پہ نہیں' پلکوں کے بل

جھک جھک کر چلتا ہوں...... جب میری چاچی نے مجھے اڑھائی قدموں والی بات بتائی تھی تو سب سے پہلے میرے دل میں جو خواہش پیدا ہوئی تھی' وہ یہی تھی کہ مَیں بغداد شریف والے پیرؒ پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے قدموں میں جاؤں گا جبکہ مکے مدینے کے بارے میں ہم بچوں کی سوچ یہ ہوا کرتی تھی کہ یہاں صرف بوڑھے بوڑھے حاجی لوگ جاتے ہیں اور بغداد شریف صرف بچوں کے لئے ہے۔ ''لے یارویں والے دا ناں' تے ڈُبی ہوئی تر جاویں گی''۔ جب ہم بچے لہک لہک کر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پڑھتے تھے تو پیران پیرؒ کا روضہ مبارک جس کے صحن میں کھجوروں کے درخت ہوتے تھے' واضح طور پہ نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ پھر گیارھویں کے بڑے ختم شریف پہ بھی خوب کھانا پینا اور برکت ہوتی تھی۔ گو چاچی نے ہمیں خوشخبری سُنا دی ہوئی تھی کہ ہم انشاءاللہ پیران پیر دستگیرؒ کے روضہ مبارک پہ یوں چلے جایا کریں گے جیسے بچے جب دل چاہے مسجد میں چلے جاتے ہیں۔ یوں ہی ایک دن ہم نے لہک میں آ کر پوچھ لیا۔

''چاچی! آپ بھی تو وہاں جاتی رہتی ہوں گی......؟''

چاچی حسبِ عادت مسکراتے ہوئے بولی۔

''مدینے شریف کے بعد بڑا دفتر تو وہیں ہے نجف اشرف اور پھر بغداد شریف۔ یہ ولیوں' درویشوں' فقیروں کے سارے فیصلے اور حساب کتاب وہیں ہوتے ہیں۔ ولیوں قطبوں کے ساتھ ساتھ فقیروں' درویشوں کے نصیب بھی کُھل جاتے ہیں اور جیسے کوئی بڑا آدمی اگر کہیں جائے تو ساتھ نوکر چاکر' گدھے گھوڑے بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں' اسی طرح میری حاضری بھی کبھی کبھی وہاں لگ جاتی ہے......''

مَیں مچل سا گیا' گلے میں بانہیں ڈال کر خوشامد سی کرنے لگا۔

''میری اچھی' چاچی! میری بھی وہاں حاضری لگوا دو' مَیں بھی تو درویش ہوں اور تمہارا کاکا بھی ہوں......''

''ہاں ہاں' تمہاری حاضریاں بھی خوب لگیں گی...... کاکا بغداد شریف میں قادریہ جیلانیہ مکتب کی حصیر پہ بیٹھا کرے گا' بس ذرا موسم تو کُھلنے دو۔''

مَیں نے جواب کے ساتھ ہی نیا سوال داغ دیا۔

''موسم کب کُھلے گا چاچی......؟''

چاچی مجھے پچکارتے ہوئے کہنے لگی۔

''موسم تب کُھلے گا جب رُت گدرائے گی' جب میرے مولا کے نجف شریف اور بڑے پیر کے

بغداد شریف کی جانب پُروائی چلے گی اور میرے کاگا کے بازوؤں میں بوجھ سہارنے کے لئے بال و پر اور سمت سدھارنے کے لئے حوصلہ یقین اور عزم پیدا ہو جائے گا......"

میری تو بال ہٹ تھی' میں تو اڑھائی قدم اُٹھانے اور بغداد شریف پہنچنے کی ضد میں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے چکر میں تھا۔ میرے مزید اصرار پہ چاچی نے شاید مجھے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

● ارغون کے کاگے......!

"سنو' کاگا! بغداد شریف سے آگے نجف اور کوفے سے پہلو بچاتا ہوا ایک شہر ہے موصل۔ اس کے پاس ہی صحرا میں ایک بے نام سی جگہ ہے۔ اس جگہ کو ہم ارغون کہتے ہیں یہاں ویرانے میں ایک سیاہ رنگت کا ٹیلا سا اُبھرا ہوا ہے بالکل جیسے اُونٹ کا کوہان ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ٹیلا نہ تو مٹی کی مانند بُھربُھرا ہے اور نہ ہی پتھر کی طرح سخت اور کُھردرا بلکہ یہ اُونٹ' ہاتھی کے تھنتھلے سے گوشت کی طرح ہے اور مزید حیرانی کی بات کہ اس میں موٹے موٹے مسام اور ان میں بالوں کی طرح گھاس سی اُگی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں [illegible] قابیل کو مُردہ دفن کرنا سکھایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ اب تک زندہ ہی صحرا میں گڑا ہوا ہے۔ چاند کے ماتھے پہ جھومر پڑنے کی رات نہ جانے کہاں کہاں سے بڑے بڑے کاگے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اس روز دور دور کی بستیوں والے سرِشام ہی اپنے گھروں میں پڑ جاتے ہیں' اشد ضرورت پہ بھی کوئی باہر نہیں نکلتا۔ یہاں پہ مشہور ہے کہ یہ پرندوں کے روپ میں جنات ہوتے ہیں...... اگلی صبح دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ ٹیلے کے گرد دور دور تک لاکھوں پرندوں کے پاؤں کے نشان ہوتے ہیں......"

میں دانتوں تلے زبان دیئے چاچی کی بات سُن رہا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ میں بغداد جانے کی ضد کیوں کر بیٹھا؟...... چاچی سُنا رہی تھی اور میں ہُو بہُو اسی نقشے میں پہنچا ہوا تھا بلکہ وہ ٹیلا' وہ سُنسان سا صحرا' لاکھوں کاگے' شب بھر کی آہ و بکا اور پھر صبح صادق سے پہلے سب پرندوں کا اپنے اپنے ٹھکانوں منزلوں کی جانب کوچ کر جانا' مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں خود بھی ان پرندوں میں شامل ہوتا ہوں...... چاچی میری جانب غور سے دیکھ رہی تھی' بڑے پُراسرار انداز میں بولی۔

"کاگا! کہاں ہو......؟"

میں جیسے اس کی بات سُنی' اَن سُنی کرتا ہوا بولا۔

''چاچی! وہاں سے ہم سب پرندے اُڑان بھر کر نجف شریف آتے ہیں' حاضری دے کر پو پھوٹنے سے پہلے پہلے کوفہ کے قبرستان میں پہنچ جاتے ہیں جہاں طلال فاطمی کور کی ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ہے......''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چاچی نے اک بڑی سی ''ہوں'' کی' میں سر کے ایک بڑے سے جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ میں واپس آیا۔

''چاچی! ہر چیز میری نظروں کے سامنے ہے......''

''ہاں' کاکا! یہ پوری کائنات انسانی کی آنکھ کی پتلی کے کالے تل میں ہوتی ہے' بس آنکھ کے پیچھے بصارت کی ساری بات ہے۔''

''چاچی! یہ جو کچھ میں نے ابھی دیکھا ہے' یہ پہلے مجھے کیوں نہیں دکھائی دیا......؟'' میں اچانک پوچھ بیٹھا۔

''...... اس لئے کہ تم نے آج سے پہلے یہ کچھ کبھی سوچا ہی نہیں تھا' بغداد شریف جانے کی کبھی ضد نہیں کی تھی۔ تم ذہنی اور باطنی طور پہ کبھی [illegible] میں [illegible] قریب نہیں ہوئے اور آج تمہاری باطنی بصارت' تمہاری آنکھ کی کالی پتلی نے لگا کھائی ہے......''

''چاچی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......؟'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

● سکاٹ لینڈ کا پُراسرار جزیرہ اور یہودی بُڑھیا

میں سکاٹ لینڈ میں گلاسگو کے ایک نواحی ننھے منے جزیرے ''میرن آئی ہاتھ'' میں جو ایک پرائیویٹ پراپرٹی تھا' اپنے ایک سکاچ واقف کار جیکب کے ساتھ ایک ہفتے کے لئے پڑا ہوا تھا۔ میرا یہ جاننے والا ایڈنبرا میں مشرقی علوم اور روحیت کا طالب علم تھا۔ بنیادی طور پہ وہ یہودی النسل' طبعی طور پہ مسیحیت پسند مگر فکری طور پہ اسلام کے بے حد قریب تھا۔ آسمانی صحائف اور خاص طور پہ قرآن حکیم کا پڑھنے والا' نماز' روزے سے بھی واقفیت اور دلچسپی تھی۔ وضع قطع' داڑھی اور حلیہ لباس بھی بالکل مولویوں جیسا تھا۔ میرے علاوہ سب ہی اسے نومسلم سمجھتے تھے۔ ہم دونوں پاگلوں کا اس آدھ ہتھیلی بھر جزیرے میں آنے کا مقصد محض چھ سات روز دُنیا کے ہنگاموں سے دور' فطرت کی گود میں بیٹھ کر تنہائی اور سکون میں کچھ غور و فکر اور آرام کرنا تھا۔ اس جزیرے کی مالک ایک بوڑھی سکاچ یہودن تھی جو چند ملازموں' کچھ گھوڑوں

گدھوں، چھ عدد گائیوں اور بچھڑوں کے ساتھ وہاں اکیلی رہتی تھی۔ میرے نیم یہودی دوست سے تعلقات کی بناء پر اس کاروباری ذہن رکھنے والی بُڑھیا نے مبلغ بیس پونڈ ایڈوانس کے عوض قیام و طعام مع مچھلی شکار کرنے کا سامان، ایک چھوٹی سی چپوؤں والی کشتی اور سواری کے لئے دو ٹٹو فراہم کرنے والی میزبان بننا قبول کیا تھا۔ بڑھیا نے مویشی خانے سے ذرا پرے، لکڑی اور پتھروں سے بنی ہوئی ایک بوسیدہ سی کاٹیج نما کوٹھڑی ہمارے لئے مختص کر دی جس میں پرانی مگر مضبوط سی لکڑی کے بنے ہوئے دو فراخ سے تخت دراز پڑے ہوئے تھے جو شاید ہماری استراحت کے لئے تھے۔ کوٹھڑی کی چاروں دیواروں میں کھڑکیاں تھیں۔ شمال میں دور گلاسگو سٹی کی بلند و بالا عمارتوں کی جانب کھلتی تھیں، مغرب میں بندرگاہ اور جیٹی نظر پڑتی تھیں۔ ایک جانب کھلا سمندر، بادبانی کشتیاں، چھوٹے جہاز، ماہی گیر اور چوتھی طرف دیگر جزیرے اور تاحدِ نظر نیلا آسمان..... تخت دراز پہ اپنا رک سیک پھینکتے ہوئے میں نے جیکب سے کہا۔

"یار! یہ بڑھیا تو گانٹھ کی بڑی پکی دکھائی دیتی ہے۔ معاملات طے کرتے ہوئے اس نے تمہارا ذرا بھی تو لحاظ نہیں رکھا، ایک ایک دھیلا گن کر ایڈوانس دھرا لیا ہے....."

وہ کھلی کھڑکی سے باہر سمندر دیکھتے ہوئے بڑے پُرسکون لہجے میں کہنے لگا۔

"ہاں! معاملات ہوں اصولوں میں جو لوگ سخت گیر ہوتے ہیں وہی بھرپور [illegible]ے اور کامیاب ہوتے ہیں..... وہ سمندر سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"..... دیکھو سمندر کو غور سے دیکھو۔ سوچو! اس پہ تدبّر کرو۔ یہ اپنے اندر ضابطوں، اصولوں، سمبندھنوں اور تذبذب و توازن کی معاملات کے کیسے کیسے اضطراب چھپائے پڑا ہے۔ ہر جاندار جاذب و جامد کو جو اس کے پاس پہنچتا ہے، یہ اسے اپنے باطن میں اُتار لیتا ہے اور جو کوئی بانجھ، برانگیختہ اور بے ثمر و بار پڑے، اسے کنارے پہ لا پھینکتا ہے۔ خامت میں خلا رکھنے والوں کو اُٹھائے رکھتا ہے اور بھیتر بندھے ہوؤں کو باندھ لیتا ہے..... تم نے کبھی آبی کونجوں کو سطحِ سمندر سے ذرا اُوپر دیوانہ وار اُڑتے پھڑپھڑاتے اور چیختے کرلاتے دیکھا سنا ہے، کبھی اِن کی صدائیں غور سے سُنیں ہیں.....؟"

وہ خبطی اپنے خبط میں بہہ نکلا تھا..... میں نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

"دوست! میں نے غلطی سے بڑھیا کی بات کی تھی، تم سمندر کے پیچھے پڑ گئے ہو.....؟"

جیکب نے میری اس بات کو اپنی ازلی حماقت آمیز بے نیازی کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے اپنے اسی ٹمپو اور موڈ میں جواب دیا۔

"دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ آنٹی آبیرے ڈیوڈ سمندر میں رہتی ہے اور سمندر آنٹی آبیرے میں

رہتا ہے......"

اس کی یہ بات بھی میرے سر پہ سے یوں گزر گئی جیسے شام کے سمے کوئی اَبابیل آپ کے سر پہ سے زنّپ سے گزر جاتی ہے اور آپ اس کے صرف ساؤنڈ بیریر کو ہی محسوس کرتے رہ جاتے ہیں۔ میں آنکھیں کشادہ کئے ہوئے اسے دیکھنے لگا...... آنٹی آبیرے اور سمندر' سمندر اور آنٹی آبیرے؟...... میں اپنے ذہن میں سمندر اور آبیرے کی جمع تفریق میں اُلجھ سا گیا۔ جیب تمباکو کی ڈبیا نکال کر سگریٹ رول کرنے لگا۔

میڈم آبیرے سے پہلے اس کی پوش پوپی نسل کی ٹھگنی سی کُتیا اندر داخل ہوئی تھی...... سر پہ قدامت پرست یہودنوں کے انداز میں سکارف باندھے اور ٹخنوں تک عبا نما ڈھیلا ڈھالا کُرتہ پہنے چہرے پہ لیڈی میڈ مسکراہٹ سجائے میڈم ہمارے لئے بنی سُرخی کلوٹی ہوئی چینی کی پرانی سی کیتلی میں گرم گرم بلیک کافی لائی تھی۔

"جنٹلمین! ناچیز آبیرے ڈیوڈ کی جانب سے جزیرے ٹیرسن آئی باتھ پہ آمد کی خوشی میں یہ حقیر سی ضیافت قبول فرمائیں......"

تام چینی کے پرانے مگوں میں کافی انڈیلتے ہوئے اس نے انکشاف کیا کہ یہ نادر الوجود مگ اس کے آنجہانی پیارے شوہر ڈیوڈ بر وود کی نشانی ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں کام آ گیا تھا۔ کافی کے مگ ہمارے سامنے تخت در اوپر رکھتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ کافی پینے سے پہلے اپنے رَبّ کے حضور شکر گزاری کی دُعا مانگ لینی چاہئے۔ اس کے ساتھ ہم نے بھی سر جھکا کر ہاتھ اُٹھا لئے...... کافی دیر وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتی رہی۔ میں تنگ آ کر کنکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سُرخ و سپید جُھریوں سے بھل تھل گالوں پہ دو موٹے شفاف سے آنسو جھلملا رہے تھے' اپنی آستین سے چہرہ صاف پونچھتے ہوئے اس نے ہمیں کافی سے لُطف اندوز ہونے کی اجازت دی اور پھر کُٹیا کی بے سروسامانی پہ اک نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگی۔

"مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اس پُرسکون جگہ پہ کوئی تکلیف نہیں ہو گی...... صبح کا ناشتہ علی الصبح پہلی عبادت کے فوراً بعد تیار ہوتا ہے۔ جو کا دلیہ' خشک انگور' دودھ اور گھر کی بنی ہوئی ڈبل روٹی۔ ناشتے میں چائے یا کافی کا میرے ہاں رواج نہیں۔ دلیئے کی جگہ تازہ پنیر یا دہی لیا جا سکتا ہے۔ ناشتے کی میز پہ بیٹھنے سے پہلے غسل اور ناشتے کی عبادت دُعا ضروری ہے۔ تمباکو نوشی کی اجازت صرف اسی مغربی حصے میں ہے جہاں آپ اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔ ناشتے سے ٹھیک پندرہ منٹ پہلے میرے معبد سے گھنٹہ بجنے کی

آواز بلند ہوگی' پھر میری پیاری کُتیا مسلسل دو منٹ تک اپنی خوبصورت آواز میں بھونکے گی۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر اگر ناشتے پہ نہ پہنچا جا سکے تو اس صبح ناشتے سے محروم رہ جانے کا امکان ہے...... دوپہر ایک بجے کے قریب وہی گھنٹہ بجے گا۔ ظہرانے میں تلی ہوئی مچھلی' آلو کے قتلے' اُبلی ہوئی گوبھی' مٹر' پھلیاں' حسبِ ضرورت جو کے اَن چھنے آٹے کی ڈبل روٹی' مشروم کا سُوپ اور کوئی ایک میٹھی ڈش...... رات ساڑھے چھ بجے عشایئے میں اُبلی ہوئی سبزیاں' بیف کٹلس اور قیمے کے سموسے کافی کے ساتھ...... دن کو مشرقی اور شمالی حصے کی جانب آنے کی پابندی ہے' صرف مغربی جنوبی حصہ آپ کے لئے مخصوص ہے۔ مچھلی کا شکار' گھڑسواری اور کشتی رانی سورج کے غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پیشتر تک کر سکتے ہیں اور ایک خاص تاکید جو میں اپنے معزز مہمانوں کو کرنا چاہوں گی کہ شمالی حصے کی جانب رجوع کرنے کی سختی سے ممانعت ہے۔ دن ہو یا رات' اس جانب جانے والے کی ذمہ داری مجھ پہ عائد نہ ہوگی...... ملازموں سے بات چیت کرنا منع ہے۔ ٹیلی فون کی سہولت ادائیگی پہ میسر ہے۔ مقررہ قیام سے پہلے جزیرہ چھوڑنا اگر ضرورت ٹھہرے تو قطعے اور ادا شدہ رقم واپس نہیں ہو سکتی۔ کسی ضرورت کے تحت گالسگو ٹھہرایا جا سکتا ہے' آمد و رفت کے لئے کرائے پہ کشتی اور کشتی بان مل سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر میڈم [illegible] تو میری جان میں جان آئی۔ اتنا طویل لیکچر؟ کچھ بھی تو یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے کیا کچھ کہا ہے ماسوائے اس کے کہ شمالی حصے کی جانب جانے کی سخت پابندی ہے...... وہ اور پیچھے پیچھے اس کی جھگنی کُتیا پوپی باہر نکلی تو ہم دونوں نے اپنے اُتھل پتھل سے سانس دُرست کئے۔

"دوست' جیکب! یہ تو مانتے ہو کہ قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا...... بہتر ہوا کہ اس کا خاوند کہیں جوانی میں ہی فارغ ہو گیا' اگر کسی طور زندہ بھی رہ جاتا تو اس وقت تک پاگل ہو گیا ہوتا...... ایسی سخت گیر' اُصول پرست اور آمرانہ ذہنیت کی حامل بڑھیا کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی......"

جیکب نے اپنا بُجھایا ہوا چُرمُرا سا سگریٹ سُلگاتے ہوئے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ کیا بکواس کر رہے ہو؟...... دُھویں کا ایک اچھا خاصا بادل اُگلتے ہوئے گویا ہوا۔

"مائی ڈیئر' پاکستانی! یہودیوں کی تاریخ' فطرت' قدامت پسندی اور اُصول پرستی سے اگر تمہیں ہلکی سی بھی شُد بُد ہوتی تو شاید تم یہ بیہودہ اور جاہلانہ قسم کی بات نہ کرتے...... مادام آبیرے ڈیوڈن صرف کٹر یہودی ہے بلکہ وہ پکّی کھرّی سکاٹش بھی ہے۔ اصل یہودی اور کھرّا اسکاچ قدامت اور اُصول پرست

ہوگا۔ کسی کو دل و جان سے چاہنا' بےلوث پیار اور کسی پہ بھی اعتماد کرنا اس کی فطرت میں شامل نہیں۔ پیسے کو خرچ کرنے سے کہیں زیادہ وہ اسے بچانے اور محفوظ رکھ کر انڈے بچے نکالنے پہ ایمان رکھتا ہے۔ سمندر میں ندی نالوں اور دریاؤں کی طرح وسائلِ زر کے سارے ندی نالے' دریائے جنیوا اور وال سٹریٹ کے بڑے بڑے یہودیوں کے زمین دوز سٹرانگ رومز میں اُتر جاتے ہیں جہاں نکاسی کے تمام ممکنہ راستے مسدود ہوتے ہیں......'' وہ نیا سگریٹ رول کرتے ہوئے بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے کہا تھا نا' مادام آبیرے ڈیوڈ اور سمندر ایک ہی رویئے روایت کے دو مختلف نام ہیں......''

جونہی جیکب پتلا سا رول کیا ہوا سگریٹ سُلگانے کے لئے ایک ثانئے کے لئے خاموش ہوا' میں نے بات چھین لی۔

''جیکب! تم مادام کو کب سے جانتے ہو......؟''

میں نے ایسے ہی اس کی کچ کچ چلتی ہوئی زبان کی قینچی کو روکنے کے لئے سوال داغ دیا تھا...... چند رول کئے ہوئے سگریٹ کی جملہ خرابیوں میں نمایاں خرابی یہ ہے کہ دو تین کش کھینچنے سے اس کا سارا ست ختم ہو جاتا ہے۔ سگریٹ نوش پھر مجبوراً ماحول میں پھیلائے ہوئے دھوئیں کو ہی سونگھ سونگھ کر اپنی تشفی کرتا رہتا ہے۔ جیکب بھی اس صورت حال سے دوچار تھا' ناچار اسے مجھے پوچھنا پڑا کہ میں نے اس سے کیا پوچھا تھا۔ میں نے پھر اپنا سوال دُہرایا تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا تھا کہ تم مادام کے بارے میں ضرور مجھ سے پوچھو گے لیکن میں تمہیں مادام کے بارے میں صرف اس شرط پہ بتاؤں گا کہ تم مادام کے بارے میں مزید کوئی سوال کرنے سے مکمل اجتناب کرو گے اور پانچ سات روز جو ہم یہاں پُرسکون ماحول میں غور و فکر کی غایت سے گزارنے آئے ہیں' ان میں اپنی کُرید مزید کی عادتِ بد سے بدمزگی پیدا نہیں کرو گے......'' وہ پھر نیا سگریٹ رول کرنے لگا تھا۔

''بولو......''

میں نے اُس کی لمبی تمہید باندھنے والی عادت سے عاجز ہوتے ہوئے مختصراً کہا تو وہ آنکھوں میں شرارت بھرتے ہوئے بولا۔

''نمبر ایک' مادام فی سائیڈ جیوئش سرکل کی ممبر ہے اور اتفاق سے میں بھی ہوں۔ مزید اتفاق یہ کہ میں اور مادام تین چار بار اکٹھے تل ابیب بھی جا چکے ہیں۔ مادام نے وہاں علوم قدیمہ' سحر بابلی اور تاریخ اسرائیلہ پہ تحصیل علم کیا' انہی موضوعات پہ مادام نے چار پانچ بڑی سیر حاصل' بحث و تمحیص پہ مبنی

کتابیں بھی لکھیں ہیں جو بدقسمتی سے تمام کی تمام بین کر دی گئیں......"

میں نے اُس کی بات معذرت سے قطع کرتے ہوئے پوچھا۔

"بین کرنے کی وجہ......؟"

وہ تاسّف بھرے لہجے میں بتانے لگا۔

"مذکورہ کتابیں فلسفۂ یہودیت' تسخیر و توسیع' تشخّص قوم سحرِ بابلی و سامری پہ تھیں...... مادام ہائیڈل برگ میں رُوحانیات کی اُستاد تھیں' کتابوں کی اشاعت سے بڑا شور و غوغا بپا ہوا۔ ان موضوعات نے متنازع سی صورت پیدا کر دی تھی۔ مادام کو سکاٹ لینڈ واپس بھاگنا پڑا۔ یہ ڈیڑھ فرلانگ بائی دو اڑھائی فرلانگ جزیرہ میڈم نے 59 سالہ لیز پر حاصل کیا ہوا ہے۔ مادام اپنی پسند کے سیّاحوں کو ہالیڈے کیمپنگ کے لیے سہولتیں فراہم کرتی ہے...... دوسری اہم بات نہایت تنگ الوسع اپنے پسندیدہ علمی موضوعات پہ کسی اجنبی' غیر دخیل یا کم علمی سطح والے کسی فرد سے بات چیت یا بحث کرنا پسند نہیں کرتی' خاص طور پہ وہ کسی بُنیاد پرست مسلمان کے قریب بھی بیٹھنے سے نفریں ہے......" یہ کہہ کر وہ اک شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا' میری چونچ کُھلنے سے پہلے ہی وہ میرے اگلے سوال کو بھانپتے ہوئے بول پڑا۔

"آئی آئیر [illegible] تمہیں [illegible] وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں کسی مسلمان' خاص طور پہ پاکستانی کو اس کے دسترخوان پہ اس کی ناک تلے لا کر بٹھاؤں گا لہٰذا تم میڈم کو احساس دلائے بغیر اپنی نمازیں اور تلاوتیں جاری رکھ سکتے ہو لیکن اپنی ذمہ داری پہ......"

اب میں بولا۔ "جیکب! اگر مجھے پتا چل جاتا کہ مادام مسلمانوں' خاص طور پہ پاکستانیوں سے اس قدر بیزار ہے تو میں خود ہی اِدھر نہ آتا۔ مجھے یہاں لانے کی ذمہ داری بہرحال تمہارے ہی سر پڑتی ہے......"

وہ مجھے آنکھ نکاتے ہوئے کہنے لگا۔

"خان! میں تمہیں جان بُوجھ کر یہاں لایا ہوں' اس جزیرے میں تمہاری دلچسپی کا کچھ سامان موجود ہے۔ مجھے علم ہے کہ علم حاصل کرنے اور کھوجنے جاننے کے بارے میں تمہارا حریصانہ رویّہ یہودیوں سے کچھ کم نہیں اور اگر سچ پوچھو تو تمہیں یہاں لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم خوش ہو کر مجھے بھی پاکستان لے جا کر جھیل سیف الملوک کی پُراسراریت کے مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کراؤ......"

میں اُس کی یہ بیہودہ سی منطق سُن کر بھنا سا گیا' قدرے برہمی سے بولا۔

"جیکب! اس چپّہ سے بے سرو ثمر ٹاپو نما جزیرے میں جُز چند ٹٹوؤں' گدھوں' گائیوں بچھڑوں'

جہاں ایک ملازموں‘ ایک سڑیل سی بڑھیا کے‘ کیا رکھا ہے اور پھر تم نے اِس کا ٹانڈہ جھیل سیف الملوک سے جا کر کیسے ملا دیا؟ وہ جنوں پریوں‘ دساسول‘ پیغمبروں کے فرستادوں اور حاملانِ افلاکی کا جہانِ فسوں‘ مسکن وطلسم آباد‘ تحلیل نفسی اور سرّیت کی اَبدالآباد سے دَرس گاہ...... بگلوں اور سی گلز کی غلاظت‘ گائیوں بچھڑوں‘ ٹٹوؤں کا گوبر اور تمہاری سڑی میڈم کا لمبا سا تھوبڑا یقیناً وہاں نہیں......؟‘‘

وہ خشک المزاج ومزاج‘ پیٹ اور مُنہ کھول کر خوب ہنسا اور جب میں نے اس کے پیلے دانتوں کی نمائش سے خوب بیزار ہو کر مُنہ دوسری جانب پھیر لیا تو وہ بولا۔

’’واہ خان! واہ...... تم نے خوب منظر اور تقابل کشی کی لیکن دوست! پھر بھی تم یہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے ہی جاؤ گے‘ یہ میری گارنٹی ہے......‘‘

باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اپنے اپنے سلیپنگ بیگ نکال کر ہم نے تختِ درازوں پہ بچھا دیئے تھے۔ رک سیک سے جوگنگ سوٹ‘ جوتے‘ تولیئے‘ صابن وغیرہ نکال کر مناسب جگہوں پہ رکھ دیئے۔ ملکے سے سفر اور مسلسل مغزماری سے ہم دونوں ہی تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنا چاہ رہے تھے۔ [illegible] تختِ درازوں [illegible] آنکھ [illegible] وقت [illegible] کھانے کا گھگھو بج رہا تھا۔ یہ گھگھو کی آواز بھی عجیب سی تھی جیسے کوئی سمندری کونج انتہائی کرب کے عالم میں وقفے وقفے سے کراہ رہی ہو۔ ایسی دردناک اور اکلاپے کی مجبوری میں تھرتھر کانپتی ہوئی آواز سُن کر میں تو اندر سے ہل سا گیا اور آنکھوں میں وحشت اور دہشت سی دَر آئی۔ جیکب بھی بیدار ہو چکا تھا۔ گھگھو کی کُراہٹ سے بے نیاز سا سگریٹ رول کرنے میں مگن ہو گیا تھا اور مجھے متوحش سا دیکھ کر جان چکا تھا کہ میں کس اذیت میں مبتلا ہوں۔ سگریٹ کی پنّی کو زبان سے گیلا کرنے کے بعد بولا۔

’’پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صُورِ اسرافیل نہیں‘ دوپہر کے کھانے پہ پہنچنے کا بلاوا ہے اور چند منٹ کے اندر اندر ہمیں کھانے کی میز تک پہنچنا ہے......‘‘

یہ سُن کر میں پوچھ بیٹھا۔ ’’مسٹر جیکب! یہ حشر توڑ قسم کا گھگھو بجا کر میڈم کا مقصد کھانے کی اشتہاء کو بڑھانا ہے یا یہ سُنانا کہ یہ کھانا تمہاری زندگی کا آخری رزق ہے......؟‘‘

جیکب بھرپور سا کش کھینچتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا‘ بتانے لگا۔

’’آنٹی آیرے ڈیوڈ نے یہ سائرن ٹوٹے پھوٹے جہازوں کے سکریپ یارڈ سے اونے پونے خریدا تھا‘ خود ہی اس کی ٹیوننگ کر کے اِسے ایسا بنا دیا ہے بلکہ ایک مرتبہ فخر سے مجھے بتایا تھا کہ اِس سائرن کی آواز دیوارِ گریہ کی گہرائیوں سے سسکیوں میں سُنائی دینے والی سسکاریوں سی ہے...... خان! یقین

مانو' مَیں بھی یہ سائرن سُن کر یہی محسوس کرتا ہوں بلکہ مَیں اس آواز کے زیروبم میں جو ارتعاش اور کرب کے رُوبرو تحقیق کرنے کا اِرادہ رکھتا ہوں......"

سگریٹ ہونٹوں میں داب وہ ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔ مَیں نے اپنا رَک سیک تخت دراز کے نیچے سے باہر گھسیٹا اور اُلٹے سیدھے سلیپنگ بیگ' جوتے کپڑے وغیرہ ٹھونس کر زپ کھینچ لی۔ وہ باتھ روم سے باہر نکلا تو مَیں گھس گیا' اُلٹا سیدھا ہاتھ مُنہ دھو کر باہر نکلا' رک سیک پشت پہ لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ جیکب باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس طرح تیار اور آمادۂ پیکار دیکھ کر ٹھٹکا' قدرے تردّد سے بولا۔

"خیریت......؟"

مَیں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "جیکب! مَیں یہاں تمہارے ساتھ چند روز سکون سے گزارنے آیا تھا' آزار اور اذیت برداشت کرنے کے لئے نہیں...... [illegible] سخت بھوک لگی ہوئی تھی مگر اس منحوس کھگھو کی فریادیں [illegible] کراہٹیں سُن کر سب غارت ہو گئی۔ یہ تمہاری آنٹی [illegible] مجھے کوئی بدرُوح یا چڑیل دکھائی دیتی ہے [illegible] دیکھ لینا' وہاں کھانے کی میز پہ تمہارے اور میرے لئے کسی بھوت کا [illegible] بھون کر رکھا ہوگا اور پانی کی جگہ کسی اُلّو کے نرخرے سے کشید کیا ہوا تازہ [illegible] گرم خون پیالے میں بھرا ہوگا......"

میری [illegible] [illegible] ہو اور [illegible] وہ [illegible] پکڑ کر ریت پہ بیٹھ گیا۔ مَیں اُسے اسی حال میں چھوڑ کر پکنک پوائنٹ کی جانب چل دیا جدھر سے ساحل کی جانب کشتیاں جاتی تھیں۔ تبھی پیچھے سے ایک ہلکا گول پتھر میرے رک سیک سے ٹکرایا۔ ایک [illegible] پھر ایک اور...... مَیں رُک گیا' پلٹ کر اُسے دیکھا تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتا ہوا مجھے مارنے کے لئے مزید پتھر تلاش کر رہا تھا۔

"تم کچھ بھی کر لو بلکہ اگر تم اپنی چڑیل آنٹی سے گن لا کر مجھے شوٹ بھی کر دو تو پھر بھی مَیں یہاں رُکنے والا نہیں...... مائی گاڈ! ایک نہ شُد دو شُد۔ تم دونوں ہی مجھے آخری درجہ کے پاگل دکھائی پڑتے ہو......"

یہ کہہ کر مَیں پھر چل پڑا تو وہ پیچھے سے پکارا۔

"اچھا' اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو جانے سے پہلے میری ایک بات ضرور سُنتے جاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی تم جانا چاہو تو مَیں بڑی خوشی تمہیں خود کنارے تک چھوڑ کر آؤں گا' میرا پکا وعدہ ہے......"

مرتا کیا نہ کرتا' رک سیک ریت پہ پھینک کر اسی پہ بیٹھ گیا۔

"جو بھی اُلٹی سیدھی تم نے مجھے سُنانی ہے' بس جلدی سے کہہ ڈالو......"

وہ اسی کھلنڈرے موڈ میں ریت پہ دھپ دھپ کرتا ہوا میرے پاس پہنچ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے

گردن ڈالے پڑا رہا اور میں اس دوران اُسے بے دلی سے گھورتا رہا' معاً وہ سر اُٹھا کر سنجیدگی سے مجھے بتانے لگا۔

''خان! تم یہاں پہلی بار آئے ہو جبکہ میں اس سے پیشتر بھی یہاں کئی مرتبہ آ چکا ہوں۔ سحرِ بابلی' آنٹی کا دل پسند موضوع ہے' وہ اس موضوع پہ پہروں سر کھپائی کرتے ہوئے نہیں تھکتی۔ اسی شوق اور تجسس کی خاطر آنٹی ملکوں ملکوں گھومی ہے' خاص طور پہ بابل' نینوا' مُوصل جیسے پُراسرار شہر اور کوفہ' قونیہ' قاہرہ' بیت المقدس کے قبرستان اور دیوارِ گریہ وغیرہ وغیرہ...... وہ سحرِ بابلی' استعانت تجسیم افلاکی پہ بڑے لمبے چوڑے سیر حاصل تھیسس مکمل کرنے میں جُتی ہوئی ہے۔ وہ ایڈنبرا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے شب و روز اسی شغل میں بسر ہو رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی سڑیل' اصول پرست اور جنون کی حد تک قدامت پرست ہے......''

میں ایسی تمہید سے بیزار سا ہو کر اُسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

''مائی ڈیئر' فرینڈ! تمہاری اب تک کی گفتگو سے میرے پلّے ابھی تک کچھ نہیں پڑا۔ اگر تم مجھ پہ مہربانی کرو اور اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے فوراً مطلب کی بات زبان پہ لاؤ تو ہم دونوں بشمول مادام' تینوں کی صحت کے لئے بہتر ہوگا......''

وہ جھنجلا کر پھوٹا۔ ''ایک تو تم میں صبر بالکل نہیں ہے نہ ہی ادب آداب ہیں' شاید تم سارے پاکستانی ایسے ہی......''

میں بھنک سے بھڑک گیا۔ ''دیکھو مسٹر جیکب! ذاتیات سے بات قومیات تک مت لے جاؤ ورنہ مجھے بھی یہودیت کی تاریخ' تمہیں ازسرِنو سنانی پڑے گی اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رُوحیانیات کے علاوہ تاریخ بھی میرا پسندیدہ موضوع ہے......''

وہ خجل سا' سوری سوری کرنے لگا۔ پھر گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''آج پہلا دن اور پہلا کھانا صرف تمہاری بچوں کی سی عادت' بیہودہ قسم کی غلط فہمی کی وجہ سے غارت ہو گئے ہیں۔ آنٹی تو اب کھانے کی جُوٹھی پلیٹیں سمیٹ رہی ہوگی' وہ تو دو منٹ کی لیٹ برداشت نہیں کرتی اور یہاں تو تمہاری بک بک جھک جھک میں پندرہ منٹ اوپر ہو گئے ہیں......''

''تم بات پوری کرو گے یا میں اُٹھوں اور جاؤں؟'' میں نے گھٹنوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

جیکب نے پھر داستانِ امیر حمزہ شروع کر دی۔

''خان! میں اِک عرصہ سے آنٹی آمیرے ڈیوڈ کی شخصیت' پُراسراریت اور اس کی ماورائے

فوق الفطرت وطبیعاتی علمی استعداد کا بنظرِ غائر جائزہ لے رہا ہوں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کسی حد تک استفادہ بھی کر رہا ہوں۔ میں آج تم سے ایک اہم بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک حکایت سُنانا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ تم یہ جان سکو کہ یہودی' انسان تو کیا' اپنے خدا پہ بھی اجر اور جزاء کے معاملہ میں اعتبار نہیں کرتا۔ اس کی سرشت میں ہی اعتبار اور پیار کرنا شامل نہیں ہے۔

● یہودی فلسفۂ اعتماد......!

حکایت یوں ہے کہ ایک بوڑھا کاروباری یہودی جب اپنی لاعلاج علالت کی وجہ سے سر پڑی کاروباری ذمہ داریاں پوری طرح نبھانے سے قاصر ہو گیا تو اس نے اپنے نابالغ اکلوتے فرزند کو اپنی جگہ تفویض کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ایک خدشہ اُسے رہ رہ کر پریشان اور فکرمند کر رہا تھا کہ بچہ ابھی کچا اور کاروباری معاملات کی ہیرا پھیری سے ناواقف ہے۔ چونکہ جلد سے جلد بیٹے کو اپنی جگہ پہ بٹھانا اس کی مجبوری اور ضرورت بن چکا تھا اس لئے خرانٹ بوڑھے نے فوری طور پر اسے وہی اول سبق پڑھانے کا سوچ لیا جو کبھی اس کے باپ نے اسے پڑھایا تھا اور جس کے نتیجہ میں ابھی تک اس کی کمر میں ریڑھ کا مہرہ اپنی جگہ سے کھسکا ہوا تھا۔ بوڑھے بوبک نے بیٹے کو اوپر کوٹھے پہ چڑھا دیا اور خود نیچے صحن میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو بڑی مہربان سے حکم دیا کہ وہ نیچے چھلانگ لگائے' جونہی وہ نیچے آ رہا ہوگا تو وہ اُسے اُچک کر سنبھال لے گا۔ فرمانبردار بیٹا باپ کی یہ عجیب سی بات' خواہش اور حکم سُن کر بڑا پریشان ہوا۔ اس کی کچی عقل ابھی باپ کی پکی بات کو سمجھنے سے عاجز تھی' آخر اس نے اپنے مہربان باپ سے اس ڈرامے کی وجہ اور حقیقت پوچھ ہی لی۔ تجربہ کار باپ نے بڑے محبت اور شفقت سے کہا کہ جانِ پدر! میں اب ناکارہ اور بوڑھا ہو گیا ہوں' تم میری اکلوتی اولاد اور میری ہر چیز کے بلاشرکتِ غیرے وارث ہو لہٰذا آج میں تمہیں ایک سبق دینا چاہتا ہوں جو تمہاری آئندہ تمام زندگی اور کاروباری معاملات میں کام آئے گا۔ اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بلا کسی تردد و خوف آنکھیں بند کر کے نیچے صحن میں چھلانگ لگا دو......بچہ کبھی بلندی' کبھی صحن اور کبھی باپ کو دیکھ دیکھ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ ڈرتے ڈرتے بچہ زبان کھولی اور اپنا خدشہ خوف بیان کیا کہ اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے کے لئے میرے پاس حوصلہ نہیں' نیچے گرنے سے میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتے ہیں یا آپ سے مجھے سنبھالنے میں کوتاہی ہو سکتی ہے۔ آخر آپ مجھے اور خود کو ایسی آزمائش میں کیوں ڈالنا چاہتے ہیں؟......گھاگ باپ بڑی مکاری سے سمجھانے کا

کہ بیٹا! یہ سب کچھ جو ہمارے اردگرد بکھرا ہوا ہے اِک کارخانۂ آزمائش ہی تو ہے۔ ہمارے پیغمبروں' نبیوں اور اُن کی اولادوں پہ بھی آزمائشیں ڈالی گئیں تاکہ وہ دانش' دبدبہ اور دلگیری و درماندگی کا درماں حاصل کرسکیں' آزمائش ہمارے اسلافِ کبار کی سنتیں اور صفتیں ہیں لہٰذا میرے جگر گوشے! تُو بھی آزمائش پہ پورا اُتر اور اس سے حاصل ہونے والی نصیحت کو مضبوطی سے پکڑ۔ تو زیتون کے پکے ہوئے پھل کی مانند نیچے آ' تیرا مُشفق و مستعد باپ تجھے اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں بھر لے گا' بھلا باپ سے زیادہ دُنیا میں قابلِ اعتماد ہستی اور کون ہو سکتی ہے؟ شاباش! دل پکا اور مضبوط کر۔ اپنے مہربان باپ پہ بھروسہ کرتے ہوئے چھلانگ لگا دے...... باپ کی بریفنگ سے بیٹے کا دل و دماغ سُن ہو چکا تھا۔ زبردستی آنکھیں بند کیں' دانت بھینچے اور جی کڑا کر کے نیچے چھلانگ لگا دی۔ عین اسی لمحہ بوڑھا اپنی جگہ سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور لڑکا پتھروں کے فرش پہ گر کر اپنے گوڈے تڑوا بیٹھا۔ جب وہ دو ماہ کے لئے بستر پہ پڑ گیا تو بوڑھے غمگین باپ نے جی جان سے اپنے اکلوتے' جان سے پیارے بیٹے کی تیمارداری کی' کئی رات دن جاگتی آنکھوں میں نکال دیئے' روپیہ پیسہ پانی کی مانند بہا دیا۔ بیٹا قدرے تندرست ہوا تو اُسے بتایا کہ یہی تمہارے لئے سبق ہے کہ سگے باپ پہ بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا لہٰذا زندگی ہو' پیار یا بیوپار' دوستی' رشتہ داری' سیاست یا محبت کسی پہ بھی اعتماد نہ کرنا......"

وہ سگریٹ سُلگانے کی غرض سے پل کے پل خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

"تمہاری حکایت جو پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ میں پڑھ اور سُن چکا ہوں یقیناً اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ اب کچھ مزید کہنے کو ہو تو وہ بھی کہہ ڈالو۔"

اُس نے ایک نظر گھڑی پہ ڈالتے ہوئے پھر وہیں سے بات شروع کر دی۔

"خان! میں نے یہ حکایت صرف اس غرض سے سُنائی کہ اصل بات جو میں بتانا چاہ رہا ہوں' وہ تم اس حکایت کے تناظر میں اچھی طرح سمجھ سکو...... میں نے تمہیں شاید یہ نہیں بتایا کہ آنٹی کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ دس برس پہلے اس نے مجھے قانونی طور پہ اپنا مُتبنّیٰ بنا لیا تھا' ویسے بھی میں رشتے میں اس کا سیکنڈ پورشن میں بھتیجا لگتا ہوں۔ ہائی سکول تک میں آنٹی کے پاس اسی جزیرے میں رہتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آنٹی نے میرا ہر طرح سے خیال ہی نہیں رکھا بلکہ مجھے بے پناہ پیار و محبت سے بھی نوازا۔ میرے تعلیمی تفریحی مصارف' مشاغل' ٹور ہالیڈے وغیرہ۔ مجھے سگے بیٹے سے بڑھ کر ہر وہ نعمت سہولت بہم پہنچائی جس کی میں کبھی خواہش کر سکتا تھا...... اُٹھتی جوانی کی خرمستیاں بڑھیں۔ اب میں چوری چوری سگریٹ اور شراب بھی پینے لگا تھا۔ نہ جانے آنٹی کو کیسے خبر ہو گئی لیکن بجائے منع کرنے یا ڈانٹ ڈپٹ کے

آنٹی نے مجھے اعلیٰ قسم کی شراب اور سگریٹ بھی مہیا کرنے شروع کر دیئے۔ بات آگے بڑھتی ہے' یہ معلوم ہونے پہ کہ مجھے اب لڑکیاں بھی اچھی لگنے لگی ہیں تو آنٹی نے مجھے ایسی پارٹیوں میں بھیجنا شروع کر دیا جہاں خوبصورت ونو خیز دوشیزاؤں کی آمد آمد ہوتی۔ یہاں تک کہ آنٹی نے میری چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی' اچھی بُری' جائز ناجائز خواہش کو ہر ممکن پورا کیا۔ ظاہر ہے کہ اب میں سنِ بلوغت کو آ لگا تھا۔ شہر کی ہمہ ہمیوں' گہما گہمیوں اور حُسن و جمال' آہنگ و رنگ کی جھلملاہٹوں سے الگ تھلگ یہ جزیرہ اب مجھے کالے پانی کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ چپہ سی زمین' سرِشام ہی اُداسی اور اندھیرے کا احساس اُجاگر ہو جاتا۔ نمدار ہوا' مچھلیوں کی باس' پرندوں کا شور اور آتے جاتے چھوٹے بڑے سٹیمروں اور جہازوں کے وسل سیٹیاں...... ملازم سارے دن کے تھکے ہارے' رات کا کھانا کھاتے ہی لمبے پڑ جاتے اور آنٹی کھانے اور دُعا کے بعد ایک اپنا مخصوص لباس پہنتی اور جزیرے کے شمالی حصے میں اپنے مخصوص معبد میں عبادت کے لئے اُتر جاتی۔ میں اُداس سا تنہا اپنے ہٹ یا باہر سمندر کنارے بیٹھا سگریٹ اور شراب سے دل بہلاتا رہتا یا ڈور ڈالے مچھلیوں کے پھنسنے کا انتظار کرتا رہتا۔ آنٹی کے آگے دم مارنے کی ہمت نہ اس ماحول سے بغاوت کرنے کی جرأت' بڑی بے کیف سی زندگی' کئی بار سمندر میں غرق ہونے کو جی چاہا۔ اچانک آنٹی کو مجھ پہ رحم آ ہی گیا اس نے کھانے کی میز پہ مجھے مژدہ سنایا کہ تم ڈنڈی کے گرامر سکول میں نامزد کر لئے گئے ہو اور ٹھیک دو ہفتے بعد تم یہاں سے وہاں سکول کے ہوسٹل میں منتقل ہو جاؤ گے۔ ہر ویک اینڈ پہ تمہیں یہاں آنے کی اجازت ہوگی۔ آنٹی نے ایک بڑا سا پیکٹ میرے آگے دھرتے ہوئے بتایا یہ تمہارے سکول' تمہارے سلے بس' کتابیں' سٹیشنری' یونیفارم' کھانے کے مینیو' سپورٹس' تفریحات اور سکول و ہوسٹل کے قوانین وضوابط کے متعلق کتابچے ہیں۔ دو ہفتوں میں ان کا خوب مطالعہ کرو۔ مزید کتابیں' سٹیشنری' یونیفارم اور سپورٹس کٹ' جانے سے ایک ہفتہ پہلے تمہیں مل جائیں گے۔ پھر دو فارم اور قلم میری جانب بڑھا کر حکم دیا کہ کراس والی جگہوں پہ دو دو دستخط کر دو۔ سکول کے قریب فشر سٹریٹ برانچ بنک آف سکاٹ لینڈ پرسنل اکاؤنٹ میں تمہارے نام دو سو پونڈ ڈیپازٹ کروا دیئے گئے ہیں جو تمہاری صرف ذاتی ضروریات کے لئے ہوں گے......''

میں دم سادھے ہوئے اس کی ''ہذیان'' سُننے میں مگن یہ بھی جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس ساری کتھا میں میرے لئے دلچسپی کا سامان کہاں ہے؟...... اچانک اُسے پھر سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ اِدھر اُس کے ہاتھ سگریٹ رول کرنے میں مصروف ہوئے اور اُدھر میرے لب آمادۂ استفسار ہوئے۔

''جیکب! اس تمہاری پرسنل ڈاکومنٹری کی اور کتنی قسطیں باقی ہیں' یا پھر یوں کرو کہ مجھے صرف

وہ حصہ سُنا وہ جو بقول تمہارے' میرے لئے سُننا انتہائی اہم ہے......''

''وہ میرے کاٹ دار طنز کو محسوس کرتے ہوئے' کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دینے ہی والا تھا کہ میں نے فوراً اُسے خبردار کر دیا۔

''دیکھو' جیکب! کچھ بھی کہہ لینا لیکن تم نے اگر پاکستانی کے الفاظ استعمال کئے تو میں تمہیں پوری سورۂ اسرائیل قرأت کر کے سُنا دوں گا......'' اُس کے کُھلے ہوئے ہونٹ بھنچ سے گئے' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''تم تو ہر پانچ منٹ بعد سگریٹ پی کر اپنے دماغ کے خُلیوں اور پیٹ کی کھپاؤں کو نکوٹین کا زہر فراہم کر دیتے ہو اور میں صبح سے اپنے خالی پیٹ کو تمہاری جج جج اور بک بک کی یورت کے سلفر ایسڈ سے جلا رہا ہوں...... تاہم دیکھو۔ تم یہودی ہو' تمہارے لئے تو مَن وسلویٰ کہیں سے اتر آئے گا اور میں اَلحمدُللہ' مسلمان ہوں' کوئی حیلہ وسیلہ کروں گا تو اللہ رزق دے گا......''

وہ آدھا سگریٹ ایک ٹوٹی ہوئی سیپی سے مسلتے ہوئے بولا۔

''یار! بھوک کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے لیکن اس وقت آنٹی سے سوائے جھڑکیوں کے اور کچھ کھانے کے لئے نہیں مل سکتا...... ہاں' یاد آیا۔ میرے پاس کچھ کاجو اور مونگ پھلی پڑی ہے...... جھونپڑی میں چل کر اسی سے گزارہ کرتے ہیں......''

ہٹ میں تخت درازوں پہ بیٹھے ہم کاجو اور مونگ پھلیاں ٹونگ رہے تھے کہ مادام ایک تُند و تیز لو کے جھکڑ کی طرح مع ایک کھانا بردار ملازم کے اندر داخل ہوئی اور بغیر کسی تمہید کے ہی شروع ہو گئی۔

''جنٹلمین! آج آپ کا پہلا روزہ ہے اور مجھے بھی احساس ہے کہ آپ دونوں صبح سے بھوکے بھی ہیں اس لئے کھانا لے کر آئی ہوں لیکن آئندہ ایسا دُہرایا نہیں جائے گا۔ کھانا صحیح وقت پہ وہیں ملے گا......''

کھانا رکھ کر وہ مجہول سے ملازم کے ساتھ پاؤں پٹختی ہوئی نکل گئی اور ہم کھانے پہ ٹوٹ پڑے۔ تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے چپس' اُبلی ہوئی گوبھی' مٹر' پھلیاں اور ٹماٹر۔ ڈبل روٹی اور مکھن بھی تھا...... جو بھی تھا' لذیذ اور پیٹ پسند تھا۔ کھانے کے بعد میں تخت پہ نیم دراز سا پڑ کر خلال کرنے لگ گیا اور جیکب' وہی اس کا پرانا دھندہ یعنی سگریٹ سازی میں جُت گیا تھا۔ میں خود ہی پوچھنے لگا۔

''جیکب! تم نے اس تُند خُو آندھی کے ساتھ ایسا لمبا عرصہ کیسے گزار لیا' تم تو بڑے ہی مَن موجی اور ملائم الطبع انسان ہو......؟''

''تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں آنٹی آیرے ڈیوڈ کا مُنہ بولا بیٹا اور اس کا قانونی وارث ہوں' اس

کی نیازمندی میں اور اس کی زیرِ کفالت رہنا میرا اخلاقی اور انسانی فرض ہے جبکہ اس کے ساتھ افہام و تفہیم کی فضا کو خوشگوار بنائے رکھنا میری قانونی مجبوری ہے......''

میں نے اُسے لفظی تھاپڑا لگایا۔

''واہ جیکب' یُو آر گریٹ گائے...... اچھا' اب ایک اور بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ ایسی کٹر یہودن' ٹوٹ کر پیار کرنے والی ماں' احساسِ ذمہ داری سے مالا مال عورت' عصری تقاضوں اور قدامت پرستی کی اقدار کو ایک ساتھ لے کر چلنے والی پڑھی لکھی ہستی جس کا نام مادام آبیرے ڈیوڈ ہے' اس نے اپنے بیٹے یعنی تمہیں خود ہی شراب کباب لا کر دیئے' لڑکیوں کی جانب رجوع کرنے میں معاونت کی۔ نائٹ کلب کیسینو کی ممبر شپ اپنے ریفرنس سے دلوائی یعنی ایک ماں نے اپنے بیٹے کو کسی بُرائی کسی گناہ' کسی گندگی اور کسی دلدل میں اُترنے سے نہیں روکا...... مائی ڈیئر جیکب! مادام کی شخصیت' حیثیت' محبت اور علمیت کا یہ انداز اور انوکھا پہلو کم از کم میری ناقص سمجھ میں نہیں آیا......؟''

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے تولتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم بات مختصر اور کم سے کم آسان الفاظ میں نہیں کر سکتے؟...... تمہاری باتیں سُن کر ان پہ غور کرنے' انہیں [illegible] اور وہ [illegible] ڈالوں اور اگر ایسا نہ کر سکوں تو پھر خودکشی کر لوں۔ تمہاری گمبھیر باتوں' لفظوں کے گورکھ دھندوں سے محفوظ رہنے کا کوئی راستہ نہیں...... ویسے میرے ان ریمارکس کو دل پہ نہ لینا......؟''

''نہیں' جیکب! میں نے قطعی تمہارے ریمارکس کا بُرا نہیں مانا۔ تمہیں اپنی رائے کے برملا اظہار کا پورا پورا حق حاصل ہے اور تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں ذرا تفصیلی آدمی ہوں' میں بڑے بڑے پہاڑوں پر چڑھنے کی بجائے لق و دق صحراؤں میں بکھرنا' ذرے ذرے کو کھوجنا' دریافت کرنا اور اس کے باطن میں اُترنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مختصر' آسان' ٹیڑھے میڑھے اور نشیب و فراز کی کُلفتوں سے مبرا راستے مجھے سفر کی برکت اور ذوقِ آوارگی کی لذت سے محروم کر دیتے ہیں۔ جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بات مختصر ہو مگر جامع ہو' مختصر سی مسجد جامع مسجد کیسے ہو سکتی ہے۔ افہام و تفہیم کے لئے اختصار استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا گیا کہ کلام کرو کہ علم سیکھو اور سکھا سکو اور سکوت اختیار کرو تا کہ تم غور و فکر کر سکو۔ کثرتِ کلام یا قلتِ کلام ماحول' مجلس' موضوع اور موزوں یا ناموزونی طبع کے سیاق و سباق پہ منحصر ہوتا ہے......''

جیکب اُٹھ کھڑا ہوا جیسے کہیں جانے کا ارادہ کر رہا ہو۔

''کدھر......؟''میں نے اپنی رواں بات کو ایمرجنسی بریک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''تم چالو رہو...... میں نے ذرا سی بات کیا کر دی' تم نے تو میکبتھ ڈرامہ پڑھنا شروع کر دیا...... ویل ڈن! تم اپنے طور لگے رہو' میں اتنی دیر لیٹرین کا چکر لگا آتا ہوں...... اور سُنو! تم اتفاق سے اُن لوگوں میں سے ہو جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ نصیحت اور صائب مشورہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے......''

اس سے پیشتر کہ میں اپنی اس عزت اور قدر افزائی کے لئے اُس کا شکریہ ادا کرتا' وہ نابکار لیٹرین میں گُھس چکا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ اب آدھے پونے گھنٹے کے لئے لمبا ہی گیا ہے۔ وہاں ''پُرسکون ماحول'' میں بیٹھ کر چار پانچ سگریٹ پھونکے گا' قدیمی عبرانی زبان کا ایک لوک گیت گائے گا جس میں کہا گیا ہے کہ میرے ہم نفس! میں نے یہ پنج شاخہ شمعدان گُل کر دیا ہے کیونکہ مجھے تیرے اِن خوبصورت ہاتھوں کی اُنگلیوں پہ کئی روشن مہتاب اُترتے دِکھائی دے رہے ہیں۔ پھر موڈ ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے جھپکی بھی لے لے گا اور پھر اگر یاد آیا کہ وہ یہاں کس ضرورت سے آیا تھا تو اس سے فراغت حاصل کر کے باہر نکلے گا۔ زپ چڑھانا بھول جائے گا' کسی دوسرے کی نشاندہی پہ ''سوری'' کہہ کر وہیں کھڑے کھڑے زپ اُوپر کر لے گا...... میں اُس کی فراغت تک کے وقفے میں ذرا [illegible] کر کے تختے پہ نیم دراز ہو گیا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام بھی اپنی مشک بار زلفیں کھول رہی تھی۔ شفق کا آسمان پہ رنگ گھولنا' معشوق کا گیسوؤں کو کھولنا' ہم نفسوں کا باہم سانس رولنا' چندن کاٹھ کو تولنا اور محبوب سے جھوٹ بولتے ہوئے' عود و عنبر کو مُونگلی سے توڑتے ہوئے ایک ناقابلِ فہم سی مہک کا احساس اُبھرتا ہے۔ یہ مہک یا خوشبو ہر کس و ناکس محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ان نعمتوں سے محظوظ اور انہیں محسوس کرنے کے لئے اِنسان کی ظاہری' باطنی تمام تر لطیف و نفیس حسّوں کا زندہ و تابندہ ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔

● ایرانی عقیدت مند......!

میرے باباجی کا ایک ایرانی مُرید ہر برس رمضان المبارک میں شیراز سے کالے کوسوں کا سفر طے کر کے زیارت کے لئے حاضر ہوتا تھا۔ یہ کمر خمیدہ باوقار ایرانی عطر و خُوشبویات کا بہت بڑا مُوجد اور تاجر تھا۔ اس کے اپنے ذاتی گُلستان' نباتات کے ذخیرے اور قطعات تھے۔ اس رجلِ رشید کا تعلق شیراز کے اُس عطر کشید کرنے والے قدیم سلسلے سے تھا جو صدیوں سے اس تجارت اور کسب و ہُنر سے وابستہ تھا' ان کی مصنوعات کی پذیرائی نہایت اعلیٰ سطح پہ کی جاتی تھی۔ ملکی' غیر ملکی بادشاہ شہزادے' اُمراء' رؤسا اور

اصحابِ حشمت و جاہ ہی اُن کے بڑے بڑے خریدار ٹھہرتے تھے۔ آقائے فریدوں شیرازی اکثر ماہِ رمضان شروع ہونے سے دو چار روز پہلے ہی پہنچ جاتا تھا۔ اس کے بھاری بھرکم سامان میں ایک موی نمدے میں لپٹی صندل کی چوب سے بنی ہوئی منقش صندوقچی علیحدہ ہی ہوتی تھی۔ صندوقچی کے اندر زربفت کے پانچ گوشے شال میں ملفوف ہاتھی دانت کا ایک مخمس شکل کا عطردان ہوتا جس پہ خالص سونے سے بے نقش و نگار اور سونے کی ہی تالا چابی ہوتی۔ اِس کے اندر دیبا کے پنج گوشہ سیاہ رومال میں لپٹی ہوئی سنگِ یشب کی ننھی سی بوتل اور اس کے اندر عطرِ گِل (مٹی کا عطر) عجیب بے رنگ و بُو سا مائع...... بابا جی کو اکثر جمعہ کے روز پیشانی پہ سجدہ والی جگہ کے عین اوپر عمامہ پہ شہادت کی اُنگلی سے لگاتے دیکھا' نصیبوں نے یاوری کی تو یہ مقدس عطرِ گِل ہمیں خود بابا جی کو لگانے کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی۔ ہر بار یہی خواہش پیدا ہوئی کہ اس نادر اور پُراسرار عطر کے باطن اور اس کے روحانی خواص سے ہمیں کچھ قدر آگاہی حاصل ہو سکے لیکن اس وقت تو یہ خواہش ہماری حسرت ہی بنی رہی۔ خوش قسمتی سے قدرت نے ایک موقعہ خود ہی فراہم کر دیا۔ بابا جی بڑے [illegible] مگن تھے' خوش وقتی میسر تھی۔ یہ وقت' ایسی ساعتیں طالبانِ حق خواہ وارفتگانِ جستجو کے لئے اک نعمتِ غیر مترقبہ ہوتیں ہیں۔ اک واضح اشارہ ہوتا تھا کہ فقر کا دَرِ دولت [illegible] کھلا ہے۔ مانگو' پوچھو اور چاہو۔ [illegible] جلوئیں ہوں تو پروانے آ ہی جاتے ہیں اور پروانوں میں ذوقِ خاکستری ہو تو وہ شمع ڈھونڈ ہی لیتے ہیں' نہ ملے تو اپنے اندر سے نکال لیتے ہیں یعنی جن کو جلنا ہے وہ آرام سے جل جاتے ہیں۔ جب سر پھوڑنا ہی مقدر ٹھہرے تو پھر پتھر کیا آستاں کیا...... اس وقت مجالسِ عام و خاص برخواست تھیں' مجھ سمیت تین خدامِ خاص حاضر باش تھے۔ دو تو پاؤں دبا رہے تھے اور میں کاندھوں کو پولے پولے ہاتھوں سے سہلا رہا تھا' بلا ارادہ میرے مُنہ سے موتی سی ایک بات نکل گئی۔

"بابا جی! پسند فرمائیں تو سر کی چادر پہ ہلکا سا عطر لگا دوں' مزاج مزید خوشگوار ہو جائیں گے......"

میں چونکہ پُشتِ مبارک کی جانب بیٹھا تھا اس لئے مجھے بابا جی کے چہرے پہ آتے ہوئے کسی تاثر کا علم نہ ہو سکا۔ بات تو میں کر چکا تھا' جواب ندارد...... پاؤں دابنے والوں کی جانب دیکھا' دونوں سر جھکائے پاؤں دابنے میں مگن تھے۔ وہ ویسے بھی چپ کی گُڑھتی والے تھے اور میں بڑبولا' بکواسی۔ ہر وقت کاگا کی "کیا کیا' کیوں کیوں" کرنے والا۔ کبھی کبھی تو میں اپنی بک بک بکنے والی عادت سے خود ہی عاجز آ جاتا تھا' ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتا کہ جواب دینے والے یہ سوچنے لگتے کہ یہ بلونگڑا جواب سُننے سمجھنے کا متحمل ہے بھی یا نہیں؟ وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتے' یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن میری اس اچھی

بُری عادت سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میرے علم اور معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا' خود اعتمادی بڑھی' علم کلام و بیان کی ترویج ہوئی۔ سوچ' سمجھ اور عمل میں استحکام پیدا ہوا۔ اب یہاں بھی بنا سوچے سمجھے مُنہ سے بات نکال کر پچھتا رہا تھا کیونکہ ابھی تک جواب نہیں ملا تھا' لگتا تھا کہ جیسے بابا جی کی خوش وقتی اور شگفتگی میں کچھ خلل واقع ہوا ہے۔ اندر سے کلیجہ پنکھے کی طرح کانپنے لگا' مختلف خدشات کے سانپوں نے پھن اُٹھانے شروع کر دیئے۔ میرے ساتھ کچھ ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بلا سوچے سمجھے' وقت بے وقت' جو بھی مُنہ آتا پوچھ بیٹھتا۔ کہیں بدگمانی اور بے صبری کا مظاہرہ ہو جاتا' کبھی اپنی ذات اوقات سے چنداں بڑھ کر بات مُنہ سے نکل جاتی اور بعد میں پچھتاوا رنگ لاتا۔ یہی کچھ ابھی بھی مجھ سے سرزد ہو چکا تھا۔ میرے تجربے میں آیا ہے کہ تردّد' خوف و اندیشہ' یہاں تک کہ سوچ و بچار' خیالات اور وساوس بھی ایک سریع الاثر بجلی کی رَو کی طرح ہوتے ہیں۔ میرے ایسے بے جوڑ سے بے تکلے چونکہ اپنی کم ظرفی کے ہاتھوں اَرتھ ہوتے ہیں اس لئے فوراً انہیں جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے ہیں' ان کے اندر باہر اُتھل پتھل سی مچ جاتی ہے۔ خون کا فشار' چہرے کی رنگت' آنکھوں کے پھیلاؤ میں کشادگی' دل کی دھڑکن میں اضافہ اور بے اعتدالی' ہاتھ پاؤں میں تشنج' یعنی ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے...... باباجی نے میری کیفیت کو یقیناً محسوس کر لیا تھا' میرے ہاتھ کی [illegible] پر اپنا دستِ شفقت رکھ کر فرمایا۔

''استغفر اللہ!...... یہ کیا تم نے چکی سی چلا رکھی ہے۔ دھڑ دھڑ' کیا اپنے اندر پتھر کوٹ رہے ہو؟''

● گُلِ شبو......!

باباجی نے پاؤں دابنے والوں کو اشارے سے رُخصت فرماتے ہوئے مجھے کمرے کے اندر سے ''گل شبو'' یعنی عطروں والی صندوقچی باہر لانے کا حکم دیا۔ میں حُکم کی تعمیل میں فوراً حُجرے میں گیا۔ مخمل کے معطّر غلاف میں لپٹی صندل کی بے گانٹھ لکڑی سے بنی ہوئی پنج گوشہ صندوقچی کو بازوؤں میں بھرا' انتہائی احتیاط و شوق سے اُٹھا کر باہر باباجی کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ باباجی کے حُکم اشارے سے میں نے بسم اللہ پڑھ کر غلاف علیحدہ کیا۔ سونے کی چابی ایک ریشمی ڈوری سے بندھی صندوقچی کے شکمی تالے میں ہی پڑی ہوئی تھی۔ چابی گھمائی' مسجد کے گنبد جیسا ڈھکن اُٹھایا۔ اندر چھوٹے چھوٹے مخمس خانے بنے ہوئے جن میں روئی پڑی ہوئی تھی۔ مختلف جسامتوں اور رنگوں والی شیشیاں بھی مخمس یعنی پانچ گوشوں والی تھیں۔ آج یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں صندوقچی اُٹھا کر لایا تھا اور خود ہی کھولا تھا' اس سے پیشتر صرف باباجی ہی کھولتے

اور بند کرتے تھے وہ بھی حُجرے کے اندر' باہر صرف عطر کی شیشی ہی لائی جاتی تھی۔ سرکار بابا جی اپنے عمامہ پہ عطر خود لگاتے یا کبھی کبھی مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہوتی مگر آج تو کمال ہی ہو گیا تھا۔ عطور کی صندوقچی کھلی ہوئی میری ناک کے نیچے پڑی ہوئی تھی اور میں بابا جی کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ ہم بابا جی کے سامنے سر نیہوڑ کر قعدے کی حالت میں بیٹھا کرتے تھے۔ آنکھیں رُوبرو' ہاتھ ناف پہ باہم بندھے ہوئے۔ کیا مجال جو ذرا سی بھی جنبش یا حرکت ظہور پذیر ہوتی۔ پاؤں سُن ہو جائیں یا خون کی روانی سُست پڑ جائے۔ گھٹنے ٹخنے سُوج جائیں یا نفس پہ نس سواری کر بیٹھے' چاہے جو بھی ہو' آسن میں جنبش اور محویت میں خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔ تزکیہ نفس کے ضمن میں ایک ابتدائی مشق' صاحبانِ ذوق وشوق کے لئے بڑی ممد ثابت ہوتی تھی۔ یہ یوگا اور مراقبات' ریاضتیں' مجاہدے' چلے' مختلف عبادات اور نشست و استادگی کے آسن' یہ سب تزکیہ نفس اور تسخیرِ ذات کی منزل کے سنگِ میل ہیں۔

میں اسی مراقبے کے آسن میں سامنے عطور کی صندوقچی کھولے بابا جی رحمتہ اللہ علیہ کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ انتظارِ حکم میں بڑی تحمل سی ساعتیں بیت گئیں۔ نامعلوم' نامحسوس سا غبار جیسے میرے دل و دماغ پہ چھاتا جا رہا تھا۔ میرا مادی جسم جیسے آہستہ آہستہ کافور کی مانند تحلیل ہو رہا تھا۔ آنکھیں' نتھنے' ناک کی جڑ' لبوں کے کنارے' ابرو اور کان کی لویں' کنپٹیاں جیسے ان کے جوڑ کھل گئے ہوں یا یہ اعضا پھیلتے جا رہے ہوں۔ سر پہ مساموں نے بالوں کی جڑیں چھوڑ دی ہوں۔ دماغ سُن ہوا' پھر آنکھیں مندھ گئیں۔ جسم کا پہلوان' چاروں شانے چت بیچ اکھاڑے میں پڑا تھا..... ''ڈگ' ڈگا ڈگ'' ڈھول پٹ رہا تھا۔ سر پہ بڑا سا کالا پگڑ باندھے خلیفہ جی چاروں جانب گھوم گھوم کر مٹھیاں بھر بھر تازہ تازہ سُوندھی سُوندھی مکھن ملائی کی طرح نرم و ملائم مٹی میرے جسم پہ ڈال رہے ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ مٹی میرے جسم پہ پھینکی جا رہی ہے لیکن اس مٹی کا اصل جوہر رِس رِس کر میرے وجدان میں سرایت کرتا جا رہا ہے' جس سے میری رُوح تک سرشار و سیراب ہو رہی ہے' یہاں تک کہ میں نہال سا ہو گیا۔ میرے اندر جیسے زمین اُگ رہی ہو۔ سُوندھی سُوندھی خوشبو والے مٹی کے ٹیلے' پہاڑ' سر اُٹھا رہے ہوں۔ درخت' پودے' پھل پھول۔ انسان' حیوان' چرند پرند۔ سونا چاندی' ہیرے جواہر۔ ہر چیز' ہر شے مٹی سے جنم لے رہی ہو اور پھر مٹی میں ہی تحلیل ہو رہی ہو۔ کالے پگڑ' گھمبیر مونچھوں' جوگیا رنگ کا کرتہ' سفید تہبند اور سُرخ چادر والے خلیفہ جی نے پھر ایک بڑا سا مٹکا پانی کے قلزم سے بھرا ہوا میرے مٹی مٹی گوندھے ہوئے جسم اور پیاس سے تڑپتے ہوئے جسم پہ پتلی دھار ڈالا۔ غبار اور دھواں دُھند سا اُٹھا اور پھر آہستہ آہستہ پانی کا جوہر' غبار میرے وجدان میں اُترنے لگا' حتیٰ کہ میری رُوح تک جا پہنچا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے یہ میں اور مابعد جو بھی ہے' سب کچھ

پگھل کر قطرہ بہ قطرہ، لہر بہ لہر، موج در موج اک بحرِ بے کنار سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔ کئی صدیاں، کئی قرن میرے اسی منزل میں بیت جاتے ہیں۔ ہر بوٹا پتا، مرد و زن، مسجد و معبد، پرند چرند، وحوش آبی مخلوق، سیاہ و سفید، سب کچھ پانی پانی ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچتا جز اک چمکتے ہوئے تابندہ سورج کے جو نصف النہار پہ اپنی پوری تابانیوں سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ یکایک اس کی دل افروز تمازت میں تندی سی در آتی ہے یہاں تک کہ پانی بخارات کی صورت اُڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر جاندار اور بے جان جل جھلس کر راکھ میں تبدیل ہو کر عنقا ہو جاتا ہے۔ پھر کئی زمانے اسی جلن جھلس میں بیت جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک معصوم سی پُروائی، باغ عدن سے اٹھلاتی ہوئی کہیں رستہ بھول کر ادھر راہ پہ آ جاتی ہے۔ مجھے اک تیز سی مہک کا شدت سے احساس ہوتا ہے، ایک بھرپور سی چھینک آہنگ کا رنگ اُڑاتی ہوئی اُبھرتی ہے، میرے مُنہ سے فوراً ''الحمدُ للہ'' نکلتا ہے اور اُدھر خلیفہ جی ''یرحمک اللہ'' سے جواب دیتے ہیں۔ آنکھ کھلتی ہے تو بابا جی مسکراتے ہوئے ڈھکنے کی شیشی کو گُلِ شبو میں رکھ رہے ہوتے ہیں۔ گُلِ شبو صندوقچی کو سرکا کر بابا جی نے اپنے سامنے دھر لیا ہوتا ہے۔ میں گُلِ شبو کو یوں آنکھیں بچا کر دیکھتا ہوں جیسے وہ عطور کی نہیں، کالے ناگوں کے فتور کی پٹاری ہو...... بابا جی بکمال شفقت [illegible] گویا ہوتے۔

''رازِ [illegible] معرفت و حقیقت [illegible] کے [illegible] سمجھنے اور جاننے کا کوئی موقع اور ایک وقت ہوتا ہے۔ وقت، تحمل اور جذب کی صحت کے بغیر ان میں سے کسی ایک کی بھی طلب و جستجو کرنا اپنی ہلاکت کا سبب ہی ہو سکتا ہے...... مجھے یقین ہے کہ تم نے عطرِ گل کی اصل حقیقت اور اس کی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کر لی ہو گی اور شاید یہ بھی جان چکے ہو گے کہ عطرِ گل کے علاوہ عطرِ آبِ رواں، عطرِ آتش اور عطرِ بادو باراں بھی ہوتا ہے۔ ان عطور کی مقدار بھی گلِ شبو میں موجود ہے۔ ان کے ڈھکن کھلنے، دیکھے جانے اور سُونگھے بغیر انہیں صرف لانے سے ہی تمہاری یہ کیفیت ہو گئی اور سُونگھ لیتے تو کیا ہوتا؟ اسی لیے گُلِ شبو کو لانے، کھولنے اور دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ تم اپنی خواہشوں کے ٹٹوؤں کو ذرا باندھ کر رکھا کرو۔ مزید جانو کہ خوشبوئیں، مہکاریں، دلپذیر پھواریں، جلوتیں، کرنیں، یہ سب ذات کی گھاتیں ہوتی ہیں۔ کشتے، تریاق، اکسیر، جوہر، عروق، عطور وغیرہ، یہ مخلوقات، معدنیات، جمادات کے باطنیات کے اصل جوہر ہوتے ہیں جو اپنے تمام تر خواص و خصائل کے ساتھ ہر کسی پہ نہیں کھلتے مگر جسے اللہ ایسی حسِ شامہ اور دریدہ دم دماغ دے......''

بات انسان کی باطنی نفیس و جمیل حسوں کی ہو رہی تھی کہ میں جب ہلکی سی نیند لے کر بیدار ہوا تو عروسۂ شام نے اپنی عنبریں زلفیں جھٹک کر پریشان سی کر دیں تھیں۔ ایک شعر ذہن میں جگنو کی مانند چمکنے

لگا ہے ۔

یہ کہہ کر ستم گر نے زلفوں کو جھٹکا
بہت دن سے دنیا پریشاں نہیں ہے

شام کا وقت' آسمان کا لہولہو دامن۔ ہر جانب اک چل چلاؤ کا عالم۔ تھکے ہارے پرندوں کی بوجھل سی واپسی کی پروازیں' ان کی کرب میں اتری ہوئی چیخیں اور اس پہ مستزاد لوٹیں لیتا ہوا سمندر۔ جزیرے کے اردگرد اور نزدیک کسی گورستان میں قبروں پہ لرزتے ہوئے دیپوں کی جھلملاتی' ٹمٹماتی ہوئی جہازوں' بادبانی کشتیوں کی نیلی' پیلی' سُرخ روشنیاں اور اس پہ ستم کہ جیکب کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ کافی دیر میں تخت دراز پہ نیم دراز سا دائیں بائیں اور سامنے کی چوپٹ کھلی کھڑکیوں سے شام کی اُداسی' اپنی تنہائی اور ہولے ہولے جاگتے ہوئے سمندر کی سسکاریوں سے چشم پوشی کرتا رہا۔ آخر اُٹھتے ہی بنی۔ ہلکی اُٹھک بیٹھک کی' جب سُستی ذرا دُور ہوئی تو وضو کر کے نماز ادا کی۔ اب تخت دراز پہ بیٹھا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ جیکب کہاں مرگیا ہے؟ اگر اُسے کہیں جانا ہی تھا تو مجھے بھی جگا کر ساتھ لے جاتا۔ وقت دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ وقت تو شام کے کھانے کا ہے یقیناً وہ کھانے کے لئے چلا گیا ہوگا لیکن کیا تو مجھے بھی کھانا تھا۔ سوچا کہ چلو [illegible] ہم [illegible] پہنچتے ہیں [illegible] جیکب [illegible] میں چل جائیں گے...... باہر اور اندر اب اندھیرا اور خنکی بڑھ چکے تھے۔ بتی روشن کرنے کی غرض سے دروازے کے پاس آیا تو دروازے کی پشت پہ ایک سفید کاغذ چسپاں دکھائی دیا۔ کاغذ اُتارا' بتی روشن کی وہیں کھڑے کھڑے پڑھنا شروع کیا۔ جیکب نے لکھا تھا:

''پیارے خان! تم بڑی گہری اور میٹھی نیند سوئے ہوئے تھے۔ تمہارے سُریلے اور غنائیت بھرے دلنواز خراٹے' نیم وا منہ اور آنکھیں' چہرے پہ کھلی ہوئی آسودگی اور معصومیت دیکھ کر یقین کرو' چاہنے کے باوجود تمہیں جگانے کی جرأت نہ کر سکا۔ تم شاید جانتے ہو کہ سکون کی میٹھی نیند سوئے ہوئے کو جگانا ایک اچھے یہودی کو زیب نہیں دیتا۔ سوئے ہوئے انسان کی رُوح اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے کی غرض سے عالمِ برزخ میں اُتر جاتی ہے یا کہیں سیروتفریح کے لئے نکل جاتی ہے لہٰذا میں تمہارا اور تمہاری رُوح' دونوں کا گنہگار نہیں بن سکتا تھا...... میں نے آج دوپہر جو قصہ تمہیں سنجیدگی سے سُنانا چاہا اور جسے تم اپنے غیر سنجیدہ رویے کی وجہ سے مکمل طور پہ سُن نہیں سکے' اگر اُسے سُن لیتے تو جہاں تم میرے اور آنٹی آیرے ڈیوڈ کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے وہیں مجھے بے پناہ سکون اور تسلی کا سہارا بھی مل جاتا اور ساتھ ہی تمہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں آج اس وقت کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟...... خیر' میں اس

مختصر سے نوٹ میں صرف تمہیں اس قدر ہی بتا سکتا ہوں کہ آج چاند مُکٹ کی رات ہے' آنٹی کی خاص عبادت کی رات جس کے لئے وہ پورا مہینہ تیاری کرتی ہے۔ اس رات عبادت یا ریاضت کے مختلف مراحل پہ مجھے آنٹی آئیرے ڈیوڈ کی معاونت میں مستعد رہنا پڑتا ہے۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے..... رات کا کھانا باورچی خانے میں گرم رکھا ہوا ہے۔ باورچی خانے چلے جاؤ' ملازم تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ واپس آ کر اطمینان کی نیند سو جانا' صبح ملاقات ہوگی۔

ضروری نوٹ۔ جزیرے کے شمالی حصے کی جانب جانا سختی سے منع ہے۔ وہ حصہ غیر محفوظ اور خطرناک بھی ہے..... جیکب۔''

''لعنت ہو تم پر۔''..... میں نے غصے میں رُقعے کا گولہ بنا کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔

میں دروازے کی چوکھٹ کے بیچ' دونوں اطراف بازو پھیلا کر کھڑا تھا۔ سامنے گہرا سبز رنگت مائل سیال سمندر کسی بپھرے ہوئے دیو کی مانند کروٹیں بدل رہا تھا جیسے وہ لحظہ بہ لحظہ نامحسوس انداز سے آگے بڑھتے ہوئے شفتالو کے پتّے جیسے اس ننھے سے جزیرے کو یوں ہڑپ کر لے گا جس طرح ساون بھادوں کے [illegible] میں زُرّاتے سینے [illegible] غبار [illegible] جہنم سے [illegible] تک چھتوں اور برساتی مچھروں والے بڑھ بڑھ کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔

لیلائے شب آہستہ آہستہ اپنا معشوقی رنگ کھول رہی تھی' سمندری ہوا نے بھی دھیرے دھیرے اپنے بادبان کھول دیئے تھے۔ ستارے نکلے سُرمئی آنچل کی اوٹ سے' پونم کے ماہِ کامل نے ابھی ہلکی سی جھلکی ہی دکھائی تھی کہ ماحول نُور کے دودھیائی غبار سے بھیگ سا گیا۔ اک چھناکے سے میرے وجدان کے تانپورے کی تنی تار کو اک خوشبو کا لہریا مضراب بن کر چھیڑ گیا۔ تنی تار کی جھنجھلاہٹ کی بازگشت جب اِک سحر بن کر میرے اعصاب پہ چھانے لگی تو مجھے بابا جی والی عطروں کی بیچ گوشہ صندوقچی ''گلِ شبو'' یاد آ گئی۔ پھر عطرِ گل' عطرِ بادِ باراں' عطرِ آبِ رواں۔ جیسے تیس بتیس برس بعد گلِ شبو کا ڈھکنا بابا جی نے کھول دیا ہو۔ سمندر کی ایسی بے کلی اور بے چینی دیکھ کر معاً مجھے یاد آیا کہ آج تو چاند مُکٹ کی رات ہے۔ ماہِ کامل' یعنی چودھویں کے چاند کی رات۔ آج کی رات تو سمندر پاگل ہو جاتا ہے' خوب جوار بھاٹا لاتا ہے۔ اس کے مدّوجزر کی بے کل لہریں چکور بن کر چھم چھم کرتے چاند کے چہرے کو چُومنے کی جستجو میں سطح اور کناروں سے بہت اُوپر اور آگے تک نکل آتی ہیں..... میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کو بڑی برگشتگی سے اپنی جانب لحہ بہ لحہ بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہانکا لگا کر مجھے کہہ رہی ہوں کہ خان! مرد بچے ہو تو تھوڑی دیر تک یہیں کھڑے رہنا' اپنے پاؤں کی ریت نہ چھوڑنا۔ اگر آج تمہیں گھسیٹ کر کسی سیپی میں بند

کر کے اپنے ''قلزمِ شبو'' کے بے گوشہ صندوقچے میں بند کر لیا تو مجھے بھی سمندر نہ کہنا۔ پھر صدیوں بعد جب کوئی بابا جی اس قلزمِ شبو سے ''عطرِ کاگا'' نکال کر اپنے عمامہ پہ لگائیں گے تو تب تمہاری ''کیا کیا اور کیوں کیوں'' راز کھلیں گے۔

اسی لمحہ زن سے کوئی آفت سی اڑتی ہوئی آئی اور تھپ سی مجھ سے ٹکراتے ہوئے اندر میرے تختِ دراز پہ بے سدھ سی ڈھے گئی۔ شاید میں صحیح سے اس آفت کی زد میں نہیں تھا یا پھر اس کا نشانہ غلط پڑ گیا تھا ورنہ میرا چہرہ یا بازو یقیناً زخمی ہو جاتے۔ اس ناگہانی صورتِ حال نے مجھے پل بھر میں زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔ تختِ دراز کے قریب پہنچ کر اس زبردستی آنے والے مہمان کو ذرا غور سے دیکھا تو یہ ایک کوّا تھا جو چونچ کھولے' متوحش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شکرے کی سی شکل و شباہت اور جسامت والا ایسا کوّا اس سے پیشتر کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ میں اس کے ذرا اور قریب ہوا تو وہ مجھ سے بدک کر کچھ اور دوسری طرف کھسکنے کی کوشش میں دائیں پہلو پہ لڑھک سا گیا...... اس کے بازو سے لہو رس رہا تھا۔ تختِ دراز پہ خون اور اس کی سیاہ سفید بیٹ کا لمبا سا نشان تھا جیسے وہ تختِ دراز پہ ایمرجنسی میں کریش لینڈنگ کرنے والے جہاز کی طرح گھسٹتا ہوا آ رکا تھا۔ آدھی چونچ کھولے وہ بڑی وحشت بھری نظروں سے مجھے تکتے ہوئے بری طرح ہانپنے لگا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر سوچنے لگا کہ اس وقت اس زخمی پرندے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں؟ یقیناً یہ باہر سمندر کے طوفانی باد و باراں میں کہیں پھنس کر زخمی ہو گیا ہے اور اس روشن کٹیا کو جائے پناہ جان کر کسی نہ کسی طور ادھر آ پڑا ہے یا پھر سخت تیز ہوا کے رخ نے اسے اس سمت اور اس جگہ گرنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ اسی لمحے سمندر کی جانب سے ہوا کے ایک طوفانی جھکڑ نے کھلے دروازے کے پٹوں کو ایک زبردست سی گونج دار آواز کے ساتھ کھٹ سے بند کر دیا' کھلی کھڑکیوں کے پٹ بھی کھڑ کھڑ آپس میں ٹکرانے لگے۔ ایک عجیب سی افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے کھڑکھڑاتی ہوئی کھڑکیاں بند کرنی شروع کیں' تیسری کے بعد چوتھی کی جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ زخمی بازو والے کوّے نے کمال عجلت' ہمت اور بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تختِ دراز سے کھلی کھڑکی کی جانب اڑنے کی ناکام کوشش کی جیسے اسے احساس سا ہو گیا ہو کہ یہ کھڑکی بند ہو جانے سے میں اس جگہ قید ہو کر رہ جاؤں گا۔ میں کھلی کھڑکی کو بھول کر اسے پکڑنے کے لئے لپکا۔ میرے ہاتھ کی گرفت اس کی ٹانگ پہ پڑ گئی تھی۔ وہ بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں میرے کپڑوں کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ خون کے چھینٹے' غلاظت' حتیٰ کہ میرا چہرہ اور ہاتھ بازو تک سب لتھڑ گئے۔ اس کی ٹانگ پہ میری پکڑ مضبوط تھی۔ وہ اپنے جہازی سائز کے بڑے بڑے پروں کو پھیلائے' میرے ہاتھ

سیں جھوٹا ہوا میرے پنجے سے آزاد ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ آخری حربے کو آزماتے ہوئے اس نے اپنی چونچ میری ٹانگ میں گاڑ دی' بس یہیں میری گرفت ڈھیلی پڑی تو وہ ایک ڈیڑھ بازو پہ پھڑ پھڑاتا ہوا سامنے کھلی کھڑکی سے باہر تھا۔ آگے بڑھ کر باہر اندھیرے میں دیکھا تو اُمڈے ہوئے سمندر کی بپھرتی' جھاگ اُڑاتی اور شور مچاتی ہوئی لہروں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ اک عجیب سی بے چینی' بے کلی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ جزیرے پہ پہلا دن اور پہلی رات تھی۔ جب سے یہاں آیا' اس وقت سے اب تک کچھ بھی تو ایسا نہ تھا جو میرے لئے پسندیدہ اور موافق ہوتا۔ ہر فرد افلاطون' ہر چیز چیزے دیگرے' ہر بات بنتِ سامری' ہر واقعہ وجہِ اضطراب...... الٰہی! میں کس قسم کے جادو کے جزیرہ حیرت و حصار میں پھنس گیا...... کھڑکی بند کرتے ہوئے چٹخنی چڑھانے ہی والا تھا کہ باہر سے اسی زخمی کوے کی ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کی آواز آئی۔

لاہور میں مرد سیاپوش کی مصاحبت میں جب میں شاہی محلہ کی حویلی جمنا بائی چیل پوری میں جاتا ہوں تو وہاں ایک گربہ سیاہ سے واسطہ پڑتا ہے جو میاؤں میاؤں کی بجائے ''من آنم کہ من دانم'' کی آوازیں نکالتی [illegible] زخمی کوا بھی [illegible] ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کر رہا ہے......

کھڑکی کھول کر پھر غور سے آس پاس اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر اندھیرے اور تیز ہوا کے جھکڑوں اور سیٹیوں' سمندر کے شور شرابے میں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کھڑکی بند' چٹخنی چڑھا کر میں باہر نکل آیا۔ نکلتے ہی احساس ہوا کہ اس بادوباراں اور اندھیرے میں زخمی کوے کو تلاش کرنا بہت مشکل ہوگا...... اب شاید ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں اُلٹے پاؤں اندر آ گیا' دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ پھر اک کراہ سی اُبھری...... ''کیا کیا' کیوں کیوں''...... جیسے دروازے سے باہر اندھے طوفان کے چنگل میں پھنسا ہوا کوئی معصوم بچہ اندر آنے کے لئے التجا کر رہا ہو۔ میں نے فوراً رک سیک سے ایسے موسموں سے محفوظ رکھنے والی فل سائز برساتی اور لائٹ ویٹ واٹر پروف لانگ شوز نکالے۔ جلدی سے ہاتھ پاؤں' سر ڈھانپے۔ ہاتھ میں طاقتور' پانی سے محفوظ رہنے والی ٹارچ پکڑی اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

سمندر اپنی روزمرہ کی حدود سے شاید بہت آگے بڑھ آیا تھا۔ چودھویں کا ماہِ کامل یقیناً اپنی تمام تر تابانیوں سے جلوہ افروز تھا مگر سکاٹ لینڈ کے سمندروں' جھیلوں' دریاؤں اور بہت سے جزیروں پہ اکثر چھائی رہنے والی ازلی دُھند کو کیا کہئے جو آفتاب کی تمازت اور ماہتاب کی مفرحت کے درمیان کبھی دبیز اور کبھی مہین پردہ بن کر تنی رہتی ہے۔ آؤٹ آف فوکس چاند کسی محجوب اور معتوب کی طرح بڑا شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی زرد روشنی والا بٹن دبایا۔ زرد روشنی' خاص طور پہ دُھندلے اور بھیگے

گندلے موسم میں بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ کاٹج کے اِردگرد قرب وجوار میں ہر جگہ دیکھا مگر کوّے کا وجود کہیں نظر نہ آیا...... سمندر کی طرف جانا لاحاصل تھا پھر بھی میں قدرے آگے بڑھ گیا یہاں تک کہ لہریں آتیں اور میرے پاؤں کو چھوکر واپس پلٹ جاتیں' معاً ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کی دلخراش سی صدا پھر میرے کانوں سے ٹکرائی مگر میں سمندر کے شور کی وجہ سے آواز کی سمت کا تعین کرنے میں ناکام رہا۔ میرا یہ اندازہ تھا کہ یہ صدا پیچھے مادام آبیرے کے فارم ہاؤس کی جانب سے آئی ہے۔ میں نے اپنا رُخ پلٹا اور فارم ہاؤس کے رُخ پہ چل پڑا...... شاید یہ لکھنا' ظاہر کرنا مناسب ہے کہ نہیں کہ اللہ کریم کا خاص فضل وکرم اور میرے بابا جی کی نظر وعنایت ہے کہ بچپن ہی سے میرے اندر تیسرے کلمہ پاک کا خفی ذکر اپنے آپ ہی چلتا رہتا ہے۔ کوئی بھی کام دھندا ہو۔ مجلس' مذاکرہ' تنہائی' سفر' طعام' قیام' ڈرائیونگ' لڑائی' ہنگامہ' شادی' موسیقی' فلم' ڈرامہ' مشاعرہ' کوئی بھی دین ودنیا کی مصروفیات ہو یہ اندر کی چکی چلتی رہتی ہے۔ اس میں نہ تو میرے کسی ارادے کا دخل ہوتا ہے اور نہ ہی کوشش اور توجہ...... اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں کبھی بھی تنہا نہیں رہا اور نہ ہی کبھی بوریت اور یکسانیت کا شکار ہوا۔ سینکڑوں بار ہزار' ڈیڑھ ہزار میل تک روزانہ اکیلے ڈرائیونگ کی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک تک صحراؤں کے صحرا اور جنگلوں کے جنگل پاؤں اور پہیوں تلے نکال دیے مگر کبھی تھکاوٹ' خوف وہراس' فکر' نقاہت کا احساس تک نہیں ہوا۔ یہ اسی تیسرے کلمے پاک کی برکت ہے۔ یہ کلمہ پاک اپنے اندر ہر ذکر پاک کا جوہر رکھتا ہے لیکن اسے کسی کامل کی اجازت' اس سے سمجھ' جان اور پہچان کر پڑھنا چاہیے ورنہ اس کے خاطر خواہ اثرات اور ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔

• اخلاص' اصل الخصاص......!

میرے بابا جی قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں ایک بہت ضعیف العمر شخص حاضر ہوا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں حافظِ قرآن بننا چاہتا ہوں۔ میرے بابا جی اور حاضرینِ مجلس نے یہ دیکھا کہ اس بوڑھے میں صحیح سے کھڑا ہونا تو کجا' ٹھیک سے بات کرنے کی بھی سکت نہیں۔ آنکھوں کے اندر باہر کے چاروں شیشے ایسے بُری طرح دھندلائے ہوئے تھے کہ سامنے کھڑا شخص اُسے کوسوں دور بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ پوپلے مُنہ میں صرف اور صرف ایک گلی سی زبان بچی تھی' وہ بھی اکثر حلقوم کی جانب کھنچی رہتی۔ دوسرے کی بات البتہ ہاتھ کا بھونپو سا بنا کر تھوڑی بہت سُن لیتا تھا۔ یہ حالتِ ناتوانی اور شوقِ حفظِ قرآنی

دیکھ کر بابا جی نے تبسم فرماتے ہوئے اُسے پاس بٹھایا' پوچھا۔

"بابا جی! آپ کو اس عمر میں' جب انسان گھوڑے پہ بیٹھنے کی تیاری کرتا ہے' یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے کا خیال کیونکر آیا......؟"

بوڑھے آدمی نے ٹھہر ٹھہر' سوچ سوچ کر جواب دیا۔

"پیر جی! بس جی' حیاتی ساری ایسے ہی گنوا دی ہے۔ ایک دن میرے یار علیے نے مجھے نصیحت کی کہ چراغ دین' تو مرنے ڈنڈے لگا ہوا ہے۔ سُنا ہے کہ قبر میں بڑا اندھیرا ہوتا ہے۔ یار! تیرا نام چراغ دین ہے' میرے دل میں آیا ہے تو قبر میں کوئی ایسا چراغ لے جائے جس سے تیری قبر کا اندھیرا دور ہو جائے اور تجھے وہاں کوئی تکلیف وغیرہ نہ ہو...... پیر جی! اس کی یہ بات' میرے دل میں کُھب سی گئی۔ میں نے اپنے پنڈ کے "مولبی" رمضان ملوانے سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ قرآن پاک کا حافظ اپنی اگلی پچھلی سات سات پشتوں کی بخشش کا سبب بنتا ہے اور چونکہ مرنے والے کے سینے میں قرآن مجید ہوتا ہے اس لئے اس کی قبر میں نُور برستا رہتا ہے کیونکہ قرآن بھی چراغ دین ہے......"

بوڑھے [illegible] بہت محظوظ ہوئے...... بابا جی نے فرمایا۔

"بھائی جھوگا! یہ تمہارے یار نے تو تمہیں بالکل بڑے فائدے اور علم کی بات بتائی' قرآن مجید تو واقعی چراغ دین اور نور ہدایت ہے۔ جس نے اسے پکڑا' پڑھا' سیکھا' حفظ کیا۔ پھر اسے سنبھالا اور اس کے مطابق عمل کیا' اس نے فلاح پائی...... اب بولو کیا ارادے ہیں......؟"

وہ رعشہ زدہ ہاتھ کا بھونپو کان پہ دھرتے ہوئے بولا۔

"پیر جی! ذرا اُچی بولو' مینوں گھٹ سُنائی دیندا اے......"

بابا جی نے بڑی نرمی سے ذرا بلند آہنگ میں پھر اپنی بات دُہرائی۔ بابے نے اپنے اسی دیہاتی لہجے میں جواب دیا۔

"پیر جی! ارادہ تو یہی لے کر آپ کے قدموں میں پہنچا ہوں کہ آپ مجھے خدا واسطے چراغ دین بنا دیں۔ میں قرآن شریف کا حافظ بننا چاہتا ہوں......"

بابا جی اب سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔ "بابا جی' آپ نے ناظرہ تو پڑھا ہوگا......؟"

"نہیں جی' میں نے کچھ پڑھا ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتا......؟" بابے نے اسی ٹیو میں جواب دیا۔

بابے کے باقی انٹرویو سے معلوم ہوا کہ اُسے نہ تو نماز آتی ہے اور نہ ہی کوئی آیت یا سورت...... اور تو اور کلمہ طیبہ بھی زیر زبر کی غلطی کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آگے "سوہنا پاک رسول اللہ" پڑھتا ہے۔ بسم اللہ شریف بھی صحت سے نہیں پڑھ سکتا۔ بابا جی نے جب اُس کی ایسی علمی صورت حال دیکھی اور زبان' لہجہ' یادداشت وغیرہ کو بھی ناقابلِ بھروسا پایا تو بابے کو مشورہ دیا کہ تم صرف کلمہ شریف ہی اچھی طرح صحیح سے یاد کرلو اور ہر وقت اسی کا ورد کیا کرو' انشاء اللہ' تم چراغ دین بن جاؤ گے اور اللہ مہربان ہوا تو قبر بھی روشن رہے گی۔ اگلے جمعہ کے روز مجھے آ کر کلمہ پاک کا سبق سُنانا...... بابا جی نے کلمہ شریف پڑھا کر بابے کو رُخصت کر دیا۔ اگلے جمعہ کے روز جب بابے نے آ کر کلمہ سُنایا تو وہی زیر زبر کی غلطی اور وہی "سوہنا پاک رسول اللہ" کلمہ میں موجود تھا...... بابا جی سخت جُز بز ہوئے کہ آٹھ دِنوں کی دُہرائی اور پکائی کے بعد بھی بابے کا کلمہ کچے کا کچا ہی رہا۔

"بابا جی! کلمہ طیبہ کو صحیح اور دُرست مخرج کی ادائیگی کے ساتھ پڑھنا کیا دُرست اور ثواب ہے؛ غلط یا بڑھا گھٹا کر پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے......"

بابا جی نے دوبارہ زیر زبر کی غلطیاں صحیح کرائیں اور سوہنا پاک کے زائد الفاظ لگانے سے منع فرمایا۔ بابا پوپلے منہ سے کلمہ دہراتے ہوئے چلا گیا۔ اگلے جمعے نماز سے پہلے بابا حاضر ہو گیا' آتے ہی ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

"پیر جی! زیر تے زبر دی غلطی تو ٹھیک ہو گئی ہے پر "سوہنا پاک" لگائے بغیر میں کلمہ شریف نہیں پڑھ سکتا' میرے مُنہ سے خالی محمد رسول اللہ نکلتا ہی نہیں ہے...... آپ کے بچے سلامت رہیں' آپ اللہ کولوں مجھے سوہنا پاک لگا کر کلمہ پڑھنے کی اجازت لے دیں۔ بے شک کہہ دیں کہ بابے چراغ دین دے مُونہوں خالی محمد رسول اللہ پھبدا ای نہیں......"

بابا جی اور ہم سب ہم نشیں بابے چراغ دین کا پوپلا مُنہ دیکھ رہے تھے۔ بابا جی نے تیسری بار پھر بابے کو صحیح کلمہ پاک پڑھنے کی تلقین کر کے رُخصت کر دیا۔ اس بار رُخصت ہوتے سمے وہ بوڑھا کچھ دل گرفتہ سا نظر آیا تھا۔

کچھ دِنوں سے بابا جی کے دُشمنوں کے مزاج برہم تھے۔ مجالسِ خاص و عام موقوف تھیں' کھانے پینے اور عبادات کے اوقات میں بھی خلل واقع تھا۔ روزانہ آنے جانے والے احباب کے علاوہ ہم دو تین خادم خاص جنہیں بابا جی کے مزاج میں خاصا دخل تھا' پریشان سے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ ایسی کسی میں جرأت نہیں تھی کہ زبان کھول کر پوچھ لیں' لے دے کر ایک صرف مَیں ہی تھا جس پہ سب کی

نظر تھی کہ میں ٹوہ لگاؤں کہ سرکار کے مزاج کیوں برہم ہیں' نصیبِ دشمناں طبیعت پہ کیا بوجھ ہے؟۔۔۔ ظہرانے کے فوراً بعد' قیلولے سے پہلے میں اجازت لے کر حجرے میں داخل ہوا۔ وہ فرشی نشست پہ نیم دراز سے کسی کتاب کے مطالعہ میں مگن تھے' وعلیکم السلام کہتے ہوئے کتاب بند کر دی اور فرمایا۔

''بابا چراغ دین کے پنڈ جانا ہے۔۔۔۔۔۔''

مسلسل اڑھائی گھنٹے تانگے پہ سفر کے بعد جب ہم بابے کے پنڈ پہنچے تو گاؤں کی مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ ہم سیدھے مسجد میں ہی چلے گئے۔ مسجد کے امام مولوی محمد رمضان کو جب معلوم ہوا کہ بابا جی تشریف لائے ہیں تو اس نے اپنے ذرائع سے کانوں کان پورے گاؤں میں یہ خبر اُڑا دی' دیکھتے ہی دیکھتے مسجد نمازیوں سے آسودہ ہو گئی۔ بابا چراغ دین اور اُس کا بیلی بابا علم دین بھی آ گئے۔ عورتیں' بچیاں' بوڑھیاں مسجد کے باہر پیپل کے درخت تلے جمع ہو گئیں۔ سُنتوں سے سب فارغ ہوئے تو مولوی صاحب نے باباجی کی خدمت میں امامت کے لئے درخواست کی' بابا جی نے متبسم لہجے میں سب نمازیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اللہ کے نیک بندو! آج میں خود ایک ایسے اللہ کے بندے کے پیچھے نماز ادا کرنے کے لئے یہاں تک آیا ہوں جو آپ کے گاؤں کا ہی وسنیک ہے اور آپ سب اُس اللہ کے بندے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اُس اللہ کے بندے سے درخواست کروں کہ وہ ہماری امامت کرے۔۔۔۔۔۔''

سب نمازیوں نے ''سبحان اللہ' سبحان اللہ'' کہتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ تب بابا جی اُٹھے اور بابے چراغ دین کے پاس پہنچے دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا ساتھ لے کر امامت کے مصلّے پہ لا کھڑا کیا' خود تکبیر کہنے کے لئے اُس کے عقب میں کھڑے ہو گئے۔ اب بابے چراغ دین کا یہ عالم کہ وہ باؤلوں کی طرح اِدھر اُدھر سب کو دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔۔ بابا جی نے اُسے کہا۔

''بابا چراغ دین! آج ہم سب تمہاری اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔۔۔۔۔۔ میں تکبیر پڑھتا ہوں' تم نماز شروع کراؤ۔۔۔۔۔۔''

پھر وہی بات کہ بابے چراغ دین کے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ آج یہ کیا ہو رہا ہے؟ اُس کے ساتھ تو ویسے ہی نمازی کھڑے ہونے میں اجتناب برتتے تھے کہ جب جماعت قیام میں ہوتی تو بابا رکوع میں چلا جاتا۔ قعدے کے وقت وہ سجدے میں پڑا ہوتا اور خدا جانے وہ کیا کچھ پڑھتا

رہتا۔ اکثر وہ سجدے میں پڑا پڑا خراٹے بھی لینے لگتا۔ نماز دُعا کے بعد نیک دل نمازی اُسے بیدار کر کے ہاتھ بازو تھامے گھر تک پہنچا آتے۔ اب اسی نیم مخبوط الحواس چراغ دین کو بابا جی نے پورے گاؤں کے خورد و کبیر کی نماز کا ''فرسٹ کیپٹن'' بنا کر مسجد کے ''کاک پٹ'' میں بٹھا دیا تھا۔ کوئی کیا بولتا' بابا جی کی حیثیت اور مرتبے سے سب ہی واقف تھے...... بابا جی نے تکبیر پڑھنی شروع کر دی' ختم بھی ہو گئی۔ اب بابا چراغ مُنہ کعبہ کی طرف کرے۔ ''اللہ اکبر'' کہے تو مقتدی بھی ''اللہ اکبر'' کہہ کر ہاتھ باندھیں مگر بابا چراغ دین تو رُخ نمازیوں کی جانب کئے بِٹ بِٹ سب کو دیکھ رہا تھا۔ بابا جی نے اُس کا رُخ قبلہ شریف کی جانب موڑا' خود ہی اُس کے ہاتھ ناف پہ رکھوائے اور خود اللہ اکبر کہہ نیت باندھ لی۔ مقتدیوں نے بھی ایسا ہی کیا...... ایک منٹ' دو منٹ' پانچ منٹ۔ حتیٰ کہ اتنا وقت گزر گیا کہ کوئی مشاق حافظ پورا پارہ ختم کر جائے۔ بابا چراغ دین آگے کھڑا کبھی پیچھے دیکھنے لگتا' کبھی پنڈلیوں اور پاؤں کو کھجلانے لگتا۔ بوڑھے بیماروں اور بچوں نے تو کبھی کے کھنگورے مارنے شروع کئے ہوئے تھے مگر وہاں آگے سُننے اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا' بابا چراغ دین! جس کے دو قدم پہلو میں توپ داغی جائے تو اُسے پٹاخے کی آواز بھی سُنائی نہ دے۔ تین چار نمازی' نماز توڑ کر صفوں سے باہر نکل گئے اور کچھ وقت اسی کشمکش صبر و جبر میں گزر گیا۔ پھر [illegible] بابا چراغ دین [illegible] میں چلا گیا۔ اگر اس وقت ہمارے بابا جی ''اللہ اکبر'' نہ کہتے تو پیچھے کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ آگے رکوع بھی ہو چکا ہے...... بہر حال' سب ہڑبڑا کر رکوع میں چلے گئے۔ جب دس منٹ اسی طرح مرغا بنے گزر گئے تو چند اور لوگ نماز توڑ کر مسجد میں سے نکل گئے۔ کھنگورے اور مصنوعی کھانسی بدستور چل رہی تھی۔ پھر اللہ کا کرنا کچھ یوں ہوا' بابا چراغ دین وہیں سے ہی سجدے میں چلا گیا بلکہ یوں کہئے لیٹ ہی گیا۔ مقتدی بھی سجدے میں تھے اور امام بھی اور اب جیسے ان سب کو سجدے نے پکڑ لیا تھا۔ کھُسر پھُسر ہو رہی ہے اور ایک دوسرے کو کُہنیاں ماری جا رہی ہیں۔ آخر کب تک کوئی سجدے میں پڑا رہے؟ انسان ہے' فرشتہ تو ہے نہیں کہ سجدے میں پڑا ہے تو قیامت تک وہیں پڑا ہے...... اب پانچ سات نفر اور کم ہو گئے۔ امام صاحب کے خراٹوں کی آوازیں' مسجد کے سقاوے تک سُنائی دے رہی تھیں۔ دو چار اور ثقہ قسم کے نمازی لاحول پڑھتے ہوئے نماز توڑ کر گھروں کو نکل گئے۔ اب پچھلی والی پانچ صفوں کی حالت مکئی کی اس پکی پکی چھلی (بھٹے) جیسی تھی جس کے چھدرے چھدرے دانے ہوتے ہیں۔ صرف پہلی صف جس میں کچھ معززین گاؤں اور بابا جی سرکار تھے' دائیں بائیں اور آخری ایک دو نمازی غائب ہو جانے کے باوجود سالم تھی...... کہیں پیچھے سے کسی بچے کی آواز اُبھری۔

''اوئے بابا دینیاں' مر گیا ایں یا جیوناں ایں......؟''

ہمارے بابا جی نے اکبراللہ کہتے ہوئے سجدے سے سر اٹھایا' سلام پھیر کر نماز توڑ دی۔ پھر بلند آواز سے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا...... عشاء کے بعد بابا چراغ دین کی نمازِ جنازہ بابا جی نے پڑھائی۔ اپنے گاؤں کے علاوہ نزدیک و دور کے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ بڑے بوڑھوں نے کہا کہ آج تک اس علاقے میں کسی انسان کا اتنا بڑا جنازہ نہیں دیکھا گیا۔ دفن کے وقت بابا جی نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹی دی اور دُعا کے بعد لوگوں سے کہا۔

''لوگو! تم کیا جانو کہ تمہارے درمیان سے آج کون سی ہستی' عالم بالا کی جانب مراجعت کر گئی ہے...... اَن پڑھ' دیہاتی سا بابا چراغ دین جسے نماز آتی تھی اور نہ کلمہ شریف صحیح سے پڑھا جاتا تھا۔ اسے کلمہ شریف پڑھتے وقت ''سوہنا پاک'' کی اضافت کے ساتھ ''محمد رسول اللہ'' کہنا اچھا لگتا تھا۔ بس اسی سوہنے پاک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدقے میں ہی اللہ پاک نے اپنے اس سادے مُرادے انسان کو بخشش کا وہ رُتبہ عطا فرما دیا جس کی خواہش ولی اور قطب کیا کرتے ہیں...... بے شک' اللہ پاک کو اخلاص ہی پسند ہے۔ کسی کی غلط ملط ادا' سادگی' بھولپن' زندگی میں بے ادبی' بے تکلفی اور بے علمی بھی جس میں اخلاص اور نیت کی پاکیزگی شامل ہو۔ اللہ پاک کو ایسی پسند آتی ہے کہ وہ اُسے شرفِ بخشش عطا کر دیتا ہے اور کہیں بڑے بڑے عابدوں' پرہیزگاروں اور عالموں کاملوں کو اُن کے غرور' ریا' تکبر' علم یا پرہیزگاری کے ذرا سے زعم پہ انہیں قعرِ ذلت میں پھینک دیتا ہے...... یاد رکھو کہ اللہ کے ہاں ادنیٰ و اعلیٰ صرف اس کے خوف' اخلاص' تقویٰ' مخلوق کی خدمت سے اور اس کے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کے مراحل سے گزرنے کے بعد تعیّن کئے جاتے ہیں۔ حسب و نسب' دستار و کلاہ' علم' داڑھیاں' نمازیں' حج' منصب وغیرہ سب کچھ بیکار اور بے فائدہ ہیں اگر اخلاص موجود نہیں ہے۔ ہر وقت اللہ پاک سے اُس کا فضل و کرم طلب کرتے رہا کرو۔ وہ تمہاری عبادتوں اور ریاضتوں سے بے نیاز ہے' اُس سے اپنی پرہیزگاریوں اور نمازوں کا اجر مت مانگو۔ اپنے آپ کو گنہگار اور گندہ سمجھتے ہوئے صرف اُس سے' اُس کی رحمت اور توفیقِ بندگی چاہو......''

- ## بے عِملے کا علم......!

بات میرے تیسرے کلمے پاک کے ورد سے شروع ہوئی تھی کہ بچپن سے ہی اس کا خفی ورد

میرے پاک پروردگار نے اپنے کمال فضل و کرم سے مجھے عطا کر دیا ہوا ہے۔ اس میں مزید استقامت اور برکت' باباجی کی اجازت اور تصرف نظر سے ملی۔ بابا چراغ دین کا قصہ بیان کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ میرے ساتھ بھی کچھ کچھ بابے جیسا ہی معاملہ ہے۔ میں بھی نابلد ہوں' مجھے بھی کچھ نہیں آتا۔ میرے دُنیاوی علم کا معیار تو آپ کے سامنے ہی ہے۔ مجھے بارہ مہینوں کے نام' پوری گنتی نہیں آتی۔ یعنی میں اتنا بھی نہیں جانتا جتنا ایک آٹھویں جماعت کا طالب علم جانتا ہے۔ کچھ ایسی حکمت تھی کہ جو مجھے جاننا اور پڑھنا چاہئے تھا وہ باوجود کوشش کے جان اور پڑھ نہ سکا اور جو شاید میرے لئے ضروری اور اہم نہ تھا (میرے اپنے فہم کے مطابق) مجھے مانگے چاہے بغیر ہی مل گیا۔ کئی بار قرآن الحکیم ناظرہ پڑھنے کے باوجود آج تک میں کوئی آیت مبارکہ صحیح سے نہیں پڑھ سکتا' فرقان الحمید کا تصور آتے ہی کانپ سا لگ جاتا ہے کہ پڑھوں تو کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ نماز پڑھنا بھی نہیں آتی۔ دُعائے قنوت' سارے کلمے' ایمان کی صفت' چھوٹی بڑی نماز جنازہ' نکاح کی دُعائیں۔ یہاں تک کہ نماز کے بعد جو دُعائیں بچوں کو بھی آتی ہیں' مجھے نہیں آتیں۔ کوئی چھوٹی نماز میں زیادہ تر سورۂ کوثر' سورۂ اخلاص' سورۂ عصر سے کام چلاتا ہوں۔ کئی بار' اکثر مواقع پہ پھنس بھی جاتا ہوں۔ بھولے لوگ میری داڑھی اور ظاہری بزرگی والے کپڑوں سے متاثر ہو کر مجھے امامت کے لئے کہتے ہیں۔ ان موقعوں پر میری جان پہ بن جاتی ہے۔ میں مختلف حیلوں سے جان چھڑاتا ہوں۔ آخری حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہوں کہ بھائی! میں کسی اور مسلک سے ہوں' میرے پیچھے آپ کی نماز مشکوک ہو جائے گی۔ ان سب بہانوں کے باوجود کہیں نہ کہیں قابو آ ہی جاتا ہوں اور شاید اتنی اذیت تختہ دار پہ کسی مجرم کو محسوس نہیں ہوتی ہوگی جتنی اس وقت مجھے ہوتی ہے۔ رکوع کا خیال' نہ سجدے کی خبر اور وہی بابے چراغ دین والا حال۔ کئی ایک بار قرأت والی نماز میں پھنس گیا۔ سورۂ کوثر سے مختصر کیا کوئی سورۂ ہوگی۔ ایک آیت پڑھ کر آگے؟...... پھر خود بخود تیسرا کلمہ زبان پہ آ جاتا ہے...... حج کیسے ہوتا ہے' عمرہ کے مختلف مراحل میں کیا پڑھا جاتا ہے' مناسک کیا ہیں۔ مختلف مقامات کی دُعائیں...... توبہ کریں جو مجھے کچھ آتا ہو۔ ہر جگہ تیسرا کلمہ ہی چلتا ہے۔ کئی بار نماز جنازہ اور نکاح مسنونہ پڑھانے کے لئے زبردستی دھر لیا گیا اور خدا جانتا ہے کہ آج تک باوجود یاد کرنے کے مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ نماز جنازہ اور عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کی نمازوں میں کتنی تکبیروں' رکوعوں اور سجدوں کا فرق ہے' ہاتھ کب بند کرنے یا کھولنے ہیں؟ اکثر کانی آنکھ سے دائیں بائیں دیکھ کر تقلید کر لیتا ہوں اور یقین فرمائیں کہ کئی بار ایسی جگہوں پہ جنازہ پڑھانے پہ مجبور ہوا کہ وہاں شاید مجھے ہی سب سے زیادہ نیک اور دینی معاملے میں معتبر سمجھ لیا گیا۔ کئی مقامات ایسے بھی آئے کہ انکار کی جگہ یا گنجائش نہیں تھی۔ یہ بھی یاد نہیں کہ نیت اور تکبیریں کتنی ہیں؟ دل ہی

دل میں اللہ سے گڑگڑاتا ہوں کہ مولا! کیا کروں؟ بس تو ہی معاف کرنے والا' اس میت کے گناہ بخشنے والا اور ان سادہ لوح انسانوں سے میری ''عزتِ سادات'' محفوظ رکھنے والا ہے۔ پھر میں کمال مکاری سے کسی اچھی سی داڑھی والے کو پاس بلا کر آہستہ سے بلغمی سی آواز نکال کر کہتا ہوں کہ حضرت! میری آواز بیٹھی ہوئی ہے' ازراہِ کرم ذرا بلند آواز سے نمازِ جنازہ کی نیت مع تکبیروں...... رکعتوں اور طریقہ دُہرا دیں۔ جزاکم اللہ فی الدارین...... جلدی سے یاد کر کے فوراً پڑھا دیتا ہوں۔ کئی اک بار تکبیروں میں کمی و بیشی بھی واقع ہوگئی۔ پھر ایسے ایمرجنسی اور دُکھ و اندوہ کے موقع پہ کسے تکبیریں اور ہاتھ اُٹھانے چھوڑنے یاد رہتے ہیں۔ ہر ایک کے دماغ میں اپنی نمازِ جنازہ گھسی ہوتی ہے۔ میں بھی صرف اور صرف تیسرا کلمہ ہی پڑھتا ہوں یا یوں کہیے کہ یہی تو ہے جسے میں پڑھ سکتا ہوں۔ مانیں کہ ہمیشہ ایسے ہی ہوا ہے کہ اسی رات وہی نمازِ جنازے والا مُردہ ہنستا مسکراتا ہوا خوش خوش خواب میں کہتا ملتا ہے کہ باباجی! کیا کمال کا جنازہ پڑھا ہے کہ میرا تو نصیبہ کھل گیا ہے...... نکاح بھی بے شمار پڑھائے سوائے اپنے بچوں کے کہ گھر کے پیر کو کوئی نہیں مانتا اور نہ ہی گھر کے ڈاکٹر سے شفا ملتی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ جس کا بھی بوٹا لگایا ہے' وہ سدا بہار ہی ہو گیا ہے۔ دوسروں کی بیویوں پہ برس میں ایک [illegible] نکاح والی بیوی پہ برس میں کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین تک پھل لگے ہیں۔ ایک تو یہ اسی تیسرے کلمے کا کمال ہے اور دوسرے میں چپکے سے دُولہا کے کان میں کہتا ہوں کہ پہلے بیٹے کا نام محمد علی رکھنا' دوسرے کا احمد علی اور پھر چل سو چل۔ بیوی کو اللہ کی نعمت اور رزق سمجھو گے تو ہمیشہ اللہ سے نعمتیں اور کُھلا رزق ہی پاتے رہو گے۔ بیوی کے پاس جاؤ تو پہلے سلام کرو' بسم اللہ شریف پڑھ کر ہاتھ لگاؤ اور اسے اپنے سے بہتر انسان سمجھو۔ حُسنِ صورت پہ نہ جانا' حُسنِ سیرت کھوجنا۔ اس کے سر پہ دوپٹہ اور آنکھوں میں حیا برقرار رکھنا۔ ٹیڑھی پسلی ہے' نرم خوئی اور برداشت والا معاملہ رکھنا...... پچھلی سطروں میں ''عزتِ سادات'' کہیں لکھا ہے' اس پہ یاد آیا کہ مجھے اکثر لوگ شاہ جی کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے میری کتاب شب دیدہ کی کہانی پڑھی ہو اس میں وارسک کا مدنی خان ہوٹل والا بھی مجھے شاہ جی کہتا تھا۔ اسے میں نے بتایا تھا خان! میں پٹھان ہوں' سیّد نہیں۔ مجھے گنہگار مت کرو تو اس کا جواب تھا۔

''خو تم پٹھان ہو یا ترکھان...... ہم تم کو شاہ جی ہی بولے گا......''

بالکل یہی حالت اب بھی ہے کہ میں کہہ کہہ' سمجھا سمجھا کر تنگ آ گیا ہوں مگر کہیں بھی کوئی میری نہیں سنتا۔ یہ ''شاہ جی'' والا معاملہ کم ہونے کی بجائے زیادہ ہی ہو گیا ہوا ہے۔ ایک عقلمند نے مجھے اس کا ایک علاج یوں بھی بتایا تھا کہ میں ایک آٹھ بائی تین کی پلاسٹک کی پلیٹ لاکٹ کی طرح گلے میں لٹکا لوں

جس پہ جلی حروف میں تحریر ہو...... ''میں سید نہیں، پٹھان ہوں''...... اس طرح لوگ مجھے شاہ جی کہنے سے اجتناب برتیں گے مگر جب میں نے اسے یہ بتایا کہ بھائی! میرے بہت سے ملنے والے میری طرح کورے چٹے اَن پڑھ ہیں، وہ تو اپنا نام بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ مجھے تو پھر ان کے لئے ایک ٹیپ ریکارڈر بھی جیب میں ''فُل لوڈ'' رکھنا پڑے گا کہ جب کوئی ایسا چٹا اَن پڑھ میری جانب آتا دکھائی دے تو فوراً بٹن دبا دوں تا کہ ''میں سید نہیں، پٹھان ہوں'' کی تکرار شروع ہو جائے...... کچھ دیر خاموش رہنے اور سوچنے کے بعد اس عقلمند دوست نے آخری مگر معقول مشورہ دیا۔

''شاہ جی! ایسا کریں آپ جی کڑا کر کے اشتہار دے دیں کہ میں فلاں ابن فلاں با کراہت و قباحت، بصد مجبوری و ذہنی معذوری اپنی قومیت پٹھان بدل کر ''قوم شاہ'' اختیار کرتا ہوں۔ آئندہ مجھے ''فلاں شاہ ابن فلاں خان'' پکارا جائے...... آخر آئے دن اخبارات میں لوگ اپنا نام بلکہ مذہب تک بدلتے رہتے ہیں تو قوم، ذات بدلنا کیا مشکل ہے......؟''

آہ میرے قلم کی زقندیں ملاحظہ فرمائیں، ہے اسے کوئی سکون و سکوت؟ پل میں یہاں اور اگلے لمحے کدھر۔ سیالکوٹ بارڈر سے جو نکلا تو بغیر ویزہ پاسپورٹ سیدھا لینڈز اینڈ کے ایک ننھے منے جزیرے سیلی آئی لینڈ میں...... بات پھر وہیں کہ میں ہاتھ میں ٹارچ لئے مادام آبیرے کے فارم ہاؤس کے مرغ زار میں زخمی کوے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اچانک سامنے چاند ابھر آیا شاید دُھند کی کوئی دبیز سی چادر چاند کے چہرے سے سرک گئی تھی۔ ایسا صاف اور روشن مکھڑا، مکھڑے کے گرد ہالہ، نیلگوں مائل بنفشی سا ملگجا جیسے چاند کے گرد کسی نے روشنی کا دیا جلا کے نورانی نوزائیدہ سے چاند بکھرے ہوئے ہوں۔ ایسا دلکش منظر زمین سے انسانی آنکھ نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ چاند کی جوانی کو دیکھنا ہو تو سمندر کی گود میں بیٹھ کر دیکھو اور سمندر کی جولانی کو دیکھنا ہو تو چاندنی کی ہنڈول میں بیٹھ کر محسوس کرو...... میں نے ٹارچ کی زرد روشنی گُل کر دی تھی، اس کی اب ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ آسمان اب صاف ہوتا جا رہا تھا، کچھ دیر پہلے موجود آوارہ بادلوں کے قافلے اب نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ دُھند کا سُرمئی سا غبار یوں چھٹ گیا تھا جیسے پہلے کہیں اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ سمندر میں کھڑے جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں، آسمان پہ ستاروں کی کہکشائیں اور جگنوؤں جیسے جُھرمٹ۔ پل کی پل مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خدا کی خدائی تلے میں اکیلا ہی کھڑا ہوں اور اللہ کی رحمت جوش میں آئی ہوئی ہے۔ یہ ساری محفل، یہ چاند ستارے، نظارے۔ یہ موسم، سمندر اور یہ سماں، سب کچھ میرے اکیلے ہی کے لئے ہے۔ یہ سمندری سرسراتی، گنگناتی ہوئی ہوا، یہ عطر آب کی مہکاریں اور عطر باد و باراں کی پھواریں صرف اور صرف

مجھے سرشار کرنے کے لئے ہیں...... میرے اردگرد آگے پیچھے' اوپر نیچے اور نزدیک و دور کی ہر شے ''سُبحان اللہُ والحمدُاللہ ولا اِلٰہ اِلا اللہ واللہُ اکبر ولاحول ولاقوۃ اِلا باللہِ العلی العظیم'' کا ورد کر رہی ہے۔

- یہودی جادوگر......!

چاند کے گرد کا ہالہ اب شاید مزید وسیع ہو گیا تھا' یوں جیسے چاند اپنے سائز سے کئی گنا بڑا ہو گیا ہو اور شاید اسی لئے چاندنی میں بھی مزید نکھار در آیا ہو گیا تھا۔ اب جیسے ہر شے نے اپنی نوک پلک دُرست کر لی تھی۔ چاندنی کا وہ جو اپنا ایک خاص فسوں ہوتا ہے' بس اسی فسوں نے جزیرے کی ہر چیز کو اپنے حصار میں باندھ لیا تھا۔ بھول ہی چکا کہ میں تو زخمی کوّے کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں اور شاید ابھی بھی بھولا ہی رہتا اگر میری دائیں جانب قریب ہی سے کہیں کوّے کی ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کی آواز میری سماعت سے نہ ٹکراتی۔ میں ٹھٹک کر دائیں جانب اُسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا تو میں ٹارچ روشن کر کے دائیں جانب قدرے بلندی کی جگہ پر آ گیا۔ یہاں ایک طویل سا چوبی بینچ شاید سیاحوں کے [illegible] پاس ہی ایک [illegible] تقریباً چھ سات فٹ لمبا کھمبا استادہ تھا جس کے اوپر لکڑی کا ایک بڑا سا...... جس پہ جزیرے کے چاروں سمتوں کے متعلق معلومات لکھی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی شمالی حصّے کی جانب جانا سخت ممنوع لکھا تھا۔ اسی کھمبے کے نیچے فالتو چیزیں ڈالنے کا بڑا سا گول ڈبا بھی تھا۔ میں ذرا سی دیر کے لئے اس بینچ پہ بیٹھ گیا۔ میری کھلی آنکھیں اس اندھیرے اُجالے میں زخمی کوّے کو تلاش کر رہی تھیں جو چھلاوے کی طرح مجھے اپنی موجودگی کا احساس بھی دلا رہا تھا اور نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ آواز تو یہیں کہیں قریب سے ہی آئی تھی' اسی اسرار پہ غور کرتے ہوئے چند حیران کن سے لمحے اور گزر گئے۔ سامنے شمالی حصّے کی جانب جو اچانک نظر اُٹھی تو دیکھا کہ ایک کالی سی گھٹا بڑی سُرعت کے ساتھ جزیرے کی جانب اُمڈی آ رہی ہے' ایسی واضح اور سیاہ کالی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسے جیسے جزیرہ قریب آتا جا رہا تھا' وہ کالی گھٹا اپنی بلندی چھوڑتی جا رہی تھی۔ میں ششدر سا یہ عجیب وغریب نظارہ دیکھنے اور اس کے متعلق سوچنے میں مگن تھا کہ اسی کالی گھٹا یعنی شمال کی طرف سے پھر ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کی آواز آئی۔ اس بار میں نے کسی عُجلت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے تحمّل' صبر اور انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے ذہن کا ایک بٹن دبایا اور پوری توجہ ''کیا کیا' کیوں کیوں'' کی فریکوئنسی کو پکڑنے پہ لگا دی۔ اِدھر کالی گھٹا کا ایئر کرافٹ بھی جیسے لینڈنگ آرڈر لے چکا تھا۔ میری حیرانی

اپنے عروج پہ پہنچ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ کالی گھٹا ایک عقاب یا جہاز کی صورت اختیار کر چکی ہے جیسے ڈائنوسار کے زمانے کا کوئی دیوہیکل دیومالائی آسمانی پرندہ کسی ڈائنوسار کے بچے پہ جھپٹنے کے لئے آسمان سے نشانہ باندھ کر زمین پہ گرتا ہے۔ اسی لمحہ پھر کوّے کی آواز آئی۔ میں نے اپنا میٹر سیٹ کیا ہوا تھا' وہ مجھ سے تقریباً پچیس فٹ شمالی مشرقی حصے میں' پچانوے ڈگری پہ تھا۔ میں بڑے حساب کتاب سے اُٹھا' آدھے دائرے کا چکر کاٹ کر اس کے سر پہ جا پہنچا۔ اس سے پیشتر کہ میں اس پہ ہاتھ ڈالتا' وہ پھر مجھے غُچہ دے کر بھاگنے کی سعی کرنے لگا مگر اس بار وہ میرے ہاتھ آ ہی گیا۔ اسے گرفت میں لیتے ہی یکدم اندھیرا سا چھا گیا' جیسے بجلی بند ہو گئی ہو۔ پھر ایسی کرخت اور کٹیلی سی آوز بلند ہوئی جیسے کوئی سپر سانک فائٹر طیارہ ہلکی بلندی پہ پرواز کرتا ہوا سر کے اُوپر سے گزر گیا ہو۔ میں ہڑ بڑا کر اپنے پاؤں پہ ہی بیٹھ گیا' زخمی کوّے اور اپنے سر کو گھٹنوں میں دے لیا۔ چند لمحوں کے بعد احساس ہوا کہ آواز کے ساتھ اندھیرا ابھی ختم ہو چکا ہے تو سر اُٹھایا۔ دیکھا کہ وہی دیوہیکل' جمبو جیٹ کی مانند آسمانی پرندہ۔ میرے سر پہ سے گزر کر اب سمندر کے اُوپر بڑی نیچی سطح پہ پرواز کر رہا ہے بالکل جیسے ہوائی جہاز رن وے پہ اُترنے کے لئے ہوائی اڈے کے اوپر چکر کاٹ کر اپنی بلندی کم کرتے ہوئے اپنی سمت تبدیل کرتا ہے۔ کوّے کو بھول کر اب میں اس جہازی پرندے کی پرواز دیکھ رہا تھا' ایک لمبا چکر کاٹ کر اب وہ پھر میرے اوپر سے گزرنے والا تھا۔ اب میں اسے غور سے دیکھنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میں بھاگ کر واپس بینچ پر آ کھڑا ہوا تاکہ میں اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکوں...... میرے خدا! وہ تو اس زخمی کوّے کی نسل کے کوّوں کا ایک بڑا غول محوِ پرواز تھا۔ ہزاروں کوّے ایسی ترتیب اور نظام کے ساتھ پرواز کر رہے تھے کہ دور سے یا قدرے اندھیرے میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ کوئی بڑا سا پرندہ یا جہاز پرواز کر رہا ہے۔ تیسرے چکر میں وہ سطحِ سمندر کو چھوتے ہوئے تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے...... ان کے تیور' رفتار اور رُخ دیکھتے ہوئے میرے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی سی بجنے لگی تو میں نے فوراً واپس اپنے کاٹج کی طرف دوڑ لگا دی' بس مجھے اتنا ہی موقعہ مل سکا کہ اُفتم پشتم کسی نہ کسی طرح اپنے کاٹج میں گھس کر کھٹ سے دروازہ بند کر سکا تھا...... کھڑکیاں تو پہلے سے ہی بند تھیں' اندر سے چٹخنی اور ارل بند کر کے میں نے زخمی کوّے کو تخت دراز پہ بٹھا دیا...... وہ اب بھی متوحش سا مجھے دیکھ کر ہانپ رہا تھا۔ میں نے فسٹ ایڈ کی کٹ نکالی' سپرٹ اور روئی سے اس کے بازو کے زخم کو صاف کیا اور ٹنکچر لگا کر معمولی سی پٹی باندھ دی۔ اُڑنے کے قابل تو وہ پہلے ہی نہیں تھا' پٹی باندھنے کے بعد وہ بالکل ہی ہلنے جُلنے کا اہل نہ رہا۔ اب مجھے اسے کچھ کھلانے کی فکر ہوئی۔ میں نے کچھ نمکین بسکٹ اور مونگ پھلی اس کے سامنے بکھیر کر ڈال دی۔ اس دوران کاٹج کے باہر کچھ ٹھک ٹھک ہوتی رہی مگر میں نے

زخمی کوّے کی ڈریسنگ میں اُدھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اوپر ٹین کی مخروطی چھت تھی' محسوس ہو رہا تھا کہ اوپر کوّوں کی اچھی خاصی تعداد بیٹھی ہوئی ہے۔ گو سمندر کے شور میں ان کا غوغا دب سا گیا تھا پھر بھی کاٹیج کے باہر کافی ہنگامہ سا بپا سنائی دیتا تھا۔ میں نے احتیاطاً ایک بار پھر دروازہ اور کھڑکیاں چیک کیں' ان کے اندر آنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ میں اس مقید حالت میں آخر کب تک اس کال کوٹھڑی میں بند رہوں گا؟ فوراً خیال آیا کہ جیکب تو صبح آ ہی جائے گا یا ہو سکتا ہے' صبح سے پہلے یہ کوّوں کی برادری یہاں سے مراجعت کر جائے...... ایک دم لائٹ غائب ہو گئی۔ آمادہ پیکار کوّے' بپھرا ہوا سمندر اور اندر گھُپ اندھیرا۔ فوراً ٹارچ ٹٹولی...... اُف میرے خدا! ٹارچ غائب...... یاد آیا کہ ٹارچ تو باہر بینچ پہ کھڑے ہوتے وقت وہیں پہ رکھ دی تھی اور بعد میں کوّوں کی پرواز میں ایسا مگن ہوا کہ ٹارچ دوبارہ اُٹھانا بھول گیا۔ اب کیا ہو؟...... اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنی شروع کیں کہ کہیں جیکب کی ٹارچ مل جائے۔ کوئی کھڑکی دروازہ کھلا ہوتا تو تھوڑی بہت روشنی اندر آتی مگر یہاں تو دروازہ کھڑکیاں سب سیل بند تھے۔ درمیانی چوبی ستون سے ٹکرایا۔ کبھی اِدھر' کبھی اُدھر۔ ایسا بوکھلایا کہ سمتوں کو بھول گیا' کچھ یاد نہ رہا کہ دروازہ کدھر ہے اور کھڑکیاں کہاں ہیں؟ تخت دراز پہ ہاتھ لگا تو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ تخت دراز میرے والا ہے یا جیکب کا؟...... کلیجے پہ خنجر سے چوکے لگاتی ہوئی زخمی کوّے کی آواز اُبھری...... "کیا کیا' کیوں کیوں"...... اللہ! یہ "کیا کیا' کیوں کیوں" سے کب میری جان چھُوٹے گی؟...... آواز میرے پاس تخت دراز سے ہی آئی تھی۔ میں نے ذرا آس پاس ہاتھ پھیرا تو وہ کوّا بندھا ہوا مل گیا' ہاتھ لگتے ہی پھر وہی "کیا کیا' کیوں کیوں"...... اچانک میرے منہ سے نکلا۔

"چا' چ چ چ چی......!"

بجلی کا ایک کوندا سا میرے سر پہ لپکا' کنپٹیوں سے تیز نیلے رنگ کی شعاعیں سی خارج ہونا شروع ہوئیں' دماغ میں جیسے کسی نے کانچ کی چوڑیوں بھرا ٹوکرا' اُٹھا کر فرش پہ پھینک دیا ہو۔ اندھیرے کے باوجود ہر چیز واضح دکھائی دینے لگی۔ چاچی کی برسوں پہلے کی بات یاد آ گئی کہ عراق کے شہر مُوصل کے قریب اُرغون نامی چند گھروں پہ مشتمل چھوٹے سے گاؤں کے باہر ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جو نہ مٹی ہے' نہ پتھر اور نہ کوئی دھات۔ وہ زندہ ٹیلہ ہے اس کوّے کا جو سب کوّوں کا جدامجد ہے۔ اس ٹیلے کے زندہ مساموں سے بالوں جیسی گھاس اُگتی ہے۔ ہر مہینے جب پونم کی رات ہوتی ہے' ہزاروں کوّے نہ معلوم نہیں کہاں کہاں سے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شب بھر یہاں اک عجیب سا ہاہو کا عالم رہتا ہے۔ اس شب گاؤں والے سرِشام ہی گھروں میں بند ہو جاتے ہیں...... ایک بار بابا جی نے بتایا تھا کہ کاہن' جادوگر اور ساحر جو کایا پلٹ کا فسوں

جانتے ہیں' وہ اکثر کالے کوّے کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ کوّا عام کوّوں سے خاص بڑا ہوتا ہے یا پھر وہ چھپکلی' چمگادڑ' سانپ' گیدڑ' بڑی سی بلّی کی بھی جون بدلنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے خبیث کاہن' ساحر اور جادوگر زیادہ تر یہودیوں میں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے نچلے طبقوں' کالی دیوی کے پجاریوں اور ملحد ملیچھ شودروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہودی جادوگروں کا یہ مخصوص طبقہ یہودی ملوکیت اور ایک خاص نظریہ قومیت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ساحر کاہن سحرِ سامری اور سحرِ بابلی کے پیروکار اور عالم ہوتے ہیں۔ یہ اپنے جادو کے زور پہ ہر سیدھا اُلٹا کام نکلوا سکتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ جادو اک باقاعدہ سائنس کا درجہ رکھتا ہے اور اس شیطانی علم کی باقاعدہ تحصیل ہوتی ہے جیسے یہ مادام آبیرے ڈیوڈ یا جیکب کر رہے تھے۔ بظاہر یہ روحیت کا سلسلہ ہوتا ہے لیکن دَر پردہ یہ سفلی علوم کا حصول اور تحصیل ہوتی ہے۔ ہمارے ایک باباجی قدرت اللہ شہاب مرحوم اسرائیل میں اپنے ایک مشن کے دوران ان جادوگروں کے ہتھے چڑھ گئے تھے جس کے نتیجے میں باباجی کو بے پناہ مشکلات اور عارضوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں خود بھی ان دنوں اسرائیل میں موجود تھا اور ایک آدھ واقعہ کا شاہد بھی ہوں۔ کہتے ہیں کہ شاہ فیصل کے قتل میں بھی ان ساحروں کا بلاواسطہ ہاتھ تھا۔ یاسر عرفات پہ بھی بے شمار وار کیے جا چکے ہیں' اور بھی لاتعداد واقعات ہیں جو بوجوہ منظرِ عام پہ نہیں لائے جا سکتے ... ... یہ بھی ... یہودی ... ساحروں اور ... نے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا اور آج بھی یہ ہمارے ازلی دُشمن ہمارے دُشمنوں کے ساتھ مل کر ہمیں کسی بھی موقعہ پہ زک پہنچانے سے مطلق نہیں چوکتے۔ ہمارے صحابہ کرامؓ اور خود نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور مابعد بھی تدِ مبارک تک کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آئے۔ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے فری میسن ہال' کلچر اور انسانی احیاء و بہبود کے نام پہ قائم کیے گئے یہ ادارے' یہ تنظیمیں' سوسائٹیاں' کلب انہی یہودی ساحروں اور اسلام دُشمن قوتوں کی بانیاں اور کمین گاہیں ہیں۔

چاچی کا نام بلا ارادہ زبان سے نکل گیا تھا جیسے بلا ارادہ اور کوشش اندر تیسرے کلمے کی چکّی' اپنے آپ ہی چلتی رہتی ہے۔ چاچی کا نام جیسے کوئی سونے کی چابی تھا' زبان پہ نام اور ذہن میں تصور قائم ہوتے ہی جیسے میرے اندر کے کُل شبو کی بیچ گوشہ صندوقچی میں محفوظ' اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتیں اور میرے بزرگوں کی عطا کی ہوئی استطاعتیں باہر نکل آئی ہوں۔ میرے دیکھنے' محسوس کرنے اور سوچنے سمجھنے کی قوتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہو۔ مجھ میں جراَتِ ایمانی' حوصلہ اور جذبہ دوچند ہو گیا ہو۔ اندھیرے کے باوجود اَب میرے لئے کاٹج کی ہر چیز روشن روشن تھی جیسے کسی نے میری آنکھوں میں اندھیرے میں دیکھنے والے ریڈ الٹرا وَیو لینز لگا دیے ہوں...... حلق سے چیخ نکلنے سے پہلے ہی میں نے خود پہ قابو پالیا تھا۔ تخت دراز پہ

ایک کریہہ الصورت بڈھا کھوچل پڑا دکھائی دیا...... میرے خدا! یہاں تو زخمی کوا بندھا پڑا تھا؟...... یہ سوچتے ہی اب بڈھے جادوگر کی جگہ مجھے وہی کوا نظر آنے لگا' یعنی وہی دونوں آنکھیں بیک وقت اپنا اپنا کام دکھا رہی تھیں۔ وہی بچپن والی آدھے شیشے کو اندھا کر کے دیکھنے والی مشق جو چاچی نے کرائی تھی۔ دوسری آنکھ سے پھر بڈھے کو غور سے دیکھا...... طوطے کی طرح لٹکی ہوئی خمیدہ ناک' آنکھوں میں نفرت اور وحشت' چہرے پہ لعنت اور پھٹکار کھنڈی ہوئی۔ ٹیڑھی میڑھی انگلیاں' بدبُو اور تعفن کا ایک تو بڑا...... وہ کسمسا کر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ عربی لہجے کی انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''خوش بخت انسان! اگر تم میری حقیقت سے واقف ہو ہی چکے ہو تو اب تمہاری اور میری بہتری اسی میں ہے کہ تم مجھے کھڑکی کھول کر آزاد کر دو...... اور ہاں' میری بازو کی یہ پٹی بھی اُتار دو......''

''ضرور......'' میں نے اُسے مختصر سا جواب دیتے ہوئے اس کے پاس پہنچ کر پٹی اُتار دی' زخم سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ ''تمہارا زخم ابھی کچا ہے' تم ابھی اُڑنے کے قابل نہیں ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہیں تلاش کر کے مرہم پٹی کی ہے اور باہر موسم خراب ہے' اندھیرا اور طوفان ہے...... ہو سکے تو موسم بہتر ہونے تک یہیں رُکے رہو......''

''نہیں' میں موسم کے بہتر ہونے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھے فوری طور پہ یہاں سے رُخصت ہونا ہے اور باہر میرے ساتھی ہیں' وہ مجھے ساتھ لئے بغیر یہاں سے جا نہیں سکتے اس لئے تم مجھے فوراً کھڑکی سے باہر کر دو تا کہ ہم اپنی منزل پہ پہنچ سکیں......''

''تم سب اب کہاں جاؤ گے......؟'' میں نے اگلا سوال کر دیا۔

''ہم یہاں ہر ماہ پونم کی رات' مادام آئیرے کے معبد میں عبادت میں شمولیت کے لئے آتے ہیں اور پو پھٹنے سے پہلے یہاں سے واپس روانہ ہو جاتے ہیں۔''

میں نے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ لوگوں کے لئے یہ کوّوں کی جون بدلنا ضروری ہوتا ہے......؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں' جب لمبی اُڑان مقصود ہو تو کوّے کی کایا لینی ضروری ہو جاتی ہے...... کوا بجلیوں کی زد میں نہیں آتا' موسم کی خرابیاں اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں' دُشمنوں کے حملے سے محفوظ ہوتا ہے۔ سمت اور سفر کا تعین اسے خوب رہتا ہے......''

اب میں بولا۔ ''...... اور جادوگروں کو اس کے قالب میں ڈھلنے کے لئے خاصی آسانی رہتی ہے' بس پاؤں کی خاک میں تھوکا اور سر پہ ڈالی۔ انگشتِ شہادت' پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان پھنسائی۔ بائیں ہاتھ سے ناک بند کی اور زیرِ لب پڑھا۔ ''ہدنب اک سیلبا اونگ نیم'' کوّے کی کایا بدل

لی...... ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" میں نے کھڑکی کھولتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی تو کوّے ہو' تمہیں دیکھ کر ہی تو میں پناہ لینے کی غرض سے اس جگہ آ گرا تھا۔ یہ جتنے سوال جواب تمہارے اور میرے درمیان ہوئے ہیں' یہ قطعی غیر ضروری تھے...... تم بہت اچھے اور مہربان انسان ہو۔ تمہاری رحم دلی اور جو مشقت تم نے میرے لئے اٹھائی' اس کی وجہ سے میں نے وہ باتیں بھی تمہیں بتا دیں جنہیں چھپانا ہمارے لئے انتہائی ضروری ہوتا ہے...... آخری بات' میں ایک یہودی فسوں گر ہوں۔ میرا نام شمعان ابوز ہے...... اب تم مجھے کھڑکی سے باہر نکال دو۔ میرے ساتھی جو میرے پیروکار ہیں' میرا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں......"

میں اُٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو "زخمی کوّے" نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کھڑکی سے باہر چھوڑنے سے پہلے میں نے شمعان ابوز کو بتایا۔

"یہودی ساحر! غور سے سنو...... میں اللہ کے اَمر اور اپنی چاچی کے روحانی تصرف کی وجہ سے تمہیں پہچان چکا تھا اور مجھے یہ احساس بھی ہو چکا تھا کہ تم پہ بھی میری اصلیت کُھل چکی ہے۔ اس جادوگری جزیرے میں میرا نماز ادا کرنا' تیسرے کلمے پاک کا مسلسل ورد اور باوضو ہونا' ہر لمحہ اپنے بابا جی کی توجہ اور نظر میں رہنا' اگر [illegible] تو آپ اور میرا چچا پہلے [illegible] میں ہی جھٹکا کر چکے ہوتے......"

وہ میری گرفت میں ہی جُز بُز ہوتے ہوئے حقیقت کا اظہار کرنے لگا۔

"میرے مہربان! یہ درست ہے کہ میں ہمت کر کے تم پہ حملہ آور ہوا تھا۔ تمہارے جسم سے ٹکراتے ہی میرا افسوں بجائے تم پہ آفت توڑنے کے اُلٹا مجھے ہی ہلکان کر گیا۔ ایک خنجر سا تمہارے پہلو سے نکلا' میرا بازو اور پسلی کاٹ گیا اور اب میری یہ دگرگوں حالت تمہارے سامنے ہے...... میں حیران ہوں کہ تم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہارا دشمن ہوں' میری جان بچائی' مرہم پٹی کی۔ میرے آگے کھانا پینا رکھا......"

میں نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں کوّے کا نہیں' کاگا کا سروپ ہوں' دوسرے یہ کہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ سلوک کیا ہے یہ میرا انسانی اور اخلاقی فرض تھا۔ ایک سچا مسلمان اختیار اور طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنے دشمن یا بدخواہ سے درگزر کرنا ہی احسن گردانتا ہے......" میں نے اسے کھڑکی سے باہر اُتارتے ہوئے کہا۔ "شمعان ابوز! جادو' طلسم' سحر' یہ سب کچھ استعانتِ ابلیس رجیم ہے۔ یہ ساری

باطل اور بدسرشتی سامری کی فسوں گری ہے اور فسوں گری کے سانپوں' اژدہوں کی تعداد استعداد کیسی ہی قوی اور جری کیوں نہ ہو' ان کے لئے ایک عصائے موسوی کا ظہور ہی کافی ہے.......''

جونہی میں نے زخمی کوّے کو باہر اُتارا' جھپ سے بجلی بحال ہو گئی۔ کھڑکی کے باہر سمندر اور باد و باراں بھی قدرے شانت سے پڑ گئے جیسے اُبلتی ہنڈیا جوش لینے کے بعد اپنی اوقات کے اندر سمٹ جاتی ہے۔ کوّوں کا کارواں غائب ہو چکا تھا' قدرے خوش گواری کا احساس ہوتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چاند اپنے جوبن پہ تھا۔ چاندنی نے زد میں آنے والی ہر شے پہ چاندی کا ملمع چڑھا دیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے میں نے زخمی کوّے کی ٹوہ لگائی کہ کہیں کمبخت یہیں کہیں نہ دھرا ہو مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ باہر نکل کر میں اسی لکڑی کے بینچ کی طرف آ گیا' سکون سے بیٹھ کر گزرے ہوئے تمام واقعات کا اَز سرِ نو جائزہ لیا...... بیٹھے بیٹھے محسوس ہوا کہ مجھے تو بڑی سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ آج صبح سے یہی کچھ ہو رہا تھا کہ کوئی بھی کھانا پینا وقت پہ نہ ہوا۔ گھڑی کی ریڈیم لائٹ پہ وقت کا اندازہ کیا۔ سوچا' عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ روٹی پانی کے بارے میں سوچیں گے۔ ٹارچ اُٹھائی' واپس کاٹج میں آ گیا۔ کوّے کے خون کے چھینٹوں والے کپڑے اُتارے' باہر برننگ ڈرم میں ڈال کر آگ دکھا دی۔ نہایا دھویا' لباس تبدیل کر کے اسی بینچ پہ واپس پہنچا۔ اب [illegible] نفل شکرانہ واسطے رفعِ شر اور عشاء کی نماز ادا کر کے بیٹھا تسبیح کر رہا تھا کہ بائیں جانب سے کسی کی آہٹ سی محسوس ہوئی' دیکھا تو ایک شخص میری جانب چلا آ رہا ہے...... اک اور مصیبت! یہ کون ہو سکتا ہے؟...... میں اپنے تئیں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ سبک تلے قدموں سے بڑے سکون سے آ رہا تھا۔ اُن کے بائیں ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ سا دکھائی دیا' پاس پہنچ کر اس نے بڑے اَدب سے سلام کیا اور تھیلا بڑھاتے ہوئے کہا۔

''معزز مہمان! میں کافی دیر آپ کا انتظار کرنے کے بعد آپ کے لئے کھانا لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کھانا گرم ہے' آپ کی ضرورت کی ہر چیز اس تھیلے میں موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ آج کے خاص اور لذیذ کھانے سے خوب لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ فُل مُون کی چاندنی اور اس سحر آگیں موسم کی بشاشت اور تازگی سے بھی محظوظ ہوں گے......''

وہ شب بخیر کہہ کر رُخصت ہو چکا تھا۔ سکاٹش بھیڑ کے چربیلے گوشت کے تلے ہوئے پارچے اور سٹیم میں پکے ہوئے ثابت آلو' ریڈ کِڈنی یعنی لال لوبیا۔ ڈبل روٹی اور براؤن کیک کے دو ٹکڑے...... باباجی والا نسخہ استعمال کیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' اللہ خیر الرازقین تین بار پڑھ کر' دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں پہ پھونکا۔ پھر کھانے کو مَس کرتے ہوئے اُنگلیاں پھریں' کھانے کو غور سے دیکھا۔ اچھی طرح اطمینان ہونے

پہ تمہ تمہ "الحمدُللہ" کہتے ہوئے کھانا تمام کیا۔

● ابلیسی عبادت گاہ......!

اب میری تمام تر توجہ شمالی حصے کی جانب مرکز تھی جو سختی اور تاکید سے میرے لئے آؤٹ آف باؤنڈ ایریا تھا بلکہ کسی بھی اجنبی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جیکب کی زبانی اور اُس کے دروازے پہ لگے ہوئے نوٹ سے مجھے کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ حصہ انتہائی پُراسراری اہمیت کا حامل ہے...... جادوگر کوّوں کے سربراہ شمعان ابوز کے بیان سے بھی یہی اشارہ ملا تھا کہ اُدھر کوئی معبد ہے جہاں چندرمُکٹ کی رات چیدہ چیدہ جادوگر دُور دراز کا سفر طے کر کے یہاں اپنی مخصوص پوجا پاٹ اور شیطانی ریاضت وعبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور پو پھٹنے سے پیشتر اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔

رات سر پہ تھی۔ سُنسان سا جزیرہ سونے یا لیٹنے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ کھانا کھایا تھا، ذرا ٹہلنے کی نیت سے [illegible] یہ جزیرہ طول و عرض میں [illegible] پھیلا تھا جو جنم جنم چلتے رہو تو ختم نہ ہو۔ کوئی پندرہ منٹ لگے ہوں گے، جزیرہ ختم، اور سامنے سمندر آ گیا۔ ٹکڑوں، کیڑوں سے بچتا بچاتا کنارے کنارے دُور تک نکل گیا۔ کچھ دور آگے جا کر لکڑی کا بنا ہوا ایک شکستہ سا پُل نظر آیا جو کنارے سے تیس چالیس فٹ اندر سمندر میں اترا ہوا تھا، دو تین ملکی کشتیاں اس کے ساتھ بندھی ہوئی ہچکولے لے رہی تھیں۔ میں اس کے اُوپر چڑھ گیا اور احتیاط سے قدم دھرتا ہوا اس کے آخری سرے تک چلا گیا۔ بپھرا ہوا سمندر، پُل کے ستونوں سے سر پٹختی اور جھاگ اُڑاتی ہوئی لہریں، سامنے اور پُرنور کی کرنیں بکھیرتا ہوا چاند، کہیں کہیں اُودھے سفید آوارہ بادلوں کے ٹکڑے۔ ایسا پُرفسوں ماحول کہ میں کتنی ہی دیر تک پُل کی ریلنگ پہ ٹھوڑی ٹکائے نیم خمیدہ سا کھڑا رہا۔ دیکھا کہ دُور سمندر سے کچھ پرندے پرواز کرتے ہوئے جزیرے کی جانب آ رہے ہیں، تیس چالیس پرندوں کا یہ گروہ لمحہ بہ لمحہ اپنی اُونچائی کم کرتا ہوا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ پرندے میری دائیں جانب جیسے کنارے پہ ہی کہیں اُتر گئے ہوں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوّے یا کسی اور نوع کے پرندے آج رات کی تقریب میں مادام آپیرے ڈیوڈ کے مہمان ہیں، یقیناً یہ کوئی جادوگر یا بدرُوحیں ہوں گی۔ غیر ارادی طور پہ میرے اندر تیسرے کلمے والی چکّی ذرا تیز ہو گئی اور میں بلا ارادہ اس طرف چل نکلا جدھر کچھ دیر قبل پرندے اُترے تھے۔ کچھ ہی دور آگے پہنچ کر معلوم ہوا کہ

جزیرے کا یہ حصّہ خاصا کٹا پھٹا اور ناہموار سا ہے۔ کہیں سمندر اندر گھسا ہوا تھا اور کہیں جزیرہ سمندر کے اندر بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مجھے خاصا بچ بچا کر چلنا پڑا۔ ذرا اور آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور کئی چھوٹی سمندری چٹانیں آ گئیں جن کی وجہ سے مجھے آگے بڑھنے میں اچھی خاصی دشواری محسوس ہوئی' مزید پریشانی یہ تھی کہ یہ چٹانیں سبز کائی اور سمندری حشرات سے اٹی پڑی تھیں' پھسلن کی وجہ سے ان پہ قدم تک نہیں دھرا جا سکتا تھا۔ آگے بڑھنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس جانب کنارے کے ساتھ ساتھ بڑی مضبوط آہنی کانٹے دار باڑھ لگی ہوئی تھی' باڑھ کے اندر پرائیویٹ پراپرٹی تھی۔ شاید یہی وہ آؤٹ آف باؤنڈ علاقہ تھا جہاں داخلہ بڑی سختی سے ممنوع تھا مگر میں تو اب اس ''وادیٔ عشق'' میں قدم رکھ چکا تھا' واپسی خاصی مشکل تھی اور ویسے بھی انسانی فطرت ہے کہ جس کام سے روکو' انسان اُدھر ہی جاتا ہے' خوامخواہ کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت میرے لئے ایک اچھی بات یہ تھی کہ میں نے لانگ شوز پہنے ہوئے تھے۔ اس قسم کے جوتے پہاڑی علاقوں میں مہم جوئی کے لئے پہنے جاتے ہیں۔ ان کے تلووں میں کیل سے لگے ہوتے ہیں۔ میں بڑی احتیاط سے پاؤں جماتا ہوا تھوڑا سا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ ایک غلطی یہ ہوئی کہ میں باہر نکلتے وقت ٹارچ لینا بھول گیا تھا' اچھی خاصی چاندنی کے باوجود بھی کہیں کہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آگے ایک [illegible] چٹان [illegible] پہ چڑھے بغیر دوسری جانب نہیں جایا جا سکتا تھا اور اس پہ ان حالات میں چڑھنا انتہائی مشکل اور خطرناک تھا یا پھر اس چٹان کے گرد گھوم کر جایا جا سکتا تھا اور یہ راستہ سمندر کے پانی میں اُترے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب خدا جانے سمندر کتنا گہرا ہو؟......

جوار بھاٹا کی وجہ سے سمندر میں کافی چڑھاؤ تھا۔ ایسی صورت میں سمندر کے راستے سے گزرنا اور بھی خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ کچھ دیر میں اُدھر ہی کھڑا مختلف ترکیبیں لڑاتا رہا مگر سوائے واپسی کے اور کوئی راستہ محفوظ نظر نہ آیا۔ واپس پلٹا تو کچھ دور آگے دائیں ہاتھ پہ اسی چٹان کے ساتھ ایک تنگ سی دراڑ دکھائی دی جو چاند بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے اندر تک صاف نظر آ رہی تھی۔ سامنے کھڑے ہو کر چند لمحے غور کیا' پھر تھوڑا سا آگے بڑھ کر میں اس کے اندر اُتر گیا۔ ذرا آگے جا کر چٹان کے اُوپر چڑھنے کا راستہ مل گیا۔ تین چار منٹ کی کوشش اور ہمت کے بعد میں اُوپر ایک تنگ چبوترے کے پاس کھڑا تھا' اس کے ساتھ ایک بڑے بڑے پتھروں کی فصیل سی تھی جسے سمندر کی تیز تُند نمدار نمکین ہواؤں نے بھُربھرا سا کر دیا ہوا تھا اور اس کے اُوپر ایک گول سے مینار کی پہلی منزل کا حصّہ تھا۔ یہاں شاید کسی زمانے میں روشنی کا مینار ہوتا ہوگا جو اَمتدادِ زمانہ سے آہستہ آہستہ اپنا وجود ختم کر چکا تھا' کسی نہ کسی طور پہ پہلی والی منزل باقی بچی رہ گئی ہوگی۔ اس میں ایک بڑی سی گول کھڑکی بھی تھی جس کی آہنی سلاخوں کو بھی سمندر کی نمدار نمکین

ہواؤں نے چاٹ لیا ہوا تھا۔ میں پتھروں کے چبوترے پہ کسی نہ کسی طرح سے چڑھ گیا تھا لیکن آگے کسی جیل کی سنگلاخ' ناقابلِ تسخیر دیوار کی طرح تنی کھڑی فصیل پہ چڑھنا میرے لئے اس وقت نانگا پربت پہ چڑھنے کے مترادف تھا۔ میں فصیل کے ساتھ ساتھ کوئی راستہ یا دراڑ دیکھنے کی غرض سے آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک دم نشیب سا آ گیا۔ یہاں اگر جزیرے کو ایک بلی تصور کر لیا جائے تو سمجھئے کہ اس بلی کی دم سمندر کے اندر دور تک ایک پتھریلی پگڈنڈی کی صورت چلی گئی تھی اور یہاں سے فصیل کی دیوار کافی نیچے اٹھائی گئی تھی۔ اب تصویر یہ بنتی تھی کہ کسی زمانے میں یہ چھوٹا سا ٹاپو جسے آپ بے بی جزیرہ کہہ سکتے ہیں' کسی سکاچ لارڈ کی جاگیر رہا ہوگا۔ پہلے وقتوں میں یورپ کے لارڈ' رئیس اپنے اپنے علاقوں جاگیروں کے مطلق العنان حکمران ہوا کرتے تھے' وہ آپس میں چھوٹی موٹی جنگیں بھی لڑا کرتے۔ ان کی ذاتی فوج' اسلحہ خانے' اصطبل' قلعے اور ان پہ اونچے اونچے مینار بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ مینار عام طور پہ رات کے وقت روشنی کے لئے استعمال ہوتے تھے مگر ہنگامی حالات میں انہیں جنگی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ مینار اور ایسی لاٹیں بطور عقوبت خانہ اور بندی خانہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جب کسی مخصوص قیدی کو قید تنہائی [illegible] کھانا پانی وقتاً اوپر رسی سے چھینکے سے پہنچا دیا جاتا اور وہ بے چارہ معتوب اسیری کے دن سلاخیں لگے کسی دریچوں سے تنگ زمین اور بے رحم آسمان کو حسرت بھری نظروں سے تکتا تکتا ایک دن کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پتھر کی مانند ساکت ہو جاتا۔

اسے میری خوش قسمتی سمجھیں یا بدقسمتی کہ مجھے دنیا کے بہت سے معتوب لوگوں سے منسوب ایسے بندی خانے اور عقوبت گاہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں مختلف حیثیت کے تاریخ ساز اور مشہور لوگوں نے اپنی اسیری کے آخری ماہ و سال گزارے۔ برصغیر پاک و ہند سے لے کر یورپ تک پھیلے ہوئے ان گنت واقعات دنیا کی تاریخ کا المناک حصہ ہیں۔ یہ جیلیں' بندی اور عقوبت خانے' قید تنہائی کی کوٹھڑیاں' قصوری چکیاں' پاؤں کی بیڑیاں اور ٹلکنیاں۔ زمین دوز تہہ خانے اور آسمان کو تکتی لگاتے ہوئے مینار' گرم پانیوں کے حوض' دریا سمندروں میں بھٹکتے ہوئے بڑے بڑے لکڑی کے مٹکے' بانسوں کے جنگل میں بانس کی قمچیوں سے بنائے ہوئے شکنجے' تازہ اتری ہوئی مویشیوں کی کھالوں کے لحاف' چنوں سے بھری توشکیں' کچے چمڑے کے تسمے' آہنی خود اور سیسے کے بنے ہوئے جوتے' چوبی صلیب اور گیس چیمبر' الیکٹرک کرسیاں اور زہر انجکشن' توپ دم اور دریا برد' فیل پایہ' باگھ بدڑ' کال کوٹھڑی یا سانپ کوٹھڑی' علاقہ بدر یا کالا پانی۔ یہ سب ایذا رسانی کے آلات اور عقوبتوں کے مختلف انداز اور طریقے ہیں۔ یہ ساری ایجادیں جاگیردارانہ

نظام' حاکمانہ ذہنیت' سیاست اور مذہبی جنون کی بگڑی ہوئی شکلیں اور منفی سوچ و فکر کے شاخسانے ہیں۔ نظامِ ملوکیت میں رشتوں اور تعلقوں کے تقدس کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ دور مت جائیے' یہ اپنے مغلوں کی تاریخ ہی اٹھا کر دیکھ لیں۔ یہ قید و بند کی صعوبتیں محض سزا کے طور پر ہی نہیں ملتیں' کبھی کبھی تو جزا' انعام اور خراج تحسین کے طور پہ بھی مل جاتی ہیں۔ یعنی ؎

اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

● اسپین کی دل آویزیاں اور کراہتیں......!

ہسپانیہ کے سواحل بڑے خوبصورت وسیع و عریض اور دلکش ہیں۔ یورپ کے دیگر ساحلی مقامات کے مقابلے میں یہ معتدل موسموں کی ساری مہربانیاں' فطرت کے حُسن کی تمام تر شادابیاں اور زندگی کی صحتمند حرارتیں لئے ہوئے ہیں۔ اس ملک کی زیادہ تر معیشت کا دارومدار پھل پھولوں' سبزیوں' ترکاریوں اور سیاحوں کی آمدورفت پہ ہے۔ میں ایک زمانہ اس خوبصورت چھوٹے سے ملک کے حُسن جہاں سوز کا اسیر رہا۔ جب بھی مجھے فطرت کے حسن بے پناہ سے آنکھیں سینکنے کو جی چاہا' سپین پہنچ گیا۔ ایک خوبی یا سہولت جو اسے یورپ سے ممیز کرتی ہے' وہ ہے اس کے ساحلوں پہ تفریحات کی بے پناہ' کم خرچ' آزادانہ سہولتیں اور رہائش کے لئے نہایت ہی ارزاں اور سہل الحصول چھوٹے بڑے خوبصورت کاٹج مکانات جنہیں آپ پورے سیزن یا پانچ دس سال کے لئے کرائے پہ لے سکتے ہیں' نقد یا قسطوں پہ خرید بھی سکتے ہیں۔ میرے ایک کاروباری دوست نے اسی طرح کا ایک فلی فرنشڈ کاٹج ایک لمبی لیز پہ لے رکھا تھا۔ یہ کاٹج مرکزی ساحل سے لگ بھگ ستر میل جنوب میں ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے ٹریس میں لبِ سمندر واقع تھا۔ ایک مقامی کسان اس کا کیئر ٹیکر یعنی رکھوالا۔ یہ رکھوالا بھی عجیب گھگھو قسم کا تھا۔ تیس بتیس برس کا وجیہہ جوان جو کبھی بُل فائٹر تھا۔ ایک فائٹ میں ٹانگ تڑوا بیٹھا' ہڈی پہ ہڈی نہ بیٹھی تو یہ اپنے گاؤں گھر پہ بیٹھ گیا۔ اب یہ بھنڈیاں' ہری مرچیں' بینگن توریاں اُگا اُگا کر لندن بھیجتا تھا جہاں میرا ہول سیل سبزی فروش دوست انہیں فروخت کرتا تھا۔ میں سپین پہنچنے سے پہلے اسے ٹیلی فون کر دیتا' یہ میرے لئے کاٹج کو جھاڑ پونچھ کر تیار کر دیتا اور مجھے لینے ایئر پورٹ پہ موجود ہوتا...... اس کمبخت کو پامسٹری سے دلچسپی تھی جبکہ اس کی موٹی سی بیوی شیلا ازبیلا ساحل پہ چھوٹی رنگین چھولداری لگا کر کرسٹل بال اور تاش کے پتوں کے ذریعے سیاحوں کو ان کی قسمت کا حال بتایا کرتی تھی۔ میرے سبزی فروش دوست نے پتہ نہیں کہ میرے بارے میں ان پاگل سے

میاں بیوی کو کیا کچھ اُلٹا سیدھا بتایا ہوا تھا کہ یہ دونوں ہی میرے دیوانے تھے...... ظاہر ہے انہیں میرے متعلق یہی کچھ بتایا ہوگا کہ مَیں بہت بڑا نجومی ہوں یا بلیک میجک جانتا ہوں (استغفر اللہ) یورپ سارے کا سارا توہم پرست ہے، بس انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ فلاں شخص پامسٹ ہے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔ ہپناٹزم جانتا ہے، رُوحوں اور جن، بُھوتوں سے رابطہ کرسکتا ہے، بس پھر یہ لوگ اسے پوجنا شروع کر دیتے ہیں...... یہ دونوں بے وقوف میاں بیوی بھی میرے بارے میں کچھ ایسا ہی حُسنِ ظن رکھتے تھے۔ جب بھی مَیں وہاں پہنچتا، وہ دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میری خدمت اور جی حضوری میں لگ جاتے اور کبھی کبھی دبے الفاظ میں مجھ سے کچھ سیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کرتے۔ مَیں انہیں کئی بار صاف صاف الفاظ میں سمجھا چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ایسا علم ولم نہیں ہے جو ان کے مقصد کا ہو اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ صرف سچے مسلمان یعنی کسی صاحبِ ایمان و ایقان کے مطلب کا ہے، دوسرے مذاہب اس سے کما حقہ، مستفیض نہیں ہو سکتے۔ وہ دونوں مسلمان بھی ہونے کے لئے تیار ہو گئے مگر مَیں انہیں ٹال گیا...... دراصل اس کی بیوی شیلا ازبیلا، نام نہاد پامسٹ، آسٹرولوجسٹ، میگناٹسٹ اور ہپناٹسٹ، خدا جانے کیا کچھ بنی ہوئی تھی۔ آتا جاتا اسے کچھ نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان علوم کے بارے میں کوئی باقاعدہ تعلیم و تجربہ رکھتی تھی، بس ان موضوعات پہ کچھ مطالعہ تھا اور باقی کام وہ اپنی موٹی موٹی نیلی آنکھوں اور اپنی پُرکشش نسوانی شخصیت سے پورا کر لیتی تھی...... ''مادام شیلا ازبیلا پُراسرار علوم کی ماہر، قدیم جپسی قبیلے کی چشم و چراغ۔ آئیے اپنی قسمت کا حال جانئے۔ مستقبل، محبت، شادی، بزنس، سفر، کچھ بھی پوچھئے''...... اس کی چھولداری کے باہر اندر بڑی خوبصورت رنگین تصویریں نمایاں طور پہ لگی ہوئی تھیں۔ کہیں وہ مہاتما بدھ کے ہاتھوں کا مطالعہ کرتی نظر آتی ہے، کہیں الزبتھ ٹیلر کے پاس کھڑی ہے۔ امریکن، برٹش، اٹالین ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے علاوہ ہندوستانی اداکاروں کے ساتھ بھی اس کی تصویریں تھیں۔ اگرچہ اس دُور افتادہ بیچ پوائنٹ پہ کوئی زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی، پھر بھی سیزن خوب لگتا تھا اور مادام ازبیلا اپنی چتر چالاکی اور مسحور کن شخصیت سے بھولے بھالے سیاحوں کو خوب جھاڑ پونچھ لیتی تھی۔ ان کا اصل گھر، کھیت کھلیان اور فارم وغیرہ تو گاؤں میں تھے جو ساحل سے خاصے فاصلے پہ تھا۔ ازبیلا کا خاوند زوگو اکثر اپنے کھیتوں میں رہتا تھا البتہ ویک اینڈ پہ وہ اپنی بیوی ازبیلا کے پاس چلا آتا اور اس کی چھولداری کے سامنے آئس کریم کا ٹھیلہ کھڑا کر لیتا۔ ویک اینڈ پہ میاں بیوی دونوں کا قیام میرے دوست کی کاٹیج پہ ہوتا جو ویسے بھی سال بھر ان ہی کی تحویل میں رہتا تھا...... سال میں ایک آدھ بار میرے لندن والے دوست کے بال بچے اِدھر آ جاتے اور ہاہو کر کے واپس لندن لوٹ جاتے، باقی سارا سال یا تو کاٹیج خالی رہتا یا پھر میرے جیسا کوئی انٹرنیشنل فُقرا یہاں آ کر پڑ جاتا۔

جون کے پہلے ہفتے میں ہی' مَیں سپین پہنچ گیا تھا۔ خلافِ معمول اس بار مادام ازبیلا بھی زوگو کے ساتھ ایئرپورٹ پہ میرے استقبال کے لئے آئی تھی اور مجھے پھولوں کا تحفہ دیتے ہوئے چناخ سے اس نے میرا بوسہ لے لیا تھا۔ وہ بڑی خوش اور ہلکی سی فربہ دکھائی دے رہی تھی...... وہ حسبِ معمول اپنی پچیس برس پُرانی کھٹارا اسی وین پہ مجھے لینے آئے تھے۔ یہ پرانی جرمن مرسیڈیز وین کاٹھی کی بڑی مضبوط اور خصلت و عادات کی بڑی شستہ تھی۔ کھیتوں کی کھاد' مویشیوں کا چارہ' کھیت مزدوروں کو لانا لے جانا' سبزیوں کی باربرداری اور بیچ پہ سیزن کے دنوں میں موبائل بیڈروم کا کام بھی دیتی تھی۔ اب جب مَیں اس پہ سوار ہوا تو مجھے اس کی حالت قدرے دگرگوں سی لگی اور مَیں یوں ہی اسے کہہ بیٹھا۔

''زوگو! تم اپنی یہ کھٹارا کب بدلو گے' اب تو یہ بے چاری بہت بوڑھی ہو گئی ہے......؟''

ازبیلا ڈرائیونگ سیٹ پہ تھی' زوگو مسکراتے ہوئے ازبیلا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''مسٹر خان! تم بہت کمال کے آدمی ہو مجھے تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جرمن اور امریکن گاڑیاں' اسپینش اور اٹالین عورتیں' پاکستانی اور عربی مرد اپنی زندگی میں کبھی بوڑھے نہیں ہوتے......''

مَیں گھوم کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا کہ اس یورپین پینڈو کو ایسے پتے کی بات کیسے سُوجھ گئی؟ ازبیلا بھی [illegible] بولی۔

''مائی ڈیئر مسٹر خان! یہ بات بڑی سچی ہے کہ جب تم یہاں آتے ہو تو اس بیوقوف کی عقل بھی کہیں سے واپس آ جاتی ہے یہ بڑے پتے اور کام کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے مَیں تم سے کہتی ہوں کہ پرمانٹ یہیں سپین میں سیٹل ہو جاؤ۔ مَیں اپنے کیبن کے باہر ایک شاندار بورڈ کا اضافہ کر دوں گی...... مسٹر خان! گریٹ ہولی مَین' پیراسائیکلوجسٹ' پامسٹ' آسٹرلوجسٹ فرام پاکستان وغیرہ وغیرہ۔ پھر دیکھو پیسہ کیسے برستا ہے۔ اگر ایک دو سیزن فل لگ جائیں تو چار پانچ ولاز اور کاٹج یہیں لے لیں گے اور اس ڈرائی ڈیول کی بھی کچھ اصلاح ہو جائے گی......''

''تھینک یُو مادام ازبیلا! کہ آپ نے مجھے ایسی ہوشربا آفر دی مگر افسوس کہ مَیں ایسا نہیں کر سکتا......'' مَیں نے کہا۔

''کیوں' تم کو کیا پرابلم ہے؟ فیملی ہے تو ان کو بھی اِدھر لے آؤ۔ نائس ویدر' بیوٹی فل پلیس...... وہاں کے لوگ اِدھر سیٹل ہونا چاہتے ہیں اور تم انکار کرتے ہو......''

مَیں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔...... ''بات یہ ہے کہ مَیں اپنے شوق کو پروفیشن نہیں بنا سکتا اور پھر مَیں سیلانی سا درویش آدمی ہوں' کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا......''

ایسی ہی باتوں میں مگن جب ہم اپنے کاٹیج پہنچے تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے...... دو چار روز ایسے ہی کسلمندی' سونے جاگنے' لکھنے پڑھنے میں گزر گئے۔ چونکہ میرے آتے ہی دوسرے روز ویک اینڈ پڑ گیا تھا' دو دن دونوں میاں بیوی بے حد مصروف رہے اور میں نے بھی انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھانا پینا کر کے میں ساحل کے ساتھ ساتھ لمبی واک کو نکل جاتا۔ سینڈوچ اور بسکٹ پاس ہوتے' جہاں اور جدھر بھوک لگتی' گزارہ کر لیتا۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہیں سمندر کنارے وضو کر کے کسی پتھر یا ریت پہ چھوٹی سی چادر جو سفر میں تولیے کا بھی کام دیتی' بچھاتا اور سجدہ دے لیتا۔

● درد کا مینار......!

ایک روز میری واک شاید کچھ لمبی ہی ہو گئی تھی۔ صبح نماز کے وقت کا نکلا جب ظہر کا وقت پڑ گیا اور میں اپنی لگن میں مگن کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اندر کی چھٹی چل پڑی تو چل ہی پڑی۔ چلتے چلتے' ڈوبتے سورج کے ساتھ ڈوبنے پہ ہی پتہ چلتا تھا کہ کہاں سے کہاں آ نکلے ہیں؟ جہازوں کے گھنٹوں کے سفر بھی کئی گھنٹوں میں طے کئے گھنٹوں تک نہ ہوا اور یہ بھی شاید کوئی ایسا ہی سفر تھا۔ گھڑی ٹٹولی' معلوم ہوا کہ عصر لگ گئی ہے۔ نماز کے بعد دور نزدیک نظر دوڑائی۔ چرند نہ کوئی پرند۔ دور دور تک کھلیان' میدان' ٹیلے' کھالے' کھائیاں یا پھر سمندر' آوارہ بادل' دور دور نظر آتے ہوئے جہاز......!

اب اِک عجیب سا علاقہ شروع ہو گیا تھا' سمندر بہت نیچے اور زمین بہت اوپر تھی۔ سمندر کے ساتھ عمودی اٹھے ہوئے تودے' شاید سمندر کے کٹاؤ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ انگلستان' خاص طور پہ ڈوور کے ساحل بھی ایسے ہی ہیں' بعض جگہوں پہ دو دو سو فٹ اونچے تودے اور پھر اوپر زمین۔ یہاں بھی یہی صورت تھی' ظاہر ہے کہ میں اب آگے نہیں جا سکتا تھا' بالکل وہی اسکاٹ لینڈ والے جزیرے آئی یا تھ والی صورتِ حال۔ میں کچھ پیچھے پلٹ آیا اور ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر اوپر چڑھ آیا۔ سمندر بہت نیچے رہ گیا تھا۔ سب سے پہلے جو چیز نمایاں نظر آئی' وہ ایک بلند مینار تھا۔ اس کے نیچے جیسے کوئی صدیوں پرانا' اجڑا ہوا قبرستان ہو۔ ٹوٹی پھوٹی شکستہ سی دیواریں' جا بجا بکھرے ہوئے تراشیدہ' ناتراشیدہ پتھر' سوکھے ہوئے درخت' اصطبلوں کے لئے باڑوں کے نشانات' کچھ منہدم سی کوٹھڑیاں اور صحن۔ اِک عجیب سی شکست و ریخت اور بربادی و تاراجی مجھے اس قطعۂ زمین پہ اپنی پرچھائیں ڈالے ہوئے نظر آ رہی تھی' لگتا تھا جیسے کوئی آفت آئی اور ہنستی بستی مسکراتی ہوئی اس چھوٹی سی بستی کو روند کر گزر گئی۔ کچھ قبروں کے نشانات بھی دکھائی دیے۔

ٹوٹے پھوٹے کتبے اور سنگی لوحیں آدھی اوپر اور آدھی زمین میں دھنسی ہوئیں۔ ذرا اور آگے بھاری پتھروں کا ایک بڑا سا چبوترا جس کے نیچے سے پتھریلی سیڑھیاں شاید اس کے تہہ خانے میں اُترتی تھیں۔ اسی چبوترے پر پُرہیبت' بھاری پتھروں سے بنا ہوا روشنی کا مینار کھڑا تھا۔ چار منزلوں کے اوپر آتشی روشنیاں گھمانے والے ٹوٹے پھوٹے زنگ آلود آلات لٹکے پڑے تھے۔ ہر ایک منزل پہ چاروں اطراف گول پتھریلی کھڑکیاں تھیں جن کے پٹ ٹوٹے ہوئے اور کھڑکیوں کے گول پتھر پرندوں کی گندگی سے اَٹے پڑے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ الٰہی! یہ کیسی اُجڑی ہوئی جگہ ہے' شاید اِدھر کوئی آنا پسند نہیں کرتا۔ اتنی بلندی پہ صدیوں پرانا یہ روشنی کا مینار جو اور بھی کئی صدیاں اپنے اس شکستہ وجود کو برقرار رکھنے کا حوصلہ رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اتنا اکیلا اور ایسا اکیلا؟...... میں یہی سوچتے سوچتے چبوترے پہ چڑھ کر اس درویش مینار کے قدموں میں جا بیٹھا کہ پوچھوں "اے بابا! ایسا ویرانہ اور ایسا ابہام۔ ذرا مَن کا در تو کھولو' اپنے بھیتر جھانکا تو لگانے دو۔ دیکھیں تو سہی کہ تم ہم ایسے اکیلے ہو یا ہم' تم جیسے اکیلے ہیں؟"...... یہ جگہ کافی اونچائی پر تھی۔ جہاں تک نگاہ کام کر رہی تھی وہاں کھیت' بڑے بڑے کھلیان' باڑے تھے۔ ذرا دُور پرے ایک سڑک بھی دکھائی دی جس پہ دیہاتی قسم کے چھکڑے گزر رہے تھے۔ ایک بات مجھے [illegible] الا تھی کہ کھیت باڑے اور مختلف طرح کی فصلیں بھی موجود تھیں لیکن کوئی کسان' کھیت مزدور' مویشی جانور دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ معاً مجھے ہلکی سی بھوک کا احساس ہوا' بغلی تھیلے سے چائے کا فلاسک اور دو چار کریم [illegible] نکالے۔ مینارے سے ٹیک لگائی اور سامنے پُرہیبت سمندر۔ پُرسکون' شانت۔ یوں لگا جیسے اس وقت کرۂ ارض پہ اوپر اللہ اکبر' درمیان میں میرا وجود اور نیچے سمندر ہے۔ چائے کے چسکے لیتے میں سوچ رہا تھا کہ موہنجوداڑو' ہڑپہ تو گھر کی مرغیاں ہیں۔ روم' ایتھنز' قاہرہ' نینوا' بابل' کوفہ' بغداد' دمشق' دہلی وغیرہ بربادیوں اور آبادیوں کی بڑی بڑی عبرت اور تماشا گاہیں دیکھی ہیں لیکن ایسی ویرانی سی ویرانی کہیں نظر نہیں آئی۔

کھلے کھیت کھلیانوں میں' سمندر کنارے اور اونچے پہاڑوں پہ صبح بہت جلد نکھر آتی ہے لیکن شام بڑی دیر تک اپنی زلفیں بکھیرے رہتی ہے۔ سورج کا تانبا' دن بھر کی تمازت سے تپ کر شفق رنگ ہو چکا تھا۔ سمندر کے سینے پہ دھرا ہوا لہو رنگ سورج یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے تازہ تازہ کلیجہ نکال کر مشہدی قالین پہ رکھ دیا ہو۔ تب ہی کہیں سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی' میں نے ذرا کان کھڑے کیے تو محسوس ہوا کوئی موٹر سائیکل اِدھر مینارے کی طرف ہی آ رہی ہے۔ میں کھڑا ہو کر اس پگڈنڈی کی جانب دیکھنے لگا جو اُدھر سڑک کو اس ویرانے سے ملاتی تھی۔ دُور سے وہ کوئی اول جلول قسم کا کسان نظر آیا۔ کھیت مزدوروں والا لباس' سر پہ سُرخ پھندنے والی ٹوپی۔ سُرخ پھندنا ہوا کے دوش پہ پیچھے لہراتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔

لمحہ لمحہ وہ قریب پہنچتا آ رہا تھا۔ مَیں چبوترے سے نیچے اُتر آیا' شاید اُس نے بھی مجھے نیچے اُترتے دیکھ لیا تھا اسی لئے تو وہ ہاتھ ہلا کر اپنی آمد کی خبر دے رہا تھا۔ اُس نے میرے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل روکنے کے لئے بریک کے علاوہ اپنے بڑے بڑے جوتوں سے بھی کام لیا' شاید موٹر بائیک کے بریک خراب تھے۔ موٹر بائیک کو قریب سے دیکھا' وہ کوئی پرانی جرمن فوجی موٹر سائیکل تھی جس کی سائیڈ میں ایک انڈے کی شکل کی نشست جُڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس موٹر سائیکل کے تین پہیئے ہوتے ہیں مگر وہ اکیلا تھا' اضافی نشست پہ کھانے پینے کا سامان' کچھ پھل اور سبزیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سُرخ ٹماٹری رنگت والا یہ کسان بڑا چاق و چوبند اور ہشاش بشاش سا دکھائی دیا۔ اُس نے ایک بلند سے قہقہے کے ساتھ مجھے شاید شام کا سلام کیا تھا۔ نیچے اُتر کر اُس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا' معانقہ بھی کرنے کی کوشش کی مگر مَیں دو قدم پیچھے ہو لیا۔ اب خدا جانے وہ مجھے کیا کچھ کہتا یا پوچھتا رہا' مَیں بس سر ہلا ہلا کر ''یس یس'' ہی کرتا رہا کیونکہ مَیں اتنی ہی اسپینش جانتا تھا جتنی وہ انگلش سمجھتا ہوگا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے ایک طرح کے گونگے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے سامان کا تھیلا اور پھل سبزیاں وغیرہ اُٹھائیں اور اپنی ترنگ میں چبوترے کے نیچے بنی ہوئی شکستہ سی پتھریلی سیڑھیوں سے اتر کر کہیں غائب ہو گیا۔ ان سیڑھیوں کے آس پاس خودرو کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہیں۔ مَیں نے یہاں پہنچتے ہی یہ سیڑھیاں دیکھ لی تھیں جو شاید مینارے کے نیچے کسی تہہ خانے کی طرف اُترتی تھیں۔ اس کسان کے سیڑھیوں سے نیچے اُترنے کے بعد مَیں بھی ذرا سا آگے بڑھ کر سیڑھیوں والے راستے کو دیکھنے لگا کہ یہ کسان سامان لے کر کہاں اُتر گیا ہے؟...... تھوڑی دیر بعد وہ جس طرح قینچی سا کترتا ہوا گیا تھا ویسے ہی سرعت سے کاٹتا ہوا اوپر آ گیا۔ وہ اب بھی مجھ سے یوں مخاطب تھا جیسے مَیں اُس کا کوئی لنگوٹیا ہوں اور اُس کی ہر ادا اور بات سمجھ رہا ہوں' اُس کو میرے کسی جواب کی شاید ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ اس سے کوئی غرض مطلب کہ مَیں کون ہوں' کیا ہوں اور یہاں اس ویرانے میں اس وقت' بے وقت کیا کر رہا ہوں؟ وہ زمین دوز تہہ خانے سے کچھ فالتو چیزیں' ان دُھلے کپڑے' خالی برتن اور کچھ کاٹھ کباڑ اُٹھا کر لایا تھا جو اُس نے موٹر سائیکل کی سائیڈ کار میں ٹھونس ٹھانس دیا مگر کیا مجال جو اس دوران ایک لمحے کے لئے بھی اُس کی انتھک زبان رُکی ہو۔ وہ اپنے اس رنگ میں مجھ سے اور اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ایک بار پھر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ اب مَیں اوپر کھڑا اس سوچ میں گم تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے مَیں بھی نیچے جاؤں یا نہ جاؤں کہ وہ ٹیب ٹیب کرتا ہوا پھر اوپر آ رہا...... اب کے اُس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے دو بھاری سے لفافے تھے جنہیں اُٹھائے ہوئے وہ سمندر کی جانب بڑھ گیا۔ مَیں اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمندر کے رُخ اپنے اسی ٹمپو میں ہوا سے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا۔ آخری

کنارے پہ پہنچ کر اُس نے وہ لفافے سمندر میں پھینک دیئے جنہیں سطحِ سمندر تک پہنچنے میں بھی شاید کچھ وقت لگا ہوگا کیونکہ اِس جگہ سے سمندر بہت ہی نیچے تھا۔ وہ اپنے ہاتھ بازو لہراتا' ہَوا سے باتیں کرتا ہوا واپس آرہا تھا۔ کبھی وہ مجھے مخبوط الحواس دِکھائی دیتا' کبھی اُجڈ بے وقوف کسان اور کبھی صحیح ٹھیٹ اسپینش ...... مَیں نے دیکھا ہے کہ اسپینش بڑے باتونی' ہنسوڑے اور بے وقوف سے دِکھائی دینے والے ہوتے ہیں۔ پہلی دونوں باتیں سو فیصد دُرست ہیں۔ تیسری بات کہ وہ بیوقوف دِکھائی دیتے ہیں' یہ بھی دُرست ہے لیکن وہ اندر سے بڑے صحیح' سمجھدار اور مخلص ہوتے ہیں۔ تین چیزیں ان کی زندگی ہیں۔ اوّل بھینسے سے لڑائی کرنا' دوم موسیقی سے لطف اندوز ہونا' سوم عشق کرنا......!

سورج ڈوب رہا تھا اور مَیں سوچ رہا تھا کہ مَیں دوسروں کو پاگل' بیوقوف' مخبوط الحواس اور نہ جانے کیا کیا سمجھ لیتا ہوں مگر مَیں خود کیا ہوں؟ دیکھا جائے تو مجھ جیسا احمق اور گاؤدی شاید ہی کوئی ہو۔ کوئی تُک بنتی ہے کہ صبح کا گھر سے نکلا ہوا' شام سر پہ' رات سامنے اور ابھی تک گھاٹ کا علم نہیں۔ نہ یہ سُدھ کہ یہ جگہ کون سی ہے' واپسی کا کوئی سامان ہے بھی کہ نہیں؟ ...... وہ پاگل کسان میرے پاس سے ہوائی باتیں کرتا ہوا یوں گزر گیا جیسے کالا شاکاکو کے سٹیشن سے تیزگام دامن بچا کر نکل جاتی ہے۔ وہ واپس جانے کے سلسلے میں اپنی پھٹیچر موٹر سائیکل کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا' پرانی موٹروں اور پرانے بڈھوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تردّد تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اِس کی زبان اور پاؤں دونوں چل رہے تھے' وہ لگاتار پاؤں مار مار کر اُسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں خود ہی بے شرموں کی طرح اُس کے پاس چلا گیا' انگریزی میں اُسے کہا کہ پلگ اور پٹرول وغیرہ چیک کر لو۔ اب خدا جانے اُس کے پلّے کچھ پڑا یا نہیں البتہ اُس نے جواب میں جو "انگریزی" بولی وہ تو بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی جبکہ مَیں اُس کے ہر لفظ پہ یوں اثبات میں سر ہلا رہا تھا جیسے میں اُس کے مُنہ سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو پورے سیاق وسباق کے ساتھ سمجھ رہا ہوں۔ مَیں جانتا تھا کہ میری انگریزی اُس گدھے کے سر پہ سے گزر گئی ہے۔ اب مَیں نے گفتگو کا انٹرنیشنل طریقہ اختیار کیا۔ موٹر سائیکل کی ٹینکی اور پلگ کو چُھو کر ہاتھ کے مختلف انداز بنا کر انہیں چیک کرنے کا اشارہ کیا۔ میرے اشارے وہ سمجھ گیا تھا لیکن میرے مشورے پہ عمل کرنا اُس نے شاید کچھ مناسب نہ سمجھا' البتہ اونچی اونچی کچھ صلواتیں سُناتے ہوئے اُس نے زور سے اس کے انجن کی پسلی پہ لات جمادی۔ یقین کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد ایک ہی کِک سے دھڑ دھڑ کی آواز کے ساتھ انجن سٹارٹ ہوگیا۔ اُس پہ اس نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا' پھر شاید اس کے بنانے والوں کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھا۔ پھر دوسری جانب گھوم کر ایک اور دَھر دی' اِس تازہ تازہ پہ انجن ایسا سرپٹ بھاگا جیسے

ابھی ابھی زیرو میٹر سٹارٹ ہوا ہو۔ پھر اُس نے میری جانب دادطلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ یہی ہوسکتا تھا کہ دیکھا' لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے...... وہ ایک فاتحانہ انداز سے موٹر سائیکل پہ سوار ہوا کہ الیگزینڈر دی گریٹ یعنی سکندر اعظم بھی اپنے گھوڑے پہ ایسی شان استغنا سے سوار نہ ہوتا ہوگا۔ سورج اب ناک کے بعد آنکھوں تک ڈوبنے پہ آ گیا تھا۔ اُس کی آخری دم توڑتی ہوئی زرد زردسی کرنیں' اِس ''للوجگدر'' کے چہرے پہ ایک عجیب احمقانہ سا تاثر اُبھارے ہوئے تھیں......
میرے دل میں تھا کہ یہ بیوقوف رُخصتی پہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ تم کون ہو' یہاں کیوں اور کیسے پہنچے' کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے مگر توبہ کیجئے کہ اُس نے مجھے کوئی اہمیت دی ہو۔ وہ تو یوں مجھ سے سلوک کر رہا تھا جیسے میں ہمیشہ سے یہیں رہا ہوں اور اُس کا پرانا لنگوٹیا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ اب وہ ایک دو تین کہنے والا ہے تو میں نے ہڑبڑا کر اشاروں' کنائیوں اور آسان آسان انگریزی میں اُسے بتانے کی کوشش کی کہ اللہ کے بندے! مجھے کہاں اس خوفناک ویرانے میں چھوڑ کے جا رہے ہو' مجھے بھی ساتھ بٹھاؤ اور کم از کم اِس سڑک تک تو چھوڑ جاؤ جدھر سے مجھے کسی شہر تک کوئی سواری میسر آ سکے...... میں اپنی انگریزی ہانک رہا تھا' وہ اپنی اسپینش جھونک رہا تھا۔ اب تو میرے ہاتھوں کے اشارے بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے چھوڑنے ہی والا ہے تو آخری کوشش کے طور پہ میں نے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ اور اپنی بیک سیٹ کی طرف واضح طور پہ ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ مجھے یہاں بٹھالو۔ اُس نے میرے اشارے کا مطلب سمجھنے کے لئے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ اور میری ''تشریف'' کی طرف باری باری دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ پٹرول کی ٹینکی کے پاس سے ایک پرانا کپڑا گھسیٹ کر باہر نکالا۔ میں خوش ہوا کہ وہ میرے بیٹھنے کے لئے پچھلی سیٹ کی جھاڑ پونچھ کرے گا مگر اس نے کپڑے سے اپنے جوتے صاف کئے اور پھر اچانک سائیڈ کار پر چڑھ کر ایک زور کی دولتی بیک سیٹ پہ جھاڑی۔ پھر وہ نیچے اُتر کر میری جانب بڑھا' پتہ نہیں کہ زور زور سے کیا کہہ رہا تھا۔ میرا خیال یہی ہے کہ وہ مجھے مشورہ دے رہا تھا کہ اُدھر سمندر اور ڈوبتے سورج کی جانب مُنہ کر کے ہلکا سا مرغا بن کر اپنی تشریف واضح کرو تاکہ میں بھرپور لات جما سکوں۔ میں اُس کی آمد کا مطلب سمجھتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا اور بندر کی طرح پھلانگ کر چبوترے پہ چڑھ گیا۔ وہ نیچے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ اور اشارے سے میری بیک سیٹ کے متعلق کچھ زور زور سے کہہ رہا تھا اور مجھے نیچے اُترنے کے اشارے کر رہا تھا پر توبہ کیجئے' میں تو یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر وہ میری بیک سیٹ پہ لات جمانے کے لئے چبوترے کی جانب بڑھا تو میں سیدھا وہاں سے سمندر کی جانب بھاگ لوں گا' چاہے مجھے تین سو فٹ کی

بلندی سے چھلانگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے...... خیر! اس کی نوبت اس لئے نہ آئی کہ وہ میری بجائے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ کو ایک اور لات لگا کر اور خوب زور زور سے مجھے صلواتیں سناتا ہوا واپس چلا گیا۔

مَیں نیم اندھیرے میں دُور تک اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا' سوچ رہا تھا کہ الٰہی! آج کس پاگل سے واسطہ پڑ گیا تھا؟ پھر سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا' چبوترے کے نیچے والی سیڑھیوں سے اُتر کر وہ کہاں گیا تھا۔ وہ کچھ لے کر گیا تھا اور کچھ اُٹھا کر باہر آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ نیچے کسی جگہ کوئی ہے جس کی کچھ ضرورتیں ہیں۔ وہ کھاتا پیتا اور کپڑے پہنتا ہے' اس کا کچھ کاٹھ کباڑ بھی ہوتا ہے جو سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔ وہ کون ہے' اِدھر کیوں ہے اور یہ پاگل' نیم دیوانہ' سٹھیایا اور کھسکا ہوا کون ہے اور اگر یہ ایسا ہے تو وہ کیسا ہوگا جو نیچے کہیں موجود ہے۔ کوئی جرائم پیشہ' چور' ڈاکو؟...... مَیں چبوترے پہ نیچے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میرے پاؤں کے عین نیچے وہ سیڑھیاں تھیں جو کہیں مزید نیچے جا کر غائب ہو جاتی تھیں۔ فوری ضرورت کے دو کام اہم تھے۔ ایک نماز' دوسرا فوری طور پہ یہاں سے نکل لینا تاکہ مزید کسی بدمزگی میں پھنسنے کی بجائے اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے پہلے کسی قریبی شاہراہ تک پہنچا جا سکے جو مجھے شہر تک لے جائے۔ وضو کی بھی ضرورت تھی اور اس کے لئے پانی دو قدم سمندر میں تو تھا مگر آس پاس کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاں چند چٹانیں' پتھر اور اِنسان تک نظر نہیں آئیں وہاں پانی کا کیا مقام۔ بہرطور تیمم کیا' وہیں چبوترے پہ چادر بچھا کر سجدہ ریز ہو گیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اونچائی اور کھلی فضاء ہونے کی بنا پہ مناسب سی روشنی تھی' آس پاس دیکھا جا سکتا تھا۔ نماز کے بعد دُعا سے پہلے اُنگلیوں پہ ورد کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ فارغ ہوتے ہی موٹر سائیکل والی پگڈنڈی پہ ہو لوں گا۔ کسی نہ کسی شاہراہ تک رسائی تو ہو ہی جائے گی' وہاں سے پھر اللہ مالک ہے۔ پن ٹارچ میرے بغلی بیگ میں تھی۔ دُعا کے بعد مَیں اُٹھنے کا جتن کر رہا تھا کہ قریب ہی سے کہیں انسانی کُھسر پُھسر کی سرسراہٹ سی اُبھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مَیں ملگجے سے نیم اُجالے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے مستعد پا کر وہ کُھسر پُھسر کرنے والے شاید خاموش ہو گئے تھے۔ مَیں نے تھیلے سے ٹارچ نکالی اور چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ شاید مَیں اِن کی توقع کے خلاف فوری طور پہ نیچے کود آیا تھا یا انہیں کہیں روپوش ہونے میں دیر ہو گئی۔ مجھے دو سائے جو سرتاپا چادروں یا چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے تھے' بصد دِقت اور آہستگی سے نیچے سیڑھیوں پہ اُترتے ہوئے نظر آئے۔ شاید وہ اپاہج یا لنگڑے تھے' ایک سائے نے دوسرے کو سہارا دے رکھا تھا۔ مَیں نے فوراً روشن ٹارچ کا رُخ اُن کی جانب پھیر دیا مگر وہاں مجھے سوائے تاریکی' جھاڑ پھونس' شکستہ پتھروں کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ مَیں اوپر سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑا

سوچنے لگا کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ شاید یہ وہی لوگ تھے جن کی ضرورت کا سامان پہنچانے اور ان کا فضلہ کچرا سمندر میں ٹھکانے لگانے وہ موٹر سائیکل والا احمق یہاں آیا تھا۔ واقعی ایسے ویرانوں میں رہنے والوں' ایسے اندھیروں تنہائیوں کے خُوگر چمگادڑوں کی چاکری کے لئے ایسے ہی اُلّو ہونے چاہئیں جو چاروں گانٹھ کے فارغ ہوں۔

میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی جب ایک موٹی بِلّی برابر چوہا جو بڑی تیزی کے ساتھ نیچے سے اوپر آیا' میرے دونوں پاؤں کے درمیان سے گزرتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔ اتنا بڑا چوہا شاید میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اگر اُس کی دُم پتلی' لمبی اور چہرہ لمبوترا نہ ہوتا تو میں اُسے بِلّی ہی سمجھتا۔ کراہت سے مجھے متلی سی آ گئی' سوچنے لگا کہ ابھی تو صرف چوہا نکلا ہے' اس کے پیچھے کوئی خونخوار آنکھوں سے شعلے برساتی بِلّی نکلے گی۔ پھر کوئی خون آشام چمگادڑ اباتیل اُلّو۔ اِن کے بعد کوئی ڈریکولا دانت نکوستا ہوا اُوپر آئے گا۔ مجھے وہ دونوں سائے کچھ اسی قسم کی چیزیں ہی لگے۔

تجسّس اور کچھ مزید جاننے کا لپکا ہر انسان میں کم و بیش موجود ہوتا ہے۔ کمزور قوتِ ارادی اور عام علم و فہم کے لوگ کسی چیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہیں پڑتے۔ ملی ملی اور نہ ملی' تو کیا کہہ کے وہ کسی اور جانب نکل جاتے ہیں مگر مضبوط قوتِ ارادی' قوی الاعصاب' خبطی اور مخصوص علمی طبع والے لوگ بڑے خطرناک اور ہٹ کے پکے ہوتے ہیں۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی برآمد ہو' وہ وہی کچھ کر گزرتے ہیں جو ان کے مَن میں سمایا ہوتا ہے۔ میرے اپنے خیال میں میرا شمار بھی اُنہی خبطی' جنونی اور ضدی لوگوں میں ہوتا ہے۔

• پیا رنگ کالا ......!

کہتے ہیں کہ اوپر چڑھنے کے لئے توانائی اور طریقہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن نیچے اُترنے کے لئے صرف ارادے کی' نکاح کے لئے دو گواہوں کی مگر طلاق کے لئے تین لفظوں کی۔ اسی طرح بنانے کے لئے ہزار بناؤ سنگار چاہئیں مگر بگاڑنے کے لئے صرف دو چار تغافل کے چھینٹے ہی کافی ہوتے ہیں۔ کہنا یہ کہ کوئی چیز مجھے اُکسا رہی تھی کہ چبوترے پہ چڑھنا' مینارے سے ٹیک لگا کر بیٹھنا' نماز پڑھنا۔ اب تہہ خانے کی سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑا ہونا' آگے بڑھوں یا پیچھے چلا جاؤں' وہی تجسّس کہ نیچے کیا ہے' سائے کہاں گئے' چوہا کہاں سے آیا؟...... جس طرح موٹر یا مشین پہ لوڈ بڑھ جائے یا گندم پیسنے والی چکی میں دانوں کا گالا زیادہ پڑ جائے تو رفتار ذرا دھیمی اور آواز قدرے بھاری ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح' میرے

ساتھ بھی جب کوئی غیر معمولی حرکت' برکت' واقعہ' سلسلہ یا مسئلہ درپیش آنے والا ہوتا ہے تو اندر کی چکّی پہ لوڈ پڑ جاتا ہے۔ میری چھ کی چھ حِسّیں اَلرٹ ہو جاتی ہیں' اِسی چھ کا آدھا تین' یعنی تیسرے کلمہ کے وِرد کے آہنگ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ دِل و دماغ' دروں مشینری پہ ایسا بوجھ پڑ جاتا ہے کہ لامحالہ میرے مُنہ سے اِس چڑیا کی طرح جس نے کوّے کے ساتھ مل کر ساجھے میں کھچڑی پکائی تھی اور بھوک کے ہاتھوں ساری کھچڑی خود ہی ہڑپ کر لی' کوّے نے غصّے میں آ کر اِس کی دُم کو گرم گرم چمٹے سے داغ دیا تھا اور وہ ''چی چی'' کرتی ناچتی پھری تھی۔ ایسے مواقع پہ میرے مُنہ سے بھی خود بہ خود ''چی چی' چا چا چی' چا چی'' نکل جاتا ہے۔ پھر جیسے میں بکتر بند سا ہو جاتا ہوں۔ پھر ایسے موقعوں پہ مجھے ہمیشہ اپنے بابا جی کا فرمان یاد آ جاتا ہے کہ میرے سیاہ پوش' کالے شا کالے بچوں پہ سے بامراللہ ظلمت و طاغوت کی نحوست و نجاست' بدنگاہی' فسوں طلسم کی ہیبت و اذیت ساکت و ساقط کر دی گئی ہے۔ جس طرح کالے رنگ سے مل کر ہر رنگ کالا ہو جاتا ہے اور اپنے نمود و وجود' جودت و جمال اور اصل ذات کو ذات کی سی سیاہی میں ضم کر دینے پہ مجبور ہو جاتا ہے' اِسی طرح بدنگاہ' بدخیالی' بدذات' بدفطرت' بدکوش و بدرُوح' سیاہ پوش سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔

کالا رنگ [illegible] رکھتا ہے۔ یہ میرے مولا علی کا رنگ' یہ قرآن اور وارث قرآن کا رنگ' یہ کعبہ اور غلافِ کعبہ کا رنگ' یہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کملی اور زلفوں کا رنگ' کرب و بلا اور یہ کوفہ و شام کی فضا کا رنگ۔ مکّہ میں حجرِ اسود کا رنگ' یہ مدینہ میں حجاب روضۂ اشرف کا رنگ' عصائے موسیٰؑ کا رنگ' یہ عبائے عیسیٰؑ کا رنگ' خیمۂ عباس کے علم کا رنگ' یہ لیلتہ القدر کا رنگ' یہ ساعتِ مکّہ بدر کا رنگ۔ یہ وہ رنگ کہ ہزاروں کو سینے سے لگائے' اپنے سا کر لے۔ اسے کوئی پاس نہ بٹھائے کہ وہ بدرنگا کہلائے۔ کوئی اِسے یاس و حزن کہے' کوئی ماتم و شامت سمجھے۔ کوئی کچھ بھی کہے' میں تو صرف ایک ہی بات جانتا ہوں ؎

سکھی ری! دیکھو ری' پیا رنگ کالا
اپنے رنگ میں موہے رنگ ڈالا
سکھی ری! دیکھو ری' پیا رنگ کالا

ہم نے بابا جی کو کبھی سُرخ' سفید یا سبز مرچ استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک صبح اُن کے مزاج اور طبیعت میں کچھ بشاشت سی محسوس ہوئی۔ ہم بچہ لوگ ایسے مواقع کی جستجو میں رہتے تھے کہ کب طبیعت اور مزاج میں شگفتگی دَر آئے اور ہم پہلے سے سوچے ہوئے سوالات دریافت کریں۔ میں نے ہمت کر کے

پوچھ ہی لیا۔

''بابا جی! اجازت ہو تو ہم لوگ بھی سُرخ اور ہری مرچوں سے پرہیز کیا کریں اور سیاہ مرچ شروع کریں......؟''

ارشاد ہوا۔ ''بھئی' آپ لوگ اگر سُرخ مرچ پسند کرتے ہیں تو کھانے میں کوئی حرج نہیں...... میں تو سیاہ مرچ صرف اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ اس کا رنگ کالا اور مزاج معتدل ہوتا ہے''...... پھر مسکراتے ہوئے مزید فرمایا۔ ''میں نے ایک چینی کہاوت سُن رکھی ہے کہ خوبصورت عورت اور سُرخ مرچ دونوں سے ہوشیار رہنا چاہئے''...... فرمانے لگے۔ ''کالی مرچ' کالا نمک' کالا گڑ' کالے چنے' کالا زیتون' کالی کلونجی' کالا گلاب اور مشکی گھوڑا مجھے بھلے لگتے ہیں۔ کالے رنگ سے نسبت خاص رکھنے والے کے لئے رُوحانی اور باطنی علوم و اسرار جاننے سیکھنے کے لئے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سیاہ رنگ کا لباس پہننے والا شیطان کی دستبرد سے بچا رہتا ہے۔ اس میں عجز' انکساری' خاکساری اور درویشانہ خو خصلت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ انسان تو انسان' چرند پرند' چوپائے اور حشرات الارض تک احترام عزت اور حفاظت کرتے ہیں۔ سیاہ لباس پہننے والا اللہ کے خوف کو محسوس کرتا ہے۔ عبادت و ریاضت کی جانب رغبت حاصل کرتا ہے۔ یہ رنگ روحانی ترقی اور نفسانی خواہشات و خیالات کو ختم کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے لیکن اس رنگ کے کچھ مضرات بھی ہیں۔ قدرت نے اگر اس کے نقیض پیدا نہ کئے ہوتے تو ہر ہما شما اسے اپنا لیتا۔ آپ نے سُنا' دیکھا ہوگا کہ بہت سے گھرانوں میں خاندان کے بڑے بزرگوں کی جانب سے کالا رنگ پہننے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اسے صرف اہلِ تشیع کا مخصوص رنگ سمجھ کر محض ضد اور جاہلیت کی بنا پہ اس سے کَد کھاتے ہیں' ویسے بلا سوچے سمجھے ہر کسی کو اسے اپنانا بھی نہیں چاہئے تا آنکہ کوئی صاحبِ انگ رنگ' اس رنگ کو اختیار کی اجازت نہ دے' ویسے شوقیہ طور پر پہننا اور بات ہے۔

بات رنگوں کی طرح پھیلتی پھیلتی اور ایک رنگ سے دوسرے رنگوں میں جذب ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں تک دراز ہو گئی' واپس وہیں چلتے ہیں جہاں سیڑھیوں سے اُتر کر پُراسرار سائے کہیں گم ہو گئے تھے...... میں نیچے اُترتی ہوئی شکستہ سیڑھیوں کے دہانے پہ گومگوسی حالت کھڑا تھا۔ شاید مجھے پیچھے سے کسی شریر سے جھونکے نے ہلکا سا آگے کی جانب دھکیلا تھا کہ بلا ارادہ میرا ایک پاؤں نیچے سیڑھی پہ جا پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے خدا! میری تو آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں۔ جہاں تک نظر پڑی' چوہے ہی چوہے' ویسے ہی کسی بڑی سی بلّی کے قد و کاٹھ جیسے۔ آدھا آدھا گز پیچھے لمبی لمبی دُمیں' چار چار انچ لمبی مونچھیں' سُرخ انگاروں کی مانند دہکتی ہوئی آنکھیں...... وہی چوہا' جو کچھ دیر پہلے نیچے سے اُوپر آیا تھا اور

میری ٹانگوں کے درمیان سے گزر کر کہیں غائب ہو گیا تھا' اغلب یہی تھا کہ یہی چوہا اب پوری برادری کو لے کر یہاں آیا ہے۔ اب میرے لئے سوائے نیچے کودنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا' اُوپر آتا تو شاید میرے لئے زمین پہ پاؤں دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی اور یہ خونخوار چوہے مجھے شاید دو قدم بھی بھاگنے کے مہلت نہ دیتے۔ ابھی تک میرا ایک پاؤں اُوپر ہی تھا اور دوسرا نیچے دوسری سیڑھی پہ' میں نے اپنے اَوسان برقرار رکھے اور فل سپیڈ سے اندر کی چکّی گھما دی۔ ایک نظر پھر مُڑ کر اِس آفتِ ناگہانی کی جانب دیکھا۔ یوں دکھائی دیا جیسے کسی چوہا فیکٹری سے ایک ہی سائز' ماڈل اور رنگ کے چوہوں کی لاٹ تیار ہو کر نکلی ہے۔ وہی پہلے والا چوہا شاید اُن کا سردار تھا' اپنی پچھلی ٹانگوں پہ بیٹھا' لمبے لمبے دانت نکوستا ہوا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اندازہ کر رہا تھا کہ میری اگلی مُوومنٹ کیا ہوگی؟...... میں نے کچھ سوچتے ہوئے نیچے والا پاؤں آہستہ سے اُوپر اُٹھایا۔ دونوں پاؤں پہ کھڑا ہو کر بغیر رُخ موڑے آدھا قدم پیچھے' چوہوں کی طرف ہٹا۔ چوہے تھے کہ بغیر وہ برابر ڈٹے رہے۔ پھر میں نے ایک اور آدھا قدم پیچھے ہٹایا۔ اب شاید میرے پاؤں اور سردار چوہے کا درمیانی فاصلہ زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی فٹ رہا ہوگا۔ وہ اب بھی اپنے پاؤں پہ قائم تھا' اُس شیر دِل نے اپنے پاؤں کی مٹی نہیں چھوڑی تھی۔ ایسے نڈر چوہے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے...... اب کیا کروں...... چمک میں اپنی بائیں جانب دیوار کی طرف ذرا سا کھسک لیا۔ چوہوں نے اب بھی کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اب میں تین قدم ترچھے سے دھرتا ہوا' بائیں دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد اُچک کر دو اڑھائی فٹ اُونچی دیوار کی منڈیر پہ چڑھ گیا۔ پھر کیا تھا' جیسے کسی نے ایک سیلاب کے آگے سے بند توڑ دیا ہو۔ چوہے مانندِ سیل رواں نیچے سیڑھیوں پہ بہے جا رہے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی چھوٹا بڑا ہو' یوں لگتا تھا جیسے یہ سارے پہلے والے چوہے کا ہی چربہ ہیں یا اس کی ہی کلوننگ سے اِنہیں غیر فطری طور پہ پیدا کیا گیا ہے۔ مجھے کسی قسم کا زک پہنچائے بغیر وہ سب کے سب کہیں نیچے غائب ہو گئے تھے...... مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ میں صرف اُن کا راستہ روکے ہوئے کھڑا تھا' میں ہٹا اور وہ چلے گئے...... وہیں سے میں منڈیر پھلانگ کر اوپر چبوترے پہ چڑھ آیا کہ کچھ طبیعت کا تکدّر دُور ہو۔ یہاں موسم اور وقت کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ فضا میں ایک بھیگی ہوئی تازگی اور سمندر کی لافانی خوشبو کا احساس رچا بسا ہوا تھا۔ بائیں جانب تاحدِ نظر بچھا ہوا گہرا نیلگوں سمندر' دیگر اطراف خدا کی پھیلی ہوئی زمین' جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی دُور دُور کہیں کہیں روشنیاں۔ خاموشی' سکوت اور تنہائی...... جن لوگوں کو فطرت کی گود میں بیٹھنے' اُس کے زانو پہ سر دھر کر لیٹنے اور اُس کی زُلفوں کو چہرے پہ ڈال کر سونے کا چسکا پڑ جاتا ہے تو وہ پھر بستیوں اور بسیروں سے کہیں دُور نکل لیتے ہیں۔ جہاں

بے سروسامانیاں' نا آسودگیاں' محرومیاں اور تنہائیاں ان جوگیوں' بیراگیوں اور درویشوں کی راہ تک رہی ہوتی ہیں...... چاند بھی اب جلوہ فگن ہو گیا تھا' فضا میں دُودھ اور ہوا میں جیسے زعفران سا گھل مل گیا ہو' کسی دیوانے کے لئے آشفتہ سری کا پورا سامان تیار تھا۔ طبیعت جہاں سرشار ہوئی تھی' وہیں آنکھوں میں بھی مُدھرا سی تیرنے لگی تھی۔ جسم سکون پکڑنے لگا تھا' سوچا کہ اگر اسی کیفیت میں اِدھر کہیں پڑ گیا تو جانے پھر کیا ہو؟ بہتر ہے کہ کہیں پڑنے سے پہلے نماز پڑھ لی جائے۔

رات تو قبر ہوتی ہے' انسان مُردہ بن کر لیٹ جاتا ہے' مقدور ہو تو اگلا سورج چمکتا دیکھ لے ورنہ کالی شا کالی چادر اوڑھ کر اپنے اندر ڈوب جاتا ہے...... کچھ اللہ والے اپنی ظاہری حیاتی میں ہی موت کے مزے لوٹ لیتے ہیں۔ ہر شب اپنے ہاتھوں کھدی ہوئی قبر میں موت کا مراقبہ کرتے ہیں' صبح نماز کے وقت اگر اجازت ملے تو اپنی چھ چادر ڈال کر قبر کو اوپر سے ڈھانپ کر باہر نکل آتے ہیں' شب کو دوبارہ آنے کے لئے کہتے ہیں بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسی گہری' میٹھی اور سُہانی نیند کہ کسی کو پھولوں کی سیج پہ پہلوئے محبوب میں کیا آتی ہوگی...... یہ شعر برمحل ہے کہ نہیں' سُنانے کو جی چاہتا ہے۔

مومن کے لئے موت بھی ہے زانوئے محبوب

کافر کے لئے زیست بھی اندیشۂ جاں ہے

مجھے ویرانوں' بیابانوں اور قبرستانوں میں گھومنے پھرنے' کتبے پڑھنے' مُردے سونگھنے کا بڑا شوق ہے۔ برِصغیر پاک و ہند تو گھر کے آنگن ہیں۔ اس کے علاوہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں بھی مسلمان' یہودی اور عیسائی ہیں وہاں بڑے بڑے قدیم قبرستان موجود ہیں' ہر قبرستان اپنی علیحدہ علیحدہ تاریخ' اہمیت اور شہرت رکھتا ہے۔ میں بالخصوص' بغداد' کوفہ' نجف' بصرہ' دمشق' سقارہ' بہاریہ' یروشلم' دہلی' ملتان' مکلی اور لاہور میانی صاحب میں اک زمانہ سے ''قبر نوردی'' کرتا چلا آ رہا ہوں...... قبریں (بشمول مزارات) بھی کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ جو لوگ کشف القبور کا علم رکھتے ہیں' وہ خوب جانتے ہیں کہ آگ کا الاؤ' غلاظت کی ڈھیری' بچھوؤں سانپوں کیڑوں مکوڑوں کی آماجگاہ کون سی قبریں ہیں...... اور روشن' پھولوں کا گلدستہ' تروتازہ قرأت قرآن والی' جنت کی کھڑکی اور زندہ قبریں کون کون سی ہیں۔ ہر لحد کے کچھ نیچے اس کے مکین کے اعمال کا تعویز اور لحد کے کچھ اوپر اس کے احوال کی دستاویز لٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ اہلِ قبور میں ایسی زندہ و تابندہ ہستیاں بھی ہوتی ہیں جن کا رُوحانی تصرف اور فیض کسی رواں دواں چشمے کی مانند جاری وساری رہتا ہے' اب چشمے کا ٹھنڈا میٹھا پانی تو وہی حاصل کرے گا جو وہاں جائے گا' چشمۂ فیض تلاش کرے گا۔ جب کوئی قبرستان پہنچ کر ''السلام علیکم یا اہلِ القبور'' کہتا ہے تو جواب میں ''وعلیکم السلام'' کا ایسا بلند آہنگ ...

[illegible] ہے کہ اگر ہم سُن پائیں تو گھبرا کر بھاگ اُٹھیں مگر ہمارے پاس ایسے کان ہی نہیں ہیں۔ میں بھی کسی [illegible] نوع تحرک میں اکثر قبرستانوں میں بھٹکتا رہتا ہوں۔ میرے ساتھ قبرستانوں میں ایسے ایسے حادثے [illegible] ہو گزرے ہیں کہ اگر لکھنے بیٹھوں تو ایک آدھ کتاب آسانی سے لکھی جا سکتی ہے۔ میں کئی بار [illegible] ہوئی قبروں میں دھنس گیا' ساری ساری رات مُردوں کی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کے درمیان پڑا رہتا [illegible] میں اکثر اپنے جاننے والے گورکن کو بتائے بغیر زیرِ زمین ہڈیوں کے گودام میں گھس جاتا تھا اور وہ [illegible] سے تالا لگا کر رات بھر کے لئے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ بستی نظام الدینؒ دہلی کے قبرستان میں ایک توجہ [illegible] دوران میں بیٹھا بیٹھا پاس والی بُھربُھری مٹی والی قبر میں لڑھک گیا' پوری رات میں ایک شریف سے [illegible] کی گود میں بیٹھا رہا کہ خود نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دُور کسی کی آہٹ اور آواز آئی' انہیں آواز دی [illegible] مجھے قبر سے نکالو۔ وہ "بھوت بھوت" کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔ اگلے روز صبح ہی صبح کچھ اور [illegible] پاس محسوس ہوئے۔ اب میں نے پہلے "السلام علیکم" کہا۔ پھر کلمہ شریف پڑھا کہ کم از کم وہ مجھے [illegible] نہ سمجھیں۔ وہ بھی جواب میں کلمہ شہادت پڑھنے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ مُردے کا حساب [illegible] ہو رہا ہے۔ قبر بیٹھ گئی ہے' مُردہ بے پردہ ہو رہا ہے [illegible] کو مٹی ڈالنے [illegible] ورنہ [illegible] باہر نکال لیا ورنہ……!

میانی صاحب میں اکثر راتوں کو جایا کرتا تھا۔ خوب گھومتا' "السلام علیکم" کہہ کہہ کر ساکنانِ قبور [illegible] بہلاتا رہتا۔ یہ قبرستان' کچی پکی قبروں' مزاروں اور چھوٹے موٹے مقبروں کا ایک جنگل ہے۔ جیسے [illegible] میں مختلف نوع کے جانور رہتے ہیں' اسی طرح یہاں بھی بہت سے دو ٹانگوں اور چار پاؤں والے [illegible] اور پروں والے پرندے رہتے ہیں' جنگل کے قانون کی طرح یہاں کا بھی اپنا قانون ہے…… یہاں [illegible] زندہ' مُردہ آبادی کچھ اس طرح سے آپس میں گڈمڈ اور غلط ملط ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا' زندوں [illegible] کون کون مُردہ ہیں اور مُردوں میں کتنے زندہ ہیں؟ کچھ طبقاتی رُو رعائیت بھی روا نہیں…… گورنر کے [illegible] ب دین گجر لیٹا ہوا ہے تو کہیں اپنے وقت کے نامور شاعر کے پہلو میں شریفا پہلوان شرق پوریا [illegible] ہے' اُستاد مجھلے لطافت علی خان کی سنگت میں مولوی لُطف الرحمٰن بھائی پھیروی پڑے ہوئے [illegible] افسانہ نگار' چرم فروشوں میں گھرا ہوا ہے اور زبدۃ الحکماء ایک مشہور ایکٹرس کی ہمسائیگی میں پڑے رہنے [illegible] ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیر صاحب کے مزار کے ساتھ والی قبروں میں مُردوں کی بجائے کلاشنکوفیں' [illegible] اور منشیات ہوں۔ کوئی نئی قبر کھودتے وقت اگر انڈیا کی مالٹا وسکی کے کچھ کریٹ یا وائٹ ہارس سکاچ [illegible] بوتلیں نکل آئیں تو کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈز' ٹیلی ویژن' ریڈیو' زیورات' پارچات کچھ بھی

نکل سکتا ہے۔ یہاں بجو' نیولے' سانپ' خارموش' اُلو' چمگادڑیں' مُردہ خور بلّیاں اور چوہے' کوّے اور کرلے بڑے دھڑلے سے رہتے ہیں۔ انہی کے ساتھ اِن کے بھائی بند منشیات فروش' منشیات خور' چور اُچکے عادی مجرم' مُردوں کی کھوپڑیاں' اعضاء اور کفن اکھاڑنے والے' چلّے چوکے' وظیفے۔ منتر جنتر' مسانوں کی ہانڈیاں چڑھانے والے' اولادِ نرینہ کے لئے نوزائیدہ بچوں کی قبروں پہ اولاد کی خواہشمند عورتوں کو غسل دلوانے والے ٹھیکیدار' بدکاری کے لئے عورتیں' بچے اور ہیجڑے' یہ دو ٹانگوں اور چار ٹانگوں والے سارے جانور یہاں مِل جُل کر رہتے ہیں...... ایک قبر میں بجو گُھسا ہوتا ہے' ساتھ والی میں بشیرا چنیوٹیا گُھسا ہوا کفن کھینچ رہا ہوتا ہے۔ بجو کی طرح برکتا اڑھائی پھٹ' قبر کے پاؤں میں ایسی سینڈھ لگاتا ہے کہ چند منٹ میں دو ماہ قبل دفنائے گئے ملک مشتاق احمد شوگر یے مرحوم کی کھوپڑی' پسلیاں اور ہاتھ پاؤں' بازوؤں کی پوری ہڈیاں جھاڑ پھونک کر باہر نکال لاتا ہے ایسی صفائی اور بے کھٹکے کہ ساتھ والے مُردے تو کیا خود ملک صاحب کو خبر نہیں ہوتی کہ اُن کے ساتھ کیا بیت گئی ہے اور اکثر اوقات بجو اور برکتا اڑھائی پھٹ دونوں آگے پیچھے ہی باہر نکلتے ہیں۔

اس جنگل میں ایسی رونقوں کی منگائی' اکثر یہاں کے بادشاہ ان گورکنوں کی رضا فہمید سے ہوتی ہے' یہاں تک کہ کوئی نیا پرانا مُردہ اِن کی خوشنودی کے بغیر اپنی کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ انسان تو انسان یہاں کے حشرات الارض تک انہیں فی قبر مُردہ ٹیکس دیتے ہیں۔ ان گورکنوں کو مرشیوں کی طرح ایک ایک قبر اور ہر ایک مُردے کا محلِ وقوع' حسب نسب' ذات اَوقات' تاریخِ دفن' قسم لٹھا کفن' متعلقین کی مالی اور سماجی حیثیت' یعنی ایک ایک جزئیات ازبر ہوتی ہیں۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ کون سی قبر پہ اِن کے وارث کب آتے ہیں۔ ہر روز' جمعرات' عید شبرات یا ''مر گیا مردود' نہ فاتحہ نہ درود''...... اگر تو کسی قبر پہ روزانہ حاضری ہے۔ پھول پتی' دیا بتی جلانے چڑھانے کوئی آتا ہے۔ گھاس پھونس' روڑا کنکر اُٹھانے صفائی ستھرائی اور لوٹا پانی کے لئے گورکن کی خدمات بامعاوضہ حاصل کرتا ہے تو ٹھیک! وہ قبر' وقار بشرطِ استواری تک وجود میں رہتی ہے اور اگر ایسا نہیں۔ ابّا کو دفنانے کے بعد بیٹوں کو کاروبار اور بیوی بچوں سے فرصت ہی نہیں ملی تو اس قبر پہ طرح کراس کا نشان لگا دیا جاتا ہے۔ دو چار مہینے اور دیکھا جاتا ہے اس قبر پہ حاضری کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ جب وارثوں کی بے حسی اور عدمِ دلچسپی کی مکمل کلیئرنس مل جاتی ہے تو پھر قبر کے ملبے کی بولی لگ جاتی ہے۔ کھوپڑیوں' ہڈیوں کا ٹھیکیدار اپنا ملبہ نکلوا کر لے جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے کفن اُتار اپنی کاروائی ڈال گئے ہوتے ہیں۔ پھر قبر کی جڑوں میں پانی ڈالا جاتا ہے آہستہ آہستہ اُوپر کی ڈھیری کی مٹی ہلکی کی جاتی ہے' پھر مزید اُوپر کھلے پانی کا تر دیا جاتا ہے۔ اب آہستہ

قبر اندر کو دھنسنے لگتی ہے۔ اگر اس دوران کوئی وارث آ گیا تو بارشوں کا کہہ کر اس سے مٹی کی مد میں ت سو پھر جھاڑ لئے جاتے ہیں اور تین مہینے بعد پھر وہی سلسلہ دُہرا دیا جاتا ہے۔ ایسی ریڈ نشان والی جگ ایڈوانس ہی ہو چکی ہوتی ہے بلکہ گورکن نے اندر ہی اندر بیعانہ تک پکڑ لیا ہوتا ہے۔ نیا مُردہ' بننے کے بعد اگر کوئی پہلی قبر کا وارث وارد ہو جاتا ہے تو وہی ہمیشہ والی رٹی رٹائی بات کہ موتیاں آپ نے سُنا تو ہوگا کہ ایک ایک قبر سے قیامت کے دن ستر ستر مُردے اُٹھیں گے۔ اگر ایک قبر میں مُردہ ہمیشہ کے لئے لیٹا رہے تو باقی مرنے والے کہاں جائیں گے؟ یہ آپ کے والد صاحب والی قبر یہاں ''مُردے تو میں اپنے ہاتھوں سے پہلے ہی ڈال اور نکال چکا ہوں۔ جناب! آپ کے والد کی یہ قبر بھی اسی دن زبردستی خالی کرائی تھی۔ آپ لوگ جنازہ گاہ میں جنازہ پڑھ رہے تھے اور ہم قبر سے حاجی اللہ جوایا توڑی ہونڈے والے کی ہڈیاں بوری میں ڈال رہے تھے۔ سرکار! سینکڑوں روزانہ آتے ہیں، ہم کسی کو واپس نہیں بھیجتے۔ قبرستان تو ہر کسی کو اپنے تڈ میں چھپا لیتا ہے۔ جب مٹی مل جاتی ہے تو لیا ہوا اُدھار واپس دے دیا جاتا ہے۔

• سنگلاں والے میاں صاحب......!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کس طرف نکل گیا...... انسان کسی طرف بھی نکل جائے' آخر اُسے کسی نہ کسی میانی صاحب میں اپنی حاضری لگوانی پڑتی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی میں ہی کسی صاحب سے تعلقات رکھے تو پھر زندگی کی حقیقت صحیح سے اس پہ کُھلنا شروع ہو جاتی ہے اور موت پھر کے لئے کوئی ڈراؤنی اور تکلیف دہ چیز نہیں رہتی...... میانی صاحب سے میرا رابطہ یا واسطہ بچپن ہی سے تھا—— اس وقت میانی صاحب ایک جیتے جاگتے مگر اندر سے مَرے ہوئے میاں صاحب کی شکل سے قریب آئے۔ یہ سلسلہ چاچی کی ملاقات سے کچھ پہلے شروع ہوا تھا۔ میں جب دیکھتا کہ میاں صاحب روزانہ اونچی سڑک سے اُترتے اور ہماری گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے شہر کی جانب چلے اور پھر کہیں شام سے ذرا پہلے شہر سے واپس آتے دکھائی دیتے پھر اونچی سڑک سے ہوتے ہوئے بخش کے تالاب کے عقب میں پیر بہاول شہیدؒ کے مزار اور قبرستان کے بائیں جانب' جوہڑ کے اپنے آستانے میں چلے جاتے ہیں۔ آستانہ کیا تھا؟ ایک چاردیواری سی جس کے اندر ایک کچی سے بنا ہوا ایک نامکمل سا گنبد تھا۔ زمین سے گز بھر اوپر کُرسی' پانچ ستونوں پہ کھڑے گنبد کے نیچے

عین وسط میں کُھدی ہوئی قبر...... یہ سب کچھ ہمیں بہت بعد میں باقاعدہ پوری پوری جاسوسی کرنے پہ معلوم ہوا تھا۔ میاں جی کون تھے' کہاں سے آئے اور ان کا ذریعہ معاش' حسب نسب' بیوی بچے' کوئی کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ بس کہیں سے آئے' زمین کا ٹکڑا خریدا اور یہیں کے ہو گئے۔ نکلتے قد اور دوہرے جسم پہ فوجی افسر کی وردی' کالروں اور آگے سینے پہ سجے ہوئے تمغے' نیلے پیلے سُرخ فیتے بڑے بھلے اور سجل لگتے تھے۔ فوجی بھاری بوٹ' جس میں گز گز لمبے تسمے ہوتے ہیں۔ سر پہ سولا ہیٹ' نکٹائی' صفاچٹ داڑھی لیکن بڑی بڑی دبیل مونچھیں۔ یہ حُلیہ اور ایسا گٹ اَپ اپنی جگہ پہ بڑے رُعب داب والا تھا لیکن ایک انوکھی چیز ان کو بڑا خوفناک اور عجیب سا تاثر دے کر ابھارتی تھی' وہ تھے قریب قریب ڈیڑھ مَن وزنی لوہے کے سَنگل جو انہوں نے کسی سندھی وڈیرے کی اَجرک کی طرح گردن' شانوں اور جسم پہ لپیٹ رکھے تھے اور پاؤں میں قیدیوں جیسی بیڑیاں پہنی رہتیں۔ گرمی سردی برسات جب بھی دکھائی دیئے' اسی حُلیے میں ملے۔ ہاتھ میں افسروں کی طرح بید کی بینت ہوتی جسے وہ کبھی کبھی بغل میں بھی داب رکھتے تھے۔ کچھ لوگ انہیں شاہ صاحب بھی کہتے تھے۔ علیک سلیک بھی اشارے سے کرتے' ہلکی سی مسکراہٹ اور قدرے [illegible] کرتے ہوئے وہ بڑے مہذب اور مہربان لگتے۔ خدا جانے اِن کا ذریعہ آمدن کیا تھا۔ کسی سے کبھی کچھ طلب کیا اور نہ [illegible] کھاتے پیتے دکھائی دیئے۔ عجیب' نرالی سی شان استغنا تھی جو انہیں سینکڑوں میں نہیں' ہزاروں لاکھوں میں ممیز کرتی تھی۔ چھوٹے بچے اکثر انہیں دیکھتے ہی کواڑوں کے پیچھے چھپ جاتے۔ اکثر مائیں ضدی' شرارتی بچوں کو بابا سنگلاں والا [illegible] ڈرا دھمکا بھی دیا کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ کسی منزل میں پھنسے ہوئے بزرگ ہیں جنہوں نے دُنیا سے ناتا توڑ کر درویشی اختیار کرتے ہوئے اپنی زبان بھی بند کر لی ہے اور [illegible] اپنے کسی گناہ کی سزا دینے کے لئے جسم پہ لوہے کے سَنگل اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال لی ہیں۔ اکثر [illegible] نے اِن کا لَڑ پکڑنے کی کوشش کی۔ انہیں جاننے اور پھنسانے کے جتن کیے مگر جو دُنیا' عزت' دولت' شہرت کو لات مار دے وہ کہیں نہیں پھنستا۔ دام میں تو وہ پرندہ پھنستا ہے جو دانہ دیکھتا ہے اور وہ [illegible] آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔

شہر سیالکوٹ میں اک میں بھی ان کا دیوانہ تھا۔ میری کیا جرأت کہ میں کبھی ان سے بات کرنے کی سوچتا' میں نے تو کبھی انہیں سلام تک نہیں کیا تھا البتہ ان کے آنے کا انتظار کرتا رہتا۔ جب [illegible] دیتے' میں اوٹ لے کر انہیں غور سے دیکھتا رہتا اور دل میں سوچتا کہ کاش! ان کے جسم پہ پڑے [illegible] لوہے کا بوجھ کچھ میں بھی اُٹھا سکتا...... میں اِنہیں دُور سے آتے اور دور تک جاتے ہوئے دیکھتا [illegible]

بھی زنجیروں کی چھنچھناہٹ اور پاؤں کی بیڑیوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں مجھے دیر تک مغموم رکھتیں۔ دل چاہتا کہ کبھی میں اِن کے پاؤں' پنڈلیوں پہ لپٹی ہوئی کپڑے کی پٹیاں کھولوں اور دیکھوں کہ گھٹے کہاں کہاں پڑے ہوئے ہیں۔ وزنی زنجیروں کو شانوں سے اُتاروں' دیکھوں کہ آہنِ نارسا نے جسم اور ہڈیوں کو کہاں کہاں سُرمہ کیا ہے؟ یہ میں سوچتا سوچتا آگے بڑھتا اور خاک پہ واضح سے اِن کے کفِ پا کے نشان سے تھوڑی سی مٹی اُٹھاتا اور گھر آ کر اِسے شیشے کے مرتبان میں ڈال دیتا جو میں نے اِن کے قدموں کی مٹی اکٹھی کرنے کی نیت سے رکھا ہوا تھا۔

میاں جی کی چاردیواری کے ذرا اِدھر جوہڑ کنارے ایک بڑا سا گراؤنڈ تھا جہاں ہم سامنے گورنمنٹ سکول کے لڑکوں سے کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ مجھے کرکٹ سے کیا دلچسپی ہونا تھی' میں تو محض میاں جی کے آستانے کی قربت کی وجہ سے محلے کے لڑکوں کے ساتھ اِدھر چلا آتا تھا۔ کھیل کے دوران بھی اصرار کر کے آستانے کے آس پاس ہی کھڑا ہونے کو ترجیح دیتا۔ مجھے خوب یاد ہے' وہ جمعرات کا روز تھا قریب قریب شام کا وقت تھا۔ گیند ہِٹ ہوئی اور اُڑتی ہوئی میاں جی کی چاردیواری میں کہیں اُتر گئی۔ لڑکوں نے کھیل بند کر دیا کیونکہ کھیلنے کے لئے اور گیند نہیں تھی اور اِدھر شام کے سائے بھی اُترنے لگے تھے۔ لڑکے [illegible]

"میاں جی کے آستانے پہ سے تمہارے سوا کوئی اور گیند نہیں لا سکتا...... گیند لے کر ہی آنا۔"

یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا...... میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ لوگ اپنی منزل کو ڈھونڈنے کے لئے نکلتے ہیں اور کچھ دانے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں خود منزل کھوجتی ہوئی اِن تک پہنچتی ہے یا یوں سمجھیں کہ کچھ لوگ بیلوں کو بُلواتے ہیں کہ وہ آئیں اور انہیں ماریں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بیل سر جھکائے خود ہی ان کے پاس پہنچ جاتا ہے کہ لو حضرت! میں حاضر ہو گیا۔ مجھے جیسا چاہو' مار پیٹ لو...... میں ہمیشہ سے ہی پنگا' بحث جھگڑا پلّے سے پیسے دے کر خریدتا ہوں۔ خوامخواہ دوسرے کے مسئلوں میں کود پڑوں گا' یعنی خود ہی بکرا بن کر خود ہی بکر منڈی پہنچنے کا اہتمام کر لیتا ہوں۔ کئی بار لڑائی جھگڑوں' نکاحوں' طلاقوں' ضمانتوں اور جائیدادوں کے بکھیڑوں میں بطورِ ثالث' ضامن بزرگ بن کر اپنی حجامت کروا چکا ہوں۔

• نیکی کر دریا میں ڈال......!

ننکانہ صاحب کا ایک سادہ سا لڑکا سرور سائیکل کے پیچھے بندھے ٹوکرے میں پودے بیچا کرتا تھا'

دو چار بار مَیں نے اس سے پودے خریدے۔ میرا دماغ خراب جو مَیں نے ایک دن یونہی اس سے کہہ دیا۔

''بیٹا! یہ کام سائیکل کا نہیں' ریڑھے کا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی ہتھ ریڑھی یا گدھا ریڑھی لے لو۔ پودے بھی زیادہ لا سکو گے' ورائٹی بھی ہو گی اور آسانی کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی کچھ فائدہ ہو گا......''

وہ مجھے دُعا کرنے کا کہہ کر چلا گیا...... تیسرے دن وہ میرے دروازے پہ تھا۔

''بابا جی! وہ زینت بلاک میں جو خالی پلاٹ میں چنگڑ رہتے ہیں' ان کے پاس ایک ٹائروں والا ریڑھا برائے فروخت ہے' دُعا کریں کہ اسے لینے کا کوئی وسیلہ بن جائے''......

پھر ایک دن اسی سائیکل پہ مجھے ایک پودا دینے آیا۔

''کیا بنا اس ریڑھے کا......؟'' مَیں نے یونہی پوچھ لیا۔

''بس جی! آپ کی دُعا کی دیر ہے...... پندرہ سو تو مَیں نے جمع کر لئے ہیں' پچیس سو اور چاہئیں۔ پانچ ہزار مانگ رہا تھا' بڑی مشکل سے چار ہزار تک آیا ہے...... ویسے چار ہزار کا تو صرف ریڑھا ہی ہے' گدھا مفت سمجھیں......''

ایک دم میرے منہ سے نکل گیا

''پتر! گدھا' ہاتھی اور بیوی کا بھائی یعنی سالا اگر مفت بھی ملیں تو پھر بھی بہت مہنگے پڑتے ہیں۔''

وہ مُنہ میں میری بات دُہراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''مَیں کچھ سمجھا نہیں......؟''

مَیں نے اسے سمجھایا۔

''اگر تم یہ کہو کہ گدھا ہی اتنی قیمت کا ہے اور ریڑھا جھونگے میں ملتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

وہ پھر بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگا۔

''چلئے جی! یہی ٹھیک ہے...... بس میرے لئے دُعا کیجئے۔ آپ کی دُعا جب بھی ٹھک گئی ریڑھا مل جائے گا۔''

وہ چلا گیا...... ٹھیک دو دن بعد مَیں گھر کے باہر کھڑا اسکول کے بچوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ ریما' چکوری اور سید نور کی کوٹھیوں کی طرف سے ریڑھے پہ کھڑا' گدھے کی لگامیں تھامے' پیپسی کی ڈیڑھ لیٹر والی پلاسٹک کی خالی بوتل میں کنکر چھنکاتا یوں سرپٹ آ رہا تھا جیسے ریڑھا ریس جیت کر آیا ہو۔ ریڑھے پہ سلامتا چنگڑ اور علاقے کا افغان چوکیدار بیدار خان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گدھے کے گلے میں

منکوں کی مالا اور آنکھوں میں قدرتی سُرمہ پڑا ہوا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے گدھے کے ٹھیک سے ٹکا کر ریڑھا روکا' سلامتا اور بیدار خان سلام کرتے ہوئے نیچے اتر آئے...... ظاہر ہے میں یہی سمجھا کہ سرور نے گدھا گاڑی خرید لی ہے۔ میں نے خوش ہوتے ہوئے گدھے کے سر پہ پیار کیا اور گاڑی کے گرد چکر لگا کر اس کو دیکھتے ہوئے سرور کو مُبارک باد دی تو وہ سر جُھکا کر بولا۔

"بابا جی! یہ سب آپ کی دُعائیں ہیں......"

میں پوچھ بیٹھا۔ "سرور! کتنے میں سودا پٹا......؟"

اس کی بجائے مجھے سلامتے چنگڑ نے جواب دیا۔

"شاہ جی! اس کے پاس پورا دو ہزار بھی نہیں' یہ اکیس سو اُدھار کرنا چاہتا ہے...... میں نے اِسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر آدھا اُدھار کرنا ہے تو پھر پوری قیمت پانچ ہزار ہوگی اور اگر نقد لینا ہے تو چار ہزار۔ مگر یہ دو ہزار اُدھار بھی کر رہا ہے اور قیمت بھی چار ہزار دے رہا ہے...... اب یہ آپ کو ریڑھا دکھانے کے لئے لایا ہے' آپ ہی فیصلہ کریں......"

میں نے سلامتے چنگڑ سے کہا۔

"سلامتے! یہ آپ دونوں کا آپس میں معاملہ ہے' ایک دوسرے کا خیال کرتے ہوئے خود ہی کوئی فیصلہ کر لو......"

سرور بولا۔ "بابا جی! میں اِسے کہہ رہا ہوں کہ دو ہزار کیش لے لو اور باقی دو ہزار' پانچ پانچ سو کی چار قسطوں میں دے دوں گا......"

میں نے سلامت کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سلامت! یہ تو معقول آفر ہے...... یہ بے چارہ بھی غریب محنت کش ہے' میں نے اِسے خود ہی کہا تھا کہ سائیکل کی بجائے کوئی ریڑھی لے لو......"

سلامت سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"چلئے شاہ صاحب' ٹھیک ہے۔ آپ بزرگ ہیں' آپ مجھے بھی جانتے ہیں۔ میں آپ کے پیچھے والے خالی پلاٹ میں دو سال رہ کر گیا ہوں اور غریب آدمی ہوں...... نہ میری' نہ اِس کی۔ آخری بات یہ ہے کہ اگر یہ کیش دے تو چار ہزار اور اگر آدھا اُدھار کرے تو ساڑھے چار ہزار...... اگر منظور ہو تو ٹھیک ورنہ اس کا بھی بھلا اور ہماری بھی خیر......"

اب بیدار خان بھی بولا۔

''حاجی صیب! یہ بات ٹھیک ہے' یہ انصاف کا بات ہے......''

مَیں نے بھی صاد کرتے ہوئے سرور سے کہا۔

''بول بھائی' اب تو کیا کہتا ہے......؟''

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے جی...... مَیں صرف دو دن کی مہلت چاہتا ہوں۔ آج جمعرات' کل جمعہ پرسوں تک مَیں چار ہزار نقد دے دوں گا......''

مَیں بڑا خوش ہوا کہ چلو' سرور بھی اب بڑے سے ریڑھے پہ لمبی چوڑی پودوں کی ورائٹی رکھ کر بیچا کرے گا اور خوب پیسے بنائے گا۔ مَیں نے ایک بار پھر سرور کو ریڑھے کی مبارک دی' اس نے پھر ہمیشہ کی طرح میری دُعا کی ہی بات کی...... اب سرور کہنے لگا۔

''سلامت! اگر تمہیں میرا یقین ہو تو ریڑھا مجھے ابھی سے ہی دے دو۔ ایک تو مَیں اِسے اپنے ماموں کو دِکھا کر اُن سے کچھ پیسے لینا چاہتا ہوں۔ دوسرے کل صبح مجھے کچھ مال بھی نرسری سے لانا ہے۔ سودا تیرا میرا بابا جی کے رُوبرو ہو گیا ہے' بس دو دن نکال کر پیسے مَیں خود پہنچا دوں گا......''

سلامتے نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک ہے' سودا تیرا میرا شاہ صاحب کے سامنے ہو گیا ہے لیکن ریڑھا تب ملے گا جب چار ہزار اِن کے ہاتھ پہ دھو دے یا پھر شاہ جی کہہ دیں......''

سرور نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اِن کی دُعائیں اور برکتیں ہیں۔ ہم بھی اِن کے اور ریڑھا گھوڑا بھی اِن کا......''

میری دُعائیں واقعی مستجاب ہو گئی تھیں۔ مَیں نے سلامتے سے حامی بھر لی تھی اور سرور ریڑھا لے گیا تھا...... ڈیڑھ برس ہونے کو آیا' نہ سرور دیکھا اور نہ وہ ریڑھا اور گدھا' البتہ زبانی کلامی سودے کے عین تیسرے دِن سلامتا اور بیدار خان چوکیدار میرے ہاں پہنچ گئے تھے۔ مَیں نے سلامتے سے شام تک کا وقت لے لیا کہ سرور آتا ہی ہو گا مگر جسے نہ آنا تھا' وہ نہ آیا اور مَیں نے اپنی زبان کے مطابق مبلغ چار ہزار گن کر سلامتے کے ہاتھ پہ رکھ دیئے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد ایک بوڑھا سا مفلوک الحال شخص میرے ہاں آیا' بتانے لگا کہ مَیں نیلم بلاک کے گندے نالے کے پُل کے پاس سائیکلوں کو پنکچر لگاتا ہوں۔ مَیں دمہ کا مریض ہوں' چار چھوٹے بچے ہیں اور ایک ٹی بی کی مریض بیوی ہے۔ سرور جو مالیوں کا کام کرتا تھا' میرے پاس اپنی پرانی سائیکل میں ہوا بھرنے یا کبھی کبھی پنکچر لگوانے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میرے پاس آیا اور کہا کہ میری سائیکل گلشن اقبال پارک کے باہر سے چوری ہو گئی ہے۔ اب نئی پرانی سائیکل خریدنے کی طاقت نہیں ہے' کچھ

پرانی سائیکل روزانہ کرائے پہ دے دیا کرو۔ میں نے اپنے بیٹے کی سائیکل اُسے روزانہ تیس روپے کے عوض دینا شروع کر دی۔ وہ صبح لے جاتا اور چار بجے واپس دے جاتا۔ کبھی کبھی وہ غیر حاضر بھی ہو جاتا مگر دوسرے روز آ کر سائیکل اور کرایہ دے جاتا۔ اب مہینے سے اوپر ہو گیا ہے' وہ سائیکل سمیت غائب ہے۔ میں بیمار آدمی ہوں' کام نہ کروں تو رات کو بھوکا سونا پڑتا ہے۔ پیچھا کرنے کی ہمت طاقت نہیں' یہی سوچ کر انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ سائیکل پہ اپنے گاؤں چلا گیا ہو یا بیمار شمار ہو۔ آخر تنگ کر میں اُسے تلاش کرنے نکلا۔ ایک اور مالی سے پتا چلا کہ وہ سلامتے چنگڑ کا ریڑھا لے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ میں سلامتے کو تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچا تو اس نے مجھے آپ تک پہنچایا ہے...... میں نے اس کی خستہ حالت زار دیکھ کر اسے بٹھایا' شربت پلایا اور عرض کی۔

''مستری صاحب! میں آپ کی سائیکل کی بازیابی کے لئے صرف دُعا ہی کر سکتا ہوں' اور کچھ نہیں...... ویسے آپ نے میرے پاس تشریف لانے کی زحمت کس مقصد سے کی ہے؟''

وہ مسکرایا' جیسے بات نہیں کرے گا' رو پڑے گا۔

''جی میں آپ کو کسی بات میں ذمہ دار نہیں ٹھہرا رہا۔ میں تو صرف دُعا کے لئے حاضر ہوا ہوں...... وہ میرے بچے کی سائیکل تھی' اس نے اپنے پیسے جوڑ کر بڑے شوق سے خریدی تھی۔ وہ اس پہ سکول جاتا تھا۔ میں نے اسی لالچ میں کرائے پہ دے دی کہ تیس روپے روز ملا کریں گے' اس کی کتابوں کاپیوں کا ہی خرچہ نکل آیا کرے گا۔ اب اس نے رو رو کر بُرا حال کر لیا ہوا ہے۔ یہ بھی مجھے سلامتے ہی نے بتایا تھا کہ میں آپ کو دُعا کے لئے کہوں...... میں سردو کو بھی بُرا نہیں کہتا۔ پتا نہیں' اُسے کیا مجبوری ہو گی۔ وہ کوئی بُرا لڑکا نہیں تھا' مجھے ہمیشہ چاچا جی کہا کرتا تھا...... اللہ اُسے خوش رکھے''۔ وہ روہانسو سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا جی' تکلیف کی معافی چاہتا ہوں...... بس' اتنی گزارش ہے کہ میرے اکلوتے بیٹے کے لئے دُعا فرمائیں۔ اللہ اسے سائیکل کے معاملے میں صبر دے اور اس کا پڑھائی میں جی لگے......''

وہ مجھے دُعا کی مزید تاکید کر کے مُنہ چھپاتا ہوا چلا گیا' شاید اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے...... دوسرے روز میں مون مارکیٹ کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد نیلم بلاک کی جانب ہو لیا۔ ذرا آگے نالے کے پُل کے پاس وہی سائیکلوں والا مستری موٹے شیشوں کی عینک لگائے سائیکلیں مرمت کرتا نظر آیا۔ میں نالے کے کنارے سفیدے کے درختوں کی اوٹ لئے کافی دیر اُسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ پٹرول پمپ کی طرف سے ایک گیارہ بارہ برس کا دُبلا پتلا مدقوق سا لڑکا شاید کھانا لے کر آیا تھا' پاس ہی کسی بیوپاری نے کینوؤں کا ڈھیر جما رکھا اور بارہ روپے درجن کی آوازیں لگا رہا تھا۔ وہ باپ بیٹا دونوں کینوؤں

کے ڈھیر کے قریب چھاؤں میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میں کالی چادر سے چہرہ ڈھانپے' کینوؤں کے ڈھیر کے پاس کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ کچے پیاز کی ایک بڑی سی گانٹھ' اچار اور روٹیاں تھیں۔ میں یہ دیکھ کر چپکے سے واپس چلا آیا۔

وہ بھی جمعرات کا ہی روز تھا۔ میں اکثر اس دن گھر سے ہی نہیں' اپنے آپ سے بھی باہر ہوتا ہوں۔ یہ دن ویرانوں' مزاروں' قبروں اور ڈھیریوں پہ خجل خوار ہونے کا ہوتا ہے۔ میں باہر نکلنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ یہ باپ بیٹا ایک نئی چم چم کرتی ہوئی سائیکل لئے میرے ہاں پہنچ گئے۔ بچے کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے پاؤں والی حرکت پہ مناسب سی سرزنش کی اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ مستری صاحب بولے کہ شاہ صاحب! میں نے اب لوگوں کو شاہ صاحب کہنے پہ ٹوکنا چھوڑ دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارا من حیث القوم مزاج ہی ایسا بن چکا ہے کہ ہمیں اصلی' حقیقی' خالص' صحیح اور کھری کھری کوئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی۔ ہر دو نمبر سے لے کر ایک سو ایک نمبر تک نقلی' جعلی' نقلی' گردی' بیکار مصنوعی چیزوں کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ کاروبار' سیاست' تعلقات' معاشرت' تمدن' ادب' کلچر' آرٹ' تعلیم و تدریس' قانون' احتساب' خوراک' ادویات' انصاف۔ پاسپورٹ' شناختی کارڈ' لائسنس' ڈگریاں' ڈپلومے' تمسکات' سرٹیفکیٹ' اسناد' اخبار' مجلے' صوری صوتی ذرائع ابلاغ' امیر' سفیر' فقیر' عامل' عالم' طبیب' حکیم' صحافی' کالم نگار اور سید شاہ تقریباً ننانوے فیصد اکثر میری طرح خالص دو نمبر کے ''شاہ جی'' ہیں۔ سات بہنوں میں اکلوتا بھائی آٹھویں بہن کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا' میں کس کس کی زبان پکڑوں؟ آپ کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ سائیکل' بلکہ بالکل نئی سائیکل سرورے مالی نے کسی دوست کے ہاتھ آج صبح صبح بھجوا دی ہے۔ وہ بڑی خوشی سے بتانے لگا کہ آج صبح جب میں اپنی دوکان پہ آیا تو ایک بھلا سا لڑکا یہ سائیکل لئے کھڑا تھا۔ گارنٹی کارڈ' رسید' مٹھائی کا ڈبا' پانچ سو کا نوٹ اور سائیکل دیتے ہوئے وہ لڑکا بتانے لگا کہ یہ سائیکل سرورے نے بھجوائی ہے اور کہا ہے کہ میرا گناہ معاف کر دیں۔ میں کسی مجبوری کے تحت لاہور سے باہر جانے اور سائیکل بیچنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ اب شاہ صاحب کی دعا برکت سے میں نے لاہور سے باہر اپنی نرسری بنالی ہے اور خوب ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو رہی ہے۔ آپ کی پرانی سائیکل کی جگہ نئی سائیکل حاضر ہے' کرایہ بھی بھیج رہا ہوں اور سائیکل واپس ملنے کی خوشی میں مٹھائی بھی' امید ہے کہ آپ میرا قصور معاف کر دیں گے...... اتنا کہہ کر مستری نے مٹھائی کا ڈبا کھول کر میرے آگے کر دیا۔

''شاہ جی! مجھے یقین تھا کہ سچے سید بادشاہوں کی دعا فریاد کبھی خطا نہیں جاتی......''

مَیں اس کے مُنہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ پھر مسکراتے ہوئے مَیں نے بسم اللہ پڑھ کر ایک برفی کا ٹکڑا بچّے کے مُنہ میں رکھا۔ اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ مستری صاحب کا بھی منہ میٹھا کروایا اور ایک ٹکڑا خود بھی کھایا...... مٹھائی میں بادام والی برفی ہی ایک ایسی مٹھائی ہے جسے مَیں "شوگریا" ہونے کے باوجود بھی کبھی ٹونگ لیتا ہوں...... دیکھا آپ نے 'میری پنگا لینے والی عادت مجھے کہاں کہاں خوار کراتی ہے...... نہ مَیں سرور کے ذاتی معاملے میں دخل دیتا اور نہ مجھے سرور بن کر پانچ سو روپے اور مٹھائی کا ڈبا' اس سائیکلوں والے مستری کو بھجوانا پڑتا۔

■ گردے گپورے' شادی کے پھوڑے......!

اسی طرح ایک اور شریف سا نوجوان جس کا نام بھی شریف تھا' یہ بھی میرے پیار کی زلفوں کا اسیر تھا...... شریف پلمبر ایک دن میرے ہاں آیا' رسمی بات چیت کے بعد کہنے لگا۔

"بابا جی! گردوں گپوروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بڑا لذیذ اور اعلیٰ خیال ہے...... چلو اٹھو آج یہی سہی...... بولو کہاں چلیں؟" مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ ایک لمحہ سوچ کر بولا۔ "میو ہسپتال......"

"بالکل ٹھیک...... گوال منڈی' مرتضیٰ کے پاس چلتے ہیں۔ چاہو تو لکشمی چوک' بٹ کے ہاں بھی جایا جا سکتا ہے......"

"مَیں کسی ہسپتال جانے کا کہہ رہا ہوں اور آپ شاید تکا ٹک گردے گپورے سمجھے ہیں......"

وہ میری غلط فہمی دُور کر رہا تھا۔ مَیں اوس کی طرح بیٹھ گیا' کھابا کھانے کا سارا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"کھل کر بات کرو بھائی...... گردوں گپوروں سے تمہاری کیا مُراد ہے......؟"

وہ میری دائیں جانب دیوار پہ آویزاں اسم اللہ کے طغرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "بابا جی! آپ میرے بزرگ ہیں اور دوست بھی' جو کچھ میں آپ سے کہہ سکتا ہوں وہ کسی اور کو نہیں بتا سکتا...... مَیں اپنا گردہ مناسب معاوضے پہ کسی ضرورت مند کو دینا چاہتا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ کے کئی ڈاکٹر عقیدت مند ہیں' آپ کے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس حوالے میں میری مدد کریں' مَیں احسان مند رہوں گا......"

اِس کے مُنہ سے یہ بات سُن کر میرا تو فیوز اڑ گیا' قہر بھری نظروں سے اسے تولتے ہوئے کہا۔

''اِس سے پیشتر کہ تمہاری شان میں میرے مُنہ سے کوئی قصیدہ نکلے' تم مختصر سے الفاظ میں اس کی وجۂ تسمیہ بکو......''

وہ مجھ پہ اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے چھوٹی سی تمہید سے بات شروع کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے میں پیشگی معذرت خواں ہوں...... آپ نے پڑھا ہوگا کہ مرحوم اُستاد نصرت فتح علی خان کے گُردے خراب تھے' ان کے ہمراہ لندن اُن کی سالی بھی گئی تھی اِس غرض سے کہ اگر گردے کی ضرورت پڑے تو وہ اپنا گُردہ پیش کر سکے......''

''دُرست...... مَیں بھی اِس وقت لندن ہی میں تھا' اُن کی سالی کی جانب سے اِسی جذبے کا اظہار ہوا تھا......''

''آپ مجھے بتائیں کہ اُن کی سالی کا یہ جذبہ شرعی' اخلاقی اور قانونی حیثیت سے دُرست تھا؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل......'' مَیں نے قطعیت سے کہا۔ ''بلکہ قابلِ تحسین و ستائش بھی...... ایک گُردہ عطیہ دینے سے معطی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ مریض کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔''

''بابا جی! کیا مَیں کسی معصوم کی زندگی اور خوشیاں بچانے کے لئے اپنا گُردہ نہیں دے سکتا؟''

''شریف میاں! آپ نے گُردہ دینے کے لئے معاوضے کی بات بھی کی ہے...... کسی کی جان بچانے کے لئے اگر ایسا کیا جائے تو یہ بہت بڑا ایثار' قربانی اور اصل عبادت ہے اور اگر یہ کام معاوضے کی غرض سے کیا جائے تو یہ محض ضرورت یا تجارت ہے' اور اسلام میں زندہ مُردہ انسانی اعضاء کی تجارت کا تصوّر ہی باطل ہے......''

''اگر کسی کے پاس مکان' زیور اور کوئی ایسی قابلِ فروخت چیز بھی نہ ہو۔ کسی سے قرض بھی نہ مل سکے اور پچاس ساٹھ ہزار کی اشد ضرورت بھی ایسی آ پڑے جسے اگر پورا نہ کیا جائے تو ایک معصوم کی زندگی تباہ ہونے کا امکان ہو۔ سامنے صرف تین راستے ہوں۔ معصوم بے گناہ کو برباد ہونے دیا جائے' کہیں چوری ڈاکہ ڈالا جائے یا پھر اپنا ایک گُردہ بیچ دیا جائے جبکہ ایک گُردے کے ساتھ بھی نارمل زندگی بسر کی جا سکتی ہے...... فرمایئے' کیا کہتے ہیں بابا جی' بیچ اس مسئلے کے......؟''

''اُوں ہُوں......'' مَیں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' ...... ہو سکتا ہے' کوئی چوتھا راستہ بھی ہو...... بات کھول کر کرو۔ اغواء برائے تاوان کا کیس ہے یا بلیک میل' زر ضمانت یا......؟''

"ایک بھولی بھالی شریف سی لڑکی ہے جس کی نسبت اپنے چچازاد سے بچپن ہی میں ٹھہرادی گئی تھی۔ اب دو مہینے بعد ان کی شادی ہونا طے پائی' لڑکی کے غریب والدین شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ دو دن ہوئے' لڑکے نے مطالبہ کیا ہے کہ اُسے جہیز میں موٹر سائیکل اور ٹیلی ویژن چاہئے اور ان کے بغیر وہ شادی نہیں کرے گا جبکہ وہ اور اس کے والدین جانتے ہیں کہ لڑکی والے تین کپڑوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دے سکتے......"

"اس کی وجہ کچھ سمجھ میں آئی کہ لڑکے میں یہ اچانک تبدیلی کیسے واقع ہوئی ہے؟" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... ان کے گھر سے چند گھر پرے ایک گھر ہے' آسودہ حال لوگ ہیں۔ ان کی ایک ہی لڑکی ہے' لڑکے سے عمر میں بڑی لیکن پڑھی لکھی اور فیشن ایبل ہے۔ اس کا باپ اور دو بھائی کویت میں ملازم ہیں۔ اُنہوں نے لڑکے کو موٹر سائیکل' ٹیلی ویژن اور جہیز کا لالچ دکھا کر قابو کر لیا ہے۔ اب لڑکا موٹر سائیکل اور ٹیلی ویژن کے مطالبے کی آڑ میں منگنی توڑ کر وہاں شادی کرنا چاہتا ہے' وہ جانتا ہے کہ پہلی لڑکی والے اپنی تنگدستی کی وجہ سے اس کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتے۔ اس طرح منگنی ٹوٹ جائے گی اور وہ اپنی من مرضی کی شادی کر سکے گا...... اب لڑکی کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کی شادی وہاں نہیں ہوتی تو بہت ممکن ہے' وہ اپنی جان پہ کھیل جائے۔ سیدھی سادی لڑکی' بچپن سے ہی اُسے من میں بسائے بیٹھی ہے۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتی ہے کہ عین شادی کے دنوں میں وہ اسے ٹھکرا کر کسی اور کو دلہن بنالے......؟"

چند ثانئے خاموش رہنے کے بعد میں نے ایک اور سوال کیا۔

"یہ بتاؤ' تمہیں یہ گردہ بیچنے کا خیال کیسے آیا......؟"

"اخبار آپ بھی پڑھتے ہیں' دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی پڑھتا ہوں۔ آئے دن چھپنے والے اشتہارات نظر سے گزرتے رہتے ہیں' بڑے پُرکشش معاوضوں کی پیشکش ہوتی ہے۔ ہسپتالوں کے باہر بھی خون فروش کے ساتھ گردہ فروش بھی بیٹھے ہوتے ہیں اور میں کئی ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے گردے بیچ کر اپنی بیٹیوں کے جہیز بنائے ہیں' سود خور پٹھانوں کے قرضے ادا کئے ہیں۔ ہمارے محلّے کے دو نوجوان اپنے گردوں کی بدولت آج پیرس میں بیٹھے ہوئے ہیں......"

وہ لمبی سرد سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"بابا جی! غریب انسان کسی فوری اور حادثاتی ضرورت کے لئے پیسے کہاں سے لائے؟ غریب غیرت مند کے لئے صرف یہی ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے اعضاء بیچ کر اپنی ضرورت پوری

کرلے......''

''اچھا' ایک اور سوال...... اُس لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ یا تعلق ہے؟'' میں نے اُسے غور سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ''گستاخی نہ سمجھیں تو میں فی الحال اس کا جواب نہیں دے سکتا' ایک اخلاقی مجبوری ہے......''

''اگر میں یہ ضرورت پوری کردوں...... میرا مطلب ہے' قرضِ حسنہ کے طور پہ یا ویسے ہی انسانی ہمدردی......''

وہ میری بات بیچ میں ہی قطع کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''بڑی مہربانی بابا جی' آپ نے ایسا سوچا۔ اللہ آپ کو زیادہ دے' آپ صرف گردے کے سلسلے میں میری مدد فرمائیں۔ میں گردوں کی جوڑی کو رکھ کر کیا کروں گا' ایک گردہ اگر کسی کے کام آجائے تو میرے لئے سعادت ہوگی...... اور ہاں' معاوضے کی بھی کوئی شرط نہیں ہوگی۔ اپنی خوشی اور سہولت سے اگر کوئی کچھ دے دے تو وہ رقم کسی کے کام آجائے گی......''

وہ یہ سب کچھ بہت سادگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ تمہید بھی نہیں باندھی...... آپ میرا یہ کام ضرور کریں۔ اگر آپ نے مجھے مایوس کر دیا تو مجھے کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑے گا...... رات بستر پہ جیسے کانٹے اُگ آئے تھے' کسی کروٹ چین نہ تھا۔ کبھی شریف کا چہرہ سامنے آجاتا اور کبھی وہ معصوم لڑکی' اُس کے مجبور والدین اور کبھی اُس خبیث لڑکے کی جانب دھیان جاتا۔ ارادہ کیا کہ صبح شریف سے کہہ کر اُسے اپنے ہاں بلواؤں گا اور اُس اُلّو کے پٹھے' بیوقوف لالچی انسان کو سمجھاؤں گا کہ تمہاری ہونے والی بیوی تمہاری چچازاد بہن بھی ہے۔ معصوم گھریلو لڑکی بچپن سے لے کر جوانی کی دہلیز تک تمہاری پوجا کرتی رہی' اس کے انتظار میں گھڑیاں گنتی رہی اور تم حرص کے ٹٹو' مال اور جہیز کے لالچ میں اپنے سے بڑی لڑکی سے شادی کرنے پہ تُل گئے ہو۔ اگر ہو سکا تو اُس کے ماں باپ سے بھی ملوں گا' شاید اُن میں ہی کوئی انسانیت کی رمق باقی ملے یا خود ہی مطلوبہ سامان خرید کر لڑکی کے والوں کے گھر چھوڑ آؤں گا لیکن شریف نے تو مجھے کچھ اتنا پتہ نہیں بتایا۔ شاید وہ شریف آدمی کسی سفید پوش کو ننگا نہیں کرنا چاہتا۔

میں شریف کو بڑی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ لگ بھگ دو برس قبل وہ میرے گھر پانی کا پمپ مرمت کرنے آیا تھا۔ اکثر یہ بجلی والے' ترکھان' پلمبر' مستری وغیرہ دہاڑی لگانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ کام چاہے کتنا ہی معمولی اور آسان ہو' یہ کھینچ کھانچ' توڑ مروڑ کر کے اسے مشکل بنا دیتے ہیں۔ اچھے خاصے

...ے بیکار بتا کر نئے لگانے پہ اصرار کریں گے' پھر پرانے پُرزے بھی ساتھ لے جائیں گے اور نئے ... میں پہ دوکان دار سے کمیشن وصول کریں گے۔ دیسی ولائتی کے چکّر میں بھی پیسے بناتے ہیں۔ آنے جانے' صفائی گھسائی۔ گھنٹے کا کام پوری دہاڑی کے کھاتے میں ڈالیں گے اور آپ کو چھیل چھال' حیران پریشان کر کے چلتے بنیں گے۔ یہ اسے ٹویا لگانا یا چھوڑے اُتارنا کہتے ہیں لیکن یہ رہتے ہمیشہ بھوکے اور ننگے ہی ہیں۔ جیسی کمائی' ویسی لگائی' جیسا سوہرا ویسا جوائی...... شریف پہلی بار پمپ مرمت کرنے آیا تو میں نے اُس کی پیشانی' چہرہ مہرہ دیکھا۔ یہ مجھے کچھ معقول سا دکھائی دیا۔ اپنے نام کی طرح شریف۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بھائی! میں کسی اور ڈھنگ کا آدمی ہوں۔ اپنی جائز مزدوری ضرور لینا بلکہ پہلے لے لو۔ چائے پانی' کھانا حاضر کروں گا۔ نہ میں سر پہ سوار رہوں گا' کوئی چخ چخ نہ بک بک۔ کام صحیح کرنا' مجھے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ جس پُرزے کی ضرورت ہو' خود لاؤ۔ دیسی ہو تو دیسی بتانا' ولائتی نہ کہنا۔ جھوٹ نہ بولنا' دوکاندار سے کمیشن نہ کھانا۔ کسبِ حلال کماؤ گے تو روزی رزق میں برکت اور چہرے پہ نُور آئے گا' گھر میں خوشی خوشحالی اور اتفاق ہوگا۔ آزمائش شرط......"

وہ میری باتیں سُنتے ہوئے میرا منہ تک رہا تھا...... پھر دو ڈھائی گھنٹوں میں وہ فارغ تھا۔ میں نے اُسے چائے پانی' کھانے کے علاوہ اُس کی توقع سے زیادہ مزدوری دی۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اب وہ آتے جاتے سلام کی غرض سے میرے ہاں آنے لگا۔ میرے مشورے پہ اُس نے داڑھی بھی رکھ لی' پان سگریٹ میں خاطر خواہ کمی کر دی اور میری باتوں کا اُس پہ اثر بھی ہوا تھا' ٹوئے لگانے اور چھوڑے اُتارنے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ نماز بھی پڑھنے لگا' یعنی اس طرح سے میری اُس سے جان پہچان ہو گئی تھی۔

دوسرے روز میں نے اپنے ایک ڈاکٹر بچے کو ٹیلی فون پہ سارا ماجرا سُنایا' شریف سے بھی ملاقات کروائی۔ ہسپتال لے جا کر مختلف ٹیسٹ ہوئے اور ٹھیک چار روز بعد اُس کا گُردہ نکل گیا...... شریف آپریشن کے بعد بڑا خوش تھا' خوش کیوں نہ ہوتا کہ ستر ہزار روپے نقد اُس کو ملے تھے۔ دو ہفتوں کے بعد جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میرے پاس آیا۔

"بابا جی! بات تو ساری ٹھیک ہو گئی ہے لیکن ایک اڑچن اور پڑ گئی ہے۔ لڑکا کہتا ہے کہ مجھے شادی پہ راڈو گھڑی بھی چاہیے' اِس کا انتظام بھی کریں...... اُس کی نیت ٹھیک نہیں لگتی' وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر یہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ پیسے تو سارے خرچ ہو گئے ہیں' کیا اب دوسرا گُردہ......"

''وہ تمہارا دوسرا گُردہ کھا کر بھی کوئی اور بہانہ کر دے گا' پھر تیسرا گُردہ کہاں سے لاؤ گے ......؟''

مَیں نے شریف سے پوچھا۔

''کیا دل یا پھیپھڑے' پتہ یا تلّی ...... ہاتھ بازو' کان وغیرہ نہیں بِک سکتے ......؟''

''بکواس مت کرو ...... تم اِنسان ہو' بکرے نہیں ......'' غُصّے سے مَیں کانپنے لگا۔

''ڈیمانڈ کرنے والا بھی تو مجھ جیسا اِنسان ہے ......'' خشک ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

''وہ اِنسان نہیں' پاگل کُتا ہے ...... تم مجھے اُس سے ملا دو یا اُس کا پتا بتاؤ' مَیں اُس کو سیدھا کر لوں گا ......''

''نہیں' بابا جی! مَیں ایسا نہیں کر سکتا ...... وہ لڑکی اُس لڑکے سے بے حد پیار کرتی ہے' ابھی اُسے اُن کے خیالات اور مطالبات کا علم نہیں' نہ ہی ہم اُسے بتانا چاہتے ہیں ...... بابا جی! وہ بڑی حسّاس اور خود دار لڑکی ہے' مر جائے گی ......''

مَیں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ...... تم کسی نہ کسی طرح لڑکے کو قابو کر لو' جو کچھ ہو گا' ہم دیکھ لیں گے ......''

''بابا جی' مگر ہم اُس کے بے جا مطالبات کیسے پورے کریں گے ......؟''

''شریف صاحب! اِس وقت یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں' جتنا اہم یہ کہ ہم نے لڑکے کو اُن لوگوں کے چنگل سے نکالنا ہے چاہے اِس کے لئے ہمیں جائز' ناجائز کچھ بھی کرنا پڑے ...... گُردہ آپ نے دے دیا' اب ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ایک گھڑی کے لئے ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے بلکہ آپ اُسے کہیں کہ کچھ بھی اور چاہئے' لسٹ بنا کر ہمیں دے دو۔ جہاں سیر' وہاں سوا سیر بھی ...... دیکھیں' وہ کہاں تک جاتا ہے؟''

مَیں نے اُسے ایک نئی راڈو نکال کر دی اور کہا۔

''...... اور بھی جو کچھ مانگے' مجھے بتا دینا ...... انتظام ہو جائے گا۔''

وہ گھڑی لے کر چلا گیا اور مَیں سوچنے لگا کہ اِنسان لالچ میں آکر رشتے ناتے' اِنسانیت حتیٰ کہ رسول' سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اُسے سوائے وقتی فائدے کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی سمجھ میں آتا کہ یہ لڑکا بُرا نہیں ہے' سطحی عقل اور کچّی سوچ کا مالک ہے۔ کسی نہ کسی طرح اُن کی نگاہ میں آگیا' اپنے مطلب کا پا کر اُن لوگوں نے اُسے بھرپور جہیز کا لالچ دے کر قابو کر لیا ہے۔ اُس نے بھی سوچا ہو گا کہ

تب بچا کی سیدھی سادی عام سی لڑکی سے شادی کر کے کیا ملے گا' محض بیوی۔ جبکہ اُدھر شادی کرنے سے محض بیوی کے علاوہ' وہ بھی سب کچھ ملے گا جو شاید ساری عمر حاصل نہ ہو سکے۔ وہ محض لالچ میں آ کر یہ کر رہا ہے اور اگر یہ ساری چیزیں اُسے یہاں سے ہی میسّر آ جائیں تو یقیناً وہ کوئی راہ فرار نہ پا کر اپنے گھر کی طرف واپس آ جائے گا...... میرے دل میں اُسے ملنے یا کم از کم دیکھنے کی خواہش شدت پکڑ چکی تھی۔ جب شریف ملے گا تو مجبور کروں گا کہ بھائی! مجھے ایک بار اُس سے ملا تو سہی' ممکن ہے کہ میری کوئی بات اُس کی کھوپڑی میں بیٹھ جائے۔''

دس بارہ روز بعد شام کے وقت اُس کا ٹیلی فون آیا۔

''بابا جی' میں سروسز ہسپتال سے بول رہا ہوں...... منظور کی آنکھ نکل گئی ہے' ڈاکٹر اُس کا آپریشن کر رہے ہیں......''

ٹیلی فون بند ہو گیا' میں بے جان ریسیور کو دیکھتا رہ گیا...... ہسپتال' منظور کی آنکھ نکل گئی' آپریشن؟ یہ منظور کون ہے' کاٹ پلے نہ پڑا...... کپڑے تبدیل کر کے ہسپتال چلا گیا۔ شریف مجھے ایک دو عزیزوں کے ساتھ کھڑا' دروازے پر ہی مل گیا۔

''مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے اِس لئے میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا......''

میں اُسے پکڑ کر پارکنگ ایریے میں لے آیا۔

''ساری بات بتاؤ کیا ہوا...... یہ منظور کون ہے؟''

''یہ وہی موٹر سائیکل اور راڈو والا منظور ہے...... دوپہر کو اُن لوگوں کے گھر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ لڑکی کی ماں ٹرے میں شیشے کا پانی سے بھرا ہوا جگ لائی' بے دھیانی میں وہ جگ پھسل کر نیچے شیشے کی میز پہ گرا' وہاں پلیٹوں میں گرم گرم سالن تھا۔ جگ کے شیشے اور شیشے کی میز کی کرچیاں چنگاریوں کی مانند اُڑیں' گرم گرم شوربے کے ساتھ شیشے کی کوئی کرچی دائیں آنکھ میں گھس گئی' وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھ کا ڈیلا بیٹھ گیا۔ گرم مصالحوں سے چہرہ لتھڑ گیا۔ کسی طرح ہسپتال پہنچایا...... میں کہیں گیا ہوا تھا' گھر پہنچا تو یہ خبر ملی اور بھاگا بھاگا یہاں پہنچا تو ڈاکٹر اُسے آپریشن تھیٹر لے جا چکے تھے۔ ابھی تک وہ اندر ہی ہے......''

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شریف کا ایک عزیز بھاگتا ہوا آیا' اطلاع دی کہ منظور کو وارڈ میں لے جا رہا ہے۔ ہم دونوں اندر آئے۔ ڈاکٹر اُس کی رپورٹ لکھ رہے تھے' اُنھوں نے بتایا کہ اُس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے' دوسری آنکھ بھی شیشے کے ٹکڑوں اور گرم سالن کی وجہ سے زخمی ہے۔ صفائی کر دی گئی ہے' چند روز بعد پھر ملنے سے آپریشن کی ضرورت پڑے گی۔ وارڈ کا پوچھ کر ہم اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"بے چارے کی آنکھ...... بابا جی! دُعا کریں' اُس کی دوسری آنکھ بچ جائے......"

وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ میرے پھٹے مُنہ سے فوراً نکلا۔

"جو آنکھ کھرا کھوٹا' پیتل سونا نہ پہچان سکے وہ رہے' نہ رہے' کیا فرق پڑتا ہے......؟"

وہ سیڑھیوں کی ریلنگ پکڑ کر رُک گیا۔

"بابا جی! کچھ بھی ہو' میرا چچا زاد بھائی تو ہے...... یقین کریں' وہ بڑا اچھا لڑکا تھا۔ بھائی بھی دوست بھی...... بس دماغ خراب ہو گیا۔ دولت اور عورت چیزیں ہی ایسی ہیں' اچھے اچھوں کی عقل پہ پردہ ڈال دیتی ہیں......"

میں اُسے بِٹ بِٹ تکنے لگا...... اسی نوع کی باتیں کرتے ہوئے ہم وارڈ میں آ گئے' اُس کے بیڈ کے گرد کرٹن ڈال کر عارضی پردہ کر دیا ہوا تھا۔ دو نرسیں اندر باہر آ جا رہی تھیں' اندر شاید کوئی ڈاکٹر کارروائی میں مصروف تھا۔ پاس ہی منظور کے والد اور ایک جواں سال لڑکی بھیگی آنکھوں سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی سمٹ سی گئی' اُس کے والد ہماری جانب بڑھے......"

"منظور کیسا ہے چاچا......؟"

شریف آگے بڑھ کر پوچھنے لگا۔ جواب میں وہ اُس کے گلے سے لگ کر پھس پھس رونے لگا۔ مری سی آواز میں کہنے لگا۔

"شریف پتر! ایک آنکھ پھوٹ گئی' دوسری کا اللہ وارث ہے...... ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ شدید زخم آئے ہیں لیکن ٹھیک ہو جائے گی......"

شریف نے میرا مختصر سا تعارف کرایا' وہ میرے ہاتھ چومتے ہوئے دُعا کے لئے ملتجی ہوا۔ لڑکی میرے سامنے کچھ فاصلے پہ اکیلی کھڑی تھی۔ میں نے اُسے بغور دیکھا' وہ سر جھکائے شاید رو رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی' یہ لڑکی یقیناً منظور کی منگیتر چچا زاد بہن تھی...... ایسے میں ہیڈ وارڈن ہمارے پاس آئی۔

"پلیز' آپ لوگ باہر ویٹنگ روم میں تشریف لے جائیں۔ بڑے ڈاکٹر راؤنڈ پہ آنے والے ہیں......"

شریف کہنے لگا۔ "کیا ہم دو منٹ کے لئے مریض کو دیکھ سکتے ہیں؟...... میں اُس کا بھائی ہوں یہ اُس کے والد صاحب ہیں......"

"مریض بے ہوش ہے......" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ سے زیادہ ایک منٹ دے سکتی

ں اُس کے بعد آپ باہر تشریف لے جائیں......''
پورا چہرہ سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوا' ناک اور منہ میں پلاسٹک کی ٹیوبیں لگی ہوئی تھیں۔ بلڈ اسٹینڈ اور ایک دو ریڈنگ مشینیں بھی سرہانے کے قریب پڑی گرافنگ کر رہی تھیں' پتلی پتلی تاریں سر اور سینے سے جڑی ہوئی تھیں...... لڑکی بھی اندر آ گئی' بھیگی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ باہر آ کر علیحدگی میں 'میں نے شریف سے پوچھا۔
''یہ لڑکی منظور کی......؟''
''ہاں' یہی اُس کی منگیتر ہے...... اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں' یہ میری چھوٹی بہن ہے......''
''مجھے اندازہ ہو گیا تھا......'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور پوچھا۔
''وہ لوگ نظر نہیں آ رہے جن کے گھر یہ حادثہ ہوا......؟''
چاچا نے بتایا۔ ''حادثے کے وقت وہ اپنے گھر پہ موجود تھے' انہیں علم نہیں تھا کہ منظور اُن کے گھر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ اُن کی ملازمہ بوکھلائی ہوئی آئی' اطلاع دی کہ منظور زخمی ہو گیا ہے۔ وہاں پہنچے تو منظور کی آنکھیں' چہرہ لہولہان۔ اُس کے کپڑے' صوفہ' قالین' دیوار سالن کی چھینٹوں سے اَٹے پڑے تھے۔ شیشے کی میز اور برتن کرچی کرچی ہوئے ہوئے تھے۔ لڑکی نے روتے ہوئے بتایا کہ اُس کی والدہ کے ہاتھ سے پانی کا جگ پھسلنے سے یہ حادثہ پیش آیا۔ ماں دل کی مریضہ' دل پکڑے صوفے پہ نڈھال پڑی تھی۔ منظور نے بھی اِس واقعہ کی تصدیق کی۔ ہم نے فوراً گاڑی کا انتظام کر کے ہسپتال پہنچایا...... باقی سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔''
تیسرے دن منظور کا ایک اور آپریشن ہوا' باقی ماندہ آنکھ سے مزید شیشے کے ذرات نکلے تھے۔ دس بارہ روز میں اُس کی پٹی اُتار کر سبز شیشوں کی عینک پہنا دی گئی۔ بینائی بُری طرح متاثر ہوئی تھی جو صرف روشنی اور دُھندلے سائے دیکھنے کی متحمل تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ آہستہ آہستہ صاف دیکھنے کے قابل ہو جائے گا...... پندرہ سولہ روز مزید گزر گئے۔ اُس کی منگیتر اور شریف کی بہن جس کا نام شاکرہ تھا' مسلسل اُس کی تیمارداری میں مصروف رہی جبکہ وہ لوگ ایک بار بھی اسے دیکھنے ہسپتال تک نہ آئے۔ منظور جب گھر لوٹا' تو ایک آنکھ مصنوعی پتھر کی اور دوسری کمزور بینائی والی جس میں سُرخ سُرخ زخم بھی تک باقی تھے۔ اب تو جیسے اُس کی دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ جہیز' موٹر سائیکل' راڈو کی گھڑی تو دُور کی بات' اُس نے تو بنایا ہوا جہیز بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُسے شریف کے گُردہ بیچنے کا بھی علم ہو چکا تھا۔ وہ کھوئی آنکھ سے آنسو بہا بہا کر شریف سے معافیاں مانگتا رہتا' کہتا کہ میری وجہ سے آپ نے زخم کھایا' خدا

نے مجھے سزا دے دی۔ آپ بھی سچے دل سے مجھے معاف کر دیں...... جو تاریخ شادی کے لئے متعین تھی' اسی تاریخ کو بڑی سادگی سے نکاح کر دیا گیا۔ شادی کے لئے جو کچھ تیار تھا' اُس کے باپ نے لے لیا اور ستر ہزار روپے زبردستی شریف کو ادا کر دیئے کہ تمہارے گُردے کی قیمت ہمارے لئے حرام ہے...... کچھ دنوں بعد شریف میرے پاس آیا' رونی سی شکل بنا کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''اب کیا بات ہے......؟'' میں نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لیجئے......؟'' اُس نے ایک لفافہ میرے سامنے دھرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے......؟''

''روپے ہیں' وہی جو آپ نے مجھے دلوائے تھے۔ جن لوگوں نے اپنے مریض کے لئے مجھ سے گُردہ خریدا تھا' اُن کا پتا آپ کے پاس موجود ہوگا۔ انہیں یہ روپے واپس کر دیں' اب مجھے ان کی ضرورت نہیں......''

''ڈیل تو مکمل ہو چکی' اب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دیئے ہوئے روپے واپس لیں...... ویسے یہ روپے تم نے کہاں سے حاصل کیے......؟''

اُس نے مجھے ساری بات بتائی کہ کس طرح زبردستی اُسے مظلومہ کے باپ نے یہ روپے دیئے ہیں۔ پھر بولا۔

''اب جبکہ انہوں نے یہ روپے واپس کر ہی دیئے ہیں' تو مجھے بھی یہ روپے آپ کو لوٹا دینے چاہئیں......''

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔

''بابا جی! جو ڈرامہ آپ نے میرے ساتھ کیا ہے' میری خوش قسمتی ہے کہ میں اس سے آگاہ ہو چکا ہوں آپ نے اپنے دوست ڈاکٹر سے مل کر میرا جھوٹا آپریشن کروایا...... اور روپے اپنے پاس سے دیئے۔ میرے جسم میں دونوں گُردے موجود ہیں......'' اُس نے ایک بڑے لفافے سے ایک ایکسرے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ''آج صبح میری کمر میں سخت درد اُٹھا تو ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اُس نے مجھے گُردوں کا ایکسرے کروانے کا مشورہ دیا' ایکسرے کروائے تو ڈاکٹر نے کہا کہ تمہیں معمولی پیشاب کی تکلیف ہے' خوب پانی پیو۔ تمہارے دونوں گُردے صحت مند ہیں...... میں نے جب اُسے اپنے گُردے کے آپریشن کے متعلق بتایا تو اُس نے پھر میرا ایک اور ایکسرے لیا' لٹا کر مکمل معائنہ کیا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا کہ بھائی! تمہارا گُردہ نکالا نہیں گیا بلکہ تمہارے ساتھ ڈرامہ کیا گیا ہے' صرف اوپر سے کھال کو چیر دے کر

ٹانکے لگا دیئے گئے ہیں۔ یقین نہ ہو تو کسی اور ڈاکٹر سے معائنہ کروا لو...... اس کے باوجود میں ایک اور ڈاکٹر کے پاس گیا' اُس نے بھی اچھی طرح معائنہ اور ایکسرے کے بعد پہلے ڈاکٹر کی بات کی تصدیق کر دی...... باباجی! آپ بڑے گریٹ......''

اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اُسے بُرا بھلا کہنے لگا۔

''بہتر ہے کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم جیسے کم ظرف لوگ تو کسی غریب کا پردہ بھی رہنے نہیں دیتے...... دفع ہو جاؤ' اور مجھے کبھی اپنی شکل مت دِکھانا......''

ملاحظہ فرمایئے آپ نے دو مختلف اِنسانوں کے دو مختلف قصے...... سرور مالی اور شریف پلمبر! ایک نرم و نازک پودوں کو توجہ' نرماہٹ اور پیار سے نشوونما دینے والا' سینچائی اور نگلائی سے پروان چڑھانے والا انسانوں کے اعتبار اور خلوص و پیار سے کیسا مذاق کرتا ہے اور ایک آہنی سختی تندی توانائی سے نبرد آزمائی کرنے والا کیسے نفیس جذبات اور دوسروں کے پیار اور اعتبار کو معتبر رکھتا ہے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جھانکا لگانے کی عادت والا بڑا خوار اور خجل خراب ہوتا ہے۔ وہ جھانکا چاہے کسی کے گھر دروازے یا ذاتی معاملات میں ہو یا کسی کے دل دماغ یا وجدان و رُوح میں ہو۔ حُسن میں یا [illegible] کسی کی خرابی [illegible] کسی فقیر کی گودڑی میں یا کسی درویش کی کوٹھڑی میں ہو' کسی کی صورت و سیرت میں ہو یا کسی کی دانش و بصیرت میں ہو' اِس کا انجام کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا...... درویش کو تاکا جھانکی کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ یہ پہلے اپنے ''گھر'' سے شروع ہوتا ہے۔ اپنے دِل کے کسی روزن سے اندر جھانکے گا۔ وجود و وجدان کی ٹوہ لیتا رہے گا۔ روشنی اور رُوح کی جاسوسی کرے گا۔ اِدھر سے جی بھرا تو اپنے اردگرد شروع کر دے گا' یہاں کچھ خاطر خواہ نظر نہ آئے تو کائنات اور خدا کی خدائی کو ٹٹولتا پھرے گا۔ عرش فرش' لوح و قلم' مکاں لامکاں' ہست اَلست' ہر جگہ تاکا جھانکی کرے گا۔ کرکٹ کے گیند اور فٹ بال کی مانند ہر وقت' گرفت و رفت' نرم و سخت۔ نگاہوں ٹھوکروں کی زد میں بھی رہتا ہے۔ یہاں' کبھی وہاں۔ اس کے نصیب میں لپکا جھپکی' لُڑھکنا' اُڑنا' ٹھہرنا' بَل کھانا ہی لکھا ہوتا ہے۔

● جلوتِ نقش و مثال' محشرِ عزم و خیال......!

کھیلنے والے کھیل کر چلے گئے تھے اور مجھے اس گیند کو لانے کے لئے چھوڑ گئے جو میاں جی

سنگلوں والے کے آستانے کی چاردیواری کے اندر کہیں پڑی ہوئی تھی' کیسی خوش نصیب گیند تھی جو ایک درویش کے اندر جھانکا لگانے کے لئے اُڑ کر وہاں پہنچ گئی۔ اب میں اس چاردیواری کے واحد دروازے کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اندر داخل ہونے کا کیا وسیلہ ہو؟ گیند کا اندر جھانکا لگانا' اتفاق تو تھا ہی مگر مجھ نڈیدے کے بھاگوں تو جیسے چھینکا ٹوٹا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا جیسے کوئی گنہگار' فرشتوں کی آنکھ سے بچ نکل کر جنت کے دروازے تک پہنچ گیا ہو اور اب اُس کا واحد مسئلہ صرف اندر داخل ہونا ہو۔ وہ باہر کھڑا بڑا دماغ لڑا رہا ہے مگر فی الحال کوئی قابلِ عمل ترکیب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ دروازہ عام سائز سے بڑا اور بڑی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا' وہی دیسی سی کنڈی لٹک رہی تھی جو دروازہ مقفل کرنے کے علاوہ کھٹکھٹانے کے کام بھی آتی ہے۔ اب میں دروازے میں سے کوئی روزن تلاش کر رہا تھا کہ کچھ تو نظر آئے کہ "درِ دولت" کے اندر کون سی جنت کھلتی ہے؟ چوکھٹ کی درزوں کے درمیان اک درزسی دکھائی پڑی' آگے بڑھ کر آنکھ دیکھنے کا جتن کرتے ہوئے جونہی دروازے پہ ہاتھ دھرا' ہلکی سی چُوں چُوں سے پٹ اندر کی جانب تھوڑا سا کھسک گیا جیسے دروازہ اندر سے بند نہ کیا گیا ہو' صرف بھیڑ رکھا ہو۔ ذرا سا مزید دباؤ ڈالنے سے پٹ چُوں چُوں کرتا ہوا یونہی کُھل گیا۔ اندر بڑا پاکیزہ اور کھلا سا جہان تھا۔ عصر ویا مغرب کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا اور اذان میں بھی دیر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میاں جی سورج غروب ہونے سے پہلے شہر گشتی سے واپس اپنے آستانے پہ پہنچ جایا کرتے ہیں۔ اب میں بتاشوں پہ پگ دھرتا ہوا ہولے سے اندر داخل ہو چکا تھا' یونہی محسوس ہوا جیسے میں شدید گرمی اور حبس میں سے گزر کر اچانک کسی خنک بستہ' پُرسکون' نورانی سے مقام پہ آنکلا ہوں۔ باہر کی دُنیا کوئی اور تھی اور یہ جہان جیسے کوئی اور ہے۔ پیچھے دروازے کا پٹ بھیڑتے ہوئے میں چند قدم آگے بڑھ آیا۔ اب میں نوتعمیر نامکمل سے دالان میں کھڑا تھا اور میرے سامنے کوئی بیس گز کے فاصلے پہ اندازاً دوگز اُونچے چبوترے پہ ستونوں پہ اُٹھایا ہوا گول سا گنبد تھا۔ کمرا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کوئی دیوار وغیرہ تو تھی نہیں۔ پانچ گول اُٹھے ہوئے ستون جن پہ گنبد تھا۔ چبوترے پہ چڑھنے کے لئے فراخ سیڑھیاں بھی سامنے تھیں۔ یہ سب کچھ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے تکمیل کے دوران اچانک کسی وجہ سے بقیہ کام روک دیا گیا ہو۔ ہر جگہ ننگی اینٹیں' اندر باہر کہیں بھی پلستر وغیرہ کا تکلف نہ تھا۔ گنبد والے چبوترے کے چاروں اطراف خالی جگہوں پہ اینٹیں روڑے' بجری ریت مٹی وغیرہ اور جھاڑ جھنکاڑ کے طومار لگے پڑے تھے۔ صدر دروازے والے برآمدے اور گنبد کے علاوہ اور کوئی حجرہ یا کمرا دکھائی نہ دیا جہاں میاں جی کی موجودگی کا گمان کیا جا سکتا ہو لیکن مجھے یقین تھا کہ میاں جی یہیں کہیں موجود ہیں ...... کہاں ہیں' بس یہی کھوجنے کے لئے میری نظریں آستانے کی چاردیواری کے اندر ہر جگہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر میں

سوچنے لگا کہ یہاں تو مجھے میاں جی جیسا بھلا انسان دکھائی نہیں دے رہا' اک چھوٹی سی گیند کہاں ملے گی؟ ایسی وسیع جگہ جو تعمیراتی مال مسالے' کاٹھ کباڑ اور جھاڑ جھاڑیوں سے اَٹی پڑی ہو' کسی گیند کو تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی بُھس بھری کوٹھڑی میں کسی برگد کے چھوٹے سے گولڑ کو تلاش کرتا پھرے اور پھر اوپر سے اِس راگیشری اور للِت ملاپ کے اُچنگ سمے تو سامنے پڑا سونا' سیسہ لگے اور سیماب کھلا ہوا سُرمہ جاپ پڑے۔ مَیں نے گیند کی گدی چھوڑی اور اس گیلانی کی گرہ پہ دھیان دیا جس نے ایک گیند کو تو دیوار کے اوپر سے اُڑا کر کہیں چُھپا لیا تھا اور دوسرے گیند کو کواڑ کُھلا چھوڑ کر اندر بلا لیا تھا۔ سیڑھیوں کے رُوبرو کھڑا مَیں اپنے آپ ہی گنگنانے سا لگا......

"چھپ تلک سب چھین لی مو سے نیناں ملا کے"

سورج طلوع ہونے میں دیر لگے تو لگے مگر سورج غروب ہونے میں بڑی جھٹ پَٹ ہوتی ہے۔ غروبِ شام ذرا سا شرمائی' گال لال گلال کئے' کجرنینوں سے ہلکی سی ادا دکھائی اور سُرمئی آنچل سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ بسم اللہ پڑھ کر مَیں نے پہلی سیڑھی پہ پاؤں رکھا۔ دوسری' تیسری' ساتویں پہ پہنچ کر مَیں رُک گیا۔ سیڑھیاں ختم اور چبوترہ شروع تھا۔ سامنے کچے فرش پہ ایک کچی سی قبر' سرہانے کچی اینٹوں کے ٹھڑے پہ مٹی کا ایک ٹوٹا ہوا دیا...... مَیں نے سوچا کہ شاید یہ قبر میاں جی کے باباجی یا کسی بزرگ کی ہو لیکن ایسی ویرانی' تنہائی' اُداسی...... روایتی بزرگوں کی قبروں کی مانند یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں تو قبر بھی مٹی کا ایک ڈھیر ہی ہوتی ہے۔ پھول پتی' خوشبوئیں' اگر بتیاں' دیئے چراغ' مصحف' چادر غلاف اور کچھ دیگر لوازمات اِس ڈھیر کو برگزیدہ کی قبر' مقدس مبارک یا مزارِ شریف بنا دیتے ہیں مگر یہاں ایسا کوئی تکلف نہیں تھا۔ نیچے ارد گرد بھی تو جابجا مٹی کے ایسے ڈھیر' تودے لگے پڑے تھے۔ اب مَیں اِس شش و پنج میں تھا کہ فاتحہ پڑھوں یا بھاگ لوں؟...... بلا ارادہ اچانک میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"السلام علیکم یا صاحبِ مزار"...... مَیں نے فاتحہ شریف کے لئے ہاتھ اُٹھا لئے تھے' تُرت جواب ملا۔

"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" جیسے سُنی' اَن سُنی سی ہوئی۔ مَیں سورۃ الفاتحہ پڑھ رہا تھا' اچانک مجھے جھٹکا سا لگا کہ یہ "وعلیکم السلام" کی آواز کہاں سے آئی ہے؟ اب زیرِ لب تو فاتحہ جاری تھی لیکن آنکھیں دائیں بائیں' سامنے کسی "وعلیکم السلام" کہنے والے کو تلاش کر رہی تھیں۔ یہ بھی خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ میرا محض وہم ہو...... فاتحہ شریف ختم ہوگئی مگر وعلیکم السلام والا وہم یا تجسس و تردد ہنوز باقی تھا۔ مَیں قبر کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا' پوری قبر میرے سامنے تھی۔ بڑی آہستگی سے سرہانے والے کچی اینٹوں کے ٹھڑے کے پیچھے سے جس پہ مٹی کا ٹوٹا سا دیا پڑا ہوا تھا' سرکار میاں جی کا سَر مبارک یوں اُبھرا جیسے طلوع کے سمے

آفتاب اُبھرتا ہے۔ میں نے میاں جی کو پہلی مرتبہ آج سولا ہیٹ کے بغیر دیکھا۔ سر پہ سفید کاکلیں' شانوں پہ اَبرِ رحمت کی مانند اُتری ہوئیں۔ دھیمی سی مسکراہٹ کا اُجالا وہ پُرنور چہرے پہ لئے شفقت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

زمین کا ماہتاب لحظہ لحظہ اُوپر اُٹھ رہا تھا اور آسمان کا آفتاب اب بڑی عُجلت سے اک جھکائی لے کر مُنہ چھپا گیا تھا۔ وہ مرقد کے سرہانے کی جانب کی سیڑھیوں سے چبوترے پہ تشریف لے آئے۔ جسم پہ وزنی زنجیریں اور پاؤں کی آہنی بیڑیاں دیکھتے ہی میں کانپ سا گیا۔ نگاہیں جُھک کر اُن کے قدموں سے لپٹ گئی تھیں۔ ہاتھ ناف پہ بندھے ہوئے' ہلکا سا جُھکا ہوا سر...... میں کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔

انسان جب اپنے بحرِ بطون میں اُترنا' ڈوبنا' تیرنا اور پھر اُبھرنا سیکھ لیتا ہے اور فی نفسہٖ ان جملہ کیفیات کے جمال و کمال' اُمنگ ترنگ کی سرمستیوں اور سرشاریوں سے کسی حد تک آشنا ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لئے وقت جیسے تھم سا جاتا ہے' وہ زماں و مکاں کی نظر نہ آنے والی قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کائنات کے تمام ضابطے قاعدے' قانون اُصول' طور طریقوں سے وہ جیسے مستثنیٰ سا ہو جاتا ہے۔ یہ مراقبہ بھی دھیان' گیان ہی کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اِنس' جن اور قدسیوں کے علاوہ یہ وصف وظیفہ حیوانات' چرند پرند' جمادات' نباتات [illegible] پایا جاتا ہے۔ شجر و اشجار میں تو یہ کیفیت بدرجہ اُتم ہوتی ہے۔ اس کائنات کی ہر تخلیق کسی نہ کسی سمے' کسی نہ کسی شکل' حالت و انداز میں اپنے خالقِ حقیقی کے دھیان گیان میں اُتر جاتی ہے۔ مجھے اپنی جبل خواری' صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کے دوران بارہا ایسی مخلوقات دیکھنے' ان سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مختلف وقتوں سے اور مختلف حالتوں میں معرضِ مراقبہ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کئی تو ہزاروں لاکھوں برسوں سے ابھی تک مراقبوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور نہ جانے کب تک وہ اسی حالت میں رہیں۔ اسکندریہ' بابل' نینوا' کوہ ارارا ط' حضر موت' سائبیریا' زنجان' جلال آباد' کوہ البرز' رے' جبلِ نور' جبلِ ثور اور مکران و قونیہ میں کئی ایسے پتھر' چٹانیں' درخت' جانور اور انسان و جن دیکھے جو صدیوں سے حالت مراقبت میں پڑے ہوئے ہیں' گو اَمتدادِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار نے ان کی ہیئت کذائی میں ایسی عجیب و غریب سی تبدیلیاں نمایاں کر دی ہیں کہ عام انسانی آنکھ ان کی اصل حقیقت کو پہچان نہیں سکتی۔ کائنات کو تو علیحدہ رکھئے' اس ارض کے مُٹھی بھر کُرہ میں لاتعداد ایسی جگہیں ہیں جہاں تک ابھی انسان کی رسائی نہیں ہوئی۔ خلاء تو باہر ہے' سمندر تو دسترس میں ہے اور یہ قریب قریب سارے کا سارا ہی اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسے ایسے عجائب' تحیّر و اَسرار' مدفن و معدنیات' مدائن و خزائن پوشیدہ ہیں کہ انسان ان کی افادیت و اہمیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ انسان کی جستجو اور علم و سائنس نے اپنے

تئیں زمین کے چپے چپے کو کھنگال ڈالا ہے مگر نہیں' ابھی دلّی دُور ہے۔ دیوار اور پہاڑ تک پہنچ کر انسان رُک جاتا ہے کہ آگے راستہ بند یا ختم ہے حالانکہ اصل کھوج تو وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اَرض تو ایک شہابیہ ہے' کائنات میں اس کی حیثیت ایک ننھے سے ذرّے سی ہے۔ جو ذرا سے ذرّے کو بھی ابھی تک ذرّہ بھر نہ سمجھ سکا' اچھی طرح نہ دیکھ بھال اور جان سکا وہ بھلا اس کائنات کو کیا جانے اور سمجھے گا اور پھر اس کائنات کے آگے بھی ایسے لاتعداد عالم ہیں۔ بیت المقدس' جبلِ نور' جبلِ رحمت' جبلِ ثور' مدینہ شریف' نجف' جھیل سیف الملوک وغیرہ میں کئی ایسے شجر' حجر اور ستون گڑے پڑے ہیں جو مراقبے میں اُترے ہوئے جنّات ہیں۔ اسکندریہ' قاہرہ' لبنان و شام میں بھی ایسا کچھ بہت دیکھا۔ اسی لئے کہا گیا کہ پتھر' کنکر (درخت کی چھال) گوبر اور کوئلہ وغیرہ سے نجاست مت صاف کرو' اِن سے جنّات کی غذا اور بقا کا تعلق ہے۔ اِنسان یا جِن جنہیں مراقبہ کرنے کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر وہ باز نہیں آتے۔ جونہی کہیں موقع ملا' سَر جُھکا لیا' اپنے آپ میں اُتر گئے۔ وہی بات کہ سَویا مَرا برابر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ کوئی سویا تو پھر جاگا ہی نہیں' وہیں سوئے سوئے ہی نُسوئے عدم مراجعت کر گیا۔

سوئے ہوئے انسان کے جسم سے اس کا نوری جسم خارج ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی اکیلا شخص صبح کام پہ جاتے ہوئے اپنے مکان کو یا مرے کو خالی کر جاتا ہے۔ مراقبہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس حالت میں نوری جسم باہر نہیں نکلتا بلکہ وہ خاکی جسم کی خستگی و کثافت' دماغ کے اُبلتے ہوئے فاضل فتور اور دل کی دریدہ ذہنی کو درست کرنے میں لگ جاتا ہے۔ جیسے جیسے مراقبہ میں حُضوری اور لذت پیدا ہوتی جاتی ہے' مراقبہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ صلوٰۃ بھی تو مراقبہ ہی تو ہے بلکہ معراج المراقبہ ہے' اس فرق کے ساتھ کہ مراقبۃ الذات میں نماز کی طرح قرأت اور قعود و سجود نہیں ہوتے۔ مراقبۃ الذات میں اکثر تو نہیں لیکن کبھی کبھی ایسا مقام بھی آ جاتا ہے کہ صاحبِ مراقبہ واپس نہیں پلٹتا' بس وہیں کہیں اندر ہی ٹہل جاتا ہے۔ پھر لوگ اُٹھا کر نہلا دُھلا اور کفنا کر دفنا دیتے ہیں جبکہ وہ طبعی موت مرا نہیں ہوتا۔ اِسی لئے بڑے بڑے گیانی دھیانی' رِشی مُنی اور دَرویش آبادیوں سے کہیں دُور نکل کر جنگل' پہاڑ' غاروں' گھپاؤں میں مراقبہ کرتے ہیں کہ اس حالت میں اگر ان کا مراقبہ طوالت پکڑ لے (یہ طوالت عشروں مہینوں' برسوں اور صدیوں پہ بھی محیط ہو سکتی ہے) تو اُنہیں کوئی پریشان کرنے والا نہ ہو۔ اس صورت میں اِن کے خاکی جسم پہ کوئی خاص اثر نہیں پڑتا کیونکہ اِن کا نُوری جسم اِسے سنبھالے رکھتا ہے۔ ایسا جسم سُوکھ کانٹھ کر پتھر سا ہو جاتا ہے۔ برسوں صدیوں بعد صرف اس کے حُلیئے اور رنگت میں تبدیلی آ جاتی ہے مگر کایا تبدیل نہیں ہوتی۔ خاکی جسم کی تازگی جو پانی کی مرہونِ منّت ہوتی ہے' ختم ہو جانے سے پوست و استخوان سُوکھ و خشک ہو جاتے ہیں مگر وُجود اور اس کے

اندر وجدان زندہ رہتا ہے کیونکہ اس کی غذا اور ضرورت ہوا' پانی اور خوراک نہیں۔ عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے ''ساکی منی'' یعنی گوتم بدھ کی مثال سامنے ہے۔ مراقبۃ الذات کے علاوہ بھی بہت سی قسم کے مراقبات ہیں مثلاً مراقبۃ الموت' مراقبۃ القبر' اور بھی بہت سے جن کا ذکر فی الوقت ضروری نہیں۔

میں سرخم کئے' ناف پہ دونوں ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا یعنی نیم مراقبے میں اُتر گیا تھا۔ میاں جی سامنے مرقد کے سرہانے' لحد نور بنے متبسم کھڑے تھے اور میں جیسے محمود کے سامنے ننھا سا ایاز کھڑا کسی حکم کا منتظر ہو۔ خدا جانے' یہ آمنے سامنے والی کیفیت کتنی دیر تک قائم رہی؟ بس مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ ''اللہ اکبر' اللہ اکبر'' کی سرمدی صدا نے مجھے ہلکا سا جھنجھوڑا...... میاں جی فرما رہے تھے۔

''چلو' وضو کرلو......''

ایک تنگ سے کنویں پہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں ایک چھوٹا سا کنواں بھی ہے جس کے دہانے پہ ایک چوبی ہنسلی سی گڑی ہوئی تھی۔ اوپر لوہے کے سریئے میں لکڑی کا پہیہ سا پڑا ہوا تھا۔ ٹین کا ایک ڈول کپڑے کی بٹی ہوئی رسّی سے بندھا ہوا تھا۔ میاں جی نے خود ہی کنویں سے پانی کھینچ کر مجھے وضو کروایا۔ ایسا ٹھنڈا میٹھا اُمرت سا پانی...... میاں جی نے خود ہی فرمایا کہ پیاس لگی ہے تو خوب پیٹ بھر کر پانی پیؤ...... چبوترے [illegible] پائنتی کی طرح یہاں بھی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں لیکن کچھ زیادہ چوڑی اور فراخ۔ ان سیڑھیوں کی بغل کے ساتھ کچھ گہرائی میں ایک چھوٹے دروازے سے گزرتے ہوئے ہم اندر تہہ خانے میں اُتر آئے...... اللہ اللہ! یہاں تو عالم ہی کچھ اور تھا کسی دیئے یا روشن چراغ کے بغیر ہی ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ تازہ ہوا اور سوندھی سوندھی کچی مٹی کی خوشبو نے ایک جاں فزا قسم کا ماحول پیدا کر رکھا تھا کہ طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ گول بڑا سا تہہ خانہ' دیواریں پکی اینٹوں سے اُٹھائی گئی تھیں۔ اوپر' یعنی تہہ خانے کی چھت بھی پختہ تھی۔ دیواروں میں کچھ روزن سے نظر آرہے تھے جو شاید تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے تھے۔ درمیان میں ایک قبر کُھدی ہوئی تھی' کناروں پہ نکالی ہوئی مٹی کے ڈھیر لگے تھے' کدال اور بیلچہ بھی پاس دھرے تھے۔ قبر کے دونوں اطراف کھجوری چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ پانی کا مٹکا' مٹی کا کوزہ' لوٹا۔ ایک آدھ مٹی کا برتن اور چند ایک پارچات بھی دکھائی دے رہے تھے...... میاں جی نے مجھے قبر کی دائیں جانب چٹائی پہ بٹھایا' مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''پہلے کچھ کھا پی لو پھر کوئی اور بات ہوگی......''

اُنہوں نے نہ جانے کہاں سے ایک بڑا سا سیب نکالا۔ ایسا خوش نظر' خوش رنگ اور فربہ سیب

کم از کم میں نے اپنی اس وقت تک کی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی فوجی وردی میں کہیں سے ایک شکاری چاقو نکالا' سیب کی قاشیں کاٹ کاٹ کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے مجھے کھلانے لگے۔ سیب کی حلاوت وشیرینی' خوشبو اور خستگی بتا رہی تھی کہ یقیناً یہ سیب اس دُنیا کے کسی باغ کا ثمر نہیں اور نہ ہی ان دنوں سیب کا موسم تھا' ابھی تو آموں آڑووں کی منڈلیاں لگی ہوئی تھیں' سیب تو کہیں دکھاوے کو بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ایک عجیب سی بات یہ بھی تھی کہ اس سیب کو جیسے جیسے ہم کھاتے جا رہے تھے' ویسے ویسے ہی اس میں برکت بڑھتی جا رہی تھی۔ جب میاں جی نے محسوس کر لیا کہ پیٹ بھر چکا ہے تو انہوں نے بھی ہاتھ روک لیا۔ سیب اپنی جگہ اور میری یہ سوچ اپنی جگہ کہ یہ روشنی' یہ نیم اُجالا' کہ زیر زمین اس اندھیری جگہ پہ سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ بظاہر کوئی چراغ بتی بھی دکھائی نہیں پڑتی' آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟...... میاں جی مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔

''چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اتنا زیادہ غور مت کیا کرو......'' وہ مجھے گیند دیتے ہوئے بولے۔ ''تو گیند سنبھالو اور جلدی سے گھر جاؤ' گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے...... اور ہاں تم ظہر کی نماز سے ایک گھنٹہ بعد اور شام کی نماز سے آدھ گھنٹہ پہلے تک جب بھی چاہو یہاں آ سکتے ہو۔ دروازہ کھلا ملے گا۔''

میں نے .... سے کہا۔

''میاں جی! اجازت ہو تو ایک آدھ بات پوچھ لوں......؟''

وہ میرا بازو تھام کر مجھے اُٹھاتے ہوئے بولے۔

''آؤ' میں تمہیں باہر سڑک تک چھوڑ آؤں...... رات ہو گئی ہے' یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں۔''

کھدی ہوئی قبر پہ میں ایک نظر ڈالتے ہوئے اُن کے ساتھ باہر نکل آیا۔ چبوترے پہ چڑھ کر وہ گنبد کے نیچے والی قبر کے پاس رُک گئے' کہنے لگے۔

''یہ مجازی قبر مٹی کا ڈھیر ہے' یہ زمین سے اُوپر اور اندر سے خالی ہے' صرف دکھائی دینے کے لئے ہے۔ نیچے والی حقیقی زندہ قبر زمین کے اندر ہے......'' میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پائینتی کی سیڑھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے مزید فرمانے لگے...... ''ویسے مرنے کے بعد مجازی یا حقیقی' دونوں قبروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ تو بس......''

وہ آگے مزید کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ صدر دروازہ ہلکا سا بھیڑ کر وہ مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئے تھے۔ پاؤں کی چھن چھن کرتی بیڑیاں اور وزنی زنجیریں...... بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میاں جی! آپ نے اتنا بوجھ اُٹھا رکھا ہے' کیا آپ کو تکلیف نہیں ہوتی......؟''

جواب میں فرمایا۔ ''یہ بوجھ نہیں' میرا اعزاز ہے۔ یہ میرا انعام' میرے تمغے میرے لئے پھول گجرے اور گہنے ہیں۔ اسی لئے تو میں انہیں پہن کر' سجا کر شہر بھر کو دکھانے جاتا ہوں کہ دیکھو' مجھے میرے بابا نے کیسے گہنے پہنائے ہیں......'' انہی باتوں میں ہم بڑی سڑک تک آ گئے' فرمایا۔ ''اب تم سیدھے گھر جاؤ...... فی امان اللہ' انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی......''

● بدن کا بُخار' رُوح کا خُمار......!

پھر وہی سلسلہ کہ صبح اُن کی آمد سے پہلے میں اپنی گلی کے سامنے اُن کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ اُن سے پہلے ان کے ''زیورِ گہنوں'' کی چھن چھن مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ پھر انہیں اونچی سڑک سے اِک قلندرانہ شان سے آتے ہوئے دیکھتا۔ وہ مجھے کسی اونچے پربت سے ترائی میں اترتے ہوئے کسی مہان تپسوی کی مانند دکھائی پڑتے جو کئی کالے یُگ دھیان گیان میں بِتا کر بُھولے سے پھر بستی کی جانب لوٹ آیا ہو۔ برابر پہنچتے تو میں قدموں میں نظریں بچھا کر سلام عقیدت کی کلیاں نچھاور کرتا۔ ان کی خفیف سی مسکراہٹ مجھے سارا دن شاد و کام رکھتی۔ شام اُن کے لوٹنے کے سمے میں پھر سلام و نیاز کے لئے موجود ہوتا۔ پھر سَر پہ چڑھی رات میں رنگین اُڑن کھٹولوں میں سوار' نجانے کیسی کیسی گُلرنگ جنت نظیر وادیوں اور خوش نظر مرغزاروں میں اڑتا پھرتا۔ ایک غلطی یہ ہوئی جو میں نے محض شوبازی اور اپنی اہمیت جتانے کی خاطر محلّے کے دوستوں اور گھر میں ماں جی کو بتا دیا کہ میاں جی کے کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور بچّہ داخل نہیں ہو سکتا اور وہاں گرا ہوا گیند بھی میرے سوا کوئی اور نہیں لا سکتا اور میاں جی نے مجھے جنت کے باغ سے انوکھی خوشبو' مٹھاس اور لذّت والا بڑا سا سیب اپنے ہاتھوں سے کھلایا ہے۔ سیب والی بات کے علاوہ باقی ساری سٹوری پہ یقین کر لیا گیا۔ بات بھی صحیح تھی کہ سیب پنجاب تو پنجاب' ابھی کشمیر' کابل و کوئٹہ میں بھی دستیاب نہیں تھا۔

ان ہی دِنوں مجھے موسی بخار نے آ لیا۔ دو چار روز سخت نقاہت اور نیم بیہوشی کے عالم میں گزرے۔ شدھ بدھ ماری گئی تھی' میاں جی کی جانب سے بھی توجہ ہٹی ہوئی تھی۔ بخار اُترا تو کمزوری اور مُنہ ذائقے کی بے سوادی نے ناک میں دَم کر دیا۔ دلیہ' کھچڑی' دہی اور ایسی ہی بے ذائقہ' بے لذت چیزیں کھا کھا مَت ماری ہوئی تھی' موسمی پھل بھی زہر لگتے تھے۔ بس سارا دن گھر پلنگ پہ لیٹا رہتا یا پھر ریڈیو' اخبار' رسالوں سے جی بہلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ ماں جی نے کئی بار کہا کہ کاکا! ذرا اُٹھ کر باہر کا چکر لگا لو'

جاؤ دوستوں سے ملو مگر میرا کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کمزوری کے بعد جیسے ہلکی سی یرقانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ سوکھے سڑے ہوئے ہونٹ، پھیکی پھٹک آنکھیں، گردن بازوؤں کی اُبھری ہوئی رگیں۔

پچھلے محلّے سے ایک گوجری اُپلے فروخت کرنے ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ میں دالان میں چارپائی پہ تکیئے سے ٹیک لگائے نیم دراز سا تھا۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی، کچھ لمحے میری آنکھوں میں جھانکنے کے بعد وہ باورچی خانے میں ماں جی سے کُھسر پُھسر کرنے لگی...... میں نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ گوجری کچھ میرے ہی بارے میں ماں جی کے کان بھر رہی ہے۔ میں چارپائی سے اُٹھ کر ماں جی کے پاس پہنچ گیا۔

"ماں جی! یہ ماسی گوجری مجھے یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہی تھی؟"

ماں جی نے کہا۔

"گوجری کہہ رہی ہے کہ کاکا کہیں ڈر گیا ہے...... کاکا جی! مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تو جو سائیں سنگاں والے کے ڈیرے پہ گیا ہے نا، وہیں سے تجھے یہ کسر لگی ہے۔ اب تو بالکل وہاں کرکٹ کھیلنے نہیں جائے گا......"

گوجری [illegible] قندھاری انار مل جائے تو اسے رات بھر گرم بھوبھل میں دبا دیں۔ صبح نچوڑ کر اس کے رس میں چٹکی بھر سفید زیرہ پیا ہوا ملا کر اسے پلا دیں۔ اگلے روز ہی اس کی کمزوری رفع ہو جانے کے علاوہ اس کی بھوک بھی کھل جائے گی، یرقان کا اثر بھی جاتا رہے گا اور ڈر خوف سے بھی نجات مل جائے گی۔

جونہی میں نے قندھاری انار کا سُنا تو یوں لگا کہ گوجری نے جیسے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میرے اندر سے جیسے اُبل اُبل کر یہ خواہش نکل رہی تھی کہ کہیں سے قندھاری انار ملے، خوب خوش رنگ، میٹھا اور قدرے ترش۔ یاقوتوں کے طرح ترشے ہوئے لال سُرخ گلابی دانے زندگی بخش تراوٹ اور حلاوت سے بھرے ہوئے ہوں اور میں خوب جی بھر کر کھاؤں۔

بیمار کی بھی اپنی ایک الگ ہی بُدھی اور خواہش ہوتی ہے، ایسی اوَق چیز چاہے گا جو کہیں بھی دستیاب نہ ہو۔ موسمی اور متعدی بخاروں کے مریض، اکلوتے لاڈلے بچّے، سر پہ چڑھے ہوئے معشوق اور پہلوٹھی کے بچّے والی حاملہ عورت، یہ چاروں "چیزیں" ہمیشہ عجیب و غریب، ناقابلِ حصول، کمیاب اور بے موسمی چیزوں کی خواہش کا اظہار کر کے اپنے متعلقین کی محبت، برداشت اور جیب کا امتحان لیتی ہیں۔

اس قندھاری انار سے ایک حکایت یاد آ گئی جو بابا جی کی زبانی سُنی تھی۔

الف انار' ب بیمار' پ پیار......!

بابا جی فرماتے تھے کہ جس عشق' پیار محبت کی منزلِ مقصود یا انتہا عورت یا مرد ہو وہ فساد' فتور اور فتنہ ہے۔ مرد' عورت دونوں اک دُوجے کے لئے شریکِ حیات یعنی میاں بیوی کے رُوپ میں ہی رحمت و برکت ہیں۔ اس مقدس بندھن کا مقصد و معنی ہی محبت ہے۔ جو مرد و زن اِس مقدس بندھن کے بغیر ایک دوسرے سے سچے عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ متوازن شخصیت و کردار کے حامل نہیں ہوتے بلکہ وہ ذہنی جنسی مریض ہوتے ہیں۔ ایسے ہر دو کو آپس میں شادی نہیں کرنی چاہئے اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر اولاد پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ اب آیئے حکایت کی طرف...... کسی نیک خُو' عادل و بہادر' رحم دل اور بیدار دماغ فرمانروا کا اکلوتا بیٹا جو ولی عہدِ سلطنت بھی تھا ایک طرح نے گانے والی خوبصورت عورت کی مست نگاہی کا اسیر ہوا۔ اسی شغلِ حُب و صُحبت میں وہ کارِ سلطنت سے بھی بیگانہ ہو گیا' رہی سہی کسر بدذاتوں کی مصاحبت اور شب و روز کی بادہ نوشی نے پوری کر دی...... بادشاہ نے جب دیکھا کہ اس کا بیٹا اب بیکار ہو چکا ہے' کاروبارِ سلطنت سنبھالنے کا اہل نہیں رہا اور کوئی نصیحت و فہمائش بھی اس پہ اثر انداز نہیں ہوتی تو ا[illegible] پھر [illegible] اس چنچل [illegible] عورت اور اُس کے کنبہ قبیلہ' حواریوں' سب کو ملک بدر کر دیا۔

بادشاہ ہوں یا شہزادے' ان کا معاملہ تو ہاتھیوں جیسا ہوتا ہے۔ زندہ لاکھ اور مُردہ سوا لاکھ کے۔ بادشاہ شہزادے حکمران ہوں یا معزول و محکوم' بادشاہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے کرّوفر یا مزاج و مظاہرت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ احمق' بدرو' عیاش شہزادہ اپنا تام جھام' متاع و مال لے کر اپنے باپ کی عملداری سے باہر نکل آیا اور ایک وسیع سے صحرا میں خیمے گاڑ دیئے خوشامدی مصاحب اور حواری ساتھ' اور وہ محبوبۂ دلنواز پہلو میں تھی۔ شیشہ و جام' آلاتِ موسیقی' مُرغ و ماہی۔ ہر روز عید اور ہر شب' شبِ برأت تھی...... کہتے ہیں کہ مطلبی دوست' عیاشی بدکاری کے حوالے کی ہوئی جوانی......طوائف زادی اور دونوں ہاتھوں سے بے دریغ لٹایا جانے والا مال بہت جلد ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ جب تک مال و منال کی چکا چوند اور شہزادے میں رَعب داب' دَم خم رہا' سارے ہی وفاداری اور جانثاری کا دَم بھرتے رہے۔ جونہی ذرا خرچ خرچا میں احتیاط آئی' خوشامدیوں نے بھی دوسرے کبوتر خانے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ ادھر محبوبۂ دلنواز کے مزاج بھی تیور سُروں کی طرح چڑھ گئے۔ وہ زنانِ بازاری خوب جان گئی تھی کہ اب بانسری کے اُلٹا بجنے کا سمے لگ گیا ہے لیکن وہ یہ بھی خوب سمجھتی تھی کہ شکاری کے جال میں پھنسا ہوا پرندہ

شاید ایسا بے بس نہیں ہوتا جتنا کسی صاحبِ اقتدار و منصب کے چُنگل میں جکڑا ہوا انسان ہوتا ہے اور وہ انسان بھی ایسا کہ جس کے لئے تخت و تاج پہ لات ماردی ہو۔ کہتے ہیں کہ جتنے بازاری عورت کے سر پہ بال ہوتے ہیں' اس سے دُگنے اُس کے پاس چلتر ہوتے ہیں۔ مکاری' عیاری' فریب' عشوہ طرازی' حیلہ سازی' بہانہ بازی' لبھانے پرچانے اور اُنگلیوں پہ نچانے کے ہزار ہا رنگ ڈھنگ اُس کی پوروں میں ہوتے ہیں۔ دبنگ سے دبنگ مرد کو کاٹھ کا اُلو بنانے کے لئے اِسے اڑھائی ساعت درکار ہوتے ہیں۔ اس چھنالا آفت کی پرکالہ نے کمال مکاری و اداکاری سے حاملہ ہونے کا ڈھونگ رچایا اور شہزادے کو اس تخت پہ لگایا کہ ہمارے ہاں یقیناً اولادِ نرینہ پیدا ہو سکتی ہے۔ بادشاہ سلامت اپنے پوتے کی خوشخبری سن کر ہماری خطائیں معاف کر دیں گے اور ہمیں واپس راجدھانی میں بُلوا کر ہماری پذیرائی فرمائیں گے' بس یہی ایک صورت ہمارے بچاؤ اور آئندہ کے بھاؤ کی ہے لیکن...... وہ ''لیکن'' کہہ کر خاموش ہو گئی اور سر جھکا کر ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

شہزادے نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''اے حسین جان! اس ''لیکن'' کے آگے کیا ہے......؟''

وہ کمال [illegible]

''شہزادے! کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا' سرِ راہ ایک فقیر کی نگاہ جو مجھ پہ پڑی تو پاس بلا کر نوید سُنائی کہ تُو ملکہ بنے گی۔ تیری کوکھ سے جو پہلی اولادِ نرینہ ہو گی' وہ بھی اپنے وقت کی حکمران ہو گی''...... اتنا کہہ کر اُس نے شرماتے ہوئے شہزادے سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اُس فقیر کی یہ پیشین گوئی ضرور پوری ہو گی' لیکن......''

شہزادہ ایک بار پھر ''لیکن'' سُن کر اُلجھ گیا۔ اُس کی عنبریں زُلفوں کے پیچ و خم میں اُنگلیاں پھنساتے ہوئے دوبارہ پوچھنے لگا۔ ''اِس ''لیکن'' کی گرہ کھولو اور جو من میں رکھا ہے وہ صاف صاف بولو......''

وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے بتانے لگی۔ ''شہزادہ عالی! اُس فقیر نے یہ بھی کہا تھا کہ جب بچہ پیٹ پڑے تو پھر وہی کچھ کھانا جو من بھاوتا ہو۔ اب کئی پہر بیتے' کوئی شے لبوں تک لا کر نہیں چکھی۔ کھانا پینا دیکھتے ہی اُبکائیاں آنے لگتی ہیں' من یہی چاہے کہ کوئی بڑا سا سُرخ اَنار جو خوب پُختہ اور تازہ' میٹھے میٹھے رَسیلے جواہر دانوں سے بھرا ہوا ہو' اِسے کھولوں تو وہ سُرخ گلاب کی مانند کھِل اُٹھے۔ مَیں دانہ دانہ امرت چوسوں......'' پھر نگاہیں جُھکا کر آہستہ سے کہنے لگی۔ ''مجھے تو یوں لگے' پیٹ میں آپ کا شہزادہ بھی یہی کچھ چاہے ہے......'' پھر بڑی لگاوٹ سے شہزادے کے پاؤں پہ سر ٹکاتے ہوئے اک ادا سے کہنے لگی۔

''شہزادہ عالی! کچھ بھی جتن کرو' مجھے کہیں سے اَنار لا کر دو ورنہ میرا بُرا حال ہے اور زندگی بے کار ہے۔ پیٹ بھی مانگے اور پیڑ و بھی......''

شہزادے نے تمام گفتگو سُنی اور کچھ سوچتے ہوئے سر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد بچے کھچے حاضر باشوں کو بُلوا کر حکم دیا کہ بکمال عُجلت و طراری سے چاروں کھونٹ پھیل جاؤ۔ جہاں سے' کہیں سے جیسے بھی بن پڑے' رَسیلے' مٹھاس سے بھر پور' خوش رنگ و خوشبودار اَنار تلاش کر کے لاؤ اور مُنہ مانگا انعام و اکرام پاؤ۔ کارندگانِ زمانہ دیدہ و چشیدہ نے ہاتھ باندھے التجا گزاری کہ موسم اَنار و انجیر تو ابھی بہت آگے ہے' دُور دُور تک کہیں نام و نشان تک نہیں۔ سوائے باغِ عدن اور کوئی راہ شادکامی اور کامرانی کی دکھائی نہیں دیتی۔ شہزادے نے تیور بدلتے ہوئے تلوار بے نیام کی اور نہایت نخوت و نفور سے کہا۔

''اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔ کہیں صبح ہے تو کہیں شام پڑی ہے۔ گرمی ہے تو کہیں سردی' کہیں انگور کچا ہے تو کدھر شفتالو پکا ہے...... نمک حلالی کا موقع ہے' اَنار کی طلب شدید اور حالات کشید ہیں۔ مُنہ دکھاؤ تو اَناروں کی ڈالی لئے ورنہ کہیں بھی مُنہ کالا کر لینا......''

حکمِ حاکم' مرگِ مفاجات کا طوق گردن میں ڈالے چاروں اطراف پھیل گئے۔ کئی دنوں کے انتظار و بے قراری [illegible] وہ صاحب [illegible] اپنے [illegible] لانے [illegible] کوس بطرف مشرق کوہ کلیار کے دامن میں ایک پیر مرد درویش دکھائی پڑا جو اپنے اَناروں کے باغیچے میں بیٹھا اپنے سامنے دھرے پڑے سینکڑوں اَناروں سے اچھے پکے سُرخ اَناروں کو دبا دبا کر ان کے شیریں رس سے اپنی پیاس بُجھا رہا تھا۔ ہماری آمد کی بھنک پا کر اُس نے ہمیں بھی پیٹ بھر کر رس پینے کو دیا مگر وہ اَنار تو کیا' اَنار کا ایک دانہ بھی دینے پہ تیار نہ ہوا اور نہ ہی اُس نے کسی لالچ یا خوف کا اظہار کیا۔ ہم نے کہا کہ بابا' سینکڑوں پکے اَنار گرمی اور رس کے بوجھ سے پھٹے جا رہے ہیں۔ ایک آدھ دانہ ہی دے دو اور مُنہ مانگے دام حاصل کرو مگر وہ کسی طور پہ ایک اَنار کا چھلکا بھی دینے کو تیار نہ ہوا۔ ہم نے سوچا کہ اُسے ہلاک کر کے تمام اَنار لے کر چل دیتے ہیں مگر اس نے فوراً ہمیں خبردار کر دیا کہ جو کوئی زبردستی کا ارتکاب کر کے انہیں لے جائے گا' وہ سراسر نقصان اُٹھائے گا لہٰذا ہم جگہ کی نشاندہی کر کے آپ کو اطلاع دینے کی خاطر چلے آئے...... شہزادے اور اُس کی محبوبہ نے جب یہ ساری داستان سُنی تو بہت خوش ہوئے' جھٹ پٹ وہ چنڈالہ بولی۔

''میرے شہزادے! فوراً جاؤ اور میرے من کی مُراد لے کر آؤ......''

شہزادہ اپنے مصاحبین کے ساتھ بے آرام و بے تھکان منزلیں مارتا ہوا جب وہاں پہنچا تو بوڑھے

درویش کو اپنے اناروں والے باغیچے میں اس حالت میں پایا کہ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف کھلے پھٹے ہوئے کھائے اناروں چھلکوں کے ڈھیر پٹے پڑے ہیں۔ درویش کے سامنے اب صرف ایک ہی انار پڑا تھا جسے وہ ہاتھ بڑھا کر نچوڑنے ہی والا تھا کہ شہزادہ کمال عُجلت گھوڑے سے کود کر سامنے آ گیا۔ عرض گزاری کہ انار کی جانب رغبت کرنے سے پیشتر میری التجا سُن لی جائے۔ درویش نے ہاتھ روک کر شہزادہ کو بات کرنے کا موقع دیا۔"

''درویش بابا! میرے حرم میں اولادِ نرینہ کی آس بندھی ہے، حاملہ انار کھاتی تو جیتی ہے ورنہ ابکائیاں کرتی کرتی مرتی ہے۔ آپ سے بنتی ہے، یہ آخری انار مجھے دان کر دیں اور اس کے عوض جو چاہیں گے، ہم آپ کے چرنوں میں ارپن کر دیں گے......''

بوڑھے انتہائی لاغر درویش نے کمال بیگانگی اور بے غرضی سے شہزادے اور انار کی جانب دیکھا اور پھر بڑی متانت سے کہا۔

''میں پورا برس اپنے اس اناروں کے باغیچے کی حفاظت اور آبیاری کرتا ہوں، کیڑوں مکوڑوں اور پرندوں، موسموں سے اسے بچاتا ہوں اس لئے کہ یہی انار میری غذا اور میرا مشروب ہیں۔ یہ میرے سامنے دھرا انار میرا آج کا رزق ہے۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اس کا رس بطور مہمانداری تمہیں پیش کردوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ انار تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے دے دوں، یہ میرے طریقے اور اصول کے خلاف ہے......''

شہزادہ ہاتھ باندھ کر بولا۔ ''درویش بابا! مجھے اس رس کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ اس تمری بے چاری کو ہے۔ جس کے پیٹ پڑی بوٹی بھی یہی انار والی مالا جپے ہے۔ آپ تو بہتیرا جانیں ہیں کہ بعض پیٹ پڑی رُوح بوٹیاں تو اپنی میا کو مٹی کنکر، کچا اناج، چونا، کوئلے، کچی کلیجی تک کھلا چٹوا دیتی ہیں۔ ایسی چیزیں کھانے دیکھنے کو جی چاہتا ہے جو دھرتی آکاش پہ نہ ملیں...... بس، بابا! ہم بھی ایسی ہی بپتا جوکھم میں پھنس گئے ہیں۔ ہم پہ دیا کرو......''

بوڑھے درویش نے بڑی بے اعتنائی سے دریافت کیا۔

''حاملہ عورت تمہاری باقاعدہ بیوی ہے یا کوئی لونڈی رکھیل......؟''

شہزادے نے نگاہیں جُھکاتے ہوئے دھیمی سی مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''بابا! وہ بیاہتا استری نہیں لیکن مَن چاہی محبوبہ ہے......''

بوڑھے، لاغر مگر زیرک درویش نے سامنے دھرے ہوئے انار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''نادان بالک! تو عجیب سی کتھا لے کر میرے پاس آیا ہے۔ کیا تو چاہے گا کہ ایک اچنے اور بیٹے پیٹ سے جنم لینے والا تیرا وارث اور کل کا بادشاہ ہو؟...... میرے ہاں کے اناروں کی یہی خاصیت ہے کہ جو کوئی حاملہ کھائے وہ بادشاہ کو جنم دے۔ اسی لئے میں نے یہاں کے سارے انار خود ہی کھا لئے ہیں اور اگر تُو ابھی چند لمحے دیر سے آتا تو یہ انار بھی میں کھا پی چکا ہوتا کیونکہ یہ اس موسم کا آخری دانہ تھا......''

شہزادہ بُوڑھے درویش کی بات سُن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا...... آخر بولا۔

''بابا! کیا کوئی ایسا اُپائے ہے کہ یہ آخری دانہ مجھے مل جائے......؟''

درویش نے تُرنت جواب دیا۔ ''ہاں...... تمہیں میری ایک شرط ماننی پڑے گی۔''

''میں آپ کی ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں......'' شہزادے نے بڑے جوش سے جواب دیا۔

''لیکن وہ شرط تمہیں انار حاصل کرنے سے پہلے پوری کرنی پڑے گی...... شرط یہ ہے کہ وہ عورت ایک مہینہ بھر میرے پاس رہے گی اور یہ انار وہ یہاں آ کر کھائے گی...... اگر تمہیں یہ شرط منظور ہو تو اُس عورت کو یہاں میرے پاس چھوڑ جاؤ......''

شہزادے کی تو سٹی گم ہو گئی۔ وہ عجیب سی قہر بھری نظروں سے درویش کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں چاہوں تو تلوار کے ایک ہی ہاتھ سے تمہارا سر تمہارے پاؤں میں ڈال دوں اور انار اُٹھا کر لے جاؤں مگر تمہارے بڑھاپے اور اپنی ضرورت نے میرے ہاتھ باندھ دیئے ہیں...... ویسے مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم جو دنیا سے منہ موڑے اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہو ایسی گھٹیا شرط سامنے رکھو گے......؟''

درویش نے اُس کے تاؤ بھاؤ سے قطعی بے نیاز رہتے ہوئے جواب دیا۔

''آخر میں بھی تو جانوں کہ میں نے ایسی کون سی گھٹیا یا ان ہونی سی بات کی ہے جو تمہیں ایسی بُری لگی؟...... میں نے تو تمہاری رکھیل کی بات کی ہے جو تمہارے ناجائز بچّے کی ماں بننے والی ہے۔ بیوی اور رکھیل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بیوی کا ایک ہی مالک ہوتا ہے اور رکھیل کا ہر وہ ہو سکتا ہے جو اُسے پہلے والے سے زیادہ سہولتیں اور مال و زر دے سکے۔ بیوی گھر کی چاردیواری میں فروزاں شمع اور آنگن میں چٹکی ہوئی چاندنی کی مانند ہوتی ہے اور طوائف یا رکھیل بالا خانے میں لٹکے ہوئے فانوس اور کُھلے میدان میں چمکتی جھلستی دھوپ...... رکھیل تو وہ ہوتی ہے جسے منہ مانگی قیمت دے کر اپنے پاس رکھا جائے۔ تمہاری رکھیل کو اگر میں تم سے زیادہ مال و دولت دکھاؤں تو تمہیں چھوڑ کر میرے پاس چلی آئے گی جیسے وہ کسی کو چھوڑ کر تمہارے ہاں پہنچ گئی تھی...... ہاں! اگر تمہیں یہ شرط منظور نہ ہو تو تم جا سکتے ہو......''

درویش کی حقیقت آموز مگر بظاہر کڑوی کسیلی باتوں سے کسمسائے ہوئے شہزادے کو ساتھیوں نے کانا پھونسی سے مشورہ دیا کہ اس گستاخ اور بے ادب نام نہاد درویش کو تہ تیغ کرتے ہوئے انار اُٹھا کر واپس چلا جائے۔ شہزادہ انتہائے غضب میں تلوار کھینچ کر درویش کی جانب بڑھا۔ درویش بڑے تحمل و سکون سے انار دبا کر اس کا رس پیتے ہوئے شہزادے سے کہنے لگا۔

''تم مجھے ضرور قتل کرو تاکہ یہ اناروں اور شہزادوں والا سلسلہ ختم ہو...... بیس برس قبل اگر میں تمہارے باپ کو تمہاری ماں کے چاہنے پہ انار نہ دیتا اور تم پیدا نہ ہوتے تو آج مجھے یہ دن بھی دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ تم بادشاہان اور شہزادگان اپنی جائز ناجائز کرتوتوں کو فقیروں کے ہاں دُعاؤں اور آہ و زاری سے جائز کروا لیتے ہو مگر ان کا خمیازہ درویشوں کو بھگتنا پڑتا ہے...... دیر مت کرو' بس ایک ہی وار سے میرا سر تن سے جُدا کر دو......''

شہزادے کو جیسے سانپ سونگھ گیا' وہ تلوار نیام میں واپس رکھتے ہوئے آگے بڑھا اور بولا۔

''بابا! مجھے چھما کرو...... کیا میرے باپ نے بھی......؟''

''ہاں تمہارے باپ نے بھی ایک خوبصورت طوائف کی خاطر اپنے باپ کی حکم عدولی کی تھی۔ باپ کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہوئے اس ناخلف نے راتوں رات اٹھوا کر اپنی راجدھانی سے دُور ایک اندھے کنویں میں پھنکوا دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا' اپنی رکھیل کو ملکہ بنالیا۔ اس کی رکھیل ملکہ بننے کے تین برس بعد حمل سے ہوئی تو اس نے بھی بادشاہ سے انار طلب کیا۔ وہ موسم بھی اناروں کا نہیں تھا۔ اس کے کارندے انار کی تلاش میں یہاں تک آ پہنچے اور مجھ سے انار کے طلبگار ہوئے۔ میں اُس وقت ایک انار ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرے انکار پہ اس کے ایک سپاہی نے تلوار کے وار سے میرا ہاتھ کاٹ دیا اور انار اُٹھا کر لے گئے...... یہ دیکھو میرا بازو......'' درویش نے بازو دکھا کر پھر بات شروع کی...... ''شہزادے! تم وہی میرے انار کی پیدائش ہو۔ آج تم یہ سلسلہ ختم کرو' میرا دوسرا ہاتھ کاٹنے کی بجائے میری گردن تن سے جُدا کر دو تاکہ میں تمہارے بیٹے کو تمہیں کسی اندھے کنویں میں پھینکتا ہوا نہ دیکھوں......''

شہزادے نے گھٹنے زمین پہ ٹیک دیے اور روتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بابا! سچ کہو' تم کون ہو......؟''

درویش نے اُسی بے نیازی سے کہا۔

''شہزادے! پوچھتے ہو تو بتاتا ہوں کہ میں تمہارا دادا ہوں...... کنویں میں گرنے کے بعد میں کسی

نہ کسی طرح باہر نکل آیا‘ سوچا کہ اب کیا زندگی ہے۔ جب اپنی اولاد ہی دُشمن ہو جائے تو پھر کسی اور سے کیا وفا کی اُمید؟...... حال حُلیہ تبدیل کیا اور یہاں پہاڑ کے دامن کو جائے پناہ جان کر بیٹھ گیا۔ پتھر کاٹ کر کچھ زمین ہموار کی۔ خدا نے میرے رزق کا سبب بنایا۔ اللہ کی قدرت سے اَنار کی بیل پھوٹ پڑی‘ اسی دھیان لگ گیا۔ دن رات محنت کی‘ خونِ جگر سے اس کی سینچائی کی۔ انتظار کیا‘ پھر اللہ کی مہربانی سے ایسی برکت اُتری‘ ایسے اَنار پھوٹ پڑے جو روئے زمین پہ کہیں اور نہ ہوں۔ پھر بے موسے‘ دُنیا میں کہیں اَنار نہ ہو تو اِدھر مل جاتا تھا...... خیر‘ چھوڑ ان بیتی باتوں کو‘ تو بھی تلوار اُٹھا اور کاٹ میرا دوسرا ہاتھ اور لے جا یہ بچا کھچا اَنار تاکہ تیری رکھیل تیرا بچہ جنے اور تو بھی کل کلاں اسی انجام کو پہنچے جس کو تیرا باپ بھگت رہا ہے......"

شہزادہ کی بدبختی کی بند رَگ کُھل گئی۔ وہ تلوار پھینک کر دادا کے قدموں سے لپٹ گیا اور اپنی نادانی کی معافی چاہنے لگا۔

یہ اَنار والی بات جو میرے متعدی بخار اور یرقان کے علاج کے لئے کسی گوجری نے میری ماں جی سے کی تھی کہ خوب پکا ہوا سُرخ اَنار رات گرم بھوبھل میں دبا کر رکھ دو‘ صبح اس کا رس نچوڑ لو اور اس میں پسا ہوا سفید زیرہ ملا کر اسے پلا دو۔ اس کی بھوک فوراً کُھل جائے گی اور کمزوری یرقان وغیرہ بھی دُرست ہو جائیں [illegible] مجھے بھی [illegible] بھولی ہوئی نعمت یاد آ گئی تھی‘ اب بے تحاشا اَنار چوسنے کو جی چاہنے لگا لیکن وہی بات کہ کابل قندھار تک کہیں اَنار کا نام و نشان تک نہ تھا‘ ابھی تو شگوفے ہی پھوٹے تھے۔ ماں جی طرح طرح کی چیزیں میرے لئے بناتیں مگر میری ایک ہی رٹ کہ کھاؤں گا تو اَنار ہی کھاؤں گا۔ اگر زبردستی ایک آدھ لقمہ لیتا بھی تو اگلے ہی لمحے باہر نکل آتا۔ اب ماں جی بیزار ہو گئیں‘ بولیں۔

"کاکا! مَیں تمہیں اَنار کہاں سے منگوا کر دوں......؟" پھر خود بخود ہی اُن کے مُنہ سے نکل گیا۔

"جا‘ اپنے میاں جی سے کہہ کہ وہ تمہیں کہیں سے اَنار منگوا کر دیں...... سیب بھی تو اُنہوں نے تمہیں کھلایا تھا۔"

کئی روز میرے اس بیماری کی کشاکش میں بیت گئے تھے‘ اُن کا نام سُنتے ہی جیسے میرے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کہاں مَیں کہ غسل خانے تک جانے سے بدکوں کہ کھڑا ہوتا ہوں تو چکر سے آنے لگتے ہیں‘ کہاں اب کہ مَیں اُن کا نام سُنتے ہی جھٹ چپل پہن کر اُنہیں ملنے کے لئے تیار ہو لیا...... ماں جی نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"خبردار جو ابھی کہیں باہر نکلا...... کمزوری سے بات تک تو ہو نہیں رہی‘ اُن کا نام سُنتے ہی جھٹ

کمزور کرتیار ہو گیا ہے......'' وہ میرے آگے دلیہ اور دودھ رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''پہلے یہ کھاؤ' پھر باہر نکلنے کا نام لینا......''

اسی دوران میرا دوست اسلم میری خبر گیری کے لئے آ نکلا' وہ میری ماں جی سے کہنے لگا۔

''ماسی' یہ کام آپ میرے سپرد کریں...... دیکھیں' میں اسے کیسے کھلاتا ہوں''...... ماں جی اندر چلی گئیں تو وہ کہنے لگا۔ ''جلدی سے دو چار چمچ کھالو' میں تمہیں لینے آیا ہوں...... آج رنگ پورے کی ٹیم سے ہمارا میچ ہے......''

''مگر میں تو بیمار ہوں...... میری حالت دیکھئے' دو قدم تک تو مجھ سے چلا نہیں جاتا' فیلڈنگ کیا کروں گا......؟''

''تم پہلے کون سی فیلڈنگ کرتے ہو...... گیند اگر میاں جی کے ڈیرے گر گیا تو اسے کون لائے گا...... چلو' آدھا دلیہ میں کھاتا ہوں اور باقی تم کھالو......''

جمعہ کی نماز کے بعد دو ٹیمیں میاں جی کے ڈیرے کے باہر' جوہڑ کنارے جمع ہو گئیں۔ ٹاس رنگپورے کی ٹیم نے جیتا تھا۔ میں حسبِ معمول اپنی جگہ پہ کھڑا تھا' کھڑا کیا تھا بلکہ بیٹھا ہوا تھا۔ بادلِ نخواستہ اگر [illegible] جاتا۔ میری کمزور کارکردگی اور بیماری دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے ریٹائر کر کے وہیں بٹھا بلکہ لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبا ہی چھکا پڑا اور گیند اُڑتی ہوئی احاطہ گیلانیاں یعنی میاں جی کے ڈیرے جا گری۔ اب وہاں سے کون لائے؟ مجھے معذور سمجھتے ہوئے کیپٹن صاحب خود ہی چارو ناچار دروازے تک گئے۔ دروازہ بند تھا' ایک آدھ بار کھٹکھٹایا بھی مگر جواب ندارد۔ واپس آ گئے۔ نئی گیند ڈال لی گئی...... میں بھی گھاس پہ لیٹے لیٹے یہ ساری کارروائی سونگھ رہا تھا۔ پیاس سی محسوس ہوئی' ذرا دور سامنے چوک میں دستی پمپ لگا ہوا تھا یا پھر میاں جی کا ڈیرا تھا' کسی اور تیسری جگہ پینے کا پانی میسر نہ تھا۔ میچ ویچ کا تو محض بہانہ تھا' آیا تو میں یہاں میاں جی کی دید کے لئے تھا اور مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ جمعہ کے روز میاں جی پیر بہاول شہیدؒ کی مسجد میں نماز ادا کر کے واپس ڈیرے پر پہنچ جاتے ہیں' شہر کا راؤنڈ نہیں لگاتے یعنی جمعہ کے روز اُن کی بھی چھٹی ہوتی ہے۔ میری نگاہیں اِدھر پیر بہاول شہیدؒ والے راستے پہ لگی ہوئی تھیں۔ ابھی تک انہیں نماز سے فارغ ہو کر واپس آ جانا چاہئے تھا' میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک اور چھکا لگا اور دوسری گیند بھی دیوار کے اندر جا گری۔ کیپٹن اور ایک کھلاڑی پھر دروازے پہ پہنچے' دستکیں دینے کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو وہ دونوں میرے پاس آئے اور دیوار پھلانگنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے انہیں منع کیا کہ یہ حرکت نہ کرنا' تمہارے

حق میں بہتر ہوگا۔ وہ کہنے لگے کہ پھر تم جاؤ' دروازہ کھلواؤ یا دیوار پھاندو' ہمیں گیندیں لا کر دو۔

''اچھا' میرا ہاتھ پکڑو اور مجھے اُٹھاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ میاں جی کدھر ہیں''...... میں نے انہیں کہا۔ ''تم لوگ تیسری گیند سے کھیلو' جب تک میں گیندیں لانے کی کوئی ترکیب سوچتا ہوں......''

وہ مجھے ہلکا سا سہارا دیئے ہوئے دروازے تک لائے۔ میں نے دروازے کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھ میں کھڑا ہونے کی ہمت نہیں...... تم لوگ پھر دروازہ کھٹکھٹاؤ' ہوسکتا ہے کہ میاں جی پہلے نماز پڑھ رہے ہوں......''

اُنہوں نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا مگر جواب ندارد۔ وہ مجھے دروازے کے سامنے بیٹھا چھوڑ کر واپس گراؤنڈ میں چلے گئے۔ ادھر پیاس نے حلق میں کانٹے سے ڈال دیئے تھے۔ ہونٹ خشک' زبان لکڑ۔ ناچار اُٹھا' دروازے کے پاس آیا۔ ہاتھ لگایا تو دروازے کا پٹ یوں کھل گیا۔ جیسے دروازہ میرے ہاتھ لگانے کا انتظار کر رہا ہو۔ میں نے اِک نظر گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے لڑکوں پہ ڈالی اور خاموشی سے دہلیز الانگ کر اندر داخل ہوگیا۔ دروازے کا پٹ بھیڑتے ہوئے میں سامنے چبوترے کی جانب چل دیا اور آہستہ آہستہ [illegible] پہلے دن والی جگہ پہ کھڑا ہوگیا...... ''السلام علیکم' میاں جی......!'' کہتے ہی مجھے ''وعلیکم السلام'' کا جاں فزا جواب موصول ہوگیا۔ چند لمحے توقف کے بعد حکم ہوا کہ سرہانے والی سیڑھیوں کے دیکھے بھالے راستے سے نیچے چلے آؤ۔ نیچے جانے والی پہلی سیڑھی پہ قدم دھرتے ہی اِک رُوح کو تروتازہ کر دینے والی بھینی بھینی خوشبو نے میرا استقبال کیا۔ دوسرا' تیسرا اور چوتھا' پھر پانچویں قدم کے بعد جیسے میں کسی ایسی جگہ پہ آ گیا جو کسی کے نُور کے ظہور سے بقعہ نُور بنی ہوئی ہو۔ داخلے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس کے ذریعے میں آج دوسری مرتبہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ کوئی روزن اور نہ کوئی کھڑکی' بس ایک گول سا نیچی چھت والا کمرا جس کے درمیان نہ جانے کب سے ایک عام سی قبر کھدی ہوئی تھی' جس کی پائنتی کی جانب تین چار بے ڈھبی سی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو شاید اس مقصد کے لئے تھیں کہ قبر میں آسانی سے اُترا اور باہر نکلا جا سکے۔ نیچے سیڑھیاں اُترتے ہی مجھے میاں جی قبر میں بیٹھے ہوئے دِکھائی دیئے' بیٹھے ہوئے بھی وہ یوں تھے کہ بیڑیوں میں جکڑے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے اور گلے شانوں پہ بھاری زنجیریں دائیں بائیں لٹکی ہوئی تھیں۔ دو قدم اور قریب آیا' غور سے دیکھا تو وہ قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے اور قرآن مجید یکجا کر کے جھولی میں رکھ لیا۔ میں اپنے قدموں پہ بیٹھ چکا تھا۔

''وہاں مت بیٹھو...... آؤ، نیچے آ کر میرے پاس بیٹھو......''

اُنہوں نے بالکل ایسے ہی انداز میں کہا جیسے کوئی کسی کو کہے کہ ارے نیچے مت بیٹھو! ادھر میرے پاس صوفے پہ بیٹھو اور میں بھی یوں شوق سے اُٹھ کر اُن کے قدموں کی طرف قبر میں جا بیٹھا جیسے کوئی بالک پہلی بار گھوڑے یا موٹر میں بیٹھتا ہے' بیٹھا بیٹھا میں اُن کے بیڑیوں میں جکڑے ہوئے پاؤں کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا' خوف نہ ڈر...... قبر تو قبر ہوتی ہے۔ کھلی ہو یا بند' مُردے والی یا زندوں والی۔

''اُٹھو...... تمہیں پیاس لگی تھی' میں نے تمہاری پیاس کا پہلے ہی انتظام کر کے رکھا ہوا ہے......''

قبر میں قریب دھرا کپڑے سے ڈھکا ہوا ایک مٹی کا پیالہ وہ مجھے دکھا رہے تھے۔ تازہ سُرخ اَناروں کا کھٹا میٹھا ٹھنڈا رس تھا۔ معاً مجھے ایک فقیر کی صدا یاد آ گئی...... ''پی پیالہ صبر دا' کوئی نہ ساتھی قبر دا'' لیکن مجھے اس فقیر کی یہ صدا آج کچھ دیگر معنوں میں بھٹکی ہوئی سی لگی۔ یہاں تو سب کچھ اُلٹ ہے یعنی چاروں چیزیں ہی موجود ہیں۔ صبر بھی' قبر بھی' ساتھ دینے والا بھی اور پیالہ بھی...... بیڑیوں والے پیارے ہوئے پاؤں کے اُوپر سے اُنہوں نے مجھے پیالہ بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

''لو بسم اللہ...... پیاس بُجھاؤ۔''

یخ بستہ [illegible] کی حلاوت وطراوت میں رچا بسا' پیالہ جب جُرعہ جُرعہ تمام ہوا تو فصیلِ جاں میں اِک تازگی و توانائی کا خوشگوار سا احساس بیدار ہوا' کسلمندی اور تھکی جیسے منہ چھپا کر کہیں عنقا ہو گئی۔ مجھے ہشاش اور سُرخ رُو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے' ارشاد فرمایا۔

''مَیں نے چند موٹے موٹے سُرخ' خوب شیریں رَس سے بھرے ہوئے اَنار تمہارے لئے رکھے ہوئے ہیں' شرط صرف یہ ہے کہ انہیں تم یہیں آ کر کھا سکتے ہو۔ یہ گھر لے جانے والی چیز نہیں ہیں......''

پھر خود ہی پاس پڑی گُدڑی سے' ایک بڑا سا اَنار نکالا۔ ایسا اَنار کم از کم مَیں نے اس سے پہلے نہ کبھی دیکھا تھا اور کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سُرخ اور ایسا سڈول صحت مند کہ اگر اِسے فوراً کھانے کے لئے کھولا نہ گیا تو یہ ''وفورِ شباب'' سے خود ہی پھٹ جائے گا۔ وہ مٹی کی ایک رکابی میں سُرخ یاقوتوں کے تراشیدہ دانے ڈالنے لگے' چوتھائی اَنار کھولنے سے ہی رکابی بھرپور ہو گئی۔

''بسم اللہ' کھاؤ......''

مَیں مٹھی بھرتا اور غڑپ مُنہ میں ڈال لیتا۔ مجھے اَنار کھانے میں ایسا ''اُبا بڑا'' پڑا ہوا تھا کہ میاں

جی بجائے ڈانٹنے کے خوش ہو رہے تھے۔

''خوب جی بھر کر کھاؤ...... انار ہی کھانا چاہ رہے تھے نا......!''

آدھا انار ہی کھایا ہوگا کہ پیٹ جواب دے گیا' یوں لگا جیسے ڈھیر سارے انار ہڑپ کر لئے ہوں۔ ہاتھ' مُنہ' ناک' حتیٰ کہ قمیض تک سُرخ عنابی رَس کی رنگت سے داغ داغ ہو گئی۔

''بس......'' میرے مُنہ سے خود ہی نکل گیا۔

میاں جی نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ روک لیا' فرمایا۔

''اچھا' ٹھیک ہے۔ باقی آدھا میں کھا لوں گا......'' پھر وہ مجھے دونوں گیند دیتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''اب بھاگ جاؤ' ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے......''

میں گیندیں لے کر اُٹھنے ہی والا تھا کہ ''ٹھک'' سی آواز آئی اور کہنے لگے۔

''ذرا رُکو' تیسری گیند بھی لیتے جاؤ......'' وہ ذرا توقف سے قبر کے سرہانے کی طرف سے گیند اُٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ''کبھی مجھے بھی کرکٹ کھیلنا بہت پسند تھا' میں بھی یونہی چوکے چھکے لگایا کرتا تھا......''

میں [illegible] تھا میں تو اِس سارے کو سمجھنے کی کوشش میں پھنسا ہوا تھا کہ یہاں تہہ خانے میں باہر کہیں گیند گرنے کی آواز کیسے آئی اور گیند گرنے کے اگلے چند لمحوں میں گیند تہہ خانے کی قبر میں کیسے پہنچ گئی اور بے موسے اناروں والا گورکھ دھندا بھی ہنوز حل طلب تھا' اور بھی کئی باتیں کہ صرف میرے ہی ہاتھ لگانے سے بند دروازہ کُھل جاتا ہے۔ چبوترے پہ ''السلام علیکم'' کہنے کے فوراً بعد ہی وعلیکم السلام کا جواب مل جاتا ہے۔ میاں جی اگر نیچے تہہ خانے کی قبر میں ہوتے ہیں تو اُنہیں اوپر کسی کے آنے کی خبر اور اُس کے سلام کی آواز کیسے پہنچ جاتی ہے اور پھر اُن کا جواب اوپر کیسے سُنائی دیتا ہے؟ یہ بہت سے سوالات تھے جو میں اُن سے کرنا چاہتا تھا مگر شاید کوئی مناسب وقت نہیں مل رہا تھا یا پھر میری ہی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے کافی دیر متردّد اور خاموش پا کر وہ بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور شاید انہوں نے میری سوچ و بچار اور دماغ کو پڑھ لیا تھا۔ قبر کی دائیں بائیں دونوں دیواروں پہ دونوں ہاتھ جما کر وہ بصد مشکل اُٹھتے ہوئے بولے۔

''بیٹا! ننھے سے دماغ پہ اتنا بوجھ نہیں ڈالتے' دھیرے دھیرے سب کچھ سمجھ جاؤ گے...... سمجھتے تو کچھ ابھی بھی ہو مگر ساتھ دلیل اور وجہ وقوع بھی جاننا چاہتے ہو مگر یہ تو کسی مناسب وقت پہ سمجھ میں آئے گی اور وہ وقت ابھی بہت دُور ہے......'' وہ مجھے ساتھ لے کر قبر سے باہر نکل آئے' لب گور کھڑے ہو کر فرمانے

لگے۔ ''یہ مُشتِ خاک اِنسان صرف اِسی خاکِ قبر میں ہی آسودۂ خاطر ہوتا ہے۔ دُنیا کا طمع' لالچ' حرص' اقتدار اور خواہشات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے وسیع و عریض دُنیا کو اس کے لئے بہت تنگ و تاریک' حبس زدہ اور چھوٹا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی نا آسودہ تمناؤں اور طمع و حرص کے کمزور جال قابلِ ہضم و حصول مچھلیوں کی بجائے دیوہیکل وہیلوں پہ پھینکنا شروع کر دیتا ہے۔ بس' یہیں اس کا اَنت سَرادھ ہو جاتا ہے اور جو شروع سے ہی آرزوؤں' خواہشوں' آسائیوں اور ہوس کے آزار میں خود کو نہیں پھنساتا' دُنیا کو امتحان گاہ اور چند سانسوں کی عارضی زندگی کو کسی کی امانت سمجھتا ہے تو وہ پھر اپنے جسم اور اپنی رُوح کو مادر پدر آزاد اور اپنی مرضی کا مالک نہیں رہنے دیتا۔ وہ مجاہدوں' مشاہدوں' مراقبوں اور محاسبوں مشکلوں سے اپنے آپ کو اِس قابل بناتا ہے کہ خالقِ جِن و بشر' مالکِ اَرض و سما اِس سے راضی ہو جائے۔ یہ میرے جسم پہ لدی وزنی' بے رحم زنجیریں میرے بدن کو اللہ کے احکام میں جکڑ کر رکھتی ہیں اور مجھے احساس دلاتی ہیں کہ مَیں محض قفسِ ہستی میں اَسیر قیدی ہوں۔ یہ میرے پاؤں پڑی بیڑیاں مجھے بے راہروی سے روکتی ہیں۔ یہ کھدی ہوئی تیار قبر جس میں بیٹھتا اور سوتا ہوں' لیٹ کر راحت پاتا ہوں' مجھے ہمیشہ یاد دلاتی ہے کہ آخر مجھے یہیں آسودۂ خاک ہونا ہے...... پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی محنت ادا کر دینا' مقررہ وقت سے پہلے ہی وعدہ وفا کر دینا' اولاد کے بدراہ ہونے سے پہلے اِن کا نکاح کر دینا اور مرنے سے پہلے اپنی لحد تیار کر لینا اِن لوگوں کا کام ہے جو متقی ہیں' اللہ سے حیا کرتے ہیں......''

زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ تینوں گیند سنبھالے جب میں باہر نکلا تو پوری ٹیم سامنے کھڑی تھی...... کیپٹن بولا۔

''یار! تم اندر ہی سو گئے تھے' ہم کب سے باہر کھڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں......؟'' گیند لیتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ ''یہ کیا...... تم پیلے ڈڈو اندر گئے تھے اور کھلتے ہوئے سُرخ گلاب کی مانند مہکتے ہوئے باہر آئے ہو۔ تمہارا منہ' چہرہ' ہاتھ اور کپڑے...... اندر میاں جی سے کوئی شربت پیتے رہے ہو؟''

جب مَیں نے بڑے فخر سے بتایا کہ میاں جی نے مجھے ایسے بڑے بڑے سُرخ رسیلے دانوں والے اَنار کھلائے ہیں تو سب نے مل کر میری ہنسی اُڑائی بلکہ اُلٹا مجھے اِس صدی کا سب سے بڑا جھوٹا اور گپی کہا۔ یہی حال میرا گھر پہ ہوا' میری بات پہ کسی کو یقین نہ آیا لیکن قمیض پہ پڑے عنابی دھبوں کو ماں جی نے غور سے دیکھا تو آنکھیں پھیلا کر بولیں کہ یہ تو واقعی اَنار کے رس کے دھبے ہیں...... میری' میاں جی اور اَنار کی خوب چرچا ہوئی۔ مَیں نے میاں جی کے بارے میں تمام باتیں بڑھا چڑھا کر سُنائی تھیں۔ گیندوں کا قبر میں خود بخود پہنچنا' میرا دروازے پر ہاتھ دھرتے ہی کھل جانا' کھلی قبر کی ساری تفصیل

اور قبر میں لیٹنے کے بارے میں بھی بتایا۔ اس کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ میرا میاں جی کے ہاں جانا یکسر موقوف ٹھہرا بلکہ کرکٹ کھیلنا تک سختی سے بند کر دیا گیا...... چھوٹے بڑے میاں جی کے سب ہی عقیدت مند تھے۔ اُن سے دُعا سلام پہ بھی کسی کو اعتراض نہ ہوتا لیکن وہ جو میں نے کُھدی قبر والا قصہ بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا تھا' بس اسی سے گھر والے ڈر گئے۔ اُن کی اپنی جگہ پہ سوچ کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ اکلوتا بچہ' وہ بھی بڑھاپے میں درویشوں اور اللہ کے نیک بندوں کی سفارشوں اور دُعاؤں سے اللہ سے لیا ہوا' ایسی جگہ پہ کوئی ماں باپ یہ نہیں چاہے گا کہ ہنسنے کھیلنے کے دنوں میں اُن کا بچہ کُھلی قبروں میں جا کر لیٹے۔ میں بعد میں پچھتایا کہ یہ قبر والی بات سب کو بتا کر میں نے سنگین حماقت کا ارتکاب کیا ہے بلکہ مجھے تو کچھ بھی بتانا نہیں چاہئے تھا۔ اسی لئے تو ایسے خارق العادت اور ماورائے فطرت مشاہدات' مظاہرات اور تصرفات پردۂ اخفا میں رکھے جاتے ہیں کہ ہم تم انہیں دیکھنے سمجھنے برداشت اور ہضم کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ زندگی اور اس کے بندھے اصولوں' سلسلوں اور عام روزمرہ کے عوامل و عواقب میں خلل واقع ہوتا ہے...... غلطی سرزد ہو چکی تھی' اب لکیر کو پیٹنا بیکار تھا لیکن آئندہ احتیاط کا مصمم ارادہ تھا۔

میاں جی نے اس چند روزہ عارضی زندگی کی جو تصویر کشی کی اور اپنے سرکش نفس' خواہشات' طمع اور حرص و ہوا کو اعتدال و قابو میں رکھنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا اس کی بازگشت ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ قبر میں بیٹھنے اور تھوڑا سا لیٹنے کے تجربے مشاہدے نے جیسے مجھے جینے مرنے کی اک نئی جہت سے روشناس کرا دیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جو کھیل پہلے جھیل لو' جھنجھٹ ختم ہو جائے گا۔ انجام کے خیر پہ ہمیشہ نظر رکھو تو دائمی عزت' فلاح اور فرحت ملے گی۔ آخری یقینی جیت کے لئے ساری عمر مسلسل ہارنا پڑے تو ہارتے جاؤ۔ مشقت' بوجھ' تکلیفیں اُٹھاؤ کہ تم کل کی دائمی راحت کے لئے تیار ہو سکو۔

اس رات کئی روز نیچے دالان میں سونے کے بعد میں اوپر کوٹھے پہ کُھلے آسمان تلے سونے پہ اصرار کر رہا تھا۔ ماں جی نے سمجھایا کہ ابھی تو تیری کمزوری نہیں ٹوٹی۔ اوپر اوس کھا جائے گا' خدا نہ کرے کہ پھر بیمار پڑ جاؤ۔ بہتر ہے کہ تم نیچے دالان میں ہی سو جاؤ مگر میں ضد کر کے اوپر کوٹھے پہ چڑھ گیا......
دراصل میری عجیب سی کیفیت تھی' رہ رہ کر میاں جی' زنجیریں' بیڑیاں اور قبر کی جانب دھیان بٹ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ آج میرے اردگرد دُور دُور تک کوئی بھی ذی نفس موجود نہ ہو' میں خود سے بھی تنہا ہونا چاہ رہا تھا۔ اکیلا ہو کر یہ محسوس کرنا چاہتا تھا کہ قبر کی تنہائی کیا ہوتی ہے' کیسی ہوتی ہے۔ اس کی تنگی' تاریکی' ٹھنڈی سختی ایک جیتے جاگتے انسان کے دل و دماغ کے خیالات و احساسات پہ کیا کیا اثرات مرتب کرتی

ہے۔ کیا یہ بوسیدہ جسم کو ٹھکانے لگانے کے لئے محض ایک گڑھا ہوتی ہے یا پھر اَرواح کے عالمِ برزخ کی طرح یہ بھی مُردہ اجزائے اجسام کا ازقسم برزخ ہوتی ہے؟...... ستاروں بھرے کھلے آسمان تلے میں بازو کے تکیے پہ سر ٹکائے لیٹ گیا۔ کسی گورستان کی طرح بڑی ڈراؤنی سی خاموشی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی' ہوا بھی جیسے کسی کے ''دمِ آخریں'' کی مانند ساکت تھی۔ کوئی دم جاتا ہے کہ میں عالمِ غنود میں اُتر گیا۔ دُنیا میرے اردگرد چاردیواری کی صورت سمٹتی آ رہی تھی۔ پھر جیسے قبر جیسی لمبائی چوڑائی میں پہنچ کر رُک سی گئی کہ بازو ذرا کھولوں تو دیواروں سے لگیں اور پاؤں پنجے' سر اکڑاؤں تو بھی دیواروں سے بھڑیں۔ پھر جیسے میں قد آدم نیچے دھنس گیا۔ آنکھیں وا' شعور ہوشیار' حواس بھٹکتے ہوئے۔ میں قبر میں لیٹا ہوا دو گز اوپر مستطیل چوکھٹے سے سیاہ مخمل پہ ٹکے جھلملاتے ہوئے ننھے ننھے ستارے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھر جیسے سوائے قبر کے باقی سارا منظر ہی بدل گیا۔ وہی میاں جی کی کھلی قبر والا تہہ خانہ' وہی قبر۔ کبھی میاں جی لیٹے ہوتے ہیں اور کبھی میں قبر میں پڑا ہوا دکھائی دیتا ہوں...... ساری رات یہی اَدل بَدل ہوتا رہا۔ علی الصبح ماں جی میرے اوپر جھکی ہوئی تھیں' بخار سے میرا جسم پھنک رہا تھا۔ اللہ جانے وہ کس طرح سے مجھے نیچے اُتار کر لائی تھیں...... پھر مجھے ہلکا سا ہوش آیا تو ماں جی میرے ماتھے پہ برف کی پٹیاں رکھ رہی تھیں' ایک دو ہمسائیاں بھی پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک بات پہ سب متفق تھے کہ میں میاں جی کے ڈیرے جا کر ''ڈر'' گیا ہوں اور یہ سارا بخار و خار وہاں پہ جانے کا شاخسانہ ہے۔ ایک ہمسائی کالی مرچیں میرے سر سے وار کر دہکتے ہوئے کوئلوں پہ ڈال رہی تھی' دوسری کچھ پڑھتے ہوئے پھونکیں مارتی جا رہی تھی۔ مجھے ذرا آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دیکھ کر ماں جی بولیں۔

''کاکا' ہوش کر پُتر!...... لے' ذرا شربت کا گھونٹ پی......'' وہ گلاس میرے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگیں...... ''کہا تھا' اوپر اکیلا اوس میں نہ سو۔ دیکھ لے' ایک سو دو بخار ہے......''

میں نے شربت کا گلاس پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ نہیں پیوں گا' مجھے صرف اُتار......''

اُتار والی بات ابھی آدھی میرے مُنہ میں تھی کہ ایک بچہ بھاگا بھاگا اندر آیا۔

''ماسی' ماسی...... باہر سنگاں والے میاں جی کھڑے ہیں' وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے کاکے سے ملنا ہے......''

میں یوں اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے مجھے کسی نے بجلی کا تار چھوا دیا ہو' چارپائی سے نیچے اُترنے لگا تو ماں جی نے منع کر دیا۔ وہ ہمسائیوں کو لے کر باورچی خانے میں چلی گئیں اور وہ بچہ' میاں جی کو لے کر اندر آ گیا۔ پہلے خوشبو آئی' پھر پاؤں کی ''پائلوں'' سے جھن جھنا جھن کی جھنکار آئی۔ وہ جانِ بہار آیا جس نے

شب بھر مجھے مراقبۂ الموت کا اسرار سکھایا۔

صاحبو! یہ سب کچھ سُنانا اس لئے مقصود ٹھہرا تھا کہ مَیں صرف یہ عرض کر سکوں کہ قبرستان' اندھی کھلی قبریں' مقبرے' مزار' معبد و مینار میرے لئے اجنبی نہیں تھے بلکہ بچپن ہی سے میرا ان سے واسطہ اور رابطہ تھا۔

- تماشا بن جاتے ہیں تماشا دیکھنے والے......!

مَیں ایک بار پھر آپ کو وہیں اسپین میں' سمندر کے کنارے اس پُراسرار ہیبت ناک' صدیوں پرانے روشنی کے مینار تلے لئے چلتا ہوں جو کہ سمندر سے اونچے کنارے پر واقع تھا۔ یہاں سے آگے کھلا چٹیل میدانی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ٹیلے' ٹبے بھی نظر آتے تھے۔ دُور دُور وسیع و عریض مرغزار' کھیت باڑے' اونچے نیچے راستے' گھاس پھونس کے ذخیرے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوبصورت سرسبز علاقہ جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ شاید یہاں کبھی کوئی سنگراتی کوئی بستی رہی ہو بوڑھے مینار کے سائے میں کھڑے اردگرد دُور تک نظر دوڑائیں تو یہی محسوس ہوتا تھا۔ بڑی بڑی چار دیواریوں کی اُدھڑی ہوئی شکستہ دیواریں' بڑے بڑے تعمیراتی پتھر' ہموار قطعے' کھدی ہوئی آب زویں۔ بے شمار شواہد یہی بتاتے تھے کہ یہ کوئی آفت زدہ علاقہ ہے۔ یہاں کے وسنیک یا تو کسی وباء سے مر کھپ گئے یا پھر انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا یا پھر وہ کہیں اور ہجرت کر جانے پہ مجبور کر دیئے گئے۔

سمندر کنارے ایسا خوبصورت لینڈ اسکیپ جہاں صناعِ فطرت نے حُسن و جمال کے تمام تر خوبصورت رنگ بڑی فیاضی سے بکھیرے ہوئے تھے۔ خوشگوار آب و ہوا' دلفریب نظارے۔ تاحدِ نظر سمندر' کھلا نیلا آسمان اور بلند و بالا فنِ تعمیر کے کمال و جمال کا نادر نمونہ یہ روشنی کا مینار' صدیاں گزرنے کے باوجود جس کے وقار' استادگی اور حُسنِ نظارگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تھا۔ چاندنی نکھر کر بڑی پُرجمال ہو گئی تھی۔ اندھیروں کے خوگر اور چاندنی کے چاہنے والے ہی جانتے ہیں کہ ان ہر دو کے جادو کیسے سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ شبِ تار کی کالی ناگن کیسے مست ہو ہو کر ڈستی ہے اور اُدھر چاند کی چھم چھم کرتی ہوئی نقرئی چاندنی کی چھپا چھپائی دِل و نگاہ میں کیسی کیسی چکا چوندی جگاتی ہے...... مَیں بھول ہی گیا کہ مَیں کون ہوں' یہاں کیوں ہوں۔ انجانی جگہ' بیگانہ ملک۔ یہ وقت بے وقتی اور وہ دو سائے جو بہر طور انسان دکھائی دیتے تھے' کون تھے جو میری سُن گن پا کر غائب ہو گئے...... کسی مزید بکھیڑے میں پڑنے سے پہلے مَیں

نے نماز سے فارغ ہو جانا مناسب سمجھا' وہیں چادر بچھا کر ربّ العزت کے حضور کھڑا ہو گیا اور دُعا کی کہ اے باری تعالیٰ! مجھ عاجز گنہگار کو اپنے کرم وفضل کی سائے میں رکھیو۔ میری رہبری و دستگیری فرمائیو...... شرِّ شرار' شیطان' شرک اور شامت سے محفوظ رکھیو' آمین!

فلاسک سے آدھا کپ کافی انڈیلی اور دو کریکر بسکٹ لئے۔ ہلکا سا پیٹ آسرا کر کے میں اللہ کا نام لے کر نیچے اُتر آیا۔ پن ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی' احتیاط سے قدم جماتا ہوا میں سیڑھیاں اُتر رہا تھا' پوری آٹھ سیڑھیوں کے آگے ایک پتلی سی راہداری آ گئی۔ دائیں بائیں دونوں اطراف کہیں تاریکی میں گم ہو گئی تھیں۔ یہاں اس ''ٹی جنکشن'' پہ کھڑا اب میں سوچ میں پڑ گیا کہ کدھر جاؤں؟ دونوں طرف راہداری ہی تھی۔ ٹارچ کو فوکس کر کے پہلے دائیں جانب دیکھا' پھر بائیں جانب۔ وہی خودرو گھاس پھونس' کنکر پتھر' آگے راہداری گول سے چکر میں مڑتی ہوئی نظر آئی۔ دائیں جانب یوں دکھائی دیتا تھا کہ راستہ قدرے صاف اور استعمال شدہ ہے' اگر نہ بھی ہوتا تو میں اپنے اصول طریقے کے مطابق اپنے سیدھے ہاتھ ہی چلنے پہ ترجیح دیتا۔ دائیں جانب بڑھنے سے پیشتر میں نے قدرے بلند آواز میں ''ہیلو' یہاں کوئی ہے' کوئی میری آواز سُن رہا ہے''۔ دو مرتبہ کہا مگر میری آواز ہی گھوم پھر کر مجھ تک واپس آ گئی۔ اب میں ٹارچ روشن کئے قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ پہرہ داروں کی غلاظت کا تعفن سا محسوس ہوا لیکن گھٹن نہیں تھی' صاف ہوا موجود تھی۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا' مجھے محسوس ہوا کہ راہداری تنگ ہوتی ہوئی گولائی کی صورت میں ڈھلوان ہوتی جا رہی ہے' یعنی راہداری اسپرنگ کی شکل میں نیچے کی جانب اُتر رہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ بائیں جانب والی راہداری' مینار کے اوپر جاتی ہو گی...... میرا خیال ہے' میں نے گولائی میں دو چکر ہی پورے کئے ہوں گے کہ مجھے کھُسر پھُسر اور کسی کے چلنے گھسٹنے کی ہلکی سی آواز سُنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے آگے کوئی اور بھی ہے۔ ایک چکر اور پورا ہوا تو قدرے روشنی اور سمندر کی تازہ بھیگی ہوئی ہوا نے مجھے مزید ہوشیار کر دیا۔ اب شاید مجھے ٹارچ کی روشنی کی ضرورت نہیں رہی تھی' اگلے ہی چکر کے اختتام پہ ایک بڑا سا غار نما کمرا سامنے تھا۔ سمندر کی جانب کھُلتی ہوئی دو بڑی سی گول پتھریلی کھڑکیاں تھیں جن پہ زنگ آلودہ آہنی قبضے اور زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ان کھڑکیوں کے درمیان ایک پتھریلی چوکھٹ بھی تھی جس کے باہر قریباً پندرہ بیس فٹ آگے سمندر کی جانب لوہے اور لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا جس کے لکڑی کے تختے اور پشتے ٹوٹ چکے تھے اور اس کا کچھ حصہ ٹوٹ پھوٹ کر نیچے لٹکا ہوا تھا۔ میں اس بے پٹ کی چوکھٹ کے پاس آ کر رُک گیا۔

آگے سامنے سمندر تھا' جو ابھی بھی بہت نیچے تھا۔ اندازہ ہوا کہ ابھی ایک آدھ اور منزل نیچے بھی ہو سکتی ہے۔ حیرانی بھی ہوئی کہ میرے آگے گھسٹ کر چلنے والے یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں' میں نے کمرے کی بغل میں ایک اور راستہ کھوج لیا جو یقیناً نیچے جاتا ہوگا اور وہ دو سائے بھی یقیناً اسی راستے سے کہیں نیچے چلے گئے ہوں گے۔ یہ کمرا' غار یا کھوہ' جو کچھ بھی تھا' روشنی کے مینار کے عین نیچے تھا اور اسے پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ اندر دیواروں میں جا بجا طاقیں اور خانے سے بنے ہوئے تھے' آہنی چراغ دان دیواروں پہ لگے نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں پتھر کاٹ کر ایک بڑا سا حوض بنا ہوا تھا جو یقیناً کسی زمانے میں جب یہ مینار کارآمد تھا' روشنی کے لئے تیل ایندھن ذخیرہ کرنے کے کام آتا ہوگا۔ اب میں اس راستے کی جانب متوجہ ہوا جو یقیناً نچلی منزل کی طرف کھلتا تھا۔ یہاں نیچے اُترنے والی سیڑھیاں قدرے کشادہ بھی دکھائی دیں۔ ٹارچ روشن کرنے کی یہاں بھی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ ہوئی' میں اب قدرے اعتماد کے ساتھ نیچے اُتر رہا تھا۔ چار چکر پورے کرنے پہ میں اب ایک خاصے کشادہ سے کمرے میں موجود تھا' یہ کمرا بھی پہاڑ کو کھود' تراش کر بنایا گیا تھا سمندر کی جانب بالکل کھلا ہوا۔ اندر دو چار ٹوٹی پھوٹی کشتیاں' چپو اور اسی نوع کا ماہی گیری کا سامان پڑا ہوا تھا۔ جا بجا کیکڑے اور سمندری حشرات دکھائی دے رہے تھے۔ سمندر بالکل سامنے تھا۔ یقیناً جوار بھاٹوں کے موسم میں سمندر کا پانی اس غار کے اندر تک آ جاتا ہوگا۔ سیپیاں' گونگے اور سمندری کیچوؤں کے بھاگنے کے نشان ٹارچ کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان نشانوں کے درمیان مجھے کچھ اور غیر واضح سے نشان بھی نظر آئے جیسے بہت سے انسان پاؤں پہ کپڑا باندھ کر یہاں سے ابھی ابھی گزرے ہوں۔ ان دونوں بجھوڑوں کے علاوہ اور یہاں کون ہو سکتا ہے؟ اُوپر تو میں نے صرف دو سائے ہی دیکھے تھے مگر یہاں تو اور بھی کچھ پُراسرار سے لوگ رہتے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں' انہیں سامنے آنے میں کیا قباحت یا مجبوری ہے؟...... انہی سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی خاطر' میں ان کے کھُرے اُٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔ سمندر ریت پہ پاؤں کا نشان کافی دیر تک برقرار رہتا ہے' کھُرے اُٹھاتا اُٹھاتا میں ایک اور غار کے دہانے پہ کھڑا تھا۔ یہ غار جس کا دہانہ بڑا تنگ تھا' مجھے کسی کنویں کی طرح دکھائی دی۔ ٹارچ کی ماند پڑتی ہوئی روشنی میں مجھے اس کے اندر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں کافی دیر تک ایک پتھر پہ بیٹھا ان عجیب و غریب لوگوں کے بارے میں غور کرتا رہا۔ آخر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے زور زور سے انگریزی میں پکارنا شروع کر دیا۔

''شریف لوگو! میں تمہارا دوست ہوں' مجھ سے ڈرو نہیں...... باہر نکلو اور مجھ سے ملو۔ میں

تمہارے علاقے اور ملک میں اجنبی ہوں' سیر سیاحت کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔ اتفاق یا میری لاپروائی سے مجھے یہاں کسی نہ کسی طور رات بسر کرنے پہ مجبور ہونا پڑا ہے۔ مہربانی سے باہر نکلو اور مجھ سے ملو...... اگر تم لوگ کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو بھی میرے قریب آؤ۔ میں مسلمان پاکستانی باشندہ ہوں۔ مجھے حکمت' کیمیا اور روحانیت سے دلچسپی ہے' ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت نے مجھے یہاں صرف آپ لوگوں کی مدد اور دردمندی کے لئے بھیجا ہے......"

یہ لمبی چوڑی تمہید یا تقریر میں نے قریب قریب چار پانچ بار رنگ بھنگ انہی معنوں و مطالب میں دہرائی۔ گلا پھاڑ کر میں اب خاموش ہو چکا تھا...... دراصل یہ سب کچھ میں نے بطور ایکسر سائز کیا تھا۔ کئی گھنٹوں سے میں کسی سے بات کرنے کو ترس گیا ہوا تھا' یہ چیخ پکار بس ذرا خود کو ایکٹیو رکھنے کا ایک بہانہ تھی۔ ایک ہوتی ہے صدا بصحرا...... یعنی صحرا میں کوئی صدا' ندا اثر نہیں دکھاتی۔ ریت کا ذرّہ ذرّہ سمندر صدا کے صد رنگ آہنگ کو کچھ اس طرح سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ صدا بے چاری کسی بے کس و بے بس کی آہ کی مانند اپنے آپ میں ہی گھٹ کے رہ جاتی ہے' بالکل اسی طرح آج میری یہ "صدائے غار" بھی کچھ ایسی ہی بے نتیجہ نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ اور کان لگائے اس غار سے کسی کے باہر نکلنے یا کسی کے جواب کا منتظر رہا۔ ناچار وہاں سے اٹھا اور واپس پہلے والے غار کی جانب چلا آیا' ارادہ کر لیا کہ میں اب اوپر چل کر ذرا مینار پہ چڑھوں گا' اردگرد کا تھوڑا سا نظارہ کروں گا اور پھر واپسی کی کوئی سبیل سوچوں گا۔

غار میں داخل ہونے سے پہلے میں نے یونہی اپنے پیچھے اس جانب جدھر سے میں آیا تھا' نظر ڈالی تو دیکھا کہ پانچ سات سیاہ چادروں میں لپٹے ہوئے انسان یا جن بھوت' ڈرے ہوئے سہمے سے میری جانب آرہے ہیں۔ مجھے متوجہ پا کر وہ وہیں اپنے قدموں پہ رک گئے...... "یا اللہ' خیر!" کہتے ہوئے میں نے اپنے اندر کی چکّی ذرا تیز کر دی۔ میں ان کی جانب ذرا غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ان میں سے کچھ لوگ معذور ہیں جنہیں کھڑے ہونے میں دقت محسوس ہو رہی ہے' ساتھیوں نے انہیں سنبھالا ہوا ہے۔ میں اپنے تئیں خوش بھی ہوا کہ چلو وہ یہاں تک تو آئے ہیں' اب آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟...... میں انہیں اعتماد میں لینے کی خاطر پاس ہی ایک پتھر پہ بیٹھ گیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں خیر سگالی کے انداز میں ہاتھ سے اشارے کرنے لگا لیکن وہ تو جیسے ہر جذبے سے نابلد تھے۔ جو معذور تھے' وہ تو وہیں بیٹھ گئے اور جو کھڑے تھے وہ بتوں کی طرح خاموش' بے حس و بے جنبش رہے۔ اب میں اس سوچ میں تھا کہ اگر میں یہاں سے اٹھا تو ہوسکتا ہے کہ بے چارے پھر کہیں چھپ لگ جائیں' خاص طور پر

مجھے معذور افراد کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ دفعتاً اِن میں سے ایک شخص آگے بڑھا' آٹھ دس قدموں کے فاصلے پہ وہ رُک گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ کوئی قد آور شخص تھا' سیاہ یا براؤن رنگت کے لبادے میں وہ سرتاپا ملبوس تھا۔ ہاتھ' بازو' حتیٰ کہ آنکھوں کے علاوہ چہرہ بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ اُس نے قدرے ہاتھ بلند کرتے ہوئے مجھے شاید سلام کیا یا خود کو اِذنِ کلام دیا تھا۔

''اجنبی! ہم آفت زدہ اس حال میں ہیں کہ تم کو یہاں خوش آمدید بھی نہیں کہہ سکتے' اِس کے باوجود تمہاری یہاں موجودگی ہمارے لئے خوش آئند سی محسوس ہو رہی ہے...... ہم یہاں کل سات افراد ہیں۔ تین خواتین اور چار مرد' ایک خاتون اور دو مرد بوڑھے اور چلنے پھرنے سے قریب قریب معذور ہیں۔ ہم تمہاری یہاں آمد سے یقیناً بے خبر نہیں ہیں۔ تمہیں کسی بھی قیمت پہ یہاں نہیں آنا چاہئے تھا لیکن شاید تم یہاں کی اور ہماری آفت زدگی کی صحیح صورتِ حال سے واقف نہیں ہو ورنہ تم ایک لمحہ بھی یہاں رُکنے کا خطرہ مول نہ لیتے......''

وہ قد آور ذرا سانس دُرست کرنے کے لئے رُکا تو مَیں نے فوراً سوال داغ دیا۔

''میرے انتہائی بااخلاق اور نفیس دوست! کیا تم مجھے اپنی آفت زدگی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے......''

اس نے میرے سوال پہ پیچھے اپنے دیگر ساتھیوں کی طرف مڑ کر دیکھا جیسے وہ مجھے کچھ جواب دینے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔ ایک اور بھاری سا شخص اُس کے پاس آ کھڑا ہوا' آپس میں دو چار باتیں کرنے کے بعد پہلے والا شخص بولا۔

''یہ جگہ اور اس وقت کا موسم ہم آفت زدوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔ ہمیں اجازت دو کہ ہم سب اپنے ٹھکانے پہ جائیں۔ آپ ہمارے پیچھے کچھ توقف کے بعد چلے آئیں اور سیدھے اُوپر جہاں سے آپ نیچے تہہ خانے میں داخل ہوئے تھے' پہنچ جائیں۔ وہاں سیڑھیوں کی دائیں طرف لکڑی کا ایک کُھلا صندوق پڑا ہوا ہو گا۔ اس صندوق کے اندر سبز پتّوں والی ٹہنیاں پڑی ہوں گی۔ اِن پتّوں کو لے کر دونوں ہاتھوں سے مسل لیں' اپنے پورے جسم' کپڑوں اور اپنے سامان پہ ہاتھ پھیریں اور کچھ پتّے مسل کر اپنی جیبوں میں بھی ڈال لیں۔ آپ کچھ پتّے چبا بھی سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد آپ مینار میں داخلے کا بایاں راستہ اختیار کرتے ہوئے مینار کے اوپر دوسری منزل پہ پہنچ جائیں' آپ کے اِس سوال اور دیگر تمام سوالوں کا جواب آپ کو وہیں ملے گا...... اب آپ براہِ کرم چند قدم آگے سمندر کی جانب بڑھ جائیں اور اپنا چہرہ اُدھر سمندر کی طرف ہی رکھیں۔ جب آپ اوپر سے لوہا بجانے کی آواز سُنیں تو پھر آپ

اسی راستے سے اوپر جا سکتے ہیں جس راستے سے آپ نیچے تشریف لائے تھے......"

ان کی لمبی چوڑی ہدایتیں سُن کر میں تو بوکھلا سا گیا کہ میں کس چکر میں پڑ گیا؟ بہر حال' اب اتنا آگے بڑھنے کے بعد واپس پلٹنا بھی گوارہ نہ تھا...... سمندر کی جانب مُنہ کر کے آگے کچھ دُور تک چلا گیا۔ پانچ' دس' پندرہ' بیس منٹ گزر گئے۔ جانے والوں نے نہ تو لوہا بجایا اور نہ ہی کوئی اور نشانی اشارہ دکھلایا کہ میں بھی اپنا مُنہ اِدھر کر لوں' ٹھنڈی یخ بستہ نمکین ہوا اور جھکڑوں نے میری قلفی جمانا شروع کر دی تھی۔

موسم اور سمندر آہستہ آہستہ بھیگ رہے تھے' چاندنی نے اپنا ایک علیحدہ ہی تماشا لگایا ہوا تھا۔ خاموشی' تنہائی۔ سامنے بیکراں سمندر۔ یوں لگا جیسے میں سمندر سے نکلا ہوا اور کرۂ ارض پہ اتارا ہوا پہلا آدم ہوں اور کئی صدیوں سے یہیں' اسی حال میں کھڑا ہوں۔ کائنات کی ہر شے نمو پذیر ہے۔ کسی کو چمک دی جا رہی تو کسی کو دھنک کے رنگوں سے سجایا جا رہا ہے۔ کہیں نقش بکھیر اجا رہا ہے تو کہیں نغمگی کی پھواریں ڈالی جا رہی ہیں۔ کہیں حُسن کے چار چاند لگائے جا رہے ہیں تو کہیں عشق کے زمزمے بہائے جا رہے ہیں۔ کہیں نُور کے چھپاکے کئے جا رہے ہیں تو کہیں ظہور کے تڑاکے کئے جا رہے ہیں۔ کہیں رنگوں کی قوسِ قزح تو کہیں نسیم و نکہت و بادِ صبا...... میں انہی فطرت کی بوالعجبیوں میں مگن تھا کہ اسکول کی ٹلی جیسی آواز کہیں پیچھے [illegible] نظر [illegible] پھر وہ ہم [illegible] نہ ہو۔ دو چار بار ٹن ٹن کی آواز سے مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے مجھے سمندر کی جانب سے مُنہ پھیرنے کی اجازت دے دی ہے جبکہ پہلے میرے دل میں آئی تھی کہ یہ پُراسرار سے لوگ مجھے غچہ دے کر پھر کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔

میں بڑی احتیاط سے چھت پہ سے روشنی میں پہلی منزل اور پھر وہاں سے اوپر پہنچ کر باہر نکل آیا۔ سبز پتوں ٹہنیوں والا ڈبا نما صندوق بھی نظر آ گیا۔ نیم کے پتوں جیسی سبز تازہ پتیاں ٹہنیوں سمیت وافر مقدار میں صندوق میں موجود تھیں۔ میں نے ایک بڑی سی ٹہنی سے پتیاں علیحدہ کر کے دو ہاتھوں کے درمیان خوب رگڑیں' سونگھنے سے پتا چلا کہ از قسم نیم ہی ہے۔ انتہائی تیز و تُند جو ہر میری ہتھیلیوں میں سنسنی سی پیدا کر گیا۔ میں نے فوراً چہرے' گردن' ہاتھ بازو' جہاں جدھر میرا ہاتھ پہنچتا تھا' خوب ملا۔ کپڑوں اور اپنے رک سیک' جوتے' چشمہ' ہر چیز کو اس جوہرِ خاص سے آشنا کر دیا۔

جب پہلی بار میں نے دو سایوں کو غائب ہوتے دیکھا تھا تو مجھے شک پڑ گیا تھا کہ اس ویرانے میں جذامیئے رہتے ہیں۔ وہ موٹر سائیکل والا پاگل انہیں ایک مقررہ وقت پہ ان کی ضرورت کی اشیاء پہنچانے یہاں آتا ہے۔ ایسا مخبوط الحواس ہی ایسا کام کر سکتا ہے۔ صحیح الدماغ انسان تو اس جگہ کے قریب تک نہیں پھٹکتا۔ یہ کوڑھ کے بدنصیب مریض انسانوں کی بستیوں سے کوسوں دُور ویرانوں' پہاڑوں کی

غاروں، کھوؤں اور زیرِ زمین رہتے ہیں۔ دُنیا والے ان سے ناتا توڑنے پہ مجبور ہوتے ہیں...... یہ کوڑھ، جذام، آتشک، تپ دق وغیرہ چھوت کی بیماریاں ہیں۔ خاص طور پہ کوڑھ کی بیماری بڑی کریہہ اور غلیظ ہے۔ اعضاء کی جڑیں جوڑ اس سے متاثر ہوتے ہیں، اعضاء گل سڑ کر جھڑنے لگتے ہیں۔ تعفن آمیز پیپ اور گندہ خون، سرسراتے ہوئے کیڑے، مکروہ المنظر زخم وغیرہ بدنصیب مریض کا مقدر بن جاتے ہیں۔ انسانی بستیوں، رونقوں، ہماہمیوں اور خوشیوں سے دُور اس مرض کے مریض، اپنے بدہیئت، رستے جھڑتے زخموں پہ گندی پٹیاں لپیٹے اپنی شکلیں، جسم چھپاتے زندگی کے باقی ماندہ دن پورے کرتے ہیں۔ ان کا وقت پورا ہونے پہ انہیں دفنایا نہیں بلکہ چڑیلوں اور ڈائنوں کی طرح جلایا جاتا ہے...... خدا کسی کو اس منحوس بیماری میں مبتلا نہ کرے۔ یہ امتحانوں اور آزمائشوں کی بڑی بڑی گہری دلدلوں میں اُتار دیتی ہے، پیغمبر تک آزمائے گئے لیکن انہی عارضوں اور آزاروں کے لئے مسیحائی بھی اتری۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُکھی انسانیت اور خاص طور پر یہ جذامیوں، کوڑھیوں، اپاہجوں، لولوں لنگڑوں اور اندھوں کی مسیحائی، دردمندی اور دستگیری کے لئے آئے۔ جن کو اُن کے اپنوں نے ہی اپنے گھروں، بستیوں اور آبادیوں سے دُور ویرانوں، قبرستانوں اور بے آباد پہاڑوں میں لا کر پھینک دیا تھا، ان سے محبت، قرابت کے سارے رشتے ناتے توڑ ڈالے تھے۔ ایسے میں [illegible] ان کے اندر جھانکا، [illegible] ناسوروں اور پیپ کیڑوں بھرے زخموں پہ اپنا دستِ مسیحائی رکھا۔ انہیں سینے سے لگایا، اپنے ہاتھوں سے کھلایا، زخم دھوئے۔ نہلایا اور فرمایا کہ دُکھی انسانیت کی دلجوئی، خدمت ہی انسانیت کی معراج ہے۔ بیماروں، کوڑھیوں سے دُور مت بھاگو۔ انہیں منحوس اور غلیظ و متعفن جان کر ویرانوں اور پہاڑوں میں مت پھینکو۔ انہیں محبت اور قربت دو۔ ان کا معالجہ کرو، تیمارداری کے فرائض سرانجام دو۔ یہ مت خوف رکھو کہ کہیں تم بھی بیمار پڑ جاؤ گے۔ آفت زدہ علاقوں سے ہجرت مت کرو کہ تم موت سے کہیں بھی بھاگ کر نہیں جاسکتے لیکن اس کے باوجود احتیاط کرنا اور ان کی بیماری کے مضر اثرات سے خود کو بچانا ضروری ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے۔

مَیں نے بھی احتیاطاً وہ پتیاں خوب مل رگڑ کر اپنی بساط اور عقل سمجھ کی حد تک خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ کچھ پتیاں رومال میں لپیٹ کر اپنے ناک مُنہ پہ باندھ لیا اور ایک بار پھر تہہ خانے کے دروازے میں داخل ہو گیا مگر اب مَیں دائیں جانب نہیں بلکہ بائیں جانب مینار کے اوپر جانے والے راستے پہ ہو لیا۔ سیڑھیوں کے دو چکر کاٹ کر اب میں اوپر پہلے والی منزل کے گول کمرے تک پہنچ گیا تھا۔ اندر نیم اندھیرے میں مناسب سی روشنی کے لئے یا شاید یہاں کی عفونت کو صاف کرنے کے لئے ایک آہنی پیالے میں کچھ جڑی بوٹیاں ہلکی سی لَو دے رہی تھیں، کڑواہٹ بھرے دھوئیں نے کمرے میں ایک نامانوس سی بو پھیلا رکھی

تھی۔ لہریے لیتی ہوئی مدھم سی روشنی اور دُھویں کے دُھندلے سے غبار میں مجھے وہ سارے لوگ سامنے پتھریلی دیوار سے چپٹے ہوئے بُھوت سے لگے۔ وہ یوں دیوار کے ساتھ ضم سے تھے کہ جیسے اگر میں ایک قدم اور آگے بڑھاتا تو وہ سارے دیوار میں چھلاووں کی مانند جذب ہو جائیں گے۔ وہ شخص جس سے میری پہلے بات چیت ہو چکی تھی' قدرے آگے جُھکا سا بیٹھا ہوا تھا۔ شاید یہ شخص اِن خستہ حالوں کا ترجمان تھا۔ دروازے کے پاس' کمرے کے اندر فرش پہ دھرے ہوئے ایک چوبی سٹول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُس شخص نے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ جب میں بیٹھ چکا تو وہ گویا ہوا۔

''ہمارے پیارے مہمان!...... مہمان کہتے ہوئے مجھے اک عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی ہے کیونکہ بصدِ مجبوری ہم اپنی دیرینہ روایات کے برعکس اِس وقت' اِس جگہ اور ان حالات میں آپ کے خورد و نوش کے لئے کچھ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اِس سے پہلے کہ میں اپنی بات کو آگے بڑھاؤں' میں اپنا تعارف کرانا مناسب خیال کرتا ہوں...... میرا نام ایلکس رابرٹ ہے۔ قومیت کے لحاظ سے میں برٹش ہوں جبکہ میری ماں اسپینش اور باپ ظاہر ہے' برٹش ہی تھا۔ اُسے لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا' اچھی خاصی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ چاہتا تو اپنے علمی وسائل سے کسی یونیورسٹی کا سربراہ بن سکتا تھا مگر لکھنے پڑھنے اور [illegible] عمر اور روپیہ پیسہ صَرف کرنے کے بعد وہ صرف ایک معمولی سا پادری بن کر ملکوں ملک دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگا۔ آواخرِ دورِ حصولِ تعلیم میں اس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا کہ اعلیٰ اور ارفع تعلیم کے حصول کا صحیح اور سب سے بہتر مصرف ایک صالح اور درد مند انسان کے نزدیک صرف اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر علمی توانائیوں کو انسانیت کی بہبود کے لئے بروئے کار لائے اور کسی حُجرے' معبد یا کلیسا میں بیٹھنے کی بجائے سفر و سیاحت کی صعوبتیں اُٹھائے...... میری تعلیم و تربیت بھی میرے باپ نے اسی اندازِ فکر میں کی تھی۔ جب میں تعلیم حاصل کر چکا تو اُس نے مجھے بھی پادری بنا کر ایک مشنری گروپ میں شامل کروا دیا اور آخری بار مجھے نصیحت کی کہ وہاں تک اور اُن تک پہنچو جو کسی بھی وجہ سے تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ بادلوں کی مانند ہمیشہ محوِ سفر رہو' ہواؤں سا سرسراتے اور اُڑتے رہو اور گھنگھور گھٹاؤں کی طرح چھم چھم برس برس کر ان تشنہ کاموں تک پہنچ پاؤ جہاں سمندر بھی اپنی تمام تر وسعتوں اور فیاضیوں کے باوصف نہیں پہنچ پاتا...... بہر حال' میں اس وقت نوجوانی کے دور میں اُس کا یہ فلسفہ تبلیغ و تدریس تو نہ سمجھ سکا مگر بعد میں جب میں عملی طور پہ اِس فیلڈ میں آیا تو میں خوب سمجھ اور جان پایا کہ اعلیٰ تعلیم اور بے پناہ دولت و وسائل' دونوں کی معراج اور ان کا اصل مقصد و مصرف ہی یہی ہے کہ انہیں انسانیت کی بقا اور احیاء کے لئے صَرف کیا جائے۔ میں نے چونک

میڈیکل کی بھی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اس لئے میں اکثر اُن پس ماندہ ملکوں' علاقوں کو فوقیت دینے لگا جہاں خوراک کی کمی یا موسمی' وبائی بیماریوں کی وجہ سے اللہ کی مخلوق پریشان ہوتی۔ اس طرح افریقہ' ایشیا کے بہت سے ممالک میں' میں نے اپنی زندگی کا ایک خاصا حصّہ گزار دیا۔ جب میرا باپ فوت ہوا تو میں اس وقت افریقہ میں تھا...... میرے باپ نے مرنے کے بعد ترکے میں بھی وصیتیں اور نصیحتیں ہی چھوڑیں' وہ یہ کچھ نہ بھی چھوڑتا تو پھر بھی میں اپنی ڈگر سے ہٹنے والا نہیں تھا۔ دُکھی انسانیت کی خدمت' بیماروں لاچاروں کی تیمارداری اور بھٹکوں ہوؤں کو راہ دکھانے کی عادت اور خُو میرے خون میں رچ بس سی گئی تھی۔

میں اپنے باپ کی الوداعی تقاریب میں شرکت کے لئے واپس انگلینڈ آیا۔ پھر جیسے یوں ہوا کہ میرا اب کہیں بھی جانا نہ ہو سکا۔ اب تک میں کنوارہ تھا' دل میں آئی کہ چلو اب شادی ہی کر لیں مگر مجھے کوئی ایسی خاتون دکھائی نہ دی جو میرے خیالات اور حالات کے مطابق ہوتی۔ اسی دھیان میں ذرا ہوا بدلی کے لئے اِدھر اسپین چلا آیا۔ کچھ عرصہ تک میں اپنی عادت کے مطابق قرب و جوار اور دُور دراز کے دیہی علاقوں میں گھومتا رہا' تبلیغ کے ساتھ ساتھ بیمار دُکھی انسانوں کا علاج معالجہ بھی چلتا رہا۔ خدائی رحمت و برکت کہ میرے ہاتھ میں شفا بھی ہے۔ کچھ میرا طریقۂ علاج' میرا جذبۂ ہمدردی اور کچھ محبت و خدمت کا اعجاز ہے کہ مریض صحت یاب ہو جاتا۔

انہی دنوں اتفاقاً میری ملاقات ایک اسپینش خاتون سے ہو گئی۔ یہ عرب النسل مسلم خاتون بھی میری طرح دُکھی انسانیت کی خدمت کرنے کے جذبے کے خبط میں مبتلا تھی۔ اس خاتون کا مرحوم شوہر بھی یہاں کے ایک صدیوں پُرانے مسلمانوں کے قبرستان کا کیئر ٹیکر تھا جو ایک زمانہ پہلے یہاں جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ خاوند کے مرنے کے بعد اس خاتون نے اس قبرستان کے قریب ہی ایک شفاخانہ بنا لیا جہاں وہ مختلف جڑی بوٹیوں اور مالشوں سے مختلف بیماریوں کا علاج کرتی تھی۔ میں اس کے ہاں ایک جڑی بوٹی کی تلاش کے سلسلے میں پہنچا تھا۔ اس خاتون نے نہ صرف مجھے دوا تیار کر کے دی بلکہ آئندہ بھی غریبوں مسکینوں کے علاج کے لئے ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کی۔ اب میں اسپین میں جیسے کچھ ٹِک سا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ' آب و ہوا' کھانا پینا' سادہ پاکیزہ سے تفریح و مشاغل مجھے شاید اچھے لگے تھے یا پھر شاید یہ مسلمان خاتون تھی جسے دیکھ' سُن اور جانچ کر مجھے شدّت سے احساس ہوا کہ یہی وہ عورت ہے جو میرا آئیڈیل ہے۔ اس ایسی نیک نفس' خوش اطوار' فعال اور ہمدرد خاتون ہی میری شریکِ حیات ہو سکتی ہے جو میرے ساتھ میرے مشن میں میرا ہاتھ بٹا سکے۔ اب میں اکثر اس کے شفاخانے میں آنے جانے لگا۔ ایک بات میں نے شدّت سے محسوس کی کہ یہ نیک خُو خاتون میری عزت اور تعاون تو ضرور کرتی ہے مگر وہ

مجھ سے بے تکلف ہونا یا ایک حد سے آگے بڑھنا پسند نہیں کرتی۔ وہ سر ڈھانپے رہتی اور مختلف اوقات میں اپنی نماز اور عبادت بھی نہ بھولتی۔ اس سے پیشتر میں مسلمانوں کو محض جنونی اور پسماندہ اوقات وفکر کی حامل ایک فضول قسم کی قوم تصور کرتا تھا۔ میں نے اپنے طور اس خاتون کے قول وفعل اور طور طریقوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ میں دینِ اسلام اور قرآن مجید کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ نماز، روزہ اور اسلامی شعار اور مشاغل کو بھی دیکھتا، سمجھتا رہا۔ بالآخر مجھ پہ عقدہ کھلا کہ اس کائنات میں صرف اسلام، قرآن اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کامل دین، منبع ہدایت اور اعلیٰ رہنما ہیں۔ پاکیزگی، صفائی، سچائی، ایمانداری، محنت، محبت، بہادری، خودداری، مساوات اور ایک خدائے برتر کی عبادت اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اسلام کے رہبر اصول ہیں۔ یہی مذہب سچ اور حق ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اندر سے مسلمان ہو چکا تھا۔ میں اندھیرے سے باہر اُجالے کی جانب نکل آیا تھا۔ اب مجھے صرف ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے طمانیت کا احساس دلا سکے اور وہ اس ہمدرد خاتون کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟...... ایک دِن اُس نے مجھے پاکٹ سائز قرآن مجید پڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ جس روز یہ قرآن الحمید تمہارے ہاتھوں، آنکھوں اور ذہن سے گزر کر تمہارے ہونٹوں اور دل تک آ جائے گا تو اُس دن مجھے بے حد خوشی ہوگی...... ٹھیک چھ ماہ بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔ مخلص اور مضبوط ہمسفر، تابندہ منزل، سچا دین، اک تازہ سی سوچ وفکر اور ایک نئی ولولہ خیز اُمنگ پا کر میں نے بڑی کشادگی سے محسوس کیا کہ اب میری بے مہار، بے مُراد و بے منزل سی زندگی کا قبلہ دُرست ہو گیا ہے۔

اس مادی دُنیا کی حرص و ہوا سے لتھڑی ہوئی خواہشوں اور آلودگیوں سے کہیں پرے ہم دونوں بڑی سادہ مگر بڑی بامقصد سی زندگی گزارنے لگے۔ ہمارے صبح وشام، ماہ وسال بے سہارا دُکھی اور لاچار انسانیت کی خدمت، دلنوازی اور اللہ کی اطاعت وعبادت سے تعبیر تھے۔ ہم جنگلوں، پہاڑوں، مرغزاروں اور سمندر کے کناروں سے جڑی بوٹیاں، سیپیاں، مونگے، گھونگے، سمندری جھاگ اور کائی گھاس وغیرہ چُنتے رہتے۔ کانٹ چھانٹ، رگڑ، پیس کر ہم دوائیں، مرہم، لعوق ولبوب اور عروق تیار کرتے رہتے جنہیں ہم حاجت مند بیماروں، خستہ حالوں میں حسب ضرورت تقسیم کرتے رہتے...... آج سے ٹھیک سات برس پہلے ہم میاں بیوی انہی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس جگہ آ نکلے تھے۔ اِدھر اردگرد ہمارے مطلب کی بے شمار جڑی بوٹیاں تھیں۔ ہم نے خوب تھیلے بھرے اور واپسی کی ٹھانی مگر اسی دوران ہم ایک اور مسئلے میں اُلجھ کر رہ گئے۔ ہماری چھوٹی سی پرانی ویگن اسی جگہ پہ کھڑی تھی جہاں اس پاگل سے شخص نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی رفع حاجت کے لئے ذرا دور ٹیلوں کی اوٹ میں نکل گئے، وہاں سے

نیچے سمندر کے کنارے اُتر گئے۔ شام سے ذرا پہلے واپس پلٹے تو ہماری گاڑی سے کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کے سامان کے علاوہ چند ایک اور چیزیں بھی غائب تھیں۔ اس ویرانے میں ہمارے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے ہم اِدھر مینار کے پاس چلے آئے' تہہ خانے کے دروازے پہ کھڑے ہی تھے کہ چوہوں کا سیلاب اندر سے باہر کی جانب نکل آیا۔ ہمیں یہ جاننے اور سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی کہ نیچے کسی جگہ پہ کوڑھ کے مریض موجود ہیں' نیچے سے آنے والی بدبو نے بھی ہمارے اندازے کے دُرست ہونے کی تصدیق کر دی۔ ہم دونوں میاں بیوی نیچے اُترے اور پھر وہی کچھ پیش آیا جو آج تمہارے ساتھ ہو گزرا ہے......''

چند لمحوں کے لئے اِدھر سے سکوت ہوا تو میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً سوال کر دیا۔

''اے عظیم انسان! کیا تم سات برس سے اِدھر ہی مقیم ہو......؟''

''ہاں......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنی بیوی زلیخا کے ساتھ اِدھر ہی رہ رہا ہوں...... اس وقت ان قابلِ رحم لوگوں کی تعداد ستر سے اوپر تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی نے اپنی زندگیاں انہی آفت زدوں کی خدمت اور علاج [illegible] کے لئے وقف [illegible] کوئی معاوضہ [illegible] یہی [illegible] کر سکتا ہے' ہم ایسا کوئی گنہگار اِنسان نہیں۔ ستر افراد میں سے آج صرف یہی پانچ بدنصیب انسان باقی ہیں جن کی حالت بھی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔ ہم نے مقدور بھر کوشش کی۔ رات کی نیند اور دن کا سکون' ہر ضرورت اور حاجت ان بیماروں لاچاروں کی تیمارداری اور علاج معالجہ پہ تج دی مگر ہم دونوں صرف کوشش' دوا دارو اور دُعا ہی کر سکتے ہیں' شفا دینا تو صرف اُسی حکیم و حاکم کا کام ہے......''

وہ شاید سانس دُرست کرنے کی غرض سے پَل کی پَل خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''میرے دوست! میں محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے تم بھی بیمار ہو' تمہاری حالت بھی مجھے دِگرگوں سی دِکھائی دے رہی ہے......''

میرے سوال پہ اُس نے پہلی بار ہلکا سا قہقہہ لگایا' پھر تھوڑا چہرہ ننگا کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''تمہارا اندازہ دُرست ہے...... کوڑھ کے معالج کو بے پناہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا نامُراد مرض ہے کہ علاج کرنے والا یا تیماردار خود بھی اس کا شکار ہوسکتا ہے۔ شروع شروع میں تو ہم دونوں نے قدرے احتیاط کی پھر......''

''اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں میاں بیوی بھی اس مرض کا شکار ہو چکے ہو......؟''

وہ اپنا پورا چہرہ ننگا کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کیا فرق پڑتا ہے...... یہ لوگ بھی تو ہم ایسے انسان ہیں' ہم بھی اگر ان ایسے ہو گئے تو کیا ہوا؟''

اُس کا چہرہ دیکھ کر میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی...... ناک' ہونٹ' جبڑے بالکل گل سڑ کر گڑھے بن چکے تھے۔ دانت بے ہونٹ' سامنے نکلے ہوئے۔ آنکھوں کے ڈیلے پپوٹوں اور پلکوں کے بغیر۔ سر پہ بڑے بڑے کھرنڈ اور کریہہ المنظر زخم۔ سُرخ سُرخ گوشت میں کھوپڑی کی سفید ہڈی نظر آ رہی تھی۔ مَیں چاہتا بھی تو اُس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا...... میرے مُنہ سے یوں ہی نکل گیا۔

''تم انہیں اپنے شفا خانے میں لے جا سکتے تھے جہاں تم اپنی پیشہ وارانہ احتیاط کے ساتھ ان کا علاج بھی کر سکتے اور اپنی حفاظت بھی......؟''

''ہاں' ایسے ہو سکتا تھا مگر یہ لوگ جو کئی صدیوں سے پشت در پشت یہاں بو جبر رکنے پہ مجبور ہیں' انہیں یہاں سے نکالنا بھلا ایسا آسان نہیں تھا......''

''ٹھیک...... یہ ان کی مجبوری ہو سکتی ہے مگر آپ تو مجبور نہیں تھے......؟'' وہ اب پیہم میرے سوالات کی زد پہ تھا۔

''ہم میاں بیوی اسی مشن پہ ہیں اس کا تقاضا بھی تھا کہ ہم انہیں اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہ جائیں۔ یہ ہم میاں بیوی دونوں کا باہمی فیصلہ تھا' ہم دونوں نے ان ہی کے ساتھ مرنے جینے کا فیصلہ کر لیا...... اَلحمدُ لِلّٰہ! ہم اس حال پہ پہنچنے کے بعد بھی اپنے فیصلے پہ شرمندہ نہیں۔ یہ ہماری آزمائش اور امتحان ہے۔ ہماری چند روز زندگی اگر کسی بیمار کی دلجوئی اور خاطر داری میں کٹ جائے تو اس سے زیادہ خوش قسمتی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟...... اَلحمدُ لِلّٰہ' ہم سب باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں......''

''نماز اور قرآن......'' مَیں دُہراتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''کیا یہ سب مسلمان ہیں......؟''

''ہاں' یہ سب مسلمان ہیں......''

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب ہو لیا۔ اب ہم مینار کی دوسری منزل پہ تھے۔ یہاں کی تو دُنیا ہی اور تھی۔ صاف ستھرا گول سا کمرا' فرش پہ پرانا سا قالین۔ جاء نماز' رحلیں اور مصحف' طاقچوں میں چند کتابیں' تسبیحیں اور چراغ دان...... ایک چراغ روشن کرتے ہوئے اُس نے مجھے قالین پہ بیٹھنے کی دعوت دی' بولا۔

''یہ کمرا ہماری جائے پناہ' عبادت گاہ اور شفا خانہ بھی ہے۔ یہاں سے پانچ کوس پرے ایک گاؤں کا بظاہر گاؤدی سا بھلا انسان روزانہ ہمارے لئے خوراک' ضروری ادویات اور دیگر سامان ضرورت

یہاں پہنچا جاتا ہے۔ اس کے بدلے میں ہم اُسے کچھ معاوضہ اور بہت سی دُعائیں دیتے ہیں' وہ ہمارا سامان اسی کمرے میں پھینک کر باہر باہر سے ہی ہمیں بُرا بھلا کہتا ہوا چلا جاتا ہے' یعنی ہمارے مُنہ نہیں لگتا......''

''وہ بڑے بڑے چوہوں کا طوفان......؟'' اچانک یاد آنے پر میں نے چوہوں کا بھی پوچھ لیا۔

''ہاں' وہ جنگلی چوہے ہمارے دوست ہیں' خدا نے اُن کی خوراک کا وسیلہ بھی ہمیں بنا رکھا ہے۔ اگر وہ چوہے نہ ہوں تو ہم سب برسوں پہلے مرکھپ گئے ہوتے...... ہم دونوں میاں بیوی روزانہ تمام مریضوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں' ہمارے اور ان کے گلے سڑے جسموں اور زخموں سے اُتری ہوئی پیپ اور خون بھری پٹیاں' زخموں کے کھرنڈوں سے اُترے ہوئے چھلکے' جھڑی ہوئی کھال' سڑا ہوا گوشت' یہ ساری متعفن چیزیں ان چوہوں کی مَن بھاتی خوراک ہیں۔ ہر روز شام کو یہ آتے ہیں اور اپنی خوراک چٹ کر کے چلے جاتے ہیں......''

''مگر یہ تو بڑا خطرناک عمل ہے' ان چوہوں کے ذریعے یہ بیماری پھیل سکتی ہے......؟''

''نہیں...... یہ سمندری چوہے ہیں' انسانی آبادی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل میں یہ چوہے بھی نہیں' انہیں آپ سمندری گلہریاں کہہ سکتے ہیں......'' وہ بڑی دھیرج سے کہنے لگا' ''میرے معزز دوست! مجھے یقین [illegible] کہ ہم ضرور کوئی ایسا شخص یہاں میرے پاس بھیجے گا جسے میں اپنے دل کی کیفیت اور یہاں اس مینار کی اوپر والی آخری منزل کا کچھ احوال سُنا سکوں گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج وہ بابرکت اور ہمدرد انسان اللہ نے یہاں میرے پاس بھیج دیا ہے......''

''مگر وہ میں ہی کیوں ہوں' کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''نہیں' وہ آپ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف مسلمان اور کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل انسان ہی ہو سکتا تھا اور وہ اچھا انسان میرے سامنے موجود ہے۔''

''آپ اپنی اس بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گے......؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میرے معزز! آپ خوب سمجھتے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کسی بھی طور وضاحت نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ خود ہی اپنی وضاحت اور فصاحت ہوتی ہیں۔ وہ کانوں کے سُننے لائق نہیں ہوتیں' وہ صرف باطنی طور پہ سمجھی جا سکتی ہیں...... آپ کا تو خود بھی تعلق رُوحانیت' حکمت و کیمیا سے ہے' کیا آپ دیانت گوئی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ وہ نہیں ہیں جس کا مجھے انتظار تھا......؟''

میں تجل سا اُس کا مُنہ تکنے لگا...... وہ اپنی نشست کو قدرے آرام دہ بناتے ہوئے بتانے لگا۔

''اس ویرانے میں آپ کا پہلا قدم میری رُوح پہ پڑا تھا۔ اس خطۂ آفات میں کسی بھی جگہ پتھر'

ٹیلے، چبوترے، مینار، کسی دیوار، یہاں تک کہ اگر کسی خودرو گھاس کی بالیں پہ بھی کوئی ننھی سی ٹڈی بیٹھ جائے اور ہم چاہے اپنی اس سکونت میں کہیں بھی ہوں، ہمیں سگنل مل جاتا ہے کہ باہر کوئی موجود ہے۔ خاموش سمندر کی مدھم سی سسکیاں اور اُداس مغموم ہواؤں کی گھٹی گھٹی چیخوں کے سوا یہاں کسی تیسرے کی آواز سُننے کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں تو سمندری پرندے بھی اُڑان بچا کر گزرتے ہیں، زمینی مخلوق ادھر کی بو باس اور نحوست سے بہت پرے پرے رہتی ہے۔ کم از کم میں جب سے یہاں آیا ہوں، آج پہلی مرتبہ کسی انسان کو دیکھا ہے...... ہم نے آپ کو مینار سے ہی ساحل کنارے آتے دیکھ لیا تھا۔ پھر آپ کنارہ چھوڑ کر اوپر یہاں آئے۔ اِدھر اُدھر گھومے، چبوترے پر چڑھے۔ نماز ادا کی، کھایا پیا۔ چوہے دیکھے، پھر نیچے اُترے...... اگر آپ وہ نہ ہوتے جس کا ہمیں انتظار تھا تو آپ سورج ڈوبنے سے بہت پہلے یہاں سے چلے گئے ہوتے......"

مجھے پھر بات کرنے کا موقع مل گیا تھا، بولا۔

"میں نے جانا چاہا تھا مگر اس پاگل سے انسان نے مجھے لے کر جانا شاید مناسب نہیں سمجھا۔ پھر سوچا کہ نماز پڑھ کر اس پگڈنڈی پہ ہو لوں گا جس سے وہ جنگل والا بھول گیا تھا......"

وہ بڑی خوفناک سی ہنسی ہنسا۔ بے ہونٹ منہ اور بے پپوٹوں آنکھوں سے بھلا کیا کوئی ہنسی کا تصور کرسکتا ہے...... وہ ہنسی روک کر گویا ہوا۔

"ہاں، ایسا آپ صرف کہنے کے لئے کہہ رہے ہیں ورنہ آپ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ جس کام کو سرانجام دینے کی غرض سے آپ یہاں آئے ہیں، اُسے انجام دیئے بغیر آپ کیسے یہاں سے جا سکتے ہیں"...... اچانک اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی عبا کی فراخ آستینوں سے نکال باہر کئے۔ چیتھڑے لپٹے ٹُنڈ مُنڈ سے بے اُنگشت ہاتھ میرے سامنے تھے۔ وہ بے دھڑک بولا...... "یہ میرے ہاتھ دیکھئے...... دو برس ہوئے، میرے اور میری بیوی کے ہاتھوں کی اُنگلیاں گل سڑ کر جھڑ چکی ہیں۔ اب ناسور کُہنیوں اور بازوؤں تک چڑھ آئے ہیں۔ ہمارے اس قبیلے میں صرف دو افراد ہی ایسے ہیں جن کے ناک، مُنہ، چہرے تو ختم ہو چکے ہیں مگر ہاتھوں کی کچھ باقیات ابھی ہیں، وہی ہم سب کو کھلاتے پلاتے ہیں اور دیگر ہاتھوں سے کرنے والے کام کرتے ہیں۔ اب سے پہلے دو برس تک میں باقاعدہ ڈائری اور دیگر مسوّدات لکھتا رہا، جب سے معذور ہوا تب سے یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا......" وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک چمڑے کے صندوق کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، بتانے لگا۔ "اس صندوق میں وہ سب کچھ ہے جو میں نے آج تک تحریر کیا ہے۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ ان تحریروں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ میرے تحریری مقالے، نباتات کے

متعلق میری ریسرچ تجربے اور تحقیقات سے یقیناً فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ انہیں کسی ریسرچ سنٹر یا کسی ہسپتال کو بھی دے سکتے ہیں......'' پھر وہ صندوق کھول کر پلاسٹک کے لفافے میں لپٹا ہوا ایک پلندہ فرش پہ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ ایک الگ سبجیکٹ ہے لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ اس پیکٹ کو آپ اسپین میں قیام کے دوران نہیں کھولیں گے۔ جب آپ اپنے ٹھکانے پہ پہنچ پائیں تو پھر سکون سے اس پیکٹ کو کھولیے گا۔ پیکٹ کھولیں گے تو اوپر ہی ایک ہدایات نامہ دھرا ہوا ملے گا۔ اس ہدایت نامہ کے مطابق اگر آپ ان مسوّدات کو پڑھیں گے تو اس تمام کہانی کے رازوں اور اسراروں کو سمجھنے میں آسانی محسوس کریں گے جو اس مینار اور اس آفت زدہ جگہ سے تعلق رکھتی ہے۔ میں اپنی عدیم الفرصتی' اسلامی علوم اور تاریخی پس منظر کو کماحقہ طور پہ نہ جان پانے اور پُراسرار مخفی علوم' تازعہ روحیت و رُوحانیت کو نہ سمجھنے کی بنا پہ اس مینار والے اَسرار اور اس علاقے کی آفت زدگی پہ کوئی تحقیق نہیں کر سکا۔ ایک علیحدہ پیکٹ میں ایک پرانی بڑی سی چابی موجود ہے اور دروازے کے دُہرے نظام والے بے چابی کے قفل کو کھولنے کا ایک نقشہ بھی رکھا ہوا ہے اور ایک تیسرا احتیاطی نظام بھی ہے جو میں آپ کے ساتھ اوپر چل کر عملی طور پہ سمجھانے کی کوشش کروں گا......''

UrduPhoto.com

- مینارِ میں تنہائی میں تنہا......!

اس نے مجھے دوسرا پیکٹ کھول کر چابی نکالنے کو کہا...... وہ آگے آگے چراغ کو دونوں بے اُنگلیوں والے ہاتھوں سے تھامے ہوئے سیڑھی بہ سیڑھی' قدم بہ قدم اوپر والی آخری منزل کی طرف چڑھ رہا تھا اور میں سہما سہما سا چابی' ہدایت نامہ اور نقشہ پکڑے اندھیری رات' کسی گھنے جنگل میں بھٹکے ہوئے کسی معصوم مگر دلیر بچے کی طرح جو کسی صدیوں پرانے بڈھے کھوسٹ' طوطے کی سی ناک والے جادوگر کے چنگل میں پھنس کر رہ گیا ہو اور سحر زدہ ہو کر اس کے پیچھے پیچھے' اس کے جادو محل کے لرزاں مینارے پہ چڑھ رہا ہو۔ اڑھائی تین چکروں کے بعد آخر وہ بھاری بھرکم آہنی دروازہ سامنے نظر آ ہی گیا۔ اُس نے مجھے قفل کھولنے کا اشارہ کیا۔ قفل کیا تھا' اک جناتی مغلاق تھا۔ ٹھوس تانبے سے گھڑا ہوا یہ تالا کم و بیش پانچ پکے سیر وزنی ہوگا۔ اس عجیب و غریب تالے کی دونوں جانب چابی ڈالنے والے سوراخ تھے۔ تالے کی ساخت کچھ ایسی وضع کی تھی کہ اسے کسی بھی ہتھیار یا اوزار سے توڑا یا کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے تالے کے دائیں سوراخ میں چابی داخل کی' چابی یوں گھوم سی گئی جیسے تالا اندر سے خالی ہو۔ اُس نے مجھے نقشہ دیکھنے اور ہدایت

پڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہدایت پڑھنے کے بعد مَیں نے بائیں ہاتھ سے تالے کو تھاما اور دائیں ہاتھ سے چابی دبا کر گھمائی۔ اب کے چابی نے اندر کسی پرزے کو پکڑ لیا تھا۔ چار بار سیدھی طرف گھمانے پہ تالے کے اوپر ایک موٹا سا کیل اُبھر آیا' کیل کو انگوٹھے سے دبایا تو چابی باہر نکل آئی۔ پھر تالے کی دوسری جانب یہی کچھ کیا' پھر چابی باہر نکل آئی۔ دونوں سوراخوں میں دو دو بار یہی کچھ کرنے کے بعد تالے کو کہیں کچھ رحم آیا اور اس نے اپنا آپ کھول دیا۔ اب اگلے قدم کے لئے پھر نقشہ اور ہدایات دیکھنی پڑیں۔ اب مَیں نے چوکھٹ کے دائیں بائیں لگے ہوئے ایک آہنی پنج گوشہ ستارے کو سیدھی جانب ایک پورا پورا چکر دے کر گھمایا' کلِک کلِک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھُلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس کے اشارہ کرنے پہ اگلی یعنی تیسری ہدایت کی جانب توجہ مبذول کی' معلوم ہوا کہ اب مجھے آہنی ستاروں کے اوپر بنے ہوئے اُبھار نما سورجوں کو باری باری پانچ پانچ ٹھُکے مارنے پڑیں گے...... دونوں پٹ کھل چکے تھے' ایک عجیب سی باس نے ہمارا استقبال کیا جسے نہ تو بدبو کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی مکمل خوشبو' بدبو اور خوشبو کا ایک عجیب سا امتزاج تھا۔ جالے سے اُجالے نے اندھا نما اس گول سے کمرے کو بڑا پُراَسرار سا بنا رکھا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس تنگ گول کمرے کے اوپر بھی ایک منزل یا چھت ہے کیونکہ کمرے کی مخروطی سی چھت کے عین درمیان ایک بڑا سا گول سوراخ تھا جس سے آسمان کے ساتھ ساتھ اوپر کا بالا بھی دکھتا تھا۔ فرش سے ایک آہنی سیڑھی سوراخ تک اُٹھی ہوئی تھی۔ اسی کمرے کی تنگی دیوار میں ایک مضبوط آہنی کُنڈے سے منسلک ایک بھاری زنگ آلودہ زنجیر بھی اوپر سوراخ کے راستے کہیں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کمرے کی دیواروں میں بھی گول گول کھڑکیاں موجود تھیں۔ فرش پہ کھڑے کھڑے چاروں اطراف دُور دُور تک سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مختلف عجیب و غریب سا پرانا سامان' زنجیریں' صندوق' چمڑے کے مشکیزے' جوتے' بڑے بڑے برتن اور مٹکے...... مَیں کولہو کے بیل کی مانند آہستہ آہستہ بڑے تجسس اور تردّد کے ساتھ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر کاٹ رہا تھا۔ میرا میزبان عجیب و غریب میزبان بڑی خاموشی اور بیچارگی سے دروازے کے پاس کھڑا میری حرکات ملاحظہ کر رہا تھا...... ایک چکر کاٹ کر جب مَیں اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے اشارے سے مجھے سیڑھی سے اوپر جانے کو کہا۔ میرے لئے اب اوپر جانا شاید واجب ہو چکا تھا کیونکہ اوپر والا کمرا میرے لئے آخری اَسرار تھا جسے اب مجھے دیکھ ہی لینا چاہئے تھا۔ مَیں نے اللہ کا نام لے کر سیڑھی پہ پاؤں رکھ دیا۔ پانچ یا چھ قدم اُٹھانے پہ مَیں نے اوپر والے گول سوراخ کے اُس پار سر نکال لیا تھا۔ یہاں نیچے کی نسبت روشنی بھی قدرے زیادہ تھی۔ اوپر شیشے کا گنبد' چٹکی ہوئی چاندنی اور بلندی...... مزید تین قدم اُٹھانے کے بعد مَیں اوپر شیشے کے گنبد والے کمرے میں داخل ہو چکا تھا' نیچے سے اوپر چڑھی ہوئی زنجیر اگر اس وقت

مضبوطی سے تھامی نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ میں ہڑبڑا کر نیچے گر پڑتا کیونکہ جو منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا اس کا فوری ردِعمل یہی ہو سکتا تھا۔

نیچے سے اوپر آئی ہوئی زنجیر کے سرے پہ ایک انڈے کی شکل کا پنجرہ نما خود تھا جو ایک انسانی پنجر کے سر پہ گرفت کئے ہوئے تھا۔ یعنی انسانی سر چہرے کے مطابق' اسی شکل کا شکنجہ نما خود اس بدنصیب معتوب انسان کے سر چہرے پہ چڑھا کر جبڑوں کے نیچے گردن کے گرد گرفت دے کر لوہے کی ربتوں سے ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا گیا تھا۔ اس آہنی شکنجے کے سر پہ تالو کی جگہ یہ آہنی زنجیر پیوست تھی جس کا دوسرا سرا نیچے کمرے کی دیوار میں ٹھکا ہوا تھا۔ اس انسانی ڈھانچے کے سر پہ چڑھا ہوا یہ پنجرہ نما شکنجہ کچھ ایسا تھا کہ منہ کے آگے گول سا سوراخ تھا' اسی طرح ناک اور کانوں کے برابر بھی سوراخ تھے جو شاید قیدی کے کھانے پینے اور سننے کی سہولت کے لئے تھے۔ موٹے لوہے کے ٹکڑوں سے بنا ہوا یہ پنجرہ کسی انتہائی ہنرمند ہاتھوں کا تیار کردہ دکھائی دیتا تھا' کسی صاحبِ کسب و کمال آہن گر نے خوب مشاقی سے لوہے کا انسانی چہرہ بنا دیا تھا۔

• ننگِ [illegible]

بالکل ایسا ہی ایک چہرہ میں نے بہت عرصہ پہلے مشرقی پاکستان میں دیکھا تھا۔ سندر بن کے نشیبی دلدلی علاقوں اور تاریکیوں کی دھند میں لپٹے ہوئے اسراروں' طلسموں کی مانند گھنے گہرے جنگلوں میں مسلسل چھ سات ماہ کی خجل خواری اور گدھے سواری کے بعد میں مختلف جنگلی اور دلدلی قسم کے عوارض میں مبتلا ہو کر اپنے ایک بنگالی ہندو بنیے کے ہاں کاکس بازار کے علاقے بھورگنج میں پڑا ہوا "ہائے ہائے' اوئی اوئی" کر رہا تھا۔ جنگلی اور دلدلی مچھروں' مکھیوں' ٹڈیوں' آب و ہوا اور نامعقول قسم کے جنگلی اور بنگالی انداز کے خورد و نوش نے مجھے بخار' یرقان' خفقان اور نسیان کے عوارض میں جکڑ رکھا تھا۔ ساگ پات' بھات اور مچھلی کھا کھا کر میں خود بھی کوئی کیچوا' کچھوا یا کوئی ڈڈو قسم کی آبی مخلوق بن چکا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کا یہ عالم کہ بات کرنے کے لئے مجھے اپنی زبان اور ہونٹ خود پکڑ کر ہلانے پڑتے تھے۔ آنکھوں میں پیلیا کچھ یوں اترا ہوا تھا کہ بنگالی مجھے چینی اور جاپانی دکھائی دیتے تھے' میرا اپنا کالا لباس مجھے مایوں کا پیلا پہناوا دکھائی دیتا تھا۔ رنگ سڑ گیا تھا۔ اس میرے بنیے پروفیسر' شاعر' وید بھگت ویاس واویلا نے جو پکا ویدانتی تھا مجھے اپنے موروثی وید کی تیز بہدف جڑی بوٹیوں والے جوہر جوشاندے پلا پلا اور اپنے شعر سنا

سُن کر اس مقام آخریں پہ لا کھڑا کر دیا ہوا تھا کہ مجھے فل الفور' جبراً قہراً اسے قتل کر دینے کا ارادہ باندھ لینا پڑا۔ اظہر من الشمس تھا کہ اگر میں مروّت سے کام لیتے ہوئے یہ انتہائی قدم اٹھانے کا نہ سوچتا تو وہ مجھے جوشاندوں کا بطی الاثر زہر پلا پلا کر ''مفعلن' مفعلن' فاعلان'' کر دیتا اور میں بنگلہ دیش میں مشرقی پاکستان کی موت' بے موت مر گیا ہوتا اور پھر کاکس بازار کی تنگ و تاریک گلیوں سے کیلوں کے پتوں سے سجی ہوئی میری ارتھی گداوڑی کے شمشان گھاٹ کی جانب جا رہی ہوتی۔ کٹر ویدانتی ہونے کے باوصف' وید بھگت ویاس واویلا ایک انتہائی گھٹیا قسم کا متعصب تھا' وہ یقیناً مجھے دفنانے کی بجائے جلانا زیادہ پسند کرتا کہ کم خس جہاں پاک ہو جائے لیکن اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس تمام تردد کی نہ مجھے ضرورت پیش پڑی اور نہ آئے' اور ہم دونوں ازلی کمینے ایک دوجے کی خباثتوں سے بچ گئے تھے۔

وہ کہیں سے خبر لایا تھا کہ پچاس کوس پچھم کے باہمن کی گاؤں کا مکھیا کالے یرقان اور سندر بن کی قاتل مکھی ''بھڑی'' کے کاٹنے کے بخار کا شافی علاج کرتا ہے۔ فیس نہ کوئی نذر نیاز بس دو چار روز افاقے تک اس کے آشرم میں رہنا پڑتا ہے۔ جل بھوجن' دوا دارو پہ بھی کوئی دام نہیں پڑتے اور ٹہل سیوا کرنے والے سیوک بھی کچھ طلب نہیں کرتے۔ چار کندھوں پہ جانے والا دکھیارا ہنستا مسکراتا اپنے دو پاؤں پہ چل کر لوٹتا ہے۔ [illegible] جاتے ہیں۔ وہ بھی کوئی اسی کا منہ بھائی بند ہوگا' وہ لنکا ہی کیا جہاں کوئی باون گز سے کم کا ہو۔ یہی سوچ کر بھگت ویاس واویلا کے ساتھ ہو لیا کہ وہ مکھیا بھلے کالا ناگ ہی کیوں نہ ہو' اس موروثی وید کے کڑوے کسیلے جوشاندوں سے تو جان چھوٹے گی۔ کچھ سفر ریل گاڑی' کچھ راستہ بیل گاڑی اور پھر ایک لمبی پگڈنڈی پیدل طے کر کے بالآخر ہم تیسرے پہر سے اس مکھیا کے گاؤں پہنچ ہی گئے۔

ایسا سرسبز اور خوشحال گاؤں مشرقی پاکستان میں کہیں کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہاں کے باسیوں کے تن انگ سے بھی آسودگی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی' گو سفر کی صعوبت نے مت ماری ہوئی تھی مگر پھر بھی میں تر و تازہ چہرے' فربہ تندرست مال مویشی' صاف ستھرے گھر گھروندے' مچھلیوں سے بھرے ہوئے تالاب' اور گھور کھلیان چگتی ہوئی مرغیاں چوزے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اسی دیکھا دیکھی میں ہم مکھیا جی کے آشرم تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی سبحان اللہ والا معاملہ تھا۔ صاف ستھری عمارت' چاک و چوبند' دھیرج دیا والے کارندے...... ''جے رام جی کی'' کر کے ہم بھی دیگر دکھی مریض لوگوں میں مل کر بیٹھ گئے۔ اسی دوران اکا دکا اور مریض بھی آتے گئے۔ اگلے قریب قریب ایک گھنٹے میں آشرم کا کھلا صحن مریضوں سے بھر چکا تھا۔ ہر مریض کے پہنچتے ہی اسے ایک پیتل کا پترا سا تھما دیا جاتا جس پہ اس کا نمبر ہوتا۔ میرا وہاں

بارھواں نمبر تھا...... بیٹھے بیٹھے پاؤں کولہے سُن سے ہونے لگے تو میں نے دھیرے سے پروفیسر واویلا کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ مُکھیا جی اپنا مُکھڑا کب دِکھائیں گے...... دیکھ رہے ہو کتنے لوگ جمع ہو چکے ہیں......؟''

وہ مریضوں سے جل تھل صحن پہ اک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''مُکھیا جی کا مُکھ تو یہاں آج تک کسی نے نہیں دیکھا...... باقی رہی ان مریضوں کی بات' تو ان میں آدھے سے زیادہ تو جل بھُوجن کے لئے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کچھ دان پن لینے والے ہیں اور چند ایک ہی ہوں گے جو ہماری طرح دَوا دارو کے لئے پہنچے ہوں گے......''

پروفیسر واویلا کی باتیں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں کہ سُن کر پہروں ڈوبے رہنا پڑتا ہے کہ اس بندۂ عجیب الخلقت نے کیا کہہ دیا ہے؟...... میں بھی چند لمحے غور کرتا رہا جب کچھ سُجھائی نہ دیا تو ناچار پوچھ بیٹھا۔

''اے بندۂ دانا! پہلے یہ مُکھ والی بات تو سمجھاؤ کہ ان کا مُکھ کیوں کسی نے نہیں دیکھا' اور پھر دُوسری نہ سمجھ میں آنے والی باتیں دریافت کروں گا......''

وہ ماتھے پہ تیوری چڑھا کر بولا۔

''کبھی کسی بات کے لقمے کو بغیر چبائے ہوئے بھی نگل لیا کرو' دانت جبڑوں اور آنتوں کے لئے اچھا ہوتا ہے...... مُکھ والی بات کا جواب دینے کا اب وقت نہیں رہا۔ وہ دیکھو سامنے چادر تانی جا رہی ہے اور مُکھیا جی اب پدھارنے ہی والے ہیں۔ اُن کے پنڈال میں پدھارتے ہی تمہیں تمہاری بات کا جواب مل جائے گا......''

اس سے پیشتر کہ میں ایک بار پھر اس کی بات پہ غور کرتا' ایک لالو پرشاد سا گول گپا قسم کا آدمی جس نے بھدرا کرایا ہوا تھا' زور زور سے نیم کے جھاڑ سے لٹکی ہوئی کانسی کی ٹلی کھڑکانے لگا۔ لوگ باگ ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے اور اپنی اپنی نمبروں والی پتریاں دیکھنے لگے۔ میری نظریں سامنے برآمدے میں دائیں بائیں دو ستونوں کے درمیاں کھنچے ہوئے پردے پہ جمی ہوئی تھیں جس کے پیچھے ایک بڑا سا چوبی چوکا بچھا ہوا تھا۔ چوکے کے دائیں بائیں پگڑیاں باندھے دو انتہائی مستعد اور مضبوط سے کارندے بیٹھے ہوئے منتظر لوگوں کو گھور رہے تھے۔ یہ بالکل ایسا سماں تھا جیسے گاؤں گھروں میں رام لیلا کے تماشے دِکھائے جاتے ہیں۔ ڈھولکیں' کھڑتالیں' نفریاں' شہنایاں اور کانچ کھڑکائے جاتے۔ پھر شور اور قہقہے سنائی دیتے' پھر آہستہ آہستہ پردہ سرکتا اور رام گوپالے مکھن چراتے دِکھائی دیتے...... پروفیسر واویلا نے اچانک مجھے کہنی

سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''بس اب مُکھیا جی درشن دینے ہی والے ہیں......''

ایک بار پھر ٹلی کھڑکی اور پردے کے پیچھے کچھ سرسراہٹ اور بھنبھناہٹ سی ہوئی' یعنی مُکھیا جی مہاراج پدھار چکے تھے۔ پردے کے دائیں بائیں اب دو صاف ستھری' صحتمند سی عورتیں بھی آ براجی تھیں۔ ایک بار پھر ''ٹَن'' کی آواز تھرتھرائی' کانسی کی ٹلی پہ لوہے کا ڈھرا پڑا تھا۔ پہلے نمبر والی ایک جوان سی لڑکی تھی اور سامنے تنی چادر کے نیچے پڑے ہوئے لکڑی کے چوکے پہ بازو کھول کر کھڑی ہو گئی۔ دائیں طرف والی عورت نے اُس سے نمبر والی چِٹ لی اور اسے ذرا سا آگے سرکایا۔ اُس کے بازوؤں کو ذرا اور کھولا' سر کو آگے کی جانب ہلکا سا جھکایا۔ اب وہ لڑکی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ابھی پردے کے پیچھے سے ''وَن ٹُو' تھری'' کی آواز آئے گی اور یہ پرواز کر جائے گی۔ میں مبہوت سا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ بیزار سے بیٹھے ہوئے پروفیسر واویلا کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

''تم نے تو کہا کہ مُکھیا جی درشن دینے والے ہیں' یہاں تو یہ کنیا نرت درشن کے بھاؤ بتا رہی ہے۔''

پروفیسر واویلا نے مجھے ایسے گھورا جیسے دل میں کہہ رہا ہو ہے بھگوان! اس بڈھی کے بھگوڑے سے سابقہ پڑی ہے...... پھر بے دلی سے بتانے لگا۔

''یہ کنیا نرت کے بھاؤ تاؤ نہیں دکھا رہی بلکہ اپنی بپتا' بیماری بتا رہی ہے......''

اتنا کہہ کر وہ پھر لڑکی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ لڑکی نے اب اسٹائل بدل لیا تھا یعنی اب وہ سائیڈ پوز دے رہی تھی اور دونوں بازو سیدھے کیے ہوئے تھے۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا' بڑی محبت سے پروفیسر واویلا کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت فدویانہ انداز میں عرض کی۔

''پروفیسر واویلا صاحب! نگاہیں اور نیت بے تامل اُدھر اسٹیج کی جانب ہی رکھیے' صرف مُنہ سے مجھے بتا دیجیے کہ یہ وجنتی مالا' ہیلن اور وحیدہ رحمان بھی فلموں میں کچھ ایسے ہی انداز میں......''

وہ میری بات کو بیچ میں ہی قلم کی طرح کاٹ کر بولا۔

''وہ ہیرو اور پبلک کو اپنی تکلیف بتا رہی ہوتی ہیں......''

میں اُس کا مسکت سا جواب سن کر کھسیاتے ہوئے کہنے لگا۔

''مہاراج! میرا مطلب یہ نہ تھا' میں تو صرف اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا تھا...... اچھا چھوڑیے اس بات کو' مجھے صرف یہ بتائیے کہ ہر مریض کو خواہ وہ عورت ہو یا مرد' بوڑھا بچہ' بچی یا کوئی جوان'

کیا ہر کسی کو ایسے ہی انداز اور پوز بنا کر اپنا دُکھ یا مرض بتانا بلکہ دکھانا پڑتا ہے یا کچھ مریضوں کی مکھیا جی نبض' آنکھیں' زبان وغیرہ بھی دیکھتے ہیں؟''

اُدھر لڑکی بائیں جانب کا پوز بنائے ہلکی سی جھکی ہوئی کھڑی تھی' پروفیسر واویلا اُدھر سے نظریں ہٹائے بغیر مجھے بتانے لگا۔

''خان صاحب! مکھیا جی پردے کی دوسرے جانب بیٹھے مریض کے سائے کو ملاحظہ کرتے ہوئے اس کے مرض کو پکڑ رہے ہیں' یہ اُن کی اپنی خاص خاندانی ویدک ہے۔ وہ صرف سایہ دیکھتے ہیں۔ نبض' آنکھیں' ناخن' زبان یا خون پت کی رنگت وغیرہ نہیں دیکھتے......''

''سُبحان اللہ......!'' اچانک میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''پیارے مسٹر واویلا! میں نے یہاں تک تو سُن بلکہ دیکھ رکھا تھا کہ اُچھل کود' یوگا کی مختلف ورزشیں اور چند اقسام نرت و رقص سے ہمہ بیماریوں کا شافی علاج ہوتا ہے مگر آج کے اس ''مریض ڈانس'' کا ملاحظہ میرے لئے بہت بڑا انکشاف ہے کہ مریض کے نرت بھاؤ دیکھ کر معالج اس کے ظاہری باطنی امراض کو کھوج لیتا ہے......''

اِدھر تنیا ''پردہ سکرین'' سے اُتری تو اُدھر مسٹر واویلا نے اگلے نمبر پہ ایک بڈھے کو پردے کی جانب بڑھتے دیکھ کر پہلو کو چہرے پر فخر و غرور لاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں ایسا ہی ہے۔ اپنی اپنی ویدک' حکمت اور طریقۂ علاج ہے......''

مسٹر واویلا بتاتا چلا گیا کہ اِدھر بنگال میں تو ایسے ایسے سیانے اور وید ہیں جن کے پاس مریض کو لے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' بس ایک دن رات تن پہ پہنا ہوا کپڑا ساتھ لے جاؤ' وہ کپڑے کو سُونگھ دیکھ اور چھو کر ہی دوا دارو باندھ دیتے ہیں' کیا مجال جو تشخیص مرض میں کوئی سقم ہو۔ پردہ دار خواتین جو حکیموں اور ویدوں تک سے پردہ نشین ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھ پیر کو چھونے تک نہیں دیتیں' ان کی کلائی پہ بندھے ہوئے دھاگے کے اگلے سرے سے نبض سمجھ کر مرض معلوم کر لیتے ہیں۔ ایسے مہامنش ویدی سنیاسی بھی ہیں جو محض مریض کے ہاتھ کی کسی اُنگلی سے تراشے ہوئے ناخن اور سر کے بال کو محض اک نظر دیکھ کر ہی اگلے جنم میں لگنے والی بیماری کی بھی خبر دے دیتے ہیں۔ اسی طرح سایہ اور پرچھائیں پڑھنے والے بھی مہان بھی موجود ہیں اور ان مکھیا جی کا شمار بھی انہی مہامنشوں میں ہوتا ہے۔

نمبر دو پہ مریض بڈھے نے بھی دو چار انگ بھاؤ دکھائے اور اُتر آیا' تیسرے نمبر پر ایک بوڑھی سی عورت تھی' چلنا یا کھڑے ہونا تو کجا' وہ تو ڈھنگ سے بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے اس کے وارثوں نے اٹھا کر وہاں تک پہنچایا اور سہارا دے کر اسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ اس سے اگلے نمبر پر پھر ایک بوڑھی

عورت تھی مگر اسی دوران اچانک سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ جانے سے سلسلۂ تشخیص رُک سا گیا' معلوم ہوا کہ پچھلے پہر کے ڈھلتے سورج کی روشنی کا ہی سارا کھیل ہے۔ مریض پہ سورج کی ترچھی کرنیں پڑتی ہیں' پردے پہ مریض کا سایہ پڑتا ہے اور دوسری جانب بیٹھا ہوا مُکھیا سایہ ملاحظہ کر کے مرض معلوم کر لیتا ہے۔ مریض اور معالج کے مابین کسی قسم کا کوئی مکالمہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ معالج محض سائے سے مریض کی عمر تک معلوم کر لیتا ہے...... دیکھتے دیکھتے آخر میری باری بھی آ گئی۔ ''یا اللہ خیر!'' کہہ کر میں بھی پردے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور مُکھیا کے معاونین کے حکم کے مطابق میں بھی اپنے انگ انگیرے بدلتا رہا' بلکہ بدلتا ہی رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا ''رقصِ درویش'' شاید مُکھیا جی کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا ہے۔ مجھے ایسے ایسے انداز اور انگ بھاؤ بتانے پہ مجبور کیا جاتا رہا کہ جیسے میں مُکھیا جی کے آشرم میں نہیں' نبیل چوہدری کی ڈانس اکیڈمی میں کسی خاص ڈانس کی ریہرسل کر رہا ہوں۔ مجھے اچھا خاصا رگیدنے اور نچانے کے بعد مُکھیا جی کے ایک خاص کارندے نے مجھے انتہائی احترام سے ایک علیحدہ اور پُرآسائش سے کمرے میں لا کر بٹھایا۔ پروفیسر واویلا بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ یہ کمرہ آشرم سے ہٹ کر ایک علیحدہ سے حصہ میں واقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چاروں اَبرو بھدرا کیے' لنگی لنگوٹ چڑھائے' چیچک زدہ بشرے پہ ایک اچھا خاصا [illegible] ایک شخص اندر داخل ہوا اور نگاہیں بچھا کر گویا ہوا۔

''مُکھیا جی کی اِچھا ہے کہ آپ یہاں پہ دھیرج اور سکھ شانت سے بیٹھیں' جل پانی سے مَن پرچائیں۔ پنڈال منڈل سمپورن ہونے پہ ملاقات ہوگی......''

یہ کہہ کر اُلٹے پاؤں وہ ''کچھوکما'' سا شخص جدھر سے آیا تھا' اُدھر ہی نکل گیا۔

''مائی ڈیئر پروفیسر واویلا! کچھ پلے نہیں پڑا...... دوسرے مریض تو اُدھر ہی برآمدے میں بٹھائے جا رہے تھے' ہم سے یہ وی آئی پی سلوک......؟''

''بھیا! تم پروفیسر واویلا کے ساتھ پدھارے ہو' کسی نتھو خیرے کے ساتھ نہیں۔ ہمارا سنگ سنگوڑنے سے ایسے ہی عیش پڑتے ہیں......''

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ماش کے ملیدے کی مانند زیادہ اینٹھنے کی ضرورت نہیں...... ڈیڑھ گھنٹے سے اُدھر میدان میں دھرنا دیئے' بے نیل و مرام لنڈورے سے بیٹھے سڑتے رہے' کسی نے نام تک نہ پوچھا کہ بھائیو! مُنہ میں کتنے دانت اور پیٹ میں کس ذات کی آنت ہے۔ کیا اُدھر تمہاری وی آئی پی' نہیں دکھائی نہیں دی تھی......''

''ہر بات اور گھات کا کوئی سمے ہوتا ہے...... بس دیکھتے جاؤ' آگے آگے کیا ہوتا ہے......''

بھوک پیاس سے نڈھال سا ہوتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

''مہاراج! جب سے میں یہاں آیا ہوں' بس دیکھ ہی تو رہا ہوں' کچھ کھا پی تو نہیں رہا...... باہر کم از کم کچھ دیکھنے سننے کو تو تھا' یہاں تو صرف تم ہی تم ہو جسے دیکھ دیکھ اور سن کر مجھے ہر طرح کی بدہضمی ہو چکی ہے......''

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو......؟''

''جی' آپ...... جو کچھ بھی میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس کا مرکز آپ کی ہی ذات ہے۔ مکھیا جی سے تو ابھی میرا باقاعدہ طور پہ پریچے ہوا ہی نہیں......''

مکھیا جی کا ایک ملازم سرکنڈوں سے بنے ہوئے ایک ٹرے نما برتن میں آدھے کاٹے ہوئے چھلکوں اور بالوں سمیت کچے ناریل لے کر آیا جن میں پانی اور نرم نرم' ملائم' مدھم سی مہک والا گودا بھرا ہوا تھا جیسے کسی نے دودھ چاول کی ذائقہ دار کھیر بنا کر بھیجی ہو' ساتھ پیغام تھا کہ آپ لوگ جل پان کریں' رات [illegible] ملازم نے کمرے کے ساتھ بنے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود ہے' اشنان سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کر لیں......'' ایک کانسی کی گھنٹی تپائی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دیں' میں حاضر ہو جاؤں گا......''

ملازم کے باہر نکلتے ہی ہم دونوں جنم جنم کے بھوکوں کی طرح ناریلوں کی کھیر پہ ٹوٹ پڑے...... یہ بنگال کے ایک مخصوص علاقے کی خاص ڈش ہے۔ کچے ناریل کے گودے اور پانی میں موٹے بھات پکائے جاتے ہیں' کمزور اور معدے کے مریضوں کے لئے یہ مقوی مگر زود ہضم غذا کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی' غذا کی غذا اور دوا کی دوا...... کہاں کہ کئی دنوں سے ایک مکمل لقمہ تک حلق سے نیچے نہیں اترا تھا اور اب یہاں میں ندیدوں کی طرح ہڑپ ہڑپ کھا رہا تھا۔ کھانے کا خوب لطف لیا' پھر منہ ہاتھ پونچھتے ہوئے میں نے پروفیسر واویلا کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''باہر کے قرائن اور میرے بھیتر کے نرائن بتا رہے ہیں کہ کم از کم ہم آج کی رات یہیں رہیں گے......''

''...... لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے''...... پروفیسر واویلا ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے فرش کی چٹائی پہ لیٹتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ ''چلو' ٹھیک ہی ہے۔ تھکاوٹ سے سر ٹوٹ رہا ہے۔ تم بھی جھٹ کی جھٹ کچھ کمر سیدھی کر لو پھر اُٹھ کر اشنان کر لینا...... مُکھیا جی کے درشن بھی لینے ہیں......''

سونا کیا تھا' بس آدھا پون گھنٹہ کمر نکالی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا' شام اُتر آئی تھی۔ ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر وہی ملازم دھیرے سے اندر داخل ہوا اور ہاتھ باندھے' سر جھکائے کہنے لگا۔

''مُکھیا جی نے پرنام بھیجا ہے' بنتی کی ہے کہ رات کا بھوجن آپ اُن کے ساتھ کریں...... ٹھیک آدھے گھنٹے بعد آپ نہا دھو کر تیار ہو جائیں......''

اُس کے اُلٹے قدم واپس ہوتے ہی میں نے پروفیسر واویلا سے دریافت کیا۔

''پروفیسر صاحب! یہ آپ کے مُکھیا جی کیا چیز ہیں...... وید ہیں' نرا گیان ہیں یا بیراگی یا کوئی رِشی یا مہارِشی اور یہ اُن کا پردے کے پیچھے چھپ کر بیٹھنا' کسی کو درشن نہ دینا' یہ بھی میری سمجھ سے بالا ہے......''

وہ میری بات سُنی' اَن سُنی کرتے ہوئے غسل خانے کی جانب بڑھتے ہوئے صرف اتنا بولا۔

''بس دیکھتے جاؤ' دِلّی اب کچھ زیادہ دُور نہیں''

نماز سے [illegible] پھولوں کے ہار جن میں تلسی کی کونپلیں اور پتے پروئے ہوئے تھے' لئے جُھکا ہوا اندر داخل ہوا۔ بندھے ہاتھ پرنام کر کے وہ آگے بڑھا اور ایک ایک ہار ہمارے گلے میں ڈال کر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ نرسلوں کی ایک لمبی باڑھ عبور کر کے ہم تینوں ایک بڑے سے جھونپڑے کے پاس رُک گئے۔ وہ ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے جھونپڑے کے ایک حصے میں کہیں غائب ہو گیا۔ یہاں جابجا ناریل کے درخت' بانس اور ہری نرسلوں کی باڑھیں تھیں' پاس ہی ایک پختہ تالاب بھی نظر آیا جو زمین سے قدرے اونچا تھا۔ چند ایک صحتمند سے ملازم بھی آس پاس دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے کمرے کی طرح یہ جگہ بھی آشرم کی حدود سے قدرے علیحدہ تھی' یعنی آشرم اور اس جگہ کے درمیان نرسل کی باڑھ اور چند جڑی بوٹیوں اور سبزیوں کے کھیت تھے...... وہی ملازم' چندن کاٹھ کی کھڑی کھڑاویں اُٹھائے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

''اپنے چپل اُتار کر آپ انہیں پہن لیں......''

جس کسی نے یہ لکڑی کی کھڑاویں کبھی نہ پہنی ہوں اس بیچارے کے لئے انہیں پہننے کا تجربہ کچھ خوب خوشگوار نہیں ہوتا۔ یہ جوگیوں' سنیاسیوں اور گیانیوں دھیانیوں کے پاؤں کا پہناوا ہے' عام آدمی کے لئے یہ محض بوجھ بالجبر ہیں۔ مسلمان فقیروں درویشوں میں تو ان کا بالکل ہی رواج نہیں۔ یہ بڑی

غیر ضروری اور غیر فطرتی لگتی ہے۔ ''ٹک ٹک'' کی آواز سماعت پہ بڑی گراں گزرتی ہے۔ پاؤں تلے جیسے چکی پاٹ بندھے ہوئے ہوں اور پھر پیر کے انگوٹھے اور اُنگلی کے درمیان لکڑی کی سخت سنت بڑی دُکھن دیتی ہے جیسے شطرنج کی بساط سے پٹے ہوئے فرضی (وزیر) کو پکڑ کر لکڑی کے موٹے پتاوے پہ انگوٹھے اور بڑی اُنگلی کے درمیان والی جگہ پہ لا کر گاڑ دیا ہو...... کھڑاویں ''ٹک ٹک'' کرتے ہم دونوں ''وشنو'' اسی ملازم کے پیچھے پیچھے جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔

ظاہر سے باطن ہمیشہ مختلف ہوتا ہے' مکان باہر سے کچھ نظر آتا ہے اور اندر سے کچھ۔ اسی طرح انسان کا ظاہر کچھ ظاہر کرتا ہے اور باطن کچھ اور ہوتا ہے۔ صورت کچھ اور سیرت کچھ۔ جھونپڑا ہو یا کوئی کُٹیا' فقیروں درویشوں کی طرح یہ بھی بھیتر سے بڑے گپت اور گمبھیر ہوتے ہیں۔ ان کی بے سروسامانی' سادگی اور سکوت میں ہی لاہوت ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں کوئی صوفی فقیر ہو یا درویش اور ہندوؤں' سکھوں' عیسائیوں' یہودیوں' بدھوں میں کوئی رشی منی ہو یا کوئی بیراگی جوگی' گیانی دھیانی ہو یا کوئی بھکشو' لاما' پنڈت پروہت ہو یا کوئی سینٹ پادری' ان میں سے ہر ایک اپنے مالک کو جانتا پہچانتا ہے اور اُسی کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ کوئی اُسے اللہ' رب' مالک' خدا' مولا کہہ لیتا ہے۔ کوئی ایشور' پرماتما' بھگوان' پربھو پکار لیتا ہے۔ کوئی گاڈ' [illegible] فطرت' قدرت' حقیقت' ازلی ابدی [illegible] رنگ اور روپ میں وہ نظر آیا' وہ وہی کہلایا۔ کسی نے اُسے اپنے طور کھینچ تان کر ایک خط مستقیم بنالیا' کسی نے اُسے توڑ موڑ کر دائرہ بنالیا اور کسی نے مستطیل' تکون' مربع اور کسی نے اُسے بیضوی شکل دی۔ کسی کو کوہ طور پہ تجلی میں نظر آیا' کہیں وہ غارِ حراء میں وحی کے پردے میں دکھائی دیا' کہیں معراج کی شب عرش کی خلوت میں جلوہ افروز ہوا۔ کسی کو برگد کے نیچے' کسی کو سُولی کے اوپر' کسی کو سُورج اور کسی کو مُورت میں دکھائی دیا۔ کہیں وہ آگ میں چمکا' کہیں وہ راگ میں لپکا۔ کسی کی صورت دیکھ کر وہ یاد آیا اور کسی کی سیرت میں اس کا پرتو نظر آیا۔ کسی کی تخلیق میں وہ اُبھرا اور کسی تحقیق میں وہ سامنے آیا۔ کسی کے طریق و وصف سے وہ جھانکا اور کسی کے ہُنر و کسب سے وہ ہویدا ہُوا اور وہی خُدا ہُوا---!

یہ جھونپڑا بھی اندر سے ایک گپھا یا غار کی مانند تھا۔ فرش پہ سُرنت اور نرسل کے ریشوں سے بنی ہوئی چٹائیاں بچھی تھیں۔ ایک کونے میں چندن' ہرمل اور لوبان کی دُھونی اُٹھ رہی تھی' روشنی کے تکلف کے لئے ایک زرد رو قمقمہ روشن تھا۔ دو چار بھدرا کئے ہوئے ملازم مستعد استادہ تھے۔ چٹائی پہ ایک کپڑے کا دسترخوان سا بچھا ہوا تھا جس کے درمیان لکڑی کی ایک گول قاب میں نیم کی نمولیاں' گُنے کے پھول' کچا ناریل اور چند ایک ہری ہری داتنیں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے ذرا ہٹ کر قدرے کم روشنی میں کاٹھ کے چوکے پہ

ایک عجیب و غریب سی ''چیز'' گیروے رنگ کی چادر میں لپٹی ہوئی آسن جمائے بیٹھی تھی اور حیرت سے مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میرے قدم رُک گئے' میں اس پُراسرار ہستی کو دیکھنے میں ایسا مگن ہوا کہ یہ خیال بھی نہ رہا کہ مجھے قاعدے طریقے کے مطابق سلام یا پرنام کرنا چاہئے تھا۔ وہی تپسّیوں' بھکشوں والا آسن۔ دایاں ہاتھ سرس کنڈل پہ دھرا تھا اور انگلیوں میں چھ مالا تھی۔ سیدھے چوڑے شانوں پہ ایک سر بھی ہونا چاہئے تھا مگر...... میری حیرت کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اس کے شانوں پہ سر کی جگہ چاندی کا ایک مرتبان سا رکھا ہوا تھا۔ آنکھوں اور منہ' ناک کے سامنے سوراخ سے تھے مگر ان کے آگے بھی چاندی کی موٹی سی جالی لگی ہوئی...... اچانک ہکلائی ہوئی آواز اُبھری' جیسے کوئی ناک میں بہ دقت بول رہا ہو۔

''مجھے آپ کا سواگت کرتے ہوئے بڑا آنند ملا ہے...... آپ بیٹھئے' جل بھوجن کیجئے۔ پھر آپ سے چنتا روگ کے بارے میں بات ہوگی......''

اگلے چند لمحوں میں کیلوں کے پتوں اور ناریل کے پیالوں میں بھوجن پروس دیا گیا' وہی چاولوں اور کچے ناریل کے گودے اور دودھ کی پھیکی کھیر۔ کچے کیلے کے کھٹے کچالو' لوبیا اور بیسن کی ٹکیاں...... اللہ کے پاک نام کی پھونک ماری اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے کھانا کھایا جبکہ میزبان خاموش بے حس و حرکت اپنی تپسیا میں ڈوبا ہوا تھا اور میں کھانا کھاتے ہوئے کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہی حال پروفیسر واویلا کا بھی کہ جب سے وہ اندر آیا تھا' اس کی مکمل طور پہ بولتی بند تھی اور نہ ہی ہم دونوں نے آپس میں کوئی بات کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی بیماری و ماری بھول ہی چکا تھا۔ کہاں آج صبح میں اپنی کمزوری اور نقاہت سے بے حال سا دو قدم بھی چلنے کے قابل نہ تھا۔ آنکھیں کھنچی ہوئی تھیں ایک آدھ لقمہ بھی پیٹ میں اتارنے کا اہل نہ تھا اور اب چند گھنٹوں میں چاق و چوبند اور جیسے ہر آزار سے آزاد ہو گیا ہوں...... کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک ملازم نے نہایت ادب سے داتن بڑھاتے ہوئے دانت مانجھنے اور ہاتھ منہ دھونے کا مشورہ دیا...... اب ہم دوبارہ اپنی نشستوں پہ بیٹھ چکے تھے۔ مُکھیا جی نے بڑے دھیرج سے پروفیسر واویلا سے کہا۔

''آپ مہاراج اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں' میں خان صاحب کی بیماری کے حوالے سے ان سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں......''

پروفیسر واویلا ایک ملازم کے ساتھ رُخصت ہوا تو مُکھیا جی نے دیگر تمام اہلکاروں کو بھی باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ کاٹھ کباڑ سے خلوت نصیب ہوئی تو مُکھیا جی اپنے چوکے سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں میں نے مناسب سی روشنی میں غور سے ان کا جائزہ لیا' آنکھوں کے جالی بند سوراخوں

سے مجھے اُن کی شعلوں کی مانند دَہکتی ہوئی آنکھیں بھی دِکھائی دیں۔ اُن کا قد کاٹھ' ظاہری شخصیت بڑی رُعب دَاب والی تھی۔ وہ اِک مہاتما کا رُوپ سُروپ دِکھائی پڑتے تھے اور مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمیں یہاں روکنا' علیحدہ کمرے میں ٹھہرانا' ایسی خصوصی آؤ بھگت اور خاطر داری اور اِس وقت مجھ سے علیحدگی میں ملنا یقیناً یہ سب کچھ خالی از عِلّت نہیں...... وہ میرے سامنے سر جُھکا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔

''مہاراج! آپ کی آگیا ہو تو میں آپ کے چَرن چُھونا چاہتا ہوں۔ مجھے وشواس ہے کہ آپ مجھے نراش نہیں کریں گے...... '' اس سے پہلے کہ میں اُسے کوئی جواب دیتا' مُکھیا جی میرے پاؤں کو چُھو چکے تھے...... ''مہاراج! مجھے آپ کا ایک مدّت سے انتظار تھا۔ میرے دَھن بھاگ کہ آپ یہاں پدھارے...... میں ویدانتی ہوں' اللہ کو ایک مانتا ہوں۔ ماس نہیں کھاتا' بیاج نہیں لیتا دیتا' بتوں کی پوجا نہیں کرتا۔ ربّ کے دُکھی بندوں کی خدمت سیوا کرتا ہوں۔ ایک سو ایک بندے کا لنگر بھوجن مولا علیؑ کے نام کا ہر روز یہاں بنتا ہے۔ آپ کے کالے کپڑے اور مُکھ دیکھ کر ہی مجھے وشواس ہو گیا تھا کہ آپ ہی وہ مولا علیؑ کے ملنگ ہیں جن کا مجھے انتظار تھا...... ''

میں حیران پریشان سا اُن کی یہ عجیب سی باتیں سُن رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ چاندی کے پترے سے بنے ہوئے خود یا اس پُراسرار سے نقاب کو دیکھ رہا تھا جو اُس کے پورے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ مُنہ کے آگے جالی کے سوراخوں سے اُس کی آواز اِس طرح خارج ہوتی تھی جیسے وہ گوشت پوست کا اِنسان نہ ہو' کوئی روبوٹ یا کسی سائنس دان کا بنایا ہوا ایسا انسان ہو جس کا سارا دھڑ اِنسانی اور صرف سر مشینی ہو...... میں اُسے دیکھنے اور جاننے میں ایسا محو تھا کہ اُس کے آخری ایک دو جملے میں سُن ہی نہ سکا...... وہ ہاتھ جوڑے کہہ رہا تھا۔

''مہاراج! آپ میری بنتی سُن رہے ہیں نا......!''

میں نے ہڑبڑی میں یوں ہی اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر یونہی کہہ دیا۔

''میں آپ کو مُکھیا جی کہوں' وید جی یا اچاریہ جی کہہ کر مخاطب کروں......؟''

اُنہوں نے میرے گُھٹنے چُھوتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے اپنا سیوک اور بالکا کہہ کر پکاریں......''

میں نے بڑے آرام سے اُن کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! آپ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں...... میں تو خود آپ کے بالکوں جیسا

ہوں' اتنی دُور سے آپ کا نام اور آشرم کا بھان بھاؤ سُن کر اپنی بیماری اور لاچاری کی دوا درمان لینے آیا ہوں۔ آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ مجھے معتدی بخاروں اور کالے یرقان نے بے حال کر رکھا ہے۔ دیسی' انگریزی سارے علاج معالجے آزما چکا ہوں...... بنگال کی سیاحت کے لئے آیا تھا' اب چھ سات ماہ سے یہیں پھنسا بیٹھا ہوں۔ کرپا کر کے میرے دُکھ کا کوئی اُپائے کریں تاکہ میں یہاں سے واپس اپنے گھر جا سکوں...... مجھے یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔"

مُکھیا جی بڑے عجیب انداز میں ہلکا سا ہنسے جیسے حلقوم' زبان' ہونٹوں یا صوتی لہروں پہ اُن کا مکمل کنٹرول نہ ہو' نطقی سسٹم کہیں ڈسٹرب ہو گیا ہو۔ پھر بولے۔

"خان صاحب! آپ جب یہاں پدھارے تھے' اُس وقت آپ کی حالت کیا تھی اور اس وقت آپ کیسا محسوس کرتے ہیں' یہ آپ خود بہتر بتا سکتے ہیں...... آپ کا علاج ہو چکا' اب آپ بخاروں اور پیلیئے سے چھٹکارہ حاصل کر چکے ہیں۔ آئندہ کبھی جیون میں آپ کو بخار اور پیلیا نہیں ہو گا......"

میں ہکا بکا سا اُس کا یہ انکشاف سُن رہا تھا' قدرے ہکلا کر پوچھنے لگا۔

"آپ نے مجھ سے میرا مرض پوچھا اور نہ ہی کوئی دوا دی پھر یہ میری بیماری خود بخود کیسے دُور ہو گئی......؟"

مُکھیا جی نے خوب جواب دیا۔ "میں نے آپ کا مرض آپ کے پَرتو سے جان لیا تھا اور دوا تو دو وقت کے جل بھوجن میں آپ کو کھلا دی گئی تھی...... ہاں' ایک اور بات آپ نے محسوس کی ہو گی کہ آپ کو پردے کے سامنے کافی دیر تک رُکنا پڑا' مختلف انگ بھاؤ بدل بدل کر آپ پچھتے کے لئے پریشان بھی ہوئے۔ دراصل میں مزہ لے رہا تھا۔ آپ کے سریر کے پَرتو چھایا نے ایسے ایسے بھید بھاؤ کھولے کہ میری تو بُدھی ہی ماری گئی' چھایا اور چھل وید کو بھی جیسے پسینہ آ گیا...... مہاراج! آپ کی سرل کایا بڑی مہان تو اور اُتم بھید وچار ہے...... سیوک سیس نوا کر یہ بنتی کرتا ہے کہ میری یہ سنکٹ جو میرے لئے جیون روگ بن گئی ہے' اِس سے میرے پران چھڑائیں......"

میں آنکھیں پٹپٹا کر مُکھیا جی کی یہ نہ سمجھ میں آنے والی بھاشا اور اُن کے وچار سُن رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اُنہیں کیا جواب دوں' کس طرح سے اُنہیں کہوں کہ مہاراج! آپ میری جان چھوڑیں۔ میں تو یہاں اپنی کہانی لے کر آیا تھا' آپ نے اپنا ناول سُنانا شروع کر دیا ہے...... بات کا موقع ملتے ہی میں نے ممیانے کے سے انداز میں عرض کی۔

"مُکھیا جی! آپ نے جو کچھ بھی میرے بارے میں اپنی وِدیا وید سے سمجھا جانا ہے وہ کچھ

غیر محتاط سا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم مسلمان دراصل ایسے اُلٹے سیدھے چمتکاروں پہ ذرا کم ہی یقین کرتے ہیں اور جیسا کہ آپ میرے بارے میں گمان کئے ہوئے ہیں اگر واقعتاً میں ایسا ہوتا تو مجھے اپنی اس معمولی سی بیماری کے ہاتھوں ایسا پریشان ہونے کی ضرورت نہ ہوتی اور نہ ہی میں اتنی دور آپ کے چرنوں تک آنے کا کشٹ اُٹھاتا' وہیں بیٹھا بیٹھا اپنا کوئی اُپائے لڑا کر شانت ہو جاتا......"

چاندی کے بند پنجرے کے اندر بند پنچھی کے چہرے پہ کیسے تاثرات تھے یا آنکھوں میں کیسی کیسی بیچارگیاں اُمڈی یا ڈوبی تھیں' میں تو کچھ اندازہ نہ کر سکا البتہ اُس کی لہجے کی کسمساہٹ سے میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ میری اس بودی اور ہلکی دلیل سے جُز بُز سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑی آہستگی مگر مضبوط سے لہجے میں کہنے لگا۔

"مجھے علم ہے کہ ایک اچھا مسلمان چھل کپٹ اُپائے اور جھوٹ مکر سے دُور رہتا ہے اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ سُر لوگ سنت کا سریر دھارن ہیں...... سرل آتما گیانی ہیں' بڑے بڑے مہارشیوں اور دھرماتماؤں کے آپ بالک ہیں۔ کالے سرپ آپ کے سیوک اور پورتماتمائیں آپ کی سہائے میں رہتی ہیں......"

میں نے درمیان میں بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آپ کی بڑی کرپا ہوگی اگر آپ میرے بارے میں ایسے شبد استعمال نہ کریں جو نہ تو میری ذات سے لگا کھاتے ہیں اور نہ مجھے شوبھا دیتے ہیں...... آپ کی بڑی دیا ہوگی اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ میں آپ کے کس کارن کا ہوں' ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کو میرے متعلق کوئی سخت قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے......"

اُنہوں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"خان صاحب! مجھے آپ کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے' آپ کہہ دیں کہ وہ غلط ہے اور اگر یہ سب کچھ درُست ہے تو میرا اَنت منت آپ کے چرنوں میں ہے۔ آپ مجھے اُس دیوی کے سراپ سے نکال دیں جس نے پندرہ برس سے میرے جیون کو نرگ بنا رکھا ہے۔ میں زندوں میں ہوں اور نہ مُردوں میں' صبح وشام نرگ کی اگنی میں بھسم ہو رہا ہوں۔ اپنے پاپ اپرادھ کے پراچت کے لئے مجھے کوئی راہ راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میں ویدانتی ہوں' ایک پالن ہار پہ وشواس رکھنے والا' کلکتہ میں پیر سائیں صمصان باباؒ کے ہاں حاضری دینے والا' خواجہ غریب نوازؒ کے چرنوں کو چُومنے والا...... سلطان الہندؒ سرکار، قطبؒ کلیر شریف، داتا ہجویریؒ، اجودھن شریف'

سہون شریف' مَیں ہر جا' ہر دَر کا کتّا ہوں۔ لاَالٰہ اِلاّاللہ محمدُ رّسول اللہ۔ مَیں مدینے والی سرکار کا غلام' مولا علیؑ کا ملنگ ہوں۔ آپ مجھ سے لاہوری پنجابی میں بات کریں' بنگالی بھاشا بولیں۔ تلنگو' ملیالم' ہندی' پُوربی' سنسکرت' مدراسی' انگریزی' عربی اور فارسی' کسی بھی بھاشا میں بات کریں۔ مَیں سنگیت کار اور چتر کار بھی ہوں۔ وید' پنڈت' جوتشی بھی اور پتر کار بھی......!''

''پھر یقیناً آپ کا تعلق شانتی نکیتن سکول آف تھاٹ سے ہے......'' اُس کے ذرا کی ذرا خاموش ہونے پہ مَیں نے یہ پوچھ لیا تھا۔

''ہاں...... مَیں اِک زمانہ گرو مہاراج رابندر ناتھ ٹیگور کے ہاں کلکتہ میں رہا ہوں۔ میرے سورگباشی پتا جی اچاریہ کشور لعل اگروال کا سمبندھ بھی شانتی نکیتن سے تھا۔ لاہور' موری دروازہ اُردو بازار کے پاس اُن کا اپنا چھاپہ خانہ اور ویدک کی کتابوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ویدانتی ہونے کے کارن وہ بھی بس نام کے ہندو تھے' اُن کا ہر کام اور طور طریقے بھی مسلمانوں جیسے تھے۔ اُٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' رسم و رواج۔ ہر صبح پیدل راوی تک جانا' واپسی پہ داتا صاحب ''سیس نوانا' دان پُن کرنا اور پھر کاروبار پہ بیٹھنا...... تقسیم سے بہت پہلے انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کو بھانپ لیا تھا۔ ایک مناسب سے وقت میں اُنہوں نے اپنا تمام کاروبار اور جائیداد فروخت کر کے یہاں بنگال میں آشرم لیا۔ یہاں اِسی گاؤں میں میرے ننھیال تھے۔ ایک اچھی خاصی اراضی خرید کر اپنے فارم بنائے اور دُکھی انسانیت کی خدمت کے لئے یہ آشرم تعمیر کیا۔ مَیں نے جب ہلکی سی سُدھ بُدھ لی تو مجھے کلکتہ' شانتی نکیتن میں بھجوا دیا۔ مَیں نے اپنی سُرت وہیں پہ سنبھالی' جوانی کی پہلی بہار بھی وہیں پہ اُتری۔ اپنے پتا جی کی طرح مَیں بھی بڑا سُندر اور سانبھر کی مانند کڑیل جوان تھا۔ دیوتاؤں کی طرح روشن' چمکتی ہوئی بڑی بڑی کٹیلی آنکھیں' لانبے لانبے گھنگھریالے برستی ہوئی گھٹاؤں سے کالے کالے بال۔ چہرہ پُروجاہت اور مُنہ بول جادو۔ میرا خاندانی پس منظر اور دُنیاوی وسائل کی آسودگیاں بھی میرے ساتھ ساتھ تھیں۔

شانتی نکیتن میں قیام کے پانچویں برس مَیں ایک شکتی اور شانتی سے روشناس ہوا جس نے میرا سکھ چین اور اُدھر ودیا شالہ میں آنے کا مقصد' سب کچھ اُتھل پُتھل کر دیا۔ وہ ایک مسلمان لڑکی شکیلہ رحمانی تھی جس کا کلکتہ کے ایک متوسط سے گھرانے سے تعلق تھا' وہ اپنے سکول ٹیچر بوڑھے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی جسے کلاسیکل فائن آرٹ سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی' تنگدست اور قدامت پسند ماں باپ کی مخالفت کے باوجود اُس نے کسی نہ کسی طرح نکیتن میں داخلہ حاصل کر لیا۔ شکیلہ جب پہلے روز کلاس میں آئی تو مَیں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ شکیلہ اپنے نام کی طرح شکیل اور تجمل تو تھی ہی مگر اُس کی سہاتا میں تو چندی کی چاندنی

کی مانند اِک علیحدہ سی نمرتا اور کُوملتا تھی۔ میں ایک طرح سے اُس کا اُستاد بھی تھا' پرانا اور معتمد طالبعلم ہونے کے ناتے میں اکثر اُستادوں کی غیر حاضری کے دوران کلاسیں لے لیا کرتا تھا۔ میرے فارغ ہونے میں دو سال باقی تھے جبکہ وہ نئی نئی داخل ہوئی تھی۔ وہ پیدائشی طور پہ ہی نابغہ تھی' سنگ تراشی اور صرف سنگ تراشی ہی اُس کا پہلا اور آخری جنون تھا جس میں وہ مزید جلا پیدا کرنے اور مستقبل میں اس فن کو پروفیشن بنانے کے لئے ڈپلومہ حاصل کرنے یہاں آئی تھی۔ شکیلہ کو یہاں داخلہ بھی بڑی ترجیحی بنیادوں پہ ملا تھا۔ ایک تو آرٹ میں اُس نے بڑے شاندار نمبر حاصل کر رکھے تھے' دوسرے اُس نے مٹی' پتھر اور دھات سے جو کچھ تخلیق کیا ہوا تھا وہ اس قابل تھا کہ اُس کے فنّی' جمالیاتی اور نُدرتی پہلوؤں پہ گھنٹوں بحث کی جا سکتی تھی۔ تیسری اہم چیز اس کی مسحور کُن اور دِل آویز شخصیت تھی۔ وہ خود بھی کسی یونانی صنم تراش کا تخلیق کردہ کوئی ایسا شاہکار تھی جسے تراشنے کے بعد اصنام گر دیوانے ہو جاتے ہیں اور یا پھر اُسی شاہکار سے سر پٹک پٹک کر جان سے ہار جاتے ہیں۔ اُس کے آنے سے مجھے یوں لگا جیسے یہی ایک کمی تھی۔ میں نے جو کچھ پڑھا سیکھا' اُس پہ تکمیل کی آخری مُہر شکیلہ ہی لگائے گی۔

اپنی خداداد صلاحیتوں' محنت' توجہ اور بے پناہ لگن کے باعث وہ بہت جلد اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی بہت [illegible] مقام حاصل [illegible] کامیاب [illegible] لکیر پیٹنے کے برعکس نئی جہتیں اور نئے اسلوب اختیار کرنا بھی جیسے اُس کی فطرت وطبیعت میں شامل تھا۔ اُس نے مجسمہ سازی اور اشکال تراشی میں ایسی انوکھی نئی فنی اختراعیں' طریقے' آسانیاں اور دلچسپیاں دریافت کیں کہ اس فن و ہنر کے بڑے بڑے اُستاد اور ماہر انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ ان ساری کامیابیوں کامرانیوں میں بہت حد تک میرا خلوص' توجہ اور محنت بھی شامل تھی۔ میں دن رات ایک مشفق اُستاد اور پُرخلوص ساتھی کی طرح اس کی ریاضت و محنت اور معاونت میں پیش پیش رہتا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں ہر قیمت اور ہر حالت میں اُس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ میری زندگی کا ہر مقصد اب اُس کی ذات پہ ہی آ کر رُک گیا تھا۔ وہ کٹر مسلمان' پانچ وقت نماز پڑھنے والی' سر اور بدن ڈھانپ کر رکھنے والی اور محرم و نامحرم کے درمیان اِک واضح فرق روا رکھنے والی تھی مگر ایک مشفق اُستاد کے طور میرا احترام وعزت کرتی' نگاہیں جُھکا کر اور ہر لحاظ سے ایک فاصلہ درمیان رکھ کر روابط رکھنے کی عادی تھی البتہ میں اُسے کسی اور نظر سے محسوس کرتا تھا۔ میرے اندر کا یہ حتمی فیصلہ تھا کہ چاہے اِس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ مذہب' ماں باپ' حتیٰ کہ زندگی' کچھ بھی قربان کرنا پڑے' میں دریغ نہیں کروں گا...... اگلے ڈیڑھ برسوں میں شکیلہ نے اتنا کام اور نام کر لیا کہ پورے بنگال اور ہندوستان میں اُس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

وہ شانتی نکیتن میں میرا آخری سال تھا' ٹھیک دو ماہ بعد میں یہاں سے فارغ ہو رہا تھا۔ اب میرے سامنے دو آپشن تھے۔ ڈگریاں لے کر اپنے گاؤں واپس چلا جاؤں یا پھر ایک اُستاد کی حیثیت سے یہیں رہ جاؤں۔ اِن ہی دِنوں گاؤں سے اچار یہ جی کا سندیس ملا کہ پڑھائی سے فارغ ہونے کی بعد فوراً واپس پلٹو۔ وہ اب ماندے رہنے لگے تھے اور پھر اُنہیں میرے بیاہ کی بھی چنتا تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ میرے گاؤں پہنچتے ہی پتا جی نے مجھے لگن منڈپ پہ چڑھا دینا ہے جبکہ میں شکیلہ کو ہر قیمت پہ جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اتفاق سے اِنہی دِنوں کلکتہ کی نیشنل آرٹ گیلری نے شکیلہ کے فن پاروں پہ مشتمل ایک سولو نمائش کا اعلان کر دیا۔ شکیلہ اور میں چند دیگر شاگردوں کے ساتھ بے حد مصروف تھے۔ وقت کم اور کام زیادہ تھا۔ کھانا پینا' آرام' سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نمائش کے بعد شکیلہ پھر مڑ اور رُک کر نہیں دیکھے گی۔ اُسے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی اس نے کبھی تمنا کی ہوگی جبکہ میری منزل کا ابھی کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ میری منزل ہے بھی کہ نہیں؟ یہ تو ایک طرح سے ایک ہاتھ کی تالی تھی جسے میں اپنے طور بجا رہا تھا۔ وہ مجھے اُستاد یعنی پتا سمان سمجھتی تھی اور میں اُسے اپنی محبت کا آسمان سمجھتا تھا۔ میں اُس سے کسی طور بھی اپنی محبت' چاہت کا اظہار نہیں کر پایا تھا۔ وہ اتنی معصوم اور پاکیزہ سی تھی کہ اُس کا سامنا ہوتے ہی میں [illegible] کی مقناطیسیت جیسے میرے خیالات' جذبات اور جرأتِ اظہار کو جکڑ لیتی مگر مجھے بہر طور فوراً کچھ نہ کچھ فیصلہ ضرور کرنا تھا۔

ایک رات ہم دونوں دیر تک بیٹھے اپنے سٹوڈیو میں پتھروں کے چہرے رگڑ رہے تھے۔ پتہ نہیں' مجھے کیا ہوا' اچانک کہنے لگا کہ "شکیلہ جی! ان پتھر کے چہروں میں ایک بات تو ہوتی ہے کہ یہ اپنے رنگ رُوپ اور رُخ نہیں بدلتے۔ ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں اور منش کا تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اُس کے چہرے کے پیچھے یا آگے کتنے اور چہرے چھپے ہوئے ہیں' نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلوص اصلی ہے یا اس کی نفرت نقلی ہے اور نہ ہی اس کی خاموشی کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ یہ بھیتر سے بھی شانت ہے اور یہ کہ اس کا شور شرابا' اس کی شوریدہ سری ہے...... وہ ہاتھ روک کر مجھے خالی خالی نظروں تکنے لگی' پرنتو حسبِ توقع وہ خاموش ہی رہی اور مکھی کو اُڑانے کے انداز میں سر جھٹک کر پھر اپنی رگڑ رگڑ میں مصروف ہو گئی۔ یہیں مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ یہ کھردرے' سخت' بے حس پتھروں کو اپنے پرکار ہاتھوں کے ہنر و لمس سے تراش خراش کر ملائمت' جاذبیت اور تاثر تو دے سکتی ہے مگر شاید جیتے جاگتے' حسیات' جذبات اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور کسی انسان کو ایک لمحہ بھر کی سچی خوشی نہیں دے سکتی۔ پتھروں' سنگ ریزوں اور ہتھوڑوں اوزاروں سے کھیلتے کھیلتے یہ خود بھی ایک بے رُوح' بے جان' بے رُخ پتھر کی

طرح بے حس اور سخت ہو گئی ہے۔ پریم پندھار پریت کی ریت اور من کا میت ایسے سُندر کومل شبد شاید اب اُس کے لئے بے معنی اور بے مقصد ہو چکے ہیں...... میں نے اب اُسے ایک دوسرے زاویے سے دیکھا۔ وہ بُری طرح مشقت میں جُتی ہوئی تھی جیسے وہ ایک تخلیق فنکار نہ ہو، سڑک کنارے پتھر روڑی کوٹنے والی دیہاڑی دار مزدور ہو۔ میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا کہ میں بہت دنوں سے تمہیں ایک بات کہنے کی سوچ رہا ہوں مگر کوئی ایسا مناسب سمے نہیں مل رہا تھا۔ آج اگر اجازت دو تو میں اپنے من کی کامنا کہہ دوں اور اگر تمہیں میرا کوئی شبد بُرا لگے تو منہ سے مت کچھ کہنا، مجھے چھما کرتے ہوئے تم میرے ماتھے پہ ہلکا سا دباؤ ڈال دینا، میں سمجھ جاؤں گا اور اگر تمہیں میری بات بُری نہ لگے تو میرے ہونٹوں کو ہلکے سے چھو لینا۔ پھر میں نے من کڑا کر کے کہہ دیا کہ میں تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں، میں جیون بھر تمہاری پوجا کروں گا۔ یہ کہہ کر میں لرزتے ہوئے خاموش ہو گیا کہ دیکھئے میری قسمت میں ملن کی خوشیاں ہیں یا پھر برہا کے ہاڑے؟

کئی پل کئی جنموں پہ بھاری سے بیت گئے۔ میری نگاہیں نیچے پڑے ہوئے ٹوٹے پھوٹے فالتو پتھروں سے اُلجھیں اور نہ ہی اُس کے ہاتھ میری قسمت سنوارنے یا بگاڑنے کے لئے اُٹھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ... وقت کے ... کا ... ہی ... سر جھکائے جھکائے جب میرا دم سا گھٹنے لگا تو میں نے ہلکا سا سر اونچا کرتے ہوئے اُس کی جانب دیکھا مگر وہ تو آگے پیچھے، پورب پچھم، دھرتی آکاش، جیسے سب سے نراش سی اپنی لگن میں یوں مگن تھی جیسے اُس نے میری بات یا بکواس سُنی ہی نہ ہو یا پھر غور ہی نہ کیا ہو، اُسے محسوس ہی نہ ہوا ہو کہ میں نے کیا کہہ دیا ہے۔ اُس کے کانوں تلے جُوں تک نہ رینگی تھی۔ میں نے اُسے دوبارہ پکارا تو وہ ہاتھ روکتے ہوئے بولی۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا......؟"

میں نے اُس کی ہرنی سی چھٹی چھٹی وحشت بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں فی الحال تو صرف دو لفظ یعنی "مس شکیلہ" ہی کہے ہیں۔ پرنتو اس سے پہلے بھی کچھ کہا تھا، شاید وہ آپ نے سُنا ہی نہیں۔"

اُس نے بغیر آنکھیں جھپکائے، بڑا سا سر انکار میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے، آپ نے اس سے پیشتر بھی مجھے کچھ کہا تھا۔"

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اپنے مجسمے کی رگڑائی میں مشغول ہو جاتی، میں نے فوراً کہا۔

''ہاں، میں نے بہت کچھ کہا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے خود بخود ہی میرے منہ سے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس نکل گئی جیسے جال پھائی میں پھنسی ہوئی کوئی چڑیا ہلکی سی راہ پا کر پُھر سے نکل جائے۔

وہ ہٹ بٹ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا ہو۔ وہ میرے پاؤں پہ اپنا پولا سا ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا! میری بُدھی میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔ پلیز! کیا آپ وہ سب کچھ دوبارہ سے دُہرا سکتے ہیں؟''

میں اب ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ جواب میں یہی کہہ سکا۔

''مس شکیلہ! شاید اب میں وہ کچھ نہ کہہ سکوں جو ان جانے میں کبھی میرے منہ سے کیسے اور کیوں نکل گیا تھا۔''

وہ بولی۔ ''میرا نہیں خیال کہ کوئی بھلی اور معقول بات دوبارہ نہ دُہرائی جا سکتی ہو۔ الاپ، تان، بول، بات، معقول کوئی اچھی کویتا، پیارا سا شعر، سُندر سا نام، خواہش، خواب، خوبی، کچھ بھی جو ریپیٹ کرنے سے کانوں کو بھلا لگے، من کو بھائے، آنکھوں میں خوشی کی چھلک اٹھے انگ انگ سرشار ہو جائے۔ ایسی بات جو کرنے سے اپنا اور اگلے کا مان بھرم بڑھے دوبارہ نہ دُہرائی جا سکتی ہو۔ پلیز! آپ من وعن وہی کچھ دوبارہ کہہ دیں۔''

وہ بچوں سی ضد کرنے لگی تو میں نے کہا۔

''مس شکیلہ! میں اسی ماہ یہاں سے فارغ ہو رہا ہوں۔ میرے پتا جی میری واپسی کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور مجھے یہ علم ہے کہ میرے وہاں پہنچتے ہی میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔ گاؤں برادری کی کسی ایسی لڑکی سے جسے میں نے دیکھا تک نہ ہوگا۔ کلکتہ جیسے شہر اور شانتی نکیتن جیسے وِدّیا شالہ میں ایک لمبی مدّت تک رہنے والا علم حاصل کرنے کے بعد میں شاید اب اپنے پتا جی کے وچار کے مطابق اپنی زندگی کا فیصلہ نہ کر سکوں۔ کچھ میرے اپنے بھی آدرش ہیں، کامنائیں اور خیالات ہیں۔ میں بھی اپنے پراپت لبدھ اور بھسنائی چیچ کو ٹٹولنے کا اُدھیکار رکھتا ہوں۔ میں بہت دنوں سے اپنے من میں ایک کومل سی کامنا چھپائے بیٹھا ہوں، زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاتا رہا کہ کہیں آپ بُرا نہ مان جائیں۔ آپ کو شاید پتہ ہی ہوگا کہ پریم کے اندھے پن میں پُرش ذات پات، نفع نقصان نہیں دیکھتا، وہ تو صرف چاہ لیتا ہے اور پھر اپنی چاہ کو پانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ ہار جیت، بدنامی رسوائی، زندگی موت سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی ہی راہ

پہ لگا رہتا ہے اور میں بھی اِس دُرگھٹنا میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں نے بھی ایک ایسی ہی سُندر سی دیوی دیکھ رکھی ہے جسے پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہی میرے سپنوں کی رانی ہے' یہی وہ ہستی ہے جس کا ہر رنگ انگ میرا مَن بھاونا ہے اور اگر ہو تو صرف یہی میری جیون ساتھی ہو سکتی ہے۔ میں اُس کے لئے اپنا سب کچھ تیاگ سکتا ہوں۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹی اور دھرم دین میں بھی الگ ہے مگر ہم دونوں کے بھیتر کا رنگ سنگ ایک جیسا ہے' ہم دونوں کا پُرسنگ بھی ایک ہی چِنتا اور ایک ہی آدرش لئے ہوئے ہے۔''

میں نے اسے دیکھا تو وہ ہاتھ کی ہتھیلی پہ چہرے کا گلاب رکھے مجھے دیکھ بھی رہی تھی اور شاید سُن بھی رہی تھی۔ مجھے پَل کی پَل اپنی جانب متوجہ پا کر کہنے لگی۔

''سر! آپ تو بڑے بھاگوان ہیں کہ آپ کو کوئی ایسی دیوی سمان کنیا ملی جو آپ کی مَن بھاونا بھی ہے اور مَن کامنا بھی...... باقی رہی بات ذات پات اور عمر میں چھوٹے بڑے کی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جو آپ دونوں کے ملاپ میں رکاوٹ بنے بلکہ میری یوجنا یہ ہے کہ آپ فوراً اس کنیا کے کانوں میں اپنی کتھا کہانی کہہ ڈالیں۔''

میں نے کہا۔ ''مصیبت یہی ہے کہ یہ سب کچھ وَن وے ہے۔ یہ تو اُس پہ کھُلا ہی نہیں کہ میں اس حد تک [illegible] ہی نہ پڑ جائے' آس نراس کا رَسیا سواد بھی نہ مارا جائے۔''

''وہ ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''اس طرح خاموش رہنے سے بھی تو معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ اگر اسے علم ہی نہ ہو کہ کوئی اس حد تک اُسے چاہتا ہے تو وہ کوئی اچھا بُرا فیصلہ کیسے کر پائے گی؟ سیانے کہتے ہیں کہ نفرت اور محبت کا اظہار دُشمن اور دوست سے کر دینا چاہئے' اس طرح منش اپنی نظر ذات میں پَرا پراسٹیٹ ہو جاتا ہے اور کچھ سیانے یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ سریر کا روگ سیانے کو' مَن کا روگ متوا کو اور آتما کا روگ کسی اُتم چاریہ کو بتا دینا چاہئے تاکہ بات بگڑنے سے پہلے کوئی اُپائے کیا جا سکے۔''

وہ کسی مہا گیانی کی مانند مجھے اُپدیش دے رہی تھی اور میں تجل تجل نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ناری دھیان گیان' عقل سمجھ اور بُدھی بدھمان کی باتیں کرتی ہوئی بڑی جھوٹی اور مصنوعی سی لگتی ہے مگر وہ تو یہ باتیں کرتی ہوئی بڑی سچی اور اچھی لگ رہی تھی میں باتیں تو کیا سُن رہا تھا' صرف بِٹر بِٹر اُسے تکے جا رہا تھا۔ اس طرح دیکھنے سے وہ میرے سر ہو گئی' جھجکتے ہوئے بولی۔

''سر! آپ یوں عجیب سی نظروں سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

میں کیا جواب دیتا' بس ایسی ہی باتیں کرتے کرتے رات اچھی خاصی بھیگ چکی تھی۔

''جیسے ابھی یہاں بھیگ رہی ہے''...... میں نے بڑی ہوشیاری سے اُس کی چالو بات کے درمیان لقمہ لگایا تھا...... مُکھیا جی کی باتیں مزے دار اور بہت ہی دلچسپ تھیں اور میں انہیں کسی نقطۂ عروج کی جستجو میں سُن رہا تھا۔ جہاں مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ مُکھیا جی نے مجھے یہاں کیوں روکا تھا' اُن کے چھپے ڈھکے چہرے کا کیا اَسرار ہے اور میں اِس تمام کتھا کہانی میں کہاں پہ واقع ہوا ہوں؟

''آپ شاید میری بے رنگ سی گفتگو سے بور ہو گئے ہیں...... مجھے چھما کریں' شاید مجھے ایسی طویل بات شروع نہیں کرنی چاہیے تھی پرنتو میں بھی مجبور ہوں' جیون بھر کی کتھا پل دو پل میں تو سُنائی نہیں جا سکتی۔ میں نے کئی سالوں پہ پنجے گاڑے ہوئے یہ اَمر کہانی چند منٹوں میں آپ کو پرب پرتیت کر دی ہے اور یہ آپ کا پرچک پرتاپ ہی ہے کہ میں نے اتنا بول بچن کر لیا ورنہ میں تو چند شبد بھی سیدھے اور سکت سے نہیں کہہ سُن پاتا......'' شاید وہ روہانسو ہو کر چپ پڑ گیا تھا۔

''مُکھیا جی! اپنی کتھا کا اَنت تو کیجیے......'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔

وہ بڑے شکستہ سے بولے۔ ''خان صاحب! میرا اَنت اَتم تو آپ کی کرپا سے ہی ہوگا......''

وہ ہاتھ باندھے [illegible] جاؤں ؟''

میرے ''جی'' کہنے پہ اُنہوں نے بات پھر اُسی رات سے شروع کی جدھر وہ مس شکیلہ کے ساتھ بیٹھے اُسے اپنا حالِ دل سُنا رہے تھے۔

وہ سُن رہی تھی اور کیلی سُنا رہا تھا۔ سُنتے سُنتے شکیلہ کو جیسے اونگھ سی لگ گئی۔ خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں کے آنگن میں دھوپ اور چھاؤں کی طرح نِندیا کی رُتیاں بھی بڑی شتابی اور خانہ خرابی سے اُترتی ہیں' اَکھیوں کے جھروکے خود بخود ہی بند ہونے لگتے ہیں۔ اپنی بات کے دوران میں نے یونہی شکیلہ کی طرف دھیان دیا تو وہ کسی معصوم بالک کی مانند نِندیا کے پالنے میں مزے سے جھولنے لے رہی تھی' ہونٹوں کے آلوچے اور ٹھوڑی کا شفتالو کیا کیا رنگ بہار دکھا رہے تھے۔ بھاری پپوٹوں والے نَین دریچوں کے پَٹ پوری طرح سے بند نہیں تھے جیسے کسی درشن پیاسے نے اپنے پیا کی دید درشن کی خاطر خود ہی ہلکے سے کھلے رکھے ہوں' بنگال کی سیاہ لانبی زُلفوں نے اپنا ایک اَلگ سا جادو جگا رکھا تھا۔ ریگ مال ابھی تک اُس کی اُنگلیوں کی گرفت میں تھا اور سٹوڈیو کا ایپرن بھی گلے میں پڑا تھا۔

میں نے آہستہ سے ریگ مال کا گھسا ہوا ٹکڑا اُس کی اُنگلیوں سے علیحدہ کیا' اُس کا قدرے مڑا ہوا بازو سیدھا کرتے ہوئے اُسے وہیں لٹا دیا' اِس بالک کی طرح جو دن بھر کھیلنے کودنے کی تھکاوٹ سے

ٹوٹ کر بے سُدھ سا پڑ گیا ہو' جو جگہ دیکھے نہ اوڑھنا بچھونا بھالے۔

● مُشتِ خاک آندھی کے ساتھ......!

بچپن اور جوانی کے دِن سارے موسموں' مذہبوں' بندھنوں اور ضابطوں اصولوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اسی طرح ان کی نیند کی بھی کوئی ٹھور اور کوئی منزل نہیں ہوتی اور پھر موٹے رسیلے غلافی نینوں اور لانبی سیاہ زُلفوں والوں کی نیند برکھا رُت کی لمبی گہری راتوں کی طرح بھیگی سوکھی اور کھٹے میٹھے تجل سپنوں کی سنگند۔ ڈھول بجے یا تاشۂ دِل ٹوٹے یا بتاشہ' ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی...... ایک حُسنِ بیمار ہوتا ہے اور ایک حُسنِ سوگوار۔ حُسنِ سَرراہے کی طرح ایک حُسن گاہے گاہے ہوتا ہے۔ ایک حُسنِ محوِخواباں ہوتا اور ایک حُسنِ خانہ خراباں بھی ہوتا ہے۔ ان سب میں خطرناک اور اچھے بھلے انسان کو پاگل دیوانہ اور بے خود کر دینے والا حُسن "محوِخواباں" ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے "سلیپنگ بیوٹی" کہتے ہیں۔ اس حُسنِ خوابیدہ کا ایک نادر شاہکار موی مجسمہ مادام تساد کے بین الاقوامی شہرت یافتہ میوزم لندن میں موجود ہے اور شاید اس میوزیم کی سب سے نمایاں اور حسب و جمال کا نادر الوجود مجسمہ بھی ہے۔

شاہی حرم سرا کی ایک پُرشکوہ سی حریم ناز کے حریری چھپر کھٹ پہ اک فرخندہ جمال' پری تمثال' ناہید خصال' آئینہ بدن محوِخواب ہے۔ دایاں سُبک سا شمعی اُنگلیوں والا ہاتھ سینے پہ دھرا ہے۔ سانس کے نرم رَو زیر و بم سے ہاتھ بھی ہلکورے لیتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ بلوریں صراحی کی گردن اور دائیں کنپٹی کی پھڑکتی ہوئی نبض کی رگیں۔ گاہے گاہے گلاب کی پنکھڑی کی مانند نمعلوم سی کپکپاہٹ لئے ہوئے ہونٹ۔ چہرے کے چاند کے گرد عنبریں گیسوؤں کا پھیلا ہوا ابریشم...... گلگوں سے گال کو بار بار چومتی ہوئی ایک شریر سی لٹ۔ ہر منٹ' دو منٹ کے بعد چہرے پہ ایک آسودہ سی مسکان کا اُبھرنا اور لمبا سا سانس کھینچ کر کیف بھرے انداز میں مسکرانا جیسے وہ کوئی خوبصورت سا خواب دیکھ رہی ہو۔ دیکھنے والے پہ یہ حُسنِ خوابیدہ کا اِک ایسا گہرا تاثر چھوڑتا ہے جسے وہ مدتوں نہیں بھلا پاتا۔ اپنی نوع کے باکمال ہُنرمندوں نے اک موم کے مجسمے کو زندگی' توانائی' تروتازگی' حُسن و جمال' ظاہر و باطنی کیفیات اور رنگ و رُوپ کے اتنا نزدیک کر دیا ہے کہ حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔

رات اپنے جادو کا پٹارا کھولے بیٹھی تھی اور اِدھر اس جادوگرنی نے اپنے حُسنِ خوابیدہ کے بھڑکتے شعلوں سے تنہائی کے اس جنگل میں آگ سی لگا دی تھی۔ اچھائی بُرائی اور محبت و نفرت کے عروج و زوال

میں کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ کبھی اِنسان فرشتوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور کہیں وہ شیطان کے آگے لگ جاتا ہے...... نہ جانے مجھے کیا ہوا' جیسے مَیں سب کچھ بھول گیا کہ مَیں کون ہوں۔ میری حیثیت' عزت' میرا مرتبہ' مقام' دھرم کرم' حیا شرم' ہر چیز میرے لئے جیسے اجنبی سی بن گئی تھی۔ مَیں اربوں کھربوں سال پیچھے اسی زمانہ جاہلیت کا وہ اِنسان نما درندہ بن گیا جس نے ابھی مشکل سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا سیکھا تھا۔ مذہب' رشتے ناتے' اِنسانی' اخلاقی اور سماجی قدریں ابھی اِس کی ضرورت نہیں بنی تھیں۔ وہ صرف جھپٹنا' چھیننا' لڑنا' کھانا پینا' سونا اور جب جی چاہا' جسمانی ملاپ کرنا جانتا تھا۔ اس وقت عورت' صرف عورت تھی' رشتوں کے خانوں میں ابھی تقسیم نہیں ہوئی تھی اور مَیں اس تنہائی میں بالکل وہی مَرد بن گیا جو صرف مرد ہوتا ہے۔ شوہر' باپ' بھائی' بیٹا' اُستاد' گرو وغیرہ کی کسی گروپ بندی میں نہیں ہوتا۔

میری وَاسنا کی گرفت اتنی مضبوط اور اس کی بے چارگی اور بے بسی ایسی کمزور تھی کہ نہ کوئی مزاحمت ہوئی اور نہ ہی کوئی بدمزگی پیدا ہوئی۔ جس شدّت اور جدّت سے یہ طوفان اُمڈا تھا' اس سے کہیں شانتی اور عجلت سے یہ گزر چکا تھا۔ نہ کہیں بجلی گری' نہ آندھی اور طوفان سے کوئی درخت جڑ سے اُکھڑا۔ بگولا اُٹھا' نہ کہیں [illegible] ہوئی۔ وہ [illegible] شکیلہ نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا تھا۔ شکوہ نہ کوئی شکایت' آنسو نہ کوئی [illegible] سسکنا۔ وہ چپ چاپ نارمل سی پھر مجسمے کے چہرے کی پالش میں جُٹ گئی اور مَیں بھی خاموش خجل سا دوسرے مجسمے کو لے کر بیٹھ گیا۔ جیسے جیسے وقت آگے سرکتا گیا' اس کی کام میں لگن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں جیسے بجلیاں سی لپک رہی تھیں۔ چہرہ پسینے سے شرابور' رنگ گلنار سا ہوگیا تھا جیسے اگلے پَل پسینے کی جگہ لہو ٹپکنے لگے گا۔ مَیں خاموشی سے اس کی پھرتیاں دیکھ رہا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا' مَیں نے کہا۔

''مِس شکیلہ! پلیز' شانتی سے کام کرو۔ ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہیں ہے...... میری مانو تو تھوڑا سا آرام کرلو......''

اس نے ہلکا سا مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ پھر ایپرن کی آستین سے ماتھے اور چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اب تو آپ مِس نہ کہئے...... اور ہاں' اب ہمیں واقعی تھوڑا سا آرام کر لینا چاہئے......''

وہ اُٹھی اور میرے پہلو میں نیم دراز سی ہوگئی' کہنے لگی۔ ''مجھے مہاکوی ٹیگور کی کوئی کویتا سُنائیں۔ آپ کے پڑھنے کا انداز بڑا اوریجنل ہے......''

''کویتا اور اِس سمے......؟''

مَیں نے ایک لمبی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔ وہ کروٹ بدل کر میرے سرہانے سے چپک کر کہنے لگی۔

''کیا کویتا اور کرگھنا کا کوئی وقت ہوتا ہے؟...... مِتوا موہے انگ لگا دیکھو رینا بیتی جائے' یہ تو ہوئی کویتا...... اب تم میرا ہاتھ تھامو گے تو یہ ہوئی کرگھنا......''

رات مَیں سویا نہ وہ...... نیند نے میرا بُرا حال کر دیا ہوا تھا اور وہ تو جیسے اب جاگ پڑی ہو۔ زبردستی جب میری آنکھیں خود ہی بند ہو گئیں تو کہنے لگی۔

''نیند آ رہی ہے......؟''

''ہاں......'' نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں میرے منہ سے نکل گیا۔

''مجھے تو نہیں آ رہی......''

اس نے کہا تھا۔ مَیں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے خاموش رہا۔ وہ پھر بولی۔

''عجیب مرد ہو...... جب مَیں سو رہی تھی تو تم نے مجھے زبردستی جگا دیا اور اب مَیں جاگ پڑی ہوں تو تم سو رہے ہو...... یہ جو مَیں 'آپ کو ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی ہوں' اس کا بُرا مت منایئے گا۔ جب درمیان سے فاصلے مٹ جائیں تو پھر تکلّف درمیان میں نہیں رہتا۔''

مَیں اب بھی جان بوجھ کر خاموش رہا اور اس کی اس بات پہ غور کرنے لگا۔ ''جب عورت جاگ جائے تو پھر مرد کو نیند کیوں آنے لگتی ہے؟''...... اس نے مجھے رات کا باقی حصّہ بھی سونے نہیں دیا۔ اس نے بات چیت میں تکلّف کی طرح' باقی بھی ہر چیز کے تکلّف کا لباس اُتار کر پرے پھینک دیا ہوا تھا۔ مجھے تو جیسے شکیلہ نے پاؤں سے اُکھاڑ دیا تھا اور مَیں کہیں منہ چھپا کر بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ مَیں نے گھگھیانے کے انداز میں اسے کہا۔

''شکیلہ! اب ہمیں تھوڑا سا آرام کر لینا چاہئے ورنہ دن بھر ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے جبکہ اگلے دو دن ہمارے لئے بڑے ہی اہم ہیں۔ تین روز بعد تمہاری نمائش......''

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اچانک وہ مجھے یوں جھنجھوڑنے لگی جیسے بھُوکی بھوک میں بِلّی' چوہے کو جھنجھوڑتی ہے' پھر استہزائیہ سی ہنس کر بولی۔

''اب ہم دونوں کے لئے آرام ہی آرام ہے اور واقعی اگلے دو چار روز ہمارے لئے بہت ہی اہم ہیں...... صبح تم مسلمان ہو جاؤ گے یا جس طریقے سے تم چاہو گے' ہماری شادی ہو جائے گی۔ نمائش کا کیا ہے' وہ پھر کبھی سہی......''

اُس نے پھر ایک بار خود کو میرے پہلو میں ڈال دیا اور مجھے یوں لگا جیسے صبح یہاں سے میری

اَرتھی ہی اُٹھے گی۔ بھگوان جانے اُس میں کوئی راکھشس سما گیا تھا یا وہ پاگل ہوگئی تھی۔ میں اُس سے جان چُھڑا رہا تھا اور وہ میری جان سے زندگی کا آخری قطرہ نچوڑنے پہ تُلی ہوئی تھی۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور فرطِ جذبات سے اُس کی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ باتھ روم کا بہانہ کرکے جو میں وہاں سے بھاگا تو اپنے آشرم پہنچ کر سانس لیا' سامان وغیرہ سمیٹا اور اپنے ایک دوست کے ہاں چلا آیا۔ دو چار اشد ضروری کام نہ ہوتے تو میں اُس وقت ہی کلکتہ چھوڑ چکا ہوتا۔

مُکھیا جی نے اپنی ''وَاسنا کتھا'' جس تفصیل اور تواتر سے سُنائی تھی' واقعی میں اس میں کھو کر رہ گیا تھا' وہی لیڈی چیٹرلے والے جنسی ناول سا تلذذ اور مزہ...... میں نے اس مزے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''مُکھیا جی! آپ شکیلہ کو وہاں چھوڑ کر خود یہاں چلے آئے...... وہی شکیلہ جو بقول آپ کے' آپ کی آئیڈیل تھی۔ آپ نے اُسے پانے کی خواہش کی تھی' اُسے دل و جان سے چاہا تھا اور اس حد تک چاہا کہ اُسے اپنے جسم و جان میں جذب کرلیا مگر جب وہ آپ کے جسم و جان کا حصہ بن گئی تو آپ اُسے دھوکا دے کر خود بھاگ لیے......؟''

مُکھیا جی خاموش سے کھڑے رہے اور میں جو منہ میں آیا بکتا رہا۔ جب میں کہہ چکا تو وہ اک ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے بولے۔

''خان صاحب! آپ تو خود بدھوان ہیں' آپ کو کچھ بتانا سمجھانا یا آپ کے سامنے کسی بات کی صفائی پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر جھوٹ بولے...... میں نے اُس رات کی تمام وارداتیں اور جسم و جان کی ساری حالتیں کیفیتیں کھری کھری آپ کے رُوبرو بیان کردیں' ان میں کہیں رتّی بھر بھی اونچ نیچ نہیں۔ آپ خوب جان گئے ہیں کہ شکیلہ ناری کی کون سی قسم تھی اور اُس کا بھیتر سروپ کیا تھا؟ میں اس حقیقت سے اس سمے واقف ہوا جب وہ میرے انگ لگی۔ اس نے اُس رات میرے اندر اتنا زہر بھر دیا تھا کہ اگر میں فوراً وہاں سے راہِ فرار اختیار نہ کرتا تو وہیں بھسم ہو کر رہ جاتا...... میں جانتا ہوں کہ آپ کو یہ کچھ بتانا اَوشِ نہیں ہے' آپ سب جانتے ہیں پھر بھی جب اَپرادھی انسان اپنے مُنہ سے اپنے اَپرادھ کہہ لیتا ہے تو اُسے ایک طرح کی سہارتا مل جاتی ہے' اُسے سکھ چین سا محسوس ہوتا ہے۔ آپ پہلے انسان ہیں جو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں...... اک جیون بیت گیا' میرے چہرے پہ یہ پنجرہ چڑھا ہوا ہے۔ یہاں پوری بستی میں کوئی ایسا منش نہیں جس نے میرے کلکتہ سے آنے کے بعد میرا چہرہ دیکھا ہو۔ میرے پتا سورگباشی کا دیہانت ہوئے اک زمانہ گزر گیا۔ ہر سال ہزاروں

دُکھیارے لوگ یہاں آتے ہیں۔ میں نے اپنا سب کچھ دُکھی لوگوں کی سیوا کے لئے تیاگ دیا ہے تاکہ کچھ تو میرے پاپوں کا پرائچت ہو۔ دَوا دارُو' رہنا' کھانا پینا' سب کچھ بھگوان دیتا ہے۔ لوگ مجھے دیوتا سمان سمجھتے ہیں۔ میرا چہرہ چھپانا بھی اُن کے نزدیک میرا کوئی چمتکار اور تپسیا جیسا ہے۔ یہ بھولے بھالے اور اچھے لوگ کیا جانیں کہ مجھے کیا دُکھ ہے اور کیسے کیسے روگ چمٹے ہوئے ہیں' میں کتنا پاپی اور بُرا ہوں۔ میں نے کیسے کیسے اَنیائے کئے ہیں' میرے لئے یہ منحوس چہرہ چھپانا کیوں ضروری ہے اور اس چاندی کے پنجرے کے اندر کون سا پاپ پکھیرو قید ہے......"

اُس کی آواز بھرّا گئی تھی...... چند لمحوں کے توقّف کے بعد وہ بتانے لگا۔

"میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی' آشرم کی طرف سے فارغ تھا اور صرف شکیلہ اور اس کی نمائش کی خاطر وہاں رُکا ہوا تھا۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں شکیلہ کو دِل سے چاہتا تھا' چپکے چپکے اس کی پوجا کرتا تھا۔ دین دھرم اور عمروں کے نمایاں فرق کے باوجود میں اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا اور دھرم تو میرے لئے کبھی بھی اہم نہیں رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سارے دھرم ندی نالے' نہروں دریاؤں' آبشاروں اور جھرنوں کی طرح ہیں جو آخر میں ایک ہی وشال ساگر سے جا کر مل جاتے ہیں۔ پھر بھی میں اس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار تھا۔ میں نے اپنا اسلامی نام بھی چن رکھا تھا' عبداللہ...... میں ذہنی طور پہ بڑا صاف اور آسان سا آدمی تھا۔ اپنی ہوس و واسنا کی خاطر کسی ناری سے بلادکار کرنا میرے نزدیک مہاپاپ تھا' میں کبھی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... خان صاحب! بھگوان جانتا ہے کہ میری ایسی کوئی خواہش یا ضرورت نہیں تھی مگر اُس رات کیا ہوا' کیسے ہوا' میں ایسی گراوٹ اور واسنا کے اندھے کنوئیں میں کیسے اُتر گیا؟ میرا دماغ کچھ کام نہیں کرتا...... اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی' مجھے زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا' اُس کا یہ رَویّہ بھی میرے لئے حیران کُن ضرور رہا......"

میں بیچ میں بول پڑا...... "مُکھیا جی! اُس کا یہ رَویّہ' موقع کے مطابق فیصلہ کرنے والے ایک دانشمند انسان کا رَویّہ تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ موجودہ صورتحال میں کسی قسم کی مزاحمت یا داد فریاد فضول ہی نہیں بلکہ لاحاصل بھی ہے' سو پیاز کے ساتھ سو جوتے کھانے والی بات ہوگی۔ اس قسم کے حالات میں پھنسنے والی اکثر ناریاں لاحاصل قسم کی مزاحمت اور واویلا کر کے دوسری پارٹی کو مزید تشدد اور بربریت پہ اُکسانے کا موجب بنتی ہیں' زیادتی کرنے والا ناری کی اس لاپادچسپی کو محض ڈرامہ سمجھتے ہوئے خوب لطف اندوز ہوتا ہے' اس کی نام نہاد مردانگی کو بڑی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ شکیلہ جان چکی تھی کہ جس دلدل نے اس کے پاؤں پکڑے ہیں وہ اسے پورا نگل کر چھوڑے گی۔ جیسے کہ سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ دلدل سے نکلنے کے

لئے ہاتھ پاؤں چلانے والا ڈوب کر ہی رہتا ہے بلکہ بُری طرح غرق ہوتا ہے کیونکہ بے طرح ہاتھ پاؤں مارنے سے نیچے دَلدل میں خلاء اور ہوا پیدا ہو جاتی ہے جو اسے غڑپ سے اندر کھینچ لیتی ہے۔ بس ایک راستہ ہوتا ہے جس سے ایک دو فیصد بچنے کی اُمید ہوتی ہے۔ دَلدل' دریا یا کوئی سمندر جب دیکھو کہ پھنس گئے ہیں تو اپنے حواس قائم رکھو اور خود کو ڈھیلا اور نارمل کر لو۔ دماغی اور جسمانی قوتوں کو بیدار رکھو۔ اپنے پالن ہار اور اچھی بُری تقدیر پہ ایمان رکھتے ہوئے خود کو بچانے کے متعلق سوچو اور اگر کوئی موقع' راستہ یا وسیلہ دکھائی دے تو کوشش کرو ورنہ ایسے مواقع پہ مدافعت کا حربہ بالکل کام نہیں آتا...... مُکھیا جی! شکیلہ کمزور سی چیز ہوتے ہوئے بھی وہاں ڈٹی رہی اور آپ مَرد اور مضبوط ہوتے ہوئے بھی وہاں سے بھاگ آئے' اپنی اس چاہت اور مَن چاہی شکیلہ کو آپ تنہا اور بے آسرا چھوڑ آئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی مرد کی وَاسنا کا شکار ہو جاتی ہے تو پھر وہ بھری دُنیا میں تنہا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مرد بھی اُسے اپنا کر سہارا نہ دے تو اُس بے بس کا ٹھور ٹھکانہ کوئی اندھا کنواں' جھولتا ہوا رسّہ' ریل کی پٹڑی' پِسا ہوا کانچ ہوتا ہے اور اگر وہ جینا چاہے تو کسی بدنام گلی بازار میں ویشیا بن کر خون اُگلتی اور پیپ چاٹتی رہتی ہے...... اب آپ آگے بتائیں کہ پھر کیا ہوا' آپ وہاں سے بھاگ کر کہاں آ گئے اور شکیلہ......؟

مُکھیا جی جیسے کسی گہرے کنویں سے بول رہے تھے۔

● زہر کہتے ہیں خود اپنی دوا ہوتا ہے......!

خان صاحب! ایک آدھ روز' میں اپنے ایک مِتر کے پاس پڑا رہا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے تمام کام نمٹا لئے تھے اور سمندر کے راستے سلہٹ جانے کے لئے ایک روز بعد کی بکنگ بھی کروالی تھی۔ اسی روز شکیلہ کی نمائش بھی تھی...... دوسرے دن میں ٹیکسی پہ سوار بندرگاہ کی جانب جا رہا تھا۔ آنکھیں میچے' ہلکے سے درد سے بھاری سر پیچھے ٹکائے میں سوچ رہا تھا کہ کلکتہ میں پانچ لمبے برس بتانے کے بعد آج میں کلکتہ چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے یہاں سے کیا پایا ہے اور کیا کھویا؟...... رہ رہ کر شکیلہ کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے اُبھرتا رہا اور میں شرمندہ سا اُس کے تصوّر سے بھی آنکھیں چُرا رہا تھا۔ میں نے بند آنکھوں ہی ڈرائیور کو ذرا تیز چلنے کی ہدایت کی' میں جلد سے جلد کلکتہ چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کی خطا نے میرے پانچ برسوں کی کڑی محنت اور شانتی نکیتن کی تربیّت کو تہس نہس کر دیا تھا۔ میں جیسے اندر سے کٹ کر رہ گیا تھا' مجھے اپنے مَرد ہونے پہ شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آتما ہتیا کا بھی سوچا' اپنے آپ کو

نامرد کر دینے کا بھی خیال آیا۔ میں خود کو کوئی کڑی سزا دینا چاہتا تھا...... ایک دم بریک چیخے اور ٹیکسی رُک گئی۔ سڑک پار کرتی ہوئی کوئی بُڑھیا سڑک کے درمیان پہنچ کر ہڑبڑا سی گئی تھی۔ ٹیکسی والا بُڑھیا کو دو چار سُنا کر آگے بڑھا تو میں نے پوچھا کہ یہ راستہ تو بڑا چکر لے کر بندرگاہ کی طرف مُڑتا ہے اور یہ وہ سڑک تھی جہاں وہ آرٹ گیلری واقع تھی اور جدھر شکیلہ کی آج نمائش ہو رہی تھی۔

''یہ تم نے کون سا راستہ پکڑا ہے......؟'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

''بابو جی! یہ راستہ تھوڑا سا لمبا ضرور ہے مگر شہر کی بے پناہ ٹریفک اور شور شرابے سے جان چُھوٹ جاتی ہے...... آپ فکر نہ کریں' میں آپ کو پندرہ منٹ میں وہاں پہنچا دوں گا......''

موڑ مُڑتے ہی نیشنل آرٹ گیلری میری سامنے تھی۔ باہر بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے' خوب چہل پہل تھی۔ شکیلہ کی تصویروں اور مجسموں والے پوسٹر آویزاں تھے۔ بےساختہ ارادہ میرے مُنہ سے نکل گیا کہ گاڑی کو ذرا اندر لے چلو۔ ٹیکسی پارک کر کے' دس منٹ کا کہہ کر میں گیلری میں چلا آیا۔ سوچا کہ چلو' جاتے ہوئے آخری بار شکیلہ کے درشن ہی کر لوں۔ اُس کی پہلی نمائش ہے۔ اگر اُس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں اور نمائش کی مبارک بادی' اُس کی کامیابیوں کے لیے شبھ کامناؤں کا اظہار کر دوں تو کیا حرج ہے؟...... خوب رونق تھی۔ گیلری میں بھیڑ سی امڈی پڑی تھی مگر میری نظریں تو بس شکیلہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر میں نے اُسے کھوج ہی لیا۔ وہ شانتی نکیتن کی وائس پرنسپل ماتا شکنتلا ٹیگور کے سنگ اپنے ایک مجسمے کے سامنے کھڑی دو چار غیر ملکی عورتوں کو بریف کر رہی تھی۔ میں کچھ دیر ایک کونے میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ شانتی نکیتن کا سارا اسٹاف' سٹوڈنٹ ہر جگہ مختلف کاموں میں لگے نظر آ رہے تھے۔ اتفاق کہہ لیں کہ ابھی تک مجھ پہ کسی کی نظر نہیں پڑی تھی ورنہ میں یہاں ایسے کھڑا نہ ہوتا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ شکیلہ واش روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں دو چار لمبے سے ڈگ بھرتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''شکیلہ دیوی......!''

جیسے خود بخود ہی میرے مُنہ سے نکل گیا۔ وہ رُکی اور پیچھے مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''آپ......؟'' وہ جیسے مجھے دیکھ کر چونک سی گئی۔ پھر خود ہی میرے پاس پہنچ گئی اور مسکرا کر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں اب بھی دیوی ہی ہوں؟...... مجھے یہ دُکھ اور شکایت نہیں کہ آپ نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا' افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میرا واسطہ ایک نامرد سے پڑا تھا......''

اک دم اُس نے میرے مُنہ پر تھوکا اور کہا۔ ''یہ چہرہ ہمیشہ چُھپا کر رکھنا۔ وہ ساری غلاظت جو تم نے میرے پوتر سریر پہ ڈالی تھی' میں نے تمہیں لوٹا دی ہے۔ اگر تم مجھ سے اپنا یہ چہرہ نہ چُھپاتے تو اُس رات

جو ہوا' وہ صرف غلطی ہوتی جس کا پرائچت ہو سکتا تھا مگر چہرہ چھپا کر تم نے اس غلطی کو ایک مہاپاپ میں بدل دیا ہے...... ناؤ یو گٹ لاسٹ!''

وہ مجھے چہرے تک زمین میں دھنسا کر لیڈیز واش روم میں جا چکی تھی۔ میں پتھر کا بت سا بنا کھڑا تھا۔ شانوں پہ دھرا میرا چہرہ اور سر یوں جلنے اور سلگنے لگا جیسے سندر بن میں سپ بنی کی کسی خطرناک سی ڈنگا ناگن نے اپنے کرودھ کی ساری زہریلی پچکاری میرے منہ پہ پھونک دی ہو یوں لگا جیسے میرے چہرے کی کھال میں انگارے بھرے ہوئے ہیں یا کسی نے تیز آب بھری بالٹی میں میرے سر کو ڈبکی دے دی ہو...... اس سے پہلے کہ میں تماشا بنتا' فوراً الٹے پاؤں باہر نکل آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور بیڑی پی رہا تھا۔ منہ سر دونوں ہاتھوں سے چھپائے میں جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ کھلی سڑک پہ آئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''صاحب! آپ کے چہرے کو کیا ہوا......؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فوراً کسی ہسپتال لے چلو۔ فوراً' جلدی...... میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ میرے چہرے پہ کسی نے تیزاب کی پچکاری چلا دی ہے۔ دو ہفتے میں ہسپتال میں خاموشی کے ساتھ پڑا رہا۔ بر وقت ہسپتال پہنچ آنے سے میری دونوں آنکھیں اس حد تک بچ گئیں کہ میں دھندلا سا کچھ دیکھ سکوں۔ ناک کی پھنک سڑ چکی تھی' ہونٹ اتنے بچے کہ پورے بھینچنے سے بھی اوپر نیچے کے دانت جبڑوں سمیت ننگے رہتے۔ پلکیں' بھنوئیں' ابرو' گال' کان سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ کھال سکڑ کر کھنچ گئی تھی' جبڑے باہر آ گئے تھے۔ ہسپتال والوں نے میرے بستر کے گرد پردے گرا دیئے تھے' نرسیں اور وارڈ بوائے تک میرے قریب آنے سے بدکتے تھے اور میں خود اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ کر ڈر گیا تھا...... کسی نہ کسی طور میرے آشرم کو خبر ہو گئی' وہ مجھے زبردستی لے گئے اور آشرم کے ہسپتال میں ڈال دیا۔ اب جڑی بوٹیوں اور مرہموں سے میرا علاج ہونے لگا' میرے چہرے پہ تیزاب پھینکنے کی خبر آشرم میں ہر طرف پھیل چکی تھی۔ میرے شاگرد' استاد' اپنے پرائے بھی آئے اور نہ آئی تو شکیلہ ہی نہ آئی۔ میں نے بھی زیادہ کرید نہ کی اور نہ ہی کسی پہ ہمارے کئے کرائے کا بھید کھلا۔ پھر اچانک ایک دن پتا جی کے دیہانت کی خبر مجھ تک پہنچی۔ اب میرا کلکتہ سے نکلنا ضروری ہو چکا تھا۔ کئی ماہ کے علاج کے بعد میں ذہنی طور پہ اس قابل ہو چکا تھا کہ اس عذاب مسلسل کے ساتھ جی سکوں۔ مایوسی سے میں نے دامن چھڑا لیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ہر حال میں جیوں گا' زندہ رہوں گا۔ اپنے پاپ کا پرائچت مجھے ہر طور کرنا ہے...... اچھا ہوا کہ میں شکیلہ کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچا۔ ہم دونوں گھائل ہوئے' وہ بھیتر سے گھائل

ہوئی اور میں چہرے سے زخمی ہوا اور ہم دونوں کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے۔

میرے گاؤں پہنچنے سے بہت پہلے ہی میرے چہرے کے روگ کی خبر یہاں پہنچ چکی تھی۔ اب میری حالت یہ تھی کہ مرہم سے لپے پوتے کروے کے پتے میرے چہرے پہ چپکے رہتے۔ آنکھیں' ناک اور ہونٹوں والی جگہ خالی رہتی' اوپر کپڑے کی تھیلی اوڑھ لیتا۔ آنکھوں کے سوراخ اور منہ کے آگے گول سی خالی جگہ بڑی عجیب سی لگتی۔ عورتیں' بچے اور کمزور دل کے لوگ میرے قریب آنے سے گریز کرتے تھے' میں سوائے ذاتی نوکروں کے علاوہ کسی اور سے کوئی رابطہ نہ رکھتا...... کئی برس علاج معالجے اور ہر طرح کی کوششوں کے بعد بھی میرا چہرہ اس قابل نہ ہو سکا کہ میں خود ہی دیکھ سکوں۔ پلاسٹک سرجری اس وقت اتنی ایڈوانس اور ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ جبڑے اور باقی چہرہ کھال اور گوشت سے قریب قریب خالی ہو گیا۔ وہاں دانت' زبان' تالو سب کچھ نظر آتا تھا۔ بدبو اور عفونت ایک الگ مسئلہ تھا۔ چہرے پہ کپڑے کی تھیلی اب بیکار ثابت ہو رہی تھی۔ چہرے کا تو بڑا مسئلہ' وہ بھی راس نہ آیا۔ آخر ایک مسلمان جراح کی بھنک پڑی کہ وہ خناق اور کوڑھ کے زخموں کا علاج کرتا ہے خالی ہڈیوں پہ بھی کھال گوشت چڑھوا دیتا ہے۔ رختِ سفر باندھا' ایک ملازم ہمراہ لیا اور گوالیار چلا گیا۔

وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ گوالیار میں ہی سید شہید کا مزار بھی تھا جنہیں انگریزوں نے ایک ناکردہ جرم میں پھانسی لٹکا دیا تھا۔ یہ بزرگ جراح بھی سید تھے اور اسی شہید بزرگ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کمال محبت و شفقت سے پیش آئے' بڑی توجہ سے میری بپتا سنی۔ میرا چہرہ دیکھا اور خاموش ہو لئے۔ پھر فرمایا کہ جب تک میں تمہیں اجازت نہ دوں' یہاں سے واپس مت جانا۔ ان کے ہاں بھی ایک چھوٹا سا آشرم یعنی مریض خانہ بنا ہوا تھا' دُور دراز سے آنے والے مریض یہیں رہتے تھے۔ چام چمڑی' ہڈی کے زخم پھوڑے علاج معالجے میں بڑا لمبا عرصہ لیتے ہیں۔ یہ کام بڑا صبر اور طبیعت پہ بڑا جبر مانگتا ہے۔ ہروقت گندگی' بدبو' خون پیپ اور کیڑوں سے واسطہ رہتا ہے۔ وہاں قیام کے دوران مجھے سید صاحب کی شخصیت کا بڑا گہرا مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا...... میں اُن کے حکم کے مطابق آشرم میں نچنت ہو کر پڑ گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے مجھے آشرم سے کچھ دُور ایک چھوٹی سی مسجد کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں منتقل کر دیا۔ اس کوٹھڑی کے اندر چاولوں کی بھوسی بچھی ہوئی تھی اور اوپر چھت نہیں تھی۔ تین وقت کھانا پینا یہیں پہنچ جاتا تھا' ساتھ مسجد کے وضو خانے سے ایک پتلی سی نالی تیار کروا کر اس کوٹھڑی کے اندر سے گزاری گئی تھی۔ سید صاحب کا حکم ہوا کہ پانچ وقت جب اذان ہو اور نمازی وضو کریں تو اس نالی کے پانی سے میں اپنے چہرے کو دھوؤں اور پیاس لگے تو پی بھی لوں' چہرے کو ننگا اور

کوٹھڑی کے دروازے کو اندر سے بند رکھوں...... پورے تین چاند میں نے بند کوٹھڑی میں گزارے تو میرے چہرے پہ گوشت اور کھال چڑھنی شروع ہوگئی۔ آئینہ تو کوئی تھا نہیں، چہرہ دھوتے سمے محسوس ہوتا تھا جیسے خالی گھاؤ دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں۔

بند کوٹھڑی میں میری واحد دلچسپی صرف اذان اور وضو کے پانی کا انتظار کرتے رہنا تھا۔ اذان کی آواز مجھے ایسا سکون دیتی کہ میری آتما تک نہال ہو جاتی۔ مسجد کے صحن کا رُخ میری کوٹھڑی کی جانب تھا، امام صاحب کے نماز پڑھنے کی آواز بھی توجہ دینے پہ سُنائی دیتی تھی۔ میں نے کسی طرح دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لیا، اب میں پانچ وقت آنکھ جما کر نماز پڑھنے کا منظر بھی دیکھنے لگا۔ اگلے چند دنوں میں باقاعدہ نقل کر کے نماز بھی ادا کرنے لگا تھا، یعنی رکوع سجود نمازیوں کے ساتھ ہی ادا کرتا۔ میرے اور مسجد کے درمیان صرف ایک برائے نام سا دھرم اور ایک پتلی سی دیوار حائل تھی...... اگلے تین ماہ بھی کسی منش نے میری صورت تک نہ دیکھی اور نہ ہی سیّد صاحب نے اِدھر کا رُخ کیا۔ سردی گرمی، ساون بھادوں، دھوپ بارش، سب موسم اسی اصطبل سی بے چھت کی کوٹھڑی میں گزر گئے۔ نہ کوئی دوا اور نہ کوئی مرہم۔ ناشتے میں دلیہ، دوپہر کھٹے دہی کا سالن جس میں خوب مرچی اور ارنڈی کے بیج سے پڑے ہوتے، ساتھ جوار اور جو کی موٹی کی چپاتی ہوتی تھی، شام کو بھی دال کے ساتھ باجرے کی چپاتی یا چاول۔ میرے سر کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے اور چہرے پہ بھی کچھ گوشت چڑھ آیا تھا جسے میں صرف اپنے ہاتھوں کی اُنگلیوں سے ہی محسوس کر سکتا تھا۔

وہ جمعہ کا روز تھا۔ صبح ہی صبح، فجر کی نماز سے بہت پہلے سیّد صاحب میرے طازم کے ساتھ میرے پاس آئے اور مجھے ساتھ لے کر پاس مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے۔

”مہاراج! آج آپ کا کشٹ اَنت ہوا، آپ ابھی یہاں سے تشریف لے جائیں۔ میرے بس میں صرف یہی کچھ تھا...... آپ کے چہرے پہ کھال اور گوشت چڑھ آیا ہے لیکن آپ کے اندر کی جلن اور سڑن ہمیشہ ایسے ہی رہے گی اور چہرے کی کھال اور گوشت ہمیشہ کچے ہی رہیں گے، خون اور پیپ بھی پیدا ہوتی رہے گی۔ جب تک کسی نمازی کے وضو کے پانی سے چہرہ دھوتے رہیں گے، افاقہ محسوس ہوتا رہے گا یا وہ ناری جس کا آپ سے اپمان ہوا ہے، آپ کو معاف کر دے اور آپ کے لئے دُعا کرے یا کوئی نجیب الطرفین سیّد جو نا کتخدا یعنی کنوارہ ہو، پیدائش کے سمے سر پہ سفید بالوں کی لٹ لئے پیدا ہوا ہو اور آگ کے انگاروں پہ ماتم کرنے والا ہو یا پھر کوئی مولا علیؑ کا ملنگ جو سیاہ پوش، سیاہ توش اور پچھلی کایا کا سروپ ہو اور ماتھے پہ چندن کا چمت ہو۔ ایسا مہا پرش اگر آپ کو مل جائے تو آپ کا یہ روگ ختم ہو سکتا ہے کیونکہ یہ

محض سریر روگ ہی نہیں' سراپ روگ بھی ہے۔۔۔۔۔''

میں یہ سب کچھ سُن کر' ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''سید صاحب! میں ایک پاپی وید انتی نادان ہوں اور آپ ایک بدھوان مسلمان ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ذہنی اور باطنی طور پہ اسلام کے قریب ہوں۔ اُس مسلم بَرجوگ ناری کی قربت' اس مسجد اور آپ کی تھوڑی بہت صُحبت سے مجھے مسلم دَھرم کی بہت لگن پیدا ہوگئی ہے۔ اب اس ناری سے جس کے سَراپ دینے سے میری یہ حالت ہوئی ہے' رابطہ کرنا بڑا مشکل اَمر ہے۔ اب رہی بات کسی سید کو تلاش کرنے کی تو میں یہ کسی کو نہ دکھانے کے قابل چہرہ لے کر کہاں خوار ہوتا پھروں اور پھر جو صفتیں آپ نے بیان اور نشان کی ہیں' ایسے مہان اوگنی سید صاحب مجھے کہاں ملیں گے؟۔۔۔۔۔ آپ ہی میری کوئی سہائتا کریں گے تو میں سپھل ہو سکتا ہوں ورنہ میں کسی جوگا نہیں۔۔۔۔۔ سید صاحب! میں اپنا دھرم تیاگ کر مسلمان بھی ہونے کو تیار ہوں' بس آپ میری رَکھشا اور سہائتا کریں۔ میں اپنا باقی جیون آپ کے چرنوں میں بیٹھ کر اور آپ کی سیوا کر کے بتانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔''

سید صاحب مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ''مسلمان ہونے کے لئے آپ اتنے اتاولے نہ ہوں' خوب سوچ بچار اور دیکھ پرکھ کر کوئی فیصلہ کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔۔۔۔ یہ بات طے ہے کہ آپ کو ابھی سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا ہی امر ہے۔ باقی رہی بات کسی سید کے تلاش کرنے کی تو اس کے لئے آپ چاہیں تو اَمروہہ چلے جائیں' ایسے سید سرکار آپ کو وہاں مل جائیں گے اور اگر آپ ایسا بھی نہ کر سکیں یا اَمروہہ سے بھی کامیابی نہ ہو تو اپنے ٹھکانے پہ چلے جائیں۔ کچھ عملیات لکھ دیتا ہوں' ان پہ عمل کریں۔ چالیس روز کے اندر باہر آپ کے پاس ایک شخص خود چل کر آئے گا' بس اس کو پکڑ لیں۔ وہی آپ کے درد کا دارو ہوگا اور اگر اس دوران آپ اپنے من کی اچھیا سے مسلمان بھی ہونا چاہیں تو اسی شخص کے ہاتھ آپ کا مسلمان ہونا بہتر ہوگا۔۔۔۔۔''

اتنا کہہ کر اُنہوں نے اپنے ایک ملازم سے کاغذ قلم اور چراغ منگوایا اور جلدی جلدی کاغذ پہ کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ چند سطریں ہی لکھی ہوں گی کہ میں نے پاؤں پکڑ لئے۔

''سید صاحب! چھ سات مہینے میں آپ کے چرنوں میں رہا ہوں' اب آپ کے اَمر سے جا رہا ہوں۔ مجھ پہ ایک دَیا اور کر دیجئے۔۔۔۔۔ میں اپنا باقی جیون دُکھی بیمار لوگوں کی سیوا میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس دھن پیسے کی کمی نہیں ہے' مجھے اتنی اَشیرباد دے دیں کہ میں دُکھیوں کے لئے ایک آشرم کھول سکوں اور آپ کی طرح اپنے آپ کو ان کی سیوا کے لئے تیاگ دوں۔۔۔۔۔ بس مجھے اسی پتر پہ کچھ ایسے اکھر بھی پراپت کر دیں کہ جو دُکھی میرے پاس آئے وہ سُکھی ہو کر جائے۔۔۔۔۔''

سیّد صاحب نے ایک کاغذ پہ کچھ لکھ کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ چند عملیات ہیں' چالیس چاند ان پہ عمل کریں۔ اس دوران اگر وہ سیاہ پوش شخص آپ کے پاس نہ آئے تو اگلے چالیس چاند پھر یہی عمل دُہرائیں۔ پھر بھی وہ شخص نہ آئے تو پھر دُہرائیں اور جب تک وہ نہ آئے' یہی عمل دُہراتے رہیں......"

پھر وہ خود اُٹھے۔ چند منٹوں بعد تشریف لائے تو ایک قلمی کتابچہ جو کم وبیش پچاس صفحوں پہ لکھا ہوا تھا' مجھے دیتے ہوئے فرمایا۔

"یہ چھایا وِدّیا کا بھید وِیدک ہے' اس شاستر میں سب کچھ لکھا ہے...... جائیے' اللہ کے دُکھی بندوں کی سیوا خدمت کریں۔ کسی سے کچھ لینا نہیں ہے۔ یہ فی سبیل اللہ ہے' لوبھ لالچ کرو گے تو یہ وِدّیا اُڑ جائے گی جیسے چڑیا اُڑ جاتی ہے......"

سیّد صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ پہلے امروہہ جاؤ اور مطلوبہ سیّد صاحب کو تلاش کرو اور اگر کوشش کے باوجود بھی سیّد صاحب نہ ملیں تو پھر اپنے ٹھکانے پہ پہنچ کر اس پتر کو پڑھو' جو لکھا ہے اس پر عمل کرو...... اور ہاں اپنے چہرے پہ چاندی کا کنٹوپ چڑھائے رکھو' کسی کو بھی اپنا چہرہ مت دکھاؤ...... میں وہاں سے سیدھا بمبئی آیا اور وہاں سے امروہہ اور یہاں پہنچتے ہی میں نے سادات کی بستی میں سب سے بڑی امام بارگاہ کا رُخ کیا۔ سر منہ چھپائے' آنکھوں پہ سیاہ عینک چڑھائے میں ہر کسی سے کسی ایسے سیّد صاحب کے بارے میں پوچھتا پھرا جو اِن مخصوص خصوصیات کے حامل ہوں۔ کسی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ' پورے امروہہ میں میری اس بات اور ایسی طلب کی دھوم مچ گئی تھی۔ کوئی مجھے دیوانہ سمجھے اور کوئی کچھ......

دس پندرہ روز جب میری خوب رُسوائی ہو چکی اور وہ مخصوص سیّد صاحب نہ ملے تو میں نے واپسی کی ٹھانی لیکن اچانک ہی ایک بزرگ سے میری ملاقات ہوگئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ یہاں سے پچاس کوس ایک گاؤں منگولی شریف ہے' وہاں سادات کے گھرانے ہیں۔ وہاں چلے جاؤ۔ مزار کے مجاوروں میں ایک سیّد صاحب یہی خصوصیات رکھتے ہیں...... ایسا پتہ پڑتے ہی وہاں کی راہ لی۔ شام سے ذرا پہلے منگولی شریف جا اُترے' سیدھے درگاہ شریف کا رُخ کیا۔ وہاں تو ایک اور ہی عالم تھا۔ معلوم ہوا کہ آج سہ پہر ہی سیّد بشارت علی شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ وہی سمے تھا جب میں امروہہ سے منگولی شریف کے لئے روانہ ہوا تھا۔ وہاں سے بھی میں بے نیل ومرام واپس اپنے گاؤں چلا آیا۔

گاؤں پہنچ کر میں نے سیّد صاحب کا دیا ہوا عملیات والا بند لفافہ کھولا تو عمل پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہر روز نادِ علی کا وِرد اور مولا علیؑ کا لنگر جاری کرنے کی ہدایت تھی۔ گندے ماس' ہر قسم کا نشہ' سود بیاج

اور لوبھ لالچ سے بچنے کی تاکید درج تھی۔ دوسری وِدّیا والی پُستک کھولی تو اسے پڑھ کر بھی میں دنگ رہ گیا۔ یہ ایسی وِدّیا تھی جس کا تعلق انسان کے سائے پرچھائیں سے تھا۔ تیسرے پہر اُترتے ہوئے سورج کی کرنیں اور روشنی جب منش کے سر پہ ٹک کر سفید کپڑے کے پردے پہ جو پرچھائیں چھوڑتیں' بس اس سائے کو پڑھنے کی وِدیک پہ ہی یہ پُستک لکھی ہوئی تھی۔ سیّد صاحب کے ذاتی قلم سے لکھی ہوئی یہ پُستک بڑی قیمتی اور نادر چیز تھی۔ میں نے بیک وقت دونوں پہ ہی عمل درآمد کرنا شروع کر دیا...... کئی روز مسلسل سفر کے دوران وضو کا پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے چہرہ نہ دھو سکا تھا' سخت بے چینی اور تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا' چہرے پہ وَرم اور سُرخی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے گاؤں کے قریب ہی دوسرے گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی' جتن کر کے وہاں سے وضو کا پانی منگواتا اور چہرہ دھو لیتا۔ مولا علیؑ کا لنگر بھی جاری کر دیا اور نادِ علی کا وِرد بھی پڑھنا سیکھ لیا۔ مندر جانا' پوجا پاٹ' پرارتھنا وغیرہ تو کبھی کا چھوٹا ہوا تھا' ہندو جاتی اور اپنے گاؤں کے پنچھ پاتھوں سے بچنے کی ترکیب بھی میں نے نکالی ہوئی تھی۔ چاندی کا ایک کنٹوپ بنوایا اور سر پہ چڑھا لیا تھا۔ آنا جانا' پرجا پوجا' سبھا برادری' پریوار اکٹھ' پنچایت مکھوٹ' سب کچھ ترک تھا۔ اپنا یہ جھونپڑا ہی سب کچھ تھا۔ کچھ پرانے رازدار ملازم تھے جن کے ذریعے باہر کی دُنیا سے رابطہ تھا' ویسے بھی سب [illegible] بگڑ چکا ہوا [illegible] اب کچھ دیکھنے دکھانے کے قابل نہیں۔ بس یہی ایک وجہ تھی جس کی بدولت میں بچا ہوا تھا' کوئی نہ جانتا تھا کہ میں اندر سے ایک مسلمان ہوں ہوں...... وضو کا پانی لانے میں دُشواری پڑی تو میں نے خود ہی وضو کرنا شروع کر دیا' وضو ہوا تو نماز بھی آ گئی۔ اب میں پانچ وقت نماز پڑھتا تھا۔ مولا علیؑ کا لنگر بھی لوگ کھاتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے پرچھائیوں سے علاج معالجہ شروع کر دیا۔ جو بھی آتا' لنگر بھوجن کرتا بلکہ اکثر صرف لنگر ہی کھانے آتے اور ساتھ بھی لے جاتے۔ اللہ کا کرم اور مولا علیؑ کے نام کا لنگر اور گڑاولی والے سیّد صاحب کی بخشی ہوئی پرچھائیں وِدّیا سے جو بھی دُکھی دُکھیارا آتا' وہ ہنستا مسکراتا' دُعائیں دیتا واپس لوٹتا۔ زندگی اک لگے بندھے ڈگر پہ چل نکلی تھی۔ پہلے چالیس روز بھی نکل گئے' وہ مولا علیؑ کا سیاہ پوش ملنگ نہ آیا۔ چالیس پھر اور گزر گئے۔ پھر...... اور پھر...... لیکن جسے آنا تھا وہ نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ملنگ ضرور آئے گا۔ اسی انتظار اور کشمکش میں یہ ہوا کہ میں پکّا نمازی بن گیا۔ وضو کرتا تو ایسا سکون ملتا کہ جیسے میں نے اپنے چہرے کے زخموں پہ کوئی مرہم رکھ دیا ہو۔ سیّد صاحب نے مجھے شیشہ دیکھنے کی سختی سے ممانعت کی ہوئی تھی' کبھی چہرہ دیکھنا چاہوں تو وہ بھی ہلکورے لیتے ہوئے پانی میں دیکھ سکتا تھا۔

مُکھیا جی نے اپنی کتھا کہانی سے ماحول اور مجھے ایسے باندھ رکھا تھا کہ جیسے وہ سُنانے اور میں

صرف سُننے کے لئے ہی یہاں پہ موجود ہوں...... نہ وقت کے گزرنے کا احساس اور نہ کچھ جسمانی فطری تقاضے یا بھوک پیاس......ذرا کی ذرا وہ سکوت میں آئے تو میں نے بھی اپنا صدیوں سے بند مُنہ کھول ہی دیا۔

''مُکھیا جی! اگر آپ چاہیں تو چائے وغیرہ منگوا سکتے ہیں۔ اگر آج کی شب پَو پھٹنے تک ہمیں جاگنا ہی ٹھہرا تو پھر کچھ تو ''بہر رَت جگا'' ہونا چاہئے......''

مُکھیا جی نے پاس لٹکی ہوئی کانسی کی ننھی ننھی گھنٹیوں والی ڈوری کو ہلایا' کچھ توقف کے بعد ایک ناری مُنہ سر لپیٹے' گھونگھٹ کاڑھے بڑے اَدب سے اندر داخل ہوئی اور چائے کا حکم لے کر اُلٹے قدم باہر نکل گئی۔ اِس عورت کے باہر نکلتے ہی میں نے کہا۔

''آپ کی پتنی پَردہ کرتی ہے...... یہ تو بڑی اچھی بات ہے......''

مُکھیا جی نے جواب میں کہا۔ ''خان صاحب! میں نے شادی نہیں کی اور نہ ہی شاید میں اس قابل ہوں...... یہ ناری ان بہت سی ناریوں میں سے ایک ہے جو مستقل یہاں آشرم میں رہتی ہیں۔ یہ ودھوا' اناتھ' روگی' بے سہارا ناریاں اور کنیائیں ہیں۔ ایسی تمام ناریاں اوٹ پردے میں رہتی ہیں' کسی کو اپنا مُکھ سر نہیں دکھاتیں۔''

''مُکھیا جی! اگر آپ کی اچھیا ہو تو چائے کے آنے تک آپ کو ریلیف دینے کی خاطر میں بھی کچھ بات کروں' چائے پانی کے بعد آپ پھر اپنی کتھا سمپورن کر لیجئے گا...... ویسے میرے خیال میں آپ کا باقی اتہاس کچھ یوں ہے کہ آپ جس سیاہ پوش مولا علیؑ کے ملنگ کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں' آپ کی نظر میں وہ میں ہوں اور آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آپ کا یہ چہرے والا روگ بھی میں دُور کر سکتا ہوں اور تیسرے آپ باقاعدہ مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ چوتھی بات میں آپ کو چائے پینے کے بعد مناسب موقع پہ بتاؤں گا...... اس کے علاوہ بھی آپ کلکتہ والی اُس ناری شکیلہ کے بارے میں بہت کچھ کہنا اور پوچھنا چاہتے ہیں......؟''

مُکھیا جی میری یہ باتیں سُن کر گنگ سے ہو گئے' چاندی کے کنٹوپ کے پیچھے سے بس گھورے جا رہے تھے۔ میں بھی یہ کچھ کہہ سُن کر اُن کا ردِعمل جاننے کی خاطر چپ سا ہو گیا تھا۔ پھر یوں ہی بات کا رُخ بدلنے کی خاطر پوچھ بیٹھا۔

''آج آپ نے عشاء کی نماز پڑھی......؟''

''آپ کے یہاں پدھارنے سے پہلے میں نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ میرے دو انتہائی بااعتماد

ملازم بھی مسلمان ہیں' وہی مجھے وضو وغیرہ کرواتے ہیں......؟''

''اِس کا مطلب ہے کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں......؟''

''باقاعدہ نہیں' مَیں ویسے بھیتر سے مسلمان ہی ہوں۔ اعلان اِس لئے نہیں کرتا کہ یہاں پھر سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ یہ آشرم اُجڑ جائے گا۔ یہ سینکڑوں بے سہارا دُکھیارے لوگ دربدر ہو جائیں گے' آس پاس کی ہندو جاتی مجھے قتل کر دے گی' سورگباشی پتا جی کا شُبھ نام کام بدنام ہوگا اور اگر میرے دھرم چھپانے سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہے' فساد نہیں ہوتا' آگ نہیں لگتی۔ جانوں کو خطرہ نہیں ہوتا تو پھر میرے وچار میں چُپ رہنا ہی بہتر ہے......''

جھونپڑے کے دروازے پہ جلترنگ سی بجی۔ ایک بارہ چودہ برس کی انوکھی سی بچّی اور اُس کے پیچھے پیچھے وہی سر منہ ڈھانپے ہوئے ناری چائے کی طشتری اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ چھوٹی بچّی نے آتے سمے پرنام کیا۔ پھر بڑے سلیقے انداز میں لکڑی کا ایک چوکا درمیان رکھا۔ ناری چائے کی طشتری چوکے پہ رکھ کر اُلٹے قدموں باہر نکل گئی۔ بچّی نے مُکھیا جی کی آگیا سے بڑے پُراعتماد انداز سے چائے بنانا شروع کی۔ نفیس پیالوں میں قہوہ انڈیل کر دودھ' شہد اور مصری کی ڈلیاں سامنے پروس کر وہ بھی پرنام کرتی ہوئی پیٹھ دکھائے بغیر [illegible] باہر [illegible] بچّی اور جوان ناری کو آتے جاتے غور سے دیکھ چکا تھا۔

''یہ بچّی......؟''

میرے منہ سے الفاظ جیسے خود بخود اُچھل کر لبوں تک آ گئے تھے۔ مُکھیا جی کے پاس بھی جواب جیسے تیار پڑا تھا۔

''اِس دُکھیاری ناری کی ہے...... ایک راکھشس اسے پریم کے چکر میں ڈال کر یہ پریم نشانی دے گیا۔ یہ ناری بڑے پریم پرمت والی ہے۔ منہ سے کچھ بول نہیں بولتی' اس نے اپنی زبان خود ہی بند کر لی ہوئی ہے...... آپ چائے بنایئے' ایک پیالی میرے لئے بھی......''

مَیں چائے بنانے میں مشغول ہو گیا۔

''آپ چائے میں شہد یا مصری......؟''

یہ پوچھتے ہوئے اچانک جو مَیں نے مُکھیا جی کی جانب دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا...... اُنہوں نے چاندی کا کنٹوپ اُتارا ہوا تھا۔ بالوں کا اِک جنگل' سُرخ بھوئی چہرہ' اُبھری ہوئی ہڈیوں پہ کہیں کہیں سکڑی کھچی اور تڑخی ہوئی کھال' بن پلکوں پپوٹوں اور ابروؤں کے پھیلی ہوئی سُرخ آنکھیں جیسے آنکھوں کے

گڑھوں میں سُرخ انگارے رکھے ہوں۔ مُردے کی کھوپڑی کی طرح بیٹھی ہوئی ناک' اوپر بانسے کی ہلکی سی ہڈی باقی بچی تھی۔ ہونٹ غائب' صرف دانت اور جبڑا موجود تھا...... آدھی رات' تنہائی اور جھونپڑے کے اندر کا ڈراؤنا سا ماحول' یقیناً مجھے بے ہوش ہو کر لمبا پڑ جانا چاہئے تھا مگر میں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر کہا۔

''آپ کا چہرہ اب کافی حد تک بہتر ہو گیا ہے......'' میں نے اُن کی چائے میں اچھا خاصا شہد ملا دیا۔ ''یہ لیجئے' چائے پیجئے......''

مُکھیا جی کچھ بھی کھا پی نہیں سکتے تھے' صرف چمچ سے مشروب یا گھلی ہوئی غذا حلق میں ڈال کر نیچے اُتار لیتے تھے...... وہ بولے۔

''خان صاحب! آپ نے میری صورت دیکھی......؟''

میں نے پھر انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔''

مُکھیا جی! میں نے ایسی اور اس سے بھی کہیں گئی گزری صورتیں بہت زیادہ دیکھی ہیں...... یہ تو پھر بھی بہت اچھی صورت ہے' جبکہ اس صورت کی پیشانی پر ایک نورانی دیپ بھی جل رہا ہے تو پھر یہ صورت کیسے بُری ہو سکتی ہے۔ آپ بس ایک کام کیجئے' مجھے معاف کر دیں' انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا......''

مُکھیا جی پھسک پھسک کر رونے لگے' میرے گھٹنے پکڑ کر کہنے لگے۔

''خان صاحب! مجھے گھنا وشواس تھا کہ آپ وہی ہیں جن کے متعلق مجھے سید صاحب نے بتایا تھا اور مجھے یقین ہے کہ میرا مہربان اللہ میرے گناہ ضرور معاف کر دے گا۔ بس آپ میرے لئے دُعا فرمائیں اور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا داس بنا کر اپنے چرنوں میں جگہ دیں...... یہ میرا سب کچھ حاضر ہے' یہیں قیام فرمائیں اور یہاں کے دُکھی لوگوں کی رکھشا کریں......''

''مُکھیا جی! میرے بارے میں آپ بہت زیادہ خوش گمانی سے کام لے رہے ہیں......'' میں نے کہا۔ ''میں تو محض ایک آوارہ گرد ملنگ ہوں' میں کہیں ٹِک یا جم کر بیٹھ نہیں سکتا۔ ہر دَرد اور چنتا کا دارو ملنگ کے اپنے پاس ہی ہوتا ہے۔ آپ کے ہر دُکھ اور چنتا کا علاج بھی آپ کے پاس ہی ہے' میری تو کہیں بھی آپ کو ضرورت نہیں...... اپنے آپ کو کھوجئے' اپنے اردگرد دھیان دیجئے۔ اپنی آتما کو پہچانئے' آپ کو سب کچھ اپنے پاس سے ہی مل جائے گا......'' پھر اچانک میں نے سوال کیا۔ ''آپ وضو میں ہیں......؟''

''الحمدللہ' میں وضو میں ہوں......''

ماشاء اللہ کہہ کر میں نے عرض کی۔ ''تو پھر آپ کی مسلمانی میں باقی جو کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔ آپ ذرا آگے بڑھ کر میرے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ جایئے...... ہاں' آگے بڑھنے سے پہلے وہ گھنٹیوں والی ڈوری ہلا دیجئے تاکہ یہ چائے کے برتن درمیان سے اُٹھا لئے جائیں'' ...... گھنٹیاں بجتے ہی وہ بچّی اور پیچھے پیچھے ناری اندر داخل ہوئیں۔ بچّی نے چوکا ہٹایا اور ناری نے برتن' اُلٹے پاؤں جانے لگیں تو میں نے دھیمی سی آواز دے کر روک لیا اور کہا۔

''برتن رکھ کر کچھ دیر کے لئے یہاں بیٹھ جائیں......''

وہ دونوں مُکھیا جی کی جانب دیکھنے لگیں جو اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے صاف دِکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مُکھیا جی نے انہیں تذبذب میں دیکھتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔

''آپ بیٹھ جایئے......''

''...... اور ہاں' مُکھیا جی! اپنے دو ملازموں کو جو مسلمان ہیں' اندر بلا لیں'' ...... ملازم جب آ گئے تو میں نے مُکھیا جی سے کہا۔ ''آج آپ اللہ کے اَمر اور اپنی دیرینہ خواہش کے تحت باقاعدہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ جو کچھ میں پڑھتا جاؤں' اُسے آپ دُہراتے جائیں......''

ا[illegible] کے بعد وہ عبداللہ کے نام سے [illegible] مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے' فرطِ جذبات سے اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے انہیں مبارک باد دی۔

''ایک مزید خوشی کی مبارک بھی آپ قبول فرمائیں...... آج ابھی یہیں آپ کا نکاح بھی ہو رہا ہے۔ میں جو کچھ کہتا جاؤں' وہ آپ پڑھتے جائیں'' ...... اب میں ناری کی جانب مخاطب ہوا۔

''خاتون! آپ آگے آ جایئے......''

مُکھیا جی اور خاتون دونوں میری جانب دیدے پھاڑ پھاڑ دیکھنے لگے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ آج کیا ہو رہا ہے؟ ...... خاتون نے لب کھولنے چاہے مگر میں نے اپنے لبوں پہ اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں مسلمان ملازم بطور گواہ موجود تھے۔

قبول کے سمے جب شکیلہ رحمانی بنت مرزا عبدالشکور رحمانی کے لفظ آئے تو مُکھیا جی بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ اُن کی آنکھیں بندھ گئی مُورکھوں کی مانند کبھی مجھے اور کبھی شکیلہ کو دیکھ رہے تھے...... نکاح بخیر ہوا تو مصری کی ڈلیاں بانٹی گئیں۔

اگلے روز جب دوسرے پہر میں نے اور پروفیسر واویلا نے واپسی کا قصد کیا۔ مُکھیا جی' عبداللہ صاحب سے اجازت چاہی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُنہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''مکھیا جی! جس طرح آس نراس، چِنتا منش کے اپنے اندر ہوتی ہے اسی طرح شکتی شانتی، دُکھ سُکھ، پیر مُرشد بھی اس کے بھیتر ہی بھید کی طرح موجود ہوتے ہیں، بس کھوجنے بھالنے کی ضرورت ہوتی ہے...... آپ کے سب دُکھوں کا علاج یہیں پہ موجود تھا۔ خدا بھی یہیں تھا، شکیلہ اور آپ کی بچی شبانہ اور شہد بھی یہاں پہ موجود ہے۔ کالے شہتوت کے جلے ہوئے پتے پرانے شہد میں ملا کر شکار کئے ہوئے شیر کی ہڈی سے کھرل کر کے یہ مرہم روزانہ چہرے پہ لیپ کریں پھر قدرت کا تماشا دیکھیں۔ وضو کے پانی والا عمل جاری رکھیں۔ یاد رکھیں، وضو کرنے سے ستر عارضے ظاہری اور ستر بیماریاں باطنی دُور ہوتی ہیں۔ نمازیوں کے وضو کا پانی تمام بیرونی جلدی بیماروں کے لئے اکسیر ہے......''

مکھیا جی، عبداللہ میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''میں آپ کی کوئی سیوا نہیں کر سکا۔ کوئی سیوا خدمت ہو تو......''

میں نے اُن کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مکھیا جی! آپ کی دھرم پتنی کے وَلی کے طور پہ میں نے اپنا نام لکھا ہے، بس اس کی لاج رکھیئے گا...... اس سے زیادہ آپ کی طرف سے سیوا خدمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ یہاں اپنی بہو بیٹی لے کر آیا اور اللہ نے آپ کے دیکھتے دیکھتے ہی اتنی بگڑی ہوئی بیماری درست کر دی۔ مجھے تو آپ کا شکر گزار ہونا چاہئے...... اب آپ یہ چہرے کا کنٹوپ اُتار کر اپنی دھرم پتنی کو دے دیں......'' پھر میں نے شکیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بٹیا! اللہ درگزر کرنے والوں کو بڑا اجر دیتا ہے۔ تم نے اِن کی خاطر بڑا کشٹ اُٹھایا ہے مگر تم نے صبر کیا اس لئے آج پھل پایا ہے......'' مکھیا جی نے اپنا کنٹوپ اُتارا اور میں نے اپنی سیاہ چادر اُن کے سر پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''آج سے آپ سیاہ پوش ہو گئے ہیں۔ یہ پردہ پوش رنگ ہے، علیؑ پیا کا رنگ......''

جب ہم رخصت ہونے لگے تو مکھیا عبداللہ جی نے میرے کان میں کہا۔

''خان صاحب! آپ نے شکیلہ کو کیسے جانا؟ میں تو اِک عرصہ قریب رہ کر بھی اُسے نہ پہچان سکا؟''

''مکھیا جی! آپ چھایا شناس ہو سکتے ہیں تو کیا کوئی کایا شناس نہیں ہو سکتا......'' میں نے کہا۔

قارئین! بات کہاں سے کہاں آ پہنچی...... ذکر چین کے ساحل پہ صدیوں پرانے روشنی کے مینار کے اوپر اس لوہے کے کنٹوپ میں جکڑی ہوئی کھوپڑی سے شروع ہوا تھا۔ اس کنٹوپ کے اوپر ایک بھاری آہنی زنجیر پیوستہ تھی اور اس کا دوسرا سرا نچلی منزل کی دیوار میں جکڑا ہوا تھا۔ دراصل یہ مکھیا جی والا واقعہ مجھے اس آہنی کنٹوپ کو دیکھ کر ہی یاد آیا تھا۔ اِنسان کی مختصر سی زندگی ایسے ہی اچھے برے، حیرت ناک،

عبرت ناک یا وقتی طور پہ متاثر کرنے والے چند ایک یا بہت سے واقعات پہ مشتمل ہوتی ہے۔ جو لوگ محدود' لگی بندھی' کولہو کے بیل سی زندگی گزارتے ہیں یا گزارنے پہ مجبور ہوتے ہیں ان بیچاروں کے پاس کہنے سُننے کو سوائے ذاتی دُکھ دَرد یا مَرنے جینے کے چند واقعات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا لیکن لاکھوں میں دو چار دانے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا رزق پانی دُنیا کے ذرّے ذرّے پہ پڑا اُبھرا ہوا ہوتا ہے۔ (بعض کا تو اللہ کے دیگر عالموں میں بھی پھیلا ہوتا ہے) ان کی زندگی سمٹی' بندھی' گھٹی ہوئی نہیں بلکہ بکھری' پھیلی اور دُور دَراز تک بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ نظر نظر نفس نفس' جُرعہ جُرعہ' قدم قدم نت نئے واقعات' تجربات اور مشاہدات سے ملتفت و مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اور کان ہر لمحہ کھلے اور تمام حواس ہمہ وقت بیدار و ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان کے مخصوص لاشعور کے کمپیوٹر میں لمحہ بہ لمحہ' جُز بہ جُز ہر واقعہ' وجوہ' منظر' مقام و مکالمہ اپنی تمام تر جُزئیات' تفصیلات اور مفاہیم و مقاصد کے سیاق و سباق کے ساتھ ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں۔

ایسے لوگ اپنے مخصوص طرزِ حیات اور اندازِ عمل و فکر کی بنا پر اپنی ایک علیحدہ سی پہچان اور حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا حال سے صاحب حال و قیل و قال لوگوں کی اپنی الگ سی دُنیا ہی نہیں اپنے علیحدہ سے جہان ہوتے ہیں۔ یہ اپنی ہی طرز کی بھیلوں' پہیلیوں' ترکیبوں' تادیبوں کی عجیب و غریب' نئی نئی اور پرت دَر پرت جہتوں میں بیک وقت جی رہے ہوتے ہیں۔ دُنیا کی دُرگھٹنائیں' زمانے کے نشیب و فراز اور وقت کے اُدلتے بدلتے تیور ان کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ یہی لوگ ثقافتوں' تہذیبوں' تاریخوں' حکمتوں اور قدیم و جدید علوم و فنون کے امین ہوتے ہیں۔

میرا تعلق بھی ایسے نابغۂ روزگار' اللہ کے بندوں کے غلاموں اور کفش برداروں میں ہوتا ہے۔ جہاں اپنے بزرگوں بابوں کی جوتیاں چاٹیں' وہیں اس دُنیا کے چپے چپے پہ اس قادرِ مطلق' اللہ لم یزل کی یکتائی' بڑائی' پاکی اور ہمیشگی بھی بیان کی۔ اپنے زمانہ آوارگی' خوارگی اور بادیہ پیمائی کے دوران مجھے اکثر شدّت سے احساس ہوا کہ میرا کہیں بھی جانا' پہنچنا کبھی بھی خالی از مصلحت نہ ہوا۔ ''جہاں بھی گئے' داستاں چھوڑ آئے'' والی بات ہی ہوئی۔ کوئی نہ کوئی حادثہ' واقعہ' معاملہ' ہونی اَن ہونی' فرد و افراد میرے منتظر ہی ہوتے۔ کوئی طاقت' کوئی سسٹم مجھے زبردستی اُدھر دھکیل رہا ہوتا ہے اور الحمدُ للہ! کہ ہمیشہ میرا پہنچنا خیر و برکت پہ ہی منتج ہوا۔ ان گنت واقعات ایسے ہیں کہ میں بلا کسی ارادے' ضرورت یا وجہ کسی ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کوئی جانور' پرندہ' دَرندہ کسی مصیبت میں پھنسا ہوتا۔ اس کی مصیبت دُور کرنے کے بعد احساس ہوتا کہ واہ! مالک تیرے بچانے کے انداز بھی نرالے ہیں...... ایک واقعہ سُنانے کے قابل ہے۔

● پٹڑی، پُل اور اندھا پرندہ……!

مجھے بچپن میں موٹرکار چلانے کا بہت شوق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیالکوٹ میں اگر سڑک پہ سے کار گزرنے کی آواز آتی یا اس کا ہارن بجتا سُنائی دیتا تو سوئے جاگے بچے گھروں سے باہر سڑک پہ پہنچ جاتے، کار کے پیچھے بھاگتے بھاگتے دُور تک چلے جاتے اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے۔ اُس کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ اور خاص طور پر ڈرائیور کسی اور ہی دُنیا کے باشندے جان پڑتے تھے۔ میں اکثر اپنی گلی کی نالی والی تھڑی پر بیٹھ جاتا، دونوں بازو ہاتھ آگے کر کے خیالی اسٹیرنگ کو تھامتا اور مُنہ سے موٹر چلنے کی آوازیں نکالتا ہوا سارا شہر گھوم آتا۔ ہاتھ باقاعدہ اسٹیرنگ وِہیل کو گھماتے، پاؤں ایکسیلیٹر اور بریک پہ ہوتا، تصور میں ایسی ڈرائیونگ ہوتی کہ اصلی ڈرائیونگ کیا ہوتی ہوگی۔ اسی طرح ہم ریہڑا بھی چلایا کرتے تھے۔ سائیکل کا پرانا پہیہ یا موٹی تار کا گول چکر ہم ایک تار یا لکڑی کے ڈنڈے کے ساتھ بطور موٹرکار چلایا کرتے تھے۔ مُنہ سے ''پھوں، پھوں'' کی آوازیں آتیں۔ موڑ کاٹنا، سپیڈ کم زیادہ کرنا۔ کبھی کبھی ایکسیڈنٹ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک اور شوق بھی جنون کی حد تک تھا، وہ تھا ریل کی پٹڑی پہ بغیر اِدھر اُدھر گرے [illegible] سیدھا نہیں چل سکتا اور ہم شرط بد کر میلوں میل چلا بلکہ بھاگا کرتے تھے۔ اس کھیل کا نام ہم نے ''باؤ ٹرین'' رکھا ہوا تھا۔ اکثر محلے کے لڑکوں کے ساتھ کانگڑے پارک والے ریلوے پھاٹک تک پہنچ جاتے۔

مغرب کی جانب سیالکوٹ کا اسٹیشن اور مشرق کی طرف چونڈہ، نارووال اور جموں۔ ہم شرطیں باندھ کر دونوں پٹڑیوں پہ دونوں ٹیمیں چڑھ جاتیں اور تلواڑے جموں کی طرف ہماری باؤ ٹرین روانہ ہو جاتی۔ غازی پورہ اور تلواڑہ گزر کر ہم مضافات میں نالہ ایک کے پُل تک اور پھر وہاں سے آگے روانہ ہو جاتے۔ اکثر چونڈہ پسرور کو ہاتھ لگا کر آتے تھے اور اگر جموں والے ٹریک پہ ہوتے تو کبھی کبھی جموں تک بھی ہو آتے …… یہ بچپن تھا اور یہ بچپن کے کھیل تماشے۔ زندگی آگے بڑھی اور پھر بہت دُور تک نکل گئی، بچپن بہت پیچھے رہ گیا اور بچپن کی یادیں بھی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کی طرح پرانی فائلوں میں کہیں دب کر رہ گئی تھیں۔

لگ بھگ تیس برس بعد میں ایک لمبی خجل خواری کے بعد اپنے گھر سیالکوٹ پہنچا۔ وہی پرانا گھر، وہی گلیاں بازار اور کچھ میرے وقتوں کے پرانے لوگ بھی مگر سب کچھ جیسے بدلا بدلا سا تھا۔ یقین ہی نہ آتا کہ یہ وہی گھر، گلیاں اور بازار ہیں جہاں ہمارا بچپن بیتا۔ ہم نے موٹر گاڑی چلانا سیکھا، باؤ ٹرین چلائی،

مُرغیاں چرائیں۔ ہر چیز جانی جانی سی مگر اجنبی اجنبی بھی...... دو چار روز اِسی یگانگت اور بیگانگت میں گزر گئے۔ بہت ہی لمبے عرصے بعد لوٹے تھے' اُداس اُداس سے گھر پہ ہی پڑے رہے۔ آنے جانے اور ملنے ملانے والوں نے بھی پریشان اور مصروف رکھا ہوا تھا۔ بھرپور گرمیاں تھیں...... حبس اور لُو۔ مَیں پچھتا رہا تھا کہ اس موسم میں اِدھر کیوں آیا؟...... ایک دوپہر سخت گرمی' سڑکیں بازار خالی۔ چیل نے گھونسلہ چھوڑ دیا ہوا تھا۔ باہر تو باہر گھروں' کمروں' دالانوں میں بھی چین نہیں۔ مَیں بھی ''العطش' العطش'' پکارتا ہوا ننگی چارپائی پہ پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اچانک جی میں کیا آئی کہ ایک عزیز کو ساتھ لیا اور باہر نکل آیا۔ عزیز نے سوچا ہوگا کہ شاید مَیں باہر کوئی ٹھنڈی بوتل شربت لینے کی نیت سے نکلا ہوں۔ وہ مُنہ سے کچھ نہ بولا' بس میرے پیچھے پیچھے نکل آیا۔ شکر دوپہر' سورج سوا نیزے پہ اُترا ہوا تھا۔ میرا رُخ بازار کی بجائے کانگلے پارک یعنی ریلوے پھاٹک کی جانب تھا۔ سر پہ ٹوپی کپڑا نہ کوئی چھتری۔ جب اس عزیز کا دماغ گرم ہوا تو ناچار پوچھ بیٹھا۔

''خان جی! کِدھر کا رُخ ہے؟...... اگر کہیں دُور جانا ہے تو مَیں گھر سے چھتری وغیرہ لے آتا ہوں یا پھر کوئی تانگہ لے لیتے ہیں......'' اس کا اندازہ تھا کہ مَیں کینٹ میں آئس کریم وغیرہ کھانے جا رہا ہوں۔

''نہیں یار! بس ذرا باؤ ٹرین کھیلنے کو جی چاہ رہا ہے......''

وہ تو بہت چھوٹا تھا' اس کو باؤ ٹرین کھیل کا علم نہیں تھا۔

''باؤ ٹرین......'' اس نے دُہرایا۔ ''خان جی! مَیں سمجھا نہیں...... باؤ ٹرین تو صبح صبح ساڑھے چار بجے اسٹیشن سے لاہور جاتی ہے' آپ کس باؤ ٹرین کے کھیل کا ذکر کر رہے ہیں......؟''

ہم سڑک پہ چلنے کی بجائے گلیوں سے گزر رہے تھے۔ مَیں نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے باؤ ٹرین کھیل کی تفصیل بتانی شروع کی کہ کس طرح ہم ریلوے کی لائن پہ چلتے اور بغیر دائیں بائیں گرے میلوں میل چلے جاتے تھے بلکہ چونڈے' پسرور' جموں تک ہو آتے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''اس وقت آپ کہاں جا رہے ہیں......؟''

''بھائی! بتایا ہے کہ وہی باؤ ٹرین کھیلنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اس وقت پٹڑی خالی ہوگی' سوچا کہ چلو آج بچپن کی یاد تازہ کریں اور دیکھیں' سیدھی راہ پہ قدم بہ قدم چلنے کی پریکٹس کہیں بھول تو نہیں گئی......؟''

وہ وہیں رُک گیا' میرا ہاتھ اپنے کاندھے سے اُتارتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کے دماغ کو گرمی چڑھ گئی ہے۔ فوراً یہیں سے واپس چلیں، میں آپ کو ٹھنڈا ٹھنڈا صندل کا شربت پلواتا ہوں...... غضب خدا کا! گرمی کی انتہا، سر پہ سورج قہر برسا رہا ہے، نیچے زمین تنور بنی ہوئی ہے اور یہ ریلوے کی لوہے کی پٹڑیوں کے اوپر باؤ ٹرین کھیلنے جا رہے ہیں...... خان جی! ریل کی پٹڑیاں اس وقت آگ کا انگارہ بنی ہوئی ہیں۔ زیادہ ہی شوق ہے تو کل صبح صبح یہاں سیر کرنے کے لئے آئیں گے، آپ اس وقت باؤ ٹرین بھی کھیل لیجیے گا......"

"بھائی! تم یوں کرو کہ واپس گھر چلے جاؤ، میں تو باؤ ٹرین کھیل کر ہی آؤں گا...... شاباش! چلو گھر بھاگو......"

وہ پھر کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے روک دیا اور اسے گھما کر رُخ گھر کی جانب موڑ دیا۔ اگلے موڑ پر جب میں نے پیچھے دیکھا تو وہ پھر میری جانب آ رہا تھا۔ میں رُک گیا۔

"یار! تم گھر جاؤ...... کیوں اس گرمی میں اپنا ناس کرنے پہ تُلے ہوئے ہو؟"

میں نے اسے سمجھایا مگر وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگا۔

"خان جی! بڑی گرمی ہے، تپتی ہوئی پٹڑیوں پہ چلو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔ کل صبح سورج نکلنے سے پہلے اپنا شوق پورا کر لینا...... خدا کے لئے ضد مت کرو۔"

میں اس پاگل کو کوئی جواب دیئے بغیر پھر اپنی راہ پہ چل پڑا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ پھاٹک پہ پہنچ کر میں اسی نشان پہ جا کھڑا ہوا جہاں سے ہم باؤ ٹرین سٹارٹ کیا کرتے تھے۔ اس عزیز نے شاید پھاٹک والے سے ایک ٹوٹی کالی چھتری پکڑ لی تھی۔ اب میں بسم اللہ کر کے پٹڑی پہ چڑھ گیا اور آہستہ آہستہ اپنی رفتار پکڑ لی۔ لڑکے کو تو پٹڑی پہ چلنے کی پریکٹس نہیں تھی، وہ کبھی نیچے اور کبھی پٹڑی پہ پاؤں جما کر میرے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرتا۔ اس کی چپل بھی پرانی اور گھسی پٹی تھی۔ نوکیلے پتھر، گرم گرم لوہا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا اور میں بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا، کیا مجال جو ایک قدم بھی "رہِ شوق" میں غلط پڑا ہو۔ جیسے ٹھیلے کو دھکا لگانے والے ہوتے ہیں اور صاحب لوگ سولا ہیٹ پہنے، فائلیں زانو پہ رکھے اوپر گدی والے بنچ پہ بیٹھے ہوتے ہیں اور سر پہ پگڑی باندھے، تہبند اڑوسے دھکا مزدور پٹڑی پہ بھاگ رہے ہوتے ہیں، میں بھی دھکا مزدور بنا بھاگ رہا تھا مگر میرے اندر کا صاحب آرام سے بیٹھا لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھاٹک سے اندازاً کوئی چار پانچ کوس آگے نالہ عیک پہ کوئی تین سو فٹ لمبا ایک آہنی پُل آتا ہے۔ جموں توی سے نکلنے والا یہ نالہ اس پُل کے کافی نیچے سے گزرتا ہے۔

انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا یہ پُل بڑا مضبوط اور سنگل ٹریک کی پٹڑی ہے۔ ہم تو اپنی لگی بندھی

چال رفتار سے اس پُل پہ سے بھی بلا خوف وخطر گزر جایا کرتے تھے یا وہ لوگ جو اس پُل کو مستقل آنے جانے کے لئے استعمال کرتے ہیں' انہیں بھی کوئی خوف نہیں ہوتا مگر وہ جو اس پہ پہلی بار گزرنا چاہیں اُن کے لئے بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ دھیان اُن کا نیچے دُور پانی پہ رہتا ہے اور ادھر اوپر لکڑی کے شہتیروں پہ قدم دھرنے میں چوک جانے کا خطرہ موجود ہوتا ہے۔ کئی لوگ اس پُل سے نیچے بھی گرے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گزرنے والا ابھی آدھا پُل ہی طے کر پایا کہ اُدھر سے ٹرین آ گئی۔ اب یا تو وہ پٹڑی کے نیچے کی طرف دونوں آہنی شہتیروں کے درمیان جو خلا ہے' وہاں گھس کر پناہ لے اور ٹرین اوپر سے گزر جائے یا پھر نیچے چھلانگ لگا دے' اس کے علاوہ جان بچانے کا کوئی تیسرا راستہ نہیں...... میں اب اس پُل کے قریب پہنچ چکا تھا' پیچھے مڑ کر میں نے عزیز کو آواز دی۔

''تم اِس پُل پہ مت چڑھنا بلکہ پاس کے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر میرا انتظار کرو......''

جواب میں اُس نے بھی مجھے پُل پہ نہ چڑھنے کا مشورہ دیا مگر میں تو اپنی رفتار سے چڑھ چکا تھا۔ وہ رُک گیا تھا۔ کوئی چالیس قدم ہی آگے آیا ہوں گا کہ کان میں کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ آواز پہ ٹھٹکا۔ نیچے پاؤں اپنی رو میں گت سے چار انچ آہنی پٹری پہ پڑ رہے ہیں اور دماغ اپنی گت پہ لگ گیا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے...... چند ہی قدم آگے آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک نوجوان سی عورت اُلٹی نیچے لٹکی ہوئی ہے' اُس کی شلوار آزار بند کی جگہ سے اُوپر فش پلیٹ کے موٹے سے بولٹ کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی۔ ٹانگیں اوپر' سر دھڑ نیچے۔ اس کی قمیض' سر کے بالوں کی چوٹی نیچے جھول رہی ہے۔ چہرہ اور بچہ نظر نہیں آ رہے تھے کیونکہ قمیض اور دوپٹہ اُلٹ کر نیچے لٹک رہا تھا۔ قمیض خون سے سُرخ ہو چکی تھی اور بچے کو شاید اُس نے دونوں بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا' بازو بھی دوپٹے اور قمیض کے اندر تھے۔ میں بالکل اُس کے اوپر کھڑا یہ اندوہناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اندر کی چکّی کی رفتار بڑھ گئی۔ ایک نظر فش پلیٹ کے اُبھرے ہوئے بولٹ پہ ڈالی جس نے دو زندگیوں کو نیچے گہرائی میں گرنے سے روکا ہوا تھا۔ پُل کے اردگرد' سامنے پُل کی دوسری جانب کہیں بھی کوئی ذی نفس نظر نہ آیا۔ گرمی اپنے جوبن پہ' سورج سر پہ کھڑا تھا۔ یہاں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بھی کچھ اتنی نہیں' صبح و شام یا شاید پچھلے پہر لوکل گاڑیاں آتی جاتی تھیں یا پھر کبھی مال گاڑی یا پٹڑی مرمت کرنے والے اور ٹھیلے وغیرہ بھی کبھی کبھی دکھائی دیتے تھے...... اُدھر عزیز مجھے کافی دیر اِدھر کھڑا دیکھ کر درختوں کے سامنے سے نکل کر پُل پر چڑھ آیا اور آواز دے کر پوچھا۔

''خیریت ہے......؟''

''کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو......؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''......آ ہی تو رہا ہوں......''

میرے پاس پہنچ کر اسے جب معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تو وہ ہڑبڑا کر گرتے گرتے بچا۔ میں نے اسے وہیں پٹڑی پہ بٹھا دیا۔

''پہلے اپنے حواس درست کرو' پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کر سکتے ہیں......''میں نے بیٹھتے ہوئے اس لٹکی ہوئی عورت کو آواز دی۔ ''بہن جی! آپ میری آواز سُن رہی ہیں؟...... گھبرائیں نہیں' بچے کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں......''

اِدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ عورت بے ہوش ہو چکی ہے یا پھر؟...... اچانک کہیں سے ایک آواز آئی۔

''اوئے' اوپر کیا کر رہے ہو؟...... آگے یا پیچھے چلے جاؤ' گاڑی آنے والی ہے...... جلدی کرو......''

بائیں طرف درختوں کی جھنڈ میں نالے سے پانی اُٹھانے والا رہٹ لگا ہوا تھا' وہیں سے ہانکا لگاتا ہوا مجھے ایک آدمی نظر آیا۔ میں نے بآوازِ بلند مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اُس سے پُل پہ آنے کی التجا کی تو وہ فوراً دو اور کسانوں کو لے کر پُل پہ پہنچ گیا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر اُن کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ اُدھر ایک اور مصیبت سر پہ آ کھڑی ہوئی۔ پرے اُس کے موڑ سے گاڑی کی سیٹی بلند ہوئی' وہاں سے پُل بمشکل چار پانچ میل ہی دُور ہو گا۔ اب کیا کیا جائے؟...... پہلے سوچا کہ گاڑی گزر جائے' پھر کچھ کریں گے مگر یہ خیال آتے ہی کہ گاڑی کی دھمک اور عورت کے اپنے وزن سے فش پلیٹ میں پھنسی ہوئی شلوار اگر کہیں پھٹ گئی تو ماں اور بچہ دونوں نیچے گر جائیں گے لہٰذا گاڑی کے گزر جانے کا ارادہ بدل کر میں نے ٹرین رکوانے کا فیصلہ کیا۔

ہم پانچوں نے جلدی جلدی پُل پار کر کے گاڑی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ بہت جلد ہمیں دُور سے گاڑی دُھواں اُگلتی نظر آ گئی۔ ہم نے قمیضیں اُتار کر ہلانا شروع کر دی تھیں۔ گاڑی نے جب مسلسل سیٹیاں بجانی شروع کیں تو ہمیں تسلی ہو گئی کہ انجن ڈرائیور نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ گاڑی کی رفتار کم ہوتے ہوتے ہمارے پاس پہنچ کر بالکل ہی رُک گئی۔ گارڈ بھی بھاگا بھاگا آیا' کچھ مسافر بھی اُتر آئے۔ ساری صورتِ حال بیان کی' ہمیں انجن پہ ہی بٹھا لیا گیا۔ آہستہ آہستہ ہم پُل کے کنارے پہ آ کھڑے ہوئے۔ دو چار مضبوط سے مسافر' گارڈ اور ہم موقع پہ پہنچ آئے۔ دو مضبوط سے رَسے باندھ کر دو آدمی نیچے

لٹکے۔ بچے کے رونے کی آواز بھی اب بند تھی' لٹکے ہوئے آدمیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح عورت کی گرفت سے بچے کو نکالیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اِن آدمیوں نے عورت کی کمر میں رسا باندھا' باقی آدمیوں نے بڑے آرام سے اوپر اُٹھا لیا۔ چار آدمی بڑی حفاظت سے اُسے اُٹھا کر قدم قدم باہر لائے۔ اتفاق سے گاڑی میں ایک ڈاکٹر اور دو میڈیکل سٹوڈنٹ بھی سفر کر رہے تھے۔ عورت اور بچے کو اُٹھا کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گدے پہ لٹا دیا گیا۔ ہم دونوں بھی ساتھ ہی سوار ہو گئے۔ چند منٹوں میں ہم سیالکوٹ کے سٹیشن پہ پہنچ گئے۔

ویٹنگ روم میں عورت اور بچے کو پہنچا دیا گیا' عورت زندہ تھی اور بچہ سویا ہوا تھا۔ عورت کہیں پاس کے ہی گاؤں کی تھی' اکثر اس پُل سے آتی جاتی رہتی تھی۔ آج بدقسمتی سے اس کی شلوار کا پائینچہ اس کی جوتی تلے آ گیا' وہ مُنہ کے بل گر پڑی۔ دونوں ہاتھ بازو شیر خوار بچے کو تھامے ہوئے تھے۔ وہ لڑکھڑائی اور نیچے گرتے ہی اس کی شلوار کہیں فش پلیٹ میں اڑ گئی۔ قدرت نے بچانا تھا' بچا لیا۔ بیہوش ہو گئی' سر زخمی ہو چکا تھا' خون بہہ رہا تھا مگر ماتا نے اپنے بچے پہ سے گرفت ڈھیلی نہ کی...... شام چار بجے کے قریب میں اور عزیز گھر واپس آ رہے تھے۔ گرمی کا زور ابھی تک ٹوٹا نہ تھا' پسینے اور پیاس سے بُرا حال...... عزیز کو جیسے اک چُپ سی لگی ہوئی تھی۔

''یار! تم خاموش کیوں ہو' کوئی بات کرو......؟'' میں نے اسے ٹٹولا۔

''بات کیا کروں خان جی! آپ نے تو بات کرنے کے لائق نہیں چھوڑا...... اچھا یہ بتائیں' کیا آپ کو کوئی اشارہ ہوا تھا یا رات خواب میں دیکھا تھا......؟''

''نہیں' کچھ بھی نہیں ہوا' بس ذرا باؤ ٹرین کھیلنے کو جی چاہ رہا تھا......''

''باؤ ٹرین نہیں' بچہ ٹرین کہیں......'' عزیز نے جواب دیا تھا۔

یہ ایک قصہ سُنانے کا مقصد یہی تھا کہ کچھ لوگ پیدا ہی انہی سلسلوں کے لئے ہوتے ہیں۔ جیسے کاشتکار کا پھاوڑا اُگانے کے لئے اور گورکن کا پھاوڑا دبانے کے لئے ہوتا ہے حالانکہ ہوتے تو دونوں لوہے کے پھاوڑے ہی ہیں۔ کچھ لوگ سڑکوں پہ دوڑنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور ہوتے ہیں اور کچھ فضاؤں میں اُڑنے والے جہازوں کے پائلٹ' مقصد دونوں کا منزل پہ پہنچانا ہوتا ہے۔ بس انداز' طریقے' فنکشن' ٹیکنالوجی اور شکلیں مختلف ہوتی ہیں اور پھر اپنی اپنی ڈیوٹیاں ہوتی ہیں' جو جس کا اہل ہوتا ہے' اُدھر لگا دیا جاتا ہے۔

اِدھر روشنی کے مینار تک بھی میں خود نہیں آیا تھا' جیسے مجھے بھیجا گیا یا میں لایا گیا تھا۔ اِسے کچھ کہہ

لیں لیکن یہ بات طے ہے کہ میرا یہاں پہنچنا کچھ یوں ہی نہ تھا۔ اب میرے سامنے ایک انسانی ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا' دکھائی دیتا تھا کہ سینکڑوں سالوں سے یہ جُوں کا تُوں ہی پڑا ہوا ہے' اسی کروٹ' جس کروٹ اس کا آخری سانس نکلا ہوگا۔ اس پنجر کا دھڑ دائیں کروٹ پہ آدھا اوپر اور آدھا نیچے فرش والی سیڑھی پہ پڑا تھا۔ پاؤں اور کمر کے گرد چمڑے کی پٹیوں کے چیتھڑے اور تانبے پیتل کے بکل ابھی تک جُوں کے توں لپٹے ہوئے تھے۔ پاؤں اور ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن جو سیاہ رنگت اختیار کر چکے تھے' ابھی تک موجود تھے۔ پنڈلیوں' چہرے اور بازوؤں پہ کہیں کہیں سوکھی سڑی کھال کی باقیات بھی باقی تھیں' اسی طرح سر پہ بھی کہیں کہیں بال سلامت تھے' شاید یہاں کی آب و ہوا یا سمندر کے نمکیات اور انسانی دست بُرد سے محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ کسی بدنصیب معتوب انسان کی ہڈیوں کا پنجر ابھی تک اپنی اصلی حالت میں یہاں پڑا ہوا تھا بلکہ میرا اپنا اندازہ تھا کہ مینار کی اس آخری منزل پہ صدیوں سے کوئی آیا تک نہیں تھا۔ میں شاید اس انسان کے مرنے کے بعد پہلا شخص تھا جو آج یہاں پہنچا تھا۔ فرش پہ بچھی ہوئی خاکستری رنگت تین تین انچ گہری دھول اور یہاں کی ہر چیز اپنے اصلی قدرتی رنگ اور انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ رسے' ڈول' چمڑے اور لکڑی کے بڑے بڑے ڈرم' کھانے پینے کا خشک سامان' موم کا ذخیرہ' ریگ گھڑی' جوتے کپڑے اور روشنی کے لیمپ جلانے بجھانے کا سامان۔ اگر کوئی یہاں آیا تھا تو یقیناً یہاں پہ موجود ان اشیاء کی ترتیب ایسی قدرتی اور جُوں کی توں نہ ہوتی۔ میں نے چاہا کہ اپنے مہربان نیک خو انسان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے مگر وہ تو نیچے تھا' آگے بڑھ کر نیچے دیکھا تو وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک مدھم سا لیمپ تھا جس کی بے جان سی روشنی میں مجھے وہ کوئی بھوت سا دکھائی دیا جبکہ میرے پاس میری اپنی ٹارچ تھی لیکن اوپر شیشے کی محراب میں چاندنی ایسی کھلی ہوئی تھی کہ مجھے ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی...... میں نے اُسے آواز دی۔

''کیا تم ذرا اوپر آسکتے ہو......؟''

جواب دینے کی بجائے اُس نے سر ہلا کر معذرت سی کر لی' شاید وہ اپنی لاچاری کی وجہ سے لوہے کی تنگ سی سیڑھی پہ چڑھنے سے معذور تھا۔ اب ٹارچ روشن کر کے میں نے پنجر کو ذرا تفصیلاً دیکھنا چاہا۔ ہاتھ پاؤں کی کھلی کشادہ سی ہڈیاں' لمبا تڑنگا قد کاٹھ' فراخ سینہ اور بڑا سا سر جو لوہے کی پتلی سلاخوں سے بنے ہوئے انسانی چہرے جیسے خدوخال والے ایک کنٹوپ میں بند تھا۔ یہ آہنی کنٹوپ اصلی چہرے سے کچھ ہی بڑا ہوگا۔ میں مزید جھکتے ہوئے غور سے کنٹوپ کو دیکھنے لگا۔ دھول گرد اٹی پڑی تھی' رومال سے دھول صاف کر کے میں نے جیب سے چاقو نکالا اور ہلکا سا کنٹوپ کو کھرچا' معلوم ہوا کہ یہ لوہا نہیں بلکہ

تانبا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مضبوط اور مردانہ قسم کے جبڑے میں ابھی پورے بتیس دانت مکمل نہیں تھے' اس کا مطلب تھا کہ معتوب قیدی ابھی جوان ہی تھا۔ ایک اگلے دانت میں سونے کی کیل لگی ہوئی دکھائی دی' گلے میں چمڑے کا ایک گلو بند لپٹا ہوا جو بالکل صحیح حالت میں تھا۔ اس کے چمڑے کے تسمے میں ایک دھات کی بنی ہوئی لمبوتری سی لوح نظر آئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا تو وہ جیسے میرے ہاتھ لگانے کی منتظر تھی' چمڑے کے تسمے سے نکل کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔

اب ایک بار پھر میری آنکھیں تانبے کے اس کنٹوپ کا جائزہ لینے لگیں جسے ایسی مہارت اور ہنرمندی سے بنایا گیا تھا کہ انسانی عقل دنگ رہ جائے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے تانبے کی پنسل برابر موٹی سلاخوں سے کسی انسان کا چہرہ بنا دیا ہو۔ منہ کی جگہ منہ۔ ناک' آنکھیں اور کان۔ کنٹوپ دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔ سامنا چہرہ کانوں تک اور پیچھے گردن اور گدی کا حصہ علیحدہ بنایا گیا تھا۔ پانچ ربتوں یا موٹے کیلوں نے دونوں حصے آپس میں پیوست کیے ہوئے تھے۔ دو کیل دائیں بائیں تھوڑی کے نیچے گردن پہ' دو کنپٹیوں کے پاس اور ایک اوپر تالو پہ جہاں زنجیر پچھلے حصے کے اوپر جڑی ہوئی تھی۔ ایک خاص ہنرمندی جس نے میری توجہ کو دوچند کیا ہوا تھا وہ کنٹوپ کے دونوں حصوں کا آپس میں کیلوں کے ذریعے پیوست ہونا تھا۔ اگلے حصے کے پانچوں کیل ایسے ٹھیک حساب اور کاریگری سے تخلیق کیے گئے تھے کہ انہیں پچھلے حصے کے سوراخوں میں داخل کر کے ہلکا سا دبا دیا گیا تھا۔ یہ کیل تانبے کے نہیں بلکہ کسی اور چمکیلی سی دھات کے اس طور بنے ہوئے تھے کہ جیسے تیر کی دوشاخی انی ہوتی ہے۔

ویسے تو تیر کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ عربی' ترکی' ایرانی' مشرقی' یونانی اور ہندی' اور بھی بے شمار شکلیں اور قسمیں ہیں۔ ہر زمانے' تہذیب اور مختلف ادوار میں انسان نے اپنے عسکری ذوق' ضرورت' حیثیت' موسمی اور جغرافیائی حساب کتاب کے مطابق تیر بنائے۔ جنگلوں میں جانوروں کے شکار اور جنگوں میں جنگی یلغاروں میں استعمال ہونے والے تیروں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے' نشانہ بازی اور پیغام رسانی کے تیر مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ تیر آگ برسانے اور لگانے والے بھی ہوتے ہیں اور کچھ محض شعبدہ بازی کے کھیل تماشے دکھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ شاعری' طعنہ زنی' غم واندوہ' ہجر و فراق اور نظروں نینوں کے بھی تیر ہوتے ہیں۔ اب صرف تین قسم کے تیر عام طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی انی آم کے پتے کی طرح ہوتی ہے' اس تیر کو سالم حالت میں کھینچ کر زخم سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ ایسے تیر سادہ بھی ہوتے ہیں اور زہر میں بجھے ہوئے بھی' زہر سے مراد یہ ہے کہ ایسے تیروں کی انی یعنی برچھی یا نوک کو آگ میں سرخ کر کے خچر کے پیشاب میں بجھا لیا جاتا ہے۔ ایسے تیر کا زخم زندگی بھر ٹھیک

نہیں ہوتا' ناسور بن کر قبر میں لٹا دیتا ہے۔ دوسری قسم کے تیروں کی اَنی اُردو کے عدد آٹھ (۸) کی شکل میں ہوتی ہے۔ ایسے تیر عجائب خانوں کے علاوہ عید کارڈز' کشوں کے پیچھے' مہندی والے ہاتھوں' عاشقوں کے خطوں یا بازوؤں پہ نظر آتے ہیں۔ جو دل کے آرپار تیر ہوتا ہے چند سُرخ سُرخ' گرم گرم لہو کے قطرے بھی ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ یہ آٹھ کی شکل والے تیر بڑے خطرناک اور مہلک ہوتے ہیں۔ جہاں گھس جائیں تو پھر انہیں وہاں سے نکالا بھی نہیں جا سکتا' باہر کھینچنے پہ مجروح کی جان بھی ساتھ نکال لاتے ہیں یعنی آٹھ کی شکل والی اَنی بان کھینچتے ہوئے گوشت' کھال اور اندر کا سازوسامان بھی باہر گھسیٹ لاتی ہے۔

کنٹوپ کے جوڑ والے سوراخوں میں یہ کیل آٹھ کے ہندسے والے تیر کی اَنی کی طرح گھس کر کھلے ہوئے تھے جسے نہ تو نکالا جا سکتا تھا اور نہ توڑا یا کاٹا جا سکتا تھا۔ کوئی لوہا کاٹنے والی آری یا کوئی ایسا اوزار جو ان کیلوں کو توڑ یا کاٹ سکے اِس کنٹوپ پہ کارآمد نہیں ہو سکتا تھا یعنی گردن چہرے اور کنپٹیوں کو خطرناک حد تک نقصان پہنچائے بغیر اسے سَر سے اُتارنے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا...... سَر' گردن' پسلیاں۔ اَب میں بازوؤں' بانہوں اور ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ سیدھے ہاتھ کی تیسری اُنگلی کی ہڈیوں میں مجھے ایک سیاہ رنگت کی انگشتری پھنسی ہوئی دکھائی دی۔ ... میں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ کے پنجے کو چھوا پھر آہستہ سے انگشتری کو پکڑ کر اُنگلی کی ہڈیوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ انگشتری تو نکل آئی مگر اس کے ساتھ پوری اُنگلی کی تین ہڈیاں بھی اُکھڑ آئیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ کو ذرا ہلایا تو وہ بھی کلائی سے نکل آیا یعنی پورے پنجر کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور اسے یہاں سے ہٹانا یا اُٹھانا عبث تھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں سَر کی جانب بڑھا زنجیر کو پکڑ کر ... اُٹھایا تو ... لمحے کنٹوپ میرے ہاتھ میں طوطے کے پنجرے کی طرح لٹک رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجرے میں طوطے کی جگہ خوفناک قسم کی کھوپڑی تھی جو دھڑ سے بڑی آسانی سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ شاید انسانی جسم میں صرف کھوپڑی ہی ایک ایسا حصّہ ہے جو انسان کے مرنے کے بعد دیر تک اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔

سَر کا تڑکا ہوا کاسہ' ماتھے کی سکندر بختی کی اُجڑی ہوئی بستی' نین ساگروں کے تاریک گہرے خشک گڑھے' سورج ہنسیوں کی سی ناک کا ٹوٹا ہوا بانسا' جبڑے کی جبر سائی' سیپ کے موتیوں کی جگہ ہنسائی۔ ساحروں اور کاہنوں کے ڈیکوریشن پیس' کالے علم اور سفلی علوم والوں کے لئے استعانت ابلیس۔ جادو' ٹونے ٹوٹکے اور جنتر منتر والوں کی خباثت خبیث...... قدرے بھاری زنجیر گھسیٹتا اور کھوپڑی کے پنجرے کو اُٹھائے میں بڑی دِقت سے تنگ' اُفقی آہنی سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ میرا مہربان ڈاکٹر بڑا متعجب سا مجھے نیچے اُترتے دیکھ رہا تھا۔ زنجیر ایک ڈھیر کی صورت میں پاؤں میں پڑی تھی جس کا دوسرا سِرا میری بائیں

جانب پتھر کی دیوار میں مضبوط سے ایک آہنی حلقے کے ساتھ پیوست تھا' یہ ایک ایسا مضبوط بندوبست تھا کہ انسان تو کجا' ہاتھی بھی کھینچے تو توڑ نہ سکے...... میں نے یونہی اس مہربان ڈاکٹر سے سوال کر دیا۔

''آپ کبھی اوپر گئے ہیں......؟''

میرا سوال سُن کر وہ اوپر کی منزل کو دیکھنے لگا' پھر بڑی نحیف اور آزردہ سی آواز میں بولا۔

''اچھے انسان! میں نے تو اس جگہ پہ' جہاں ہم دونوں کھڑے ہیں' آج پہلی بار قدم دھرا ہے......'' وہ میرے ہاتھ میں لٹکی ہوئی کھوپڑی کو تجسس بھری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''......لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس جگہ اور اوپر کیا کچھ ہے' کون قید ہے' اس کا نام اور اس کی مصیبت اور گناہ' سب کچھ میرے علم میں ہے......''

''میری سمجھ سے یہ بات بالا ہے کہ آپ یہاں رہتے ہوئے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی ادھر اُوپر نہیں آئے جبکہ آپ کے پاس چابیاں بھی تھیں' تالے دروازہ کھولنے کے تمام طریقوں سے بھی آپ واقف ہیں۔ آپ ہی نے مجھے گائیڈ کیا تو میں اُوپر پہنچا ہوں' اسی طرح آپ بھی یہاں آ سکتے تھے......''

وہ بجھتی ہوئی لالٹین کو اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''یہاں سردی کچھ زیادہ ہے۔ تفصیل سے بات کرنے کے لئے بھی یہ جگہ کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ آپ پسند فرمائیں تو نیچے چلتے ہیں......''

اس کا معقول مشورہ سُن کر میں نے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پنجرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کنٹوپ اور کھوپڑی کا کیا کریں...... میرا خیال ہے کہ اسے زنجیر سے علیحدہ کئے بغیر ہم اسے اس کمرے سے باہر نہیں لے جا سکتے...... آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ بالکل دُرست فرما رہے ہیں لیکن آپ اس کنٹوپ اور کھوپڑی کو یہاں سے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟ اگر کوئی آپ کا خاص مقصد ہے تو اس پنجرے کو زنجیر سے علیحدہ کرنے کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔''

اُس کی اس بات کا واقعی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ میں اس پنجرے' کھوپڑی کو کیوں ہاتھ میں لٹکائے ہوئے ہوں اور اس کو یہاں سے باہر کیوں لے جانا چاہتا ہوں؟...... میں نے جواب دیا۔

''اسے باہر لے جانے کا کوئی خاص مقصد نہیں سوائے اس کے کہ میں ذرا اس پُراسرار' پُرحکمت' نادر سے کنٹوپ اور اس کے اندر اس عظیم' باوفا' مضبوط الاعصاب و کردار' خوبرو نوجوان کی انتہائی قیمتی کھوپڑی کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کنٹوپ سے مُنسلک کھوپڑی اور ڈھانچے نے مجھے

جیسے پکڑ اور جکڑ لیا ہے' یہ میرا بازو تھام کر مجھ سے استدعا کر رہی ہے کہ صدیوں سے بھٹکتی ہوئی میری بے چین و بے قرار رُوح کو ڈھنڈلے' بے سمت اور بے منزل راستوں کے سرابوں سے نجات دلاؤ......''
مَیں نے آہستگی سے کنٹوپ کو فرش پہ رکھتے ہوئے التجا کے لہجے میں کہا۔ ''میرے عظیم دوست! اگر ممکن ہو تو جلد از جلد اس کنٹوپ کو زنجیر سے علیحدہ کروادو......''

وہ سر نیہوڑاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نیچے تشریف لے چلئے' مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھیوں میں ایک شخص اس کنٹوپ کو زنجیر سے علیحدہ کر سکتا ہے......''

کنٹوپ کو وہیں رکھ کر ہم پھر درمیانی منزل میں واپس پہنچ گئے۔ ایک تاریک سے حصے میں وہ دُنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگ ایک دوسرے میں گھسے ہوئے' گھبرائے اور جُھل جُھل سے بیٹھے تھے ہاتھ' بازو' منہ سر اور جسم متعفن چیتھڑوں سے ڈھانپے ہوئے۔ کوڑھی کے جسم میں بن پلکوں کی صرف آنکھیں ہی تو ہوتی ہیں جو بغیر جھپکے پل بھر میں دوسرے کو اپنے تمام دَرد رَوگ کی داستان بیان کر دیتی ہیں۔ کوڑھی کی آنکھ میں ایسا نجستہ ٹھہرا ہوا کرب اور جمی پھنسی ہوئی کُرلاہٹیں ہوتی ہیں کہ ایک ذی حس انسان انہیں سنے بغیر ہی سُن ہوا ہوجاتا ہے۔ اندھیرے میں وہ سب ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی غیر محفوظ سے نیم اندھیرے جنگل میں شکاریوں سے ڈرے ہوئے پیاسے بھٹکے ہوئے پیاسے بھٹکے ایک دوسرے میں گتھم گتھا پڑے ہوں۔ ہمارے آنے پہ ان کے درمیان ہلکی سی کُھسر پُھسر شروع ہوگئی تھی' وہ اپنے لبادوں میں مزید سمٹ کر بیٹھ گئے۔ مجھے سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک چوبی نشست پہ بٹھا کر ڈاکٹر نے ایک شخص کو قریب بلا کر کنٹوپ کو زنجیر سے علیحدہ کرنے کے بارے میں کچھ کہنا شروع کیا تو مَیں نے قطع کلامی کی معذرت چاہتے ہوئے مشورہ دیا کہ شاید یہ کام اس اکیلے شخص کے بس کا نہ ہو کہ زنجیر انتہائی مضبوط اور کنٹوپ کے اندر کھوپڑی کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔ مَیں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں بے احتیاطی سے کھوپڑی اور کنٹوپ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ مَیں نے انہیں بڑے پیار سے کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو مَیں بھی ساتھ چلتا ہوں تاکہ انہیں اگر کسی مدد کی ضرورت پڑے تو پریشانی نہ ہو۔ شاید انہیں میرا مشورہ مناسب لگا اور وہ شخص ضروری اوزار لینے کے لئے نیچے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ایک بڑا سا ہتھوڑا' لوہا کاٹنے کی ایک پرانی سی زنگ آلودہ آری اور ایک کُند سی چھینی لے کر آ گیا۔ ہم تینوں آگے پیچھے ایک درمیانی فاصلہ رکھتے ہوئے اُوپر کی منزل پہ پہنچ گئے۔

ایک بات مَیں نے شدت سے محسوس کی کہ وہ لوگ کہیں بھی میرے نزدیک نہیں آئے' شروع سے اب تک دس بیس قدموں کا فاصلہ درمیان میں ضرور رکھا شاید اس لئے کہ وہ ایک ایسے موذی بیماری

میں مبتلا تھے جو ایک سے دوسرے تک دراز ہو جاتی ہے..... اوپر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ آپ صرف ٹارچ روشن کر کے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو جائیں۔ لالٹین کی لو بڑھا کر وہ کنٹوپ سے زنجیر علیحدہ کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ ادھر اُدھر اُلٹنے پلٹنے کے بعد انہوں نے کنٹوپ کے اوپر زنجیر کے حلقے پہ ہلکے سے آری کے دندانے آزمانے شروع کر دیئے۔ یہ آری بھی شاید ان قدیمی آریوں میں سے ایک تھی جنہیں کبھی آریوں نے اپنی جنگی یلغاروں میں استعمال کیا ہوگا۔ ایسی آریاں کثیر المقاصد سی ہوتی ہیں' ایک دانتا سیدھا اور ایک اُلٹا ہوتا ہے۔ یہ کبھی کند نہیں ہوتیں۔ جیسے جیسے' جوں جوں استعمال کرو' توں توں یہ تیز اور تیکھی ہوتی ہیں۔ یہ لکڑی' لوہا' چمڑا' پتھر حتیٰ کہ جانوروں اور انسانوں کو بھی تیز چھری کی طرح کاٹ سکتی ہے۔ بحری جہاز رانوں' صحرانوردوں' کوہ پیماؤں' چوروں' ڈاکوؤں' رہزنوں کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو اس ہشت پہلو اوزار کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بہت بعد اس آئیڈیا کو بنیاد بنا کر سوئٹزرلینڈ والوں نے اپنا مشہور زمانہ جیک سوئس نائف ایجاد کیا جس کے سُرخ دستے پہ کراس کا نشان ہوتا ہے۔ یہ ایک چاقو پچیس ہزار روپے سے لے کر چار لاکھ روپے کی قیمت کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مختلف جسامتوں' حجموں اور کام مقصد کے لئے ہوتے ہیں۔ چھوٹی' پیچ کس' زنبور' ناخن تراش' آری' ریتی' شکاری چاقو' شیشہ' پتھر کاٹنے کی اَنی' ٹن کین' بوتل کا ڈھکن [illegible] پلاس [illegible] بنانے [illegible] سرکی مچھلی کے منہ میں پھنسا ہوا کانٹا نکالنے والی ' ہک' کھانے کی چھری اور کانٹا' غرضیکہ یہ کثیر المقاصد سوئس نائف اوزاروں میں اَمرت دھارا کا کام دیتا ہے۔ میرے پاس بھی یہ چاقو مدتوں رہا ہے۔ اب بھی ایک قبیل کا چھوٹا چاقو میری جیبی چابیوں کے چھلے میں ہر وقت موجود رہتا ہے جو مجھے زمانۂ آوارگی کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کنٹوپ کے اوپر حلقے پہ آری آزمائی جا رہی تھی' ذرا پرے کھڑے میں نے محسوس کیا کہ آری پہ اس شخص کی گرفت بس برائے نام سی ہے' مضبوط نہیں۔ دونوں کے ہاتھوں پہ چیتھڑے اور کپڑے کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ کوڑھیوں کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں' ناک' منہ وغیرہ سب سے پہلے سڑ گل کر جھڑ جاتے ہیں۔ متاثرہ اعضاء پہ نہ مندمل ہونے والے کھلے زخم بن جاتے ہیں جنہیں مکھیوں' گردوغبار' گرمی سردی اور لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لئے یہ بے چارے انہیں پٹیوں اور دھجیوں سے لپیٹے اور چھپائے رکھتے ہیں۔ میں ان کی بے چارگی اور جان توڑ کوشش کو بڑی دردمندی سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ مجھے قریب نہیں آنے دیں گے' نہ ہی میری کسی قسم کی مدد کو قبول کریں گے کیونکہ ہر کوڑھی محسوس کرتا ہے کہ کوئی بھی صحت مند انسان ان کے قریب رہ کر بیمار ہو سکتا ہے۔ اسی لئے وہ انسانی آبادیوں سے دُور ویرانوں میں چلے جاتے ہیں..... مسلسل آری چلانے سے اس شخص کے ہاتھ کی پٹیوں

سے خون رسنے لگا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا' میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی۔

''پلیز! آپ یہ کام چھوڑ دیں اور نیچے تشریف لے جائیں' باقی کا کام میں خود کر لوں گا......''

ڈاکٹر صاحب نے مجھے فوراً روک دیا' کہنے لگے۔

''آپ برائے مہربانی آگے نہ بڑھیں...... میں جانتا ہوں کہ آپ کسی بھی اچھے بُرے انجام سے بے نیاز ہو کر یہاں رُکے ہوئے ہیں' ہماری بیماری کی سنگینی کو جانتے سمجھتے ہوئے بھی آپ نے خود کو ہمارے درمیان موجود رکھا ہوا ہے جبکہ اس جگہ کے دو دو کوس قریب کوئی نہیں پھٹکتا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس جگہ صرف تین ہستیاں ہی آ سکتی ہیں۔ عقل و خرد سے بے نیاز کوئی شخص' اللہ کا کوئی درویش بندہ جسے قدرت نے اعجازِ مسیحائی بخشا ہو یا پھر ملک الموت......!'' مجھے غور سے دیکھنے اور چند لمحے توقف کے بعد وہ مردِ مہربان بولا۔ ''میں اور میری بیوی بھی کبھی آپ کی طرح صحت مند اور دکھی انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ زندگی اور موت' عزت ذلت' سب اللہ کے ذمے سمجھتے تھے۔ یہاں کے کوڑھیوں' جذامیوں کی تیمارداری' علاج معالجے اور خدمت میں ایسے مگن ہوئے کہ ضروری احتیاطیں اور درمیانی فاصلے' حدیں قائم رکھنے میں کوتاہی اور لاپروائی برتنے لگے' نتیجہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے...... ہمیں اپنی زندگیوں کی کوئی پرواہ نہیں' افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کاش! ہم اپنے اور ان کے درمیان ایک ضروری فاصلہ اور احتیاط اختیار کرتے تو شاید کچھ زیادہ دیر زندہ رہ کر اپنے مشن کو آگے بڑھا سکتے...... اس لئے جناب! آپ وہیں کھڑے رہیں اور صرف دیکھتے رہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔''

''میرے عظیم دوست! تمہارے اور تمہارے ساتھی کے یہ بے انگلیوں کے زخمی ہاتھ یہ مشقت والا بھاری کام کرنے کے اہل نہیں۔ جس طرح دانت نہ ہوں تو فقط مسوڑھوں سے کھایا نہیں جا سکتا' اسی طرح انگلیاں نہ ہوں تو خالی ہتھیلیوں سے کسی چیز کو پکڑا نہیں جا سکتا...... رہی بات احتیاط اور فاصلے کی' تو اس معاملے میں آپ کا کہنا بالکل دُرست ہے لیکن یہ تو ایک عام اور صحت مند انسان کے لئے ہے اور میں نہ تو ایک عام انسان ہوں اور نہ ہی صحت مند...... آپ کے باہر ظاہر کوڑھ اور زخم ہیں اور میرے اندر اور باطن میں گڑھے اور گھاؤ ہیں۔ سپیرا جب بانبی میں ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ ممولا یا خرگوش پکڑنے کے لئے نہیں ڈالتا' مارِ سیاہ کے ہر وار کا منتر اس کی زبان پہ اور اس کے ہر گزند کا تریاق اس کے جھولے میں ہوتا ہے...... اب آپ دونوں پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جائیں اور اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھیں......''

وہ حیران اور پریشان سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے پاس بیٹھ گئے۔ جب میں آگے بڑھ کر آری کو پکڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب پھر بولے۔

''خان صاحب! اس آری کو ہم نے چھوا ہے' ہمارے زخموں کے خون اور پیپ سے یہ لتھڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے یہ زنجیر کاٹنے پہ ہی بضد ہیں تو مجھے اجازت دیں کہ میں اسے صاف کر دوں......''

''ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں کس کس چیز کو صاف کریں گے...... یہ زنجیر' دیواریں' دروازے' سیڑھیاں۔ یہ گھاس پھونس' یہ لکڑی کے بنچ سٹول۔ اس چمڑے کے صندوق اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے اور ان چابیوں کو جو آپ نے مجھے تھمائیں' کیا آپ نے ان سب اشیاء کو نہیں چھوا؟...... ڈاکٹر صاحب! جب سے میں یہاں آیا ہوں' میں نے ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور چھوا ہے۔ میں نے یہاں کے ماحول اور آب و ہوا میں کھایا پیا ہے' نمازیں پڑھی ہیں۔ آپ کے ساتھ نیچے' اوپر آیا' گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا؟...... آپ فکر نہ کریں' مجھے کچھ نہیں ہوگا اور اگر کچھ ہو بھی گیا تو یہی ہوگا نا' کہ میں بھی آپ کے ساتھ یہیں رہ جاؤں گا۔ آپ بھی تو انسان ہیں جو بھی یہاں پہ ان دکھیوں کا درماں بن کر آئے تھے' اگر میں بھی آپ کی طرح ان صابر' شاکر' بیمار انسانوں کی خدمت میں لگ جاؤں تو اس سے بڑھ کر میری اور کیا خوش بختی ہو سکتی ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے آتی ہوئی آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں' حرف شکایت زبان پہ نہیں لاتے۔ ہر حال میں اللہ کی بزرگی اور بڑائی کی تسبیح کرتے ہیں اور راضی بہ رضا رہتے ہیں۔ سو ڈاکٹر صاحب! میں بھی الحمدللہ! بندۂ تسلیم و رضا ہوں......''

اب میں دھیرے دھیرے کنٹوپ کے سر پہ وہ حلقہ کاٹ رہا تھا جس سے زنجیر پیوست تھی۔ ہاتھ' انگلیوں اور صحت کی سلامتی کے باوجود مجھے اسے کاٹنے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ زنجیر کا حلقہ کٹا تو میرے حلق سے بھی اپنے آپ ''الحمدللہ'' نکلا۔ کنٹوپ اٹھا کر ہم نیچے اتر آئے۔ میں نے لالٹین اور ٹارچ کی روشنی میں ایک بار پھر کھوپڑی کا مشاہدہ کیا' تانبے کی سلاخوں کے اندر جو کچھ بھی مجھے نظر آیا' اس سے یہی اندازہ ہوا کہ کھوپڑی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب بھی سامنے بیٹھے کھوپڑی کو گھور رہے تھے' اچانک پوچھنے لگے۔

''میرے قابل تعظیم دوست! کیا میں ایک بات دریافت کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں...... کچھ دیر پہلے آپ نے اس کھوپڑی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ کھوپڑی ایک عظیم' باوفا' مضبوط الاعصاب و کردار' خوبصورت نوجوان کی ہے۔ عمر اور صحت مندی کا اندازہ تو خیر' دانت اور کھوپڑی کی باقیات کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے مگر کردار' خوبصورتی' وفا اور اس کی عظمت کا اندازہ آپ نے کس طرح سے اخذ کیا......؟''

میں نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ شاید جانتے ہوں گے کہ ہر چیز

اپنے نقطہ یا مرکز کے اردگرد بھی چھوٹے چھوٹے یا بڑے بڑے غیر مرئی دائروں اور حلقوں کی شکل میں پھیلی ہوتی ہے۔ یہ حلقے یا دائرے محسوس ہونے والی یا غیر محسوس سی خوشبو' مہک' مقناطیسی اور ہلکی تیز روشنی کی لہروں یا پھر صوتی ارتعاش و آہنگ کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں۔ جاندار یا بے جان' کوئی بھی چیز اپنی اچھائی' بُرائی' خوبی و خرابی' سرشت و جبلّت' افادیت و اُفتادیت کے تناظر میں احیاء' فنا اور بقا کی تمام منزلوں سے گزرنے کے باوجود بھی اپنے باقی ماندہ کسی سالمے میں کسی نہ کسی صورت سلامت ہوتی ہے۔ معمول چاہے جان میں ہو یا بے جان' عامل کے سامنے بولنے لگتا ہے۔ جیسے پانی چولہے پہ چڑھنے سے کھولنے لگتا ہے' رنگ باتیں کرتے ہیں اور پھولوں سے خوشبو آتی ہے۔ ہر چیز نطق رکھتی ہے چاہے وہ ہونے میں ہو یا نہ ہونے میں ہو' مسلسل آپ سے کچھ نہ کچھ کہتی رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اسے کتنا' کب اور کیسے سُن پاتے ہیں؟......

آپ تک جو سینہ بہ سینہ پہنچا اور جو کچھ آپ نے اپنی ڈائریوں میں لکھا' خاص طور پر جو کچھ یہاں قیام کے دوران آپ کے مشاہدے میں آیا' ممکن ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں اَبہام ہو لیکن جو کچھ اس کھوپڑی کی بے زبانی مجھ سے کہہ رہی ہے وہ بالکل سچ اور صحیح ہوگا...... میرے دوست! آپ مجھے وہ چمڑے کا تھیلا یا صندوق مرحمت فرمادیں اور یہ بھی اجازت دیں کہ میں آخری مرتبہ کچھ کہہ کر یہاں سے رخصت ہو جاسکوں......

اور ہاں' یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں چند ایک معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اب باقاعدگی سے مینار کے سب سے اوپر والی جگہ کو صاف کروائیں۔ ڈھانچے کو کسی کپڑے کے تھیلے میں بند کر کے کہیں دفن کر دیں اور اسی کمرے میں پانچ وقت با آواز بلند اذان کا اہتمام کریں۔ جو نماز پڑھنا چاہتیں' مل کر باجماعت پابندی سے نماز پڑھیں...... دوسری بات' یہاں چین میں شہد کی کمی نہیں اور زیتون بھی مل جاتا ہے۔ خالص شہد اور زیتون کا تیل منگوالیں۔ عورتیں علیحدہ اور مرد الگ صبح صبح نماز سے فراغت کے بعد اپنے پورے جسموں پہ شہد اور تیل ملا کر خوب ملیں۔ پھر الگ الگ اپنے آپ کو سمندر کے کنارے کسی محفوظ جگہ' جہاں سمندر کی لہریں صرف چھو کر واپس لوٹ جاتی ہوں' ریت میں چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا کر اس طرح سے لیٹ جائیں کہ سارا جسم گیلی ریت میں دفن سا ہو جائے۔ پہلے کچھ روز بڑی پریشانی اور تکلیف ہوگی۔ ننھے ننھے آبی کیڑے جسم کو کاٹیں گے' یوں محسوس ہوگا کہ وہ جسم سے زخموں کو کُرید رہے ہیں۔ ایک ہفتہ اگر آپ یہ تکلیف کسی طور برداشت کر پائیں تو پھر یہ سمجھ لیں کہ آپ صحت یاب ہو رہے ہیں۔ چار پانچ مہینوں میں آپ عذاب ناک بیماری سے اللہ کے فضل سے نجات پالیں گے...... یاد رکھیں۔ شہد اور زیتون کا تیل' سمندر کا کنارہ اور گیلی ریت میں دفن ہونا...... میں آپ سب کو اللہ کے اَمر سے شفایابی کی نوید سُناتا ہوں......"

مَیں جب دوسرے روز صبح واپس اپنے کاٹیج پہنچا تو زوگو اور مادام ازابیلا مُنہ لٹکائے ہوئے یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں کچھ دیر پہلے کسی عزیز کے فوت ہو جانے کی اطلاع ملی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے ان میں جان پڑ گئی' مادام ازابیلا نے وارفتگی میں اُٹھ کر چٹاخ پٹاخ دو چار گرم گرم بوسوں سے میرا استقبال کیا۔ پھر بچوں کی مانند مُنہ بسور کر روٹھنے کے انداز میں ناراض ہو کر پوچھنے لگی کہ مَیں رات کہاں رہا؟ وہ دونوں ساری رات میرا انتظار کرتے رہے' ایک منٹ کے لئے بھی دونوں نہیں سوئے۔ میوزک' بیئر اور لڑائی جھگڑائی سے دل بہلاتے رہے...... میرے ہاتھ میں پُرانا چمڑے کا صندوق اور طوطے کا ڈھکا ہوا پنجرہ سا دیکھ کر اس کا تجسس بھڑکا' وہ موٹی موٹی آنکھیں پھیلا کر پوچھنے لگی۔

"یہ کاٹھ کباڑ کہاں سے اُٹھا لائے ہو......؟"

مَیں یہ دونوں چیزیں خاص طور پہ کنٹوپ اور کھوپڑی مادام ازابیلا سے چُھپانا چاہتا تھا کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ وہ پہلے ہی اُلٹی کھوپڑی کی ہے اور مجھ سے جادو منتر' کالا علم' زائچے بنانا اور پیش گوئیاں کرنا سیکھنا چاہ رہی ہے اور مَیں ابھی تک کوشش کے باوجود اس کی موٹی عقل میں سفلی' علوی اور نوری علوی علوم کا یقین فرق بھی واضح نہیں کر سکا تھا۔ وہ رُوحانیت' شیطانیت سب کو ملا جُلا کر صرف ایک ہی نام دے دیتی تھی یعنی بلیک میجک۔ وہ [illegible] سادھوؤں' جوگیوں' مرشد سید اور [illegible] صاحب کے لمبی لمبی داڑھیوں' پگڑیوں والے جٹے دار سکھوں' گیانیوں اور مسلمانوں کے نورانی ریش مولویوں' عالموں' پیروں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی تھی۔ ان سب لمبی اور گھنی داڑھی والوں کو بلیک میجک ماسٹر ہی سمجھتی تھی۔ اب اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس پنجرے میں ایک انسانی کھوپڑی بند ہے تو وہ میرا بالکل ہی ناطقہ بند کر دیتی بلکہ وہ اس کنٹوپ کو اپنے کیبن میں لٹکا کر اپنا نام نہاد بلیک میجک اور آسٹرو پامسٹری کا دھندہ چمکاتی...... مَیں اس کے سوال کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا' اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مَیں ان چیزوں کو چُھپانے کے متعلق سوچنے لگا مگر جب انہیں چُھپانے کی کوئی مناسب جگہ سُجھائی نہ دی تو فی الحال کنٹوپ کو کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ کر اپنے پلنگ پہ سرہانے کے پاس رکھ لیا اور چمڑے کے صندوق کو پلنگ کے نیچے سرکا دیا۔ کمرے میں کپڑوں کی الماری موجود تھی مگر تالے کے بغیر' ورنہ مَیں پنجرے اور صندوق دونوں کو وہیں دھر کر تالا لگا دیتا۔

ساری رات کا رت جگا' مغز ماری اور اعصابی تھکن الگ تھی' کپڑے بدلے بغیر ہی مَیں پلنگ پہ ڈھیر ہو گیا۔ نیند کی جھونک میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ دروازہ ہی اندر سے بند کر لیتا۔ ابھی ڈھنگ سے پلک سے پلک بھی نہ جُڑی تھی کہ وہ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی اور حسب دستور کانسی کی گھنٹی بجا کر مجھے

ناشتے کی اطلاع دینے لگی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ طیش' عیش اور کیش میں خود کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے' اس سمے میری بالکل یہی حالت تھی۔ اگر میں نام نہاد سا درویش نہ ہوتا تو یقیناً وہ احمق گائے میرے ہاتھوں ضائع ہو بھی ہوتی...... طبیعت اور زبان پہ بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے میں نے اس سے التجا کی۔

''مادام! اس وقت مجھے بالکل کسی ناشتے' واشتے کی حاجت نہیں بلکہ مجھے اُس وقت تک بیدار کرنے کی کوشش نہ کی جائے جب تک میں خود اپنی مرضی سے بیدار ہونا نہ چاہوں......''

وہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہ رہی تھی کہ میں نے فوراً منہ سر ڈھانپ کر' کروٹ بدل کر اپنا رُخ کنٹوپ کی جانب کر لیا۔ یعنی میں نے مادام ازابیلا کو دوسرے الفاظ میں یہ کہا کہ تم جاؤ جہنم میں' مجھے اس وقت سونے دو...... یقیناً وہ بے وقوف' بزعم خود بہت بڑی آسٹرولوجسٹ' جادوگرنی میرے اس غیر متوقع' غیر مناسب برتاؤ پہ تاؤ کھاتی ہوئی' پاؤں پٹختی باہر دفع ہو گئی ہو گی اور وہاں سے پھر وہ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے دھندوں پہ نکل گئے ہوں...... اس کا مطلب تھا کہ میں اب لمبا ہی فارغ تھا۔

میں شاید پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ اگر انسان کو نیند اور نسیان یعنی بھولنے' فراموش کر دینے کی نعمتیں نصیب نہ ہوتیں تو انسان ذہنی طبعی' فکری' تجسس' تصوراتی اور انبساطی زندگی کی گوناگوں تب و تابانیوں سے کب کا محروم ہو کر رہ گیا ہوتا' وہ ملتفت ہو چکا ہوتا۔ یہ نیند اور تلخ باتوں کی کیفیتوں اور اذیتوں کو بھول جانے کی نعمت ہی ہمیں اس دُنیا اور اس زندگی کے تلخابے کو آبِ حیات کی طرح جرعہ جرعہ پینے پہ اُکساتی' ہمت بندھاتی اور آس اُمید دلاتی ہے۔

نیند کو موت کی چھوٹی بہن کہا جاتا ہے۔ نیند کی کیفیت و حالت میں انسان بالکل ہلکا پھلکا اور دُنیا و مافیہا سے بے نیاز و بیزار سا ہو جاتا ہے۔ غم و اندوہ' فکر و تردد اور دُکھ تکلیف کی ہر کیفیت جیسے شانت سی پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح موت کا جھٹکا بھی انسان کو ہر قسم کے سود و زیاں سے آزاد کر دیتا ہے۔ سینکڑوں سالہ زندگی اور اس کا سارا ساز و سامان' جدوجہد' نفع نقصان' تعلق' محبتیں' کشمکش' عداوتیں اور نفرتیں' عشق و عشوے' زعم و دعوے' بھرم اور مان' غرضیکہ سب کچھ ''اِک دیوانے کا خواب'' سا دکھائی دینے لگتے ہیں۔

نیند اِک طرح کا جسمانی مراقبہ ہے۔ جسمانی' قلبی اور دماغی اعصاب کچھ دیر کے لئے سکون و سکوت چاہتے ہیں۔ عجیب سی بات ہے کہ جسم اور جملہ اعصاب کے پُرسکون اور مائل سکوت ہوتے ہی انسان کا باطن مشتعل و مستعمل ہو جاتا ہے اور اپنی اپنی بساط و بصیرت' حدود و اہداف میں مصروف کار ہو جاتا ہے۔ (خیال رہے کہ یہاں باطن کی اصطلاح ذہنی' شعوری اور قلبی کیفیتوں کے طور پہ استعمال کی گئی ہے)......

بچّے کی نیند اور ماں کی نیند مختلف ہوتی ہے' بچّے تتلیوں کے پیچھے اور مائیں تسلّیوں کی پیچھے ہوتی ہیں۔ نوجوان اور بوڑھے کی نیند بھی اپنی اپنی فیلڈ میں ہوتی ہے۔ دُنیادار اور دین دار کی نیند اپنے اپنے دوزخ اور اپنی اپنی جنتیں سجائے ہوئے ہوتی ہے۔

اسی طرح دَرماندہ عشق اور دَرخاک درویش کی نیند بھی اپنے اپنے دشت مخملیں' گریباں اور سنگ آستاں سجائے ہوئے ہوتی ہے۔ جیسے نیند اپنی اپنی' خیال اپنے اپنے اور خواب اپنے اپنے...... نئی نئی نویلی تروتازہ دُلہنیں اپنے محبوب شوہر کے استعمال کے لئے جو تکیہ تیار کرتی ہیں اس پہ خوبصورت اشعار' رنگ برنگے پھول' چاند' ستارے' منتظر آنکھیں' بے تاب دِل اور جُدائی کا آرپار تیر کاڑھتی ہیں۔ پردیس میں پڑا ہوا محبوب شوہر اسی تکیے پہ سر ٹکا کر ساری رات وصل کے مزے لوٹتا رہتا ہے اور اِدھر دُلہن دل گرفتہ بھی دولہا کے پیار کی نشانی رومال کو جس کے درمیان سرخ دل میں اُس کا نام کاڑھا ہوا ہوتا ہے' ساری رات سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سپنے دیکھتے دیکھتے جُدائی کے پہاڑ جیسے دِن اور صحرا جیسی لمبی چوڑی بے نم و نخل راتیں ایسے ہی گزار دیتے ہیں' ان کے درمیان اگر نیند اور نسیان نہ ہو تو یہ دونوں دو دو لمحے بھی نہ جییں' پھڑک کر مر جائیں

میری [illegible] بیداری [illegible] میری کیفیات میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ یوں سمجھئے کہ میں اکثر حالتِ بیداری میں سویا ہوا اور کہیں کھویا ہوا ہوتا ہوں۔ جسم کہیں ہوتا ہے اور وجود کہیں' آنکھیں کچھ دیکھ رہی ہوتی ہیں اور نگاہ کہیں اور لگی ہوتی ہے یعنی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ یوں ہی بظاہر سوتے ہوئے باطن جاگ رہا ہوتا ہے' اندر باہر کی خوب سیر ہوتی ہے۔ اپنے آپ پہ ہی خوب ہنستا ہوں' پھبتیاں کستا ہوں' رُگیدتا ہوں' کبھی خُود کو کاندھوں پہ اُٹھائے بہت بہت دُور تک نکل جاتا ہوں۔

گرمی ہو تو خود کو پنکھا جھلتا ہوں اور اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ سویا ہوا ہوں اور باہر گھنٹی ہوئی۔ دروازے پہ جا کر پوچھا کون ہے؟...... جواب آیا' بابا جی سے ملنا ہے...... میں نے کہا کہ بھائی' وہ سو رہے ہیں۔ پھر کبھی تشریف لایئے گا' آنے سے پہلے ٹیلی فون کر لیجئے گا...... اُدھر سے جواب ملتا ہے کہ بابا جی! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے اور میں کہتا ہوں' جناب! بابا جی سو رہے ہیں' کبھی پھر آیئے گا...... وہ بے چارہ حیران پریشان سا ہو کر چلا جاتا ہے۔

مادام ازابیلا کے جانے کے بعد میں خوب پاؤں پسار کر سو گیا' جب تھکا ماندہ گوشت پوست آرام پانے لگا تو اندر کا ''دِل آرام'' چپکے سے اُٹھا اور پاس دھری ہوئی کنٹوپ کی گٹھڑی کو اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

• لَوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو......!

ابوطلحہ کا جدِامجد اِن مجاہدین میں شامل تھا جو صدیوں پہلے ہسپانیہ کے ساحل پہ اسلام کی سربلندی کا جذبہ لے کر اُترے تھے۔ پیچھے وسیع وعریض ساحل پر جلتی ہوئی کشتیوں نے اِن کی ناکامی اور واپسی کے تمام راستے مسدود کر دیے ہوئے تھے اور اب صرف اور صرف کامرانی ہی اِن کا مقصد اور مقدّر تھی۔ فتحِ مبین کے بعد صدیوں مسلمان اِس چھوٹے سے ملک پہ حکومت کرتے رہے' ظاہر ہے کہ ہزاروں عرب نژاد مسلمان یہاں پہ موجود تھے جنھوں نے ہزاروں غیر مسلم خواتین کو دائرہ اسلام میں لا کر اِن سے شادیاں کیں اور پھر نسل دَر نسل یہ عرب نژاد مسلمان سپین کی آبادی کا ایک حِصّہ بن گئے...... تغیر کا پہیہ گھوما' وقت نے رُخ بدلا اور مسلمانوں کا اثر و نفوذ کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا' سپین ایک بار پھر غیر مسلموں کے قبضۂ اختیار میں چلا گیا۔ صدیوں سے بستے رَہتے مسلمان وہاں ایک اقلیت بن کر رہ گئے۔ اِن کی تاریخی عظیم الشان مسجدیں' مکتب اور محلات آہستہ آہستہ معبدوں' لائبریریوں' عجائب خانوں اور گرجا گھروں میں تبدیل ہو گئے۔ غیر مسلموں نے کھرچ کھرچ کر وہاں سے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے نشان مٹا دیے۔ [illegible] میں ایسا وقت بھی آیا کہ آٹے میں نمک کے برابر بچے کھچے مسلمان اپنا مذہب اور منہ چھپائے پھرے۔

ایسا ہی ایک اُجڑا ہوا خاندان جس کا سربراہ ادھیڑ عمر ابُوطلحہ تھا' تلاشِ معاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ یہاں کے مقامی عیسائی ایسے لوگوں سے بے پناہ نفرت کرتے تھے جو تھے تو سپین کے باشندے مگر وہ اِن عرب مجاہدوں کی اولاد تھے جو کبھی اِس سرزمین پر فاتح بن کر اُترے تھے اور یہاں کے لوگوں کو سرنگوں کر کے اِن پر ایک لمبا زمانہ حکومت کی۔ وہ اِن بچے کھچے مسلمانوں پہ دائرۂ حیات تنگ کرنے پہ تُلے ہوئے تھے۔ یہ آرزدہ خاطر مسلمان یہاں سے کہیں جا بھی تو نہیں سکتے تھے کہ اِن کے آباؤ اجداد کی قبریں' جائیدادیں اور اِن کی اپنی معاشرتی' جذباتی' تہذیبی قدروں کی جڑیں یہاں اِس سرزمین میں گہری اُتری ہوئی تھیں۔

اَبوطلحہ فنِ آہن گری کا بڑا مشہور ماہر اور باکمال ہُنرمند تھا۔ یہ فن اِس نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ تلواریں' تیز نیزے بھالے' آہنی زنجیریں' اوزار' بُل فائیٹنگ کے لئے بیل کی گردن پہ بندھنے والی چُھریاں یا جو بھی لوہے کا کام اِسے مل جاتا' وہ کر لیتا۔ اَبوطلحہ کہا کرتا کہ میرا بیٹا اپنے دادا پہ گیا ہے۔ وہی نکلتا ہوا قد' ہاتھ پاؤں کی وہی اُٹھان' وہی ذہانت و فطانت۔ اشرفی کی کھنک سا لہجہ' چیتے سی

متجسس اور تیز آنکھیں' اپنی ہمت طاقت اور عمر سے بہت آگے بڑھ کر کام کرنے اور سوچنے سمجھنے کا خوگر اور سب سے بڑی بات کہ پکا نمازی اور شرم و حیا کا پیکر...... ابوطلحہ اُسے لوہے کے اِس کام سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ پڑھے لکھے۔ دین و تبلیغ کی تربیت حاصل کرنے کے لئے قاہرہ' جامع الازھر جائے مگر وہی کہ غریبوں اور خستہ حالوں کے ہاں صرف خواب اور خواہشیں ہی ہوتی ہیں' اُن کی تعبیریں نہیں ہوتیں...... بوڑھا ہونے کے لئے سَر میں چاندی کے ایک بال اور جوان ہونے کے لئے چہرے پہ سونے کی ایک چھال کی کھوج ہوتی ہے۔ ابوطلحہ کے ہاں ڈھیری چاندی تھی اور اِدھر احمد دینار کے ہاں بھی بہت سے سونے کے دینار آ گئے تھے' چہرے پہ نوعمری کا سبزہ اپنی بہار دکھا رہا تھا...... محنت کش' رزق حلال کھانے والے تنگ دستوں کے گھروں کے بچے اور مسائل بہت جلد جواں ہو جاتے ہیں' ایسے جوان کہ گھر والوں کو ان کے اُٹھتے ہوئے سَر دیکھ کر خوف سا آنے لگتا ہے۔

جب احمد دینار کو اپنے باپ کا جوتا بھی تنگ پڑھنے لگا تو ابوطلحہ کو شدت سے احساس ہوا کہ اب شاید بیٹے کو دین اور تبلیغ کی تعلیم دلوانا اس کے لئے ممکن نہیں رہا...... اِدھر احمد دینار بھی باپ کے بڑھاپے کی نڈھالی اور غربت کی خستہ حالی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ بڑے نامحسوس انداز سے اب اُس نے اپنے پریشان حال بوڑھے باپ [illegible] کام کا بوجھ [illegible] شروع کر دیا تھا۔ آبائی پیشہ وروں کے بچوں کو ہُنر سکھانے یا گُر بتانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ اپنی عمر سے چند ہی برس بڑے اپنے ملازم کبیر علی کے ساتھ سارا دن کام میں جُتا رہتا' دھونکنی دھونکتا ہوا کبیر علی اپنے اُستادزادے کے روشن چہرے پہ بھٹی کے شعلوں اور اُڑتے ہوئے چنگاروں کا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا۔ احمد دینار کا تانبے کی رنگت والا کڑا جسم' فراخ سینے پہ پسینے سے بھیگے ہوئے گھنگریالے بالوں کے گچھے' کڑیل بازوؤں کی تڑپتی مچلتی مچھلیاں اور پُرکار مضبوط ہاتھوں میں موم کی ملائمت پکڑتا ہوا سُرخ تپا ہوا لوہا دیکھتا رہتا۔ کام کرنے کی ایسی سچی لگن' خوب سے خوب تر کی جستجو کی ایسی پکی دُھن۔ احمد دینار کا کام تھا کہ وہ لوہے سے فن پارے تراشتا تھا' کوئی انوکھی اور نازک سی وضع قطع' کوئی مشکل ترین ڈیزائن' پیچیدہ سے پیچیدہ شکل و صورت والے کل پُرزے اور اوزار' ہتھیار جنہیں قلم سے کاغذ پہ بنانا بھی مشکل ہوتا۔ جو مٹی اور موم سے بھی نہ بن سکیں۔ وہ اس آہن گر بچے کے ہاتھوں فولاد میں ڈھل کر شاہکار بن جاتے۔

ابوطلحہ اپنے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ رہا تھا۔ اِس فنِ آہن گری میں اُس کی دلچسپی اور محنت و لگن کو محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے طور پر کسی حد تک مطمئن بھی ہو گیا تھا کہ چلو جو قسمت میں لکھا ہے' وہی سہی...... اب ویسے بھی اس کے حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ صرف خود پہ ہی تکیہ کر کے بیٹھا رہتا۔ سدا

کی تنگدستی' اپنی بیوی خدیجہ کی سدا روگ بیماری اور آئے دن کی بے روزگاری نے اسے اپنا آبائی مکان اور چھوٹی سی کھیتی گروی رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالات نے نہ سنبھلنا تھا' نہ سنبھلے۔ معاہدے کے مطابق گروی کی رقم واپس نہ کرنے کی پاداش میں اسے مکان اور کھیتی کی ملکیت سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ تو کچھ بھلا ہوا کہ گروی لینے والے شخص نے اسے کچھ مزید رقم ادا کر کے مکان کا باضابطہ قبضہ حاصل کر لیا۔ ابوطلحہ نے اسی رقم سے ایک بڑی سی بیل گاڑی بنالی۔ باپ' بیٹے اور ملازم کثیر علی نے دن رات محنت کر کے اسی چار پہیوں والی بیل گاڑی کو ایک مکمل چلتے پھرتے گھر کا روپ دے دیا۔ ایک تنومند بیل اور ساتھ ایک خوبصورت سا بچھڑا۔ سدا کی روگی بیوی خدیجہ کھانا پینا کر کے عبادت میں مشغول ہو جاتی...... یہ نوخاستہ ملازم کثیر علی بھی عجیب چیز واقع ہوا تھا۔ چھ برس پہلے اس کا باپ ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کرتے وقت اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ اس کا سوتیلا باپ ایک کٹر عیسائی اور سخت متعصب شخص تھا جس نے اسے چند روز کے بعد گھر سے نکال باہر کیا اور تب سے اس کی ماں نے جو ابوطلحہ کو جانتی تھی' کثیر علی کو اس کی کفالت میں دے دیا اور کہا کہ ابوطلحہ! کثیر علی کا مرحوم باپ تمہارا دوست بھی تھا اور ہم پیشہ بھی' میں اب اس کی کفالت نہیں کر سکتی۔ تم اسے اپنا بیٹا بنا لو اور اسے آہن گری کا فن سکھاؤ۔ اس کے مرحوم باپ نے بھی تمہارا ہی دھندا ہوگا...... یہ بچہ بڑا سعادت مند خدمت گزار اور محنتی تھا' احمد دینار کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ کھانا پینا' کام کاج' سیر تفریح' نماز روزہ' عبادت اور ہنسی مذاق' سب کچھ سانجھا تھا۔ یہ ایک دوجے کے ندیم تھے اور ہم خیال و ہم مزاج بھی۔

چلتا پھرتا گھر ملا تو ان کی تو موج لگ گئی۔ خدا کی وسیع زمین پر جدھر کی ہوا اور فضا ہوتی' بیل اُدھر کا رُخ پکڑ لیتا۔ جدھر سبزہ اور پانی دیکھتا' اُدھر رُک لیتا۔ گاڑی کے اگلے حصے میں "اندرون خانہ" تھا اور پچھلے حصہ میں ورکشاپ تھی۔ اس ورکشاپ میں لوہاروں والا پورا سامان تھا' یہاں تک کہ آگ کی بھٹی بھی اُوپر ہی بنی ہوئی تھی۔ گاڑی کے دونوں اطراف بڑے بڑے لوہے' آہنی چادریں' سریے اور اسی قبیل کا کاٹھ کباڑ لٹکا رہتا۔ جہاں جاتے لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ کوئی پھیرے والا لوہار ہے۔ عموماً دیہاتی' کسان اور محنت کش لوگ ان سے اپنے زرعی آلات وغیرہ مرمت کراتے یا بنواتے۔ بنے بنائے اوزار' آلات بھی ان سے مل جاتے۔ اگر کبھی کام میں مندا پڑ جاتا تو یہ تینوں کھیتوں' باڑوں اور روزانہ اُجرت پہ مزدوری کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔ خدیجہ بھی فرصت ملنے پر مچھلی پکڑنے کے جال بُنا کرتی تھی۔

"چلتا رہے رواں دواں' زندگی کا کارواں"...... کے مصداق زندگی گزر رہی تھی۔ اُدلتے بدلتے

موسم' صبح وشام کے اندھیرے اُجالے' راستوں کے پیچ وخم' نشیب وفراز' چٹیل میدان' سرسبز مرغزار' جھیلیں' جھرنے' کھیت کھلیان اور کھلواڑے' آرزوگیاں' بیماریاں' پرندوں کے چہچہے اور پھولوں کی پھلواریاں' ایسا سب کچھ زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ گاڑی کے نیچے پہیے مسلسل گھوم رہے تھے۔ بیل کے سُم کئی بار گھسے اور کئی مرتبہ نئے نعل بندھے۔ بچھڑا اب ایک کڑیل بیل بن چکا تھا اور زیادہ تر وہی گاڑی کے آگے جُتتا جبکہ پرانا بیل اُبوطلحہ کی طرح' سویا جگاتا' مراقبے میں رہتا۔

پچھلے پت جھڑ میں اُبوطلحہ کی بیوی' احمد دینار کی ماں اور کثیر علی کی مہربان مشفقہ سُوکھے پتے کی طرح زندگی کے شجر سے جھڑ گئی تھی۔ کانسر گاؤں کے ایک ویران سے کھلواڑے میں دفنانے کے سات دن بعد یہ پھر پہیوں پہ سوار تھے اور پہیے گھومتے رہتے ہیں' فاصلے طے ہوتے رہتے ہیں۔ بچھڑنے والے پیچھے اور ملنے والے آگے کھڑے ہوتے ہیں..... چلتے چلتے ایک دن بوڑھا بیل بھی تھک گیا' ایسا گرا کہ اُٹھنے کے قابل نہ رہا تو ایک تیز چھری کی زد میں آکر وہ چھوٹے بڑے پارچوں کی شکل میں گاڑی کے اُوپر چھت پہ پڑے ترپال پہ خشک ہونے کے لئے پہنچ گیا۔

اب کے خوب برسات ہوئی تھی' جل تھل موسم کی بھرمار نے بڑے بڑے خشک پتے پانی کر دیئے ہوئے تھے۔ [illegible] کھیتوں کے درمیان ایسی پھنسی کہ [illegible] سے قدم بھر بھی آگے پیچھے سرکانا ممکن نہ رہا۔ کئی دنوں کی بارش' یخ بستہ ہڈیوں کو کاٹتی ہوئی ہوائیں' موسمی اثرات سے جانور' انسان سب ہی جاں گُسل ہو رہے تھے۔ خشک تر خوراک کی بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ کوئی ایسا گاؤں شہر بھی نزدیک نہیں تھا جہاں تک رسائی ممکن ہوتی۔ اچھے موسم اور موافق حالات کے انتظار میں کئی روز سے یہیں پہ پھنسے تھے کہ ایک رات دوسرے نئے بیل نے بھی پران چھوڑ دیئے......

اسے کہتے ہیں مرے کو مارے شاہ مدار' رہی سہی روزی رزق کا آسرا بھی جاتا رہا۔ اب صرف تین جاندار باقی بچے تھے۔

جب بیل مرے' تیسرے دن ان تینوں کو پہلا فاقہ پڑا تو ماندے سے اُبوطلحہ نے کثیر علی کو پاس بلا کر وصیت کی۔

''کثیر علی! اب دکھائی دیتا ہے کہ میری زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گُل ہونے کو ہے۔ زندگی اور موت' عزت و ذلت' رزق روزی بے شک اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ میں نے ہر حال میں صبر کیا اور ہر سانس اللہ کا شکر ادا کیا۔ تم گواہ رہنا اور اپنے بھائی احمد دینار کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا......''

دوسری صبح موسم اچانک کُھل گیا۔ مسلسل کئی دنوں کی باد وباراں کے بعد اس صبح سورج کی کانپتی

شرمیلی سی کرنوں نے زندگی میں ہلکی سی تمازت بھر دی تھی۔ رات بھر بخار میں پھنکتے ہوئے اَبوطلحہ کو جب سورج نکلنے کی خوشخبری سُنانے کے لئے جگانا چاہا تو اس نے جاگنے سے انکار کر دیا۔ اس کی زندگی کا سورج نہ جانے رات کس پہر غروب ہو چکا تھا...... میت کو غسل دینے کے لئے آس پاس پانی تو وافر تھا' صرف قبر کھودنے کے لئے کہیں بھی خشک جگہ نہیں تھی' اِردگرد سارے کھیت تالاب' جھیلیں' دلدلیں بنے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے گاڑی کے پچھلے حصّے میں لٹا کر غسل دیا گیا' وہیں میت رکھ کر جب دونوں نے آگے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی تو سورج پوری طرح چمک رہا تھا۔ پھر اسی سورج نے دیکھا کہ وہ نوعمر سے لڑکے' کانپے کی سردی کے باوجود پسینے میں نہائے ہوئے ایک کھیت کے کنارے ایک اونچی جگہ پہ اندھا دھند پھاوڑے چلا رہے ہیں۔ پانی میں چھپ چھپ کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں' کیچڑ نکالتے ہیں تو وہاں پھر مٹی اور پانی بھر جاتا ہے۔ ایک کڑی مشقتِ شاقہ کے بعد وہ ایک گڑھا کھودنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بچہ اس میں اُترا تو وہ کمر تک پانی اور کیچڑ میں دھنس گیا۔ پھر سورج نظارہ کرتا ہے کہ وہ لڑکے میت کے سینے اور کمر پہ بھاری پتھر باندھتے ہیں اور گڑھے میں لٹا کر اوپر سے پتھر ڈال دیتے ہیں...... چشمِ فلک نے بے چارگی' درماندگی کے کئی ایسے دِل گرفتہ مناظر دیکھے ہوں مگر چشمِ انسان نے یہ بچھم کم ہی دیکھا ہوگا۔

خود [illegible] ان تین دنوں میں ہر روز چمکتے سورج نے ہر چیز کو خشک اور خوبصورت سا کر دیا تھا مگر اب بھی کہیں کہیں پانی کی ڈبیں دکھائی دیتی تھیں۔ اب انہوں نے قبر پہ سے پتھر نکال کر اِردگرد کی مٹی بھر دی۔ رہ گزر سے ذرا ہٹ کر' کھیت کے کنارے مرے ہوئے بیل کی لاش اینٹھ کر تعفّن چھوڑنے لگی تھی۔ چیلیں' گدھے' کوّے اس کے گرد منڈلانا شروع ہو گئے تھے۔ اب اِن کا یہاں ٹھہرنا دُوبھر ہو چکا تھا جبکہ بھاری گاڑی کو اونچے نیچے بارش سے ٹوٹے پھوٹے راستے پر دھکیلنا اب اِن کے بس سے باہر تھا جسے یہاں چھوڑ کر جایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اِن کی تو پوری کائنات ہی اس گاڑی پہ لدی تھی۔ یہ وہی گاڑی تھی جسے اس نے اپنے مشفق باپ اور کثیر علی کے ساتھ مل کر بڑی محنت سے تیار کیا تھا' یہ اس کا گھر بھی تھا اور آنگن بھی' اور سب سے بڑی بات کہ اس کے ماں باپ کی نشانی تھی...... وہ حیران تھا کہ یہ کیسی راہ ہے جس پہ کئی دنوں سے کوئی گزرا ہی نہیں۔ دُرست ہے کہ موسم بڑا خراب تھا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسانوں' جانوروں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا ہو۔ آس پاس' دُور نزدیک کھیت ہی کھیت...... مگر کوئی کسان یا مویشی جانور دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب انہیں بڑی عجیب سی صورت حال کا سامنا تھا۔ وہ کئی دنوں سے غذائی قلت کا شکار تھے۔ ٹھوس اور متوازن غذا کے بغیر کچھ دن تو گزارے جا سکتے ہیں' مگر زیادہ عرصہ نہیں کہ انسان لاغر' کمزور یا پھر بیمار پڑ جاتا

ہے۔ کثیر علی کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی مگر وہ صابر شاکر اللہ کا بندہ حرف شکایت زبان پہ نہیں لاتا تھا۔ وہ اسے اکیلا یہاں چھوڑ کر کہیں کھانے پینے کی تلاش میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ پہلے ذبح کئے ہوئے بیل کا نیم خشک گوشت برسات کی موسم کی وجہ سے کھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی کشش و پنج اور کیا کرے' کیا نہ کرے کی سوچ و بچار میں اُس نے زندگی کے اس مایوس کر دینے والے راستے میں ایک اور رات کسی نہ کسی طور گزار دی۔

● اُس کے آنے کی کیا کہیئے' اُس کے جانے کی کیا کہیئے ......!

جتنی رات وہ اپنے رازق' مالک و خالق سے یہ دُعا کرتے لیٹا تھا کہ اے مسبب الاسباب! ہم تینوں بیسروں کے لئے اپنی رحمت' برکت اور رزق کے دروازے کھول دے' بیشک تو آزمائشوں سے گزرنے اور سرخرو ہونے والوں کو پسند کرتا ہے...... صبح کی نماز اور تسبیح و تہلیل کے بعد گاڑی کے پچھلے حصے میں وہ مشرق کی جانب مُنہ کئے ہوئے سورج کے طلوع ہونے کا مسحور کن منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ ہی تو منظر ہوتے ہیں۔ ایک طلوع ہوتا ہوا اور ایک غروب ہوتا ہوا۔ باقی تو بس عارضی ہوتا ہے' چھوٹ اور تگ و دو کے گرد و غبار سے اَٹا ہوا۔ طلوع کی نوزائیدگی کا سودھا اور سُوندھا پن اس کے تانبے کی سی رنگت والے چہرے کے رُوئیں پہ سونے کا رنگ چڑھائے ہوئے تھے۔ کالی گوڑی کی بکل میں اُس کا صاف دمکتا ہوا ٹھہرا کسی بے عیب سے الماسِ یمانی کی مانند نُورانی سا غبار چھوڑ رہا تھا جیسے وہ اُبھرتے ہوئی آفتاب سے یہ بات بدے ہوئے بیٹھا ہو کہ نکلو تو سہی' دیکھتے ہیں کہ کون کس سے آنکھ ملاتا ہے؟

سامنے دُور تک دکھائی دیتا ہوا کچا پکا' ٹیڑھا میڑھا راستہ جہاں ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا وہاں زرد اور نارنجی رنگ اُجالے ہوئے بڑا سا سورج اُبھر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسی سُورج کے سینے سے جیسے ایک سیپی رنگت گھوڑا جس کی لہراتی ہوئی اَیال یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اُڑن گھوڑے کے پَر ہوں' وہ جیسے بہت نیچی پرواز کرتا ہوا آ رہا ہے۔ ایک سنہری نقرئی سا اُڑتا ہوا غبار اس کے جلو میں تھا۔ کھری کنوتیوں کی لگام پکڑے' سپید براق سمندر کی جھاگ کا لبادہ پہنے کوئی شعلہ رُو اُڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ پہلے تو وہ اسے نظر کا واہمہ سمجھا' پھر کوئی جاگتی ہوئی آنکھوں کا خواب...... لمحہ لمحہ وہ سُموں سے چنگاریاں اُڑاتا ہوا اَسپِ تازی قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ گھوڑے کے حقیقی وجود کا یقین آتے ہی احمد دینار چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آیا' گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُن کر نیم خوابیدہ کثیر علی بھی آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ گاڑی

سے چند قدم اُدھر ہی مُنہ سے جھاگ اور آنکھوں شعلے چھوڑتا ہوا ہوائی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر یوں الف کھڑا ہوا کہ جیسے آگے کوئی بلّور کی دیوار آ گئی ہو۔ ایک خوبصورت نوعمر سی لڑکی بڑی خشمگیں نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گھوڑا تھا یا کوئی بجلی' جڑوں' بغلوں سے پسینہ چھٹائے' مُنہ نتھنوں سے جھاگ اُڑائے ایک وحشی درندے کی مانند زمین پہ اپنے پاؤں پٹک رہا تھا۔ گاڑی چونکہ راستے کے عین وسط میں کھڑی تھی اس لئے سوار اور گھوڑے کا ردِّعمل عین منطقی تھا۔ دیہاتی سی الھڑ لڑکی بڑی چابکدستی سے چھلانگ کر گھوڑے سے نیچے اُتر آئی۔ اِس کے سرپٹ گھوڑا دوڑانے اور ایسے قدآور وحشی گھوڑے سے اُچھل کر نیچے اُترنے کے انداز سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی بڑی اچھی اور مشاق گھڑسوار ہے' وہ گھوڑے پہ بیٹھنا ہی نہیں بلکہ اُڑانا بھی جانتی ہے اور اِسے قابو کرنا بھی...... لڑکی گھوڑے سے اُتر کے چند لمحے اِسے گھورتی رہی' پھر گھوڑے کو پچکارتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تم لوگ کون ہو اور یہ چھکڑا راستے کے درمیان میں کیوں کھڑا کیا ہوا ہے......؟'' پھر اچانک اسے جیسے یہاں مرے ہوئے بیل کی پھیلی ہوئی بدبو کا احساس ہوا' ذرا آگے بڑھ کر بیل کی لاش کو دیکھتے ہوئے پھر بولی ''تمہارا تو بیل مر گیا ہے......؟''

اس نے اب ناک پہ ہاتھ رکھ لیا تھا...... احمد دینار نے کچھ بولنا چاہا مگر وہ ایک چھلاوے کی طرح اُچک کر گھوڑے پہ سوار ہو چکی تھی۔ ایک چیخ نما آواز کے ساتھ ہی گھوڑا یوں اُڑا جیسے وہ ہڈیوں کا نہیں' بجلیوں کا بنا ہوا ہو...... آئی بھی وہ' گئی بھی وہ' لو ختم فسانہ ہو گیا۔ احمد دینار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ یہ سب کچھ ایسی سُرعت اور ڈرامائی انداز میں سرزد ہوا تھا کہ اگر وہاں پہ گھوڑے کے کھروں اور لڑکی کے پاؤں کے نشانات اور کثیر علی کی چشم دید گواہی نہ ہوتی تو وہ اِسے صرف ایک واہمہ ہی تصوّر کرتا۔ وہ دُور اُفق میں اس چھلاوہ سی لڑکی اور ہوائی سمندِ سپید کو منظر میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا...... اچانک کثیر علی پوچھ بیٹھا۔

''یہ کون تھی......؟''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں......'' احمد دینار نے خواب کی سی کیفیت میں جواب دیا۔

کثیر علی' احمد دینار کو یوں سراسیمہ سا دیکھتے ہوئے کہنے لگا...... ''پہلی بار ایسی نوعمر' خوبصورت اور نڈر لڑکی دیکھی جو موت کے فرشتے کی طرح گھوڑا دوڑاتی' اُڑاتی ہوئی یوں آئی جیسے کسی کی جان نکالنے آئی ہو اور یوں گئی جیسے کسی کی رُوح قبض کرنے جا رہی ہو...... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا؟''

احمد دینار خالی خالی نظروں سے لڑکی کے جانے والے راستے کو تکتے ہوئے خوابناک سی کیفیت میں پھنسا ہوا بولا۔

''ہاں، میری رُوح ہی تو قبض کرنے آئی تھی اور کر کے چلی گئی...... کیثر علی! اس کے گھوڑے اور اسے دیکھتے ہی بالکل یہی خیال میرے دل میں بھی اُبھرا تھا۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے سُورج کے سینے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ سُورج سے اس جگہ تک وہ لمحوں ساعتوں میں پہنچ گئی اور...... اور پھر وہ آنکھ جھپکتے یہاں سے بھی غائب ہو گئی۔ یقیناً یہ مَوت ہی تھی جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی بلکہ میرے جسم سے میری جان اور رُوح نکال کر اپنے ساتھ لے گئی......''

کیثر علی تعجب بھری نظروں سے اپنے آقازادے اور دوست کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی خوفناک اور گہری باتیں اس نے آج سے پہلے کبھی احمد دینار کے مُنہ سے نہیں سُنی تھیں...... چند لمحے وہ ٹُکر ٹُکر سا کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر بات کا رُخ پلٹنے کی خاطر وہ کہنے لگا۔

''اچھا، بھول جاؤ اس کی بات...... اب صرف یہ سوچو کہ کھائیں کیا، بڑے زور کی بھوک لگی ہے......''

''گھاس پھونس اور برساتی جڑی بوٹیوں کے علاوہ یہاں اور کیا ہے جو کھایا جا سکتا ہے؟...... توشہ دان کو دیکھ لو ہو سکتا ہے کہ کچھ جو، دلیئے کے دانے بچے ہوئے پڑے ہوں...... ویسے میری بھوک اور پیاس تو جیسے ختم ہی ہو گئی ہے......'' احمد دینار نے نیچے زمین پہ اس ہوائی گھوڑے اور شعلہ بداماں دوشیزہ کے پاؤں کے نشان غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

کیثر علی بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم تو اب کام سے گئے۔'' پھر اس کے کاندھے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ ''اچھے دوست! اب موسم قدرے موافق ہو گیا ہے۔ گاڑی کے بارے میں تو بعد میں سوچیں گے، پہلے پیٹ بھرنے اور پھر یہاں سے کسی آبادی کی طرف نکلنے کا سوچو......''

احمد دینار قدرے ہوش پکڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''چلنا تو اُدھر ہی ہے جس طرف وہ میری جان نکال کر لے گئی ہے مگر اب سوچنا یہ ہے کہ اس بھاری بھرکم گاڑی کو گھسیٹنے کے لئے ایک موٹا تازہ سا بیل کہاں سے لائیں؟...... ہم دونوں کے بس کا تو یہ روگ ہے نہیں......''

کیثر علی بولا۔ ''بیل تو بیل، یہاں کسی اِنسان کی صُورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں، راستے کے درمیان راہ بند کئے ہوئے کھڑے ہیں...... اچھا، پہلے کچھ پیٹ میں ڈال لیں پھر گاڑی کو کسی طرح گھسیٹ کر ایک طرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں......''

گاڑی کے اندر چمڑے کے تھیلے اُلٹنے پلٹنے سے کچھ جَو کے ستّو اور خشک خوبانیاں خوش قسمتی سے

نکل آئیں۔ انہی سے ناشتے کا کام لے کر وہ دونوں گاڑی کو راہ سے ہٹانے کے جتن کرنے لگے...... پہلے وقتوں میں ایسی کاروان قسم کی چار پہیہ گاڑیوں کا بڑا رواج تھا۔ آپ نے اکثر امریکن کاؤبوائے قسم کی فلموں میں ایسی گاڑیاں دیکھی ہوں گی جن کے آگے دو یا دو سے زیادہ گھوڑے جتے ہوئے اور پیچھے ریڈ انڈین لگے ہوئے ہوتے ہیں مگر یہ گاڑیاں بڑی مضبوط اور سبک ہوتی ہیں' باربرداری اور مسافروں کی سواری کا کام دیتی ہیں۔ خاص طور پر میکسیکو اور دیگر پہاڑی صحرائی ریاستوں اور لمبی دشوار گزار مسافتوں پہ یہ تیز رفتار اور سبک گاڑیاں بڑی کارآمد اور آرام دہ سمجھی جاتی ہیں' پہلے وقتوں کے امریکہ میں تو باقاعدہ طور پر آج کی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کی طرح کام کرتی تھیں۔ مخصوص فاصلوں پہ صحرائی ہوٹل' آرام گاہیں' چھوٹی موٹی دوکانیں اور تازہ دم گھوڑے دستیاب ہوتے تھے۔ یہ مسافر گاڑیاں تھیں مگر وہاں کے پہاڑی' صحرائی قبائل اور خانہ بدوشوں کی نقل و حرکت اور بود و باش کے لئے جو گاڑیاں ہوتی تھیں وہ کشادہ اور بھاری ہوتیں۔ یہ زیادہ تر خاندانوں کی رہائش کے کام آتیں۔ یہ چلتے پھرتے مکمل گھر جنہیں کاروان کہا جاتا ہے' بڑے خوبصورت' مضبوط اور بود و باش کی ہر ضرورت سے مزین ہوتے ہیں۔ گھوڑے' خچر' ٹٹو اور بیل' یعنی ہر وہ جانور اس کے آگے جوتا جا سکتا ہے جو دستیاب ہو۔ اس گاڑی کے اندر خلوت خانہ' غسل خانہ' باورچی خانہ' اسٹور' غرضیکہ سب کچھ ہوتا ہے۔ گھر کا زیادہ تر سامان گاڑی کی دو اطراف کے علاوہ نیچے اور چھت پہ دھرا پڑا اور لٹکا ہوا رہتا ہے۔ جب یہ کاروان رواں دواں ہوتا ہے تو بڑے رنگ آہنگ ابھرتے ہیں' جل ترنگ بج رہے ہوتے ہیں تو کہیں کھڑتالیں اور دفیں' طبلے' تھیلیاں بھی سنائی دیتی ہیں۔ گھر والے بیٹھے ہوئے ہیں' سوئے ہوئے بھی ہیں اور گھر کے ساتھ ساتھ چل بھی رہے ہیں۔

اسی کاروانوں پہ بچے چلتے چلتے جنم لیتے رہتے ہیں' بوڑھے بھی چلتے چلتے ہی چلے جاتے ہیں' چلتے چلتے ہی انہیں پس راہ کہیں دبا دفنا کر پھر آگے چل دیا جاتا ہے۔ پیار' محبت' نفرت' عشق و وحشت' سب کچھ چلتے چلتے ہوتا رہتا ہے۔ خانہ بدوش جینے مرنے کا صحیح لطف اٹھاتے ہیں اور زندگی کو دوسرے لوگوں سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ یہ جپسی لوگ فطرت اور حقیقت کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ یہ ہر وقت حادثات' اتفاقات' مہمات اور ہنگامی حالات کی کیفیات میں رہتے ہیں اس لئے نڈر' بہادر' ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے والے مہم جو ہوتے ہیں۔ روس' یورپ' امریکہ اور آسٹریلیا میں ان کے بڑے بڑے قبیلے اور خاندان ہیں۔ یہ کسی قانون اور قاعدے' کلیئے کو نہیں مانتے۔ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ حکومتیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں' نہ تو یہ اعداد و شمار میں آتے ہیں اور نہ کسی ووٹنگ لسٹ میں یہ شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایشیا میں بھی ایسے قبائل موجود ہیں۔ ان کا بھی اِدھر یہی حال ہے۔ میں نے ایک

زمانہ قریب رہ کر ان کے طرزِ زندگی، اندازِ فکر، ذہنیت، بود و باش کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ لمبے لمبے سفر بھی کیے مگر شاید یہاں بھی میری مرضی، اتفاق اور حالات کا دخل نہیں تھا، یہی کہ جیسے یہ بھی طے شدہ تھا۔

انگلینڈ بہت چھوٹا سا ملک ہے، سمندر کے بیچ ایک چھوٹا سا ٹاپو سمجھ لیں۔ کسی بھی شہر سے سمندر کی طرف رُخ کر لیں تو زیادہ سے زیادہ اسّی نوّے میل پرے سمندر دکھائی دے جائے گا۔ انگلینڈ کے ساحل بڑے خوبصورت اور قدرتی ہیں۔ بعض مقامات سے اگر موسم صاف ہو تو فرانس، بلجیم کے ساحل بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہاں ایک بہت ہی خوبصورت اور تفریحی ساحل بلیک پول ہے، تفریحی اس لئے لکھا ہے کہ یہاں روایتی ساحلوں کی طرح جہاز، ٹرالر، کشتیاں، بڑی بڑی گودیاں کرینیں اور سمندری پشتے، لنگر وغیرہ کچھ نہیں۔ یہ خالصتاً تفریحی اور قدرتی ساحل ہے۔ ممبئی کے میرین ڈرائیور اور جُوہو جیسا لمبا چوڑا، نیم دائرے کی شکل میں یہ دُنیا کے بہترین ساحلوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں کی ایک نادر چیز یہاں کا بلیک پول ٹاور ہے جو قریب قریب پیرس کے ایفل ٹاور کی طرز کا ہے، قد کاٹھ اور شکل میں بھی اس کا چھوٹا بھائی نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے نفیس، خوبصورت اور اعلیٰ ہوٹل، کلب، سوئمنگ پول، عجائب گھر، لاس ویگاس کی طرز کے [illegible] پب اور انگلینڈ کے چند بہترین اور مشہور و معروف تھیٹروں اور اوپیرا ہاؤسز میں سے دو چار ادھر بھی ہیں جو بلیک پول کی وجۂ شہرت ہیں۔ سمندر کے باوجود کشتیوں اور اسٹیمروں کی سیر و تفریح یہاں نہ ہونے کے برابر ہے، شاید اس کی وجہ کشتی رانی کے لئے ناموافق ساحل ہو۔ اس کے برعکس ہیلی کاپٹر اور چھوٹے ہوائی جہازوں پہ سمندر اور ساحل کی فضائی سیر کا بڑا لُطف آتا ہے۔ ایک اور بڑی وجۂ شہرت یہاں کا تفریحی مرکز ہے جو اتنے بڑے رقبے پہ پھیلا ہوا ہے کہ انسان ایک دن میں اسے مکمل طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ دُنیا کے چند بڑے اور بلند ترین رولنگ ٹریکس میں ایک یہاں پر بھی موجود ہے۔ امریکہ اور فرانس کے والٹ ڈزنی لینڈ کے بعد یہ جگہ خاصی مشہور معروف ہے۔

میری یارک شائر والی اقامت گاہ سے یہ لنکا شائر والا خوبصورت ساحل وہی محض ستر اسّی میل ہی ہے اور موٹروے پہ یہ فاصلہ صرف گھنٹہ سوا گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ میرا ویک اینڈ پہ کبھی کبھی اِدھر جانا رہتا تھا یا ویسے ہی کبھی سویرے اندھیرے، آدھی رات سنسان سڑکوں، اونچے اونچے پیچ دار پہاڑی راستوں اور ''بابا سمندر خان'' سے باتیں کرنے، دیکھنے اور چھونے، محسوس کرنے کو جی چاہتا تو چُپ چاپ گاڑی نکالتا اور ہیلی فیکس کی پہاڑیوں پہ ڈال دیتا...... موٹروے، بائی داوے، ممبئی کا گیٹ وے، ماہی وے اور چن وے تو بڑے بڑے ''وے'' ہیں اور اگر کوئی بھولے پن سے یونہی ''وے'' کہہ دے تو دل و دماغ

میں بڑا واویلا بپا ہو جاتا ہے۔ موٹروے پہ راستہ اور رات بڑا تنگ کرتے ہیں، ایسے میں اگر وہی تیسرے کلمے کا سرمدی لحن چھیڑ دیا جائے تو یہ کلمہ پاک پھر بڑے اسرار کھولتا ہے، اس کا مزہ تو پھر وہی جانتا ہے جس پہ یہ کلمہ پاک کھل جائے۔

ایک رات کے آخری پہر میں ایک ایسی ہی کیفیت میں جل تھل اور غرق و غرق آنکھیں ملتا ہوا، جاگا سویا سا بلیک پول کے مشرقی حصے میں لبِ ساحل ایک خوبصورت سے پارک میں جو صرف بوڑھے نیم اپاہج اور ذہنی طور پہ معذور افراد کے لئے مخصوص ہے، پہنچ گیا۔ یہ میری فیورٹ جگہ تھی۔ ساحل کی گہما گہمیوں اور شور و غوغا سے بہت پرے بلیک پول کے ساحل کے آخری حصے میں ایک کنجِ عافیت، جیسے دُنیاداروں میں دَرویش ہوتا ہے چُپ چُپ، اپنے آپ میں ڈوبا ہوا، کھویا کھویا، بالکل یونہی یہ جگہ یعنی یہ پارک بھی بلیک پول کی دَرویش تھی...... ہاں اللہ سبحان و تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں فضیلت و پس ماندگی، بدصورتی کمتری، گندی، گندگی موجود ہے۔ اس میں صرف اشرف المخلوقات حضرت انسان ہی نہیں بلکہ جنات اور ارواح کے علاوہ مختلف عالم، دیگر جہان، بروج ستارے، ارض و سماء، نباتات، معدنیات، حجرات، پہاڑ، صحرا، سمندر، جنگل، وادیاں، بستیاں، شہر اور پھر چرند، پرندے، آبی مخلوق، پھل، پھول، سبزیاں، ترکاریاں، بیابان، کھیت، کھلیان غرض ہر چیز میں ادنیٰ، اعلیٰ، اچھا، برا، سعد و نحس، خوب و ناخوب، شاہ، گدا، دبنگ و دَرویش موجود ہیں۔

عرشوں میں عرشِ بریں، رسولوں میں خیر المرسلین ﷺ کتابوں میں کتابِ مبین، مہینوں میں رمضان المبارک کا مہینہ، دِنوں میں جمعتہ المبارک، پہروں میں رات کا آخری پہر، شہروں میں شہرِ مدینہ، حجرات میں عقیق جیسا نگینہ، صحابہ میں علیؓ شیرِ خدا جیسا اور عاشقوں میں اویس، صدق و وفا، بلال حبشی جیسا اور عالموں میں احمد رضا جیسا...... دَرندوں میں شیر، پرندوں میں شہباز اور انہیں جانوروں میں لکڑ بگھا، بجو اور گدھ، گدھا بھی ہوتا ہے۔ فرشتوں میں قُدس الامین بھی ہیں اور شیطان الرجیم بھی تھے۔ اِدھر حضرت سلیمانؑ، سکندر، نمرود، فرعون اور شداد بھی تھے۔ حسینؓ بھی تھے اور یزید بھی تھا، حمزہؓ بھی اور ابوجہل بھی...... اسی طرح دُنیا کی ہر چیز میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی صفات موجود ہوتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اَثنائے راہ آ گئیں کہ میں نے بلیک پول کے پارک کو دَرویش کہہ دیا...... ہاں، جگہیں بھی انسانوں کی مانند بادشاہ اور دَرویش ہوتی ہیں، وہی فرق جو کسی شاہ کے دربار اور فقیر کے حُجرے میں ہوتا ہے۔

القصہ تفریح، عیش و عشرت کے رَتجگے اور آہ و فغاں، شبِ بیداری، دونوں میں شراب و شباب کے بدمست نشے اور جذب و حجاب کے سَرمدی سُرور کا فرق ہے۔ پورا بلیک پول، یہاں کی عشرت گاہیں

گہری نیند و بے گانگی میں ڈوبی ہوئی تھیں' اُوپر آسمان اور نیچے سمندر جاگ رہے تھے یا کچھ میری طرح بے چین و بے کل آبی پرندے...... ریڈیم گھڑی دیکھی اور پھر مشرق کی جانب آسمان کے کنارے پہ نظر ڈالتے ہوئے قطبی ستارے کو صبح کا سلام کیا۔ نماز سے فارغ ہوا تو تھرموس سے گرم گرم براز یلین بلیک کافی مگ میں اُنڈیل کر سِپ کرنے لگا...... بلیک کافی بھی مجھے شاید اس بلیک پول کی طرح صرف لفظ ''بلیک'' کی وجہ سے پسند ہے۔

● تھا جو نہ خُوب وُہی خُوب ہُوا......!

ایک بار لیڈز کی کرکٹ گراؤنڈ میں ایک پاکستانی چوکے پہ تالیاں بجانے کی پاداش میں مجھے ایک شرابی انگریز نے غُصّے میں ''بلیک باسٹرڈ'' کہہ دیا۔ میرے ساتھ چند ایک دوست بھی تھے جو فوراً مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے مگر میَں نے اشارے سے انہیں روک دیا اور اُس انگریز کو بڑی نرمی سے کہا۔

''پلیز' وَنس مور......''

اُس نے پھر وہی کچھ کہہ دیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے ایک بار پھر یہی کہنے کے لئے کہا۔ اُس ''شریف آدمی'' نے پھر میری خواہش پہ یہی کچھ تیسری بار دوہرا دیا...... اب یہ حال کہ وہ میری خواہش بلکہ فرمائش پوری کرتے کرتے تنگ آ گیا اور اُٹھ کر بائیں طرف دور جا کر بیٹھ گیا' وہ بڑے انہماک سے میچ دیکھنے میں مگن تھا۔ اسی اثناء میں وسیم نے ایک اور چوکا جو لگایا تو میَں نے خوشی اور وارفتگی کے عالم میں پھر تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ اُس نے اچانک میری جانب دیکھا اور ''اُؤ نو'' کہتے ہوئے اُٹھنے لگا تو میَں نے اُس کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔

''جنٹلمین! پلیز' صرف آخری بار پھر وہی کچھ کہو......''

اُس کا نشہ شاید کچھ ہلکا پڑ چکا تھا' وہ بکری کی طرح ممیاتے ہوئے کہنے لگا۔

''آخر تم بار بار کیوں مجھ سے گندی گالی کہلوانے پہ اصرار کر رہے ہو؟''

میَں نے اسے تُرت سا جواب دیا۔ ''مجھے مزہ آتا ہے......''

''مزہ...... اِس میں مزے کا کون سا پہلو ہے؟''

وہ یوں مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میَں کوئی ذہنی طور پر کھسکا ہوا اُس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میَں نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جب تم مجھے بلیک کہتے ہو تو میں خوشی سے پاگل سا ہو جاتا ہوں...... ایک تم ہی تو مردم شناس ملے ہو جو مجھے کالا کہتے ہو ورنہ لوگ تو مجھے اُجلا سمجھتے ہیں جو کہ سراسر غلط ہے......''

وہ اب پوری طرح میری جانب متوجہ ہو چکا تھا اور نشہ بھی جیسے کہیں وشہ ہو گیا تھا' کہنے لگا۔

''مگر میں تو تمہیں بلیک کے ساتھ باسٹرڈ بھی کہتا ہوں' یہ لفظ تمہیں بُرا نہیں لگتا...... تمہیں اس لفظ کے معنی معلوم ہیں' اس گندی گالی پہ تمہارا خون نہیں کھولتا؟''

''نہیں' بالکل نہیں......'' میں نے قطعیت سے کہا...... ''تم نے مجھے کالا' شاید میرا لباس یا میرا اندر دیکھ کر کہا ہے' اس کا مطلب ہے کہ تم ظاہر اور باطن شناس ہو اور تم شاید یہ بھی جان گئے ہو گے کہ مجھے کالا کہلوانا پسند ہے...... باقی رہا یہ کہ تم مجھے باسٹرڈ کہتے ہو تو کوئی کسی دوسرے کو کچھ بھی کہہ سکتا ہے' یہ لفظ میں بھی تمہیں کہہ سکتا ہوں لیکن کہنے سے پہلے مجھے سوچنا چاہیے کہ مجھے کسی اچھے یا بُرے انسان کے لئے بغیر تحقیق' ایسے ناروا قسم کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں یا نہیں؟...... تم شاید نشے کی ترنگ میں ایسا کہہ گزرے ہو یا عربوں کی سوچ کی طرح ہم ایشین' خاص طور پر یہ پاکستانی بھی تم یورپین قوموں کی نظر میں محض عجمی ہیں جو اپنے گراؤنڈ میں ہمارے سنگل ڈبل' چوکے چھکے اور آؤٹ برداشت نہیں کر سکتے جبکہ ہم نے اپنے ملک میں دو سو برس آپ کا جبری تسلط برداشت کیا ہے...... اور وہاں پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ' حرامی اسے نہیں کہتے جو حرام الولد ہو بلکہ اسے کہتے ہیں جو محسن کُش اور بے محابا عیار و مکار ہو۔ اگر یہ برائیاں تمہیں مجھ میں دکھائی دی ہیں تو مجھے باسٹرڈ کہنے میں حق بجانب ہو اور اگر نہیں تو جان لو کہ تم کسی زعم' غرور' کسی احساسِ برتری یا پھر شراب کے نشے میں تھے اور اسی لئے ہمارے دین میں شراب یا نشے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اس سے انسان اچھے بُرے کی تمیز' رشتوں کی پہچان اور تقدس' کہنے' سُننے' دیکھنے' محسوس کرنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے......''

وہ مجھے یوں ہکا بکا سا دیکھ رہا تھا جیسے میں پہلے کوئی پتھر تھا اور اب مجھے زبان لگ گئی ہو...... شرمندہ سا کہنے لگا۔

''جنٹلمین! آئی ایم ریئلی سوری' مجھے اپنے اِن الفاظ پر بڑی ندامت محسوس ہو رہی ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ تم مجھے فراخدلی سے معاف کر دو گے......'' اُس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا...... ''میرا نام رابرٹ کلے ہے' میں ہیون آئس اسکیٹنگ اسٹیڈیم میں گراؤنڈ منیجر ہوں۔ میں آپ سے پھر مستقبل قریب میں ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں......''

''مسٹر کلے! میں ایک سیلانی سا انسان ہوں۔ آج یہاں اور کل کہیں اور...... بائی دی وے' میں

پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو......؟"

وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم میں ایک مخصوص سی چھپی ہوئی شخصیت دکھائی دی ہے۔ مجھے تمہارے آج کے اس عجیب و غریب برتاؤ' برداشت اور بلیک کلر سے محبت نے بڑا متاثر کیا ہے...... تمہیں شاید اپنے الفاظ یاد ہوں' تم نے کہا تھا کہ "ایک تم ہو جو مجھے کالا کہتے ہو ورنہ لوگ مجھے اُجلا سمجھتے ہیں"...... میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ مجھے باطنی اور رُوحانی علوم سے دلچسپی ہے یا ان کی کچھ سمجھ ہے لیکن میں نیپال' کھٹمنڈو آسام' جاوا سماٹرا میں کافی گھوما ہوں۔ سینٹ' صوفی' یوگی' باوا لوگ مجھے بہت پُراسرار دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے آج یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم بھی کچھ ایسے ہی ہو...... میں تم سے مل کر کچھ سیکھنا چاہتا ہوں' مذہب اور مشرقی عُلوم کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں......"

میں نے اُسے اپنا ٹیلیفون نمبر اور پتہ لکھواتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کلے! یو آر موسٹ ویلکم' اگلے ہفتے تک تم کسی بھی وقت مجھے مل سکتے ہو......"

اگلے کرسمس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے مسٹر کلے بریڈفورڈ جامع مسجد میں بارضا و رغبت مسلمان ہو گیا۔ میں نے اس کا اسلامی نام محمد علی رُومی تجویز کیا۔ میں نے اس کی شادی اسی کی خواہش کے مطابق لیسٹر کے ایک انتہائی دیندار مسلم گھرانے میں کرادی۔ اس کی بیوی انتہائی پڑھی لکھی پردہ دار خاتون ہیں۔ دونوں میاں بیوی برسر روزگار ہیں' تبلیغ اور دین کے دیگر کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ ان کے بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ محمد علی رُومی کو اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس کا ماضی کیسا تھا اور کیا تھا؟ وہ تو اب اپنی آخرت سنوارنے کی فکر میں لگا رہتا ہے...... دیکھا آپ نے کہ صبر' سجاؤ اور تحمل' سبک بول سے کیسے کیسے گرانڈیل اور ژولیدہ خاطروں کو نکیل ڈالی جا سکتی ہے۔

● آذرِ احساس کی اصنام گری......!

بات بلیک پول کی ہو رہی تھی کہ لفظ "بلیک" کی وجہ سے یہ مجھے پسند ہے اور بلیک کافی بھی جو میں پلاسٹک کے ایک بلیک کپ میں سِپ کر رہا تھا۔ صبح صبح کا وقت' گیلی گیلی ریت' تازہ تازہ ہوا جس میں سردی کی ہلکی سی سنسناہٹ بھی شامل تھی' اس وقت بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے میں اب مشرق کی جانب بڑھ گیا۔ سمندر کے پسِ منظر میں سُرخی آمیز اُجالا اُبھر رہا تھا۔ یونہی چلتا چلتا اب میں کافی آگے نکل آیا تھا' اس سے پیشتر میں یہاں تک کبھی نہیں آیا تھا کیونکہ آگے

ساحل قدرے خم کھا کر شمال کی جانب مڑ جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چٹانیں 'پتھر' یعنی محفوظ ساحل میرے پیچھے رہ گیا تھا۔ نرم نرم گیلی گیلی ریت سے لطف اندوز ہوتا ہوا آگے بڑھا تو بائیں جانب بڑی سی خاردار تاروں کی دیوار نظر پڑی۔ ذرا اور آگے جا کر معلوم ہوا کہ یہ تو بلیک پول کا کاروان کیمپ ہے...... میں شاید کہیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یورپ' امریکہ وغیرہ میں لوگوں کے اپنے ذاتی چلتے پھرتے گھر یعنی کاروان ہوتے ہیں۔ ویک اینڈ یا سالانہ چھٹیوں میں لوگ اپنے کاروان گاڑیوں کے پیچھے لگا کر ہالیڈے سپاٹ پہ پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں دل چاہا' وہیں ڈیرہ جما لیا۔ اس کاروان میں بیٹھنے' کھانے پینے' باتھ لیٹرین' بیڈ روم' ہر قسم کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ بجلی کے لئے سٹینڈ بائی جنریٹر' پانی کی ٹنکیاں' گیس پہ چلنے والا فریج وغیرہ ان کاروانوں کے لئے ایک علیحدہ گاؤں بنا ہوتا ہے' اسے کاروان ویلج کہتے ہیں۔ لوگ یہاں اپنے کاروان چھوڑ کر سیر تفریح کے لئے نکل جاتے ہیں رات کو یہاں آ کر سو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ ہالیڈے کے دنوں میں مہنگے ہوٹلوں کے اخراجات سے محفوظ رہتے ہیں۔

یہ بھی ایک کاروان ویلج تھا جو کافی بڑی جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ میں دور سے اسے نظروں سے ٹٹولتا ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ اب صبح کا اجالا بھی نکھر آیا تھا۔ یورپ میں خاص طور پر سمندر کے کنارے آباد شہروں میں ایک بڑی مصیبت دھند کی بھی ہوتی ہے جبکہ صبح کے وقت اس کی خاص شدت ہوتی ہے' سامنے چند قدم بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ خلاف توقع یہاں آج صبح دھند کا نام و نشان تک نہ تھا ورنہ شاید میں اتنی دور تک یوں ہی منہ اٹھائے چلا نہ آتا...... جب کاروان ویلج اچھا خاصا پیچھے رہ گیا اور سمندر کے مشرقی حصہ میں سورج کے طلوع کی آگ سی شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ بائیں جانب ایک اور کاروان ویلج شروع ہو گیا ہے مگر یہ پہلے والے کے برعکس کچھ غیر منظم اور صرف پندرہ بیس کاروانوں پہ مشتمل تھا اور یہ کاروان موٹر گاڑیوں کے پیچھے باندھنے والے نہیں تھے بلکہ یہ چار پہیوں اور آگے گھوڑے جوتنے والے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میری دلچسپی دوچند ہو گئی' میں سمندر چھوڑ کر ذرا کنارے کی جانب کھسک آیا تا کہ ذرا قریب سے انہیں دیکھوں۔

یہ جپسیوں یعنی یورپین خانہ بدوشوں کے کاروان تھے۔ صدیوں سے ان چلتے ہوئے کاروانوں پہ جینے والے یہ لوگ بڑے پراسرار' جفاکش' آزاد منش اور قدرتی سے ہوتے ہیں۔ مرد اتھرے' گرانڈیل' تنومند' مشقتی اور خطرناک ہوتے ہیں جبکہ عورتیں بلا کی تیز طرار' چلبلی' مضبوط اور خطرے کی حد تک خوبصورت ہوتی ہیں۔ خوبصورتی تو شہروں یعنی متمدن مہذب معاشرے میں رہنے والوں میں بھی ہوتی ہے مگر ان خانہ بدوشوں کے مقابلے میں ان کی خوبصورتی بڑی مصنوعی اور غیر فطری سی ہوتی ہے جو

سامانِ زیبائش' توجہ اور آلات ومحنت کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ خانہ بدوش دوشیزائیں تو وہ اُپسرائیں ہوتی ہیں جو کسی بھی آرائش کی محتاج نہیں ہوتیں۔ یہ جنگلی گلابوں' دلدلوں کے کنولوں' گھپاؤں کی جھاڑیوں کی بیر بہوٹیوں اور سَر بالیں لالے کی مانند رنگِ شباب پکڑتی ہیں۔ ان پالتو ناگنوں کو ان کے سپیرے ہی قابو میں رکھ سکتے ہیں' یہ اپنے قبیلے میں ہی ڈھکی چھپی رہیں تو چند دن سکون رہتا ہے اور جو باہر نکل آئیں تو ان کے حُسنِ جہاں سوز سے اک جہاں جھلس کر رہ جائے۔ یہ جپسی دوشیزائیں بہت کم اپنی حدود سے باہر نکلتی ہیں۔ پاک و ہند کے خانہ بدوشوں چنگڑوں' کنگروں' سانسیوں' مصلّیوں'' کے برعکس اِن کے مردان کے لئے کما کر لاتے ہیں۔ اِن دوشیزاؤں کی صرف تین دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ اپنے مَرد کو لُبھانا پرچانا' موسیقی سے دِل بہلانا اور اپنے کاروان کو نت نئے انداز میں سجاتے سنوارتے رہنا اور اس کے ساتھ ہی ان میں تین زبردست قسم کی خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہر وقت اپنے آپ سے بے نیاز یعنی نہانے دھونے' صفائی ستھرائی اور پہننے اوڑھنے سے بیزار رہنا' چہرہ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ بالوں میں جوئیں' دُنیا بھر کا کاٹھ کباڑ اُلجھا ہوا ہے۔ آنکھوں میں کیچ بھری ہوئی ہے۔ گریبان پھٹ کر ناف تک اُترا ہوا ہے۔ لاکھ لاکھ ڈالر کا ایک ایک انگ' زنگ صفائی بنا ہوا ہے۔ ہونٹوں کے یاقوت بے توجہی سے دُھند دُھند ہو رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پہ یہ حد درجے چٹوری اور کھوری ہوتی ہیں اور سوائے مٹی ریت کنکر پتھر' یہ ہر رینگنے' اُڑنے' تیرنے اور چلنے والی چیز ہڑپ کر جاتی ہیں۔ سانپ' کرلے' بجّو' مینڈک' نیولے' خرگوش' کُتوں کے پلّے' مگرمچھوں کے بچّے' گدھ' شکرے' اژدھوں کی بوٹیں تو ان کی من پسند ڈش ہے۔ چھپکلیوں کا تکا تک اور مِنڈیوں کی یخنی' الغرض جو چیز کھانے یا ادھر اُدھر نظر آئی' بیلا سے منٹوں میں چٹ کر جاتی ہیں اور یہی اِن کی ملکوتی خوبصورتی کا راز بھی ہے...... تیسری اِن کی کمزوری لڑنا بھڑنا ہے۔ ضروری اَمر ہے کہ جو ایسے ایسے ''وٹامنز سے بھرپور'' غذائیں کھائے گا پھر اسے وہ ہضم بھی تو کرے گا لہٰذا وہ آپس میں خوب لڑتی مرتی ہیں اور کہیں اِدھر اُدھر لڑنے مرنے کا چانس نہ لگے تو وہ ضرورتاً اپنے خاوند سے ہی محاذ آرائی شروع کر دیتی ہیں کہ تم آج کل موٹے کیوں ہوتے جا رہے ہو' تمہاری ابھی عقل داڑھ کیوں نہیں نکلی۔ اس مہینے تم نے معمول کے مطابق میری ٹھکائی کیوں نہیں کی' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اب مجھ سے پہلی سی عداوت نہیں رہی یا تم نے اس دفعہ میری دُھلائی کرتے ہوئے میرے بالوں سے پکڑ کر نہیں گھسیٹا' میری پسلیوں پہ ٹھوکریں صرف دو ہی ماری ہیں تو کیوں......؟

مَیں ایک قدرے اُونچے سے پتھر پہ کھڑا ان کے کاروان دیکھ رہا تھا۔ ان کا ایک ایک کاروان اپنی جگہ پہ ایک عجائب گھر ہوتا ہے۔ ہر کاروان اِک دوسرے سے مختلف ہوگا' مختلف سے مراد ہے کہ اس

کی آرائش مختلف ہوگی۔ ہر کاروان کا اپنا اپنا نام ہوگا۔ کوئی لالہ صحرائی ہے تو کوئی گل یاسمن' لِلی تو کوئی روز ویلٹ ہے۔ نیا گراافال تو کوئی ڈریم آف سٹریم ہے۔ بلیو سٹار' ہاف مون' ٹیپولر ڈولف اور بلیک کیٹ' ہاؤس آف میلوڈی' کوئین آف میلوڈی' ڈریکولا ہاؤس' تاج محل وغیرہ وغیرہ۔ ہر کاروان کے آگے ماتھے پہ سینگ ٹھکا ہوا ضرور ہوگا۔ بارہ سنگھا' دوسنگھا' بیل کے سیدھے ترچھے سینگ معہ آدھی کھوپڑی۔ گینڈے کا اکلوتا سینگ' ہاتھی کے دانت بھی دیکھے۔ مینڈھے کے سینگ' مگرمچھ' سمندری ہاتھی' وہیل' ہانڈل کے خطرناک دانت' کسی مگنے کی کھوپڑی...... یہ بڑے توہم پرست اور پراگندہ باطن لوگ ہوتے ہیں' قدم قدم پہ شگون اور فال نکالنا اِن کے معمولات میں ہے۔ بلا کے گھڑسوار' چاقو زن اور متعصب بھی ہوتے ہیں۔ اپنے قبیلوں کے علاوہ کہیں اور شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان کی عورتیں بھی اگر کہیں لگاوٹ کر رہی ہیں تو وہ صرف پیسے کھینچنے کی خاطر۔ اپنے ہاں کے خانہ بدوشوں کی طرح ان کے مرد بھی عورتوں کو اجازت دیتے ہیں کہ اگر کوئی عقل کا کچا گانٹھ کا ڈھیلا پھنس جائے تو جانے مت دو۔ عزت' عصمت' غیرت وغیرہ کے الفاظ یہ نہیں جانتے۔

دور سے مجھے گھوڑا ہنہنانے کی آواز سی آئی' بڑا سا ہاؤن ہاک گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ ہاک گھوڑا وہ ہوتا ہے جو زیادہ تر کاروان کے آگے جوتنے کے کام آتا ہے۔ بلند قامت' مضبوط جسم و اعصاب والے اِس گھوڑے کے پاؤں بڑے بڑے اور مضبوط ہوتے ہیں' ٹخنے کے اوپر بالوں کی جھالر سی ہوتی ہے۔ گھڑسواری کے لئے یہ کوئی موزوں نہیں ہوتے' تاہم ورزش کے لئے کبھی کبھار انہیں سرپٹ دوڑالیا جاتا ہے...... سوار پہ پہلی نظر پڑتے ہی مجھے دو تین زبردست قسم کے جھٹکے لگے' میرے اندر جیسے سائرن بجنے شروع ہوگئے اور میں خوب جانتا تھا کہ یہ خطرے کے سائرن کب بجتے ہیں؟...... وہ ایک خوبصورت سی لڑکی تھی' جپسی لڑکی! لمبی سی فرغل پہنے' جھکتے ہوئے توسیں شانوں پہ جھولتے ہوئے سنہری گیسو' تنی ہوئی گردن پہ آڑوسی کاٹ دار ٹھوڑی کے اوپر ننھا سا دہانہ نہ ہونے کے برابر ناک کے اوپر دو وحشی سی آنکھیں' کھلے گریبان سے نیم جھانکتا ہوا آفتابِ شباب...... اِک قیامت تھی جو میرے سر پر کھڑی تھی۔

مرد تو مرد ہوتا ہے۔ فقیر ہو یا وزیر' ہو شاہ یا درویش' سید یا تیلی' بوڑھا' جوان یا بچہ' مرد پن تو سب میں مشترک ہوتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ اپنی نظروں کی حفاظت بھی عبادت ہے' اسے جھکا کر رکھا کرو۔ نظریں ملانا یا اٹھا کر رکھنا خشونت' تکبر' جہالت اور بے ادبی کی ذیل میں آتا ہے مگر میرے جیسے چاروں کھونٹ کے کمیت کے لئے تو اٹھانا' جھکانا سب برابر ہے۔ میں دیکھوں یا نہ دیکھوں' سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور ضروری نہیں کہ انسان محض آنکھوں سے ہی دیکھے۔ لوں لوں' روم روم سے بھی نظر آتا ہے۔ اپنے

دھیانے‘ سر نیہوڑائے‘ نگاہیں جھکائے نپے تلے قدموں سے بازار میں گزرنے والی لڑکی یا عورت (جسے اگر دیکھا جا سکتا ہو) خوب جانتی ہے کہ اِسے کون کون‘ کہاں کہاں سے اور کس کس نیت سے دیکھ رہا ہے۔ کسی محفل‘ کسی بس‘ کسی بھی جگہ جہاں کچھ اپنے پرائے بیٹھے ہوں وہاں بیٹھی ہوئی دوشیزہ یا عورت لڑکی ہر گئی‘ جمی‘ ٹھہری ہوئی آنکھ کو محسوس کر رہی ہوتی ہے۔ ہر نظر کا پیغام بھی اس کے پاس پہنچا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے کام‘ گفتگو اور دھیان میں مگن ہوتی ہے۔ وہ تو اس کبھی کبھار‘ بچتے بچاتے‘ چوری چھپے دیکھنے والی آنکھ کو بھی جانتی پہچانتی ہے جو بڑی ہوشیاری چالاکی سے اسے جانچ رہی ہوتی ہے...... میں نے اِسے دُور سے آتے تو ضرور دیکھا مگر اب سر پہ کھڑی کو میں نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ خواہ مخواہ صبح صبح بدمزگی ہو جائے گی۔

”گڈ مارننگ‘ ینگ لیڈی...... “ میں نے بڑی مشکل سے پہل کی۔

”گڈ مارننگ “ اُدھر سے بھی جواب آں غزل آیا‘ وہ پھر بولی۔ ”نائس ویدر......“ اب میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”او یس‘ ویری نائس ویدر ٹوڈے...... تم یقیناً اُدھر رہتی ہو گی؟“ میں نے اُدھر کاروانوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اُتر آئی اور بالکل میرے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہم اُدھر ہی رہتے ہیں...... اور تم؟“

”میں تو ابھی ابھی کچھ دیر پہلے یہاں آیا ہوں صبح خیزی کے لئے‘ ابھی کچھ دیر بعد واپس چلا جاؤں گا...... میں اِدھر یارک شائر میں رہتا ہوں......“

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سراپے کی جانب غور سے دیکھا۔ لمبی فرغل میں وہ کچھ یوں لگ رہی تھی جیسے چنگیز خان کے لشکر سے بچھڑ کر یہ معلوم کرتی پھرتی ہو کہ بھڑکتی آتش کا سیلِ رواں کہیں جاتے دیکھا ہو؟...... مشکل سے پندرہ سولہ کا سِن ہو گا۔ ایسا سُنہری رنگ جیسے بچپن میں شنگرف اور اب جوانی میں سونا چاٹتی رہتی ہو‘ ویسی ہی رنگت کے اُلجھے ہوئے بے ترتیب بال جنہیں اس نے شاید اب تک روغنِ زیتون اور آسٹریلین لعل بی شہد میں ڈبو کر رکھا ہوا تھا۔ چہرے پہ اک دل آویز سا بھولپن‘ رُخساروں کے سُنہری غُبار میں باریک باریک گلابی رنگت تل جیسے کِھلے ہوئے‘ پھوٹنے پہ آمادہ لال گلابی قندھاری اَنار پہ ننھے ننھے سپاٹ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی اُبھرے اُبھرے‘ بھرے بھرے‘ رَس بھریوں سے ہونٹ...... میں نے اس خوف سے نگاہیں ہٹا لیں کہ کہیں گستاخ نگاہی سے رَس بھریاں پھوٹ ہی نہ پڑیں

اور وہ گھوڑے کو چکارتے ہوئے ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، بتانے لگی۔

''میں اِدھر کراس پوائنٹ پہ تازہ اسٹرابری کی بنی ہوئی آئس کریم کے مشہور پارلر کے سامنے کرائے پہ گھوڑے، گدھے پر سواری کراتی ہوں، سیر کرنا چاہو تو آ جانا......'' پھر وہ اُچک کر گھوڑے پہ بیٹھ کر کہنے لگی۔ ''ضرور آنا، میں تمہارا انتظار کروں گی......''

میں اسے اُدھر گھوڑے پہ اُڑتے ہوئے جاتے دیکھ رہا تھا جدھر سے میں آیا تھا۔ تب میرے منہ میں رس بھریوں اور اسٹرابریوں نے عجیب کسیلا سا مٹھاس بھرا سواد بھر دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ وحشی ہرنی یقیناً انہی کاروانوں کے کسی بھٹ میں رہتی ہو گی...... سورج نے اپنی سنہری کرنوں کی جھالر میں سے ہلکا سا مکھڑا باہر نکال لیا تھا۔ اب میں پھر ایک بار کاروانوں کی جانب متوجہ ہوا۔ رنگ برنگے کاروان کسی طریق سلیقے، ترتیب کے بغیر ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ کھڑے تھے لیکن سب کے رُخ سمندر کی طرف ہی تھے، اُدھر سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک اِن کے پالتو چوکیدار کُتوں کی نگاہ، نتھنوں میں نہیں آیا تھا ورنہ میرا وہ سواگت ہوتا کہ مجھے اِدھر سے بھاگتے ہی بنتی...... پھر کتنا ہی میں جو کچھ سامنے دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ اب میں نیچے اُتر کر واپسی کے لئے ہو لیا۔ میرے پیچھے چڑھتے سورج کی کرنیں مجھے آگے کی جانب دھکیل رہی تھیں جدھر وہ پری تمثال، فرخندہ جمال اُڑی جا رہی تھی۔ گیلی ریت پہ میرے اِدھر آنے کے نشان ہنوز برقرار تھے، اب میں اِن ہی نشانوں پہ قدم دھرتا ہوا واپس جا رہا تھا، اپنی ترنگ اور اپنے رنگ میں جیسے میں کبھی ریل کی پٹڑی پہ چلا کرتا تھا یا مجھے جب کسی ہوئی تار پہ چلنے کا شوق چرایا تھا۔

ہُوا یوں کہ ایک دوپہر بابا جی کے قدموں میں خاک سے بنے ہوئے پڑے تھے، فضا اور ماحول میں بڑی اداسی اور سنجیدگی دَر آئی ہوئی تھی۔ بابا جی اس وقت نیم مراقبہ کی حالت میں تھے، ویسے بھی یہ وقت بابا جی کے قیلولے کا ہوتا تھا۔ ہم دو چار حاضر بچے، دَم سادھے ہوئے تھے کہ کہیں کُھل کر سانس لینے سے بابا جی کی محویت یا آرام میں خلل نہ پڑ جائے۔ پچھلے دِنوں مجھ سے ایک دو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ میں اندر ہی اندر چُھپا، ڈرا سہما بیٹھا تھا کہ دیکھیں، کب پیشی پڑتی ہے اور یہ بھی سوچ بیٹھا تھا کہ کبھی موقع یا خلوت نصیب ہوئی تو بابا جی سے عرض کروں گا کہ یہ دَرویشی، دُنیاداری کے ساتھ کس طرح نبھائی جا سکتی ہے، دو متضاد سمتوں میں بیک وقت سفر کرنا ایک کمزور اِنسان کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کیچڑ اور غلاظت بھرے بازار سے گزرنا بھی ہے لیکن دامن پر چھینٹ نہ پڑے، جسم بھی پلید نہ ہو اور جبیں پہ شکن بھی نہ آئے۔ یہی کچھ سوچ سوچ کر اپنے ذہن میں سوالنامے کو ترتیب دے رہا تھا کہ بابا جی پشت پہ تکیے کی ٹیک

چھوڑ کر ذرا آگے کو ہو لئے' پانی طلب فرماتے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے کہ تم نے کبھی نٹوں اور بازیگروں کا ایسا تماشا دیکھا ہوگا جس میں تنی تار پہ چھوٹا سا لڑکا یا ننھی سی بچی چلتے ہیں اور پھر ایک پہیہ والی سائیکل بھی چلاتے ہیں؟...... میں نے ادب سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں' بازی گروں کے ایسے بہت کھیل تماشے اور سرکس میں بھی تنی تار پہ چلنے والے کرتب اکثر دیکھے ہیں۔ بعض تو آنکھوں پہ پٹی باندھے ہوئے' نیچے احتیاطی جال کے بغیر بھی لمبی تار پہ ایک لمبا فاصلہ طے کرتے ہیں......''

بابا جی نے ایک نظر میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''شاباش' تم نے بالکل ٹھیک کہا...... اتنی باریک تار پار کرنا تو کجا' انسان اتنی بلندی پہ دو فٹ چوڑے راستے پر بھی نہیں چل سکتا۔ ایسا کرنا صرف مشق' اپنا توازن بحال رکھنے کے اعتماد اور دوسری جانب سلامتی سے پار لگنے کے یقین سے ہی ممکن ہوتا ہے اور یہ مشق' یہ اعتماد اور یہ یقین ان کے اُستاد پیدا کرواتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مت دیکھو کہ تمہارے پاؤں تلے کتنی باریک تار ہے۔ تمہارے پاؤں اپنا رستہ اور جگہ خود بنا لیں گے۔ تم صرف اپنے توازن اور جہاں تم نے پہنچنا ہے وہاں پہ توجہ اور نظر رکھو۔ جونہی محسوس کرو تم ایک طرف جھک رہے ہو تو فوراً مخالف جانب جھکتے ہوئے سانس لینا بند کر دو اور ایک قدم آگے بڑھا کر توازن برقرار کر لو لیکن ٹارگٹ سے نگاہ نہ ہٹے ورنہ جھکنے والی جانب دھڑام سے گر جاؤ گے۔ بس ایسے ہی جھکتے' سنبھلتے ایک ایک پگ آگے بڑھاتے اپنی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ اس سارے کام میں مشق' سانس کا کنٹرول' اعتماد و یقین کی بحالی اور اپنے توازن پہ قابو بڑا اہم ہوتا ہے...... تنی ہوئی تار زندگی ہے' بلندی آزمائش ہے۔ دائیں دین ہے' بائیں دُنیا' سامنے آخرت اور سکھانے والا اُستاد' مُرشد' رہبر یا بابا' اسے تم کوئی بھی نام دے سکتے ہو۔ بس' اتنا یاد رکھو کہ تم نے اپنی منزل پہ ایمان اور جان کی سلامتی کے ساتھ پہنچنا ہے۔ دائیں بائیں جھکنے لپکنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... چھوٹی موٹی غلطی کوتاہی سرزد ہو جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی' بس اگلا قدم بڑھاتے ہوتے اپنے توازن کو درُست کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

میرے گال پہ ہلکی سی چپت کراتے ہوئے وہ اُٹھے اور قیلولہ کے لئے اپنے حُجرے میں تشریف لے گئے۔ بس وہ دن' میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں نے اب ہر صورت تنی تار پہ چلنا سیکھنا ہے۔ بابا جی نے تو محض تنی تار کا استعارہ استعمال کیا تھا' اصلی بات تو اُنہوں نے دین و دُنیا کو ساتھ لے کر یقین' ایمان و جان کی سلامتی کے ساتھ آگے بڑھنا' یعنی عاقبت سنوارنے کی بتائی تھی مگر میں نے حقیقت سے پہلے مجاز کی تنی تار پہ چڑھنے کی ٹھان لی تھی۔ حبسِ دم' ساکت نظری' تخیل بندی' ارتکازِ خیال' پیغام رسانی'

تحلیلِ نفسی وغیرہ' اور بھی بے شمار عمل عوامل ہیں جنہیں اگر انسان سیکھنا چاہے تو کئی جنم درکار ہوں مگر یہ تو جنونی اور ابنارمل لوگوں کے کام ہیں۔ دُنیادار اور صحیح الحواس اِنسان کے لئے یہ محض تضیعِ اوقات کے علاوہ اور کچھ نہیں...... پہلے تو بنیرے کی دیواروں پہ توازن قائم کیا۔ پھر ٹرین کی پٹڑی پہ کئی کئی میل دائیں بائیں بغیر گرے چلنا دوڑنا سیکھا۔ پھر دس فٹ بانس پہ چلے' پھر تیس فٹے پہ پریکٹس کی اور آخر ہم نے گرتے پڑتے رَسّے' تار پہ چلنا سیکھ ہی لیا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ ہم نے ایک مکان سے دوسرے مکان' نیچے چلتا ہوا ٹریفک گاڑیاں' بجلی کی تاریں صرف فلم یا تکئے' چانیوں کی شرط بد لگا کر تار پہ عبور کئے۔ سیالکوٹ سے سمبڑیال جاتے ہوئے محض پریکٹس کے لئے ریلوے کے ٹیلیگراف کے کھمبوں کے اُوپر چڑھ جاتے' کئی کئی کھمبے اوپر دَوڑتے رہتے۔ دوست یار بھی ساتھ ہوتے' وہ نیچے کھیتوں میں کسانوں کو ہماری بازی گری سے متاثر کر کے گونگلو' مولیاں' گاجریں اور گنّے بٹورتے رہتے۔

مَیں اب یہاں ساحل پہ بھی اِسی پریکٹس کے تحت اپنے ہی اُلٹے قدموں پہ سیدھے قدم رکھتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ گنتی میں گنتی کے چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ اِک دَم جیسے مجھے ایمرجنسی بریک لگ گئے' مَیں اپنے قدموں پہ کھڑا آگے پیچھے' دائیں بائیں ریت پہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ابھی چھلاوہ سی لڑکی تلے ہاک گھوڑے [illegible] میرے سامنے وہ اسی جگہ [illegible] گھوڑا دوڑاتے ہوئے گئی تھی مگر اب گھوڑے کے کسی قدم کا نشان وہاں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مَیں اپنا وہم دُور کرنے کی غرض سے دائیں بائیں اِدھر اُدھر بہت دُور تک گیا مگر وہاں صرف گھونگوں' سیپ' آبی کیکڑوں' کیڑوں یا پھر میرے آنے اور جانے کے علاوہ گھوڑا تو گھوڑا' کسی پرندے کے پنجے کا بھی نشان موجود نہیں تھا۔

رات کو سمندر کنارے تک پھیل جاتا ہے اور صبح دم سِمٹ جاتا ہے ساحل کی ریت ہموار ہوتی ہے۔ گیلی گیلی یکساں ریت' پڑنے والے ہر نشان کو دیر تک محفوظ رکھتی ہے اور یہاں صرف پانچ دس منٹ بعد گھوڑے کے پاؤں کے نشان یوں غائب تھے جیسے وہ زمین پہ قدم دھر کر نہیں' ہُوور کرافٹ کی طرح دو چار فٹ اونچا اُڑ کر گیا ہو...... سورج اب قدرے اوپر اُٹھ آیا تھا اور مجھے اِس پُراسرار لڑکی کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے کہ مَیں اِدھر آئس کریم پارلر کے سامنے کرائے کے گھوڑے' گدھوں پہ سواری کراتی ہوں۔ سیر کرنی ہو تو آ جانا' مَیں تمہارا انتظار کروں گی...... مَیں مسکرا دیا کہ مجھے ایسے گھوڑے' گدھوں پہ سواری کرائے گی جن کے سموں کے نشان زمین پہ نہیں پڑتے؟...... مَیں نے اب پہلے شیڈول کے مطابق کہ بس ذرا ہوا خوری کے بعد واپس آ جاؤں گا' اپنا واپسی کا پروگرام ذرا موخر کر دیا کہ چلو جہاں سومن افیم' وہاں سوا من اور سہی' اب تو گھڑ یا گدھا سواری کے بعد ہی واپس جائیں گے' وہ بھی اگر گدھے گھوڑے کے سم

زمین پہ لگ گئے تو' ورنہ دیکھیں گے کہ یہ کیسے گھوڑے گدھے ہیں جن کے ہُوور کرافٹ میں رولز رائس کا انجن فِٹ ہے جو ان کے پاؤں زمین پہ ٹکنے نہیں دیتا۔

بلیک پول اب دھیرے دھیرے جاگ رہا تھا' ساحل کی جانب بہت سے لوگ آ رہے تھے۔ میں مزے سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ٹاور تک آ گیا۔ ٹاور کے نیچے ایک خوبصورت سے کافی بار سے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر اخبار بغل میں داب کر سمندر رُخ ایک بینچ پہ آ کر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں نے ہلکی سی سُستی محسوس کی' یعنی نیند اور تھکاوٹ اپنا رنگ دِکھا رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ زبردستی آنکھیں بند ہو جاتیں اور میں اسی بینچ پہ کہیں لمبا پڑ جاتا' فوراً اُٹھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ آ کر لیٹ گیا..... جب تھکاوٹ اور نیند کی بھرمار سے انسان نیند کی گود میں پہنچ جاتا ہے تو اِسے جگانے والا کوئی نہیں ہوتا' تب وہ اسی وقت جاگتا ہے جب اگلی پچھلی ساری معطل نیندوں کی کسر پوری ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ہوا۔ جب آنکھ اُکھڑی تو سُورج نِصف النہار پہ پہنچ چکا تھا۔ گھڑی پہ وقت دیکھا تو سوا ڈیڑھ بجا رہی تھی' یعنی ظہر کی نماز میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ گاڑی دبائی اور پانچ چھ منٹ میں مسجد پہنچ گیا۔ اس زمانے میں بلیک پول میں ایک بنگالی ریسٹورنٹ کے نہایت ہی دیندار مالک نے اپنے مکان کے ایک حِصّے کو مسجد کی شکل دے رکھی تھی۔ وہاں پہنچے ہی اذان ہو گئی۔ تین مقتدی نمازی اور سب بنگالی' چلو' الحمدُللہ! مسجد برائے نام اور نماز پڑھنے والے بھی بنگالی ہی سہی۔ مسلمان تو ہیں' یہی کافی ہے۔ اسی بنگالی کے ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر میں نے پھر اسی جگہ گاڑی لا کر کھڑی کر دی۔

بازار' مارکیٹیں' ساحل اور تفریحی مراکز انسانوں سے بھر چکے تھے۔ سورج بھی آج خوب چمک رہا تھا اور سامنے سمندر بھی خوب جگمگ کرتے ہوئے تھرکتے مچلتے سیماب کی طرح دیکھنے والوں کی نگاہوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ ساحلوں پہ ہوا میں تندی اور فضا میں خنکی سی ہوتی ہے جو بڑا مزہ دیتی ہے اور اگر ساتھ چمکتی دھوپ اور نکھرا موسم بھی شامل ہو جائیں تو پھر سیر و تفریح کا لطف دوآتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ ہو جاتا ہے اور آج یہ سب کچھ تھا۔ میں گاڑی سے باہر نکل کر کافی دیر تک لوگوں کی چہل پہل اور موسم کی خوش سامانیوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر آنکھوں پہ سیاہ چشمہ اور سر پہ پی کیپ ڈال کر میں زیرو پوائنٹ' آئس کریم پارلر کی جانب بڑھ گیا جو یہاں سے خاصے فاصلے پہ تھا۔

میں نے غور کیا کہ ہر گہری گپت سی چیز کے ساتھ گھوڑے گدھے کا کسی نہ کسی طور تعلق ضرور رہا ہے۔ اکثر پیغمبروں' اماموں' قُطبوں اور غوثوں ولیوں کے تذکرہ و احوال میں ان دونوں جانوروں کا بھی مناسب سا ذکر ملتا ہے۔ اِن کے علاوہ یہ مجاہدوں' غازیوں' دُرویشوں' فقیروں' صوفیوں اور مہا پُرشوں کی

باربرداری اور سواری میں بھی شامل رہے ہیں۔ اسی تعلق و مناسبت کے حوالے سے گھوڑے کو انتہائی زیرک' اعلیٰ و افضل چوپایہ اور گدھے بے چارے کو صابر و شاکر' محنتی اور جفاکش' غریبوں محنت کشوں کا ساتھی سمجھا جاتا ہے۔ الہامی کتابیں' دُنیا کی جنگ وجدل کی تاریخ' حق و باطل کے معرکے۔ ایرانی' تورانی' رُومی' آشوری' سامری' بابلی' ساسانی' آرمینی' مصریوں' آریائیوں کے بعد ماضی قریب کے ہندو دیو مالائی' کلیسائی اور اسلامی تہذیبوں اور عروج و زوال میں گھوڑا نمایاں نظر آئے گا۔ معراج النبیؐ میں پیش ہونے والی سواری بُراق' جو گھوڑے سے چھوٹی اور گدھے سے بڑی تھی وہ بھی اَز قسم گھوڑا ہی تھی۔ جناب امیرؓ کا گھوڑا' اسی طرح بے شمار گھوڑے جیسے نیرو اور سیزر کے گھوڑے' فریدوں' رُستم و سہراب کے رَخش' سکندرِ اعظم کا سفند' ٹیپو سلطان کا فرس' صلاح الدین ایوّبی اور محمد بن قاسم کے تاریخ ساز بادرفتار گھوڑے۔ ملکہ الزبتھ ثانی کے گھوڑے' آغا خان کے گھوڑے بے نظیر والے اور سواری کی ایک وجہ شہرت بھی گھوڑے ہی تھے۔ اسی طرح اور بے شمار گھوڑے مشہور ہوئے۔ پیر پگاڑو' بابا گورو نانک' گرو دیو امرداس' رام داس' ارجن دیو' ہر گوبند' ہر داس' ہر بھجن' تیج بہادر' گوبند سنگھ کے مقدس گھوڑے۔ مہاراجہ رنجیت کی مشہور گھوڑی اور ریس جیت کر مربّے کھانے والے اور پاگل یا لنگڑے ہو کر گولیاں کھانے والے گھوڑے۔ اپنے مرزا جٹ بھی گھوڑی پہ [illegible] نظر آتی تھیں۔ ہندوستان کے ایک فرمانروا نے بھاگتے ہوئے اپنا گھوڑا دریا میں اُتار دیا تھا اور مرشدؒ کو کہنا پڑا کہ......

بھج ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

کھٹکھو گھوڑے اور بسا اوقات یہ گھوڑے سرکار بہاؤ الدین جہانیاں بخاری المعروف گھوڑے شاہؒ اور ٹٹو سائیں اور ہم ایسے گدھے۔ ساری ہڈیاں تڑوائیں' کھال اُدھڑوائی مگر سمجھ نہ آئی' گدھے کے گدھے ہی رہے۔

وہ خُورشائل مجھے دُور ہی سے گھوڑوں اور گدھوں کے جلو میں کھڑی نظر آ گئی مگر شاید اس نے مجھے' مجھ سے بھی پہلے دیکھ لیا تھا کیونکہ جب مَیں نے اُسے دیکھا تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ بہرحال' مَیں قریب آیا تو وہ بھی آگے بڑھتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئی اور چھوٹتے ہی بولی۔

''خوب سوئے' عبادت کی۔ فش کری' چپاتیاں اور دال چاول کھائے اور اب آئے......؟''

مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں' تم نے سچ کہا اور سچ تمہارے مُنہ سے بھلا بھی لگتا ہے۔ ایک اور خوب سچ کہو کہ اِدھر انسانوں اور حیوانوں کے درمیان...... تم؟''

سُنی' اَن سُنی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''گھوڑے پہ بیٹھو گے یا گدھے پہ......؟''

''جس کسی پہ بیٹھاؤ گی' بیٹھ جاؤں گا مگر......''

''آگے کہو......؟'' مجھے لگاوٹ سے گھورتے ہوئے بولی۔

''مگر اس جانور کے پاؤں کم از کم زمین پر پڑنے چاہئیں' ہوا میں نہیں......''

مَیں نے دیکھا کہ چار پانچ جپسی لڑکے اور کچھ لڑکیاں' اور ایک آدھ بوڑھا بھی وہاں موجود تھے۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں بھاڑا لے کر بوڑھے مرد کو تھما دیتے اور خود گھوڑے یا گدھے کی لگام پکڑ کر سوار کو ساحل کی سیر کروانے نکل جاتے۔ یہ اب بھاڑے پہ منحصر تھا کہ سیر مختصر ہے یا لمبی؟...... اس زُہرہ وش نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کسی اجنبی سی زبان میں ایک اجنبی لڑکے سے کچھ کہا' وہ گیا اور گھوڑوں گدھوں میں سے ایک گھوڑا نکال کر لے آیا۔ عجیب چتکبرہ سا گھوڑا تھا' دیکھنے میں تو گھوڑا ہی لگتا تھا مگر شاید وہ کچھ اس سے زیادہ بھی تھا۔ آنکھیں جیسے کوئی اِنسان دیکھ رہا ہو۔ تنومند ایسا کہ کوئی پیشہ ور پہلوان ہو۔ گھوڑے کے جسم جُثّے کی اپنی ایک مخصوص بُوباس ہوتی ہے' وہ بھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سی خوشبو یا پھر بُو ایسی کہ [illegible] تھی۔ وہ اس کی بیٹھنے والی کاٹھی درست کر رہی تھی۔

''چلو اوپر بیٹھو...... مَیں تمہیں آج سیر کراؤں گی''۔

شاید یہ وہی گھوڑا تھا جس پہ وہ سواری کرتے ہوئے صبح صبح مجھے ملی تھی۔

''مجھے روایتی خانہ بدوشوں کے کاروان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایسے گھر جو مکینوں کے ساتھ کہیں بھی مستقل ٹھکانہ نہیں کرتے' اِن کے نیچے گول متحرک مضبوط پہیے زندگی کے مظہر ہیں۔ منظر اپنے' موسم اپنے' فضا اپنی' ہوا اپنی' خوشی اپنی' خواب اپنے...... پھیلی ہوئی زمین اِن کا آنگن' کشادہ آسمان اِن کی چھت' سورج ستارے اِن کے روشن چراغ۔ مرغزاروں اور گلزاروں کی خوشبوئیں اور نکہتیں اِن کا سنگھار۔ شفق اِن کی سُرخی' اُفق اِن کا غازہ اور شبِ تار اِن کی کاکلوں کی سیاہی......''

جب میرے الفاظ ختم ہو گئے تو مَیں نے اس ناہید خصائل کی جانب دیکھا۔ وہ تحسین و آفرین بھری نگاہوں سے مجھے گُم صُم سی دیکھ رہی تھی' بولی۔

''تم تو شاعری بھی کر لیتے ہو؟''

''ہاں' ماحول بن جائے تو بودا آدمی بھی شاعری کرنے لگتا ہے۔''

''چلو، پاؤں رکھو اور اوپر بیٹھو۔''

''شکریہ...... مجھے گھوڑے پہ چڑھنا اور گدھے سے اُترنا خوب آتا ہے۔''

وہ گھٹنا جھاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی تو میں اگلے لمحے گھوڑے پہ سوار تھا۔ گھوڑا خود بخود اپنے لگے بندھے روٹ پہ چل نکلا۔ ساحل پہ ایسا اژدحام تھا کہ راستہ نکلنا مشکل پڑ رہا تھا' ایسے میں کون دیکھتا یا کیا نظر آتا کہ پاؤں کے نشان ریت پہ پڑ رہے ہیں یا نہیں؟...... کچھ اور آگے نکلے تو میں نے اس سے کہا۔

''چاہو تو لگام مجھے دے سکتی ہو اور چاہو تو......''

ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ چشم زدن میں وہ میرے پیچھے گھوڑے کی چوڑی پیٹھ پہ لگامیں تھامے کھڑی تھی اور گھوڑے نے میرے حساب سے زمین چھوڑ دی تھی۔ آپ نے سرکس میں گھوڑے کی پیٹھ پہ کھڑی لیڈی دیکھی ہوگی' گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا ہوتا ہے اور وہ بازو پھیلائے بڑے آرام و اعتماد سے کھڑی ہوتی ہے۔ یہ سارا پریکٹس' بیلنس اور خود اعتمادی کا کھیل ہے لیکن یہ سمندر کا ساحل تھا' کسی سرکس کا پنڈال نہیں تھا جو وہ ایسے کرتب دکھاتی مگر یہ ایسی سُرعت اور نظر بندی سے ہُوا کہ مجھے آنکھوں آنکھ کچھ دکھائی اور سُجھائی [illegible] اپنے کانوں کی طرف تھا۔

مجھے سری نگر کی ڈل میں کھڑے' بہتے ہوئے' لہریے لیتے ہوئے راج ہنسوں کی مانند گردنیں اُٹھائے وہ شکارے بجرے یاد آ گئے جو کسی محنت کش' غریب' خستہ حال کشمیری کی جھونپڑی بھی ہیں۔ کسی کا مکان' گھر' کوٹھی بلڈنگ' بنگلہ اور محل بھی ہیں۔ تھری' فور' فائیو سٹار ہوٹل' ریسٹورنٹ' سنیک بار' فاسٹ فوڈ' آئس پارلر' کلب کیسینو اور ٹینس کورٹ بھی ہیں۔ میلوں گہرے پانیوں کے سینے پہ تیرتے ہوئے یہ نئی اور پرانی تہذیب کی چوبی تعمیراتی قدروں کے نادر نمونے دیکھ کر انسانی عقل ششدر رہ جاتی ہے۔ مجھے کئی بار سری نگر کی اس ڈل کے تیرتے ہوئے ''فائیو سٹار ہوٹلوں'' میں قیام کا اتفاق ہوا جو اکثر مغلوں کے بنائے نشاط باغ' شہر اور حضرت بل شریف کی درگاہ کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں دُنیا بھر کی تمام دستیاب سہولتیں موجود ہیں۔ ان کا ماحول بالکل وہی راجے مہاراجوں کے محلات جیسا ہی ہے۔ ویسی ہی خواب گاہیں' نشست گاہیں' طعام اور قیلولہ کرنے کے کمرے' راہداریاں' غلام گردشیں' شہہ نشینیں' جھروکے' فوارے' حمام' مشاطہ گاہیں اور ویسے ہی کورنش بجالاتے ہوئے خدام' کنیزیں' مامائیں' نگہبہ دار اور فراش و اردلی۔ استقبالیہ لاؤنج کے ایک مخصوص حصے میں ان معزز مشہور زمانہ لوگوں کی تصاویر اور تعریفی سرٹیفکیٹ آویزاں ہیں جو ماضی میں یہاں فروکش ہوئیں۔ ان میں بڑے بڑے

ملکی و غیر ملکی سیاستدان، صنعتکار، فلمستار اور فلمی یونٹ اور دیگر سماجی اور مذہبی ہستیاں شامل ہیں۔ انہی ڈل کے پانیوں سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔ اب جب کبھی میں دریائے جہلم کے پل سے گزرتا ہوں تو سری نگر کی ڈل کے پانیوں، کشتیوں اور مکینوں کو سلام بھیجتا ہوں۔

آپ کو کافی گھما پھرا لیا، مناسب یہی ہے کہ اب ہم واپس وہیں چلتے ہیں جہاں بیچ راستے احمد دینار اور کثیر علی کا کاروان کھڑا ہے...... دراصل بات ہی کاروان سے شروع ہوئی تھی کہ کاروان کیا چیز ہے اور اس کی خانہ بدوشوں کی نظر میں کیا کچھ اہمیت ہوتی ہے۔ میری پریشانی یہ ہے کہ جب بات سے بات جنم لے لیتی ہے تو میں پھر اس نوزائیدہ بات کو لاوارث چھوڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی میں کسی نومولود معصوم کے ساتھ نظر اندازی کا ایسا ناروا سلوک ہوتا دیکھ سکتا ہوں۔ جب تک میری بات سے بات کا پیدا ہونے والا ''بچہ'' قدرے سنبھل نہیں جاتا میں پہلی والی بات کے قریب نہیں آتا، اسے میری مجبوری یا کمزوری سمجھ لیں...... ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ احمد دینار اور کثیر علی ناشتے سے فارغ ہو کر اب کاروان کو بیچ راستے سے ہٹا کر ذرا کنارے پہ لانے کا جتن کرنے لگے تاکہ اگر کوئی گاڑی یا سواری ادھر سے گزرنا چاہے تو اسے کوئی پریشانی یا دقت نہ ہو۔ پہیوں کے نیچے کیچڑ وغیرہ تو کب کا سوکھ چکا تھا لیکن مسلسل کھڑے رہنے سے پہیے [illegible] جگہ یا [illegible] جگہ ہموار اور [illegible] نہیں تھا۔ آگے پیچھے سے ہلانے جلانے کی بہت دیر تک کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ہانپتے ہوئے اسی کے ہی سائے میں بیٹھ گئے کہ یہ کام فی الحال ان دونوں کے بس کا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر ستانے اور غور و خوض کے بعد احمد دینار، کثیر علی کا بازو پکڑے اپنے مرحوم والد کی قبر پہ آ کر بیٹھ گیا۔ جو کچھ بھی دونوں کو آتا تھا اور یاد تھا، پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی تقلید میں ہاتھ اٹھا کر اپنی والد اور والدہ کی مغفرت کی دُعا مانگی، اپنے اللہ سے اس آزمائش سے سُرخرو ہونے کی التجا کی۔ قدرے ہلکے پھلکے ہو کر وہ دونوں اُٹھے، گاڑی سے پھاوڑے نکال کر پہلے کسی طرح گڑھا کھود کر مُردہ بیل کو ٹھکانے لگایا، پھر کاروان کے پہیوں کے نیچے سے پھنسی ہوئی سخت مٹی نکالنی شروع کی۔ کچھ دیر کے بعد انہیں اپنے سیدھے رُخ سے کچھ آوازیں اور اُڑتے ہوئے پرندے دکھائی دیئے۔ وہ ہاتھ روک کر ذرا آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے لگے کہ کون ہے جو اس بھولے ہوئے راستے پہ چلا آ رہا ہے؟...... وہ کچھ مزید آگے بڑھ آئے، جب دونوں اطراف درمیانی فاصلہ کم ہوا تو دونوں مفلوک الحال مسافروں نے حیرت سے دیکھا کہ چار گھڑ سوار ایک خوبصورت سی تنومند جوان بیلوں کی جوڑی اپنے درمیان رکھے ہوئے بڑی سُرعت سے ان کی جانب بڑھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ فرطِ جذبات سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں کہ آخر اللہ کریم نے ان یتیموں آفت زدوں کی فریادوں

کو سُن لیا تھا۔

آنے والوں نے مسکراتے چہروں اور نہایت پُروقار انداز سے بیان کیا کہ ہم یہاں سے اک خاصے فاصلے پہ تلمیڈ بوک کی جاگیر کے فرستادے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی خودمختار جاگیر ہے اور جس جگہ آپ ابھی کھڑے ہیں' یہ علاقہ بھی اسی جاگیر کا حصہ ہے۔ اس جاگیر کے بلند مرتبت جاگیردار فرینکس بوک نے آپ کے لئے یہ تازہ دم بیلوں کی جوڑی اور ناشتہ کے لئے توشہ بھیجا ہے اور ہمیں پابند کیا ہے کہ ہم آپ کو باسہولت ان کی بارگاہ تک پہنچائیں...... پیغام دینے والا توشہ دان ان کی جانب بڑھاتے ہوئے مزید کہنے لگا کہ میرا نام نُورکیم لی ہے' میں اس چار رُکنی دستے کا کمانڈر ہوں۔ آپ ناشتے سے فارغ ہوں' اتنے میں ہم کاروان کو دیکھتے ہیں...... توشہ دان تھام کر وہ دونوں ایک کنارے پہ بیٹھ گئے۔ گرم گرم قتلے اور بُھنے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو نے انہیں بے صبرا سا کر دیا تھا۔

کئی دنوں کی نیم فاقہ مستی کے بعد آج یہ پُرتکلف توشہ نصیب ہوا تھا۔ چمڑے اور نمدے کے توشہ دان میں کھانا ایسا گرم تھا جیسے ابھی ابھی چُولہے سے اُترا ہو۔ اس سے پہلے کہ لقمہ منہ میں رکھتے' وہ لقمہ اُٹھائے ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے کہ حلال ہے یا حرام' کہیں ہم مارے نہ جائیں؟...... فوراً ہی اس شخص نے کاروان کے آگے کھڑے ہوئے کہا۔

"آپ اطمینان سے ناشتہ کریں' اس طعام میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں ہے جو بحیثیتِ مسلمان آپ نہ کھا سکیں......"

پھر تو وہ کھانے پہ جیسے ٹوٹ ہی پڑے۔ ایسا لذیذ کھانا کئی دنوں بعد جو نصیب ہوا...... خوب پیٹ بھرنے کے باوجود بھی توشہ دان میں ابھی بہت سا طعام موجود تھا۔ فراغت کے بعد وہ بھی ان مہربانوں کے ساتھ کاروان کو کیچڑ سے نکالنے پہ جُٹ گئے۔ خاصی تگ ودو کے بعد وہ ان کے ساتھ نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو لیے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے' موسم اور اردگرد کا ماحول خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔ سرسبز فصلوں' پھلوں پھولوں' سبزیوں سے بھرے ہوئے کھیت' درختوں کے ذخیرے' دیہاتی طرز کے کشادہ کشادہ خوبصورت مکان اور انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھوں سے خوش آمدید کا اظہار کرتے ہوئے کُشادہ جبیں' صحت مند لوگ' پھولوں سے بچے' مویشی چوپائے...... مزید آگے بڑھے تو ایک دم وہ جیسے کسی گنجان خوشحال سے قصبے میں پہنچ گئے ہوں۔ مختلف پیشہ ور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔ ہوا اور فضا میں سمندر کی مخصوص خوشبو اور نمی سے محسوس ہوتا تھا کہ سمندر کہیں بہت ہی نزدیک ہے...... آگے آگے چار گھڑسوار اور پیچھے پیچھے وہ کاروان پہ سوار پوری بستی سے گزر گئے مگر ابھی تک کہیں رُکنے کی نوبت

نہیں آئی تھی...... آگے پھر میدان اور کھیت سے آ گئے۔ دُور ایک پکّی سی چاردیواری کی اوٹ میں ایک چھوٹا سا مکان دِکھائی دیا' یہ سب شاید اسی طرف جا رہے تھے۔ اُدھر گھوڑے رُکتے ہی احمد دینار نے بھی کاروان روک لیا' وہی بارُعب شخص نیچے اُتر کر ان کے پاس آیا۔

''یہ جگہ آپ کے لئے مختص ہے...... آپ اور اِن بیلوں کی ہر ضرورت کی چیز اندر موجود ہے' ایک خدمت گار بھی آپ کو مہیا کر دیا جائے گا۔ آپ جب تک چاہیں' اس جاگیر میں مہمان کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں اور اگر آپ یہاں صرف اپنی دلچسپی اور ذاتی مفاد کی خاطر اپنا آہن گری کا کام کسی بھی سطح پہ کرنا چاہیں تو آپ کو مکمل آزادی ہوگی۔ اس کے لئے ضرورت کی اشیاء آپ کو یہاں دستیاب ہو جائیں گی...... اور ہاں' ہمارے جلیل القدر مالک و جاگیردار فرینکس بوک ہر پندرواڑے اپنے محل میں اپنی رعایا' مہمانوں اور دیگر خاص خاص لوگوں کو شرفِ باریابی بخشتے ہیں۔ نئے آنے والے مہمانوں کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ حشمت مآب فرینکس بوک سے اظہارِ وفاداری اور استواری کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق نذر گزاریں اور ان کے شایانِ شان الفاظ و انداز میں اظہارِ ممنونیت و تشکر کرنا پسند کریں۔''

وہ وہیں اپنے کاروان میں بیٹھے ان چاروں فرستادوں کو واپس جاتے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ تو اُن [illegible] میں آیا ہے' ناشتہ' بیلوں کی جوڑی' رہنے کے لئے یہ کشادہ' علیحدہ سا مہمان خانہ' کام کرنے کی سہولت' کام کاج کے لئے ملازم' گھر کا پورا ساز و سامان اور پھر جاگیردار سے ملاقات کے وقت نذر گزارنا اور اس کی شان میں قصیدے پڑھنا وغیرہ...... جب دونوں کے پلّے کچھ نہ پڑا تو وہ بیلوں کو ہشکار کر چاردیواری کے اندر لے آئے۔ ایک مناسب سی جگہ درختوں کے نیچے اُنہوں نے کاروان کھڑا کر کے بیلوں کو کھول کر باڑے میں دھکیل دیا۔ ان کے لئے چارہ گھاس وہاں پہلے سے ہی موجود تھا' پانی کی ناند آگے سرکا کر دونوں سادہ سے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ پہاڑی تراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے کمرے' نہانے دھونے کے لئے علیحدہ جگہ' دالان اور پیچھے خاصا وسیع باغ جس میں بہت سے ثمربار درخت استادہ تھے۔ کمروں میں فرشوں پہ چٹائیاں' تکیے اور موٹی موٹی چادریں' کھانا پکانے کی جگہ دالان کی ایک کونے میں تھی۔ پکانے کے برتن' چولہا اور گھر کا پورا سامان وہاں موجود تھا۔ کبیر علی سے نہ رہا گیا' بولا۔

''برادر! یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالا ہے...... ہم ناداروں خستہ حالوں کے ساتھ ایسا اپنائیت اور خلوص بھرا سلوک؟...... اگر کچھ تمہارے پلّے پڑا ہو تو مجھے بھی سمجھاؤ......؟''

احمد دینار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک منڈیر پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھائی! اللہ مسبب الاسباب ہے' اس نے ہمارے رزق پانی کا وسیلہ پیدا کر دیا ہے۔ اب ہاتھ سے محنت مشقت کریں گے' کمائیں گے اور کھائیں گے۔ ہم کوئی بھیک منگے تو ہیں نہیں جو اِن کے دَر پہ پڑے مُفت کی روٹیاں توڑیں گے...... اور ہاں بھائی' کثیر علی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ کل کلاں اگر ہمیں جاگیردار صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا تو ہم اُنھیں نذر میں کیا پیش کریں گے؟"

کثیر علی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو...... یہ سامنے کاروان کے اندر ہمارا سب کچھ دَھرا پڑا ہے جو ہم دونوں کا دیکھا بھالا ہے۔ کپڑے چیتھڑے' توشکیں' چند ایک چمڑے اور چوب کے صندوق۔ اَوزار' ایندھن اور فالتو قسم کا بہت سا کاٹھ کباڑ' اس کے علاوہ اگر کوئی نادر اور نفیس چیز یہاں موجود ہو تو بتاؤ......؟"

"ہاں' یہ سب کچھ جو تم نے گنوایا ہے سب کاٹھ کباڑ ہی تو ہے مگر چند ایک چیزیں نادر و نفیس ہی نہیں بلکہ بہت ہی قیمتی' نایاب اور مقدس بھی ہیں جیسے اللہ کی کتاب عظیم' مصلّے اور تسبیحیں جن پہ ہمارے والدین کے سجدوں' ہاتھوں' انگلیوں کے نشان اور اُن کے جسموں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ وہ روغنِ زیتون سے خوب روشن ہونے والا چراغ جس کی پاکیزہ سی روشنی میں میری ماں مجھے گود میں لیے قرآن پاک کی تلاوت کر کے مجھے پھونکا کرتی تھی۔ ہمارے اوزار آلات' آگ کی بھٹی' چمڑے کی دھونکنی' ہتھوڑے' سندلیاں' چھینیاں اور اُونٹ کے چمڑے کا وہ توبڑا جس میں میلا کچیلا پانی پڑا رہتا ہے اور ہم سُرخ لوہے کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ وہ چاند تارہ جسے میں نے اپنے باپ سے چُھپ کر بغیر کسی کی مدد لیے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور پھر میری ماں نے بڑے فخر سے میرے باپ کو دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دینار کی پہلی کاوش ہے۔ دیکھو کیسا خوبصورت اور نوک پلک سے دُرست چاند تارہ بنایا ہے۔ میرا بیٹا ایک دن تم سے بھی بڑا ہُنر مند ہوگا۔ اِنشاء اللہ...... میرے باپ نے میری محنت اور ہُنرمندی کو سراہتے ہوئے مجھے شاباش دی تھی اور چاند تارے کو کاروان کے ماتھے کا جُھومر بنا کر سجا دیا تھا...... کثیر علی! دیکھا تم نے کہ کیسی کیسی نادر' مقدس اور قیمتی چیزیں' یادیں اور خوشبوئیں یہاں اس کاروان میں موجود ہیں......"

کثیر علی نے احمد دینار کے کاندھے پہ دلجوئی کی خاطر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو بھی کہا' بالکل سچ کہا اور میں نے بھی صحیح کہا تھا کہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو...... یہ بات بھی تم یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہو گے کہ یہ ساری مہربانیاں اسی شعلہ رُو نیک خُو لڑکی کی جانب سے ہیں جو آج صبح ہی صبح ہمیں رحمت کا فرشتہ بن کر سرِراہ ملی تھی......"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو......؟" احمد دینار نے اِسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی! ذرا دھیان دو تو ساری بات تمہاری سمجھ میں اُتر آئے گی...... وہ لڑکی جو کہیں سے بھی آ رہی تھی' اُس راستے سے گزرتے ہوئے اُس نے ہمیں اس کسمپرسی کے حال میں دیکھا کہ ہم خراب موسم اور گردشِ حالات کے مارے ہوئے یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ باپ بھی مر گیا اور بیل بھی' زندگی اور گاڑی کھینچنے والے دونوں ہی ہم نوعمر بچوں کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ فاقے بھی کڑی دھوپ کی طرح اُترے ہوئے ہیں اور اس ویرانے میں ہم بے یارومددگار پڑے ہوئے ہیں تو وہ نیک دل لڑکی مزید وقت برباد کئے بغیر وہاں سے اُڑتی ہوئی یہاں پہنچی اور فوراً ہمیں ضروری امداد بھجوائی۔ اب اگر میری بات قرینِ قیاس دکھائی نہ دے تو بات کرو......؟''

احمد دینار بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس نوعمر یتیم لڑکے کی ذہانت سے بھرپور باتیں سُن رہا تھا جس کی ماں اسے اُن کے سپرد کر کے اُس کی پرورش سے دستبردار ہوگئی تھی اور جسے زمانے کے سرد گرم نے اس چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے تلخ وشیریں تجربوں کے پُلوں کے نیچے سے بہتے ہوئے پانی کی مانند گزار دیا تھا...... احمد دینار قدرے متانت سے کہنے لگا۔

''اس ضمن میں کوئی اور بات......؟''

''ہاں...... وہ لڑکی اُس جاگیردار کی بیٹی ہے یا پھر بہن بیوی نہیں ہوسکتی۔ مزید یہ کہ لڑکی مسلمان ہے یا پھر مسلمانوں کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے''......

کثیر علی یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور انتظار کرنے لگا کہ اب دیکھیں' احمد دینار کیا جواب دیتا ہے یا ان باتوں کا اُس پہ کیا ردِعمل ہوتا ہے؟...... بہت سا وقت دونوں کے درمیان چُپ چاپ گزر گیا۔ احمد دینار اس سے نظریں ہٹا کر دُور خلاؤں میں گھورنے لگا تھا اور کثیر علی ایک تنکے سے زمین کُریدنے لگا۔ اچانک احمد دینار نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''...... اور کچھ آگے......؟''

اُسے کثیر علی کی باتوں سے سکون مل رہا تھا یا وہ چاہ رہا تھا کہ اُس لڑکی کے بارے میں سُنتا رہے...... کثیر علی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے خاموش ہی رہا۔ احمد دینار سے جیسے رہا نہ گیا' وہ پھر بولا۔

''بھائی! اس کے آگے کچھ ہے یا تمہاری بات ختم سمجھوں......؟''

کثیر علی مسکرایا' پھر کہنے لگا۔

''ہاں' صرف ایک بات آخری رہ گئی ہے مگر وہ نہ ہی کروں تو بہتر ہے......''

''وہ بھی کہہ گزرو بھائی! کہ ہاتھی کے ساتھ دُم بھی نکل جانے دو......''

''بُرا تو نہیں مانو گے......؟'' کثیر علی نے اُسے شرارت بھری نظروں سے تولتے ہوئے پوچھا۔
''کیا تم مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہو' اور پھر کون سی ایسی بات ہو گی جو تم مجھے کہو گے اور میں بُرا مان جاؤں گا؟...... جلدی کہہ ڈالو......''
''وہ...... یعنی میرا مطلب ہے کہ وہ لڑکی تمہاری ذات سے کچھ دلچسپی سی لیتی محسوس ہوتی ہے' اب تم اِسے میرا وہم ہی کہہ لو کہ مجھے تم بھی اسی مرض میں مبتلا دکھائی دیتے ہو......؟'' کثیر علی جیسے ڈرتے ڈرتے بولا۔
''کھودا پہاڑ نکلا چوہا' بس یہ بات تھی جسے تم کہتے ہوئے جھجک رہے تھے...... بھائی! پہلی بار آپس میں ملنے والے ایک دوسرے کو جاننے کے لئے آپس میں دلچسپی تو لیتے ہی ہیں' اس طرح ایک دوجے کو سمجھنے جاننے میں مدد ملتی ہے...... ویسے کثیر علی! بات کا بتنگڑ بنانا اور بال کی کھال اُتارنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ گھاس پھونس اور پر تنکے اکٹھے کر کے مُرغ زرّیں بنا کر اُڑانا اور دھاگے سے دھاگہ جوڑنا تمہیں خوب آتا ہے لیکن ایک بات ہے کہ تم نے اِس بات کے علاوہ جو باتیں کہی ہیں' وہ مجھے بھی دُرست معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ اُسی لڑکی کا مرہونِ منّت ہے......''
احمد [illegible] گا۔
''مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ بہت جلد ہمیں جاگیردار کے سامنے پیش ہونا پڑے گا...... اب صرف یہ سوچو کہ ہم نذرانہ یا تحفہ کون سا پیش کریں گے...... ویسے بھی جس کی عملداری میں ہمارے ساتھ ایسا کریمانہ سلوک ہوا ہے' ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اُس کی مہربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔''
کثیر علی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
''بالکل دُرست' مگر حاضری اور کچھ نذر گزرانے کے لئے ہمیں اُس وقت فوری طور پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے دو چار روز اپنی تھکن اور کسلمندی دُور کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اِس جگہ کو اپنی ضرورت کے مطابق کوئی شکل بھی دے لیتے ہیں۔ آگ کی بھٹّی' سان سُنت' دیگر سامان اوزار' پانی کی ناند وغیرہ جماتے ہیں اور پھر جب جسم ٹھکانا اور دماغ ذرا سکون پکڑ لیں تو پھر سوچیں گے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟...... اِن لوگوں کو بھی پتہ ہے کہ ہم پریشان اور تھکے ٹوٹے ہوئے ہیں' پانچ سات روز سے پہلے وہ بھی ہمیں نہیں چھیڑیں گے......''
سارا دِن وہ اپنے اِس نئے ٹھکانے کو اپنی ضرورت' سوچ اور بساط کے مطابق ٹھیک ٹھاک کرتے رہے۔ لیپا پوچی' چنائی کر کے ایک کونے میں آگ کی بھٹّی بنائی' پتھروں کو جما کر اُوپر دو وکش اُٹھایا۔ زمین

کو ہموار کر کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کا فرش تیار کر دیا۔ اپنے کاروان سے آہن گری کا متعلقہ سامان اُتار کر مناسب جگہوں پہ رکھا' پھر باورچی خانے میں موجود کھانے پینے کے سامان سے ہلکا پھلکا کھانا تیار کیا' بیل کو چارہ ڈالا اور رات ابھی ایسی گہری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ تھکن سے چُور فرش پہ نرم نرم گھاس کے بچھونے پہ ڈھے سے گئے۔ کثیر علی تو کمر لگاتے ہی ٹُن ہو گیا تھا لیکن احمد دینار!...... اس کا جسم تو شاید آرام پکڑ گیا ہو مگر دل و دماغ اور ستارہ سی تابندہ آنکھیں جاگ رہی تھیں جیسے اِن کے دھڑکنے' کھلنے اور جاگنے کا سماں اب لگا ہو۔

یہ خواب گاہ بھی بستی کی دیگر گھر گھروندوں کی طرح قبہ نما تھی۔ پرانے ہسپانیہ میں بھی ایسی قبہ نما آماجگائیں اکثر نظر آتی تھیں۔ اب بھی یہ اندازِ تعمیر بلوچستان' ایران کے مضافات اور بصرہ' سکندریہ کے نواح اور تُرکی کے سرحدی علاقوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرزِ تعمیر میں چھت پہ لکڑی' لوہے یا سیمنٹ کے شہتیر نہیں ڈالے جاتے بلکہ مسجد کے گنبد کی طرح گولائی میں اینٹ پہ اینٹ یا پتھر پہ پتھر بڑھاتے ہوئے گول اُٹھتی ہوئی قبہ نما چھت تیار کر دی جاتی ہے۔ یہ چھت انتہائی مضبوط اور گرم و سرد آب و ہوا میں معتدل رہنے والی ہوتی ہے اور نہ ہی موسموں کے اثرات سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے۔

یہ کمرہ بھی [illegible] تھا۔ اندر [illegible] اور گنبد چھت بھی [illegible] کے اندر [illegible] سے نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے طاق پہ روغنِ زیتون سے روشن چراغ کی اُتری ہوئی لَو جب قریب سمندر کی چنچل ہوا کے کسی شریر جھونکے سے کپکپا سی اُٹھتی تو پھر جیسے کمرے کے اندر سوئے جاگے سایوں اور دُھندلکوں کے سارے سائبان پھڑپھڑانے لگتے' در و دیوار پہ لرزہ اور چوبی ستون کا سایہ کسی ڈگمگاتے ہوئے مستول کی مانند ڈانواں ڈول ہونے لگتا۔ اس کے سر کے نیچے ہلکی ہلکی سی بھینی بھینی مہک والی' خواب آور شامی گھاس کا تکیہ تھا جس پہ صرف سر ٹکانے اور چند ایک ہموار سی سانسیں لینے کی شرط ہوتی ہے' لیٹنے والا لمحوں میں نیند کی پُرکیف اور پُرسکون وادیوں میں اُتر جاتا ہے مگر یہاں تو احمد دینار کُھلے مے خانوں سی آنکھیں کھولے کانپتے لرزتے اور جھکولے کھاتے ہوئے سایوں کا تماشا دیکھنے میں مگن تھا۔

مکان خالی ہو تو جن بھوت آ جاتے ہیں۔ پیٹ خالی ہو تو اِنسان دِین دُنیا' اخلاق قانون' حرام حلال' اچھائی بُرائی سے بیزار ہونے لگتا ہے۔ دِل و دماغ خالی ہو تو شیطان آ بسرام کرتا ہے اور جب کوئی اِنسان نیند سے خالی خالی آنکھیں لئے ہوئے دِکھائی دے تو جان لینا چاہیے کہ وہ کسی کے انتظار میں ہے یا پھر کسی پیار بیوپار میں ہے۔ اُسے اپنی اس موجودہ کیفیت کا صحیح اندازہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ تو اِس قبیل کا بندہ نہیں تھا...... دُنیا کے سارے عاشق یا اِس راستے کے راہی فطرتاً بڑے شرمیلے' شریف الطبع'

بہادر، جفاکش اور بھولے بھالے واقع ہوئے ہیں۔ پیار و یار، ہجر و وصال کی لذتوں اور عہد و پیاں کی بندشوں سے بہت دُور مگر کیا کہیئے کہ یہی لوگ دُنیائے عشق میں بڑی بڑی داستانیں چھوڑ گئے۔ بادشاہ، شہزادے، ولی عہد، امیر وزیر، سلاطین اس وادئ عہد و وفا میں اُترتے ہی رہے ہیں لیکن غلاموں، اسیروں، جنگجوؤں، ہُنرمندوں و معاش کشوں اور خانہ زاد پروردوں میں بھی بڑے بڑے ''عشق دانے'' یکتا و یافت ہوئے۔ یعنی آنکھ اور دل لڑنے اور ٹھکنے سے پہلے ذات پات، اوقات اور آغاز انجام نہیں دیکھے جاتے، بس اپنے آپ ہر چیز سے بے نیاز و بے لحاظ یہ کام ہو جاتا ہے۔ ''بُھک نہ دیکھے سالنا، تے عشق نہ تکّے ذات'' والی بات ہوتی ہے۔

یہ احمد دینار بھی صبح جب سے وہ مہ رُو ملی تھی، ایک لمحہ کے لئے بھی اسے اپنی آنکھوں اور خیالوں سے ہٹا نہیں سکا تھا۔ جونہی اس پری جمال کا تصوّر ذرا دُھندلا پڑتا، وہ پھر کرید کرید کر اُس کے روشن اور ملکوتی حُسن کو اپنے دماغ میں اُجال لیتا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خوش خصال اُسی کے جسم و جاں کا ایک اٹوٹ انگ رہی ہو۔ اُس سے کوئی ایسا راہ و ربط ہے جو آپس میں مشترک ہو۔ اُس کو دیکھنے سے پہلے وہ جو بھی تھا مگر ایسا عالم تھا کہ نہیں، اُس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں۔ نیند نہ سکون، بھوک نہ پیاس، آرام نہ چین، جیسے سب کچھ بے معنی اور بے کار سے ہو کر رہ گئے ہوں...... جب انسان خودلذتی کا عادی یا خوگر ہو جاتا ہے تو پھر اسے کسی خارجی ذات کے حوالے سے کوئی بھی راحت و لذت مزہ نہیں دیتی خواہ وہ خودلذتی جنسی، جسمانی ہو یا بطونی اور رُوحانی ہو۔ کسی اندرونی چوٹ کی ہو یا کسی ٹوٹے ہوئے سنگوٹ کی ہو۔ کسی کی یاد یا کسی گلا گھونٹی ہوئی فریاد کی ہو، خیالی پلاؤ پکانا، احمقوں کی جنت کی سیر، شیخ چلی کے خواب، بے ثمر خواہشوں آرزوؤں کے گلزار کھلانا اور دُشمنوں مخالفوں، دولت مندوں کو تہہ تیغ کرنا، انہیں اپنے تلوے چاٹتے ہوئے دیکھنا، اس قسم کی تمام خودلذتیاں عاشقوں، بے روزگاروں، بے ہمت و جرأت، بے وسائل، جنسی اور نفسیاتی مریضوں، ملنگوں، نام نہاد صوفیوں، نشیوں کو بڑا شاد کام رکھتی ہیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری، انسان خود بخود ہنستا مسکراتا، منہ بسورتا، لپکتا جھپکتا رہتا ہے، یہ مقدور نہ ہو تو پھر کسی بھی سامنے والی چیز کو نشانہ بنا کر تاڑتا رہتا ہے، بظاہر بے حس و حرکت مگر اس کی اندر معرکہ آرائی جاری رہتی ہے۔ جو عملاً نہیں کر سکتا یا نہیں کر پاتا، اس طرح وہ خیالوں اور تصوّر میں کر کے اپنے آپ کو خوش کر لیتا ہے۔ یہی خودلذتی کہلاتی ہے جس کے ڈانڈے آگے بڑھ کر خود پسندی یعنی نرگسیت سے جا ملتے ہیں۔

نئی جگہ، نیا قیام، نئی لذت، نیا تجربہ...... وہ بھول ہی گیا کہ ابھی کچھ روز پہلے اس کے ماں باپ یکے بعد دیگرے اسے چھوڑ کر دوسری دُنیا میں چلے گئے۔ اس نے کیسی بے چارگی اور کسمپرسی کے کیسے کیسے

شب و روز بسر کیے۔ درختوں کے پتّے اور کھیتوں کی گھاس ڈنٹھل کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی مگر کیا کہیے کہ اس پَری وش کے حُسنِ جہاں سُوز نے اسے چشم زدن میں ان تمام تلخیوں اور اعصاب شکن محرومیوں کے احساس سے بیگانہ کر دیا تھا جنھیں وہ عام حالات میں شاید مُدتوں فراموش نہ کر پاتا۔ جانئے کہ یہ اعجاز آنکھ لڑنے اور دل کے بھڑنے کا ہی تو ہوسکتا ہے...... کروٹیں بدل بدل وہ ہار چکا تھا۔ بائیں جانب کبیر علی گھوڑے گدھے بیچ کر سویا ہوا تھا' اسے دیکھتے ہی وہ فوری کروٹ بدل لیتا۔ دائیں جانب شاید سمندر تھا' ہلکی ہلکی خنک ہوا اس کے گال تھپتھپانے لگتی۔ شاید باہر چاند بھی اُوپر اُٹھ آیا تھا' نرم نرم چاندنی کا احساس ہوتے ہی وہ سہل سا کھڑکی کے پاس اُٹھ آیا۔ ادھ کُھلی کھڑکی پوری کھول کر اب وہ باہر صحن میں کِھلی ہوئی چاندنی کا نظارہ کرنے لگا۔ سمندری کُونجوں کی ڈار عین اس کی سر کے اُوپر سے پرواز کرتی ہوئی شاید سمندر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہولے سے دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں نکل آیا تھا۔ دُور کھڑے جُگالی کرتے ہوئے بیل نے اس کی آمد کو محسوس کرتے ہوئے ہولے سے ہنکارہ بھرتے ہوئے اسے سلام پیش کیا اور اپنی گردن میں پڑی ہوئی کانسی کی گھنٹیوں سے ہلکا سا جلترنگ بجا کر اُسے' اس وقت باہر صحن میں نکلنے پہ شادیانہ بجایا تو احمد دینار مسکراتے ہوئے اس کے تھان پہ آ لگا' اور پیار سے پچکارتے ہوئے اس کے کوہان کو سہلانے لگا۔

کُھلے صاف آسمان پہ تیرتے ہوئے روئی گالوں جیسے ابر پارے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ گو یہ جگہ بستی سے خاصی ہٹ کر تھی' لیکن چاندنی کے ملگجے اُجالے میں وہ کافی دُور تک دیکھ سکتا تھا۔ ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پہ بنے ہوئے کشادہ اور خوش نظر مکانات' باغیچے' مویشی باڑے' کھیت کھلواڑے' ذخیرہ کوٹھڑیاں' صاف ستھرے راستے' دُور سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی نمائشی مثالی گاؤں' بستی یا پھر کسی خوابوں کی سرزمین کی جانب آ نکلا ہو جہاں سکون ہی سکون ہے' طمانیت اور انبساط کا دَور دَورہ ہے۔ جہاں قدرت' فطرت' اخلاق و محبت اور شرافت و انسانیت کی بنیادی بہبود و برکات کی خوشبوؤں کی حکمرانی ہے۔ زمین کے دفینے' آسمان کے نگینے اور سمندر کے خزینے یہاں کے مکینوں پہ مہربان ہیں...... وہ یہی کچھ سوچتا' محسوس کرتا اور دیکھتا ہوا صحن سے باہر نکل آیا۔ سوئی ہوئی زمین' اونگھتے ہوئے آسمان اور جاگتے ہوئے سمندر' تینوں کی ملی جُلی مہکاروں نے اُسے بے خود سا کر دیا تھا۔

یہ تو کوئی مجھ سے پوچھے یا اِن شب خیزوں اور شب پیاؤں سے جو بیدار ہی رات کو ہوتے ہیں۔ پھر وہ اِن راستوں پہ نکلتے ہیں جہاں اندھیرے' خاموشیاں' ویرانیاں' تنہائیاں' حادثات' اَسرار' سماوی اور

افلاکی خیر و شر کی قوتیں، نساچ، شب رَوئیں، بھوت پریت، جنات، حشرات الارض اور آفات الافلاک قدم قدم ان کے منتظر اور نظر نظر ان کے مقابل ہوتے ہیں۔ راتوں کو جاگنے اور مصروفِ عمل رہنے والے چوکیدار، روگی، کُتے، درویش اور عابدِ شب زندہ دار کے پاس اندیشہ ہائے سُود و زیاں، ظاہر و پنہاں، حال و جال اور توضیحِ زمین و آسمان کا کوئی تکلف و تردد نہیں ہوتا۔ ان کی قریب کوئی چیز نہیں آتی اور یہ ہر چیز کے سر پہ پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو زمین و آسمان کی وہ ''چیزیں'' بھی دکھائی دیتی ہیں جو اور کسی کو دکھائی نہیں دیتیں۔ (استثنٰی کے ساتھ......)

اُسے یوں لگا گویا وہ اس بھری بستی میں اکیلا ہی اس سمے جاگ رہا ہو، باقی تمام سوئے ہوئے ہوں۔ کوئی پرندہ، جگنو، مچھر، مکھی، یہاں تک کہ کوئی تتلی تک اُسے راہ راستے میں کہیں دکھائی نہ دیے اور نہ ہی اُسے معلوم تھا کہ وہ کس راہ پہ آ لگا ہے؟ بس وہ ایک نیند میں چلنے والے مریض کی مانند منہ اُٹھائے ہوئے اس راستے پہ ہو لیا جو اُس کے گھر کے سامنے کسی نامعلوم جانب کھلا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر چلنے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ کہیں سمندر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سمندر کی شوریدہ موجوں کا شور ہوا اور فضا میں سمندر کی مخصوص خوشبو، نمی اور تازگی نے اُسے لپکا سا دیا..... آگے کچھ چڑھائی سی آ گئی، راستہ کشادہ مگر پتھریلا سا تھا۔ ایک طویل موڑ کاٹ کر جب وہ اوپر ایک بڑے سے سرسبز میدان میں آ نکلا تو چاند عین اُس کے ماتھے کے سامنے جگمگا رہا تھا اور بہت پرے نیچے پُرہیبت گہرا سبز مائل سمندر قالین کی مانند بچھا ہوا تھا۔ ابھی وہ منظر سے آنکھ بھی اُٹھا نہ پایا تھا کہ لرزتی بجلی کے لپکتے کوندے کی مانند ایک عظیم الجثہ تازی گھوڑا، خوفناک آواز میں ہنہناتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ایسا سربلند گھوڑا کہ احمد دینار کا سَر اس کے سینے سے کچھ ہی نیچے رہ گیا۔ اس کی اگلی دونوں ٹانگیں پوری ایک منزل اوپر کا احاطہ کیے تھیں، یوں تھا کہ گویا گھوڑا سامنے چاند سے پھلانگ کر چشم زدن میں زن سے اُس کے سامنے آ ٹکا ہو۔ وہ یکبارگی کئی قدم پیچھے ہو لیا۔ دیوہیکل تازی نے اگلے پاؤں پٹکے تو دھانی سی ایک اَبلا پری چھلانگتی ہوئی اس کے رُوبرو تھی۔ کاکلوں کا آسودہ اَبریشم اس کے سیمیں سراپے پہ غبار کی مانند اُمڈا پڑا تھا، چمڑے کا چست لباس جیسا کہ سرکس کی بازی گر لڑکیاں پہنتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک شمشیرِ براں تھی۔ ایسی شمشیر، شمشیر زنی کی مشق میں یا پھر کہیں گھڑسواری کی تیز رفتاری میں اسپِ زیرِ زانو کو ہشکارنے اور زقندانے میں کام آتی ہے...... وہ مسکراتی ہوئی ایک اَدائے دلبری کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی، اتنا آگے کہ اس کے نتھنے سے ستواں ناک کے پھڑپھڑاتے نتھنوں سے تارِ نفس ہلکے سے ہلتا ہوا بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے......'' آنکھیں جھپکائے بغیر اچانک اس نے کہہ دیا تھا۔

''میرا نام پازوکا بوک ہے' یہاں کے جلیل القدر جاگیردار فرینکس بوک کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا مہربان باپ اس لحاظ سے دُنیا کا بدنصیب انسان ہے کہ وہ آنکھوں سے اندھا' مُنہ سے گونگا اور کانوں سے بہرہ ہے...... '' وہ یکدم پلٹ کر چاند کی جانب دیکھتے ہوئے پھر بولنے لگی۔ ''میں ہی اُس کی آنکھیں' زبان اور کان ہوں بلکہ میں ہی اُس کا دماغ' طاقت اور آخری اُمید بھی ہوں...... '' دو قدم سمندر کی طرف بڑھ کر پھر بتانے لگی۔ '' یہاں سے چالیس فرلوس پرے' سمندر کے بیچ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں کا حکمران میرا چچازاد ہے جو بڑا مکار' عیاش' ضدی اور جنگجو ہے۔ وہ ہماری اس جاگیر پہ اپنی حریصانہ نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ وہ مجھے اپنی ملکہ بنا کر یہاں کی ہر چیز پہ قبضہ کرنا چاہتا ہے مگر...... '' وہ بجلی کی سی سُرعت سے اُس کے رُوبرو کھڑی ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الفاظ چباتے ہوئے کہنے لگی۔ '' مگر میں اُس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی...... '' پھر یکدم جیسے اُسے دورہ پڑا' وہ ہوا میں شمشیر زنی کرنے لگی گویا کئی شمشیر زنوں میں گھری ہوئی ہے اور ایسے میں وہ اکیلی اُن سے نبرد آزما ہونے کے بعد دیگرے سب کو تہہ تیغ کرنے کے بعد وہ اچانک بائیں ہاتھ سے نوک پکڑے ہوئے شمشیرِ بُراں کا نیم دائرہ سا بنا کر احمد دینار کی جانب دیکھتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہنے لگی۔ ''میں اس پاگل کُتے کی آنکھیں سب سے پہلے اس طرح نکالوں گی......''

پھر ایک خوفناک چیخ اس کے مُنہ سے نکلی اور گھوڑا یوں بگٹٹ اُچھل کر بھاگا گویا اُس نے اندھیرے میں بھوت دیکھ لیا ہو مگر وہ خود احمد دینار کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے وہیں کھڑی تھی اور شمشیرِ بُراں بھی نیم دائرے کی صورت کھنچی ہوئی اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھی' جوں ہی گھوڑے نے آدھا دائرہ اندھا دُھند بھاگتے ہوئے پورا کیا اور دائیں جانب برابر پہنچا ہی تھا کہ بغیر اِدھر دیکھے کھنچی ہوئی شمشیر کی نوک اس نے چھوڑ دی۔ شمشیر تڑپ کر اُچھلی اور اپنے ہی زور پر گھوڑے کی جانب لپکی۔ اگلے ہی لمحہ وہ گھوڑے کی بائیں آنکھ سے دائیں آنکھ کے پار تھی' شمشیر کا دستِ قبض نہ ہوتا تو تیر کی طرح دوسری جانب سالم ہی نکل جاتی۔ بدمست گھوڑا اپنی رَوش اور زور میں بہت دُور تک بھاگتا چلا گیا۔ اُسے تو احساس تک بھی نہ ہوا ہوگا کہ ایک لحظ میں اپنے ڈیلے نکلوا چکا ہے اور اب وہ اندھیرے میں اندھا بھاگ رہا تھا۔ آخر وہ بہت آگے روشنی کے مینار کے قریب ایک پتھریلی دیوار سے ٹکرا کر ڈھے گیا...... احمد دینار کے تو دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ وہ ہنوز اُسے دیکھ رہی تھی جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو...... بہت سا ٹھٹھرا سہما سا وقت اِن دونوں کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔ احمد دینار اس کی عسکری تربیّت کا کمال دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔ وہ اِک سَراپا قیامت' آتش فشاں پہاڑ اور کانپتی کڑکتی بجلی سی بنی سامنے کھڑی تھی اور کچھ دیر پہلے جو

کچھ بھی اس نے اپنے بارے میں مختصر سا بتایا تھا اُسے سُن کر اور اس کے ارادے خیالات اور یہ گھوڑے کی آنکھیں بغیر دیکھے نشانہ باندھنے نکالنے اور تلوار پھینکنے کی مشاقی اور اس کی پُھرتی نے احمد دینار کو خاص متاثر کیا تھا...... اِن دونوں کے درمیان ابھی تک خاموشی کی اتھلی سی دُھندتنی ہوئی تھی' شاید دونوں ہی ایک وُوجے کے بارے میں اپنی اپنی کھچڑی پکا رہے تھے۔ اچانک اسی قبیل کا ایک اور تازہ دم گھوڑا' مُنہ میں وہی شمشیر پکڑے سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور بڑی آہستگی اور تمیز سے سر جُھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا' شمشیر پہ تازہ تازہ خون کے نشان موجود تھے۔ پازوکا نے گھوڑے کی جانب بغیر دیکھے ہاتھ بڑھا کر اُس کے مُنہ سے شمشیر لے لی' اُسی کی اَیال سے خون صاف کرتے ہوئے پیار سے گھوڑے کو پُچکارا۔ پھر اُس کے ماتھے اور تھوتھنی پہ ہاتھ پھیرتی ہوئے احمد دینار سے پوچھنے لگی۔

''تمہارے کاروان کے ماتھے پہ ایک خوبصورت سا چاند تارہ سجا ہوا ہے......''

احمد دینار فوراً بول اُٹھا۔ ''ہاں' وہ چاند تارہ میں نے بنایا ہے...... آہن گری سیکھنے کے بعد جو چیز میں نے سب سے پہلے بنائی تھی' وہ یہی چاند تارہ تھی۔ میری مرحوم ماں نے میرے ننھے ننھے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا تھا کہ میرا فرزند بہت بڑا آہن گر بنے گا' میرا بیٹا اس کام میں ایسے ایسے نمونے بنائے گا جو پہلے کسی نے نہ بنائے ہوں......''

''احمد دینار! تمہاری ماں نے تمہارے متعلق بالکل صحیح پیش گوئی کی تھی' تم واقعی آہن گری میں ایسے نادر نمونے تخلیق کرو گے کہ آنے والے زمانے میں بھی تمہارا نام یاد رکھا جائے گا......''

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا......؟'' احمد دینار اُس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کر حیران ہوتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

وہ شمشیر بُرّاں کو دونوں ہاتھوں سے تولتے ہوئی بتانے لگی۔

''تمہارا نام چاند تارا کے نیچے لکھا ہوا تھا جس پہ میری اچانک نظر پڑ گئی تھی' پھر یہ کہ چاند تارہ کے ساتھ اسی کا نام ہی ہو سکتا ہے جس نے اسے تخلیق کیا ہو......''

''اِس کا مطلب ہے کہ آپ عربی پڑھنا جانتی ہیں......؟''

''ہاں' میں یقیناً عربی پڑھ سکتی ہوں بلکہ لکھ اور گزارے لائق بول بھی سکتی ہوں کیونکہ میری ماں مسلمان تھی...... خیر' تم اس وقت اس بات کو چھوڑو اور مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنی نئی سکونت گاہ پسند آئی اور یہاں کسی چیز کی کمی تو محسوس نہیں ہوئی؟...... یہاں کا موسم معتدل' زمینیں زرخیز' لوگ محبت کرنے والے ہنس مکھ اور یہاں کا جاگیردار مہربان ہے۔''

قدرے رنجیدہ اور سنجیدہ سے احمد دینار نے جواب میں کہا۔

''آپ بھی اپنے مہربان باپ کی طرح مہربان ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ میری پیشہ وارانہ ہنرمندی کی وجہ سے میری قدردان بھی ہیں اور جس عُجلت' عزت محبت سے آپ نے ہم مصیبت زدوں کی اعانت فرمائی اور ہمیں سہارا دیا' اس کے لئے ہم ہمیشہ آپ کے احسان مند رہیں گے اور تہہ دل سے یہ تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ محنت ہنر' جسم جان' جس طرح سے بھی بن پڑے' ہم آپ کی اطاعت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھیں اور ہمارا شمار آپ کے ادنیٰ سے جاںنثاروں میں ہو......''

پازوکا' احمد دینار کی مہر و وفا' ذہانت و فطانت کی خوشبو سے مہکتی ہوئی باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی' وہ دل ہی دل میں بڑی خوش ہو رہی تھی کہ اُسے احمد دینار کو کھوجنے اور پھر پہچاننے میں شمہ بھر بھی غلطی نہیں ہوئی' یہ یقیناً وہی تھا جسے اس نے کئی بار اپنے خواب میں دیکھا...... بچپن سے لے کر اب تک اُس نے ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھا' اتنی بار اور ایسا کہ اب اُسے دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ جیسے اُس کے نصیبوں میں صرف ایک ہی خواب لکھ دیا گیا تھا۔ بہت بڑا جنگل جس میں درخت' پہاڑ' جانور' جھاڑیاں' ندی نالے' پھل پھول' پتے' کانٹے' گھاس پھونس' غنچے' جھنڈ' درندے' سب کچھ لوہے کا ہے۔ ندی نالوں میں پانی کی بجائے پگھلا ہوا سیسہ بہتا ہے' غرضیکہ جہاں نظر جاتی ہے لوہا ہی لوہا...... اس جنگل کے درمیان ایک آتش فشاں لوہے کا پہاڑ ہے جس کے دہانے سے گرد و غبار کے غلیظ بادل سے نکلتے رہتے ہیں' چاند سورج کی کرنیں اور گرم ہوائیں بھی لوہے کے ذرات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس جنگل میں اس کے علاوہ ایک نوجوان ہے جو گوشت پوست کا بنا ہوا ہے لیکن وہ بھی آہن گر ہے۔ خدا جانے کہاں سے اس نے لکڑی اکٹھی کر کے ایک بڑا سا خوبصورت اور مضبوط رتھ بنایا ہوا ہے۔ اس رتھ کے آگے ماتھے پہ چاند ستارہ سجا ہوا ہے اور ساتھ کلمہ شریف بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ نوجوان چاہتا ہے کہ آتش فشاں زندہ ہونے سے پیشتر ہی وہ اس رتھ پہ سوار ہو کر اس آہنی جنگل سے کہیں بہت دُور نکل جائے۔ اس کے پاس رتھ کے آگے جوتنے کے لئے بیل نہیں ہیں۔ وہ ہر بار اسے بیلوں کی جوڑی دیتی ہے اس شرط پہ کہ وہ اُسے بھی اس لوہے کے جنگل سے نکال کر لے جائے مگر جونہی وہ بیلوں کی جوڑی' رتھ کے آگے جوتتا ہے' بیل فوراً لوہے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ جتنوں سے ایک اور جوڑی بیلوں کی تیار کرتی ہے مگر سب کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ غرضیکہ یہ کام وہ صدیوں سے کر رہی ہے...... یہی خواب وہ اک نہ ٹوٹنے والے تسلسل سے دیکھ رہی تھی جس کی تعبیر شاید اُسے احمد دینار کی صورت میں نظر آئی۔ احمد دینار کے ساتھ اُس کی یہ مہربانی بھی شاید اسی خواب پریشاں کی شاہد تھی۔ اُس نے صبح سے لے کر ایک گھنٹہ پہلے تک اپنے

خاص کارندوں سے کئی بار بیلوں کی حالت کی تصدیق کروائی تھی کہ بیل کہیں لوہے میں تو تبدیل نہیں ہو گئے؟...... احمد دینار اُس کی مسلسل خاموشی سے خوف زدہ سا ہو کر التجا بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''شہزادی صاحبہ! اگر اِس خستہ حال اور بے علم و بے ادب سے کوئی لفظ گستاخی کی ذیل میں نکل گیا ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں......''

وہ پاسِ ادب میں جواب کے انتظار میں سرنگوں سا ہو گیا...... ایک لمبا سا وقفہ خاموشی پھر درمیان میں آ کھڑا ہو گیا تھا۔ جب پازوکا اپنے خواب کے حصار و اثر سے باہر نکلی تو احمد دینار سراپا سپاس و نیاز بنا سامنے کھڑا تھا...... اس نے کیا کچھ پازوکا سے کہا' شاید پازوکا نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وہ اب اُسے کسی اور زاویہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی...... اُس کا کسی تناور شاہ بلوط کی مانند نکلتا ہوا قد' عربی النسل ہونے کے ناتے ملیح رنگت' روشن روشن واضح سے خدوخال' گھنگریالے سیاہ بال' اٹھتی ہوئی گردن پہ مضبوط جبڑا' چھریرا سا مگر مضبوط کاٹھی کا جسم' آنکھوں میں سیاہ موتیوں کی سی آب اور فراخ فروزاں ماتھے پہ اقبال مندی کی تب و تاب...... بالکل وہی خواب' وہی دُھواں دُھواں خدوخال...... یہ کچھ تصور میں آتے ہی وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ احمد دینار نظریں جھکائے یوں کھڑا تھا جیسے وہ اپنے کسی کردہ ناکردہ جرم کی سزا سننے کے لئے قاضی القضاۃ' مطلق العنان فرمانروا یا جابر و قاہر بادشاہِ عصر کے دربار میں اپنی قسمت کا شمشیر کی دھار پہ دھرے منتظر کھڑا ہو۔ پازوکا کو شاید اِس کی یہ ادا پسند آ گئی تھی۔

ادائیں بھی بڑے بڑے معجزے' اَن ہونیاں' تماشے اور چمتکار دکھاتی ہیں۔ جیسے کہتے ہیں نا' کہ دِل آنے کے ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔ دِل آیا گدھی پہ تو پری کیا چیز ہے۔ مَن کی مَوج اور مرضی کی کھوج' مال اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی...... عشق نہ دیکھے جات اور بھوک نہ بھالے بھات' راجے کی فقیر کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ سات ضلعوں کا مالک ڈومنی پہ دِل ہار بیٹھتا ہے' سات گھبروؤں کی لاڈلی چمار کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ کوئی ہیرا چاٹ لیتی ہے تو کوئی زہر پی لیتی ہے۔ شکنتلا تو کوئی میرا' کوئی لیلیٰ' سَسّی تو کوئی سوہنی' گل مکی تو کوئی ہیر۔ اِس طرح مَردوں میں بھی بڑے ذی جاہ و حشمت بہادروں' ناموروں اور کچھ معمولی سے لوگوں نے اِس میدانِ عشق میں بڑے بڑے معرکے سر کئے اور تاریخ یا داستانوں میں اپنے نام سُنہری حروف سے لکھوائے۔ یہ سارے کارنامے اور تماشے اِسی ''دِل آنے'' کے ہیں اور یہ دِل کم بخت ضروری نہیں کہ کسی اچھی' قیمتی اور خوبصورت چیز پہ ہی آئے۔ یہ بھوتنی چڑیل' انتہائی بدصورت عورت اور چور ڈاکو' نشئی' پھکڑ اور بے حد غلیظ اور کم ذات پہ بھی آ سکتا ہے۔ بس موقع محل' وقت کی گردش' سے کی مناسبت و موافقت' موڈ' ماحول اور مقدر کی پذیرائی و کہربائی پہ موقوف ہے۔

عالمانِ جمالیات اور علمُ الاجسام واَصنام کے بڑے بڑے ماہرین، علمُ الاَبدان و اعضاء کے اچھے اچھے ناقد و مُبصّرین، جمال و کمال، آرائش و زیبائش کے نامور منجھے ہوئے اہلِ ہُنر و فکر، کوئی بھی آج تک خوبصورتی یا بدصورتی کی کماحقہ تعریف نہیں کر پایا۔ ایشیائی ممالک میں خوبصورتی، خوش پیکری اور جاذبیت کی تعریف و تکمیل کچھ اور ہے اور یورپین ممالک میں کچھ اور، جبکہ افریقین ممالک میں قطعی کچھ اور...... کہیں رنگ رُوپ اور نازک اندامی کو اہمیت دی جاتی ہے اور کہیں شمشاد قامتی اور فربہی کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ کہیں سیاہی دِلنشین ہے تو کہیں میدہ ملیدہ رنگت پسندیدہ ہے۔ زُلفیں، نین، ہونٹ، گردن، ناک نقشہ، سینہ، کمر، کولہے، ہاتھ پاؤں۔ ہر قوم و ملک حُسن و خوبصورتی کے معاملہ میں اپنا ذوقِ جمال رکھتے ہیں۔ افریقہ میں کالی شار رنگت، موٹے موٹے ہونٹ، باہر نکلے ہوئے دانت، بے ڈھبے سے ہاتھ پاؤں اور ناٹا پربت سینہ اعلیٰ ترین معیارِ حُسن کے مظہر ہیں۔ جاپان، چین، کوریا، تھائی اِن ممالک میں معدوم سی ناک، نہ دِکھائی دینے والی آنکھیں، بچوں کی مانند ہاتھ پیر، بونا قد، پانی پت سینہ، گھر گھرہستن سی عورتوں کو حسین سمجھا جاتا ہے۔ اٹلی، اسپین، سوئٹزرلینڈ میں کشیدہ قامتی، سیاہ دراز زُلفیں، بھاری سینہ، معدوم سی کمر، تیز طرار، عیب کرنے والی، رقص و سرور کا ذوق رکھنے والی خواتین کو پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ انگلینڈ، جرمنی، فرانس، بلجیم، ڈنمارک وغیرہ میں دھان پان، متناسب قامت، شوخ و چنچل، معتدل، اجلی رنگت، روشن و فراخ پیشانی، بیلے رقص کی دِلدادگی معیارِ حُسن ہے۔ رُوسی بلاک میں مردنما، دیوہیکل، نفاست و نجابت سے محروم، جابر اور تھوبڑی عورتوں کو قابلِ فخر و وجاہت سمجھا جاتا ہے۔ اب آئیے موجودہ عرب بلاک میں تو اُن کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ قبیح قماش، آزاد خیال، نسوانیت و شہوانیت سے بھرپور عورتیں، بھاری بھاری جل تھل اعضاء قواء والی لانبی لانبی، سیاہ چشم و گیسو، ژولیدہ اعمال و اقوال والی جو کالے لمبے حشیش بھرے مراکشن سگریٹوں کے دھوئیں کے مرغولے مردوں کے چہروں پہ اُگلیں، جن کی بوٹی بوٹی پھڑکے، ایسی عورتیں اُن کی نظر میں اپسرائیں ہوتی ہیں۔ بنگال میں لمبے لمبے بالوں، سوکھی سڑی چرخ، لانبے لانبے نینوں والی، دھان پان سی، بچے پیدا کرنے کی محنت اور مزدوری میں مشقت پسند کرنے والی عورت کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں رقص و موسیقی میں طاق، چھیل چھبیلی، گفتگو میں بیباک، بڑے گھرانے اور نئے زمانے کی ماڈرن لڑکی کو کھرا مال سمجھا جاتا ہے اور پاکستان میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن کو بہتر سمجھا جاتا ہے جس کا ایک بھائی کویت، دوسرا دوبئی، تیسرا نیویارک اور چوتھا کسٹم یا پولیس میں ہو۔ سو گالی اور ایک سو ایک جوتا کھا کر بھی ''جی بسم اللہ'' کہے اور خاوند سے آدھی رات کو گھر آنے پہ یہ کبھی نہ پوچھے کہ تمہارے مُنہ میں سونف خوشبو والا پان اور الائچی کیوں ہوتی ہے؟ علاوہ ازیں تیرہ تالن اور پیچھے کٹن ٹائپ کی خواتین کو بھی بڑی تحسین

بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں اکیلی دوکیلی' زمین مربعے یا جائیداد والی ہر قسم' عمر اور سائز کی بیوہ' طلاقن عورتوں کو اعلیٰ ترین حسین و جمیل سمجھا جاتا ہے۔ معیارِ حُسن صرف جہیز' جہیز اور جہیز ہے اور جہیز کے بغیر شرافت اور نجابت یا خداخوفی انتہا درجہ کی بدصورتی گروانی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ کھانے پکاتے ہوئے تیل کے چولہے پھٹنے' بچوں سمیت نہر میں کودنے' چوہے مارنے والی گولیاں کھانے اور دارالامان' ایدھی سنٹر' پاگل خانے آنے جانے والیوں سے ہوتا ہے۔

بات سے بات نکلی تھی کہ دل آنے کے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں۔ ذات پات' امیری غریبی' خوبصورتی بدصورتی' حیثیت دیکھے بغیر ہی کیوپڈ کا دیوتا اپنا نشانہ تاک کر تیر چلا دیتا ہے اور پھر رومیو جولیٹ' لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' وامق عذرا' سوہنی مہینوال' ہیر رانجھا وغیرہ کی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ میں بھی اپنی اس عارضی زندگی میں کئی ایک واقعات کا چشم دیدہ ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسے عشق و محبت کے قصے' واقعات لکھنے یا پھر دہرانے کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ ایسا کچھ ہر دور' زمانے' شہر' گلیوں محلّوں میں ہوتا رہتا ہے۔

دو مخالف جنس اور دو مختلف مزاج جہاں بھی ہوں گے وہاں ایسے کام ہوتے رہیں گے۔ آنکھ' دل' جذبات تو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ تعجب و حیرت تو وہاں ہوتی ہے جہاں بظاہر دل لگانے یا نظر کی چوٹ کھانے کی گنجائش سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ گنجی نہائے گی کیا' نچوڑے گی کیا؟ لیکن کبھی کبھی اور کہیں کہیں یہ اَن ہونیاں بھی ہو کر رہتی ہیں۔ بلکہ بڑے دھڑلے سے ہوتی ہیں۔ پھر سب کچھ دیکھ کر یہ کہنا ہی پڑتا کہ واقعی عشق اندھا ہوتا ہے۔

پچھلے صفحات میں آپ کراچی کے بازارِ حُسن کی ایک پتلی سی گلی میں اس بظاہر طوائف کا مختصر سا احوال پڑھ چکے ہیں جس کے دو بیٹے تسلیم اور رضا' صوفی نور دین المعروف باوا نُورجہاں کے پاس کام کرتے تھے۔ اس خاتون نے مجھے ایک ڈیرہ دارنی' سُودخورنی نائیکہ کی بلڈنگ کے کونے پہ لگے نل سے پانی پینے سے روک دیا تھا اور اشارے سے اپنے پاس بُلا کر نہ صرف پانی پلایا بلکہ کواڑ بھیڑ کر مجھے اپنے پلنگ پہ بٹھا کر پیار کیا۔ میرا ماتھا چُوما' مجھ سے باتیں کیں۔ پھر دو روپے دیئے۔ تسلیم اور رضا کے متعلق بتایا' باوا کو سلام بھیجا۔ پچھلی جانب صحن کے برآمدے میں اس کا اپاہج شوہر اپنی بیوی کے گاہکوں کے آمد و رفت اور آمدنی پہ نظر رکھے بے حس و حرکت چارپائی کی پٹی سے لگا پڑا رہتا تھا۔ گاہک کے آنے جانے میں ذرا دیر لگ جاتی تو وہ اُدھر ہی پڑے پڑے ڈنڈے سے کواڑ پیٹتا اور مادرزاد ننگی گالیوں سے اپنی بیوی کی گوشمالی کرتا ہے۔

جو تیرا حکم ہو جو تیری رضا ہو......!

بہت برس ہوئے کہ پٹیالے کے بازارِ حُسن کے ایک شاندار بالاخانے کے پچھواڑے خانہ زادوں کی رہائش گاہ کی ایک تنگ سی کوٹھڑی میں ایک کلونسی ہوئی مدقوق سی مسلمان دایہ نصیبو بھی رہتی تھی۔ یہیں ایک اور ایک کوٹھڑی میں روشنی خان بھی رہتا تھا۔ چھیل چھبیلا سا روشنی خان اسی بالاخانے میں پھول' ہار' گجرے' نورتن کی خدمت اور حویلی بالاخانے کے تمام کمروں' غلام گردشوں' سیڑھیوں' دریچوں اور شہ نشین کی محرابوں کے علاوہ بڑے مجراخانے کی چراغ بتی' جھاڑ فانوس کی تیل تلین پہ مامور تھا جبکہ سدا کی بدنصیبو نصیبو پاؤں دابنے والی دایہ تھی۔ ناچ مجرے کے بعد جب نوچیاں لڑکیاں پور پور تھکن سے انگ انگ ڈھیلا کر کے بے سُدھ پڑ جاتیں تو نصیبو سب کی باری باری ٹانگیں دابتی۔ چنبیلی کے تیل سے مالش' مٹھی چاپی یا پھر سر سہلانے بیٹھ جاتی۔ اول تو اگلی صبح دن چڑھے تک اسے فرصت ہی نہ ملتی اور اگر نصیب ہو بھی جاتی تو پھر اسے بڑی بی بی یعنی اس ڈیرے کی نائکہ پریم رس کور کے کوہ ہمالیہ سے جسم پہ اپنی تمام بچی کھچی توانائیاں بروئے کار لانی پڑتیں۔ ذرا ہاتھ ڈھیلا پڑا نہیں' بڑی بی بی کی زوردار ٹانگ اس بیچاری کی پسلیاں پلستر کر کے رکھ [illegible] بھی [illegible] پریم رس کور تو جیسے اس کی جان کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ اچھی بُری شکل صورت تو اس عظیم صناع اور سب سے مصور کی مشیت ہے' اگر یہ کلونسی ہوئی چیچک رو تھی تو اس میں نصیبو کا کیا دوش؟...... پریم رس کور اس کو اکثر اپنی ٹھوکر پہ رکھتی۔

"نصیبو' کلموہی! شکل چھپا کر رکھا کر مجھ سے' تیرے ہاتھ کی انگلیوں میں میری ناڑیوں کا چین نہ ہوتا تو کبھی کا تجھے بھگتو بھنگی کو بخش دیا ہوتا......"

اس بدنصیب کا نام نصیبو پتا نہیں کس منہ جلے نے رکھ دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے' وہ کہاں پیدا ہوئی تھی؟ توبہ سیوا سنگھ کا مہندرا بردہ فروش اسے بچی عمر میں پریم رس کور کے ہاں پچیس چہرہ شاہی مُہر کے عوض بیچ گیا تھا۔ اُس وقت چہرہ صاف' تیکھے نقش نوکیلے اور انگ سنگ کھلا کھلا سا دکھائی پڑا تھا۔ ڈیرہ دارنی نائکہ کی شطرنجی پہ سارے مُہرے لڑکیوں' بالیوں' نوچیوں کے ہی ہوتے ہیں اور جو بساط پہ نہیں ہوتے وہ غلام گردشوں' ڈیوڑھیوں' بند دروازوں کے باہر' تھڑوں گلیوں میں تاش کھیلتے ہوئے' ممٹیوں پہ کبوتر بازی کرتے ہوئے' طبلہ سارنگی' سازوں کی دوکانوں پہ حقّے سے شغل کرتے ہوئے یا پھر سری پایوں کی دوکانوں پہ بڑے بڑے پیالوں میں شوربا پیتے ہوئے ہوتے ہیں۔ مندا ہُوا تو ٹکڑوں پہ گاہک پھانستے رہتے ہیں یا پھر طوائف کی بساط پہ مردِ سازندوں' اُستادوں کی صورت دھرے ہوتے ہیں۔

اُس زمانے میں پچیس چاندی کے روپے بڑی خطیر رقم تھی مگر ڈیرہ دارنی طوائف تو بہت ہوشیار قمار باز ہوتی ہے' وہ سمجھداری سے داؤ لگاتی ہے۔ اگر کبھی ہارتی ہے تو کسی لمبی جیت کے لئے اور جیت تو جیت ہوتی ہے لیکن اس کے ہارنے میں بھی اِک جیت کا سواد ہوتا ہے۔ ڈیرہ دارنی نے سمجھداری سے نصیبو پہ داؤ لگایا تھا مگر نصیبوں کو کیا کہیئے کہ دو برس بعد نصیبو کو چیچک نے آ لیا' اچھا خاصا صاف شفاف چہرہ کالی بجڑوں کا چھتہ بن کر رہ گیا۔ چیچک دانے' کالی مکئی کے دانوں کی مانند چہرے پہ لشکنے لگے۔ ناک کے بانسے پہ ایک موٹا سا دانہ ایسا بیٹھا کہ اچھے خاصے ستواں ناک کی ریڑھ مار کر رکھ دی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر پریم رس کور ہلکی سی مایوس ضرور ہوئی مگر وہ طوائف ہی کیا جو بگڑتی ہوئی صورت حال کو اپنے حق میں سیدھا نہ کر سکے؟...... اُس نے اِسے اُوپر والے کاموں پہ لگا دیا اور یہ ٹھان لی کہ جب تک چلے' چلاؤ' پھر کسی ضرورت مند عقل اور آنکھ کے اندھے کے پاس دھکیل کر اپنے دام مع بیاج کھرے کر لے گی۔ آواز میں لوچ اور رچاؤ ہوتا تو میراثیوں اور ڈومنیوں کی سنگت میں چلا دیتی مگر آواز کے معاملے میں بھی نصیبو' استاد پنڈت راول سے شیام کے بے سُرے اور کھریدر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

اسی اُجڑی بگڑی میں پندرہ سولہ کے سن پہ وہ آ پہنچی۔ خوبصورتی اور بدصورتی اپنی جگہ مگر آمد شباب کی بھینی بھینی خوشبو' شفاف مستور ہرنی کی مانند اپنی طرف کھنچتی ہوئی تو ایک کشش ہوتی ہے۔ اُٹھتی جوانی کی خوبصورتی چہرے سے تعلق نہیں رکھتی یہ تو محسوسات اور خون کے سُرخ ذرات کی بیشی سے تعلق رکھتی ہے جو انسان کی جبلت کے اندر چھپے ہوئے ایک وحشیانہ سے احساسِ تلذذ سے متعلق ہے۔ بچپن کی خوشبو' نوعمری کی خوشبو' سہاگ کی خوشبو' حاملہ عورت کی خوشبو' بڑھاپے اور آنے والی موت کی خوشبو اور پھر پاک دامنی کی اور بدکرداری کی بھی اپنی خوشبو' بدبو ہوتی ہے جسے ہر آدمی سونگھ اور محسوس نہیں کر سکتا۔ جس طرح سمجھدار سیانی عورتیں اپنا پیٹ چھپاتی پھرتی ہیں اسی طرح باعفت' باحیا دوشیزائیں اپنی اُٹھتی ہوئی جوانی کی مہک چھپاتی ڈھانکتی رہتی ہیں...... ڈھیلے کپڑے' اُجاڑ چہرہ ماتھا' ہار نہ سنگار' ہنسنا نہ مسکرانا' کوٹھے اور کھڑکی میں کھڑا ہونا موقوف مگر کیا کیجئے کہ یہ شباب کی دبی ہوئی چنگاریوں کی تپش اور تمازت کبھی لُکی چھپی نہیں رہتی۔ اس ہلکی ہلکی آنچ کو انسان تو انسان' جانور پرندے تک محسوس کر لیتے ہیں۔ کنکوے اور پتنگیں اِسی گھر کے آنگنے میں اُلجھتی ہیں۔ کبوتر اور کوّے کم بخت اسی گھر کے دریچوں اور منڈیروں پہ زیادہ اُترتے اور قیلولہ کرتے ہیں۔ سورج کی کرنیں' ڈوبتے سائے' کِھلے چاند کی چاندنی' گُڈی گُڈے کی پینگ' سات ستاروں کا جھرمٹ' سرِشام ابابیلوں کے پرے کے پرے اسی مکان کو تاکے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ چھابڑی' ریڑھی اور خوانچے والے اسی گھر کے سامنے اپنے گلے صاف کرتے ہیں۔ ڈاکیہ' خط ہو نہ ہو مگر ہر دوپہر یہ ضرور ہانکا

لگائے گا کہ بی بی جی! آج کوئی خطرہ نہیں۔ جوان اور نکھٹو بیٹوں والے رشتہ دار تواتر سے آنا جانا شروع کر دیتے ہیں۔ اِس گھر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے والا بی کام کا سٹوڈنٹ بھی نئے نئے آفٹر شیو لوشن ٹرائی کرتا رہتا ہے اور آپ سمجھ گئے ہوں کہ یہ ساری کھیکھڑ اور سیاپے اِس گھر میں دوشیزگی کی خوشبو پھیلنے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ بدنصیبوں' خستہ حالوں' تنگ دستوں پہ جوانیاں بھی کافر اور کڑوے دُھوئیں کی طرح آتی ہیں۔ کسی بھی غریبوں' بدحالوں کی جھونپڑی' کٹڑی یا بستی میں چلے جائیں۔ ہر گھر میں آگ لگی ہوئی یا کم از کم کڑوا دُھواں اُٹھتا ہوا ضرور آپ کو متوجہ کرے گا۔

نصیبو کو جب پہلے پہلے کپڑے دِن لگے تو حویلی' بالاخانے' ہر جگہ بھُنی ہوئی کلیجی کی بُساند پھیل چکی تھی اور وہ کونوں کھدروں میں چھپتی پھر رہی تھی۔ سوائے بڑی بی بی' کوئی بھی نہ جان سکا کہ یہ دُھواں کہاں سے اُٹھ رہا ہے؟...... ڈیرے کی رسم روایت کے مطابق بتاشے بانٹے گئے تو تب پتا چلا کہ نصیبو بھی خیر سے جوان ہوگئی ہے۔ اگر کسی کوچی پہ دن آتا ہے تو باقاعدہ ڈیرے پہ جشن بپا ہوتا ہے۔ تنجن اور بریانی کی دیگیں اُترتی ہیں۔ شب رنگ و رامش اور ناچ گانے کے جلسے ہوتے ہیں...... ڈیرے کی دوسری روایت کے تحت چاندی کی نتھ بھی پہنا دی گئی جو اِس بات کا اعلان تھی کہ کوئی بھی دام ڈھیلے کر کے اِس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

• چراغ تلے اندھیرا......!

روشنی خان کا اصل نام روشن خان تھا۔ یہ ریاست کپورتھلہ کے شاہی بازار کی پیداوار تھا۔ جیسا کہ اِس بازار اور اِن لوگوں کی ریت ہے کہ لڑکیوں کو تو دھندے پہ لگا دیا جاتا جبکہ طوائفوں کے لڑکوں کا مستقبل بڑا مخدوش ہوتا ہے۔ اکثر طبلہ سارنگی پہ بیٹھ جاتے ہیں لیکن تماش بینوں پہ یہ ظاہر نہیں ہونے دیا جاتا کہ یہ ناچنے یا گانے والی اِن کی بہن' ماں یا بیٹی ہے۔ اگر یہ نہ کریں تو پھر اُن کی دَلاّلی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے رواج و ریت کے مطابق بہوؤں سے پیشہ نہیں کروایا جاتا البتہ اِن ہی کی بیٹیوں کی ناک میں نتھیں ضرور ڈال دی جاتی ہیں...... روشن خان کو روشنی خان سب سے پہلے بڑی بی بی پریم رس کور نے کہا تھا' بس چل سو چل۔ وہ روشنی خان ہی مشہور ہوگیا۔ ڈیرے پہ اِس کا کام دھندا بھی فانوس' قندیلیں اور شمعیں روشن کرنا تھا۔ پھول پتی' ہار گجرے کا شغل تو یہ صرف اوپر کا خرچہ نکالنے کے لئے کرتا تھا۔ بڑی بی بی پریم رس کور نے اِسے نابھہ کے بے تارہ میلے میں ایک نواب کے گانے بجانے کے جلسے میں دیکھا تھا۔

جس سی تمکنت' چاندی کے ورق جیسی جوانی کی چکا چوند' سرخ ہونٹوں پہ نرم نرم کھڑی مونچھیں اور سانبھر سے کٹیلے نین۔ اٹھ بوسکی کا پیرہن پہنے وہ کسی ریاست کا راجکمار جا پتا تھا۔ گو بڑی بی بی کی اُدھیڑ عمری' گنٹھیا کا سدا بہار روگ اور پھیلا ہوا تن و توش وغیرہ کسی قسم کے جسمانی یا جذباتی معرکے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے جبکہ اُس کے مقابل روشنی خان بالکل بلونگڑا سا تھا لیکن پھر وہی بات کہ دِل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ وہ اِسے دِل دے بیٹھی تھی اور کسی نہ کسی طور اپنے ساتھ پٹیالہ لے آئی۔ کُھل کر عشق جھاڑنے کی نہ تو عمر تھی اور نہ ہی اُس کا مرتبہ اور حیثیت اِس کی اجازت دیتی تھی' دَر پردہ سب ہی جانتے تھے کہ پریم رس کور نے روشنی خان کو رکھیل رکھا ہوا ہے۔ بظاہر وہ اِسے خوب ڈانٹتی' بُرا بھلا کہتی اور ایک فاصلے پہ رکھتی مگر وہ شاید اپنی نظر پہ قابو نہ رکھنا جانتی تھی' اُس کے دیکھنے میں لگاوٹ صاف محسوس ہوتی تھی...... روشنی خان بظاہر پچھواڑے کے ایک کمرے میں رہتا تھا جہاں دیگر کمروں میں نصیبو کے علاوہ دوسرے سازندے' اُستاد لوگ اور ملازم پیشہ بھی پڑے ہوئے تھے مگر یہ سب کو معلوم تھا کہ رات پاؤں دابنے کے بہانے روشنی خان کہاں ہوتا ہے؟ خیر اِس دُنیا میں ایسی ہونیاں اور اَن ہونیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس اربابِ نشاط کی دُنیا کا ہر فرد صرف اپنے کام اور دام سے مطلب رکھتا ہے' یہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل ذرا کم ہی دیتے ہیں کیونکہ اس حمام میں سب ننگے ہی ہوتے ہیں۔

اس ڈیرے میں نام کے صرف تین چار ہی مسلمان دانے تھے۔ روشنی خان' نصیبو' ایک سارنگی نواز اُستاد دُلارے خان اور ایک پکھاوجیہ عمدو خان آگرے والا' باقی تمام ہندو یا دو چار بشمول بڑی بی بی پریم رس کور' سکھ جاتی سے تھے۔ یہ سارا عملہ اپنے اپنے حساب سے اپنا اپنا دال دلیہ کرتے تھے۔ مسلمان اپنا کھانا پینا علیحدہ کرتے' ان کی رسوئی نصیبو کرتی تھی۔ اِن چاروں مسلمانوں کا رہنا سہنا بھی دُوجوں سے علیحدہ تھا۔ اُستاد دُلارے خان اور عمدو خان حاجی' نمازی' اللہ توبہ کرنے اور پاکی پلیدی کا خیال رکھنے والے تھے۔ جب سے نصیبو کو کچے دن لگے' دونوں نے اس کے ہاتھ کا پکا کھانا بند کر دیا تھا...... ایک دوپہر روشنی خان' نصیبو کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اچانک بولا۔

''نصیبو! تجھے نتھ تو خوب جچی ہے' اب تو بڑی بڑی اور سُندر بھی لگنے لگی ہے......''

نصیبو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

''نصیبو بڑی بُری لگے یا سُندر دِکھے' نتھ ڈالے یا مانگ میں سیندور بھر لے' وہ اپنے نصیبوں کی کالک کو دھو نہیں سکتی......''

روشنی خان لُقمے والا ہاتھ روکتے ہوئے بولا۔

’’یہ تو کیسے کہہ سکتی ہے‘ نصیبوں کی بند پوٹلی تو کسی نے کھول کر نہیں دیکھی؟...... تو ایسی مایوسی کی اور دُکھی کر دینے والی باتیں مت کیا کر۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ نتھ کا مطلب کیا ہوتا ہے...... دیکھتی جا‘ بس اب جلد ہی تیرے نصیب کُھلنے والے ہیں......‘‘

وہ زہرخندہ سی کہنے لگی۔ ’’ہاں‘ میں جانتی ہوں۔ اس نتھ نے میرا بند نصیبہ کیا کھولنا ہے‘ اب مجھے اپنی قبر کا کُھلا مُنہ ضرور دکھائی دے رہا ہے...... روشنی خان تُو بھی اور میں بھی جانتی ہوں کہ میرا جنم اس بازار اور حویلی میں نہیں ہوا۔ بڑا دُھواں دُھواں سا اِک منظر میرے حافظے کے کسی کونے میں سمٹا ہوا پڑا ہے۔‘‘

وہ دُور خلاؤں میں دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔

’’ہمارا ایک آنگن تھا‘ بیل اور گائیں تھیں۔ میرے ابّا اور اماں‘ ایک ہماری بوڑھی سی دادو ہوتی تھی۔ میں اپنے ابّا کے کندھے پہ سوار میلہ دیکھنے آئی تھی۔ ایک چھوٹی سی مسجد تھی‘ مجھے پاس بٹھا کر ابّا نماز پڑھ رہے تھے۔ میں میٹھے باجرے کے لڈو کھا رہی تھی کہ کچھ چڑیاں آس پاس آ کر منڈلانے لگیں۔ میں لڈو توڑ توڑ کر انہیں باجرہ کھلا رہی تھی۔ اسی دوران چادر لپیٹے ایک شخص باہر دروازے پہ آیا‘ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پہ ایک [illegible] مجھے اشارے [illegible] چوزہ لینے کے لئے کہا۔ میں سرکتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ اُس مُنہ ڈھانپے شخص نے چُوزہ میری ہتھیلی پہ اور اپنی چادر میرے سَر پہ ڈال دی۔ بس! کہانی ختم ہے...... اور ہاں‘ یہ ساری بات آج پہلی بار میں نے تمہارے سامنے بیان کی ہے اس لئے کہ ایک تو تم مسلمان ہو‘ دوسرے یہ کہ شاید پھر مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہ ملے...... میں ایک اللہ کے متقی بندے کے گھر اس کے لئے رحمت بن کر پیدا ہوئی اور اللہ کے گھر سے ہی اس سے بچھڑ گئی‘ اُس وقت میں اتنی کم سن تھی کہ مجھے نہ تو باپ کا نام کا پتہ تھا اور نہ ہی گاؤں یا علاقے کی پہچان تھی...... بارہ تیرہ برس میں نے یہاں بڑی بی بی کے ہاں پاؤں‘ پنڈلیاں دابتے‘ گالیاں جھڑکیاں اور کوسنے سُنتے سہتے گزار دیئے۔ میرا نام نصیبو بھی شاید بڑی بی بی نے رکھا تھا...... بڑی بی بی نے میرے ساتھ جیسا بھی سلوک کیا سو کیا مگر ایک بہت بڑی نیکی بھی کی کہ اُس نے مجھے گندے دھندے پہ نہیں لگایا۔ ایک دفعہ کہا تھا کہ جیسی بھی ہے‘ مسلمان بچی ہے۔ یہ اس جوگی ہی نہیں‘ اسے تو کسی درگاہ پہ بٹھا دینا چاہئے۔ کوٹھے پہ بیٹھنے کی یہ چیز نہیں......‘‘

’’مگر اب یہ نتھ......؟‘‘ روشنی خان نے اَن کھایا لقمہ واپس تھالی میں رکھتے ہوئے کہا۔

’’ہاں‘ یہ نتھ اسی لڑکی کو پہنائی جاتی ہے۔ جس کے دام کھرے کرنے ہوتے ہیں......‘‘

"نصیبو! تم نے اپنی کتھا سُنا کر مجھے ہلا دیا ہے اور یہ یاد دلا کر کہ میں ایک مسلمان بھی ہوں' مجھے سوتے سے جگا دیا ہے۔...... تم تو جانتی ہو کہ میں بھی اسی ماحول کی پیدائش ہوں' یہیں کا پروردہ...... میں ایک طوائف کی ناجائز اولاد ہوں۔ میرا باپ ایک انتہائی دولت مند' خوبصورت' اشرور سوخ والا مگر عیاش انسان تھا۔ مجھے آج یہ بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ مسلمان تھا جبکہ میری ماں ہندو تھی۔ تم جانتی ہو بلکہ سب جانتے ہیں کہ بڑی بی بی جو مجھ سے تیس برس بڑی ہے' مجھے رکھیل رکھا ہوا ہے۔ دن کے اُجالے میں' مجھے جوتے مارتی ہے اور رات کی تنہائی میں میرے تلوے چاٹتی ہے۔ وہ درپردہ میری ہر ضرورت اور عیاشی کا خیال رکھتی ہے مگر میں ایسی زندگی اور بڑی بی بی کے لَولو پوپو سے بیزار ہو چکا ہوں۔ اب میں شرافت' محنت اور عزت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں......"

روشنی خان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ٹھہرے الفاظ میں کہنے لگا۔

"یہ آج تم نے انتہائی مایوسی اور مرنے کی باتیں کی ہیں' ان سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک پاک دامن اور کسی شریف والدین کی اولاد ہو' حالات اور قسمت نے تمہیں اگر اس گندگی میں پھینکا ہے تو مایوسی اور حوصلہ ہارنے کی بجائے اس گندگی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کرو کیونکہ ابھی تک بہت کچھ تمہارے بس میں ہے۔ اگر تمہیں کوئی بردہ فروش یہاں لا کر بیچ سکتا ہے تو کوئی سرفروش اللہ کا بندہ تمہیں یہاں سے نکال کر بھی لے جا سکتا ہے......"

نصیبو ایک استہزائیہ ہنسی سے بولی۔

"روشنیے! یہ جگہ تازہ صحت مند نوخیز جوانیوں سے بھرپور سرخ گوشت کی منڈی ہے۔ یہاں بوٹی بوٹی' انگ انگ' نس نس ٹٹول اور سونگھ چکھ کر بھاؤ چکایا جاتا ہے اور یہ سب کچھ میرے پاس نہیں...... ہمدردی' خلوص اور انسانیت جیسے الفاظ اور جذبے بھی کسی نہ کسی مفاد و مصلحت کے تحت ہی اُبھرتے ہیں۔ رنگین آب و تاب والے خوبصورت قیمتی نگینوں کے ہوتے ہوئے کوئی بھلا معمولی بے قیمت پتھر کو کیونکر پسند کرے گا......؟"

"دُنیا میں بڑے بڑے سرپھرے اور بدمغزے پڑے ہیں نصیبو!...... جو ہمیشہ گھاٹے کا سودا ہی کرتے چلے آئے ہیں......" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "اگر میں ہمیشہ کے لئے یہ ہاتھ پکڑ لوں تو کیا تم چھڑانا چاہو گی......؟"

"روشنیے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو' تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟...... تم اپنی عمر اور قد کاٹھ دیکھو۔ میں تو ابھی سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی ہوں......"

وہ ہنس دیا' بولا۔ ''تم نے بڑی بی بی کی عمر' ڈیل ڈول اور رنگے ہوئے سفید بالوں کی چُٹیا دیکھی ہے...... اگر ایک قبر رسیدہ بُڑھیا اپنے پوتے کی عمر کے بچے کو اپنا محبوب یا رکھیل بنا سکتی ہے تو کیا ایک کھڑی عمر کا مَرد ایک نوعمر لڑکی سے حق نکاح نہیں کر سکتا؟...... یہ کوئی اَن ہونی تو نہیں نا۔''

نصیبو اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''روشنیئے! مذاق ختم کرو۔ تم جیسے خوبصورت' طرح دار' صحت مند مَرد جسے ایک سے بڑھ کر ایک جوان' حسین عورت مل سکتی ہے۔ جس کے لئے علاقے کی خوبصورت سے خوبصورت عورتیں ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں اُسے ایک بے حیثیت' کم سِن' چیچک رُو' بدصورت مَریل سی چھوکری سے کیا نسبت......؟''

''نہیں' بلکہ یوں کہو تو زیادہ صحیح ہے کہ اِن موٹی روغنی پتلیوں کو تم سے کیسی نسبت؟...... نصیبو! بُرائی' حرام' جھوٹ کیسے بھی حسین اور دلفریب کیوں نہ ہوں' انت اِن کا سوائے خرابی' رُسوائی' نقصان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اچھائی' سچ اور نیکی سے وقتی طور پر کیسے ہی نقصان اور گھاٹے دکھائی دیتے ہوں' بالآخر خیر ہی نکلتی ہے...... ہاں' یہ ضرور سوچ اور سمجھ لینا کہ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن مسلمان ضرور ہوں۔ اب یہ دیکھ لو کہ تم کسی غیر مسلم کے ہاں بکنا پسند کرو گی یا کسی مسلمان کو ترجیح دو گی جو تمہیں دل کی گہرائیوں اور سچائیوں سے چاہتا بھی ہو......''

وہ سر جھکا کر یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی نالائق طالب علم اپنے سخت گیر اُستاد کے سامنے سرنگوں سا بیٹھا ہوتا ہے۔ نصیبو بہت دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ آخر جب وہ بھی اِسی طرح سر ڈال کر بیٹھ گئی تو روشنی خان مسکراتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔

بڑی بی بی دوپہر کے خاصّہ کے بعد اپنے کمرے میں قیلولہ کر رہی تھی کہ روشنی خان اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ پریم رس کور اس کی بے وقتی آمد پر ٹھٹکی تو ضرور مگر متعجب نہیں ہوئی کہ کبھی کبھار وہ کسی اچانک ضرورت کے تحت وقت بے وقت مُنہ اُٹھائے چلا آیا کرتا تھا۔ پہلے تو وہ اسے نیند سے جل تھل نیم باز آنکھوں سے گھورتی رہی' شاید وہ اس کی اِس وقت آمد کا مقصد اپنے حساب سے جاننا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنی طوائفانہ بارھویں حِس خاص سے محسوس کیا کہ روشنی خان کے دیئے کی لَو آج کچھ زیادہ ہی روشن ہے...... وہ بڑی بی بی کی فرشی نشست کے پاس خاموشی سے دُم دبا کر بیٹھ گیا۔ وہ مصنوعی سے تحکمانہ انداز سے پوچھنے لگی۔

''کہو روشنیئے! کیا بپتا آ پڑی جو اِس طرح مُنہ لٹکائے ہوئے ہو......؟''

''بڑی بی بی! وہ نصیبو ہے نا' وہ......''

''ہاں' نصیبو ہے...... کیا ہوا اُسے......؟''

وہ اِسی انداز میں سر جھکائے ہوئے ممیایا۔ ''اُسے نتھلی پہنا دی گئی ہے اور میں اُس کی نتھ اُتارنا چاہتا ہوں......''

اتنا کہہ کر وہ چُپ ہو گیا تھا...... بڑی بی بی کو جیسے پشت پہ کسی بڑے سے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو' وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اسے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر اُدبدا کر بولی۔

''روشنیئے! نتھ اُتارنے کا مطلب تم سے اور مجھ سے زیادہ کون جانے گا؟...... میں نے نصیبو پہ بڑی رقم پھینکی ہوئی ہے۔ میری ڈوبی رقم نکلنے کا سمے آیا تو کمبخت تُو گھر سے ہی سنپولئے کی مانند نکل آیا...... ہم اپنے خانہ زادوں سے کاروباری معاملت نہیں کرتے......'' نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پاؤں پسار کر کہنے لگی...... ''ذرا میرے پاؤں دباؤ......!''

''بڑی بی بی اب مجھے اِس خدمت سے معذور سمجھو' میں صرف یہاں اِس وقت نصیبو کو مانگنے آیا ہوں......''

اب تو پریم رس کور کو جیسے کسی کالے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ اُسے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ روشنی خان بھی ایسا گستاخ و بیباک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے طوائفانہ طور میں پوچھنے لگی۔

''کیا دام لگاتے ہو نصیبو کے......؟''

''...... وہی جو کبھی آپ نے روشنی خان کے لگائے تھے۔''

یہ کچھ اپنے آپ ہی اِس کے مُنہ سے نکل گیا...... جسے سُن کر پریم رس کور پہ جیسے فالج کا اٹیک ہو گیا ہو۔ اُسے اپنا جسم سُن ہوتا محسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ ضرورت کے کھونٹے پہ مجبوری کی زنجیر سے ہر حرام و حلال جانور کو باندھا تو جا سکتا ہے مگر اُسے ہمیشہ روک کر رکھا نہیں جا سکتا...... وہ جیسے اپنے تئیں کوئی فیصلہ کر چکی تھی' وہیں سے آواز لگا کر ایک خادمہ کو بلوایا اور فوراً اِسی وقت نصیبو کو طلب کیا۔ اِس کے پہنچنے میں بھلا کیا دیر لگتی تھی۔ وہ سہمی ہوئی' بارش میں بھیگی کبوتری کی طرح سامنے کھڑی تھی۔ دونوں کو کافی دیر سر سے پاؤں تک گھورنے کے بعد بڑی بی بی نے نصیبو سے پوچھا۔

''نصیبو! روشنیئے نے تم سے کبھی کوئی بھی غیر اخلاقی حرکت کی......؟''

وہ کپکپاتی سی آواز میں بولی۔ ''غیر اخلاقی تو نہیں...... اخلاقی حرکت ضرور کی ہے۔''

بڑی بی بی نے لہجے کا پینترہ بدل کر پھر پوچھا۔ ''کبھی ہم نے تمہیں کوئی غیر اخلاقی کام کرنے کے

لئے کہا ہو یا آمادہ کرنے کی کوشش کی ہو......؟''

وہ اسی بے خوفی سے بولی۔ ''نتھ ڈالنے کے علاوہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں......؟''

''یہ ہم کنجروں کی ریتیں اور رواج ہیں جن سے انحراف ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔''

بڑی بی بی نے اس کی آدھی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

نصیبو نے بھی اسی طرح تُرت جواب دیا۔

''بڑی بی بی! ایسے ہی ہم شریفوں کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں...... ہم آپ کے قدموں میں زندگی تو گزار سکتے ہیں' آپ کے پاؤں دھو دھو کر پی سکتے ہیں مگر ناک میں نتھ ڈلوا کر نہیں جی سکتے......''

بڑی بی بی' روشنی خان کی جانب نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم روشنیئے کو شاید مکمل طور پہ نہیں جانتی...... یہ سر سے پاؤں تک کنجر ہی کنجر ہے' کنجر کوئی ذات یا قوم نہیں۔ عورت کی کمائی کھانے والا اور اس کو بے جا سر پر چڑھانے والا کنجر ہوتا ہے۔ کنجر کی کوئی ماں' بہن' بیوی' بیٹی نہیں ہوتی...... اور ہاں' جسے ایک بار حرام راس آ جائے وہ پھر کبھی حلال نہیں کھاتا' اگر کبھی کھا بھی لے تو قے اور دست لگ جاتے ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا' سوچ لو...... یہاں رہنا ہے یا روشنیئے کے ساتھ جانا ہے......''

وہ ناک سے نتھ اُتار کر اس کے قدموں میں دھرتے ہوئے کہنے لگی۔

''بڑی بی بی! آپ نے مجھے نصیبو نام دیا ہے۔ اگر میرے نصیب میں یہی روشنیئے ہی لکھا ہے تو بھی میں خوش ہوں...... کسی اونچی ذات اور عزت دولت والے کی رکھیل بننے سے کسی کنجر کی بیوی بننا میرے نزدیک زیادہ افضل ہے۔ وہ پھر بیوی کو چراغ خانہ بناتا ہے یا شمعِ محفل' یہ اس کے اپنے اعمال ہیں......''

بڑی بی بی نے توجہ اور سکون سے نصیبو کی باتیں سُنیں۔ پھر وہ روشنی خان سے مخاطب ہوئی۔

''روشنیئے! آج ابھی سے تمہارا اس ڈیرے سے تعلق ٹوٹا۔ تم آج سے ٹھیک سات روز بعد چند معززین کے ساتھ یہاں پہنچ جانا اور نصیبو کو بیاہ کر لے جانا...... اب تم جا سکتے ہو۔''

پریم رس کور کے یہ الفاظ روشنی خان کے کانوں کے قریب تڑ تڑی پٹاخے کی مانند پھٹے' وہ کسی گھوڑے گدھے کی طرح بدکا ضرور مگر بدحواس نہیں ہوا تھا' وہ تو یہاں کشتیاں جلا کر آیا تھا۔ اُسے خوب اندازہ تھا کہ آج تخت ہے اور یا پھر تختہ۔ عشق میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ پریم رس کور جیسی توپ عورت جس نے اک زمانے کو اپنی لاتوں' گھاتوں اور باتوں کی آڑ سے گزار دیا ہوا تھا' اُس کے دانتوں سے شکار چھین

کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر بڑی بی بی پریم رس کو روشنی خان کی کاٹ نہ ہوتی تو وہ اسے کھڑے کھڑے دو کوڑی کا کر دیتی مگر اس زمانہ دیدہ چشیدہ نائیکہ نے اس نازک موقعہ پہ بڑی دُور اندیشی سے فوری فیصلہ کیا تھا اور کیوں نہ کرتی' یہ عشوہ و غمزہ فروش لوگ ہوتے ہی وقت شناس ہیں۔ وقت کا صحیح استعمال اور اس سے کماحقہ فائدہ حاصل کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ یہ وقت اور موقع شناس ہی نہیں' چہرہ مہرہ اور مزاج شناس بھی ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت' جبلت نفسیات' جنسیات' جذباتیات۔ انسانی کمینگی' درندگی' نفرت' محبت' وفا' دغا سے جتنے یہ لوگ واقف ہوتے ہیں' اور کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ' سفلہ سے اصیل' جاہل سے عالم تک ہر قبیل کا بندہ ان کا بندۂ بے دام بن جاتا ہے۔

بڑی بی بی جان چکی تھی کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے' اب فضیحتہ کھڑا کرنے سے اپنی آب بھی جاتی ہے۔ گلی کوچے کو سنائے بغیر عزت و بھرم سے اس تلخ گھونٹ کو حلق سے نیچے اُتارنے میں ہی اُس نے اپنا بڑا پن سمجھا۔ اس میں کچھ نام نیکی بھی تھی۔ نصیبو کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر جب روشنیے کی جانب دھیان جاتا تو سینے پہ سانپ لوٹ جاتا۔ یہ تصور کر کے کہ یہ بے وفا' ہرجائی' دغاباز اب اُس کی بجائے نصیبو کا دم بھرے گا' اس کا کلیجہ حلق میں آ جاتا۔ کئی مرتبہ وہ اپنے ارادے اور کئے ہوئے فیصلے سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔ روشنیے جیسا طرحدار اب اُس کے پاؤں دابنے والی دو ٹکے کی چیچک ماری کلوٹی ہوئی ساڑھے چار فٹی چھوکری کے پہلو میں ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ واقعی عورت چاہے بیوی ہو یا محبوبہ' رکھیل۔ اپنے مقابل کسی اور عورت کو برداشت نہیں کر سکتی البتہ طوائف کی بات الگ ہے کیونکہ وہ عام گھریلو شریف عورت کے برعکس اکثر دماغ سے بھی کام لے لیتی ہے۔ یہ درمیانی پانچ سات دنوں کا عرصہ بھی اُس نے اس موہوم سی اُمید کے پیشِ نظر رکھا تھا کہ شاید اس دوران اس کا دماغ ٹھکانے آ جائے...... کمبخت' کم ظرف جل تھل بحر اکاہل کو چھوڑ کر پایاب سی گومتی پہ جا پڑا۔ اور کم نصیبو کا مُنہ نہ ماتھا' اِدھر تھا کیا جو کسی کو بھاتا؟ شاید یہیں پہ کسی نے کہا تھا کہ دل آنے کے انداز نرالے ہیں...... روشنی خان یوں پلّو جھاڑ کر یہاں سے نکلا جیسے وہ انگارے اُگاتا اور اُجالتا رہا ہو یا پھر اک لمبی قید بھگتنے کے بعد وہ آزاد ہوا ہو۔ اس کے تو چھوٹے منہ سے یہ تک نہ نکلا کہ بڑی بی بی! مجھے اپنے قدموں سے دُور نہ کریں یا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف کر دیں۔ اس نے جاتے سمے آداب' بندگی یا شکریہ تک نہ کہا اور نہ ہی پلٹ کر اک نظر نصیبو کی جانب دیکھا۔ پریم رس کو نفرت بھری نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''گھر کا نہ گھاٹ کا' دو ٹکے کی اوقات کا!...... نصیبو' او بدنصیبو! دیکھ لیا کلجگ؟ موری کی مٹی منارے پہ چڑھی۔ آستین کا سانپ...... ہائے' گاڑھا اُتروا کر ریشم پہنوایا' بتولی کے کھڑوے سے پھنکوا کر

تُجّی کا مداری سلیم شاہی پاؤں ڈلوائی' بھٹیارے کی پتلی دال اور چپاتی سے اُٹھا کر بریانی اور قورمے پہ بٹھایا مگر کم ذات کو عزت آسودگی راس نہ آئی...... ہائے' نصیبو! تو آج سے بدنصیبو ہوگئی۔ جس طوطا چشم' احسان فراموش نے میری مہربانیوں اور احسانوں کا یہ بدلہ دیا وہ تجھ جیسی ڈیڑھ تھنی بھاری بکری کا کتنے روز دودھ پیئے گا...... اری' میری بات یاد رکھ' تیسرے روز ہی تیرے دام کھیسے میں ڈال کر تجھے کسی قصائی کے حوالے کر دے گا۔ روئیو پھر بیٹھی' دوہتھڑ اُٹھاتی...... اری بدلحاظی' بدشگنی' کلموہی! شگنوں کی نتھ اُتار پھینکی۔ برادری والوں کو خبر ہو جاوے تو کوئی تیرے مُنہ پہ نہ تھوکے۔ اب بھی وقت ہے' اُٹھا اِسے اور جیسے اُتاری ویسے ہی پہن......''

نصیبو نے سر اُٹھا کر اِک نظر نتھ کی جانب دیکھا' پھر دھاڑ مارتی ہوئی بڑی بی بی کے پاؤں میں گر گئی' ہچکیوں کے درمیان فریاد کرنے لگی۔

''بڑی بی بی' میں نے کبھی بتایا نہیں۔ میں مسلسل کئی برسوں سے ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ ایک بزرگ' سفید داڑھی' نورانی چہرہ کہیں سے آتے ہیں۔ خمیدہ کمر' تھکے ہارے۔ مجھے السلام علیکم کہہ میرے سر پہ دست شفقت رکھتے ہیں' پھر جیب سے سُرخ رومال جس میں چاندی کے دو روپے بندھے ہوتے ہیں' میری جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور ہاتھ اُٹھا کر میرے لیے دعا کرتے ہیں پھر آج یعنی پچھلی شب یہی خواب ایک چھوٹی سی تبدیلی کے ساتھ دیکھا۔ معمول کی ساری کارروائی کے بعد اِن بزرگوار کی نگاہ اچانک میری نتھ پہ پڑی یہیں اُن کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہو جاتا ہے قدرے خفگی سے مجھے حکم دیتے ہیں کہ اِس نتھ کو اُتار کر پھینک دے۔ یہ تمہارے لیے نہیں۔ واپس کر دو' اِسے لوٹا دو۔ میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ یہ نتھ مجھے بڑی بی بی کے حکم اور ڈیرے کٹم کی ریت و رواج کے مطابق پہنائی گئی ہے۔ یہ نتھ ایک بار پہنا دی جائے تو پھر اِسے وہی اُتارتا ہے جو ڈیرہ دارنی کی مُنہ مانگی نتھ اُتروائی ادا کرتا ہے۔ میری یہ بات شاید اُنہیں ناگوار گزری' قدرے خفگی سے بولے کہ اتنے عرصہ سے ہم تمہیں لال رومال میں باندھ کر روپے دے رہے ہیں' وہ سب اُٹھاؤ اور جو مانگے اُسے دے دو مگر یہ نتھ اُتار دو۔ یہ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہو گئے اور پھر یہ روشنیے والا معاملہ درمیان میں آ گیا...... بڑی بی بی! میں قسم کھا کر کہتی ہوں' اِس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی مسلمان ہوں اور تم بھی مسلمان ہو۔ میں نے اِسے بہتیرا سمجھایا کہ تیرا میرا کوئی جوڑ نہیں۔ میں بیمار' بیکار' بدصورت سی لڑکی ہوں اور نہ ہی تیری میری عمر میل کھاتی ہے مگر وہ میری ہر بات ہنس کر ٹال گیا اور آپ کے پاس چلا آیا......''

پریم رس کور نہ صرف بڑے انہماک اور باریک بینی سے اِس کی یہ باتیں سُن رہی تھی بلکہ بڑی

گہرائی میں اُتر کر ان پہ غور بھی کر رہی تھی۔ خاص طور پہ خواب۔ بزرگ' نتھ اُتارنے والی بات اور لال رومال میں بندھے ہوئے روپے...... نصیبو تو اپنی بات کبھی کی ختم کر کے پاؤں دابنے میں جُتی ہوئی تھی جبکہ پریم رس کور شاید کہیں اور پھنسی ہوئی تھی۔ پھر وہ جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے اُٹھی اور نصیبو کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اس کی کوٹھڑی میں پہنچ گئی۔ چھوٹی سی کمرا نما کوٹھڑی میں جھلنگی سی چارپائی' دو تین ٹین کے اُدکے پچکے سے صندوق' الگنی پہ لٹکے سے جُوٹھے مُوٹھے پہناوے کے کپڑے اوڑھنیاں' دیوار پہ چمٹے ہوئے پھٹے پُرانے سے کلموں' آیتوں والے کیلنڈر اور چوکھٹے میں جڑا ہوا اندھا سا شیشہ' اوپر دو چھتی پہ ایک گٹھڑی میں بندھے توشک اور لحاف۔ تانبے کی ایک پُرانی سی ناند' فرشی حُقّے اور پرانی دریاں وغیرہ پڑی تھیں۔ ایک کونے میں لکڑی کے ایک چوکے پہ پھٹی پُرانی سی جائے نماز بچھی تھی جس کے ساتھ ایک تسبیح اور کچھ عربی کے قاعدے اور وِرد و دُرود کے کتابچے تھے۔ بڑی بی بی اسی لکڑی کے چوکے پہ بیٹھ کر کوٹھڑی میں موجود ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر قدموں میں بیٹھی ہوئی نصیبو سے اچانک پوچھا۔

''خواب میں دکھائی دینے والے بابا جی جو لال رومال میں باندھ کر روپے دیتے رہے ہیں وہ کہاں رکھے ہیں......؟''

نصیبو آنکھیں پٹ پٹا کر بڑی بی بی کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''بڑی بی بی! وہ تو خواب میں دیتے تھے' کوئی سچی مُچی سے لال رومال میں بندھے ہوئے روپے تو نہیں دیتے تھے...... عجیب بھولپن سے وہ کہہ رہی تھی...... ''وہ تو خواب تھا جو کئی برسوں سے مجھے ہر رات دکھائی دیتا ہے۔ ایک ساتھ ایک جیسا ہی۔''

بڑی بی بی اپنی موٹی خرانٹ آنکھوں کے بَرمے اس کی معصوم ہرنی جیسی وحشت بھری آنکھوں میں گھسیڑتے اور نتھ والی بند مُٹھی اس کے سامنے کھولتے ہوئے کہنے لگی۔

''مگر یہ نتھ تو تم نے حقیقت میں میرے مُنہ پہ دے ماری ہے اور لال رومال اور اس میں بندھا ہوا مال خواب تھا؟...... واہ' کیا تمہارا خواب اور تمہارا روپوں والا لال رومال' پھر تمہارے خواب والے بزرگ' جو مال تو خواب میں دیتے ہیں اور نتھ حقیقت میں اُترواتے ہیں......'' پریم رس کور اُٹھتے ہوئے بولی...... ''بدنصیبو' کم ذات! یہ خواب والے ڈرامے اور یہ بزرگوں والی کہانیاں ہم نے بہت سُنی ہوئی اور سنائی ہوئی ہیں...... خبردار جو آج کے بعد اس کوٹھڑی سے باہر قدم نکالا' چُٹیا سے پکڑ کر تجھے مہتر کے حوالے کر دوں گی۔ تمہارے سارے خوابوں کی تعبیر وہ ایسی نکالے گا کہ تم پھر کبھی ایسے خواب دیکھنے کے قابل بھی نہ رہو گی......''

نصیبو مضبوطی سے پاؤں پکڑتے ہوئے گھگھیائی۔

''بڑی بی بی! خدا کے لئے' میرے خواب والے بزرگ کے بارے میں کچھ مت کہو۔ مجھے چاہو تو مجھے مہتر کے حوالے کر دو یا کتوں کے آگے ڈال دو۔ جو چاہو سلوک کرو مگر میرے خواب والے......''

وہ چٹیا پکڑ کر اُسے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''میں بزرگوں' ولیوں' گیانیوں بھگتوں کی منکر نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کو جھوٹا' سچا کہتی ہوں مگر یہ تم ایسی مکار چھوکریوں کے خوابوں والے بابوں بزرگوں کو نہیں مانتی...... اگر تم ایسی ہی اپنے بزرگ پہ یقین رکھتی ہو تو نکالو کھرے چاندی شاہی مہر کے روپے جو تمہیں تمہارے بزرگ نے دو روپے کے حساب سے ہر رات خواب میں دیئے...... روپے میرے ہاتھ پہ دھرو اور میں یہ نتھ تمہارے ہاتھ سے کنویں میں پھنکوا دیتی ہوں۔ پھر تم جہاں چاہو گی' تمہارا پلّا باندھ کر میں اپنا پلّا پاک کر لوں گی......''

نصیبو کی چٹیا ابھی تک پریم رس کور کے ہاتھ میں تھی۔ منہ اوپر آسمان کی طرف اٹھا ہوا' آنکھوں میں آنسوؤں کی جھل دھارا۔ کپکپاتے' خاموش سے فریاد کرتے ہوئے ہونٹ۔ خاکستری چہرے پہ ٹھنڈا ہوا حزن اور ملال کی بجھی ہوئی ملاحت...... وہ اک عجیب بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اسی کُرلاتے ہوئے لمحے میں آسودہ سے شاید قریب ہی کہیں مسلمانوں کے علاقے سے کسی مفلوک الحال موذن کی کانپتی لرزہ لیتی ہوئی اذان کی آواز سُنائی دی۔ نصیبو نے بھیگی آنکھوں سے بڑی بی بی کے چہرے کی جانب دیکھا اور کہا۔

''بڑی بی بی! بڑے بے پرواہ کی کبریائی کا پیغام کانوں میں پڑ گیا ہے۔ اُس کی بڑائی اور یکتائی کے آگے سر جھکا لوں' پھر چاہے بالوں کی بجائے شہ رگ پکڑ لینا......''

بڑی بی بی نے چند لمحے اس کے الفاظ پہ غور کیا۔ ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح' حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' کی صدا کے دوران ہی اُس نے بال چھوڑ دیئے اور نتھ کو نماز والے چوکے پہ تسبیح کے قریب دھرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں آدھے گھنٹے میں واپس آ رہی ہوں۔ جب میں واپس یہاں پہنچوں' نتھ تمہارے نتھنے میں ہونی چاہئے یا پھر چاندی کے کھنکتے چمکتے سکّے نتھ کے ساتھ اس نماز کے چوکے پہ پڑے ہونے چاہئیں......''

وہ باہر نکلی تو نصیبو وضو کرنے بیٹھ گئی۔ ایسا وضو جو کنویں' نل یا نہر دریا کے پانی سے نہیں' آنکھوں سے بہتے جھرنوں سے ہوتا ہے اور یہ وضو ظاہری اعضاء سے زیادہ باطنی بدن کو منزّہ کرتا ہے۔ جب وہ خوب جل تھل ہو گئی تو پاس سرک کر نماز کے چوکے پہ آ گئی...... کبھی نمازی' نماز پڑھتا ہے اور کبھی نماز'

نمازی کو پڑھتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی نماز تھی۔ نہ قیام وقعدہ کی خبر اور نہ ہی سجود وسلام کا خیال۔ بس وہ سراپا عجز وفریاد اور اِک نالۂ آہ و بکا بنی ہوئی تھی۔ وقت کی اکائیاں' دہائیاں تو حساب وکتاب والوں کے ہاں ہوتی ہیں' دیوانوں کے ہاں تو وقت دَرد کے دَریدہ دَرودیوار کی دَرماندگی کی مانند ہوتا ہے۔ آیا' گیا۔ چل سو چل۔ ٹھہرا' تو ٹھہر گیا۔ وقت کی نبض ان کی کروٹ تلے دَبی ہوتی ہے' پہلو بدل لیا تو پہیہ گھوم گیا ورنہ وہیں وقت پتھر سل ہو جاتا ہے...... وہ وہیں سجدے میں ڈھے سی گئی۔ وہی بزرگ آئے' نتھ اٹھائی اور سُرخ رومال میں سو روپے بندھے ہوئے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''بڑی بی بی سے کہیو' دُوچھتی پہ تانبے کی ناند کے اندر بھی روپے پڑے ہیں۔ جیسی ضرورت پڑے نکال لینا......''

بڑی بی بی جب آئی تو مٹھی میں وہی نتھ اور کھلے منہ میں وہی دُشنام...... نصیبو تو دونوں بندھے ہاتھوں پہ گال ٹکائے' بے سُدھ سی نیم کھلے منہ سے رال ٹپکائے جیسے نیند کے رادھی پار اُتری ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں دیکھتے ہی بڑی بی بی کا پارہ چڑھ گیا' دو ہتھڑ جماتے ہوئے بولی۔

''حرام خور' مکار! نتھ میرے منہ مار کر بھاگ آئی ہے اور کیسے نیند کا ڈرامہ رچا کر مجھے بیوقوف بنا رہی ہے...... ٹھہر' ذرا تجھے مزہ چکھاتی ہوں......''

اُس نے ہنٹر منگوانے کے لئے ملازم کو آواز دی...... نصیبو ہڑ بڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی' پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑی بی بی کو دیکھ رہی تھی۔ خواب والے بزرگ کی زیارت' سو روپے والی رومال کی پوٹلی اور دُوچھتی پہ پڑی تانبے کی ناند والی بات اور نتھ اُٹھا کر لے جانے والا منظر' یہ سب کچھ ایک دِل بیز خوشبو کی مانند وہ محسوس کر رہی تھی...... وہ اب مسکرانے لگی' اِدھر ملازم چمڑے کا ہنٹر لے کر آ پہنچا تھا۔ بڑی بی بی ہنٹر لہراتے ہوئے خونبار نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''چھنال! اب دیکھتی ہوں کہ تو یہ نتھ کیسے نہیں پہنتی......''

بڑی بی بی نے ہنٹر لہرایا اور اُدھر نصیبو نیچے بیٹھ کر اپنی کمر ننگی کرتے ہوئے بولی۔

''بڑی بی بی! آج خوب اپنے جی کی بھڑاس نکال لو۔ میری چمڑی اُدھیڑ اُدھیڑ کر ہڈیاں ننگی کر ڈالو' مَیں اُف تک نہیں کروں گی مگر مارنے سے پہلے میری ایک چھوٹی سی بات ضرور سُن لو...... وہ یہ کہ اگر نتھ وہاں پھینکنے کی وجہ سے مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے تو مَیں بے قصور ہوں اور اگر کوئی اس کے علاوہ میرا قصور ہے تو مَیں حاضر ہوں' میری کھال اُدھیڑ ڈالو......''

بڑی بی بی نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ایک زور کا ہاتھ جڑ ہی دیا' ہنٹر لہرا کر معصوم

کی معدوم سی کمر کو چاٹ گیا۔ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اور ہنٹر کی تڑاخ سی گونج نے جیسے ایک بھونچال سا سماں پیدا کر دیا۔ نصیبو کو ہر چیز گھومتی اور لرزتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ چمک کر بولی۔

''بڑی بی بی! بڑا ہی سواد آیا ہے۔ ایک اور ذرا زور سے......''

اس نے اپنا کُرتہ ذرا اور اُوپر سرکا دیا۔ بڑی بی بی نے ہنٹر سمیت کر مارنے کے لئے پھر لہرانا چاہا تو جیسے بازو نے اُٹھنے سے انکار کر دیا ہو' بازو ٹوٹے ہوئے ٹہن کی طرح بے حس سا لٹکا ہوا تھا۔ وہ حیران اور پریشان سی اپنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر بازو شاید بے حس ہو چکا تھا۔ نصیبو نے جُھکا ہوا سر اُوپر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ بڑی بی بی اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو پکڑے ہوئے وہیں بُھوسا بھری بوری کی طرح تھپ سی ہو گئی۔ ملازم کو کہا کہ میری نس پہ نس چڑھ گئی ہے' جلدی سے میرے بازو کو اوپر نیچے ہلاؤ...... نصیبو اُٹھی اور بڑی بی بی کے بازو کو سہلاتے لگی' بولی۔

''بڑی بی بی! مالک ہو۔ جو چاہو' سو کرو۔ تمہیں زیبا ہے مگر قصور پہ سزا عقوبات بھی ہے۔ بے قصور پہ ظلم اللہ کو پسند نہیں......''

بڑی بی بی نے اسے دُھتکارتے ہوئے کہا۔ ''پرے ہٹ' کلموہی! چور بھی' جن بھی۔ مجھی سے مکاری اور مجھی کو [illegible] یہ نتھ میرے [illegible] مار کر میرے منہ پہ [illegible] آئی اور چلی مجھے انصاف اور ظلم کا سبق دینے......''

نصیبو بولی۔ ''بڑی بی بی! مَیں تو نماز کے چوکے سے ایک لمحے کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئی اور آپ مجھے اپنے کمرے تک جانے کا کہہ رہی ہیں...... اگر میری بات کا یقین نہیں تو یہ قرآن شریف پڑا ہے' مَیں اِس کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مَیں باہر نہیں نکلی......''

''تو پھر یہ نتھ میرے مُنہ پہ کون مار کر گیا ہے...... کوئی جِن یا تمہارا وہ خواب والا بزرگ......؟''

نصیبو نے بازو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جِن کا تو مجھے پتہ نہیں البتہ وہ بزرگ...... ہو سکتا ہے کہ یہ کام اُنہوں نے ہی کیا ہو کیونکہ آپ کے جانے کے بعد وہی میرے پاس آئے تھے۔ نتھ چوکے سے اُٹھا کر بولے کہ یہ تمہارے کے لئے نہیں۔ یہ چاندی کے پورے سو روپے رکھے ہیں۔ جو مانگتے ہیں' انہیں دے دو اور یہ بھی کہا کہ اگر اور بھی چاہئے ہوں تو اوپر تانبے کی ناند سے نکال لیں......''

پریم رس کور ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ''بخشو بی بی! مَیں لنڈوری ہی بھلی...... تم نکھندی مجھے سو روپلی دو گی اور مَیں سکھندی تمہارے سو روپوں سے اپنے ایک سو ایک گھاٹ پورے کروں گی......''

وہ پھر نتھ نماز کے چوکے پہ دھرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں جا رہی ہوں' بازو کو دبوا کر پھر لوٹوں گی...... فیصلہ کر رکھیو۔''

نصیبو بڑے اَدب سے بولی۔ ''بڑی بی بی! فیصلہ تو بزرگ کر گئے ہیں...... وہ تکئے کے نیچے آپ کے لئے چاندی کے روپے رکھے پڑے ہیں' گن لیجئے...... بزرگ نے کہا تھا' سُرخ رومالوں میں بندھے ہوئے تیرے ہر روز کے دو دو روپے بھی اُوپر تانبے کی ناند میں جمع ہیں۔ مانگنے والے کا سو روپے سے کھیسہ نہ بھرے تو اُوپر بھری ناند کا مُنہ کھول دینا......''

چوکھٹ پھلانگتی ہوئی پریم رس کور یوں رُکی گویا کسی نے اُس کی کمر سے بندھی ہوئی رسی کھینچ لی۔ وہ اِسے اور کبھی تکئے کو دیکھنے لگی۔ بالآخر کچھ سوچتے ہوئے اندر آئی' میلا چیکٹ تکیہ اُٹھایا اور چونکتے ہوئے یوں ایک قدم پیچھے ہٹ آئی گویا وہاں سُرخ بانات کی چاندی کے کھرّے سکوں سے بھری ہوئی مُعطّر پوٹلی نہ ہو کسی کا سُرخ لہو سے لت پت تازہ تازہ نکلا ہوا کلیجہ ہو۔ اُس کے تنگ تنگ ماتھے پہ ننھے ننھے پسینے کے ستارے سے چمکنے لگے' آنکھیں جیسے پتھرا سی گئی ہوں۔ تکیہ اُٹھائے وہ گویا پتھر کی سل سی ہو گئی' بھول ہی گئی کہ جس ہاتھ بازو سے اُس نے تکیہ اُٹھایا ہوا ہے' تھوڑی دیر پہلے وہ بازو ناکارہ سا ہو گیا تھا۔ تکیہ پرے چارپائی پہ پھینک کر اُس نے سُرخ بانات کی پوٹلی کو بڑی آہستگی اور احتیاط سے اُٹھایا۔ وزنی پوٹلی نے اُسے باور کرا دیا تھا کہ [illegible] پوٹلی کا [illegible] کھول کے [illegible] اسے چارپائی کی چادر پہ اُلٹ دیا۔ چمکتے کھنکتے ہوئے نقرئی سکّے گویا تازہ بہ تازہ' نئے نئے ٹکسال سے نکال کر لائے گئے ہوں۔ ایک روپے کو دانتوں تلے کچا اور ہاتھ کی اُنگلی انگوٹھے سے ٹھن ٹھنا کر دیکھا' سو فیصد اصل کھرّی تھوبی چاندی تھی۔ اب اُس نے اپنی سدا کی کھوٹی کانچی کی طرف دیکھا' جو کبھی بڑی بی بی' کبھی سُرخ باناتی پوٹلی اور کبھی چاندی کے کھرّے مُہرہ شاہی روپوں کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹھو......!''

پریم رس کور نے خود چوکے پہ بیٹھتے ہوئے' اِسے سامنے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب جیسے اُس کے چڑھے ہوئے سُر اُتر آئے تھے' لہجہ کی تلخی اور تُرشی جیسے حلاوت بھری شیرینی میں شیر و شکر ہو گئی تھی۔ بار بار روپوں' پوٹلی اور نصیبو کو دیکھتی پھر جیسے کچھ کہنا بھی چاہ رہی ہو لیکن الفاظ ساتھ نہ دے رہے ہوں...... ملازم کو دو گلاسوں میں شربت لانے کا کہہ کر وہ پھر ٹکٹکی باندھے نصیبو کو دیکھنے لگی۔

''بڑی بی بی! آپ بار بار مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہیں......؟''

اب جیسے پریم رس کور کو الفاظ مل گئے ہوں' بولی۔

''نصیبو! میں تمہیں دیکھ دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ تم کتنی خوش نصیب ہو اور میں کیسی بدنصیب

اور بُری ہوں کہ تم جیسی نیک' دیوی سمان اللہ کی بندی کو کتنا غلط سمجھا۔ کیسے کیسے ظلم وستم کیے۔ گالی گلوچ کی' ہنٹر مارے' بالوں سے گھسیٹا' اور تو اور تمہارے بزرگ بابا کے بارے میں گستاخیاں کیں...... میں سوچ رہی ہوں کہ میری بھی کہیں مکتی ہوگی' میں بھی کہیں بخشی جاؤں گی......؟"

ملازم شربت والے گلاس رکھ کر باہر نکلا تو پریم رس کور نے اُٹھ کر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ نصیبو کو نماز والے چوکے پہ بٹھایا اور خود اس کے پاؤں میں بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اب جو چھما چھم شروع ہوئی' رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ ہچکیوں میں کہہ رہی تھی۔

"بیٹی! مجھ گنہگار اَپرادھن کو معاف کر دو اور اپنے بزرگ سے بھی معافی دلا دو۔ میں دُنیا کی گندگی' ایک گندی گالی' عورت کے نام پہ کلنک کا ٹیکا...... بیٹی! میری زبان تو تجھے بیٹی کہنے کے قابل بھی نہیں...... دیکھ' تو اس بات کی تو شاہد ہے کہ میں نے تجھے کبھی بدکاری پہ نہیں لگایا۔ بس میری عقل بدھ ماری گئی جو میں نے تجھے نوکرانیوں نوچیوں' کونیوں کی طرح ناک کی نوک پہ رکھا......"

نصیبو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' کیا نہ کرے؟ الفاظ نہیں مل رہے تھے' بڑی مشکل سے اتنا کہہ پائی۔

"بڑی بی! [illegible] آپ ایسے الفاظ [illegible]...... آپ نے مجھے کچھ نہیں کہا' میرے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی......"

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب چاندی کا ایک روپیہ بہت بڑی دولت ہوا کرتا تھا۔ دمڑی' دھیلا' پائی۔ پیسہ' ٹکہ' آنہ' دونی کا دور تھا' ہر ضرورت انہی چھوٹے چھوٹے سکوں سے پوری ہو جاتی تھی۔ روپے کی حیثیت تو بہت اوپر کی سطح تھی' سینکڑہ اور ہزار تو کسی دھنوان کے پاس ہی ہوا کرتے تھے اور لکھ پتی کوئی لاکھوں میں ایک ہوتا تھا۔ سو روپے کی پوٹلی بہت بڑی رقم تھی۔ بڑی بی بی نے بسم اللہ پڑھ کر باندھ کے پوٹلی نصیبو کی جھولی میں ڈال دی اور بولی۔

"بیٹی! مجھے معاف کر' یہ سب کچھ تیرا ہے۔ میری کمائی' روپیہ پیسہ جائز اور حلال نہیں۔ تو اللہ والی ہے' آج سے تیرا کھانا پینا بھی اس گھر سے بند۔ پانچ روز کسی طرح کاٹ' پھر جو تیرے نصیب...... میرا مشورہ ہے کہ روشنیے کا دھیان چھوڑ۔ وہ عیبی اور نشے باز ہے' زندگی بھر تنکا توڑ کر دوہرا نہیں کیا۔ جوا' تاش' گنجفہ' چوسر کا رسیا...... ماتھے پہ حرام کی مُہر ٹھکی ہے' حرام کاری اس کا پیشہ ہے۔ اس کی جوانی' خوبصورتی اور لچھے دار باتیں اس کا خطرناک ہتھیار ہیں۔ بڑی بڑی منہ ماتھے والی طوائفوں' کسبیوں کو ٹانکے لگا چکا ہے...... اب چُھپانے سے کیا فائدہ؟ اس حرام خور نے میرا بڑھاپا بھی خراب کر دیا ہے۔ اس لئے میں بیٹی

سمجھ کر تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ اس لپاڑیئے کے چکر میں مت پڑو۔ اللہ کے اچھے اچھے بندے ہیں۔ کسی نیک' شریف اور غیرت مند انسان سے جڑو گی تو عزت آبرو سے رہو گی۔ یہ مرُوود' عورتوں کی کمائی اور بُرائی کھانے والا! میرے منہ میں خاک' یہ تو کل کلاں تمہیں بھی بُرائی میں دھکیلنے سے گریز نہیں کرے گا......''

''بڑی بی بی! یہ فیصلے تو اُوپر ہوتے ہیں...... ویسے اچھائی کو بُرائی اور بُرائی کو اچھائی میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آپ خود اپنی مثال لیں۔ پہلے آپ کا رویّہ کیسا تھا اور اب کیا ہے؟ اگر انسان خود اندر سے مضبوط' اپنی نیّت کوشش پہ مطمئن اور اپنے مالک کی مرضی و رضا کو اپنا مقدّر ماننے والا ہو تو پھر اسے جو کچھ بھی ملے' جیسا بھی ملے' جو بھی ہو گزرے اس پہ شاکر اور خوش رہنا چاہئے...... مَیں نے ہاں کہہ دی ہے' روشنیئے کو دِن بھی بتا دیا گیا ہے۔ اب میرے مقدّر......!''

روشنی خان اور نصیبو کے نکاح سے پہلے ہی پریم رتن کور مسلمان ہو کر اپنے تمام کام دھندے سے تائب ہو چکی تھی۔ پندرہ روز چکّی پیس کر اپنے لئے معمولی سا لباس بنوا لیا۔ تمام جائیداد اور مال و زر حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ چکّی کی محنت کے تین کپڑے چادر اوڑھے وہ پٹیالہ سے نکل گئی' خواب والے بزرگ نے اپنے ہاتھ سے مسلمان کر کے اِسے ہجرت کروائی۔ دو ہتھی والی تانبے کی ناند یعنی دیگ جو اُس کی نانی [illegible] کا حکم ملا۔ پٹیالہ [illegible] قادیان پہنچا وہاں ایک گاؤں سرسانی کے ذخیرے میں ڈیرہ جما لیا۔ کھانا پینا' کپڑا' ضرورت کی ہر چیز حتیٰ کہ روپیہ پیسہ بھی اسی تانبے کی ناند سے نکلتا رہا۔ روزانہ سینکڑوں میں لنگر تقسیم ہوتا تھا مگر ناند میں کبھی کمی نہ آئی۔ مائی سدا ورت کے نام سے مشہور ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے دوران ہندو مسلم فساد میں چند ناخلف قسم کے بلوائیوں نے مائی جی کو مسلمانوں کی ''دیوی'' سمجھ کر تِکّا بوٹی کر ڈالا' مال و دولت کے لالچ میں ناند کو اُلٹا پلٹا مگر سوائے خون کے اور کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ اُن کم بختوں نے مائی جی کے جسم کے ٹکڑے اسی ناند میں ڈال کر نہر میں بہا دیئے۔

روشنی خان اور نصیبو کی شادی انتہائی سادگی سے سرانجام پائی۔ کپڑے لتّے' زیور اور دیگر سامان' کھانا پینا' تمام چھوٹے بڑے اخراجات اسی سُرخ بانات والی پوٹلی اور تانبے کی ناند کے اندر کے خزانے سے ہوئے تھے۔ بڑی بی بی نے اپنی ناجائز کمائی سے ایک اَکنّی بھی خرچ نہیں کی تھی۔ اسی ناند سے خاصی رقم نکال کر کانج منڈی کے ایک اچھے علاقے میں دو منزلہ مکان خرید کر دیا' روشنیئے کو ایک اچھی خاصی رقم کاروبار کے لئے دی۔ مکان کے نیچے روشنیئے نے پان تمباکو کی دوکان کھول لی۔ لکھنؤ' مراد آباد' دہلی اور کانپور کے خمیرے' زعفرانی' شیریں نوش' مشکی' اَدکے' رابڑے۔ غرض کہ طرح طرح کے کشیدن' چشیدن تمباکو' بیڑے' گلوریاں۔ پیچوان' سرخلابے' سلفیاں' آگردان' بخورے' اُگالدان' آفتابے اور چاندی کے

دست پناہ۔ کولوں' موتی گیری اور کستورہ گوبری کے انگور ڈلے' سب کچھ فروخت ہونے لگا۔ روشنیے کی جامہ زیبی' محبوبانہ گفتگو والتفات' نرگسیت اور وجاہت وطرحداری نے بوٹے گل کھلائے۔ صاف ستھری' مشک وعنبر اور خمیروں سے مہکتی خوبصورت رنگین روشنیوں سے جھلملاتی ہوئی دوکان کیا تھی' ایک آئینہ خانہ گوشۂ تسکین وطرب تھا۔ ایک دو ملازموں کی شکل میں خُوبرو نوجوان ملازم بھی رکھ لئے...... روشنیے کی تو جیسے زندگی ہی بدل گئی تھی اور نصیبو کو تو وہ اب خوش نصیبو کہنے لگا تھا۔ اب دوکان نیچے اور اوپر گھر تھا۔ دیگر تمام خرمستیاں' دوستیاں' کمینوں اور سفلوں کی صُحبت یاریاں' تاش شطرنج اور نشے کی بازیاں' سب کی سب جیسے کبھی تھیں ہی نہیں...... اُدھر پریم رس کور کی حویلی اُجڑ کر پھر آباد ہو چکی تھی۔ اب وہاں کوئی آگرہ کی بائی آ براجی تھی۔ اُدھر بوم بسے یا بُلبل' اب روشنیے کے لئے سب برابر تھا۔

سانولی سلونی چیچک ماری' مریل سی نصیبو اب ایسی کھل کر نکھری کہ چھب ہی بدل گئی' دِق زدی ایسی کنول کی کلی کی مانند کھلی کہ جل پری کے آبی انگ سار کی لہلہوٹ سی جاپ پڑنے لگی۔ لکشمی ایسی مہربان ہوئی کہ تو آنے من بھاؤ کا روشنیے' دنوں میں نہال چند ہو گیا...... موسم بہار ہو تو کانٹے بھی کونپلیں دکھائی دیتے ہیں' پتہ پتہ پیار کے پرچم کی مانند لہراتا نظر آتا ہے۔ دھوئیں' خوابناک دُھند کا پیرہن پہن لیتے ہیں' اندھیرے بھی اور جگنو بھی اور چاہتوں محبتوں کی رُت فصل کی خمیدہ گردنیں بھی بڑی تمکنت وتفاخر سے تنی ہوتی ہیں۔ واقعتاً یہ سب کیفیتیں تنی تار کی طرح ہوتی ہیں جن کے تڑک سے ٹوٹ جانے کا دھڑکا ہر دم لگا رہتا ہے۔ دُرویش کے اِک تارے کی واحد تار بھی ضرورت سے ذرا کم ہی تنی یا پھر دانستہ ڈھیلی ڈھالی رکھی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کی ایک ہی ''ترنگ' تڑنگ'' ہوتی ہے' ایک اَلوہی رنگ انگ ہوتا ہے۔ سورنگی (سارنگی) یا سوتار (ستار) کی طرح الف لیلیٰ کی ہزار داستانیں نہیں ہوتیں' صرف اِک کھڑا الف ہی ہوتا ہے اور جو پورے حروف تہجی میں واحد مجرّد اور متکلم ہوتا ہے جیسے الف اللہ' احمد' ال م میں مجرّد اور متکلم ٹھہرا۔ اپنے اپنے فہم کی بات ہے' مجھے تو آلِ محمد بھی ''ال م'' متکلم اور متذکر دکھائی دیتی ہے۔

بات تھی کہ روشنیے کی تار تنی ہوئی تھی' دُھن تھا کہ مینہ کی مانند برس رہا تھا مگر دُرویش صفت' اللہ کی گائے' اِک تارے کی طرح ڈھیلی ڈھالی سی اِک تار دُھن' ساون بھیگی نہ بھادوں ہری۔ دُنیاداری میں تیرہ نہ تین کی' راگنی ایسی جو باجے کی نہ بین کی۔ تن پہ چکا چوند آئی ہو سو آئی ہو پر من اور بھاون میں وہی مسکینی اور عاجزی جیسے چار چوٹ کی سہہ کر ابھی کسی عقوبت خانے سے نکلی ہو۔ اوپر کے کام کاج اور اس کی نگہداشت' نگاہ داری کے لئے دو دو مامائیں موجود تھیں۔ مگر جب سے روشنیے کو گھر میں پاؤں بھاری ہونے

کی میٹھی سی گُن مُن لگی تھی' تب سے اُس نے نصیبو کو سختی سے کام کاج سے منع کر دیا تھا کہ اللہ دے رہا ہے' آرام کرو۔ من چاہا کھاؤ' پہنو۔ موج اُڑاؤ مگر ایک بات یاد رکھنا کہ مجھے پیاری سی بیٹی چاہئے...... وہ اس اُلٹی خواہش کا کیا جواب دیتی کہ لوگ بیٹا مانگتے ہیں' یہ بیٹی کی شدید خواہش کر رہا تھا۔ بار بار کی تکرار سے تنگ پڑتے ہوئے آخر اس نے ایک دن کہہ ہی دیا۔

''روشنیے! من چاہیاں کرنا اگر انسان کے اپنے بس میں ہو تو اس دُنیا کا نظام دو دن بھی نہ چلے...... انسان صرف سوچ سکتا ہے' چاہ سکتا ہے' خواہشیں پال سکتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو وہ قادرِ مطلق چاہتا ہے۔ اُسی کو ہی تقدیر یا مقدّر کہتے ہیں...... جو بھی ہمارے مقدّروں میں ہو گا وہ ہمیں مل جائے گا......''

مگر روشنیے کا تو صرف نام روشنی خان تھا' ویسے ہی جیسے کسی کا نام علم دین ہو اور ضروری نہیں کہ وہ عالم فاضل بھی ہو۔ نُور عالم اندھا اور کالا بجھنگ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ روشنی خان بھی دراصل علمی' عقلی اور باطنی طور پہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر چہرہ مہرہ' پیکر و پاؤں ہاتھ ایسے اُجلے کہ دیکھا کرے کوئی...... فصلِ شباب نے انگارے سے دہکا رکھے تھے' دیکھنے والوں کی نگاہیں جُھلس جاتی تھیں۔ جنسِ مخالف کے لئے ایسی کشش تھی کہ سات بچوں کی ماں سب کو سنکھیا کھلا کر اس کے پیچھے ہو لے۔ پریم رس کور کی مثال سامنے تھی۔ اُس پہ قیامت یہ کہ روشنیے کو اپنی اس طاقت کا علم اور ادراک بھی تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے پاس اپنی جاذبیت اور پُرکشش شباب کی کتنی بڑی دولت ہے اور یہ حقیقت تھی کہ پورے پٹیالہ کی تمام ڈیرہ دارنیاں' طرحدار اور ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دینے والی خوبرو طوائفیں' نوچیاں' نتھ باریاں' پسریاں اس دانۂ یکتا پہ دل اور آنکھ رکھتی تھیں۔ ایک مشہور طوائف نے اسے یہاں تک کہا کہ روشنیے! تجھ سے اگر ایک بچی مل جائے تو اپنے چار بیٹوں کا بلیدان چڑھا دوں' سیر بھر پکا سونا قدموں میں رکھوں اگر ایک بار میری سیڑھیاں چڑھ آئے...... اس تناظر میں اگر دیکھا اور سوچا جائے تو روشنیے کا مسکین سی غریب نصیبو کا شادی کے لئے ہاتھ تھامنا اور پریم رس کور جیسی دھڑلے کی ڈیرہ دارنی جس کا وہ منظورِ نظر رکھیل تھا' سے ٹکر لینا اور سب سے بڑی بات کہ اس بازار سے نصیبو کو ایک چھدام خرچ کئے بغیر بیاہ کر لے جانا' ساتھ ہزاروں کا جہیز بھی اُٹھوانا سمجھ میں نہیں آتا جبکہ حرام الولد' اس بازار اور ماحول کے پروردہ نشاط پیشہ حضرات میں غیرت وحمیّت' اخلاق جرأت اور والا تباری و وقار کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔

نصیبو اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی اور جو نہیں جانتی تھی وہ پریم رس کور نے بتا دیا تھا۔ یہ شخص کسی بھی لحاظ سے اس کا اہل نہیں تھا' اس کے باوجود نصیبو با رضا و رغبت اس کے ساتھ مناکحت پہ راضی ہوگئی اور اب اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ یہ سب کچھ بظاہر بڑا عجیب و غریب اور اَن ہونا

سا لگتا ہے مگر ایسا نہیں۔ یہ تو ازل سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ اچھائی میں بُرائی' بُرائی میں اچھائی۔ غلط میں صحیح اور صحیح میں غلط۔ نیکی بدی' اصیل سفلے' یہ سب کچھ صرف ہمیں ضابطے اور قطار میں رکھنے کے لئے ہیں۔ ہمیں اس درمیانی فرق اور ہلکی سی حد بندی سمجھانے کے لئے وضع کی ہوئی اکائیاں ہیں۔ ایک بہت ہی طویل (یا چند لمحوں کی) بظاہر زندگی طے کرنے کے بعد یہ نکتہ ہلکا سا سمجھ میں آیا کہ بے علمی اور بے عقلی بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جتنی علم یا عقل ہے۔ نیکی' اچھائی' سچائی' عقلمندی' بہادری' حیا' وفا' کردار اور خاندان و نسب وغیرہ یہ سب کچھ محض اصطلاحیں اور اکائیاں ہیں تاکہ ہم باہمی کسی فرق و تفاوت کو ظاہر کر سکیں۔ قدرت کے اصولوں' طریقوں اور قانونوں کو دیکھیں۔ ہر چیز کو ایک ضد کے ساتھ پیدا فرمایا۔ کسی کو ظاہر کیا اور کسی کو پردہ دے دیا۔ حضرتِ انسان ہی کو لیں' عجیب مجموعۂ تضاد ہے۔ گھڑی میں تولہ' گھڑی میں ماشہ۔ لاکھوں میں ایمان دکھائے اور دمڑی دھیلے کے لئے جھوٹ بولے۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم' پتھر کبھی ہیرا' زہر کبھی تریاق' بزدل کبھی بہادر۔ چار کتابیں پڑھ کر سینہ پھاڑ دے تو مسیحا کہلائے اور کوئی چار دن کے فاقے کو ٹالنے کے لئے کسی کی معمولی سی جیب یا کسی کا پیٹ کاٹ لے تو جیب کترا اور قاتل کہلائے۔ یہی پیٹ و جسم جس میں دو لیٹر پیشاب' ڈھائی لیٹر گندگی' پیپ' کیڑے' شُدے' غلیظ آلائشیں' غدودیں' حرام مغز' حرام خون اور پتہ نہیں کیا کچھ [illegible] ہے۔ یہ بدبوئیں اور حشرات [illegible] دھرے پڑے ہیں اور ہم بڑے صاف ستھرے پاک منزہ ہیں۔ کیا کیا بے ایمانیاں' شرارتیں' اُستادیاں اور بُری بُری ترکیبیں اور تماشے ہمارے دماغ میں ایجاد ہوتے ہیں مگر ہم نیک' پارسا اور مخلص ہیں۔ دل میں کیا کیا اصنام اور بُت دھرے ہوتے ہیں' کیسے کیسے وسوسے اور خیالات جنم لے رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آنکھیں' کان' لب' ہاتھ' پاؤں' پورا انسانی نظام ہی اچھائی بُرائی' نیکی گناہ' سچ جھوٹ' انسانیت کمینگی' حلال حرام' پاکی پلیدی کی ضدوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر سُرخ صالح خون کی ورید کے ساتھ نیلے رنگ کی رگ حرام خون کی ہوتی ہے جیسے بجلی کی دو تاریں' سُرخ اور کالی۔ تازہ خون کی اور' استعمال شدہ خون کی اور...... ہر صالح' طیب' خوش نظر و خوش وقت' تازہ اور لذیذ غذا' تعلق' سوچ' فکر' سفر' رویے' روایات' اصول' قانون' رشتے اور راستے اپنی ضد کی طرف لوٹتے ہیں۔ بظاہر ایک بُرا آدمی جب ہدایت پکڑتا ہے تو ولی اللہ بن جاتا ہے۔ چور سے قطب بننا' راہزن سے ولی بننا' غلام کا بادشاہ بننا' گڈریے کا سربراہ بن جانا...... اسی طرح بڑے بڑے ذی جاہ و ذی شان' بڑے بڑے عالم دین' پرہیزگار اور ولی جب قعرِ مذلت میں گرے تو ایسے بُری طرح گرے کہ ان کا نام و نشاں بھی باقی نہ رہا۔

اس طولانی تمہید سے یہ ظاہر ہوا کہ کبھی کسی کو بُرا نہ کہو البتہ اس کے اعمال کو بُرا یا غلط کہنا

عین واجب ہے۔ کسی کو نیچ' کمتر اور پیشے کے لحاظ سے بھی کبھی چھوٹا اور کھوٹا نہ سمجھو۔ رنگ روپ' قد کاٹھ' بداعضائی' عقل' سمجھ بُوجھ اور ذات پات کی بناء پہ بھی کسی سے نفرت نہ کرو کہ ایسے لوگوں میں اکثر صاحبِ حال و جاہ و جمال ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی کی صورت' دولت' عزت و شہرت' حسب و نسب اور رُتبہ و مقام دیکھ کر بے جا خوش ہو کر اس کی خوشامد کرنی چاہئے کہ ایسے لوگ اکثر بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ انہی افراد میں بیشتر چور ڈاکو' اسمگلر' بلیک کرنے والے' منشیات فروش' شرابی کبابی' جواری ہوتے ہیں...... آپ نے دیکھا کہ پریم رس کور کیا تھی' اُس کا قماش کیا تھا۔ اُس نے کیسی اوباشی میں وقت گزارا تھا اور کیسی بدمعاشی اور عیاشی کی زندگی بسر کر رہی تھی مگر ایک دھان پان سی مغویہ اور مدقوق' چیچک رُو' کسبیوں کی ٹھوکروں میں بیٹھ کر ان کے پاؤں دابنے والی عاجز سی لڑکی نے ایک قحبہ گر چھنال کی زندگی کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ اس لڑکی کے پاس صرف صبر' برداشت' خدمت' اخلاص اور نماز والے چوکے کی استعانت تھی۔ اس کی غریب صابر و شاکر ماں نے کہیں سے تسلیم و رضا کے نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ انسانی بساط صرف کر لینے کے بعد اس تسلیم و رضا کی پتلی نے اپنی اس بچی کو اپنے مالک کے سپرد کر دیا تھا۔ پھر اس نے ہر تہجد کی نماز پہ وظیفہ رحیم اپنا ورد بنا لیا۔ اپنی ایک چھوٹی سی بے بضاعتی کی درخواست بھیج دی' بس کسی اچھے موقع پہ درخواست قبول ہوگی' بننا ہے مرتبے بچی کی راہنمائی ہوئی۔ معلوم یہ ہوا کہ جب کسی ایک کی راہنمائی ہوتی ہے تو ساتھ کئی اور بھی فیض پاتے ہیں۔ جیسے قرآن ایک حفظ کرتا ہے اور گرد بخشے کئی جاتے ہیں۔ شادی ایک کی ہوتی ہے خوش دوسرے اور زردہ پلاؤ کئی اُڑاتے ہیں۔ قوالی کسی ایک کے ہاں ہوتی ہے مگر سُننے بہت سے ہیں۔ نصیبو کی وجہ سے پریم رس کور سیدھی ہوگئی' روشنیئے کی زندگی کا رُخ بدلا اور اب تو اس قطار میں ایک نئے فرد کو بھی شامل ہونا تھا لیکن وہی روشنیئے کی ہٹ کہ مجھے بیٹی ہی چاہئے اور وہی کہ اگر انسانی خواہشیں اس کی مرضی کے عین مطابق پوری ہونی شروع ہو جائیں تو پورا نظام بگڑ کر رہ جائے۔ اللہ کو سب بھول جائیں کہ خواہشیں تو خود بہ خود پوری ہو رہی ہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ بابِ مدینۃ العلم حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ربّ کو اپنی خواہشوں کے نہ پورا ہونے سے پہچانا...... سب جہانوں کا مالک و خالق جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہم تو محض سوچ سکتے ہیں یا پھر خواہش کر سکتے ہیں' گڑگڑا کر مانگ سکتے ہیں۔ اب اُس کی رضا کہ وہ دے یا نہ دے۔ ہر دو حالت میں راضی رہنے کا نام تسلیم ہے' یعنی اپنے مالک کی رضا پہ راضی رہنا ہی اصل بات ہے۔ بندہ سمجھے نہ سمجھے' اُس کی کہیں نہ کہیں بہتری اسی میں ہی مضمر ہوتی ہے...... پھر تسلیم نے جنم لیا' یہ نام نصیبو کے بزرگ نے خواب میں رکھا تھا۔ زچہ کی سارا دن نگاہ دروازے پہ جمی رہی مگر روشنیئے نیچے دوکان سے اُوپر نہیں چڑھا تھا۔ تین ٹوکرے

امرتیوں والے اس نے پچھواڑے گنیش جی کے مندر میں ہاتھی گنیش راؤ کے آگے بطور پرت پرشاد ڈلوا دیئے تھے اور شام کو وہ دوکان پہ ملازموں کو بٹھا کر متھرا گلی نکل گیا۔

● فیروزہ اور گندہ بیروزہ......!

بازار ابھی بُجھا بُجھا سا تھا۔ انسان جب اپنی کسی خواہش یا تمنّا کی ناکامی پہ پریشان' اُداس یا مایوس سا ہوتا ہے تو پھر اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا' جگمگ جگمگ کرتی روشنیاں بڑی بے نور اور اندھی سی لگتی ہیں۔ کوئی ہنسے کِھلکِھلائے تو بھی اچھا نہیں لگتا۔ خوشبو وحشت پیدا کرتی ہے اور اپنے بیگانے سے لگتے ہیں۔ گو بازار میں ابھی وہ چہل پہل اور رونق نہیں تھی۔ دوکانوں' دروازوں اور نکڑوں پہ ٹھٹ اور نہ ہی ابھی دریچوں' دروں اور بالا جھروں پہ سے ریشمی پردے پوری طرح سرکے تھے' آنکھوں کے ستارے اور چہروں کے چاند بھی تو ابھی نہیں نکلے تھے۔ موی بازوؤں' اُنگلیوں' ہاتھوں کی شمعیں فروزاں ہوتیں تو شاید بازتماش بین' بھڑوے' ہار گجروں والے بھی نکلتے۔ وہ واقف کاروں اور سابقہ ہم پیشہ وروں سے نگاہیں بچاتا ہوا امرت بائی کے والی سیڑھیوں پہ چڑھ آیا۔ خانہ زاد ملازم پیشہ اہلکار چاندنیوں تکیوں کی سلوٹیں دُرست کر رہے تھے کہ وہ دیوان خانہ پھلانگتا ہوا اندر شہ نشین کی جانب بڑھ گیا۔ امرت بائی کی نوچی' فیروزہ آئینے کے روبرو ایک شعلہ جوالہ بنی بیٹھی اپنے جُوڑے میں جُوہی کی کلیاں سجا رہی تھی' روشنیے پہ نگاہ پڑتے ہی اُسے جیسے سکتہ سا ہو گیا...... یہ کیا؟...... اُسے اس کا یوں آنا ایک خواب سا لگا۔ وہ تو ان بازاروں گلیوں سے ناتا توڑ کر بہت دُور چلا گیا تھا اور پھر اس بازار کی سب سے چلبلی' خوبصورت' طنطنے اور دَم خم والی فیروزہ کے ہاں اور وہ بھی سیدھا تیر کی طرح اندر چلا آیا تھا۔

موٹے موٹے نین' شفتالو جیسے گالوں اور رَس بھرے عنابی ہونٹوں کے پیچھے ننّھے موتیوں جیسے دانتوں والی فیروزہ' فیروزپور کی تعلیم یافتہ طوائف زادی تھی۔ انیس بیس کا سِن' بوٹا سی قامت' شہاب وعناب رنگت' کالی رَین کی طرح سیاہ دَراز گیسو۔ وہ مُڑی ہوئی دراز سیاہ پلکیں اُٹھاتی' جُھکاتی تو مقابل کا کلیجہ بھی جھکول کھا جاتا۔ خدا جانے اِس بازار میں کیسے بیٹھ گئی تھی' اُس کے لئے تو کسی ریاست کے ولی عہد کی چھاتی یا گود میں بیٹھنا عین واجب تھا...... روشنیے اُسے ایک بیگانہ سی نظر دیکھتے ہوئے دھپ سے بچھی ہوئی دوتہی پہ ڈھیر سا ہو گیا۔ فیروزہ نے ایک مستانہ نگاہی سے اسے دیکھا' وہ کافی بَدلا بَدلا سا تھا۔ شباب جیسے کچھ اور نکھر آیا ہو' سادہ سا مگر قیمتی لباس...... کچھ حسین لوگ قدرتی طور پہ ہی ''جامہ زیب'' ہوتے ہیں' خالی لنگوٹ

بھی پہن لیں تو پھبتا جچتا ہے اور وہ تو تھا ہی شہزادہ!...... فیروزہ اس کی غلافی آنکھوں میں مستی اور اُداسی کی گنگا جمنی کیفیت بھانپ کر ہلکے سے مسکرا دی۔ طوائف کی طبیعت اور تربیت بھی نرالی ہوتی ہے۔ اس کے عشرت خانے پہ بندہ گرے یا پرندہ' بجلی گرے یا تجلّی' بدمعاش یا بھلامانس' وہ سب کا سواگت کرتی ہے۔ وہ انسان اور مزاج شناس ہوتی ہے' دلنوازی اور دلداری کا دریا نہیں بلکہ ایک سمندر ہوتی ہے۔ رُجھانا بہلانا' عشوؤں اور اداؤں سے دلوں میں سیندھ لگانا اس کا اصل پیشہ اور ہنر وفن ہوتا ہے۔ اِن بازاروں' گلیوں میں جانے والے اکثر لوگ ضروری نہیں کہ عیاشی یا بدکاری کے لئے ہی جاتے ہوں اور یہ بھی نہیں کہ یہاں صرف عیاش' بدکار اور جسم و ادا فروش ہی رہتے بستے ہیں بلکہ یہاں منزّہ نفس' نیک' باکردار اور بلند و اعلیٰ اخلاق و اعمال والی ہستیاں بھی فروکش ہوتی ہیں۔ مسجدیں' مدرسے' امام بارگاہیں' اولیاء اللہ کے مزار بھی ہوتے ہیں۔ موسیقاروں کے بڑے بڑے گھرانے اور ڈیرے ہوتے ہیں' سماجی اور فلاحی بہبود کے ادارے ہوتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو ہمارے ثقافت اور فنونِ لطیفہ کی ساری وراثت کے سوتے یہیں سے پھوٹتے اور پروان چڑھتے ہیں...... فیروزہ جان گئی تھی کہ یہ جانِ بہار اپنے دل میں کوئی غبار لئے ہوئے آیا ہے' دِلربائی سے پوچھنے لگی۔

"سلام نہ آداب...... تسلیم نہ تسلیم......؟"

وہ یہ سن کر یوں بدکا ہوا اُٹھا گویا نیچے سے کسی بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو' وفورِ غضب سے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ ہذیان کے انداز میں بکنے لگا۔

"وہاں بھی تسلیم اور یہاں بھی تسلیم...... مجھے نہیں چاہئے تسلیم......!"

فیروزہ حیران و ششدر سی اُٹھی' بڑی لگاوٹ سے اس کے کندھے پہ دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔

"بیٹھو تو سہی...... تسلیم کہہ کر ہم سے ایسی بھی کیا خطا ہوئی' روٹھیئے جی! ہمارا مطلب تھا کہ ایسے منہ دھیانے تم آئے کہ جیسے کوئی ویرانے میں آ بیٹھے۔ ہم سامنے آئینے کی مانند دھرے بیٹھے ہیں۔ کچھ تو آداب تسلیم کہو کہ معلوم پڑے' کوئی بھولا بھٹکا ہرجائی مُدتوں بعد اس کوٹھے کی راہ لگا ہے......"

"پھر تسلیم...... کیا تم تسلیم کہے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتیں......؟"

وہ اس کے ڈھلواں شانے پہ کاٹ دار ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے چہکی۔

"اچھا' اب نہیں کہتے...... بولو' کچھ کھاؤ گے یا کچھ پیو گے؟"

"کچھ بھی ہو' مگر اس میں زہر ضرور شامل ہونا چاہئے......"

وہ اس کے کان کی بے لگی لو کو نتھ والی ناک کی پھنگ سے چھوتے ہوئے بولی۔

''شش' زہر تیرے دُشمنوں کو جو تیری قدر نہ جانیں......نصیبو کیسی ہے' گھر میں خیریت تو ہے نا؟''

''بیٹا جنا ہے' تسلیم نام رکھا ہے......میں نے اُسے شروع دنوں سے کہا تھا کہ مجھے بیٹی چاہئے۔ اب بول' میرا دماغ نہ بگڑے تو کیا بگڑے؟''

وہ اس کے جسم کی خوشبو کا مزہ لیتے ہوئے بڑی لٹک میں بولی۔

''بیٹے کی مبارک ہو' روشنیے! بیٹیوں سے تو یہ بازار بھرے پڑے ہیں' ایک نہ ہوئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پھر یہ کوئی کسی کے بس کی بات تو ہوتی نہیں کہ جو چاہو' وہی ہو۔ بس وہ جو دے' اُس کے آگے سرِتسلیم کرنا چاہئے......''

وہ اُس کا سر اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

''جب میں پیدا ہوا تھا تو میری ماں نے مجھے اُتنے دن بھی اپنے ہاں ٹھہرنے نہیں دیا تھا جتنے دن اُس نے مجھے اپنی کوکھ میں ٹھہرا کر رکھا تھا۔ میری نانی نے مجھے ایک دُور دَراز گاؤں میں ایک پیشہ ور دایہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میرے ماں باپ کون ہیں' دوسرے اپنی طرح کے بچوں کی طرح ہی اِسی دایہ کو دادو کہہ کر بلایا کرتا تھا اور پھر جب میں نے قد کاٹھ نکال لیا تو میری ماں مجھے [illegible] نانی مر چکی تھی اور ماں اپنی جوانی کے [illegible] دن [illegible] چکی تھی۔ میرے اوپر دو بہنیں پیدا ہوئی تھیں جو اب ماں کے بڑھاپے کا سہارا تھیں۔ مجھے اُستادوں کے سپرد کر دیا گیا جہاں میں نے مختلف ساز بجانے سیکھے۔ جب تیار ہو گیا تو بہنوں کے مُجرے میں سنگت کرنے لگا۔ میری ماں نے مجھے کبھی اپنا بیٹا اور بہنوں نے کبھی اپنا بھائی نہیں کہا۔ مندا ہوتا تو میں کوئی تماش بین پھانس کر لاتا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میرا باپ کون ہے؟......ماں مر گئی تو بہنوں کی کمائی کھانے لگا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مجھے پریم رس کور بڑے بڑے سبز باغ دِکھا کر زبردستی اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ مجھے ایک اچھا سازندہ سمجھ کر ساتھ لائی ہے' یہ تو بعد معلوم ہوا کہ وہ مجھے ایک اچھا پرندہ جان کر یہاں لائی ہے۔ اور جب پرندہ کسی قفس میں قید ہو جاتا ہے تو پھر مشکل سے ہی نکلتا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ طوائفوں کے ملازم' اِن کے اسیر' اِن کے گھر کے پالتو جانور' کتے' بلّیاں' طوطے' مینائیں' یہ مر کر ہی وہاں سے نکلتے ہیں' جیتے جی ساتھ نہیں چھوڑتے مگر میں کسی نہ کسی طرح بڑی بی بی کے چنگل سے نکل آیا۔ نصیبو کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کبھی شادی کرنے کا خیال آیا تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا' میں خود حیران ہوں۔ جیسے کسی نادیدہ سی طاقت نے مجھ سے یہ سب کچھ زبردستی کروا دیا ہو۔ نصیبو جو کبھی اچانک سامنے بھی آ جاتی تو طبیعت مالش کرنے لگتی تھی' اچانک مجھے اچھی لگنے لگی۔ پھر ایک وقت ایسا

بھی آیا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مَیں اس کے بغیر ادھورا ہوں' مَیں اس کے بنا جی نہیں سکتا۔ نصیبو پہ کسی بزرگ کا سایہ بھی تھا' وہ ہر شب اس کے خواب میں آ کر زیارت کراتے تھے۔ ہماری شادی میں اُن بزرگ کی مرضی اور مدد بھی شامل تھی۔ بقول نصیبو' یہ تسلیم نام بھی اُنہی بزرگ کا ہی دیا ہوا ہے لیکن مجھے بیٹا نہیں چاہئے تھا...... مَیں نے بچّی کو دیکھا ہے اور نہ ہی نصیبو کے پاس گیا...... دوکان پہ ملازموں کو بٹھا کر مَیں گرم گرم دماغ کے ساتھ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس طرف نکل آیا ہوں......''

وہ اٹھلاتے ہوئے کہنے لگی...... ''سُنتے آئے تھے کہ خوبصورت' حسین اور مَن موہنے لوگ اکثر بے وقوف' بے عقل اور پھوہڑ مغز ہوتے ہیں۔ تمہاری کتھا کہانی سُن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں......''

وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب غلط ہے' اس کا ثبوت تم خود ہو جو نہ پھوہڑ' بے وقوف اور نہ بے عقل ہو...... ویسے یہ کچھ اگر تم نے میرے لئے کہا ہے تو بھی یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ نہ مَیں کوئی ایسا خوبصورت ہوں اور نہ......''

پھر وہ جھنجھلا کر بولی۔ ''اچھا' چھوڑو...... یہ سب...... گھر جاؤ' نصیبو تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اُسے تسلی اور مبارک دو' تسلیم کو گود بھر کر چومو پیار کرو اور اُسے اچھی اچھی دُعائیں دو......'' پھر بالکونی میں کھڑی ہو کر سامنے طوائفوں کے چوباروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''خوش نصیب ہو کہ تمہیں نصیبو جیسی پاک دامن اور کسی اچھے خاندان کی شریف سی بیوی ملی جس کے بھاگوں تمہیں بھی اس دلدل سے نکلنے کا موقع ملا اور اولادِ نرینہ نصیب ہوئی...... تم پاگل ہو جو بیٹی کے طلبگار ہو...... مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم بیٹی اس لئے طلب نہیں کر رہے کہ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے بلکہ صرف اس لئے طلب کرتے ہو کہ تم خود ایک طوائف بنتِ طوائف کے گھر پیدا ہوئے۔ تمہیں اپنے باپ کا پتہ نہیں کہ وہ کون تھا۔ ہندو' مسلمان' سکھ یا عیسائی؟ تم نے ناآسودگیوں' محرومیوں اور ماں باپ کی ممتا' شفقت کے بغیر جو زندگی گزاری بس اسی کا خوف اور اندیشہ تمہارے دماغ میں گھس کر بیٹھ گیا ہوا ہے جس کی وجہ سے تم بیٹے سے نفرت کرتے ہو۔ اب سوچنے کی یہ بات ہے کہ اگر تم کوٹھوں' بالاخانوں سے نکل چکے ہو تو پھر یہاں کی ریتوں روائتوں کو بھی بھول جاؤ اور اگر تم ابھی تک آسمان سے گر کر کھجور میں ہی اٹکے ہوئے ہو' نانی اور اماں کے پیشے قماش کو نہیں بھولے تو پھر تمہیں حسبِ ضرورت بیٹی کی خواہش ہی کرنا چاہئے...... اب سوچ لو' تم زندگی کے جس دوراہے پہ کھڑے ہو وہاں تمہیں صرف ایک واضح راستہ اختیار کرنا ہے۔ بیٹے والا یا بیٹی والا' قلم درانتی ہتھوڑے والا یا طبلہ سارنگی اور گھنگھروں والا' اللہ کی تسلیم و رضا والا یا طوائفوں کے مجروں کی آداب و تسلیم

والا......"

"فیروزہ! مَیں تو تمہارے پاس اپنا غم غلط کرنے آیا تھا اور تم نے مجھے آگے سے بھاشن دینے شروع کر دیئے......"

وہ ایک اَدائے دِلربائی سے اپنا خوبصورت سا ہاتھ اس کے آگے لہراتے ہوئے بولی۔

"میرے ہاتھ کی تیسری اُنگلی کو غور سے دیکھو' چھوٹی سی انگشتری میں تمہیں اِک قطرہ آبِ زلال کی مانند سپیدی مائل ننھا سا فیروزہ دِکھائی دے رہا ہوگا۔ اکثر فیروزے' فیروزی رنگت ہی ہوتے ہیں مگر نیشاپوری فیروزوں میں ایک علیحدہ سی قسم زلالی فیروزوں کی بھی ہوتی ہے جو بے حد نفیس' سپیدی مائل' سکون آور' سعد' معتدل مزاج اور انتہائی سریع الاثر سمِ قاتل بھی ہوتے ہیں' ہتھیلی پہ رکھ' ہلکا سا تھوک دو اور پھر نگل لو تو کلیجہ کاٹ کر رکھ دیتے ہیں' یعنی یہ اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔ اس نیشاپوری فیروزے کی طرح مَیں بھی فیروزہ' فیروز پور والی ہوں' سہاگن عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ نصیبو تیرے گھر میں بیوی کی حیثیت سے نہ ہوتی تو آج تیری آمد پہ بالاخانے کے دروازے بند اور دل کا دروازہ کھلا ہوتا...... مَیں نے آج تک کسی عورت کے خاوند کو بالاخانے پہ چڑھنے نہیں دیا اور کسی بے بیوی کے عیاش کو نچوڑے چھلکے بغیر سیڑھیوں سے اُترنے نہیں دیا اور پھر یہاں تو اللہ والی نصیبو کی بات ہے۔ اس تسلیم و رضا کی بندی نے تجھے ترجیح دی اور تو اُس پاکیزہ' معصومہ اور مظلومہ کو جاں کنی کی حالت میں چھوڑ کر یہاں اپنا جھوٹا غم غلط کرنے چلا آیا...... بدنصیب! جا' چلا جا اُس خوش نصیبو کے پاس جس کے ہاں تیری دُنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنے کے وسیلے ہیں......"

وہ ایک راہ کھوٹی کیے ہوئے صحرائی اُونٹ کی مانند جباڑا کھولے ہوئے' پھیلی پھیلی آنکھوں سے اِس فیروزپوری "چوہیا" کو دیکھ رہا تھا جس نے اس کی ساری مردانہ پان پَت اُتار کر اس کی ہتھیلی پہ دَھر دی تھی اور اُس کی تکمیل اُسی کو تھما کر نخلستان رُخ کر دیا تھا۔ وہ جانے لگا تو آخری گرہ باندھنے کی غرض سے تبرکاً کہنے لگی۔

"جن خوش نصیبوں کے ہاں ہدایت اُترنے والی ہوتی ہے نا' اُن کے ہاں پہلے نیک' سگھڑ اور دین دار بیویوں کی ڈولیاں اُترتی ہیں اور جن بدنصیبوں کی دُنیا اور دین برباد ہونے ہوتے ہیں اُن کو خوبصورت' بے دید و لحاظ' دین اور شرم و حیا سے بیگانہ' بازاری قسم کی زبان دراز عورت نما عفریتوں کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے......"

وہ سیڑھیاں اُترتے ہوئے سوچ رہا تھا...... میرے مولا! مَیں گھر کی مولویان سے بِدک کر یہاں

پہنچا تھا' آگے مجھے مُفتیانی ٹکری...... واپسی پہ اِسے یوں لگا گویا وہ کسی دھوبن کے پاس سے اپنی طبیعت صاف اور فطرت اُستری کروا کر آ رہا ہے۔ چھمن داس حلوائی کی دوکان کے آگے اس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ دو ٹوکریاں اَمرتیاں بندھوا کر جب وہ اپنی دوکان کے قریب پہنچا تو راج گنج کے بیپر ووں کی مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوئی...... ''حی علی الصلوۃ' حی علی الفلاح''...... دوکان پہ مٹھائی اُتار کر وہ گھر کی بجائے مسجد کی جانب بڑھ گیا۔

معلوم ہوا کہ ہدایت جہاں سے ملنی ہوتی ہے' وہیں سے ہی ملتی ہے۔ جہاں کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی نگاہ کام نہیں کرتی وہاں کسی انتہائی گنہگار' بدکار اور بُرے اِنسان کی بات بول کام کر جاتے ہیں۔ ماں باپ کہتے کہتے تھک ہار' عاجز آ جاتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا مگر وہی بات کوئی اجنبی کہہ دیتا ہے تو فوراً مان لی جاتی ہے۔ بڑے بڑے قابل اور کوالیفائیڈ ڈاکٹروں معالجوں سے افاقہ نہیں ملتا اور فٹ پاتھ پہ بیٹھنے والے عطائی حکیم سے شفا نصیب ہو جاتی ہے۔ مَیں نے پڑھا ہے اور بارہا میرے تجربے مشاہدے میں آیا ہے کہ اچھوں' نیکوں اور حاجیوں نمازیوں سے کہیں زیادہ گنہگاروں' خطا کاروں اور بُروں کی بات میں اثر ہوتا ہے' وہ زیادہ دلپذیر اور دِلنشین ہوتی ہے۔ اکثر بُرے' بدمعاش' اُجڑے ہوئے اور شرابی کبابی لوگ اُچھوں' نیکوں سے کہیں بڑھ کر وفادار اور وقت پہ کام آنے والے ہوتے ہیں۔ اکثر اچھے اور نیکوں کے ہاں اپنی پاک طینتی اور دین داری کا زعم و مان ہوتا ہے اور بُروں' بدکاروں' گنہگاروں کے ہاں عجز ہی عجز' شرمندگی ہی شرمندگی اور ہر وقت خود پہ لعن طعن اور توبہ استغفار ہوتی ہے۔ بس یہی شرم اور خود کو مِٹ مٹی سمجھنا ہی میرے اللہ کو پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے خالی پیٹ والے بیمار نہیں ہوتے جتنے کہ خوب بھرے ہوئے پیٹ والے بیمار ہوتے ہیں یا مرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔ خود کو نیک' اچھا' عبادت گزار' ولی اللہ اور دوسروں کو بُرا نہ کہو کہ کون جانے' کوئی آج کیا ہے اور کل کیا ہوگا؟ بقول شخصے ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

- **شوق خانہ خراب' نہ اَجر نہ عذاب......!**

مجھے حجرات یعنی پتھروں ازقسم جواہرات سے بڑا شغف رہا ہے۔ کیمیا' حکمت' علوم خفی اور اَرضی وسماوی' استعانتی علوم وعوامل میں اِن کا بہ اہتمام کم وبیش ضرور دخل ہوتا ہے۔ حجرات زندہ بھی ہوتے ہیں اور مَرے ہوئے بھی' کچھ بدیر زندہ ہونے والے اور بہت سے بہت جلد مَرنے والے بھی ہوتے ہیں۔

ہر دو قسم کسی نہ کسی طور فعال ضرور ہوتے ہیں۔ یہ حجرات جہاں اپنا اپنا مخصوص رنگ روپ' اپنے اپنے سَعد و نحس' مُحاسن و مَعائب' حجم اوزان و اَثرات اور قدر و قیمت والے ہوتے ہیں' وہیں یہ اپنے اپنے مخصوص مخفی اَسرار' اعدادی تنجیم' فروعی و فراری اور افروزی موکلات کے حامل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خصوصی طور پہ رُوحانی فیوض و برکات والے بھی ہیں۔ کئی ایک کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ حکمت و کیمیا کی کتابوں' آسمانی صحیفوں' الواح' ویدوں' شاستروں اور دیگر کئی ذرائع سے ہمیں حجرات' خاص طور پہ شُدھ پتھروں کی اہمیت و خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں خصوصی طور پہ ہمہ اقسام رنگ و اثرات عقیق' فیروزہ' مرجان' مروارید' سنگِ ستارہ' زبرجد۔ ہیرے کی پانچ اقسام ابرکی' سیمابی' بلوری' زاغی اور سحری۔ سنگِ سلیمان' سنگِ یشب' سنگِ مریم اور سنگِ داؤدی قابل ذکر ہیں۔

آج سے بہت برس پہلے مجھے ایک لوح بنانے کے لیے حجرِ الصوی فیروزے کی بے داغ چکی کنی کی ضرورت پیش آ گئی۔ جو جسم اور سائز میں چھوٹے مسور کے برابر ہو۔ تراش خراش سے مبرا' اباہیل کا ٹپکا ہوا آنسو۔ ایسا قدرتی دانہ قیمتی ہی نہیں' نایاب بھی ہوتا ہے۔ فیروزے کے تھوبے میں کسی مقدر والے کے ہاتھ لگ جائے تو لگ جائے ورنہ کسی کو نہیں ملتا۔ ایسے نایاب قدرتی تراشیدہ ہوئے بے داغ' بیش قیمت دانے شاذ ہی کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ چند ایک ایسے فیروزوں کی زیارت میں نے بھی کی ہے۔ ایک دانہ ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کے پاس تھا جو ننھی سی انگشتری میں جڑا ہوا تھا۔ بقول اُن کے' یہ اُستاد عبدالکریم خان نے انہیں انعام میں دیا تھا۔ دوسرا عشرت جہاں ببو (پرانی اداکارہ) کی ناک کے کوکے میں آویزاں تھا جسے وہ جان سے عزیز رکھتی تھی۔ شاہ نور اسٹوڈیو میں انور کمال پاشا مرحوم کی فلم "قاتل" کے سیٹ پہ عشرت جہاں' پاشا صاحب' فلمسٹار آزاد' نیر سلطانہ' اس کی والدہ' ایمی مینوالا' اس کی ممی اور بھائی نومی' صبیحہ وغیرہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ عشرت جہاں ببو کو آج کی نسل تو کیا' پرانے لوگ بھی ٹھیک سے نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چیز تھی۔ اس کا طنطنہ' وقار' شاہانہ لہجہ اور رکھ رکھاؤ اس بلا کا تھا کہ بڑے بڑے راجے مہاراجے اس کی چشمِ التفات کے منتظر رہتے۔ اس کی گاڑیاں' محل' اسٹاف' لباس' ہیرے جواہرات اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کسی ملکہ سے کم نہ تھے۔ اس کی تو جوتیاں بھی قیمتی حجرات سے مزین ہوتی تھیں......خیر' بات اس کی ناک کی کیلی میں جڑے ہوئے اباہیل کے آنسو یعنی الوری فیروزے کی کنی کی تھی۔ جب جوانی گہنائی' وقت نے کروٹ بدلی اور وہ پاکستان آئی تو گزری جوانی کی طرح اس کے بچے کھچے اثاثوں میں یہ ناک کی کیل بھی تھی۔ وہ بڑے ٹھسے سے بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ دن کا وقت' باہر لان میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ میرا اچانک ادھر سے گزر ہوا۔ خلیل قیصر مرحوم کے ایک اسٹنٹ سے میری

اچھی خاصی علیک سلیک تھی' اُس نے مجھے اشارے سے پاس بلایا اور کہا۔

''ذرا رُکو' ابھی ابھی مینوالا کے ڈانس کا ٹمیسٹ ہے......''

وہ کراچی سے آ کر اپنی ممی اور بھائی کے ساتھ لاہور کے اسٹوڈیوز میں کام کی تلاش میں پھر رہی تھی۔ اسی دوران اچانک میری نظر بو کی ناک کی کیلی کے فیروزے پہ پڑ گئی' ذرا دھیان دیا تو فیروزے والے بھی نظر آ گئے۔ اب کیسی شوٹنگ اور کون سی مینوالا؟ میں باؤلا سا ہو کر فیروزے پہ نظریں جما کر کھڑا ہو گیا تھا...... قارئین! یقین فرمائیں کہ اگلے ہی لمحے بو نے میری جانب گھور کر دیکھا۔ دیکھا جائے تو میرے علاوہ بے شمار لوگ وہاں کھڑے بیٹھے تھے جو سب ہی اُدھر دیکھ رہے تھے مگر میرا دیکھنا شاید کسی اور قسم کا دیکھنا تھا۔ وہ سن بھی کیا تھا۔ کچی سی عمر' اس عمر میں کوئی فیروزے کو کیا جانے یا سمجھے گا اور پھر اس مخصوص فیروزے کو لیکن وہی کہ میرے ساتھ معاملہ دیگر تھا...... بو کا اب کھانا پینا غارت ہو چکا تھا' وہ مسلسل مجھے غصے سے گھورے جا رہی تھی۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ میں فوراً گھوم کر اُدھر اس کے پاس پہنچ گیا' مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو......؟''

میں شاید دونوں سوالوں کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا' میں بات میں شامل کر کے میں خاموش ہو کر پھر فیروزے کو گھورنے لگا...... زچ ہو کر کہنے لگی۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ یا ہم یہاں سے رُخصت ہو لیتے ہیں...... تم نے میری ناک میں انگارے سے دہکا دیئے ہیں......''

میں نے روکھے سے لہجہ میں پوچھا۔ ''میڈم! آپ نے یہ فیروزے کی کنی کہاں سے حاصل کی؟''

یقین کریں کہ بو نے جواب دینے کی بجائے وہاں سے اٹھ کر میک اَپ روم میں چلے جانے کو ترجیح دی...... تیسرا اللہ میں نے اپنے باباجی کی گل شبو (عطردان) کے ڈھکنے کے اندر کی سطح پہ کُھدی ہوئی ایک الوح کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بائے (ب) کے نقطے کی جگہ جڑا ہوا دیکھا تھا۔ اس وقتِ رواں میں تو کبھی پوچھنے یا بسم اللہ کے بائے کے نقطے کی جگہ یہ الوری فیروزہ کی موجودگی جاننے' سمجھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی' بعد میں جب سر پہ پڑی تو پھر ساری سمجھیں آ گئیں...... چوتھی اور آخری بار میں خود اس کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ کہاں جاتا' کہاں سے ڈھونڈتا؟ وہ جو شعر ہے کہ...... ؎

نہ ہو طلب تو کسی در سے کچھ نہیں ملتا
جو ہو طلب تو دونوں جہاں سے ملتا ہے

میرے لئے ایک لوح کی تکمیل و ترتیب بے حد اہم تھی' چار کھرے برس میں نے اسے ترتیب دینے اور تیار کرنے میں لگا دیئے تھے۔ اگلا برس اس کی تکمیل کے لئے بے حد سعد تھا اور اسی اگلے برس محرم میں مجھے یہ مکمل لوح لے کر موصل (عراق) ضرور پہنچنا تھا۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر میں اس کی کھوج اور تلاش میں نکل کھڑا ہوا' اور تو کچھ نہ سوجھی' میرے ایک دیرینہ کرم فرما جو ایک بہت نامور خاندانی حکیم ہیں۔ پکّے پنجابی لاہوریئے۔ عربی' فارسی' اُردو' سنسکرت کے عالمِ اجل۔ پنجاب یونیورسٹی کے پُرانے گریجوایٹ' مسلمانوں سے زیادہ مسلمان مگر ہندو ہیں۔ میں ان کے ہاں دہلی پہنچ گیا۔ نئی بستی نظام دین ایکس ٹینشن میں رہتے ہیں۔ بیٹیاں' بیٹے انڈین ایئر لائین میں بڑے بڑے عہدوں پہ تھے۔ یہ حکیم صاحب خوب مفت ہوائی سفر کرتے رہتے ہیں۔ کبھی امریکہ' کبھی انگلینڈ۔ کبھی کہیں' کبھی کدھر۔ دُنیا بھر میں ان کے عقیدت مند اور مریض موجود ہیں جو ان کی خاندانی وَیدک سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ بے حد مرنجاں مرنج' مخلص اور ذات پات' مذہب' ملت سے دُور' بہت پرے ہٹ کر انسانیت کی پوجا کرنے والے! میری ان سے دوستی کی وجہ ایک تو حکمت اور کیمیا ہے۔ دوسری وجہ ان کے ایک بے حد عزیز دوست ہیں جو ممبئی کے ہیں مگر رہتے لندن میں ہیں۔ اُن کا نام بھی محمد یحییٰ خان ہے۔ ایک سے ناموں کی مناسبت سے بھی ایک وجہ دوستی ہے۔ تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی پڑیا کے آدمی ہیں دماغ سے کھسکے ہوئے۔ انہوں نے بھی ادھر اُدھر کے جتنے بھی اُلٹے سیدھے علوم ہیں' گھوٹ کر پی رکھے ہیں۔ ان کی کوٹھی' کوٹھی سے زیادہ مطلب' لیبارٹری' تجربہ گاہ' دواؤں کشتوں کی فیکٹری' سیارگاہ' میرے جیسے پاگل دوستوں کی قیام گاہ' مشاعرہ گاہ' طعام گاہ وغیرہ وغیرہ ہے۔ وہ خود بھی ہر صبح سیر کے بعد حضرت نظام الدینؒ' امیر خسروؒ اور اسداللہ غالبؔ کے مزارات پہ حاضری دیتے ہیں اور ان کی مسلمان بزرگوں اور اولیاء اللہ سے عقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ باقاعدہ عُرسوں اور دہلی کی تمام خانقاہی تقریبات میں بہ اہتمام شرکت کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ مہاشے ہندو ہیں مگر ان میں ہندوؤں والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ کھانا پینا' اُٹھنا بیٹھنا' مرنا جینا' سب مسلمانوں جیسا اور ان کے ساتھ ہے۔ میں ان کے ہاں پہنچا تو بہت خوش ہوئے' کہنے لگے۔

''بڑے مناسب وقت پہ آئے ہو۔ میسور' بنگلور' ڈیرہ دون اور رانچی چلیں گے۔ کچھ مفردات اور جڑی بوٹیاں چُن کر لانی ہیں اور ساتھ ساتھ شکار کی تفریح بھی رہے گی……''

میں نے ہاتھ جوڑ دیئے' کہا۔ ''مہاراج! پچھلی بار اوٹی اور شملہ کی تفریح سے مجھے جو ذہنی' اعصابی اور مالی نقصان پہنچا تھا ابھی تک میں اس سے سنبھل نہیں پایا اور پھر اس بار میں آپ کے پاس ایک اہم کام سے آیا ہوں۔ میری رہبری فرمائیں تاکہ میں اپنی راہ پکڑوں…… یار زندہ صحبت باقی' انشاء اللہ یہ

میسور' بنگلور وغیرہ پھر کسی اچھے اور فارغ وقت جانے کا پروگرام بنائیں گے۔''

میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ہر قیمت پہ ایک اُلوری فیروزے کی نگی چاہئے اور وہ بھی پکی نُچی..... فٹ سمجھ گئے' پوچھنے لگے۔

''کسی اکھر یا جنتر کی مینڈھ میں لگانی ہے یا انگشتری میں جڑوانی ہے' یا پھر.....؟''

''مہاراج! مجھے ایسے ہی کسی مقصد کے لئے چاہئے.....''

بولے۔ ''بھائی! دہلی میں تو سوال ہی نہیں اُٹھتا کہ مل پائے البتہ اگر تم ممبئی' لکھنؤ یا حیدر آباد کا چکر لگا آؤ تو شاید کچھ کُھن سُن لگ جائے' ویسے اُمید نہیں.....''

میں نے یونہی کہہ دیا۔ ''جے پور یا اجمیر شریف کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتے..... دو برس ہوئے' ٹونک کے ایک صراف کے پاس دیکھی تھی۔ وہ کوئی پیسے والا گاہک تلاش کر رہا تھا مگر نگی تھی پکی' رنگ اُکل مینڈھ چکی تھی اور آپ کو تو پکی تو مڑی چاہئے..... اجمیر چلے جاؤ' غریب نواز سرکار سے بات کر کے دیکھ لو۔ شاید وہاں کوئی کام بن جائے.....''

مگر جانے کیوں میں دہلی سے اجمیر کی بجائے ممبئی کے لئے عازم سفر ہو گیا۔ ممبئی سونا چاندی' نوادرات' کندنی زیورات اور جواہرات کی بہت بڑی منڈی ہے۔ ہر طرح کا دیسی بدیسی مال وافر مل جاتا ہے۔ بیچنے اور خریدنے والے دونوں ممبئی کا ہی رُخ کرتے ہیں۔ محمد علی روڈ چلے جاؤ۔ میرین ڈرائیو' جوہو' گیٹ وے آف انڈیا' فارس روڈ' بانندرہ' مولا بخش تالاب' ٹرام ٹاور' سبھاش مارگ' جوہری بازار' جواہر نگر' ماہم' اندھیری۔ جو چاہو خریدو اور جو چاہو بیچو۔ ممبئی میں لاکھ بُرائیوں کی ایک بُرائی یہ ہے کہ یہ کراچی' مدراس' کولکتہ کی طرح انسان کو سر سے نہیں بلکہ پاؤں سے پکڑتا ہے یا پھر جو شہر سمندر کے کنارے آباد ہوں وہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں اور میں کسی کو اپنے پاؤں پکڑنے یا چھونے نہیں دیتا..... ہاں تو کہہ رہا تھا کہ میں ممبئی پہنچ گیا۔ یہاں میرا قیام اکثر شکیلہ بانو بھوپالی کے ہاں دادر میں رہتا یا پھر محمد علی روڈ پہ سیٹھ سلیمان خان سورتی کے ہاں ہوا کرتا تھا جن کا لندن سوہو میں بھی قالینوں اور نوادرات کا کاروبار ہے' اِدھر ممبئی میں بھی میرین ڈرائیو پہ ایک فقید المثال نوادرات کا امپوریم ہے جہاں صرف حجرات' ہیرے جواہرات کی مصنوعات نمائش اور فروخت کے لئے ہوتی ہیں۔ موتیوں کے جڑاؤ زیورات' قیمتی پتھروں کے ظروف' ہاتھی دانت کے بنے ہوئے زیور' تاج محل کے ماڈل' سنگِ خارا اور سنگِ اسود کے ٹیلی فون سیٹ اور دیگر آرائش اور زیبائش' قیمتی سامان وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں یہاں زیادہ تر غیر ملکی نوادرات

کے شوقین اور تاجر بڑے بڑے پاگل قسم کے دولت مند آتے ہیں جو صرف دولت خرچ کرنے کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں' پچاس ہزار کی چیز کو اڑھائی لاکھ میں خرید کر فخر محسوس کرتے ہیں یا پھر ایسے لوگ جو کسی خاص چیز کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اس امپوریم میں بہت ہی خاص مال آہنی تجوریوں میں ہوتا ہے جو صرف مخصوص قسم کے گاہکوں اور صاحب حیثیت لوگوں کو دکھایا جاتا ہے۔ بلاشبہ لاکھوں کروڑوں کے ہیرے جواہرات یہاں مخملیں تھیلیوں اور خوبصورت ڈبوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ میری موجودگی میں ایک دفعہ کوئی معزول قسم کے راجہ صاحب اپنی غیر ملکی بیگم کے ساتھ تشریف لائے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ دس لاکھ روپے کی خریداری کر کے چلے بھی گئے۔ اپنے لئے اُنہوں نے ہیرے جڑے کف لنکس اور اُن کی غیر ملکی بیوی نے اپنے لئے ہاتھی دانت کا بنا ہوا سگریٹ ہولڈر پسند کیا جس پہ پنے' یاقوت اور نیلم کے نگینوں سے بنا ہوا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس سانپ کی دونوں آنکھیں ابابیل کے آنسو' رنگ پکڑے ہوئے الوری فیروزوں سے جگر جگر کر رہی تھیں۔ گو اس سانپ کی آنکھوں میں جڑے ہوئے فیروزوں کو دیکھے ہوئے اک زمانہ بیت گیا مگر اب بھی میرے ذہن کے کمپیوٹر میں یہ منظر محفوظ تھا۔ اب میں اسی اُمید پہ سیٹھ سلیمان سورتی کے فرزند ارجمند سیٹھ مصطفےٰ علی سورتی کا مہمان ہوا تھا کہ شاید اِن کے ہاں سے مجھے مط[illegible] یا [illegible] شش سے میرا [illegible] کام بن جائے۔

سیٹھ مصطفےٰ علی خان سے میری پرانی یاد اللہ اور نیازمندانہ تعلقات تھے۔ جس زمانے میں وہ بریڈفورڈ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے' اکثر رات کا کھانا میرے ساتھ ہی ہوتا۔ وہ رات گئے تک میرے ساتھ علمی ادبی گپ شپ میں شامل رہتے' ریسٹورنٹ بند ہوتا تو وہ اپنے ہوسٹل میں چلے جاتے۔ پھر یہ مراسم تب گہرے ہوئے جب اُنہوں نے اپنے والد سیٹھ سلیمان کی رضامندی کے بغیر اپنی ایک کلاس فیلو انگریز لڑکی سے جو میرے ہاتھ پہ مسلمان ہوگئی تھی' شادی کر لی۔ تین سال والدین کی ناراضی رہی اور دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد پھر میری ہی کوششوں سے والدین سے تعلقات بحال ہوئے تھے۔ ہم دونوں پٹھان تھے اور پھر ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے کبھی کبھی دین دُنیا کے معاملات اور بکھیڑوں میں مشورے کی صورت میں استفادہ کرلیا کرتا تھا جبکہ حجرات یعنی پتھروں سے عشق' ہمارے مابین ایک مشترکہ قدر کے طور پہ موجود تھا' شعر و شاعری کا چسکا اور جمال پسندی بھی ہماری وجۂ دوستی تھی...... ممبئی پہنچ کر ایک آدھ روز تھکن اُتارنے اور رسمی گپ شپ میں گزرا' پھر میں اپنا مُدعا زبان پہ لے آیا۔

''یار سیٹھ! میں اس بار تمہارے پاس سو فیصد اپنے مقصد اور غرض کے لئے آیا ہوں۔ مجھے ایک عدد ابابیل کا آنسو' الوری فیروزہ چاہئے مگر کچا' ابھی اس کی جڑ نہ پھوٹی ہو......''

وہ مجھے یوں تکنے لگا جیسے میں نے اس سے یہ کہہ دیا ہو کہ مجھے پیٹرٹ میزائل چاہیے' مگر وار ہیڈ سمیت ابھی اس کی پیکنگ بھی نہ کھلی ہو...... آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے' میری بات سن کر تم مجھے اس طرح سے کیوں گھورنے لگے ہو؟''

اس نے مجھے ڈائریکٹ سوال کی زد پہ رکھ لیا۔ ''آپ کوئی لوح تو نہیں بنا رہے؟''

چند ایک ثانیے توقف کے بعد میں نے جواب دیا۔

''ہاں' بنا رہا ہوں...... بلکہ تیار کر چکا ہوں۔ اب صرف اسی مطلوبہ فیروزے کی ضرورت ہے' اسی کے لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں......''

وہ اک لمبی سی ''ہوں'' کر کے پُر معنی خیز نظروں سے مجھے تولنے لگا۔ میں نے اس کے اس طرح دیکھنے سے زچ ہو کر کہا۔

''یار! کیوں مجھے پریشان کرنے پہ تُلے ہوئے ہو...... میرے ماتھے پہ سینگ اُگ آئے ہیں جو مجھے اس طرح تکے جا رہے ہو......؟''

وہ بڑے پختہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''خان صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ میں' آپ اور ہیڈز کے مشہور آسٹرالوجسٹ نذیر چوہدری' ایک بار بریڈفورڈ سے بائی روڈ لندن گئے تھے' وہاں ایک مشاعرے میں شرکت کے بعد ہم تینوں مشہور دست شناس میر بشیر صاحب سے ملے تھے۔ کافی دیر تک آپ تینوں کے مابین کسی خاص لوح پہ بات ہوتی رہی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا لیکن تمام گفتگو میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے سُنی تھی۔ چاند گرہن' پورنماشی' نوچندی' سورج گرہن' چاندی' کانسی' مُردہ شتر بچّہ کی کھال۔ زعفران' کستوری' لوبان' مچھلی کے جبڑے کی ہڈی' سُرمہ' اوری فیروزہ' زَرَتی' لاجورد جیسے الفاظ میں نے کثرت سے سُنے تھے۔ دو اڑھائی گھنٹے کی گفتگو سُننے کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ اس موضوع پہ میں آپ سے ضرور بات کروں گا...... نذیر چوہدری تو لندن ہی میں رہ گئے' ہم دونوں باری باری ڈرائیو کرتے ہوئے واپس بریڈفورڈ آئے تھے۔ راستے میں اس موضوع پہ گفتگو کرنا چاہی مگر آپ برابر ٹالتے رہے کہ پھر کبھی سہی۔ مسلسل دو تین برس جستجو کے بعد میں خود ہی تنگ آ کر خاموش ہو گیا کہ جب آپ بتانا ہی نہیں چاہتے تو پھر بار بار پوچھنے سے کیا فائدہ؟...... بہت عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ میں لندن آفس میں بیٹھا تھا' والد صاحب اپنی دوا کی گولیاں نگل کر لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ایک ٹیلیفون کال آئی' کوئی شخص والد صاحب سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور یہ بتانے کے باوجود کہ سیٹھ صاحب اس وقت دوا کی غنودگی کے زیرِ اثر ہیں' وہ شخص والد صاحب سے فوری بات کرنے پہ اصرار کرتا رہا۔ بحالتِ مجبوری میں نے والد

صاحب کو جھنجھوڑ کر ٹیلی فون اُن کے کان کے قریب کر دیا' اُدھر سے آواز سُنتے ہی والد صاحب اُچھل کر چاق و چوبند سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آئی کہ اُنہوں نے مجھے جلدی سے اپنے کمرے میں آویزاں ایک طغرا لانے کا حکم دیا جس پہ ''یا رزّاق' یا غفار'' لکھا ہوا تھا۔ مَیں اُٹھا' فوراً اُن کے کمرے میں جا کر طغرا اُتارا اور اُن کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ وہ ابھی تک اُسی اجنبی شخص سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے شدید قسم کی پریشانی لاحق ہو گئی ہوئی تھی کہ آخر یہ کون شخص ہے جس کی آواز سُنتے ہی والد صاحب کی سُستی غنودگی غائب ہو گئی ہے اور وہ سب کچھ بھول' اُس سے محوِ گفتگو ہیں اور بڑی خاکساری' نیازمندی سے ''جی' جی'' کر رہے ہیں...... جب وہ گفتگو سے فارغ ہو کر ٹیلی فون بند کر چکے تو مَیں نے پہلا سوال جو والد صاحب سے کیا وہ یہ تھا کہ ابا جی' یہ کون تھا اور اُس کو اس انداز سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور وہ کیا کہہ رہا تھا؟...... وہ میری تشویش اور سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے ایک قینچی اور کاغذ کاٹنے والی چھری کے طلبگار ہوئے۔ یہ چیزیں مہیا کر دینے پہ اُنہوں نے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے مجھے شوروم سے کچھ مخصوص فائلز لانے کے لئے کہا۔ میں سخت جھنجھلاہٹ میں دفتر سے باہر آیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں لیکن کیوں؟ وہ شخص' ٹیلی فون' طغرا' چھری' قینچی؟...... جب میری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں مزید دماغ پہ زور دیے بغیر اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اُنہوں نے مجھے پھر طلب فرمایا۔ جب مَیں اُن کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ بڑے خوش اور چاق و چوبند کسی سے ٹیلی فون پہ بات کرنے میں مصروف تھے' طغرا سامنے ٹیبل پہ رکھا ہوا تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ مجھے طغرا دیتے ہوئے بولے کہ اس کو وہیں پہ جا کر لٹکا دو۔ کمرے میں پہنچ کر مَیں نے طغرے کو بغور دیکھا تو وہ پیچھے سے کھولا گیا تھا' بیک پیپر اُتار کر دوبارہ چپکایا ہوا تھا جیسے طغرے کو کھول کر کچھ نکالا یا رکھا گیا ہو۔ وہ نکالنے یا رکھنے والی چیز کیا ہو سکتی ہے؟...... ظاہر ہے' کوئی کاغذ نما پتلی سی چیز ہی ہو سکتی تھی......''

اب مصطفےٰ علی خان قدرے قریب ہو کر کہنے لگا۔ ''خان صاحب! مَیں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ چمڑے یا چاندی کا ایک کاغذ کی طرح باریک ٹکڑا تھا' وہ ایک لَوح تھی جو ''یا رزّاق' یا غفار'' کے طغرے میں بیک کور کے اندر رکھی ہوئی تھی اور یہ بھی بتاؤں کہ ٹیلی فون پہ کون شخص تھا......'' چند ساعتیں وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ''وہ پُراسرار شخص آپ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا......؟''

مَیں کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''چلئے' آپ کی اس بات پہ پھول چڑھا دیتے ہیں...... اب آپ فرمائیے کہ اس طولانی تمہید

سے آپ کا کیا مقصد ہے اور آپ اتنی ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے کیا کہنا چاہتے ہیں......؟''

اب وہ ایزی ہو کر کہنے لگا...... ''کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اُس دن جان گیا تھا کہ آپ نے میرے والد صاحب کو کوئی نقش یا کوئی مقدس لوح تیار کر کے دی تھی کیونکہ کچھ عرصہ پہلے والد صاحب اپنے کاروباری مسائل میں بُری طرح گھرے ہوئے تھے اور اُن کی ایک ذاتی کمزوری یا خامی کی وجہ سے جہاں ہمارے کاروبار کو شدید نقصان پہنچا تھا' وہاں ہمیں اخلاقی اور سماجی سطح پہ بھی خاصی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ لندن سے کئی بار آپ کے پاس پہنچے اور آپ کے ساتھ اُن کی لمبی لمبی نشستیں ہوا کرتی تھیں......''

میں نے ایک ہلکے ڈھیلے سے قہقہے کے ساتھ اُس کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔

''مائی ڈیئر' شرلاک ہومز! اِن تمام انکشافات میں یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ طغرے کے پیچھے واقعی کوئی لوح تھی یا لوح میں نے ہی اُنہیں دی تھی اور اُن کا میرے ہاں آنا اور لمبی لمبی نشستیں' یہ سب کچھ تو میرے ساتھ روز مرّہ ہوتا رہتا تھا...... مصطفےٰ صاحب! اِن فضول باتوں کو چھوڑیں اور فیروزے کے نگینے کے سلسلے میں میری مدد فرمائیں......''

وہ اُلجھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''خان صاحب! وہ میر بشیر سے ملاقات کے بعد لگ بھگ تین برس میں نے آپ کی منتیں کیں کہ مجھے کچھ لوح کے بارے میں بتائیں مگر آپ مجھے برابر ٹالتے رہے۔ اب بھی آپ مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے اور آپ چاہے کچھ بھی کہیں' مانیں نہ مانیں' وہ والد صاحب کی لوح والی بات بھی دُرست ہے کہ آپ نے اُنہیں لوح بنا کر دی تھی جس کی برکت سے والد صاحب کے کاروبار میں حرکت ہوئی اور اُنہیں اپنی راہ روش بدلنے میں بھی مدد ملی۔ اب اصولی بات تو یہ ہے کہ ہم ٹھہرے کاروباری لوگ آپ نے مجھے تین برس لٹکائے رکھا مگر لوح کے بارے میں کبھی پلّہ نہ پکڑایا' والد صاحب کے معاملہ میں بھی آپ نے مجھ سے فاصلہ رکھا۔ جو سلوک آپ نے مجھ سے روا رکھا' اب آپ بھی اسی کے مستحق ہیں...... وہ چار برس گزر لینے دیں' پھر سوچیں گے کہ ابابیل کا آنسو' الوری فیروزے کی پکّی تامڑی کہاں سے ملے گی؟...... ویسے مدّت سے کہیں نظر نہیں پڑی اور نہ ہی کہیں بکنے بکانے کے لئے دکھائی دی......''

میں ممبئی کے اِس بنیے کی شرارت سمجھ گیا تھا۔ اِس نے بھی مجھے خوب پکڑا تھا کہ اب کوئی راہِ مفر میرے لئے باقی نہیں بچی تھی مگر نہیں...... جس طرح بلّی ایک داؤ چھپا کر اور ایک اچھا کھلاڑی ایک ٹرپ کا پتہ بچا کر رکھتا ہے اسی طرح...... لیکن نہیں' بلکہ ایک دُرویش کی طرح جو کوئی بھی عمل یا بات کرنے سے پیشتر اس کے انجام کو اللہ کی مشیت سے منسلک کر دیتا ہے' اندیشہ ہائے سود و زیاں سے لاتعلق ہو جاتا ہے......

میں نے سیٹھ صاحب کو پچکارتے ہوئے کہا۔

''اب تم جب مرنے مارنے پہ تُل ہی گئے ہو تو ہم بھی بصدِ مجبوری کُھل جاتے ہیں...... تم جانتے ہو کہ تمہارے والد صاحب میرے دیرینہ دوست تھے' ہماری دوستی لندن کے ادبی حلقوں میں پروان چڑھی تھی۔ مشتاق احمد یوسفی' ضیا محی الدین' ساقی فاروقی' بخش لائلپوری' ن م راشد' بڑے شاہ جی' زہرہ نگاہ' سحاب قزلباش' فہمیدہ ریاض' محمود ہاشمی' میر بشیر' ضیاء سرحدی' افتخار عارف' کیسے کیسے نادر اور نابغہ روزگار لوگ لندن میں جمع تھے...... ہر روز' ہر شب کہیں نہ کہیں کوئی ادبی' علمی' ثقافتی ہنگامہ ضرور بپا ہوتا تھا' مشاعروں کا بھی عام رواج تھا۔ لندن اور انگلینڈ بھر میں کیا موقوف' یورپ بھر میں کہیں نہ کہیں مشاعرے' ادبی مذاکرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ہم گاڑیاں بھر بھر وہاں جایا کرتے۔ خوب ہلا گلا رہتا اور اس طرح دیارِ غیر میں باہم مل بیٹھنے کے مواقع مل جاتے اور کچھ علم و ادب اور زبان کی خدمت بھی ہو جاتی تھی۔ تمہارے والد صاحب بھی خوب حصہ لیتے تھے' وہ شاعر تو نہیں تھے البتہ شعر اور شاعر نواز ضرور تھے۔ میرا ترنم سے شعر پڑھنا اُنہیں اچھا لگتا تھا۔ خوب داد دیتے' سر دھنتے۔ انہیں اچھے شعر اور اچھے انسان کی بڑی پہچان تھی۔ لندن کی مشہور و معروف بکلے اسٹریٹ میں ان کا شوروم اکثر و بیشتر شاعروں کا شوروم بنا رہتا۔ وہ وضع دار مہربان انسان تھے۔ ہر وقت کھانا پینا' ملنا ملانا' اپنے بیگانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بیرونِ ملک یا بیرونِ شہر سے آنے والے اکثر شاعر' فنکار احباب کا قیام و طعام ان کے ہاں ہی ہوتا۔ میرے ان سے مراسم عام سطح سے اُٹھ کر گھریلو سطح تک آ پہنچے تھے۔ آپ تو اپنے دادا اور بڑی ماں کے ساتھ رہتے تھے' آپ کی چھوٹی والدہ میری منہ بولی بہن تھیں جو آپ کے والد صاحب کے ساتھ لندن میں مقیم تھیں۔ بدقسمتی سے آپ کے والد صاحب کو ریس کی عادت تھی' وہ باقاعدہ لندن ریس کورس کلب کے ممبر تھے۔ ہر ہفتے' عشرے' مہینے سینکڑوں ہزاروں پونڈوں کی جمع تفریق کرنا ان کا ''روزمرّہ'' بن چکا تھا۔ ارض و افلاک کی استعانتیں ان کے حق میں جا رہی تھیں' دِن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی' مرے ہوئے ٹٹو پہ بھی لگاتے تو وہ کمبخت جیت جاتا۔ ایک شوروم سے دو شوروم ہوئے' مرسیڈیز کے ساتھ جیگوار اور بینٹلے بھی آ گئیں۔ مجھے یاد ہے' انہی دنوں میں آپ کے والد نے سیون سسٹر کے پوش علاقے میں ایک خوبصورت فلیٹ خریدا تھا کیونکہ اس دوران اُنہوں نے بڑی لمبی لمبی رقمیں ریس میں جیتی تھیں...... ایک بات میں بتانا بھول گیا کہ آپ کے والد صاحب مجھے صرف ایک خوش گلو اور خوش کلام شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ میرے دیگر مشاغل' طور طریق اور خاک نشینی و دربدری کے بارے میں وہ لاعلم تھے۔ میر بشیر' جو میرے اُستاد بھی تھے' اُن سے ہمارے خاندانی مراسم سیالکوٹ سے ہی استوار

تھے۔ اُن کے ہاں اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن سے ملاقات جو بھی ہوتی تھی اس میں یہی اُلٹے سیدھے عُلوم' ریکھائیں' بروج' ستارے' زمین آسمان کی گردشیں' ہاتھ' ہتھیلیوں کے نقشے ہی زیرِ گفتگو رہتے تھے۔ آپ کے والد کو کہیں بھنک پڑ گئی تھی کہ مَیں بھی اُلٹے سیدھے معاملات میں دخل رکھتا ہوں۔ ایک دن اُنہوں نے مجھے پکڑ لیا اور ساتھ گھر لے گئے جبکہ وہ اپنے دوستوں کو کبھی اپنے گھر نہیں لے جاتے تھے۔ کرائیڈن میں اُنہوں نے ایک مکان صرف دوستوں کے تصرف و قیام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ رات کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے۔

''خان صاحب! مَیں نے آپ کو ایک خاص چیز دکھانی ہے' اسی غرض سے آج مَیں آپ کو یہاں گھر لے کر آیا ہوں۔''

مَیں ٹھٹکا کہ اللہ خیر' وہ کون سی ایسی چیز ہے جسے دکھانے کے لئے مجھے بطورِ خاص گھر پہ مدعو کیا گیا ہے اور وہ بھی رات کو؟...... وہ ایک عام آدمی کی ہتھیلی کے برابر تین گوشہ سا کوئی ایک پتلی سی تختی کالے رومال میں لپٹی ہوئی جیب سے نکال کر میرے سامنے دھرتے ہوئے کہنے لگے۔

''یہ جنتر مجھے متھرا کے ایک مہا گیانی نے بطورِ خاص تیار کر کے دیا ہے۔ بقول اُن کے' اس جنتر کو اُنہوں نے برسوں کی تپیا اور جوتش کے بعد تیار کیا تھا۔ چھ سات برس گزر گئے ہیں' ہر شکروار کو اس کے درشن کرتے سمے مَیں اس پہ ناریل کا تیل چھڑتا ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن' میرے ہاں دھن دولت کی کمی نہیں ہوئی۔ اُن مہاراج کا یہ بھی کہنا تھا کہ جب تک یہ مہان جنتر تمہاری رکھشا میں رہے گا' لکشمی کے چمتکار اور چکا چوند سے تمہاری آنکھیں چمکتی رہیں گی۔ خان صاحب! آپ یقین کریں' مَیں ہارنے والے گھوڑے پہ بھی لگا دوں تو وہ جیت جاتا ہے۔ میرے کاروبار میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ مَیں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج شکروار ہے' مَیں نے آج خصوصی طور پہ آپ کو اس کے درشن کرانے کے لئے تجوری سے نکالا ہے۔''

سیاہ مائل تیل سے چپڑی ہوئی صندل کی چھوٹی سی تکونی تختی کے اوپر سفید کانسی کی سہ گوشہ پتری سونا' چاندی اور لوہے کی تین میخوں کے ساتھ جڑی ہوئی میری ناک کے عین نیچے کافی ٹیبل پہ رکھی ہوئی تھی۔ مَیں اسے غور سے دیکھ اور پڑھ رہا تھا۔ میری ناک کے نیچے جیسے کسی نے مرے ہوئے بھورے اُلو کا جگر نکال کر رکھ دیا ہو' بدبو سے میری ناک سڑنے لگی تو اپنا رومال ناک پہ رکھ لیا۔ آپ کے والد صاحب بولے۔

''خیریت! ناک پہ رومال رکھ لیا ہے......؟''

میں نے انہیں خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ کو اس جنتر سے سڑی ہوئی بدبو کے بھبکے اُٹھتے ہوئے محسوس نہیں ہو رہے؟''

وہ نتھنے پُھلاتے ہوئے جنتر اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے کہ نہیں' بالکل نہیں بلکہ مجھے تو بھینی بھینی صندل اور ماروے کی مہک سی محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پھر اس منحوس جنتر کی جانب دھیان دیا۔ ایسے نحس جنتر پترے بھورے اُلو کے جگر کے خون سے کسی مُردار کی سوکھی ہوئی کھال پہ لکھے جاتے ہیں مگر یہ سفید کانسی کی ترشول نما پتری پہ کندہ کیا گیا تھا۔ ایسے جنتر پترے لکشمی اور کالی دیوی کا پردہ جوت کر کے تیار کیے جاتے ہیں اور پھر انہیں احتیاط سے کسی سورج یہ اور چندرما گرہن کے درمیانی سمے کے دوران' ہر چاندکی گھٹتی ہوئی راتوں کو چاندنی میں رکھ کر منتر جوت کیا جاتا ہے۔ یہ عرصہ کئی کئی برسوں پہ بھی محیط ہو سکتا ہے ...... (واضح رہے کہ چاند اور سورج کے گرہن دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک وہ جو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے یا جن کے اثرات واضح طور پہ دیکھے اور جانے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم وہ جسے انسانی آنکھ یا آلات نہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی عام انسان ان کے اثرات کو محسوس و معلوم کر سکتا ہے) ایسے جنتر پترے غیر معمولی شہرت و دولت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے عمل کئے جاتے ہیں مگر یہ ترشول کی شکل کا جنتر جو سفید کانسی کی پتری پہ کندہ' سونے چاندی اور لوہے کی کیلوں سے صندل کی تکونی لکڑی پہ جڑا ہوا تھا ایک مخصوص قسم کا تھا۔ یہ صرف اور صرف شیطانی ذرائع یعنی ناجائز طریقوں سے ہی دولت و شہرت میں بے پناہ اضافے کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی بدبودار اور کریہہ المنظر ہونے کے علاوہ مرے ہوئے کسی بڑے سے بچھو کی طرح نظر آتے ہیں لیکن اک عجیب بات یہ ہے کہ جن کے پاس ہوتے ہیں اور جو ان کے زیرِ اثر ہوں یا جنہیں وقتی طور پہ یہ استفادہ پہنچا رہے ہوتے ہیں' انہیں نہ تو ان سے گھن آتی ہے اور نہ ہی انہیں یہ بچھو دکھائی دیتے ہیں۔ اس منحوس جنتر پتر کی ایک بڑی خباثت یہ بھی ہے کہ یہ جس کے پاس ہوں انہیں ایمان' یقین اور اعتماد کی دولت سے تہی دامن کر دیتے ہیں۔ ہر چند کہ وقتی طور پہ دولت اور شہرت میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں لیکن انجام کار ان کے دساسول اور دشٹ چنڈال اپنی سفید کانسی کی وِش' حامل کے حالات میں شامل کر کے اسے کسی ناگہانی حادثے' خوف و ہراس یا پھر خللِ دماغ میں مبتلا کر کے واصلِ جہنم کر دیتے ہیں۔

آپ کے والد صاحب نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب! دیکھا آپ نے اس جنتر کا چمتکار ...... ریس کورس چلا جاؤں' کسی کلب کیسینو یا

کہیں دوستوں میں تاش پہ بیٹھ جاؤں' ہمیشہ جیبیں بھر کر واپس لوٹتا ہوں۔ اس کرشمے والے مقدس جنتر کی زیارت کرانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ بھی کاروباری اور اقتصادی طور پہ کچھ آسودہ دکھائی نہیں دیتے۔ میرا آپ سے بھائی چارہ بھی ہے اور دوستی بھی' اس ناتے اگر آپ چاہیں تو یہ جنتر تجربے کے طور پہ کچھ عرصہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے دن بھی پھر جائیں گے۔"

میں اسی معنی خیز ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باتیں سنتے ہوئے اُن کے چہرے کی جانب مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔

"بھئی' آپ میری بات سُن بھی رہے ہیں یا یونہی ٹکٹکی باندھے مجھے گھور ہی رہے ہیں؟"

میں نے نظریں ہٹائے اور پلکیں جھپکائے بغیر نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔

"سیٹھ صاحب! میں جس محویت سے آپ کو دیکھ رہا ہوں اُس سے کہیں زیادہ توجہ اور دلچسپی سے آپ کی باتیں سنتے ہوئے کچھ سوچ بھی رہا ہوں کہ میں آپ کی اس مہربانی اور ہمدردی کا کیسے شکریہ ادا کروں جو آپ نے میرے بھلے کے لئے سوچا ورنہ کون اس مطلب پرستی اور نفسانفسی کے دور میں کسی کی بھلائی اور اچھائی کے لئے سوچتا ہے بلکہ عملی طور پہ کچھ کر بھی گزرتا ہے؟"

آپ [illegible] ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ میرے لئے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ میرے احباب میں آپ پہلے فرد ہیں جن سے میرے گھریلو تعلقات ہیں۔ میں آپ کے لئے مالی طور پہ بھی ہر معاونت کے لئے حاضر ہوں مگر میں آپ کی خوددار طبیعت سے بھی تھوڑا سا واقف ہوں اس لئے کبھی ایسی بات نہ کہہ سکا۔ پچھلی ریس پہ میں نے پندرہ ہزار پونڈ سے زیادہ جیتے' اسی طرح کیسینو اور بلیک جیک سے خاصی رقم ہاتھ لگی۔ یہ سب اسی جنتر پتر کا چمتکار ہے۔"

وہ ایک مخمل کے کپڑے میں اسے لپیٹ کر مجھے دیتے ہوئے بولے۔

"یہ لیجئے' آپ بھی کچھ عرصہ تجربہ کر کے دیکھ لیں مگر کسی اور سے ذکر نہ کیجئے گا۔ یہ میری آپ کے پاس امانت ہے۔"

میں بہ وقت اس نحس جنتر کو لیتے ہوئے بولا۔

"سیٹھ صاحب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اسے کیا کروں گا؟ ریس جوا تو میں کھیلتا نہیں' سٹہ لاٹری سے بھی کوئی رغبت نہیں جبکہ اس کرشماتی جنتر کے اصل جوہر اسی قبیل کے کام دھندوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دیکھئے نا! آپ کا قالینوں کا کاروبار ہے۔ جائز کاروبار' جائز آمدن ومنافع اس جنتر سے ہونی چاہئے نہ کہ ریس جوئے میں' جو میری دانست میں جائز کمائی کی ذیل میں نہیں آتے۔"

وہ چند ثانیے سوچتے ہوئے بولے۔ ''ہاں' یہ تو آپ کا کہنا درست ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ جو اپنا وطن چھوڑ کر یہاں پڑے ہوئے ہیں اس کی وجہ کوئی شوق یا تفریح نہیں' مجبوری اور ضرورت ہے۔ یہاں عزت نفس کے ساتھ بہتر طریقے سے پیسہ کمایا اور بچایا جا سکتا ہے۔ چوری' ڈاکہ' دھوکا فریب' گناہ اور جرم ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ ریس' کیسینو یا لاٹری سٹے میں قسمت آزمائی کرنا بھی کوئی ناجائز ذرائع کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے اپنا سارا کاروبار' بلکہ آکسفورڈ سٹریٹ والا نیا شوروم بھی اسی ریس اور کیسینو کی کمائی سے بنائے ہیں۔ یہ کمائی ٹیکس پیڈ ہے' گورنمنٹ ساڑھے اٹھارہ پرسنٹ کاٹ کر اسے جائز آمدن کی رسید دے دیتی ہے...... خان صاحب! پیسہ صرف پیسہ ہے' بلیک یا وائٹ نہیں ہوتا۔ یہی تو ہم میں اور ان یورپین ممالک میں فرق ہے کہ ہم حرام حلال' جائز ناجائز کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ جیسے کہ پاکستان اور ہندوستان میں ناجائز اولاد کو معاشرے میں بڑا ذلیل اور گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ بغیر شادی عورت' مرد کا اکٹھا رہنا معیوب گردانا جاتا ہے مگر یہاں ناجائز بچے قطعی کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی معاشرہ انہیں دھتکارتا ہے یا ان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے اور نہ ہی یہاں کا قانون یا کوئی اخلاقی ضابطہ کسی مرد' عورت کو شادی کی زنجیروں میں جکڑے بغیر اکٹھے زندگی بسر کرنے سے روکتا ہے۔ شخصی آزادی [illegible] اور [illegible] یہی ہیں کہ انسان اپنے ہر قسم کے ذاتی معاملات میں آزاد ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں اب نیم غنودگی انداز میں سیٹھ صاحب کی باتیں سن رہا تھا جیسے مجھ پہ نیند کا غلبہ ہو۔ وہ پھر کہنے لگے۔

''میرے خیال میں آپ کو نیند آ رہی ہے۔ ٹھیک ہے' آپ آرام کریں۔ صبح ملاقات ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں' سیٹھ صاحب! آپ بیٹھئے۔ نیند ہی تو ایک چیز ہے جو اپنے ہاں نہیں آتی' صبح پھانسی پہ چڑھنا ہو تو رات کے نیند آتی ہے البتہ یہ میری آنکھیں نیم سی مندھی ہوئی اور ہلکا سا خمار جو دکھائی دے رہا ہے' یہ آپ کی پُرکیف باتوں اور اس جنتر منتر کی وجہ سے ہے۔ میں تو یوں ہی آج تک حرام و حلال اور جائز ناجائز کے چکر میں پڑا رہا' میری تو آپ نے آنکھیں روشن کر دی ہیں...... شکریہ سیٹھ صاحب! دوست ہو تو آپ جیسا...... اب مجھے اجازت دیجئے' میں کنگ کراس سے آخری ساڑھے گیارہ بجے والی شٹل ٹرین پکڑوں گا اور علی الصبح بریڈفورڈ پہنچ جاؤں گا۔''

وہ چونک کر پوچھنے لگے۔ ''یہ ایک دم آپ کو بریڈفورڈ جانے کی کیا سوجھی۔ بلا کی سردی اور پھر رات کا وقت ہے' ایسے بھی بے آرام ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ صبح دیکھا جائے گا۔''

مَیں نے اُنہیں بتایا۔ ’’اب میرے لئے یہاں رُکنا ممکن نہیں‘ آپ کی حقیقت افروز گفتگو اور اس نایاب مہا کام جنتر چتر سے میرے اندر ایسی تبدیلی آئی ہے کہ مجھے یہاں رُکنا تو کجا‘ زمین پہ پاؤں دھرنے بھی مشکل پڑ رہے ہیں۔‘‘

بریڈفورڈ پہنچ کر آرام کرنے کے بعد جو مَیں نے پہلا کام کیا‘ وہ یہ تھا کہ مَیں اس جنتر کو لے کر جنگلے کی پہاڑیوں پہ چلا گیا۔ ایک پُرانے درخت کی جڑ کے پاس اس جنتر کو درمیان میں پانچ انچ لمبی کیل رکھ ٹھونک دیا‘ غیر انسانی چیخوں کا سے ذخیرہ گونج اُٹھا مگر مَیں جانتا تھا کہ یہ دل خراش چیخیں میرے سوا کسی اور کو سُنائی نہیں دیں گی۔ پھر فوری طور پہ مَیں نے درخت کے گرد دو دو فٹ کا فاصلہ رکھ کر پانچ حصار قائم کئے اور بغیر مڑ کر دیکھے واپس چلا آیا...... مصطفےٰ خان صاحب یہ وہی دن تھا جس دن آپ نے مجھے ٹیلی فون پہ بتایا کہ والد صاحب کو چند غنڈوں نے مضروب کیا ہے اور آپ کو ابھی لندن پہنچنا ہے‘ وہ ہسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں ہیں...... آپ یقین کریں کہ مَیں اس جنتر کو ٹھونک کر گھر پہنچا‘ فوراً کپڑے پہن کر تیار بیٹھ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب کسی وقت بھی لندن سے اطلاع آئی کہ آئی اور اطلاع آئی مگر لیٹ...... خیر‘ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم دونوں کس سپیڈ سے لندن پہنچے تھے۔ ساڑھے چار گھنٹے کا نان سٹاپ سفر‘ میرے ہاتھ میں ایک اٹھارہ باٹی چودہ کا پیکٹ بھی تھا۔ آپ نے ایک آدھ بار پوچھا بھی کہ یہ کیا ہے؟ یہ میرا اپنا بنا ہوا طغرا تھا جس پہ ’’یا رزّاق‘ یا غفار‘‘ لکھا ہوا تھا۔ یہ وہی طغرا تھا جسے سیٹھ صاحب کے کہنے پہ آپ نے کمرے سے اُتروایا تھا اور جس کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں کہ اس کے بیک کور میں کوئی لوح چھپی ہوئی تھی...... ہم سیدھے ہسپتال پہنچے تھے۔ وہاں آپ کی چھوٹی والدہ‘ بہنیں اور سٹاف کے کچھ لوگ موجود تھے۔ پولیس اور کیسینو کا سپروائزر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب ایک لمبی رقم سمیٹ کر کیسینو سے نکلے‘ پارک میں اپنی گاڑی تک آئے۔ وہاں پہلے سے موجود کچھ غنڈوں نے لوہے کے چین اور چمڑے کی سٹڈ جڑی بیلٹوں سے سیٹھ صاحب پہ حملہ کر دیا۔ جیب سے رقم‘ چیک بک‘ قیمتی پن‘ رولیکس کی جڑاؤ گھڑی اور قیمتی انگوٹھیاں لے جھپٹ کر اڑنچھو ہو گئے۔ سیٹھ صاحب کے سر کی کھوپڑی فریکچر تھی اور دو اگلے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے علاوہ سینے اور پسلیوں پہ بھی ضربیں پڑی تھیں‘ انگوٹھیاں اُتارتے وقت دونوں اُنگلیاں بھی اُتر گئیں۔ جسم پہ جابجا چمڑے کی بیلٹوں اور آہنی چین کے نیلے نیلے لہریئے نما نشانات بھی تھے۔ پولیس بیان لینے کے لئے بیٹھی تھی اور ساتھ کیسینو والے بھی بٹھائے ہوئے تھے مگر سیٹھ صاحب کے ہوش میں پلٹنے کے کوئی آثار دِکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ممبئی تک دیگر اعزاء کو بھی ٹیلی فون کھڑکا دیئے گئے تھے۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ آپ نے کئی بار اپنی اس تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ابّا

کب ہوش میں آئیں گے؟ میں نے ہر بار آپ کو تسلی دی تھی کہ اللہ سب بہتر کرے گا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ جس وقت میں جنتر کے ترشول میں ہتھوڑے سے کیل ٹھونک رہا تھا' عین اسی وقت لندن میں غنڈے سیٹھ صاحب کو ٹھونک بجا رہے تھے۔ بالکل اتنی ہی ضربیں جتنی میں نے جنتر کے درمیان ٹھونکنے کے لئے کیل پہ لگائی تھیں......"

سیٹھ مصطفےٰ علی سورتی میرے سامنے بیٹھا مجھے یوں سہما اور ٹھٹکا ہوا اپنے والد سیٹھ سلیمان سورتی ممبئی والے کی "داستانِ حسرت" سُن رہا تھا جیسے وہ انسانوں کی نہیں' جنوں کی کوئی ڈراؤنی کہانی سن رہا ہو۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیلی ہوئی' باریک باریک ہونٹ ہلکے سے سیٹی بجانے کی انداز میں سکڑے ہوئے تھے اور یقیناً حلق بھی اندر سے خشک ہوگا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا تو وہ بمشکل اپنا حلق تر کرتے ہوئے بولا۔

"خان صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں...... آپ کو علم بھی تھا کہ جتنی چوٹیں جنتر پتر کو لگائیں گی اتنی ہی ضربیں والد صاحب کو بھی مجروح کریں گی' اس کے باوجود آپ نے کیل پہ ہتھوڑے سے ضربیں لگائیں؟...... مجھے تو یہ سن کر تعجب ہی نہیں' حیرت بھی ہو رہی ہے......"

میں نے تعجب کا [illegible] ہوئے جواب دیا۔

"سیٹھ مصطفےٰ علی خان صاحب! آپ کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور کاروبار کا یہ زرّیں اُصول بھی خوب جانتے ہوں گے کہ کاروبار میں اگر نقصان ناگزیر ہو جائے تو پھر بھی ہر حالت نقصان میں اپنے فائدے کے مواقع کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ میں نے دُرویش ہونے کے باوجود اپنے یعنی کہ آپ کے مفادات کو اوّل ترجیح دی۔ سیٹھ صاحب کی دُرگت میں بھی آپ کے وسیع تر مفاد کو ہی پیشِ نظر رکھا گیا......"

سیٹھ مصطفےٰ علی خان کچھ نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولے۔

"میں کچھ نہیں سمجھا کہ والد صاحب کے ساتھ ایسے بہیمانہ تشدد میں ہمارے وسیع تر مفاد کا کون سا پہلو پنہاں تھا......؟"

میں نے تُرت جواب دیا۔

"دیکھئے نا' اگر ایک شخص تملگو یا ملیالم زبانیں نہیں سمجھتا یا پھر اس نے بارہ بنکی یا بانس بریلی نہیں دیکھا سُنا تو اس میں اِن زبانوں یا شہروں کا قصور تو نہیں؟...... میرا قصور فقط یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں نے آج تک آپ سے اِن باتوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں جانا۔ آج آپ کے مجبور کرنے پہ

اگر ناچار مجھے اِن باتوں پہ سے پردہ سرکانا پڑا تو گنہگار کو معاف کر دیں......"

سیٹھ صاحب میرے کاندھے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے بولے۔

"خان صاحب! میری باتوں کا غلط مطلب نہ لیں۔ اگر مَیں کسی چیز کی حقیقت اور اصلیت کو نہیں جانتا تو میرا کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا عین ممکن ہے...... براہِ کرم صرف دو باتیں کلیئر کر دیں۔ آپ جنتر منتر کے اوپر وہاں جنگل میں کیل پہ ضربیں لگاتے تھے تو اِدھر ساڑھے تین سو کلومیٹر پرے لندن میں والد صاحب کو چوٹیں کیوں لگتی تھیں اور دوسری بات کہ والد صاحب پہ اس ناروا تشدد میں ہمارے بھلے کا کون سا پہلو مضمر تھا......؟"

مَیں نے بات سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

"سیٹھ صاحب! اگر اِن باتوں کا آپ سے ذکر کرنا یا ان کی پوشیدہ مصلحت و حقیقت کو کھولنا مناسب ہوتا تو مَیں کبھی کا آپ کو بتا چکا ہوتا۔ یوں سمجھ لیں کہ جیسے گھروں یا سلطنتوں کے بھی بعض ایسے راز ہوتے ہیں جو گھر کے دیگر افراد یا ملک کے عوام تک کسی مصلحت کے تحت نہیں لائے جاتے...... بہرحال ہلکی سی بات کھولنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آپ کی اندر کی کھُدبُد ختم ہو سکے۔ مذکورہ جنتر منتر آپ کے والد صاحب کو کسی شیطانی صفت سادھو نے بہت پہلے عطا کر دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ جنتر تمہاری زندگی بدل کر رکھ دے گا۔ تم بے انتہا امیر کبیر ہو جاؤ گے' دولت تمہارے گھر کی لونڈی اور شہرت تمہارے دَر کی داسی بن جائے گی اور یہ بات تھی بھی سو فیصد دُرست۔ یہ جنتر بڑی کٹھن تپیا اور لمبے سالوں کے انتظار اور محنت کے بعد جا کر سِدھ ہوتے ہیں اور پھر جو انہیں اپنے پاس حفاظت سے اور باقاعدہ ڈنڈوت کر کے رکھتا ہے' اسے یہ لکشمی مایا سے نہال کر دیتے ہیں۔ بس ایک ہی عیب ہوتا ہے کہ یہ ایمان' یقین اور اعتماد سے محروم کر کے صرف اور صرف دولت اور غرض کا پجاری بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ حرام حلال' اچھائی بُرائی' سب کچھ ملا جُلا کر الحاد کی ایک کاک ٹیل سی بنا کر پلا دیتے ہیں۔ اس جنتر کی ابلیسی استعانتیں' اپنا ڈنڈوت کرنے والے کی بڑی رکھشا کرتی ہیں۔ اسے ہر قسم شیطانی کاموں میں مگن رکھ کر غیر معمولی فائدہ بھی پہنچاتی رہتی ہیں' لیکن یہ قوتیں ہر وقت اس کے دَرپے رہتی ہیں' چمٹ جاتی ہیں تاوقتیکہ وہ اسے بُری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ کر اسے انجام تک نہ پہنچا دیں۔ لکشمی دیوی اپنا چند روزہ چمکار اور ریل پیل دِکھا کر روپوش ہو جاتی ہے اور کالی مائی کلکتے والی اپنا بلیدان پرَمت کر کے پرے ہٹ جاتی ہے...... اب آپ کی پہلی بات کہ مَیں ہتھوڑا تو وہاں کیل پہ لگاتا تھا اور چوٹ لندن میں سیٹھ صاحب کو لگتی تھی۔ جب ان شیطانی قوتوں کو مَیں نے کیل گاڑ کر اور ان کے گرد حصار کھینچ کر مشتعل کر دیا تو وہ مجھے کوئی گزند

پہنچانے سے عاجز ہو کر اپنے پہلے عامل کی طرف لوٹ گئیں اور انہیں نقصان پہنچا گئیں۔ شکر کریں کہ وہ کچھ زیادہ نقصان پہنچائے بغیر ہی اپنے زخم چاٹتی ہوئی کسی نرکھ میں دفعان ہو گئیں...... دوسری بات کہ سیٹھ صاحب کی دُرگت میں ہمارے بھلے کا کون سا پہلو مضمر تھا؟ یہ میں بتا چکا ہوں کہ اس پٹائی سے اُن کی جان کا صدقہ نکل گیا تھا۔ جو بڑا نقصان کل کلاں ان شیطانی قوتوں سے سرزد ہونا تھا' وہ اس معمولی نقصان سے ٹل گیا۔ آپ کی طرح بڑے سیٹھ صاحب بھی مجھے اور میرے کسی عمل اور رَدِ عمل کو کماحقہٗ' سمجھ نہیں پائے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کسی کا قصور نہیں تھا' ہماری سمتیں ہی الگ الگ تھیں۔ جیسے کسی جوہری اور انجینئر کی آپس میں تو ہو سکتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پروفیشن کو بھی سمجھتے ہوں......"

مصطفےٰ علی خان میری بات پہ بولے۔

"خان صاحب! آپ نے جن باتوں پہ سے آج پردہ اٹھایا ہے' میں واقعی اِن کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ والد صاحب تو شیطانی قوتوں کے چنگل میں بُری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہوا کہ وہ بروقت' کچھ نقصان کے بعد سنبھل گئے تھے ورنہ پتہ نہیں' آج ہمارا کیا حشر ہوتا؟...... آپ نے ابھی تک اُس "یا رزّاق' یا غفّار" والے طغرے کی بات تو کوئی نہیں...... والد صاحب پہ غنڈوں کے حملے کے موقع پر جب آپ ان کے پاس آئے تھے اور آپ کے ساتھ ایک پیکٹ بھی تھا' کیا وہ پیکٹ یہی طغرا تھا......؟"

"ہاں...... اُسے آپ کے دریافت کرنے کے باوجود میں نے نہیں بتایا تھا کہ یہ کیا ہے مگر یہ وہی طغرا تھا جسے آپ اُن کے کمرے سے اُتار کر اُنہیں دفتر میں دے کر آئے تھے......"

"......اور اِس کے بیک کور کے اندر کچھ اور بھی تھا؟"

سیٹھ مصطفےٰ علی خان نے فوراً نیا سوال داغ دیا تھا۔

اب میں کیا چھپاتا؟...... فوراً کہہ دیا۔

"ہاں' اِس اللہ کے صفاتی اسماء والے بابرکت طغرے کے اندر ایک لوح بھی چھپی ہوئی تھی......

ہسپتال میں جب سیٹھ صاحب کو ہوش آیا اور وہ پولیس اور دیگر ضروری کارروائیوں سے فارغ ہوئے تو اُنہوں نے مجھے تنہائی میں طلب کر کے شکایت سی کی کہ آپ کو جنتر پتر دینے سے میری یہ دُرگت ہوئی' اس کو علیحدہ کرنے کی دیر تھی کہ میرا مال بھی گیا اور جان پہ بھی بن گئی لہٰذا آپ مہربانی سے میرا جنتر مجھے واپس کر دیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُنہیں تسلی دی کہ آپ گھبرائیں نہیں' میں آپ کے لئے "جنتر" لے کر آیا ہوں۔ پھر میں نے اُنہیں وہ پیکٹ والا طغرا پیش کرتے ہوئے کہا کہ سیٹھ صاحب! یہ طغرا میں نے خود

ڈیزائن کیا ہے۔ اِس پہ ''یا رزّاق'' اور ''یا غفار'' لکھا ہے' یعنی پاکیزہ رزق دینے اور خطائیں معاف کرنے والا وہی ربّ کریم ہے۔ انسان اپنی محنت' کوشش اور ہُنر وفن سے جو رزق حاصل کرتا ہے وہی پاکیزہ اور حلال ہوتا ہے چاہے وہ تھوڑا اور ضرورت سے کم ہی کیوں نہ ہو لیکن اِس میں خیر' برکت اور سلامتی ہوتی ہے۔ اِس تھوڑے' حلال' پاکیزہ اور پسندیدہ رزق سے جو خون پیدا ہوتا ہے وہ صالح ہوتا ہے۔ اِس خون کی پھلکی سے پھر جو اولاد پیدا ہو اِس سے پھر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان اور صحیح مسلمان ہوگی...... یا رزّاق! یعنی وہی آپ کو سب رزق اور اپنی بہترین نعمتیں عطا کرنے والا ہے اور یا غفار! اِنسان خطا اور نسیان کا خُوگر ہے۔ دانستہ' نادانستہ اِس سے خطاؤں گناہوں کا سرزد ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ یہ اَزلی خطا کار ہے اور وہ ربّ کریم مثالی بخشن ہار ہے' معاف اور درگزر کرنے والا ہے' چشم پوشی کر لیتا ہے۔ مَیں نے اُنہیں اِن کی وہ گفتگو یاد دلائی جو اُنہوں نے ایک روز پہلے یہ جنتر پتر دیتے ہوئے مجھ سے کی تھی کہ اِس ملک میں پہنچ کر ہمیں صرف اور صرف پیسہ کمانا یا جیسے بھی حرام حلال آئے' اکٹھا کرنا چاہئے اور یہ سارے اخلاق' قانونی اور دینی شرعی ضابطے بس یونہی ہیں۔ مَیں نے عرض کی کہ مَیں اس وقت بھی آپ کو ان باتوں کا مسکت جواب دے سکتا تھا مگر مَیں جانتا تھا کہ اِس وقت میری کوئی دلیل بھی آپ کو مطمئن اور قائل نہیں کر سکے گی کیونکہ ابھی لوہا گرم اور نرم نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے بہت جلد آپ کے ہاں واپس لندن پہنچنا ہے آپ کی اِن باتوں کا جواب دینے کے لئے...... آپ نے حیران ہو کر پوچھا بھی تھا کہ مَیں نے اچانک اِسی وقت رات کو بریڈ فورڈ جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟ اِس لئے کہ مَیں آپ کے لئے یہ طغرا لانا چاہتا تھا۔ یہ طغرا آپ اپنے کمرے میں وہاں آویزاں کریں جہاں سے یہ آپ کو زیادہ سے زیادہ دِکھائی دیتا رہے......''

''آپ کی اِس گفتگو کا والد صاحب پہ کیا ردِّ عمل ہوا......؟''

مصطفےٰ علی خان صاحب نے پوچھا۔

''وہ گُم صُم سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں تو اُن کی پہلے سے ہی سُوجی ہوئی تھیں' اب ذرا نم دار ہو گئیں۔ آنکھوں میں آنسو لا کر نحیف سی آواز میں بولے خان صاحب! آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ دُعا فرمائیں' اللہ مجھے صحت دے اور توبہ کی توفیق دے...... میرا وہ جنتر پتر مجھے واپس لوٹا دیں۔ مَیں آپ کی سب باتوں کو صحیح سمجھتا ہوں لیکن اِس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے وہم سا ہو گیا ہے کہ یہ ساری آفت آپ کو جنتر پتر دینے سے ہی مجھ پہ ٹوٹی ہے' اِسے دینے کے بعد مجھے یاد آیا تھا کہ اُس مہا گیانی سادھو نے تاکید بھی کی تھی کہ اِس جنتر پتر کو کسی کے حوالے نہ کرنا ورنہ تمہارے لئے بہتر نہ ہوگا...... مَیں نے بڑے

اَدب سے جواب دیا کہ واقعی آپ نے اِسے خود سے علیحدہ کر کے تھوڑی سی اپنے لئے اور بہت سی اس جنتر اور اس کے نَساچروں کے لئے پریشانی پیدا کر لی ہے۔ خیر' کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا...... آپ کا ''جنتر پتر'' عنبر اور زعفران میں بسا کر اِس طغرے کے بیک کور میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ''یا رزّاق'' اور ''یا غفار'' کے مقدس اسماء اور ''جنتر پتر'' کے رُوحانی اثرات' یعنی دونوں کی نورانی برکات سے آپ بہت جلد ظاہری' باطنی طور پہ صحت یاب ہو جائیں گے اِنشاء اللہ......! وہ کچھ متذبذب سے ہو کر کہنے لگے کہ میرے لئے ہر شکروار کو جنتر پتر کو ناریل کا تیل لگانا اور اس کے آگے ڈنڈوت کرنا ضروری ہوتا ہے' پھر درشن بھی تو کرنے ہوتے ہیں؟...... میں نے اُنہیں تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ آپ فکر نہ کریں' میں نے اِس جنتر پتر کو ہمیشہ کے لئے ایسا ڈنڈوت کر دیا ہے کہ اب اِسے بار بار ڈنڈوت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ناریل کی جگہ میں نے خالص عنبر اور زعفران سے اِسے پُرا چوم کر دیا ہے۔ باقی رہی اس کے دَرشن کی بات' تو جیسے میں نے عرض کی کہ آپ اِس طغرے کو اپنے کمرے میں وہاں آویزاں کریں جہاں پہ زیادہ سے زیادہ آپ کی نظروں کے سامنے رہے۔ پہلے آپ ہر شکروار کو درشن کرتے تھے' میں نے اللہ کے اَمر سے آپ کے لئے روز و شب' سینکڑوں بار دَرشن کرنے کا انتظام کر دیا ہے تاکہ اللہ کے مقدس اسماء کی برکات بھی ملتی رہیں اور آپ کے ساتھ خوشبو میں بسے ہوئے جنتر پتر کی حرکات بھی چلتی رہیں یعنی ایک پنتھ دو کاج' چپڑی بھی اور دو دو بھی' لیکن یہ خیال رہے کہ اِس مقدس جنتر کو اب آپ نے ہاتھ سے مَس نہیں کرنا اور نہ ہی اِسے بیک کور سے بے پردہ یعنی باہر نکالنا ہے۔ میں نے اِسے عنبر و زعفران کی سات سات خوشبو کی دبیز لیئوں میں یا رہ دو کر کے ملفوف کر دیا ہے۔ اب اس پردہ دار کو ننگا کرنے سے جان کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے البتہ جب اس کے دَرشن کا سمے آئے گا تو میں آپ کو مطلع کر دوں گا...... مصطفےٰ علی خان صاحب! آپ کے والد' اللہ اُن کی قبر کو عنبریں رکھے' اُنہوں نے میری باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سُنیں۔ میرے بے حد مشکور ہوتے ہوئے کہنے لگے کہ خدا آپ کو خوش رکھے' آپ نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے میرے راستے آسان کر دیئے ہیں۔ اس ناگہانی سانحہ اور آپ کی ایمان افروز گفتگو نے میری سوچ کا دھارا ہی بدل دیا ہے۔ آپ نے میرے بے حد قیمتی اور کرشماتی جنتر کو بھی اِس طغرے میں خوشبوؤں میں بسا کر محفوظ کر دیا ہے' میں اب اس کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا اور اب کبھی بھی کسی کو اس کی ہوا تک لگنے نہیں دوں گا۔ چند گھنٹوں کے لئے جدا کر کے میں نے نتیجہ بھگت لیا ہے......''

سیٹھ مصطفےٰ علی خان پوچھنے لگے۔ ''اس کا مطلب ہے' والد صاحب یہی سمجھ رہے تھے کہ اس

طغرے کے اندر اصل جنتر پتر ہی ہے؟"

"ہاں...... میں نے مصلحتاً انہیں نہیں بتایا کہ اس منحوس اور ناپاک جنتر پتر کا تو کلیان کر دیا ہوا ہے' یہ تو ایک مقدس لوح ہے جسے اللہ کریم کے مخصوص صفاتی اسماء کو افلاکی نجوم و بروج کی سعد گردشوں کے تناظر میں چاندی کے پترے پہ نوچندی کی چاندنی میں ایک خاص وقفۂ وقت میں شہد' روغنِ زیتون' آبِ زم زم اور عرق زعفران سے نقش کیا گیا ہے۔ یہ لوح جس کی تحویل وتعمیل میں ہوگی وہ ارضی سماوی بلیات' نحوس وشر' شیطانی نفسانی وساوس اور دشمنوں حاسدوں کے خوف وخطرے سے محفوظ رہے گا مگر شرط یہ ہے کہ حاملِ لوح اکل حلال کھاتا ہو' حرام حلال اور پاکی پلیدی کا خیال رکھتے ہوئے پابندِ شریعت ہو...... ویسے بھی یہ لوح ایسی سعد اور تسخیر القلوب ہے کہ اس سے انسان خود بخود ہی راستی' نیکی اور دین کی جانب رغبت پکڑتا ہے"۔

"خان صاحب! میں کیا کہوں؟...... میرے لئے آپ ہمیشہ ایک بند مٹھی کی مانند رہے ہیں اور پھر آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ کے قریب آنے والا ہر شخص ہمیشہ اس خوش فہمی میں رہتا ہے کہ صرف میں ہی خان صاحب کے زیادہ قریب ہوں' میں ہی ان کو خوب جانتا سمجھتا ہوں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ آپ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جیسے ایک کے بعد دو' پھر تین چار حتیٰ کہ سینکڑوں ہزاروں لاکھوں تک انسان چلتا چلا جائے تو آنکھیں بند کر کے وہ گنتا رہتا ہے' آپ بظاہر ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں مگر ہیں نہیں...... ایک کے بعد دو' تین کے بعد نو' پھر پندرہ' پانچ سو' دو لاکھ' پھر چار' پھر اڑھائی کھرب بھی ہو سکتے ہیں...... میں ایک زمانہ میں آپ کے پیچھے پڑا رہا کہ مجھے لوح کے متعلق بتائیں لیکن آپ دانستہ ٹالتے رہے مگر والد صاحب کو آپ نے بِن مانگے ہی بنا کر دے دی...... بتایئے' میں آپ کے اس سلوک کو کیا نام دوں اور لطف یہ کہ آج آپ میرے پاس تشریف لائے ہیں کہ مجھے ابابیل کا آنسو' انوری فیروزہ چاہئے کہ اسے کسی لوح میں جڑنا ہے...... کیا آپ کے پاس کوئی لوح میرے لئے نہیں؟"

"آپ کے لئے ہے...... آپ بھی میرے دوست ہیں بلکہ دوست' ابنِ دوست ہیں۔ میں تو آپ کا خادم ہوں......" میں نے خاکساری سے کہا۔

مصطفےٰ علی خان خوش ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ "تو پھر میرا وعدہ رہا کہ آپ کو مطلوبہ فیروزہ مل جائے گا لیکن میرے پاس سے نہیں' کہیں اور سے......"

"سیٹھ صاحب! آپ کو لوح مجھ سے نہیں ملے گی' ملے گی تو کہیں اور سے......" میں نے بھی بات پہ بات مارتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں......؟''

''اگر آپ وہ طغرا جو میں نے آپ کے والد صاحب کو دیا تھا اور ساتھ اپنے جواہرات جانچنے والا محدّب شیشہ یہاں منگوالیں تو ساری بات سمجھ میں آجائے گی......'' میں نے کہا۔

دو منٹ بعد وہ طغرا میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے محدّب شیشہ مصطفےٰ علی خان کو تھماتے ہوئے کہا۔

''ذرا غور سے 'یا رزاق' 'یا غفار' کو دیکھیں......''

وہ دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

''سُبحان اللہ''......! اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا...... طغرا دیکھنے کے بعد اس نے عدسہ ٹیبل پہ دھرتے ہوئے کہا۔ ''خان صاحب! اتنا باریک کہ انسانی آنکھ بغیر شیشے کے پڑھ ہی نہ سکے...... آپ نے یہ کیسے......''

''سیٹھ صاحب! ایسا باریک لکھنا کوئی خاص کمال نہیں ہے' اس سے کئی گنا زیادہ باریک لکھا جا سکتا ہے۔ اصل کام تو سورہ یٰسین کی آیات مبارک کے پہلے حروف سے آپ کے [illegible] اعداد اس خوبی و ہنر سے [illegible] آپ کے [illegible] برکت کے حصول کے لیے ممد و معاون ہوں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو کچھ آیاتِ مبارکہ کے پہلے حروف نمایاں اور سبز رنگ سے لکھے ہوئے ہیں۔''

وہ پھر شیشہ لے کر غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''خان صاحب' سُبحان اللہ......! اتنا باریک اور ایسا نستعلیق کہ بغیر شیشے کے دیکھے کوئی نہیں جان سکتا کہ ان اسماء کے اندر سورہ یٰسین پورے اعراب اور صحت حرف و الفاظ کے ساتھ تحریر ہے' بظاہر یہ محض رنگ نظر آتا ہے...... خان صاحب! یہ آپ کیسے......''

''سیٹھ صاحب! اللہ مُصوِّر ہے' وہ جمال اور حُسن کو پسند کرتا ہے اور اس کی دین ہے' وہ جسے بھی عطا فرما دے۔ وہ ربّ کائنات' عظیم و کریم ہے جس نے انسان کو علم الاسماء کی حکمت اور نظام تکوین کے اسرار و رموز سکھائے اور پھر آگے انسان نے اپنی اپنی گُر گر بدیا' سُر سرگیان کے مطابق ان علوم وفنون اور رموز و اسرار سے تحصیلِ کمال کیا......''

وہ پھر آتشی شیشہ لے کر طغرے کو دیکھتے ہوئے اچانک پوچھنے لگا۔

''خان صاحب! یہ کچھ آیات کے پہلے حروف سُرخ بھی ہیں مگر زیادہ تر سبز ہیں......؟''

''ہاں...... حروفِ ابجد میں سات حروف آتشی ہوتے ہیں مثلاً ''ا' ہ' ط' ف' ش' م' ذ......'' چند ے افلاکی بروج میں بھی کچھ برج آتشی ہوتے ہیں جیسے' حمل' اسد' قوس۔ آپ کے نام کے اعدادی حروف میں

جو حروف آتشی ہیں' اُنہیں میں نے سُرخ آتشیں لکھا ہے اور جو حروف شبنمی مزاج ہیں' اُنہیں سبز خط کیا ہے۔ یعنی یہ لوح آپ کے لئے تھی' اس کی برکات اور فیوض آپ کے سامنے ہیں......''

''خان صاحب! ایک بات مجھے اور یاد آئی۔ اس حادثے کے بعد والد صاحب مختلف جسمانی عوارض اور کاروباری خساروں کا شکار ہو گئے۔ یہاں تک کہ جہاں دل کا عارضہ اور خفقان کا مرض لاحق ہو گیا' وہیں دیوالیہ بھی پٹ گیا۔ کہیں اُنہیں یہ وہم تو نہیں ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ جنتر پتر کو خود سے جدا کرنے کے کارن ہوا ہے اور کیا اس میں کسی حد تک کچھ حقیقت کا عنصر موجود ہے......؟''

''مصطفےٰ علی خان صاحب! وہم کا تو کوئی علاج نہیں یا جو صحیح یا غلط بات انسان کے دماغ میں بیٹھ جائے تو وہ پھر مشکل سے ہی نکلتی ہے...... مجھے یاد ہے کہ جب آپ کے والد صحت اور کاروباری مالی پریشانیوں سے بُری طرح نڈھال ہو گئے تو اُنہوں نے مجھے لندن بلایا اور ساری صورت حال سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کچھ اپنے وہم کا اشارتاً ذکر کیا۔ میں پوری بات سمجھ گیا اور کہا کہ سیٹھ صاحب' میں نے آپ کا جنتر اس طغرے کے اندر رکھ کر آپ کو واپس کر دیا ہوا ہے اور وہ طغرا آپ کے کمرے میں آویزاں ہے...... وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگے [illegible] طغرے نے اس کے اثرات سلب کر لئے ہوں گے اسی وجہ سے میں خرابی صحت کے علاوہ پے در پے مالی خساروں سے دوچار ہو رہا ہوں...... میں نے بات کو سمیٹنے کی غرض سے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ وقتی خسارہ اور دین و دُنیا کی سُرخروی اور سربلندی یا پھر وقتی فائدہ اور دین و دُنیا کی بربادی؟ جو آپ چاہتے ہیں' وہی ہو جائے گا...... وہ بُز بُز ہوتے ہوئے بولے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا؟...... میں نے بڑی آہستگی اور نرمی سے کہا کہ یہ کچھ سمجھنے کے لئے آپ کو بریڈفورڈ میرے ساتھ چلنا ہوگا......

دوسرے روز میں اُنہیں وضو کرا کے' ایک مخصوص تسبیح اُن کے گلے میں ڈال کر اُنہیں پہاڑیوں میں لے گیا جہاں میں نے جنتر کو ایک پرانے درخت کے تنے کے ساتھ گاڑا ہوا تھا۔ میں نے اُنہیں حصار کے باہر کھڑا رہنے کی تلقین کرتے ہوئے چند کنکر دیتے ہوئے کہا کہ بائیں ہاتھ سے ایک ایک کنکر درخت کے جلے ہوئے حصے پہ ماریں۔ جونہی اُنہوں نے کنکر پھینکا' درخت بید مجنوں کی مانند کانپنے لگا۔ چیخیں' فریادیں' یوں جیسے کوئی ہنٹروں سے کسی کو پیٹ رہا ہو۔ سیٹھ صاحب اچانک یہ چیخیں' شور شرابا سُن کر گھبرا گئے۔ میں نے فوراً کہا کہ جلدی سے دوسرا کنکر بھی ماریں۔ پھر تیسرا' چوتھا۔ چوتھا کنکر مارتے ہی جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔ ہلکا ہلکا دُھواں اور سڑاندسی درخت کے تنے سے اُٹھنے لگی۔

صبح صبح کا وقت' جاڑا جوبن پہ اور پینائن کے سلسلے کی پہاڑیوں کے بغلی جنگلات میں سیتا سپاری و

صنوبر کے جھنڈوں میں صدیوں سے سوئی ہوئی پُراسرار دُھند نے ماحول کو پہلے سے ہی بڑا خوفناک اور ڈراؤنا سا بنا رکھا تھا۔ درخت سے اُبھرنے والے شور اور چیخوں سے جھاڑیوں' گھونسلوں اور شاخوں پہ جنگلی پرندوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ سیٹھ صاحب اچھے خاصے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے' اس کے باوجود اُن کے ماتھے پہ پسینہ اور جسم پہ لرزہ طاری تھا۔ وہ انتہائی خوف کے عالم میں کہنے لگے کہ مجھے فوراً یہاں سے نکال کر لے چلئے' میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔ میں نے عرض کی کہ گھبرائیں نہیں' اللہ ہمارے اوپر ہے۔ آپ کے گلے میں میری ڈالی ہوئی تسبیح ہے اور آپ حصار کے باہر محفوظ کھڑے ہیں۔ انشاء اللہ ہمیں یہاں کوئی چیز گزند نہیں پہنچا سکتی۔ دیکھ لیں' میں کسی چیز سے نہیں گھبراتا۔ مجھے اللہ کے سوا کسی سے کوئی خوف نہیں اور خوف باہر نہیں' انسان کے اندر سے اس کی بے یقینی اور اپنے اعمال اور کالے کرتوتوں کا ہوتا ہے۔ جو تسبیح آپ کے گلے میں اور جس کا امام آپ کے عین قلب کے اوپر جُھکا ہوا ہے' اس تسبیح کی منت لاکھوں کے حساب سے یاحیّ یاقیوم کا وِرد موجود ہے۔ اس کے امام کو کان پہ دھر کر دیکھیں' "یاحیّ یاقیوم" کا وِرد آپ کو سُنائی دے گا۔ سیٹھ صاحب بمشکل بولے کہ یہ درخت سے دھوئیں اور بدبوئیں اُٹھنے لگی ہے اور یہ خوفناک سی آوازیں جیسے چڑیلیں اور بھوت آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ میں نے آپ کے والد سے [illegible] اس وقت آپ کو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ سامنے جلے ہوئے حصے میں آپ کو ایک بڑا سا کیل ٹھکا ہوا دکھائی دے رہا ہوگا اور اس کے نیچے وہ خون آلودہ لکڑی اور [illegible] کانسی کا ٹکڑا بھی نظر آ رہا ہوگا۔ یہ آپ کا جنتر پتر ہے اور یہ خوفناک آوازیں اس جنتر کے قیدی بھوتوں اور راکھشسوں کی ہیں جو کالی مائی اور لکشمی مائی کے سیوک [illegible] ہیں۔ ان منحوس اور پلید' پورے پریوار کو میں نے یہاں اس سنسان اور خوفناک جنگل میں اس درخت کے ساتھ باندھ کر مارا ہے۔ ان کو میں نے ایسا جکڑا اور پھانسا ہے کہ یہ اپنی دُمیں' سینگ اور خونخوار دانت کٹوا کر یہاں سے بھاگ گئے ہیں لیکن کبھی کبھی یہاں پھیرا ڈال جاتے ہیں۔ جب تک اِن کا دان درکار وہ آپ کے پاس موجود ہے' وہ آتے جاتے رہیں گے اور آپ ان کے عتاب کا گاہے گاہے شکار ہوتے رہیں گے...... وہ جو آپ کو طغرا بنا کر دیا ہے' اس کے بیک کور میں ایک میری بنائی ہوئی لَوح موجود ہے۔ وہ آپ کو اللہ کے اَمر سے ان نجس اور ابلیسی قوتوں سے محفوظ رکھے گی اور آپ کو دھوئے گی۔ جب تک ان شیطانی قوتوں کا دیا ہوا ایک پیسہ بھی آپ کے پاس موجود ہے' وہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ یہ جتنا آپ کا نقصان ہوا ہے جان یا مال کا' یہ سب اِن کا دان دیا ہوا ہے۔ جیسے یہ آہستہ آہستہ آیا تھا' ایسے ہی یہ دھیرے دھیرے جا رہا ہے۔ یہی حقیقت بتانے کے لئے آپ کو یہاں لایا۔ یہ سب کچھ لندن میں بتانا سمجھانا یا دکھانا ممکن نہ

تھا...... ہاں! لندن جا کر آپ وہ میری لوح نکال کر دیکھ سکتے ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اکلوتی اولاد' مصطفےٰ علی خان کو تمام عمر ان پلید' نجس چیزوں سے بچا کر رکھے گی اور آپ کے اندر صالح اور پاکیزہ خیالات و اطوار پیدا کرے گی مگر جب میں کہوں' آپ اس وقت اُس لوح کو نکالیے گا......

مصطفےٰ علی خان صاحب! یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ آپ کے والد محترم کو سمجھانا اور پھر قائل کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا لیکن اللہ کا شکر کہ وہ حقیقت کو سمجھ گئے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ ساری حرام' جوئے اور گھوڑوں کی کمائی آہستہ آہستہ غائب ہو گئی یعنی جیسے آئی' ویسے چلی گئی۔ جب سارا میل کچیل' کچرا نکل گیا اور جیب' جسم دونوں صاف ہو گئے تو طبع' میلان اور زندگی' کاروبار' ہر چیز میں ایک نمایاں خوشگوار اور پاکیزہ سی تبدیلی آ گئی۔ گو اب وہ پہلے سے ٹھاٹ باٹ نہیں تھے لیکن ایک رُوحانی آسودگی اور خیر و برکت کا احساس زندہ ہو گیا تھا۔ بس یہی وہ چیز تھی جو اس لوح کا اصل مقصد تھا...... آج ایک طویل زمانے بعد جبکہ آپ کے والد اور میرے دوست سیٹھ صاحب حیات نہیں ہیں' مجھے آپ کے اصرار اور ضد کے آگے مجبور ہو کر یہ سارے راز و اَسرار کھولنے پڑے ورنہ میں تو حسبِ عادت وطریق ان پہ پردہ ڈالے ہوئے تھا۔ اب آپ کی لوح طغرے کی شکل میں آپ کے پاس موجود ہے لہٰذا حسبِ وعدہ آپ مجھے الوری فیروزے کی پکی کنی دلوائیں......"

"خان صاحب! صرف ایک بات اور' لیکن وعدہ فرمائیں کہ اسے بھی صاف صاف بتائیں گے اور کوئی پردہ پوشی نہیں ہوگی...... یہ الوری فیروزے والی لوح کس مقصد کے لئے ہوتی ہے' آپ اسے اپنے لئے تیار کر رہے ہیں یا کسی اور کے لئے......؟" وہ گھٹنے پکڑتے ہوئے بولا۔ "پلیز' خان صاحب! آپ کو علم ہے کہ مجھے اِن الواح کا بہت شوق اور کھوج ہے۔ میں اسے بنانا یا بنوانا نہیں چاہتا لیکن جاننا ضرور چاہتا ہوں...... میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ مجھے جو کچھ بھی بتائیں گے' میں کہیں اور اس کا ذکر نہیں کروں گا......"

میں نے مصطفےٰ علی کا ہاتھ اپنے گھٹنے پہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بھائی! آپ کیوں میری اتنی خوشامد کر رہے ہیں؟...... میں کوئی پیشہ ور الواح یا زائچے بنانے والا نہیں ہوں اور نہ ہی اس علم و فن میں کوئی نمایاں دَرک رکھتا ہوں۔ میں تو بس ذرا شوقیہ شغل کے طور پہ کبھی کبھی اُلٹی سیدھی بنا کر ہاتھ سیدھا کرتا رہتا ہوں...... باقی رہی بات اس الوری فیروزے والی لوح کی' تو بھائی! میں اسے کسی اور کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے مطالعہ' مشاہدے اور تجربے کے لئے بنا رہا ہوں۔ چار برس سے اسے مکمل کرنے کے لئے دن رات کی جاں گسل مشقت میں جُتا ہوا ہوں' اب آ کر کہیں اس

کے گھر بیٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کی آخری چوکھٹ یعنی بسم اللہ شریف کی بائے (ب) کے نقطہ پہ بٹھانے کے لئے ابابیل کا آنسو الوری فیروزے کی کنی چاہیے۔ پھر تین چار مہینے کی ایک اور مشقت کے بعد اسے حلبی آئینہ کی صندوقچی میں بند کر کے آنے والے محرم کے ایام میں موصل عراق لے کر پہنچنا ہے۔ وہاں ایک صحرائی مقام ارغون کے قریب ایک شکستہ غیر آبادسی خانقاہ میں ایک سیاہ رنگت تھلتھلا سا ٹیلہ اُبھرا ہوا ہے جسے ایک نظر دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے ریت کی دلدل میں حبش کا اسودی شتر غرق ہوا اور اس کا صرف کوہان باہر نکلا رہ گیا ہو۔ وہاں پھر ایک غیر معینہ مدت تک نئی مشقت اور قیام ہوگا' تب شاید کہیں یہ لوح اپنے مستقل گھر پہ بیٹھے اور میری ایک طویل محنت ثمر بار ہو جائے......"

"خان صاحب! قطع کلامی کی معافی چاہتے ہوئے پوچھنا چاہوں گا کہ وہاں موصل کے صحرائی مقام ارغون کی اس خانقاہ میں کیا شرف ہے کہ آپ خاص طور پہ وہیں لے جا کر اپنی اس لوح کو آئینوں کی صندوقچی میں بند کر کے گھر بٹھائیں گے۔ مزید میں اس "گھر بٹھانے" والی اصطلاح کو بھی سمجھ نہیں سکا؟"

میں نے شرارت بھرے انداز میں جواب دیا۔

"میاں صاحب! آپ نے کبھی بڑھئی کو چارپائی کے پائے کی چولیں یا کسی جوڑوں کے ماہر کو گھٹنے ٹخنے یا جوڑ بٹھاتے دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو اسی طرح زائچہ یا لوح کو گھر بٹھانے کی اصطلاح بھی سمجھ میں آجانی چاہیے' مزید آپ اسے یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے کسی لڑکی کو مایوں یا کسی لڑکے کو ختنہ بٹھایا جاتا ہے...... لوح کو گھر بٹھانے سے مُراد ہے کہ لوح اپنے ربع مسکنوں میں مبسوط ہو کر قائم بالخواص ہو جائے اور ہر طرح کے ابہام و تشکیک سے بالا اُورج عالی منزلی سے آسودہ ہو جائے......

دوسری آپ کی بات کہ اسے موصل ہی لے کر جانا کیوں ضروری ٹھہرتا ہے؟ دراصل یہ مسئلہ اور اس ٹیڑھے سے راز کو سمجھنے کے لئے انسان کا علمُ الارض' طبقات' طبیعات' جمادات کا عالم اور علمِ تکوین' تنجیم اور تقویم کا عامل نستعلیق ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ الاسماء' علمُ الارواح اور علمُ الالواح کا بھی کامل ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔ لوح ایک تختی ہوتی ہے جیسے بچی کچی کے بچوں کچوں کے لئے الف بے تے لکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ بچوں کی لکڑی کی گاچ سے مسطح تختی بانس کے خامے اور جلے ہوئے اخروٹ بادام چھال کی سیاہی سے لکھی جاتی ہے اور بڑوں' پکوں والی تختی چھال' چمڑے' شیشے' کپڑے' پتھر' چوب اور کئی قسم کی دھاتوں کے پتروں کے علاوہ مختلف اقسام کے قرطاس پہ بھی لکھی جاتی ہے۔ معمولی سیاہی کی جگہ زعفران' عنبر' شہد' آبِ زم زم' رتن جوت اور دودھ وغیرہ استعمال ہوتا ہے اور جو ابلیسی استعانت و معاونت کی حامل ہوتی ہے وہ مختلف جانوروں اور انسان کے خون مثلاً اُلو' کوا' کتا' خنزیر' بلی' حاملہ اور بانجھ عورت' نوزائیدہ مُردہ بچے کا لہو' بچھو

کے نقش اور سانپ کے جبڑوں کا زہر' عورت کے حیض کا خون' آبِ زلال' تھور کا پانی' خچر کے پیشاب وغیرہ سے نقش کی جاتی ہے۔ ایسی نحس الواح کو بیٹھ بٹھانے کے لئے بانس کی انی دار کونپلیں اور بلی' گیدڑ بھیڑیوں کے پنجوں کے ناخن اور دانت یا چیل' بگھڑ' باز' گدھ کی چونچ' تھور اور کیکر کے کانٹے' لکڑی اور سرکنڈوں کے پھانے' تیز کیل اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کام آتے ہیں جبکہ سعد الواح کے لئے مختلف خوشبوئیں' عطریات' اگر و بخورات' چاند کی چاندنی' صُبحدم کی پُروائی' اذان کا آہنگ وغیرہ شامل ہوتا ہے۔ ایک اور بات کہ خاص طور پہ موصل کے صحرائی مقام ارغون جانا ہی کیوں ضروری ٹھہرا؟ گو یہ اَدق سا مسئلہ سمجھانا بہت مشکل ہے' تاہم کوشش کرتا ہوں کہ آسان فہم الفاظ اور طریقہ سے آپ کو سمجھا سکوں۔

یوں سمجھیں کہ کُرۂ اَرض پہ کچھ جگہیں ایسی ہیں جو مخصوص قسم کی قوتوں' اَسرار' خاصیتوں' جغرافیائی اہمیتوں' اَرضی سماوی اور رُوحانی اقتدار کی حامل ہوتی ہیں۔ میدانِ عرفات کے پاس جبلِ نور' غارِ حراء ہے۔ وادئ سینا میں جبلِ طور' ترکی میں جبلِ اَراراط' عراق میں موصل' پاکستان میں مانسرو جھیل' جھیل سیف الملوک' امریکہ کے پاس سمندر میں ٹرائی اینگل ٹریپ' مصر میں بہاریہ' سقارہ اور غزہ کے اہرام وغیرہ وغیرہ۔ بالخصوص یہ مقامات اور چند ایک اور جگہیں عالمین اَنفس و آفاق کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ پُراَسرار اور [illegible] مقامات ہیں جہاں [illegible] افلاک کے فرش [illegible] بحر و بر اور جبل و صحرا کے ساتھ تاب و تجلیاتی' مقناطیسی اور برقیاتی سلسلے قائم رہتے ہیں۔ افلاکی نجوم و بروج کے قیام و قلول' دِرخشندگی و معقول کی نحستیں اور ساعتیں اِن مقامات پہ عکس ریز ہوتی ہیں۔ اَرض کے تمام تر خزانے اور وسائل اِن جگہوں کے زیرِ نگیں اور ہم نشیں ہیں...... سیٹھ صاحب! اِس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں اِن میں کئی جگہوں پہ بارہا پہنچا۔ سیاحت و قیام کے دوران بے شمار مشاہدات ایسے بھی ہوئے کہ اِنہیں لکھنے کے لئے جگرا اور اُنہیں پڑھنے کے لئے اِک بڑا کلیجہ چاہئے۔ یہ لوح جس پہ عرصہ چار سال سے محنت کر رہا ہوں' اِسے تیار کرنے کے لئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے بابا جی سے اجازت لی تھی۔ میں نے اپنے حساب و کتاب سے اسے بٹھانے کا جو سمے نکالا تھا' وہ نویں محرم ہے اور مناسب' قریب ترین تختِ تیاہ موصل ہے۔ نجف اشرف کے پاؤں میں اَرغون' وہ سیاہ سا تھلتھلا سا اُبھرا ہوا کوہان نما ٹیلہ جس پہ بال سے اُگے رہتے ہیں اور جس کے اِردگرد ہزاروں بڑے بڑے سے پُراَسرار کوّے منڈلاتے رہتے ہیں۔ افلاک کی گردشوں کے سارے پَرتو اِس کی تھلتھلاہٹ سے محسوس ہوتے ہیں اور جہاں سعد سمے کے سائے میں اگر لوح بیٹھ جائے تو......"

"خُدا کے لئے' رُکئے مت۔ جملے کو مکمل کریں...... اگر لوح بیٹھ جائے تو پھر......؟"

مصطفےٰ علی خان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس' یہاں تک ہی کافی ہے۔ آگے بتانے سے نطق کے پر جلتے ہیں۔۔۔۔۔۔''

سیٹھ مصطفےٰ علی خان قدرے مایوس سے ہو کر پوچھنے لگے۔ ''الوری فیروزہ کہاں بیٹھتا ہے۔۔۔۔۔؟''

''یہ بھی ایک بڑی گہری بات ہے اور کسی غیر متعلقہ فرد کے لئے اسے سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ اگر میں آپ کو کچھ بتانے یا سمجھانے کی کوشش کروں تو سب سے پہلے یوں کہوں گا کہ لوح کا تصور' لوح محفوظ سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا کہ جو کچھ ہے یا جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے' وہ سب کچھ اس پہ لکھ کر محفوظ کر دیا ہوا ہے۔ ازل ابد' مقدر' مقسوم' سزا جزا' عرش اور فرش' حتیٰ کہ پوری کائنات' تمام عالمین کے حالات اور آغاز و انجام یہاں لکھ دیئے گئے ہوئے ہیں۔ سینہ بہ سینہ' زبان در زبان اور حافظہ کی مدد سے محفوظ کیا ہوا کلام و پیغام زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنے اور آگے پہنچانے پہنچانے اور سہو و خطا سے بچانے کے لئے چمڑے' پتھر' مٹی' لکڑی' پتے' چھال' کانچ اور مختلف انواع کی دھاتوں کے علاوہ پارچات' بانس گھاس اور دیگر مختلف نباتاتی گودوں کے بنائے قرطاس استعمال کئے گئے۔ اللہ کے فرستادہ بندوں اور دیگر صلحاء علماء و فقہاء نے اس سلسلہ و وسیلہ کو علم اور دین و مذہب کی تبلیغ و ترویج کے لئے خوب استعمال کیا۔ شر شیطان اور بہکا دینے والے وسوسوں ارضی و سماوی آفات و بلیات سے محفوظ و مامون رکھنے کے لئے آیات قرآنی' مقدس اسماء ربانی اور تنجیم و تقویم آسمانی کے تعویز' نقش' نقشے' پرت پرتار' تکیرے' پتر پاتے' لکیرے لیکھے' اکھر آکھر' پترے' ترقیے اور زائچے الواح وغیرہ تحریر کئے جاتے رہے۔ خیر و برکت' فراوانی رزق' صحت و تندرستی' اتفاق و یگانگت' سفر و سیاحت' میلان عبادت و ریاضت' حب و رفاقت' کامرانی و تسخیر' جاہ و جلال اور جمال و جلوت کے لئے بھی یہ لوحیں لکھی اور بنائی جاتی ہیں۔ عاملان خفی و سریت الٰہیات' عمرانیات' متخیلات' افلاکیات' ملکوتیات اور لاہوتی معارف و علوم کے متبدی و ماہر اور ماورائے حقیقت اور مابعد المدرکات کے متلاشی و متوالی اپنی ریاضت کے آڑے مضرات و مباہم سے بچنے اور اللہ کی استعانت کے حصول کے لئے عجیب و غریب لوحیں بناتے رہتے ہیں۔ چلّے' ریاضتیں' مجاہدے اور مختلف نوع کے مراقبے بھی اسی ذیل کے سلسلے ہیں۔ رجال الغیب' موکلات' ہمزادات اور جنات کی تسخیر و تحصیل کے لئے بھی لوحیں کام آتی ہیں۔ بس سارا کام اور کمال اس کا لکھنا' تیار کرنا اور اس کا صحیح راسخ بٹھانا ہوتا ہے۔ تعویز گنڈے تو چھوٹے موٹے مولوی' نام نہاد پیر اور عامل بھی لکھ لیتے ہیں کیونکہ یہ صرف نقل اور عقل کا کام ہے۔ آیتیں یا کچھ اسماء اور اعداد لکھے' خانے چوکھٹے بنائے' لپیٹ لپاٹ چوکور سی پڑیا بنا کر تھما دی اور کہا کہ جاؤ' کالا دھاگہ لپیٹ کر باندھ لو یا کہیں رکھ دو۔ سائل کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس پہ کیا لکھا ہے؟۔۔۔۔۔

لوح یوں نہیں ہوتی۔ یہ مولوی یا کسی چھوٹے موٹے عامل یا کسی دو نمبر پیر کے بس کا روگ نہیں۔ یہ علمِ الافلاک وعلمِ آفاق جاننے والے کامل منجموں' علوم مخفیہ و روحانیہ کے عالموں اور عاملوں کا وظیفہ اور کام کلام ہوتا ہے جن کے سامنے چودہ طبق آئینہ کی طرح روشن ہوں اور جن کے رُوبرو گڑا مردہ بھی بولے اور جن کی بساط میں دیگر مخلوقات کی تسخیر و تعمیل ممکن ہو۔ جانئے کہ سر کے دائیں جانب شعور اور بائیں طرف لاشعور ہوتا ہے' سیدھے اور اُلٹے شانے پہ کرام الکاتبین کی ترتیب بھی ایسے ہی ہے۔ بعینہٖ الواح نو سینندہ کے دائیں بائیں ایک انبوہ مُلہمات اور پشت پہ حلقۂ جنّات ہوتا ہے اور نگاہ کے سامنے ہفت چرخ مانندِ خیمہ بانات تنے ہوتے ہیں اور یہ اعزاز کئی جنموں کی ریاضت و مشقت کے بعد بھی کسی قسمت والے کو حاصل ہوتا ہے۔''

سیٹھ مصطفےٰ علی خان حیرت' تجسس اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبا ہوا بغیر آنکھیں جھپکے میری کچھ سمجھ میں آنے اور کچھ پلّے نہ پڑنے والی گفتگو سُن رہا تھا اور میں بھی نہ جانے کس رَو میں بہتا ہوا اس وقت ایسی ایسی مخفی باتیں بغیر کہیں رُکے بتا رہا تھا۔ مجھے خود پہ تعجب ہو رہا تھا کہ میں آج ایسا کیوں کر رہا ہوں؟...... کہاں میں کہ اس موضوع پہ لب تک نہ ہلاؤں اور کہاں یہ آگہی جیسے صدیوں کے بند سوتے کُھل گئے ہوں...... میں نے سیٹھ صاحب کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ صاحب! کہاں ہیں آپ......؟''

''ہونہہ...... !'' وہ ہکلاتے ہوئے جیسے سوتے سے جاگے۔ حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں کو ایک چکر سا دے کر سمیٹتے ہوئے سنبھلتے ہوئے بولے۔ ''خان صاحب! یقین فرمائیں میں تو کسی اور جہان میں اُترا ہوا تھا۔ آپ کی پُراسرار اور سحر انگیز گفتگو نے مجھے تو جیسے پتھر سا کر دیا ہے' یوں لگتا ہے گویا صدیوں سے آپ محوِ کلام ہیں اور میں ہمہ تن گوش بر آواز...... پلیز! آپ رُکیئے نہیں۔ کہتے جایئے اور میں سُنتا جاؤں......''

''سیٹھ صاحب! آپ کاروباری بندے اور دُنیادار لوگ ہیں۔ میری باتوں پہ نہ جایئے' یہ تو جادوئی بین کی مسحور تانوں پلٹوں کی طرح ہیں جو سُننے والوں کو دُنیا سے بیگانہ کر کے نکما کر دیتی ہیں۔ بس انہیں دیوانے کی بڑ جان کر لطف لیجئے' اِدھر سے سن کر دوسری طرف سے نکال دیں ورنہ آپ دو کوڑی اور ڈیڑھ رتی کے ہو کر رہ جائیں گے...... بھائی! ہم تو درویش ٹٹ پونجیئے' گھر کے نہ گھاٹ کے...... ہوش پکڑیں' ابابیل کا آنسو کہیں سے دلوائیں اور ہم اپنی راہ لیں......''

''وہ تو ٹھیک ہے' ایسا ہی ہوگا مگر میرے ایک سوال کا جواب ابھی تک عطا نہیں ہوا......''

مصطفےٰ علی خان پھر نگاہیں' میری نگاہوں میں ڈال کر کہنے لگا۔

''آپ نے خود ہی ابھی میری تعریف میں فرمایا کہ مَیں ایک کاروباری بندہ ہوں' وہ بھی جواہرات کا۔ ہمارے ہاں پرکھ بڑی اہمیت رکھتی ہے خواہ وہ جواہر کی ہو یا انسان کی' اور دوسری اہم چیز ہمارے ہاں بات' بول اور قول ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی نایاب' انمول اور قدر و قیمت والی چیز نظر آ جائے تو پھر ہم اِسے چھوڑتے نہیں' ہر حال میں اِسے حاصل کرتے ہیں اور پھر اسے اپنی قیمت پہ کسی قدردان شوقین کو فروخت کر دیتے ہیں۔ ہم خاندانی جوہری ہیں' جوہر کو خوب پہچانتے ہیں اس لئے ہمیں دونوں پارٹیوں کو اپنے اپنے بول' قول اور بات کا خوب خیال رکھنا چاہئے...... ہاں' تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ ابابیل کا آنسو' اس کی آپ کی لوح میں کیا اہمیت ہے اور یہ لوح بنانے کا مقصد کیا ہے......؟''

مَیں نے اِس حریص جوہری کی جانب قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ صاحب! اِس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے ایک شریفانہ طریقے سے بلیک میل کر رہے ہیں...... بہر حال! جو کچھ بھی ہے۔ اب مَیں چونکہ آپ کے پاس ایک غرض لے کر آ گیا ہوں تو ٹھیک ہے۔ آپ جو چاہیں' سلوک کریں......'' مَیں نے اپنے زیر جامے کی جیب سے ایک پیکٹ نکالتے ہوئے پھر کہا۔ ''اب [illegible] کھول کر لوح ان کے سامنے کر دی۔ ''یہ ایک صدیوں پرانی لوح ہے۔ چاندی' سونا اور تانبے کی یہ بادام کی شکل' سائز والی لوح مَیں نے ایک ڈھانچے کی گردن سے اُتاری تھی...... ذرا غور سے دیکھیں' اس کے عین درمیان میں ایک ننھا سا سوراخ ہے جس سے کرنوں کی مانند لہریں' لکیریں سی پھیلتی پھوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ گویا یہ ننھا سا سوراخ ایک سورج سے مشابہ ہے۔ اب آپ اگر محدب شیشے سے دیکھیں تو کچھ اعداد اور کچھ عربی حروف کندہ دکھائی پڑیں گے۔ ایک عام سی خالی نگاہ ڈالنے سے یہ بادام یا آم کی شکل کی طرح کا کوئی کانسی کا ٹکڑا دکھائی دیتا ہے جبکہ یہ ایک نادر اور زبردست قسم کی مقدس لوح ہے جو آج سے صدیوں پہلے کسی عربی النسل عامل نے کسی کو خیر و برکت' فتح و نصرت' کامرانی و شادمانی اور حشمت و جاہ کے لئے دی تھی۔ اگر آپ مزید غور کر کے سوراخ کو ملاحظہ فرمائیں تو پتہ چلے گا کہ اس سوراخ میں کوئی نگینہ آویزاں تھا۔ سوراخ کے اندر ایک ''زے'' سی بنی ہوئی ہے اور کناروں پہ نگینہ جکڑنے کے لئے چار اُبھار بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ امتدادِ زمانہ' کسی حادثے' لاپرواہی یا دانستہ طور پہ نگینہ اپنے محور سے اُتر گیا اور پھر اس لوح کے اثرات منفی رُخ پکڑ گئے یعنی پھر یہ لوح' حاملِ لوح کے لئے سعد کی بجائے نحس ثابت ہوئی۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کا احترام اور حفاظت بھی نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے موکلین ایک ایک کر

کے یہ گھر خالی کر گئے اور اس خالی گھر میں شیطانی قوتیں قبضہ جما کر بیٹھ گئیں۔

گہرے مشاہدے اور توجہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوح جو بارہ تیرہ سو سال پرانی ہے، خطِ کوفی میں کوفے کے کسی جید عامل نے تیار کی تھی اور نجدی فیروزے کی الوری کنی اس کے درمیان بٹھائی گئی تھی۔ اس کنی پہ اس عامل نے مشقت کر کے ایک گروہ موکلین حاضر بھی اس لوح پہ بٹھایا تھا۔ اب میں نے بھی اس پہ بڑی مشقت کی ہے، اسے دوبارہ بٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور اب بڑے بھائی! اس کے لئے مجھے ابابیل کا آنسو چاہیے......"

مصطفٰی علی خان محدب شیشے سے اس کو الٹ پلٹ کر ملاحظہ کر رہا تھا، پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ تو واقعی بڑی مقدس، قیمتی اور پرانی لوح ہے۔ سونا، چاندی، تانبا، تینوں دھاتوں کا میل ہے۔ سبحان اللہ......! اب آپ یہ فرمائیں۔ فرض کر لیتے ہیں کہ الوری فیروزے کی کنی مل گئی ہے اور آپ نے اُسے اس پہ جما بھی دیا ہے...... پھر کیا ہوگا؟"

"بڑے بھائی! بس میرا آپ سے بول تول والا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کے صرف دو سوال تھے، ان کا جواب دے چکا ہوں۔ اب آپ کے ایسے مشکل ذہن باتیں کرنے سے میرا دماغ پلپلا ہو گیا ہے......"

میں نے لوح لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے لوح کپڑے کے رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لی، بولا۔

"خان صاحب! میں آج سے آپ کا باقاعدہ شاگرد اور آپ میرے اُستاد...... اب آپ مجھے لوح لکھنا، بنانا اور بٹھانا سکھائیں گے۔ میں انشاء اللہ آپ کی خوب خدمت کروں گا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے شوق ہے اور وہ بھی جنون کی حد تک...... میں کوئی عامل کامل بننا نہیں چاہتا، صرف شوقیہ سیکھنا چاہتا ہوں۔ اب اللہ نے میری سُنی اور آپ کو میرے پاس بھیج دیا......"

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا تو اس نے جھٹ سے میرے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"...... نہ، خان صاحب! اب آپ کچھ بھی نہیں کہیں گے...... انشاء اللہ! یہ ابابیل کا آنسو ضرور کہیں نہ کہیں سے حاصل کر کے رہیں گے......" وہ اُٹھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ "ہم جوہری لوگ بات، بول، تول کا بہت خیال رکھتے ہیں......"

"سیٹھ صاحب! باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ پیکٹ مجھے دے دیں۔ یہ بڑی خطرناک اور قیمتی

نایاب چیز ہے' اسے میں اندر کی مخصوص جیب میں بڑی حفاظت سے رکھتا ہوں......''

وہ بڑے اعتماد سے کہنے لگا۔

''آپ بالکل بےفکر ہو جائیں' ہم جوہری لوگ ایسی قیمتی اور نایاب اشیاء کی حفاظت کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ یہ ابھی' اسی وقت آپ کے سامنے بڑی تجوری میں سات حفاظتی پردوں اور آٹھ فول پروف تالوں کی کفالت میں ہوگی...... باقی رہی اس کے خطرناک ہونے کی بات' تو سانپ پٹاری میں بند کر دیا جائے تو کینچوے سے بھی زیادہ بے ضرر ہو جاتا ہے اور آپ جیسے دُرویش کی موجودگی میں کیسا خطرہ اور کیسی پریشانی......؟''

میں اُس کا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔

آدھی رات آگے اور آدھی پیچھے تھی جب پورے گھر میں ایک قیامت سی مچ گئی یوں جیسے اس گھر میں کہیں زمین سے جن بھوت نکل آئے ہوں' تمام چھوٹے بڑے اور ملازمین بڑے کمرے میں اکٹھے سہمے سے کھڑے تھے۔ چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں...... میری تو اچانک آنکھ اُچٹ گئی تھی' باہر کوئی دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ''خان صاحب' خان صاحب'' کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا' دروازہ کھولا تو باہر سیٹھ صاحب کھڑے تھے۔ بکھرے بال بکھرے ہوئے رنگ فق اور پریشان سے مجھے گھورنے لگے۔

''خیریت...... اس وقت یہ شور کیسا ہے اور یہ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟'' میں نے ان کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''خان صاحب! مجھ پہ قیامت ٹوٹ گئی ہے اور آپ سو رہے ہیں؟...... میں لُٹ گیا' برباد ہو گیا۔ میری عمر بھر کی کمائی' جائیدادوں کے تمسکات' لوگوں کی امانتیں اور رہن رکھی ہوئی تمام قیمتی اشیاء اور آپ کی لَوح' سب کچھ ڈاکو لے گئے ہیں...... آیئے میرے ساتھ' خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں......''

وہ مجھے قریب قریب کھینچتے ہوئے اپنے شب خوابی کے کمرے میں لے گئے۔ سامنے دیوار کی ساتھ پرانی وضع قطع کی کپڑوں کی ایک الماری تھی جو اپنی اصل جگہ سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک پرانی طرز کی بڑی سی آہنی تجوری دیوار میں چنی ہوئی دکھائی دی جس کے موٹے بھاری بھاری دُہرے پٹ گلیوں میں کُھلنے والی کھڑکیوں کی طرح دو نیم کُھلے ہوئے تھے۔ فرش سے دو سوا دو فٹ اُونچی دیوار میں گڑی ہوئی تجوری کے اندر دو بڑے سے طاق اور چند ایک چھوٹے چھوٹے خانے جن کے تالے کُھلے ہوئے تھے۔ سب خانے اس طرح سے خالی اور صاف تھے جیسے چوروں نے مال سمیٹنے کے بعد انہیں اچھی طرح کپڑے سے صاف بلکہ پالش تک کر دیا ہو...... مصطفےٰ خان کی بُری حالت تھی' میں تو دیکھ ہی رہا تھا مگر وہ

دیکھ کر منہ سر پیٹنے لگے تھے۔

''ہائے...... لوگوں کی امانتیں' میرے ہیرے جواہرات' سونا چاندی۔ جائیدادوں کے کاغذات۔''

''......اور میری لوح......!''

لاشعوری طور پہ میرے منہ سے نکل گیا۔ انہیں جیسے یکدم بریک لگ گئی ہو۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر وہ شہادت کی اُنگلی میرے سامنے لہرانے لگے جیسے بات کرنے کا یارانہ ہو۔ بڑی دقت اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

''ایک لوح کی وجہ سے ہی میرے والد مرحوم پہ غربت کا عتاب ٹوٹا تھا اور آج ایک دوسری لوح کی وجہ سے میری لُٹیا بھی ڈوبی......'' وہ شدتِ جذبات و غضب سے کانپتے ہوئے کہنے لگے۔ ''دونوں مرتبہ وجۂ بربادی آپ ہی ہوئے ہیں......''

پیچھے کھڑے گھر والے بھی مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں اکیلا بھیگی بلی بنا ہوا ان کے رحم و کرم پہ کھڑا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ باہر سے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں اندر پہنچ گئیں۔ پولیس نے پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔ خان مینشن کے باہر بہت سی پولیس تھی۔ میں نے جلتی بجھتی اور گھومتی ہوئی روشنیوں میں دیکھا کہ دو گاڑیوں سے سراغ رساں کتے بھی اتر رہے تھے۔ پولیس اور کتے دیکھ کر میں نے مصطفٰی علی خان سے سوال کیا۔

''یہ پولیس آپ نے منگوائی ہے......؟''

وہ شک بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اس گھر میں میرے علاوہ بھی کچھ اور لوگ رہتے ہیں۔ میں نے نہ سہی' کسی اور نے ٹیلی فون کر دیا ہوگا...... ویسے بھی یہاں کا ایریا انسپکٹر میرا بہنوئی سعد علی خان ہے اور اس وقت وہی باہر کھڑا' وائرلیس پہ کسی سے بات کر رہا ہے......''

پولیس نے آتے ہی گھر کے علاوہ پورے علاقے کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ علاقے کے سب سے متمول' سماجی' سیاسی اور کاروباری لحاظ سے ایک سرکردہ شخصیت کے گھر واردات ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا' مزید یہ کہ اس گھر کا داماد علاقے کا انسپکٹر بھی ہو...... انسپکٹر سعد علی خان سے میرا تعارف نہیں تھا۔ سر سے اپنی کیپ اُتارتے ہوئے' ہاتھ میں بیٹن پکڑے ہوئے وہ جب ''اسلام علیکم'' کہہ کر اندر داخل ہوا تو وہ مجھے بے حد سمارٹ' فرض شناس اور ذہین دکھائی دیا۔ خوبصورت اور مضبوط اعصاب و جسم کا مالک تھا' کھلے ماتھے کے ساتھ مسکراتا ہوا وہ مجھے بے حد خلیق اور مہذب بھی لگا۔ اُس نے مجھے گھر والوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر بڑی گرم جوشی سے ''ہیلو'' کہتے ہوئے مضبوط سا ہاتھ ملایا' پھر مصطفٰی علی خان کی جانب ایک نظر

دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''انسپکٹر سعد علی خان' ساؤتھ ریجن ممبئی پولیس...... آپ کی تعریف؟''

اُس نے بڑے پروفیشنل میکانکی انداز میں یہ سب کچھ بڑی سُرعت سے کہہ ڈالا مگر میں تو اپنی بُری عادت سے مجبور اسے اپنی ایکس ریز کے لینزوں والی نگاہوں کی زد میں رکھے ہوئے تھا' اُس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''آپ اپنا نام نہ بھی بتاتے تو میں آپ کو ''آپ بڑے سعد ہیں'' ہی کہہ کر مخاطب ہوتا......''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے شانے اُچکا کر بولا۔ ''پارڈن می' میں کچھ سمجھا نہیں......؟''

مصطفےٰ علی خان بول پڑا۔ ''سترہ برس کے گہرے تعلقات کے باوجود بھی میں انہیں نہیں سمجھ سکا' تم ایک دومنٹ میں کیونکر سمجھ سکو گے؟...... یہ میرے انگلینڈ والے دوست محمد یحییٰ خان ہیں' کئی بار تم سے ان کا ذکرِ خیر ہو چکا ہے...... انہیں چھوڑو۔ گھر میں اتنی بڑی واردات ہوگئی ہے پہلے اس کی طرف دھیان دو......''

وہ اپنے ماتحتوں کے لیے جائے واردات پہنچ گیا۔ ہم بھی پیچھے پیچھے ہولئے۔ وہی پولیس والوں کے سوال جواب اور بال کی کھال اتارنے والے تفتیشی انداز۔ فوٹو گرافر' فنگر پرنٹ ایکسپرٹ اور دیگر کھوج پکڑنے والے ماہرین اپنے اپنے کاموں میں جُت گئے۔ سعد علی خان اپنے ماتحت کے ساتھ مجھے اور مصطفےٰ علی خان کو لے کر دوسرے کمرے میں الگ منڈلی جما کر بیٹھ گیا' یعنی پہلی تفتیش کا سیشن شروع کر دیا۔ سیٹھ صاحب نے بتایا کہ میں نے خان صاحب سے ایک چیز لے کر اپنی بیگم کی موجودگی میں سیف کے اندر رکھی۔ پھر حسبِ معمول میں اپنے وقت پہ سو گیا۔ خواب گاہ کی کھڑکیاں' دونوں دروازے' واش روم کی کھڑکی دروازہ سب اندر سے محفوظ اور مضبوط تھے۔ سونے سے پہلے خفیہ الیکٹرونک سکیورٹی سسٹم بھی آن کر دیا گیا تھا۔ خواب گاہ کے باہر بڑے دروازے اور پھر صحن کے آگے بڑا صدر گیٹ' سب حسبِ معمول بند اور سکیورٹی سسٹم بھی چالو تھا۔ اندر اور باہر کے دونوں چاق و چوبند چوکیداروں نے بھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا اس کے باوجود کوئی جادوگر نقب زن گودریج کی بنی ہوئی فول پروف' اٹھارہ لیور' چار باہر' چھ اندر کے تالوں کے دُہرے نظام والی سیف کو کھول کر میرا سب کچھ لے اُڑا اور وہ بھی یوں کہ نہ تو الیکٹرونک سکیورٹی سسٹم کو خبر ہوئی' نہ ہمیں میاں بیوی کو جو چند فٹ کے فاصلے پہ سوئے ہوئے تھے اور نہ کسی چوکیدار کو' نہ ہی ان خونخوار کتوں کو جو اجنبی چھپکلی کو بھی گھر کی حدود میں گھسنے نہیں دیتے...... انسپکٹر کا ماتحت بڑی سُرعت سے سارا بیان قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔ انسپکٹر نے بڑی توجہ سے

بیان سُنتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے خان صاحب سے کون سی چیز لے کر تجوری میں رکھی تھی......؟"

سیٹھ صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں؟...... مَیں نے ان کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔

"انسپکٹر صاحب! وہ ایک میٹل کا ٹکڑا تھا جیسے آج کل کے لونڈے بالے سیاہ ڈوری کے ساتھ گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں......"

انسپکٹر نے چند لمحے توقف کرتے ہوئے پھر سوال کیا۔

"ایک معمولی میٹل کا لاکٹ اتنے اہتمام کے ساتھ تجوری میں رکھنے کی کوئی معقول وجہ......؟"

سیٹھ صاحب نے پھر مجھے دیکھا' گویا کہہ رہے ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی تم ہی دو۔ مَیں نے لب کھولنا ہی چاہے تھے کہ انسپکٹر نے بڑے نرم سے تحکّم کے ساتھ کہا۔

"میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا کہ میرے سوالوں کا جواب سیٹھ مصطفیٰ علی خان دیں۔ چوری یا نقب زنی کی واردات ان کے کمرے میں اور ان کے گھر ہوئی ہے اور آپ تو ایک معزز مہمان ہیں......"

مَیں نے اثبات میں سر جھکا کر اس کے قانونی نکتے پہ صاد کرتے ہوئے سیٹھ صاحب کی جانب اشارہ کیا کہ وہ جواب دیں۔

"انسپکٹر صاحب! وہ میٹل کا ایک معمولی ٹکڑا نہیں تھا بلکہ ایک قیمتی اور بہت پُرانی لَوح تھی......"

"لَوح......" انسپکٹر نے بھوئیں سکیڑتے ہوئے دہرایا۔ "یہ کیا چیز ہوتی ہے......؟"

سیٹھ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سوال کا جواب یہ دیں گے کیونکہ یہ ان کی ملکیت تھی' اس کے متعلق مجھ سے زیادہ یہ جانتے ہیں...... ہاں' ایک بات صاف کر دوں کہ ان کے انکار کے باوجود مَیں نے ہلکی سی زبردستی استعمال کر کے یہ لَوح ان سے لے کر حفاظت کی غرض سے تجوری میں ڈال دی تھی......"

انسپکٹر دیدے گھماتے ہوئے مجھے اور کبھی سیٹھ صاحب کو دیکھنے لگا۔ پھر جیسے کچھ فیصلہ کرتے ہوئے مجھ سے گویا ہوا۔

"خان صاحب! آپ لَوح کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے......؟"

"انسپکٹر صاحب! مَیں پہلے اپنا ہلکا سا تعارف پیش کرنا چاہوں گا...... میرا نام تو آپ جان چکے

ہیں۔ میرے اس فیملی سے بہت پُرانے تعلقات ہیں۔ مصطفےٰ علی خان صاحب تو ماشاء اللہ اب بڑے ہوئے ہیں' جب یہ اسٹوڈنٹ تھے تو یہ میرے پاس ہی انگلینڈ میں مقیم تھے۔ اصل دوستی میری بڑے سیٹھ صاحب مرحوم سے تھی۔ مَیں ایک دُرویش آدمی ہوں۔ سائیکلوجی' پیراسائیکلوجی' سائیکاٹری' آسٹروپامسٹری' کیمسٹری اور ہسٹری میرے شوق ہیں' پروفیشن نہیں...... لوح کا مطلب ہے سلیٹ' بلیک بورڈ یا وہ چیز جس پہ کچھ لکھا ہوا ہو۔ ویسے یہ لوح کا لفظ خاص طور پہ ان چیزوں کے لئے مستعمل ہے جن پہ بالخصوص اسماء حسنہ یا کوئی قرآنی آیت وغیرہ تحریر یا کندہ ہو۔ یہ چیزیں کاغذ' چمڑا' کوئی بھی میٹل پیس' لاکٹ' لکڑی' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک میٹل پیس جو بشکل بادام کے سائز اور شکل کا تھا' وہ مجھ سے لے کر سیٹھ صاحب نے اپنی تجوری میں رکھ دیا ہوگا......"

"رکھ دیا ہوگا...... کیا مطلب؟" انسپکٹر نے میری بات کی وضاحت چاہی۔

"...... مطلب یہ کہ انہوں نے مجھ سے لے لیا تھا۔ اب انہوں نے اسے کہاں رکھا' مَیں گارنٹی سے کچھ نہیں کہہ سکتا......"

اتنے میں کچھ تفتیشی ماتحتوں نے انسپکٹر سے علیحدگی میں بات کرنی چاہی تو وہ معذرت چاہتے ہوئے اُٹھ کر [illegible] سیٹھ صاحب بولے۔

"خان صاحب! آپ کچھ بھی کہہ لیں مگر یہ بات پکّی ہے کہ اس واردات میں کسی نہ کسی طور آپ ضرور ملوث ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ یا اس لوح کی وجہ سے ہے"...... پھر وہ لجاجت سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "خان صاحب! پولیس نے کیا کر لینا ہے' یہ تو صرف خانہ پُری کرنے کے لئے آتی ہے۔ چور' ڈاکو' قاتل سرحد پار کر چکے ہوتے ہیں اور یہ ابھی تفتیش میں ہی لگی ہوئی ہوتی ہے...... پلیز! کچھ آپ ہی کریں۔ مجھے معلوم ہے' بلکہ پورا پورا یقین ہے کہ آپ نے ہی درد دیا ہے اور آپ ہی دوا دیں گے......"

"سیٹھ صاحب! آپ اپنی کسی بات پہ تو قائم رہیں...... کچھ دیر پہلے فرما رہے تھے کہ آپ کے علاوہ آپ کے مرحوم والد صاحب کی بربادی کا ذمہ دار بھی مَیں ہوں' اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے ہی آپ کو دوا وغیرہ ملے گی......؟"

"دیکھئے نا' جس کی چوری ہوتی ہے' اس کا ایمان جاتا ہے اور جو سامنے آتا ہے' اسی پہ شک ہونے لگتا ہے۔ آپ سب باتیں جانتے ہیں' پھر بھی مجھے کہہ رہے ہیں......"

اسی دوران انسپکٹر صاحب آ پہنچے' پیچھے پیچھے ان کا ماتحت ایک گٹھڑی اُٹھائے آ رہا تھا...... اب وہ

مسز مصطفےٰ علی خان سے پوچھنے لگا۔

''بھابی! اَب آپ بتایئے کہ کیا انہوں نے آپ کے سامنے تجوری کھولی تھی اور وہ لوح اندر رکھی تھی......؟''

وہ بولیں۔ ''بھیا! اس تجوری کے تالے ایسی بھی آسانی سے نہیں کھلتے' بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ چابیوں کے دو دو سیٹ ہیں' اکیلے سیٹ کی چابیوں سے صرف آدھے تالے کھلتے ہیں اور جب تک ہم دونوں موجود نہ ہوں یعنی چابیوں کے دونوں سیٹ نہ ہوں' تجوری کھل نہیں سکتی۔ یہ تجوری کھولنے اور بند کرنے کا کام ہم دونوں نے مل کر کیا تھا۔ لوح بھی میری موجودگی میں اندر رکھی گئی تھی......اور ہاں' تجوری کے اندر والے اوپر کے دو خانے صرف اِن کی چابیوں سے کھلتے ہیں اور نیچے والے دو خانے میری اکیلی کی چابیوں سے کھلتے' بند ہوتے ہیں۔ یعنی یہ خانے ہمارے علیحدہ علیحدہ ہیں جو ایک دوسرے کی چابیوں سے نہیں کھلتے...... تعجب تو اس بات پہ ہے کہ ہم دونوں سوئے ہوئے ہیں اور چوری ہو گئی۔ نہ الارم بجا' نہ سکیورٹی سسٹم نے کام کیا۔ مزید تعجب اور حیرت کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے کپڑوں کی الماری جسے پورا ہٹائے بغیر تجوری تک رسائی ممکن نہیں' اس کے اندر خفیہ طور پر ایک تیسرا سکیورٹی انتظام بھی ہے جو بجلی کی بجائے بیٹری سے کام کرتا ہے۔ اسے آف کیے بغیر اگر الماری کو سرکایا جائے تو فوراً الارم بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ الماری دیکھیے' وہ سسٹم آن ہے مگر الماری ہٹا کر بہت پرے کر دی گئی......''

اب انسپکٹر نے سیٹھ صاحب سے پوچھا۔

''بھائی صاحب! آپ اپنے تجوری والے پورے سامان کی لسٹ مجھے دیجیے......''

ان کی اہلیہ نے ایک لمبی چوڑی لسٹ اُن کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''میں ہر وقت ایسے بُرے وقت سے ڈرتی رہتی تھی' کئی بار انہیں کہا کہ اتنا سٹاک گھر میں مت رکھا کرو مگر......''

''بھابی! کسی نوکر یا گھر کے کسی فرد پہ شک ہو تو بتائیں......؟''

''بھیا! نوکر چاکر سارے دیکھے پرکھے ہوئے ہیں' بڑے پرانے اور اعتماد بھروسے والے ہیں۔ رات کو اگر کوئی ہمارے کمرے تک آنا چاہے تو پانچ دروازے اور دس تالے کھولنے پڑتے ہیں۔ سب دروازوں کھڑکیوں کے پٹ اور تالے اندر سے بند تھے اور......''

''......اور چوری پھر بھی ہو گئی؟'' انسپکٹر نے بات اُچکی اور کہا۔ ''باہر سے کوئی آیا نہیں' الماری بغیر الارم پرے ہٹ گئی اور تجوری چابیوں کے بغیر کھل گئی...... میں نے الماری اور تجوری کے سارے سسٹم

کو چیک کیا ہے اور دوسرے ماہرین سے کروایا بھی ہے' تالوں کو بھی دیکھا ہے مگر ہمیں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی کہ جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کے علاوہ کسی نے اِسے سسٹم آف اور چابیاں لگا کر کھولا ہو لیکن......''

جب انسپکٹر کو ''لیکن'' کہے ہوئے چند لمحے گزر گئے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھا تو سیٹھ صاحب نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

''لیکن کیا......؟''

انسپکٹر نے میز کے اوپر پڑی ہوئی کپڑے کی گٹھڑی کھول کر سیٹھ صاحب کے آگے دھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھر یہ سارا مال و متاع تجوری کھولے بغیر آپ کے بیڈ کے سرہانے کے نیچے چادریں تکیے رکھنے والے بیڈ دراز کے اندر کیسے پہنچ گیا......؟''

اس کل بے ہوشی کے بعد سیٹھ صاحب ہوش میں آ چکے تھے۔ لسٹ کے مطابق سارا مال خزانہ دُرست تھا' صرف ایک چیز کم تھی۔ لوح کو نہ ملنا تھا' نہ ملی۔ انسپکٹر گھر کا داماد تھا۔ پولیس مال اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جانے کی بات ... واہی ... خوب ... شکرانے ... ملازموں کو انعام و اکرام' خیر خیرات ہوتی رہی۔ اس دوران میں مُنہ پھلائے اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ مصطفےٰ علی خان شاید شرمندگی کی وجہ سے دانستہ میرے کمرے تک نہ آئے اور نہ ہی میں ان تک گیا۔ کھانا پینا' چائے ناشتہ ملازموں کے ذریعے پہنچ جاتا۔ میں نے ان دو دنوں میں خوب آرام کیا' تھکن اُتاری۔ مطالعہ اور نماز روزہ کرتا رہا لیکن کب تک؟...... اس سے اگلے روز جمعرات کی صبح سیٹھ مصطفےٰ خان سر جھکائے' ہاتھ باندھے اندر داخل ہوا' السلام علیکم کہہ کر میرے پلنگ کے آگے مُرغا بن گیا...... اندازہ کریں۔ ممبئی کا ایک سرکردہ سیٹھ' اچھی خاصی سماجی' سیاسی اور دینی اہمیت کا مالک باوقار شخص اگر کسی کے سامنے یا کہیں مُرغا بن جائے تو کیا ہوگا؟ بچے لوگ ہنسیں گے اور تالیاں بجائیں گے مگر یہاں تو دونوں ہی قریب قریب بوڑھے تھے۔ میں بھی مُرغ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ جب مُرغے کی ٹانگیں کانپنے لگیں' آگا نیچے اور پیچھا اوپر ہونے لگا تو میں نے ترس کھا کر کہا۔

''سیٹھ صاحب! یہ بچپنا چھوڑیں' اُٹھیں اور یہاں میرے پاس تشریف رکھیں......''

مُنہ ناک' آنکھوں سے چھما چھم ہو رہی تھی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے معافیاں مانگنے لگے۔

''خان صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے خوب احساس ہوا کہ دُنیا کا مال و دولت انسان کو کتنا

چھوٹا' کمزور' کمینہ اور خودغرض بنا دیتا ہے۔ اِس کا حاصل ہونا اور اس کا کھو جانا' دونوں ہی آزار جان ہوتے ہیں...... کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے پاس مال و دولت' ہیرے جواہرات' جائیدادوں کے تمسکات نہیں ہوتے۔ وہ فول پروف تجوریوں' سکیورٹی کے کتوں' مسلح چوکیداروں کے محتاج نہیں ہوتے اور ان کی حفاظت لمبی لمبی زبانوں اور دانت نکوستے ہوئے کتوں کے سپرد نہیں ہوتی۔ وہ انجائنا' ہارٹ اٹیک' ہائی بلڈ پریشر اور نروس بریک ڈاؤن کے مریض بھی نہیں ہوتے...... خان صاحب' اپنی درویشی کے صدقے مجھ نادان کو معاف کر دیں۔ میں دو روز تک آپ سے مُنہ چُھپاتا رہا۔ آج جمعرات ہے۔ چلیے' آج ماہم شریف چلتے ہیں اور سید سرکار کے دربار میں چل کر لنگر بانٹتے اور کھاتے ہیں۔ میں نے منّت مانی ہوئی تھی' سیّد سرکار کی دُعا برکت سے اللہ نے وہ کام کر دیا ہے......"

"مصطفےٰ علی خان! واقعی اللہ نے بڑا کرم کیا' تمہارا مال تمہیں اپنے کمرے سے ہی مل گیا ورنہ اور جو ہوتا سو ہوتا' پر تم نے میرا بُرا حال کر دینا تھا...... یہ بتاؤ' تم نے یہ چوری والا ڈرامہ کیوں رچایا۔ مال نکالا اور اپنے ہی سرہانے رکھ دیا۔ کہیں تم مجھے تو پھانسنا نہیں چاہتے تھے یا اپنے والد کا بدلہ لینے کی کوئی ترکیب تھی؟"

وہ میرے پاؤں پہ گر پڑا۔ "نہیں نہیں خان صاحب! نادان محبت کرنے والے بچوں کو ایسی کڑی سزائیں نہیں دیتے۔ میں سب سمجھ گیا' میں نے سب کچھ پالیا۔ ماہم شریف تشریف لے چلیں' وہاں میرے گلے میں دُرویشی ڈال دیں۔ میں نے یہ دُنیا چھوڑی' یہ حرص چھوڑی۔ یہ دولت' یہ شہرت' ہر چیز پہ لات ماری۔ اس دولت نے مجھ سے میرا چین' سکون' اعتماد و یقین چھین لیا...... میں نے آپ پہ بھی الزام لگائے' شک بھری نظروں سے دیکھا۔ تف ہے مجھ پہ اور میری......"

میں نے اسے اُٹھایا' سینے سے لگا کر سامنے بٹھایا اور اندرونی جیب سے لَوح نکال کر اس کے ہاتھ پہ دھر دی اور کہا۔

"مصطفےٰ علی خان! یہی اس نامکمل سی لَوح کا کمال ہے کہ اللہ نے تیری سوچ اور زندگی کا رُخ بدل دیا ہے۔ یہ لَوح میرے سینے سے لگی' میرے دِل کے عین اوپر دھری رہتی ہے۔ یہ آہنی تجوری میں مال و دولت کے بچھوؤں سانپوں کے درمیان دھرنے والی چیز نہیں' یہ تو دل کے لوتھڑے کے اوپر "اللہ ہو" کی ہلکی ہلکی آنچ پہ قرار پاتی ہے...... تمہیں لَوحیں بنانے' انہیں سمجھنے جاننے کا جنون تھا۔ چلو' سیّد کے دربار سے ہو کر بڑے بابا خواجہ غریب نواز کے ڈیرے اجمیر چلتے ہیں اور وہیں موتی مسجد میں بیٹھ کر تمہیں دیے کی نورانی لَو کی روشنی میں لَوح لکھنا بتائیں گے مگر جیتنی تو وہ اللہ کے اَمر سے ہے......"

● قیام و دوام، فروغ و فروزش......!

قارئین! وہی پہلے والی بات کہ جہاں سے ہدایت اور فیض ملنے ہوتے ہیں، وہیں سے مل کر رہتے ہیں۔ لاکھ انسان نمازیں پڑھے، مکے مدینے جائے، ملتا تب ہی ہے جب حکمِ ربی ہوتا ہے۔ وہ جو چاہے کرتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ وہی پرانی بات کہ اچھوں سے بُرے اور بُروں سے اچھے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی ایک چکر جو چلتا ہی رہتا ہے۔ جہاں دن ہوتا ہے وہاں سے پھر رات اُبھرتی ہے۔ اندھیرے کو اُجالے نگل لیتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ایک بُرا ہمیشہ بُرا رہے اور ایک اچھا ہمیشہ اچھا رہے۔ یہ تو سمے اُمر، من بھاون پی مناون، دُکھ سناون، کبھی آون کبھی جاون اور نصیبوں کے کھیل ہیں۔ آگ لینے جائیں، پیغمبری لے آئیں۔ دان لینے جائیں، [illegible] برتن لینے جائیں، دلبری لے آئیں۔ پہاڑ پہ چڑھے تو سروری لے آئے اور کوئی وہ جو دار پہ کھال اتروا دے تو کوئی سجدے میں گردن کٹوا دے۔ کوئی نیزے پہ چڑھ کے قرآن سُنا دے تو کوئی بند مٹھی میں کلمہ پڑھا دے، کوئی اپنے سارے [illegible] نکلوا دے تو کوئی دہکتی آگ میں بے خطر کود پڑے، کوئی رگِ گردن پہ چھُری چلا دے اور کوئی غم [illegible] آنکھیں گنوا دے۔ اپنے جسم پہ [illegible] کے دیئے ہوئے رُوپ سروپ ہیں۔ کوئی رذالت سے نکل کر اصیل ہو گیا تو کوئی تونگری سے لوٹ کر فقیری پہ آ لگا۔ کہیں ہیرا کسی کی پیر [illegible] آ لگا، اور کوئی پھول گجرے میں بندھ گیا تو کوئی گور پہ آ گرا۔ کوئی محمل سوار ہوا تو کوئی خارِ مغیلاں میں خوار ہوا۔ یہ سب اپنے اپنے نصیب اور مقسوم ہیں۔

بات روشنیئے سے آگے بڑھی تھی، اس کے ہی قصۂ دل گرفتہ سے یہ لوح والی گرہ کھلی تھی کہ اس کے دل کی گرہ ایک چلبلی سی طوائف فیروزہ نے کھول دی تھی، اور پھر اسی فیروزہ سے ابابیل کے آنسو والی فیروزے کی بات نکلی تھی جس نے مجھے ممبئی کے لکھ پتی سیٹھ کی کہانی سُنانے پہ اُکسایا کہ کس طرح شیطانی چکروں میں پھنسا ہوا یہ خاندان منحوس سادھو کے دیئے ہوئے جنتر کے سحر اور نحوست سے آزاد ہوا اور کس طرح ایک طوائف سے اللہ پاک نے وظائف کا کام لیا۔ اس نے بیٹی اور بیٹے کے رشتے، بے حیائی کے کوٹھے اور عزت شرافت کی کوٹھڑی کے فرق کو ایسے سمے کی دھار بنا کر پیش کیا کہ بدقماش، بدخصلت مگر وجیہہ وغلمان رُو روشنیئے کے ظلمت خانے میں ایک نور کی کرن سی پھوٹ پڑی اور وہ کوٹھے سے نیچے اتر کر سوئے دوکان آیا۔ مٹھائی کی ڈالیاں گھر بھجوا کر اذان کی مدھر دھارا پہ بندھا ہوا مسجد میں آ پہنچا۔ مسجد کے کھڑے مینار نے اس اندر سلامتی لئے بیٹھے ہوئے انسان کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر جو لگا تار مسجد جانے اسے کیا

سوا د آئے' کبھی کبھی کے سجدوں اور گریہ زاری کا مزہ تو کوئی اس بے نمازی سے پوچھے جسے اچانک اپنے رّب کی رَبوبیت اور اپنی معصیت کا اِدراک ہو جائے۔ وہ اللہ اور اللہ کے بندوں سے آنکھیں چُراتا ہوا' ڈرا ڈرا' مجحوب سا مسجد میں یوں داخل ہوتا ہے جیسے وہ نماز کے لئے نہیں' اپنے سائز کا کوئی جوتا اُٹھانے کے لئے آیا ہو۔ وہ کسی کونے میں یا سب سے پیچھے کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ کوئی واقف کار اِسے مسجد میں نہ دیکھ لے اور یہ نہ کہہ دے۔

''اوئے روشنیا! اے کی ہنیر' اوئے توں تے مسیت...... اللہ خیر' کوئی کارروائی پاون تے نہیں آیا......؟''

روشنیئے کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی اپنی زندگی میں کسی مسجد میں گیا بھی ہے یا نہیں؟...... عشاء کی نماز کا وقت تھا۔ ایک کونے میں لگ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا' دوسرے نمازیوں کی نقل کرتے ہوئے اس نے کسی نہ کسی طرح نماز نبٹا ہی لی تھی مگر بعد میں دُعا کے لئے اسے کسی کی نقل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ہاتھ اُٹھائے وہ کچھ نہ کچھ ضرور مانگ رہا تھا۔ میرے خیال میں بس یہی ایک موقعہ ایسا ہوتا ہے جب بندے اور مالک کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔

وہ دُھلا دُھلایا سا اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھا تو سب سے پہلے اسے نصیبو کی آنکھیں نظر آئیں جو اس کی راہ تکتے تکتے نرگس کا پھول سی بن گئی تھیں۔ مٹھائی کی ٹوکریاں پلنگ کے پاس تپائی پہ دھری تھیں ویسی کی ویسی ہی رنگین کاغذ اور پھولوں سے سجی بندھی ہوئی...... وہ پلنگ کی پٹی پہ یوں ٹکا جیسے وہ پلنگ پہ نہیں' خوش نصیبو کے پیٹ پر بیٹھا ہو۔

''کیسی ہو......؟'' اس کی زبان سے خود بخود ہی نکل گیا۔

''تمہیں پہلوٹھی کا بیٹا مبارک ہو...... اپنے بیٹے کا مکھڑا نہیں دیکھو گے؟ اِدھر آؤ' اس کا ماتھا چُومو۔ بسم اللہ پڑھ کر اس کے کانوں میں اذان کہو......''

وہ اُٹھ کر پلنگ کی دوسری جانب جا کر بیٹھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے ہوئے دوتہی میں لپٹے ہوئے گول مٹول بچے کو دیکھنے لگا۔ نصیبو خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ڈر کیوں رہے ہو؟...... لو! اسے اُٹھاؤ۔ پیار کرو' اس سے باتیں کرو۔ تمہارا بیٹا ہے۔ دیکھو تو سہی' اس کی شکل ساری تم پہ گئی ہے۔ تم سا کھڑا ناک' کھلا ماتھا' کٹورا سی آنکھیں؟...... پھر وہ سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔ ''تمہارے ایسا اس کا بھی سارا بدن سیاہ کالے بالوں سے بھرا ہوا ہے۔ سلوچنا رانی کہہ رہی تھی کہ ایسا بچہ بڑا بھاگوان ہوتا ہے......'' روشنیئے نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بچے کو دھیرے سے

اُٹھالیا۔

چھلاپے کے بعد تیسرے مہینے تسلیم کے ختنے بھی ہو گئے۔ تین چاند اور لگے تو اسے محسوس ہوا کہ نصیبو بی بی تو پھر بچے کی ماں بننے والی ہے اور دوکان پہ جگن ناتھ ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ بہت جلد فساد پھوٹنے والے ہیں۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہونے والا ہے' مسلمان اپنا الگ دیس مانگ رہے ہیں۔ روشنیے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ بٹوارہ کیا ہوتا ہے لیکن بہت جلد وہ جان گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اکا دکا مرنے مارنے کی خبریں آنے لگی تھیں۔ جلسے' ہڑتالیں' جلوس۔ بری بری خبریں...... ایک دن پٹیالے کے مسلمانوں کے علاقے میں دو مسلمان' ہندو بلوائیوں نے قتل کر دیے تھے۔ ایک مکان اور دو کانوں کو آگ بھی لگا دی تھی۔ دوسرے دن جب چار پانچ ہندو مارے گئے اور پرتاپ گنج میں ایک دھرم شالہ کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تو پھر اک سلسلہ قتل و غارت کا چل نکلا۔ روشنیا محسوس کر رہا تھا کہ دوکان پہ لگے بندھے روزانہ کے ہندو' سکھ گاہکوں کے تیور ٹھیک نہیں ہیں اور یہ تو پورا علاقہ ہی ہندوؤں کا تھا۔ پھر ایک روز صبح ہی صبح لالہ جگن ناتھ ہیڈ ماسٹر نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا' دو چار اخبار اس کے ہاتھ میں تھے۔

"روشنی خان......!" وہ بلا تمہید بولا۔ "حالات ٹھیک نہیں ہیں' بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کر رہے ہیں۔ اخباروں میں اور ریڈیو پہ دیکھو...... میں تو منہ سویرے تمہارے پاس چلا آیا۔ میرا ایک شاگرد کہہ رہا تھا کہ رات ایک دارو کے اڈے پہ کچھ لوگ تمہاری دوکان کو آگ دکھانے اور تمہیں قتل کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ میری مانو تو فوراً بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے نکل لو......"

اتنا کہہ کر لالہ جگن ناتھ منہ سر ڈھانپے جلدی سے کھسک گیا۔ اسی دن شہر میں کئی جگہوں پہ آگ لگنے اور مسلمانوں کو قتل کرنے کی وارداتیں ہو گئیں۔ شام سے ذرا پہلے اس کے چند ایک ہمدرد قسم کے گاہکوں نے مشورہ دیا کہ اگر اپنی اور بیوی بچے کی جان پیاری ہے تو جتنی جلدی ہو سکے' یہاں سے نکل کر مسلمانوں کے علاقے میں چلے جاؤ۔ ہندو بلوائیوں کے تیور ٹھیک نہیں' ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں موقعہ نہ ملے۔ دوکان اس نے کھولی ہی نہیں تھی' فوراً بیوی بچے لئے' چھوٹا موٹا ضروری ضروری سامان باندھا اور سراج پور کی جامع مسجد کے پچھواڑے کشمیریوں کی گلی میں اپنے ایک پرانے جاننے والے کے ہاں اُٹھ آیا۔ اس کی طبلے' ڈھولکیاں بنانے اور مرمت کرنے کی دوکان تھی۔ یہاں پہنچنے کے دوسرے روز ہی کرفیو لگ گیا۔ اب فسادات کی آگ نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مسلمان اپنی صدیوں پرانی جائیدادیں' کاروبار' اموال' پرکھوں کی قبریں' ہر چیز جوں کی توں چھوڑ کر قافلوں کی صورت میں ہجرت کر رہے تھے۔ کچھ تو راستے میں ہی کٹ رہے تھے اور جو بچے رہتے' وہ مُردوں سے بھی بدتر...... نیا وطن

پاکستان دُنیا کے نقشے پہ بڑے خونیں پس منظر کے ساتھ اُبھرا۔ ایسے ہی ایک قافلے کے ساتھ وہ بھی خستہ حال' بے سروسامان اور پورے دِنوں کی بیمار لاچار نصیبو اور ننھے تسلیم علی کو گود اُٹھائے ہوئے حیدرآباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچنے کے ٹھیک پندرہ روز بعد ایک رفیوجی کیمپ میں بڑی آزردگی اور کسمپرسی کے عالم میں ایک رات کے آخری پہر رضا علی نے ایک مہین سی چیخ بلند کر کے اس حزن و آزمائش کی دُنیا میں اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ یہ بڑی ابتلاء' جاں گسل پریشانیوں اور محرومیوں' مایوسیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا دور تھا۔ کوئی کسی کا پُرسان حال نہ تھا' ہر کوئی ایک دُوجے سے بڑھ کر دُکھیلا اور پریشان ...... لڑکھڑاتے پاؤں پہ بمشکل کھڑی ہونے والی گورنمنٹ اور رفاہی اداروں کی معاونت و اعانت کی وجہ سے بمشکل سر پہ خیموں کی چھت اور دو وقت روکھی سوکھی میسّر تھی جس کی بنا پہ ان کے علاوہ لاکھوں پناہ گزینوں کا سانس اور جسم کا رشتہ جُڑا ہوا تھا مگر بڑی عجلت و ترتیب سے ان بے گھروں' بے آسروں کو ان کی حیثیت اور ہندوستان میں چھوڑی ہوئی جائیداد کے مطابق یہاں سے ترکِ وطن کرنے والے ہندوؤں کی متروکہ جائیدادوں میں بسایا بھی جا رہا تھا۔ زمین داروں کو زمینیں' کارخانہ داروں کو کارخانے' اسی طرح دوکانداروں کو دوکانیں اور عام شہریوں کو ان کی ضرورت اور افرادِ خانہ کے مطابق رہائش فراہم کی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اور مختلف طریقوں سے اچھی اچھی جگہوں پہ قابض ہو رہے تھے۔ ان کی باری آئی تو انہیں بھی ایک دو کمرے والا چھوٹا سا مکان مل گیا لیکن یہ جگہ ان دونوں میاں بیوی کو کچھ پسند نہ آئی۔ بڑی گنجان سی جگہ اور گندہ علاقہ ...... اسی دوران اچانک روشنیے کی ملاقات اپنے ایک پُرانے واقف کار سے ہوئی جو فسادات سے بہت پہلے ہی یہاں کراچی اُٹھ آیا تھا۔ یہ بھی اسی بازار کا آدمی تھا' ایک بائی کے ہاں طبلہ بجاتا تھا۔ بائی جی کی بڑی بہن یہاں کراچی میں تھی اور کچھ رشتہ دار حیدرآباد کے بازارِ حُسن میں بھی رہتے تھے۔ اسی طبلچی کے مشورے پہ یہ دونوں بچوں سمیت اسی کے ساتھ کراچی چلے آئے۔ اسی طبلچی نے ایک الاٹمنٹ افسر جو اس کی بائی کے پاس آیا کرتا تھا' کی وساطت سے روشنیے کو نیپیئر روڈ بازارِ حُسن کے قریب ایک گلی میں کسی ہندو طوائف کا دو منزلہ مکان الاٹ کروا دیا۔ خوش قسمتی کہ اس مکان میں گھر گرہستی کی ہر چیز اندر سے نکل آئی۔ اسی واقف کار نے قریب ہی کوٹھے پہ ایک گانے ناچنے والی طوائف کے ہاں طبلے ڈھولک پہ بٹھا دیا۔ اس طرح اُس کے کام دھندے کی سبیل بھی نکل آئی۔ یہ سب کچھ اس کی طبیعت اور خُوخصلت کے عین مطابق تھا۔

وقت گزرتا گیا اور بہت جلد زندگی اپنی روزمرہ کی ڈگر پر آ گئی۔ جیسا ماحول' محلّہ' صحبت سنگت اور رنگ ڈھنگ پیچھے چھوڑ کر آئے تھے اس سے کہیں سوا یہاں میسّر آ گیا۔ ویسی ہی گلیاں بازار' روشنیاں'

گھنگھروؤں' طبلوں کی آوازیں' تماش بین' جاگتی راتیں اور اونگھتے ہوئے دن۔ چوباریوں' حجاموں' حکیموں اور خوشبوؤں کی دوکانیں۔ ہوٹل' سینما' بدقماش' بدمعاش' بھڑوے' مالیشئے' مہازندے' گلاباں' چنبیلیاں اور رات کی رانیاں...... دنوں میں ہی روشنیئے کے وہ پرانے طور طریقے اور چھب ڈھب عود کر آئے' پینا چسکنا بھی منہ لگ گیا' سلک ریشم بوسکی انگ لگ گئی اور وہی چپڑی ہوئی زلفیں' آنکھوں میں کجیلی دھار' ترنگ مستی کی سرخی۔ نوکیلی کھڑی مونچھوں کے نیچے بھرے بھرے' پان کے لاکھے سے یاقوت بنے ہوئے ہونٹ' سپید دانت' جیسے سچے موتی منہ میں بھر رکھے ہوں۔ کراچی کی سمندری آب و ہوا نے اس کے تانبے کو جیسے کھرے سونے میں بدل دیا تھا۔ سورج کی دھوپ یا کوٹھے کے بڑے کمرے کے بارہ بتی کے تیرہ جھومروں والے فانوس کی چھچھاتی ہوئی کرنوں کی روشنی میں روشنیئے کا کندنی سراپا یوں دمکتا جیسے اسے سورجیا ساگر کی کسی سنہری جل مچھلی نے جنم دیا ہو اور پھر وقت کی گردش یا پھر قسمت کے کسی پھیر نے اسے اس سُرسبھا اور ساغر و مینا کے منڈل منڈپ پہ لا بٹھا دیا ہو۔

- دیں گردشیں اتنی کوزہ گر نے......!

پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بدی' بدکاری' برائی' بدمعاشی و بدنگاہی اور بے نکاحی یا بازاری عورت میں بڑی کشش' خوش لطفی' خوش وقتی اور بظاہر بڑی افادیت نظر آتی ہے مگر انجام سوائے رسوائی' ذلت اور دین دنیا میں خرابی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی میں نے خوب دیکھا کہ جو اولاد ناجائز تعلقات اور بے راہ روی کے نتیجے میں جنم لیتی ہے وہ اکثر خوبصورت' توانا و تندرست اور بے پناہ جنسی کشش کی حامل ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں' خاص طور پہ یورپ اور امریکہ میں نظر آیا کہ شوبز سے تعلق رکھنے والے انتہائی خوبصورت اور بے پناہ جنسی کشش و جاذبیت رکھنے والے افراد زیادہ تر گمنام باپوں کی اولادیں ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے چہرے اور پیکر میں جنسِ مخالف کے لئے بے پناہ جنسی کشش ہوگی اور ان سے انسانی راہ روی نہیں' شیطانی بے راہ روی برتنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے افراد کے چہرے' آنکھیں حیا اور مروت سے خالی ہوتے ہیں۔ یہ محسن کش' بے دید' بدلحاظ اور پروفیشنلزم کے گرویدہ ہوتے ہیں۔

دنیا بھر کے شاہی بازاروں' ہیرامنڈیوں میں بیٹھنے والی عصمت فروش یا ناچنے گانے والی دو قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو کسی طوائف کے ہاں ایسے ہی بغیر نکاح کے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی پڑنانی'

نانی اور ماں کی طرح وہ کوٹھے پہ ہی بیٹھے گی اور جو طوائف کے بطن سے نکاح کے نتیجے میں جنم لیتی ہے، اکثر وہ بھی بالآخر طوائف ہی بنتی ہے کیونکہ طوائف کی بیٹی کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ وہ دو چار مرتبہ طوائف ماں کا طعنہ سُن کر، تنگ آ کر کوٹھے پہ آ بیٹھتی ہے یا پھر شوبز میں آ جاتی ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری، اسٹیج میں خاص طور پہ بڑے بڑے کچھ نام ایسے ہی ہیں جن کی مائیں طوائفیں اور باپ بڑے بڑے زمیندار، سیاستدان، گدی نشین، صنعتکار اور ڈپلومیٹ ہیں۔ کچھ تو بڑے دھڑلے اور فخر سے اپنی ولدیت بتاتی رہتی ہیں اور کچھ اپنے ''بزرگوار'' والد صاحب کو ساری زندگی بلیک میل کرتی رہتی ہیں اور منہ بند رکھتی ہیں..... طوائف کی دوسری قسم میں خریدی ہوئی عورتیں، جھوٹے عشق و محبت کے چکر میں پھنسی ہوئی لڑکیاں یا پھر کسی بے غیرت، نکھٹو، بدحرام، منشیات کے عادی یا مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی بیویاں، بیٹیاں ہوتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں بڑی آسانی سے ایسے گرگوں اور بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں جو انہیں اپنے چنگل میں جکڑ کر بالآخر پیشہ کرنے پہ راضی یا مجبور کر لیتے ہیں یا کچھ اغواء شدہ مال بھی ہوتا ہے جن کی منزل کوٹھا، کسی عیاش وڈیرے کی حویلی اور یا پھر کسی پوش علاقے میں پرائیویٹ کوٹھی خانہ ہوتا ہے۔ جیسے یہ نصیبو بچپن میں ایک بردہ فروش کے ہاتھوں اٹھائی گئی تھی اور [illegible] خرید کر [illegible] پالا پوسا جوان کیا۔ یہ تو اس کی قسمت [illegible] اسے چیچک چاٹ گئی اور دو ٹکے کی ہو کر رہ گئی ورنہ بڑی بی بی کب کی اسے گھنگھرو پہنا چکی ہوتی۔

نصیبو حیدر آباد سے کراچی پہنچ تو گئی۔ بھرا پُرا گھر بھی مل گیا، تسلیم و رضا بھی گود میں تھے۔ روشنیے بھی دھندے پہ بیٹھا ہوا تھا مگر وہ اندر سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ روشنیے دن بہ دن گھرداری اور بچوں سے لاپرواہی برت رہا ہے۔ کوٹھوں کا کام ہی راتوں کا ہوتا ہے اور دن سونے اونگھنے میں گزرتے ہیں لیکن پھر بھی مرد کو رات کے کسی پہر تو گھر لوٹنا چاہئے۔ وہ اکثر راتوں کو باہر ہی رہنے لگا تھا۔ تسلیم و رضا کے درمیان مشکل سے ایک برس کا ہی تو فاصلہ تھا۔ دونوں معصوم ننھے سے بچے! ایک کو سنبھالتی تو دوجا روتے، لوٹنے لپٹنے لگتا۔ وہ خود کون سی اچھی بھلی صحتمند تھی۔ ہڈیوں کی مٹھ، پیلی پھٹک۔ ہندوستان سے ہجرت اور دربدر کی ٹھوکروں نے اسے مزید نڈھال کر دیا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ روشنیے کی راہ دیکھتے ہوئے، بھوکی پیاسی ''اللہ والی فضل خیالیں، دیئے بیٹے تو ہی پالیں'' کی لوری سناتے سناتے، دونوں معصوموں کو سینے پہ لٹائے پڑی رہتی۔ کسی پہر یہ معصوم جانیں سو بھی جاتیں تب بھی یہ نیند اور بے آرامی سنگ لئے اٹکی ہوئی آنکھوں سے دروازہ دیکھتی رہتی، کان باہر گلی میں آتے جاتے کی چاپ پہ دھرے رہتے کہ کب روشنیے کے آنے کی مخصوص آہٹ اسے سنائی دے اور وہ کھانستا ہوا دروازے کے تھڑے پہ

پاؤں دھرے تو وہ لپک کر زنجیر اُتارے' مگر...... کہتے ہیں کہ انتظار سے بڑھ کر کوئی اذیت اور بربریت نہیں ہوتی۔ انتظار تو آنکھوں میں غیض کے انگارے' دل و دماغ میں شبہات اور وسوسات کا دُھواں پھیلا دیتا ہے اور انتظار کرنے والا تو دُوہری دھار کے خنجر کی مانند اپنی آتی جاتی سانسوں کے چرکے سہتا ہوا' بے دَرد ٹھہرے ہوئے سَمے کی سُولی پہ صبر کا کالا کنٹوپ چڑھائے لٹکا ہوتا ہے۔ نصیبو شاید یہ کچھ بھی برداشت کر لیتی لیکن ایک رُوحانی اذیت کا وہ مسلسل شکار تھی۔ یہ علاقہ' محلّے' گلیاں کوچے' سب اسی بازارِ حُسن کا حصّہ تھے۔ یہاں کا ہر گھر' ہر دَر و دروازہ طوائف کا بالا خانہ ہی سمجھا جانا کوئی بعید از قیاس بات بھی نہیں تھی۔ کبھی کبھی رات اِدھر سے گزرنے والوں میں اکّا دُکّا اِس تھڑے پہ بھی چڑھ آتا' اِدھر روشنیئے گھر سے باہر ہوتا۔ دروازے پہ میخوں سے جُڑی ہوئی ٹین کی پلیٹ تو کوئی پڑھا لکھا ہی پڑھ سکتا ہے' وہ بھی اندھیرے میں کہ ''یہ پرائیویٹ رہائشی مکان ہے'' پھر اِس اندھیر نگری میں سبھی پڑھے لکھے تو نہیں آتے۔ نسوں میں حرام خون اور آنکھوں میں ہوس یا بوتل کا نشہ تیر رہا ہو تو نیم اندھیرے میں دروازے کے درمیان لگی ہوئی یہ ٹین کی پلیٹ کون دیکھتا' اِس تحریر کی تحریم کرتا ہے؟ کبھی زور سے تھپ تھپ' کبھی ہلکے ہلکے دستک اور کبھی سرگوشی کہ ''خالی ہو تو دروازہ کھولو...... میری جان' سوگئی ہو یا جاگ رہی ہو؟...... اگر کوئی بھاڑو اندر ہو تو مَیں انتظار کرتا ہوں [illegible] اور فقرے اِس کو ہلکان کر کے رکھ دیتے۔ ایک بار زور دے کر روشنیئے سے کہا بھی کہ یہ جگہ بڑی بدنام ہے' ہر رات کوئی نہ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے' فقرے کستا ہے۔ مجھے اکیلے میں بڑا ڈر لگتا ہے' تم بازار بند ہوتے ہی گھر آ جایا کرو مگر روشنیئے کے تو جیسے کانوں جُوں تک نہ رینگی۔ وہ آ لے بالے کر کے ٹال دیتا جیسے اِسے احساس تک نہ ہو کہ دو معصوم شیر خوار بچے اور جوان بیوی اتنے بڑے گھر میں اکیلی پڑی ہے۔ بدنام علاقہ' کبھی کہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے...... غیر متوقع طور پہ ایک روز وہ نصف شب کے قریب' نشے میں چور گھر لوٹا تو نصیبو بچّوں کو گود میں لئے ہوئے جاگ رہی تھی' اِس کے بیٹھتے ہی نصیبو نے قریب قریب روتے ہوئے شکایت کی۔

''آج رات کوئی مسلسل دروازے سے لگا' دروازہ کھولنے کے لئے ضد کرتا رہا ہے' اِس نے دروازے کے سوراخ سے اندر روپے کا نوٹ بھی پھینکا اور کہا کہ دروازہ کھولو' ایک روپیہ اور دوں گا...... خدا کے لئے' گھر جلد آیا کرو......'' وہ ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑی تھی' مزید کہنے لگی۔ ''میرا نہیں تو اِن معصوم بچّوں کا ہی کچھ خیال کر لیا کرو......''

وہ تو نیند اور کچے نشے سے دیوانہ کُتا بنا ہوا تھا' تنک کر بولا۔

''تُو ہر روز میرے آنے پہ یہی بکواس کرتی رہتی ہے کہ ہر رات لوگ دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں......

مجھے بتا' اس میں خرابی کی کیا بات ہے؟ وہ پٹیالے کا شاہی بازار تھا' یہ کراچی کا شاہی بازار ہے۔ یہ گلیاں' چوبارے' آتے جاتے' اُترتے چڑھتے' دروازہ کھٹکھٹاتے لوگ' کچھ بھی تو نیا نہیں ہے......" وہ بے سُدھ سا جوتے سمیت چارپائی پہ لمبا پڑتے ہوئے بڑی آسانی سے کہہ گزرا...... "اگر من چاہے تو بچوں کو پچھلے دالان میں کھٹولے پہ ڈال دیا کر' زیادہ روئیں تو افیون کی باجرہ گولی' دودھ میں بھگو کر چسا دی...... اور پھر سکون سے......"

کچھ بھی نہ سمجھی میں نصیبو ماتھے پہ تیوری ڈالتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "میں کچھ سمجھی نہیں......؟"

وہ اسے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شیطانی مسکراہٹ سے کہنے لگا۔

"ایک آدھ روپلی کا دھندا کر لیا کر......" پھر وہ آنکھیں موندتے ہوئے بڑبڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔"

یہ سُن کر نہ تو اسے سکتہ ہُوا' دھاڑ مار کر روئی نہ ہی اس کے منہ سے ایک لفظ تک نکلا۔ جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو اور نصیبو نے کچھ سُنا ہی نہ ہو...... خاموشی سے آگے بڑھی' روشنیئے کے پاؤں سے جوتے اُتار کر ٹانگیں سیدھی کر کے اوپر چادر ڈال دی۔ بچوں کی چارپائی پہ ایک نظر ڈالی۔ باہر نکل کر وضو کیا اور مصلاً بچھایا...... دوزانو بیٹھ گئی۔ اللہ ہی جانے کہ وہ اس سے کیا کچھ کہتی رہی۔ پھر بولائی ہوئی اُٹھی' باورچی خانے سے ایک تیز دھار بڑی سی چُھری اُٹھا لائی' اپنے آگے سجدے کی جگہ رکھ دی' سر جھکائے زیرِ لب کچھ پڑھتی رہی۔ کچھ دیر بعد پھر اُٹھی' اندر گئی رحل سمیت ترجمے والا قرآن پاک اُٹھا لائی' سامنے چادر بچھا کر چُھری کے پاس رکھ دیا اور پھر شروع ہو گئی...... دعا مانگی' قرآن پاک اُٹھا کر گود میں رکھا' بسم اللہ پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر کے مصحف پاک کھول کر سیدھے ہاتھ کے صفحے کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر قرآن شریف بند کر کے واپس رکھ دیا۔ ایسے میں دروازے پہ کسی نے دستک دی تو بغیر استعجاب' ڈر اس نے آگے بڑھ کر زنجیر ہٹا دی اور خود سر جُھکائے کھڑی رہی۔

"السلام علیکم......!"

آنے والے نے اندر داخل ہوتے ہی پہل کی۔ اسی سمے پچھلے اندر سے روشنیئے کی آواز آئی۔

"دروازے پہ کون ہے......؟"

نصیبو نے اسی لمحہ جواب دیا۔ "کوئی بوڑھے سے بابا ہیں......"

وہ اسی ترنگ میں کہنے لگا۔

"بھاروُ بھارو ہوتا ہے۔ جوان' بوڑھا یا بچہ' بابا نہیں ہوتا...... اُس سے اِس وقت آٹھ آنے سے کم

مت لیؤ اور اُ کتی دودھ کی علیحدہ...... دروازہ اندر سے بند کر' اور دیکھ! مجھے نہ جگائیو' سر بھاری ہو رہا ہے۔''

بزرگ اندھیرے سے قدرے روشنی میں آئے تو نصیبو کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی...... یہ تو وہی اُس کے خوابوں والے بابا تھے' وہی' جنہوں نے تسلیم اور رضا کا نام رکھا تھا' جنہوں نے تانبے کی ناند روپوں سے بھری تھی اور جن کی برکت سے پریم رس کور مسلمان اور پھر دُنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئی تھی...... وہ کھڑے کھڑے کہنے لگے۔

''وہی کر جو تمہارا خاوند تمہیں حکم دے' اپنے خاوند کی کبھی حکم عدولی نہ کرنا...... میں ہر روز' رات کو اسی وقت آیا کروں گا۔ قرآن کھول کر ہر رات بیٹھ جایا کرو اور ہاں آج کے بعد تمہارا خاوند گھر سے باہر نہیں نکلے گا...... تسلیم و رضا کا خیال رکھنا...... جس حال میں بھی مالک رکھے' اس پہ راضی اور مطمئن رہنا' یہی تسلیم و رضا ہے......'' وہ دو چاندی کے کھرے چمکتے ہوئے روپے دیتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''ہر روز' اسی وقت یہ ملا کریں گے......''

وہ اس کے سَر پہ ہاتھ پھیر کر عجلت سے باہر نکل گئے۔ دروازے پہ زنجیر چڑھا کر وہ پلٹتی تو تسلیم نے مُنہ کھول لیا تھا۔ اس تک پہنچتے پہنچتے روشنیے کی سرگوشی سنائی دی۔

''[illegible] ادھر آ [illegible] کیا دے گیا ہے...... کچھ دودھ پانی کی بخشش بھی لی یا یونہی مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے پڑی رہی؟''

بھلا وہ کیا مُنہ کھولتی' باوا کے دو روپے اس کی طرف پھینکتے ہوئے بچی کی جانب متوجہ ہو گئی۔ چمکتے کھنکتے نویں نکور چاندی کے دو روپے جیسے ابھی ٹکسال سے ڈھل کر باہر نکلے ہوں' دیکھ کر اُس کی تو آنکھیں کُھل گئیں۔ لیٹے لیٹے ہی روپوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''واہ' بڈھا تو بڑا دیالو نکلا اور تیری بوہنی بھی بڑی اچھی ہوئی...... اس دھندے میں گئے گزرے بڈھے اور کچے لونڈے جو مانگو دے جاتے ہیں اور ٹائم بھی خراب نہیں کرتے۔ بس ایسے بھاروؤں کی جانب ذرا توجہ دیا کرنا......''

وہ اللہ کی معصوم بکری' تسلیم کو سینے سے لگائے اللہ والی کر رہی تھی' اس نے شاید روشنیے کی یہ بکواس سُنی ہی نہیں تھی۔ وہ روپے جیب میں اڑس کر پھر لمبا پڑ گیا...... اذان کا نور جب شہد کے قطرے بن کر اس کے کانوں میں اُترنے لگا تو اس نے روشنیے کی زہر آلودہ باتوں' گندی سوچوں اور اس کی بے راہ روی کے رویوں سے پراگندہ اپنے دل و دماغ کو صاف سا ہوتا ہوا محسوس کیا۔ اُٹھی اور اپنے مالک و خالق' حافظ و ناصر' وکیل و مجیب کے رُوبرو سجدہ ریز ہو گئی اور پھر شاید وہ وہیں بیٹھی بیٹھی لڑھک کر اونگھ میں چلی

گئی تھی۔

صبح کا دودھیا اُجالا دالان میں آ براجا تھا' تب اِس کی آنکھ اُکھڑی' روشنیئے چیختے ہوئے اِسے آوازیں دے رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اُٹھی' اُدھر لپکی۔ وہ متوحّش سا اپنی ٹانگوں' رانوں پہ زور زور سے مُکّے مار رہا تھا۔

''اری نصیبو! دیکھ! میرا نیچے کا دھڑ سا تھ ہے کہ کسی نے کاٹ کر علیحدہ کر دیا ہے......؟''

وہ گھبرائی ہوئی اس کی ٹانگوں اور پاؤں کو ہلانے لگی' بولی۔

''روشنیئے! تجھے کیا ہوا؟...... تیرے پاؤں ٹانگیں سب سلامت ہیں۔ یہ دیکھ' میں انہیں چھو رہی ہوں......''

وہ گردن نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نصیبو! میری ٹانگوں کو زور زور سے ہلا' دبا۔ انہیں مالش کر' ان میں جان ختم ہو گئی ہے......''

انتہائی ظالم قسم کے فالج کے حملے نے اس کی ناف سے نیچے کا دھڑ مٹی کے تودے کی طرح بے حس و بے جان کر دیا تھا۔ اب وہ اس حصے کو کوئی حرکت تو کیا' ایک ہلکی سی جنبش دینے سے بھی قاصر تھا...... وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا اور نصیبو چپ چاپ بیٹھی اس کے بے حس حصوں پہ تیل سے مالش کر رہی تھی۔ ذرا سورج اوپر اُٹھا تو وہ سر پہ چادر کھینچے باہر دروازے تک آئی۔ نئی نئی جگہ' اجنبی لوگ' کسی سے جان نہ پہچان۔ سامنے والی بلڈنگ کے بغلی دروازے سے کوئی ملازم پیشہ سی ادھیڑ عمر عورت باہر نکلی تو اس نے آواز دے کر اُسے بلایا۔

''بُوا! میرا مرد سخت ماندہ ہے۔ گھر میں کوئی بڑا بچہ بھی نہیں...... ہم لوگ نئے نئے یہاں آئے ہیں۔ کسی حکیم' ڈاکٹر کی خبر ہو تو بتاؤ......؟''

وہ بتانے لگی۔ ''اِدھر باہر بازار میں دو چار ڈاکٹر حکیم تو ہیں پر ابھی بڑی سویر ہے۔ اِدھر بازاروں' گلیوں میں خاصا دن چڑھے دوکانیں کھلتی ہیں......'' پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ بازو والی گلی کی نکڑ پہ دھوبی کی دوکان کے ساتھ ایک حکیم صاحب ہیں۔ ان کی رہائش بھی دوکان میں ہی ہے' وہ شاید اس وقت مل جاویں گے......''

اتنا بتا کر وہ نکل گئی تو نصیبو دروازے بھیڑ کر اس کی بتائی ہوئی سمت چل دی۔ ساتھ والی گلی کی نکڑ پہ دھوبی کی دوکان کے ساتھ حکیم صاحب سرکنڈوں کے موڑھے پہ بیٹھے' داتن مُنہ دبائے کسی دوا کی گولیاں بٹ رہے تھے۔ وہ سلام کر کے اپنی بپتا بتانے لگی اور شریف النفس انسان ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر دواؤں والا

بقچہ بغل میں داب ساتھ ہولیا۔ بھڑا دروازہ کھولتے ہی تسلیم و رضا کے رونے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔ وہ حکیم صاحب کو مریض دکھا کر خود دالان میں روتے ہوئے بچوں کی جانب بڑھ گئی۔ یہ وقت دونوں بچوں کے دودھ پینے کا تھا۔

روشنیئے کا نچلا حصہ بے جان کیا ہُوا' اس کے نیچے کے حصے والی ہمت طاقت بھی گویا اس کی گویائی یا بدگوئی میں آ گئی تھی۔ وہ بے نطق بچوں اور نصیبو کو گالیاں بک رہا تھا کہ وہ ان حرامی پلّوں کو اس کے سر پہ چیختا چلاتا ہوا چھوڑ کر پتہ نہیں کس یار کے ساتھ کہیں دفعان ہو گئی ہے۔

حکیم صاحب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نبض دکھانے کو کہا۔ آنکھیں' زبان دیکھی۔ نیچے کے مختلف حصوں پہ سوئی چبھوئی' رگوں پٹھوں کو دیکھا بھالا۔ معلوم ہوا کہ فالج کا حملہ ہی ہوا ہے۔ حکیم صاحب نے روشنیئے کی خرخصلت بدزبانی یا پھر اس کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر فوراً اسے بڑے ہسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا' وقتی طور پہ افاقے کے لئے اسے ایک دوا کھلا دی اور اجازت چاہی۔ تسلیم و رضا نصیبو سے چمٹے ہوئے تھے کہ جیسے ان کی ماں انہیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو۔ حکیم صاحب کو جاتا دیکھ کر وہ روہانسوی ہو کر کہنے لگی۔

''حکیم صاحب! ہم [illegible] ہوا ہے ہم [illegible] یہاں آئے ہیں۔ ہمارا یہاں کوئی رشتہ دار ہے اور نہ ہی کوئی سہارا...... میں اکیلی عورت ذات' دو معصوم بچوں کی ماں! میں انہیں کس طرح لے کر کہیں جاؤں' اور اگر چلی بھی جاؤں تو ان بچوں کو کس کے حوالے کروں......؟''

روشنیئے نے پھر اپنی گالی زبان کھولی۔

''سُن' نصیبو! میں کسی ہسپتال وسپتال میں نہیں جاؤں گا......'' پھر وہ حکیم صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے تُو ہی رات کو یہاں آیا تھا اور اب تُو میری بیوی سے مل کر مجھے ہسپتال پہنچانا چاہتا ہے...... میں کہیں نہیں جاؤں گا' سُنا......''

حکیم صاحب یہ خرافات سُن کر سٹپٹا کر رہ گئے' بولے۔

''میاں! ہوش کی دوا لو...... تم یہاں نئے آئے ہو اور میں یہاں چالیس برس سے ہوں' فقیر آدمی ہوں...... تمہیں میرے اور اپنی اس نیک طینت بیوی کے بارے میں ایسی بیہودہ گفتگو نہیں کرنی چاہئے۔ خدا سے ڈرو' اپنی حالت تو دیکھو...... میری مانو تو بڑے ہسپتال چلے جاؤ۔ تمہاری موجودہ حالت بڑی خطرناک ہے......''

حکیم صاحب جان چھڑا کر بھاگ لئے۔

• تماشاہائے سُخن......!

کتاب کے پچھلے صفحوں میں آپ میری کراچی والی رُوداد پڑھ ہی چکے ہیں۔ صوفی نُوردین المعروف نُور جہاں' نیپیئر روڈ والی طوائف' تسلیم و رضا اور طوائف کی کوٹھڑی کے پیچھے دالان میں پڑا ہوا اس کا مفلوج خاوند...... آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ طوائف کون تھی؟...... ممبئی کے سیٹھ مصطفےٰ علی خان اور لَوح کی کہانی بھی آپ نے پڑھ لی۔ یہ لَوح وہی تھی جو مجھے کبھی اسپین میں سمندر کے کنارے روشنی کے مینار کی آخری منزل میں صدیوں پرانے ڈھانچے کی گردن میں لٹکی ہوئی ملی تھی' جس کے درمیان میں سورج کے گھر والے سوراخ سے کوئی نگینہ اترا ہوا تھا۔ اب میں اس نگینے کی تلاش و کھوج میں ممبئی سیٹھ مصطفےٰ علی خان کے ہاں مہمان تھا جہاں اسی لَوح کی وجہ سے عجیب و غریب واقعات نے جنم لیا تھا۔ لَوح کو سیٹھ صاحب نے زبردستی مجھ سے لے کر اپنی محفوظ ترین تجوری میں بند کر دیا تھا مگر کئی جدید ترین حفاظتی انتظامات کے باوجود' بند دروازوں اور نیچے اوپر کئی فول پروف تالوں کے اندر سے سارا مال متاع نکل کر سیٹھ صاحب کے سرہانے والے دراز کے اندر پہنچ گیا جسے پولیس نے برآمد کر لیا اور اس واردات کو سیٹھ صاحب [illegible] صرف لَوح والی میری واسکٹ کی اندرونی اسی جیب میں پہنچ گئی جہاں سے نکالی تھی۔ پولیس اس واردات کو سمجھ نہیں سکتی تھی' یہ تو میرے علاوہ' مصطفےٰ علی خان اور اُس کی بیگم ہی جانتے تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا' اسی لئے میں نے بھی سیٹھ صاحب کو لَوح دینے میں کوئی رَدّوکد نہیں کی تھی کہ لَوح کے موکلین خود ہی اس کی حفاظت کریں گے' سو ایسا ہی ہوا۔ اب سوال اُٹھتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سات بند تالوں میں رکھی ہوئی کوئی چیز' بغیر کسی ظاہری کارروائی کے یوں باہر نکل آئے کہ نہ تجوری کھُلے' آہٹ نہ آواز پیدا ہو اور نہ کوئی یا کچھ دکھائی دے اور کیا ایسی خارق الفطرت' خارقُ العادت اور فوقُ العقل وارداتیں' مَنصّۂ شہود پہ لانے پہ کوئی دُرویش' صوفی' مجذوب' علمِ بریّات کا جاننے والا یا کوئی علومِ سفلی و سماوی کا کوئی ماہر' عامل یا عالم کوئی قدرت رکھتا ہے یا پھر صرف ارضی و سماوی' سفلی و علوی استعانتوں سے ہی ایسے واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں؟...... اس کا جواب دینے سے پیشتر میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ یہ سب کچھ تو آج کل سائنسی طور پہ ہو رہا ہے جبکہ مندرجہ بالا تمام علوم اور قوتوں کو سائنس کماحقہ طور پہ قبول کرنے سے گریزاں ہے البتہ تحلیلِ نفسی' طبیعات' مافوق الطبیعیات' مابعد الفوق الطبیعیات' قوتِ متخیلہ' قوتِ ممیزہ اور قوتِ جاذبہ وغیرہ کی قوتوں' محرکات اور مدرکات کو تسلیم کرنے میں چنداں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ سب مداوات عمل ایسے ماورائے عقل اور ماورائے فطرت

مظاہرات میں ممد ہوتے ہیں۔ اب رہی بات کہ نوری' افلاکی' سفلی علوم اور خارجی استعانتوں اور دیگر مداوات سے بھی کیا یہ سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے؟...... اس کا جواب بھی اثبات میں ہے۔ امریکہ' روس اور یورپین ممالک کی چیدہ چیدہ یونیورسٹیوں میں یہ علوم ایک مکمل سبجیکٹ کے طور پہ پڑھائے جاتے ہیں اور ان علوم کے بڑے بڑے ماہر اور عامل و عالم موجود ہیں۔ قیافہ' مکاشفہ' رویا بینی اور تعبیری' تنویم' منتقل خیالی' غیب بینی' غیب گوئی' پیغام رسانی' نظر بندی اس کی ادنیٰ سی مثالیں ہیں۔

انسان کے اندر ایسی قوت موجود ہے جسے بیدار اور قابو کرنے کے بعد وہ ہزاروں میل دُور بات کر سکتا ہے' اپنا خیال منتقل کر سکتا ہے' دیکھ اور سُن سکتا ہے۔ اب دیکھئے کہ فیکس' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن کے لاسلکی سسٹم کے ذریعے بغیر کسی درمیانی تار' آپ ہزاروں بلکہ لاکھوں میل دُور بات کر سکتے ہیں' دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ کوئی تحریر و تصویر من و عن پلک جھپکنے سے پہلے بھیج یا وصول کر سکتے ہیں۔ اگر تصویر' تحریر اور آواز کو ہزاروں لاکھوں میل دُور کسی بھی جگہ پہ بھیجا جا سکتا ہے یا کسی ہوا بند ساؤنڈ پروف کمرے' سمندر کی سب سے نچلی تہوں اور آسمان و فضا کی بیکراں وسعتوں اور بلندیوں سے آواز' ساکت و متحرک تصاویر' ہر نوع کی تحریریں کہیں بھی منتقل کی جا سکتی ہیں تو کسی بند تجوری سے کچھ میٹریل کچھ حرکت' چھوئے یا کھولے بغیر کیوں نہیں نکل سکتا؟ [illegible] گیسوں' مائعات اور موہومات و عنصرات میں دیر بہ دیر یا فی الفور منتقل ہونے کی صفات ہوتی ہیں۔ جیسے پانی کو بخارات' مختلف تیزابوں کو گیس اور متعدد معدنیات کو برادوں' مٹی یا محلول میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور پھر انہیں اپنی اصلی حالت میں بھی واپس لانا ممکن ہے۔ یہ تو مادی اشیاء ہیں جن میں حجم' وزن اور دیگر متعدد کثافتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اب رہی وہ استعانتیں اور مداوات جو نوری اور عنصری ہیں' جو نہ تو کوئی معینہ حجم و وزن اور صوت و صورت رکھتی ہیں اور نہ ہی کسی کثافت و نقاہت سے آمیز ہیں' انہیں کارہائے خرق الفطرت سرانجام میں کیا مداخلت پیش آ سکتی ہے۔

انسان کے دماغ' آنکھ' زبان' اعصاب میں ایسی ایسی قوتیں اور حیرت انگیز قسم کی طاقتیں پنہاں ہیں کہ انسان انہیں بروئے کار لا کر محیر العقول کارنامے انجام دیتا ہے اور دے بھی سکتا ہے کہ آپ اسے روحانی طاقت قرار دینے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں کریں گے جبکہ ان کا تعلق اعصاب سے ہوتا ہے' نہ کہ روحانیت یا افلاکیت سے...... میں نے آنکھ کی طاقت سے پنسل برابر لوہے کے موٹے کیل ٹیڑھے ہوتے دیکھے' خیال کی طاقت سے انسانی فیصلے تبدیل ہوتے دیکھے' زبان کی طاقت و تاثیر سے پتھروں کو موم کی مانند نرم ہوتے دیکھا' دماغی اور ذہنی قوتوں سے بڑے بڑے کارنامہ ہائے انجام ہوتے دیکھے۔ اعصابی طاقتوں سے

وہ کام ہوتے دیکھے جو بظاہر انسان کے بس و اختیار میں نہیں...... اب دیکھئے کہ انسان (اشرف المخلوقات) کے ساتھ سونے چاندی' چوب و حجرات (ارضی مادیات) بھی عنصرات میں تبدیل کر کے لائے جاتے ہیں اور پھر ان عنصرات کو وہی اصل صورت و شکل واپس دے کر محیط کر دیا جاتا ہے۔ برزخ اوّل و ازل سے اَرواح کو کن کن مراحل و اشکال سے گزار کر قرارِ ہستی میں آدم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت اسی انسانی قالب کو عنصری شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مٹی' مٹی میں مل جاتی ہے اور اللہ کا اَمر' اَمر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں اُڑنا' پانی پہ چلنا' آگ میں کود جانا' ایک مقام سے دوسرے مقام پہ پہنچ جانا' دُور بیٹھ کر مشاہدہ کرنا یا پیغام منتقل کر دینا۔ کسی انسان' جانور اور ارضی مادی اشیاء کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لینا' ان پہ حکم لگا دینا' یہ سب کچھ انسانی عقلی' شعوری' دماغی' اعصابی استعانتیں اور شعوری قوتیں ہیں۔ روحانیت کا ان میں کوئی دخل نہیں۔ یہ ریاضت کی [illegible] ہیں۔ میں نے ایسے سادھو سنت دیکھے جو نقطۂ انجماد سے بھی اُتری ہوئی سردی اور بارہ مہینے کی برف باری میں صرف ٹاٹ کی لنگوٹی میں ننگے پنڈے پڑے رہتے ہیں حالانکہ عام انسان اس حالت میں بیس منٹ بعد اکڑ کر فارغ ہو جاتا ہے مگر وہ بغیر کھائے پیئے' اہم ضروریات زندگی کے بغیر بھوکے ننگے' پچاس پچاس سالوں سے پڑے ہوئے ہیں۔ نزلہ' نہ زکام بخار' نہ یرقان [illegible] ہے اور نہ کوئی [illegible] ہوتا ہے۔

کتاب کے پچھلے صفحوں میں آپ نے سائیں ٹنو سرکار اور بابا رحمت سائیں جلیبیاں والے کا ذکر تو پڑھا ہوگا۔ ٹنو سرکار تو مجذوب تھے اور صوفی رحمت سائیں سالک! ہوش اور جوش کے ایک معمولی فرق کے ساتھ آپس میں جڑے ہوئے۔ ٹنو سرکار کبھی کبھی ہوش و خرد کا مظاہرہ بھی فرما دیتے تھے مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا۔ اُس زمانے میں' میرا قریب قریب ہر روز کا ہی معمول تھا کہ مجھے جونہی فرصت ملتی' میں گھوڑے شاہ سرکار کی راہ پہ آ لگتا۔ بابا رحمت سائیں اور ٹنو سرکار اگر وہاں مل جاتے تو ٹھیک' ورنہ ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ سائیں ٹنو سرکار اکثر ریلوے شنٹنگ یارڈ یا اسی آہنی پُل کے آس پاس یا اُوپر کہیں مل جاتے۔ ٹنو سائیں کو ریلوے سٹیشن کا ماحول مثلاً گاڑیاں' انجن' ڈبے اور قلی' مسافر وغیرہ بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ اکثر شنٹنگ یارڈ میں کھڑی بوگیوں' مال بردار ڈبوں' انجنوں میں گھس کر بیٹھ جاتے اور وہیں ٹانگیں پسار کر سو بھی جاتے یا اگر موج میں ہوتے تو آہنی پُل پہ چڑھ کر ریلنگ پہ ٹھوڑی ٹکا کر نیچے آتی جاتی گاڑیوں کا تماشا دیکھتے رہتے لیکن جہاں بھی ہوتے' عقیدت مندوں کا ایک جمِ غفیر بھی وہاں ضرور اکٹھا ہو جاتا۔ کوئی جلیبیاں آگے بڑھا رہا ہے' کوئی پھل دِکھا رہا ہے۔ کوئی گلے میں ہار ڈال کر خوش ہو رہا ہے تو کوئی بازو ٹانگیں پکڑ کر دابنا شروع کر دیتا۔ میں بھی اکثر انہی کی کھوج میں نکلتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ

گھوڑے شاہؒ کی مسجد میں بابا رحمت سائیں' ٹنڈو سائیں سرکار اور میں بیٹھے تھے۔ بابا رحمت سائیں اور میں' ٹنڈو سائیں سرکار کی ٹانگیں داب رہے تھے۔ ان کی میلی کچیلی ٹانگیں اور گندے پاؤں' بڑھے ہوئے کٹے پھٹے ناخن دیکھ کر میری طبیعت میں ہلکا سا تکدر پیدا ہوتا ہے' اگلے لمحے سرکار نے اپنا پاؤں میری گود سے کھینچ کر بابا رحمت سائیں کی گود میں رکھ دیا اور بابا رحمت سائیں نے مجھے وہاں سے اُٹھ جانے کا حکم دیا۔ اس کی پاداش میں بھرے بازار میں میرے اوپر کچی بدبودار نمک لگی کھالیں گر پڑی تھیں۔ نمک اور گندگی سے لتھڑا' پتھرو میں ایک نل کے نیچے پہنچتا ہوں۔ وہاں کوئی آتا ہے' نل چلا کر مجھے اچھی طرح نہلاتا ہے اور میرے گیلے کپڑے اُتروا کر کالے کپڑے پہننے کو دیتا ہے' آنکھوں میں سُرمہ لگاتا ہے۔ وہ بابا رحمت سائیں سرکار ہوتے ہیں' اس طرح مجھے احساس دلایا جاتا ہے کہ ظاہری گندگی' باطنی پاکیزگی اور کشف کیا ہوتا ہے؟...... اس کے بعد مجھے ایک تانگہ والا سیاہ پوش ملتا ہے جو مجھے ''پیا رنگ مبارک ہو'' کہتا ہے اور داتا سرکار لے جاتا ہے۔ وہاں لذیذ سا زردہ پلاؤ کھلا کر اسی تانگہ میں بٹھا کر شاہی محلے جمنا بائی جَبل پوری کی حویلی میں لے جاتا ہے۔ یہاں کے کچھ واقعات بیان کرنے کے بعد بات سے بات نکلی ہے اور دراز ہوتی چلی گئی ہے۔

اب [illegible] بات بیان ہو رہی تھی کہ کیا جنات' مُوکلات اور دیگر ارضی سماوی غیر مرئی استعانتوں کے علاوہ انسان کے پاس ایسی کوئی طاقت ہے کہ وہ مادہ ارضی اور مادہ در مادہ پہ اپنا کوئی حکم رکھ سکے؟...... میں نے لکھا تھا کہ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ یہ اشرف المخلوقات اسی لئے ہے کہ یہ دیگر مخلوقات پہ اللہ کی عطا کی ہوئی استعانت سے حکم رکھتا ہے۔ مخلوقاتِ حاضریہ و ناظریہ کے علاوہ یہ مخلوقاتِ خفیہ' حجریہ' معدنیہ' بحریہ' ہوائیہ پہ بھی کامل حکم وحمل رکھتا ہے۔ سائیں ٹنڈو سرکار کے حال' معاملات اور تصرفات کا چنداں ذکر اسی بات کی تائید ہے مگر اس سے پہلے ہمیں جان لینا چاہئے کہ مخلوق کسے کہتے ہیں؟

فرقانِ حمید میں ربّ العظیم نے مخلوقات کا بہت سی جگہوں پہ ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ مخلوق کسے کہتے ہیں۔ جو کچھ ''کُن'' کہنے سے معرضِ وجود میں آیا وہ اللہ کی تخلیق کردہ مخلوق ہے اور جو بھی کچھ مخلوق کی ذیل میں آتا ہے' جاندار ہے اور جاندار کی تعریف یہ ہے کہ وہ شکل' جسم' وزن' رنگ اور تغیر رکھتا ہو...... کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ' خفیہ و ظاہر' شجر حجر' معدنیات' آگ' پانی' ہوا' مٹی' پھول پتے' کانٹے' جو کچھ بھی ہے' وہ جان رکھتے ہیں' سُنتے ہیں' باتیں کرتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں' ہنستے مسکراتے اور برہم بھی ہوتے ہیں۔ یہ نفرت بھی کرتے ہیں اور محبت بھی...... روزمرہ کی زندگی میں اگر ہم غور کریں' مکمل توجہ اور یکسوئی

سے محسوس کریں تو دیکھیں گے کہ ہمارے اردگرد کی ہر چیز ہماری توجہ' مہربانی' شفقت اور دلچسپی کی طلبگار ہوتی ہے۔ میری ساری زندگی عمل و حرکت میں گزری' سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرتے کرتے میں زندگی کی شام تک پہنچ گیا۔ میدان' پہاڑ' صحرا' سمندر۔ زمین کے نیچے' فضا کے اوپر' سمندر کی تہوں میں لمبے نہ ختم ہونے والے سفر۔ انسانوں سے زیادہ میرے دوست یہی سفر' فاصلے' راستے' پتھر' سنگِ میل' درخت' پھول کانٹے' پھل' چاند ستارے' جگنو پرندے' چرندے' درندے' جنات' رجالُ الغیب' غیر مرئی مخلوقات رہے۔ ہر مخلوق کی اپنی اپنی ایک مخصوص فریکوئنسی ہوتی ہے جسے سمجھے اور جانے بغیر ان سے رابطہ یا بات چیت نہیں ہو سکتی۔ جب تک آنکھ کے قرینے پہ دیکھنے کے لئے اک مخصوص کنٹیکٹ لینز نہ ہو انہیں اُن کی اصلی حالت اور باطنی صورت میں دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ بہت پیچھے اگر ہم نہ جائیں اور صرف ماضی قریب کے اپنے چند ایک بزرگوں جو کالا پانی کے اسیر رہے' قلعوں اور دیگر عقوبت خانوں میں قید رہے یا پھر مولانا آزاد' سید عطاءاللہ بخاری' مولانا ظفر علی خان' فیض' شورش کاشمیری' منڈیلا ہی سے کبھی پوچھتے کہ چڑیاں' کوے' مکھیاں' مچھر' چوہے' کھٹمل' پاؤں کی بیڑیاں' سلاخیں' کراہتے سسکتے در و دیوار' ابھرتے پھیلتے سمٹتے ٹوٹتے سائے' روشنی کے لئے اندھے چراغ' بدبودار پھٹے ہوئے کمبل اور راتوں کو جھینگروں کی آوازیں۔ تنہائی اور لمبے عجیب دنوں میں وہ کس کس سے ہم کلام ہوتے تھے پہاڑ جیسے دن اور صحرا جیسی بے آب و گیاہ راتیں کس طرح کاٹ لیتے تھے؟ انتظار اور اکلاپے کے تو دو چار گھنٹے ہی قیامت بن جاتے ہیں۔ کالا پانی اور گولکنڈہ' آگرہ' رنگون' میسور' چتوڑ' لاہور' دہلی' روہتاس' بیلاک' منگلا' اٹک' کاٹھیاواڑ' راجھستان' جھانسی' جے پور' جموں وغیرہ کے قلعوں' محلوں' کنوؤں' میناروں' غاروں' جزیروں کے بندی خانوں اور عقوبت گاہوں میں پابجولاں' دست و گردن گرفتہ' کمر میں آہن کمر کس کا بوجھ اُٹھائے کس طرح یہ اُسیرانِ وفا' صاحبانِ اقتدار و جاہ' مردانِ بلند نگاہ' پیکرِ تسلیم و رضا' چشمۂ شرم و حیا' نازک خیالاں اور خوش اَدا صبح و شام کے نہ ٹوٹنے والے تسلسل میں' تنہائیوں' سوچوں' خیالوں اور محرومیوں کے آسیبوں اور ناگوں سے خود کو ثابت و سلامت رکھ پاتے ہوں گے؟...... مگر نہیں۔ فطرت' ضرورت' صبر اور حالات و وقت کا جبر ایسے میں بڑی زبردست مدافعتی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہ اور دسترس میں جو کچھ بھی مادے' منظر' ماحول' مَدارت و محرکات ہوتے ہیں وہ سب کے سب محرم و ندیم بن جاتے ہیں۔ چڑیاں' کبوتر' کوّے ان کے شانوں' زانوؤں اور ہاتھوں پہ بیٹھ کر ان سے گپ شپ لڑاتے ہیں۔ چوہے' چھپکلیاں' مکھیاں' مچھر تک ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ ان عقوبت گاہوں اور بندی خانوں میں سانپ بچھو اور دیگر حشرات الارض بھی موجود ہوتے ہیں۔ اکثر ان سے لپٹ کر پڑے رہتے ہیں' ساتھ سو جاتے ہیں' سامنے سے گزر جاتے

ہیں لیکن کیا مجال جو کسی کو ضرر پہنچا پائیں۔ دیواریں' چھت' فرش اور سلاخیں' دروازہ' یہ تمام چیزیں مونس و غمخوار سی بن جاتی ہیں۔ قیدی اِن سے مشورے لیتا ہے' اپنی کہتا اور اُن کی سُنتا ہے۔ یہ مٹی' چونا' پتھر اور لوہا لکڑی بظاہر مادۂ متمکّن ہیں مگر بنانے والے اَمرِ الٰہی سے انہیں مادۂ متکلّم اور کبھی مادۂ متجسّس بھی بنا لیتے ہیں......

جب تم نہیں ہوتے پہلو میں کیا قہر کی راتیں ہوتی ہیں
دروازوں سے ٹکرا جاتے ہیں' دیواروں سے باتیں ہوتی ہیں

مجذوب جب مشاہدۂ ذات میں اُترا ہوتا ہے تو وہ گم صُم' اندر ہی اندر کسی خاموش' ٹھنڈے' مُردہ آتش فشاں پہاڑ کی مانند چُپ چاپ سا رہتا ہے۔ اُسے اپنے گرد و پیش کی مطلق خبر و فکر نہیں ہوتی' وہ اندیشہ ہائے سود و زیاں سے یکسر بیزار و بے نیاز ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے قندھاری انار کی طرح پکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چھال پھٹنا' چٹخنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ بیدار ہونے والے آتش فشاں کی مانند اس کے ظاہر و باطن میں اندھی صدیوں سے دہکتی' بھڑکتی' کھولتی آگ اور اُبلتا ہوا لاوا زبردستی اپنا رستہ بناتا ہوا باہر نکلنا شروع ہوتا ہے۔ اس آتشیں بہتے ہوئے لاوے میں بڑی بڑی زرخیز معدنیاتی مٹی' جس میں ملے بڑے نایاب و انمول ہیرے' جواہر' پتھر اور بڑی قیمتی دھاتیں بھی باہر نکل آتی ہیں اور یہ پھر [illegible] ہیں۔

مشاہدۂ ذات میں اُترے ہوئے مجذوب کی جب ظاہر و باطن کی تمام تر کثافتیں' دریافتیں' اضافتیں' علامتیں' بلاغتیں اور لطافتیں اس کی زد میں آ جاتی ہیں اور جب وہ خوب جان پاتا ہے کہ وہ کیا ہے' کیسے ہے' کیوں ہے اور کس لئے ہے تو پھر مشاہدۂ حق میں ڈوبنے کی توفیق کا طلبگار ہوتا ہے یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون ہے' کیسے ہے' کیوں اور کس لئے ہے؟ ذات کے دروازے سے نکلنے کے بعد اگر حق کے دروازے میں داخل ہونے کی توفیق و اعزاز مل جائے تو پھر مجذوب ہر اصول و طریق' قاعدے کلیئے' گناہ و ثواب' پاکی پلیدی' وقت' زمانہ' زندگی' موت اور عنصر و مادہ کی ہر آلائش و آزمائش سے فارغ ہو جاتا ہے — زمان و مکان کے آگے لازماں اور لامکاں تک اس کی نگاہ کی حدود میں ہوتے ہیں۔ اس کا رابطہ براہِ راست نجف اشرف، بغداد شریف کے سٹیلائٹس سے منسلک ہو کر مدینہ منورہ کے ہیڈ آفس سے ہو جاتا ہے لیکن اُسے اس ساری کارروائی سے پہلے شاہ حسینؒ کے پرائمری سکول' حضرت لعل شہباز قلندرؒ، حضرت بو علی قلندرؒ، حضرت بہلول داناؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ کے مڈل سکول اور حضرت اویس قرنیؒ، حضرت بلالؓ کے ہائی سکول کے سرٹیفکیٹ اور معیاری کارکردگی کے کاغذات حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت پیرانؒ، حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیارؒ کاکی، گنج شکرؒ، حضرت مسعود گنج شکرؒ، مخدوم علاؤ الدین صابرؒ،

شیخ نظام الدین اولیاءؒ، نصیرالدین چراغ دہلویؒ، سیّد گیسودرازؒ، شیخ بہاؤالدین زکریاؒ،شیخ رکن عالمؒ، مخدوم جہاندار جہاں گشتؒ،شیخ جلال الدین تبریزیؒ،حضرت سلطان باہوؒ،حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ، حضرت برّی امامؒ،حضرت میاں میر سرکارؒ،حضرت شاہ جمالؒ،حضرت بابا گھوڑے شاہ (بہاؤالدین جھولن بخاریؒ) کے دفاتر سے جو بھی قریب پڑتا ہو تصدیق کروانے پڑتے ہیں۔

میں سکول' مکتب اور خانقاہوں کا بھگوڑا' الف پڑھا نہ بائے اور بس اپنی خرمستی اور آوارگی کی عادت سے مجبور سارا سارا دن گدھے سواری کرتا رہتا۔ ٹھور نہ ٹھکانہ' ناشتہ نہ کھانا۔ تن کی ہوش' نہ من کا توش۔ کپڑا لتا' جوتا اور رومال ٹوپی سے بے نیاز جدھر منہ اُٹھا' چل دیے۔ بابا رحمت سائیں تو سالک تھے اور سائیں ٹنو سرکار مہدِ مادر سے ہی مجذوب تھے۔

● ہے بندۂ آزاد اِک زندہ کرامات......!

شاہدرے کے قریب ایک گاؤں میں سیدوں کا ایک گھر تھا' وہاں ایک سیدھی سادی اللہ والی نیک سی عورت [illegible] تھا [illegible] بھاگ چھٹی پہ گھر آ جاتا۔ [illegible] عورت گاؤں کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا اور سینا سلائی سکھا کر اپنا وقت پورا کرتی تھی۔ اولاد نرینہ ماد [illegible] سے محروم یہ عورت بانجھ تھی۔ خاوند بھی شریف آدمی تھا' اولاد کی خواہش کے باوجود وہ راضی بہ رضا سا زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ سال چھ مہینے بعد وہ چھٹی پہ گھر بھی آتا تو کوئی ایسا خوش نہ ہوتا کہ اولاد کی کمی جو شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ طلاق بھی نہ دیتا اور دوسری شادی کی بھی نہ سوچتا کہ فوجی آدمی گھر سے زیادہ باہر ہوتا ہے' دو بیویوں کو آسرا دینے کا اہل نہیں ہوتا...... ایک بار کہیں وہ مختصری چھٹی پہ گھر آیا تو بیوی نے ڈرتے جھجکتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! میں نے پچھلے دنوں ایک خواب دیکھا ہے۔ ایک نورانی شکل وصورت والے بہت بوڑھے بزرگ تھکے ہارے' ایک گٹھڑی اُٹھائے میرے پاس آئے ہیں' اسی جگہ صحن میں چارپائی پہ بیٹھ کر فرماتے ہیں کہ 'پتر! بہت دُور سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ پھر وہ مجھے گٹھڑی کھول کر مٹی کا بنا ہوا ایک خوبصورت سا گھوڑے کا بچہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ لے' یہ ٹٹو لے لے...... میں وہ مٹی کا کھلونا لے لیتی ہوں' پھر دیکھتی ہوں کہ ان کی گٹھڑی میں اور بہت مٹی کے خوبصورت گھوڑے پڑے ہوئے ہیں۔ میں پوچھ لیتی ہوں کہ بابا جی! یہ چھوٹا سا ٹٹو؟ مجھے کوئی اور بڑا سا گھوڑا دے دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹٹو تو میں

خاص طور پر تیرے لئے لایا ہوں' گھوڑے تیرے لئے نہیں ہیں۔ پھر وہ پانی طلب کرتے ہیں' پانی پی کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور رُخصت ہوتے ہوئے کہتے ہیں میرا نام شیخ حسن بیج پیر ہے۔ یہ ٹٹو مجھے خاص طور پہ ہمارے جدِ امجد مخدوم سیّد جہانیاں جہاں گشتؒ نے دیا ہے کہ جاؤ' سکینہ بی بی کو دے آؤ۔ پھر تاکید کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اِسے تم ہمارے پوتے گھوڑے شاہ جھولن بخاری کے پاس لے جانا...... اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔''

خاوند نے خواب سُن کر کہا۔ ''دکھاؤ مجھے' وہ ٹٹو کہاں ہے؟''

بیوی بولی۔ ''ٹٹو تو انہوں نے مجھے خواب میں دیا تھا' حقیقت میں نہیں......''

خاوند مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''نیک بخت! تم بھی میری طرح ہر وقت اولاد کا سوچتی رہتی ہو اس لئے تمہیں بھی میری طرح اکثر خوابوں میں ٹٹو' بلونگڑے اور بکریاں' گایوں کے لیلے و بچھڑے وغیرہ دکھائی دیتے رہتے ہیں......''

بات آئی گئی ہو گئی لیکن دو دن بعد جمعرات کے دن جب ان کا پروگرام داتا سرکارؒ کے ہاں حاضری دینے کا بنا تو سکینہ بی بی کہنے لگی۔

''داتا سرکارؒ کی حاضری کے بعد ذرا گھوڑے شاہ سرکارؒ کے دربار بھی چلیں گے......'' پھر وہ ایک رنگین کپڑے میں لپٹا ہوا چھوٹا سا کھلونا نکال کر دکھانے لگی' بولی۔ ''یہ مٹی کا ٹٹو میں نے ہو بہو ویسا ہی بنایا ہے جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا......''

خاوند نے مٹی کے کھلونے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا.... کہنے لگا۔

''نیک بخت! اگر بنانا ہی تھا تو کم از کم کسی ڈھنگ رنگ کا تو بناتی۔ یہ نہ تو گھوڑا دکھائی دیتا ہے اور نہ اُونٹ...... یوں لگتا ہے جیسے تم نے مٹی لے کر اُلٹا سیدھا جو بھی بنا' بنا دیا......''

سکینہ بی بی بولی۔ ''شاہ جی! دراصل دو روز پہلے جب میں نے آپ کو اپنا خواب سُنایا تھا' اسی دن میرے دل میں آئی' میں اسی طرح کا ٹٹو بنا کر آپ کو دکھاؤں کہ اسی طرح کا ٹٹو میں نے خواب دیکھا تھا۔ اب مجھے مٹی کی تلاش ہوئی' سوچا کہ اتنے بڑے بزرگ نے مجھے ٹٹو دیا تھا' ایسا ٹٹو کسی عام مٹی سے نہیں بنانا چاہئے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں ایک سو ایک مرتبہ ''سورۃ تین'' پڑھ کر جو آٹا گوندتی ہوں اور بعد میں آٹے کا فالتو پانی جس مخصوص جگہ ڈالتی ہوں' کھلونا بنانے کے لئے مجھے وہیں ہی سے مٹی لینی چاہئے۔ چنانچہ میں نے اسی جگہ سے تھوڑی سی مٹی لی۔ پھر ایک سو ایک مرتبہ ''سورۃ تین'' سے دَم کئے ہوئے پانی سے اسے گوندھا' ایک سو ایک مرتبہ ''سورۃ تین'' پڑھتے ہوئے اسے ٹٹو جیسی شکل دی تاکہ خواب والے

بزرگ خوش ہو جائیں۔ پھر دو دنوں میں دو ہزار مرتبہ یہی دم کر کے اسے پھونکا' قرآن کے سائے میں رکھ کر اسے سکھایا...... بس اس طرح اُٹھاتے' رکھتے' پھونکتے یہی کچھ بنا ہے......''

جمعرات کے دن داتا سرکارؒ سے فارغ ہو کر وہ دونوں سیدھے سادے پینڈو قسم کے میاں بیوی' گھوڑے شاہ سرکارؒ حاضری کے لئے پہنچ گئے۔ پھول پتی' اگربتیاں' ایک تیل بھرا چراغ بھی جلایا۔ رنگین خوشبو بھرے کپڑے سے ٹنو نکال کر مزار شریف کی پائنتی قدموں میں رکھ دیا...... سکینہ بی بی بولی۔

''سرکار! اگر وہ خواب سچا ہے تو یہ ٹنو بھی ہُوبہو ویسا ہی ہے...... مجھے جو حکم ہوا میں نے پورا کر دیا۔ اب آپ جانیں' آپ کا خدا......''

اس دن کے بعد وہ ہر جمعرات یہاں حاضری اور ٹنو بنا کر لانا نہ بھولتی تھی...... ٹھیک دس ماہ تین دن کے بعد جب وہ ایک جمعرات اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی تو اس کی گود میں مٹی کا ہی بنا ہوا جیتا جاگتا' ہمکتا ہوا ٹنو تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس ٹنو کی مٹی اللہ خالق و مصور کی ''احسن تقویم'' والی مٹی تھی۔ سکینہ بی بی یہ گول مٹول ٹنو وہیں قدموں میں ڈال کر واپس لوٹنے لگی تو خاوند نے کہا۔

''نیک بخت ابھی تو اُٹھا......''

وہ نیک بخت بولی۔ ''وہ تو امانت تھی لوٹا دی...... شاہ جی! گھر چلو یہ اب اپنے گھر پہنچ چکا ہے......''

● کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا......؟

اس دن میں گھر سے سیدھا سٹیشن کی جانب آ نکلا تھا۔ پُل پہ چڑھا تو آگے مولا داد لولے کے ٹھیئے کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے' مجھے وہیں کھڑک گئی تھی کہ یہ لوگوں کا مجمع ٹنو سرکار کے گرد ہی جمع ہے...... سرکار اوپر کھڑے نیچے کھڑی چم چم چمکتی ہوئی گاڑی اور سیاہ لمبے سے انجن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اکثر لوگوں اور بچوں نے ہاتھوں میں ٹین پتری کے بنے ہوئے انجن اور گاڑیاں پکڑی ہوئی تھیں' ہر عقیدت مند کی یہ کوشش تھی کہ ٹنو سائیں اس کی گاڑی یا انجن قبول فرمالیں۔ سائیں سرکار کی گاڑیوں' انجنوں سے دلچسپی دیکھ کر دو چار دوکاندار قسم کے لوگوں نے پُل کے اوپر ٹین پلاسٹک کی گاڑیاں انجن بھی فروخت کرنے شروع کر دیئے ہوئے تھے...... میں بھی پاس جا کھڑا ہوا۔ سرکار لوہے کی ریلنگ میں پاؤں پھنسائے ہوئے' ریلنگ کے اوپر جُھک کر لوگوں سے انجن گاڑیاں لے لے کر نیچے پھینک رہے تھے۔ جس

کی انجن گاڑی سرکار لے کر نیچے پھینک دیتے' وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا۔ نیچے ریلوے پلیٹ فارم پہ یہ عالم کہ قلی' مسافر' ٹھیلوں چھابڑیوں والے دوکاندار' ریلوے ملازمین آپس میں چھینا جھپٹی کرتے ہوئے اُوپر سے آتے کھلونوں کو دبوچ رہے ہیں۔ جس کے ہاتھ کچھ لگ جاتا' وہ بھی خود کو خوش نصیب سمجھتا۔

یہ نیچے کھڑی ہوئی گاڑی دراصل مختلف بین الاقوامی کمپنیوں کی ایک نمائشی ٹرین تھی جو شاید کراچی' کوئٹہ اور لاہور سے ہوتی ہوئی' پشاور لنڈی کوتل تک جا رہی تھی۔ نئے نکور' چمکتے ہوئے رنگوں والے ڈبے۔ ہر ڈبہ' کسی نہ کسی کمپنی کی مصنوعات کے لئے مخصوص تھا۔ رنگین جھنڈیاں' قمقمے' غبارے۔ لاؤڈ سپیکر بھی لگے ہوئے تھے۔ اس پہ سینما بھی تھا' رات کو پلیٹ فارم پہ فلمیں بھی دکھاتے تھے۔ اس ٹرین کے دو انجن تھے۔ آگے والے انجن کی شان ہی نرالی تھی' بہت ہی لمبا اور کالا شا کالا...... دو روز پہلے یہ مخصوص ٹرین لاہور پہنچی تھی۔ اس کے پہنچنے سے پہلے اس کی خوب پبلسٹی ہوئی تھی۔ انگریزی میلہ' انعامات' چائے' سگریٹ' مفت تصویر کھینچنے کی ترغیب اور بہت سی دلچسپیوں کی وجہ سے پورا پلیٹ فارم کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا جس میں مسافر کم اور تماش بین زیادہ تھے...... جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ گاڑیاں اور انجن' ٹنو سرکار کی کمزوری تھے۔ خدا جانے انہیں ان میں [illegible] نظر آتا' دکھائی دیتا تھا کہ وہ پہروں سٹیشن یا پُل پہ ان کے دید تماشے میں مگن رہتے یا یوں کہہ لیں کہ مجذوب کی اپنی موج ہوتی ہے۔ نیچے سے گزرنے والی گاڑی کے انجن کا ڈرائیور اس پُل کے نیچے پہنچتے ہی وسل بجا کر ٹنو سائیں کو ضرور سلامی پیش کرتا۔ سائیں سرکار موجود ہوں یا نہ ہوں مگر سلامی پیش کرنا ایک روایت یا روٹین بن چکی تھی۔ اس زمانے میں گاڑیوں کے ڈرائیور' گارڈ' سٹیشن ماسٹر' چیکر وغیرہ اینگلو انڈین دکھائی دیتے تھے۔ یہ ملازمتیں بڑی اونچی اور عزت والی سمجھی جاتی تھیں۔ مسلمان اکثر اس سے نیچے ملازمتوں پہ متمکن ہوتے تھے یا پھر کوئی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں ترقی کر کے ڈرائیور یا گارڈ' چھوٹا سٹیشن ماسٹر بن جاتا تھا لیکن ٹنو سرکار کی سلامی اور عقیدت و عزت کے معاملے میں انگریز' اینگلو انڈین' ہندو' سکھ' عیسائی' مسلمان' سب ہی ایک تھے۔ ان سب کا پختہ یقین تھا کہ سائیں سرکار کی خوشی اور اجازت' مرضی کے بغیر اس سٹیشن سے کوئی گاڑی' انجن وغیرہ نہ تو جا سکتا ہے اور نہ ہی آ سکتا ہے...... بے شمار واقعات اس ضمن میں ظہور پذیر ہو چکے تھے اور آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ سائیں جی شنٹنگ یارڈ' ورکشاپ' واشنگ یارڈ میں گھومتے رہتے۔ بچے بالے' بڑے ان کے آگے پیچھے ہوتے اور یہ سب سے بے نیاز کسی بھی ڈبے' بوگی یا انجن پہ چڑھ کر بیٹھ جاتے یا سو جاتے...... اب کسی کی کیا مجال کہ وہ ڈبہ یا انجن وہاں سے ہل جائے۔ جب تک سرکار موجود ہیں' سب کھڑے بیٹھے انتظار کر رہے ہیں یا پھر خود ہی اُٹھ کر انجن کا وسل بجا دیتے یا لیور گھما دیتے اور منہ سے چھک چھک کی

آوازیں نکالتے' مقصد یہ ہوتا کہ چلو' انجن سٹارٹ کرو۔ دل چاہتا تو پائیدان پہ لٹک کر ''ہُوٹے'' لیتے رہتے۔ چلتے انجن یا بوگی سے اُتر اور چڑھ بھی جاتے اور اس سے ڈرائیور کچھ کرے یا نہ کرے' انجن خود ہی اُترتے چڑھتے وقت دھیما ہو جاتا۔ کئی بار ایسا بھی دیکھنے کو ملا کہ سرکار کھڑے انجن کو ''چھک چھک'' کہتے ہوئے مُکے مارنے لگتے ہیں اور وہ بغیر سٹیم' پریشر اور ڈرائیور سرکنے لگتا ہے۔ مُنہ پہ مُٹھی رکھ کر ''کُو کُوں'' کی آوازیں نکالتے ہیں تو انجن کا وِسل بھی بجنے لگتا ہے۔

اُس دن اسپیشل ٹرین کے موقع پہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ ظہور میں آیا۔ پُل پہ کھڑے کھڑے نہ جانے جی میں کیا آئی کہ لوگوں کے درمیان میں سے رستہ نکال کر نیچے پلیٹ فارم پہ آ گئے۔ تماشائی زیادہ تھے جو صرف اس ٹرین کی دلچسپیاں دیکھنے سٹیشن پہ آئے تھے اور سائیں سرکار سے واقف نہ تھے۔ سائیں سرکار سیدھے انجن کی جانب بڑھ آئے بڑی دلچسپی اور محویت سے اس لمبے چوڑے خوبصورت انجن کو دیکھنے لگے۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔ کبھی ہاتھ لگا کر دیکھتے اور کبھی مسکرا کر تالیاں بجاتے۔ پھر اچانک اگلے پائیدان پہ پاؤں ٹکا کر اوپر چڑھ گئے اور بوائلر کے اردگرد گھومنے لگے۔ کچھ دیر بعد پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور عقیدت مندوں کا ہجوم بھی وہیں رُک گیا۔ ڈیڑھ بجے پھر اس ٹرین نے گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہونا تھا۔ ڈرائیور اینگلو انڈین تھے [illegible] مسلسل [illegible] شور مچا رکھا تھا۔ سگنل چھوڑنے میں دس پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اینگلو انڈین ڈرائیور بڑی رعونت سے کیبن سے نکل کر ساتھ والے فٹ دے پہ چلتا ہوا آگے انجن کے فرنٹ ہیڈ تک آیا اور سائیں سرکار سے کہا۔

''بابا! اب اُتر جاؤ' گاڑی چلنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

سائیں سرکار نے بھلا کہاں کسی کی سُنی تھی جو اس کی بات بھی سُنتے' وہ ہمیشہ کی طرح بے نیازی سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے اپنے آپ میں مگن تھے...... پاس کھڑے ہجوم میں سے ایک بزرگ بولے۔

''ڈرائیور صاحب! سائیں جی اپنی مرضی سے اُتریں گے...... ذرا صبر کرو' انہوں نے سُن لیا ہے۔''

اودھر اینگلو انڈین گارڈ بھی چلنے کی تیاری میں تھا۔ چار پانچ منٹ پہلے وہ پوری ٹرین کو چیک کرتا ہوا انجن کی جانب آیا تو انجن کے پاس لوگوں کا ہجوم دیکھ کر ٹھٹکا۔ آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک ننگ دھڑنگ فقیر آگے بمپر کے پاس پاؤں لٹکائے انجن پہ بیٹھا ہے اور لوگ پاس کھڑے عقیدت سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ بدمغزہ اینگلو انڈین اس اسپیشل ٹرین کا گارڈ' خوبصورت بے عیب یونیفارم' سر پہ ہیٹ' بغل میں سبز سُرخ جھنڈی' شولڈر بیلٹ میں لٹکی ہوئی چمکتی سی وِسل لٹکائے بڑے طمطراق اور غُصے سے لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نفرت بھری نگاہ سے سائیں سرکار کو دیکھا' پھر لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بابا کون ہے‘ اس کو انجن سے نیچے اُتارو......“ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک منٹ کے بعد گاڑی روانہ ہو جائے گا...... چلو‘ جلدی جلدی اس کو اُتارو......“

اس سے پیشتر کہ کوئی جواب دیتا‘ وہ ڈرائیور کے پاس پہنچ گیا۔ اس سے کچھ بات کر کے وہ واپس اپنے کیبن کی جانب جا رہا تھا۔ ٹھیک ایک بج کر تین منٹ پہ گارڈ نے پہلا وسل بجایا‘ ڈرائیور نے بھی جواب میں سائیں سرکار کی جانب دیکھتے ہوئے وسل بجایا مگر وہاں سننے والا کون تھا؟...... گارڈ نے سیکنڈ وسل کے ساتھ سبز جھنڈی بھی دکھائی۔ اب ڈرائیور کے ذہن میں یہ تھا کہ وسل بجاتے ہی یہ فقیر بابا چھلانگ لگا کر اُتر جائے گا مگر وہاں تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ تیسری چوتھی وسل پہ جب گاڑی نہ سرکی تو گارڈ غصے سے دانت پیستے ہوئے انجن کی جانب دیکھتے ہوئے‘ پھر ایک بار وسل بجا کر جھنڈی لہرانے لگا۔ اب ڈرائیور نے بریکیں کھول کر لیور کھینچا مگر وہاں تو ”زمین جنبد نہ جنبد گل محمد“ والی بات تھی‘ انجن جیسے پاتال میں جڑیں اُتارے ہوئے جما ہوا کھڑا تھا۔ سٹیم گیج چیک کیا۔ بریک پریشر سب چیزیں‘ کلیں آلے دُرست مگر انجن حرکت کرنے سے عاجز تھا۔ گارڈ منہ میں بڑبڑاتا ہوا انجن کی جانب آیا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ انجن حرکت نہیں کر رہا۔ ہر چیز ٹھیک ہے‘ سمجھ نہیں آ رہی کہ انجن کو کیا ہوا؟...... گارڈ نیچے اُترتے ہوئے بولا۔

”تم بابا کو نیچے اتارو‘ میں کنٹرول روم میں رپورٹ کرتا ہوں......“

ڈرائیور پھر آگے آیا اور بولا ”بابا! نیچے اُتر جاؤ‘ ہم جانا مانگتا ہے...... گاڑی پانچ منٹ لیٹ ہو گیا ہے۔“

گارڈ جلد ہی دو تین مکینکوں کو ساتھ لے کر پہنچ چکا تھا‘ مکینکوں نے جب ٹنڈو سرکار کو آگے بیٹھے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر گارڈ سے کہنے لگے۔

”صاحب! یہ سائیں بابا جب تک اجازت نہ دیں گے اور اُتریں گے نہیں‘ تب تک یہ گاڑی نہیں چلے گی......“

گاڑی کو لیٹ دیکھ کر گاڑی کے ساتھ سفر کرنے والے دیگر ذمہ دار افراد بھی آگے انجن کے پاس پہنچ آئے تھے اور حیرت سے سائیں سرکار کو دیکھ رہے تھے...... گارڈ اور ڈرائیور‘ مکینکوں کی یہ بات سُن کر غصے سے لال پیلے ہو گئے اور لگے دھمکیاں دینے کہ وہ اِن کی رپورٹ کریں گے۔ مکینک یہ دھمکی سُن کر اوپر چڑھ گئے۔ ڈرائیور اور گارڈ کو ایک ایک چیز چیک کروائی اور کہا۔

”صاحب! مانو یا نہ مانو‘ یہ انجن اس وقت تک ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک ٹنڈو سرکار اس کے اوپر موجود ہیں......“

گارڈ پاؤں پٹختا ہوا نیچے اُترا اور اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں چلا گیا۔ اس سے بات کی' وہاں سے بھی یہی جواب ملا لیکن سٹیشن ماسٹر یہ کہتا ہوا اس کے ساتھ انجن تک چلا آیا کہ میں سائیں سرکار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نیچے اُتر آئیں اور گاڑی روانہ ہونے کی اجازت دیں۔ اس نے آتے ہی پہلے سلام کیا اور پھر پاس کھڑے ایک لڑکے سے ایک کھلونا گاڑی لے کر سائیں سرکار کو پیش کرتے ہوئے نیچے تشریف لانے کی درخواست کی۔ اللہ کا کرنا ہوا کہ سائیں سرکار نے کھلونا تھام کر نیچے چھلانگ لگا دی اور پھر کیا ہوا؟...... ڈرائیور اور اس کے دونوں معاون نیچے گارڈ اور سائیں سرکار کے پاس کھڑے تھے' انجن کا کیبن خالی تھا۔ سائیں جی کے اُترتے ہی خود بخود وسل بج اُٹھا جیسے کوئی تار کھینچ کھینچ کر روانہ ہونے کی آخری اطلاع دے رہا ہو۔ گارڈ' ڈرائیور اور دیگر لوگ جو سائیں سرکار سے واقف نہیں تھے' ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈرائیور کے لیور کو چھوئے بنا ہی انجن کے انھارہ آہنی پہیئے چنگاریاں چھوڑتے ہوئے اک مہیب سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیزی سے گھوم گئے۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ وہ گارڈ بعد میں مسلمان ہو گیا اور ریلوے کی نوکری چھوڑ کر سائیں سرکار کی نوکری میں لگ گیا۔ یہ ساری کتھا کہانی سُنانے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ جو خود کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں' اللہ ہر چیز ان کا مطیع کر دیتا ہے۔ میں نے سیکھا یہ ہے کہ مجذوب ظاہر ہو جاتا ہے اور حق اس کے منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ یہاں ایک مجذوب تھا' لامحالہ عنصر و مادیت پہ بھی اس کی گرفت تھی مگر میجر کے مصطفےٰ علی خان کی تجوری والے واقعے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو لوح کے موکلات کی واردات تھی اور اس واردات میں میری کسی مرضی کو دخل بھی نہیں تھا لیکن یہ میرے ادراک میں تھا کہ ایسا ہوگا۔

● ہے کہاں تمنا کا دُوسرا قدم یا ربّ......!

یہ پُراسرار علوم کی دُنیا بھی بڑی عجیب و غریب دُنیا ہے۔ دیگر قریب قریب تمام علوم کے برعکس ان مخفی علوم کا کوئی منطقی انجام مقرر نہیں ہوتا۔ کوئی اُصول' کوئی قانون' طور و طریق نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے کہ ان علوم کے عامل اور عالم حیران و ششدر ہونا بھول چکے ہوتے ہیں۔ ان کے رُوبرو کوئی سیدھا اور منتخب شدہ راستہ نہیں ہوتا۔ وہ ہونیوں میں اَن ہونیاں اور اَن ہونیوں میں ہونیاں نکالتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں کسی خیال' سوچ' ارادے' عمل اور انجام کی کوئی ضد نہیں ہوتی۔ یہ لوگ خوبصورت پرندوں کے جہاں میں کالے کوّوں کی طرح ہوتے ہیں جو ''کیا کیا'' اور ''کیوں کیوں'' کرتے رہتے ہیں۔

مجھ کالے پربت کے کاگا کے سنگ ممبئی کے جوہو ساگر کا سیکا بگا یعنی مصطفےٰ علی خان دوسرے روز علی الصبح حسبِ پروگرام ابابیل کے آنسو یعنی الوری کچے فیروزے کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ لگژری کوچ کے ذریعے ہم پہلے احمد آباد پہنچے' وہاں ایک آدھ روز ان کی خالہ کے ہاں قیام کیا۔ رَتی بازار اور جواہر مارکیٹ کی ایک ایک جگہ چھان ماری مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہ لگا۔ رات ٹرین پکڑی' صبح اجمیر شریف اُتر آئے۔ خواجہ غریب نوازؒ کی چوکھٹ پہ بیٹھنے اور اسے تھامنے کا لطف و مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ پشتینی مجاوروں اور سجادہ نشینوں سے پُرانی یاد اللہ ہے اور یہ سلسلۂ خاندان یہاں بڑا با اَثر اور ثروت و حیثیت والا ہے۔ بِلا شرکتِ غیرے یہ اس علاقہ اور گردونواح میں باوقار اور بااختیار لوگ ہیں۔ میرے قیام و طعام کا انتظام مولوی وجاہت علی صاحب کی بیٹھک میں رہتا تھا۔ یہ مولوی صاحب بھی میرے چاہنے والوں میں سے ایک نایاب سی چیز کی حیثیت رکھتے تھے۔ بے حد مرنجاں مرنج اور زُود حِس۔ تینوں' چاروں بیویاں یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ اولاد میں صرف بیٹیاں تھیں جو اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ مولوی صاحب دربار پہ منعقد ہونے والی قوالیوں کے مہتمم تھے اور بغلی شغلی کاروبار کے طور پہ پان میں کھانے والا قوام بنایا کرتے تھے' ظاہر ہے کہ پان اور قوام چبانے کے شوقین بھی تھے۔ وہ یہ قوام وغیرہ اسی بیٹھک میں تیار [illegible] دالانوں میں ایک نفیس سی خوشبو رچی بسی رہتی جو تمباکو کی تیز بُو سے متنفر ہونے کے باوجود بھلی لگتی اور خاص طور پہ سو کر جاگنے سے تو مشامِ جاں تازہ ہو جاتی' کافی دیر تک ایک خمار سا چھایا رہتا...... اجمیر شریف پہنچ کر مولوی وجاہت علی کی بیٹھک میں ایک بار ٹِک جانے کے بعد یہاں سے نکلنا بڑا مشکل ہو جاتا۔ لنگر کے علاوہ ان کے گھر کا کھانا بھی انتہائی مزیدار ہوتا اور اَرہر کی دال تو لازماً ہوتی۔ کئی بار احساس ہوا کہ جیسے اسے بھی قوام کا بگھار لگایا جاتا ہے...... ان سے بھی میرے مُحبّانہ تعلقات کی بنیادی وجہ میرا یہی شوقِ خانہ خراب تھا۔ درگاہ شریف سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مولوی صاحب کو بتا دیا تھا کہ حاضری کے علاوہ میرا یہاں پہنچنے کا دوسرا مقصد کیا ہے؟ دوسرے روز ہم تینوں اجمیر کے بازاروں میں نکل گئے۔ یہاں جواہرات اور صنعتی' عمارتی قیمتی پتھروں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے اور یہاں سے بھی بڑی مارکیٹ جے پور اور جودھ پور ہے اور اس سے بھی بڑی مارکیٹ ممبئی ہے اور اسی ممبئی سے ہم فیروزے کی تلاش میں اِدھر آئے تھے...... گلیوں' بازاروں' دوکانوں اور مارکیٹوں میں خجل خواری کے بعد ہم تینوں لنڈورے بے نیل و مرام واپس لوٹ آئے کہ وہ دُرِنایاب' ذرۂ آفتاب' صد پردۂ حجاب اور دُردانہ لاجواب کہیں سے دستیاب نہ ہوا۔ ایک آدھ دانہ دِکھائی بھی پڑا تو وہ پختہ تھا' رنگ پکڑ چکا تھا جبکہ ہمیں کچا اور اَزقسم ابابیل کا آنسو چاہیے تھا...... رات موتی مسجد میں

نماز عشاء کے بعد سیٹھ مصطفےٰ علی خان کہنے لگا کہ مناسب سمجھو تو کل جمعرات کا روز ہے' نیاز پکوا کر بابا کی فاتحہ دلوا دیتے ہیں۔

دوسرے دن صبح ہی صبح مولوی وجاہت علی صاحب نے خواجہ غریب نوازؒ کی چھوٹی دیگ کا سامان خرید کر باورچیوں کے سپرد کر دیا ہوا تھا۔ جمعرات کے روز تو اضافی رونق اور برکت ہوتی ہے' زائرین کی آمد و رفت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ بھک منگے' محتاج نہ جانے کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں۔ بازاروں' دوکانوں' گلی کوچوں' ہوٹلوں' سراؤں میں بلاتمیز و امتیاز' مسلم و غیر مسلم زائرین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہیں۔ وسیع و عریض درگاہ شریف کے اندر باہر ایک میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ اردگرد علاقوں کے مسلم' غیر مسلم قبائل اور خاص طور پہ کم ذات ہندوؤں' اچھوتوں' شودروں کے ہاں کے نئے شادی شدہ جوڑوں کی آمد بھی زیادہ تر جمعرات کو ہی ہوتی ہے۔ دولہا دلہن بیاہ کے بعد لگن منڈپ سے سیدھے خواجہ غریب نوازؒ کی چوکھٹ پہ سیس نواتے ہیں۔ پھول پتی' چڑھاوا' چڑھا کر تبرک باد لے کر گھر جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان بھر سے گوئیے' قوال' گانے بجانے والیاں بھی یہاں بڑی عقیدت سے چوکی دینے اور چادر چڑھانے آتی ہیں۔ خواجہ غریب نوازؒ سب کی من کامنائیں پوری کرتے ہیں۔ سب کو نوازتے ہیں اور اسی لئے تو غریب نواز کہلواتے ہیں۔

میں اور مصطفےٰ علی خان ظہر کی نماز سے پہلے پہلے ہی نیاز و فاتحہ سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنے معمول کے مطابق موتی مسجد کے باہر جو مزار شریف کی بغل میں دائیں طرف واقع ہے' اپنی مخصوص جگہ پہ نماز کے لئے بیٹھ چکے تھے۔ اذان میں ابھی ذرا سی دیر تھی' مصطفےٰ علی خان نے بڑی دھیرج سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''خان صاحب! آپ کو تو یاد ہی ہوگا کہ آپ نے ممبئی میں مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اجمیر شریف' موتی مسجد میں بیٹھ کر تمہیں لوح لکھنا یا تیار کرنا بتائیں گے...... دیکھ لیجئے' یہ اجمیر شریف اور موتی مسجد کا موقع محل ہی ہے......''

میں بڑی جُز بُز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہوسکتا ہے' میں نے ایسا کچھ مذاق وزاق یا تمہیں ٹالنے کے لئے کہہ دیا ہو مگر حد ہے کہ تم ابھی تک لوح کی لکیر کو پیٹنا نہیں بھولے...... اللہ کے بندے! کم از کم یہاں تو اس قسم کی دُنیا داری کی باتیں نہ کرو......'' پھر میں نے دھیرے سے اس کا زانو دباتے ہوئے کہا۔ ''خواجہ پیا برا مان جائیں گے......''

وہ میری بات کے نہلے پہ دہلا مارتے ہوئے کہنے لگا۔

''مگر آپ بھی تو لوح کے تکینے کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں.....؟''

مَیں نے اس کی دلیل سے زچ ہو کر بات بناتے ہوئے کہا۔

''مَیں اس لوح کو اللہ کی مخلوق کی بہتری اور اچھائی کے لئے ہی دوبارہ متحرک بنانے کی کوشش میں ہوں۔ اس کا کھویا ہوا ہابیل کا آنسو دوبارہ اپنی جگہ پہ بیٹھ جانے سے صدیوں پُرانے تاریخی اَسرار اور اس وقت کے مسلم ماہرینِ فلکیات' ہیئت' سریّات اور الواحات کی انداز' طور طریق اور عمل و فکر کو جاننے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اگر تم نہیں جانتے تو جان لو کہ طلوعِ اسلام سے پہلے میریوں' بابلیوں' اَسیریوں' یہودیوں' عبرانیوں' فارسیوں' کلدانیوں' یونانیوں اور مصریوں' عربوں کی قدیم تہذیبیں موجود تھیں اور وہ اس وقت بھی اَرضی سماوی' افلاکی اور خفتہ علوم میں ہم سے یعنی ہماری اس وقت کی سائنسی معراج کے سنہری دُور سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ آج سے صدیوں پہلے کی تہذیبیں' اصولِ علم و حکمت کی کتابیں' الواح' تعمیرات' قاعدے' قانون' کلیئے' نظریئے' مقالے' اَرضی تقسیمیں' فلکیاتی تجسیمیں' جدولیں' جنتریاں' بروج' سیاروں ستاروں کے نقشے' جھرمٹ راستے' گھر چالیں اور کیلنڈر وغیرہ اتنے قابلِ رشک ہر لحاظ سے دُرست اور قابلِ عمل تھے کہ آج ہم ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ آج کی سائنس منجملہ تمام عُلوم و حکمت اور نظریئے سقراط' بقراط' لقمان' جالینوس' ہرمس' بوعلی سینا' البیرونی' محمد بن زکریا رازی' جابر بن حیان' الحسن الہیثم' عمر خیام سے استفادہ نہیں کر رہے؟ یورپ' امریکا اور روس کی لائبریریوں' یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں سے اگر ان دانشوروں' منجموں' ہیئت دانوں' ریاضی دانوں' حکمت و کیمیا گروں' علمِ تقویم' علم الافلاک کے ماہروں اور روحانیات کے عالموں کی کتابیں' اقلیدسیں' لوحیں' صحیفے' تجربے' نظریئے اور مقالے اُٹھا اور نکال لئے جائیں تو ان کی لائبریریوں میں شرلاک ہومز' لیڈی چیٹر لے لوز' شیکسپیئر' آسکر وائیلڈ' کیٹس' بائرن کی کتابیں بچیں اور یونیورسٹیوں میں گھوڑوں کے اصطبل کھل جائیں۔''

سیٹھ مصطفےٰ علی خان ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''مائی باپ! مجھ راندۂ درگاہ' جاہل سے غلطی ہو گئی جو لوح کی بات کر بیٹھا......'' پھر وہ اپنے کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے بولا۔ ''میری تو ''توبۃ النصوح'' کہ مَیں کبھی اپنی زبان سے لوح سیکھنے کے بارے میں کوئی لفظ نکالوں...... مَیں نے لوح کا لفظ مُنہ سے کیا نکال دیا کہ آپ نے تو دُنیا بھر کے علوم' تاریخ' اَسرارِ عالم اور بڑی بڑی شخصیات اور ایسے مشکل مشکل نام جو مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سُنے ہیں۔ بتانے شروع کر دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے' شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ اس وقت نماز کے لئے موتی مسجد کے باہر بیٹھے ہیں......'' پھر وہ دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''توبہ توبہ! آپ کی باتوں

کے گنجلکوں اور سحر میں پھنس کر انسان اگر پاگل نہیں تو کسی حد تک ذہنی طور پہ کھسک ضرور جاتا ہے......‘‘

میں نے بھنا کر جواب دیا۔ ’’تم نے بھی تو اسی جگہ لوح کی بات کی ہے؟...... میں نے ذرا تفصیل اور تمہید سے بات کر دی تا کہ لوح اور اس کے متعلقہ علوم اپنے تمام تر پس منظر اور سیاق و سباق کے ساتھ اگر تمہارے علم میں آ جائیں تو اس میں کیا بُرائی ہے......؟‘‘

بھلا ہو تکبیر کا کہ اس نے تکبیر شروع کر دی ورنہ ہم دونوں نے یہیں آپس میں سینگ پھنسا ہی لئے تھے...... نماز دُعا ختم ہوئی تو قوالوں کے طبلچی نے کھرن پہ ہتھیلی جما دی...... راجھستان کا علاقہ بھی راگ راجھستانی مانڈ کی مانند بڑا گھمبیر اور پُراسرار ہے۔ یہاں کے لوگ جفاکش، بہادر، اپنی قدیمی صحرائی روایات پہ فخر کرنے اور انہیں زندہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی حسِ جمال بڑی تیکھی ہوتی ہے۔ پیار و محبت کے متوالے، چاہت کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپنے والے...... موسموں اور رُتوں کی دل آویزیاں، ان کی اٹھکیلیاں، کروٹیں، چونچلے اور جبر محسوس کرنا، انہیں سہنا برداشت کرنا اور ان سے پیار کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ اپنے مویشیوں، خاص طور پہ اُونٹوں اور ہتھیاروں سے یہ عشق کرتے ہیں۔ رنگت کی ملاحت، نین نقش کی تیکھی نزاکت اور موسیقی کی بلاغت و صراحت انہیں فطری طور پہ ودیعت ہوتی ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے کا خواہ کسی بھی مذہب و مسلک سے تعلق ہو خواجہ غریب نواز سے ضرور عقیدت و محبت رکھتا ہوگا۔ ہندو، سکھ، عیسائی، کوئی بھی جو درگاہ شریف کے پاس سے گزرتا ہے، عقیدت سے سر جھکا کر پہلے سلام کرتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ کوئی کاروبار، کوئی معاملہ سلسلہ، شادی بیاہ، سیاحت، جھوٹ، خواجہ پیاؒ کی آشیرباد، منت، حاضری، نذر و نیاز، چادر چڑھائے بغیر نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں کے لئے اکثر جمعرات کا روز ہی مناسب یا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ایشیا ہی نہیں بلکہ دُنیا بھر سے عقیدت مند آتے ہیں اور اپنی اپنی طرز و توفیق کے مطابق نذر نیاز کرتے ہیں، چھوٹی اور بڑی دیگیں چڑھی رہتی ہیں۔ بلاشبہ سینکڑوں من لنگر پکتا ہے اور ہزاروں زائرین اور مسافروں، محتاجوں میں بٹتا ہے۔

نذر نیاز اور نماز سے فارغ ہو کر اب ہم دونوں قوالی پنڈال کی جانب اُٹھ آئے تھے۔ عُرس کے دنوں میں ملک بھر سے قوال پارٹیاں یہاں حاضری دیتی ہیں مگر عام دنوں میں مقامی درباری قوال اور گرد و نواح کے چھوٹے موٹے گانے بجانے والے ہی اکثر بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ہوتے ہیں بلکہ جمعرات کے علاوہ باقی دنوں میں یہی ہوتے ہیں، ان میں شاذ ہی کوئی قوال پارٹی اپنے چہرے مہرے، لباس، ساز و سامان، فن، حُسنِ کلام اور ضروری افراد سے مکمل یا آراستہ پیراستہ ہو ورنہ اکثر چھوٹے موٹے گویئے، راگی، غریب غربے، پھٹی ڈھولکی، بے سُرے باجے اور کھڑتالوں والے ہی

ہوتے ہیں۔ یہاں میں نے تین چار افراد پہ مشتمل قوال پارٹیاں بھی دیکھی ہیں' ان میں بھی ایک آدھ بچہ ہوتا...... قوالی پنڈال میں ہم اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھ گئے۔ مولوی وجاہت صاحب چونکہ قوالی پنڈال کے مہتمم تھے اور بنفسِ نفیس وہاں موجود ہوتے تھے لہٰذا ہمیں بھی ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھنا پڑا۔ میں نے بیٹھتے ہی قوالوں کے لئے پہلی نذر' مولوی صاحب ہی کے ہاتھوں منت کرتے ہوئے قوالوں کے پاس پہنچا کر ایک نظر قوالوں کو دیکھا...... میرے خدا! یہ کیا؟...... میں دیدے پھاڑے دیکھنے لگا۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ نو برس کا ایک کلونسا ہوا' سنکا سا لونڈا ایک چھوٹے سے خستہ حال باجے پہ بڑی مشاقی اور پھرتی سے کالی کیکری کی مسواکوں سی انگلیاں چلا رہا تھا اور دھم دھم ڈھولک پہ پندرہ سولہ کا سن لئے ایک شیاما سی لڑکی ایسی کالی شا کالی کہ شب تار اگر دیکھ لے تو مارے رشک' جل بھن کوئلہ ہو جائے۔ دھانی رنگت کی چنریا اوٹ کالی گھٹا سی زلفوں کا ایک انبار..... وہ کسی پختہ پکھاوجی کی مہارت سے ڈھولک بجا رہی تھی۔

نرت کے بعد اگر کوئی چیز جمالی طور پہ کسی صاحبِ ذوق و جمال کو الٹ پلٹ کر سکتی ہے تو وہ مردنگ اور طبلہ پہ کسی صاحبِ فن کا اظہارِ فن ہے۔ ان آلاتِ طرب و غنا سے چھیڑ چھاڑ کرنے والا اگر صاحبِ سیرت و صورت بھی ہو تو قیامت سے پہلے قیامت آ جائے گی' والی بات بن جاتی ہے۔ میں اکثر ایسی کیفیات سے گزرا ہوں۔ بعض بڑے بڑے نامی گرامی استادوں کا طبلہ سنا' بجاتے دیکھا تو ماشاء اللہ کہا مگر سبحان اللہ صرف چند ایک بار ہی کہا ہوگا۔ استاد اللہ رکھا' استاد ذاکر حسین' استاد شوکت' استاد تاری اور اس دور کے جادوگر طبلہ نواز استاد طافو...... منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلوانے والے عظیم فنکار ہیں۔ ممبئی میں شکیلہ بانو بھوپالی کے ہاں بھوپال کا ایک طبلچی سنا اور دیکھا یا پھر لاہور آرٹ کونسل میں جشنِ بہاراں کے موقع پہ روشن آراء بیگم سے اُن کا ایجاد کیا ہوا ایک راگ ''زرتاش'' سنا تھا۔ فیروز نظامی مرحوم کمپیئر تھے' ایک بھلے سے فنکار نے طبلے پہ سنگت کی تھی۔ روشن آراء مرحومہ کو بہت سنا تھا مگر اس رات کھلے آسمان کے شامیانے تلے' اوس کے برستے موتیوں کی بوچھاڑ میں اُس طبلے والے اور اس کے فن کو ہی دیکھا' سنا اور خوب سبحان اللہ کہا۔

- راجھستان کا کالا ایلم......!

وہ کلاکار سی لڑکی سیاہ چندن کے کاٹھ کا تراشا ہوا ایک مجسمہ سی لگ رہی تھی۔ میں کئی مبہوت سے ساکت لمحے اس کے سر پہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ جھکا ہوا سر' دائیں ٹانگ تلے زانو اور پنڈلی کے درمیان

اس نے ڈھولک پھنسا رکھی تھی۔ یہ بھی ڈھولک یا تال بجانے کا ایک خوبصورت سا انداز ہوتا ہے' اس طرح ڈھولک پہ پوری طرح گرفت رہتی ہے' بے جا آگے جھکنا نہیں پڑتا...... ڈھانی اوڑھنی' پیشانی سے آگے آنکھوں تک پڑی ہوئی تھی جیسے اُس نے اپنی صُورتیا کو قدرے لُکانے کا جتن کیا ہوا ہو۔ لڑکے اور لڑکی کے درمیان پیچھے ایک بڑے سے سر والا بچہ بیٹھا کانچ بجا رہا تھا۔ بس' یہ دو یا سوا دو افراد! میں اس کالی کلوٹی' پُراسرار سی لڑکی کے ڈھولک بجانے کے اس دلفریب سے انگ میں ایسا مگن اور مسحور ہوا کہ مجھے ''سُبحان اللہ'' کہنا بھی یاد نہ رہا۔ قوالی کے موقعوں پہ ایسے حال یا ایسی ہی کچھ حرکتیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں کہ کسی شعر' کلام' مضمون' لے ردھم کے آہنگی جادو یا پھر گانے والے کے انداز' آواز کے اثر سے سامعین میں کچھ لوگ بے خود سے ہو جاتے ہیں' ان میں اکثر ڈرامہ کرتے ہیں اور کچھ واقعی ایسے ہو جاتے ہیں اور پھر دیکھا دیکھی اور خربوزے بھی رنگ پکڑتے ہیں۔ قوال ایسے موقعوں کی تاک میں ہوتے ہیں' خوب لوگوں کو جذب و حال میں لا کر پیسے نکلواتے ہیں...... میں بھی چھوٹی بڑی ریزگاری ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس لڑکی کے سر پہ کھڑا دھیرے دھیرے نچھاور کر رہا تھا جبکہ میں عام حالات میں ایسا کرنا پسند نہیں کرتا لیکن میری تو مت ہی ماری گئی تھی۔ کالا رنگ میری کمزوری اور طاقت' دونوں کیفیتوں میں ہے۔ اس کالی کستوری نے مجھے مسحور کر دیا ہوا تھا۔ دونوں وجاہت صاحب اور نیئر مصطفےٰ بھی میرے ساتھ کھڑے پیسے نچھاور کر رہے تھے......

''مہاراج موڑے کھواجہ گریب نواج
بگڑے بنا دو سارے کاج موڑے
کھواجہ گریب نواج ....!''

بڑا لڑکا اور پیچھے معصوم بچہ دونوں گلے پھلا پھلا کر بار بار یہی تکرار کر رہے تھے۔ پھر یوں ہُوا جیسے سُر کی گرہ کُھل گئی...... بات لڑکی کے کالے سراپے اور ڈھولک بجانے کے منفرد انداز سے شاید کہیں آگے نکل گئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہ رہا کہ کیا ہوں' کہاں ہوں اور کیوں ہوں؟ روپے روپے والے نوٹ جو ڈھولک کے بار بار گرنے والے سَم کے ساتھ اک ردھم سے اُنگلیوں کی گرفت سے نیچے گر رہے تھے' ختم ہو گئے...... میرا ہاتھ اندرونی جیب میں گیا اور بہت سارے نوٹ لئے ہوئے لوٹ آیا' چھوٹے بڑے بہت سے نوٹ جو میگھا کی مانند برس رہے تھے......

''بگڑے بنا دو سارے کاج' موڑے گریب نواج
مہاراج' موڑے گریب نواج ......''

اَب پتہ نہیں تھا کہ کس کے بگڑے کاج بن رہے تھے؟...... عرض کرتا چلوں کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ اکنّی' دوئی' چوئی سے زائد کوئی کسی قوّال کو نہیں دیتا تھا۔ بندھا روپے کا نوٹ' قوّال کے خون کی گردش تیز کر دیتا تھا۔ سیٹھ مصطفےٰ علی تو سیٹھ آدمی تھا اور میرے مزاج اور پسِ منظر سے خوب واقف' اس نے تو مجھے روکنا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی اسے ایسی جرأت تھی مگر مولوی وجاہت علی کی تو آنکھیں چُندھیا گئیں کہ ایک معمولی سی حیثیت کے سواد وانا ڑی سے بچّی بچّے جو زیادہ سے زیادہ دو چار روپے کے لائق تھے' سینکڑوں سے آگے ہزاروں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس نے بڑے ڈھب اور نامحسوس طریقہ سے مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر دھیرے دھیرے پگ پگ واپس کھینچتے ہوئے اپنی جگہ پہ لے جا کر بٹھا دیا۔ اس سے پہلے کہ مولوی وجاہت علی ان قوّال بچوں کو رخصت کے لئے اپنا مخصوص اشارہ دیتا' وہ بیچارے بچّے اتنے ڈھیر سارے نوٹ دیکھ کر بے ہوش ہو چکے تھے لڑکی بجائے نوٹ سمیٹنے کے وہیں بے سکت وسمت سی بیٹھی تھی۔ میں کوئی ایسا بھی بے سُدھ نہیں ہوا تھا کہ انگ سنگ کی خبر نہ رکھتا ہو۔ بس یونہی' ہلکا سا ''بگڑے بناؤ سارے کاج' مورے گریب نواج'' میں اٹک سا گیا تھا۔ کچھ لڑکی کی ڈھولک نوازی کا برت بھاؤ اور کچھ اپنے کالے رنگ کی رمیا سمیا کہ بُدھ بُدھ کا بدھیان ذرا اُلجھ سا گیا تھا...... درگاہ کے متعین خادموں نے وہ ریزگاری اور نوٹ رنگوں کی جھولی میں ڈال دیئے وہاں اب ایک نئی ٹکڑی جمے ہوئے رنگ کو پکڑنے بیٹھ چکی تھی مگر اُڑتے ہوئے رنگ اور پرندے کو پکڑنا اگر ایسا ہی آسان ہوتا تو اکثر مشکلیں' مشکل نہ رہتیں کسی معصوم بچّے کی نیند کی مانند اب میرا مزہ سواد بھی اُچٹ سا گیا تھا لہٰذا میں اور مصطفےٰ علی' دونوں قوالی پنڈال سے اُٹھ کر وضو والے حوض کے کنارے املتاس کے جھاڑ کے نیچے آ براجے۔ سر میں ہلکے ہلکے درد کا دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور آنکھیں یوں چُندھیائی ہوئی سی کہ جیسے ویلڈنگ کا آرک دیکھنے سے ہو جاتی ہیں۔ مصطفےٰ علی اپنے زانو پہ میرا سر رکھے ہولے ہولے داب رہا تھا' مُنہ نیم وا اور آنکھیں بند۔ املتاس کے چھدرے جھاڑ سے سورج کی کرنیں میرے چہرے پہ پڑ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی تمازت' پولی پولی پوروں کا دباؤ' اِدھر نئے بیٹھنے والوں نے خسرو رنگ اور پوربی انگ میں کوئی قلبانہ بانی چھیڑی ہوئی تھی......

''مورے رنگریجوا نے رنگ دی چُنریا دھانی

نجام الدین اولیاؒ، معین الدین خواجہؒ نے رنگ دی چُنریا دھانی......''

وہ دھانی چُنریا والی' ڈھولک نواز کالی شا کالی لڑکی پھر جیسے میری ناک کے بانسے پہ آ بیٹھی۔ ناک کی جڑ یا بانسے پہ بیٹھی ہوئی مکھی دکھائی نہیں دیتی مگر محسوس بہت زیادہ ہوتی ہے' میں ایسے ہی بڑبڑایا۔

''یار مصطفیٰ! اسے ہٹاؤ......''

''میں کیسے ہٹاؤں؟...... یہ تو ایسے بیٹھ گئی ہے جیسے کبھی کسی کی کوئی بات دل میں بیٹھ جاتی ہے۔''

اس پتھروں کے پارکھ کی زبان سے خلاف توقع ایسی مرصع اور مجلّی بات کان میں پڑی تو حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں...... اب کیا دیکھا کہ وہ راجستھان کا ''کالا ایلم'' میرے پاؤں کے پاس بیٹھی تھی جبکہ اس کے دونوں ساتھی پیچھے سہمے سے بیٹھے' چھٹی چھٹی کجریلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اب غور سے لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس نے راجستھانی انداز میں ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا جبکہ اس کی عمر ابھی گھونگھٹ نکالنے کی نہیں تھی۔ یہاں کچھ قبائل میں کنواری کنیائیں چھوٹا سا گھونگھٹ ضرور نکالتی ہیں اور کچھ قبائل میں بیاہتا استریاں لمبا سا گھونگھٹ گراتی ہیں مگر یہ تو ایک بالڑی سی تھی......

دھانی اوڑھنی کی گوٹ کے نیچے اس نے کانپتے تھرتھراتے ہوئے شاکالے ہونٹ دکھائی سے دیئے۔ رنگ تو اُجالوں اور روشنیوں میں نکھرتے اور اُبھرتے ہیں' رات اور رات کے اندھیرے تو زندگی اور زندہ رنگوں کے سارے ترنگ و ترارے تلف کر دیتے ہیں۔ سیاہ رنگ کے علاوہ سب ہی رنگ' رنگوں کو اُجالتے اور نکھارتے ہیں اور کالا رنگ ساتھ ملتے سارے رنگوں کو بھی سیاہ کر لیتا ہے...... ایسے سیاہ ہونٹ شاید ہی میں نے پہلے کہیں دیکھے ہوں...... پیچھے سے شاید اس کے ننھے ساتھیوں نے اسے ٹہوکا دیا تھا کہ اُس نے شاکالے مگر خوبصورت سے دُبلے پتلے ہاتھ بڑھا کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں یوں اُچھلا جیسے وہ دو ہاتھ نہ ہوں' دو کالے ناگ ہوں۔ وہ پیچھے سرکتی ہوئی ہاتھ جوڑ بیٹھ گئی' ان بچوں نے بھی ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ میں اب سنبھل کر باقاعدہ بیٹھ چکا تھا۔ ایک نظر مصطفیٰ علی خان کو دیکھا' آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ یہ سب کیا ہے؟ اس نے بھدے سے شانے اُچکاتے ہوئے خاموشی کی زبان سے کہا' میں کیا جانوں؟...... چند لمحے یوں ہی گومگوئی میں گزر گئے' اچانک پیچھے سے لڑکے نے لڑکی کے کان میں کوئی سرگوشی کی تو لڑکی نے گھاگرے کے اندر سے ایک پوٹلی نکال کر میرے آگے رکھ دی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''مہاراج! ہم گریبوں کو اتنا ہی دیو جتنا ہم اپنی چھٹی چنریا کے کونے میں باندھ لیویں' جتنا ہم ایک بکھت میں کھالیویں......'' وہ میرے دیئے ہوئے روپوں کی پوٹلی کو کانپتے ہاتھوں سے مزید آگے میری طرف سرکاتے ہوئے بولی۔ ''مہاراج! انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیو' کسی اور گریب جرورتمند کو دے دیو' ہمکن اس کی جرورت ناہیں......''

بات کرتے سمے میں نے اُس کی سفید دانت اور لال زبان کی نوک دیکھی۔ چھوٹا سا دہانہ اور

کٹھل آم کے نیچے کے حصے کی مانند ننھی سی ٹھوڑی...... وہ میری نظروں کی تاب نہ لا کر گھونگھٹ مزید گہرا کرتے ہوئے سمٹ سی گئی۔ میں اب بھی اُسے' کبھی بچوں اور کبھی روپوں کی پھولی ہوئی پوٹلی کو دیکھ رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو یونہی پوچھ بیٹھا۔

''کنیا! تمہارا نام کیا ہے......؟''

وہ کیا جواب دیتی' اُس کی بجائے پیچھے بیٹھے ہوئے بڑے لڑکے نے اپنا سوکھا حلق تر کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مہاراج! یہ میری پتنی رُکمنی ہے اور میں اِس کا مرد راکھن ہوں...... یہ میرا چھوٹا بھیا روپھن ہے۔ ہم پانچ کوس پچھم شاطیر میں رہت ہیں...... سکروار کے روج آزمیر سرپھ' گریب نواج آوت ہیں' دو چار روج یہاں رہت ہیں پھر گریب نواج کی اپھیر باد لے کر اپنے گوڑ واپس لوٹ جاویں ہیں......''

میں آنکھیں پھاڑے' گھونگھٹ کاڑھے ہوئے رُکمنی اور اُس کے پیچھے چوہے کی مانند چھپے ہوئے اُس کے مرد راکھن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے مصطفٰے خان کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا' وہ بھی دیدے لگائے چھنگلی برابر خاوند اور بالشت بھر کی بیوی کو تک رہا تھا۔ خیر' کوئی ایسے تعجب اور اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ہندوستان میں اب بھی بہت سے علاقے موجود ہیں جہاں بچپن میں ہی انتہائی بے جوڑ' بے تکی شادیاں کر دیتے ہیں یا پھر کہیں مجبوری اور کوئی اَشد ضرورت بھی آڑے آ جاتی ہوگی۔ تعلیم و ہُنر حاصل کرنا تو ان لوگوں کے نزدیک محض وقت برباد کرنے والی بات ہوتی ہے' اپنے موروثی کام دھندے ہی سیکھتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ وہ سیکھے سکھائے ہوتے ہیں' وہی گھسی پٹی ایک ہی ڈگر پہ رواں دواں سی زندگی۔ پھر ان کے ہاں ماضی' حال' مستقبل یا بچپن' جوانی اور بڑھاپے کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے کوئی معنی ہوتے ہیں' یہ صرف حال میں جیتے ہیں۔ ان میں صرف نقر' ایک ہی ڈگر' ڈھور ڈنگر اور مسلسل سفر ہوتے ہیں...... اچانک مصطفٰے علی خان نے ایک مضحکہ خیز سا سوال داغ دیا۔

''تمہارا کوئی بچہ وچہ بھی ہے......؟''

راکھن نے بنا کسی تذبذب یا کچھ محسوس کیے ہوئے تُرت جواب دیا۔

''مہاراج! ہمارا لگن تو جنم سے ہی ہو گیا تھا پر ابھی رُکمنی جورو بن کر میرے ہاں ناہیں آئی۔ ہم گاتے بجاتے ایک سنگ ہیں پر ابھی اکٹھے رہت ناہیں ہیں......''

یہ سوال جواب سُن کر میں پانی پانی ہو رہا تھا۔ مصطفٰے علی کو گھور کر دیکھا' اِس کاروباری سیٹھ نے تو اپنے تئیں ایک سیدھا سادا سا سوال کیا تھا لیکن اِس مکالمہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ راکھن واقعی ایک مرد بچہ

ہے...... میرے دیئے ہوئے روپوں کی پوٹلی میرے سامنے دھری سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ دی ہوئی چیزیں از قسم دل' درد' داغ' دم' دُعا' دلاسا' دان اور دام دمڑی وغیرہ کا واپس لینا شاید ممکن نہیں ہوتا اور نذر نیاز میں دیا ہوا واپس لینا تو کسی طور پہ بھی نہیں بنتا...... میں اس شش و پنج میں تھا کہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کروں جو یہ رقم انہیں قبول کرنے پہ آمادہ کرسکوں۔ پھر یہ حیرت بھی ابھی تک نہیں ٹوٹی تھی کہ اس قبیل کے لوگ جن کی بسر اوقات ہی نذر نیاز' انعام بخشش پہ ہوتی ہے' اتنی بڑی رقم جو ان کی مہینوں کفالت کرتی' واپس لوٹا رہے ہیں۔ بظاہر یہ کام ایسا آسان نہ تھا۔ یہ انداز فقیری' بے نیازی اور ایسا کلیجہ جگرا یہ دو' سوا دو صحرائی بچے جنھوں نے دہلی' جودھ پور' جے پور تو کیا' اجمیر شریف بھی ابھی ٹھیک سے نہیں دیکھا ہوگا' ایسا حوصلہ' ایسی شان استغناء رکھتے ہیں...... میں نے چند ثانیے غور کرنے کے بعد پوٹلی کو لڑکی کی جانب سرکاتے ہوئے کہا۔

''کُنیا' یہ آپ لوگوں کا انعام ہے اور پھر یہ خواجہ غریب نواز کی سرکار ہے اور سرکار جو دلوا دے اُسے واپس کرنے سے توہینِ دربار کا ارتکاب ہوسکتا ہے لہٰذا تم یہ پوٹلی اُٹھاؤ اور موج کرو...''

کستوری کی گٹھڑی میں تو کوئی جنبش [illegible] ملنگ نما مرد پھر ہاتھ باندھے آگیا ہوا۔

''مہاراج! سیوکوں کو روپلی' دو روپلی سے جیادہ لینے کا کوئی ادھیکار نا ہیں۔ کھواجہ گریب نواج کا لنگر پرشاد حاجر پیٹ بھرنے کے لئے ہوتا ہے' جیادہ لے جاویں گے تو پھر ادھر پلٹ کر کیسے آویں گے......؟ ہم نے اپنا محنت مجوری دو تین روپلی لے لیا ہے۔ آپ نے دیا اور کا بہت بہت دھنے باد......!''

وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر سیس نوائی کر رہا تھا۔ اب میں نے جیسے ایک اور پینترا بدلا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ' راکھن! تمہارے ہاں اَستریاں اپنے مردوں کے سامنے بھی یہ لمبا سا گھونگھٹ کاڑتی ہیں یا صرف دُوجوں' پرائے منشوں کے لئے ہی ایسا کرتی ہیں؟''

ساتھ ہی سیٹھ مصطفےٰ علی نے بھی سوال داغ دیا۔ ''......اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ پرائے منشوں کے سامنے بولتی بھی ہیں یا کہ نہیں کیونکہ ہر بات کا جواب تم ہی دیتے ہو......؟''

راکھن تھوڑا سا سرک کر آگے بڑھ آیا' اس کے ہاتھ ابھی تک اسی طرح جُڑے ہوئے تھے یا پھر اس کی ایسی عادت سی بن گئی ہوئی تھی' ویسے بھی وہاں کے کم ذاتوں اور طبقاتی ذات پات کے لحاظ سے ایسے چھوٹے لوگوں کا انداز ہی ایسا ہے۔ لجاجت' عاجزی۔ سہما سہما سا رہنا' حیثیت والوں کے آگے اکڑوں سر جُھکا اور ہاتھ باندھ کر رکھنا' آنکھ نیچی رکھ کر مختصر سا جواب دینا۔ دُرویشوں میں بھی ایسی خطرناک قسم کی

عادتیں پائی جاتی ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس قسم کے لوگ ہی دھرتی کا جوہر ہیں جو اگلے کو مان مہانتا دے کر خود جوتوں کی خاک سے ملے رہتے ہیں۔ میری کمزوری سمجھ لیں کہ ایسے غیر معمولی' عجیب وغریب اور اچانک رونما ہونے والے حالات اور واقعات میرے اندر ایک نامعلوم سی ایمرجنسی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں ظاہری و باطنی طور پہ الرٹ سا ہو جاتا ہوں۔ مجھے کھٹک جاتی ہے کہ اب کہیں نہ کہیں کوئی غیر معمولی معاملہ' واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے...... لڑکے نے جواب دیا۔

''ہمن گریبوں' گم جاتوں کے پلے کوئی رتن جتن تو ہووے ناہیں جو ہم گھونگھٹا کی آوٹ بوٹ چھپاویں اور ناہیں ہمن کوئی باتوں کی بدیا آوے جو بتر بتر بولیں......'' وہ لڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہماری جورو کی مشکل بپتا ہی ایسی ہے جو وہ گھونگھٹا لپیٹے رکھے ہے......''

مصطفےٰ علی خان نے لڑکی کی جانب پھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کنیا کالی اور کم بن ضرور ہے مگر ایسی خراب شکل کی بھی نہیں جو ہر سمے ڈب کی مالا جپتی رہے اور لمبا سا گھونگھٹ کھینچے پڑی رہے...... ابھی یہ بالک ہے' کوئی بڑی بھورانی نہیں......''

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پر یہ اس گھونگھٹ کا کارن اس کا کالا روپ ناہیں' کچھ اور ہے۔''

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا...... ہائے ہائے! ایسا چمتکار جیسے رادھے شیام اور رادھیکا شیام کا مکھ نماس کر دیا ہو۔ وہ موٹی موٹی' بھاری پپوٹوں والی آنکھیں' میوٹے' کالے کو ہو کا تراشا ہوا اک مجسمہ۔ بالکل گم سم سادھے سی بیٹھی تھی جیسے اُسے ہماری موجودگی اور گفتگو سے کوئی سروکار نہ ہو۔ دونوں ابروؤں کے درمیان بڑی سی بندیا' پچنے ہوئے ماتھے کے دونوں اطراف لٹکی ہوئی بالوں کی مینڈھیاں' راجستانی کٹار کی مانند خمدار ناک اور دونوں نتھنوں میں موٹے موٹے چاندی کے بلاق اور دائیں جانب کے بلاق کے عین بیچ وہی میری جستجو' ابابیل کا آنسو' الوری کچے فیروزے کی کنی...... مٹی' میل کچیل میں ایسی دبی پھنسی ہوئی کہ اگر میری نگاہ کی تیز تیکھی انی اسے کرید نہ پاتی تو میں ہرگز اسے کھوج نہ پاتا۔ میرے اندر تو جیسے دل سے کھڑکنے شروع ہو گئے تھے۔ میری نگاہیں اس معصوم کالی پری کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں جس نے پاس ادب یا فرط حیا سے ابھی تک آنکھ اٹھا کر ایک نظر بھی ہماری جانب نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے کان کئی جگہوں سے چھدے ہوئے تھے' چاندی کے ننھے ننھے موگرے اور اونٹ کی مونچھوں کے بالوں کے کنڈل کڑے پہن رکھے تھے۔ راجستان میں بالڑی ہو یا عورت' یہ روایتی اور قدرتی ہار سنگھار افریقی قبائل کی طرح بچپن سے ہی کرا دیا جاتا ہے۔

مجھے اس طرح لڑکی میں گم صم دیکھ کر مصطفےٰ علی خان نے ایک کھنکارا لگایا۔ کسی سوچ یا خیال میں

کھویا ہوا کوئی شخص کھنکارنے سے واپس آ جاتا ہے مگر کسی کی ذات' بات یا اپنی مات کے کنویں میں ڈوبا ہوا شخص کسی کھنکار سے باہر نہیں نکلتا۔ مصطفےٰ علی خان جب اپنے کھنکار سے میری محویت توڑنے میں ناکام رہا تو اس نے میرے گھٹنے کو ذرا زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب! اب اس روپوں کی پوٹلی کا کیا کرنا ہے......؟''

میں نے سُنی' اَن سُنی کرتے ہوئے مصطفےٰ علی خان کی بات کا جواب دینے کی بجائے لڑکی سے کہا۔

''کنیا! ذرا میرے قریب ہو جاؤ......'' وہ اسی طرح سر نہوڑے پتھر کی سِل ذرا آگے سرک آئی۔ میرے اور اس کے درمیان بازو بھر کا فاصلہ رہا ہو گا۔ میں نے بن آنکھیں جھپکے اس سے کہا۔

''اپنا مُکھ اوپر اُٹھاؤ اور میری جانب دیکھو......''

● کستورا بلّی مسک پوٹ کی جھلّی......!

اس نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا۔ اس کی برقی ابرکی سفید پتلیاں سکڑتی' پھیلتی اُفقی جوت لئے میرے سامنے میرے اس خیال کی تائید کر رہی تھیں جو اُس کے قریب آنے سے میرے دل میں اُبھرا تھا کہ اس کالی موشی دال میں کوئی چنا ضرور ہے جیسے میری چاچی برکی کبوتری' چاچا اصیل مُرغ اور میں موصلی کا گا اور جس طرح ہر ذی نفس کسی نہ کسی درندے' پرندے' چرندے' حشرات الارض' مخلوق البحر' نباتات' جمادات' معدنیات' فلکیات سے جبلی یا سرشتی طور پہ متشابہ و مبعوث ہے اور اسی طرح یہ کنیا بھی ایک کستورا بلی تھی...... کستورا گھوڑی' کستورا ہرنی' کستورا مُرغی' کستورا مچھلی' کستورا کونج' کستورا کوئل' کستورا خوش آہنگ چڑیا' کستورا ہفت رنگ تتلی' کستورا شب تاب' کستورا بلّی' القصہ۔ اسی طرح کستورا عورت بھی ہوتی ہے۔ ان سب ''کستورات'' میں تین اوصاف مشترک ہوتے ہیں۔ اول یہ کالی شا کالی ہوتی ہیں۔ دوم' ان کی آنکھیں برقی' ابرکی جھلمل جھلمل سُکڑتی پھیلتی اور سفید اُفقی جوت لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ سوئم یہ نایاب ہوتی ہیں' کسی قسمت والے کو کہیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خفتہ علوم کے عاملین اور عالمین کے لئے یہ خاصے کی چیز اور نوری علوی علوم والوں کے لئے یہ سعد اور خیر و برکت آمیز ہوتی ہیں جبکہ سفلی اور ابلیسی استعانتوں کے حامل اور کالا ایلم کے معتقدین اور عاملین ان سعید سرِی صفات و اثرات والی مخلوق کو ابلیسی زبروجد سے اُلٹ پلٹ کر مکروہ اور منفی نتائج و نیابت کے لئے استعمال

کرتے ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ کالا بکرا' کبوتر' مُرغا' ماش کی دال' بال' دھاگا' چمڑا' کاغذ' کپڑا وغیرہ' ان جنسوں کو اچھے بُرے دونوں طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کو وہ کالی شا کالی' عجیب وغریب سی بلّی بھی یاد ہوگی جو کبھی جبل پُور کی جمنابائی کی پُراسرار حویلی میں ''میاؤں میاؤں'' کی بجائے ''مَن آنم' مَن دانم'' کرتی ہوئی مجھے اپنے ساتھ اندر لے کر گئی تھی' وہ بھی ایسی ہی کستورا بلّی تھی۔ بلّی' کتّا' گھوڑا' کوّا' ان چاروں کی بصارت کے چار پردے ایسے ہی ہٹے ہوتے ہیں جو انسانوں کی آنکھوں پر عام طور پہ پڑے ہوتے ہیں۔ غیر مرئی' عنصری' ہوائی' آتشی اور افلاکی مخلوق ان کو دکھائی دیتی ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ (غور کریں یا نہ کریں) گھوڑے' کُتّے' بلّیاں' کوّے اکثر کسی نہ کسی' نہ دکھائی دینے والی چیز سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ خود بخود ہنہنانا' زور زور سے مختلف انداز سے بھونکنا' بلّیوں کا درد بھری آواز میں رونا چیخنا اور کوّوں کا بے چین ہو کر ادھر اُدھر اُڑنا' کائیں کائیں کرنا' یہ سب بے محل نہیں ہوتا اور اگر یہ چاروں جانور کستورے ہوں تو ان کی غیر معمولی بصارت کے علاوہ ان کی دیگر حسیات اور قویٰ' قوت کی قدرتیں بھی چہار چند ہوتی ہیں۔ یہ ماورائے فطرت وعادت بھی کارِ اظہار پہ قدرت رکھتے ہیں۔ مثلاً غائب ہو سکتے ہیں' اُڑ اور تیر سکتے ہیں' انسان کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں' اپنی ہیئت اور آواز تک بدل سکتے ہیں۔ سیدنا آدم علیہ [illegible] کو ابلیس [illegible] آدم کے ہمدم مونس اور رفیق بن کر ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ صحیفے' کتابیں' روایتیں' قصے کہانیاں ان کے اذکار سے خالی نہیں۔ ان جانوروں نے امرِ الٰہی سے رہبری' معاونت' حفاظت' رفاقت' یعنی ہر طرح سے بنی نوع انسان کی خدمت بجالائی۔

وہ کنیا بھی جیسے چوکنّی سی ہو گئی تھی۔ بالک ہو یا جوان' ہر کسی کو اپنی باطنی اچھائی بُرائی کا مکمل ادراک ہوتا ہے مگر کوئی نہ کوئی محرومی' کمزوری آڑے ہوتی ہے کہ وہ برمحل اور برملا اظہار نہیں کر پاتا۔ جیسے کسی انتہائی تجربہ کار عادی چور کے رُوبرو اگر کوئی چھوٹا سا بچہ' جو صرف گھر اور مسجد میں ہی پیسے ٹکے کی چوری پہ ہاتھ سیدھا کرتا رہا ہو' آ جائے تو وہ دونوں ہی پہلی نظر میں ایک دوجے کو پہچان جاتے ہیں اور آمنے سامنے اپنی اپنی ''ہسٹری شیٹ'' ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں بالکل ایسے ہی وہ بھی چندی چندی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''چندی چندی'' اس لئے لکھا ہے کہ یہ چاروں جانور جو انسان کے بغیر نہیں رہ سکتے' انہیں سورج کی کھلی روشنی میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ نجاسروں اور ملہموں کی مانند یہ بھی روشنی سے بیزار ہیں' پیٹ کا پاپ اگر ساتھ نہ ہوتو یہ سب ہی چمگادڑوں اور ابابیلوں کی مانند سورج کی چکاچوند روشنی کے سُرمئی ملگجے میں تبدیل ہونے تک کسی گوشۂ تاریک میں پڑے رہیں...... اس ارتکازِ نگاہی میں وہ مجھ سے بھی دو آنکھیں آگے نکلی۔ میں تو تھا ہی پرانا پاپی' ایسے دل ونگاہ کے کھیل' کھیل

کھیل کر مجھے تو کھلیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن وہ بھی جیسے نگاہ نوردی میں میرے مقابلہ پہ اُتر آئی تھی۔ اب نہ میں آنکھ جھپکوں اور نہ وہ نظر نیچی کرے۔ وہ تو تھی کستورا بلّی! نگاہ کے قوس کو سکیڑنا' پھیلانا اس کے لئے چنداں مشکل نہ تھا اور پھر بلّی کی آنکھ کی پُتلی میں جو اُفقی جوٗ جوت ہوتی ہے وہ انسانی آنکھ کے نور نقطے کی طرح نہیں ہوتی۔ کہاں پہلے کہ وہ گھونگھٹ تک نہ اُٹھائے اور کہاں کہ وہ دیکھتے ہوئے پلک تک نہ جھپکائے...... کیا شعر یاد آیا ہے...... ؂

شرم مانع تھی فقط بندِ قبا کُھلنے تک
اس کے بعد وہ جانِ حیا ایسا کُھلا' ایسا کُھلا

میں نے سوچا کہ بچّوں سے مقابلہ اچھا نہیں ہوتا اور جانتا تھا کہ راجھستانی ٹھاکر راجپوت تو خیر راجپوت ہیں' یہاں ان ٹھاکروں کے تیرے بھی ٹھوک ٹھام کے معاملے میں ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہاں کے ناآسودہ موسم' صحراؤں کی سفاکیاں' معاشرتی سماجی سنگدلیاں اور ناہمواریاں بھی ان کے حوصلوں' ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتیں اور نہ ہی ان کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتی ہیں اور نہ ان کی اٹھی ہوئی نگاہوں کو جھکا سکتی ہیں۔ ان کی وفاداری بشرطِ استواری اور دشمنی بھی غداری نہیں ہوتی...... اسی لمحہ ایک دم مجھے خیال ہوا کہ وہ تو اپنی قفسک کر رہی ہے نین سے نین ملائے رکھے دو...... نین سے نین...... میں نے یونہی اسے ایک میسج دیا...... بغیر آنکھیں جھپکائے یا ہٹائے اُس نے مردنگ کھینچ کر ٹانگ کے نیچے دبائی' ہارمونیم سے خالی وہ محفل ردھم پہ ہی شروع ہوگئی...... ؂

''ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم ایجاں' نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں''

اس کے مردنگ کھن نے بندھا ہوا باجا نکال کر سُر پہ اُنگلی دھر دی اور ساتھ چھوٹے روپچھن نے تالی تپا کر گلے کی رگیں پھلائیں۔ امیر خسروؒ کا کلام' راجھستانی لب و لہجہ' غلط تلفظ مگر سُر اور عقیدت و اخلاص کی آمیزش نے ایک سماں باندھ دیا۔ رُکمنی کے ہاں جیسے برسات کُھل گئی تھی' آنسو دھارا ٹپ ٹپ اس کے گھٹنے پہ گر رہی تھی' تب میں نے شہادت کی اُنگلی نچا کر نگاہوں کی بندھی تار کو توڑ دیا اور اس نے دھامے پہ جو تابڑ مارا تو ہاتھ پھٹے ہوئے بڑے کے اندر دھنس گیا۔ وہ بائیں جانب لُڑھک سی گئی تھی...... دائیں نتھنے میں پڑا ہوا چاندی کا بڑا سا بلاق' قطبی تارے کی طرح میرے آگے روشن تھا۔ نازک

سی ناک' چھلکے سا نتھنا اور بھاری سا بلاق بلکہ ایک کی بجائے دو مگر وہ میلا مدھم سا فیروزہ ناک کی سیدھی جانب ہی تھا۔ رُکمنی کے یوں ڈھنے سے اس کا چھوٹا سا بالموا راکھن گھبرا سا گیا' آگے جھک کر اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

"اے رُکمنو! سُدھ پکڑ ری......"

وہ رو دینے والی شکل بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' اس کے مُنہ پہ پانی کے چھپاکے مارو' ابھی ہوش میں آ جائے گی...... وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"مہاراج! رُکمنی کو کیا ہو گیا ہے......؟"

"اسے امیر خسرو نے پکڑ لیا ہے...... دھیرج رکھو' ابھی چھوڑ دیں گے۔ بس ایک دو پانی کے چھپاکے اس کے مُنہ پہ مارو۔"

پاس ہی پانی کا حوض تھا' راکھن نے پانی لے کر ایک دو چھپاکے اس کے چہرے پہ پھینکے۔ بے ہوش تو وہ نہیں ہوئی تھی' بس نین ملا کر اور خسروؒ کو گا کر ذرا گیلی ہو گئی تھی۔ سُر اور سخن جب لڑ جاتے ہیں تو سُدھ [illegible] جاتی ہے۔ منتشی [illegible] اِن کی [illegible] ٹنگے ہوئے پُرآب چشمے اور نمکیدہ قلمیدہ کٹوری بھرے اپنے بند کھول دیتے ہیں پھر آنکھوں کے ڈیموں کے ڈیموں سے ٹپ ٹپ شروع ہو جاتی ہے۔ کسی مخصوص مغنی' سخن گو یا خوش لحن کلام پڑھنے والے پہ ہی شاذ و نادر ایسی کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب وہ کسی صاحبِ جذب و نظر اور سخن و فکر کے رُوبرو اکٹھے سُر سُر کیے اور سانسوں کا سُرمنڈل ملائے بیٹھا ہو...... پانی کا چھپا کا پڑتے ہی رُکمنی نے شاید کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ شا کالی رنگت والے لوگوں کے ہونٹ بھی کالے شا ہوتے ہیں جبکہ اندر مسوڑے اور زبان سُرخ ہوتی ہے' ایسے لوگوں کے دانت بڑے اُجلے ہوتے ہیں سپید نُچے موتیوں کی سی آب و تاب والے' اس کے دانت بھی ایسے ہی نُچل تھے مگر جب اس کی کالی زبان پہ نظر پڑی تو میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ اس کی زبان "اُدھام کھی" تھی۔ ایسی زبان کا آگے نوک والا حصہ سُرخ اور باقی تمام سیاہ ہوتی ہے اور ایسی زبان والے لوگوں کو ہی "کالی جیب والا" کہتے ہیں۔ عام طور پہ مشہور یہی ہے کہ ایسے لوگوں کے مُنہ سے اکثر بدشگونی کی باتیں ہی نکلتی ہیں۔ وہ کوئی پیشین گوئی کر دیں تو وہ سچی ہو جاتی ہے یا ان کی بددعائیں کام دکھا جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ...... حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی زبان یا خاص جگہوں پہ کالے نشان' بالوں والے مسّے' خال اور تِل چٹے' سیاہ بالوں میں سفید بالوں کی لٹ' کھوپڑی پہ بالوں کی جڑوں میں مخصوص سے بھنور' پیدائشی مختون و مجرّد' دونوں ابروؤں کے درمیان رگِ ماہی' پیدائشی دانتوں بالوں اور ایسی ہی نشانیوں والے

لوگ عام لوگوں سے بہت مختلف اور پُراسرار سے ہوتے ہیں۔ ان میں یقیناً کوئی نہ کوئی ماورائی خوبی یا خرابی ہوتی ہے۔ کوئی چاند گرہن کی بندگرہ میں ہوتا ہے تو کوئی سورج گرہن کے سوبھ سمبندھ میں' کوئی ماں کے پیٹ سے ہی افلاکی گردشوں کے گرداب میں پھنسا ہوتا ہے تو کوئی زماں و مکاں اور وقت و سمے کی سَونت کَسَونت میں کسا ہوا ہوتا ہے۔ کسی پہ جنّات کا سایہ اور کوئی کسی نوری یا کالے ایلم کا شاخسانہ ہوتا ہے' کسی کی دُعا برکت والے اور کوئی کسی کی عطا بخشش سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اچھی رُو خصلت والے کستورے ہوتے ہیں اور بدبتر ے والے بدتُورے ہوتے ہیں۔ کستوروں سے کستوری کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور بدتُوروں سے بھُسے ہوئے بینگن کی بدبو آتی ہے۔ یہی خوشبو' بدبو ان کے سعد اور نحس ہونے کی ایک واضح پہچان ہے۔

یہ کنیا رُکمنی' بہ جبلّت و فطرت کستورا کربہ تھی اور اس کی اَدھنافی کتھی زبان اور اُفقی جوُ جوت والی آنکھوں سے یہ بھید کھلا تھا کہ اس کی جنم جڑ اس اَپدج سے پھوٹی تھی جب چندرما کو راہو نے آدھے تک پکڑ لیا تھا' اسی کارن ہی اس کا شُبھ نام رُکمنی رَتو ٹھہرا ہے۔ ایسی کنیا بڑی بھاگوان ہوتی ہے۔ جس انگ لاگے رُنگ لاگ۔ [illegible] ہاں' تو ابھی کچھ [illegible] چرتن [illegible] تھی کہ ابھی پوٹا میں بند رہ کر اپنی کایا کلپ کر رہا تھی...... میں نے پاس سے گزرتے ہوئے درگاہ کے ایک خادم سے تھوڑا سا لنگر منگوا کر رُکمنی' راکھن اور چھوٹے روچھن کو کھلایا' پھر چائے منگوائی۔ کھا پی کر میں نے محسوس کیا کہ اب یہ بچہ لوگ کافی سنبھل گئے ہیں' رُکمنی نُرت پکڑتے ہی پھر لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر بیٹھ گئی...... میں نے راکھن کو اپنے قریب کرتے ہوئے پوچھا کہ ہیتا فلانے' تمہارے پتاجی کیا کرتے ہیں؟...... بقول اس کے' اس کے پتاجی جے پور کے کسی محل میں جسے اب ہوٹل بنا دیا گیا ہے' طبلہ بجاتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ راکھن کی ماتا کے دیہانت کے بعد انہوں نے راکھن کا لگن رُکمنی سے کر دیا۔ راکھن کو ایک چھوٹی سی کنیا' مریل سی گائے' طبلہ' ڈھولک اور چند کپڑے دے کر وہ جے پور چلا گیا کیونکہ وہاں اس نے ایک چلاسن عورت سے جو ایک طوائف کے ہاں چولہا چوکا کرتی تھی' بیاہ کر لیا تھا اور اُس عورت سے اس کی ایک لڑکی بھی جنم لے چکی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی پتنی کے ساتھ اجمیر شریف ماتھا ٹیکنے آتا تو اپنے گاؤں کا چکر بھی لگا لیتا۔ بہو' بچوں کو کچھ کھانا پینا' کپڑا لتا اور دم تسلی دے کر واپس لوٹ جاتا...... اس نے اپنے طور راکھن کا بیاہ کر کے اپنی ذمہ داری سے فراغت لے لی تھی۔ اِدھر رُکمنی کی ماں بھی نہیں تھی' بوڑھا بیمار باپ آنکھوں سے محتاج تھا۔ جب تک پاؤں پہ کھڑا رہا' ان بچوں کے ساتھ گانا بجانا کر لیتا تھا مگر جب اُسے گنٹھیے نے لاچار کر دیا تو وہ اپنے جھونپڑے میں پڑا رسلوں اور ناگرہ گھاس سے کھلونے' پنکھے اور چٹائیاں بناتا رہتا۔ اُسے افیون

کھانے کی لت بھی تھی' اکلوتی بیٹی بیاہ کر وہ بھی نچنت سا پڑا ہوا تھا..... میں نے یونہی راکھن سے پوچھ لیا کہ تمہاری رکمنی دہیج میں کیا کچھ لائی؟..... وہ فر فر بولنے لگا۔

''میرے اور اپنے چار جوڑے کپڑے' جوتے' دو تیھی رجائی' دو ڈھیر بتاشے اور میٹھے چنے' بکری' ڈھولک' چاندی کا مُکٹ' مالا' جھانجھر اور ناکو کا بلاق.....''

پیچھے سے روچھن نے پہلی بار لقمہ دیا۔ ''دو روج بعد بکری کا دیہانت ہو گیا تھا.....''

راکھن اُسے اپنی کہنی کے ٹھوکے سے چپ کراتے ہوئے پھر کہنے لگا۔

''مہاراج! رکمنی میرے تاؤ کی چھوکری ہے' ہم ایک ہی جھونپڑے میں رہت تھے..... میرا جب جنم ہوا تو رکمنی سات برس کی تھی' مجھے گود میں ڈال کر کھیر کھلایا کرتی تھی.....''

پھر روچھن نے لقمہ دیا ''.....اور مجھے بھی.....''

ایسی ہی باتوں سے جب یہ بچے ذرا بے تکلف سے ہوئے تو میں نے اب رکمنی کے فیروزے والے بلاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بلاق تمہیں تمہارے باپو سے دہیج میں ملا تھا.....''

''ہاں..... وہ پھر بھو نے نین ملاتے ہوئے بولی۔ یہ میری میا کا بلاق تھا' اس کا دیہانت ہوا تو باپو نے میرے نکو میں ڈال دیا.....''

''.....اور یہ دوسرا بلاق.....؟'' میں نے اب بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میرے سسر جی نے لگن سے دیا تھا۔'' پھر وہ اپنے کانوں کی کڑیاں اور بازو کا جُھل دکھاتے ہوئے بولی۔ ''.....اور یہ بھی.....''

''اچھا! اگر تمہیں پتا ہو تو بتاؤ کہ تمہاری ماتا کو یہ بلاق کس نے دیا تھا؟'' میں نے بڑی نرماہٹ سے ایک اور سوال داغ دیا۔

''میری میا کو بھی یہ بلاق میرے باپو نے دیا تھا.....'' اُس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے فوراً جواب دیا۔

''تم یہ کیسے جانتی ہو.....؟''

''میری میا نے دیہانت سے کچھ روج پہلے مجھے کہا تھا کہ جب سے تمہارے باپو نے مجھے یہ بلاق پہنایا ہے' میں روگی ہو گئی ہوں' مو سے کسی پل چین ناہیں آوت ہے۔ میں جانوں کہ میں ناہیں بچوں گی..... اری' اس سنگوڑے بلاق کو میرے ناکو سے اُتار لے.....'' اتنا بتا کر وہ چپ ہو گئی۔

مَیں نے اس کے نین دَرشن میں دُور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''پھر تم نے اِسے اُتارا......؟''

''ناہیں...... مَیں نے ناتھو سے اُتارنا چاہا تو کھُون نکل آیا' میّا کو بہت دُکھن ہوئی تو مَیں نے چھوڑ دیا......''

وہ اپنی میّا کی بیماری اور موت کے متعلق بہت کچھ بولتی رہی مگر مَیں اب اِسے کانوں سے نہیں' آنکھوں سے سُن رہا تھا۔ اس نے تو جیسے میری آنکھوں میں اپنی کھُلی آنکھوں کے بھاری پپوٹوں والے خیموں کی طنابوں کے پلکیں پھانسے ٹھونک دیئے تھے' کیا مجال جو لحظہ بھر کے لئے آنکھ جھپکی ہو...... مَیں خوب جانتا تھا کہ وہ اِس طرح لنک لے رہی ہے۔ مَیں اس کی ننھی سی جان اور مختصر سی انجان زندگی میں شاید پہلا منش تھا جس نے اس کی آتما بھت جھانکا تھا۔ اس کو میری آنکھوں میں اپنی سکھ چھایا بلکہ اپنی ہی کام کایا دکھائی پڑتی تھی' آنند اور شانتی کی شالا ملی تھی۔ مَیں بھی خوش کہ چلو' بچی خوش ہو لے۔ تپتے جھلتے صحرا میں کسی پیاسے آبلہ پا بھٹکتے ہوئے مسافر کو اگر کسی مُردار اُونٹ کا سڑا ہوا ڈھانچہ سر چھپانے اور اس کا بدبودار گوشت' موت ٹالنے کو مل جائے تو وہ اسے بھی بہت بڑی نعمت سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ مَیں جو بھی تھا' اس کے [illegible] خواجہ غریب نوازؒ اور اُوپر اللہ سب دیکھ رہے ہیں کہ ہم دونوں بڑی محویت سے ٹکٹکی باندھے ایک دُوجے کے رُوبرو تھے۔ راکھن اور روپھن دونوں بیچے جمورے ہم دونوں کو بٹ بٹ دیکھتے ہوئے کسی خوشگوار انجام کے منتظر تھے کیونکہ ہمارے درمیان ابھی زدیوں کی پوٹلی مسئلہ کشمیر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ جناب مصطفےٰ خان صاحب تو خیر میرے بھید و تھے اور جانتے تھے کہ میرے ساتھ ایسے ٹیڑھے کھسونڈے اکثر و بیشتر ہوتے ہی رہتے تھے۔ ایسی ''وارداتوں'' میں وہ ہمیشہ چُپ شاہ بنے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی وہ اپنے کاروباری چہرے پہ بکمال متانت کا ماسک چڑھائے' کوّے اور بلّی کے درمیان بندر بنے بیٹھے تھے...... ہاں' مَیں نے انہیں بندر کہا ہے جیسا کہ ان کا جبلّی حیوان بندر تھا' سری لنکن باز جو بڑا خوبصورت' عام بوزنوں بندروں سے کہیں زیادہ عقیل وجمیل ہوتا ہے لیکن مَیں نے انہیں کبھی بتایا نہیں تھا۔ تول مول' بندر بانٹ' کاروباری ہوشیاری چالاکی' چاروں کھونٹ کی کمیتی چاتری' خود پسندی' بیوی کی بندگی' عیال داری کی رغبت وغیرہ غرضیکہ یہ جبلّی طور پہ ہمکنڈے کا ہنومان تھا...... بے ارادہ میرے منہ سے نکلا۔

''جب تم جانتی تھیں کہ یہ بلاق تمہاری میّا کے لئے اَشبھ تھا تو پھر تم نے اِسے کیوں پہنا......؟''

وہ بے حس سی بولی۔ ''کیا کرتی' میری میّا کی نسانی تھی...... ہمن لوگن میں ایسا ہی رواج ہے کہ

مری ماں میا کا جیور جھام گنیا پہنے یا پھر گھر کی بہو......؟"

مَیں نے اس کے بلاق کو اُنگلی سے چھُوتے ہوئے کہا۔

"اس کے اوپر اتنا مَیل جما ہوا ہے' کیا تم اسے صاف نہیں کرتی ہو' اور یہ اس کے بیچ کوئی نگینہ بھی دکھائی پڑے ہے...... جانتی ہو' یہ کیا ہے؟"

وہ اسی بے نیازی سے بولی۔ "ہمرا سارا جیون ہی مَیل کچیٹ ہے' ہمن کس کس کو پونچھ پانچھ کریں گے مہاراج! اور ہمرے جیوروں میں سیسے اور لاخ لوٹنے کے چتر کنچے ہوتے ہیں' ہیرے پھکرج نہیں ہوتے......"

باتوں ہی باتوں میں یہیں عصر کا وقت لگ گیا' آس پاس لوگ وضو کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ مَیں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "دیکھو گنیا! یہ روپے مَیں نے تمہاری نذر کئے تھے۔ اب یہ میرے نہیں' تمہارے ہیں۔ مَیں انہیں واپس نہیں لے سکتا...... بہتر ہے کہ تم انہیں اپنے پاس رکھو......"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "دھنے ہو' مہاراج! آپ دیالو ہیں اور ہم اُبھاری' اِتّے پیسے دان ہم لے کر جا نہیں سکتے۔ ہمن نے ٹوٹے ریج گاری لے لی ہے' باقی آپ رکھیو......"

اس نے پلّو [illegible] میری طرف کر دی۔ مَیں نے بات کو سمیٹ کر کہا۔

"کیا مَیں تمہارے گاؤں آ سکتا ہوں......؟"

رُکمنی کی بجائے اب رَاکھن نے جواب دیا۔ "جرور پدھاریے...... [illegible] یاں سے پانچ کوس ریڈومیر کے پاس ہے' بھلیاں اور موٹر بھی جاوے ہیں......"

"ٹھیک ہے' ایک دو روز میں ہم تمہارے گاؤں آئیں گے۔ رُکمنی کے باپو سے بھی ملیں گے اور تمہارا گھر بھی دیکھیں گے......" مَیں نے کہا۔

دو دن بعد ہم دونوں رَاکھن کے گاؤں پہنچے۔ گاؤں کیا تھا' تیس چالیس جھونپڑوں' چند ایک پتھر ریت سے کھڑی دیواروں' اوپر پوستین اور ٹین کی چھتوں پہ مشتمل ایک چھوٹی سی آبادی تھی' انسانی زندگی کی تمام تر بنیادی ضرورتوں سے یکسر خالی جیسے یہاں انسان نہیں' صحرائی بدروحیں رہتی ہوں۔ مریل سے مویشی جانور' اونٹ۔ افلاس زدہ بیمار بیمار' اَدبے اَدبے سے لوگ۔ یہ سب نیچ جات کے ڈوم ڈھاری تھے یہاں کے جنہیں اونچی جات اور کھاتے پیتے لوگ اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ ہم وہاں پہنچے تو گاؤں کے خاصے لوگ ہمیں دیکھنے اور ہمارے سواگت کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے' ڈھانچہ سی بکریاں اور جھلاوا سے میمنے' کتے۔ کچھ عورتیں' جو سروں پہ پانی کے مٹکے اُٹھائے

گھونگھٹ کاڑھے کہیں دُور سے پانی لے کر آ رہی تھیں۔ جھونپڑوں کے باہر بیٹھے ہوئے فارغ بوڑھے جو ناریل کی چلموں پہ دَم لگا رہے تھے' ہمیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑتے ہوئے ہمارے سواگت کے لئے آ گئے۔ سلام' پرنام کرنے کے بعد ہم نے رَاکھن اور رُکمنی کا پوچھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کوئی جواب دیتے' رَاکھن اور رَوچھن' ایک بوڑھے اندھے کو ساتھ لئے کہیں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ ان کے ساتھ کچھ نوجوان بھی تھے۔ رَاکھن نے شاید ہماری متوقع آمد کے متعلق گاؤں والوں کو پہلے سے ہی بتایا ہوا تھا' اُنہوں نے ہمیں ایک نسبتاً صاف ستھرے کشادہ سے جھونپڑے میں نیچے ریت پہ بچھی سرکنڈوں کی ایک چٹائی پہ بٹھایا۔ کچھ دیر بعد رُکمنی بھی یہاں پہنچ گئی' رَاکھن اور رَوچھن کے ساتھ رُکمنی کا اندھا باپو دِتّو بھی تھا۔ ہمارے سامنے سرکنڈوں کے چھاج میں کچھ پھل پیش کیے گئے' جو باسی اور داغدار تھے...... دِتّو' ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''مہاراج! آپ یہاں ہم گریبوں کے پاس پدھارے' آپ کا بہت بہت دھنے باد...... بالکوں نے بتایا تھا کہ آپ نے انہیں بہت سے روپے دیئے۔ مہاراج! ہم گریب چھوٹے لوگ [illegible] کو روپے پیسے سے جیادہ آپ کی دَیا چاہئے...... رَکھو اور رُکمنی [illegible] آپ [illegible] اور اونچے منش ہیں۔ ہمری [illegible] مہاراج! پوری رات سوتی ہے اور نہ ہی کچھ ڈھنگ کا کھاتی اوڑھتی ہے' ہر پَل آکاس کو گھورے رہت ہے۔ ہمری کھری بدھی میں تو یہ آوے کہ اس کا بھوت پریت سے [illegible] لاگا ہے......'' وہ بیس نوا کر پھر کہنے لگا۔ ''آپ لوگن گریب نواج کی مانت اور چاہت والے ہیں۔ ہمارے رَکھو اور رُکمنی کے لئے......''

مَیں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

''بابا! مَیں سمجھ گیا' تم کیا کہنا چاہتے ہو...... ابھی تو ہم اجمیر شریف سے آپ کا گاؤں دیکھنے اور تم کو ملنے آئے ہیں۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی' پہلے ذرا ٹانگیں اور دَم سیدھا کر لیں......''

اُنہوں نے اپنی بساط بھر خوب خاطر داری کی تھی۔ میٹھے باجرے اور بُھنے ہوئے چاولوں کے لڈو' صحرائی کھٹ میٹھے گہرے سُرخ رنگت بیر' کچھ باسی سیب' پلپلے سے سنگترے اور چھوٹے چھوٹے کھٹے اَنار۔ پھر کچھ بچوں بچیوں اور بڑوں نے اپنے اپنے انداز میں نعتیں' بھجن اور قوالیاں سُنائیں۔ گھنٹے دو گھنٹے کی پیٹ پیلا اور رام لیلا کے بعد جب فالتو بھیڑ چھٹی تو مَیں نے رَاکھن' رَوچھن اور رُکمنی کو بھی بہانے سے ٹہلا کر باہر بھیج دیا۔ مَیں' سیٹھ مصطفےٰ علی اور رُکمنی کا باپو ہی جھونپڑے میں رہ گئے تو مَیں نے اَندھے کٹھیا مارے دَم ذارو کے رَسیا دِتّو سے کہا۔

''بابا! اب ہم تینوں کے سوا اور کوئی منش یہاں موجود نہیں۔ ہمارے پاس سمے بہت تھوڑا ہے' ہم نے دیا جی کے وقت سے پہلے اجمیر شریف واپس پہنچنا ہے اس کارن ہمارے بیچ جو بھی بات چیت ہو وہ بنا کسی لگی لپٹی' سیدھی اور سچ سچ ہونی چاہئے۔ میں کچھ پوچھوں' تم چھپاؤ یا جھوٹ کہو تو نہ ہمارے ادھر آنے کا مقصد پورا ہوگا اور نہ ہی تمہاری کنیا رُکمنی کے لئے کچھ پراپت ہوگا...... یہ تو شاید تم نہیں جانتے ہو کہ رُکمنی کیسی اجیرنم میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کی کومل سی کایا کے سنگ کون سی کلپنا ایک اگیا بیتال کی طرح لگی ہوئی ہے۔ اگر تم میرے سوالوں کا جواب بالکل سچائی سے دو اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرو تو پھر شاید اس کے اُپائے کی کوئی صورت نکل آئے......''

میری یہ بات سُن کر بوڑھے دتّو کو تو جیسے جاڑے کا کانپا سا لگ گیا' مسلسل دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے وہ بے نور سے دیدے گھماتا ہوا چہرے کی عجیب عجیب شکلیں بنا رہا تھا' بڑی مشکل سے وہ بولا۔

''مہاراج! آگیا ہو تو میں ذرا باہر نکل کر دم دُرست کر لوں اور دم بھی لگا لوں ورنہ اس حالت میں میرے پران چھوٹ جائیں گے......''

میں نے اس کی دگرگوں حالت کے پیشِ نظر اسے باہر جا کر دم لینے اور دم لگانے کی اجازت دے دی' مجھے خوب اندازہ تھا کہ یہ بھی دتّو اپنے ضمیر کا مجرم ہے اور پھر اپاہج اندھا بوڑھا اور منشیات کا عادی! ایسے پاپیوں کو گھونٹ کے گھونٹے سے دم ماری کے بغیر کچھ اُگلوانا شاید کچھ ایسا آسان نہ تھا...... ٹٹول ٹٹول وہ باہر سرکنے لگا تو میں نے کہا۔

''رُکمنی کے ہاتھ پینے کے لئے پانی اندر بھجوا دینا......''

رُکمنی اُونٹ کی کھال سے بنی ہوئی بے ڈھنگی سی چھاگل میں پانی لئے ہوئے اندر داخل ہوئی تو خاصی بدلی ہوئی تھی۔ گھونگھٹ سے بے نیاز چہرہ' بشرے پہ بشاشت اور اعتماد۔ ایسا اعتماد اور وارفتگی جو کسی اپنے سے مل کر یا اس کی موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلتے ہوئے اس کی اُفقی جو جوت والی گربہ چشم میری آنکھوں میں شیشے کی میخوں کی مانند ٹھکی ہوئی تھی' جگر جگر کرتے ہوئے شہابیئے میری نگاہوں سے ٹکرا کر صحرائی ٹیلی مٹی کے پیالے میں جذب ہو رہے تھے۔ میں نے اسے خاموش سا اک پیغام دیا کہ دو گھونٹ پانی تو پی لینے دو ہونٹ اور اُنگلیاں تک جلنے لگی ہیں...... جب سے وہ ملی تھی' آج پہلی مرتبہ اسے ہلکا سا متبسم دیکھا تو اندازہ ہوا کہ الہڑ' معصوم اور بے ساختہ مسکراہٹ کا ایک اپنا الگ ہی حُسن اور سحر ہوتا ہے۔ ایسی نامعلوم سی مسکراہٹ کہیں اندر کی تہوں سے پانی کے ہلکوروں کی مانند یوں ہولے ہولے چہرے کی سطح پہ نمودار ہوتی ہے کہ خود سمندر کو محسوس نہیں ہوتا کہ معصوم سی موج تبسم نے

انجانے مسکانے میں کیا کیا گُل کھلا دیئے ہیں۔ ایسی خفتہ سی مسکراہٹ آمیز چہرے' قفس میں اُداس پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جبکہ رخشندہ ضیا بار مسکراہٹ سے جَل تھَل چہرے شیریں مقال خوش گوار طمانیت سے سرشار پنچھیوں کی مانند ہوتے ہیں اور کھلکھلاتے' دھومیں اُڑاتے' تبسّم ریزیوں کے لال گلال بکھراتے اور قہقہوں زمزموں کے قلابے ملاتے چہرے آزادی کی نعمت' فصل وگُل کی صحبت سے بہرور طائروں کی طرح ہوتے ہیں...... شاملیر کی شیاما کی اس نہاں سی مسکراہٹ کو میں خوب سمجھ رہا تھا۔ مٹی کا کالا سا پیالہ اسے واپس دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''کنیا! تمہارا کنہیا کہاں ہے......؟''

''کنیا کا کنہیا وہی جانو جسے وہ مکان ارپن کرے...... جے دیو جے دیو مات پتا بھراتا تم ہو تجن سنگاتی بھگت مکت......'' وہ پانی والا پیالہ میرے چہرے کے آگے گھما رہی تھی جیسے میری آرتی اُتار رہی تھی۔ پھر وہ پیالے میں پانی کی چند بچی ہوئی بوندیں اپنی سیاہ سُرخ زبان پہ ٹپکا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگی۔ ''جے ہو مہاراج! آپ پدھارے تو ہمری بھگتی ارداس سپھل ہوگئی' سریر کو سکھ اور آتما کو شانتی مل گئی......''

سیٹھ مصطفیٰ علی خان [illegible] طرف [illegible] کیا [illegible] بالشت کی چھوکری جو مُنہ آئی' بکے جا رہی ہے...... میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''کنیا! میں تمہارے کنہیا راکھن کی بابت پوچھ رہا تھا' وہ کہاں ہے......؟''

وہ ویسے ہی زمین سے تین جوڑے ہوئے بولی۔ ''اے کنہیا نہ کہئے مہاراج! وہ تو بھارو کچارو کلاونت ہے...... ہمرے کنہیا تو ہمرے سمنے ہیں......''

میں نے اُوبتے ہوئے کہا۔ ''اچھا جاؤ' اپنے باپو کو یہاں لاؤ......''

''وہ تو جھگنے کے جھونپڑ میں نشہ گھول کے پیوے ہے' سُدھ بُدھ جاوے گی تو وہیں ڈھے ڈھیر پڑ جاوے گا......''

''نہیں' وہ آج ڈھیر ہونے والا نشہ نہیں کرے گا۔ تم جا کر اسے لاؤ' میں نے اُس سے ضروری بات کرنی ہے......''

وہ بادل نخواستہ جھونپڑے سے باہر نکلی تو مصطفیٰ علی خان کہنے لگے۔

''خان صاحب! آپ نے اس لڑکی میں کوئی تبدیلی محسوس کی...... مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے وہ خود نہیں' اس کے اندر سے کوئی بول رہا تھا......؟''

''ہاں...... جب زبردستی قبضہ کرنے والے کوئی مکان یا جگہ خالی کرتے ہیں تو وہاں ہوائیں پھر سرسر کرنے لگتی ہیں' دَرودیوار سے لپٹی ہوئی نحوستیں اور ماتھے میں میخیں ٹھکوائے ہوئے بُھوت پریت خچر کی پچھاڑی پہ خشک جمی ہوئی متعفن لید کی مانند جھڑنے لگتے ہیں' ایسے میں تو پشو جناور بھی اُدھی بدھی حرکتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ بے چاری تو پھر انسان ہے...... ہمارے یہاں ٹِک پڑنے سے آدھی جھونجل کو تو جھوک پڑ گئی ہے' انشاءاللہ باقی بھی جاتی رہے گی......''

دِتو اچھا خاصا لُڑھکا ہوا تھا' اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور جھونپڑے میں ایک طرف پڑی پرال کے اوپر اُونٹ کے کجاوے کی مانند دھپ سے پڑ گیا' رُکمنی اور راکھن بھی اس کے آجو باجو آ پڑے جیسے وہ دونوں اسے سہارا دینے کی غرض سے بیٹھے ہوں...... میں نے دِتو کے نشے کی کیفیت کو جانچنے کی غرض سے سوال کیا۔

''دِتو مل! تم تو گاتے بجاتے بھی بہت اچھا ہو گے...... بچوں بالکوں سے قولِ میر شریف اور یہاں بھی بہت سُن چکے اب کچھ تم بھی سُناؤ......؟''

وہ اپنی اور بچوں کی تعریف سُن کر اپنے غلیظ ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

''مالک! [illegible] اور بجاوٹ سے اب [illegible] اور بانچ کا دم دمہ [illegible] ہے۔ سانسو اور سریر کی سامرتھا اور سادھن ساتھ نا ہیں دیویں۔ وہ جو کہویں ہیں نا' کہ گھمنڈ اور بڑا بول پرش کو بوہت جلیل اور گندا کرت ہیں' مجھے بھی گاون بجاون اور جوبنوا کا گھمنڈ لے ڈوبا' کوئی کرنی مارے' کرودھ مارے یا پھر اُونچا بول مارے......

تن کے تنگ سرا ے میں تنک نہ پایو چین
سانس نقارو کوچ کا باجت ہے دن رین''

وہ یہ دوہا پڑھ کر زور زور سے اپنے زانو پہ مُکے برساتا ہوا بھیں بھیں رونے لگا۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''بھئی' دِتو مل جی! تم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ تمہیں گاون بجاون اور اپنے جوبن پہ بڑا گھمنڈ تھا اور اب تمہارا یہ روگ' کایا کا بُرا حال اسی گھمنڈ اور بڑے بول بچن کے کارن ہے بلکہ میں جانوں' تم یہ بھی کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری اکلوتی پُتری رُکمنی کی جیون بپتا اور آتما ناس کا کارن بھی تمہارا یہی گھمنڈ اور کھوٹے کار کرم ہیں...... بولو' میرا کہن سَت ہے یا اس میں کچھ کپٹ ہے؟''

بچوں کے کچے کچوں کی مانند بے نُور بے آب سے ڈیلے تیزی سے گھماتے ہوئے' گھبرایا ہوا سا

بولا۔ ''حجور! آپ بھلا گلط کیسے کہہ سکت ہیں؟ آپ جو کہت ہیں وہی سانچ ہے پرنتو اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت' میوز مانگرے سور مچا دیں باگھ پڑا سیت۔''

سر کی پگڑی کھل کر اس کے گلے میں آ پڑی تھی۔ اب وہ زانوؤں پہ دوہتھڑ' مکے برسانے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے چندیا کے بال اکھاڑنے کے درپہ ہو گیا تو میں نے پھر بات کا پینترا بدل کر کہا۔

''دتو مل! مہاپرشوں' اوتاروں' گیانیوں' مہاتماؤں کے علاوہ اس سنسار میں' میں' تو' یہ وہ' سب ہی منش پاپی ہیں۔ منش سے جانے انجانے میں اگر اپرادھ ہو جائے تو اسے من بھیتر چھپانا نہیں چاہئے' کسی سیانے سجن ساتھی سے کھول بول لینا چاہئے' جی کی چنتا اور بے کلی جاتی رہتی ہے...... من بھاوے تو اپنی بپتا چنتا مجھ سے کہہ سن لو......''

اُفتی اُٹھے ہوئے آنکھوں کے دھندلے دیے اور ہونٹوں کا بنا ہوا دائرہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات نہ صرف کانوں سے سن رہا ہے بلکہ من ہی من میں اس کو خوب تول اور کھول بھی رہا ہے۔ چند لمحے سکوت کے بعد اس نے دائیں بائیں رَاکھن اور رُکمنی کو ہاتھوں سے ٹٹولا تو میں نے دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے باہر چلے جانے کو کہا۔ جب اُسے ان دونوں کے اُٹھ جانے کا یقین ہو گیا تو ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ''نہیں نشہ ہو پھر ہیں اَدھ کی ای چڑھی ہوت ہے۔ نشے کا نشا اترنا بڑی کٹھنا ہے۔''

- **کوئی نشہ ہو بہر طور اُتر جاتا ہے......!**

''حجور! میں اپنے اپرادھوں کی کتھا بالکوں کے سامنے نہیں کہہ سکتا...... میں جانوں کہ اب نہیں بچوں گا' میرا انت ہونے والا ہے۔ آپ ست کہت ہیں کہ من بھیتر کا وچار نرک کی اگنی بن جاوت ہے......'' وہ ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا ذرا آگے سرک آیا' رازدارانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''ہم نردھن بنجارے ڈومنے لوگن...... لگن تیج تہواروں' تیرتھوں درباروں پہ گاوت بجاوت ہیں۔ ہمارے کٹم قبیلے کے کچھ لوگ گانے ناچنے والی نرتکیوں' مسلاؤں کی سنگت بھی کرتے ہیں اور کچھ نرت کھیل تماشے کی منڈلیوں سنگ کارکام کرتے ہیں۔ میں بھی جے پور میں کرناٹک کی ایک نرت مہلا کے ہاں پکھاوجی تھا۔ میں اس بکت جوان چھورو تھا' ہاتھ باجوؤں میں بڑی شکتی اور ہمت تھی۔ چمپاوتی کرناٹکی نرت کے توڑے بھیل بھیل کر ٹوٹ جاتی تھی پر ہمرے ہاتھ' انگلیاں اور باجو' گت گیتا سے بے سرے ہوتے اور ناہیں بے سرت...... چمپاوتی بائی سُر کی قائم اور سندرتا مدھرتا' مایا کایا میں بھی پکھل تھی۔ راج کماریوں سی

چھب اور دیویوں کی سی ڈھب میں وہ کوئی اپسرا دکھتی تھی۔ وِیاہوں' رجھالوسی بھاگ وتی...... بڑے بڑے لوگن کے ہاں' بڑی بڑی منڈلیوں میں جاوت تھی اور جھولیاں بھر بھر روپیا پیسا لاتی...... پر اس کے انگ سنگ بھی ہجاروں پتنے موتی لاگے رہتے تھے۔ راجے مہاراجے سوا ہجار کی بھینٹ سے سواگت کرتے تھے۔ ایک بار جسلمیر کے ایک ٹھاکر کے ہاں سے پلٹ رہے تھے کہ راہ میں ڈاکوؤں نے دھر لیا۔ ہمرے سنگ بھی کچھ لوگ تھے' آپس کی مٹھ بھیڑ سے ہمرے تین منش مارے گئے۔ گھائل چمپاوتی کو جب ڈاکو اٹھا کرلے جانے لگے تو اس بکت چمپاوتی نے ہجاروں کے گہنے لتّے پہنے ہوئے تھے' کسی طرح ڈاکوؤں کی نظر سے بچا کر اس نے ناکو کا بلاقا جھپٹ کر اتارا اور مجھے دیتے ہوئے بولی کہ یہ بلاقا لے اور جب تو اپنے بھٹ پہنچے تو پھر برسپت کے روج اجمیر شریف جا کر یہ بلاقا سوا سیر کالے ماش میں ڈال کر خواجہ پیا کے پرشاد والی دیگ میں ڈال دینا...... میں نے بھٹ سے بلاقا کو چھپا لیا پر میرے من میں یہ کھد تھی کہ بلاقا میں کوئی انمول ہیرا جڑا ہوگا۔ پھر گھر آ کر بلاقا کو دیکھا تو اس میں ایک چھوٹا سا معمولی پھروجا پھنسا ہوا تھا اور اس کے پیچھے کچھ خون بھی لگا ہوا تھا جو کھینچ کر اُتارتے سمے چمپاوتی کے ناکو سے لگ گیا تھا......''

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا جیسے اس کی بات ختم ہو گئی ہو۔ کچھ دیر تک مصطفےٰ علی خان اور میں خاموشی [illegible] بیٹھا رہا۔ پھر مصطفےٰ علی خان نے استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھا تو میں نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

''دتو مل! میرا خیال ہے کہ تمہارا دم پھر اُلٹ گیا ہے جو پھر دم لگانے سے ہی سیدھا ہوگا...... بولو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

وہ پھرتی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سرکار! آپ گلت کہہ ہی نہیں سکتے' مجھے نہ بھی جرورت ہو تو پھر بھی میں آپ کی بات کو اَوش ڈنڈوت کروں گا......''

وہ آنکھوں والوں کی طرح اُٹھا اور بازو ہاتھ پھیلا کر ناک کی سیدھ باہر نکل گیا۔ ہم دونوں اس خبیث بڈھے کی پھرتیاں دیکھ کر خوب محظوظ ہوئے کہ نشے کی لت انسان کو کیا سے کیا کر دیتی ہے۔ نشے کی لوٹ میں گھٹنوں کا گنٹھیا اور آنکھوں کا اندھیرا ابھی آڑے نہ آیا...... گھڑی پہ اچانک نظر پڑی تو احساس ہوا کہ باتوں باتوں میں کافی سے نکل چکا تھا' نماز کا وقت بھی لگ چکا تھا۔ مصطفےٰ علی خان سمجھ گئے کہ اس خالی وقت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟...... باہر ر دوچھن دکھائی دیا تو اسے بلا کر پانی کا دریافت کیا۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر ہی کھسک لیا' تھوڑی دیر میں رادھن ایک مٹی کی صراحی میں گدلا سا پانی لے کر آیا۔ بیٹھت بیٹھت وضو کیا۔ دستی گھڑی کے کمپاس سے قبلہ متعین کر کے نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دتو مل' رُکمنی اور رادھن

کی بیساکھیوں کے سہارے اندر داخل ہوا۔ دیکھا گیا ہے کہ نشئی کو نشہ پانی' بھوکے کو دال روٹی اور مسافر کو ٹھور ٹھکانا مل جائے تو وہ پھر طمانیت' تساہل اور الکست کے اک عجیب سے نشے میں مبتلا ہو جاتے ہیں' قویٰ اور دل و دماغ کے اعصاب سُست اور سُن سے ہو جاتے ہیں' انسان آنکھیں مُوند کر کہیں لمبا پڑ جانا چاہتا ہے اور شاید ایسی کیفیات سے لُطف اندوز ہونے کی خاطر آسودہ حال اور تن آسان رؤسا' شرفاء کے ہاں ظہرانے کے بعد قیلولہ کا رواج ہے...... دتو بھی حسبِ سابق فرش پہ تھپ سے پڑ گیا۔

''ہاں' دتو مل! اب اطمینان سے اپنی بات پوری کرو۔'' مَیں نے اسے مطمئن سا دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ نشے سے چڑھے ہوئے بے نُور ڈیلے چاروں طرف گُھماتے ہوئے بولا۔

''کون سی بات' مہاراج......؟''

مَیں نے اور مصطفےٰ علی نے بیک وقت حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا کہ یہ للّو جلد راتی جلدی بھول گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے کیا بات کر رہا تھا؟

''دتو مل! تم فیروزے والے بلاق کی بات کر رہے تھے جو تمہیں زنگی چھاونی کی رانی نے دیا تھا کہ اسے تم سوا سیر مُونٹھ میں ملا کر جمعرات کے روز خواجہ غریب نوازؒ کے لنگر والی دیگ میں ڈال دینا...... کچھ یاد پڑا؟''

مَیں نے لفظ ''یاد'' پہ زور ڈالتے ہوئے کہا تو وہ حسبِ عادت ٹیڑھی بھدی اُنگلیوں والے کپکپاتے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہاں' مہاراج! مجھے یاد پڑت ہے کہ اس بلاقا پہ کھون بھی لگا ہوا تھا۔ ہمرے ڈھولک باجے تاسے پھوٹ توڑ' ہمن سا جندون کو مار پیٹ کر وہ بائم ڈا کو بائی جی کو جبردستی اُٹھا کر لے گئے۔ ہمری تو نیا ہی ڈوب گئی' کام کار سے پھارغ ہو گئے۔ کئی روج تک تو بُدھی میں ہی نہ آیا کہ بائی جی نے بلاقا کو کھواجہ گریب نواجؒ کے لنگر پرساد میں ڈالنے کا کہا تھا۔ جب جرا سُدھ بُدھ ٹھکانے لگی تو مَیں بلاقا لے کر ازمیر سرپٹ چلا گیا' اُدھر کُندن باجار میں ہمری جورو کا ایک سگے والا سُنار کے ہاں گہنوں کے رنگ میل اور پھائی پالس کی مجوری کرت ہے۔ دَم لینے کی کھاتر اُدھر رُکا تو گانٹھ سے نکال کر بلاقا بھی دکھایا اور یہ بھی بتایا کہ اسے کھواجہ گریب نواجؒ کے لنگر میں مُونٹھوں میں ملا کر ڈالنا ہے۔ اس نے چاندی کے بلاقا کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا' مُورکھ! اس کو وہاں مت ڈال۔ اس کا پھروجا بڑا اَنمول اور بھاگوان ہے' پرساد کی دیگ میں ڈالے تو ہو سکتا ہے کہ سارا پرساد جہریلا ہو جاوے۔ یہ ہیرے' لعل' پھیروجے اور پنّے منش نگل لے تو وہ مر جاوے ہے۔ تو اس بلاقا کے مَول برابر گھی چاول لے کر دیگ میں ڈال دے اور یہ بلاقا اپنی جورو کے ناکو ڈال دے' پھر دیکھ اس بلاقا کے پھیروجے کے چمتکار اور اگر اس

بات پہ من نہ بھیگے تو لاؤ اسے لالہ کو دکھا دیتے ہیں...... سنار، لالہ بدری پرساد کو دکھایا تو اس نے خوب دیکھ پرکھ، تول کر دو اوپر چالیس روپلی مول لگایا اور بتایا کہ سوا دو آنہ کی چاندی ہے اور باقی پھیرو جے کا مول ہے۔ میں نے دینے سے ہاتھ کھینچ لیا، لالہ نے دو روپے اور بڑھائے اور پھر بڑھاتے بڑھاتے ساٹھ روپلی پہ آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ لالہ مجھے لوٹ رہا ہے، پھیرو جا انمول ہے۔ میں اٹھ آیا، وہیں باجار سے ساٹھ روپلی کا گھی گڑ اور چاول لے کر پرساد کے لئے دے دیا اور گاؤں پہنچ کر بلاق اپنی جورو کے نکو میں ڈال دیا......"

● مخفی راز، انوکھی گھاتیں......!

یہاں تک بیان کر کے دتو مل کو پھر بریک لگ گئی تھی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اندھوں نابینوں میں اگر ایک بصارت کی کمی ہوتی ہے تو ان کی دیگر حسوں میں حیرت انگیز اضافے بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان کی قوتِ متخیلہ، حافظہ، ممیزہ اگر دو چند ہوتی ہے تو قوتِ محسوسات اور حافظہ سہ چند ہوتا ہے۔ جس طرح رات کے اندھیرے اور ہجوم کے اچھے برے موسم میں دیکھنے کی دوربینیں اور ریڈار اور ایسے آلات ہوتے ہیں، اسی طرح ان اندھوں کے پاس بھی اپنی ایک الگ ہی سائنس ہوتی ہے، آنکھوں کا اندھیرا ابھی بھی ان کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر شعبہ حیات میں بادشاہی، سپاہ گری، موسیقی، مصوری، خطاطی، شاعری، کتب نگاری، ڈرامہ نویسی، حکمت، کیمیا گری، ایجادات، گلوکاری، پیراکی، فضانوردی حتیٰ کہ نشانہ بازی، ڈرائیونگ، کلائمنگ اور گھڑی سازی میں بھی اندھوں نے ایسے ایسے کارنامہ ہائے سرانجام دیئے ہیں کہ بڑے بڑے چشم بینا والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ میں نے پیرس میں ایک مادر زاد اندھے مصور کو مشاق پھرتی اور اعتماد سے پورٹریٹ بناتے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ عجیب و غریب ظاہرہ باطنی حسیات کا مالک نوجوان سامنے بیٹھے ہوئے ماڈل کی آواز سے اپنی انگلیوں کو حرکت دیتا تھا۔ کبھی مشکل میں پھنستا تو ماڈل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کی ناک کی جڑ یعنی پیشانی کے درمیان دیکھے۔ پینٹرز سٹریٹ میں بیٹھا ہوا یہ فنکار زیادہ سے زیادہ پندرہ سے بیس منٹ میں چارکول سے تصویر بنا کر گاہک کے حوالے کر دیتا اور تصویر بھی ایسی کہ تصویر والا جیسے آئینہ دیکھ رہا ہو۔ چھپکلی، اُلو، چمگادڑ، ابابیل، سانپ، کوّے، مکھی، گھوڑے، بلّی اور کتّے، مچھلیاں، مچھر وغیرہ، ان جانداروں کی اکثر بینائی ناقص اور کمزور ہوتی ہے۔ بعض تو دن کے اُجالے میں واجبی سا بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن قدرت نے ان کی اس کمی کو چند دیگر متبادل صلاحیتیں عطا کر

کے پورا کر دیا ہے۔ میکسیکو میں ایک اندھی چھپکلی پائی جاتی ہے جس کی ہنٹر نما زبان اس کے قد سے دوگنا لمبی ہوتی ہے۔ وہ مشکل سے نظر آنے والے مچھروں اور مکھیوں کا شکار کرتی ہے۔ یورپ، امریکہ کے علاوہ کوریا، تائیوان، ہانگ کانگ اور چین میں ایسی بے شمار الیکٹرونک فیکٹریاں ہیں جہاں تمام کا تمام عملہ اور کارکن اندھے اور نیم اندھے ہیں اور کام ایسے مہین اور نازک کہ آنکھوں والے بھی نہ کر پائیں۔ اندھا گھڑی ساز، پیانو نواز اور ایک آکوپنکچر کا ماہر چینی ڈاکٹر بھی دیکھا جو اندھا ہونے کے باوجود آپریشن تھیٹر میں سامنے پڑے ہوئے مریض کے نازک حصّوں میں درجنوں لمبی لمبی سوئیاں گھونپ رہا تھا۔ میں نے جموں سے سری نگر تک کا خطرناک اور مشکل ترین سفر ایک ایسے نیم اندھے سکھ ڈرائیور کے ساتھ کیا جس نے کئی بوتلیں شراب بھی چڑھا رکھی تھی مگر کیا مجال کہ اٹھارہ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے درمیان اس شرابی نے کوئی معمولی سی غلطی کی ہو اور مجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ اندھا ہے؟ راستے میں کھانے پینے کے لئے جب ہماری بس ایک پہاڑی سرِ راہ ہوٹل میں رُکی تو بس کے کنڈیکٹر نے بازو پکڑ کر اسے کھانے کے کمرے میں پہنچایا۔ کنڈیکٹر سے ہی معلوم ہوا کہ اُستاد کو صرف پانچ فیصد دُھندلا سا دِکھائی دیتا ہے، وہ بھی جب اس نے وسکی پی رکھی ہو۔ اس کے انکشاف پہ جب میں نے اپنا باقی ماندہ سفر کسی اور بس میں جاری رکھنے کا عندیہ ظاہر کیا تو اس مسافر نے بتایا۔

''اُستاد اٹھارہ برس سے اسی روٹ پہ بس چلا رہا ہے، آج تک کسی مسافر کو بریک کی وجہ سے بھی کبھی جھٹکا نہیں لگا۔ اگر آپ نے کسی رسک کے بغیر حفاظت اور وقت پہ سری نگر پہنچنا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اسی بس پہ اُستاد کے ساتھ سفر کریں اور اگر وہم کوئی اور ہے تو آپ کی مرضی......!''

یوکرائن کے ایک سرکس میں ایک رُوسی نشانے باز کو دیکھا جو ایک لڑکی کے سر پہ رکھا ہوا سیب اپنے تیر سے چھیدتا تھا۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ نشانہ باز کو جس کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوتی ایک آدمی لے کر آتا، درمیان پنڈال میں لاکر ایک چکر دے کر اسے کھڑا کر دیتا۔ اسی طرح تین لڑکیاں جن کی آنکھوں پہ سیاہ پٹیاں ہوتیں، اس کے سامنے ساتھ ساتھ کھڑی کر دی جاتیں اور ان کے سروں پہ بھی چھوٹے سیب رکھ دیئے جاتے، نشانہ باز کے ہاتھ میں تیر کمان تھما دی جاتی۔ اب نہ تو نشانہ باز نے لڑکیوں کو دیکھا اور نہ ہی لڑکیوں نے نشانے باز کو دیکھا۔ نشانہ باز کمان کے چلّے پہ تیر چڑھاتا ہے، کمان کھینچ کر تیر پھینکنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور اِدھر سامنے کھڑی ہوئی تینوں لڑکیوں میں کوئی ایک لڑکی ''مَیں کہاں ہوں'' کی آواز نکالتی ہے۔ نشانہ باز اسی آواز پہ تیر پھینکتا ہے جو سیدھا آواز والی لڑکی کے سیب کو چھید کر ساتھ لیتے ہوئے پیچھے لکڑی کے تختے پہ پیوست ہو جاتا ہے...... مزید لُطف کی بات ہے کہ آنکھوں پہ موٹی سیاہ پٹی

باندھے ہوئے نشانہ باز سو فیصد پیدائشی اندھا ہوتا ہے...... ماسکو میں اندھے شطرنج کے کھلاڑیوں کا ایک کلب ہے جو آپس میں شطرنج کھیلتے ہیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ دو اندھے کھلاڑی آمنے سامنے بیٹھے بساط پہ جُھکے ہوئے ہیں، اردگرد تماشائی بھی بیٹھے ان کا کھیل ملاحظہ کر رہے ہیں۔ یہ تماشائی بھی سو فیصد اندھے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ شطرنج کے مُہرے اور بساط کے چونسٹھ خانے ہر چال پہ اپنے اپنے مخصوص ساؤنڈ سگنل پیدا کرتے ہیں جس پہ ہر دو کھلاڑی اور تماشائی جان جاتے ہیں کہ کس نے کیا چال چلی ہے۔

اندھوں کی کرکٹ، فٹ بال، ٹیبل ٹینس ٹیموں سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ دُنیا کے بہترین قالین اور شال بافی، گوٹ طِلا، اور دابے کا کام اندھے کرتے ہیں۔ خوبصورت نفیس چٹائیاں، دروازوں کی چقیں، پرندوں کے پنجرے کا بکس، سولا ہیٹ، کُھّے، ٹوکریاں، مچھلی پکڑنے کے جال، بچوں کے کھلونے، فرنیچر، تسبیح، مصلّے، ٹوپیاں، جلد سازی یعنی بے شمار صنعتیں اندھوں نے سنبھالی ہوئی ہیں اور ان کے لئے باعزت روزگار کا وسیلہ ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ نشہ بازوں اور اندھوں کی ایک اپنی ہی دُنیا اور انداز زندگی ہوتا ہے جو بڑا دلچسپ اور قابلِ غور ہوتا ہے۔ صحیح لُطف لینا ہو تو انہیں چُھپ کر دیکھیں اور سُنیں۔ مجھے نشے بازوں، حافظوں، بھک منگوں اور مداریوں کو کھوجنے، ذِق کرنے اور ان کی "پرائیویٹ" زندگی میں جھانک کر ان کی عادات، دلچسپیاں، کمزوریاں وغیرہ دیکھنے کا بڑا چسکا رہا تھا۔ خدانخواستہ اگر ان کی بد دعاؤں میں اثر ہوتا یا کہیں پھر اللہ میاں سنجیدگی سے ان کی آہیں کو سُن لیتے تو میں اور میرے دوست کبھی کے اسے پیارے ہو گئے ہوتے کیونکہ افیون اور بھنگ کے نشے میں دُھت نشہ بازوں پہ پانی پھینکنا، ان کی دھوتیوں میں ٹرلیاں پٹاخے رکھنا، انہیں ننگا کرنا، کُتوں کے کتورے، بلیوں کے بلونگڑے، چوہے اور پیلی بھِڑیں ان کے تہ بندوں میں چھوڑنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ہم سے عاجز آ کر یہ بیچارے قبرستانوں اور مزاروں تکیوں میں جا کر پناہ لیا کرتے تھے مگر ہم وہاں بھی پہنچ کر انہیں پریشان کرتے، بڑی ہوشیاری سے لُک چُھپ کر ان کے نشے کی حالت والی حرکات دیکھا کرتے، ان کی نقل اُتارتے۔ اسی طرح حافظوں اور نابینوں سے بھی سلسلۂ جنبانی چلتا رہتا، یہاں تک کہ اپنے اُستادوں کو بھی بخشا نہیں جاتا تھا۔

- **حافظ باؤ ٹرین، بہت کچھ تھا اللہ کی دین......!**

ہمارے والد صاحب کے ایک ملنے والے حافظ صاحب تھے۔ انہیں ہم "حافظ باؤ ٹرین" کہا کرتے تھے۔ مادر زاد اندھے، پدرزاد لالچی، ندیدے اور شکی مزاج دکھائی دیتے تھے۔ ہم انہیں "باؤ ٹرین"

اس لئے کہتے تھے کہ ایک تو یہ ہمیشہ سفر یا گشت میں رہتے' دوسرے یہ چلتے بڑے تیز تھے۔ خدا جانے یہ کیسے اندھے تھے' اندھوں کی تو ہیڈ لائٹس کام نہیں کرتیں مگر شاید یہ اندر کی فلڈ لائٹوں والے روشن اندھے تھے۔ جلالپور جٹاں کے انصاریوں میں سے تھے' پیدا ہونے کے بعد چار پانچ برس شاید وہاں ٹکے ہوں مگر پھر انہیں کبھی چین' سکوت اور ٹھہراؤ نصیب نہ ہوا تھا۔ چل سو چل' ہر وقت پاؤں اور ٹرین پہ سوار...... پورے برِصغیر میں اِن کے ارادت مند اور جاننے والے موجود...... شہر بہ شہر' قصبہ بہ قصبہ اور کُو بہ کُو ان کے ٹھکانے اور ٹھور...... ہر ایک وقف کار کی کارکرتوت' ظاہری باطنی معاشی حالت بلکہ اگلی پچھلی کم از کم تین چار نسلوں تک کی آگاہی رکھتے تھے۔ سُنّی کے گھر کھڑے سُنّی' وہابی کے ہاں کٹر وہابی اور اہلِ تشیع کی امام بارگاہ میں اثنائے عشری یعنی جیسا گاؤں ویسا گوبند۔ شیخوپورہ میں شیخ اور مالاکنڈ میں مہمند۔ ایک سدا بہارسی گاڑھے کی اُچکن' جس کی بغلی اور صدری جیبیں ہمیشہ قلم سے سجی اور پھولی پھولی رہتیں ہمیشہ ان کے زیب تن رہتی تھی۔ سر پہ ململ کا کیس گزی پگڑ' بائیں شانے پہ لٹکا ہوا خاکی کپڑے کا تھیلا جس میں شاید ضرورت کا سفری سامان ہوتا۔ ہاتھ میں اگر چار انچ لمبے لوہے کے موٹے کیل والا مولا بخش نہ ہو تو وہ بسوں گاڑیوں میں گرمی کی دوا' ممیرے کا سُرمہ اور سمندری سیپ کا منجن فروخت کرنے والے مولوی صادق نقشبندی عرف ادومہار شریف سیالکوٹی ہی دکھائی دیں۔

ہمارے ان حافظ باؤ ٹرین کا اصلی نام حافظ قاری عنایت اللہ جلالپوری تھا' اپنے آپ کو سائیں کانواں والا سرکار گجرات شریف سے فیض یافتہ کہتے تھے۔ میری چاچی کے کہنے سے بہت پہلے اُنہوں نے مجھے پیار سے ''ٹوڈل کاں'' کہا تھا۔ جب بھی ہمارے ہاں آتے' اپنے تھیلے سے چورما نکال کر مجھے کھلاتے ہوئے کہتے کہ یہ سائیں کانواں والی سرکار کا تبرک ہے اپنے ٹوڈل کاں کے لئے...... توند نکلی ہوئی کہ بلا کے پیٹو' ہر وقت کھانے ٹھونسنے کا ہابڑا پڑا رہتا' باتونی بھی اور مزاقیہ بھی انتہا کے۔ واقف کاروں اور انجانوں میں اپنی بنائے رکھنے کا ہُنر انہیں خوب آتا تھا۔ جہاں پڑاؤ ڈالتے تھے' ایک تھرتھلی سی مچا دیتے۔ کسی کا کلام اور جھاڑ پھونک سے علاج ہو رہا ہے تو کسی کی دماغی جسمانی کمزوری نقاہت رفع کرنے کے لئے مغزیاتی حلوہ تیار کروا رہے ہیں۔ کسی کے گھر بھر کے لوگ جڑی بوٹیوں کی کوٹ اور چھان پھٹک میں جُتے ہوئے ہیں۔ کہیں کسی نومولود بچے کا قرآنی فال سے نام نکال رہے ہیں تو کسی کو ڈراؤنے خوابوں سے بچنے اور شرِ شیطان سے محفوظ رہنے کا نقش لکھ کر دے رہے ہیں۔ نئی نئی نعتیں سُناتے اور درود و سلام کی محفل تو ہر روز کرواتے۔ شاید یہ سب کچھ ان کی ضرورت' عادت یا پیشہ تھا کہ دو چار روز خوب خاطر خدمت کرتے کرواتے' حلوے مانڈے اُڑاتے' دعوتیں نیازیں کھا پی ڈکار کر وہ کسی اگلی چھاؤنی میں پڑاؤ ڈالنے

کے لئے روانہ ہو جاتے۔ ہندو پاک کے تمام چیدہ چیدہ عُرسوں کے انعقاد کی تاریخیں انہیں سکولی بچوں میں ریاضی کے پہاڑوں کی طرح اَزبر تھیں۔ دو چار روز پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے' مہمانِ خصوصی کی حیثیت پیدا کر کے خوب مزے لوٹتے۔ نعتیں' واعظ' صاحب عُرس کی کراماتیں برکتیں اور مجاوروں' گدی نشینوں کی خدمات کے قصیدے رواں رکھتے اور خوب مال پانی پیدا کر کے تبرّکات اُٹھائے' سبز چادریں باندھے واپس پلٹتے اور پھر کسی اور محاذ پہ پہنچنے کی تیاری میں لگ جاتے۔

ان کا ہمارے ہاں آنا' خاص طور پہ میرے لئے بڑا باعثِ برکت و حرکت ہوتا' برکت سے مراد کہ مجھے ان کی کئی ایک ظاہری اور باطنی جیبوں میں ٹھنسی ہوئی میٹھی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ مثلاً مکھانے' نُگدی' چھوہارے' بتاشے اور کھانڈ چڑھے ہوئے بُھنے چاول۔ انہیں جہاں کہیں سے کچھ بھی تر اور خشک لنگر کی صورت میں ملتا' وہ بسم اللہ کہتے ہوئے اپنی اچکن اور اندر کُرتہ کی جیبوں کے تہہ خانوں کے گوداموں میں پھینکتے جاتے۔ ان ہی ظاہری باطنی جیبوں میں سفر و حضر میں کام آنے والی چیزیں بھی ٹھنسی ہوتیں۔ مسواک' فونٹین پین' کالی لکڑی کا کنگھا' موچنا تو سامنے والی جیب میں دکھائی دیتے تھے۔ وزیر آبادی شکاری چاقو' قینچی' سوئی دھاگہ' آزار بند ڈالنے کا امام' کان سے میل نکالنے والی چاندی کی سلائی' ماچس' ناخن تراش' لکڑی کے دستے والا اُسترہ' چھوٹے بڑے بٹوے۔ یہ سامان ایک موٹے کپڑے میں لپٹا ہوا اندر کی جیب میں ہوتا۔ جنتریاں' مختلف نوع کے لکھے ہوئے نقش' چاندی کے چھلّے' گلٹ کے تعویذ بند' کالے دھاگے' مترجم کتابچہ یٰسین' گنج العرش' درود تنجینا' پنج سورہ' سلیمانی فال نامہ' سلیمانی سُرمے کی ڈلیاں وغیرہ واسکوٹ کی اندرونی بڑی جیبوں میں ہوتیں۔ اسی طرح مشک کافور' عطریات کی ننھی ننھی شیشیاں' نگینے' تسبیحیں' انگوٹھیاں' مدینے شریف کی خاک شفا' نجف اشرف کے موئے' نجف کا نگینہ' بغداد شریف کی کھجوروں کی گٹھلیاں' چُورن اور دیگر اسی نوع کے تبرّکات سے ہر وقت لدے پھندے رہتے' حسبِ ضرورت یا حسبِ طلب ان کی زیارت بھی کرواتے اور مجبور کرنے پہ ہدیۃً عطا بھی کر دیتے تھے۔

ہمارے ہاں قیام کے دوران وہ اپنی اُچکن اور کُرتہ اُتارنے سے گریز فرماتے لیکن انتہائی مجبوری یا شدید گرمی کی صورت میں یہ دونوں چیزیں اُتار کر بڑی احتیاط سے اپنی چادر میں لپیٹ کر تکیئے کے نیچے دھر لیتے۔ روپیہ پیسہ یا کوئی قیمتی اثاثہ وہ اپنے زیریں ملبوس کے میل رکھتے تھے جو صرف غسل یا پھر کبھی دُھلنے کی غرض سے ہی فصیلِ جاں سے وقتی طور پہ جُدا ہوتا تھا۔ خصوصی طور پہ ہمارے ہاں قیام کی صورت میں ہی انہیں ایسی احتیاط کی ضرورت کیوں پیش آتی تھی؟ اس کی وجہ میری ذات شریفہ تھی' ان کا شکِ خفیفہ اب یقینِ شدیدہ میں بدل چکا تھا کہ مَیں ان کی جیبوں سے اپنے کام کی چیزیں اُڑاتا ہوں۔ اب ان کی یہ

حالت تھی کہ جب تشریف لاتے، میں گھر میں موجود ہوں یا نہ ہوں، وہ اپنی پھولی ہوئی جیبوں کو یوں سمیٹ اور سنبھال کر بیٹھتے جیسے مرغی، چیل یا بِلّی کُتّے کی موجودگی میں اپنے چوزوں کو پروں تلے سمیٹ لیتی ہے۔ جمانذرو اندھوں کی مانند ان کی آنکھوں کے ڈیلوں کے ریڈار بڑی تیزی سے دائیں بائیں، اوپر نیچے حرکت میں رہتے۔ کھانا کھاتے سمے گوشت کی رکابی، کبابوں کی تھالی اور حلوے کی پلیٹ ان کے بازوؤں اور ہاتھوں، اُنگلیوں کے حصار اور دسترس میں یوں آ جاتیں کہ مکھی مچھر تک اُدھر پَر نہ مار سکتے تھے۔ کھانے کے اُوپر نیت اور ہاتھ بڑی تیزی سے تیرتے رہتے کہ مبادا کوئی غنیم اوچھے وار سے کوئی بوٹی کباب اُچک لے۔ اجتماعی کھانے میں حافظوں کے ہاتھ اُنگلیاں کسی کام کی بوٹی، پستے بادام کی کُن سُن میں پلیٹ یا قاب کے انتہائی کناروں اور شاملِ طعام افراد یا فرد کی اُنگلیوں سے بھی ٹکرا جاتی ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ اندھوں کا بھی چمگادڑوں، ابابیلوں، سانپوں، بلیوں، کُتّوں کی طرح اپنا ایک ریڈار سسٹم ہوتا ہے۔ ان کی جاذبہ اور متخیلہ سے ایسی لہریں اور شعاعیں اردگرد پھیلتی اور سکڑتی ہیں جن سے یہ آمنے سامنے، اردگرد، نیچے اوپر اکثر چیزوں، محرکات وخطرات کو محسوس کر لیتے ہیں۔ ہوا، فضا اور آواز کے زیر و بم، ارتعاش و ارتباط سے بھی بہت کچھ جان لیتے ہیں۔ بعض کور چشموں میں بینی کے ایسے مظاہرے کرتے بھی دیکھے کہ صدقے بھی ایسا پیار کرتے ہوں گے۔ ان میں سے ایک یہ ہمارے حافظ بادوزین بھی تھے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کی آمد ہمارے لئے ہمیشہ باعثِ طمانیت رہی۔ چسکا چسکاری، بھری جیبوں کی چوری چکاری اور ان کی پُرتفنن شخصیت، پُرلطف طبیعت اور بذلہ سنجی کے علاوہ ایک اور خوبی یا مہربانی جو ہمیں ان کا دیوانہ بناتی تھی وہ ہمیں اپنے ساتھ کسی غرض یا بیرونِ شہر کسی جگہ لے کر جانا تھی۔ آوارہ گردی جو ہمارے خمیر میں رچی بسی ہوئی تھی، ان کے ساتھ چلنے سے مزید نکھر کر سامنے آ جاتی۔ بظاہر ہم ان کی آنکھ یا رہبر بن کر ساتھ ہو لیتے تھے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہمیں راستہ دکھاتے ہوئے چلتے تھے۔ ہم ان کا بایاں ہاتھ تھام لیتے تھے کہ دائیں ہاتھ میں ان کا ''عصائے جلالپوری'' ہوتا۔ سمجھیں کہ ہم ان کا ہاتھ تھامے سٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ اب ہم شارٹ کٹ مارنے کے لئے بُوچڑ خانے کا راستہ اپنانے کے لئے چوک کی دائیں جانب ان کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ٹھٹک کر کہتے ہیں کہ سیدھے بازار کی طرف سے چلو، بُوچڑ خانے کے کُتّے بڑے خبیث ہیں، میری خوشبو دُور ہی سے سونگھ لیتے ہیں اور ادھر سڑے گوشت کی بدبو بھی بہت ہوتی ہے...... بازار میں داخل ہوتے تو بولتے کہ آگے سرکاری نلکے کے پاس گڑھا ہے، بچ کر گزرنا، اس میں گندہ پانی کھڑا رہتا ہے۔ آگے والے گڑھے سے بچ بچا کر گزرے تو فرمایا کہ وہ مائی بھولی کی مسجد کے آگے نانجاری بھینس بندھی ہوئی دیکھ رہے ہو، ذرا خیال سے، کمبخت کی

پُوچھل کی طرف دھیان رکھنا۔ میرے ساتھ تو اس کی جیسے خاندانی دُشمنی ہے' بس ذرا اس کی پُوچھل کی زَد میں آنے کی دیر ہوتی ہے' ایسا نشانہ باندھ کر اپنی پُوچھل کا ہنٹر جھٹکے گی کہ سارے کپڑے گندگی اور غلاظت سے پلید کر دے گی...... بیری والے چوک میں داخل ہوتے ہی ہاتھ کے دباؤ سے مجھے دائیں جانب دبا کر کہتے...... دیکھو بابا فضلا گرم گرم پکوڑے اور دال کے لڈو نکال رہا ہے اور واقعی وہ ایسا ہی کر رہا ہوتا۔ پکوڑے اور ماش کی دال کے لڈو بندھوا کر وہ مجھے راجہ بازار کی جانب دھکیلنا شروع کر دیتے۔ مسجد' سرکاری نلکا' راستے کی رکاوٹیں' کچے پکے راستے' اونچ نیچ۔ ایک ایک دوکان' سٹیشن کا ایک ایک بنچ۔ فسٹ کلاس' سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کی بوگیاں پلیٹ فارم پہ کہاں کہاں کھڑی ہوتی ہیں۔ پانی اور پولیس والوں کی بوگیاں' بیت الخلاء اور چائے خانے' یوں معلوم ہوتا کہ جیسے پورے ریلوے سسٹم میں اِن کی عملداری ہے۔ ہر متعلقہ ملازم سے یاد اللہ' نام اور کام تک یاد' ان کے بچوں اور گھر کے افراد تک کو پوچھیں گے۔ ٹرین کے تمام پھیری والے' خوانچہ بردار' ٹی ٹی' ڈرائیور گارڈ' ہر کوئی بندۂ بے دام...... اگو کی سٹیشن پہ گاڑی دَم کی دَم رُکی تو عنایت پانی والے کو آواز لگائی' وہ پانی لے کر دوڑا آیا۔ سمبڑیال سے کھویا اور برفی کھائی۔ بیگو والہ پہ بشیر چائے والا چائے لا رہا ہے۔ ایسا وی آئی پی ٹریٹمنٹ اور کھانے کو ملتا' یہی عیش تھے جو مجھے اِن کا [illegible] ہو گئے۔ [illegible] ان کی باطنی بصارت' سو فیصد صحیح اندازے' ایسا پختہ و بے مثال حافظہ کم ہی کہیں مشاہدے میں آیا ہو گا' میں مخول مخول میں ہی بڑی دلچسپی اور گہرائی سے اُن کی اِن خصوصیات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہتا اور کبھی کبھی نظر بچا کر بڑی مکاری سے اُن کو امتحان میں بھی ڈال دیتا تھا مگر وہ کمال چابکدستی سے میری دُم پہ پاؤں رکھ دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے۔

"ٹوڈل کاں! تمہارے جیسا مکار' مسخرا اور چور اُچکا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے ساتھ بھی ہاتھ کرنے سے باز نہیں آتے پر کیا کروں' تمہاری ذہانت اور فطانت مجھے بڑی پسند ہے۔ ایک اور بات کہ جب تم میرا ہاتھ تھام کر چل رہے ہوتے ہو تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی منزل کی جانب گامزن ہوں......"

مجھے کئی بار حافظ صاحب کے ساتھ علی پور سیداں جانے کا موقع نصیب ہوا۔ اُن کی طرح مجھے بھی اعلیٰ حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہؒ کی ذات قدسیہ سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرت صاحب بڑی محبت سے ان سے نعتیں سُنتے اور سراہتے۔ اسی طرح گولڑہ شریف' پاک پتن شریف' حق باہو سرکار' سہون شریف' موہڑہ شریف' داتا سرکارؒ' پیر مکی سرکارؒ' حضرت شاہ جمالؒ' سرکار مادھو لعل حسینؒ' میاں میرؒ' بری امامؒ' غرضیکہ جہاں جہاں' جدھر کدھر کوئی اللہ کا بندہ آسودۂ خواب ہے وہاں پہنچتے' میں بھی بچہ جمورا کی طرح ساتھ

ساتھ ہوتا' اس طرح میرے ذوقِ آوارگی' اللہ والوں کے قدموں کی خاک چاٹنے کی چاٹ اور راستے راہوں' دوراہوں' سہ حدوں' چوراہوں میں بھٹکنے' رُلنے رُکنے' کھوجنے اور خراب ہونے کے چسکے کو بھی تقویت ملتی...... دُنیا کی نیرنگیاں' کائنات کی بُوالعجبیاں' وقت زمانے کی کروٹیں' لیل و نہار کی جلوتیں۔ سورج چاند ستارے' زمین و آسمان' سمندر دریا' پہاڑ جنگل' لوگ باگ' درند پرند چرند' موسم نظارے' حادثے' یہ سب کچھ گھر بیٹھے تو سمجھ میں نہیں آسکتے۔ کائنات میں کرۂ ارض کی حیثیت تو صحرائے گوبی پکو میں بنتے بگڑتے ایک چھوٹے سے ریگ ٹیلے سی بھی نہیں ہے۔ جو کوئی اپنے زیرِ پا' پاؤ بھر زمین ہی نہ دیکھ پائے وہ لم یزل کی وسیع الجہت کائنات جس میں لاتعداد عالم ہیں اور ہر عالم میں لاتعداد دُنیائیں آباد ہیں' ان کا تصور کیسے کرسکتا ہے' مکاں کو سمجھے بغیر لامکاں کو کیسے امکان میں لایا جاسکتا ہے؟ ظاہری بینائی کسی بھی ہدف کو اس کی حقیقی حالت میں دیکھنے سے قاصر رہتی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قوتِ بصر جن ظاہری عوامل اور محرکاتِ حسیّہ کے تحت کام آتی ہے ان کی ترجیحات اور مدرکاتِ وقت' موسم حالات اور طبعِ طبیعت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور باطنی بصارت دِل اور دماغ کی بصیرت کے تحت کام کرتی ہے۔ اگر آنکھ بصارت رکھتی ہے تو دِل بصیرت رکھتا ہے۔ میرے باباجیؒ اکثر یہ مصرعہ دُہرایا کرتے تھے

یقیں میں اُجالا ہو دِل صورتِ بینا کرے

یعنی اصل بصارت دِل کی بصیرت ہے۔

بات یوں تھی کہ نابینوں کی ظاہری بصارت معدوم ہوتی ہے تو کسی حد تک درجہ پہ ان کی باطنی بصارت اُجاگر ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی اگر محنت اور مشقت کی جائے تو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مَیں حافظ صاحب کی اسی بصیرت کی ٹوہ میں تھا کہ وہ بجھے دیدوں سے نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو کس آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں؟...... مَیں محرومِ تماشا بس اسی کھوج میں خجل خوار ہوتا پھرتا تھا۔ موڈ' موسم اور موقع محل موافق ہوتا تو ممدوح موصوف پیدل بھی چل نکلتے یا پھر جب وہ خوب پیٹ بھر کر کھائے پیئے ہوتے تھے۔ مرغن غذاؤں کی دسترخوان پہ اپنی ایک الگ ہی بہار ہوتی ہے مگر پیٹ میں بے محابا اور بے تحاشا اُترنے کے بعد جو ان پہ پُر ڈکار اور پُراپھار خمار آتا ہے تو وہ کوئی ندیدہ اہلِ معدہ ہی جانتا ہے۔ شیر' پہلوان اور حافظ' مُلّاں وغیرہ مشقتِ کام و دہن کے بعد کچھار' اکھاڑے اور حجرے مسجد سے کہیں دُور قیلولے اور ''پھسلولے'' کے لئے نکل جاتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق ان کی بسیارخوری کے ''ردِ عملانہ'' عواقب سے محفوظ رہے۔ حافظ صاحب قبلہ بس ذرا دُور ہی تک نکل جاتے کہ جیسا کھانا ویسا سفرانہ۔ جہاں کھایا پیا گھان بچہ گولھو ہو جاتا' وہیں سے واپسی ہو جاتی۔ صبح دو تین جفادری قسم کے پراٹھے'

دو دونے دہی، انڈے اور بڑا پیالا سبز چائے کے بعد چھاؤنی میں پیر شعلہ شہید کے مزار یا بابے دی بیری تک راؤنڈ لگانا اِن کی ضرورت بن جاتا۔ اکثر مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لیتے کہ بچوں کے لئے صبح صبح کی ہواخوری بڑی ضروری ہے، سو چار و ناچار مجھے ان کا ہاتھ تھام کر ساتھ نکلنا پڑتا...... میں شاید یہ بتانا بھول گیا کہ چلتے ہوئے ان کا سر گھڑی کے پنڈولم کی مانند دائیں بائیں جھولتا رہتا۔ ہاتھی بھی مستی فراغتگی میں یونہی سر کو ہلاتا رہتا ہے یا پھر ذاکر حضرات ذکرِ جہر و خفی میں یہی انداز اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ عقدہ تو بعد میں کُھلا کہ وہ خفی ذکر کرتے رہتے ہیں...... سر کے ساتھ آنکھوں کے ڈیلے بھی گردش میں رہتے، اکثر ایسا ہوا کہ چلتے چلتے اچانک ٹھٹک کر رُک لئے یوں جیسے ڈرائیور ایمرجنسی بریک لگا دیتا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا کہ یہاں کس نے راہ ماری ہے جو اِس طرح اُٹھے قدموں پہ روک لے لی ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُوپر ان کے چہرے کی جانب نگاہ کرتا جدھر عجیب سی تبدیلی واقع ہوتی گویا وہ کچھ دیکھ اور کہہ سُن رہے ہوں...... چند ساعتوں کے بعد وہ خود ہی میرا ہاتھ دبا کر پھر چل پڑتے اور میں انتہائی بے بسی کی عالم میں پوچھ بیٹھتا۔

"حافظ جی! کیا ہوا......؟"

"کچھ نہیں، کوئی تھے، وہ گزر رہے تھے بس......"

"وہ کون......؟"

میں نے دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ڈھپ سے میری گُدی پہ دھول جماتے ہوئے کہتے۔

"وہ تیرے کچھ لگتے......!"

● ملک الموت کی پرواز......!

خدا جانے وہ میرے کچھ لگتے کون تھے؟...... رنگ پورہ میں اِن کا ایک عقیدت مند رہتا تھا حافظ صاحب جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو اِس کے پاس ضرور جاتے۔ بیچارہ ہاتھ پاؤں سے محتاج...... اوپر سے عیال داری بھی تھی۔ بس وہ خدائی بھروسے زندگی کے دِن کاٹ رہا تھا...... حافظ صاحب کی بہت سی جیبوں میں ایک جیب اِس تاج دین کے نام کی بھی تھی جس میں وہ اس کا حصّہ جمع کرتے رہتے۔ اس روز بھی وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے اُس کے ہاں جیب والی امانت پہنچانے جا رہے تھے۔ ایک انتہائی تنگ پتلی سی

گلی کے آخر پہ اُس کا ڈربا نما مکان تھا۔ گلی ایسی تنگ اور سُکڑی ہوئی کہ آنے جانے والے ایک دوسرے سے مجبوری کا معانقہ کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ گلی میں داخل ہوتے ہی حافظ صاحب نے مجھے آگے کر دیا۔ ہم بمشکل آٹھ دس قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اک دَم اِنہیں ایمرجنسی بریک لگ گئی...... ان کا وہ ہاتھ جو شانے پہ رکھا تھا' تھر تھر کانپنے لگا۔ اپنا دوسرا عصاء والا ہاتھ بھی میرے دوسرے شانے پہ رکھ کر اُنہوں نے مجھے گھسیٹ کر اپنے پیچھے کر لیا اور عجلت کے ساتھ ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گلی سے باہر نکل دائیں طرف ایک تھڑے کی آڑ لے کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے ابھی تک اُنہوں نے اپنی اوٹ میں چُھپا رکھا تھا۔ میں ابھی صحیح سے اِس صورتِ حال کو سمجھ نہ پایا تھا کہ زن سے ایک کالی شا بھینس نتھنوں سے شعلے اور کُھروں سے چنگاریاں چھوڑتی ہوئی اندر گلی سے نکلی اور گولی کی طرح ہمارے سامنے سے گزرتے ہوئے کھیتوں کی جانب چلی گئی۔ مارے خوف اور دہشت میری تو گھگھی بندھ گئی۔ بھینس تھی یا کالا شا گینڈا...... میری نگاہیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ دُور ہوتی جا رہی تھی' ایسے ایسے زمین چھوڑتی جا رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کھیتوں اور پھر درختوں کے اوپر اسی رفتار سے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے' یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرا مُنہ اور آنکھیں حیرت سے کُھلی ہوئیں اور دل سینے میں کسی خرگوش کی طرح پُھدک رہا تھا۔ ایک اور عجیب بات کہ اس واقعے کے دوران چند اور لوگ اور بچے بھی گلی کے باہر اور اندر موجود تھے مگر کسی کے بھی چہرے بشرے پہ کوئی پریشانی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی کسی کو بھینس کے اس طرح بگٹٹ بھاگنے سے اِدھر اُدھر بھاگتے یا کسی آڑ اَوٹ میں پناہ لیتے دیکھا' سب مطمئن اور نارمل تھے کہ جیسے یہاں کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا ہی نہیں۔ یونہی میں نے حافظ صاحب کی جانب دیکھا' اُن کے اندر باہر کا پنڈولم حسبِ معمول چل رہا تھا۔ ذرا سکت سے نکلتے ہی میں نے سامنے کھڑے ایک لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''یار! یہ کس کی بھینس تھی جو رسّہ تڑوا کر بھاگی ہے' اس تنگ سی گلی میں ایسی موٹی تازی خطرناک سی بھینس...... کوئی اس کے سامنے آ جاتا تو اس کا تو کچومر نکل جاتا......''

وہ لڑکا یوں میری اور حافظ صاحب کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے ہم دونوں کسی پاگل خانے سے فرار ہو کر آئے ہوں اور یہاں چُھپ کر کھڑے ہوں...... آخر وہ بولا۔

''اوئے' پاگل خانے! تم کس بھاگتی ہوئی بھینس کا ذکر کر رہے ہو؟...... میں یہاں گھنٹے بھر سے کھیل رہا ہوں۔ نہ تو یہاں سے رسّہ تڑوا کر کوئی بھینس گزری ہے اور نہ ہی اس گلی میں کسی کے پاس کوئی بھینس ہے...... گلی سے دو آدمی تو گزر نہیں سکتے' بھینس کہاں سے گزرے گی؟''

وہ لڑکا عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا ہٹا تو میں نے حافظ صاحب سے پوچھا۔
''حافظ جی یہ بھینس!...... مَیں نے اِس وقت تو گلی میں سے کسی بھینس کو آتے نہیں دیکھا تھا' آپ کو وہ بھینس کہاں سے نظر آ گئی جو آپ مجھے اس تنگ گلی سے گھسیٹ کر باہر نکال لائے؟''
چند لمحے توقّف کے بعد حافظ صاحب کے مُنہ سے نکلا'' اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ رَاجعون...... ٹوڈل کاں! چلو ذرا بازار تک ہو آئیں......''
وہ مجھے اس طرح لئے ہوئے بازار کی جانب بڑھ رہے تھے جیسے وہ بینا ہوں اور مَیں نابینا' وہ سیدھے شیخ برکت علی کی دوکان پہ پہنچے' مکمل کفن دفن کا سامان بندھوا کر مجھ پہ لاد دیا۔
''چلو اب وہیں کالی بھینس والی گلی میں چلتے ہیں......''
یہاں پہنچتے ہی آہ و بکا کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ تاج دین کے گھر کے باہر مرد عورتیں جمع تھے۔ حافظ صاحب کو دیکھتے ہی لوگوں نے رَستہ کھول دیا۔ عصر کی نماز کے بعد حافظ صاحب نے ہی جنازہ پڑھایا...... شام کو واپسی پہ مَیں نے ڈرتے ڈرتے حافظ صاحب سے پوچھا۔
''حافظ جی! وہ کالی شا بھینس......''
''کون سی [illegible] ہے''
''وہ جو تاج دین کے گھر کی طرف سے رَستہ تڑوا کر بے تحاشا بھاگی چلی آ رہی تھی اور جس کی زد سے بچاتے ہوئے آپ مجھے فوراً گلی سے باہر نکال لائے تھے......؟''
وہ کمال بھولپن سے پوچھنے لگے۔ ''تم نے خود اپنی آنکھوں سے اُس کالی شا بھینس کو دیکھا......؟''
مَیں نے فوراً جواب دیا۔ ''جی ہاں' مَیں نے اپنی آنکھوں سے اس کالی شا بھینس کو گلی سے آتے ہوئے اور اِدھر باہر کھیتوں کی جانب جاتے ہوئے بلکہ پھر اُوپر آسمان کی جانب پرواز کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے......'' وہ اپنی نرم نرم اُنگلیوں سے ٹٹول کر میرے مُنہ پہ اپنا سبک سا ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
''بس' ٹوڈل کاں! خاموش ہو جاؤ اور کبھی کسی سے یہ بھینس والا ذکر نہ کرنا وہ ملک الموت تھا...... اور ہاں' اب اس موضوع پہ کوئی سوال بھی نہ کرنا......''
علی پور شریف والے حضرت پیر جماعت علی شاہؒ کے وصال سے ایک روز پہلے وہ مجھے علی پور شریف لے آئے تھے۔ میں بخار میں بھُن رہا تھا۔ صبح ہی صبح اِن کی آمد ہوئی' میرے بخار کا سُن کر میرے پلنگ پہ آ براجمان ہوئے۔
''السلام علیکم!...... ٹوڈل کاں' یہ تم نے کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے؟''

میری بجائے میری بہن نے جواب دیا۔ ''حافظ جی! کاکے کو دو روز سے سخت بخار ہے۔ یہ کھاتا پیتا بھی کچھ نہیں اور دوائی بھی نہیں لیتا......''

ٹٹول ٹٹول کر انہوں نے میری ٹانگیں دریافت کر لی تھیں' پولے پولے داب دیتے وہ میرے پیٹ اور سینے تک آ پہنچے اور عین دل کے اوپر ہلکا سا دباؤ ڈال کر وہ میری گردن ٹھوڑی' منہ ناک' آنکھیں ماتھا اور پھر سر تک آ پہنچے۔ اندر کی جیب سے چند بڑے بڑے شیریں قسم کے املوک نکالے' بیج علیحدہ کر کے اپنے منہ میں رکھ لئے' چند لمحے چبانے اور نرم کرنے کے بعد شہادت کی انگلی سے میرے منہ میں ڈال دیئے اور میری ماں جی سے کہا۔

''ٹوڈل کاں کے کپڑے نکال لائیں' ہم ابھی اسی وقت علی پور شریف جا رہے ہیں......''

ماں جی نے جواب دیا۔ ''یہ دو تین روز سے بخار میں پھنک رہا ہے' کمزوری سے اپنے قدموں پہ تو کھڑا ہو سکتا نہیں اور آپ اسے علی پور لے جا رہے ہیں؟''

حافظ جی نے مسکرا کر فرمایا۔ ''آپ کپڑے تو لائیں' یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے......''

املوک کا ماشدہ واش علیحدہ میرے حلق سے نیچے اترا میں ایک سو تین درجہ بخار کافور بن کر اڑ گیا۔ میں یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کبھی بیمار ہی نہ ہوا تھا...... حافظ صاحب نے میرے لئے بزوری کا شربت منگوایا' آدھا گلاس شربت خود لے کر مجھے پلا دیا۔ اس کے فوراً بعد مجھے بیت الخلاء جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر منہ ہاتھ دھویا' کپڑے پہنے اور علی پور شریف جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ گھر والے تکے تکے سے ہم دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے......میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ اعلیٰ حضرتؒ کی حیات میں بھی متعدد بار قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور نماز جنازہ میں بھی شمولیت نصیب ہوئی۔ حافظ صاحب اپنی باطنی آنکھ سے ہر چیز کو صاف صاف دیکھ لینے پہ قادر تھے......میں نے کئی مرتبہ شرارت کی غرض سے حافظ صاحب کو آزمایا مگر وہ کبھی میرے چکر میں نہیں آئے بلکہ میرے چکر کو چکر دے کر انہوں نے مجھے ہی چکرا دیا......میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ مجھے چوری کی عادت تھی۔ گھر میں ہلکی پھلکی وارداتوں کے علاوہ ہمسایوں' مسجدوں اور مزاروں کے علاوہ جہاں کہیں موقع لگتا' میں اپنا کام کر جاتا تھا مگر میری چوریاں ہوتی بڑی معصوم اور بے ضرر سی تھیں۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزوں کی چوریاں۔ مرغیاں' کبوتر' سکول کی کتابیں' مسجد کے لوٹے کا تیل' مزاروں پہ پڑے ہوئے پیسے یا پھر کسی نئی فلم کے لئے گھر میں دو چار آنے کی چوری۔ اسی طرح ہم نے حافظ صاحب کو ایک آسان ٹارگٹ یا آسامی سمجھ کر دوستی بڑھائی تھی کہ چلو وقتاً فوقتاً ان پہ ہاتھ صاف کرنے کی مشق کیا کریں گے۔ مگر وہی بات کہ ایک در بند ہوتا ہے تو ستر

دَر کھلتے ہیں۔ ان کی دو آنکھیں کیا بند تھیں کہ ایک سو چالیس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اَن گنت واقعات ہیں' کس کس کو لکھوں۔ اِن کے پُرانے جاننے والے کہتے تھے کہ اِن کے پاس جِنّات بھی ہیں اور چھوٹے بڑے سینکڑوں ہمزاد و موکّل تو اِن کی پگڑی کی تہوں چُنٹوں' سلوکے کی جیبوں' اُچکن کے اندر اور شلوار کے نیفے میں ڈھیرے پڑے رہتے ہیں۔ یہ بھی سُنا کہ وہ اِن جنوں ہمزادوں اور موکّلوں کی اپنے ڈنڈے سے پٹائی بھی کر دیتے ہیں...... ہم بھی اس چکر میں تھے کہ کسی طرح حافظ صاحب کی خدمت سیوا کر کے ایک آدھ جِنّ اور دو چار موکّلوں سے دوستی گانٹھ کر خوب فائدہ اُٹھائیں۔ دوستوں پر رُعب ڈالیں' خوب روپیہ پیسہ ہو۔ جہاں دل چاہے گا' جِنّ اور موکّلات کے ذریعے پہنچ جایا کریں گے۔ گمشدگان کی خبر لگانا' چوروں کا پتہ چلانا' فیل پاس ہونے کی پیشین گوئیاں کرنا...... ویسے حافظ صاحب بذاتِ خود بھی کسی جِنّ یا موکّل سے کم نہ تھے۔ اِن کا کھانا پینا' چلنا پھرنا' علم و فضل' کمالات و تصرفات' ڈیل ڈول' لہجہ کا ایسا کھرج بول' کسی اِنسان کا کم اور کسی جِنّ کا زیادہ لگتا تھا۔ گھوڑے گدھے' کُتّے' بلّیاں' گائیں بھینسیں اِنہیں دیکھتے ہی بدک اُٹھتے تھے۔ ہوائی' افلاکی اور ارضی نادیدہ مخلوقات اِن کی مُشک سُونگھتے ہی نقل مکانی کر جاتی تھیں۔ کشف القبور بھی تھا۔ سفر میں میرا ہاتھ ایسی مضبوطی سے جکڑتے کہ میری کمزور سی ہڈیاں تڑخنے لگتیں' میں کسمساتا تو ڈپٹ کر کہتے۔

''اوئے' ییّی خانے پچھانے نُوں کاں! بیوقوفا' میرے ہاتھ میں ہاتھ مضبوطی سے دیا کر' میں تیری بیٹری چارج کرتا رہتا ہوں۔ تیرے اور تیرے سلسلے' آل اولاد کی خوشبو دافعِ شر اور جہاں قدم پڑیں گے وہاں اَبلیسی حشرات نابود ہو جائیں گے...... یعنی قدمِ درویشاں رَدِّ بلا۔''

● بلیّات کا جلوس' چلّۂ معکوس......!

سیالکوٹ چھاؤنی کے ذرا آگے کھروٹہ سیّداں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے' وہاں کے چند سادات گھرانوں سے حافظ صاحب کی یاد اللہ تھی۔ سیالکوٹ آنا ہوتا تو وہاں بھی جانا لازمی ٹھہرتا' اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اسٹیشن سے نکل کر اِدھر ہی یوں رُخ کر لیتے کہ ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ جب ہمارے ہاں تشریف لاتے تو پتہ چلتا کہ موصوف تو کئی دِنوں سے سیالکوٹ کی نگری میں پدھارے ہوئے ہیں۔ کھروٹہ سیّداں کے سادات۔ اِن سے بڑی عقیدت و مرافقت رکھتے تھے۔ یہاں کے ایک سیّد زادے کا جِنّات' رجال الغیب سے ایک تعلق خاص تھا۔ گاؤں سے بہت پَرے ہٹ کر ان کا حُجرہ تھا جہاں یہ دُنیا جہاں سے بے نیاز' اپنے

مجاہدوں' وظیفوں میں جُتے رہتے تھے۔ محدودے چند قریبی افراد کے علاوہ کوئی اور ان کے حُجرے کی طرف رُخ نہ کرتا کہ اِدھر جنّات اور ہوائی مخلوق کا پہرہ رہتا ہے۔ میں حافظ جی کا ہاتھ پکڑے یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ لیکن جب بھی آیا' دن کے اُجالے میں ہی آیا اور ہمیشہ شام پڑنے سے پہلے واپس گھر پہنچ جاتا۔ حافظ جی اور شاہ صاحب اندر حُجرے میں بیٹھ جاتے اور میں باہر اِدھر اُدھر درختوں پہ طوطوں کے انڈے بچے تلاش کرتا رہتا کیونکہ حُجرے کے اندر جانے یا جھانکنے کی جرأت تھی اور نہ اجازت...... شُنیدن تھا کہ حُجرے کے اندر شاہ صاحب نے بوتلوں' کُپّوں اور مرتبانوں میں جنّات' موکل اور شیش ناگ قید کر کے رکھے ہوئے ہیں۔

جس جگہ یہ محلِ وقوع تھا اس کے جنوب میں شہر اور مشرق میں چھاؤنی کا علاقہ تھا' درمیان میں ایک نالہ گزرتا تھا جو چھاؤنی کی حد بندی کا کام دیتا تھا۔ ہجرہ کیکروں بکائن اور کانٹے دار جھاڑیوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے کے درمیان واقع تھا' آبادی والے دیہہ دیہات اس جگہ سے خاصے دُور دُور تھے۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے کچی پکی سڑک یا کوئی باقاعدہ راستہ بھی تو نہیں تھا' چھاؤنی والے نالے کے چھوٹے سے پُل کو عبور کریں تو بائیں جانب ایک پتلی سی پگڈنڈی کوڈیالے سانپ کی مانند کھیتوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس پہ چل نکلیں تو بہت دُور درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا ہے۔ ایک عام رفتار سے آڑے ترچھے راستوں پہ ٹوٹے رتوں سے بچتے سنبھلتے آخر کار پون یا پورے گھنٹے میں شاہ صاحب کے ڈیرے پہ پہنچا جا سکتا تھا۔ پاس پہنچیں تو ذخیرے کے گِرد خود رو کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ سی دکھائی دیتی ہے۔ اندر داخل ہونے کے واحد راستے کے باہر شیشم کے درخت کے موٹے تنے پہ ایک نمایاں بورڈ ٹنگا نظر پڑتا ہے۔ ''آستانہ سیّد معصوم علی شاہ گیلانی اویسی'' ...... یہ شارعِ عام نہیں' بغیر اجازت ذخیرے میں داخل ہونے کی سختی سے ممانعت ہے...... شاہ صاحب جمعرات کے روز صرف باوضو صوم وصلواۃ کے پابند حضرات سے بعد اَز نمازِ ظہر بوڑھ والی مسجد میں ملاقات کرتے ہیں' بچّوں عورتوں اور نذر نیاز لانے والوں سے معذرت۔ ان اُمور کی پابندی نہ کرنے والا اپنے معاملہ کا خود ذمہ دار ہوگا۔

ہم جب بھی یہاں آئے تو اپنے سوا کبھی کوئی اور نظر نہ آیا۔ کئی بار جمعرات کے روز بھی یہاں آنا ہوا' تب بھی کوئی ملاقاتی یا کوئی فرد آس پاس دکھائی نہ دیا۔ عجیب پُرہیبت اور پُراسرار جگہ تھی' شاید اسی لئے اِدھر کوئی مُنہ نہیں کرتا تھا۔ ذخیرے کے چاروں اطراف چار چار کھیتوں کا رقبہ بغیر کسی کھیتی باڑی کے تھا بالکل یوں جیسے یہاں دن رات گھوڑے دوڑتے رہتے ہوں۔ بُھربُھری نرم نرم مٹی' کُھروں کے نشان...... اس قسم کی جگہ اور زمین اکثر گھوڑوں کے فارموں یا گھڑ دوڑ کے میدان میں ہوتی ہے۔ جہاں زیادہ تر

بچھڑوں، گھوڑوں کی تربیت کے سلسلہ میں آمد و رفت رہتی ہے مگر یہاں بلکہ دُور دُور تک ہم نے کبھی کوئی گھوڑا یا چوپایہ نہیں دیکھا تھا جبکہ زمین پہ کھروں کے نشان یوں دکھائی دیتے تھے کہ جیسے ابھی ابھی اس ذخیرے کے گرد سینکڑوں گھوڑے چکر لگاتے رہے ہوں۔

وہ ایک شکر دُوپہر تھی جب حافظ صاحب کا پسینے سے تربتر صحتمند ہاتھ تھامے، چھاؤنی والے پُل کو عبور کر کے میں ایک شیشم کے درخت کے تلے چند لمحے ستانے کی غرض سے بیٹھا ہوا تھا۔ بھر گرمیاں اور دوپہر۔ جب سورج سوا نیزے پہ کھڑا ہوا ہو تو باہر قدم دھرنا بڑے جگرے کا کام ہوتا ہے مگر حافظ صاحب اور مجھ جیسا افلاطونی، ہم دونوں باہر کے اندھوں اور اندر کے سندھوں کے لئے گرمی سردی، صبح دوپہر، شام یا رات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم دونوں سدا کے جیلانی اور آوارہ گرد، سیالکوٹ آمد پہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم...... میں ان کا ظاہر اور وہ میرے باطن تھے۔

”کاں، کاں“

میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو ایک کوئی، کوا عین اُوپر ٹہن پہ چونچیں کھولے خوش سے بیٹھے ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ حافظ صاحب ایک اُونچی جگہ پہ بیٹھے تھے اور میں ان کے قدموں میں قدرے نیچے [illegible] دوبارہ [illegible] وہ اچانک مضطرب سے ہو گئے۔ ان کے چہرے اور آنکھوں کے ڈیلوں کی گردش تیز ہو گئی، ہاتھ تھر تھر کانپنے لگا۔ نتھنے پُھلا کر چھاؤنی کے پُل کی جانب منہ موڑتے ہوئے انہوں نے مجھے کھینچ کر اپنی گود میں گھسیٹ لیا تیزی سے اپنی چادر میرے چہرے اور شانوں پہ ڈال دی، میرے لئے یہ اچانک پیدا ہونے والی صورتِ حال کے بارے میں کچھ اندازہ کرنا بڑا مشکل ثابت ہو رہا تھا کیونکہ حافظ صاحب نے مجھے اپنی چادر کے خیمے تلے بڑی مضبوطی سے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ ان کے جسم و اعضاء کے تشنج سے مجھے یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ یقیناً کوئی ایسی افتادِ ضرور ٹوٹی ہے جس سے محفوظ و مامون رکھنے کی خاطر انہوں نے خود مُرغی بن کر مجھے معصوم چوزے کی مانند اپنے پَروں کی عافیت میں چھپا لیا ہے۔ تین چار منٹ بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کے جسم کی سنسناہٹ قدرے مدھم اور ہاتھ بازوؤں کی گرفت بھی چنداں ڈھیلی ہوئی ہے...... انہوں نے آہستہ سے مجھے اپنی چادر کے نیچے سے یوں باہر نکالا جیسے مُرغی اپنے چوزے کو چیل بِلّی کے دفعان ہونے پہ مطمئن سی ہو کر باہر نکالتی ہے۔ اندھیرے سے باہر اُجالے میں آتے ہی میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دائیں بائیں دیکھنا چاہا کہ چیل یا بِلّی کہاں ہے کدھر گئی ہے مگر دُور دُور تک سوائے لُو کے لہراتے ہوئے سرابوں اور بگولوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ سر نیہوڑے ہوئے درخت، جُھلستے ہوئے کھیت اور اُوپر چمکتا ہوا سورج۔ اب تو اُوپر

درخت پہ کاں کاں کرتے ہوئے کوئی کوے بھی نہیں تھے جن کی ''کاں کاں'' سننے کے بعد حافظ جی نے مجھے دبوچ کر اپنے گھٹنوں پہ اوندھا کر دیا تھا۔ حلق میں جیسے کانٹے سے اُگ آئے اور زبان اکڑ کر کاٹھ بن گئی تھی' بڑی مشکل سے حلق تر کرتے ہوئے میں حافظ صاحب سے کہہ پایا۔

''حافظ جی! بڑی سخت پیاس لگی ہے......''

● یٰسین کا دُودھ پیاس کا مقصود......!

میں جانتا تھا کہ پانی پیچھے پُل کے پار چھاؤنی تانگوں والے اڈے کے نل یا وہاں کسی دوکان سے مل سکتا ہے یا پھر چند کوس آگے کھروٹہ سیداں سے دستیاب ہو سکتا ہے اور یہ دونوں جگہیں ایسی بھی قریب نہ تھیں کہ آسانی سے پانی حاصل کیا جا سکتا۔ حافظ صاحب میری پیاس کی پریشانی سے آگاہ ہو چکے تھے' بجائے کچھ کہنے یا کوئی جواب دینے کے انہوں نے بڑی محبت سے میرے چہرے اور میرے خشک پپڑی جمے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ مس کرتے ہوئے پھر مجھے پشت کے بل اپنی گود میں ڈال کر اوپر چادر ڈال دی...... یا اللہ! یہ کیسی چادر ہے میری توبہ تلی چاند ماری ہو رہی ہے' پہلے کوے کی کاں کاں پہ چادر پوشی ہوئی' اب پیاس پہ بھی چادر پوشی...... میں گود میں پڑا پڑا ہلکا سا کسمسایا۔ حافظ صاحب نے اپنی بھاری بھرکم آواز اور کہنی کا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''الحمد شریف کا شربت' آیۃ الکرسی کا دودھ یا پھر سورۃ یٰسین کا آبِ زم زم...... بول' تُو ڈل کاں! کی میں تینوں پلاواں؟''

میں بے وقت مگر بقصدِ عجلت بولا۔ ''دودھ...... مگر ٹھنڈا اور میٹھا......''

وہ اسی انداز میں بولے۔ ''تو پھر جلدی سے آیۃ الکرسی سناؤ' تا کہ تمہیں ٹھنڈا' میٹھا اور پُرلطف اللہ کا نُور پلائیں......''

حلق میں تھور اور زبان پہ کانٹے اُگ ہوئے تھے' آیۃ الکرسی پڑھنے کا کہاں سے یارا لاتا؟ فوراً کسی نہ کسی طرح حلق اور لب و زبان تر کر کے آیۃ الکرسی شروع کر دی۔ کبھی بچپنے میں مجھے عادت سی پڑ گئی تھی کہ دُعا کے علاوہ بھی میں کوئی سورۃ یا آیت پڑھنے کے بعد ''آمین'' ضرور کہا کرتا تھا' اسی طرح ابھی بھی میں نے لشتم پشتم آیۃ الکرسی پڑھنے کے بعد زور سے ''آمین'' کہا تا کہ حافظ صاحب اب مجھے جلدی سے ٹھنڈا میٹھا دودھ پلوا دیں۔ اب انہوں نے ہولے سے ہاتھوں کی گرفت ہلکی کر کے میرے اُوپر سے

چادر سرکائی، میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے آس پاس دودھ کھوجنے لگا جو مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اب میرا کسی نہ کسی طور مایوس ہونا ایک لازمی اَمر تھا، میں نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا دُودھ......؟''

وہ حسبِ معمول اپنی آنکھوں کے ڈیلوں کو اُوپر نیچے، دائیں بائیں گھماتے ہوئے مسکرائے، بولے۔

''تمہیں تو صبر کی لاگ تک نہیں لگی، تلی پہ سرسوں جماتے ہو...... ذرا صبر تو کرو بے صبرے!''

میں بھی تڑخ بولا۔ ''آپ نے بھی تو مجھے جلدی سے آیۃ الکرسی پڑھنے کے لئے کہا تھا جو میں نے سُنا دی۔ اب آپ بھی فوراً سے پہلے مجھے دودھ پلائیں، بہت سخت پیاس لگی ہوئی ہے......''

وہ پیار سے میری سر پہ ہلکی سی چپت چپکاتے ہوئے بولے۔

''اُٹھو اور جا کر وہ سامنے کیکر کے پیچھے سے دودھ اٹھا لاؤ۔''

میں اُٹھا اور قدم بڑھاتے ہوئے کیکر کی جانب لپکا، کیکر کے تنے کے پیچھے ایک چھوٹی سی مٹی کی روغنی صراحی نظر آئی جس پہ سُرخ رنگ سے بڑے خوبصورت اور عجیب وغریب سے نقش ونگار بنے ہوئے تھے، ایک چھوٹی سی پکی اینٹ کے اُوپر دھری ہوئی تھی۔ اس کے فراخ منہ پہ مٹی کی چپنی پہ کالے رنگ کا ایک چھوٹا سا رومال پڑا ہوا تھا...... میں سوچ پڑا کہ اس ویرانے میں جہاں دور دور تک کوئی بندہ بشر دیکھنے کو نہیں ملتا، یہ نعمتِ بااہتمام یہاں کون دھر گیا ہے؟...... چند ثانیے استعجاب سے اُسے تکتا رہا، پھر دو قدم آگے بڑھ کر اُنگلیوں کی پوروں سے اس پہ پڑے ہوئے رومال کو مَس کیا، سیاہ بانات کی نرماہٹ میں اک عجیب سی ٹھنڈک تھی۔ جب یقین ہو گیا کہ یہ وہم نہیں، حقیقت ہے تو میں نے بڑی نرسان سے رومال کو اُوپر سے اُٹھالیا...... رومال کے ایک کونے کو دو اُنگلیوں کی چٹکی میں یوں پکڑ رکھا تھا جیسے وہ رومال نہ ہو، زہریلا بچھو یا لُس لُس کرتی ہوئی کسی سیاہ ناگن کی دُم ہو...... صراحی کے منہ پہ سے چپنی کو اُٹھایا تو گاڑھے دُودھ کی دو چار بوندیں، چپنی کے پیندے سے ٹپک کر صراحی میں گر گئیں جس کا مطلب تھا کہ صراحی بھری ہوئی ہے۔ چپنی کے اُٹھانے سے ایسی یخ جھرجھری سی آئی جیسے میں نے برف کے ٹکڑے کو اُٹھالیا ہو، دوسرے ہاتھ سے صراحی کو چُھوا تو وہ بھی یخ بستہ تھی، دونوں ہاتھوں سے تھامے صراحی اُٹھا کر حافظ صاحب کے پاس لے آیا۔

''حافظ صاحب! یہ دُودھ سے لبالب صراحی کہاں سے آگئی ہے، اتنی ٹھنڈی ٹھار کہ جیسے ابھی ابھی اسے کوئی برف خانے سے نکال کر لایا ہو؟''

''اچھا اچھا، اب باتیں نہ بناؤ اور نہ ہی کچھ پوچھ پچھ کرو...... آرام سے بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پیو

اور اللہ کا شکر ادا کرو۔“

مَیں نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”لیں، پہلے آپ پئیں......“

”نہیں، پہلے تم پیو، تمہیں زیادہ پیاس لگی ہے......“

بسم اللہ کہہ کر مَیں نے دونوں ہاتھوں سے کُجا تھام کر ہونٹوں سے لگالیا۔ بظاہر تو یہ دودھ ہی تھا۔ گاڑھا، شیریں، خوشبودار، جیسے اسے الائچی، مغزیات اور کیوڑے میں رچایا بسایا گیا ہو۔ ایسا فرحت بخش اور تسکین آور کہ کیف و لُطف سے میری آنکھیں مُندھ گئیں۔ ایک، دو، تین، چار۔ پھر پانچویں پُچ تک گھونٹ پہ مَیں ہوش و ہوشنگ سے فارغ ہوگیا تھا۔ اُلوہی انبساط و الطاف اور ابلیسی مستی و تلذذ میں یہی ایک نمایاں فرق ہوتا ہے کہ اُلوہی رنگ پھیکا پڑتا ہے اور نہ ہی اس کا انگ چھوٹتا ہے۔ یہ سرور سرمدی ہوتا ہے جس میں اُتر کر انسان ”ہُو“ میں غرق ہو جاتا ہے۔ جبکہ نجس ابلیسی مستی و تلذذ وقتی طور پہ اوپری سی غنودگی پیدا کرتا ہے اور جب اس غنود کا مطلع صاف ہوتا ہے تو طبیعت میں تکدر اور تنفر میں سراندی پیدا ہو جاتی ہے، انسان شگفتگی اور سرشاری کی بجائے شرمندگی اور شکایت سی محسوس کرتا ہے۔ میرا کُجا ہاتھ سے خود چھٹی یا حافظ صاحب نے اُچک لی، کچھ بھی تو یاد نہ تھا۔ آنکھ کھلی تو منظر بدل چکا تھا۔

مَیں شاہ صاحب کے حُجرے کے باہر آم کے پیڑ کے نیچے نرم نرم گھاس پہ دائیں کروٹ لئے لیٹا پڑا تھا۔ سہ پہر لَد چکا اور شام کے سائے اُبھر رہے تھے۔ اک زمانہ مَیں نیم وا آنکھوں سے جاگو میٹی نیند کے مزے لُوٹتا رہا۔ پرندوں کی مترنم چہچہاہٹ، شام سے پہلے پہر کی پُروائی، اشجار و سبزہ کی فرحت بخش مہکار۔ سکوت سکون اور سج سہاتا نے اک بار پھر مجھے سُلا دیا ہوتا اگر ایک کالے کوّے نے اپنی چونچ سے اسے موٹا سا گولر تاک کر میری کنپٹی پہ نہ دے مارا ہوتا۔ مَیں ہڑ بڑا کر اُٹھتے ہوئے اکڑوں بیٹھ گیا، اُوپر تاڑ کرتا کا تو کوّا اُڑ گیا۔ اُدھر خواب و خمار کے پَروں میں ہَوا بھرنے لگی تو خرد و حواس کے خمسے بھی بیدار ہو گئے...... وہ چھاؤنی کے نالے والی پُلی کے پار شیشم کے درخت کے سائے میں دَم دُرست کرنے کے لئے بیٹھنا، پھر یک دَم حافظ صاحب کا مجھے اپنی گود میں گھسیٹ کر اوپر کالی چادر کا تان دینا۔ دھڑ دھڑ، بھگو بھگو کی آوازیں جیسے دو چار نہیں، سینکڑوں ہزاروں تیز رو، تُند خُو دیو ہیکل عفریت نما جانوروں کا گروہ گزر رہا ہو۔ پھر شدّت سے پیاس کا محسوس ہونا، اظہار کرنے پہ حافظ صاحب کا کہنا کہ الحمدللہ کا شربت، آیۃ الکرسی کا دودھ یا سورۃ یٰسین کا زم زم پیو گے؟ آیۃ الکرسی پڑھ کر دُودھ طلب کرنا، پیڑ کی اوٹ میں نقشین مٹی کی صراحی کا ملنا اور پھر میرا جُرعہ جُرعہ دودھ حلق سے نیچے اُتارنا...... اور پھر، پھر......!

اب میں پوری طرح بیدار تھا' کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ حافظ صاحب تک کیسے رسائی ہو؟ ظاہر ہے کہ وہ کہیں اندر شاہ صاحب کے حُجرے میں ہوں گے اور وہاں جاتا تو ایک طرف' محض سوچنے سے ہی جرأت وارادہ کے پرَ دُھواں چھوڑنے لگتے ہیں...... میں حُجرے کے قریب ہو کر ٹہلنے لگا کہ شاید حافظ صاحب کو میری بھنک پڑ جائے یا پھر مجھے ہی کوئی سرا سُراغ مل جائے تو میں عرض کروں قبلہ! شام کے شامیانے کی طنابیں کھنچنی شروع ہو چکی ہیں' واپسی کا راستہ اندھیروں اور کھٹیلوں سے اَٹا پڑا ہے۔ سوکتے سوکتے اِدھر سے چل دیں تو ہم دونوں بچے بوڑھے' بینا اور نابینا کے لئے بہتر ہوگا مگر یہاں لالہ تو تھا' موسے نہیں مل رہا تھا۔ دو چار چکر حُجرے کے گرد پورے کر لئے' ہنوز حافظ آباد نہیں پہنچے تھے۔ آخرش وہیں آ بیٹھے جدھر لیٹے بیٹھے اور اُٹھے چلے تھے۔ اُوپر شام کے شُدھ اُجالے سے تمتمائے آسمان پہ کُونجیں' مرغابیاں غول درغول اپنی شب گاہوں کے راستے پہ محو پرواز تھیں' شفق کی دھنک نے ان کے پروں' اَستروں اور چونچوں پہ آتشیں رنگت' گوٹ کناری کے آنچل سے لہرا دیئے تھے۔ طلوع اور غروب کے سمے سورج بڑی عُجلت میں ہوتا ہے' جھپ اندھیرے دیکھتے ہی دیکھتے ملگجے سے مطلے منڈل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اِدھر شام سے پھر جگہ اُجالے نظروں کے سامنے ہی ماند پڑتے پڑتے بالکل ماند پڑ جاتے ہیں۔ اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا...... ڈیرے کے درخت بونے جیسے آسمان سے جا لگے ہوں۔ پُرہول سا سناٹا' جھینگروں نے بھی سُر چھیڑ دیئے اور دُور دُور دیہاتوں' بستیوں کے کُتوں کی بھوں بھوں بھی شروع ہو گئی تھی...... میرے اللہ! میں کہاں پھنس گیا؟...... حُجرے میں ایسا سناٹا اور تاریکی کہ جیسے صدیوں سے اِدھر کوئی پَشہ تک نہ گزرا ہو۔ حُجرے کا دیہاتی قسم کا دروازہ ایسا بھاری اور خوفناک کہ چھونا کھٹکھٹانا تو کجا' محض اک نظر دیکھنے سے ہی جسم میں جُھرجُھری سی کھید جائے...... سامنے کھڑا میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کھٹکھٹاؤں' آواز دوں۔ یہیں خاموش کھڑا رہوں یا پھر اکیلا ہی شہر واپسی کی راہ پکڑوں؟...... کچھ دیر توقف کے بعد بلا ارادہ اور سوچے سمجھے میرے منہ سے دبی سہمی ہوئی آواز نکلی۔

''حافظ جی! آپ کہاں ہیں؟ رات ہو گئی ہے' گھر واپس بھی جانا ہے......''

وہاں کون تھا جو پلٹ کر مجھے جواب دیتا البتہ اس پُرہول مہیب سے ذخیرے کے رینگنے' اُڑنے اور چلنے پھرنے والے حشرات الارض اور دیگر جانداروں نے میرے آوازے کے جواب میں اپنے ردِّعمل کا اظہار ضرور کیا تھا...... ایک دم جیسے پاؤں تلے زمین کو کانپا لگ گیا ہو۔ تھپ تھپ طبلے سے بجنے لگے' آڑا چوتالہ اڑھائی ماترے' سینے میں دل بھی بجنے لگا۔ بالکل وہی آوازیں' وہی پُرہیبت اور دہشت ناک سی فضا جو آج دوپہر' اُدھر چھاؤنی والی پلی کے پار درخت کے نیچے پیدا ہوئی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ

اُنہوۂ عفریت لحظہ لحظہ میرے قریب تر آتا جا رہا ہے' معاً میں دروازے کے سامنے سے ہٹ کر حُجرے کی بغلی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا...... میرے خدایا! حُجرے کے باہر' حُجرے کے اردگرد سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں کالی کالی موٹی تازی بھینسیں' شعلے پھینکتی آنکھیں' دھواں اُگلتے ہوئے نتھنے' چنگاریاں چھوڑتے ہوئے کُھر' بڑے غیض وغضب کے ساتھ پھنکارتی ہوئی ڈکرا رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے وہ سب کی سب مجھے ہی گھور رہی ہیں کہ بچو! دوپہر کو تو حافظ صاحب کی وجہ سے بچ گئے تھے' اب بچو تو جانیں؟...... بائیں جانب مجھے رات کی رانی کی ایک جھاڑ دکھائی دی' آہستہ سے پیچھے ہٹتے ہٹتے میں اس کی اوٹ میں ہو گیا...... اب میرے سامنے تا حدِ نظر روشن آنکھیں تھیں جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتے ہوئے اندھیرے میں اور زیادہ چمک دار ہو رہی تھیں۔ اچانک ایک موٹا تازہ بھینسا یا بھینس اِدھر حُجرے کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب خیر نہیں' یہ کمبخت مجھے ہی پکڑنے آ رہی ہے۔ میں نے آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دی اور خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں...... ایک بار' دو بار' اور پھر جب کئی مرتبہ میں آیۃ الکرسی کی تلاوت کر چکا اور بھینس کی پکڑ سے بھی بچا رہا تو میں نے آہستہ سے ایک آنکھ کا کونا کھول کر دیکھا تو وہ بھینس میری جانب آنے کی بجائے حُجرے کے اندر چلی گئی تھی...... ہائیں! یہ کیا' بند دروازہ کس نے کھولا اور اس کا اندر جانے کا کیا مقصد ہے؟...... [illegible] ایک بھینس حجرے کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دی' وہ بھی سرنیہوڑے اندر چلی گئی۔ اب چل سو چل' یہ بھینسوں کے اندر جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب میں پچھلا تمام کچھ بھول کر صرف یہ سوچ رہا تھا کہ چھوٹا سا حُجرہ' اب تک کئی بھینسیں سالم کی سالم اندر پہنچ چکی ہیں اور وہ اندر پہنچ کر کہاں سما رہی ہیں' کیا کر رہی ہیں اور کیا شاہ صاحب اور حافظ صاحب اندر ہی ہیں اور اگر اندر ہیں تو وہ ان بھینسوں کو کہاں غائب کر رہے ہیں جبکہ حجرے کا یہی ایک واحد دروازہ ہے' جس کے سامنے سے ہٹ کر تھوڑی دیر پہلے میں اس جگہ رات کی رانی کے جھاڑ کی اوٹ میں چُھپ کر کھڑا ہوا تھا...... اب میں ذرا پیچھے کِھسک' بالکل عقب میں پہنچ گیا اور وہاں سے خودرو جھاڑیوں پودوں کی آڑ لیتا ہوا ایک قدرے اُونچی جگہ پہ آ گیا' اِدھر سے میں آسانی کے ساتھ براہ راست حُجرے کے اندر جھانک سکتا تھا۔ مگر میری یہ کوشش بھی رائیگاں گئی...... بھینسیں دروازے کی چوکھٹ پھلانگتے ہی جیسے غائب سی ہو جاتی تھیں اور پھر یہی گھٹا ٹوپ اندھیرا اُنستا ہوا وہاں رہ جاتا...... مایوس ہونے کے باوجود میں کافی دیر تک وہاں دبکا رہا۔ اب ایک نیا مشغلہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا' میں نے بھینسیں گِننا شروع کر دی تھیں۔ جو گنتی سے پہلے اندر غائب ہو چکی تھیں' انہیں چھوڑ کر اکسٹھ بھینسیں جب گِن چکا تو میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

رات اب اپنے جوبن پہ تھی...... ستاروں سے بھرا ہوا آسمان' پیلا مدھم سا چاند' ابھی آسمان کے

مشرقی کنارے سے لگا پڑا تھا۔ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ آنکھیں اور حواس جب اندھیرے کے خوگر ہو جاتے ہیں تو پھر انسان بھی سانپ' بلیوں' کتوں' چمگادڑوں کی مانند سب کچھ دیکھنے پہ قادر ہو جاتا ہے۔ چور' چوکیدار اور چاہنے والے اندھیروں' اندھے راستوں پہ دیکھنے چلنے کے عادی سے ہو جاتے ہیں۔ یہیں بیٹھے بیٹھے مجھے یاد آیا کہ صبح چلتے وقت میں نے ناشتہ کیا تھا' پھر دوپہر کو صراحی والا دودھ پیا تھا۔ دوپہر اور شام کا کھانا تو کھایا ہی نہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے جب انسان کا شعور' دماغ کسی تحیّر تماشے کے ملاحظے میں مگن ہوتا ہے تو جسمانی ضرورتیں تقاضے اور عوارض پس پشت پڑ جاتے ہیں۔ وہ اس وقت صرف خارج ہوتا ہے' داخل نہیں ہوتا اور دماغی نظام جسمانی اور فطری تقاضوں کو بڑی چالاکی اور مہارت کے ساتھ موخر کرتا رہتا ہے۔ یہی حال اس وقت میرا تھا کہ مجھے اپنی کسی جسمانی ضرورت یا تقاضے کا احساس تک نہ تھا۔ اب میں اچانک اٹھا اسی راستے کو دیکھتا بھالتا اسی پہلی جگہ' رات کی رانی کی جھاڑ کے پاس آ کھڑا ہوا اور ادھر بھینسوں کے اندر داخل ہونے والا لامتناہی سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بھینسوں کو میری موجودگی کا کوئی احساس ہی نہیں یا پھر وہ میری ذات کو اپنے لئے بے ضرر سا سمجھتی ہیں...... اپنے اسی خیال کو مزید تقویت دینے کی خاطر اب میں اوٹ سے باہر نکل کر تھوڑا سا واضح ہو کر کھڑا ہو گیا [illegible] تو دیکھ لیں اور میں بھی اپنے بارے میں ان کا ردِعمل دیکھ لوں۔ انہوں نے میرا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ میں اب بالکل ہی دروازے کی بغل میں نمایاں طور پہ کھڑا تھا کہ ہو سکتا ہے بھینسوں کو اندھراتے کا مرض لاحق ہو اور وہ مجھے اندھیرے میں ٹھیک سے دیکھ نہ پاتی ہوں مگر اب یہاں بھی مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے مجھے کسی طور بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا تھا۔ کافی دیر دروازے کے پاس کھڑا انہیں کھڑے کھروں پہ حجرے میں داخل ہو کر منظر سے غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ اب تک میرے معمولی انداز کے مطابق کوئی تین چار سو گرانڈیل بھینسیں اندر پہنچ کر کہیں اُڑنچھو ہو چکی تھیں...... اسی دوران اندر حجرے میں جھانکنے کی بھی سعیٔ لاحاصل کی' اندھیرا اور بھینسوں کا تابڑ توڑ انداز میں داخل ہونا بھی مجھے کچھ دکھائی دینے میں مزاحم تھا۔ بالآخر میں نے ایک بہت بڑا رسک لینے کا فیصلہ کر لیا...... اس حرکت سے میری جان بھی جا سکتی تھی مگر وہی بات کہ میری پہلے ہی کون سی حرکت یا عمل ایسا تھا جس میں جان جانے کا خطرہ موجود نہ ہوتا تھا؟ درویش نے تو اپنی خواہشوں' آسودگیوں' خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں کی طرح اپنا سر بھی کاٹ کر اپنی ہتھیلی پہ دھرا ہوتا ہے' اسے اپنی جان جانے کا ایسا خطرہ نہیں ہوتا جیسا کہ خطرہ دھیان جانے کا ہوتا ہے۔ دھیان ہی تو گیان ہوتا ہے' دھیان جب دھیرج پکڑتا ہے تو گیان گپت ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم اپنے بابا جی کے حضور بیٹھے ہوئے ہیں'

گفتگو و ارشاد کا سلسلہ جاری ہے۔ بظاہر سب ہمہ تن گوش ہیں' بڑی محویت اور توجہ سے نگاہیں رُوبرو ہیں۔ حاضرین کے چہروں بشروں پہ بیان و ارشاد کے اثرات منعکس ہیں کہ اچانک بابا جی نے نعرہ لگایا۔

''پلٹ' تیرا دھیان کدھر ہے۔'' اور بے دھیان پکڑا جاتا...... فرمایا۔ ''سیان بھی دھیان کی محتاج ہوتی ہے' دھیان اُچٹا' پھوٹا مٹکا۔ جیسے گائیکی میں بے سُرا تو چل جاتا ہے بے گُرا اور بے تالہ نہیں چلتا' اسی طرح دُرویشی میں طالب (مرید) اگر بے دھیانا اور بے اَدب ہے تو وہ محض جنگلی پیاز کی گانٹھ اور جنگلی بیر کی گٹھلی کی مانند ہے کہ چھلکے ہی چھلکے اور گٹھلیاں ہی گٹھلیاں ہوتی ہیں......''

اب مَیں اس تاک میں تھا کہ جونہی مجھے ایک بھینس کے بعد دوسری بھینس کے گزرنے کا درمیانی وقفہ ملے' تو مَیں یکدم حُجرے کے اندر چھلانگ دوں' دیکھوں تو سہی کہ اندر کیا ہے۔ حافظ صاحب اور شاہ جی کہاں ہیں اور یہ لاتعداد گرانڈیل بھینسیں اندر پہنچ کر کس گہری کھائی میں اترتی جا رہی ہیں؟

کافی دیر اِدھر کھڑا مَیں ان کی ٹائمنگ نوٹ کرتا رہا لیکن کچھ پلے نہ پڑا' کبھی درمیانی وقفہ بڑھ جاتا اور کبھی بالکل ہی آگے پیچھے ایک دوجی کی دُموں سے بندھی ہوئی دکھائی دیتیں۔ اس صورت میں میرے لئے اندھے کھڈے میں چھلانگ لگانے والی بات تھی۔ بہرحال مَیں چھلانگ لگا کر اندر کودنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب میری ساری چنوتی' مقدر کے بعد دیکھنے اندر جانے پہ حرکت کر رہی تھی اور مَیں کسی چیتے کی طرح اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کو سکیڑے آمادۂ پیکار تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے مَیں نے اپنے اندازے کے مطابق ایک درمیانی وقفہ تلاش کر کے زقند لگا ہی دی اور وہی کہ اندازے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ مَیں دھڑم سے حُجرے کے اندر' عین بیچ چوکھٹ مُنہ کے بل اوندھا جا پڑا جبکہ مجھے اندر دائیں کونے میں گرنا چاہئے تھا کہ مَیں ان کی ''کھردُبرد'' سے محفوظ رہتا۔ اب مَیں ان بھینسوں کے خوفناک کُھروں کے نیچے خود کو ''لِکانگ'' ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ سر' گردن' پیٹھ' کمر' ٹانگیں کوئی جسم کا حصّہ ایسا نہ تھا جو ان کے کُھروں کی زد میں نہ ہو۔ آپ نے قصاب کو بُغدے سے قیمہ بناتے ہوئے بارہا دیکھا ہوگا' بڑی مشّاقی اور پُھرتی سے دو ہاتھ پانی سے بھگو بھگو کر بوٹیوں کو اکٹھا کرتے ہوئے مسلسل بُغدے کی ضربوں سے قیمہ بنا رہا ہوتا ہے' بس یہی حشر میرے جسم کی بوٹیوں کا ہو رہا تھا اور مَیں کمال بیداری اور ہوشیاری سے اپنا قیمہ ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا تھا۔ ذرا تصور کریں کہ کسی نیچے پڑے ہوئے شخص کے اُوپر سے وحشی جانوروں کا ریوڑ اسے روندتے ہوئے گزر رہا ہے اور وہ شخص صحیح سلامت بھی ہے' یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات میری سمجھ میں اس وقت آئی جب نادابستگی میں مَیں نے کروٹ بدل کر اُٹھنے کی کوشش کی اور مَیں اُٹھ کر بیٹھ بھی گیا اور پھر بیٹھا ہی رہا' میرے اوپر سے بھینسوں کا ریوڑ گزرتا رہا۔ مَیں

اکڑوں بیٹھا ہوا خوب جائزہ لے رہا تھا یا وہ سب واہمہ تھے یا پھر میرا جسم و وجود اتنا مرّوق و معرّا بن گیا تھا کہ وہ جانور نہ تو مجھے دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی وہ مجھ سے متصادم ہو کر کوئی نقصان پہنچا سکنے پہ قادر تھے وہ بغیر کسی مزاحمت آر پار ہو رہے تھے جیسے پانی' پانی کے لئے مزاحم نہیں ہوتا یا جیسے غیر مرئی انفاس' غیر مرئی عناصر میں اپنے سالمے توڑے بغیر شعاعوں کی مانند گزر جاتے ہیں یا یوں کہ بصارت' ہوا' پانی' فضا' فاصلے' شعائیں' آتش اور نوری مخلوق کو گزند پہنچائے بغیر کروڑوں نوری میل دور چمکتے چاند سورج ستاروں تک پہنچ جاتی ہے...... اب میں مزے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ بازو پھیلا کر سامنے بھینسوں کی طرف کر دیئے' وہ اپنے اسی وحشیانہ انداز میں ڈکراتی' پھنکے مارتی ہوئی میرے جسم سے گزرتی جا رہی تھیں جیسے میں سینما سکرین کے سامنے کھڑا ہوں اور سکرین پہ جنگلی بھینسیں سامنے سے بھاگتی ہوئی میری جانب آ رہی ہیں۔ کچھ دیر یہ لطف لینے کے بعد میں نے اپنا رُخ پلٹ کر اندر کی طرف کر لیا یعنی جدھر بھینسیں جا کر غائب ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک کامل اندھیرا تھا میں چند قدم اور آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی منڈیر سے ٹکرا کر رُک گیا۔ ہاتھ سے ٹٹولنے پہ محسوس ہوا کہ یہ کوئی تین ساڑھے تین فٹ اونچی دائرہ نما اینٹوں کی منڈیر ہے جو ایک چھوٹے سے کنویں کے گرد بنی ہوئی تھی۔ چند ثانیے میں منڈیر پہ ہاتھ ٹکائے غور کرتا رہا کہ اس کنویں کا یہاں کیا مقصد ہو سکتا ہے [illegible] جان چکا تھا کہ بھینسوں کا آنے والا ریوڑ اسی کنویں میں کود رہا ہے۔ اب میں مزید ٹوہ لینے کی خاطر منڈیر کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھنے لگا' اسی طرح بہ مشکل نصف قطر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں جیسے ایک درخت سے ٹکرایا' ٹٹولا تو وہ واقعی ایک درخت تھا۔ مگر حجرے میں درخت کا کیا کام؟...... یہاں میرا رُخ بالکل دروازے کی طرف تھا یعنی جدھر سے بھینسوں کی یلغار اندر آ رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو حجرے کے باہر جہاں تک نظر کام کرتی تھی' بھینسیں ہی بھینسیں تھیں۔ میرے خدا! کیا دنیا بھر کی تمام بھینسیں اِدھر ہی اکٹھی ہو گئی ہیں؟...... میں ابھی اسی بات پہ غور کر ہی رہا تھا کہ کسی نے بڑی بے تابی سے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا...... نہیں' بلکہ جیسے کسی نے لپک کر بجلی کا مین سوئچ آن کر دیا ہو' پلک جھپکتے ہی حجرہ بقعۂ نور بن گیا۔ حافظ صاحب نے مجھے یوں کلائی سے پکڑ رکھا تھا جیسے مجھے کبھی چوری چوری امرود توڑنے پہ ایک مالی نے پکڑا تھا۔

- ایکشن نمرود اور امرود......!

یہ واقعہ اس حافظ صاحب والے قصہ سے پہلے کا ہے۔ سیالکوٹ کے شمال مشرق' شہر کے

مضافات میں آموں' جامنوں اور امرودوں کے خاصے باغات تھے۔ نالہ توی کے کنارے پہ باغات اپنے خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں کی وجہ سے بڑے مشہور تھے۔ ہم شرارتی اور ندیدے بچوں کے لئے یہ باغات ٹماٹروں ککڑیوں' مولیوں گاجروں سے لدے پھندے کھیت' نالہ توی کا اتھلا گہرا ٹھنڈا پانی' پونگ یعنی بچہ مچھلی کا شکار' بیا چڑیا کے لٹکتے ہوئے گھونسلے' جنگلی کبوتر' فاختائیں اور ہریل طوطوں کے بچے انڈے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھے۔ ہمارا جب بھی موڈ ماحول بنتا' سکول مسجد سے بھگوڑے ہوتے یا گھر محلے سے کسی وجہ کی بنا پہ راہِ فرار اختیار کرتے تو دو چار چھ لفنگے اکٹھے ہو کر اِدھر ہی کا رُخ پکڑتے۔ پھر سارا دن دوپہر خوب لوٹ ماری' نچل خواری اور گدھے سواری کے بعد شام کے پھیلتے سایوں میں سہمے سہمے اپنے اپنے گھروں میں چوروں کی طرح داخل ہوتے۔ گالیاں' کوسنے' جوتے کھا پی کر روغنی بے شرموں کی مانند پھر اگلے دن کی شرارتوں کی تیاری میں لگ جاتے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جسے ماہرین نفسیات ''گولڈن ایج'' کہتے ہیں۔ جن خوش نصیبوں کا بچپن شرارتوں' آوارہ گردیوں' لڑائیوں مارکٹائیوں' چوریوں چکاریوں اور گھر سے بھاگ بھگوڑیوں میں گزرتا ہے وہ اپنی آئندہ زندگی میں بڑے بھرپور انسان بنتے ہیں۔ اوائل عمری میں ہی وہ سب کچھ سیکھ جان جاتے ہیں جو ان کی آئندہ زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ میں نے جو بچپن سے پایا اور سیکھا ہے وہی میرا اثاثہ ہے۔ میں جوانی اور بڑھاپے میں انہیں ہی دُہرا رہا ہوں۔ آج قبر کنارے بھی میں وہی کھلنڈرا' چٹورا' چور' کمینہ' آوارہ گرد' مکار اور مطلب پرست ہوں۔ چوری چکاری آج بھی اسی طرح ہے' ڈاکہ ڈوکا ڈالنے سے آج بھی نہیں چوکتا۔ نظربازی آج بھی چلتی ہے۔ پھبتی کسنے' جگت لگانے' کسی کی دُم میں نمدا باندھنے' حسد رشک...... اور کسی کی پیٹھ پیچھے اچھائی بُرائی کہنے سُننے میں آج بھی باز نہیں آتا...... ہاں' تو میں بات کر رہا تھا اپنی بچپن اور امرود چوری کرنے کی پاداش پہ چوکیدار کے ہاتھوں پکڑے جانے کی۔

پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے۔ ''اُجڑیاں باغاں دے گالڑ راکھے'' پھول پھلوں کے باغ جب ثمرات سے خالی ہو جاتے ہیں تو پھر وہاں کسی نگہبان' چوکیدار' راکھے کی ضرورت باقی نہیں رہتی' بعینہٖ زبان جب ذکر اور دیدہ و دل جب دھیان سے دُور ہو جائیں تو پھر نحوستوں' محرومیوں' پریشانیوں اور رسوائیوں کے گالڑ اس انسان کے رکھوالے بن جاتے ہیں۔ پھل پھولوں' نگہبانوں اور انسانوں سے خالی کھیت کھلیانوں' گھروں اور باغ باغیچوں میں حشرات الارض اور بلیات الافلاک قابض ہو جاتے ہیں' نساچر اور ابلا پریوں کے ٹھکانے بن جاتے ہیں۔ چلّے' وظیفے اور علوی سفلی عملیات والے ان ویرانوں میں آ براجمان ہوتے ہیں۔ کشتے' عرق' ناجائز ادویات' دیسی شراب ٹھرا کشید کرنے والوں' جانوروں کی افزائش نسل'

کپڑا چھڑا ر تکنے ٹھکانے، جانوروں کی آنتوں کی تندی ڈوری اور دھاگے پہ مانجھا لگانے والے بھی ادھر کا رُخ پکڑ لیتے ہیں۔ نشے پانی کی علّت والے بھی ادھر آ بیٹھتے ہیں۔ غرضیکہ یہ اُجڑے ہوئے باغ ذخیرے خدائی مارے منحوس ہوتے ہیں، ہر وہ کام جو آبادی میں یا شریف انسانوں کے سامنے نہیں ہو سکتا، وہ یہاں کُھلے بندوں سرانجام دیا جا سکتا ہے، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوتا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ''اُجڑے باغاں دے گالڑ راکھے''...... احمد فراز کے مشہور شعر کا مصرعہ ہے......

''ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی''

ہمارا وہ وقت، زمانہ وفا، دغا کے بکھیڑوں میں پڑنے کا نہیں تھا۔ اس لئے ہم بچہ لوگ اُجڑے باغوں میں بلبلوں، گلہریوں، طوطوں، قمریوں کی نگاہوں سے اوجھل کہیں پتوں کے جھرمٹوں میں چُھپے لُکے رہند کھوند امرودوں کے لئے چلے جاتے تھے۔ ایسے بے موسے اِکے دُکے نایاب امرود، جن کے اوپر گہری زنگی جُھریاں چھائیاں پڑی ہوتیں، بڑے رسیلے اور میٹھے ہوتے ہیں۔ ہم بچوں کا تجربہ تھا کہ امرود کا ہر جھاڑ بے موسے وقت میں بھی ہم ایسے ندیدے بچوں کے لئے ایک آدھ دانہ اپنے پتوں کے دامن میں ضرور چُھپا کر رکھتا ہے۔ بس اس کی تلاش شرط ہوتی ہے اور [illegible] سے خاصا اوپر چوٹی کی کسی پھنگ پہ ہرے پیلے اودے خشک و تر پتوں کے جھرمٹ میں دُلہن بنا چُھپا ہوتا ہے۔ ایسے اُجڑے پُجڑے باغ میں پہنچ کر ہم سب سے پہلے اس امر کی تسلی کر لیتے کہ آس پاس کوئی رکھوالا موجود تو نہیں؟ ہم اپنی نفری کے مطابق باغ کے درختوں یا حصوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے اور پھر اپنی اپنی قسمت، محنت یا تجربہ کہ ہمیں کچھ ہاتھ بھی آتا ہے کہ نہیں؟

امرود کا پیڑ کوئی ایسا بلند نہیں ہوتا اور نہ ہی ٹہن ٹہنیاں اور چھال دوسرے درختوں کی طرح سخت اور کھردری ہوتی ہے...... بس ہم بندروں کی مانند پیڑوں پہ دھینگا مشتی کرتے رہتے، بچوں کی ہڈیوں کی طرح چونکہ امرود کا پیڑ بھی بڑا کمزور ہوتا ہے اس لئے کبھی کبھار ہم میں سے کوئی بچہ ٹانگ بازو بھی تڑوایا ہڈی جوڑ کھسکوا لیتا۔ یہی ایک بے موسی رُت تھی کہ ہم پانچ بچے جن کا شمار محلے کے شرارتی ترین بچوں کے پنچوں میں ہوتا تھا، ایک بھری دوپہر نالہ توی عبور کر کے ''شاہاں دے باغ'' میں پہنچے۔ یہ باغ رنگ پورہ سے چار کوس کے فاصلے پہ ریلوے لائن کے ساتھ ایک نشیب میں واقع تھا۔ ادھر پہنچنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ شہر کے قرب و جوار کے چھوٹے بڑے باغوں میں ''امرودوں کا شکار'' ختم ہو چکا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ''شاہاں دا باغ'' اُوپر چھت اور نہ گرد کوئی دیوار، ملنگ نہ کوئی مجاور، چادر نہ کوئی چوکا۔ یہ کوئی سیّد صاحب تھے جنہیں اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں مذہبی جنونی سکھوں کے ایک گروہ نے وضو کرتے

ہوئے شہید کر دیا تھا۔ مشہور تھا کہ جو کوئی جائز خواہش اور مُراد کے حصول کے لئے یہاں آ کر فاتحہ پڑھے اور پھر آنکھوں پر کپڑا باندھ لے' خشوع خضوع سے ایک تسبیح دُرود شریف پڑھ کر اُٹھے اور اِسی حالت میں قبر کے تھڑے پہ ہاتھ پھیر کر کسی اَمرود کو تلاش کرے۔ اگر تھڑے کے گرد ایک چکر میں کوئی اَمرود ہاتھ لگ جائے تو آنکھوں کی پٹی کھول کر اَمرود کھا لے اور پھر اسی باغ سے اَمرود خرید کر بچوں میں تقسیم کرے' اللہ کے فضل اور ان سیّد صاحب کی دُعا وسیلے سے آنے والے کی جائز مُراد پوری ہو جاتی ہے...... اَمرودوں کے موسم میں یہاں کچھ اور ہی عالم ہوتا...... امرودوں کی حفاظت کے لئے چوکیدار بھی ہوتے اور باغ کا ٹھیکیدار بھی یہاں جھونپڑا بنا کر بیٹھ جاتا' عقیدت مندوں کا آنا جانا بھی لگ جاتا اور رونقیں پھر بحال ہو جاتیں اِسی طرح موسم ختم ہوتے ہی ٹھیکیدار' ہاکے' چوکیدار اور مُرادیں مانگنے والے' بنجاروں کی طرح غائب ہو جاتے اور پیچھے باغ میں ویرانیاں' خاموشیاں' کالا اور یا پھر سیّد صاحب رہ جاتے ہیں جن کا دل بہلانے کے لئے کبھی کبھی ہم ایسے شرارتی ندیدے بچے اَمرودوں کے لالچ میں یہاں پہنچ جاتے۔ کوئی اکا دُکا مسافر راہرو یا پھر کوئی جیتے جاگتے انسانوں کا ڈسا ستایا ہوا انسان یہاں قبر میں آسودہ لیٹے ہوئے انسان کو اپنا دُکھڑا سنانے پہنچ جاتا۔

یہاں [illegible] میری حیثیت ہاتھ کی چار اُنگلیوں کے ساتھ پانچویں انگوٹھے کی سی تھی۔ [illegible] دوسرے لڑکے بھی اپنی اپنی جگہ چندے آفتاب' چندے ماہتاب [illegible] اور مکاریوں' دھوکہ بازیوں' شرارتوں' چوریوں' اُسترا کاریوں کی اُستادیوں میں ماسٹر تھے مگر میرے آگے پھر بھی ان کی حیثیت محض بچہ بلونگڑوں کی سی تھی۔ میں تو جماندرو "پی ایچ ڈی" کیے ہوئے تھا' کہنا مقصود یہ کہ اس قسم کی ہر واردات اور کارروائی کے پیچھے میرا ہی ماسٹر مائنڈ ہوتا یعنی میں ہی ان وارداتوں کا گروپ لیڈر تھا۔ اپنی شرارتوں' وارداتوں کے بھی ہم نے خفیہ نام رکھے ہوئے تھے۔ کارروائی سے پہلے ایک زبانی کلامی سرکلر کے ذریعے چاروں ارکان کو اَز قسم ایکشن وقت' جگہ اور ضروری تیاری کے متعلق مطلع کر دیا جاتا۔ مثال کے طور پہ اگر اَمرودوں کی کارروائی ہے تو خفیہ کوڈ ورڈ "ایکشن نمرود" یعنی امرودوں کا ایکشن ہوتا۔ "ککڑی کوڈی" یہ کوڈ ورڈ مرغی کو کوڈی کی مدد سے اغوا کرنا اور پھر اسے خفیہ طور پہ پکانے کے لئے مخصوص تھا۔ "کوٹھا چھاپہ" فلم کے پہلے شو پہ بھگدڑ رش میں سینما کے اندر گھسنا تھا۔ "بورے پھاڑنا" کا مطلب' رات کے وقت سڑک پہ گزرتی ہوئی بیل گاڑیوں پہ لدی ہوئی آلوؤں کی بوریاں کاٹ کر آلو چوری کرنا ہوتا۔ جنہیں ہم رات بھر محلّے کے تنور پہ بیٹھے بھون بھون نمک لگا کچے پکے' کھاتے رہتے۔ "خدا خوفی" کا کوڈ' مزاروں پہ لوگوں کے ڈالے ہوئے پیسے اور مسجدوں کے لوٹوں سے تیل چرانے کے متعلق تھا۔

''کرونجا'' صرف اپنے جگت اُستاد حافظ منّا کی سربراہی میں چالیسویں، محفل نعت، ختم شریف، قرآن خوانی کی محافل میں محض کھانے پینے اور دونی چونی کے لئے شامل ہونے کے لئے تھا۔ اللہ معاف کرے۔ سر پہ رومال باندھے، آنکھوں میں ندیدگی چھکائے، وضو نہ طہارت، محض گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں کئی کئی قرآن ختم ہو جاتے۔ ایک کی جگہ تین تین صفحے اکٹھے اُلٹے جا رہے ہیں۔ توبہ توبہ! اللہ میاں جی کے ساتھ بھی فراڈ کرنے سے حجاب نہیں آتا تھا۔ اس نادان عمر کے گناہوں کی سزا آج اس بڑھاپے میں بھگت رہا ہوں۔ ہاتھوں کی باندھی ہوئی ہونٹوں سے اور ہونٹوں کی لگائی ہوئی گرہیں آنکھوں کی پلکوں سے کھولنی پڑ رہی ہیں۔ میرا مالک و خالق میرے گناہ معاف کرے بڑا گنہگار اور خطا کار ہوں۔

''شاہاں کے باغ'' پہنچ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''بچو! چھوٹی موٹی کھانے پینے کی اشیاء کی چوری چکاری اور چھینا جھپٹی ہمارا شغل ہے، پیشہ نہیں اسی لئے ہمیں آج کا ''ایکشن امرود'' شروع کرنے سے پہلے شاہ صاحب کو سلام کرنا چاہئے اور پھر ان کی اجازت سے اپنا کام شروع کرنا چاہئے......''

ان بے صبروں نے جواب دیا کہ ہمیں بڑی سخت بھوک لگی ہے۔ ہم چاروں امرود ایکشن کرتے ہیں، تم ہمارے سربراہ اور نمائندے کی حیثیت سے اکیلے ہی وہاں مزار پہ جا کر سلام فاتحہ اور اجازت وغیرہ سے فارغ ہو لو ویسے بھی ہمارا وضو ہے اور نہ ہی نیت اور کپڑے پاک صاف ہیں اور یوں بھی ہمیں وہاں جانے سے خوف آتا ہے..... یہ کہہ کر وہ پیڑوں پہ چڑھ گئے اور میں اکیلا شاہ صاحب کی قبر کی جانب بڑھ آیا۔ امرودوں کے پیڑ ایک مناسب فاصلے پہ ہوتے ہیں، قطار در قطار، درمیان میں پتلی سی پگڈنڈیاں اور روشیں ہوتی ہیں۔ پت جھڑ نے پتّے پتّے کا پتّا مارا ہوا تھا۔ حرف الف سے شروع ہونے والے پھل، از قسم انگور، امرود، انار، آم، انجیر، آلو بخارا، آڑو، اناس وغیرہ کے پتّے جب جھڑنے پہ آتے ہیں تو شرم کے مارے شعلہ رُو ہو جاتے ہیں، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے شاخساروں پہ خون چڑھ کر جم گیا۔ پھر جب آخری ہچکی توڑ کر پتّا لہریئے لیتا ہوا زمین پہ آ رہا ہوتا ہے تو وہ کسی کٹی ہوئی پتنگ کے کلیجے کا کٹا ہوا ٹکڑا جاپ پڑتا ہے۔ ایسے ہزاروں لاکھوں کٹے ہوئے کلیجے میرے پاؤں تلے ''کچ کچ'' کر رہے تھے۔ لہو سے لتھڑے ہوئے پاؤں اُٹھاتا ہُوا میں ایک لمبی پگڈنڈی طے کرتا ہوا سیّد صاحب کے مزار تک پہنچ گیا تھا۔ ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے میں نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے..... فاتحہ اور دُعا کے بعد جی میں جانے کیا آئی کہ میں نے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پہ باندھ لیا اور پھر درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے چبوترے کو ٹٹولتے ٹٹولتے اردگرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ چکر چیز ہی ایسے ہوتے ہیں کہ انسان چکر لگاتے لگاتے چکرا سا جاتا

ہے۔ اطراف کی سُدھ بُدھ ماری جاتی ہے' دماغ گھوم جاتا ہے اس لئے کولہو اور کنویں کے سانڈ' میکے گھر کے چکروں میں پڑی ہوئی رانڈ' لگن منڈپ کے گرد بکھری ہوئی کھانڈ اور اپنے کٹم قبیلہ کی چکرداری سے نکلے ہوئے بھانڈ کی قدر و قیمت اسی لئے کم ہوتی ہے کہ یہ چکرائے ہوئے ہوتے ہیں۔

کچے پکے اُمرودوں کی مانند بچوں کے ذہن بھی کچے' پکے لالچی سے ہوتے ہیں۔ ابھی مال و زر اور جاہ و حشمت کی چکاچوند نے اِن کی معصوم سی زندگی کو حرص و طمع اور لالچ و لوبھ سے زہر آلود نہیں کیا ہوتا۔ بچے کے سامنے دو چار کھٹے میٹھے بیر' ایک آدھ بلبلوں' طوطوں کا ٹونگا ہوا اُمرود اور پاس ہی سوا سیر پکا سونا' آدھ پاؤ الماس اور مُٹھی بھر سچے موتی رکھ دیئے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بیر اور اُمرودوں پہ ہی پہلے ہاتھ صاف کرے گا۔ پھر اگر جی چاہے گا تو ان "فضولیات" کی جانب بھی دیکھ لے گا...... میں بھی پیٹ کا پاپی اور نظروں کا ندیدہ' چکر کاٹنے کے دوران دُرود شریف پڑھتے ہوئے اُمرودوں کے متعلق سوچنے لگا کہ اگر یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیّد صاحب کی دُعا وسیلہ سے پھر اچھے اچھے' میٹھے میٹھے اُمرود مل جائیں تو مزہ آ جائے اور چار یاروں میں بھی ذرا ٹور بن جائے گا۔ نادان تھا جو ایسا سوچا' سیّدِ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور [illegible] تو کیا ہی اچھا ہوتا؟...... بہرحال اب تو سوچ کے پرندے کو پر لگ چکے تھے اور وہ دماغ کے قفس سے آزاد ہو کر اُڑ چکا تھا۔ اچانک چبوترے کو ٹٹولنے والا ہاتھ کسی نرم نرم گول سی چیز سے مس ہوا' چہرے پہ سے رومال سرکا کر دیکھا تو وہ ایک چھوٹا سا گہرا سرخ اُمرود تھا' اُمرود تھا یا گہر یمانی؟ یک دانہ نایاب' سبز مخملیں پتوں کے ڈھیر کے درمیان دھرا ہوا۔ اس کی عنابی رنگت کی آب و تاب سے نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ چند لمحوں کی نظارگی کے بعد میں نے استعجاب و اشتیاق سے ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھا لیا۔ اس اُمرود کی مخصوص مہک نے مجھے سرشار سا کر دیا تھا۔ نعمت تو یہ کام و دہن کے لئے تھی مگر اس سمے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ دولت صرف دیکھنے' سونگھنے' چھونے اور محسوس کرنے کے لئے ہے۔ پھر میں نے ڈھیر سے پتوں کو اس خیال سے ٹٹولا کہ شاید ان میں کوئی اور ایسا ہی اُمرود نکل آئے۔ مزید اک خوشگوار سی حیرت سے دوچار ہوا جب میں نے وہاں پتوں میں چند اور اُمرود بھی دیکھے۔ یہ ایسے خوش رنگ اور خوش نظر اُمرود کہاں سے آئے' انہیں یہاں کون رکھ گیا؟...... میں گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' بھلا یہاں میرے سوا اور کون ذی نفس تھا؟ میں نے پتوں سمیت اُمرود اُٹھا کر اپنی جھولی میں بھر لئے اور چلا کشاں کشاں اپنے چاروں یاروں کو تلاش کرنے کہ دیکھو' میری جھولی میں جھانکو' کیسے کیسے اُمرود میں لایا ہوں؟...... ابھی بمشکل چند قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ کرخت سی ڈپٹ نے مجھے جیسے ایمرجنسی بریک لگا دیئے۔

''اوئے چور دے اَگّے مورا' اوتھے ای کھلو جا......''

وہیں کھڑے کھڑے میں نے گردن گھما کر دیکھا...... میرے اللہ! ایک اُلٹ چرَ چبوترے پہ اُمرودوں والی جگہ پہ کھڑا خشمگیں نظروں سے میری جانب دیکھ رہا ہے۔

حاضرات' موکلات' ہمزاد' رَجل الغیب' وساسول' ابلا پری' چھل پیری' مُلہم غیب' جن' بھوت پریت' ڈائن' خون آشام' چڑیل' چنڈال' آنکھ چرے' پرتوے۔ ایسے کئی ایک نام میرے مضامین میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ایسے ہی اُلٹ چرَ بھی ایک رجیمی شیطانی استعانت ہوتی ہے۔ یہ ابلیسی پیکر چاہے تو زمین سے لے کر پہلے آسمان تک طویل ہو سکتا ہے اور کسی بھی مکروہ پلید جانور کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال سکتا ہے۔ انسانی پیکر میں ہو تو اس کا چہرہ اُلٹا ہوتا ہے یعنی ماتھا' ٹھوڑی کی جگہ اور آنکھیں ہونٹوں کے اطراف میں ہوتی ہیں۔ یہ اپنے سر کو چاروں اطراف گھمانے پہ قادر ہوتا ہے۔ یہ عفریت اکثر و بیشتر شہداء کی قبور کے آس پاس پائی جاتی ہے۔ یہ دراصل اس ظالم بدنصیب مرے ہوئے انسان کا بگڑا ہوا بھوت ہوتا ہے جس نے کبھی کسی بھی وجہ سے صاحبِ مزار کو شہید کر دیا ہوتا ہے۔ شہید کی قبر پہ جب بھی کوئی فاتحہ' درود شریف یا قرآن پاک ایصالِ ثواب کے لئے پڑھنے آتا ہے تو اس مردود کو بڑی اذیت پہنچتی ہے' ہر حرف و لفظ پہ اسے پچھاڑیں پڑتی ہیں۔ اس لئے اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ یہاں پہنچنے والوں کو ہراساں کر کے بھگا دے۔ میں بھی درود شریف پڑھتے ہوئے اُمرودوں کے بارے میں سوچ بیٹھا تھا' سید صاحب نے اپنے تصرف سے میری اُمرودوں سے تواضع کر دی اور میں اُمرود لے جا رہا تھا کہ اس نے مجھے آواز دے کر خوف زدہ کر کے روک لیا۔ اس سے پیشتر کہ میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ لیتا' وہ میرے پلک جھپکنے سے پہلے میرے سر پہ کھڑا تھا جبکہ میں نے اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میری سوچ سے بھی پہلے اپنے ریچھ جیسے بالوں سے بھرے بھدے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی۔

بالکل ایسے ہی انداز میں میری اور کسی نے کلائی پکڑی تھی مگر اس بار میری کلائی پکڑنے والا کوئی اُلٹ چرَ نہیں تھا' یہ تو اپنے پیارے حافظ صاحب تھے' کلائی پکڑ کر انہوں نے مجھے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ روشنی سے یکدم اندھیرے میں جانے سے جیسے کچھ دکھائی نہیں دیتا' اسی طرح گھپ اندھیرا اگر اچانک چندھیا دینے والی روشنی میں تبدیل ہو جائے تو انسان کو کچھ دیر کے لئے نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ کچھ سجھائی' اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اگرچہ روشنی ہو چکی تھی مگر یہ سب کچھ ایسی عُجلت اور ڈرامائی انداز میں ہوا تھا کہ میں گرد و پیش سے ہی بے خبر ہو گیا۔ میں حافظ صاحب کے ساتھ چمٹا کھڑا تھا۔

وقت یوں جیسے تھم سا گیا ہو۔ بھینسوں کی یلغار کی دھب دھب' افراتفری' بھونچال سی کیفیت جیسے رُک سی گئی تھی۔ جب طوفان گزر گیا تو حافظ صاحب کے ہاتھ بازوؤں کی گرفت قدرے ڈھیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے موقع پا کر اُن کی بغل سے یوں مُنہ باہر نکالا جیسے شتر بچہ' بادِ سموم کے گزر لینے کے بعد عافیت کی گُن سُن پا کر سانس روکے ہوئے اپنی تھوتھنی نکالتا ہے۔ دُور دُور' باہر کھیتوں تک کہیں بھینسوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مناسب سی روشنی میں جب آنکھیں حُجرے کے اندر کا جائزہ لینے کے قابل ہوئیں تو پہلا منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا' وہ مجھے دہلا دینے کے لئے کافی تھا...... شمشاد کا ایک جواں سال درخت جس کا ایک ٹہنا اسی منڈیر والے کنویں کے اُوپر بڑھا ہوا تھا' اس کے ساتھ شاہ صاحب اُلٹے بندھے ہوئے کنویں کے اندر لٹکے ہوئے تھے۔ میں یہ ہولناک منظر دیکھ کر ایک بار پھر سہم کر حافظ صاحب کے ساتھ چمٹ گیا۔ چند لمحے آنکھیں بھینچے رکھنے کے بعد میں نے پھر کنکھیوں سے کنویں کی جانب دیکھا۔ وہی کچھ جو ہماری سرائے پٹھاناں سیالکوٹ میں ہر سال عُرس کے موقع پہ ہوتا تھا کہ سماع کے دوران جس شخص کو ''حال'' آتا تھا اس کے پاؤں گھٹنوں پہ موٹے کپڑے کے پٹی لپیٹ کر رسّے سے اُلٹا برگد کے ٹہن سے لٹکا دیتے تھے۔ وہ اُلٹا پھانسی سے لٹکا ہوا جھول جھول کر حال کھیلتا رہتا۔ جب تک وہ تھک ہار کر شانت نہ پڑ جاتا' نیچے نہ اُتارا جاتا۔ یہ منظر دیکھ کر بڑی اذیت سی محسوس ہوتی تھی کہ یہ اگر پاؤں کی بجائے گردن سے لٹکا ہوتا تو اسے شاید یوں جھول جھول کر مزے سے حال کھیلنے کی مہلت نصیب نہ ہوتی...... شاہ صاحب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا کہ وہ اُلٹے لٹکے ہوئے تھے مگر بالکل بے حس و حرکت جیسے کسی نے انہیں فارغ کر کے عبرت کے لئے اُلٹا لٹکا دیا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُلٹا لٹکانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ انہیں سیدھا لٹکانا زیادہ آسان اور مناسب ہو سکتا تھا؟...... پھر میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب مجھے اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے درخت سے بندھے ہوئے رسّے کا دوسرا سرا ڈھیلا کر رہے ہیں' رسّہ اپنے بندھے ہوئے بوجھ سے آہستہ آہستہ نیچے کنویں میں اُترنے لگا۔ میں نے دھڑکتے دِل سے ایک قدم آگے بڑھ کر منڈیر سے نیچے کنویں میں جھانکا۔ کسی ظاہری بتی بجلی کے بغیر ہی اندر اتنی روشنی تھی کہ میں کنویں کی اندرونی دیوار' اس پہ اُگے ہوئے خودرَو پودے اور شاہ صاحب کا دھڑ دھیرے دھیرے نیچے کھسکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اچانک منظر بدلا اور صدیوں پہلے ظلم و استبداد کے اندھیروں میں مظلوم' مقہور و معتوب عوام اور قیدیوں' مجرموں کے لرزتے کانپتے تڑپتے جسم میری گناہ گار نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے جنہیں بالکل اسی طرح اُلٹا سیدھا گرہ بند' خاردار رسّوں سے جکڑ کر چاہِ بابل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتار دیا جاتا تھا جہاں گھنے اندھیرے' ہولناک سناٹے' خوفناک حشرات الطبق' تیزابی دلدلیں اور اذیت و موت کی عقوبتیں مُنہ

کھولے ان کی منتظر ہوتیں اور پھر چشمِ فلک ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاتی تھی...... یہیں اچانک مجھے یاد آیا کہ اس کنویں میں تو سینکڑوں ہزاروں بھینسیں بھی اُتر چکی ہیں' وہ کہاں کدھر گئیں؟ اس کا مطلب ہے کہ اس کنویں کے اندر بھی کوئی زمان و مکان کا سلسلہ ہے جو میری نظر سے پوشیدہ ہے...... میں مزید کچھ دیکھنے کے لئے آگے منڈیر کے اُوپر جھکائی لے کر نیچے جھانکنے لگا۔ شاہ صاحب کا دھڑ اب کافی نیچے اُتر چکا تھا' اِدھر حافظ صاحب ایک دو قدم پیچھے ہٹے کھڑے بڑی مستعدی سے درخت کے تنے کے گرد سے رسے کے حلقے سرکاتے جا رہے تھے۔ اُنہیں اس مشقت میں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ نابینا ہیں۔ کیا اندھے' نابینے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ آگے جھک کر نیچے بھی جھانکتے جا رہے تھے؟ موٹے رسے جس پہ ہر دو فٹ پہ گرہیں لگی ہوئی تھیں' اب شاید سارا کنویں میں اُتر چکا تھا اور اس کا صرف آخری سرا درخت کے تنے سے بندھا رہ گیا۔ میرے لئے چاہت عجب تھی کہ لاتعداد بھینسوں کے بعد شاہ صاحب مع رسے اور پتہ نہیں کہ کون کون اس کنویں میں اُتر چکے ہیں۔ کنواں تھا یا حلیم' نہاری کی دیگ کہ کئی طرح کے گوشت' دالیں اور مصالحے پڑتے جا رہے ہیں اور بھی خدا جانے کیا کچھ اس میں ڈالنے کے لئے باقی دھرا پڑا ہے؟......

ہیبت' خامشی اور پُراسراریت کچھ ایسے دَر آئی تھی کہ ابھی تک ایک لفظ بھی میرے منہ سے نکلا تھا اور نہ ہی قبلہ حافظ صاحب نے ہونٹ سے کچھ کام لیا۔ کہا جا سکتا تھا کہ یہاں نطق و بصارت سوچ و عقل اور جسم و جذبات کا کچھ دخل نہیں تھا۔ یہاں تو صرف بصارت ہی بصارت یا پھر شاید کچھ بطونی ربط و بصیرت ہو جو تھوڑا بہت کام کر رہی تھی...... اب حافظ صاحب میرے سامنے پیٹھ کر کے بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے اشارہ کرنے لگے کہ میں ان کی گردن کے گرد اپنے بازو حائل کر کے کمر پہ سوار ہو جاؤں۔ میں سمجھ تو گیا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے ہیں مگر میں نے پوچھ لینا ہی مناسب سمجھا۔ اب میں اُن سے بات کرنا چاہ رہا ہوں مگر شاید میری نطق اظہار سے عاجز ہو چکی تھی۔ ذہن میں الفاظ موجود ہیں' زبان تک آ رہے ہیں' زبان حرکت بھی کر رہی ہے لیکن الفاظ صوت کی لہروں میں تبدیل نہیں ہو رہے۔ بہتیری کوشش کی مگر میری زبان شاید کچھ کہنے سننے سے قاصر ہو چکی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا' گردن کے گرد بازو لپیٹ کر حافظ صاحب کی کمر پہ لٹک گیا۔ اُنہوں نے میری پتلی پتلی ٹانگیں آگے اپنے پیٹ کی ناف کے اوپر اکٹھی کر کے میرے دونوں پیر ایک دوسرے میں نیچے اوپر پھنسا کر ایک دوسرے میں جکڑ دیئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے اُٹھا کر اس حُجرے سے باہر بھاگنے والے ہیں مگر جب اُنہوں نے کنویں کی منڈیر پہ چڑھ کر رسے کو تھام کر کنویں میں لٹکنا چاہا تو میری تو سٹی گم ہو گئی...... یا اللہ! یہ حافظ صاحب مجھے ساتھ لئے کہاں کود رہے ہیں؟...... احتجاج کی غرض سے زبان اور ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے مگر جیسے سب کچھ میرے کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔

حافظ صاحب کسی ٹرینڈ کوہ پیما کی مانند مجھے کمر پہ لادے گرہوں والے رسّے کی مدد سے قدم قدم نیچے سرک رہے تھے اور میں باندری کے بچّے کی طرح متوحّش سا لٹکا' چمٹا ہوا کبھی اوپر اور کبھی بہت نیچے اتھاہ گہرائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حافظ صاحب سے مجھے کبھی کچھ خوف محسوس نہیں ہوا تھا مگر یہ کارروائی دیکھ کر میں آج پہلی بار ان سے بِدکا تھا۔ وہ سر کا پنڈولم اور آنکھوں کے ڈیلے گھماتے' ہاتھ کی لاٹھی سے قدم قدم زمین کو ٹٹولتے ہوئے بوڑھے سے حافظ صاحب آج مجھے ایک مختلف انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پنڈے کی دھیمی دھیمی خوشبو اور تسکین دیتی ہوئی ہلکی ہلکی تمازت نے کنویں کی تہہ تک اُترتے اُترتے میرا سارا خوف و تردّد تتر بتر کر دیا تھا۔ یہاں ایک اور اچنبھا میرا منتظر تھا...... کنواں پانی سے یکسر خالی تھا۔ ہموار زمین پہ نرسل کی چٹائی بچھی ہوئی تھی' شاہ صاحب چت بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ پاس دو مٹی کے پیالے' پانی کا گھڑا' تین چار مٹی کی پکی اینٹیں اور دو چار چھوٹے موٹے کپڑے یا چادریں۔ کنویں کی دیواروں پہ دو چار چھوٹے بڑے طاقچے بھی دکھائی دیئے۔ ایک طرف مٹی کا دیا اور سبز جزدان میں لپٹا ہوا مصحفِ پاک بھی نظر آیا۔ دیا روشن تھا اور اس کی سنہری سی روشنی میں یہاں کی ہر چیز نمایاں تھی' پیچھے گھوم کر دیکھا تو دیوار میں ایک عجیب سا در بھی دکھائی دیا۔ وہی پرانی دیہاتی طرز و طرح کا دروازہ' شیشم کی رنگ و ریشہ والی لکڑی سے بنے ہوئے بیل دونوں دروازے کی نکلی ہوئی زنجیر چوکھٹ میں لٹکا ہوا کُنڈا۔

حافظ صاحب اپنی کمر کے بوجھ سمیت' شاہ جی کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اپنی گردن میری گرفت سے آزاد کراتے ہوئے انہوں نے شاہ صاحب کے رسّے سے جکڑے ہوئے پاؤں اپنی گود میں رکھ لئے' پولے پولے سہلاتے اور دابتے ہوئے انہوں نے رسّے کی اُلٹی گرہ والی گانٹھ کو ڈھیلا کر کے پاؤں آزاد کیے۔ پھر ٹخنوں اور پنڈلیوں پہ لپٹی ہوئی موٹے کپڑے کی پٹیاں بھی اُتار کر ایک طرف رکھیں۔ کافی دیر پاؤں اور پنڈلیوں پہ ہاتھ سے مالش کرنے کے بعد انہوں نے بڑی آہستگی سے دونوں پاؤں نیچے چٹائی پہ دھرے۔ میں بڑی دلچسپی اور تجسّس سے یہ ساری کارروائی اِن کے شانوں کی اوٹ سے گردن اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک حافظ صاحب میرے آگے سے اُٹھے اور سامنے دیوار کے طاقچے سے کپڑے کی ایک پوٹلی اُٹھا کر لائے' اس میں سے چند دانے ستّو نکال کر مٹی کے ایک پیالے میں ڈال کر دو گھونٹ پانی شامل کر دیا۔ پیالہ پاس دھر کر انہوں نے اب شاہ صاحب کا سر اپنے زانو پہ رکھ کر گیلے ہاتھ سے ان کے ماتھے چہرے اور آنکھوں کو تر کیا' دوسرے ہاتھ سے اُن کے شانے دابنے لگے تھے۔ میرے جی میں یوں آئی کہ میں پاس سرک کر اُن کے پاؤں سہلانے لگا۔ ہم دونوں جیسے کسی بیہوش انسان کو ہوش میں لانے کی جتن کر رہے تھے۔ ہم دونوں کی نگاہیں شاہ صاحب کے پیلے پھٹک چہرے پہ ٹکی ہوئی تھیں جس پہ شاید ڈھیرے

دھیرے دھیرے زندگی کی رمق پیدا ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ان کے لبوں کے کناروں پہ ہلکی سی جنبش دکھائی دیتے ہی حافظ صاحب نے انہیں لب ہلائے بغیر ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'' کہا' عجیب بات کہ آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی لیکن ان کے لب تک نہیں ہلے۔ اب شاہ صاحب کی آنکھوں کے بند پپوٹوں میں حرکت سی پیدا ہوئی اور چہرے کا رنگ بھی جیسے آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا ہو۔ میرے ہاتھ ان کے پاؤں پہ تھے' میں نے محسوس کیا کہ رگوں میں جیسے خون کی روانی تیز ہو گئی ہو اور جسم بھی زندگی کی حرارت پکڑتا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب نے بھی لب ہلائے بغیر ''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ برکاتہ'' کہا۔ کنویں میں شاہ صاحب کی آواز کا آہنگ کچھ یوں گرداب کی طرح گھوما کہ کنواں ''وعلیکم السلام' وعلیکم السلام' وعلیکم السلام'' کی بازگشت سے گونجنے لگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وعلیکم السلام کے کئی ٹیپ ریکارڈر آگے پیچھے' دائیں بائیں مختلف ایکو سے جاگ پڑے ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ یہاں نیچے اس کنویں اور اوپر حجرے میں کان' آنکھ' زبان' سوچ' عقل' خیالات' یہ سب اعضاء اور حسیات بیکار کیوں ہو گئی ہیں' یہ کون سی دنیا ہے؟ پھر یوں سمجھ میں آیا کہ جیسے ہم اپنی ظاہری ذات اور دکھائی دینے والی زمین کے باطن میں اتر آئے ہیں۔ یہاں ظاہر ختم ہو جاتا' صرف باطن باقی رہتا ہے۔ جیسے کعبتہ العرش اور ہے' کعبتہ الارض اور ہے۔ اندر اور ہے' باہر اور [illegible] زبان اور کان کے ظاہر [illegible] معلوم ہوا [illegible] باطنی طور پہ بات کرنے کے لئے زبان و بیاں اور بات سننے کے لئے کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہوتی...... میرا کھوجل اور شرارتی ذہن' میں نے یونہی لب ہلائے بغیر حافظ صاحب سے عرض کی۔

''قبلہ! دوپہر کو بھی [illegible] دودھ پہ اکتفا کیا تھا۔ اب رات کا معاملہ ہے' بڑی زوروں سے بھوک لگی ہے...... آپ تو صاحب تصرف ہیں' روحانی طور پہ پیٹ بھرا رہتا ہے لیکن میں بچہ کچا' ہر وقت چرنے والا۔ میرے پیٹ و نیت کی بات تو مرغ و ماہی سے ہی بنتی ہے چاہے وہ چوری کے ہی کیوں نہ ہوں......''

درخواست بڑھا کر میں سر ڈال کر بیٹھ گیا کہ دیکھیں' کیا ظہور میں آتا ہے؟...... شاہ صاحب نے پپوٹے پٹپٹاتے ہوئے نیم باز سی آنکھیں وا کیں' حافظ صاحب نے ان کی کمر کے نیچے بازو ڈال کر انہیں اپنے سینے کی ٹیک سے لگا کر بٹھا دیا اور بسم اللہ کہتے ہوئے وہی پانی والا پیالہ ان کے لبوں سے لگانا چاہا۔ شاہ صاحب نے لبوں کو جنبش دیے بغیر الحمد اللہ کہتے ہوئے متبسم لہجے میں فرمایا۔

''چند لمحے توقف فرما لیں تو مہربانی ہوگی......''

اسی لمحہ' پاس پڑے ہوئے رسّے میں حرکت ہوئی' اسے جیسے کوئی اوپر سے کھینچ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسی رسّے سے بندھی ہوئی ایک پوٹلی نیچے آئی۔ وہ ایک کندوری تھی جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی

کہ جیسے گرم گرم کھانا دیگچی سے نکال کر فوراً اس میں باندھ دیا ہو۔ وہ غیب سے اُتری ہوئی کندوری عین میری ناک کے نیچے دھری پڑی تھی اور میں اسے یوں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی جادو کی پٹاری ہو اور کوہ قاف سے کوئی جن اسے یہاں پھینک گیا ہو...... نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو حافظ صاحب اور شاہ صاحب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے اذن سے میں نے کندوری کی پوٹلی کو رسّے کے چنگل سے آزاد کیا۔ گرم گرم کھانے کے تصور اور کندوری سے اُٹھتی ہوئی اشتہا انگیز مہک نے میرے اندر کے ندیدے بھوکے کو مشتعل سا کر دیا تھا۔ اپنے آپ ہی میری زبان ہونٹوں پہ پھرنے لگی، نتھنوں میں پھڑ پھڑاہٹ سی پیدا ہوئی جسے یقیناً حافظ صاحب نے بھی دیکھ لیا ہوگا اور اسی لئے تو انہوں نے فوراً مجھے وہ کندوری کھولنے کا حکم دیا۔ عجیب سے موٹے کپڑے کی بڑی سی کندوری جو چاروں کونوں سے ضربی گانٹھ سے بندھی ہوئی تھی، گرہ کھلتے ہی اندر سے کھلے منہ والا مٹی کا ایک برتن برآمد ہوا، اس کا عجیب سی ساخت کا ڈھکن بھی سیاہ سی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ڈھکن اُٹھایا تو ایک خانے میں مرغی کا بھنا ہوا چوزہ، دوسرے خانے میں سنکی ہوئی کستورہ مچھلی، اسی طرح تیسرے میں بگھار لگے زعفرانی چاول اور چوتھے میں کافستانی تافتان کے چار برابر ٹکونے ٹکڑے...... میں ہکا بکا سا اس نعمت غیبی کو دیکھ رہا تھا جو دُنیا کے کسی فائیو سٹار ہوٹل سے تو نہیں البتہ جنات کے کسی نعمت خانے سے ہی اس طرح کے عجیب و غریب خصوصی توشہ دان میں گرما گرم، تازہ بتازہ، مختلف انواع کے لذیذ و نفیس کھانے نصیب ہو سکتے ہیں۔ ایسی ہتھیلی پہ سرسوں جمانے والی بات کہ میں نے فقط سوچا تھا، لب تک نہیں ہلائے تھے اور جو مانگا چاہا، وہ چشم زدن میں مَن و سلویٰ کی مانند اُوپر سے آپہنچا...... شاہ صاحب کے اشارے پہ میں نے چاولوں کا ایک لقمہ اپنے منہ میں رکھا۔ اِدھر حافظ صاحب نے وہی دلیہ اور پانی والا پیالہ شاہ صاحب کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چاولوں کا ہلکا سا لقمہ میرے حلق سے نیچے اُترا، میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ندیدوں کی مانند میں کھانے پہ دونوں ہاتھوں سے ٹوٹ پڑا۔ بھنا ہوا بچہ مرغ، تافتان، خستہ مچھلی، چاول، جو کچھ بھی سامنے تھا، آناً فاناً سب کچھ ہڑپ کر گیا۔ اس دوران میں نے ایک پل کے لئے بھی حافظ صاحب اور شاہ جی کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ یہ باریک نکتہ میں بہت پہلے ہی سے جان چکا تھا جب ہم حافظ منے کے ساتھ ختم قرآن، مولود شریف یا کہیں دسویں، چالیسویں پہ محض کھابے کھانے کے لئے ساتھ ہو لیتے تھے کہ جب بھی دو چار لوگوں میں کھانے کے لئے بیٹھو تو اپنی پوری توجہ بوٹیوں روٹیوں پہ مرکوز رکھو۔ اِدھر اُدھر مت دھیان دو...... ذرا سی نظر چُوکی کہ اُدھر بوٹی اُڑی۔ کوئی لاکھ متوجہ کرے، باتوں میں لگائے، آنکھوں سے گھورے۔ کسی کو ذرہ خور اعتناء ہی نہ سمجھو، ڈھیٹ بنے دسترخوان کی صفائی پہ جُتے رہو۔ میں یہاں اس وقت بھی اپنا یہی اُصول طریقہ اختیار

کئے ہوئے تھا۔ توشہ دان کے چاروں پیندے صاف کر کے اب مجھے اس لذیذ کھانے کی تہہ بٹھانے کے لئے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو کنکھیوں سے حافظ صاحب اور شاہ جی کی جانب دیکھا۔ حافظ صاحب نے توشہ دان کے پیندے میں پانی کو تلاش کرنے کا حکم سُنایا...... پیندے میں پانی؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ خالی توشہ دان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو نیچے کنارے کے ساتھ ایک اُبھرا ہوا پھول دکھائی دیا۔ یونہی اسے ہلکا سا دبایا تو پتلی سی یخ بستہ پانی کی دھار برآمد ہوئی' جھٹ توشہ دان اُٹھا کر مُنہ سے لگایا۔ اس ٹھنڈے میٹھے پانی کا بھی اپنا ایک الگ ہی سواد تھا' خوب سیر ہو کر پیا اور اس خالق و رازق کا شکر بجالایا جو زمین کے اندر پتھر میں کیڑوں کو ان کی ضرورت کے مطابق رزق بہم پہنچاتا ہے اور جو کنوئیں کے اندر اپنے بندوں کے لئے اِن کے پسندیدہ کھانے کھابوں کے وسیلے پیدا فرماتا ہے۔ اسی پانی سے مُنہ ہاتھ صاف کئے اور اسی کندوری سے ہی خشک کئے...... حافظ صاحب نے شاہ جی کو چوگا بھر پانی میں بھیگے ہوئے ستو' دلیہ کھلا کر کنوئیں کے فرش پہ لٹا دیا تھا اور پانی کا گھڑا پاس گھسیٹ کر انہیں وضو کرانے کا جتن کرنے لگے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد طبیعت میں جو آسودگی دَر آتی ہے' اسی سے غنودگی پیدا ہوتی ہے۔ طعام کے بعد ہر کسی کا جی چاہتا ہے کہ وہ گھڑی دو گھڑی پاؤں پھیلا کے ذرا کی ذرا قیام کرے' کچھ ہلکی بھاری نیند کی نیکی بھی لیتے ہیں اور پھر لوگ جب نیند میں اتر جاتے ہیں۔ یہ خدائی نعمت جو یقیناً کسی انسانی وسیلے سے تعلق نہیں رکھتی تھی' کھاپی کر میرا بے سُدھ و بے بُدھ ہونا ایک منطقی امر تھا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ خود بخود مُندھنے لگی تھیں۔ نیند' اَجل کی چھوٹی بہن اور سُکھ کی چھوٹی بھانجی ہوتی ہے' بس اسی چھوٹی سی بھانجی نے اپنے ننھے ننھے کومل ہاتھوں سے سہلا سہلا کر مجھے لُڑھکا دیا۔ میں وہی توشہ دان والی کندوری سر پہ لپیٹ کر کنوئیں کی دیوار سے لگ گیا...... حواس بیدار ہوئے تو میں اندھیرے کی قبر میں لیٹا ہوا تھا۔ چند ثانئے اسی نیم بیداری میں گزر گئے۔ پوری طرح آنکھیں کُھلنے کے بعد بھی جب اندھیرا نہ چھٹا تو لاشعوری طور پہ خود بخود ہاتھوں نے چہرے پہ پڑا ہوا کپڑا اُتار دیا...... گدرائی ہوئی رُت' ٹھنڈی پُروائی اور چڑیوں کے چہچہوں نے مجھے مکمل طور پہ بیدار و ہوشیار کر دیا تھا۔ آنکھیں کُھلتے ہی جو پہلا منظر دیکھا وہ وہی شیشم کا درخت اور اس کے ٹہن ٹہنیاں' صبح دم کے پرندے۔ ہلکی سی گردن اُٹھا کر دیکھا تو طلوعِ آفتاب کا سُنہرا غبار بھرا اُجالا اِک جادو سا جگائے ہوئے تھا۔ اَب میں ہتھیلیاں زمین پہ ٹکا کر ذرا سا اُٹھا اور اِردگرد کا جائزہ لیا۔ وہی جگہ تھی جدھر ایک روز پہلے یا ایک صدی پہلے میں اور حافظ صاحب بھری دوپہر میں بیٹھے ہوئے تھے اور جہاں اچانک حافظ جی نے مجھے اپنی گود میں گھسیٹ کر اوپر اپنی چادر ڈال دی تھی۔ دھپ دھپ' جیسے جنگلی بھینسوں کا کوئی بہت بڑا ریوڑ ہمارے اوپر سے گزر رہا ہو' پھر پیاس محسوس

ہونے پہ حافظ جی نے ایک عجیب وغریب برتن میں دُودھ منگوا کر پلایا تھا' پینے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے صدیوں کی بھوک پیاس ختم ہوگئی ہو۔ انگ انگ خمار سے بھر گیا' رُوح تک سرشار ہوگئی تھی اور پھر......
پھر میں اپنے آپ سے بے خبر ہوگیا تھا۔ ذرا ذہن پہ زور دیا تو یاد آیا کہ پھر میں شام ڈھلے ذخیرے کے اندر' حُجرے سے باہر ایک گھنے درخت تلے پڑا تھا کہ اچانک زمین کانپنے لگی' دیکھا تو وہی بھینسوں کا ایک بہت بڑا اژدھام بڑی تُندی طراری اور وحشت و بربریت سے دُمیں اُٹھائے' نتھنوں سے دُھواں اور آنکھوں سے شعلوں اُگلتا ہوا حُجرے کی جانب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ پھر میرا اندر گھسنا' حافظ صاحب کا شاہ صاحب کو کنویں کے اندر اتارنا' مجھے اپنی کمر پہ لاد کر نیچے لے جانا اور پھر مجھے بھوک کا محسوس ہونا۔ اوپر سے نیچے کھانا پہنچنا' کھانا کھا کر پھر پہلے کی طرح میرا بے سُدھ سا ہو جانا اور اب ہوش میں آنا۔ ایک ایک منظر اور بات مجھے یاد آ گئی۔ مجھے یوں بھی لگا جیسے یہ سب کچھ محض ایک خواب تھا' حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو مگر کیا کیا جائے کہ خواب اور حقیقت کبھی کبھی آپس میں ایسی گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ خواب کی دُم پکڑ لو تو بڑھتے بڑھتے آگے حقیقت مُنہ کھولے مِل جاتی ہے اور اگر کبھی حقیقت کی گردن ناپ لو تو وہاں سے پیچھے ہٹتے ہٹتے خواب وخیال کے بے بنیاد پاؤں پہ پہنچ کر ہاتھ پھسل جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو یہ دونوں چیزیں دومونہے سانپ [illegible] کہ خواب وخیال کیا ہے اور عین حق وحقیقت کیا ہے؟...... اس بیچ میں بھی خواب وحقیقت کی اُونی کندوری کے اُدھڑے ہوئے دھاگے کا سرا پکڑے اسی اُدھیڑ بُن میں پھنسا ہوا تھا کہ اس تمام واقعے کو محض خواب وخیال جانوں یا اسے حقیقت سمجھوں؟ خدا بھلا کرے اس توشہ دان کے گرد لپٹی ہوئی کندوری کا جسے میں نے کنویں کے اندر دیوار سے ٹیک لگاتے وقت اپنے سَر مُنہ پہ ڈال لیا تھا۔ یہ موٹے کپڑے کی کندوری ابھی تک میرے شانوں پہ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ سے مَس کیا۔ ملائم سمور سا لمس' میرے سارے جسم میں اِک جُھرجُھری سی لہرا گئی۔ اس کا مطلب ہے' وہ سب کچھ حقیقت ہے جس سے میں ہو گزرا تھا...... معاً مجھے خیال آیا کہ حافظ جی کہاں ہیں؟...... اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ کہیں دکھائی نہ دیے...... کہاں جا سکتے ہیں؟...... اِدھر چھاؤنی پُل کی جانب نگاہ دوڑائی تو اُدھر سے ایک تانگہ آتا ہوا دکھائی دیا...... ذرا اور قریب آیا تو اسی کی پچھلی نشست پہ حافظ صاحب براجمان تھے۔ تانگہ رُکتے ہی میں نے ''السلام علیکم'' کہنے میں پہل کی اور ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے وہ تانگے سے اُتر آئے۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ میں اب یہاں اپنے لبوں سے بات کر سکتا ہوں جبکہ حافظ صاحب نے بھی اب اپنے مُنہ سے جواب دیا تھا۔

''حافظ صاحب! آپ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے......؟''

مسکراتے ہوئے بولے۔ ''اچھا اچھا' زیادہ سوال و جواب مت کرو...... تانگے میں بیٹھو اور گھر چلو۔''

اِس روز تو اُنہوں نے میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہ دیا البتہ دوسرے دِن جب میں اُنہیں باؤ ٹرین پہ بٹھانے کی غرض سے سٹیشن تک ساتھ گیا تو گاڑی چھُوٹنے سے چند منٹ قبل میرے اصرار پہ فرمایا۔

''ٹوڈل کاں! ایک تو تم بے صبرے ہو اور دوسرے پرلے درجہ کے ضِدّی۔ جس چیز کے پیچھے پڑ جاؤ' اُسے حاصل کئے بغیر تمہیں چین نہیں آتا جبکہ ہر بات کا کوئی وقت ہوتا ہے...... کل سے تمہاری ''کاں کاں'' سے میرے کان پک گئے ہیں۔ مختصر سی بات بتاتا ہوں مگر اِس شرط کی ساتھ کہ کبھی بھی شاہ صاحب اور میری حیات میں اِس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرنا......''

مجھ سے وعدہ لینے کے بعد اُنہوں نے بتایا کہ شاہ صاحب برس میں پانچ بار چلّہ معکوس کھینچتے ہیں۔ چلّہ معکوس کے لئے چالیس دِن یا چالیس راتیں کسی کنویں میں اُلٹا لٹک کر عبادت کی جاتی ہے اور ہر دِن رات میں ایک لاکھ آسمانی اور اَرضی بلّیات وحشرات اس وظیفہ کی برکت سے اِس کنویں میں غرق کر دی جاتی ہیں۔ [illegible] میں [illegible] اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کو اُلٹا لٹکاتا ہوں اور پھر چالیس دِن کے بعد آ کر خود ہی کھولتا ہوں......''

مَیں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''کیا میرا یہ سب کچھ دیکھنا ضروری تھا......؟''

''ہاں' بہت ضروری...... دیکھو گے تو جان پاؤ گے......''

مَیں نے آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے کہا۔

''مَیں یہ اَوکھے اور خطرناک کام جان کر کیا کروں گا' مجھے کوئی ولی اللہ یا بزرگ تھوڑا ہی بننا ہے؟''

وہ قدرے خفگی سے بولے۔ ''تو پھر تم میرے ساتھ ہر وقت لڈّو لینے کے لئے چمٹے رہتے ہو؟''

''حافظ جی! مَیں تو صرف کھانے پینے کے لالچ میں......''

اُنہوں نے میری گُدّی پہ ایک دھول جماتے ہوئے کہا۔

''لالچی' ٹوڈل کاں! نہ تو مَیں حافظ منہا ہوں اور نہ ہی میرے ساتھ کھایا پیا ہوا جمعرات' ختم' مولود شریف یا کسی مُردے کے قُلوں کا کھانا ہوتا ہے۔ یہ تو خاص الخاص جِنّوں موکّلوں کا کھانا ہوتا ہے اور جو خوش نصیب یہ کھانا پینا ایک بار چکھ لیتا ہے' وہ پھر کسی بزرگ کو چلّہ معکوس ضرور کرواتا ہے اور تم نے تو یہ

کھانا پینا سپیشل فرمائش کر کے خود منگوایا تھا۔ اب تو تم نے چلّہ معکوس کروانا ہے اور خود بھی کرنا ہے......"

یہ سُن کر میرا تو خون خشک ہوگیا۔ میں خشک حلق سے صرف "حافظ صاحب" ہی کہنے پایا تھا کہ گاڑی کی روانگی کا وسل ہوگیا...... حافظ صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔

"تُوڈل کاں! اب کچھ نہیں ہوسکتا' اب تو تمہارا کنویں میں لٹکنا لکھا جا چکا ہے......" وہ گاڑی کے پائیدان پہ پاؤں ٹکاتے ہوئے کہنے لگے۔ "تم نے وہ چڑیا کوے کی کہانی تو سُنی ہوگی جس میں ساجھے کی کھچڑی پکانے میں چڑیا بے ایمانی کر جاتی ہے اور خود ہی ساری کھچڑی چٹ کر کے ہنڈیا میں ہگ مُوت کر خود چکّی کے نیچے چُھپ جاتی ہے۔ کوا بیچارہ صورتِ حال کو جان کر سخت تاؤ میں آتا ہے اور ایک لوہے کا چمٹا گرم کر کے چکّی کے نیچے چڑیا کی دُم کو داغتا ہے تو چڑیا شور مچاتی ہوئی باہر نکل کر کہتی ہے کہ ہائے ہائے' میری دُم جلی تو کوا جواب دیتا ہے' کیوں پرایا کھچڑا کھایا......؟"

یہ سُن کر میری تو ہوا سرک گئی۔ اب میں کیا کہتا اور کیا سنتا...... گاڑی سرک رہی تھی' میں سرکتی گاڑی کے ساتھ چل رہا تھا۔ حافظ صاحب دروازے میں ہی کھڑے تھے۔ گاڑی کی رفتار بڑھی تو "اللہ نگہبان" کہہ کر باآواز بلند فرمایا۔

"تُوڈل کاں! وہ کندوری والا رومال سنبھال کر رکھنا اور اپنے وعدے پہ قائم رہنا......"

اس ملاقات کے ٹھیک سات روز بعد حافظ صاحب جمعہ کے روز صبح کی نماز ادا کرتے ہوئے آخری رکعت میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ گجرات' سائیں کانواں والی سرکار کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ لکھنا بھی شاید مناسب ہوگا کہ حافظ صاحب کے پردہ فرمانے کے سوا مہینے بعد مجھے کھروٹہ سیّداں کے سیّد معصوم علی شاہ اویسی نقشبندی سرکار کا بلاوا آ گیا تھا کہ سَرڈھانپ کر پہنچو۔ ظاہر ہے سَرڈھانپنے سے مُراد یہ تھی کہ کندوری والا رومال لے کر پہنچو اور وہاں پہنچنے کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

بات اجمیر شریف کی درگاہ میں گانے بجانے والی کالی کلوٹی لڑکی رُکمنی کے اندھے باپو دِتّو مل کے اندھے پن سے شروع ہوئی تھی کہ میں اور سیٹھ مصطفےٰ علی خان' رُکمنی کی دعوت پہ اس کے گوٹھ شاملیر جاتے ہیں اور جانے کا مقصد رُکمنی کی پُراسرار شخصیت اور اس کی ناک میں انوری فیروزہ جڑے چاندی کے بلاق کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا تھی۔ رُکمنی کا اندھا باپو اُدھر جے پور کی ایک مشہور طرحدار نرتکی چمپاوتی کرناٹکی کا پکھاوجی تھا۔ چمپاوتی جہاں اپنے حُسن و جمال' عشوہ و غمزہ اور نرت و گائیکی میں ایک دانۂ گوہر تھی وہیں وہ اپنے اثر و رسوخ' دولت' محلوں اور حویلی چوباروں کے معاملے میں بھی ایک نمایاں شہرت رکھتی تھی۔ اُسے ہیرے موتی پہننے اور جمع کرنے کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس نسبت سے وہ جے پور'

جودھ پور، اجمیر، احمد آباد، ممبئی اور کلکتہ مدراس کے بڑے بڑے جوہریوں اور صرافوں کی منظورِ نظر ٹھہری تھی۔ بڑے بڑے دولت مند سیٹھ اس کی محبت کا دَم بھرتے اور اس کی چشمِ التفات کے منتظر رہتے تھے۔ وہ بھی اک کائیاں طوائف زادی تھی۔ مطلب کی آسامی کی گو دڈم کی دَم آباد کرتی اور باقیوں کو طرح دے جاتی۔ جواہرات اکٹھے کرنے کے جنون میں اس نے بڑے بڑے بیش قیمت اور نادر لعل و جواہر جمع کئے ہوئے تھے مگر وہ جو کہتے ہیں کہ مال و دولت اور اولاد فتنہ...... اولاد پیدا کرنے کے دِن نہیں تھے البتہ مال و دولت اور ہیرے جواہرات ہی اس کے لئے فتنہ ہو سکتے تھے۔ اگر خوش نظری سے دیکھا جاتا تو مال و جواہر سے کہیں بڑھ کر اس کے پاس حُسن و شباب کا سرمایہ تھا مگر شاید بیش قیمت ہیرے موتیوں کی آب و اہمیت کے سامنے اس کے حُسن و شباب کی دِلپذیری ماند پڑ گئی تھی۔ وہ تو خاص و عام جلسوں مُجروں میں بھی ہزاروں لاکھوں کے قیمتی ہیروں موتیوں اور زیورات سے لَدی پھندی رہتی تھی۔ راجستھان کے وسیع و عریض علاقے میں اکثر وہ صحرائی ٹھاکروں، قبیلہ بند راجپوتوں کے ہاں مدعو کی جاتی اور خوب گٹھڑیاں باندھ دولت سمیٹ کر لوٹتی۔ اس کے راجستھانی کٹاری کی دَھار، ناک کی دائیں طرف ایک انتہائی نادر و نایاب الوری کچے فیروزے کا دانہ جسے اصیل پارکھوں کی خاص اصطلاح میں ابابیل کا آنسو کہتے ہیں چاندی کے بلاق میں جڑا ہوا تھا اور [illegible] جھوٹی رہتی تھی۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ایسے ہی ایک صحرائی سفر میں چمپاوتی صحرائی لٹھ ماروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ چمپاوتی نے موقع پا کر اپنے سازندے دِ توّل، جو اس کے بھروسے کا آدمی تھا، کو اپنا فیروزے والا بلاق اُتار کر دیتے ہوئے تاکید کی کہ یہ بلاق وہ اپنے پاس سنبھال کر رکھے اور میرا ایک مہینہ انتظار کرے۔ اگر میں واپس نہ پہنچوں تو اس بلاق کو اجمیر شریف، خواجہ پیا کی پرشاد والی دیگ میں ڈال دے۔ اِسے کچھ اور کہنے سُننے کا سمے ہی نہیں ملا تھا۔ ڈاکو اسے مال و زر سمیت سانڈنیوں پہ ڈال کر لے گئے۔ یہ چھ سات خانہ زاد، طبلے سارنگیاں اور دوسرا تام جھام اُٹھائے، ہاتھ، جیبیں جھاڑتے ہوئے کسی نہ کسی طور واپس جے پور پہنچ گئے...... پھر وقت نے کسی ہرجائی اور فتنہ توز معشوقہ کی مانند انگڑائی لی، اُدھر لیل و نہار نے کسی بے وفا کے تیوروں کی طرح اپنے طور بدلے اور پھر ماہ و سال کی گردشوں نے دِتوّل کو بوڑھا، ناکارہ اور اندھا کر دیا۔ دِتو کی جورو کی ناک میں پڑا ہوا یہ بلاق بھی میلا کچیلا اور بوسیدہ سا ہو گیا تھا، ویسے بھی اس کی نظر میں اس کی اہمیت دو چار آنے کی چاندی سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ بلاق کے درمیان، مسور کی دال کے دانے برابر جڑا ہوا فیروزہ بھی اس کے لئے محض مکھی موم کا موتی یا کانچ کا ٹکڑا ہی تو تھا۔ اس جیسے رنگین شیشے کانچ کے نگینے اور سیپوں کے ستارے ان کی سارنگیوں تان پوروں، مجیروں کے پنجوں یا کٹاروں کے دستوں اور خول تانوں میں لگے جڑے

ہوتے ہیں۔ لُٹنے والی چھپاوتی نے معلوم نہیں کس نیّت سے کہہ دیا تھا کہ اسے خواجہ پیا کی پرشاد والی دیگ میں ڈال دینا اور جب جورو نے پہنا تو اس نے سوچا' اچھا ہوا کہ یہ بھی کسی ٹھکانے لگ گیا ہے۔ غریبوں' محنت کشوں اور ڈوم مصلّیوں کے گھروندے کی چھتوں پہ بارہ مہینے ہی ساون کی جھڑیاں لگی رہتی ہے یعنی بھوک' پیاس' ننگ ندیدی ان کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتی۔ فیروزے والا بلاق پہن کر وہ مشکل سے دو چار روز ہی خوش رہی ہوگی' اس کے بعد چل سوچل۔ گوٹھ کے ہر چولہے کی راکھ اس کے سر پڑنی شروع ہوگئی۔ کبھی باری کا تاپ تو کبھی ہیضہ بدہضمی۔ ان سے جان چھوٹتی تو دمہ کھانسی کی پھانسی اسے بے حال کر دیتی۔ ایک روز باڑے میں اُونٹ کے آگے کھڑی وہ دھرنے گئی تو اُونٹ بغلود کر رہا تھا' حلق سے گردن کی آنت غبارے کی مانند پھلائے' مستی اُٹھائے وہ رُکمنی کی میا کی جانب بڑھا۔ وہ کیا جانتی کہ یہ اُونٹ نہیں' مرتیو کی چھایا مرت ہے جو اس کے اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اونٹ' ہاتھی' گھوڑا' کتا' چکور' سیمرغ' وھیل' مار سیاہ' سمندر اور انسان جب بغلود کرنے لگیں تو پھر عافیت وشانت' بغلیں بجاتے ہوئے کہیں کھسک جاتے ہیں۔ بغلود کی کئی ایک قسمیں اور کیفیتیں ہیں۔ ظاہری اور خفی' ضرب جبری اور زدِ خفیفی' اعصابی اور ذہنی' جسمانی اور رُوحانی' علوی و سفلی' شبیہ و اشبہ' سماعی' وقائعی اور عارضی' دوامی وغیرہ۔ [illegible] سودا' خلفشار' بگاڑ' مالیخولیا' طیش' مستی' پاگل پن' جنون' حال [illegible] یہ سارے عارضے ہیں مگر یہ بغلود از قسم کیفیت ہے جو جسم و جان میں قوت اور برداشت کے عدمِ توازن سے معرضِ حالت میں آتی ہے۔ وہ قوتِ قویٰ' دل و دماغ' جنس و جذبات کی بھی ہو سکتی ہے مگر میرے مشاہدے اور تجربے میں یہ بھی آیا ہے کہ حلال جانور اور فطرت سلیمہ رکھنے والے انفاس و عناصر مخصوص نوع کے رنگوں' روشنیوں' خوشبوؤں' چند ایک راگ راگنیوں' چڑھی ہوئی سُروں' اور کچھ حجرات (پتھروں) اجرام فلکی کی گردشوں اور ان کی بڑھتی چڑھتی' غروب وطلوع' تیرہ وتنویر کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں سے بھی بغلود میں آ جاتے ہیں۔ خاص طور پہ موسیقی اور چند ایک فجری حجرات کے اثرات تو ایسے ہیں کہ زیرِ اثر سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا ہے...... وِتو کی جورو کو اُونٹ نے بازو سے دبوچ کر دو چار جھٹکے کیا دیئے کہ وہ جھٹکے کی مُرغی کی طرح گر گئی۔ سخت کوش صحرائی عورت تھی' پَران سے تو نہ گئی لیکن بازو لئے کھٹیا پہ ضرور پڑ گئی۔ ہلدی' چُونا' سینک سکائی' مالش مساج تو وہاں کام دکھائیں جہاں ہڈی بوٹی میں دَم خم ہو۔ وہ تو پہلے ہی تڑک دھم تڑک تھی' اب ہڈی بھی دو تین جگہ سے تڑخ گئی تھی۔ کسی بوڑھے یا روگی اروگی کی ہڈ ہڈی تڑخ یا ٹوٹ جائے تو پھر یہ کسی وَید جرّاح کے بس کی بات نہیں رہتی۔ اکثر پھر اس معاملے کا حل ملک الموت ہی نکالتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا مگر پکے دو برس وِتول کا بدیان کرنے کے بعد' دیہانت سے پہلے اس نے وِتول کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس کی ناک

سے یہ بلاق اُتار لے۔ دتّو نے بلاق اُتار کر پاس بیٹھی ہوئی رُکمنی کو دے دیا۔ رُکمنی کی پیٹھ ریڑھ کی سنگلی کے پانچویں مہرے پہ چاند گرہن کا پیڑا اور آنکھوں کی جڑوں میں سیاہ کالے تل پڑتے تھے اور پھر اوپر سے اُونٹنی کے اُوپرے دودھ نے اِس کے تالو کے اندر کی جِھلّی کو ہاتھ سے جھلنے والے پنکھے پہ جھولتی جھالر کی طرح لٹکا رکھا تھا۔ یہ اس کے حلقوم کے کوّے کے ساتھ دوسرا کوّا تھا' رہی سہی کسر یہ الوری فیروزے والے بلاق نے پوری کر دی یعنی مچھندر کے گھر بندر پہلے ہی بندھے ہوئے تھے' اب مچھندر نے بھی ڈیرا یہاں ڈال لیا تھا۔ کستورا ایلی کا سروپ اور مُنہ کے منگل میں اٹھائیس نچّے رتن اور اُدھام کتھی زبان۔ اتنے اور ایسے شُبھ اور اَشبھ اکھٹے ہو گئے ہوئے تھے کہ وہ بیچاری چُوں چُوں کا مُربّا بن گئی تھی اجمیر کی درگاہ شریف میں اس کو سُننے اور دیکھنے سے جو میری حالت ہوئی تھی' اس کا مناسب سا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اسے مزید جاننے سے اس کی ذات کی پُراسراریت اور الوری فیروزے والی ساری کتھا بھی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اب میرے لئے فیروزے کو حاصل کرنے سے کہیں زیادہ رُکمنی کو اس کے اثرات سے بچانا ضروری ہو چکا تھا۔ رُکمنی کی بات آگے بڑھانے سے پیشتر' میں آپ کو مختصر اً حجرات کی بابت بتانا مناسب سمجھتا ہوں۔

بہت [illegible] پتھروں [illegible] بارے [illegible] جاننے کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں کہ کون سا پتھر ان کے لئے راس ہے' ان کے نام کے لئے موافق اور قسمت کے بند دروازے کھولنے کے لئے ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ دولت' عورت اور عزت و شہرت کے حصول کے لئے کام آ سکتا ہے۔ دُشمنوں' بدخواہوں کے لئے تازیانہ ثابت ہو سکتا ہے؟ عام طور پر نیلم' یاقوت' فیروزے' عقیق' پنے وغیرہ اکثر لوگوں پہنے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ پتھر بڑے سعد اثرات کے حامل ہوتے ہیں جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو یہ عام اُنگلیوں ہاتھوں میں نظر آنے والے نیلم' یاقوت نقلی یا انتہائی گھٹیا قسم کے ہوتے ہیں جنہیں بیچنے والے بڑا بڑھا چڑھا اور غلط بیانی سے کام لے کر بیچتے ہیں' ظاہر ہے کہ دو نمبر پتھروں کے اثرات و کمالات بھی دو نمبر ہی ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ پتھروں کی بہت سی اقسام اور نسلیں ہوتی ہیں۔ اعلٰی سے لے کر اَدنیٰ تک جیسے کہ کشمیر کا زعفران' گوگوشہ' خوبانی اور سیب۔ دُنیا کے بیشتر ممالک میں بھی یہ پھل وافر پیدا ہوتے ہیں مگر کوالٹی' خوشبو اور خواص و خوبی کے لحاظ سے کشمیر کی ان نعمتوں کا کہیں جواب نہیں۔ اسی طرح گولکنڈہ کی کانوں سے جو ہیرا اور الماس نکلتا تھا اور ساؤتھ افریقہ کی کانوں سے جو دستیاب ہے وہ کوالٹی کے اعتبار سے اچھا ہوتا ہے۔ یاقوت' نیلم' پکھراج' زمرد' زبرجد' زہر مہرہ وغیرہ اگرچہ پاکستان کے علاوہ بھی کئی دیگر ممالک میں پائے جاتے ہیں مگر روس' ترکی' عرب' تھائی لینڈ' اٹلی' یونان میں

اعلیٰ کوالٹی ہوتی ہے۔ سنگِ مرمر کے لئے اٹلی' راجھستان' کابل' یونان مشہور ہیں۔ یمن' ایران' ہندوستان اور عراق بھی فیروزوں' عقیقوں اور دیگر جواہرات کے لئے مشہور ہیں۔ ترکی میں دُنیا کا بہترین سنگِ یشب' سنگِ مرمر' سنگِ سیاہ' سنگِ احمر نکلتا ہے۔...... بات فیروزے کی ہو رہی تھی۔ شجری' حسنی' حسینی' بدخشانی' ایرانی' نیشاپوری وغیرہ بہت سے نام سُنے ہوں گے مگر اَوری فیروزہ ایک خاص الخاص قسم اور نام ہے۔ اس پُراسرار' کمیاب اور وزن و حجم میں قلیل ترین جواہر کو ہر کوئی نہ تو جانتا ہے اور نہ پہچانتا ہے اور نہ ہی ہر کسے نا کس کی دسترس میں ہوتا ہے۔

تھائی لینڈ' انڈونیشیا' خلیج' مصر' پرتگال' چین' آئرلینڈ' ہوائی کے سیپ موتی بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ ہانگ کانگ' برازیل' ترکی کا مرجان۔ مدراس' ممبئی' ہانگ کانگ' پرتگال' سپین' عرب کا مُونگا۔ اسی طرح سنگِ نجف مُوئے نجف کے طرح اَلوری فیروزہ بھی اشرف اور صرف دو جگہوں پہ ہی آٹے میں نمک کے برابر کبھی کبھی دستیاب ہو جاتے ہیں اور وہ دو جگہیں عراق مقدس اور کشور ایران ہیں۔ ایک جواہر کی حیثیت سے یہ شاید کوئی ایسا قدر و قیمت کا حامل نہ ہو مگر حکمت و کیمیا اور وظیفہ ہائے علوم کی کچھ مخصوص منازل و مراتب میں اس کو عین مرکز میں رکھنا' باندھنا یا پہننا ضروری ہوتا ہے۔ جو جواہرات ہی خصوصی رُوحانی مقناطیسیت کے حامل جواہرات ہیں: عقیق (پیلا عقیق) مُوئے نجف (سفید و اسفہانی) سنگِ مریم' سنگِ سلیمانی (یروشلم کا ہیکلی) سنگِ سیاہ یا سنگِ خارا (بلالی) مروارید سیاہ (بحرینی) مرجان (مدبری) سنگِ بصری اور سنگِ موسیٰ وغیرہ وغیرہ۔ اِن تمام میں وہ شرف تحلیل اور تہذیب نہیں جو اکیلے اَلوری فیروزے (ابابیل کے آنسو) میں ہے...... الواحات کی کئی اقسام و اشکال ہیں۔ مناسب ہوگا کہ میں پہلے لوح کی مناسب سی تشریح کر دوں...... تعویذ ڈھانپی' لپیٹی' باندھی' لٹکائی' دبائی' اُڑائی' جلائی اور لکھی ہوئی تحریر ہوتی ہے۔ چند حروف ابجد' اعداد بھی ہو سکتے ہیں۔ اشکال و خطوط' نقط و نشانات بھی ہو سکتے ہیں۔ تعویذاتِ قرطاس کے علاوہ ہڈیوں' مٹی کی ٹھیکریوں' کپڑے اور چمڑے پہ بھی لکھے جاتے ہیں۔ اِن کے مقصد جائز و ناجائز مقاصد کو نوری یا اَبلیسی قوتوں کی استعانت سے وَرائے فطرت و منطق حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے کوئی ناجائز کام کرنا چاہتا ہے مثلاً اغواء' قتل' رشوت یا کوئی دھوکہ بدمعاشی وغیرہ تو ظاہر ہے کہ وہ اس جتن کے لئے کسی بدمعاش' کرائے کے قاتل' چھٹے ہوئے بستہ بے کے بدمعاش یا کسی بدعنوان پولیس والے سے رابطہ کرے گا۔ کسی مولوی' عالم عابد یا محلّے کے کسی سفید پوش سے نہیں بالکل ایسے ہی ہم اگر کسی غریب بیوہ یتیم کی مدد کرنا چاہیں یا کوئی پُل' سکول' ہسپتال بنوانا چاہتے ہیں تو پھر کسی عالم' معتبر' عزت دار ایماندار سے بات کریں گے۔ جاننا چاہئے کہ تعویذات' جادو ٹونے یا

کالا علم دونوں کا مقصد زیادہ تر کسی کو نقصان پہنچانا یا اپنے مکروہ مقاصد کی تکمیل ہوتا ہے۔ مذموم عمل کرنے اور کرانے والوں دونوں پہ اللہ کی لعنت پھٹکار اور شیطان رجیم کی جے جے کار ہوتی ہے...... ایسے دو اطراف کے افراد بے ایمان، اوتر نکھتر اور بدحال و بدشکل ہو کر دنیا سے دفعان ہوتے ہیں۔ جس گھر اور دماغ میں ایک بار تعویذ دھاگے، جادو ٹونے اُتر آئیں وہ گھر برباد، بیماریوں کی آماجگاہ، لڑائی فساد کا میدان، بے برکتی کا نشانہ اور شیطان کا اکھاڑا بن جاتا ہے۔

● کالے کے کاٹے کا منتر بھی جنتر بھی......!

آپ نے اکثر سُنا پڑھا ہوگا کہ کئی ایک گھروں میں پتھروں کی بارش، خون کے چھینٹے اور تازے گوشت کی بوٹیاں گرتی یا پڑی ہوئی ملتی ہیں۔ خوفناک فریادیں چیخیں، بجتے ہوئے ساز اور راگوں کے تانے بانے، چھنکتے ہوئے گھنگھرو اور نہ سمجھ میں آنے والے شبد سُنائی دیتے ہیں۔ ایسے گھروں، جگہوں میں رہنے والے زرد رُو، سہمے سہمے اور کسی نہ کسی جسمانی ذہنی آزار میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں...... برکت، امن اور سکون نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہیں ہوتی ہر فرد [illegible] نظر آتا ہے۔ عامل، تعویذ گنڈوں والوں اور اپنے ایسے توہم پرست رُفقاء سے اُن کے گہرے روابط ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی لوگ، ان کی ذہنی فکری، مالی اور رُوحانی بربادی کا کارن ہوتے ہیں۔ سر درد کے لئے تعویذ، قبض اور بواسیر کے واسطے تعویذ۔ ساس بہو کا فضیحتہ، شوہر کی بے توجہی، سوکن کا جلاپا...... جیٹھانی، دیورانی، نند، دیور کی جلن کُڑھن...... کاروبار کے گھاٹے، بچوں کے رشتوں میں رُکاوٹیں، صحت کی خرابی...... غرضیکہ زندگی کی ہر پریشانی مشکل کا علاج ان کے ہاں تعویذ گنڈے ہیں...... یہ نجس و نحس تعویذ، گھروں کے کونوں کُھدروں، دیواروں کی دریزوں، پلنگ تکیوں کے اندر، چولہے چکی کے نیچے، کپڑوں کی سلائی کے دوران بُکرم، اُستر، شلوار کے پائینچے میں رکھے ہوتے ہیں۔ دُودھ، چائے، کھانے میں ملائے جاتے ہیں۔ کھیر، سویّاں، حلوہ اور حلیم نہاری وغیرہ تعویذ کھلانے کے محفوظ اور زود اثر ذرائع ہیں۔ ان کی دُھونی ہوا اور سایہ دیا جاتا ہے۔ تن کے کپڑوں، بالوں، ناخنوں کو بھی جادو ٹونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بے علمی جہالت، دُشمنی اور ذاتی اَنا کی جھوٹی تسکین کی خاطر لوگ اِک دوسرے پہ جادو ٹونے کرواتے ہیں...... بڑے بڑے نذرانے دے کر عاملوں سے دوسروں کے لئے بربادیوں کے بندوبست کرواتے ہیں...... ہمارے ہاں یہ وبا ایسی عام ہے کہ شاذ ہی کوئی گھر گھرانہ بچا رہ گیا ہو...... اب آپ ہی بتائیے کہ جس گھر میں مکینوں سے کہیں زیادہ

تعویذ گنڈے وغیرہ موجود ہوں وہاں خیر و برکت' خوشی و طمانیت کا کیا کام؟...... پتھر' اینٹیں' گندگی خون پیپ نہ گریں تو کیا وہاں پھول برسیں گے...... جیسی رُوح ویسے فرشتے......!

فرمایا گیا کہ جس جگہ نماز قرآن' دُرود اور اللہ کا ذِکر ہوتا ہو' جن کے ہاں رزقِ حلال کی استعانت ہو' کسی کو زک پہنچانے کا فاسد خیال نہ آتا ہو۔ وہاں ایسی خباثتیں جنم نہیں لیتیں بلکہ اللہ کی رحمتیں اُترتی ہیں...... آیت الکرسیؒ چاروں قل' تیسرا کلمہ اور دُرودِ ابراہیمی...... ایسے شیطانی وَساوس اور سفلی مظاہرت کا حتمی توڑ ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں پڑھے لکھے معقول انسانوں کو تعویذوں گنڈوں' کالے ایلم کے چکروں اور نام نہاد عاملوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھا ہے۔ ہم انتہا کے توہم پرست ہیں' ہمارا ماحول معاشرہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہمیں اپنی ہر پریشانی' بیماری اور ناکامی کا علاج اِنہی میں دکھائی دیتا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ ان کا بطلان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ از رُوئے کتاب و حدیث ثابت ہے کہ سفلی علوم فسوں' جادو' ٹونہ' گانٹھیں' ڈورے' الواحیات تعویذات' دَم' پھونکیں وغیرہ اپنے سعد و نحس اثرات رکھتے ہیں۔ اگر شیطانی الرجیم کے وجود سے انکار ممکن نہیں پھر اس کی ابلیسی استعانت سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ شیطانی وَساوس سے چھٹکارے اور سحر و فسوں سے نجات پانے کے لئے قرآن پاک میں ایسی آیات موجود ہیں جن کے ورد سے ان کے بد اَثرات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ ثابت ہوا کہ نورانی' روحانی وسیلوں سے ہم اَبلیسی خبیث عارضوں اور نجاستوں سے خود کو مامون رکھ سکتے ہیں۔ ہر چیز کا توڑ موجود ہوتا ہے' بیماری ہے تو اُس کا علاج و شفا بھی موجود ہے' پریشانی ہے تو اس کا حل ممکن ہے...... اُلجھن کے ساتھ سُلجھاؤ' انتشار کے ساتھ سجاؤ اور جماؤ بھی ہوتا ہے۔ آشفتگی' فرسودگی آزردگی' مجبوری کی اوٹ میں...... فہمیدگی' فراست' فرحت و فرحانی ہوتی ہے۔ بس اپنی اپنی کھوج و سوچ ہے کہ بندہ کہاں تک ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

میرے ہاں آنے جانے والوں' ایک اخبار نویس بچے کی بیوی ایک نہ سمجھ میں آنے والی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ چنگی بھلی وہ دو پھول سی بچیوں کی ماں' چند دنوں میں سوکھ کر ببول کا کانٹا سا بن گئی۔ چڑچڑی ہونے کے علاوہ ایسی بدتمیز اور بدکلام ہو گئی کہ بات بات پہ گالی گلوچ ہو جاتی۔ اب جو نا قابل برداشت حرکت پیدا ہوئی کہ طیب غذا کی بجائے نجاست پہ مُنہ دھرنے لگی...... اپنی بچیوں کا بول و براز چاٹ جاتی...... کوڑا دان اُلٹ کر گند کھانے لگتی...... اک بدبو و کراہت تھی جو اُس کے جُثے سے شرنائے مارتی ہوئی خارج ہوتی...... جب حکیموں' ڈاکٹروں نے بیزار پڑ کر جواب دے دیا تو عاملوں پیروں سے رجوع ہوا۔ اب کیا تھا پورے گھر میں تعویذوں کی بہار سی لگ گئی...... کھانا پینا' برتن بھانڈے' بستر منجی' کھڑکی

چوگھٹ' چوکا چولہا غرضیکہ ہر جا' تعویذ گنڈے لٹکے ہوئے تھے۔ عاملوں نے اپنے علم کے زور پر معلوم کر لیا کہ اس عورت کے سر میں ایک انتہائی غلیظ مہترانی ڈائن کی بدروح حلول کر گئی ہے۔ جس کی غذا غلاظت اور گندہ خون ہے۔ جب تک وہ ڈائن اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی تب تک اس کی غذا خوراک یہی کچھ گندمند رہے گا...... اس کا علاج اُنہوں نے تعویذات کے ذریعہ سے شروع کر دیا تھا۔ اب اسے کیا کہئے کہ تعویذات کے باوجود مریضہ نے اپنی خوراک نہ بدلی بلکہ اور اضافہ ہو گیا۔

اب ایک رات کیا ہُوا کہ گھر والے تھکے ماندے سوئے پڑے تھے' اِسے موقعہ جو ملا پہلو پاؤں بچاتی ہوئی اُٹھتی' کواڑ کھول کر باہر سڑک پہ نکل آئی۔ بائیں جانب سے تین چار گھر پرے ایک خالی پلاٹ میں تانگے والے گھوڑے بندھتے تھے...... یہ اپنی جھونک میں وہاں پہنچی' گھوڑوں کے تھانوں کے آس پاس لید کی غلاظت بکھری پڑی تھی جو یہ بھوکوں میں پہنچی تو ادھر ہوئی...... کچھ دیر بعد بچے کے جاگنے پہ جب خاوند کی آنکھ کھلی تو بیوی بستر پہ نہ تھی...... اِدھر اُدھر دیکھتے بھالتے باہر کے دروازے پہ پہنچا تو پٹ' چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ گھبرا کر باہر نکل آیا' دائیں بائیں دیکھا پھر یونہی تو کلی اندازے سے گھوڑوں والے پلاٹ کی جانب نکل آیا۔ قریب پہنچ کر جو دیکھا تو یہ بیٹھی غلاظت پہ ہاتھ صاف کر رہی تھی...... اس طرح جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا تو وہ میرے پاس پہنچا۔

سر نیہوڑے وہ اپنی بیوی کی داستانِ غلالت سُنا رہا تھا۔ وہ بیوی جس کی گھر گرہستی' سُگھڑ پنے' دین داری اور اخلاق کو پورا خاندان سراہتا تھا...... ساس سُسر کی آنکھ کا تارا اور خاوند کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی...... آج وہی پورے خاندان کے لئے غلاظت کی پوٹ پلید اور ایک انتہائی غیر پسندیدہ فرد کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ شوہر اک عجیب مخمصے کا شکار' وہ اس کی شریکِ حیات' دو معصوم بچیوں کی ماں اور سگی ماموں زاد...... غلاظت والی حرکت' اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ صوم و صلوٰۃ والے ساس سُسر اور دیگر افراد' اُس سے کترانے لگے تھے۔ غرضیکہ وہ انتہائی غیر یقینی صورت حال کا شکار تھا۔ وہ کسی حتمی فیصلے سے پہلے سارا قضیتہ میرے گوش گزار کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

ہونقوں کی مانند مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''ہوگا تو وہی جو اللہ کو منظور ہوگا...... چھوٹے چھوٹے بچے ہیں بابا جی! کوئی سمجھ میں آنے والی اور بتانے لائق بیماری ہو تو برداشت ہو جاتی ہے۔ ہم تو شرم کے مارے کسی کو بتانے کے بھی قابل نہیں۔ خدا کے لئے کوئی رُوحانی علاج بتائیں' کوئی تعویذ دیں؟''

میں کچھ دیر اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اچانک پوچھ بیٹھا۔

''آپ کے گھر والوں کو پیروں اور تعویذوں سے خاصی دلچسپی دکھائی دیتی ہے۔''

وہ خاصا خشمگیں سا ہو کر جواب دینے لگا۔ ''ہمارے ایک خاندانی پیر ہیں' بڑے پیر صاحب تو پردہ فرما چکے ہیں اب اُن کے صاحبزادہ صاحب گدی نشین ہیں...... ضرورت پڑنے پہ اُن سے تعویذ یا پانی دَم کرا کے لاتے ہیں...... شفا تو اللہ دینے والا ہے ویسے ہمارا اُن پہ بڑا یقین ہے۔ اُن کی دُعا برکت اور تعویذوں سے ہمارے سارے کام ہو جاتے ہیں۔''

مَیں نے اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''تم میرے پاس کتنے عرصے سے آ رہے ہو؟''

''کوئی دس گیارہ برس سے......''

''مَیں نے تمہیں کبھی کوئی تعویذ یا پانی دَم کر کے دیا یا کسی اور کو دیتے دیکھا؟''

وہ کچھ مُنہ سے کچھ بولے بغیر' اپنا ہدوانے سا سر نفی میں ہلانے لگا۔

''پھر آج تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ مَیں تمہیں کوئی تعویذ دے سکتا ہوں۔''

بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''بابا جی! جس طرح مجھے یہ یقین ہے کہ ایک ہستی ایسی موجود ہے جس کے رُوبرو ہمارے ایمان، یقین اور نیتوں کے سارے گوشوارے پیش ہیں اور وہ ہر حرف و لفظ اور عدد و اعداد سے خوب واقف ہے اسی طرح مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کے پیش ہوا مسئلہ خواہ وہ کیسا بھی لاینحل ہو اُس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا......''

دل ہی دل میں اُس کی فراستی چالاکی کی داد دیتے ہوئے مَیں نے ایک سوال مزید داغ دیا۔

''برخوردار! ابھی ابھی تم کہہ چکے ہو کہ تمہارے گھر کوئی پریشانی ہو تو پیر صاحب کی دُعا برکت اور تعویذ سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اب اس پریشانی میں پیر صاحب کی دُعا برکت اور تعویذوں کو کیا ہوا؟''

وہ میرے پاؤں پکڑتے ہوئے گویا ہوا۔ ''بابا جی! اپنے پیر صاحب اور دیگر عاملوں کے تعویذ ٹونے آزمانے کے بعد ہی تو مَیں یہاں آیا ہوں کہ یہ کام کسی سُنار کی ہتھوڑی سے نہیں بلکہ لوہار کے ہتھوڑے سے ہوگا۔''

پھر اُس نے شروع سے اب تک کی تمام اَمر کہانی کہہ سُنائی کہ کس طرح بڑے بھائی کی تعویذ نواز بیوی نے جو تین عدد خوبصورت نر بچوں کی ماں ہے' نے میری بیوی کو تعویذوں کی راہ پہ لگایا...... میری اولاد میں دو بچیاں ہیں اکثر بیمار رہتی ہیں۔ جب دن رات ڈاکٹروں کے چکروں سے عاجز آ گئے۔ بڑی بھابی میری بیوی کو لے کر ایک عامل کے پاس پہنچی...... اُس خبیث نام نہاد عامل نے جانے کیا اُلٹا سیدھا عمل کیا

کہ میری بیوی جو پانچ وقت کی نمازی اور تہجد گزار تھی ایک ڈائن نما عورت بن کر رہ گئی۔ گھورنا' شک کرنا' خوامخواہ کی لڑائی بھڑائی اور گالی گلوچ اُس کا وطیرہ بن گئے...... ایک بھیانک تبدیلی یہ بھی آئی کہ وہ اپنی بچیوں سے بے پناہ محبت کا اظہار کرنے لگی۔ ہر وقت اِن کو اپنی نگاہ میں رکھتی۔ گھر کے دوسرے افراد اور بچوں کو قریب تک نہ آنے دیتی...... مجھے بھی اُن کے لاگے نہ لگنے دیتی۔ گھر میں عجیب صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی ہر فرد اِک دُوجے سے شاکی' بدظن اور اجنبی اجنبی سا...... پھر ایک دِن' میری والدہ نے اُسے غلاظت پہ مُنہ مارتے دیکھا۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن یہ حقیقت تھی کیونکہ میں نے خود اُسے اپنی چھوٹی بچی کی غلاظت لیتے دیکھ لیا...... پیار محبت سے پوچھا' ایسا کیوں کرتی ہو؟ یہ ناپاک چیزیں' انسان کے لئے نہیں...... آگے سے ٹالے وٹولے کرتی کوئی معقول جواز نہ بتاتی...... ایک دن سختی سے پوچھا تو بتانے لگی کہ مجھے غلاظت اور ناپاک چیزیں بڑی خوش نما اور خوشبودار محسوس ہوتی ہیں جبکہ عام انسانی غذا' بدنما اور غلیظ دکھائی دیتی ہے...... جب زیادہ سختی اور نگہہ داری کی تو مُنہ بند کر بیٹھی' بھلا بر اکھانا پینا چھوٹ گیا...... زبردستی سے دُودھ دلیہ دیا تو ڈڑ ڈڑ کرتے کر دی۔ اب یہ حالت ہے کہ سوکھ کر ہڈیوں کی مٹھ بن گئی ہے۔ بچیاں جو پہلے ہی لاغر بیمار تھیں ماں کی نگہداشت اور ممتا سے بھی محروم ہو گئی ہیں۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ''آپ کی بڑی بھابی جو اُس کو عامل کے پاس لے کر گئی تھی۔ اُس کا برتاؤ سلوک کیسا ہے۔ اِس سارے سینار یو میں وہ کہاں ہے؟''

''باباجی! وہ عورت بڑی حاسد اور منافق ہے۔ اِس بیماری کے بعد تو وہ جیسے لاتعلق سی ہو گئی ہے۔ کیا مجال جو وہ اپنے بچوں کو ہمارے ساتھ پاس پھٹکنے دے۔ اُلٹا وہ ہمارے خلاف رشتہ داروں میں بڑھا بڑھا کر باتیں بناتی ہے۔''

''اِس مخاصمت کی کوئی اور وجہ......؟''

وہ دماغ پہ زور دیتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

''میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ منافق اور حاسد عورت ہے۔ وہ ہمارے آبائی مکان پہ قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ کئی بار میرے بھائی کو پٹی پڑھا چکی ہے کہ وہ ہمیں کہیں اور منتقل کر دے۔ کبھی جگہ کی تنگی کبھی کچھ' کبھی کچھ...... اِس وقت بھی وہ آدھے مکان سے زیادہ پہ قابض ہے اِس کے باوجود وہ مطمئن نہیں......؟''

میں نے اپنے تئیں تمام معاملہ پہ توجہ دی تو معلوم ہوا کہ بڑے بھائی کی بیوی نے ایک جعلی عامل سے ساز باز کر کے اِس معصوم' نیک سیرت وصورت دیورانی پہ اُلٹا علم کروا دیا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ سفلی علوم کی بے شمار اقسام ہیں۔ ان میں بیشتر غیر مسلموں سے متعلق ہیں...... اس کی بڑی وجہ یہ کہ جن بنیادی مضمرات و استدراجات کی اُشد حاجت رہتی ہے وہ سب غیر مسلموں کے ہاں بدرجۂ اُتم موجود ہوتے ہیں جبکہ کسی مُسلم صاحبِ ایمان کو صالحیت کا راستہ چھوڑ کر اہلیّت کی راہ رسم اختیار کرنا پڑتی ہے۔ سفلی علوم کے لئے پلیدی نجاست، کلماتِ کفریہ اَورادِ شرکیہ تہدید و تجدید اہلیت وغیرہ ایک بنیادی پلیٹ فارم کا درجہ رکھتے ہیں۔ غیر مُسلم عاملوں جادوگروں کے ہاں کالا علم، اُلٹا علم، جنتر، منتر، تنتر، ڈھایا علم، کالی مائی کے بلیدان کا علم وغیرہ...... یہ بڑے خطرناک، زک پہنچانے والے علم ہیں۔ ان علوم کے وار اکثر و بیشتر خالی نہیں جاتے۔ ان کی کاٹ بڑی کٹھن ہوتی ہے اور اس کے لئے بڑے لمبے حساب کتاب سے گزرنا پڑتا ہے...... ہندو، ملیچھ، عیسائی، سانسی، سپیادے، چمار، مصلی، چنگڑ وغیرہ...... گتے، بلّے، بکرے، توہم، ٹموٹے، مینڈک اور سانپ کھا جانے والی قومیں، ان سفلی علوم میں ماہر تسلیم کی جاتی ہے۔ سحرِ بابلی، طلسم سامری، ارضی فسوں ہیں۔

میں معاملہ کی تہہ میں پہنچ چکا تھا بس اب چسکا لے رہا تھا۔ میری عجیب سی عادت ہے کہ میں چوہے بلّی کا کھیل بڑے شوق سے دیکھتا بھی ہوں اور جب دل چاہے کھیلتا بھی ہوں۔ اس سے مجھے کئی پہلوؤں پہ غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں نے اپنے اخبار نویس بچے سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کا استعمال کیا ہوا کوئی کپڑا لے کر آئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں اُس سے بنفسِ نفیس ملتا۔ میں کوشش کر چکا تھا مگر وہ مجھے ملنے سے کتراتی رہی۔ اُس کو مجھ سے ملنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مل لیتی تو اُس کی بیماری دُور ہو چکی ہوتی...... بہرحال، اُس کی استعمال کی ہوئی ایک قمیض مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی قمیض کے مشاہدے اور مطالعے کے بعد، میرے تجزیے کی تائید ہو گئی تھی۔ میں نے محض دو دن اس کا علاج کیا۔ تیسرے روز وہ ٹھیک ہو چکی تھی جبکہ اُس کی جیٹھانی، اُلٹی اِسی عارضے میں مبتلا ہو گئی...... علاج کے لئے نہ کسی تعویذ کو استعمال کیا گیا، نہ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرائی۔ صرف یہ کیا کہ میں نے اُس کی بیوی کو اُس کے میکے بھجوا دیا۔ وہ عورت اپنے میکے پہنچ کر تیسرے دن ٹھیک ہو گئی۔ صرف یہ اہتمام کیا گیا کہ اُسے دیسی گھی میں بنایا حلوہ ہی کھانے کو دیا جائے...... قارئین! اُس کی جیٹھانی اُسے اپنے آبائی مکان سے باہر نکالنا چاہتی تھی اور یہ بھی کہ اُس کے ہاں اولادِ نرینہ نہ ہو...... اِس ظالم عورت نے کسی انتہائی گندے عامل سے اِس پہ اُلٹا عمل کروایا، جو گندگی سے کیا جاتا ہے...... میں نے محض اُس ماحول سے نکال کر اُسے میکے پہنچایا۔ یہاں کے سفلی اور اُلٹے اثرات سے نکال باہر کیا...... اور ایک ہلکے سے نورانی عمل سے اُس عورت کی سوچ کو مثبت رنگ دیا، بس!

• رُکمنی کی گوٹھ، آدھے کنکر آدھے موٹھ......!

قارئین! ہم رُکمنی کی گوٹھ' اُس کے جھونپڑے میں بیٹھے تھے۔ رُکمنی کا باپو' دِتو مل نشے کی پینک میں اینکا بینکا سا اپنی کتھا سُنا رہا تھا...... مَیں جو کچھ جاننا چاہ رہا تھا وہ جان چکا' اب باقی ماندہ کہانی میرے مطلب کی نہیں تھی۔ اُدھر سیٹھ مصطفےٰ علی خان بار بار ٹھوکے دے کر مجھے احساس دلا رہا تھا کہ سمے کی گرہ سخت ہوتی جا رہی ہے۔ واپسی اَجمیر شریف کا راستہ کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ رَوہی میں سورج دیو مہاراج کچھ دھیرج نہیں پکڑتے شام کی شاما ڈھلتے ہی نِراس دیتے ہیں جبکہ صبح صبح تڑکے اپروا سے بھی پہلے اشنان کر کے آکاش سنگھاسن پہ براجمان ہو جاتے ہیں۔

''یہ رُکمنی راکھن اور پوچھن کہاں غائب ہو گئے؟'' مَیں نے دِتو مل کی رَواں رام کہانی میں روڑا اٹکاتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔ نشے میں بہکے ہوؤں میں یہ بھی ایک خرابی ہوتی ہے کہ وہ چالو ہی رہتے ہیں۔ آپ لاکھ بے زاری اور وقت کی تنگی کا اظہار کرتے رہیں وہ دھیان ہی نہیں دیتے۔ آپ تنگ پڑ کر اُٹھ بھی لیں تب بھی وہ رَواں دَواں ہی رہتے ہیں۔ آپ کے اُٹھنے سے اُنھیں کوئی فرق نہیں پڑتا...... ہم دونوں اپنی گھڑیاں دیکھتے ہوئے اُٹھے تو وہ ہڑبڑا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''مہاراج! کنیا اور چھوکرے آپ کے لئے جل بھوجن کی ساج کر رہے ہیں' ہم غریب لوگ آپ کی کچھ سیوا کھدمت تو نہیں کر سکت ہیں' جو ان پانی حاجر ہو' سیوکار کرو......''

مَیں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں' دِتو مل! ہم نے بہت کچھ کھا پی لیا۔ اَب کسی جل بھوجن کی طلب نہیں...... ہمیں رات پڑنے سے پہلے اَجمیر شریف پہنچنا ہے اور ہاں' مَیں جو ایک ضروری بات تم سے کرنا چاہتا تھا اُس کے لئے اب وقت نہیں رہا۔'' مَیں نے اُسے کچھ رقم تھماتے ہوئے مزید کہا۔ ''اگر تم چاہو تو دو چار روز کے اندر مجھے اَجمیر شریف آ کر ملو' مَیں تم سے رُکمنی کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں' جو تم دونوں کے حق میں بہتر ثابت ہوں گی۔''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جو حکم' مالک! آپ کی کرپا کہ آپ جیسے مہان بدھان ہمری گوٹھ پدھارے۔'' پھر میرے پاؤں چھوتے ہوئے گھگھیایا۔ ''ہم آپ کے سیوک' پرنتو آپ نے ہمن سے کیا جروری بات کرنی تھی؟ مَیں تو کھود جو رسے چھوری کی بابت کچھ جانکاری چاہ رہا تھا۔ اُس کی کسی سادھ سادھنا کا کھوج نہیں پڑتا...... یہ جس کسی گھٹنا میں بھی پڑی ہے پرنتو اس کی کیولیہ آپ کے چرنوں میں

دھری ہے' اس کی مُکتی کا کوئی اُپائے کریں مہاراج!''

میں نے اس کی یوں آزردگی اور پراتنی دیکھتے ہوئے تسلی کے طور پر کہا۔

''دِتو مل! تمہاری رُکمنی کوئی عام سی چھوری نہیں جو اس گوٹھ میں اِدھر اُدھر دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا پَرَبیت پُرش ہے جو ایک خاص سَمے' ایک انگ سی جیون جوتی اور ایک خاص سوچن لیئے ہوئے جنم لیتے ہیں...... ان کے جنم سَمے......؟''

یہ شبد کہہ ہی پایا تھا کہ زمین و آسمان جیسے پھٹ پڑے ہوں' اژدھوں کی پھنکاریں...... جانوروں کے ڈکرانے کی آوازیں...... چیخیں' کراہٹیں...... صحرائی آندھی' جھکّڑ نے چشم زدن میں پوری گوٹھ اپنے حصار میں جکڑ لی تھی جبکہ تھوڑی دیر پہلے تک اس طوفان کا دُور دُور تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ جس جھگی کُٹیا میں ہم محوِ گفتگو تھے پھڑ پھڑانے اور اُکھڑنے لگی۔ اگلے چند لمحوں میں ہم تینوں چاروں' خس و خاشاک کی مانند آندھی و جھکڑ کی زد میں تھے۔ گوٹھ والے کس حال میں تھے یہ تو ہم تب جانتے جب ہمیں اپنے حال کی خبر ہوتی؟...... نفسا نفسی کا عالم' کانوں میں آندھی کی سیٹیوں اور طوفان کی طراریوں کے علاوہ کچھ سُنائی اور نہ ہی چند ہاتھ آگے پیچھے کچھ دکھائی دیتا تھا۔ ہم پاگلوں اندھوں کی طرح ہاتھ بازو چلاتے اِدھر اُدھر بولائے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ایسا سہارا آسرا قائم نہ تھا جس سے کوئی قیام پکڑتا۔

خاص طور پہ صحرا نشینوں سے بہتر یہاں کے موسموں کے تیکھے تیوروں اور اکھڑ مزاجوں کو اور کون سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اکثر یہ لوگ بھی یہاں کی موسمی چیرہ دستیوں اور بدلتی رُتوں کی شرارتوں سے عاجز آ جاتے ہیں۔ غیر متوقع آندھیاں' زہریلی ہوائیں' طوفان' جھکڑ اور بگولے ان کے تمام تجربوں' مشاہدوں اور اندازوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ اسی لئے کام کاج' بود و باش' تہواروں' پہناوؤں' جان جانوروں' مویشیوں' جھونپڑوں باڑوں وغیرہ میں موسمی حادثات بدلتے حالات سے نمٹنے کی گنجائش رکھی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی کوئی ایسی بھی ناگہانی آفت آ پڑتی ہے جو بے پناہ جانی مالی نقصان کا باعث بنتی ہے۔

کوئی گھنٹہ بھر اس موئی ریت کے طوفان نے ہمیں اپنی ستم خیزیوں کا تختۂ مشق بنائے رکھا۔ بے بس و بے دَم' کسی کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کون ہے' کہاں ہے اور کیسے ہے...... شُوں شُوں کی بھیانک آوازیں' کانپاتی صدائیں' جیسے فضاؤں میں نادیدہ مخلوق آہ و بکا کر رہی ہو یا کسی انجانے سیارے کے باشندے صحرا میں اُتر آئے ہوں' واویلا کر رہے ہوں۔ ناک منہ آنکھیں' بال سب ریت گرد سے اَٹے پڑے تھے۔

کچھ دیر بعد چڑھا اُبال' اُترنے لگا تھا۔ حواس و توازن بحال ہوتے ہوئے اندھیرے خوب گہرے ہو چکے تھے۔ چنداں دکھائی بھی دینے لگا تھا۔ صحرائی خار دار خس و خاشاک اور واورولوں کے ہوائی انڈے اِدھر اُدھر اُڑتے دکھائی دیئے...... میں باہر کہیں ریت کے ایک ڈھیر میں گھٹنوں تک دھنسا پڑا تھا۔ خدا جانے سیٹھ مصطفےٰ علی خان' دتومل کہاں تھے؟...... آس پاس نگاہ دوڑائی پھر حدِ نگاہ تک دیکھا' وہ تو کیا کوئی اور ذی النفس بھی نظر نہ آیا۔ کچھ دُور' لکڑی بانس کے بڑے بڑے چوبے ریت میں ٹھنسے ہوئے دکھائی دیئے جو شاید گوٹھ والوں کے جھونپڑوں جھگیوں کے ستون تھے۔ مزید گرد و غبار چھٹا' اُڑتی ہوئی ریت بیٹھی' تب کچھ مریل سی بکریاں' ایک آدھ مرغی اور شتر بچے ہولائے ہوئے کہیں سے نکل آئے۔ اب میں نے خود کو ہلا جلا کر ریت سے باہر کیا۔ کپڑے جھاڑے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے سیٹھ مصطفےٰ علی کو آواز دی...... جواب نہ پا کر بلند آہنگ سے پھر پکارا' اب بھی وہی خاموشی۔ قدرے متردّد ہو کر میں اُدھر چل دیا جدھر دو چار جھونپڑوں کی باقیات دکھائی دیں...... وہاں تک پہنچتے پہنچتے کچھ اور خستہ حال مرد و زن اور بچے جیسے زمین سے یک دم اُگ آئے تھے۔ اُن کی کھوجتی ہوئی آنکھیں اور نام لے لے کر پکارتی ہوئی زبانیں' اک عجیب سا نفسا نفسی کا ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کوئی کارزارِ حشر بپا ہو کر گزر گیا ہے۔

''رکمنی [illegible] آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ یہ ہڑبڑایا ہوا راکھن تھا۔ رکمنی کا کمسن شوہر جو بے طرح چلّا چلّا کر اُسے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کی پتلی سی کلائی تھام لی۔

''راکھن! تم ٹھیک ہو نا...... وچھن اور رکمنی کہاں ہیں۔ دتومل بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا اور ہاں میرے ساتھی سیٹھ مصطفےٰ خان کہیں دکھائی دیئے...... یہ سب لوگ خیریت سے تو ہیں؟'' میں نے اک دم بہت سے سوالات داغ دیئے تھے۔

وہ میرے کسی سوال کا جواب دینے کی بجائے ''رکمنی رکمنی'' چیختا ہوا ایک جانب بھاگ لیا...... میں اُسے بھاگتے ہوئے دیکھ ہی رہا کہ ایک بوڑھا' جو ہمارے جھونپڑے میں دتومل کے ساتھ بیٹھا تھا' میرے قریب سے گزرا۔ میں نے لپک کر اُسے دبوچا۔

''بھلے مانس! دتومل کدھر ہے' وہ اپنی رکمنی بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ سب گوٹھ والے کہاں ہیں؟''

وہ بٹ بٹ پاگلوں کی مانند مجھے محض گھورے جا رہا تھا پھر حلقوم سے عجیب بھیانک سی آوازیں نکالتا ہوا ایک جانب بڑھ گیا۔ اچانک مجھے سیٹھ مصطفےٰ خان ڈگمگاتا ہوا دکھائی دیا' مجھے دیکھتے ہی بھاگا آیا۔

ہاتھ لگا کے یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ میں حقیقت میں اس کے سامنے موجود ہوں۔ ہم نے مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔

رات کے پہلے پہر کی شروعات تھیں۔ اندھیرا ابھی ایسا کہ آس پاس سہولت سے دیکھ بھی سکیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا اندھیری آندھی یا طوفان جب گزر لیں اپنا غبار نکال لیں تو بعداً اک عجیب سا واضح اُجالا گھنڈ آتا ہے' ایسی ہی کچھ کیفیت اس وقت بھی تھی...... اب ہم دونوں مسافروں کو یہاں کے مکینوں کی ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی کہ جیتے ہیں یا مرتے ہیں۔ یہاں اینٹوں پتھروں کے مکان پلازے تو تھے نہیں اُن کے شکستہ در و دیوار ہی کہیں دکھائی دے جاتے۔ بانس' بالوں' تپڑ کھالوں کی جھگیوں جھونپڑوں کی بھلا کیا اوقات ہوتی ہے' ہلکا سا باد و باراں ہی اِن کے جوڑ اکھاڑنے اور چولیں ڈھیلی کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اب آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے باسیوں کا تار پود اکٹھا ہونے لگا۔ ہم دونوں مچھندر بھی ان سے لگے کھڑے تھے پر کیا مجال جو کسی نے ہماری طرف توجہ دی ہو۔ سچ ہے کہ بپتا پڑنے پہ بندہ بھی بچوں سے لاپرواہو جاتی ہے بیچارے ڈوم ڈھاری خود ہی پریشان حال تھے ہماری کیا سار لیتے۔

سیٹھ [illegible] نے میرے شانے پہ ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

"جو ہونا تھا سو ہوا' اَب کیا ارادے ہیں؟ اجمیر شریف پہنچنے کا کوئی بندوبست تو شاید اس وقت مشکل ہے۔"

میں نے تُرت کہا...... "پوری رات بھی یہاں رہنا اس سے بھی زیادہ کٹھن......!"

"پھر......؟"

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ اچانک کہیں سے رُکمنی کا اندھا بوڑھا باپو کسی بغل بچے کی مانند نکل کر سامنے آ گیا۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"مالک! میں آپ دونوں کو ہی کھوج رہا تھا۔ بولیئے' آپ ٹھیک تو ہیں؟...... مالک! ہم گھریب برباد ہوگئے۔ ہمرے کنے کچھ بھی تو نہیں رہا...... ہم کھوش تھے آپ اِدھر پدھارے...... ہمرے بھاگ جاگ پڑے پر اَب ہمرے سنگ آپ بھی سنکٹ میں پڑے...... ہمی چھما کر دیں' مہاراج! چھما کر دیں......" وہ بلک بلک آنسو بہانے لگا۔

میں نے اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"دِتو مل! تم تو اندھے ہو اِس نیم اندھیرے میں ہمیں کیسے پہچانا؟"

''مہاراج! ہم منچھ کو اس کی سگندھ سے پہچانتے ہیں۔ شکل صورت چھپائی جاسکتی ہے مگر بُوباس لُکائی نہیں جاسکتی۔''

''تم ٹھیک تو ہو' گوٹھ والے' جانور سب ٹھیک تو ہیں؟ رُکمنی' راکھن اُس کا بھائی سب کہاں ہیں؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے راکھن کو پاگلوں کی طرح رُکمنی رُکمنی چلاتے' اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

وہ اپنے گلے میں کسی بدحواس سانپ کی مانند لپٹا ہوا سا پگڑ' سر پہ لپیٹتے ہوئے فکرمند سا کہنے لگا۔

''جو را میں ابھی اس طرف انہیں کھوجتا ہوں اِدھر تو مرگھٹ اور مُنگل جی کا مندر ہے...... نرکھ کے دروجے کھُلتے ہیں جب بھی کوئی تیج گھٹنا' طوپھان آتا ہے اُدھر کو ہی پلٹ کر جاتا ہے۔ دو چار منچھ' جانوراں کی سریرارتھیاں اُدھر جرور پڑی ہوئے ہیں۔''...... ''ہے پربھو''...... کا ورد کرتے کرتے وہ اس طرف ہولیا جس اوڑا ابھی بھی بھیانک بسکاریاں سیٹیاں کی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم دونوں اُس انوکھے کچے مگر گانٹھ کے پکے کو مرگھٹ اور مُنگل جی مندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ سیٹھ مصطفےٰ علی خان' خشک حلق تر کرتے ہوئے بکروٹے کی طرح ممیاتے ہوئے بولا۔

''خان صاحب! حلق میں کانٹے اُگے پڑے ہیں بھوک پیاس کے مارے رہی سہی بدھی عقل بھی جاتی رہی۔ پلیز یہاں سے چلیں...... ہاں یاد آیا' ڈھول خان کہہ رہا تھا کہ چھوری رُکمنی' بھاج بھوجن کا کہیں جتن کر رہی ہے۔ دیکھ لو کہیں وہ بھوجن پروسے انتظار نہ کر رہی ہو......

اس بھوکے سیٹھ کی ایسی ندیدی بات سن کر تاؤ بھی آیا اور ہنسی بھی کہ یہاں سب کو اپنی اپنی جانوں کی پڑی ہوئی ہے اور اسے پیٹ پوجا کی سوجھ رہی ہے۔

میں نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''یار سیٹھ! یہاں بندے بھاروؤں پہ قیامت ٹوٹی ہوئی ہے اور تمہیں بھوجن بھُجیا کی بُوجھ رہی ہے۔''

ابھی ہمارے درمیان یہ نوک جھونک چل ہی رہی تھی کہ ایک ہوشیار سا نوجوان' مرگھٹ کی اوڑ سے ہمیں کھوجتا ہوا برآمد ہوا۔ بوکھلایا ہوا وہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ دینے لگا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم اُس کے پیچھے پیچھے ہولئے۔

مٹی پتھر کے مقابلہ میں ریت یا کیچڑ میں چلنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے...... روہی ریگستان کے باسیوں کے پاؤں' جوتے ایک خاص انداز کے ہوتے ہیں۔ شہروں کے لوگ صحرا میں آسانی سے چل پھر نہیں سکتے...... پاؤں' ایڑیاں' پنڈلیاں دُکھنے لگتی ہیں۔ چند قدم چلنے پہ ہی آدمی خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرتا

ہے...... ایسی ہی کچھ صورتِ حال ہمارے ساتھ بھی تھی۔ وہ مردِ صحرائی آگے آگے میں قدرے عقب میں اور سیٹھ مصطفےٰ علی خان مجھ سے بھی کہیں پیچھے دھنسا پھنسا سا چلا آ رہا تھا جیسے اُس کے پاؤں پہ چکّی کے پاٹ بندھے پڑے ہوں۔

جہاں ہم پہنچے وہاں صحرائی بھیکڑ، کریڑ، اُلہنا اور تھور کے جھاڑ جھنڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے...... طوفان کے عفریت نے ان سخت جان جھاڑ جھنڑوں کو جڑ سے اُکھیڑ کر تہہ و بالا کر دیا ہوا تھا۔ یہاں اندھیرا کچھ زیادہ ہی دَر آیا محسوس ہوا، وہی شمشانوں، مسانوں والی مخصوص بو باس، دَم دبا دینے والی گھٹن اور نحوست کا احساس......!

وہ متوحش سا نوجوان ہمیں ریت پہ جھکے ہوئے ایک ہیولے کے پاس لے جا کر کہیں غائب ہو گیا...... اندھیرا اور گرد و غبار سے آلودہ ماحول! میں کچھ سمجھ نہ پایا کہ یہ سب کیا ہے؟ ہیولے نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر اُٹھایا۔ یہ گرگ باراں دیدہ دِتوّل تھا۔ اُس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے اپنے پاس پا کر اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''مہاراج! میری چھوری رُکمنی کو بچا لو اس پہ بہت بڑی سنکٹ میں پھنسی پڑی ہے۔ اس کی جیون جوتی سمٹ رہی ہے۔''

اُس سے توجہ ہٹا کر میں نے نیچے والے ہیولے کو دیکھنا چاہا...... اندھیرے میں کیا دکھائی دیتا؟ لیکن مجھے جاننے میں پھر بھی دیر نہ لگی کہ یہ رُکمنی ہے...... ساتھ ہی رُوپچین اور راکھن بھی پڑے ہوئے تھے۔

''سب ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے دِتوّل کو تسلّی دینے کی غرض سے پوچھا۔

''مہاراج! میرا من کہت تھا آج کچھ نہ کچھ جرور ہوئے پہلے طوپھان بھی آوت تھے، آندھیاں بھی چلت تھیں پرنتو! جو کچھ آج ہوا وہ تو کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ دیکھیں، چھوری رُکمنی! بات نہ کرے، ایسے جیسے پران ہار گئی ہو۔ بُلاتا ہوں تو کچھ جواب نہیں دیوے۔ مہاراج! آپ تو گیانی دھیانی ہیں کوئی اُپائے کرو۔ ہم یہ تو نہ کہت ہیں کہ آپ اِدھر پدھارے تو یہ دُرگھٹنا بھی آئی...... پرنتو! اگر اِس چھوری کو کچھ ہو گیا تو ہمیں کبھی نہ بھولے گا کہ ایک مسلمان بھگت جس روج اِدھر پدھارے، اُس دن ہمری چھوری ہمیں چھوڑ گئی...... بس! اَب آپ جانو آپ کا کاج! سُن لیا مہاراج......؟''

اتنا کہہ کے وہ اُٹھا اور چل دیا...... گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں دیکھتے ہی دیکھتے کہیں غائب ہو گیا۔

سیٹھ مصطفےٰ علی خان قدرے پریشان ہو کر کہنے لگا۔

''خان صاحب! آج کا دِن ہمارے لئے کچھ بھاگوان ثابت نہیں ہوا...... ڈتو مل اپنی چھوری کا مُدا ہم پہ ڈال کے چل دیا ہے۔ ہاں' ذرا ان چھوروں کو تو چُھو کر دیکھیں یہ کس حال میں ہیں؟''

''ہم بھلے چنگے ہیں...... رُکمنی گری پڑی تھی' ہم دونوں بھی اس کے سنگ لپٹ کر پڑ گئے۔ یہ رَاکھن' رُکمنی کا نابالغ مَرد تھا اور ساتھ اس کا بھائی رَوچھن' جو اُٹھتے ہی رُکمنی کو ٹٹولنے لگا۔''

''لپٹ کر پڑ گئے...... کیا مطلب؟'' مَیں نے وضاحتی انداز میں پوچھا۔

''مہاراج! اِدھر سمسان میں بہت ڈر لگے تھا اور اندھیرا بھی......''

رُکمنی' زندہ تھی مگر بے ہوش...... زندہ اور مُردہ منش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جو سوئے ہوئے اور جاگے ہوئے انسان' جلتی آگ اور بجھی ہوئی راکھ میں ہوتا ہے۔ تارِ نفس کو خفیف سا ہی جڑا ہوا ہو' دَم کے دیپک باتی میں اگر ہلکی سی بھی سُرخی گری باقی ہے تو اُسے چراغ شب آخر تو کہا جا سکتا ہے۔ بجھا ہوا دیا نہیں کہہ سکتے۔

● محملِ زیست اور مرگ......

ہست کی تار پود پندرہ ظاہری حجابوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ پندرہ میں سے پانچ حجاب تو ایسے ہیں جنہیں عام طور پہ لوگ جانتے ہیں مثلاً نبض' آنکھ کی پُتلیاں' چہرہ' بطلیاں' گردن کا لڑھکنا اور جسم کا ٹھنڈا پڑ جانا۔ اب پانچ حجاب اس کے آگے ہیں جن کی پہچان ذرا مشکل ہے۔ خون کا خشک ہونا' ریڑھ کی ہڈی سے رابطہ ختم' حواسِ خمسہ کی معطلی' اعضائے رئیسہ کی کارکردگی کا رُک جانا' حرام مغز کا پھیل کر زہر اور تعفن میں تبدیل ہونا۔ باقی پانچ حجابوں کا تعلق عام انسانوں اور پردوں سے براہ راست نہیں بالواسطہ سا ہے...... یعنی مادیت سے نہیں رُوحیت اور رُوحانیت سے ہے۔ ان حجابوں کے پیچھے جھانکی لینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں...... میڈیکل سائنس یہاں چُپ سادھ لیتی ہے۔ یہاں اِک دوسرا جہان اور مخصوص لوگوں کا گمان شروع ہوتا ہے۔ عام طور پہ کسی کی موت کی تصدیق مستند ڈاکٹر حضرات کرتے ہیں۔ جو صرف پہلے پانچ حجابوں کے اندر جھانک کر اپنا فیصلہ سناتے ہیں مگر کچھ مخصوص طبیب بھی ہوتے ہیں جو اگلے پانچ حجابوں تک بھی چنداں رسائی رکھتے ہیں اور کہیں مخصوص حالات میں اپنے اس علم سے استفادہ کرتے ہوئے انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ اکثر اَموات' اُدھوری ہوتی ہیں اور ہم کسی حد زندہ انسانوں کو دفن کر دیتے ہیں...... موت کی تصدیق کے لئے پہلے پانچ حجابوں کی گواہی کبھی کبھی اُدھوری بھی رہ جاتی ہے۔ آپ نے پڑھا سُنا ہوگا کہ نہلاتے' کفناتے یا دفناتے وقت مردہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بُھوت بُھوت کہتے ہوئے لوگ بھاگ اُٹھے یا بیہوش ہو گئے...... اِکا دُکا ایسا واقعہ سُننے کو ملتا رہتا ہے...... یہ وہی مُردے ہوتے ہیں جن کی موت کا اعلان پہلے پانچ حجابوں کی جانچ سے ہو جاتا ہے...... جبکہ کسی بھی وجہ سے اُن کے پہلے حجاب غلط تشخیص بتاتے ہیں لیکن وہ بعد کے دس حجابوں میں زندہ ہوتے ہیں...... یہاں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ پہلے دس حجابوں والی موت بھی کبھی کبھی دھوکا دے جاتی ہے۔ مردہ' بعد کے پانچ حجابوں میں زندہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کامل موت پندرہ پردوں کی تصدیق پہ وارد ہوتی ہے...... اکثر یہ بھی سُننے میں آتا ہے کہ مردہ' مرنے کے بعد اتنے گھنٹے یا دن سُنتا بھی ہے۔ آنے جانے والے کو پہچانتا بھی ہے۔ اُسے آسودگی یا تکلیف کا احساس بھی رہتا ہے۔ وہ قبر میں دفن ہونے کے باوجود' اپنے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے...... بیوی بچوں کی مصروفیات پہ نظر رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ...... یہ باتیں اِسی حجابوں والے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگرچہ پہلے دس پردوں سے موت کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی یہ امکان موجود ہے کہ کامل موت واقع نہ ہوئی ہو۔ دس حجابوں کے بعد کے حجابوں کا معاملہ پھر عام ہاتھوں میں نہیں ہوتا...... یہ تو پھر کوئی اور لوگ ہوتے ہیں؟

شاہ حسین شہادت پاہن جو مرن متراں دے لگے

سرکردہ ملامتی فقیر سرکار شاہ حسینؒ اور آپ کے محبوب نازنین سرکار مادھو لعل حسینؒ کا واقعہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ مادھو لعل' جو ایک اعلیٰ مرتبت ہندو خاندان کا چشم و چراغ تھا...... باباجی سرکار کی محبت میں رنگا ہوا' سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا...... ذات پات' رسم و رواج' عمر مقام' عزت' غُرلت ہر چیز سے بیگانہ اپنے بابا کے حضور حُجرے میں پڑا رہتا۔ ماں باپ' یار دوست' کنبہ برادری سب کچھ چھوٹ چکا تھا۔ کئی کئی روز باباجی کے ہاں پڑے گزر جاتے...... تب کہیں جا کر ماں باپ کو اپنے اکلوتے خوبصورت بیٹے کی فکر پڑی کہ بچہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے...... لاکھ سمجھایا' منت سماجت کی ایک مسلمان فقیر کی محبت و موانست سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی...... مگر یہ وہ نشہ نہیں تھا جو پند و نصیحت یا سختی و سزا سے اُتر جاتا۔ جب ہر طرح سے سمجھانے' اپنی بدنامی کا بتانے کے باوجود کچھ فرق نہ پڑا تو زنجیر ڈال گھر میں بٹھا دیا...... یہ تو شُعلے کو ہوا دینے والی بات تھی۔ آپ سرکار نے کسی قسم کا احتجاج یا فضیحتہ کھڑا کیئے بغیر' والدین کی ہر پابندی کے آگے سر ڈال دیا...... بس کھانا پینا بند اور اُن سے بات چیت ختم کر دی...... اَب دن رات مُرشد کے نام کی مالا جپتے اور

آنسو بہاتے رہتے۔ آخر فاقہ مستی اور ہمہ وقت کی آہ و زاری رنگ لائی...... نقاہت اور بے سُدھی نے نیم جاں کر دیا...... آخرکار آپ اِسی حالتِ فراق وفتوں میں بظاہر وفات پا گئے...... والدین کے لئے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا اور باعثِ ننگ وشرم بھی کہ برہمن زادہ ایک مسلمان فقیر کی عقیدت میں جان سے گزر گیا اور کچھ اطمینان بھی کہ ذات برادری میں کچھ بھاؤ بھرم رہ گیا کہ بیٹے کی اَرتھی نکال دی مگر گھر سے نکلنے نہیں دیا۔

یہ پرانا شاہدرہ تھا...... شمشان' راوی کے گھاٹ پہ تھا اور راستے میں پل...... اُدھر سے مادھولعل کی اَرتھی کا جلوس شمشان گھاٹ کی جانب آرہا تھا اور حُسنِ اتفاق دیکھئے یا مصلحتِ آفاق کہئے کہ عین اس وقت سرکار شاہ حسینؒ، شاہدرہ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک پا برہنہ 'فقیر بردوش' دُوجا اَرتھی پہ پڑا خواب خرگوش......

"ایک" اور "ایک سو ایک" کا آمنا سامنا جب بیچ پل کے ہوا تو ہندوؤں نے اس ملاقات کو بُرا شگون سمجھتے ہوئے بابا جی سے اہانت آمیز سلوک کیا اور اس افسوس ناک موت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اُنہیں نقصان پہنچانے کا جتن کیا...... ماتمی جلوس میں چند کہنہ سالہ بزرگ بھی شامل تھے اُن کے منع کرنے پہ یہ معاملہ رفع دفع تو ہو گیا لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ آپ اُلٹے قدموں لاہور کی جانب واپس ہو لیں تاکہ آپ کے گزرنے سے ارتھی پہ پرچھائیں نہ پڑے۔ آپ نے کمال استغنا سے جواب میں کہا۔

"پہلے یہ تو بتائیں کہ اَرتھی کس کی ہے اور میری پرچھائیں سے کسے بچا رہے ہو؟"

سرکار مادھولعل کے غمزدہ باپ نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔

"واہ بابا واہ! اَب ہمیں آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ یہ اَرتھی کس کی ہے اور اس کی مرتیو کا کارن کون ہے؟ ہمارے اِس معصوم بالک کی ہتیا کا کارن آپ ہیں۔ ہم اپنے بڑوں کی اِچھیا کا پالن کرتے ہوئے آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ اب آپ کرپا کر کے اُلٹے پگ واپس ہو لیں تاکہ ہم مرگھٹ گھاٹ تک جا سکیں۔

بابا جی نے بڑی بُردباری سے جواب میں کہا۔

"فقیر آپ کی کسی شرط کا پابند نہیں...... آپ کی اپنی راہ ہے اور میرا راستہ اپنا...... آپ نے اپنے بیٹے کے متعلق بات کی ہے کہ مَیں اُس کی ہتیا کا کارن ہوں...... مرا ہوا منش کسی دوسرے منش کو کیسے مار سکتا ہے؟ ہم تو اپنے دَم سانس بھی دُوجوں ضرور تمندوں کو بھینٹ کر دیتے ہیں۔"

پھر آپ نے اک بے نیازی سے اَرتھی کی جانب دیکھا جسے اُس کے عزیزوں نے کاندھا دے رکھا تھا...... فرمایا۔

"ذرا ارتھی کو نیچے رکھو میں بھی تو دیکھوں کہ کس کی ہتیا ہوئی ہے۔"

جلوس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کوئی بھی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا بلکہ ان کو اُلٹی سیدھی سُنانے لگے۔ اتنے میں ایک خشمگیں سے تیوروں والے پنڈت نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ ہمارے دھرم کے مطابق ہوم کیا ہُوا مُردہ کسی دُوجے دھرم پنتھی کو درشن دیا جائے تو مُردہ نرکھ میں رہتا ہے۔ آپ چھما کریں اور ہمارا سمے کھوٹا نہ کریں۔ اگنی درشن کی شُبھ گھڑی بیتے جا رہی ہے۔"

آپ نے اِک نگاہِ غلط سے سامنے سورج کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"شُبھ گھڑی تو اب آنے والی ہے۔ مجھ پیادہ اور اس سوار کا دین دھرم جُدا جُدا نہیں...... ایک ہی ہے۔ ہم دونوں کے لئے ایک دُوجے کا درشن نرکھ نہیں سورگ کا سمان ہے...... آپ بن کسی چنتا ارتھی نیچے رکھیں...... کوئی بھی دین دھرم مرنے جینے والوں کے درس درشن سے نہیں روکتا۔"

ماتمی جلوس میں پھر ایک بار کانا پھوسیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بالآخر اس امر پر منتج ہوا کہ اس ضدی فقیر سے بحث میں سمے ضائع کرنے کی بجائے اس کی بات مان کر جان چھڑائی جائے...... بڑے بوڑھوں کی اس [illegible] اور درشن [illegible] چہرے [illegible] کپڑا ہٹا دیا گیا۔

آپ نے قدرے جُھک کر مسکراتے ہوئے اپنے معشوقِ نازنین کا نگاہوں سے بوسہ لیا...... اردگرد استادہ ہندوؤں سے پوچھا۔

"کیا یہ مرگیا ہے......؟"

اُنہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

"اچھا! اب یہ آپ کے کس کام کا ہے؟"

بوڑھے پنڈت نے جواب میں کہا۔ "مرا ہُوا منش کسی کے بھی کسی کام نہیں ہوتا...... پوتر اگنی اس کے پاپ جلا کر کلیان کر دیتی ہے۔ اس طرح اس کی آتما ہلکی پھلکی ہو کر سورگ میں سدھار جاتی ہے۔"

بابا جی نے بڑی رسان سے کہا۔ "اگر یہ آپ کے کسی کام کا نہیں اور جلا کر راکھ کر دینا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اسے حقدار کو سونپ دیں اور یہ کارِ عمل اس کے اور خاص طور پہ آپ اور آپ کی نسلوں کے لئے بڑا سعد ہو؟"

بابا جی نے کہنے کو تو یہ سب کچھ آسانی سے کہہ دیا مگر اس ہجوم میں جیسے کسی نے پیلی بھڑوں کا چھتہ پھینک دیا تھا...... ہر فرد تاپا اور کھولایا ہوا تھا۔ کچھ اس بابا کو اُٹھا کر راوی میں پھینکنے کی تجویز دے رہے

تھے۔ کچھ اِس سے لڑنے بھڑنے کے لئے پَر تول رہے تھے۔ کوئی کچھ اور کوئی کچھ کہہ سُن رہا تھا...... بھلا ہو چند بوڑھوں کا جنہوں نے سارا معاملہ اپنا ہاتھ میں لے لیا اور کچھ ایسا جادو پھونکا کہ سارا ہجوم شانت پڑ گیا۔ پرانے بوڑھے سر جوڑ کر علیحدہ کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر کے صلاح مشورے کے بعد اُنہوں نے اپنے سب لوگوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے بابا جی شاہ حسینؒ سے کہا۔

''مہاراج! آپ کی سِکشا پہ کان دھرتے ہوئے ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ یہ اَرتھی لے سکتے ہیں۔ اِسے لے کر آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اس کے بعد آپ کا ہم شاہدرے والوں سے کوئی ناطہ نہیں۔''

بابا جی نے اَرتھی پہ پڑے پھول پتے اور کفن وغیرہ کھینچ پرے ہٹایا اور پنڈت کو مخاطب کر کے کہا۔

''پنڈت جی! آپ سے رشتے ناطے تو اور سے جڑے ہوئے ہیں' یہ کیسے ٹوٹ سکتے ہیں اور آج کے بعد سے تو اور مضبوط ہو جائیں گے۔'' پھر آپ مادھولعل سرکار کے پتا سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ سب نے باہمی رضامندی یہ اَرتھی مجھے دے دی ہے اس پہ آپ کا کوئی ادھیکار نہیں ہو گا۔''

غمزدہ نے اثبات میں سر ہلا کر بابا جی کی بات کی تصدیق کر دی

السلام [illegible] بابا جی [illegible] کا ہاتھ [illegible] مخاطب ہوئے

''اُٹھ یار! حجرے نوں چلیے......!''

سرکار مادھولعل پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ وعلیکم السلام کہتے ہوئے اُٹھے اور بابا جی کے ساتھ لاہور کی جانب چل دیئے...... تاریخ بتاتی ہے کہ یہی عزیز و اقارب جو اَرتھی اُٹھا کر شمشان گھاٹ کی جانب جا رہے تھے' بابا جی شاہ حسینؒ کے رُوحانی تصرف سے فیض یاب ہو کر مشرف با اسلام ہوئے اور انہی کی لڑی سے منسلک اکثر افراد بابا جی کی مجاورت' سجادہ نشینی میں شامل رہے۔

یہ سارا واقعہ تحریر کرنے کا مقصد کچھ اور بھی تھا...... موت برحق ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں لیکن اصل مَوت تو مَوت کامل ہے جو مکمل پندرہ حجابوں کے گرنے کے بعد واقع ہوتی ہے جبکہ عامتہ النّاس پہلے پانچ حجابوں میں ہی فارغ سمجھے جاتے ہیں باقی دس حجابوں کی اَموات کفنانے دفنانے کے مختلف مواقع پہ واقع ہوتی ہیں مگر اِن کیفیتوں کو عام لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ محض آنکھیں بند اور نبض رُکنے کو ہی مَوت سمجھتے ہیں۔

بڑھاپے اور دیگر اعصابی دماغی امراض میں کچھ ایسی صورتیں اور حالتیں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں کہ مِن وعَن سکرات سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اِن عوارض میں کوما' سکتہ' حبس دَم اور لمبی بیہوشی وغیرہ

ہیں۔ قتل، حادثات، غرقابی، بلندی سے گرنے اور آگ دھویں سے اموات بھی ایسی ہی نامکمل ہوتی ہیں..... وقوعہ پیش آنے کے بعد بھی کافی دیر تک بندہ کئی جہتوں حالتوں میں زندہ ہوتا ہے اور اکثر کو بچایا بھی جا سکتا ہے اس کے کئی جسمانی اور ذہنی نظام پکار پکار کر ہم سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ ہمارے ظاہری کان اس کے دماغ اور اعصاب و عضلات سے خارج ہونے والی صوتی اور مقناطیسی لہروں کو وصول کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

اللہ کے مخصوص بندے جو اعجاز مسیحائی سے با مشرف ہوتے ہیں..... نگہہ جن کی کیمیا، لمس جن کے شفائی اور قلب مصطفائی ہوتے ہیں وہی زندہ اور مردہ انسانوں کے پندرہ حجابوں کے رموز جانتے ہیں۔ زندہ انسانوں میں بھی کوئی کوئی ایسے انسان ہوتے ہیں جو آخری پانچ حجابوں سے واقف ہوتے ہیں یا جو انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اردگرد لاکھوں کروڑوں چلتے پھرتے انسانوں میں مکمل زندگی سے معمور بھی کوئی کوئی ہی ہوتا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکثر مرنے والے پانچ یا آٹھ دنوں تک اپنے گھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اٹھنے بیٹھنے والے کمروں میں ویسے ہی آکر بیٹھتے ہیں جیسے وہ اپنی زندگی میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کو دیکھتے ہیں۔ ان کے نادم یا خوش ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بغور غور سے دیکھا جائے تو ایسا اس لئے ہے کہ وہ مرنے والا ابھی مکمل موت سے ہمکنار نہیں ہوا ہوتا۔ جسم تو اک لباس کی مانند ہے۔ بوسیدہ لباس تبدیل کرنے سے اندر وجود، موجود ہوتا ہے۔ وجود کے بھی اگر پانچ حجاب ہٹ جائیں تو بطون تو بہر طور برقرار ہوتا ہے اور پھر آخری پانچ حجاب امرِ الٰہی یعنی روح ہے جس کے پرواز کرنے پہ ہی مکمل موت واقع ہوتی ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ صلوٰۃ و تسلیم بھی اپنی شفائی قوت سے باذن ربی مسیحائی کرتے تھے۔ کوڑھیوں کو شفا، اندھوں کو بصارت، گونگوں کو گویائی..... یہاں تک کہ مردوں میں زندگی کی روح پھونکتے تھے۔ اللہ نے ولیوں قطبوں کو بھی ایسی حکمت و دانائی عطا فرمائی۔ ان کے علاوہ غیر مسلموں، ویدوں، سنیاسیوں، یوگیوں، منیوں اور حکیموں طبیبوں میں بھی ایسی نادر روزگار ہستیاں موجود رہیں اور ہیں، جنہوں نے مردہ تنوں میں حیات تو پھونکی۔ غیر مسلموں کے لئے یہ استدراج ہوتا ہے اور اہل علم ایمان والوں کے لئے اللہ کا کرم اور امر ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے، جو چاہے عطا کرے یا نہ کرے وہ بے نیاز اور علیم و خبیر ہے۔

جس طرح زیست و موت کے حجاب ہوتے ہیں بعینہٖ ان کے خوشبوئیں، بدبوئیں بھی ہوتی ہیں۔ ان کو ہر کوئی پہچان نہیں سکتا..... اللہ کریم کے نبیوں، پیغمبروں، رسولوں کے اجسام و وجود کی نکہتیں مہکاریاں

گویا باغِ عدن کے مہکتے ہوئے نورانی گُل و سمن سے کشید ہوتی ہیں۔ اسی طرح درجہ بہ درجہ' خلفائے راشدین' اصحاب کبار' اولیائے کرام' اقطاب' غوث و اَبدال بھی اپنی مخصوص و منتخب خوشبو بیزیاں رکھتے ہیں...... آگے بڑھیں تو سالک' سائیں' صوفی' مجذوب فقیر و درویش جن کی باطنی جُزت' مرکزِ شریعت و معرفت سے ہو اور ظاہری ظہوریت' صالحیت' سلامتی اور عجز پہ ہو اُن کی خوشبوئیں بھی سُبحان اللہ ہوتی ہیں...... اللہ کے بندوں سے اُن کی بندگی' اُن کے تقویٰ اور اُن کے مقامات و درجات کی مہکیں پھوٹتی ہیں...... وہ جس راہ سے گزر جاتے ہیں اپنے پیچھے مُشکباریاں چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں بیٹھتے ہیں' قیام فرماتے ہیں وہ جگہیں گوشۂ گلستان بن جاتی ہیں...... عنبر لگائے ہوئے کوئی گزر جائے تو راہ عنبریں ہو جاتی ہے۔ سگریٹ کے سُوٹے لگاتا ہوا کوئی گزرے تو تے کی کھٹی بجھی ہوئی بدبُو طبیعت کو اَدبدا کر رکھ دیتی ہے...... بداعمال' بدنیت اور بدتمیز و بے اَدب کی زندگی' موت دونوں بدہیئتی اور بدبُو سے تعبیر ہوتی ہیں۔ خاص تو خاص کوئی عام آدمی بھی ان کا حال غلیظ طور طریق اور جسم جثے سے اُبلتی ہوئی غلیظ بدبُو سے نہیں پہچان سکتا ہے۔ کالا علم' اُلٹے وظیفے' جادو ٹونے اور سفلی علوم و تعویذوں والوں کی شکل و صورت پہ پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ اُن کے ڈیروں پہ اَبلیسی سائے پڑے ہوتے ہیں۔ سڑی ہوئی بدبُو' تعفن کو واضح طور پہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگربتیوں اور خوشبوؤں سے اس بدبو کو چھپانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے مگر بدبُو کبھی چھپی نہیں رہتی جبکہ خوشبو کو بھی کبھی پابندِ حجاب نہیں کیا جا سکتا......!

رزق حلال اور حرام کی بھی اپنی خوشبو بدبُو ہوتی ہے۔ اللہ کے بندے جو صاحب نگاہ اور اَدا ہوتے ہیں اُن سے کچھ بھی تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ ایک بڑے صنعتکار نے ایک پانچ ستارے والے ہوٹل میں افطار پارٹی کا اہتمام کیا...... بڑے بڑے ہم مرتبت لوگوں کو مدعو کیا...... ورائٹی کے طور اپنے علاقے کی مسجد کے امام کو بھی دعوت دے بیٹھے...... وہ موذن' وہ امام' وہ مسجد کا خادم اور مسکین لاغر سا اللہ کا بندہ کہیں صاحبِ نگاہ بھی تھا۔ افطاری' انواع و اقسام' پُرتکلف اور قیمتی ترین سامانِ خورد و نوش پہ مشتمل تھی۔ بسم اللہ ہوئی تو اِس بندۂ نقد و نظر نے چپکے سے مٹھی کھولی اور ایک معمولی سی کھجور مُنہ میں ڈال لی...... باقی طعام سے ہاتھ کھینچ لیا...... نماز کے بعد ایک معقول سے اللہ کے بندے نے اُنہیں معذرت پیش کرتے ہوئے روکا' پوچھا۔

"حضرت! آپ نے اپنی لائی ہوئی کھجور سے روزہ افطار فرمایا اور افطاری کے سامان سے کچھ بھی نہیں لیا' وجہ؟"

بہ ظاہر' دو رکعت کے امام...... جمعراتی مولوی دکھائی دینے والے بندۂ خوگرِ کسبِ حلال نے چند

لمبے اُس شخص کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر کمال استغناء سے جواب دیا۔

"جناب! آپ نے بھی تو اپنے گھر کے نمک سے روزہ افطار کیا تھا......"

دونوں نے ایک دوسرے کی خوشبو سے پہچانا تھا...... یعنی وہ سامانِ خورد و نوش بدبودار تھا...... کسبِ حلال سے نہیں تھا۔

اسی طرح ایک اور باباجی نے دعوت میں پہلا لقمہ لیا اور مُنہ میں رکھنے سے پہلے ہی رکھ دیا۔ میزبان نے جرأت کر کے وجہ دریافت کی...... باباجی نے جواب دیا۔

"اس کھانے میں بدبو آ رہی ہے...... سوچ کر بتاؤ کہ اس کی تیاری میں کوئی ایسی چیز تو استعمال نہیں ہوئی جو ناجائز، حرام یا مکروہ ہو؟"

پوری طرح غور و فکر کرنے کے بعد کہنے لگا۔

"باباجی! الحمدللہ میں رزق حلال کماتا ہوں بس آج کھانے کی تیاری کے دوران، نمک کم پڑ گیا جو ساتھ پڑوسی سے عاریتاً لیا تھا۔"

معلوم ہوا وہ پڑوسی ساہوکارے کا دھندا کرتا ہے۔

درویشوں فقیروں کی بارگاہوں میں کیا وقت ہے بادشاہوں امیروں نے زر و جواہر کے انبار پیش کیے...... کسی سے کراہت آئی اور کسی سے تازہ لہو برآمد ہوا...... کہیں سے مظلوموں کی آہیں کراہیں اُبھریں...... معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اُس کا متوکل متقی بندہ لقمۂ حرام و مکروہ کی مضرت سے بچا رہے۔ خیر الرازقین! اُسے کراہت، بدبو یا کسی غیبی اشارے کے ذریعے سے بچا لیتے ہیں۔ اللہ کی نعمت کہ کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے جنہیں ایسی ہی کچھ عطائیں ہوئیں کہ اُنہیں خود کو بھی اُن کی مطلق خبر نہ تھی۔ آپ نے اکثر ایسے عجیب و غریب قوتوں اور صلاحیتوں والے انسان دیکھے ہوں جنہوں نے اُنہیں حاصل کرنے کے لئے قطعی کوئی جستجو، خواہش یا شوق نہیں تھا...... اچانک ہی کہیں، کسی موقع پہ اس کا احساس ہوا کہ اُن کے ہاں یہ صلاحیت بھی ہے۔ مَیں نے بڑوں کے علاوہ کئی ایسے معصوم سے بچّے بھی دیکھے جو صحیح سے اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ بالکل کھلنڈرے بچّے...... لیکن اُن کے پاس ایسی ایسی خداداد صلاحیتیں اور علم و ہنر دیکھا کہ بے ساختہ مُنہ سے سُبحان اللہ نکل گیا...... بے شمار مشاہدوں، تجربوں، لکھے کھاتوں، پٹ سیاپوں، تجل خواری، محنت کشی سے اس نتیجے پہ پہنچا کہ بندہ بڑا گندہ ہے اس کے چاہنے یا جستجو سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ مالک و خالق جسے چاہے عطا کر دے، نہ علم کام آتا ہے نہ چٹی داڑھیوں اور تسبیح منکوں یا نمازوں سے کچھ ہوتا ہے...... کالے پیلے سُرخ چُوغے بھی محض ڈرامہ ہی ہیں۔ اگر کچھ ہے

تو وہ اَلف لام میم ہے جو تیری رضا میری تسلیم ہے۔ اللہ ہی جسے چاہے نُورِ علم صالح عطا کرے...... نُورِ ایمان و ایقان سے نوازے' نُورِ اخلاص' نُورِ بندگی اور نُورِ عجز بخشے...... سلامتی کے معنوں سے روشناس کرائے......!

میَں نہ پاکوں میں نہ پلیدوں میں...... علم داروں میں نہ بے علموں میں لیکن اُس مالکِ لوح و قلم نے مجھے بے حد نوازا...... میرے ذہن کا سینہ چاک کر دیا' میرے دل میں سے دریا گزار دیے۔ میری آنکھوں کو علمی آئینوں کی آب دے کر تابدار کر دیا...... میرے تخیّل کو بال و پر' سوچ کو سمت...... شعور کو شعار اور عقل میں علیمی دی۔

زندگی کے راستوں پہ بے شمار مقام ایسے بھی آئے جہاں عقل و ہمت بے بس سی ہو کے رہ گئیں یوں بھی کہ ایسے محسوس ہُوا کہ اب بس آگے کچھ نہیں یا کسی جہت اندھیرا ہی اندھیرا' کچھ بھی تو سُجھائی نہ دے۔ اندر باہر کے سب دیے بجھنے کو ہوتے۔ کوئی ایسی روشنی پھوٹتی کہ عقل و گمان کے سب گوشے جگمگانے لگتے...... حیلے وسیلے سب دائرہ اِدراک میں آ جاتے۔

بات کی زنجیر وہاں سے کٹی تھی جدھر دتّو مل رُکنی کا باپ رُکنی کو نیم مردہ حالت میں مرگھٹ کے اندر پاتا ہے۔ پاس رحمن اُس کا بھائی بھی پڑے ہوتے ہیں۔ انتہائی غم و اندوہ کی حالت میں دتّو مل مجھ سے شکوہ سنج ہوتا ہے کہ میں آج اُن کی کوٹھ آیا اور آج یہ طوفان بھی اُنھیں برباد کرنے کے لئے اُمڈ آیا جو ایسی تباہی لایا کہ پچھلے کئی لمبے عرصے سے اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ فطری طور پہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ کسی کے آنے سے خوشی کی خبر ملے تو اُسے بھاگوان تصوّر کیا جاتا ہے اور اگر کوئی ناپسندیدہ خبر ملے تو مہمان کو منحوس اور پتا نہیں کیا کیا نام دَھرا جاتا ہے۔ یہ تو تھے ہی صحرائی توہم پرست لوگ...... اور پھر یہ رُکنی کو مُردہ سمجھے ہوئے تھا وہ تھی بھی ایسی ہی حالت میں...... اندھیرا اور ریگ و خاشاک ابھی تک اُڑ رہے تھے پھر مرگھٹ کا ماحول بھی ایسا کہ نحوست کے سائے' بھوت پریت کی مانند' آس پاس منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

وہ ریت میں آدھی دھنسی ہوئی تھی۔ صحراؤں تھلوں کے اندر ریت میں دَھنسنا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ آندھیاں' جھکّڑ بگولے' بادِسموم' تند و تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں ان کے ساتھ ریت بھی اپنے ٹھکانے بدلتی رہتی ہے۔ انسان تو کیا' اُونٹ تک ریت کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ مگر رُکنی کے ساتھ ایسی صورت نہیں تھی۔ لگتا تھا کسی نے باقاعدہ قبر کھود کر اُسے دفن کرنا چاہا مگر کسی وجہ سے وہ اپنا کام اُدھورا چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

سیٹھ مصطفےٰ علی خان بھوکے پیٹ' پہلے ہی بولایا ہوا تھا اب اس صورتِ حال سے بوکھلا بھی گیا...... ویسے تو مرگھٹ ہی کافی تھا اب جو دتو مل بھی غائب ہو گیا تو سیٹھ مصطفےٰ علی خان ہکلایا سا کہنے لگا۔

''خان صاحب! مرگھٹ کے بھوتوں نے زخمی کا کریا کرم کر دیا ہوا ہے۔ میری مانیں تو اسے چھوئے بغیر یہاں سے ٹہل لینے میں ہی ہماری بہتری ہے۔'' وہ مجھے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

قدرے ناگواری سے اُس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے مَیں نے کہا۔

''سیٹھ صاحب! کسی زندہ انسان کو جانکنی کی حالت میں اِس منحوس مرگھٹ میں چھوڑ کر جانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ تم اسے ریت سے نکالنے میں میری مدد کرو......''

بادلِ نخواستہ' اُسے میرا ساتھ دینا پڑا...... دھان پان چھلتر سی لڑکی...... کسی کالی پیلی گاجر کی مانند ہم نے اُسے ریت سے نکال باہر کیا۔ ڈرتے ڈرتے سیٹھ نے اُس کے مُنہ ماتھے کو چھوا' نبض ٹٹولی...... اپنی عقل سمجھ اور علم کے مطابق ہر طرح کی تسلّی کر لینے کے بعد' میرے کاندھے پہ ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بڑے گھمبیر لہجہ میں [illegible] ہوئے کہا۔

''میرے حساب سے فرشتے اِس کا حساب کتاب بھی لے چکے ہیں اور اِس کی آتما' عالمِ برزخ کی جانب مراجعت کر چکی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں بھی چلنا چاہئے' اجمیر شریف کافی فاصلہ پہ ہے۔''

مَیں نے اُس کی فضول گفتگو سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے' جیب سے پِن ٹارچ نکالی...... روشن کر کے زخمی کے چہرے کو دیکھا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں...... اُس کی ناک کے بائیں نتھنے پہ خون کا دھبہ تھا...... غور سے دیکھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اُلوری فیروزے والا بُلاق زبردستی اُتارنے کی کوشش کی مگر کسی بھی وجہ سے بُلاق اُتارا نہ جا سکا...... اِسی کھینچا کھانچی میں ناک کے سوراخ سے خون نکل آیا...... مزید غور سے دیکھا تو بُلاق کے فیروزے پہ بھی خون کا قطرہ لگا ہوا دکھائی دیا...... مَیں نے ٹارچ سیٹھ صاحب کو پکڑائی اور شہادت کی اُنگلی سے بُلاق کو چُھوا پھر رومال نکالا' فیروزے پہ خون کے دھبے کو صاف کر ہی رہا تھا کہ فیروزہ' بُلاق کی زِے چھوڑ کر رومال پہ لگے خون سے چمٹ گیا۔ مَیں نے اسی طرح رومال لپیٹ کر فیروزے سمیت' اندر کی جیب میں محفوظ کر لیا۔

اِس عمل کے ٹھیک سات منٹ بعد زخمی' آنکھیں پٹ پٹ پٹپٹاتی ہوئی میرے سامنے بیٹھی تھی جبکہ سیٹھ مصطفےٰ علی خان قدرے ہٹ کر خوفزدہ سا بیٹھا' ہم دونوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ زخمی کا بھوت ہو اور مَیں اس بھوت کا دادا بھوت......!

● شُدھ شگن کا تیج ترنگ......!

قارئین! لگ بھگ پندرہ بیس روز بعد' میں اور سیٹھ مصطفےٰ علی خان' میسور میں ٹھیک اُس دریائی گھاٹ کے ایک پرائیویٹ کاٹج میں چند روز آرام کی غرض سے پڑے ہوئے تھے جدھر' کمال اُمروہی مرحوم نے فلم ''پاکیزہ'' کے لئے ہاتھیوں والے مناظر فلمائے تھے۔ آرام کے علاوہ یہاں پہنچنے کا مقصد اس اُلوری فیروزے کو ٹھنڈا کرنا بھی تھا۔ میں اب شاید اس ٹھنڈا کرنے والے عمل کی تفصیل نہ لکھ سکوں کیونکہ اِس ماش کے دانے سے بھی چھوٹے' اَبابیل کے آنسو' اُلوری فیروزے کو ٹھنڈا کرنے کا عمل ایسا گھمبیر اور جوکھموں میں مبتلا کر دینے والا ہے کہ عامل اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے...... ایسا ڈیلٹا' دلدل' دریا...... گج ہاتھی اور سورج جیہ مہاراج کے پرنام درشن کی لوں کریں...... یہ سب کچھ میسور میں ہی میسّر ہیں۔

یہاں ڈرتے ڈرتے سیٹھ مصطفےٰ علی خان نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''مری ہوئی رُکمنی دوبارہ زندہ کیسے ہوگئی؟''

میرا جواب تھا۔ ''وہ مری ہی کب تھی...... سانس' نبض اور آنکھیں ٹھہر جانے کا نام موت نہیں اور نہ ہی اِن کے بحال ہونے کا نام زندگی ہے...... اس کے محض پہلے پانچ حجاب اُٹھا دیئے گئے تھے...... ہمیں پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو دوسرے حجاب بھی اُٹھ جاتے۔''

''یہ مرگھٹ' عفریت' خون کا دھبہ' فیروزے والا بلاق وغیرہ سب کیا ہے؟'' سیٹھ نے خشک حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔

''سیٹھ صاحب! یہ اَدق باتیں' آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ دو چار باتیں کھولنے کی جرأت کرتا ہوں اگر آپ ہضم کر سکیں۔''

رُکمنی' کستورا بلی کا سروپ تھی...... اِس کا جنم لگن اُس خاص سمے کا سنگمن تھا جب سورج جیہ مہاراج کا ناتھن پڑتا ہے یعنی وہ بُرج آکاش سے بُرج گگن پہ براجتا ہے۔ ایسے اَن پن سمے کے سنگمن سے اگر کوئی منش جنم لیتا ہے وہ راکھشش کا رُوپ ہوتا ہے۔ ناری ہو تو ناشنی کا وَرودھ ہوتی ہے یعنی برباد کر دینے والی عورت...... ناگمن ناری' آگن ناری' بس کنیا' بہرکی اُبرکی ناریوں کی طرح یہ بھی کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اِس نے جو اُلوری فیروزہ یعنی اَبابیل کا آنسو پہنا ہوا تھا یہ کچا اور تِل والا تھا۔ ایسا دانہ ہر کسی کے لئے سعد نہیں ہوتا...... بلکہ برباد کر کے رکھ دیتا ہے...... یہ فیروزہ پہلے پہل کرناٹک کی بائی چمپاوتی کی نتھلی میں تھا۔ اُس نے کہاں سے حاصل کیا یہ معلوم نہیں...... ڈاکوؤں کی ایک یلغار میں اُس نے کمال پُھرتی سے

اُتار کر اپنے پکھاوجی دِتومل' رُکمنی کے پِتا کو دیتے ہوئے کہا۔

''اسے خواجہ غریب نوازؒ کی بڑی دیگ میں ڈال دینا۔ جس کے نصیب میں ہوگا اُس کے ہاں پہنچ جائے گا۔''

دِتومل اسے لے کر اجمیر شریف آ گیا لیکن اُس کے ایک عزیز نے مشورہ دیا کہ اس پتھر کو انسانی خوراک میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔ اسے فروخت کر کے اُس رقم سے اناج خرید کر دیگ میں ڈال دو...... جوہری کو دکھایا تو اُس نے خاصا قیمتی بتاتے ہوئے اِک معقول قیمت پیش کی۔ دِتومل نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بیچنا مناسب نہ سمجھا...... اتنی رقم کا اناج خرید کر دیگ میں ڈال اور فیروزے والا بُلاق اپنی پتنی رُکمنی کی میا کو بھینٹ کر دیا...... وہ بدنصیب اسے پہنتے ہی مختلف مشکلات میں مبتلا ہو گئی۔ بالآخر وہ ایک دن اپنے اُونٹ کی گرفت میں آ کر پرلوک سدھار گئی...... تب یہ بِچّا اباجین کا [illegible] اُس کی ناک سے اُتر کر رُکمنی کی ناک میں پہنچ گیا...... چمپاوتی اور دِتومل کی پتنی عام سی عورتیں تھیں اس فیروزے کی ہلکی سی سختی بھی برداشت نہ کر پائیں اور جان سے گئیں مگر یہ رُکمنی تو ایک عام منش نہ تھی اس کے تو چاروں کھونٹ مکھے ہوئے تھے۔ اندر باہر سے کالی' دھرم کرم کی اَن بھوگ تھی' [illegible] گیان میں ویدانتی...... ہر کے وہ اپنے سائے پر [illegible] اور دیو گن اُس کی رکھشا کرتے تھے...... جیسے کسی حکیم عطار کے ہاں' کستوری بڑی مخصوص جگہ اور کڑی نظر میں رکھی جاتی ہے۔ اِسی طرح وہ بھی ایک شکل و صورت' خواص و خاصیت' ظاہر و باطن اور اَرضی افلاکی [illegible] میں ایک خاصا کی چیز تھی۔ جسے صبح کہے یہ میری ہے' شام سمجھے وہ دونوں ایک ہیں...... رات جانے کہ میری جان ہے۔ رام کی رادھا' سیتا کی سیتاہرن' شیام کی شاملی...... وہ آکاش کا لگن کنڈل...... راجپوتانے کی راج کنیا۔ ویہہ دھارن ایک پکھاوجی کے ہاں ہوا جیسے کسی چمار کے کنوئیں سے چنے کی جڑ نکل آئے...... راگوں کے جھرمٹ میں راگنی رام کلی...... رتنوں میں رتن کندل...... کہنے کا کارن یہ کہ وہ ایک پُراسرار ناقابلِ فہم کنیا تھی...... میری نظر میں آ گئی اور اس کے ناک کے بُلاق میں جڑا ہوا انگوری فیروزہ بھی...... جس کی تلاش میں مَیں نکلا ہوا تھا...... مجھے کسی نہ کسی طرح یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ فیروزہ اس کے لئے بھاری ہے اس کی جان بھی لے سکتا ہے جیسا کہ پہلے دو جانیں اس کی نحوست کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ بَن کے چیتے اور گھر کے سدھائے ہوئے باگھ میں بڑا فرق ہوتا ہے...... جنگلی پیاز کی سڑن تُخمی ہر کسی کے برداشت کی بات نہیں ہوتی خاص طور پہ بالک تو کسی طور اس کی تڑکھٹ برداشت نہیں کر پاتے۔ زمین و آسمان کی کئی بلائیں' نسا چرٗ بُھوت پریت اِس کے در پہ تھے...... جبکہ یہ خواجہ پیا کے حصار میں تھی۔ اُن کی لگن میں لگی ہوئی......

اُن کی چوکھٹ پہ اُن کے گاون گاتی ہوئی ...... یہ اُن کے پریم راہ پہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ بس' یہی لگن اُسے بچا گئی۔

اُس دن جب وہاں تباہ کن اندھیری چلی اُس سے پہلے سورجیہ کی راہ میں ایک سنکٹ آئی ...... صحرا میں بھٹکتے ہوئے نساچروں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ریت کے بگولوں سے دھماچوکڑی بپا کر دی۔ وہ اُسے دفن کر دینا چاہتے تھے۔ کسی طرح ان تینوں چاروں کو اُڑا کر مرگھٹ میں دھکیل لائے اور ریت کے انبار میں دفن کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح دِتومل نے کوشش کر کے اُن کو بچانے کی کوشش کی۔ اسی دوران اُسے محسوس ہوا کہ رُکمنی تو پران ہار چکی ہے تو اُس نے اس کی ناک سے بلاق نکالنے کی کوشش کی مگر ہر ممکن طریقہ آزمانے کے باوجود وہ ناکام رہا۔ ایک طریقہ باقی بچا تھا کہ وہ کھینچ کر اُسے علیحدہ کر لے مگر وہ ایسے نہ کر سکا۔ جبکہ میں نے ہاتھ ہی لگایا تو بلاق سے فیروزہ علیحدہ ہو کر میرے رومال سے چپک گیا۔''

میں چپ ہو گیا' شاید میں لمبی بات کرتے کرتے تھک سا گیا تھا۔

سیٹھ مصطفیٰ علی خان نے میری جانب کچھ دیر تکنے کے بعد کہا۔

''رُکمنی کے بارے میں جو کچھ رہ گیا ہو وہ کہہ چکو!''

میں نے مخمل کی چھوٹی سی تھیلی سے فیروزہ نکال کر اپنی ہتھیلی پہ زندگی کی لکیر کے آخری سرے مشتری کے مکٹ پہ دھرتے ہوئے کہا۔

''کنکر بھی پتھر ہوتا ہے اور الماس بھی۔ لیکن دونوں کے مقسوم' درجات اور تصرفات مختلف ہوتے ہیں۔ اَبابیل کا آنسو'' لے بابا اَبابیل'' والے کے پاس ہی پہنچا۔''

''رُکمنی' راکھن' روچھن اور دِتومل کا کیا ہوا؟'' سیٹھ نے پوچھا۔

''بلاق سے فیروزے کے علیحدہ ہوتے ہی رُکمنی بھلی چنگی ہو گئی تھی ...... تم کو یاد ہو گا۔ وہاں سے واپسی پہ دوسرے دن تم ممبئی چلے آئے تھے جبکہ میں اجمیر رُک گیا تھا۔ دو روز بعد میں دوبارہ اُن کی گوٹھ گیا۔ اس بار میرے ہمراہ کچھ سامان بھی تھا' چاندی کا زیور' شادی کے پارچات' ہار سنگھار کی چیزیں اور کچھ برتن بستر ...... اس سامان میں راکھن' روچھن کے لئے بھی بہت کچھ تھا ...... شادی کی تقریب انتہائی سادہ سی تھی۔ رُکمنی' دُلہن کے لباس میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ راکھن کے تو تُور ہی علیحدہ تھے۔ بڑے سے پگڑ کے نیچے کھٹل آم کی گٹھلی سا چہرہ' کاجل سے لتھڑی' پتھری چُندی چُندی سی آنکھیں' کھنچا ہوا گہرا سانولا رنگ' سُرخ اور پیلے انگرکھے اور پٹکے میں اُڑسی ہوئی خم دار کٹار میں وہ ایک بانکا سا ٹھاکر لگ رہا تھا۔ اُدھر دِتومل

نے خوب نشہ پانی کیا ہوا تھا مگر تھا ہوش و حواس میں۔

میں نے یونہی پوچھ لیا۔ ''دِتّو مل! تم نے رُکمنی کی ناک سے بُلاق کیوں اُتارنا چاہا؟''

اُس کا جیسے سارا نشہ ہرن ہو گیا...... چند ساعتیں گھورنے کے بعد پوچھنے لگا۔

''آپ کو یہ کیسے معلوم پڑا......؟''

''منش مُنہ سے بولے نہ بولے' اُس کے کارکرم تو خوب بولتے ہیں۔''

وہ نظریں نیچے کیے ہوئے بتانے لگا۔ ''آپ سے کیا اوجھل کیا رہ سکتا ہے۔ مَن میں یہی سمایا کہ ٹھوری تو چھوڑ گئی بلاق اَنمول ہے۔ چمپاوتی اور ٹھوری کی میاّ کی آخری نشانی!...... بھگوان سوگند! مجھے کوئی روپے رو کڑے کا لوبھ نہیں...... بس نشانی اور قیمتی سمجھ کر پاس رکھنا چاہتا تھا۔ ہم گریبن لوگاں ایسی اُچ چیج کو ایسے ہی تو نہیں پھینک سکتے ہیں نا......!'' میرے چرن پکڑ کر مزید کہنے لگا۔ ''آپ نے رُکمنی کا لگن اپنی بٹیا سمجھ کر کیا ہے' آپ کا بہت بہت دھنباد......!''

میں نے اپنے پاؤں' اُس سے چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''دِتّو مل! میں نے اپنے کنبے سے کچھ بھی نہیں دیا' تو وہی روپے تھے جو تو اور تیری چوکھٹ سے رُکمنی کو ملے تھے اور ہاں یہ تمہاری ایک امانت ہے' جس کے لیے تم سے ایک اُپائے بھی سرزد ہوا......''

اَلوری فیروزے کی ڈبیا' اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''میری بات تم شاید ٹھیک سے سمجھ نہ پاؤ...... یہ اَبابیل کا آنسو فیروزہ ہے' جو اپنے مزاج کے خلاف کے کسی فرد کے پاس قیام نہیں کرتا...... بالکل یونہی جیسے کستوری ساںپ! یہ کسی عام انسان تو کیا کسی عام سپیرے کے پاس بھی ٹھکانا نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کھوکھپریل یا بل باڑ میں رہتا ہے۔ یہ یا تو چندن جھاڑ سے لپٹا رہتا ہے یا پھر چھوٹی الائچی کی ٹہنیوں پہ پینگ جھولتا رہتا ہے۔ اَلوری فیروزہ اور زرد حسنی عقیق بھی ہر عین اَلف میم کے پاس نہیں رہ سکتے...... کسی طور اگر کوئی اِنہیں قابو کر لے تو پھر یہ زبردستی اُس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں مگر اس علیحدگی میں نقصان قابو کرنے والے کا ہوتا ہے...... چمپاوتی' تمہاری پتنی اور خود تم اور رُکمنی اِسے صرف ایک قیمتی جواہر سمجھتے رہے۔ اس کے اچھے بُرے اثرات سے کوئی بھی واقف نہ تھا نتیجہ یہ نکلا' چمپاوتی پکڑی گئی۔ رُکمنی کی ماں' اُونٹ کے تشدّد کا شکار ہو کر مر گئی۔ اب رُکمنی کی باری تھی کہ خواجہ غریب نوازؒ نے اِس کی سہاتا کی اور وہ اِس کے منفی اثرات سے محفوظ رہی۔''

دِتّو مل آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے میری یہ تمام باتیں حیرت سے سُن رہا تھا۔ میرے چُپ ہوتے ہی وہ مجھے میرے ہاتھ ٹٹولتے ہوئے بولا۔

''مہاراج! یہ پچھیر وزہ! ہمارے کام کی چیز ناہیں۔ اسے آپ خود رکھ لیں یا کسی اور کو دے دیں۔''

''دتو مل! اگر اسے تم مجھے ہی دینا چاہتے ہو تو پھر تمہیں اس کی قیمت بھی وصول کرنی پڑے گی؟''

''آپ اسے ہماری طرف سے بھینٹ سمجھیں۔ آپ نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ کیا یہ کم ہے کہ چھوری رُکمنی کو نیا جیون ملا...... اُس کا بیاہ ہو گیا...... اُس کا اَنت سپھل ہو گیا۔''

قارئین! بڑی لمبی تمہید و تفصیل سُنانے کے بعد رُکمنی کی کتھا تمام ہوئی۔

(باب اول ختم ہوا)

کاجل کوٹھا

فکرِ فردا

رَبّ العالمین نے کچھ ایسی مخلوقات بھی اپنی کمالِ صناعی اور حکمت و مصلحت سے تخلیق فرمائی ہیں جن کو اوّلاً سمجھنا اور ان کے کار و وَرُود، اَجسام و وُجود، ممات و حیات، سرِشت جبلت کے متعلق کماحقہٗ جاننا ہی خاص طور پر اِنسان کے لئے اَدق کر دیا۔ آسمانی صحیفوں اور انبیاء کرام کے ذرائع سے حضرتِ اِنسان کو جو کچھ بھی معلوم ہوا اس سے شاید اس کی متجسسانہ فکر و طبع کی خاطر خواہ تسلی نہ ہو سکی۔ بس یہیں سے عُلومِ مخفی، رازہائے اخفاء مخصوص منظر پر آئے۔ صانعِ حکیم لَم یزل نے اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق سے بہت پہلے ملائکہ، جنّات اور دیگر نُوری و ناری عنصر الوجود مخلوقات تخلیق فرما دی تھیں۔ تخلیقِ آدم سے پیشتر کی یہ تمام مخلوقات اپنے اپنے دائرۂ کار میں محدود اور اپنی متعین مخصوص حد بندیوں میں مسدود تھیں۔ اِنسان سے ان کا بُنیادی عنصری بُعد ہی ان میں آپس کی تفریقی ضد ہے۔

نُوری، ناری، خاکی اور عنصری مخلوقات کی ضرورتیں الگ، دُنیائیں الگ، صُورتیں، سیرتیں، خوراکیں، طبع، عُمریں سب کچھ ایک دوسرے کی نقیض ٹھہریں۔ بس یہی چیزیں تھیں جنہوں نے اِنسان کو اُکسایا کہ وہ ان مخلوقات اور ان کے متعلقہ علوم کو جانے۔

خدائے سبّوح و قدّوس نے قرآن مجید میں اجمالاً، تفصیلاً مختصراً اور کہیں کہیں محض اشارتاً ان مخلوقات کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائیں اور ان کے اسماء، اختیارات و خصوصیات کا ذکر فرمایا۔ انسان نے اسی قرآن اور صاحبِ قرآن کا دامن پکڑ کر اپنے تفکّر و تجسّس سے علوم الٰہیات میں دَرک حاصل کیا، مالکِ قرآن نے خود فرمایا کہ قرآن میں فکر و تجسّس کرو اور یہ بھی ارشاد ہُوا کہ ہم نے تمام مخلوقات میں سے اشرف المخلوق صرف اِنسان کو بنایا

"پیار رنگ کالا" اور "کاجل کوٹھا" میری آوارگیوں' آشفتہ سریوں اور وارداتوں کی ایسی "بد" بیتیاں اور جگ بیتیاں ہیں جو قاری کے حسب وحال 'علمی' رُوحانی بصیرت اور ذوق وطلب کے مطابق اپنے پرت کھولتی 'معنی' اَجاگر کرتی ہیں۔ یہ کتابیں بے علمے' کج ذوقے' کم سوادے سلوک ومعرفت کی سوجھ سلامتی کے سوتیلوں سے حجاب کرتی ہیں کہ یہ راندۂ ادب وحضور ہیں۔ اور یہ بھی طے ٹھہرا کہ ان سیاہ رُو کتابوں کو دیکھنے پڑھنے کی توفیق بھی اُسے ملتی ہے جس کے "پی" کا رنگ کالا ہو اور پھر یہ کھلتی بھی اُس پہ ہیں جسے کسی "کالے" نے کاٹ کھایا ہو۔

عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے [illegible] بناں منتروں [illegible] کیلیے نی

یہ چاروں ہی اندر باہر سے کالے ہوتے ہیں... بابا وارث شاہ فرماتے ہیں کہ ان چاروں کالوں سے راہ و رسم اُستوار کرنا ایک مشکل امر ہے یہ کسی کے مسخر نہیں ہوتے۔ اگر ان کی قربت 'مجبوری یا ضرورت بن جائے تو ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ ان کی فطری مجبوریوں سے محفوظ رہتے ہوئے صرف خیر سے مستفید ہوا جا سکے۔

Rs. 1500.00

www.sang-e-meel.com
ISBN-10: 969-35-2225-7
ISBN-13: 978-969-35-2225-9
9789693522259
www.sang-e-meel.net